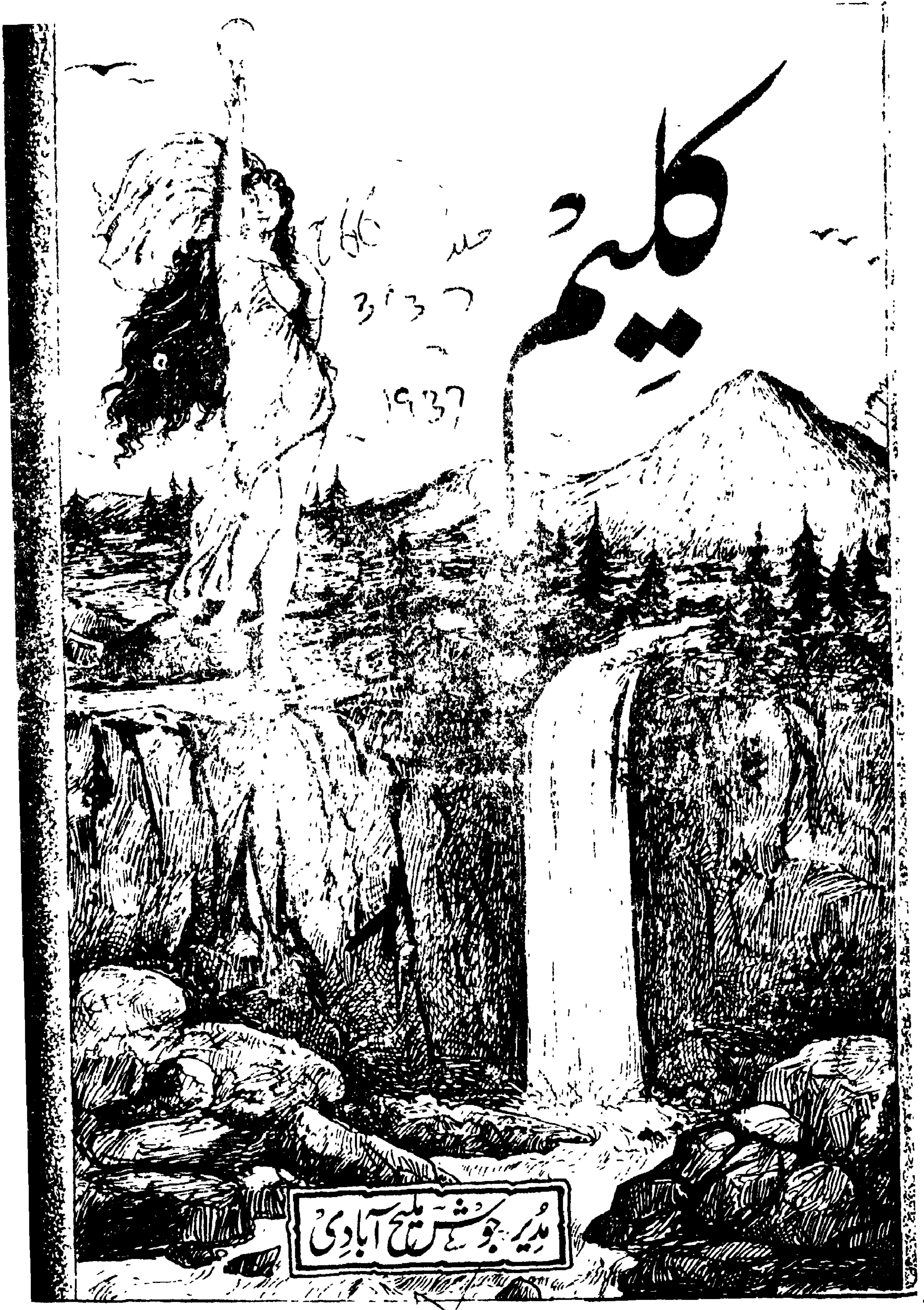
DUE DATE

Cl No.

Acc No.

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.


کلیم
1937
مدیر جوش ملیح آبادی

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کا

تازہ ترین شاہکار

فکر و نشاط

نقش و نگار، اور شعلہ و شبنم کے بعد یہ شاعرِ انقلاب کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جس میں بالکل نئی نظمیں شامل کی گئی ہیں یہ تمام نظمیں نباضِ فطرت اور حساس شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعۂ مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ ایک ایک شعر میں مسائلِ حیات اور دنیا کے رنگا رنگ واقعات پر ایسا رنگین تبصرہ کیا ہے جس کی تشریح و تفسیر دفتروں میں نہیں سما سکتی اور بیان کی شگفتگی و شادابی پر ہزاروں چمن نثار ہیں شاعرِ انقلاب نے اپنے پیام کے ذریعہ اپنے مخاطب کو فکر کی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ اسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے۔ دماغ کو اُلجھنوں میں نہیں ڈالا ہے بلکہ سازِ دل کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے اور ان سے وہ موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالمِ وجد طاری ہو جاتا ہے۔

کتابت طباعت۔ کاغذ نہایت اعلیٰ ہے۔ سائز بڑا۔ صفحات ۱۲۵۔ سرورق خوشنا رنگین کتاب مجلد ہے اور قیمت صرف عہ

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ۔ نئی دہلی**



رقص (عمل وجےورگی)

کلیم دهای

عمل اویاما

بنام قوت و حیات






آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں سے ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد (۳) — نمبر (۳)

فہرست مضامین ماہ مارچ ۱۹۳۷ء

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	فہرست مضامین		۱۹۳
۲	اشارات	مدیر	۱۹۴
۳	کوشش (نظم)	جناب اخگر صاحب مرادآبادی	۱۹۸
۴	مست کر بھارت کو بذنام (گیت)	جناب باسط صاحب بسوانی	۲۰۰
۵	انسانی فطرت اور خیر و شر	جناب مےکش صاحب اکبرآبادی	۲۰۱
۶	دولھا کی واپسی (نظم)	جوش ملیح آبادی	۲۰۴
۷	ناستک (ترجمہ)	جناب شیو صاحب فریدآبادی	۲۰۵
۸	عرض تمنا (نظم)	جناب محمد ابراہیم صاحب ہوش	۲۰۷
۹	سماج کا شکار (افسانہ)	جناب معین احسن صاحب جذبی	۲۰۹
۱۰	نکات (نظم)	جناب جعفر علیخاں صاحب آثر لکھنوی	۲۱۴
۱۱	اقوال حکیمانہ	جناب ڈاکٹر غلام سرور صاحب ایم اے پی ایچ ڈی	۲۱۵
۱۲	آرٹ (ترجمہ)	جناب مظہر علی شاہ صاحب	۲۱۶
۱۳	منظومات برق	جناب ششی چند سکسینہ صاحب طالب دہلوی	۲۱۷
۱۴	الفقر (نظم)	جوش ملیح آبادی	۲۲۲
۱۵	سرد مہری (افسانہ)	جناب سید علی سردار جعفری	۲۲۳
۱۶	مقصود کار (نظم)	جناب احسان بن دانش صاحب	۲۲۴
۱۷	ربنا فی انقلاب	جناب مولانا آزاد سبحانی صاحب	۲۲۵
۱۸	زمانے کی عیاری	جوش ملیح آبادی	۲۲۸
۱۹	دعوت درد (نظم)	جناب آغاز صاحب برہانپوری	۲۳۰
۲۰	غیر آہنگی (افسانہ)	جناب شیو صاحب فریدآبادی	۲۳۳
۲۱	گفتار و کردار (نظم)	جناب رزمی صاحب صدیقی	۲۴۲
۲۲	اقبال ثاقب	جناب عطاء اللہ صاحب پالوی	۲۴۳
۲۳	مرد مضحک (افسانہ)	جناب اسرائیل احمد خانصاحب	۲۴۹
۲۴	مور ضعیف (نظم)	جناب آغا شاعر صاحب قزلباش	۲۵۴
۲۵	یزدانیوں کے عیسائیت پر حملے	جناب اختر علی صاحب تلہری	۲۵۵
۲۶	نغمۂ زندگی (ترجمہ)	جناب ایم۔ اے شیخپوری صاحب	۲۶۲
۲۷	کل کی بات (نظم)	جناب عبرت گورکھپوری آنجہانی	۲۶۳
۲۸	کلیم پر ایک نظر	جناب مرزا صادق بی اے	۲۶۵
۲۹	نقد و نظر	ادارہ	۲۷۳
۳۰	رفتار وقت	ادارہ	۲۷۷
۳۱	اشتہارات		۲۸۱

جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کورونیشن برقی پریس دہلی میں چھپوا کر اکبر منزل اجمل روڈ قرول باغ دہلی سے شائع کیا

اشارات

مدیر

"حلقۂ مفکّرین"

ہندوستان کی ذہنی تاریکی و پستی پر نگاہ کرکے اِس سے پیشتر بھی عرض کیا جاچکا ہے، اور آج بھی عرض کیا جارہا ہے کہ ایک ایسے حلقۂ مفکرین کے قائم کرنے کی شدید اور فوری ضرورت ہے جس کے ذریعے سے ایسے تندرست افکار کی نشر و ہمت افزائی کی جائے جو فلسفیانہ اور انتقادی تحقیقات پر مبنی ہوں۔ اور ایسے ادبیات کو فروغ دیا جائے جو نوعِ انسانی کی قوتِ استدلال کو اوہام و روایات اور تنگ نظری و تعصّبات کی زنجیروں سے آزاد کردیں۔

خصوصیت کے ساتھ اہلِ ہند کے واسطے یہ انتہائی شرمناک بات ہے کہ قدامت کو یہاں اب تک مُقدّس سمجھا جاتا، اور آزاد اندیشی پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔

ہمنے اب تک سیکھا اور سوچا ہی کیا ہے، جب اس پر نظر جاتی ہے تو ماتھے سے شرم کا پسینہ ٹپکنے لگتا ہے۔

کیا ہم علوم کے روبہ ترقی رجحانات کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ اِس کے جواب میں سر بگریباں ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

جب یہ ثابت ہوچکا ہے، نظری طور سے نہیں، بلکہ عملی شکل سے ثابت ہوچکا ہے کہ ہمارے موجودہ ادارے اِس ارتقائی دور میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے، تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک تازہ اور صحیح ادارہ کیوں نہ قائم کیا جائے۔ آخر جھجک کس بات کی ہے؟

سچ بولنا ایک نہایت ہی دُشوار بات ہے، اور سچ پر عمل کرکے دکھا دینا اُس سے بھی دُشوار ہے۔ لیکن سچّی بات کا اعلان کرکے نفرین و ملامت کا ہدف بننا اِس سے کہیں بہتر ہے کہ سچ کو مخفی کرکے تحسین و آفرین کے زمزمے سُنے جائیں۔

اگر اب ہمارے ارضی و سماوی ضابطے ہمارا ساتھ دینے سے انکار کررہے ہیں، اور علمی دوڑ میں ہانپ رہے ہیں، تو کیا یہ ایک برمحل عاقلانہ بات ہوگی کہ اُن قدیم اداروں کی بوسیدہ اور مرطوب عمارتوں کو ڈھا کر اُن کی جگہ جدید فنِ تعمیر کے طرز پر ایک نیا قصرِ ضوابط تعمیر کیا جائے؟ —— یا آپ محض اپنے دیرینہ جذباتی روابط کی بناء پر یہ رائے دینا پسند فرمائیں گے کہ چونکہ اِن اداروں کے ساتھ روایتی تقدس وابستہ ہے، اِس لئے انھیں غیر صحت بخش پُرانے کھنڈروں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا جائے؟

اِس میں شک نہیں کہ آپ کے لڑکپن کا کوٹ نہایت آرام دِہ اور چمکیلا تھا، لیکن کیا جوانی میں اُسی کوٹ کے پہننے کے شوق میں آپ اپنے پر یہ ظلم کرنا پسند فرمائینگے کہ اپنے اعضاء کی قطع و برید کرڈالیں؟ سوال یہ ہے کہ کوٹ ہمارے جسم کے واسطے سیا گیا تھا، یا ہمارا

جسم کوٹ کی خاطر خلق ہوا ہے ؟

اور دوسرا سوال اسی کے اندر سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوٹ چھوٹا ہو گیا ہے تو ہم دوسرا بڑا کوٹ طیار کر لیں۔ یا اپنے جسم کو اُس کوٹ کے بقدر چھوٹا بنا لیں ؟

یہ صحیح ہے کہ وہ نسخہ جو آپ کے واسطے آپ کے بچپن میں لکھا گیا تھا وہ نفع بخش ثابت ہوا تھا، لیکن اب جبکہ آپ بالغ ہو چکے ہیں، اور آپکے مزاج و ماحول اور جسمانی خصوصیات میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں، کیا آپ اُس نسخے کے استعمال پر اصرار کرینگے، اور یہاں تک اصرار کرینگے کہ اجزا، تو اجزا، اُس کے اوزان بھی وہی رہیں جو بچپن میں تھے ؟

ان دونوں میں عاقلانہ روش کیا ہے، خود آپ ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

حقایق لامحدود طور سے عظیم ہیں، اور ان کے وہ ابقا ہر مختصر اجزاء بھی بے پایانی کے ساتھ عظیم ہیں جن پر عُقلا روشنی ڈال چکے ہیں —— یہ لکھتے ہوئے کہ "عُقلا روشنی ڈال چکے ہیں" مجھے شرم سی محسوس ہوتی ہے —— میں تو،

ہرکس نہ شناسندۂ راز است، دگر نہ
اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

کا قائل ہوں —— اِس لئے اِس مقصد کو پیشِ نظر رکھنے کا وقت آگیا ہے کہ حقایق کو کرۂ ارض اور بالخصوص ہندوستان میں عام کر دیا جائے، جہالت سے جنگ کی جائے، کوتاہ بینوں کو فنا کر دیا جائے، علم الاصنام اور "مقدس حکایات" کا تجزیہ کر کے اوہام کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے۔

صرف اِسی قدر کافی نہ ہو گا کہ جدید حقایق اور تازہ اکتشافات علمی حلقوں، یا درسگاہوں تک ہی محدود رہیں، یا محض علمی رسائل ہی میں اُنھیں بند رکھا جائے —— بلکہ اس کے برخلاف اِس کی شدید ضرورت ہے کہ اُنھیں آفتاب کی کرنوں کی طرح تمام اطراف و اکناف میں پھیلا دیا جائے۔

حقایق، جہاں تک حیات و کائنات سے اُن کا تعلق ہے، تمام نوعِ انسانی کی ملکیت ہیں، اور اُنھیں ایک جگہ محدود کر دینا اپنی نوع کے حقوق کا غصب کر لینا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ اُن تمام افراد کو جن کی تعلیم و تربیت سے غفلت روا رکھی گئی ہے، یا جنھیں غلط اسلوب سے تعلیم دی گئی ہے، ایک ایسی آنکھیں کھول دینے والی تعلیم دی جائے کہ وہ تعقّل و تدبّر سے مانوس ہو جائیں، اُنھیں فطری علوم سے آگاہی حاصل ہو جائے اور آزاد اندیشی کے پیدائشی حقوق، جن سے اُنھیں مسلسل چالاکیوں کے ذریعے سے محروم کر دیا گیا ہے، اُنھیں پھر حاصل ہو جائیں، اور اُنکے قوائے ادراک اسقدر صاف و صحیح ہو جائیں کہ اُن کے دماغ قویٔ استدلال اور صحیح استخراج کے معنے سمجھنے لگیں۔

جو حضرات اس حلقۂ مُفکّرین کے رکن بنیں، اُن کے واسطے یہ شرط ہو کہ وہ کسی منفی یا مثبت خلافِ عقل مسلک کے پیرو نہوں۔ کیونکہ اِس حلقے میں اُن تمام بے شمار خیالات و مسائل کے واسطے کافی سے زیادہ گنجایش موجود ہو گی جو فطرت اور عقل کے مسلّمہ حقایق کے مخالف واقع نہ ہوں۔

یہ حلقہ، اوہام و روایات کے معتقدین کو چیلنج دیگا کہ وہ اپنے معتقدات کا ثبوت پیش کریں، اور سوال اُٹھائیگا کہ وہ "مقدس" حضرات جو نوعِ انسانی کو فرضی معتقدات، اور اعتباری اصول کے جال میں پھنسانے کے مواقع کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتے ہیں کیا اُنھیں دُنیا میں اور کوئی روزگار نہیں ملتا، اور یہ بھی پوچھا جائیگا کہ اُنھیں اِس خطرناک کھیل کا کہاں سے حق پہونچتا ہے ؟

اِس حلقے کے ذریعے سے ایک ایسی ذہنی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کی جائیگی کہ تعقّل و استدلال کی فوقیت کو لامحدود صورت سے تسلیم کر لیا جائے، اور فلسفۂ اخلاق کا ایک ایسا مبنی بہ حکمت قاعدہ جاری کر دیا جائے کہ تمام مطلق العنان اُمور قیاسی، اور تمام بے لگام نظریّاتِ ظنّی سے آزاد ہو کر انسانیت اِس قابل ہو جائے کہ خالص تفکّر کی بنیادوں پر مسائل حیات و امور کائنات کا تصفیہ کرنے لگے۔

یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ آجکل بہت سے اربابِ تقلید و پیروانِ اوہام، زیادہ تر تو اپنے تیوروں سے، اور گاہ گاہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سے یہ ظاہر کرکے کہ وہ صحیح استدلال، اور عمیق مطالعہ و تفکر کے پسند کرنے والے ہیں، اپنی روشن خیالی اور آزاد اندیشی کا لوہا منوانے کی فکر میں رہا کرتے ہیں —— اور جہاں تک دوسری جماعتوں کے اعمال و عقائد کا تعلق ہے، یہ حضرات، استدلالیوں اور مفکروں کی طرح اُن پر نقد و اعتراض کرکے اپنی روشن خیالی اور حکمت نوازی کا ثبوت بھی پیش کرتے رہتے ہیں —— لیکن جیسے ہی کہ خود اِن کے اعمال و عقائد پر بحث چھڑ جاتی ہے، یہ فوراً روایتی عقائد اور روایتی تحقیقات کے بین بین رہتے ہوئے ایسی شاعرانہ تاویلیں، اور ایسے ادیبانہ لطیفے کرنے پر اُترتے ہیں، جن کی مدد سے تقلید و تعقل میں مصالحت ہو جائے، اور اُن کی وہم پرستیوں کو علم و دانش کا خطاب مل جائے۔

گو ہم جانتے ہیں کہ رُوحِ تفکر نہایت ہی قوی و عظیم ہے، لیکن ہمیں اِس کا بھی احساس ہے کہ انسان کی ذہنی زندگی کو اِس کا مستقلاً پابند بنا دینا کوئی آسان کام نہیں —— پھر بھی نوعِ انسانی کے ہوا خواہوں کو ہمّت نہ ہارنا چاہئے، کیونکہ ہر فتح، مستقل و مسلسل جنگ کے بعد ہی حاصل ہوا کرتی ہے۔

اگر حلقۂ مفکرین قائم کرنے میں کامیابی ہو گئی تو بجا طور سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ روایتی دینیات، رسمی اخلاقیات، اور مبنی بر اوہام تقلید کے مقابلے میں یہ حلقہ، انسانی افکار و کردار پر بہت زیادہ، اور نہایت پائدار اثر ڈال سکیگا۔

اِس سے انکار نہ کرنا چاہئے کہ ضابطۂ اخلاق کے سلسلۂ ارتقار میں دینیات و اخلاقیات ایک خاص مرتبے کے حامل رہے ہیں، لیکن جب عمیق نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ جہاں تک اخلاقِ انسانی کی صحیح، اور مستحکم نشو و نما اور فطری ترقی کا تعلق ہے، اِن دونوں اداروں نے پوست تو ضرور پیدا کیا ہے، لیکن مغز کی پیداوار میں انھیں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

ہمارے قدیم مسلک کئی حیثیتوں سے نسلِ انسانی کی حقیقی و فطری ترقی و فلاح میں ہمیشہ حارج رہے ہیں، اور ان کے نام پر آدم کی نسل ہمیشہ ایک، دوسرے کا خون بہاتی رہی ہے، نیز اِن مسلکوں کے نیک نہاد ہادیوں کے تمام جانبازانہ و مخلصانہ مساعی کے باوصف گنتی کے صرف چند افراد کے علاوہ، اِن سے عالمِ انسانیت کو کوئی عمومی اور پائدار فائدہ کبھی حاصل نہیں ہوا ہے۔

قدیم مسلکوں اور پارینہ ضابطوں کے پیرو اپنے عقائد کے برسرِ حق ہونے کے ثبوت میں اکثر یہ بات پیش کیا کرتے ہیں کہ جو لوگ اُن کی روش سے رُوگرداں کر لیتے ہیں، اُن کی زندگی بے مقصد و بے منزل ہو کر رہ جاتی ہے، اور وہ معصیت آمیز ترغیبات کے مقابلے میں بے دست و پا ہو کر ایک شائستہ زندگی بسر کرنے کے تمام تصوّرات سے خالی ہو جاتے ہیں ——

اِس میں شک نہیں کہ عقائد ترک کر دینے کے بعد انسانی زندگی اکثر و بیشتر بے لگام ہو جایا کرتی ہے، لیکن اِس صورتِ حال سے عقائد کا برسرِ حق ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا الزام (۱) اولاً تو خود نفس دینیات و عقائد ہی پر عائد ہوتا ہے کہ دینیات و عقائد نے ہمیشہ وسیع پیمانے پر بے اصل ما فوق الفطرت رشوتوں کے وعدوں سے بہلا پھسلا کر انسان کو نیکی پر اُکسایا، اور بے بنیاد ماورائے عادت عقوبتوں سے ڈرا دھمکا کر بدی سے روکا ہے —— اگر یہ ادارے رشوتوں، اور دھمکیوں سے کام نہ لیتے، اور یہ تعلیم دیتے کہ نیکی کو محض نیکی کی خاطر اختیار کرنا، اور بدی کو محض بدی کی خاطر ترک کرنا چاہئے تو ترکِ عقائد کے بعد انسانی زندگی کے لئے بے لگام ہو جانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ رشوتوں اور دھمکیوں کے ذریعے سے

نیکی کی رغبت، اور بدی کی نفرت کا بیج بونا اُس قدسی شعور اخلاق کو جو انسان کی مدنی فطرت کا جزو لاینفک ہے، قطعی طور پر فنا کر دیتا ہے، اور شعور اخلاق کو فنا کر دینے کے بعد اس بات کو دنیا کے برسرِحق ہونے کے ثبوت میں پیش کرنا کہ ترکِ عقاید کے بعد انسانی زندگی بے لگام ہو جاتی ہے، اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

(۲) اِس کے بعد اِس صورتِ حال کا الزام اُن انفرادی لے اصولوں پر بھی عائد ہوتا ہے جو حقیقی ضابطۂ اخلاق اور مدنی ضروریات کی فطری بُنیادوں کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی خاطر حقایق و معارف کا سُراغ لگانے میں کافی سرگرمی سے کام نہیں لیا کرتے ——

ہرچند اکتسابی رجحانات، عادات اور روایتی معتقدات کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی سیرت، تبدیلیٔ رائے کے ساتھ فوراً تبدیل نہیں ہو سکتی، پھر بھی اس میں شک نہ کرنا چاہئے کہ ایک حقیقی ضابطۂ اخلاق کی بُنیادوں کا ذہنی انکشاف و احساس ایک نہ ایک روز ایک بہتر عملی زندگی کی صورت ضرور اختیار کر لیتا ہے، قدیم مسلکوں، اور فرسودہ اداروں کے مقابلے میں کسی نئے مسلک یا جدید ادارے کا قائم کرنا سردست نہایت ہی مشکل کام معلوم ہوتا ہے —— پھر بھی حلقۂ مفکّرین کے قیام سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ جب اس کے بالغ نظر ارکان کے افکار مُلک کے دُور دراز گوشوں تک مستقل طور سے پہونچتے رہینگے، اور اس بّرِ اعظم کے مفکّرین مُتفقہ طور پر اور کامل باضابطگی کے ساتھ اوہام و روایات، اور تقلید و جُمُود کے خلاف مسلسل جہاد کرنے پر تُل جائینگے تو ایک نہ ایک دن اسی تاریک اُفق سے آزاد اندیشی اور تفکر کا آفتاب بلند ہو کر اس وسیع سرزمین کو جگمگا دیگا اور یہ وہ مبارک ساعت ہوگی جس کے ظہور پذیر ہوتے ہی ہندوستان میں مسلکِ جدید کا دور شروع ہو جائیگا۔

واضح رہے کہ جس مسلک میں بھی نوع انسانی کی فلاح کی خاطر صحیح انہماک، اور ذی شعور مخلوق کی مسرت اندوزی کے واسطے قوی اور بے لوث جدّ و جہد پائی جائے، وہی مسلک دراصل دُنیا کا بہترین اور فطری مذہب کہا جا سکتا ہے ——

اس میں شک نہیں کہ :—

ع- آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک

لیکن مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ :—

ہر کارے کہ ہمّت بستہ گردد
اگر خارے شود، گلدستہ گردد

نظیر اکبرآبادی نمبر

نظیر اکبرآبادی اردو کے ان شعرا میں تھے جنہیں اُردو کا سب سے پہلا ناظم کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے محض غزل کو اپنا سرمایہ نہیں بنایا بلکہ نظم کو اپنے اظہارِ خیال کیلئے منتخب کیا اور اسی پر اپنا تمام زور صرف کیا۔ یہ پودا جو انھوں نے اپنے مقدس ہاتھوں سے لگایا تھا بڑھتے بڑھتے آج پورا درخت ہو گیا ہے۔ اسی کی آبیاری آزاد و حالی اور اسی کو دورِ جدید کے شعرا نے پروان چڑھایا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسکا بیج نظیر اکبرآبادی ہی نے بویا تھا۔

چونکہ کلیم غزل کے مقابلہ میں نظم کا حامی ہے اسلئے اسکا فرض ہے کہ وہ اس شیخِ نظم کی یاد میں اپنا ایک خاص نمبر نکالے اور اس میں نظیر اکبرآبادی اور انکی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر پوری روشنی ڈالکر انہیں اچھی طرح اُجاگر کرے لیکن یہ اہم خدمت ہم اسوقت تک انجام نہیں دے سکتے جبتک ہمارے اہلِ قلم حضرات اس طرف توجہ نکریں اسلئے ہم اپنے تمام معاونین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ نظیر اکبرآبادی کے متعلق اپنے لئے موضوع منتخب فرما کر ہمیں جلد از جلد مطلع فرمائیں۔ چند عنوانات جو ہماری سمجھ میں آئے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ (۱) نظیر اکبرآبادی کے سوانح حیات۔ (۲) نظیر اکبرآبادی کے کلام کی خصوصیات۔ (۳) نظیر اکبرآبادی کے اصناف سخن۔ (۴) نظیر اکبرآبادی کی شاعری سے انکے زمانہ کی سوسائٹی کا خاکہ (۵) نظیر اکبرآبادی کی لغت اور اصطلاحات۔ (۶) اُردو شاعری پر نظیر اکبرآبادی کے کلام کا اثر (۷) کیا نظیر اکبرآبادی مبتذل گو تھے؟ وغیرہ وغیرہ

کوشش

کوشش کی کچھ سنی بھی یہ منہ زور شیخیاں؟ کہتی ہے میں ہوں قالب انسانیت کی جاں
باندھا ہے میں نے محفل آفاق میں سماں رونق مرے ہی دم سے یہ سب ہے یہاں وہاں
گھنٹے ہو شور وغل جو یہ جاہ و جلال کے
بہروپ ہیں یہ سب میرے حسن و جمال کے

تاریخ تم کو میری کہانی سنائیگی تصویر پوری وہ میری دکھائیگی
حیراں مثال آئینہ تم کو بنائے گی ہمت کی طرح دل کو تمہارے بڑھائیگی
کس کس کے ساتھ میں نے ہے کیا کیا نہیں کیا
ہے ہے کو کسکی کس کی اہا ہا نہیں کیا

غربت میں تھے جو انکو میں لطف وطن بنی صحرائیوں کے واسطے سیر چمن بنی
شربت کا گھونٹ میں پئے تشنہ دہن بنی چھوڑا بنا ہی کر اوسے جس کی دلہن بنی
آنکھوں میں اپنی اشک جو آیا بھرے ہوئے
لوٹا تو کشتیوں میں تھے موتی دھرے ہوئے

کیا جانے کوئی کیا مرے دل میں سمائی ہے بتلائیگی ابھی تو مری کیا بنائی ہے
کیسی زمیں فلک پہ میری اب چڑھائی ہے اب میں نے داغ بیل ہوا میں لگائی ہے
پتھر کو چیرتی ہوئی گردوں پہ جاوے گی
جا کر چراغ علم وہاں بھی جلاوے گی

اوپر جو آؤں میں کبھی اپنی ہی بات کے تارے دکھا دوں دن کے اوجالے میں رات کے
میں وہ ہوں ممکنات نے جس کی صفات کے بیکار حرف کر دیے ناممکنات کے
رکھ دوں اولٹ کے گردش تقدیر تک کو میں
پیچھے ہٹا دوں چھوٹے ہوئے تیر تک کو میں

ملکوں کو ایک شہر کے کوچے بنا دے گی قوموں کو ایک کنبہ کے رشتے میں لاویگی
آتش کو دشمنی کی جہاں سے مٹا دیگی بغض و حسد کی آگ کو ٹوکا لگا دیگی
کانٹوں کو اختلاف مذاہب کے توڑ کر
گلچیں ہونگی پھول صدق کی شاخوں کو موڑ کر

پہ میرے پیچھے پیچھے ہے محنت لگی ہوئی   محنت کے پیچھے پیچھے ہے دولت لگی ہوئی
دولت کے پیچھے پیچھے ہے عشرت لگی ہوئی   عشرت کے پیچھے پیچھے ہے شامت لگی ہوئی
شامت کے بعد آتا ہے تقدیر کا گلہ
آغاز ہوتا ہے یہاں قسمت کا سلسلہ

کاہل سے میرے پاس تک آیا نہ جائیگا   مردے سے بار زیست اوٹھایا نہ جائیگا
ظلمت سے روشنی میں سمایا نہ جائیگا   اندھے کو مجھ سے رنگ دکھایا نہ جائیگا
خواہاں مرا تو خود ہی میرے ساتھ ساتھ ہے
کنجی خدا کے فضل کی خود میرے ہاتھ ہے

اے وہ جو مجھ سے رکھتے ہو اُلفت سنو سنو   اک بات میری اپنی گرہ سے یہ باندھ لو
ہرگز بدی میں مجھ سے مدد تم نہ چاہیو   نقصان تاکہ نفع کے بدلے نہ تم کو ہو
گیسو سے بچیو لپٹو گلے سے جو یار کے
ناگن کو چھو نہ بیٹھیو دھوکے میں ہار کے

میں نیک خو کے واسطے لطف شباب ہوں   پیری کا بدخصال کے حق میں عذاب ہوں
دوزخ ہوں بد کو یعنی خدا کا عتاب ہوں   دریا ہوں نیک خو کو تو بد کو سراب ہوں
چکھیں جو مجکو نیک تو مادر کا شیر ہوں
پر میں بدوں کے سینہ پہ پہونچوں تو تیر ہوں

غافل یہ زندگی ہے کوئی دم کی زندگی   کب تک جئے گا شیون و ماتم کی زندگی
کب تک جئے گا دیدۂ پُرنم کی زندگی   چیونٹی سے سیکھ محنتِ پیہم کی زندگی
زندہ ہے تو تو زندگی محنت کا نام ہے
محنت کے دم سے امن و اماں کا قیام ہے

تاروں کے آسماں پہ بچھے جال ہیں ترے   دامان کہکشاں میں ٹکے لعل ہیں ترے
سکے ستارگاں کے زر و مال ہیں ترے   سیارے کہتے ہیں جنہیں فٹ بال ہیں ترے
فطرت میں ہر طرف تیرا اُبھرا جمال ہے
برقِ تپاں کی گود میں تیرا جلال ہے

اخگر نے مجھ سے منہ جو چھپایا بُرا کیا   کمبخت میرے پاس نہ آیا بُرا کیا
رحم اپنی زندگی پہ نہ کھایا بُرا کیا   وقت اپنا شاعری میں گنوایا بُرا کیا
پھرتا خدائی خوار نہ یوں دربدر کبھی
چلتا صلاح نیک پہ میری اگر کبھی

امداد حسین اخگر مرادآبادی

مت کر بھارت کو بدنام

(گیت)

(۱)

مت کر بھارت کو بدنام پیارے بھارت کو بدنام
ہندو مسلم میں کیوں بیر
مانگ اِن دونوں کی تو خیر
اِن میں کوئی نہیں ہے غیر
دَیر ہے کعبہ۔ کعبہ دَیر
رام ہے رحماں۔ رحماں رام مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

(۲)

مت کر بھارت کو بدنام پیارے بھارت کو بدنام
بھائی بھائی میں تکرار
جس کو دیکھو وہ بیزار
لڑنے مرنے کو تیار
کوئی تانے ہے تلوار
کوئی کھینچے ہے صمصام مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

(۳)

مت کر بھارت کو بدنام پیارے بھارت کو بدنام
تو نے کیا سوچا ہے یار
ناحق مذہب کی پیکار
تجھکو ہنستا ہے سنسار
تیرا جینا ہے بیکار
تیرا مرنا ہے ناکام مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

(۴)

مت کر بھارت کو بدنام پیارے بھارت کو بدنام
کوئی ایسی کر تدبیر
پلٹے داسوں کی تقدیر غلاموں
ٹوٹے پاؤں کی زنجیر
کاہے کرتا ہے تاخیر
کچھ تو سوچ اپنا انجام مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

(۵)

مت کر بھارت کو بدنام پیارے بھارت کو بدنام
دل کا پورا ہو ارمان
جنت ہو پھر ہندوستان
پھر ہو اِس کی پہلی شان
پھر ہوں اِس پر سب قربان
سُن لے باسط کا پیغام مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

باسط بسوانی

انسانی فطرت اور خیر و شر

میکش اکبرآبادی

بہ سلسلہ کلیم ستمبر ۳۶ء

نوٹ (کسی فرصت کے وقت اس مضمون پر اظہار خیال کیا جائے گا ——— (مدیر)

اصل میں سوال یہ ہے کہ فطرت انسانی خیر ہے یا شر یا یوں کہئے کہ قدرت نے آیا اسے مادۂ خیر زیادہ دیا ہے یا مادۂ شر۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے "فطرت" یا "قدرت" پر نظر پڑنی چاہیئے اور اس کے بعد خیر و شر پر۔ قدرت کا اعتقاد چونکہ قادر کے وجود کو چاہتا ہے اور اس لئے ایک علیحدہ بحث چاہتا ہے۔ لہٰذا نظر انداز کر دیجئے۔ اب فطرت کو دیکھئے، حالانکہ وہ بھی فاطر کی محتاج ہے، مگر خیر فلسفیانہ مباحث سے قطع نظر اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ فطرت ترکیب ہیولیٰ و صورت کا وہ ابتدائی خاکہ ہے جو اساس کا حکم رکھتا ہے، مجھے اس تعریف کی صحت پر اصرار نہیں ہے، کوئی اور تعریف کر لیجے، مگر یہ امر مسلم ہے کہ فطرت ایک حقیقی اور ذاتی شے ہے۔

اب خیر و شر پر نظر ڈالئے تو اس بارے میں یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ:۔

"خیر و شر کوئی حقیقی شے نہیں محض اضافی و اعتباری چیز ہے ......

تو ایک اضافی و غیر حقیقی شے کا کسی ذی حیات کی فطرت کے اندر تلاش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا"۔

واقعہ یہی ہے کہ فطرت حقیقت ہے اور حقیقت تمام تعینات سے بالا و برتر ہے نہ کہ خیر و شر کی سی چیزیں جن کا شمار اعراض میں بھی مشکل ہے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ

"اگر ہم "خیر و شر" کو اصطلاحی معنی میں نہ لیں اور اُسے "نیکی بدی" "اچھائی برائی" "زشت و خوب" "معصیت معصومیت" اور "مقبولیت و مقہوریت" کے تمام تصورات سے قطعی طور پر معرا کر کے استعمال کریں تو پھر اس کا فطرت انسانی کے اندر تلاش کرنا ہرگز ایک بے معنی سی بات نہیں ہو سکتی"۔

اور پھر اس کی مزید تشریح اس طرح کی جائے کہ:۔

"اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر ہم انسان کی قانون شکنی، دروغ بافی، امن سوزی اور خوں ریزی وغیرہ کے واقعات کو "شر" کا خطاب دیں اور اس کی قانون پرستی، راست بازی، امن پروری، اور انسانی ہمدردی وغیرہ کو "خیر" کے لفظ سے پکاریں تو اس تعریف کی رو سے "خیر و شر" کا فطرت انسانی کے اندر تلاش کرنا بالکل درست اور قطعی جائز ہوگا......"

لیکن ممکن ہے اس موقع پر کوئی سوال کرے کہ قانون پرستی وغیرہ کو خیر کے لفظ کے بجائے شر کے لفظ سے کیوں نہ پکارا جائے اور دروغ بافی اور امن سوزی وغیرہ کو خیر کا خطاب کیوں نہ دیا جائے۔ دیکھئے ارجن جس خونریزی کو شر سمجھتے تھے کرشن جی نے کس ناقابل تردید دلیل سے اس کو خیر ثابت کر دیا۔

کبھی آپ نے ہندو مسلمانوں کو گائے کی قربانی پر ایک دوسرے کو ذبح کرتے نہیں دیکھا؟ دونوں مذہب کے نام پر لڑتے ہیں۔ کبھی آپ نے کانگریس اور حکومت کی قانون اور آزادی کے نام پر رسّاکشی نہیں دیکھی! دونوں سیاست داں ہیں، اور دونوں مہذب۔ اب بتائیے قربانی اور قانون شکنی خیر ہے یا شر! گناہ ہے یا ثواب! فطرت نے یہ دونوں گناہ اور ثواب ایک سانس میں کیوں کر عطا کئے!

دولیتیں مثلاً قوی ضرور فطرت کا عطیہ مانے جا سکتے ہیں اور قوی پر خیر و شر کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص بندوق سے کسی بے گناہ کو قتل کر دے یا کسی مظلوم کی امداد اور حق کی تائید کرے تو بندوق بنانے والے کو پھانسی دی جائے گی نہ انعام

افعال علیحدہ چیز ہیں اور افعال پر خیر و شر کا اطلاق ہو سکتا ہے، مگر وہ بھی اضافی اور اعتباری، جیسا کہ بیان کیا گیا۔ شاید کہا جائے کہ فعل کے لئے قوت لازمی ہے تو لازمی ہونے سے قوت و فعل ایک تو نہیں ہو سکتے۔

فرض کر لیجئے کہ قدرت کے اسٹور میں خیر و شر تو دو ہی کی صورت میں رکھی ہوئی تھی جو اس نے مخلوقات کو تقسیم کر دی، اس صورت میں پہلے انسان کو جو کچھ ملنا تھا مل چکا تو آج یہ مسئلہ کس طرح طے ہو سکتا ہے کہ اولین انسان مائل بہ خیر تھا یا بہ مائل بہ شر۔

آج باپ کی صورت و سیرت کا اندازہ کس طرح کیا جا سکتا ہے جب کہ ایک بیٹا کالا اور ایک گورا، ایک شیطان اور ایک ولی ہے۔ اب اگر کثرت و قلت سے کوئی نظریہ قایم کیا جائے تو وہ کیونکر درست ہوگا، کیونکہ حبشیوں کی قلت کے باوجود یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ انسانِ اول گورا ہی تھا، پھر یہ کہ اگر انسانِ اوّل کی فطرت غیر منقش اور سادہ مان لی جائے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ

"انسان کی فطرت کے سادہ اور غیر منقش ہونے کے نظریئے کو جہاں تک انسانِ اول کی پیدائش کا تعلق ہے کسی حد تک ضرور قابلِ لحاظ سمجھا جا سکتا ہے"

تو پھر حال کے انسان کی فطرت انسانِ اوّل کی فطرت کے خلاف کیوں ہو گئی کیا فطرت تبدیل ہو جاتی ہے!

"کیوں کہ یہ کسی ذی حیات کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی فطرت یا متعلقاتِ فطرت سے لڑنے یا انحراف کرنے کا تصور بھی کر سکے"

چاندی سونا اور ہیرا بہ نسبت پتھر کنکر کے کم ہیں، پھول والے درخت گھاس پھونس سے کم ہیں۔ اور اچھے آدمی بہ نسبت بُرے آدمیوں کے کم ہیں، لیکن دیکھئے ان چیزوں کی اچھائی کم ہونے ہی کی وجہ سے تو نہیں ہے! شاید آپ ہر کم کو اچھا سمجھتے ہوں تو پھر فطرت پر کیا الزام ہے اگر وہ سونے کی مقدار میں پتھر اور پتھر کی مقدار میں سونا پیدا کرتی تو آپ پتھر کو اچھا سمجھتے اور سونا پتھر کی طرح ارزاں ہوتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجئے کہ کم کی قدر کرنا فطرت ہے، مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ فطرت نے شر زیادہ دیا ہے اور خیر کم۔ کیونکہ اس کا کیا اطمینان ہے کہ اگر شر کم ہوتی اور خیر زیادہ تو آپ کا نظریہ یہی ہوتا جو آج ہے۔

کیا فطرت کے اصول جنس، نوع، اور شخص کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں؟ اگر تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو معلوم ہوا کہ فطرت کوئی با اصول دارہ نہیں ہے اور اگر تبدیل نہیں ہوتے تو اس قدر اختلافات افعال کے علاوہ قوی اور مزاج و ترکیب میں کیوں پائے جاتے ہیں؟ ماننا پڑے گا کہ فطرت کا دائرہ اور حدیں جو ہم نے قائم کی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اصولِ فطرت وہی ہو سکتے ہیں کہ جو ہر مادہ، جنس، نوع، صنف اور شخص، سب پر یکساں حاوی ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ خیر و شر کا سوال جوہر سے لے کر جنس تک پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ نوع اور وہ بھی مخصوص نوع انسان ہی میں ہو سکتا ہے لیکن فطرت نوع میں تو محدود نہیں ہے تو اب فطرت کی تقسیم اس طرح کیجئے کہ فطرتِ کل اور ہے فطرتِ جنسی اور ہے، فطرتِ نوعی اور ہے، فطرتِ شخصی اور ہے، اب سوال ہو سکتا ہے کہ یہ فطرتیں آپس میں کیا نسبت رکھتی ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ فطرتِ جنس خیر و شر سے بلند ہو اور فطرتِ نوعی مائل بہ شر یا مائل بہ خیر؟ کیا فطرت محل کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے؟ کوئی بتا سکتا ہے کہ انسان کا کالا، گورا، زرد، سرخ، ہونا فطری ہے، اگر نہیں تو کوئی انسان ان رنگوں سے خالی کیوں نہیں ہے، اور اگر فطری ہے تو کیا فطرت اتنی مختلف ہے؟ کیا فطرت آب و ہوا سے تبدیل ہو جاتی ہے؟ کیا فطرت بارش کے پانی سے دُھل جاتی؟

اب ایک مہتم بالشان سوال یہ ہے کہ کیا انسان نے مبلغانِ خیر کا ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلہ نہیں کیا؟ انھیں محبسوں میں نہیں ڈالا؟ ان کی پشت پر کوڑے نہیں مارے؟ انھیں کانٹوں کا تاج نہیں پہنایا؟ اُن کے سامنے زہر کا پیالہ نہیں پیش کیا؟ اور انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر نہیں رکھ دیا؟"

ہاں بے شک خم ٹھونکے گئے، محبسوں میں ڈالا گیا، اور وہ سب کچھ ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن کیا یہ سب کچھ خیر کے نام پر نہیں ہوا؟ آبائی مذہب، تہذیب حاضرہ، اور قانونِ رائج کی حفاظت واحترام کے نام پر نہیں ہوا؟ دیکھنا یہ ہے کہ ان مبلغانِ خیر کی مخالفت کسی چور، ڈاکو، زانی کی طرف سے ہوئی یا مہذب دنیا کی طرف سے؟ اس کے علاوہ یہ فیصلہ کہ وہ مبلغانِ خیر تھے، آج صدیاں گزر جانے کے بعد کہا جا رہا ہے کیا اس وقت بھی اُن کے متعلق یہی رائے تھی؟ اور کیا معلوم ہے کہ چند صدیوں بعد فیصلہ کیا جائے کہ وہ بزرگ مبلغانِ خیر نہیں بلکہ مبلغانِ شر تھے۔ اور اس لئے اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا وہی مناسب تھا۔ پھر اس کے مقابلے میں دیکھئے کہ دنیا نے کبھی کسی چور کو چور سمجھکر قابلِ احترام نہ سمجھا، کیا ان کا ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلہ نہیں کیا گیا، کیا ازل سے لے کر آج تک یہ محبسوں میں نہیں ڈالے جاتے۔ ان کو پھانسیاں نہیں دی جاتیں، کیا مبلغانِ خیر کی طرح صدیاں گزر جانے پر بھی اُن کا احترام کیا جاتا ہے۔

کیا یہ مسلّم ہو چکا ہے کہ انسان کے تمام اعمال وکردار مطابقِ فطرت ہیں؟ کیا انسان اسی طرح رنگ برنگ کے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا، بلند مکان تعمیر کرتا ہوا، مشینیں چلاتا ہوا پیدا ہوا ہے؟ کیا یہ سب فطرت ہی فطرت ہے؟

یہ تو معلوم نہیں کیوں مگر یہ ضرور ہے کہ انسان کی انفرادیت ہر لحظہ اجتماعیت کی طرف مائل ہے۔ پس جو چیزیں کہ اجتماعی نظام کو نقصان پہنچانے والی ہیں، انھیں سے مذہب، تہذیب، تمدن، قانون، روکتے ہیں، اور چونکہ محبت وتعاون کو فطرتِ انسانی سمجھا جاتا ہے، اس لئے یہ نقصان پہنچانے والی چیزیں خلافِ فطرت یعنی شر سمجھی جاتی ہیں۔

نفسیات واخلاقیات کی رُو سے اچھی عادتوں اور اچھی چیزوں کی طرف رجحان اعتدالِ مزاج کا نتیجہ ہیں، اور بُری عادتیں فسادِ مزاج کا اچھی خوشبو کو ناپسند کرنا صحتِ شامہ کی علامت نہیں ہوسکتا۔ بیماری فطرت نہیں ہوسکتی:

کیا انسان کو اپنے مقابلے میں بھی شر اتنی ہی محبوب ہے جتنی دوسرے کے مقابلے میں کیا ایک قاتل اپنے قتل ہو جانے کا بھی اتنا ہی مشتاق ہے جتنا اپنے دشمن کے قتل کا؟ آخر یہ فرق کیوں ہے؟ اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ فطرت نہیں ہے؟ ظالم کو آزار پاکر تو وہ لذت حاصل نہیں ہوتی جو آزار دیکر ہوتی ہے، تو کیا انسان اپنی فطرت سے اپنے مقابلے میں اتنا نفور ہے؟

بچوں کے افکار وکردار پر شر کا حکم آپ ہی تو لگا رہے ہیں، کسی بچے سے تو اندازہ کرائیے۔ کیا وہ بھی اس کو بُرا ہی سمجھتا ہے، پھر جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ زمانہ وہ ہے جس میں بچہ بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے اس کے علاوہ اس عمر میں تعمیر کے ساتھ جو تخریب کا رجحان پایا جاتا ہے اس کو تلاشِ حقیقت اور رفتِ تعینات کا نام کیوں نہ دیجئے۔ تصنع وتکلف کے مقابلے میں جہاد آزادی کیوں نہ سمجھئے۔

آخر میں اتنا اور عرض کردوں گا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک انسان کی فطرت کچھ اور ہو اور دوسرے کی اور، لہٰذا اگر فطرت خیر ہے تو سب کی اور شر ہے تو سب کی، اس لئے اگر ایک آدمی بھی مظہرِ خیر ثابت ہو جائے تو یا تو اس نے خلافِ فطرت عمل کیا اور یہ مذکورہ وجوہ کی بنا پر ناممکن ہے اور یا پھر خیر وشر کا فطرت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میری رائے میں یہی صحیح ہے نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ "قدرت نے کچھ مادہ خیر کا اور کچھ شر کا رکھدیا ہے" کیونکہ محلِ واحد میں اجتماعِ نقیضین محال ہے۔ (غیر مستفاد وغیر ماخوذ)

[illegible]

دُولہا کی واپسی

"خیر مجھ ماں کو بھلا بیٹھا تو کچھ بیجا" "نہیں		"تجھ دُلہن کو بھول بیٹھا، آئے یہ کیوں کر یقیں؟"
"لیکن اے بیٹی، مرا بیٹا سعادت مند ہے"		"سچ مُچ اپنے مرنے والے باپ کا فرزند ہے"
"بیٹی، اِن بجھتی ہوئی آنکھوں میں نُور آجائے گا"		"لال میرا، آج، یا کل تک ضرور آجائے گا"
"دل مرا بے چین ہے اُس دلرُبا کے واسطے"		"جا ذرا تصویر تو لے آ، خُدا کے واسطے"

"ہاں یہی۔ کیوں سر جُھکاتی ہے؟ اِدھر آ تو سہی"
"اِس پہ میں قُربان، میرے دل کا ٹکڑا ہے یہی"

"بچپنا چہرے پہ ہے، بالوں میں ہلکے جال سے"		"چودھویں کا چاند شرماتا ہے میرے لال سے"
"مُنھ سے کہہ آمین" یہ کیسا حیا کا جوش ہے؟		"میں دُعائیں دے رہی ہوں، اور تو خاموش ہے"
"ہائیں یہ آواز؟ لاری؟ اور یہ کیا اے خُدا!"		"لاش! یہ کیا، ہائے اے اللہ یہ کیا ہو گیا؟"

"کیا ہے یہ اماں؟ ہوا جاتا ہے کیوں دل پاش پاش؟"
"میرے بچے کا جنازہ، اور ترے دُولہا کی لاش!"

جوش ملیح آبادی

ناستک

شیو فرید آبادی

(ملایا زبان سے ترجمہ کیا گیا)

غرور سے سر اونچا کرکے میں اعلان کر سکتا ہوں کہ میں ناستک ہوں، بیوقوف دُنیا میری ہنسی اُڑائے، خدا کا یقین کرنے والے غصّے سے دانت پیسیں. اُن کی ہنسی اور غصّے کی میں پروا نہیں کرتا. اور بزور اعلان کرتا ہوں کہ میں ناستک ہوں۔

ناستک کتنا خوبصورت لفظ ہے۔ اس میں بے خوفی، آزادی، صداقت اور علم کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی گُونج میں بادل کی گرج۔ بجلی کی چمک اور پہاڑ کا سا استقلال ہے، ناستک کتنا شیریں، کتنا پُرجوش لفظ ہے، ہاں میں کافر ہوں۔ میں تمہارے مذہبوں سے نفرت کرتا ہوں۔ اِن مذاہب کے زندانوں میں انسانیت قید ہے، یہ کاہلی اور سستی کی آماجگاہیں ہیں۔ اِن کی بنیادوں میں کمزور آدمیوں کے ڈھانچے دفن ہیں۔ کروروں مظلوم اور بیکس انسانوں کے خون سے مذہب کے اِن چمکتے ہوئے نقروں پر گلکاریاں کی گئی ہیں، کیا اِن مذہبوں نے کتنے ہی عیساؤں کو صلیب پر نہیں چڑھا دیا ہے؟ کتنے ہی بُدھ اور شنکروں کو قتل کرنے پر نہیں تُل گئے؟ کیا انھوں نے شردھانندوں کا خون نہیں بہایا؟ اِن کی وجہ سے کتنے دھرم یدھ ہوئے اور قتل و خونریزیاں ہوئیں، جن کے سامنے چنگیز خاں اور نادر شاہ کے قتل عام ماند پڑ گئے، اِن سے آدمی کے دماغ کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ سچائی کا گلا گھونٹتے ہیں۔ اور روشن خیالی کو پھانسی پہ لٹکا دیتے ہیں۔ مذہب کے نام پر دُنیا میں جو قبیح افعال کئے گئے ہیں۔ اُن کی تعداد اس قدر ہے کہ دماغ اُن کے سمجھنے سے قاصر ہے، مذہب اس دُنیا کے خوبصورت جسم پر مثل کوڑھ کے ہے۔ چھل، کپٹ، دغا بازی۔ مردم آزاری۔ بزدلی اور قتل عام کا جو کچھ مفہوم ہے وہ ایک لفظ "مذہب" میں آجاتا ہے، اسی وجہ سے میں پکا ناستک ہوں۔

ہاں میں ناستک ہوں۔ مجھے تمہارے مندروں سے نفرت ہے. پرستش گاہیں مندر ہوں یا خانقاہیں۔ گرجا گھر ہوں یا وہار اور مٹھ، عیاشی، دھوکے بازی کے اڈے ہیں جن میں جہالت، کُند ذہنی اور کورانہ تقلید اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ آپ کسی پرستش گاہ میں تشریف لے جائیں. اور اِن میں آپ خواہ کتنی ہی گھناؤنی باتیں ملاحظہ فرمائیں۔ تاہم یہ بہشت اور سورگ میں پہونچ جانے کے پاسپورٹ تصوّر کئے جاتے ہیں، اِن پرستش گاہوں سے میں نفرت کرتا ہوں، مے خانوں کی میرے دل میں اس سے زیادہ عزت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں کا نشہ ایک لمحے کا ہے، تھوڑی دیر بعد اُتر جاتا ہے، اور دماغ صاف ہو جاتا ہے، لیکن پرستش گاہوں کا نشہ تو سینکڑوں صدیوں تک نہیں اترتا۔ اِن سے کہیں زیادہ تو میں مذبح خانوں کی عزت کرتا ہوں، وہاں کپٹ اور دغا بازی کا راج نہیں، پرستش گاہوں میں جو کچھ ہوتا ہے اُس پر رنگین کذب کا غلاف چڑھا ہوا ہے...... اس لئے میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں...... اسی لئے میں ناستک ہوں۔

میں ناستک ہوں ۔ میں ان مذہبی پیشواؤں سے نفرت کرتا ہوں، کے باز اور مکار ہیں۔ رشوت خوری ان کا پیشہ ہے، ان کی لانبی بڑے بڑے لبادے اور عمامے ۔ زعفرانی لباس، اور گھٹی ہوئی کھوپڑی ں جو غلاظت بھری ہوئی ہے اس سے تمہاری روح لرز جائے گی۔ ان یں کبھی نہ بجھنے والی تشنگی ہے .... خون کی... امارت کی عہدے کی .... دولت کی .... عیش و عشرت کی.... ں ہے کیا؟ انسانوں کی نیک افعالی۔ دولت آزادی کو ہڑپ ایک ذریعہ۔ اپنی بدافعالی کو چھپانے کے لئے ایک سیاہ نقاب، بھروسہ کیا جا سکتا ہے، مگر ایک مذہبی پیشوا کا نہیں، سانپ کا یقین سکتا ہے، مگر دھرم کی آڑ میں شکار کرنے والے ان پروہتوں کا نہیں، ے کچلنا چاہیئے، سانپوں کا زہر ایک مستقل نشہ ہے جو سوسائٹی کی رگ شسن کر دیتا ہے۔ لے جہالت اور کورانہ تقلید کے پجاریو اور مجاورو، سے نفرت ہے .... اسی لئے میں ناستک ہوں۔

میں ناستک ہوں میں تمہارے خدا سے نفرت کرتا ہوں......... کا کچھ بھی نام رکھو، یہ محض دھوکے کا سایہ ہے، خیال کا پرتو ہے، چھایا میں مجاور اپنے مذہب کا بیوپار چلاتے ہیں، ایشور کی آڑ میں سائٹی کو دھوکا دیتے ہیں۔ عیاشی کرتے ہیں، سماج کا خون چوستے تمہارا ایشور ظالموں اور بدکاروں کی جائے پناہ ہے۔ جہالت قی ہے اور قتل و غارت کا دوسرا نام ہے۔ بے رحمی اور سفلے پن کا آئینہ اس کو رحیم کہتے ہیں۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ نگاہ کے سامنے کروڑوں تڑپ رہے ہیں۔ جب ظالموں اور بدمعاشوں کے ہاتھ میں حکومت ل ہے۔ جب قاتلوں کے محلات کے نیچے بھوکے غریب بیچارے اپنی ی کی گھڑیاں کاٹ رہے ہیں، جب جاہل اور کمزور آدمیوں پر ظلم توڑے ہے ہیں اور بیکس غریب اور معصوم بچے بے رحمی کے رولر کے نیچے کچلے جا رہے ...... پھر بھی یہ راگ گایا جاتا ہے کہ پرمیشور رحیم و داتا و مطلق ہے، شرم آتی...... اس دنیا میں مصیبتوں اور ظلم و ستم کو دیکھتے ہوئے آپ کو کیسے لیسے ہمت ہو سکتی ہے کہ آپ پرمیشور کو کریم و رحیم کا نام دیں۔ ایسے ایشور

سے نفرت ہے، میں اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، اسی لئے میں ناستک ہوں۔

میں ناستک ہوں، میں اپنے افعال اور کوشش پر اعتمادِ کامل رکھتا ہوں۔ اپنا خدا میں خود ہوں۔ اپنے افعال کی جوابدہی مجھ پر ہے۔ اُن پر کڑی نگاہ رکھنا میرا اپنا کام ہے۔ عیوب و نقائص کو پیدا کرنے والا، نظر نہ آنے والا خدا نہیں بلکہ میں خود ہوں۔ میں انصاف کی تلوار سے ناانصافی کو قتل کر دوں گا۔ میرا ضمیر میرے دل کا حاکم ہے۔ میں آپ کے سے پرمیشر پر یقین کرنے والوں کی طرح اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ آپ اندھی تقلیدوں کو روز مرہ بڑھاتے ہیں، اُن کی اندھیری چھایا میں ہی آپ کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ مگر میری کوشش یہی ہے کہ میں ان کورانہ تقلیدوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں۔ آپ روشن خیالی کو ظلمت کے گڑھوں میں دفن کر دینا چاہتے ہیں، کیونکہ اس سے آپ کی قلعی کھل جائیگی، مگر میں اس چراغ کی روشنی کو ہر جھونپڑی اور ہر اجڑے ہوئے گھر میں پہنچانا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہوں۔ آپ نے انسانی روح کو فولادی پنجرے میں مقید کر رکھا ہے۔ آپ کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ آزادی کا یہ پنچھی پنجرے کی تیلیاں توڑ کر آسمان پر نہ اڑ جاوے۔ میرے یہ ہاتھ اس آتما کو نجات دے کر ہی دم لیں گے۔ آپ کمزور اور گرے ہوئے بھائی کی چھاتی پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔ میں اُسے ہاتھ کا سہارا دے کر اُٹھا لوں گا۔ آپ مجھے پاکھنڈی۔ چانڈال۔ گمراہ۔ پاپی کتنے ہی بُرے ناموں سے یاد کریں مگر میں ذرہ بھر بھی اس کی پروا نہ کروں گا۔ میں ان گالیوں سے ڈرنے والا نہیں۔ میں جادۂ مستقیم سے نہ ڈگمگاؤں گا۔ آستک کا ڈھونگ مجھے ناپسند ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کی گالیوں سے بھی زیادہ کہیں زور شور سے میں گرج کر کہہ دوں گا کہ میں ناستک ہوں۔

بزدلو ہوشیار ہو جاؤ، وقت آپہنچا ہے۔ اب مکاری اور چھل کپٹ کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ جاہلیت کی ظلمت چھٹ جائے گی۔ اس قیامت خیز تمہید کا پہلا لفظ دور سے سنائی دے رہا ہے، انقلاب اور تبدیلی کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں برس کے ظلم کا بدلہ لینے کے لئے میں طاقت اور حوصلہ پیدا ہو رہا ہے۔ ان ہڈی پسلی والے کمزور جسموں میں طوفان کا زور اور پہاڑوں کا استقلال پیدا ہو رہا ہے۔ جھونپڑے چھوڑ کر وہ باہر آ نکلے ہیں۔ اب تمہارا

عرضِ تمنّا

اُٹھائے تھے مرے دل نے جو صدمہ ہائے فراق
وہ آج سامنے آئے تو کچھ سُنا نہ سکا
شکایتِ غمِ ہجراں زباں پہ لا نہ سکا

وہ پاس آئے مرے اور مُسکرانے لگے
دلِ غریب عنایت کی تاب لا نہ سکا
بفرطِ شوق گلے سے اُنھیں لگا نہ سکا

دل و دماغ پہ اک بیخودی سی طاری تھی
اُنھوں نے ہنس کے مجھے انکھڑیوں سے جام دیا
نگاہِ لطف سے تسکین کا پیام دیا

یہ دیکھکر ہوئی کچھ جراأتِ سخن مجھکو
جھکا کے سر یہ کہا میں نے اے بہارِ چمن
غریب ہوش کا خرمن ہے برق کا مسکن

جلا کے خاک بھی کر دو مجھے تو زیبا ہے
میں کشمکش ہی کو اپنا سکوں سمجھتا ہوں
فغاں فروشی کو یکسر زبوں سمجھتا ہوں

غرورِ ضبطِ تمنا ہے زندگی میری

مرا وجود ہے آئینۂ جمالِ نگار
مری اداؤں سے پیدا ہیں حسن کے آثار

کنارِ گل میں ہوا ہوں جوان، بو ہو کر

سکوں کے نام سے اک اضطراب ہوتا ہے
شکست سے مرا دل کامیاب ہوتا ہے

کہ شمع ہوتی ہے ضو ریز جب وہ جلتی ہے

مری بہار جو پوچھو تو ہے بہارِ خزاں
نشاطِ غم ہے مرے واسطے نشاطِ جاں

فقط اسی کے سہارے پہ جی رہا ہوں میں

میں جی رہا ہوں محبت کی بندگی کے لئے
طریقِ عشق پہ مرتا ہوں زندگی کے لئے

مری رگوں میں رواں ہے لہو محبت کا

یہ سن کے ہوش وہ مجھ سے لپٹ گئے آ کر
تھے شاد شاد مجھے یارِ باوفا پا کر

سرے سے مٹ گیا ناز و نیاز کا جھگڑا

(محمد ابراہیم ہوش سکریٹری بزمِ ابوالکلام)
کلکتہ

سماج کا شکار

ترجمہ از ٹیگور

پورن ماشی کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ بھیگی ہوا کے نرم جھونکے آم کے بور کی مہک چاروں طرف پھیلا رہے تھے۔ باغ کے تالاب کے کنارے لیچی کے پرانے درخت کی گھنی شاخوں سے ایک بیدار کوئل کی ان تھک پکار ہمنتا کی کھلی ہوئی کھڑکی سے اُس کے سونے کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

ہمنتا بھی بہار کا اضطراب محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کے گھنگریالے بالوں میں سے ایک لٹ جدا کر کے اُس نے اپنی انگلی پر لپیٹی۔ اُس کی چوڑیوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجایا یا چمبیلی کے ہار کو اُس کے سر پر اُس وقت تک آراستہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خم شدہ انداز میں اُس کے ابروؤں کے درمیان لٹکنے لگا۔ وہ اسی طرح معروف تھا جس طرح باہر بیتاب ہوا پھولوں میں حسن کا احساس پیدا کرنے کے لئے اُنھیں اِدھر اُدھر جھلانے میں مشغول تھی۔

لیکن اُس کی بیوی کُسم کھڑکی کے قریب بستر کے کنارے بے حس و حرکت اور خالی الذہن بیٹھی ہوئی چاندنی سے معمور فضا کی گہرائیوں میں غرق تھی۔ اُس کے پتی کو اس چھیڑ چھاڑ کا کچھ جواب نہ ملا۔

آخر کار ہمنتا نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور اُن کو بے صبری سے ذرا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ کُسم! آخر تم ہو کہاں۔ تم تو اس قدر دور چلی گئی ہو کہ تمہیں اگر دُوربین سے بھی دیکھا جائے تو صرف ایک باریک سا نقطہ نظر آئے گا۔ دیکھو تو کیسا جادو بھرا موسم ہے"

کُسم نے بے پروائی کے انداز میں اپنی آنکھیں آسمان سے ہٹا کر اپنے شوہر کے چہرے پر جما دیں: "مجھے ایک جادو آتا ہے" اُس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا، "جو اس بہار کے موسم کو، اس چاندنی کو، اور اس تمام حسن و جمال کو دم بھر میں فنا کر دے"

"اگر یہ بات ہے تو بڑا اچھا ہو کہ تم اپنا جادو کام میں نہ لاؤ" ہمنتا نے جواب دیا۔ "لیکن اگر تم کوئی ایسا بھی جادو جانتی ہو جس سے ہفتے میں تین چار اتوار آجایا کریں یا یہ رات کل شام تک ختم نہ ہو، تو اس منتر کا جادو ضرور کرو" یہ کہہ کر ہمنتا نے اُسے کھینچ کر اور قریب کر لیا۔

کُسم نے اُس کی آغوش سے بچتے ہوئے کہا، "میں آج تم سے ایک ایسا راز کہوں گی جسے میں بستر مرگ ہی پر ظاہر کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اب میں اپنی سزا آسانی کے ساتھ برداشت کر سکوں گی"

ہمنتا چاہتا تھا کہ کچھ عاشقانہ شعر سنا کر اس ناقابل فہم کیفیت کو دور کرنا ہی چاہتا تھا کہ اُس کے بوڑھے پتا ہری ہر مکرجی کے کھڑاؤں کی آواز سُنائی دی جو نہایت غصّے میں تیزی سے اُس کے کمرے کی طرف زینے کی راہ سے آرہے تھے۔

"ہمنتا" ہری ہر کی سخت آواز سُنائی دی، جب وہ بالکل دروازے

یہ اپنی بیوی کو فوراً نکال دو۔"

ممتا نے پریشان ہو کر کُسم کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر حیرت کے [illegible] نہ تھے۔ لیکن اُس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے اس طرح چھپا لیا [illegible] کی تمام ہستیوں سے خوفزدہ ہے۔

[illegible]ل کی آواز اب بھی کھڑکی میں سے آ رہی تھی۔ لیکن اب کوئی سننے والا [illegible] یا کس قدر دلکش ہے۔ لیکن اس کی دلکشی کتنی جلد ختم ہو جاتی ہے۔

ممتا جب اپنے باپ سے بات چیت کر کے لوٹا تو اس نے کُسم سے دریافت کیا۔

کیا یہ سچ ہے؟"

ہاں یہ سب سچ ہے" کُسم نے جواب دیا۔

"تم نے ابتک مجھے کیوں نہیں بتایا"

"اکثر میں نے کوشش کی کہ تم سے کہہ دوں۔ مگر ہمت نہ پڑی۔ میں کیسی پاپی ہوں"

"اچھا تو اب مجھے سب کچھ بتا دو"

کُسم نے ہمت اور استقلال کے ساتھ اپنے تمام واقعات بیان کر دئے۔ [illegible] کا انگار دل پر سوچ سمجھ کر دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ بغیر یہ ظاہر کئے [illegible] آگ اُسے کہاں کہاں پر اور کس قدر جلا رہی ہے۔

ممتا نے اس کی ساری داستان سنی۔ اور ایک لفظ بھی زبان سے نہ [illegible] اٹھا اور باہر چلا گیا۔

کُسم نے خیال کیا کہ میرا شوہر جو اس وقت مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے، اب [illegible] میرا نہ ہوگا۔

اُسے ذرا بھی تعجب نہ تھا۔ [illegible] جو کچھ اس وقت ہوا وہ قدرتی طور پر [illegible] زندگی کے آئے دن کے واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔ وہ اس وقت [illegible] بے حسی کی تصویر تھی۔ دُنیا اُس کی نظر میں محبت کیا بلکہ تمام چیزوں سے خالی تھی۔

جب ممتا کی پرانی محبت بھری باتیں اس کو یاد آئیں تو [illegible] ہونٹوں [illegible] باریک خشک سا تبسم کھیلنے لگا جس میں مسرت کی جھلک [illegible] نہ تھی۔ یہ ایسا تبسم تھا جو خود اس کے دل پر ایک زخم چھوڑ گیا۔ جیسے [illegible] نشتر اس [illegible] اس کو مجروح کرتا ہوا [illegible] ہو۔

وہ تمام محبت جو اب تک وہ محسوس کرتی رہی کیسی لامحدود گہرائیوں کی حامل تھی۔ ایسی محبت کا سرمایہ کہیں ختم ہو سکتا تھا۔ ایسی محبت جس میں ذرا سی [illegible] بھی بے انتہا تکلیف کا باعث ہوتی تھی۔ ایسی محبت جس میں ہر اتصال نشاط افزا تھا۔ ایسی محبت جو لامحدود ہی نہیں بلکہ وقت کے اثر سے بھی آزاد تھی۔ یہ بات خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ دوسری آن میں یہ محبت ختم ہو جائے گی لیکن سچ پوچھو تو یہ تمام محبت ایک نہایت ہی نازک رشتے پر قائم تھی۔ سماج کے ظلم کے ایک ہی جھٹکے نے اُسے زمین پر لا گرایا۔ اور محبت کا یہ سارا جوش و خروش ایک مٹھی بھر خاک میں تبدیل ہو گیا۔

"کیسی خوشنما رات ہے" تھوڑی دیر پہلے ممتا نے محبت بھری آواز میں کہا تھا۔ اب بھی وہی رات تھی۔ کوئل اسی طرح کوک رہی تھی۔ چھوا ہوا اب تک مچھر دانی کی شکنوں میں لہریں پیدا کر رہی تھی۔ چاند کی روشنی ایک محبت کی ماری ہوئی حسین عورت کی طرح اُن کے بستر کے کنارے پر پڑ رہی تھی، مگر اب یہ سب فریب نظر تھا۔

کُسم سوچنے لگی کہ کیا محبت اپنے الفاظ اور عمل میں مجھ سے بھی زیادہ جھوٹی ہے۔

دوسرے روز صبح رات بھر کا جاگا ہوا ممتا بڈھے گھوسل کے مکان پر پہنچا۔ وحشت اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ بال پریشان تھے۔

کہو کیا خبر ہے، گھوسل نے بڑی گرمجوشی سے پوچھا۔

ممتا کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ سارا جسم کانپنے لگا۔ اس کی زبان سے بے اختیاری طور پر یہی نکل سکا: تم نے ہماری ذات ستیاناس کر دی ——— ہمارا گھر مٹی میں ملا دیا ——— تمہیں اس کی سزا بھگتنا پڑے گی ——— " جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔

گھوسل مسکرایا ——— "اور تم لوگوں نے میری ذات کو بربادی سے بچا لیا۔ تم لوگوں نے مجھے سوسائٹی میں رہنے دیا۔ تم لوگ تو میرے خاندان کے لئے دیوتا [illegible] ہے اور ہمیشہ ساتھ بڑی محبت اور توجہ سے پیش آتے رہے!

اگر ہنتا کا غصہ اُتنا ہی با اثر ہوتا جتنا پرانے زمانے کے برہمنوں کی بد دعائیں تو گھوسل اس وقت جل کر بھسم ہو جاتا۔ لیکن معاملہ بالکل برعکس تھا۔ ہنتا کے غصے کی آگ خود اسی کو جلائے ڈال رہی تھی۔ اور وہ بڈھا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

ہنتا نے منمناتے ہوئے دکھ بھری آواز میں کہا "آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

"یہ سوال تو مجھے کرنے دو" گھوسل نے کہا "میری لڑکی —— اکلوتی لڑکی —— میری بچی جو میرے لئے سب کچھ تھی، اُس غریب نے تمہارے باپ کا کیا بگاڑا تھا۔ تم اس بات کو نہیں جانتے۔ اچھا میرے بچے ذرا بیٹھ جاؤ اور میں جب تک کہتا رہوں خاموشی اور سکون کے ساتھ سنتے رہو۔ داستان بڑی ہے، لیکن ہے دلچسپ۔

"میرا داماد جب اپنی بیوی کے زیور لے کر انگلستان بھاگ گیا، اُس زمانے میں تم بچے تھے۔ شاید تم کو کچھ یاد ہو کہ جب وہ پانچ سال بعد انگلستان سے بیرسٹر بن کر ملٹا تو ہمارے گاؤں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ نہیں، تم کیا جانو۔ تم اُس زمانے میں کلکتہ کے کسی اسکول میں تھے۔ ہاں تو تمہارے پتاجی نے ہماری ذات کے تمام لوگوں کو جمع کیا۔ سب سے پیش پیش وہی تھے۔ انھوں نے فیصلہ سنایا کہ اگر تم اپنی لڑکی کو اُس کے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دیتے ہو تو پھر تم کو اپنی لڑکی سے کوئی واسطہ نہ رہے گا۔

"میں نے کیسی کیسی منت کی کہ اس دفعہ معاف کر دو۔ میں نے ذلت گوارا کر کے داماد کی خوشامد کی کہ برادری میں دوبارہ لئے جانے کے لئے جو بھی کفارہ اس پر عاید کیا جائے وہ قبول کرے۔ لیکن تمہارے پتاجی نہ پسیجے۔ اور مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں اپنی پیاری لڑکی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں۔ پس میں نے ذات والوں کو خیرباد کہا اور کلکتے میں آبسا۔

لیکن یہاں بھی سماجی بندھنوں سے چھٹکارا نصیب نہ ہوا۔ میرے بھتیجی کی ایک جگہ منگنی ہو گئی تھی۔ شادی ہونے ہی والی تھی کہ تمہارے پتا۔ دولہن والوں کے گھر پر پہونچے۔ اور اُن کو بھڑکا کر یہ رشتہ ختم کرا دیا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے قسم کھائی کہ اگر برہمن کی اولاد ہوں تو بدلہ لے کر چھوڑوں گا۔

"اب تم واقعات سے کچھ کچھ آگاہ ہوتے جاتے ہو۔ ٹھیرو۔ اس داستان کا بقیہ حصہ اور بھی دلچسپ ہے۔

"جب تم کالج میں داخل ہوئے تو بائیپر داس مرحوم جسے ہم لوگ چچا کہتے تھے، تمہارے مکان سے ملحق دوسرے گھر میں رہتے تھے۔ انھوں نے ایک کائستھ لڑکی کو پناہ دے رکھی تھی۔ جو بچپن ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ بائیپر داس کو اُسے کالج کے لڑکوں کی نظروں سے بچانے میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔

لیکن ایک جوان لڑکی کے لئے ایک بڈھے کو دھوکا دینا کچھ مشکل نہیں۔ اُسے اکثر کپڑے سکھانے کے لئے اور بہت سارے کاموں کی وجہ سے چھت پر جانا پڑتا تھا۔ دوسری طرف تم بھی اپنی برابر والی چھت پر پڑھنے کی غرض سے پہنچتے تھے۔ کیونکہ وہی ایک جگہ تھی جہاں تم اطمینان اور سکون سے پڑھ سکتے تھے۔

"اُن چھتوں پر تم دونوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں، اُن سے صرف تمہیں واقف ہو۔ لیکن لڑکی کی روز بروز گرتی ہوئی حالت نے بائیپر داس کو شک میں ڈال دیا۔ خانگی فرائض سے وہ حیرت انگیز طور پر بے پروا رہنے لگی۔ اُس کی بھوک مر گئی۔ اُس کی صحت کی رعنائی ختم ہو گئی۔ ایک دن شام کو بائیپر داس نے اُسے بے وجہ روتے ہوئے پایا۔ آخر کار اُنھیں تم دونوں کے تعلقات کا پتہ چل ہی گیا۔ اُنھوں نے چھپ کر تم لوگوں کی باتیں سنیں۔ اُنھیں معلوم ہو گیا کہ تم تنہائی میں پڑھنے کے عادی ہو گئے ہو۔ کالج کا ناغہ کرتے ہو صرف اس لئے کہ اکیلے کتابیں لے کر اُس زینے پر جو چھت پر نکلتا تھا بیٹھے رہو۔

"جب بائیپر داس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا چاہئے تو وہ مجھ سے مشورہ کرنے آئے۔ میں نے کہا، دیکھو چچا! تم بہت دنوں سے چاہتے ہو کہ اس جگہ کو خیرباد کہہ کر بنارس میں قیام کرو۔ اب بہتر ہے کہ تم بنارس چلے جاؤ میں لڑکی کی حفاظت کر لوں گا۔ اُنھوں نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا، اور یاترا کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں نے کسم کو اپنے ایک گہرے دوست سری پتی چڑجی کے یہاں مقیم کرا دیا، اور اُن پر یہ اچھی طرح واضح کر دیا کہ تمہیں اسے اپنی ہی لڑکی سمجھنا پڑے گا۔

"جو کچھ اس کا انجام ہوا تم مجھ سے زیادہ واقف ہو۔ پھر بھی اُن پرانے واقعات کو دُہرانے میں مزا آتا ہے۔ کیونکہ سُننے میں یہ ایک رومان سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسے پڑھے تو بھی اس میں رومان ہی نظر آنے گا۔ پاں میں لکھ نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ میرا میدان نہیں۔ میرا بھتیجا البتہ اس طرف مائل ہے۔ میں اُس سے کہوں گا کہ ذرا اس واقعے پر اپنا زورِ قلم صرف کرے۔ لیکن ہم اور تم دونوں مل کر اس قصّے کو اور بھی اچھی طرح لکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ابھی ہمیں اس کے انجام کا پتا نہیں۔"

ہمنتا نے گھوسل کے آخری الفاظ نہیں سُنے: "کیا کُسم نے ایسی شادی کی مخالفت نہیں کی،" اپنے خیالات کی رَو میں اُس نے پُوچھا۔

"یہ آسان سوال نہیں،" گھوسل نے جواب دیا: "تمہیں تو اب خود عورت کا تجربہ ہو چکا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ عورتیں کیا ہوتی ہیں۔ جب وہ "نہیں" کہتی ہیں تو اُن کی مُراد "ہاں" ہوتی ہے۔ جب کُسم اپنے نئے مکان میں پہنچی اور تم سے نہ مل سکی تو اُس کی پریشانی کی انتہا نہ رہی۔ تھوڑے دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ تم اُس کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اب تم کالج کا راستہ بھولنے لگے اور سری پتی کے مکان کے سامنے کتابیں ہاتھ میں لئے ہوئے اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے، گویا کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈھ رہے ہو۔ میں اس نتیجے پر کیونکر پہنچ سکتا تھا کہ تم اپنے کالج کا راستہ تلاش کر رہے ہو۔ کیونکہ ایک گھر میں رہنے والی بیوہ کی کھڑکی صرف پَر والے کیڑوں اور محبت کے بیماروں کے لئے ہی وقف ہوتی ہے۔ بہرصورت مجھے لڑکی کی پریشانیوں اور تمہاری تعلیم کے دوران میں اس قسم کی مداخلتوں پر بڑا افسوس ہوتا تھا۔

"ایک دن میں کُسم کے پاس گیا اور اُسے ایک طرف لے جا کر کہا "بیٹی: تم اپنے بوڑھے چچا سے کسی قسم کا تکلّف نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیوں گُھل رہی ہو۔ اُس نوجوان کی حالت بھی اچھی نہیں۔ میں تم دونوں کو ملا کر بڑی مسرّت محسوس کروں گا۔ جواب میں کُسم پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور کمرے سے بھاگ گئی۔ میں بار بار اُس سے ملتا رہا اور تمہارے متعلق باتیں کرتا رہا، یہاں تک کہ اُس کی شرم دُور ہو گئی۔ آخر کار میں اُس کے دل پر یہ بات بٹھانے میں کامیاب ہو گیا، کہ صرف شادی ہی اُس کی پریشانیوں کا واحد علاج ہے۔ لیکن وہ اپنے خیال پر قائم تھی کہ یہ ممکن نہیں۔

"جب میں اور کُسم اس مسئلے کے موافق اور مخالف پہلوؤں پر بحث کر چکے تو کُسم نے کہا کہ اس بارے میں ہمنتا کی رائے لینا بھی ضروری ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہ بیچارہ تو قریب قریب پاگل ہو گیا ہے۔ میں اُسے خواہ مخواہ ان اُلجھنوں میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ جہاں شادی ہو گئی، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیونکہ حقیقت سے کوئی اور واقف نہیں اور نہ کسی کو معلوم ہی ہو سکتا ہے۔ پھر کیوں اُس کی زندگی کی تمام مسرّتوں کو خطرے میں ڈالا جائے۔ خدا جانے کُسم سمجھی یا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا۔ اُس پر ایک اشک آمیز خاموشی طاری تھی۔ آخر کار میں بولا تو پھر شادی ہو جانی چاہیئے۔ اس پر وہ بے اختیار رونے لگی۔

"یہاں تک معاملات پہنچ چکے تھے، جب میں نے سری پتی کو تمہارے والد کے پاس شادی کا پیغام دینے کے لئے بھیجا۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ تم نے اپنی رضامندی دینے میں وقت نہ گنوایا۔ ان حالات کے تحت بہرصورت تمہاری شادی طے پا گئی۔

"اُس فیصلے کے دن سے کچھ روز پہلے کُسم کے خیالات میں پھر تبدیلی ہوئی۔ وہ بڑی لجاجت سے بولی، چچا! میں منت کرتی ہوں اس شادی کو رکوا دیجئے۔ بیوقوف کہیں کی۔ میں چلایا۔ تمام باتیں طے ہو جانے کے بعد اب میں اُن لوگوں سے جا کر کیا کہوں گا۔ اُس نے جواب دیا، مجھے کہیں اور بھیج دیجئے۔ اور اُن سے کہہ دیجئے کہ میں مر گئی۔ اور اُس نوجوان کا کیا حشر ہو گا۔ میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ایسے موقع پر جب اُس کے خوابوں کی تعبیر کے صحیح ہونے کی امید ہو، اور وہ مسرّت کے ساتویں آسمان پر ہو، میں اُس سے جا کر کہوں کہ کُسم مر گئی، اور پھر اُس کے بعد میں تمہیں اُس کی موت کی اطلاع دوں جس کے جواب میں تمہارے مرنے کی خبر آئے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ اس ضعیفی میں میں ایک برہمن اور ایک عورت کا قاتل بنوں: "ایک مبارک دن اور اچھی ساعت میں، تمہاری شادی کی تمام رسمیں ادا ہو گئیں اور آخر کار بخیر و خوبی میرا کام پورا ہو گیا۔"

ہمنتا نے مغموم آواز میں کہا، "یہ سب کچھ کرنے کے بعد تم نے اس راز کو

ظاہر کرنے میں کیا مصلحت سمجھی "

"جب مجھے کل معلوم ہوا کہ تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے تو میرے ضمیر نے چٹکیاں لینا شروع کیں۔ فرائض سے مجبور ہو کر برہمن کی ایک ذات کو میں خراب کر چکا تھا۔ اب میں ایک معصوم برہمن کی ذات کو داغدار ہونے سے کیوں نہ بچاتا۔ یہ بھی میرا فرض تھا۔ پس میں نے لڑکے والوں کو لکھ دیا کہ ہمنتا مکرجی کی بیوی ایک "شودر" کی لڑکی ہے، اور میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے "

ہمنتا نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی ایک زبردست کوشش کی۔ رک رک کر اس نے کہنا شروع کیا "اب اس لڑکی کا کیا حشر ہو گا۔ کیا تم اسے اپنے یہاں رکھ لوگے "

"میں نے اتنا ہی کیا جتنا میرے فرض کا تقاضا تھا۔ یہ میرا کام نہیں کہ دوسروں کی نکالی ہوئی بیویوں کو پناہ دیتا پھروں" یہاں گھوسل نے زور سے اپنے نوکر کو آواز دی: "ہمنتا بابو کے لئے ایک گلاس برف کا پانی، جلد"

لیکن ہمنتا اس سردمہر کی مہمان نوازی دیکھنے کے لئے نہ ٹھیرا۔

چاند کی چودھویں رات کے بعد یہ پانچویں رات تھی۔ کوئل کی کوک کہیں سنائی دیتی تھی۔ تالاب کے کنارے لیچی کا پیڑ ایسا نظر آتا تھا جیسے ایک سیاہ پردے پر روشنائی کا دھبہ۔ پچھوا ہوا چل رہی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندھوں کی طرح آسیب زدہ آوارہ پھر رہی ہے۔ اور ستارے نظریں جمائے اس طرح دیکھ رہے تھے، گویا وہ اس تاریکی میں کسی راز کا پتا چلا رہے ہیں۔

ہمنتا کی خوابگاہ میں اندھیرا تھا۔ وہ بستر کے کنارے کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا فضا کی تاریکی کو دیکھ رہا تھا۔ فرش پر اس کے قدموں پر اس کی بیوی پڑی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت ٹھیر گیا ہے جس طرح ہمنتا ایک تصویر کو دیکھنے کے لئے یکایک خاموش ہو گیا ہو جو مصور یعنی قضا و قدر نے اندھی رات کے پردے پر کھینچی ہے —— جذبات کی کشمکش میں کھڑی ہوئی دو خاموش صورتیں —— ایک منعف —— ایک واہ خواہ۔

کچھ دیر بعد کھڑاؤں کی آواز سنائی دی۔ ہری ہر کی کرخت آواز دروازے کے باہر سے آئی "تم اس صورت کو کب تک نکالوگے۔ میں ایسی آوارہ گرد کو اب اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا "

ہری ہر کی آواز سنتے ہی کسم بے اختیاری طور پر اک آخری بار ہمنتا کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ہری ہر کے آخری الفاظ کے ساتھ ہی اس نے بطور رخصتی سلام ہمنتا کے پیر کی خاک اٹھالی۔ پیشتر اس کے کہ وہ ان قدموں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے۔

ہمنتا نے چلا کر اپنے باپ سے کہا "میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا "

"تو کیا تم ہم لوگوں کو برادری سے الگ کراؤ گے " ہری ہر نے گرج کر کہا۔

"میں ذات پات کو نہیں مانتا" ہمنتا نے جواب دیا۔ "تو تم دونوں نکل جاؤ "

مترجم۔ معین احسن جذبی

یہ نارِ جہنم ہے، سزا کچھ بھی نہیں
یہ وعدۂ روزِ جزا کچھ بھی نہیں
اللہ تو ہے ربِّ ناس و الٰہ
اللہ تو رحمت ہے سوا کچھ بھی نہیں

جوش

نکات

ہے کون سی جا، جہاں نہیں ہے
وہ جانِ جہاں کہاں نہیں ہے

لیکن ضد ہے یہ عاشقوں سے
جس جا کہیے وہاں نہیں ہے

یکساں ہے شہود و غیب، یعنی
ہے، اور کوئی نشاں نہیں ہے

وہ جلوہ فروزِ بزمِ امکاں
اتنا ہے عیاں، عیاں نہیں ہے

کوئی ہمتا نہیں ہے تیرا
تجھ پر بھی ترا گماں نہیں ہے

ادراک سے تیری ذاتِ بالا
گنجائشِ این و آں نہیں ہے

آتا ہے براہِ راست دل میں
جس راز کا رازداں نہیں ہے

دشمن کو اماں دے فتح پا کے
وہ سطوتِ بیکراں نہیں ہے

جو دل میں وہی زبان پر ہو
وہ دل نہیں، وہ زباں نہیں ہے

اک روز حیا تھی اپنا ایماں
مدت سے وہ درمیاں نہیں ہے

وہ ولولۂ نیازمندی
وہ عشرتِ امتحاں نہیں ہے

شیوہ نہ رہا جو حق پسندی
حق اپنا پاسباں نہیں ہے

جس کا جوہر نہ ہو محبت
انساں نہیں ہے ہاں نہیں ہے

~~~~~~~~

ایسی ویسی بہت بنائیں
دل سے بہتر مکاں نہیں ہے

~~~~~~~~

اب ہم نہیں درخورِ کرامت
اب ہم پہ وہ مہرباں نہیں ہے

اپنے اعمال کی ہے شامت
محنت کبھی رائگاں نہیں ہے

جو راہِ طلب میں سر بکف ہو
وہ جذبۂ خوں چکاں نہیں ہے

جنگاہ و صلوٰۃ جمعہ صف ہو
وہ دبدبۂ حکمراں نہیں ہے

اک سیلِ گہر کہ ضو فشاں تھی
اشکوں کا وہ اب سماں نہیں ہے

سہرے پڑے تھے بجلیوں کے
اب وہ طرزِ فغاں نہیں ہے

سن لے کوئی تو کلیجا تھامے
وہ حالِ بلاکشاں نہیں ہے

کیوں داغ کہوں، دئے ہیں غم نے
وہ پھول جنھیں خزاں نہیں ہے

(آثر لکھنوی)

اقوالِ حکیمانہ

ڈاکٹر غلام سرور ایم اے۔ پی ایچ ڈی

(۱) تنہا وہ قوت جو انسان کو عدل و انصاف، مہارت، اور علو طبیعت کے ساتھ وظائفِ انسانی کے سرانجام دینے میں پُر مقتدر کرتی ہے، تربیت ہے، جسے میں تربیتِ کاملہ کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔ (ملٹن)

(۲) مشغولیتوں، خوش گذرانیوں اور ہوا و ہوس کے دوران میں وہ چیز جس کی فکر کسی کو نہیں ہوتی اور جو ہمیشہ آماجِ غفلت و تحقیر ہوتی ہے، لیکن جیسے ہی کہ اس نے روگردانی کی اس کی قدر و قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔ جانتے ہو وہ کیا چیز ہے؟ تندرستی۔ (فریڈرک اعظم)

(۳) ابتدا میں کسی مملکت پر قبضہ کرنے کے لئے جو قدم اٹھایا جاتا ہے، اس کی بنیاد بہانہ تلاش کرنے اور اُس مملکت میں داخل ہونے پر ہے۔ مشکل ترین کام یہی ہے۔ بقیہ کام تو اسلحہ و توانائی کی قوت سے بآسانی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ (فریڈرک اعظم)

(۴) حقیقت کے بغیر میں کسی چیز کی جستجو نہیں کرتا۔ ہر جگہ میں حقیقت ہی سے دوچار ہوتا ہوں اور اُس کو مفترض الطاعت خیال کرتا ہوں۔ (فریڈرک اعظم)

(۵) انسان جملہ اشیاء کا واحد قیاسی ہے۔ پہاڑوں کی بلندی اور سمندر کی گہرائی کی پیمائش کے لئے اپنے قدموں کو پیمانہ بناتا ہے اور علوم ریاضی میں اپنی انگلیوں کے اعداد کو مقیاس قرار دیتا ہے۔ اس قدر ہمت و دسترسی کا مالک ہونے کے باوجود وہ کیا ہی عاجز مخلوق ہے۔ لیکن باوجود اس عجز کے مدارج ترقی پر صعود کرنے کے لئے کتنی عجیب استعداد رکھتا ہے۔

(۶) فلسفہ کو دوست رکھنا ایک حقیقت ہے نہ کہ ایک محبت جو علم کی ایک نوع یا ایک مسلک سے کی جاتی ہے۔ (بیکن)

(۷) فلسفہ اگر تجربہ سے اپنے تعلق کا انکار کرے اور چاہے کہ وہ تنہا دنیا کی توسیع معلومات اور ایجادِ قوانین کی خدمت سرانجام دے گا تو اُس کا یہ دعویٰ مضحکہ خیز ہوگا۔ (شیلر)

(۸) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ [illegible] ہی ہمارے جملہ مسموعات و مشہودات سے افضل ہے۔ (وڈی)

(۹) جہالت و غلامی انسان کی حقیقی دشمن ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے شومیٔ قسمت و بدبختی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ خوش قسمتی و نیک بختی کا وسیلہ علم، آزادی اور محاکمۂ عقلیہ ہیں، جو انسان کو اخلاقِ فاسدہ و عاداتِ رذیلہ سے نجات دیتے ہیں۔ افکارِ باطلہ کے معالجہ اور آفتابِ حقیقت کے طلوع کا امکان انہی چیزوں سے ہے۔

(۱۰) میں جانتا ہوں کہ حقیقت رنج و زحمت کا باعث ہوتی ہے، اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ دقتِ نظر کا نتیجہ موت ہو، لیکن مجھے اس بات کی قطعاً پروا نہیں۔ اے چشمہائے حقیقت بین! ہمیشہ دیکھنے میں مشغول رہو (گوئٹے)

(۱۱) آثارِ فکریہ کی موجد تنہا فکرِ انسانی نہیں ہے، بلکہ انسان کے تمام روحی و فطرتی قوا و افعال یعنی فطرت، تربیت، طرزِ زندگی، اطوارِ نفسیہ و کردارِ حسنہ اور عاداتِ رذیلہ و رفتارِ قبیحہ وغیرہ بحیثیتِ مجموعی ان آثار کے پیدا کرنے میں برابر کے شریک ہیں، اور انسان جو کچھ سوچتا اور لکھتا ہے اس میں یہ قوا و افعال اپنے مخصوص اثرات بطور یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔

(۱۲) کاہلی و بیکاری ہمت بلند و عزم صمیم کے جذبات کو فنا کر دیتی ہے، وہ اشخاص جن کا وظیفۂ حیات سعی و عمل ہے، اس بات کے مستحق ہیں کہ دوسرے انھیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں۔

(۱۳) دنیا کی بہترین نعمت تندرستی ہے، اس کے بعد حسن و جمال، پھر وہ دولت جو شرافت و نیک نامی سے حاصل ہوئی ہو اور اس کے بعد عہدِ جوانی کے لذائذ کا حصول، لیکن یہ چیز فقط رفقائے حقیقی کے کامل اشتراک سے حاصل ہوتی ہے۔

(۱۴) ہم سب کوتاہیٔ عمر و ناپائداریٔ روزگار کے شاکی ہیں، حالانکہ اپنے تصور و خیال سے کہیں زیادہ وقت کے مالک ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی کا بیشتر حصہ بلکہ ہماری تمام زندگی ایسے امور میں صرف ہو جاتی ہے جو ہمارے فرائضِ حقیقی سے خارج ہیں۔

(۱۵) ہماری دانائی و فراست اور ہمارے تصورات و خیالات حصولِ نتیجہ کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ بلکہ سب اہمیت ہمارے کردار میں ہے۔

(۱۶) اکثر اشخاص بغیر اس بات کے کہ کسی خاص مقصد کو پیشِ نظر رکھیں، زندگی گزار دیتے ہیں۔ اُن کی مثال اُس پرکاہ کی سی ہے جو سطحِ آب پر بہتا ہوا اچھلا جاتا ہو اور اپنی عمر کو انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ اشخاص خود حرکت نہیں کرتے بلکہ سیلِ عمر اُن کو اپنے ساتھ بہائے لئے جاتا ہے، اور منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

آرٹ

آسکر وائلڈ

ترجمہ مظہر علی شاہ

آرٹسٹ خوبصورت چیزوں کا خالق ہے

آرٹ کا افشا اور اپنی ذات کا اخفا آرٹسٹ کا مقصد ہوتا ہے۔

ناقد وہ ہے جو خوبصورت احساسات کو دوسری وضع میں ترجمہ کر سکے، یا اسے جدید رنگ میں اُبھار سکے۔ نقادی کا اعلیٰ یا ادنیٰ معیار ایک طرح کی روشِ سوانحِ حیات ہوتی ہے ——— جو لوگ بھیانک اور بدصورت چیزوں میں خوبصورتی تلاش کرتے ہیں وہ لوگ ایسے ہیں جو مسخ ہو چکے ہوں، اُن میں تسخیر نہیں۔

جو لوگ خوبصورتی میں خوبصورتی ہی تلاش کرتے ہیں، وہ بلند ہیں، اُن کے لئے اُمید ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں احساسِ حسن ہے۔

اُنیسویں صدی میں حقیقت سے نفرت وحشی کا غصہ ہے۔ جب وہ اپنا عکس آئینہ میں دیکھتا ہے۔

اُنیسویں صدی میں رومانیت سے نفرت وحشی کا غصہ ہے۔ جب وہ اپنا عکس آئینہ میں نہیں پاتا۔

انسان کی اخلاقی زندگی آرٹسٹ کا موضوع کار رہتا ہے۔ مگر آرٹ کا اخلاق نامکمل ذریعہ کو مکمل طور پر استعمال کرنے پر منحصر ہے۔ کوئی آرٹسٹ کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ حالانکہ جو باتیں مسلمہ ہیں وہ بھی ثابت کی جا سکتی ہیں۔

آرٹسٹ کے پاس اخلاقی ہمدردی نہیں ہوتی۔ یہ ایک ناقابلِ تلافی رسم وضعداری ہے۔ کوئی آرٹسٹ معذور یا مجبور نہیں ہوتا۔ وہ ہر چیز کا اظہار کر سکتا ہو۔

خیال اور زبان آرٹسٹ کے اوزار ہیں جن سے وہ کام کرتا ہے۔

گناہ و ثواب اور نیکی و بدی اشیاء ہیں جن پر وہ کام کرتا ہے شکل کے زاویۂ نگاہ سے ہر آرٹ شکلِ نغمہ ہے۔ احساس کے زاویۂ نگاہ سے ہر فن اداکار کا مرہون ہے۔

سب آرٹ سطحی بھی ہیں اور عمیق بھی۔

جو لوگ سطح سے نیچے جاتے ہیں وہ خطرے میں ہیں۔

جو لوگ سطح پر ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ خطرناک ہیں۔

صرف تماشائی کا چہرہ آئینہ میں نظر آتا ہے۔ زندگی کا نہیں۔

کسی موضوع پر مختلف الرائے ہونا ظاہر کرتا ہے کہ جدت ہے۔ جب نقاد آپس میں یک زبان نہ ہوں تو آرٹسٹ اپنے آپ سے متفق ہوتا ہے۔

کوئی شخص بھی جو مفید چیز پیش کرے اور اُس کی تعریف نہ کرے معاف کیا جا سکتا ہے۔

مگر بیکار چیز بنانے والے کے لئے اور موضوع کے لئے کہ اُس کی تعریف بہت ہوتی ہے، یہی بات اُن کے لئے پیغامِ مرگ ہے۔

سب آرٹ بیکار ہیں۔

منظوماتِ برق

مشاہدہ شاہد ہے کہ ایک شاعر خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبت اور کہنہ مشق کیوں نہ ہو ہر صنفِ سخن پر قادر نہیں ہو سکتا۔ بالعموم اُسے محض کسی ایک صنف میں کامل دسترس ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دیگر اصناف کی جانب سے یک قلم بے بہرہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اُس کا مذاقِ ادبی ایک خاص رنگ اختیار کر لیتا ہے جو اس کا اور محض اُس کا حصہ ہو کر رہجاتا ہے۔

مندرجہ بالا دعوے کے ثبوت میں اُستاد مرحوم کی "منظریہ شاعری" کے کچھ اقتباسات ہدیۂ ناظرین کروں گا۔ یوں تو آپ کا مجموعۂ نظم دیوان "مطلع انوار" مختلف جذبات و تاثرات کے بہترین نمونے پیش کرتا ہے، لیکن وہ حصۂ کلام جس پر مرحوم کو ناز تھا اور بجا طور پر ناز تھا اور جس سے ادبِ اُردو میں آپ کو ایک مستقل جگہ اور دوامی شہرت حاصل ہوئی وہ بیشتر آپ کی منظریہ شاعری پر مشتمل ہے۔ "ستارۂ صبح" کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

ضیا فروشِ سرِ چرخ ہے ستارۂ صبح — نشانِ محفلِ انجم ہے ماہ پارۂ صبح
اِسے نصیب کہاں فرصتِ نظارۂ صبح — فسردہ ہونے کو چمکا ہے یہ شرارۂ صبح

ملی ہے ہستیٔ بے بود نیست ہونے کو
کہ آنکھ کھولی ہے خوابِ عدم میں کھونے کو

مختلف مصرعوں کی ترتیب اور باہمی ربط و تناسب پر ایک نگاہِ غور ڈالئے اور دیکھئے فصاحت و بلاغت دونوں کس طرح ایک دوسرے سے ہم دوش ہیں۔

شیش چندر سکسینہ طالب دہلوی

"ستارۂ صبح" کو "نشانِ محفلِ انجم" کہنا کس قدر موزوں اور بدیع تشبیہات میں سے ہے۔ اسی طرح

اِسے نصیب کہاں فرصتِ نظارۂ صبح

کہہ کر آپ نے ایک صریح حقیقت کی خوب وضاحت کی ہے۔

فسردہ ہونے کو چمکا ہے یہ شرارۂ صبح

یہ بیان بھی کس درجہ پُر اثر ہے۔ "ستارۂ صبح" کو بیک ساعت حیات و موت عطا ہوئی ہے، اِدھر نمودار ہوا کہ صبح کی روشنی کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ ماند پڑنا شروع ہوا اور آخر کار نابود ہو گیا۔

شبِ گزشتہ کے جلووں پر اشکبار ہے یہ — اُداس صورتِ شمعِ سرِ مزار ہے یہ
خزاں نصیب کوئی غنچۂ بہار ہے یہ — نظر کو پیرہنِ نور میں بھی خار ہے یہ

چراغِ کشتہ ہے بامِ سپہرِ اخضر پر
یہ داغ ہے فلکِ نیلگوں کی چادر پر

شوکتِ ماضی کی یاد ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بظاہر "ستارۂ صبح" کو ایک نوحہ خواں کی حیثیت سے یاد کرنا اُسے نشانِ محفلِ انجم ہی کے کہنے کے مترادف معلوم ہوگا، لیکن جس نئے پیرایہ اور جس موثر انداز میں یہ خیال پھر مرحمت ہوا ہے وہ باید و شاید۔ جدتِ طبعی کے یہی معنی ہیں۔

اِسی طور پر "شمعِ مزار" کی بے رونقی کا تصور فرمائیں اور پھر اُس کا ستارۂ صبح سے تقابل۔ دونوں میں حد درجہ مشابہت پائیے گا۔ پھر کسی مُرجھائے

ہوئے پھول پر نظر ڈالئے اور ایک نگاہِ غلط انداز آسمان پر بھی۔ آپ کے روبرو ستارۂ صبح کی صحیح تصویر کھنچ جائے گی۔

اگرچہ چوتھے مصرعہ کے مطابق ستارۂ صبح کو قدرت کی جانب سے ایک نورانی ملبوس ودیعت ہوا ہے لیکن شاعر کی نظر میں وہ ایک خار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، کیونکہ اس سے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور اہلِ دل کے دل میں تڑپ اور کسک پیدا ہوتی ہے۔ پھر ستارۂ صبح کو "چراغِ کشتہ" کہنا بھی گویا مجروح احساسات کے ساتھ کھیلنا ہے۔ اور آخر کا مصرعہ

یہ داغ ہے فلکِ نیلگوں کی چادر پر

تو شاعر کی شدتِ حس کا آئینہ ہے۔

تمام بند موزوں اور برجستہ تشبیہات سے مملو ہیں۔ لیکن ان تشبیہات کا زور بعد کے بندوں میں بڑھتا ہی جاتا ہے؛ اور استاد مرحوم ؎

برنگِ اشک ہے بے آب و تاب گوہرِ صبح

ہے مانندِ صورتِ یاقوتِ ناتراشیدہ

کہہ کر اپنی ندرتِ طبع کا بہترین جوہر دکھاتے ہیں۔

آپ کے مجموعۂ نظم دیوان "مطلع انوار" میں ایک دلکش نظم "نسیمِ صبح" شامل ہے، حالانکہ اس تمام نظم میں شروع سے آخر تک نسیمِ صبح کی تعریف و توصیف ہے، لیکن چونکہ اس کے چند بند آمدِ صبح کی صحیح و فطری تصویر ہیں، اور ان میں ایک خاص جدتِ ادا پائی جاتی ہے۔ یہ بند درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

تو چمن میں آئی عشقِ گُل کا دم بھرتی ہوئی   چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی   پھر وہی رنگیں ادائیں روز کی برتی ہوئی

گُل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

بند کے دوسرے اور تیسرے مصرعہ میں نسیمِ صبح کے نقل و حرکت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ٹیپ کے شعر میں حسن و عشق کے اختلاطِ باہمی کا آخری انجام جس خوبی و لطافت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے [illegible] لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے [illegible] میں عملی قدم رکھا ہے [illegible] معاملات کی بہترین مثال ہے۔ آپ کو انہیں [illegible] زبانِ نظر ہی کے نقل [illegible] نظر آئے گی۔ اس کے علاوہ اس میں دلکش روزمرہ کے باعث مرحوم کے اُس عبور پر بھی روشنی پڑتی ہے جو آپ کو محاورہ دانی پر حاصل تھا۔

ایک بند اور ملاحظہ فرمائیں۔

چھاؤں میں تاروں کی وہ آنا ترا انداز سے   وہ جگانا نیند کے ماتوں کو خوابِ ناز سے
جیسے سرگوشی کرے کوئی کسی دمساز سے   یا کہے دیکھے ٹھہر کے یوں دبی آواز سے

لے چکے انگڑائیاں بس، گیسوؤں والو! اُٹھو!
نُور کا تڑکا ہوا، اے شب کے متوالو! اُٹھو!

دبی آواز سے ٹھہر کے دینا بھی کتنا دلفریب اندازِ بیان ہے۔ اس نے نسیمِ صبح میں کیسی شوخ اور الھڑ نازنین کی رعنائیاں پیدا کر دی ہیں۔

ابتدائی دور ختم ہوا، اب جلوۂ سحر کی بھی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ہیں نغمہ زن طیورِ سحر خیز باغ میں   محوِ سپاسِ حق ہیں یہ طاعت گزارِ صبح
شبنم کی ہے شراب گُلوں کے ایاغ میں   کتنی سرور خیز ہے سیرِ بہارِ صبح

کیا تازگی ہے خندۂ گُل کی شمیم میں   فرحت فزائے قلب ہے تازہ کُن دماغ
اعجازِ جانفزائی ہے موجِ نسیم میں   وقتِ سحر کھِلے ہوئے دل بھی ہیں باغ باغ

یہ تمام بند شاعر کے گہرے مطالعۂ فطرت کا نتیجہ ہیں اور ان سے کچھ وہی اصحاب لطف اندوز ہو سکیں گے جنھیں فطرت نے شاعر کا دل و دماغ عطا کیا ہے، یا پھر وہ جو فطرتاً نیک طبع ہوں یا جن کا مذاقِ ادبی نہایت پاک اور بلند مرتبہ واقع ہوا ہو۔

پنجاب بہ اعتبار اپنے ناظموں کے ایک خاص حیثیت کا مالک سمجھا جاتا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ یہ نظمیں آج بھی پنجاب کے لئے ایک قابلِ تقلید معیار پیش کرتی ہیں۔

تاروں میں اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں
گُل ہیں حیا سے [illegible] نور کے سامنے
چھپتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں
کیا رنگ جم سکے [illegible] ناور کے سامنے

پہلے مصرعہ کا اندازِ بیان طنزیہ ہے، نظم میں شروع سے آخر تک آپ وہی ایک بجلی سی دوڑتی ہوئی پائیے گا جو اس قطعہ کے ایک ایک لفظ میں دوڑ رہی ہے۔ لطفِ زبان و محاورہ اس پر طرّہ ہے۔ آخر میں۔

بیٹھا جہاں پہ سکۂ خورشید خاوری ۔۔۔ زیرِ نگیں دہر ہے اورنگِ کائنات
ظاہر ہیں ذرے ذرے سے آثارِ زندگی ۔۔۔ چاروں طرف ہے گرمیٔ ہنگامۂ حیات

زندگی کی کشمکش بیشتر روزِ روشن سے وابستہ ہے۔ اسی کی جانب ایک خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے یہ نظم ختم فرمائی گئی ہے۔

دوپہر خواہ کسی موسم کی بھی ہو عموماً پُرکیف نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس موضوع پر مرحوم کی جو نظمیں ہیں زیرِ بحث نہیں لاتا ہوں، اگرچہ محاسنِ شاعری کے لحاظ سے شاعر نے اسے بھی کسی طرح کم کامیاب نہیں بنایا ہے۔

اب منظرِ شام سے متعلق چند نظموں کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ بہارِ شفق کی جاذبیت ملاحظہ ہو۔

ہے جلوۂ بہارِ شفق آسمان پر ۔۔۔ صہبائے سُرخ یا یہ خُمِ نیلگوں میں ہے
پردے سے مہر جلوہ فگن ہے جہان پر ۔۔۔ یا برقِ بیقرار تڑپ کر سکوں میں ہے

بند کے دوسرے مصرعہ کا حاصل محض اس قدر ہے کہ آسمان پر بادلوں کے لال لال تختے جلوہ گر ہیں۔ لیکن یہ سادہ سا مفہوم جن تشبیہوں کے ذریعہ ادا فرمایا گیا ہے وہ قابلِ داد ہیں۔

لال بادلوں کو صہبائے سُرخ یعنی شرابِ آتشیں اور آسمانِ محیط کو خمِ نیلگوں قرار دے کر اُستاد مرحوم نے اپنی طبیعت کی ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے، نیلگوں ساغر میں سُرخ شراب بھر کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔

تیسرے مصرعہ میں پردے سے مہر کی جلوہ فگنی ایک نازِ معشوقانہ کی کیفیت کا مظہر ہے اور مصرعۂ ثانی تو مجسّم قیامت ہے۔ یہ سمجھئے کہ کیفیات کا ایک سمندر ان چند گنتی کے لفظوں میں موجیاں کر رہا ہے۔

ذیل میں تشبیہات کی کثرت ملاحظہ فرمایئے۔ ان سے استادِ برُور کی جدّت و آمد پر بدرجۂ اتم روشنی پڑتی ہے، کوئی کوئی تشبیہ تو بالکل نئی ہے اور اس اعتبار سے دنیائے اُردو ادب میں اضافہ ہے۔ مثلاً

شفق کے پھول دامنِ چرخِ بریں میں ہیں ۔۔۔ یا معدنِ عقیق کی ضو ہے نظر فروز
یا پارہ ہائے آتشِ گل، گل زمیں میں ہیں ۔۔۔ یا ہے سپہر پر کرۂ نارِ جلوہ سوز

پہنچا ہے اُڑ کے تا فلکِ اخضری گلال ۔۔۔ ہولی کا یا یہ کاسۂ گردوں میں رنگ ہے
یا رُوئے مہر پر ہے یہ سُرخیٔ انفعال ۔۔۔ غصّے سے لال رُوئے حسینِ فرنگ ہے

لیلائے شب ہے حجلۂ زریں میں جلوہ گر ۔۔۔ رکھے ہیں آس پاس مئے آتشیں کے جام
مستِ مئے نظارہ نہ ہو برق کیوں نظر ۔۔۔ جوشِ شباب پر ہے عروسِ بہارِ شام

مندرجۂ بالا قطعہ سے انسان کا تخیل بے ساختہ مرزا غالب مرحوم علیہ الرحمۃ کے اس شعر کی جانب مبذول ہو جاتا ہے۔ کیا خوب فرما گئے ہیں۔

ہر چند ہے مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جس طرح مرزا غالب مشاہدۂ حق کی گفتگو میں مشغول ہونے کے باوجود بادہ و ساغر جیسے رنگین الفاظ سے احتراز نہ فرما سکے، اُسی طرح اُستادِ خُلد آشیانی کی طبیعت بھی ہر مفہوم کو خواہ وہ کتنا ہی سادہ کیوں نہ ہو، رنگینیٔ الفاظ اور دلآویزیٔ تشبیہات کے ساتھ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی جس میں بلاغت، فصاحت اور لطافت کے پہلو بھی نمایاں ہوتے تھے اور دل آپ کے اعجازِ شاعری کا قائل ہو جاتا تھا۔

"شفق" کے عنوان سے ایک نظم اور بھی ہے۔ اس میں بھی تشبیہات کی کثرت نظر آئے گی۔ پورا لطف تو نظم کے تمام و کمال مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، مگر بہر حال ہمیں بخیالِ اختصار انتخاب ہی پر اکتفا کرنا مناسب ہے۔

آسماں پر موجزن جو یہ شرابِ سُرخ ہے ۔۔۔ یا محیطِ چرخِ زنگاری سحابِ سُرخ ہے
آئینے میں چرخ کے ہے عکسِ تصویرِ بہار ۔۔۔ تابشِ افزائے نظر ہے یا فروغِ شعلہ زار

از سرِ نو پھوٹ نکلا ہے شبابِ چرخِ پیر ۔۔۔ یا مئے احمر ہے زیبِ شیشۂ ابرِ مطیر
رنگ لایا ہے شفق بن کر شہیدوں کا لہو ۔۔۔ لوحِ گردوں سے عیاں ہے نقشِ خونِ آرزو

قصرِ فردوسِ بریں کا دلنشیں نقشہ ہے یہ ۔۔۔ یا بہارِ بوستانِ خُلد کا خاکہ ہے یہ
سُرخ جوڑا ایسا شب نے کیا ہے زیبِ تن ۔۔۔ روزِ روشن سے ہے ہم آغوش جو بنتی کی دُلہن

برق کی چشمک تری رنگیں ادائی پر نثار ۔۔۔ کہکشاں کا نور اس جلوہ نمائی پر نثار

لیف آور تیرا جلوہ ہے سکوتِ شام میں — آتشِ سیال ہے لبریز تیرے جام میں
جو دکھاتے ہی جھلک اُڑ جائے وہ سیماب ہے — بے ثباتی کا مرقع جلوۂ بیتاب ہے

یہی حال باقی اشعارِ نظم کا ہے۔

اُستاد مرحوم کی نظم "برسات کی شام" بھی مطلعِ انوار میں ایک خاص شان رکھتی ہے۔ اِس کے مطالعہ سے جو لطف مجھے حاصل ہوا، اِس میں ناظرین کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا خوب فرمایا ہے۔

ہلکے، گہرے مختلف رنگوں کی ہے کیسی نمود — تختۂ گلہائے رنگا رنگ ہے چرخِ کبود
ایک سے ایک دوسرے سے رنگ زینت میں فزوں — ترمذی، اُودا، سُنہری، لاجوردی، لالہ گوں
ورے بادل نظر آتے ہیں سونے کے پہاڑ — قصرِ فیروزہ میں آویزاں ہیں یا کندن کے جھاڑ
...وہ زریں پڑے ہیں گنبدِ افلاک پر — ہلکے ہلکے نُور کی بارش ہے فرشِ خاک پر
...ی در پردہ لبِ بامِ فلک گلریز ہے — یا فضا رنگینیوں سے سر بسر لبریز ہے

ایک اور نظم "شام" ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف اُستاد ...امی کو مشکل نویسی پر قدرت حاصل تھی وہاں آپ نہایت سادہ سے سادہ زبان ...ں بھی نہایت بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ ادائے مطلب کر سکتے تھے، چند ...شعار ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اندازِ بیان کس قدر بے تکلف اور فطری ہے ...ام نظم میں آمد پائی جاتی ہے، فرماتے ہیں۔

...ورج ڈوبا ہوا اندھیرا — چڑیاں لینے لگیں بسیرا
...لنے لگے دیئے گھر گھر میں — گرجا، مسجد، اور مندر میں
...نیند میں غافل ہو گئے — لوری سُنتے سُنتے سو گئے
پہونچے مزدور گھروں میں — خوش خوش ہیں بیوی بچوں میں
...ا بھر کب آرام لیا ہے — خون پسینہ ایک کیا ہے
...م نے دی ہے کام سے فرصت — دم لینے کی ملی ہے مہلت
...ت و چمن سنسان پڑے ہیں — خالی اب میدان پڑے ہیں
...ا شغل شور کہاں ہے — دوڑ دھوپ کا زور کہاں ہے
...راحت ہوا زمانہ — ختم ہوا دن کا افسانہ

چہل پہل دو چار گھڑی ہے
سب کے سرہانے نیند کھڑی ہے

اپنی ایک لاجواب نظم "تارے" میں عروسِ شب کی زینت کیا خوب فرمائی ہے۔

دیدنی شام کے نظارے ہیں — زینت افزائے چرخ تارے ہیں
آتشیں پھول پیارے پیارے ہیں — ضو فشاں نُور کے شرارے ہیں

اِن کی کچھ شان ہی نرالی ہے
نہ ہوں تارے تو رات کالی ہے

کیا بے تکلف اور مترنم بند ہے، تاروں کو آتشیں پھول اور نُور کے شرارے قرار دینا، موزوں اور بدیع تشبیہ ہے۔ نظارہ ہائے شام کو دیدنی کر دکھانے میں کوئی بات نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ اندازِ بیان کس درجہ سادہ اور بے ساختہ ہے۔ مثلاً

زینت افزائے چرخ ہیں تارے

اور مسدس کے آخر کا شعر یعنی

اِن کی کچھ شان ہی نرالی ہے
نہ ہوں تارے تو رات کالی ہے

کے بے ساختہ پن اور معصومیت پر تو طبیعت بے اختیار پھڑک اُٹھتی ہے۔

تمام نظم میں تشبیہات کا دریا اُمنڈ رہا ہے۔ دیکھیے۔

جلوہ افروزِ شب چراغ ہیں یہ — فرح بخشِ دل و دماغ ہیں یہ
سینۂ آسماں کے داغ ہیں یہ — یا ہئے نُور کے ایاغ ہیں یہ

بحرِ ظلمت میں ہیں حبابِ نُور
یا ہیں یہ گوہرِ خوش آبِ نُور

مندرجۂ ذیل شعر فصیح گوئی کا بہترین نمونہ ہے۔

چرخ پر قمقمے سے روشن ہیں
یہ دیئے بے نیازِ روغن ہیں

ایک بند اور ملاحظہ فرمائیں۔

ہجر میں مبتلائے صد آفات — تارے گن گن کے کاٹتے ہیں رات
اُن کے حق میں ہیں یہ چراغِ حیات — آنکھوں آنکھوں میں پوچھتے ہیں بات

دُور سے دیتے ہیں پیامِ سکوت
ہیں یہ دمسازِ تشنہ کامِ سکوت

مرحوم کی نظم "کہکشاں" "مطلعِ انوار" میں شامل نہیں ہے، اس کا کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں۔

کہکشاں ہے کہ حبا دۂ زریں ۔۔۔ یا فلک پر ہے جدولِ سیمیں
تابش افزا ہے جلوۂ رنگیں ۔۔۔ بہرِ گردوں ہے مایۂ تزئیں

دستِ فطرت کے نقش سارے ہیں
بہر دمہ کہکشاں کے تارے ہیں

"تاروں بھری رات" کے سلسلے میں فرماتے ہیں

دامانِ فلک میں گُلِ خوشرنگ پڑے ہیں
یا سقفِ زمرد میں دُر و لعل جڑے ہیں

تاروں کو گُلِ خوشرنگ کہہ کر انھیں دُر و لعل سے مشابہ کرنا اور فلک کو سقفِ زمرد سے خطاب کرنا خاص معنی رکھتا ہے۔ لفظِ سقف کے ساتھ زمرد کا استعمال خصوصاً قابلِ داد ہے، چونکہ زمرد باعتبارِ رنگ نیلا ہوتا ہے، اور آسمان بھی نیلا ہوتا ہے۔ اسی طرح الفاظ "دُر و لعل" کا انتخاب بھی مصنف کی دور رسی کا شاہد ہے۔ بسا اوقات تارے آسمان پر خفیف سے سُرخی مائل نظر آتے ہیں۔ انھیں تاروں کے لئے لعل کی تشبیہہ استعمال کی گئی ہے۔

اِدروں پہ عجب محفلِ انجم کا ہے عالم ۔۔۔ آتا ہے نظر دور سے اِک مجمعِ برہم
کیا خوب ہے سرِ چرخِ بریں کاہکشاں کی ۔۔۔ اِک موج ہے یہ نور کے دریائے رواں کی
قندیلیں سرِ شام سے روشن ہیں فلک پر ۔۔۔ یا گنبدِ گردوں پہ چراغاں کا ہے منظر
پوشاکِ شب اوڑھے ہوئے تاروں کی رداہے ۔۔۔ کیا حُسنِ ضیا پاش ہے دل جس پہ فدا ہے

تمام اشعار منظوم مصوری کی بہترین مثال ہیں، اور گوناگوں کیفیات سے مالامال۔

اشعارِ ذیل میں علمِ طبعیات کے اسرار کی گرہ کشائی کی گئی ہے۔

سرگشتہ گردوں ہیں یہ دامانِ خلا میں ۔۔۔ لاکھوں کُرۂ نور معلق ہیں ہوا میں
تاریک کوئی، ماند کوئی، کوئی درخشاں ۔۔۔ ثابت کوئی، سیارہ کوئی، کوئی ہے رقصاں

ان اشعار میں واقعات و حقائق بیان کئے گئے ہیں۔

لاکھوں میں جہاز ان کے اشارے پہ رواں ہیں
گویا یہ سفینوں کے لئے سنگِ نشاں ہیں

چھا جاتے ہیں جب دل پہ غم و یاس کے بادل
صحرا میں مسافر کو دکھاتے ہیں یہ مشعل
ہمدم یہی غم دیدوں کے ہیں رنج و تعب میں
دل ان سے بہل جاتا ہے تنہائیٔ شب میں

ذیل کے دو اشعار میں عروج و زوال کا نقشہ کھینچا گیا ہے

کیا گُل ہیں کھلے دامنِ گلزارِ فلک پر ۔۔۔ صدقے ہیں نذر لعل و گہر جن کی چمک پر
آیا ہے دمِ صبح یہ فرق ان کی چمک میں ۔۔۔ مُرجھائے ہوئے پھول ہیں دامانِ فلک پر

نظم "ماہِ تاباں" کی شانِ تمہید قابلِ دید ہے۔

اے مہِ تاباں! سُرور افزا ہے تیری روشنی
اُجلی اُجلی یہ شعاعیں، ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی

مصرعۂ ثانی دودھ میں دھویا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اسی طور پر ماہِ تاباں کا ضیائے محفلِ انجم سے مقابلہ کرتے ہوئے کس قدر صحیح فرمایا ہے۔

انجمِ تابندہ تابش سے تری گُل خوردہ ہیں
دامنِ چرخِ بریں میں غنچۂ پژمردہ ہیں

ذیل کے اشعار تشبیہات و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے پرکھئے۔ اندازِ بیاں کچھ ایسا پُرکیف اور مؤثر ہو گیا ہے، جس سے بہل انکاری یا چشم پوشی برتنا حق و انصاف کا خون کرنا ہے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے وادیٔ گُل پوش میں
کاروانِ نور اُترا منظرِ خاموش میں
پیرہن سیماب کا، پہنے ہوئے ہے موجِ آب
نور در آغوش ہے چشمِ نظر باز حباب

آخر کے دو اشعار میں آپ نے جن سنسنی خیز حقائق کا اظہار فرمایا ہے وہ آپ کے قلبِ مصفا اور دوربیں ہونے کے بہترین شاہد ہیں۔

نظم "شبِ ماہتاب" کی تشابیہ میں جدتِ طبع و ندرت آفرینی کا کمال دیکھئے۔ ہر تشبیہہ میں ایک انوکھی بات پیدا کی گئی ہے۔

چشمۂ نور ابل پڑا دامنِ چرخِ پیر میں ۔۔۔ موجِ ضیا نہیں ہے یہ جوش ہے جوئے شیر میں

مصرعہ پھیلی ہے روئے خاک پر سیم رقیق کی بساط

ذیل کے اشعار میں کیا خوب منظر باندھا ہے تشبیہات کا لُطف مزید ہے،

زرّیں ہیں سقف و بام و در، چمکے ہیں سب شجر حجر
جس طرف اُٹھ گئی نظر، رنگِ طلا ہے سربسر
روشنی بخشِ شش جہت، گو ہر شب چراغ ہے
یا تو شرابِ نور کا زرّیں کوئی ایاغ ہے

کیا بلحاظ روانی و سلاست اور کیا زبان و محاورہ تمام نظم ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ استاد مرحوم کی شاعری کے یہ معدودے چند نمونے ملاحظہ کرنے کے بعد کسی کو بھی اُن کے کمالِ فن میں شک نہیں ہو سکتا۔ تمام ملک میں ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک زبان ہو کر ان کی عظمت تسلیم کرلی ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آپ کو ان کے کلام میں فصاحت، بلاغت شعریت غرضیکہ تمام لوازم شاعری بدرجۂ اتم نظر آئیں گے۔ اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو ایک شاعر کو لاکر صفِ اوّل میں بٹھا دیتی ہیں۔

الّھڑ

گاؤں کی اک نگارِ ہوش رُبا — سر پہ چندری نہ ہات میں چھلا
نُور ساکن ہے، نار ہے بیتاب — ہو رہی ہے طلوعِ صبحِ شباب
انکھڑیوں میں حیا، نہ طراری — نہ نگاہِ کرم، نہ بیزاری
ایک بھٹکی ہوئی سی شانِ حجاب — ایک کھویا ہوا سا استعجاب
رُخ پہ ہلکی سی کشمکش سی ضرور — لیکن اس طرح جیسے تحتِ شعور
آ رہی ہے قدم بڑھائے ہوئے — زُلف کھولے، نظر اُٹھائے ہوئے
خواب میں جیسے چل رہا ہے کوئی
بے ارادہ مچل رہا ہے کوئی

جوشؔ

ربّانی انقلاب (۲)

مولانا آزاد سبحانی

مولانا آزاد سبحانی، ہندوستان کے اُن گنتی کے صحیح مفکرین میں سے ہیں، جن پر قوم بجا طور سے فخر کر سکتی ہے۔

آزاد صاحب صرف نہایت صفائی کے ساتھ سوچتے ہی نہیں، بلکہ جو کچھ سوچتے ہیں، اُسے نہایت صفائی کے ساتھ بیان بھی کر سکتے ہیں۔ اور یہ دراصل اُن کی ایک ایسی مخصوص صفت ہے جس میں اُن کا شریک شاید ہی کوئی مل سکے۔

"ربانی انقلاب" کی سُرخی سے مولانا کا یہ دوسرا مضمون شائع کرتے ہوئے مجھے نہایت مسرت محسوس ہو رہی ہے، اسی لئے کہ اس کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جس کی موجودہ انسانیت کو خصوصیت کے ساتھ شدید ضرورت ہے۔

مجھے آزاد صاحب کی نیت، اُن کی رُوح اور اُن کے مقاصد سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے میری رُوح میں جذب ہو کر یہ خیالات مجھ سے چھین لئے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مجھے اس پر شدید اعتراض ہے کہ اس تحریک کو مذہبی لیبل لگا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

میں اہلِ ہند کی جہالت سے واقف ہوں، اور جانتا ہوں کہ جب تک کسی دوا کی گولی پر شکر نہ لپیٹ دی جائے وہ نگل ہی نہیں سکتے، اور شاید اسی وجہ سے مولانا آزاد نے مجبور ہو کر اپنی اس تحریک کے دامن پر مذہب کی گوٹ ٹانک دی ہے۔

مگر کم سے کم میرے نزدیک اب وقت آ چکا ہے کہ عوام اور جہلاء کی ذہنیت کا پاس کرنے کے عوض اُسے صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی جائے، اور بتایا جائے کہ دوا، دوا ہے، اور شکر، شکر ہے۔ اگر تندرست ہونا چاہتے ہو تو دوا میں شکر کی آمیزش پر اصرار نہ کرو۔ دوا کو دوا کی طرح استعمال کرو، اور شکر کو شکر کی طرح۔ دین کو دین کی طرح برتو اور دنیا کو دنیا کی طرح۔ یہ کیا قیامت ہے کہ جب تک کسی دنیوی تحریک پر دین کے نقوش نہیں بنائے جاتے، اُسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا جاتا ہے

ربّانی تخریب

(۱) ربانی انقلاب اپنے دو بازوؤں پر قایم ہے، ایک بازو ربّانی تخریب ہے، دوسرا ربّانی تعمیر۔ اگر ان میں سے ایک بازو بھی شکستہ ہے تو ربّانی انقلاب بھی شکستہ ہے۔ نفسیاتی نظام کو خراب کرنا اس نیت سے کہ اس کے کھنڈر پر ربانی نظام کی ربانی تعمیر کھڑی کی جائے گی ربّانی تخریب ہے۔ ربانی تخریب ربّانی تعمیر کو جس طرح لازم ہے اُسی طرح اس سے مقدم بھی ہے۔ صحیح عمارت نہیں بن سکتی جب تک غلط عمارت ڈھا نہ لی جائے۔ پہلے غلط عمارت کو ڈھا لو پھر صحیح عمارت بنانے کا نام لینا۔ بد دماغ و بے دل لوگ تخریب کے نام سے فریاد کرتے ہیں۔ اور انقلابیوں پر بار بار تخریبی ہونے کا الزام لگاتے پھرتے ہیں۔ اُن کو جاننا چاہیئے کہ تخریب

کی مخالفت تو عین تعمیر کی مخالفت ہے، اور تعمیر کی بھی مخالفت کی جائے تو پھر دنیائے عمل میں رہ کیا جاتا ہے جس کی موافقت کی جاسکتی ہے۔ پھر تخریب کی مخالفت تو حقیقت کی مخالفت ہے، فطرت کی مخالفت ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عالم کون و فساد کی ایک چیز بھی اس وقت تک تعمیر کی ہستی نہیں پاتی، جب تک ایک دوسری چیز تخریب کی نیستی میں پہونچ نہیں لیتی خون بنتا نہیں ہے۔ جب تک غذا بگڑ نہ لے۔ ولی عہد تخت کے سر پر سوار نہیں ہو سکتا جب تک بادشاہ شاہی موت کی گود میں بے دم نہ ہولے۔ اور فطرت کا تو یہ حال ہے کہ وہ تعمیر بلا تخریب کے تصور تک سے ناآشنا ہے۔ وہ کام کا ایک ہی طریقہ جانتی ہے پہلے بگاڑتی ہے پھر بناتی ہے۔ مادے کی ایک صورت کو تخریب کی بھٹی میں پھونک لیتی ہے، تب دوسری صورت کو تعمیر کا جامہ پہناتی ہے۔ پھر تخریب کو کوسے جانا۔ اور تعمیر کا راگ گائے جانا۔ اور اس حماقت کو حکمت ٹھہرانا جہل مرکب نہیں تو کیا ہے پس ربانی انقلاب کے تماشے میں ایک سین اور پہلا سین ربانی تخریب کا اتنا ناگزیر ہے جتنا خود ربانی انقلاب ناگزیر ہے۔ اسی طرح تخریب اگر تعمیر پر ختم نہ ہو تو وہ تخریب ہی نہیں ہے، یعنی تخریب معتبر نہیں ہے۔ اور جو بے فہم و فراست لوگ انقلاب کے جوش عشق میں تخریب ہی تخریب کو رٹے جاتے ہیں اور تعمیر کے نام سے جھجکنے لگتے ہیں انھیں بتانا چاہئے کہ تخریب کو صرف سفر ہے اور منزل تعمیر ہے، جو تخریب تعمیر پر منتہی نہ ہوتی وہ سفر بلا منزل ہے۔ اور انھیں متنبہ کرنا چاہئے کہ وہ مخالفین تخریب سے کم جہل مرکب کا شکار نہیں ہیں۔ فطرت اور حقیقت دونوں حقیقت ناشناسوں کی یکساں ہنسی اڑاتی ہیں۔ پس ربانی انقلاب کے تماشے کا دوسرا لازمی سین ربانی تعمیر اتنا ہی ضروری ہے، جتنا خود ربانی انقلاب۔ لیکن یہ مضمون صرف ربانی تخریب کی داستان گوئی کرے گا۔

(۲) ربانی تخریب جن جن پرانی تعمیروں کو ڈھائے گی ان کی ایک منتخب فہرست یہ ہے۔

(الف) قومیت، وطنیت، فرقہ دارانہ ذہنیت کے قصروں کو مسمار کرے گی جو بحالت موجودہ تمام انسانی جھگڑوں اور فتنوں کے ناقابل تسخیر اڈے ہیں۔ جہاں فتنے ڈھلتے اور جہاں جھگڑے پلتے ہیں۔ جنھوں نے جنت ارضی کو جہنم نقلی بنادیا ہے۔ جن کا خاتمہ دنیا کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایمان کے لئے شیطان کا۔ ان تینوں سامان تفرقہ، جنگ کی جگہیں مذہب مطلق کے سے اسباب وحدت کو دی جائیں گی، جو جہنم ارضی کو جنت ارضی سے بدل دے گا۔ جو انسانیت کو نقطۂ حقیقت سے قریب تر کر سکے گا۔ اس لئے کہ انسانیت کی غائت کبریٰ یہی چیزیں ہیں۔

(ب) یہ تخریب متفرق حکومتوں، متفرق امتوں، متفرق تہذیبوں کے وجودوں کو جو قومیت، وطنیت، مذہبیت فرقی کی پیداواریں ہیں۔ مٹا کر ان کے حدود پر ایک حکومت، ایک آئین اور ایک تہذیب وحدانی کو محیط بنائیگی۔ تاکہ وحدت انسانی کا نقطۂ مقصود جو تصور سے بھی گم ہو چکا ہے رسائی کی دسترس میں آجائے۔ اور اس مقصود سے اس نصب العین اعلیٰ تک پہونچنا بھی ممکن ہو جائے جس کا وحدت انسانی صرف ایک وسیلہ ہے، یعنی تکمیل انسانیت و اکمال فطرت۔

(ج) متفرق معیارات زندگی کو، متفرق مدارج زندگی کو، متفرق ذرائع زندگی کو، متفرق استطاعات زندگی و متفرق امتیازات زندگی کے مصنوعی خطوط فاصل کو محو کرے گی اور ان کے بدلے ایک معیار زندگی ایک درجۂ زندگی ایک ذریعۂ زندگی ایک استطاعت زندگی اور ایک امتیاز زندگی کو عالم انسانی کا سکۂ رائج بنائے گی، تاکہ کلفتوں کے روح فرسا بار دل سے انسانیت کی لطیف روح سبکدوش ہو سکے۔ اور راحت خالصہ کا خواب شیریں جو ابھی تک صرف فردوس تخیل ہے منت کش تعبیر اور جنت حقیقت بنجائے۔

(د) شاہیوں، امارتوں، پیشواؤں کے مصنوعی تفوقات کے سر بفلک مصنوعی قلعوں کو جہاں محفوظ ہو کر حقیقت عامہ کے قدرتی حقوق انسانیت پر گولہ باریاں ہوتی ہیں۔ اور اس کے حقوق کو تباہ کرکے اس پر حکومت بیجا کی جاتی ہے، زمین کے بالکل برابر کر دے گی۔ اور اس غیر فطری، مصنوعی، ابلیسی امتیازات کو بھی ساتھ ہی ساتھ خاک کو سونپ دے گی۔ اور انسانیت کے احترام کو جو ان مصنوعی تفوقات کے باعث خاک میں ملا دیا گیا ہے، عہد فطری کی یاد مبارک کے ساتھ ساتھ جب کہ انسانیت سادہ اور واقعی طور پر محترم تھی از سر نو بلند کرے گی۔ تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو پالے اور خواب شیریں کی طرح خواب و خیال میں پڑی ہوئی جنت کو واقعۂ و تعبیر بنا کر

اس کی مالک ہوجائے۔

(ھ) دینِ مصنوعی یا تہذیبِ مصنوعی کے عقائدِ مصنوعی کی زنجیروں کو اور دینِ رسمی اور تہذیبِ رسمی کے رسوم ورواجاتِ مکلفہ کے بند ھنوں کو ایک ایک کرکے کاٹ دے گی اور دینِ حقیقی کو قائم مقام بنائے گی، اور اس ذریعے سے فطرتِ انسانی کو اس کی فطری آزادی تک پہونچائے گی۔ جو اس کا فطری حق ہے اور جس کو دینِ مصنوعی اور تہذیبِ مصنوعی کی دست درازیوں نے زبردستی چھین رکھا ہے۔

(ز) عقلیت وفطرت پر چھائی ہوئی وہم پرستیوں کے بیت عنکبوت کو تار تار کرکے رکھ دے گی۔ اور عقلیت وفطرت کی طاقت کو اتنا بڑھا دے گی کہ وہ الہام ووحی کے دوش بدوش چل سکے۔ تاکہ ایک طرف الہام ووحی اپنے محل کی وسعت وعلویت کے باعث خود اپنی وسعت وعلویت کے قرار واقعی مظاہرے کرسکیں۔ دوسری طرف عقلیت وفطرت کو بھی اپنی آخری بلندیوں تک پہونچ کر الہام ووحی کے گہرے قبول وانجذاب کے قابل بناکر فکرِ اعلیٰ اور جذبۂ اقصیٰ کی برکتوں کے بکھیرنے کے بھی قابل بنادے گی۔

(ح) نظامِ نفسانی یعنی حکومتِ نفسانی، تہذیبِ نفسانی، حیاتِ نفسانی کی پوری کائناتِ نفسانی پر حملہ آور ہوگی۔ اور جہاں تک اس پر انہدام وانعدام طاری کرسکے گی، طاری کرے گی۔ یہاں تک کہ اس کی پر رونق آبادی کو شمشان اور خرابستان سے بدل دے گی، اور تب اس مرگھٹ اور ویرانے سے دنیا، ربانی کو نکالنے کی کوشش کرے گی۔

(۳) تمام محتاجیوں تمام ذلتوں تمام کلفتوں اور تمام برائیوں پر جہاد کرے گی اور انھیں شکست دے گی اور امکان کے آخری درجے تک انھیں نیست ونابود کرکے رکھ دے گی۔ اور ان کی جگہ خوشحالیوں، عزتوں اور تمام اچھائیوں کو انسانوں کی متاعِ مشترک بنا ڈالے گی اور اس طرح انسانیت کو عذابِ الٰہی سے چھڑا کر انعامِ الٰہی سے ہم آغوش کردے گی۔

(۴) ربانی تخریب اپنے اندر تعمیر کا پہلو لئے ہوئے ہوگی، جیسا کہ ہر تخریبِ صحیح کا حال ہے اور اس لئے وہ تعمیری کام کی بھی بنیاد ڈالتی ہوئی آگے بڑھے گی۔ وہ ایک طرف نظامِ نفسانی پر حملہ آور ہوگی۔ اور رہے گی۔ اس حد تک کہ اس کے لئے تختۂ تابوت تیار ہوجائے اور دوسری طرف نظامِ ربانی کا بنیادی پتھر بھی رکھ دے گی اور ربانی تعمیر کا دست وبازو بن کر نظامِ ربانی کی تعمیر کو آگے بڑھاتی رہے گی۔ اور صاف صاف خلاصہ یہ ہے کہ ربانی تعمیر کے زیرسایہ عملی فرمانروائی کرے گی۔

(۵) ربانی تخریب، تعمیری شمول کے ساتھ ساتھ، ربانی تعمیر کے زیرسایہ اپنا صورِ عمل پھونک چکی ہے۔ اس کا قدم ہلکا مگر مضبوط ہے، اس کی چال دھیمی مگر مسلسل ہے اور وقت آئے گا اور ضرور آئے گا، جب اس کا قدم برق تمثال اور اس کی چال نمونۂ زلزال ہوجائے گی، اور اس وقت زمین، عرصۂ قیامت بن جائے گی، اور اسی وقت ایسا ہوگا کہ نشاۃ قدیمہ کے مردہ پتلے سے نشاۃ جدیدہ کا زندہ پیکر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے گا، اور اس وقت ربانی انقلاب اپنی پہلی نصف منزل طے کرچکا ہوگا اور دوسری نصف منزل کو چلے سپرد بنانے کے لئے پرجوش حوصلے اور پرجوش ولولے کے ساتھ ربانی انقلاب زندہ باد ربانی تخریب مبارکباد کے نعرہ ہائے گرم میں قدم اٹھا رہا ہوگا۔

لازم ہے دوائی نہ دعا یاد رہے
ہاں لعل لب و زلف رسا یاد رہے
دنیا کو یہ ہے نوعِ بشر کی توہین
گر عہدِ شباب میں خدا یاد رہے

جوشؔ

زمانے کی عیّاری

جوش ملیح آبادی

میرے دل کو ایک ایسی محبّت ودیعت کی گئی ہے جو بلا کی تلخ و شیریں ہے۔ وہ ایک ایسی آگ ہے، جو معشوقہ کے سوا، خود مجھے، اور تمام کائنات کو پھونکے دے رہی ہے۔

زمانے کی کیسی عدیم النظیر بے مہری اور ستم ظریفی ہے کہ میں پھر اُس ہولناک منصب پر فائز کیا گیا ہوں جسے میں ترک کر چکا تھا۔ ذرا دُنیا کا انصاف دیکھو، سالہا سال کی شب بیداریوں کے بعد، ابھی ابھی میری آنکھ جھپکی تھی کہ اس کمبخت نے مجھے پھر جگا دیا۔ ابھی ایک قیامت نے دم نہیں لیا تھا کہ دوسری قیامت نے شانے پر ہات رکھ دیا۔

ہوائیں بھی کبھی بند ہو جایا کرتی ہیں، مگر میرے دھڑکنے والے دل کو ایک لمحے کے سکوں کا بھی حکم نہیں۔

خدا کے لئے انصاف سے کہو، میں نے زمانے سے کب درخواست کی تھی کہ مجھے دوبارہ مزا چکھایا جائے۔ میں عورت، خطرناک جنت۔ انگاروں کی بہشت، پھولوں کا جہنّم یعنی عورت سے قطعی مایوس ہوں۔ یہ دلوں کو توڑ تو دیتی ہے مگر جوڑ نہیں سکتی۔ جوڑنے میں ایک ایسی کاریگری درکار ہے جو کہ در عورت کو حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اُس کی محبت، طوفانی سمندروں سے زیادہ پُر جوش ہوتی ہے۔ در کہ ہے سونے کی طرح خالص بھی، مگر افسوس، صد ہزار افسوس، اُس میں پائداری ہاں۔ عورت نازک ہے۔ اور اسی وجہ سے اُس کا پیمانِ محبت بھی نازک ہوتا ہے۔ نگینے کا ہر جزو آبگینہ ہی ہوتا ہے۔ میں عورت کی محبت کی ناپائداری کے باعث عورت کو بُرا نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ وہ مجھسے پیمانِ وفا نہ باندھے۔ کیوں کہ وہ ایک نہ ایک دن ٹوٹ کر میرے دل کو بھی توڑ دے گا۔ مگر ہمارے چاہنے سے ہوتا کیا ہے۔ زمانہ اپنی مصلحتوں کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ ہماری خاطر اپنے نظامِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا ——

کیا میں اُس محبّت کو جو زبردستی مجھے دی گئی ہے۔ زمانے کے منھ پر مار دوں۔ سینہ چاک کر کے اُسے پھینک دوں؟ کاش میں اِس پر قادر ہوتا —— زمانہ جانتا تھا کہ میں محبت کا تلخ تجربہ کر چکا ہوں، آسانی سے اُسے دوبارہ قبول نہ کروں گا۔ یہ خیال کر کے اُس نے مجھ سے ایک نہایت شاطرانہ چال چلی، اِس گرگِ باراں دیدہ نے مجھ سے کہا "لے میں تجھے ایک شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح دیتا ہوں، اس سے دل بہلا" میں نے شکریے کے ساتھ اُس "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" سے جی بہلانا شروع کیا۔ اور اُسے ایک ادبی شغلہ سمجھنے لگا —— لیکن رفتہ رفتہ یہ "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" اپنے چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب اُٹھانے لگی ——

اور جب پورے طور سے نقاب اُٹھ گئی تو معلوم ہوا کہ وہ "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" تفریح نہیں "محبت" اور خطرناک محبت ہے جس پر زمانے کے چالاک ہات نے "تفریح" کی نقاب ڈال دی تھی —— دیکھو زمانہ کس قدر عیار ہے۔ لیکن کس سے اِس کی شکایت کروں، یہ شخص تو بادشاہوں تک سے ہات ملاتا ہے۔ کس کے منھ میں دانت ہیں کہ اُسے سزا دے —— دیکھو،

چالاکی یہیں تک ختم نہیں ہوتی ہے۔ ایک چالاکی کے اندر دوسری چالاکی تہ کی ہوئی ہے، جو پہلی چالاکی سے بھی لطیف و باریک ہے۔ زمانے کو پہلے سے علم تھا کہ ایک نہ ایک دن میں اُس کی "شام کی تفریح" کو پہچان جاؤں گا۔ اور پہچانتے ہی نکل بھاگنے کی راہیں سوچنے لگوں گا۔ سو اُس نے کمالِ عیاری وہ راہیں پہلے ہی سے بند کر دی تھیں۔ یعنی اُس نے جس پر مجھے فریفتہ کیا تھا، یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ اُس کے دام میں ڈوریاں نہیں، زنجیریں ہیں، اور اُسی کے ساتھ ساتھ اُس نے اس نادرۂ روزگار کے ترکش میں نیازمندی و بندہ پروری کے وہ تیر رکھ دیے جو بھاگنے والے کا دُنیا کے ہر حصے میں تعاقب کر سکتے ہیں ؎

بہ دُور گردیِ من از غرورِ می خندد
حریف سخت کمانے کہ در کمیں دارم

زمانہ خوب جانتا ہے کہ حُسن جب وفا و کرم سے کام لے تو اُس کا مارا ہوا پانی تک نہیں مانگ سکتا۔

بہرحال، اب تو میں گرفتار ہو چکا۔ میں رو رہا ہوں اور زمانہ قہقہے مار رہا ہے۔

کیا تو سُننا چاہتا ہے وہ کیسی ہے؟ تو سُننا چاہے یا نہ چاہے، اس منزل میں جہاں اب میں ہوں، ذکرِ محبوب سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ہوا کرتا۔

وہ کیسی ہے؟ میرا سینہ رُندھا جا رہا ہے۔ مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ حیوانِ ناطق کی یہ کیسی بدبختی ہے کہ جو باتیں کہے جانے کے قابل نہیں ہوتیں۔ اُنھیں وہ کہہ سکتا ہے، اور جو باتیں اس قابل ہوتی ہیں کہ کہی جائیں، اُنھیں کہہ نہیں سکتا۔ کیسی بدقسمتی اور محرومی ہے کہ معنی کے آفتاب کا سامنا ہوتے ہی الفاظ کی شبنم اُڑ جاتی ہے۔ آہ اے گونگے انسان! تو زباندانی کا مُدعی ہے۔

زبان ایک گنوار خادمہ ہے جو پیتل اور تانبے کے برتن تو راکھ سے مانجھ سکتی ہے۔ مگر چینی اور شیشے کے ظروف توڑ ڈالتی ہے۔

ہاں تو وہ کیسی ہے؟ وہ انگوری شراب ہے، جو کسی دیوی کی دُعا سے انسانی پیکر میں جلوہ فروش ہو گئی ہے۔ وہ خالقِ عالم کا تصورِ بہشت ہے جس نے جسم کی صورت اختیار کر لی ہے، وہ شاعری کی رُوح ہے جس نے گوشت پوست کا رنگین لباس پہن لیا ہے ——— اُس کی جلد، خدا جانتا ہے، اس میں مبالغہ نہیں۔ دودھ پیتے بچّوں کی جلد سے زیادہ چکنی اور ملائم ہے۔ میں نے اُس کی جلد کو مَس کر کے فوراً گلاب کی پنکھڑی کو مَس کیا (اگر مبالغہ کرتا ہوں تو میرا حشر ظالموں کے ساتھ ہو) اور میں نے بہ یقین فرق محسوس کیا کہ میری محبوبہ کی جلد پنکھڑی سے بھی زیادہ ہموار، چکنی اور نرم ہے۔ میرے مَس نے اُس سے زیادہ نزدیکی کا آج تک تجربہ نہیں کیا ہے۔ اُس کا چہرہ یونانی دیویوں سے ملتا ہے، اور دنیا کے منتخب ترین مصوروں کا آئڈیل بن سکتا ہے۔ اُس کی گردن ہنسلی کی سی ہے۔ ذرا سا خم لیے ہوئے جس میں تلوار کی سی لچک اور رقص کرتے ہوئے طاؤس کا سا بانکپن ہے۔ جب وہ بات کرتی ہے معلوم ہوتا ہے تاروں کی چھاؤں میں کسی دُور کے مندر کے اندر چاندی کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اُس کا تبسّم، دل کے ساتھ وہ کرتا ہے جو قحط زدہ زمین کے ساتھ زُوم جھوم کر برسنے والی گھٹا کرتی ہے۔ ملبوس کے اندر سے اُس کے گورے پنڈے کا گلابی پن کس لطافت کے ساتھ جھلکتا رہتا ہے۔ اُس کے پنکھڑی سے زیادہ کاریگری کے ساتھ ترشے ہوئے لبوں کی خوشبو ایسی ہے جس سے پھولوں کی دُنیا ناواقف ہے۔ اُس کی آنکھیں، کائنات در آغوش آنکھیں کتنی مخمور، مست، ساحر، اور عمیق ہیں۔ اُن میں کتنے جادوؤں کا مسکن، اور کتنے منتروں کا آشیانہ ہے۔ اُس کی دراز پلکوں میں شراب کی موجیں ہیں، ابر کا خرام ہے، اور رُوح کی کروٹیں ——— وہ ایک آہوئے صحرا ہے۔ جس کی ملائم مگر سمندر سے زیادہ گہری آنکھوں کے سامنے شیر مقتول نظر آتے ہیں۔

میں نے ایک روز مُنھ اندھیرے، جب مُرغ بانگ دے رہے تھے، اُسے دیکھا، یہ پہلا موقع تھا کہ میری رُوح کو معلوم ہوا کہ آسودگی کسے کہتے ہیں، اگر میں راسخ العقیدہ مسلمان ہوتا تو صبح کے وقت اُس کی طرف دیکھنے کی جسارت نہ کرتا۔ کیونکہ میری محبوبہ صبحِ صادق کی حقیقی بہن ہے، اور اسلام نے دو بہنوں کا جمع کرنا حرام ٹھہرایا ہے۔

یہ ہے سرسری اور بھدا سا خاکا اُس نادرۂ روزگار کا جس کے حوالے زمانے نے مجھے کیا ہے ——— اب خود سوچ، میں بھاگوں تو کیونکر؟ اب جبکہ اچھی طرح معاملات میں نے بیان کر دیے ہیں، زمانے کو داد دو کہ اُس نے کیسی کامیاب عیاری سے مجھے ہیرا پاؤں باندھ کر حُسن کے قدموں پر ڈال دیا ہے۔

دعوتِ درد

اے تموّل پیشہ انساں اہلِ زر خانہ نشیں
کسبِ دولت میں تجھے مرنے کی بھی فرصت نہیں
صرف تجھکو وسعتِ ظرفِ امارت چاہیئے
اپنے گھر بیٹھے ہوئے دنیا کی دولت چاہیئے
یوں زمیں پکڑے ہوئے آسودگی میں گھر نہ بیٹھ
سانپ بن کر اس طرح گنجینۂ زر پر نہ بیٹھ
پاؤں کو تکلیف دے ایوانِ راحت سے نکل
جس طرف لے جا رہا ہوں میں تجھے ہمراہ چل
تجھپہ ثابت کر دکھاؤں اک تماشا گاہ سے
تو کہ ہے گزرا ہوا انسانیت کی راہ سے

درسِ عبرت کے لئے نیرنگِ دُنیا دیکھ لے
ہند کے اسٹیج پر آج اک تماشا دیکھ لے

وہ مناظر حشر زا ہو جائیں گے خود بے نقاب
کانپ اُٹھے گی لرز جائے گی روحِ انقلاب
اک دھماکا ہے کہ رعد و برق کی آواز ہے
ہند کے اسٹیج پر کس کھیل کا آغاز ہے
ہر فضا میں گُونج اُٹھی یوں نوائے انقلاب
جیسے بندھ جائے ہوائے نغمۂ چنگ و رباب
یہ سماں رامشگرانِ وقت کی آواز پر
بجلیاں تک رقص میں ہیں بادلوں کے ساز پر
دیکھ لایا ہوں تجھے میں کس تماشا گاہ میں
تو کہاں بیٹھا ہوا تھا حرصِ عز و جاہ میں

ہند کے اسٹیج پر اس کے اداکاروں کو دیکھ
جان پر کھیلے ہوئے ہیں بخت کے ماروں کو دیکھ

دیکھ نکلے راہ کوہ و دشت سے خانہ بدوش
کارواں در کارواں غربت زدہ قسمت فروش
حشر زا نظارہ ہے طفل و جوان و پیر کا
دیکھ ناداروں میں رنگ افلاسِ عالمگیر کا

اہلِ دولت کی دُہائی دے رہی ہے جابجا ان کی یہ آوارہ بختی ان کی یہ مسکیں ادا
جس طرف نکلیں لئے سودائے ہستی سر میں ہیں رات دن گردش زدہ تقدیر کے چکر میں ہیں
ہو کہاں حاصل انھیں کاشانۂ امن و سکوں
رہ نوردی میں ہیں یہ بیگانۂ امن و سکوں
دیکھ نکلا جھونپڑوں سے وہ کسانوں کا گروہ جن کے حالِ بیکسی پر رو رہے ہیں دشت و کوہ
باش لے بیدردِ انساں باش لے سرمایہ دار یہ وہ انسانی جماعت ہے جو ہے تیرا شکار
یہ جماعت دانے دانے کے لئے محتاج ہے جس کی پستی آج تک تیرے لئے معراج ہے
اے حریصِ سربلندی عالمِ پستی بھی دیکھ اپنی دولت دیکھ کر ان کی تہیدستی بھی دیکھ
ان کا خونِ گرم تیرے بدنما پیکر میں ہے ان کی کُل گاڑھی کمائی دیکھ تیرے گھر میں ہے
قرض کی صورت میں ان کا چوس لیتا ہے لہُو سانپ بن کر ڈسنے والی جونک ہے در اصل تو
کچھ زمیں کچھ تو لئے ہے ان کی محنت کا ثمر یہ جفاکش پیٹ پر نکلے ہیں پتھر باندھ کر
اے عدوئے نوعِ انساں حق تلف بیداد گر
خیر انھیں بھی چھوڑ دے تو اب خدا کے رحم پر
دیکھ مزدوروں کا دَور آیا ہے تیرے سامنے ان کا بگڑا وقت انھیں لایا ہے تیرے سامنے
بار اُٹھانے کو تری خدمت میں ہیں آئے ہوئے چار پیسوں کے لئے ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے
دیکھ تیرے رحم کا دروازہ ان پر بند ہے کیا اسی بنیاد پر تو آج دولت مند ہے
دل بجھا کر یوں نہ دے تو ان کو ناکامی کا داغ ان سے روشن ہے ترے قصرِ امارت کا چراغ
یہ وہی ہیں جن پہ ہے غلبہ کئے فکرِ معاش یہ وہی ہیں جن کو ہے ہر روز روزی کی تلاش
یہ وہی ہیں جو کہ ہیں شائقِ قیامِ ازل جن کی ہے آزردگی تقسیمِ دولت کا عمل
یہ وہی ہیں جن کے ہاتھوں ہے تری دنیا کی موت یہ وہی ہیں جن سے ہو جائے گا مقصد تیرا فوت

یہ وہی ہیں جن کا مستقبل مٹا دے گا تجھے اک نشانِ بے نشانی جو بنا دے گا تجھے
یہ وہی ہیں فتحیابی جن کی ہے تیری شکست بھول جانے والا ہے تو جلد اپنا بندوبست
یہ وہی ہیں جو اٹھائیں گے سعدائے احتیاج ان کی قوت بڑھ کے پوچھیگی امارت کا مزاج

چھوڑ دے اس حال کو بھی ان کے استقبال پر
کر نظر ان کے سوا اوروں کے بھی احوال پر

دیکھ آیا کارواں وہ مختلف افراد کا رنج ساماں حال ہے ہر خانماں برباد کا
ان میں کچھ مظلوم بھی ہیں ان میں کچھ مغموم بھی شاکی مقسوم بھی، دولت سے ہیں محروم بھی
ان میں مفلس بیبیاں بھی ان میں بیوائیں بھی ہیں بیٹیاں بھی ان میں ہیں بہنیں بھی ہیں مائیں بھی ہیں
کچھ یتیم ان میں ہیں اپنی بیکسی کی یادگار بے وسیلہ، بے سہارا بے بضاعت، بے دیار
دیکھ کتنے مبتلا امراضِ جسمانی میں ہیں طالب امداد ہیں، دَورِ پریشانی میں ہیں
ان میں کچھ مفلوج بھی ہیں ان میں کچھ مدقوق بھی ان میں کچھ مسلول بھی ہیں ان میں کچھ محروق بھی
دیکھ کتنے ہیں گدا جو طالبِ امداد ہیں تیرے ایسے اہلِ زر کی بدنصیب اولاد ہیں
کتنے ہیں جن کے ہے کشکولِ گدائی ہاتھ میں جمع کرتے پھر رہے ہیں پائی پائی ہاتھ میں
دیکھ کتنے ہیں شریف ان میں جو ہیں تکلیف میں کتنے ہیں زار و نحیف ان میں جو ہیں تکلیف میں
کتنے ہیں جن کے لئے ہے بیکسی کی زندگی کر رہے ہیں جو بسر فاقہ کشی کی زندگی
کچھ نہ کچھ عاید ہیں سب پر تیرے شیطانی حقوق اور تو بھولا ہوا بیٹھا ہے انسانی حقوق
واقعاتِ ہند ہیں عبرت نگر تیرے لئے ہاں صلائے درد ہیں اے اہلِ زر تیرے لئے
کتنے رُخ بدلے ہیں اے بدکیش تیرے سامنے سب مناظر ہو چکے ہیں پیش تیرے سامنے

کس نتیجے پر تو پہنچا ہے بتا اے اہلِ زر
یہ تماشا تو نے دیکھا ہند کے اسٹیج پر

آغاز بہار

غیر آسنگی

شیو فرید آبادی

نو بجے سے ۵ بجے تک آفس میں کام کرنے کے بعد ایک ہندوستانی کلرک کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ اِسے ہر ایک آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ آٹھ گھنٹے بیل کی طرح جُت چکنے کے بعد جب وہ آفس کے دروازے پر اپنی کرسیدھی کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو آنکھوں کے آگے کچھ دیر کے لئے اندھیرا سا آ جاتا ہے، اور اس اندھیرے میں تتلیاں سی ناچنے لگتی ہیں۔ ایک طرف تو بھوک کی وجہ سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگتی ہیں اور دوسری طرف طبیعت چاہتی ہے کہ ان لڑکھڑاتے ہوئے پیروں کو لے کر گھنٹہ بھر سو لیا جاوے۔ پھر پیچھے کچھ اور دیکھا جائے۔

رمن بابو آج کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے تھے۔ اکہرے بدن کے وہ دُبلے پتلے آدمی تھے۔ دس بارہ برس کی سخت محنت نے اُن کا ڈھانچہ ڈھیلا کر دیا تھا۔ اُن کا لمبوترا مُنہ پچک چکا تھا، اور کمی خون کی وجہ سے زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی ہو کر باہر نکل آئی تھیں۔ اور کمر کُرسی کی پیٹھ کی پہلی ہی رگڑ سے، پکے پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتی تھی۔ وہ خوراک اتنی نہیں کھاتے تھے جتنی دوائیاں استعمال کرتے تھے۔ بھوک اُنھیں بُری طرح ستاتی تھی۔ گھر میں آگ لگ جائے مگر اُنھیں کھانا وقت پر ملنا چاہیئے۔ اِدھر صبح ۹ بجے اور اُدھر شام کو چھ بجے۔

گھر میں قدم رکھتے ہی اُنھوں نے آواز دی "اوما کہاں ہو؟" یہ اُن کا روزمرہ کا معمول سا ہو گیا تھا۔ عادت سی پڑ گئی تھی۔ جب کبھی باہر سے آتے تو اسی طرح پکارتے۔

اوما بالا خانہ پر تھی، روزمرّہ اسی وقت وہ اِن کے لئے کھانا پکایا کرتی تھی، آج اُنھوں نے جو باورچی خانے کی طرف نگاہ ڈالی تو دم خشک ہو گیا۔ چُولھا ٹھنڈا پڑا تھا، اور اوما نہایت اطمینان کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ایک طوطے کو آٹا دے رہی تھی۔ ...... یعنی کھانا پکانے کا کوئی سوال ہی درپیش نہ تھا۔ غصّے اور لاچاری کی وجہ سے رمن بابو کا چہرہ تمتما اُٹھا بھوک کی تیزی نے آتشِ غضب کو اور تیز کر دیا، اُن کی زبان میں کانٹے سے پڑ گئے۔ دفتر کی فائلوں کو میز پر پٹکتے ہوئے اُنھوں نے پُوچھا "آج کھانا نہیں بنیگا کیا"؟

اُوما اِس جملے کے لئے شاید پہلے ہی سے طیار بیٹھی تھی، پنجرے کا دروازہ بند کر کے اُس کے کُنڈے میں کیل ڈالتے ہوئے اُس نے جواب دیا، "اب جاتی ہوں بازار ساگ خریدنے کے لئے، اِس کے بعد کھانا بناؤں گی"۔

کیسا لچر جواب تھا، رمن بابو کے روئیں روئیں میں آگ لگ گئی۔ بولے "اگر ساگ نہیں تھا تو دو روٹیاں ہی ڈال دیتیں۔ کم سے کم اِس وقت تو جان بچ جاتی"۔

اوما نے کہا "تمہارے دل کی تھاہ بھی کسی کو ملے۔ کبھی تو تمہیں بادن بنجن (دعوتِ شیراز) چاہئیں اور کبھی تم ایسے سادھو ہو جاتے ہو کہ ساگ کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ کوئی سُنتا ہوگا تو کہتا ہوگا کہ کیسی پھوہڑ عورت ہے۔ وقت

کھانا بھی پکا کر نہیں دیتی۔ لیکن تمہاری کرتوتوں کو کوئی جانے جب نا!

رمن بابو چُپ ہوگئے۔ سمجھ گئے بحث میں جیتنا مشکل ہے۔ اُن کی شکایتیں کبھی بے بنیاد نہیں ہوتی تھیں۔ شکایتیں وہ کرتی ہی کہاں .. .. وہ تو ایک مردہ رُوح کی "پکار" ہوتی تھی۔ جس کو ایک راہ چلتا آدمی بھی سُن لیتا تھا۔ وہ عیاں اور مناسب ہوتی تھی۔ لیکن معلوم نہیں وہ آخر میں کیوں مُنہ کی کھا جاتے تھے۔ جو آدمی باہر پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ بڑے بڑے آدمیوں سے ملتا ہے۔ وہ گھر میں گھُستے ہی اپنے ہتھیار کیوں ڈال دیتا ہے۔ یہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ناامید ہوکر وہ ٹوٹی چارپائی پر لیٹ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں، تاکہ نیند آجائے۔ اِتنے میں اُدمانے کہا، میں کھانا پکاتی ہوں تم ذرا بازار سے ساگ لے آؤ اور ہاں اس طوطے کے لئے ایک پنجرہ بھی لیتے آنا۔ ذرا آگے بڑھکر کباڑیوں کی دوکان پر مِل جائے گا۔

"کہاں سے آیا یہ؟"

موتی کی ماں نے خرید وا دیا ہے ...... ایک روپے میں۔ کہتیں تھیں پہاڑی ہے، ایک مہینے میں آدمی کی طرح بولنے لگے گا۔"

رمن بابو بھاری لہجے میں بولے "ہوں" اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد اُدمانے پھر کہا "میں نے کیا کہا سُنا، اِس کے لئے ایک پنجرہ لیتے آؤ......... یہ موتی کی ماں کا ہے ...... میں ابھی کھانا بناتی ہوں۔"

رمن بابو نے صاف انکار کر دیا "مجھ میں طاقت نہیں ہے۔" اُدما کو طیش آگیا۔ چوکے میں برتنوں کو اوپر سے پٹختی ہوئی بولی "میرا کام کرنے سے تمہیں خاص چڑ ہے۔ ابھی کوئی دوست آجائے تو جیسے بیٹھے ہو اُٹھکر چل دوگے۔ اور پھر رات کو بارہ بجے صورت دکھاؤگے۔ میں کہتی ہوں اُن دوستوں کے یہاں ہی کیوں نہیں رہتے۔ یہاں آؤگے تو میں دو چار کام بتا دوں گی۔ اور کام کرنا لگتا ہے تمہیں بُرا۔

رمن بابو کو جو بات چُبھ جاتی تھی وہ اُسے کہنے سے کبھی باز نہیں آتے تھے اِس کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔ وہ بول اُٹھے "جہاں طوطے کی خاطر آدمی سے زیادہ ہوتی ہو اُس گھر میں رہنا بھی جھک مارنا ہے۔"

اُدمانے جھٹ سے جواب دیا "اگر آدمی ڈھنگ کے ہوں تو موئے طوطے کو پالنے کی نوبت ہی کیوں آئے؟"

رمن بابو نے باورچی خانے کی طرف سے کروٹ بدل لی اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ سوچ رہے تھے۔ مزدوری کرتے کرتے یہ نوبت آگئی۔ لیکن ایک دن بھی تسلّی و تشفّی نہیں ہوئی۔ اور ٹھیک وقت پر روٹیاں بھی نصیب نہیں ہوئیں۔

(۳)

دوسرے روز علی الصباح چار بجے کے قریب رمن بابو کی آنکھ یکایک کھُل گئی۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں جلن تھی۔ رات کو بھی دیر سے انھیں نیند آئی تھی اور اِس وقت بھی جلد آنکھ کھُل گئی تھی۔ وہ پھر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ اُن کی آنکھوں میں نیند آہی رہی تھی کہ طوطا اپنی کرخت آواز میں بولا "ٹیں ٹیں" ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ، اور پھر تو اسے رٹ سی لگ گئی۔ اُس کی آواز برچھی کی طرح رمن بابو کے کان کو چھیدتی ہوئی دوسرے کان سے نِکل جاتی تھی۔ ہر "ٹیں ٹیں" پر رمن بابو تلملا اُٹھتے تھے۔ نئی جگہ ہونے کی وجہ سے طوطا بھی کچھ بے چین معلوم ہوتا تھا۔ وہ پنجرے کے چاروں طرف چکّر کاٹتا، پنکھوں کو پھڑ پھڑا کر نشست کے اوپر چھت میں اوندھا جا چپکتا..... اپنی چونچ سے سیخوں کو پکڑ کر جھولنے لگتا اور پھر اچانک چیخ پڑتا۔ ایسی صورت میں بھلا نیند کیسے آتی۔ آخر مجبور ہوکر اُنہوں نے پکارا "اُدما کہاں ہو"

"کیوں کیا کہتے ہو" جواب ملا۔

اِس طوطے کو یہاں سے ذرا ہٹا لو تو گھنٹے بھر اور سو لوں۔ میرا سر پھٹا جاتا ہے۔"

اُدما جب پنجرہ لے کر چلنے لگی تو اُنہوں نے کہا ...... "میں کہتا ہوں تمہیں لگتا ہے بُرا۔ یہ بلا نہ جانے تم نے کیا سوچ کر پالی ہے۔"

کہنے کو تو وہ کہہ گئے، مگر انہیں فوراً محسوس ہوا کہ علی الصباح [illegible] کو چھیڑ کر اُنہوں نے اچھا نہیں کیا۔ وہ کیا جواب دے بغیر [illegible]

کچھ نہیں کہا۔ وہ صرف کنکھیوں سے اُن کی طرف دیکھتی ہوئی طوطے کو لے کر چلی گئی۔

اوما کی طبیعت ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ وہ کبھی گوری چٹی اور نازک بدن تھی۔ پندرہ برس پہلے وہ اِس مکان میں روپ جوبن کے شیریں بادے اور بھنڈی اُڑھی تھی۔ اُس کا سینہ اُمیدوں اور ارمانوں سے پھولا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ امیدیں، ناامیدیوں اور حسرتوں میں تبدیل ہوگئیں، زندگی کا بہاؤ دھوکا نکلی۔ اُس کے کئی بچے ہوئے...... کھانڈ کے سے کھلونے جنھیں دیکھکر بھوک بھاگتی تھی۔ مگر ٹھنڈ کھائی ہوئی کلی کی طرح وہ سب ایک ایک کرکے اس کی گود میں ہی مرجھا کر گر پڑے...... کھانڈ کے کھلونوں کی طرح ہی لوٹ گئے۔ اِن مصیبتوں سے ڈری ہوئی اوما اپنے خاوند کے اور زیادہ نزدیک ہوگئی۔ اس بیل کی طرح جو تیز ہوا کا جھونکا کھاکر درخت سے لپٹ جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے اس نے جس درخت کا سہارا لیا وہ بھی آہستہ آہستہ سوکھ چلا تھا۔ آپس میں ٹکرا کر ٹوٹی ہوئی دو چیزوں کی طرح وہ ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔

اوما کے دن اب کیسے کٹتے۔ رمن لال جب آفس چلے جاتے، تب وقت کاٹنا اُسے مشکل ہوجاتا۔ رہ رہ کر وہی باتیں یاد آتیں۔ آخر اس نے ایک طوطا پال لیا۔ رمن بابو کے پاس سے ہٹاکر وہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گئی اور پڑھانے لگی۔ "پڑھو مٹھو رادھا کرشن...... گوپی کرشن"۔ طوطے نے پھر پھڑانا بند کر دیا، اور آہستہ سے پہلے ایک پاؤں اور پھر دوسرا رکھ کر نشست پکڑا ہوگیا۔ اوما نے پھر پڑھایا۔

طوطے نے اپنی گردن جھکاکر اوما کی طرف بڑھائی اور ایک آواز دی۔ اوما کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ جب وہ رادھا کرشن کہتی تب ہی وہ زور سے چلاتا۔ اوما کو محسوس ہونے لگا کہ طوطا دو چار روز میں بولنے لگے گا۔

(۳)

کچھ دن اسی طرح بیت گئے۔ رمن لال پر آج کل آفس کا کام زیادہ آ پڑا تھا۔ [illegible] اس وجہ سے وہ فائلوں کا انبار گھر پر لاتے [illegible] ہے۔ ایک دن کام کرتے کرتے انھیں نیند آگئی اور وہ اُسی جگہ لیٹ گئے...... فائلیں، کاغذات وغیرہ میز پر سب جیوں کے تیوں پڑے رہے۔ رات کے بارہ بجے کے قریب اوما طوطے کو لئے ہوئے وہاں آئی اور میز کے ٹھیک اوپر چھت سے لٹکتے ہوئے ہُک میں پنجرے کو ٹکایا جاتا تھا، اِس روز رمن لال نے بھی جب اپنی میز اسی جگہ جمالی تو اوما پنجرہ اُٹھاکر اندر لے گئی، اور جب اُس نے دیکھا کہ رمن لال سو گئے ہیں تو اُسے پھر اُسی جگہ کمرے میں میز پر ٹانگ گئی۔ کمرے کے اندر کوٹھے میں طوطے کا دم گھٹتا ہوگا، ایسا اُسے کچھ وہم سا ہوگیا تھا۔

رات کو کام ختم نہ ہوسکا تھا۔ اِس بے چینی میں رمن لال کی آنکھ بھی چار بجے ہی کھل گئی تھی۔ کام شروع کرنے کے لئے اُنھوں نے جو لیمپ جلایا تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ تمام کاغذات بھیگے ہوئے تھے۔ میز پنجرے کی دال سے پٹی ہوئی پڑی تھی۔ جگہ جگہ بیٹ فائلوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ اور دھبوں کا تو شمار ہی نہ تھا۔

آتش بار آنکھوں سے اُنھوں نے طوطے کی طرف دیکھا۔ شاید اُسے اِن کا اتنی جلدی اُٹھنا پسند نہ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں غنودگی تھی، روشنی کی وجہ سے وہ چندھیائی تھیں۔ رمن بابو دانت پیسنے لگے۔ ایک دفعہ دل میں آیا کہ پنجرہ باہر پھینک دیں...... دور تاکہ یہ طوطا اِسی میں لڑھک کر دم توڑ دے، اور اِس کی ٹر ٹر سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہوجائے۔ اُنھوں نے پنجرہ اُتارا اور زور سے زمین پر دے مارا۔ اوما دوڑی بھاگی آئی۔ اُس نے سمجھا بلّی نے شاید برتن گرا دئے ہیں، لیکن جب وہ کمرے میں آئی تو اُسے تمام حال معلوم ہوگیا۔ وہ کیا کہتی قصور تو اُس کا اپنا ہی تھا۔

رمن بابو نے کہا "اوما نہیں یہ معلوم تھا کہ میں یہاں کام کر رہا ہوں لیکن پھر بھی تم ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہ جانے کب پنجرہ یہاں ٹانگ گئیں۔ بتاؤ کاغذوں کو لے کر میں صاحب کے سامنے کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ پوچھیں گے جواب دوں گا۔ تمہیں معلوم نہیں یہ کتنے ضروری ہیں، اِن فائلوں کی کیا قیمت

اوما نے کہا "جب تمہیں معلوم تھا کہ طوطا روز یہاں ٹنگتا ہے تو بکھیڑے کو ذرا سمیٹ کر ہی سوتے۔ اندھیرے میں مجھے کیا معلوم تھا کہ میز پنجرے کے لٹکانے کی جگہ کے نیچے ہی رکھ کر سوؤ گے۔

رمن لال کہتے ہی جل گئے۔ "لیکن تمہیں اِس بات کا بھی ہوش رہنا چاہیئے پیٹ کی روٹیاں کہاں سے ملتی ہیں اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور طوطے کس بنیاد پر لے جاتے ہیں؟"

اوما نے آنکھیں نیچی کرلیں۔ پنجرہ اٹھاتی ہوئی بولی: "اچھا ہوا بھگوان نے تمہارے سے بے رحم آدمی کو کوئی بچہ نہیں دیا۔ اگر اُس کے ہاتھ سے تمہارا دلی کاغذ پھٹ جاتا تو شاید تم اُسے جان سے مار ڈالتے۔" اوما کی پلکوں میں ٹپ ٹپ دو آنسو گر پڑے اور وہ پنجرے کو لے کر پاؤں کو زمین پر دھمک سے رکھتی ہوئی چلی گئی۔

(۴)

اوما کی آخری بات رمن بابو کے دل میں درد سا پیدا کرگئی۔ آفس میں کام کرتے وقت بھی ٹیلیفون کی گھنٹی کی طرح رہ رہ کر اُن کے کانوں میں یہی گونجتا رہا: "اچھا ہوا بھگوان نے تمہارے سے بے رحم آدمی کو کوئی بچہ نہیں دیا۔" اوما کا کہنا ایک حد تک ٹھیک بھی تھا۔ لوگ باگ گھر گھر میں طوطے پالتے ہیں، جن کو سننے کے لئے کبھی کبھی راہ گیر تک ٹھٹک ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُن کے گھروں میں کیا روز ایسی ہی کچ کچ رہتی ہے۔ اگر نہیں تو ذرا سی بات کے لئے اتنا وائے ویلا اور شور کیوں ہوگیا۔ رمن بابو اپنی کمزوری سمجھتے تھے، وہ بہت جلد بھڑک جاتے تھے۔ ذرا سے جھٹکے سے اِن کا توازن درہم برہم ہو جاتا تھا، جب تک وہ ایک طرف سے فارغ نہیں ہو جاتے تھے دوسرے کام میں اُن کی طبیعت ہی نہیں لگتی تھی۔ ڈرافٹ کرتے کرتے اگر انھیں کسی لفظ کے املا کی صحت میں کچھ شبہ ہو جاتا تھا تو وہ قلم چھوڑ کر کاغذ سرکا کر ڈکشنری لے بیٹھتے تھے۔ کھانا کھاتے کھاتے اُن کا خیال اگر آفس کے کسی ضروری کاغذ پر چلا جاتا تو فوراً تھالی پر سے اُٹھ جاتے سوچتے کہیں کاغذ کو آفس میں ہی تو نہیں بھول آئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اُن کا محض واہمہ ہوتا تھا۔

طوطے کے خلاف بھی اُن میں ایک قسم کا جذبہ سا پیدا ہو گیا تھا۔ اب انھوں نے ارادہ کرلیا کہ وہ اِس جذبے کو دل سے نکال پھینکیں گے اور طوطے کو پیار کیا کریں گے۔ ایک پڑھے لکھے آدمی کو ادراک سے کام لینا چاہیئے ضد سے نہیں اور پھر اوما کی خوشنودی اور ناز برداری کے لئے بھی تو اُن کے دل میں گنجائش ہونی چاہیئے۔ کیا گھر میں اوما کی کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔

آفس سے جب وہ گھر پلٹے تو اوما گھر پر نہیں تھی۔ وہ پڑوس میں کسی کے یہاں گیتوں میں شامل ہونے چلی گئی تھی۔ رمن بابو نے پہلے ہاتھ منہ دھویا اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ کھانا کھایا۔ اِس کے بعد انھوں نے طوطے کی طرف رجوع کیا۔ دیکھا کٹوریاں خالی پڑی ہیں۔ نہ اُن میں پانی ہے نہ چوگا۔ گیتوں کے شوق میں اوما نے اِس طرف کچھ دھیان ہی نہیں دیا تھا، انھوں نے اپنی جیب میں سے ایک انار نکالا، جو کہ اِسی مطلب کے لئے خریدا گیا تھا، اِس کو چھیل کر اِس کا ایک ایک دانہ طوطے کی چونچ میں دینے لگے، طوطا ٹیڑھی چونچ کرکے دانوں کو کترتا ہوا کبھی کبھی دھیمی آواز میں چہک پڑتا تھا، اور کبھی دونوں پیروں سے پنجرے کی سیخوں کو پکڑ کر جھولتے جھولتے اپنی گردن باہر نکال دیتا۔ کیسا پیارا جانور ہے اِس سے خواہ مخواہ دشمنی باندھ کر انھیں بھلا کیا مل گیا۔ محبت کے جذبات سے بے قابو ہو کر انھوں نے اپنا ہاتھ پنجرے کے اندر ڈال دیا، لیکن اُن کی انگلی ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ طوطے نے اپنی چونچ سے اُسے مضبوطی سے داب لیا۔ رمن بابو نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اُسی وقت گھر کا دروازہ کھلا اور چپلوں کو چٹخاتی ہوئی، اوما اوپر آئی۔ دیکھا رمن بابو ایک ہاتھ سے انگلی پکڑے کھڑے ہیں۔ اور اس میں سے تیزی سے خون کی دھار بہہ رہی ہے۔ وہ سب سمجھ گئی۔ یہ بھی سمجھ گئی کہ اسی معاملے میں مزید پوچھ گچھ کرنا، جھگڑا مول لینا ہے، اس نے فوراً ایک کترن پھاڑی اور پانی میں بھگو کر رمن بابو کی انگلی پر باندھ دی، انھیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اوما پلک نیچے کئے کچھ کچھ مسکرا رہی ہے۔ انھوں نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور بولے "پہلے تم خوش ہو لو پیچھے پٹی بندھ جائے گی۔"

اوما خاموش رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسے آدمی کے ساتھ کیسے پیش آئے۔ کڑک کر بولی "کرتوت خود کر بیٹھتے ہو اور جھلاتے ہو دوسروں پر، جب طوطا تمہیں پھوٹی آنکھ بھاتا ہی نہیں تو اُسے چھیڑنے کی بھلا کیا ضرورت تھی، یہ لاکھ جانور ہوں، لیکن آدمی کی آنکھوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔"

رمن بابو اس کو سمجھاتے کہ وہ طوطے کو پیار کرنے [illegible] ایک فوری جذبہ تھا۔ محض بے وقوفی جس کا پھل انھیں فوراً مل گیا [illegible]

کی طرح اُن کے دل میں مخالفت کے جذبات پیدا ہوگئے ۔ اُنھوں نے ارادہ کرلیا۔ یاسں خطرناک ارادہ ۔ ۔ ۔ اِس گھر میں یا تو طوطا ہی رہے گا یا میں ہی رہوں گا۔

(۵)

موتی کی ماں کا اِس گھر میں اُٹھنا بیٹھنا یوں تو پہلے ہی سے تھا۔ پر جب سے ادما نے طوطا پالا تھا تب سے وہ اکثر آنے جانے لگی تھی ۔ دوسرے دن وہ دوپہر آتے ہی بولی "بہو تجھ سے ایک بات کہنے آئی ہوں"

"کیا"

"یہ طوطا تو پالا ہے تونے، لیکن اِس کی ہتیا کہیں اپنے سر پر نہ لینا"

"وہ کیسے"

"اِس طرح کہ بلّی کو طوطے سے خاص چڑ ہوتی ہے ، ذرا ابھی اکیلا چھوڑ دیا یا نگاہ چوک گئی تو اس کے ایک ایک پر بین کر پھینک دے گی ۔ ایسا کرنے میں اُسے بڑا مزا آتا ہے"

خوف سے ادما کی آنکھیں چُندھیا گئیں ، بولی "بوا جی ! آپ نے اچھا بتا دیا، کبھی کبھی یہاں ایک کالی بلّی چکّر کاٹنے آتی ہے، اُسے تو دیکھتے ہی میرا طوطا آدھا سوکھ جائے گا ۔ موئی کی آنکھیں مسان سی ہیں"

اِس کے بعد پچھلے دِن کے واقعہ کا ذِکر ہوا ۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں ۔ موتی کی ماں جب چلنے لگی تو ادما نے کہا "بوا جی اِسے پندرہ دن ہونے آئے لیکن ابھی یہ بولتا ہی نہیں ۔ یہ کیسا پہاڑی ہے ۔ ذرا تم اِسے پڑھا کر دیکھو، ممکن ہے میری آواز کو یہ نہ پکڑتا ہو" موتی کی ماں پنجرہ لے آئی ، ادما کے سامنے رکھ کر بولی "پڑھانا ذرا ۔ دیکھوں کس طرح پڑھاتی ہو"

ادما نے پہلے طوطے کو پچکارا اور پھر پڑھانے لگی "پڑھو ٹھو را دھا کشن ! ٹوپی کرشن"

ادما کی آواز پر طوطا کھڑا ہو گیا ، جیسے ہلنا جانتا ہی نہ تھا اور پھر آہستہ سے چونچ کھول کر اس نے پکارا "ادما کہاں ہو"

موتی کی ماں نے قہقہہ لگایا ۔ ادما نے اندرونی ہنسی کو ہونٹوں میں دبا کر طوطے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بدمعاش کہیں کا ! تو میرے لئے ایک اور.... پیدا ہو گیا"

اس دِن رات کو بارہ بجے کے قریب ادما کو کچھ ایسا وہم ہو گیا کہ گھر میں بلّی گھوم رہی ہے۔ بستر پر پڑے پڑے اس نے نگاہ دوڑائی ۔ اُسے بلّی دکھائی دینے لگی ۔ ادما نے چاہا اُسے مار بھگا دوں ، لیکن معلوم نہیں کوشش کرنے پر بھی وہ بستر سے نہ اُٹھ سکی ۔ اِسی وقت بلّی کی آنکھوں سے اس کی آنکھیں ملیں ، اُس کے جسم میں سر سے پاؤں تک ٹیس سی دوڑ گئی ، مشعل کی طرح وہ جل رہی تھیں ، ادما کے من میں یہ بھی آیا کہ اُنھیں جگالوں ۔ ۔ ۔ رتن بابو کی چارپائی قریب ہی بچھ رہی تھی ، لیکن اُس کی ہمت نہیں پڑی ۔ جب سے طوطے نے اُنھیں کاٹا تھا تب سے وہ خونخوار بن گئے تھے ۔ نہ اچھی طرح بولتے تھے ۔ نہ ڈھنگ سے کوئی کام کرتے تھے ۔ گھر میں آتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کو قتل کر کے آئے ہیں ادما نے خاموشی اختیار کر لی ۔ اور بستر پر لیٹے ہی لیٹے اندھیرے میں آنکھیں گڑا کر بلّی کی حرکتوں کو دیکھنے لگی ۔ اُس نے سوچا اگر تھوڑی دیر تک یوں ہی اِدھر اُدھر گھوم گھام کر باہر نکل آئے تو فضول شور و غُل مچانے کی کیا ضرورت ہے ، کچھ دیر تک بلّی برتن بھانڈوں کو سونگھتی رہی ، لیکن جب اُسے کچھ نہیں ملا تو شاید وہ جانے ہی والی تھی کہ اُس کی نگاہ طوطے پر پڑ گئی ۔ وہ جہاں تھی وہیں ٹھٹک کر بیٹھ گئی ۔ پنجرے کی دوری کا اندازہ لگانے کے لئے کبھی وہ اگلے پاؤں کو اُٹھاتی اور کبھی جھپٹنے کے لئے زمین سے اُٹھ اُٹھ کر رہ جاتی ۔ ادما کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا ، وہ کتنی ہی دفعہ اُسے مارنے کے لئے اُٹھی ، لیکن بستر پر کروٹ بدل بدل کر ہی رہ گئی ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بستر نے اُسے پکڑ لیا ہے۔

اِس دفعہ بلّی نے اپنا جسم سمیٹا ، کچھ پیچھے کی طرف سے اُٹھی اور پھر ایک ساتھ پنجرے پر جھپٹ پڑی ۔ ادما بڑے زور سے چیخ اُٹھی اور چیخنے کے ساتھ ہی اُس کی آنکھ بھی کھل گئی ، دیکھا تو پسینہ آ رہا ہے ۔ سانس زور زور سے چل رہی ہے ۔ رتن بابو کی بھی آنکھ کھل گئی ۔ اُنھوں نے جھنجلاتے ہوئے پوچھا "کیا ہے" موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ادما نے کہا "کچھ نہیں ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلّی آ گئی ہے ۔ ذرا اُٹھ کر دیکھ لو تو اچھا ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ طوطے کو تنگ کرے"

رتن بابو نے لیمپ جلا کر دیکھا تو نہ وہاں بلّی تھی نہ بلّی کا پتہ ۔ دانت پیستے ہوئے بولے "اب تک تو یہ طوطا دن میں ہی تنگ کرتا تھا اب اس کا

وجہ سے رات کو بھی نیند حرام ہوگئی۔۔۔۔" اوما" غصے سے اُن کی آواز کانپنے لگی، ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہوگئیں" اوما اب تک میں تم سے دبتا تھا، خوف یہ تھا کہ گھر کا سکون خراب ہو جائے گا۔ باہر کے لوگ ہنسیں گے۔ لیکن جتنا میں دبتا گیا اتنا ہی تم میری گردن دباتی گئیں۔ تم نے کبھی میرا لحاظ نہیں کیا۔ اور میں نے تمہاری ذرا ذرا سی باتوں کو برداشت کیا۔ اب نہیں سہا جاتا۔ میں بتلا دوں گا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے پیچھے گھر کس طرح برباد ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ ایک طوطے کے لئے دہلیاں کس طرح مٹ جاتی ہیں، جب میرے ہی دل کو چین نہیں ہے تو میں جیوں گا کس کے لئے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ نہ جیوں گا نہ جینے دوں گا"

وہ سو گئے، اُن کو "طلاق بل" کی خوبیاں روز روشن کی طرح دکھائی دینے لگیں۔ صبح جس وقت وہ اُٹھے تو اوما نے انوکھی بات محسوس کی، وہ کچھ کچھ خوش تھے اور آہستہ آہستہ کوئی غزل گا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے سر سے کوئی بوجھ اچانک اُتر گیا ہے۔ اوما ڈر گئی۔ ایسے آدمی کی خوشی بھی غیر فطری تھی، اس میں ایک اجنبی پن پایا جاتا تھا۔

(۴)

اوما کا ڈر سچا نکلا۔ شام کو جب رمن بابو آفس سے واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک رسّی تھی، جس کے سرے سے ایک موٹی بلی بندھی ہوئی تھی، بلی زمین پر پاؤں جما جما کر چلتی تھی اور اپنی گردن کو رسّی کے پھندے سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رمن بابو اُسے گھسیٹے لا رہے تھے، اوما نے ایک ہی نظر سے بھانپ لیا۔ یہ وہی کالی بلی تھی جس کا ذکر موتی کی ماں نے پہلے روز کیا تھا۔

رمن بابو نے آتے ہی پوچھا" دودھ آگیا ہے کیا؟"

" آتو گیا ہے، لیکن تمہارے ہی لئے ہے"

" میں جتنا پوچھوں اُتنا جواب دو۔ زیادہ بڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں ہے"

کہہ تو رہی ہوں۔ دودھ ہے! اور اگر نہ بھی ہو تو میرا خون تو ہے، پینے کو۔ تم نے مجھے دودھ پلا پلا کر اتنا موٹا جو کر دیا ہے، یہ خون اور کس کام آئے گا!"

طوطے کے پاس ہی رمن بابو نے بلی کو ایک لکڑی سے کس کر باندھ دیا۔

اور بولے،

" دیکھو ایک بار اچھی طرح سن لو، بلی کو میں نے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا ہے، تم چاہو تو خود آکر دیکھ سکتی ہو، اگر یہ کسی طرح چھوٹ گئی تو سمجھ لینا مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہے"

اوما نے اپنی ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھکر پوچھا۔ لیکن یہ جو گندگی پھیلائے گی اُس کا ذمہ دار کون ہوگا؟"

طوطے کی گندگی کا ذمہ دار کون ہے، وہی اس کا بھی ہوگا"

لیکن یہ بھی تو سنوں، اس کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی"

طوطے کی بھلا کیا ضرورت تھی، یہ تو اپنی اپنی پسند ہے، کیا لوگ باگ بلی نہیں پالتے ہیں"

اوما نے طوطے کی طرف دیکھا، بیچارہ ڈر کی وجہ سے پنجرے کی چھت سے جا چمٹا تھا۔ ایک لمبی سانس بھر کر اُس نے کہا۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تم مجھ سے یہاں تک دشمنی نبھاؤ گے۔

اوما رات بھر اسی ادھیڑ بن میں رہی کہ کیا کیا جائے، کبھی کبھی اُس کے جی میں یہ بھی آتا تھا کہ طوطے کو موتی کی ماں کے گھر پہنچا دے۔ لیکن جب اپنی آنکھ سے اُس کے اوجھل ہونے کا خیال آتا تو اُس کی چھاتی پھٹنے لگتی۔ اُس کی زندگی کس قدر پُرظلمت تھی۔ دھن نہیں، اولاد نہیں، جسے اپنی چھاتی سے لگا کر کچھ تسکین حاصل کر سکے، بیوی کا آخری سہارا خاوند۔۔۔۔۔ اُف۔۔۔۔ اُس کا یہ حال ہے، زندگی کے کچھ دن کاٹنے کے لئے اُس نے ایک طوطا پالا تھا تو اس کو بھی چھیننے کے لئے کتنے انتظام کئے جا رہے ہیں، جیسے وہ کوئی شیر ہے، چیتا ہے۔ میرے ساتھ اِس طوطے کی بھی قسمت پھوٹ گئی۔ نہ چھوڑتے بنتا ہے نہ پالتے۔ اور مرے کو موہ کتنا ہے آدمی سے بھی زیادہ۔ جب اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہوں تو کھاتا ہے اور اگر روٹھ گیا تو گھنٹوں منانا پڑتا ہے۔ اگر کبھی کسی سے باتیں کرتے کرتے اِس کو جواب دینا بھول گئی تو ایسا لڑے گا، ایسا لڑے گا کہ ٹائیں ٹائیں کر کے کان کھا جائے گا، ایسے اس کی ایک ایک بات ایک ایک کہانی ہے۔

اوما کے دل کا درد پھوٹ پھوٹ کر آنکھوں کے راستے باہر نکلنے

لگا اور اُس کی سسکیاں بند ہو گئیں۔ رمن بابو خراٹے لے لے کر سو رہے تھے اوما آہستہ سے چار پائی پر سے اُٹھی اور طوطے کے پاس جا بیٹھی۔ بلی کے ڈر سے وہ پنجرہ میں سکڑا ہوا پڑا تھا۔ نیند نہ جانے کہاں بھاگ گئی تھی۔ اوما کو دیکھتے ہی وہ پنکھ پھڑ پھڑا کر اُٹھ بیٹھا، اور اِس بات کا اظہار کرنے لگا جیسے وہ پنجرے میں نہیں رہنا چاہتا۔ باہر نکلنا چاہتا ہے اور اوما نے جونہی اُسے باہر نکالا وہ اُس کی گودی میں آ کر کپڑوں کی اندرونی تہوں کے اندر جا چھپا۔ اوما نے ساری رات اسی طرح طوطے کو گود میں لئے لئے کاٹ دی۔

(۷)

اوما نے چھاتی پر پتھر رکھ لیا تھا۔ جو کچھ ہو گا بھگت لوں گی، لیکن طوطے کا ایک بال بھی بیکا نہ ہونے دوں گی، اگر سیدھی طرح کہتے تو ممکن تھا کوئی راستہ نکل آتا۔ لیکن ضد سے مجھے چڑ ہے۔ بلی کو یہ گھر کے اندر لائے تو لائے کیسے؟

صبح ہوتے ہی اُس نے رمن بابو کا راستہ روکتے ہوئے کہا "کیوں جی تم اس بلی کو نہیں چھوڑو گے!"

رمن بابو ہنس پڑے بولے "اپنا کام کرو۔ ۔ ۔ ۔ کام"

اُمانے کہا "دیکھو میں سیدھی طرح کہتی ہوں اِسے چھوڑ دو فضیحتی میں کیا رکھا ہے"

رمن بابو نے کہا "میں نے ایک بار کہہ دیا۔ چلو ہٹو۔ راستہ چھوڑو"

اُما کی بھویں تن گئیں۔ کڑک کر بولی "تو نہیں چھوڑو گے"

رمن بابو نے کہا "نہیں! نہیں! نہیں!"

اُوما نے کہا "تو میں اِسے کھول دیتی ہوں تم مجھے پھانسی دے دینا"

اوما جونہی بلی کی طرف بڑھی، اسی وقت رمن نے چلا کر کہا "خبردار، جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔ نہیں تو اِسی وقت میں طوطے کی گردن مروڑ کر رکھ دوں گا"

اوما ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی پیشانی کو دیوار میں نکلے ہوئے پتھر پر دے مارا، ایک بار، دوسری بار، تیسری بار۔ رمن بابو کھڑے کھڑے دیکھ رہے تھے، وہ اُوما کو پکڑنا ہی چاہتے تھے کہ چوتھی بار اُس نے بڑے زور سے پھر اپنا سر پتھر پر مارا اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

دو گھنٹے بعد جب اُسے ہوش آیا تب اُس نے کہا "میرے بھائی کو بلا دو میں میکے جاؤں گی ۔۔۔ ابھی ابھی تار دیدو"

رمن بابو نے تار دیدیا۔ اس روز وہ دفتر نہیں گئے۔ اُوما کا میکہ دُور نہیں تھا، وہاں سے چار پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ شام کو بھائی کے ساتھ جب اوما جانے لگی تو رمن بابو نے کہا "اِس طوطے کو بھی ساتھ لیتی جاؤ، اِس ہتیا کی جڑ کو یہاں کس کے لئے چھوڑے جاتی ہو۔"

اُوما نے منع کرتے ہوئے کہا "اسے یہاں ہی چھوڑے جاتی ہوں میرے پیچھے بیٹھے بیٹھے تم اِس کی گردن مروڑا کرنا"

اوما چلی گئی۔ رمن بابو نے ہلکی سی سانس لی۔ تالا بند کر کے گھومنے کے لئے باہر نکل گئے۔

(۸)

گھوم کر جب وہ لوٹے تو اُنھیں ایسا معلوم ہوا جیسے گھر کسی رِشی کا آشرم ہو، اُن کا دِل پُرسکون تھا۔ من ایک دم شانت، موسم سرما کی ندی کی طرح، آلائش اور گندگی نیچے بیٹھ چکی تھی۔

وہ برآمدے میں ٹہلنے لگے، اُن کی حالت ایک مدہوش پرندے کی سی تھی۔ اُنھیں ایسا محسوس ہوا، جیسے تنہائی کے یہ لمحے اُنھیں کہیں سے اُدھار ملے ہیں۔ یہ کِس قدر پیارے تھے۔ اگر آج وہ حقیقت میں تنہا ہوتے تو کیا اُنھیں اس شامِ زندگی کے اوقات میں اِس طرح ہی ہاتھ پاؤں پٹخنے پڑتے ...... نہیں ..... وہ کسی پہاڑ کی گپھا میں گنگا کے کنارے نہایت فراغت اور بے پروائی سے اپنے دن کاٹتے ہوتے۔

ٹہلتے ٹہلتے اِسی قسم کے خیالات اُن کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِس دن کے واقعے سے طوطا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا ہے۔ جس دن وہ آیا تھا تب سے لے کر آج تک کے واقعات اُس کے لوحِ دل پر نقش تھے۔ میاں بیوی ہر دو کے لطیف ترین جذبات سے وہ باخبر تھا۔ رمن بابو نے اُس کی طرف دیکھا۔ رنج اور نفرت کی چنگاریاں اُس کی آنکھوں سے نکل رہی تھیں وہ ہنس دیے۔ اُنھوں نے طوطے کو کئی بار پچکارا، لیکن وہ نہیں بولا۔ اس کی زبان ہمیشہ کے لئے تالو سے لگ چکی تھی۔

کچھ ہی ہو وہ بولے یا نہ بولے۔ اُسے زندہ تو رکھنا ہی پڑے گا ...ادما کے پلٹنے تک۔ رمن بابو نے اُس کی کٹوریاں صاف کیں۔ دانہ پانی رکھا اور سونے سے قبل اُسے ایک محفوظ جگہ ٹانگ دیا جس کی وجہ سے گھر میں جھابجا رت ہوتا تھا جس کے ہٹانے کے لئے اُنھوں نے زمین، آسمان ایک کر دیا تھا، اس کے لیے اوما کی پیٹھ پھرتے ہی، دشمنی کے خیالات اُن کے دل میں کیوں جگہ نہ پاسکے، اس سوال کا جواب اُنھیں مل گیا۔ اُس وقت طوطا دشمن تھا، اب امانت ہے کس کی امانت......اُوما کی۔

عالمِ تنہائی میں اب صرف طوطا ہی اُن کا دوست تھا۔ دفتر سے آتے ہی وہ طوطے کی خبر لیتے۔ اور کام پیچھے کرتے۔ دوستوں کی ملاقات سے اور کتابوں سے جب طبیعت اُکتا جاتی تو وہ طوطے کو اُسی میز پر بٹھا کر اُس سے باتیں کرتے، سوتے وقت وہ پنجرے کو اپنے پاس سٹول پر رکھ لیتے، اور طوطے کی آنکھوں سے آنکھیں مِلا کر پوچھتے "کیوں رے کبھی اوما کی بھی یاد آتی ہے"

دفتر سے وہ چھٹی لے کر اب اکثر گھر میں ہی پڑے رہتے تھے۔ اُن کے جسم کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ہوٹل کی کچی پکی روٹیاں اور لال مرچ کے ساگ نے اُن کے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُوما اُنھیں ٹھیک مقدار کی غذا دیتی تھی۔ مگر ہوٹل میں اِس کا کچھ خیال نہیں تھا۔ اوما کی حالت بھی تسلی بخش نہ تھی۔ جب وہ یہاں سے گئی تو کتنے ہی امراض نے اُس پر قبضہ جما لیا تھا۔ رمن بابو سوچتے "پندرہ دن ہو گئے اس کی کوئی چٹھی نہیں آئی ہے معلوم نہیں کیا حال ہے"

ایک روز وہ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے پاس ہی طوطا بھی لٹک رہا تھا۔ حبس ہو رہا تھا۔ مغرب کی طرف کی برساتی ہوا پیاری معلوم ہو رہی تھی، اِس ہوا سے جب پنجرہ ہلتا تو طوطے کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ پنجرے میں کبھی وہ ناچتا۔ کبھی چاروں طرف چکر کاٹتا اور پھر اِس قدر شور مچاتا کہ کان بہرے ہو جاتے۔ رمن بابو اُس کی خوش ذوقیاں دیکھ رہے تھے، آج اُن کی طبیعت کچھ اچھی تھی۔ ایک دفعہ وہ بالکل پنجرے کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، اور مُسکرا کر بولے "کیوں رے آج کیا شیطانی سُوجھی ہے"

آواز سُنتے ہی طوطا ایک دم ٹھٹک کر چُپ ہو گیا، اُس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اُن کی طرف مخاطب ہوا اور پھر آہستہ سے بیٹھ کر کھڑا ہو گیا، کچھ دیر بعد اُس نے اپنی چونچ سلاخوں کے باہر نکالی اور بولا "اُدما کہاں ہو"

رمن بابو کے مُنھ سے اچانک نکل گیا "ایں۔ اوما" جیسے وہ کسی سے باتیں کر رہے ہوں۔ دوسرے ہی لمحے میں اُن کی تمام مسکراہٹ، جوش نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اُنھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی اور دیوار کا سہارا لیکر رنج و فکر کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔

آج سے بیس دن پہلے وہ طوطے کو اسی طرح پیار کرنے چلے تھے اور اُس نے اُن کی اُنگلی کاٹ لی تھی، اُس وقت اوما نے اُن کی اُنگلی پر پٹی باندھی تھی آج جب اُس نے اُوما کو ہی تیر بنا کر اُن پر نشانہ لگایا ہے تو اس پر مرہم کون رکھے گا۔

〰〰〰〰〰〰

رمن کے جذبات کو سمجھنے کی اُسے ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تھا بھی محض پرندہ اس دن کے بعد "اوما کہاں ہو" کی اُس نے رَٹ لگا دی، وہ پاگل سا ہو گیا۔ وہ جیسے ہی رمن بابو کی صورت دیکھتا فوراً چلّا اٹھتا "اوما کہاں ہو۔ اوما کہاں ہو"

طوطا جب اوما کو پکارتا تو اس کی ہر ایک پکار رمن بابو کے دل پر ایک ہتھوڑے کی سی ضرب لگاتی۔ وہ بیکل ہو اٹھتے۔ کبھی کبھی اُن کے جی میں آتا کہ وہ بھی طوطے کی سُر میں سُر ملا کر اُس کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائیں "اوما کہاں ہو" طوطا اِس ایک بات کو کبھی ناخوشی کے لہجے میں، کبھی رنجیدگی کے لہجے میں، کبھی بچوں کی طرح رو کر کبھی آہستگی سے کبھی زور سے اپنی چونچ ٹیڑھی کر کے کہتا۔ رمن بابو کے پاس اِس کا کیا جواب تھا۔ جو الفاظ وہ دن میں معمولی طریقے سے بیسیوں دفعہ بولتے تھے، آج اُسی لفظ کو سُن سُن کر کانپ جاتے تھے، کبھی پتھر کی مورتی کی طرح جہاں کے تہاں کھڑے ہو جاتے تھے اور کبھی دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے سسکیاں بھرنے لگتے تھے۔

ایک دن موتی کی ماں سے اُنھوں نے پُوچھا "تم سے کچھ آنے کی بابت کہہ گئی ہیں کیا؟"

موتی کی ماں نے جواب دیا "کہہ گئی ہیں جیوں گی تب تک اس گھر میں

تو میں نہیں رکھوں گی"

رمن بابو کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پھانسی کی سزا سنا رہا ہو۔ آگ کی لپٹ کی طرح اُن کے منہ سے اچانک نکل پڑا "اُف" اُسی وقت طوطے نے چیخ کر پکارا "اوما کہاں ہو"

موتی کی ماں نے کہا "طوطا بہت یاد کرتا ہے، اسے واپس کیوں نہیں پہنچا دیتے۔

رمن بابو نے کہا "ہاں کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں، کل میں ہی اسے لیکر جاؤں گا، دو پہر کو ایک بجے کی گاڑی سے"

دوسرے روز اُنھوں نے سب تیاری کرلی۔ دفتر سے اُنھیں دو دن کی چھٹی بھی مل گئی، ہوٹل سے کھانا کھا کر لوٹ آنے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک اُنھوں نے زبردستی آرام کیا، جب وہ اُٹھے تو اُنھیں خیال کہ طوطے کو یہیں چگا دیا جائے تو اچھا ہے۔ چار گھنٹے کا سفر ہے، کچھ کھلا نہ پلا راستے میں!

اندر سے اُنھوں نے کچھ مٹھائی نکالی اور طوطے کے سامنے رکھ کر دیکھنے لگے کہ کھاتا ہے یا نہیں۔ طوطے نے چونچ سے مٹھائی اُٹھائی اور اُسے کتر کتر کر باہر پھینک دیا، اور پھر سر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ رمن بابو نے دو چار انگور اُسے دئے وہ بھی اُس نے نہیں کھائے، اُنھوں نے سوچا ابھی بھوک نہیں ہے پھر دیکھا جائیگا۔

کچھ دیر بعد اُنھیں ایسا معلوم ہوا جیسے پنجرے کو کوئی کھڑکھڑا رہا ہے، دیکھنے پر معلوم ہوا کہ طوطا سیخچوں میں چونچ ڈال ڈال کر اُن میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے کبھی وہ الٹا ہوتا ہے اور پھر لٹکتی ہوئی رسی کی طرح بل کھاتا ہوا اینٹھا جاتا ہے۔ جیسے اُس کی گردن مروڑ کر کوئی جان نکال رہا ہو، وہ کندھے کندھے تک باہر نکل آتا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اِن آہنی سلاخوں کو توڑ ڈالے گا، چیر ڈالے گا، اس کے بعد وہ تھک سا جاتا اور خالی نگاہ سے رمن بابو کی طرف دیکھتا، ایک لمحے کے بعد اس پر وہی نزع کی سی حالت طاری ہو جاتی۔ رمن بابو حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور اُدھر طوطا۔۔۔۔۔۔۔، طوطے کی یہ حالت تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر چند منٹ تک اس کی ایسی ہی حالت رہی تو وہ جان دیدے گا۔

کوئی علاج نہ دیکھکر آخر کار رمن بابو نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا سوچا زیادہ سے زیادہ اُڑ جائے گا۔ اگر اس نے یہیں پران دے دئے تو اوما کے لئے ہمیشہ کا یہ شکوہ ہو جائے گا کہ میرے پیچھے تم نے میرے طوطے کو مار ڈالا۔

دروازے کے کھلتے ہی طوطا تیر کی طرح پنجرے سے نکلا اور برآمدے کی چھت پر جا بیٹھا۔ رمن بابو چپ چاپ بیٹھے دیکھتے رہے۔ ڈرتے تھے کہ پکڑنے کی کوشش کریں گے تو اُڑ جائے گا۔ دس پندرہ سیکنڈ تک بیٹھے رہنے کے بعد طوطے نے ایک بار مکان کے فرش پر نگاہ ڈالی اور پھر اپنی تمام طاقت جمع کرکے زور سے چلّایا "اوما کہاں ہو" رمن بابو سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھے۔ ایک عجیب وغریب خوف نے اُن کو جکڑ لیا۔ اُن کی یادداشت غائب ہو گئی۔ اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُسی وقت طوطے نے اپنے پنکھ پھڑ پھڑائے، اور اُڑ گیا۔۔۔۔ چیختا ہوا "اوما کہاں ہو۔۔۔۔۔۔۔ اوما کہاں ہو۔۔۔۔۔۔ کہاں ہو۔۔۔۔۔۔۔ کہاں ہو۔۔۔۔۔۔"

آسمان کو چیرتی ہوئی، پہاڑی سے ٹکراتی ہوئی اُس کی وہ آواز چاروں طرف سے ٹکرا کر رمن بابو کے دماغ پر ضربیں لگاتی تھی، اُنھوں نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔

(۹)

پانچ منٹ بعد اُنھیں ہوش آیا، دیکھا گھڑی میں بارہ بجکر پانچ منٹ ہوئے ہیں۔ گاڑی چھوٹنے میں ابھی گھنٹہ بھر کی دیر تھی، لیکن اُنھیں صبر کہاں تھا، اُنھوں نے خالی پنجرے کو اُٹھایا اور پاگلوں کی طرح اسٹیشن کی طرف پیدل دوڑے۔

سسرال پہنچے، سالے اور بچے اُن کے پہنچنے پر اُن سے لپٹ جاتے تھے، آج وہاں کوئی نہ تھا، مکان پڑا تھا۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ باہر کی بیٹھک کھُلی تھی۔ مگر بالکل سونی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے مکان کو چھوڑ کر سب لوگ بھاگ گئے ہوں۔ بیٹھک میں جا کر وہ بیٹھ گئے، نہیں بیٹھے کہاں، بیٹھنا چاہتے ہی تھے کہ اُن کے خُسر وہاں آگئے، رمن بابو کو دیکھتے ہی پہلے تو وہ ذرا چونکے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"ایں، کیا ہوا، آپ روتے کیوں ہیں" رمن بابو نے پوچھا، اور

جواب کا انتظار کئے بغیر، دوسرے لمحے میں وہ مکان کے اندر گھس گئے، وہاں جا کر انھوں نے دیکھا۔ پھولنس کے بچھونے پر اوما کا بے جان جسم پڑا ہوا ہے، مرد عورتیں اُسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں۔

رمن بابو کو دیکھتے ہی سب لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے اور اُن کے لئے جگہ کر دی۔ اُن کے ہاتھ سے پنجرہ چھوٹ گیا اور لڑھکتا ہوا اوما کے مردہ جسم کے پاس جا کر رُک گیا۔ رمن بابو پچھاڑ کھا کر وہیں گر پڑے۔

~~~

دوسرے روز خُسر صاحب سے اُنھیں معلوم ہوا کہ اوما کی روح اس قفسِ عنصری کو توڑ کر ٹھیک دوپہر کو بارہ بجے پرواز کر گئی تھی، جب سے وہ آئی تھی تب ہی سے اُسے ہسٹریا کے دورے شروع ہو گئے تھے، تھوڑے ہی دنوں میں وہ از حد کمزور ہو گئی، لیکن کسی کو یہ اُمید نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی چل بسے گی۔

~~~

رمن بابو اب بھی کلرک ہیں۔ جب کسی نئے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے وہ اپنی کہانی ضرور سناتے ہیں، اور آخر میں پوچھتے ہیں کہ ٹھیک بارہ بجے اوما کی جان نکلنے اور طوطے کے اُڑنے کے کیا معنی ہیں۔

ترجمہ

~~~

گفتار و کردار

تھی تماشا گاہ میں کل رات گُل چینوں کی بھیڑ — پردے پر رنگینیٔ منظر سے پھُولا تھا چمن
شب کی ظلمت میں اداکاری کے خنجر کی چمک — شرقیوں کا کارواں، تہذیبِ غربی راہزن
وقفے کے آغاز پر جب دُور تاریکی ہوئی — ہم نشینوں سے تماشائی ہوئے گرمِ سخن
ماسٹر صاحب سے اُن کے اک شناسا نے کہا — "آپ کی آتش مقالی سے فروزاں انجمن
آج کی تقریر کے مدّاح سارے شہر میں — نیک و بد، پیر و جواں، شیخ و برہمن، مرد و زن
ہم نے اتنا تو سُنا، تھی وہ مُدلّل اور فصیح — آپ سے یہ پُوچھنا ہے، کیا تھا موضوعِ سخن"
کر کے خم گردن کو پھیرا پہلے پیشانی پہ ہاتھ — پھر یہ فرمایا "تماشوں کے مُضرّات و فتن"
سُن رہا تھا اُن کا اک شاگرد بھی یہ گفتگو! — آگیا نوکِ زباں پر، دل کا آخر سُوءِ ظن
یوں مخاطب ہو کے بولا ایک ہم مکتب سے وہ — "زندگی تاریک ہے، تابندہ ہے گو شمعِ فن
وعظ کہنا صبح کو، شب کو تماشا دیکھنا
مُنکرِ مے بُودن و ہم رنگِ مستاں زیستن

رزمی صدیقی
~~~

اقبال اور ثاقب

مادرِ مُشفقہ کی یاد میں

عطاء اللہ۔ پالوی

کالم کے قلمی معاون جناب عطاء اللہ صاحب پالوی کے اس مضمون میں اقبال اور ثاقب کے اشعار پر جو لفظی یا فنی اعتراضات ہیں، اُن سے سردست قطع نظر کرتے ہوئے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فاضل مقالہ نگار نے ثاقب صاحب پر جو معنوی اعتراضات کئے ہیں مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ اظہارِ غم میں اعتدال کو فطری اور شدّت غم میں نالۂ بے اختیار کو تصنع فرماتے ہیں، جو کم سے کم میرے نزدیک درست نہیں۔ اس لئے کہ ع ———— ہر کوئی درماندگی میں نالے سے مجبور ہے۔

ذرا اُس وقت کا تصور کیجئے کہ کسی عزیز کا جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے اور آخری دیدار کے واسطے مُنہ سے کفن سرکایا جارہا ہے۔ اُس موقع پر شدت بے اختیار آہ نکلے گی یا آدمی نہایت سنجیدگی کے ساتھ موت کا فلسفہ سمجھانے لگے گا! اقبال اور ثاقب کی نظموں پر شاعرانہ خوبیوں اور اعلیٰ طرزِ بیان کے لحاظ سے رائے ظاہر کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ اس قدر ضرور کہوں گا کہ جہاں تک فطرتِ انسان کا تعلق ہے جنازہ دل کے دھڑکنے کا مطالبہ کرتا ہے نہ کہ دماغ کی حرکت کا، لاش آنسو چاہتی ہے نہ کہ حکیمانہ الفاظ۔ اقبال نے لاش کے سامنے فلسفیانہ خطبہ دیا ہے اور ثاقب نے آنسو بہائے ہیں۔ اب یہ فیصلہ آپ پر ہے کہ دونوں میں کون فطری ہے اور کون غیر فطری۔

شاعری نام ہے اظہارِ جذبات، یا اُس طرزِ بیان کا جو جذبات کو برانگیختہ کردے۔ جناب جوشؔ نے فرمایا ہے کہ شعر میں اس قدر اثر ہے کہ :-

آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب　　پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب
خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں　　قبروں سے سر کو پیٹ کے مُردے نکل پڑیں

ہوسکتا ہے کہ یہ تعریف مع مبالغہ سمجھی جائے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایسے الفاظ جو خون میں ہیجانی کیفیت اور گرمی پیدا کردیں "شعر" کہے جائیں گے اور اسی کا نام شاعری ہے۔ اور شاعر نام ہے اُس شخص کا جو جذبات کو ردیف و قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ اس طرح پیش کرے کہ سننے والوں کے دل میں تیر و نشتر بن کر اُتر جائیں۔ چنانچہ جب ایک حقیقی اور فطری شاعر کسی ہنگامی واقعے سے متاثر ہوتا ہے تو اُس کے خون میں گرمی پیدا ہوجاتی ہے اور پھر اُس کے جذبات بحر و وزن سے مُرتب ہوکر شعر کی صورت میں اُس کی زبان سے نکلنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اِس میں اس کی تخصیص ہرگز نہیں کہ وہ جذبات طربیہ ہوں یا حُزنیہ۔ جیسے واقعات ہوں گے ویسے ہی جذبات کا مدّوجزر ہوگا۔ اور اُسی نوع کے اشعار نکلیں گے۔

اقبال نے اپنی مادرِ مُشفقہ کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہوکر "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی جو "بانگِ درا" میں

شائع ہو چکی ہے اور ملک کے چند ہی افراد ایسے ہوں گے جن کی نظر سے یہ نظم نہ گزری ہوگی۔ اسی عنوان کے تحت اور اسی طرح کے حادثۂ جانکاہ سے متاثر ہو کر جناب ابو محمد ثاقب کانپوری نے بھی ایک نظم لکھی ہے۔ ثاقب صاحب کوئی غیر معروف اور نومشق شاعر نہیں، آپ دنیائے شاعری میں کافی شہرت کے مالک ہیں۔

اس موضوع پر جناب ثاقب کی نظم بھی کامیاب ہے، اور جن جذبات و اثرات کی حامل و مضامین ہے اہلِ بصیرت سے مخفی اور مستور نہیں۔ مگر میں آج کی صحبت میں یہ دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہوں کہ جب ایک ہی عنوان پر دو ماہرینِ فن نے طبع آزمائی کی تو کس نے کیا بات پیدا کی؟ کون کس قدر اور کس کس جگہ تحسین و آفرین کا مستحق ہے؟ اور کس کے کلام میں کیا عیوب و محاسن ہیں، اور وہ کس حد تک محلِ نظر ہیں؟ اس سے کسی کی تضحیک و تنقیص یا حمایت مقصود نہیں، بلکہ اظہارِ حقیقت مدِ نظر ہے۔

~~~~~~~~~~

سب سے پہلے ابتدائی مضمون میں فلسفۂ موت کے متعلق دونوں شعراء کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ جناب ثاقب ایک جگہ موت کی گتھیاں سلجھانے سے قاصر اور معذور رہ کر فرماتے ہیں۔

موت کیا ہے؟ یہ سمجھنے سے بشر مجبور ہے
پردہ ہائے راز میں یہ راز بھی مستور ہے
موت کیا ہے؟ عقل اس ادراک سے مجبور ہے
موت کیا ہے؟ علم ہی اس علم سے معذور ہے
موت کی گتھی نہ سلجھی عقل ہرزہ کار سے
چل رہی ہے ویسی ہی یہ بیش و کم رفتار سے

اقبال اس جگہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ اس کو سلجھاتے ہیں، کہتے ہیں۔

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

آگے چل کر جناب ثاقب پھر موت کی گتھی کو سلجھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

موت کیا ہے؟ زندگی کی کاوشوں کا اختتام — موت کیا ہے؟ اک حیاتِ تازہ کا گویا پیام
موت کیا ہے؟ ارتفاعِ روح کا اک نام ہے — زیست کا انجام صبحِ زندگی کی شام ہے
موت وہ ہے جس سے قائم ہے نظامِ کائنات — موت روحِ مضمحل کے حق میں اک تازہ حیات
موت کیا ہے؟ تلخیٔ ایام کا شیریں ثمر — موت کیا ہے ایک میٹھی نیند کا دلکش اثر

بلاشبہ اک اک مصرعہ نہایت خوب ہے، اور موت کی گتھیاں ایک حد تک سلجھی بھی ہیں۔ مگر مضمون طویل ہو گیا، حالانکہ کمالِ شاعری بڑے سے بڑے خیالات اور بڑے سے بڑے مضامین کو محض کم الفاظ میں ادا کرنا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہئے کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا، در اصل شاعر کی معراج ہے، جن خیالات کو جنابِ ثاقب نے چار شعر میں کہا ہے، اقبال نے ایک شعر میں ادا کیا ہے، فرماتے ہیں۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے — خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

اقبال کا پہلا مصرع ثاقب کے اول الذکر دونوں اشعار کی معنویت کا حامل ہے، اور دوسرا مصرع آخر الذکر دونوں اشعار کی ترجمانی کرتا ہے۔

حکمت نے بھی موت و حیات سے متعلق ایک شعر کہا ہے جو بہت مشہور ہے، اور اس میں انھوں نے فلسفۂ موت و حیات کا طویل و لاینحل مسئلہ جس حد تک حل کیا ہے، لائقِ صد ستائش ہے، فرماتے ہیں۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

مگر اس میں بھی وہ بات نہیں جو اقبال کے شعر میں ہے، کیونکہ اقبال موت کو ایک نئی روحانی زندگی بتاتے ہیں جو موت کے بعد شروع ہوتی ہے، اور جنابِ حکمت جسدِ خاکی کو مع روح اسی دنیا میں دفن کر دیتے ہیں اور موت و حیات کو صرف ترتیبِ اجزا بتاتے ہیں، برخلاف اس کے جگر مرادآبادی نے ایک حد تک اچھا شعر کہا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگر
زندگی ہے خواب اجل تعبیرِ خواب

اس شعر اور اقبال کے شعر میں کیا مناسبت ہے، یہ نہ تو کھول کھول
~~~~~~~~~~

کر بتانے کی ضرورت ہے، اور نہ اس کا موقع ہی ہے۔

〰〰〰〰〰

جناب ثاقب اپنی مادرِ شفیقہ کے سانحۂ ارتحال کو ایک نئی اور اپنے لئے مخصوص مصیبت تصور کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چاندنی کی ضوفشانی، چاندنی کے ساتھ ساتھ　　اور تاروں کا تبسم دلکشی کے ساتھ ساتھ
روز روشن شب کی تاریکی سے ہم آغوش ہو　　قطرہ قطرہ بحر سے مل کر سراپا جوش ہو
نکہتِ گل ہو چمن کی وسعتوں میں عطر بیز　　ہوں شعاعیں سطح پر دریا کی آکر عکس ریز
شمع کو نسبت ہو جلنے میں پروانوں کے ساتھ　　بادۂ پُرجوش وابستہ ہو پیمانوں کے ساتھ
ہاں فقط دنیا میں محروم تمنا میں ہوں　　اس فلک کے سائے میں برگشتہ قسمت میں ہوں

ماں کی جدائی اور وہ بھی دائمی، بلاشبہ بجد دردناک اور غم آگیں ہے، لیکن یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں، ساری دنیا کا اسی چلن پر مدار ہے، اس لئے قرآنی آیت كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کو پیشِ نظر رکھ کر ماں کی موت پر اس انداز میں نوحہ کرنا مستحسن نہیں۔ اقبال کا نوحہ اس عیب سے پاک ہے وہ موت کو عام اور برحق سمجھتے ہیں، اور فرماتے ہیں۔

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر　　آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت　　گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں　　کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت　　دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں　　ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں

کہتے ہیں کہ موت برحق ہے اور ہر شخص کے لئے ہے، اس دارِ فانی کا کوئی فرد، اس کی کوئی شے اور اس کی کوئی چیز فنا ہونے سے بچ نہیں سکتی، چاہے وہ کہیں ہو، کہیں جا کر پناہ لے اور کسی طرح کی تدبیر کرے، یہ خدائی قانون اپنی جگہ اٹل ہے۔ اور اس جگہ انسان بالکل مجبور ہے۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے　　پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں　　انجمِ سیماب پا رفتار بھی مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں　　سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں
نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر　　ہے اسی زنجیرِ عالمگیر میں ہر شے اسیر

اقبال موت کو برحق اور ناقابلِ رستگاری سمجھتے ہوئے کتنے خوبصورت الفاظ میں صبر و سکون کی تلقین کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے　　زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے
قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں　　اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں
آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں　　خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

بلاشبہ یہ تین شعر سکون و طمانیت کے لئے کافی ہیں اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ "مجبوری کا نام شکر ہے"؛ مگر مصرع آخر میں ایک بات کھٹکتی ہے، اقبال نے لکھا ہے کہ سیلِ اشک "دل" میں خشک ہو جاتا ہے، حالانکہ "اشک" کو "دل" سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ صرف "آنکھ" سے تعلق ہے۔ چنانچہ خود ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

سر پہ آ جاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں

پھر ایسی صورت میں اقبال کا مصرعۂ آخر کس حد تک صحیح ہے، یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

〰〰〰〰〰

بالعموم سانحۂ ارتحال اور بالخصوص مادرِ مہربان کی دائمی مفارقت جانستاں معلوم ہوتی ہے۔ مگر اظہارِ غم میں اعتدال ضروری ہے۔ ورنہ غم بجائے حقیقی غم کے مجازی اور تصنع معلوم ہوگا۔ جنابِ ثاقب اظہارِ غم میں ذیل کے اشعار نظم کرتے وقت حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نظم میں تصنع کا دخل ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سوچتا ہوں اس فضا میں واقعاتِ زندگی　　کس قدر رکھتی شعلہ بر پا کائناتِ زندگی
میں وہی ہوں گھر وہی ہے اُس کے بام و در وہی　　ہے وہی نقشہ جہاں کا اور وہ منظر وہی
ہاں مگر دنیا کو اب بدلا ہوا پاتا ہوں میں　　اُس کی ہر اک دلکشی سے آج گھبراتا ہوں میں
جی نہیں لگتا ہے اس دُنیائے غم آباد میں　　ہو مسرت پھر کہاں سے عالمِ برباد میں
بن گئی ہے موجبِ غم اس کی ہر اک دلکشی　　"ماں" نہیں ہے اب تو بے کیف ساری زندگی

آخر الذکر دونوں اشعار میں مبالغہ کا عنصر بغائت موجود ہے، بلاشبہ اپنے عزیزوں کی موت کا غم ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ مگر دنیاوی طریقہ اور

اصول یہی ہے، اس لئے انسان وقتی طور پر سب کچھ کرتا ہے، لیکن بتدریج اُس کا اثر زائل ہوتا جاتا ہے اور پھر وہی شخص جو غم کی تازگی کے وقت جان کھو دینے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کی رنگینیوں میں مشغول اور منہمک ہو کر سب کچھ بھول بسر جاتا ہے۔ جنابِ ثاقب کا یہ لکھنا کہ "اب ساری زندگی بے کیف ہے" مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔

اقبال بھی اظہارِ غم کرتے ہیں، لیکن دامنِ صبر کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے مگر قبل اس کے کہ میں اقبال کے اشعار نقل کروں، جنابِ ثاقب کے مندرجۂ بالا اشعار کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

پہلے شعر میں "واقعاتِ زندگی" کے لئے "سوچتا ہوں" لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں، "واقعات" کے لئے "سوچنا" ادا نہیں لکھتے۔ اس کے لئے ہونا، دیکھنا البتہ لکھا جاتا ہے۔

دوسرے شعر کے مصرعِ آخر میں "اور وہ منظر وہی" لکھا گیا ہے، اس میں "وہ منظر" کا اشارہ کس طرف ہے؟ یہ پتہ نہیں چلتا دوسرے "وہ" اور "وہی" ہم معنی لفظ ہیں، اس لئے ان دونوں کا ایک جگہ استعمال بُرا معلوم ہوتا ہے، یہاں پر "وہ" کے بجائے "ہے" ہوتا تو شاید زیادہ بہتر ہوتا۔

تیسرے شعر میں "دنیا" کو مذکر (بدلا ہوا) لکھا گیا ہے، حالانکہ "دنیا" بالاتفاق "مؤنث" ہے اور خود جنابِ ثاقب نے بھی اس شعر کے مصرعِ آخر میں "اس کی" لکھ کر میرے بیان کی تصدیق کی ہے۔

بہرکیف یہ عیوب اس وجہ سے قابلِ خیال نہیں کہ جنابِ ثاقب نے وفورِ غم کی حالت میں یہ اشعار موزوں کئے ہیں، اور ایسے موقع پر سارے نکات و محاسن پر خیال رکھنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ تاہم جب بغرضِ اشاعت ساقی کو یہ نظم بھیجی گئی تھی تو اس پر نظرِ ثانی کر لینا ضرور تھا۔

اب اس موضوع پر اقبال کے اشعار ملاحظہ ہوں، جس میں نہ صرف مبالغہ سے اجتناب کیا گیا ہے، بلکہ اس میں صبر و سکون کا بے مثال سبق دیا گیا ہے، فرماتے ہیں۔

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں
جانتا ہوں آہ میں آلامِ انسانی کا راز ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا راز
میرے لب پر قصۂ نیرنگیٔ دوراں نہیں دل مرا حیراں نہیں خنداں نہیں گریاں نہیں
پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے آہ یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے
موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن مرا
سر پہ آ جاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالۂ و فریاد سے خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے
آدمی تابِ شکیبائی سے گو محروم ہے اس کی فطرت میں یہ اک احساسِ نامعلوم ہے
قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں نغمہ رہ جاتا ہے لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

سبحان اللہ، کس قدر حکیمانہ اقوال ہیں اور کس قدر مؤثر الفاظ میں سکون و طمانیت کا سبق دیا گیا ہے، وقتی طور پر حادثۂ ارتحال پر دل کے ٹکڑے ہو جانا عین فطرت ہے، لیکن تدریجاً طبیعت کا مائل بہ سکون ہونا بھی ضروری ہے، اگر ایسا نہ ہو تو پھر وفورِ غم سے کلیجہ پانی ہو جائے اور قبل از وقت اس کا کام تمام ہو جائے۔

جناب اقبال نے پانچویں شعر میں "آنسو" کے بجائے "آب آورد" لکھا ہے جو محلِ نظر ہے۔ "آنسو" اک فطری چیز ہے۔ غم کے موقع پر آنکھ سے سیلابِ اشک رواں ہو جانا عین فطرت ہے۔ کوئی بھی زبردستی آنسو کبھی نہیں نکالتا، بلکہ آنسو خود نکل آتا ہے۔ بقول امین حزیں۔ ؏

شدتِ غم میں ٹپک پڑتے ہیں آنسو خود ہی

پھر ایسی صورت میں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ "آنسو" کے لئے "آب آورد" کی ترکیب کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔

جنابِ ثاقب کی نظم میں ہر جگہ اتنی بیتابی پائی جاتی ہے اور صبر و استقلال کا اس درجہ فقدان نظر آتا ہے کہ مبالغے کی جھلک آ جاتی ہے۔ جنابِ ثاقب نے مادرِ مشفقہ کی یاد میں جو اشعار موزوں کئے ہیں اور جن کا خطاب روح کی طرف ہے، ان عیوب سے پُر ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

آہ جب آتا ہوں گھر میں اور تجھے پاتا نہیں کس قدر بیتاب ہوتا ہے دلِ اندوہگیں
گھر کے آنے اور جانے میں مسرت اب کہاں تھا جو مخزن راحتوں کا اس میں راحت اب کہاں
دیکھتا ہوں تیری ہر اک چیز کو عبرت سے میں اپنی آنکھوں سے لگاتا ہوں اُسے الفت سے میں

جب کبھی دنیا کے ہنگاموں سے گھبراتا ہوں میں
تیرے مرقد پہ پئے سجدہ چلا آتا ہوں میں

اور رکھ دیتا ہوں پیشانی لحد کی خاک پر
ہوتا ہوں اس وقت گویا رفعتِ افلاک پر

باسشیہ طبیعت کی ہیجانی سب کچھ کرانے پر مجبور کرتی ہے۔ مگر یہ کہنا کہ "ہر ایک چیز کو آنکھوں سے لگاتا ہوں" مبالغہ نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر صبر و استقلال بھی کوئی چیز ہے؟ شاعر میں جہاں یہ خوبی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے الفاظ و بیان سے سینہ میں آگ لگا دے وہاں یہ بھی ہونا چاہیئے کہ اپنے رحمت پاش نغموں سے اُسے بُجھائے بھی۔ شاعر کا کام اگر یہ ہے کہ وہ اپنے پُر درد اور پُر زور چیخوں سے سینہ میں ناسور ڈال دے تو اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ سکون و طمانیت اور صبر و استقلال کا مرہم بھی لگائے۔ اس کو نظر انداز کیجئے اور آگے چلیئے۔ ایک مسلمان کا وفورِ غم سے ہی سہی "ماں کی قبر پر سجدہ کرنا" اور وہ بھی ایک دو روز انتہائے غم و یاس کے عالم میں نہیں، بلکہ "جب کبھی دل گھبرایا" کسی حالت میں مستحسن نہیں کہا جا سکتا، اور ایسا لکھنا سراسر دُور از حقیقت اور بعید از قیاس ہے، برخلاف اس کے اقبال کی نظم اس عیب سے منزہ اور پاک ہے۔ وہ جہاں بیتابی کا اظہار کرتے ہیں وہاں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے، اور کسی جگہ ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے جو مبالغہ آمیز معلوم ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

کس کو ہوگا اب وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لیکر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟

کوئی غیر فطری بات نہیں، بلکہ بالکل روزمرّہ ہے۔ مگر اس پر بھی خود صبر کی تلقین کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

رخصتِ ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ یہ ضبطِ فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دلاسائی، فراموشی نہیں

شاعر کی ہرگز یہ خوبی نہیں کہ اگر رُلا دیا تو خاموش نہیں کرا سکتا، یا اگر خاموش ہے تو رُلا نہیں سکتا۔ شاعر کو ہر ایک چیز پر قادر ہونا چاہیئے۔ اگر ایک جگہ اس کے الفاظ و بیان، خیالات و احساسات مسحور کن اور قیامت خیز ہیں تو دوسری جگہ کلماتِ سکون و طمانیت بھی اس کی زبان سے ادا ہونے چاہئیں۔ اقبال کی نظم یا اُن کے مندرجہ بالا اشعار اس معیار پر ہر نوع پورے اُترتے ہیں۔

عہدِ طفلی کی یاد اور مادرِ مرحومہ کی شفقتوں، محنتوں اور احسانوں کے اعتراف میں دونوں شعرا کے قلم کی طاقت اور جودتِ طبع ملاحظہ ہو، اقبال کہتے ہیں۔

عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اُس نے کیا
رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اُس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لیکر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

کس قدر سادی زبان ہے، اور کس درجہ عام فہم الفاظ میں اپنی اور اپنے قوتِ بازو کی بیتابیوں کا اظہار کرتے ہیں؛ خاص کر آخری شعر تو داد سے مستغنی ہے۔ عہدِ طفلی سب سے زیادہ ماں کی شفقتوں اور محنتوں کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ مگر جناب اقبال اس پر بغیر زیادہ زور دیے ہوئے صرف دو شعر کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں، البتہ اُن کا آٹھواں شعر پُر حسرت اور بے مثال ہے۔

برخلاف اس کے جنابِ ثاقب نے عہدِ طفلی کا نقشہ پورا پورا کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ ان کے کلام میں اس موقع پر زور دیا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ درجہ حد درجے مؤثر، اور ان کا انداز بیحد مسحور کن ہے، ایک ایک مصرع نشتر کی طرح دل میں اُتر جاتا ہے اور اس جگہ کم از کم مجھے تو اعتراف ہے کہ جنابِ ثاقب حضرت اقبال پر سبقت لے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اے کہ تیری ذات سے محکم تھی بنیادِ حیات
کون اب سمجھائے گا دنیا میں رودادِ حیات

میں نے یہ مانا کہ تو اب رنج سے آزاد ہے — رُوح تیری جنت الفردوس میں آباد ہے
دل کہاں پائے گا لیکن تیری الفت کے مزے — مجھکو یاد آتے رہیں گے تیری شفقت کے مزے

~~~

آہ اے ماں خاطرِ بیتاب کی تسکیں تھی تو — گو بظاہر خوش تھی لیکن دردِ غمگیں تھی تو
آرہا ہے یاد مجھکو عہدِ طفلی بار بار — جبکہ تھی محدود میری زندگی مستعار
تھا سکونِ مستقل، حاصل تری آغوش میں — رو کے سوجاتا تھا میں اُس وسعتِ خاموش میں
عطر سے بڑھکر تھی تیرے جسم کی خوشبو مجھے — مایۂ کونین سے افضل تھی یعنی تو مجھے
تیری ہر کروٹ میں تھا آرام کا میرے خیال — تھی مری افسردگی تیرے لئے وجہ ملال

لاریب یہ اشعار اس قدر سچے اور اس درجہ پُر درد اور مؤثر ہیں کہ سخت سے سخت دل بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عہدِ طفلی میں ماں کی شفقتوں کی اتنی سچی اور مکمل منظرکشی کی گئی ہے کہ بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ اور بیساختہ واہ نکل جاتی ہے۔

~~~

"مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے" یہ کسی کو نہیں معلوم۔ البتہ مرنے والے کے ذاتی صفات کی بنا پر "بقدر طاقت خود می کنند استدراک" ورنہ اللہ کی بات اللہ ہی جانے۔ جناب ثاقب اپنی مادرِ شفیقہ کے ایمانی کارناموں کے جزا کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

دل میں برپا ہوتا ہے ہنگامۂ سوز و گداز — آسماں کے مجھکو دروازے نظر آتے ہیں باز
دیکھتا ہوں نُور پاشی میں حجاب اندر حجاب — یعنی جلوے رقص و لرزش میں نقاب اندر نقاب
دیکھکر تیری عبادت کا میں یہ شیریں ثمر — غم سے اک لمحے کو ہوجاتا ہوں اپنے بے خبر

دوسرے شعر کا پہلا مصرع کن خوبیوں کا حامل ہے، یہ میری سمجھ سے باہر ہے اور مجھے اپنی فقدانِ علم کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں اس مصرعے سے کوئی مطلب نہیں نکال سکا۔ دوسرا مصرع خیر ایک حد تک غنیمت ہے، مگر بالکل بے کیف کوئی خاص بات اس میں بھی نہیں، بجز اس کے کہ چند بڑے بڑے الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ میری دانست میں "شیریں ثمر" کی وضاحت ہرگز اس شعر سے نہیں ہوتی۔ دوسرے دو راز حقیقت واقعات کا عنصر اس میں بھی موجود ہے۔ مثلاً دروازۂ آسمان کا باز ہونا یا، جلوے رقص و لرزش میں نقاب اندر نقاب، نظر آنا وغیرہ، برخلاف اس کے اقبال نے اس مفہوم کو بڑی سادگی اور خوبصورتی سے ایک شعر میں ادا کر دیا ہے، فرماتے ہیں۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر — خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

پہلے مصرعے سے زندگی کی خوشگواری اور دوسرے مصرعے سے باسانی سفرِ آخرت کا صاف پتا چلتا ہے، جو اعمالِ صالح کی جزائے اوّلیں کا بیّن ثبوت ہے۔

~~~

آخر میں اقبال نے دعائیہ اشعار پر اپنی نظم ختم کی ہے، فرماتے ہیں۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نُور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبال جہاں قدرت سے قبر کو فروزاں کرنے کی استدعا کرتے ہیں، ہاں فطرت سے اُس قبر کو قائم و دائم رکھنے کی بھی امداد کرتے ہیں، جبکہ فروزاں کرنے کی دعا کی گئی ہے۔ قبر کی تاریکی ضرب المثل ہے، ایسے موقع پر مرقد کے فروزانی کی جو تصویر "مثلِ ایوانِ سحر" کہہ کر کھینچی گئی ہے۔ وہ بے مستغنی ہے اور پھر قبر کے ظاہری شکل کو قائم رکھنے کی جو آرزو کی گئی ہے وہ عین فطرت ہے۔ اور اس طور پر اقبال قبر اور اہلِ مرقد مکان اور مکین دونوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اسی طرح جناب ثاقب بھی اپنی نظم دعائیہ شعر پر ختم کرتے ہیں۔ مگر وہ بات نہیں۔ فرماتے ہیں۔

سایہ گستر رحمتیں ہوں قبر پر تیری مدام — برکتیں نازل ہوں تیری روح پر ہر صبح و شام

پہلے مصرع میں رحمتوں کے قبر پر سایہ گستر ہونے کی دعا کی گئی ہے۔ حالانکہ اگر رحمت کی دعا صاحبِ قبر کے لئے ہوتی تو البتہ مستحسن تھا۔ ورنہ صرف قبر کے لئے رحمتوں کی بارش کی دعا بے معنی محض ہے۔

بہرکیف مری حقیر رائے ان صفات کی صورت میں حاضر ہے اب اہلِ نظر دیکھیں اور پرکھیں کہ میں کس حد تک صحیح اور غلط ہوں میری ان دو حضرات میں کسی سے بھی ملاقات یا راہ و رسم نہیں اور نہ کسی سے مجھے خدانخواستہ بغض و عناد ہے، میں نے صرف ادبی حیثیت سے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ اور جس کے کلام میں مجھے جو عیوب و محاسن نظر آئے میں نے نیک نیتی سے اُن کو ظاہر کر دیا ہے۔ یہ ایک بے لاگ تنقید ہے جسمیں تعصب یا حمایت بیجا کو ذرا بھی دخل نہیں۔

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
(غالب)
~~~

مردِ مضحک

اسرائیل احمد خان سکندر آباد دکن

(مسلسل)

(۳)

لارڈ ڈیوڈ ڈری مائر!

لارڈ کلینکارلی ہمیشہ سے کہن سال اور تباہ حال اور برگشتہ اقبال نہ تھا۔ وہ بھی جوانی کی بہشتِ رنگینی کی گلگشت کر چکا تھا! عورتوں کے ساتھ عشقبازیوں اور صنفِ نازک کی نازآفرینیوں اور نیاز نوازیوں سے وہ بھی جرعہ کش ہو چکا تھا! خود کرامویل ایسے متین و متقی مرشدِ طریقتِ سیاست کا عہدِ شباب بھی اِس مذاقِ بشری سے معریٰ نہ رہا تھا! ؎

سکتے ہیں جسے اہلِ جہاں ذوقِ گنہ اُس فیضِ ازل سے کوئی محروم نہیں!

کلینکارلی کے اک لڑکا بھی تھا جو دَورِ جمہوریت کے آخری ایام میں پیدا ہوا تھا اِس نوزائیدہ بچے کی دنیا میں آمد اور کلینکارلی کا ملک سے اخراج قریباً ہمعصر واقعات ہیں! چنانچہ بیٹا باپ کی صورت سے کبھی آشنا نہ ہوا، اور بعد میں تو اُس نے ایسی ناخلفی کا بھی ثبوت دیا کہ نووارِدِ تخت و تاج شاہ چارلس کے مقربین میں داخل ہو گیا! اِس فرزندِ ارجمند کو "لارڈ ڈیوڈ ڈری مائر" کا طویل الذیل خطاب مرحمت ہوا! اور یہ محض اپنی والدۂ ماجدہ کے طفیل میں، جو ایک حسین و مہجبین عورت تھی، ــــ جس کی نزاکتِ حُسن اپنے شوہر کے دَورِ اِدبار کی اُفتاد کے وقت اُس کے ساتھ اپنے عہدِ وفا کی تاب نہ لاسکی! اُس نے اپنے پہلے عاشق کے ساتھ پیمانِ اولین تازہ کیا! ــــ اور یہ پہلا عاشق وہی شخص تھا جو اِس وقت خود انگلستان کی "عروسِ ملک" کو کنارگیر کر چکا تھا! یعنی شاہ چارلس!

الغرض یہ عورت بادشاہ بیگم بن گئی۔ چارلس کی اقبال مندی و فاتحکاری کے کیا کہنے کہ جمہوریت کے اک زبردست اور صاحبِ استقامت قلم بردار کی بیوی اور بیٹا دونوں اُسے مالِ غنیمت میں ملے! ع

از بختِ شکر دارم و از روزگار ہم!

خاتونِ موصوف نے اپنے غیرمعمولی حُسن و جمال کی بدولت بادشاہ کے دل پر حقوقِ حکمرانی حاصل کر لئے! اُس کا بیٹا (لارڈ ڈیوڈ) گوناگوں خطابات و اعزازات کا حامل بنا، اور معتمدانِ خاص میں داخل ہو کر کثرت شاہی خدمات پر مامور ہوا۔ اُدھر باپ عالمِ جلاوطنی میں سوئٹزرلینڈ کے اک گوشۂ تاریک کے اندر اک بومِ عزلت گزین کی طرح اپنی حیاتِ تلخ کے باقی دن کاٹ رہا تھا، اور اِدھر بیٹا شاہی دربار و محلات میں عیش و نشاط اور اعزاز و اکرام کی شادکام زندگی بسر کر رہا تھا! ع

حیف اگر در پس امروز بود فردائے!

ہنری ہشتم اور جیمس دُوئم کے عہدِ سلطنت میں بھی وہ اِسی رسوخ و تقرب سے مفتخر رہا۔ کیوں نہ ہو، شاہ پرست ابن الوقتوں کا تکیۂ کلام تو یہ ہوا کرتا ہے کہ:۔

"بادشاہ نے وفات پائی، ــــ زندہ باد بادشاہ!!"

ڈیوک آف یارک کی تخت نشینی کے وقت لارڈ ڈیوڈ کے امیرانہ خطابات

میں ایک طرۂ افتخار کا اور اضافہ ہوا۔ یعنی اپنی ماں کی وفات کے بعد اُس کی شخصی متروکہ جاگیر واقع اسکاٹلینڈ کا بھی وارث بنا، اور اِسی ریاست کی ملکیت کے انتساب سے اُس کا نام نامی و اسمِ سامی اب لارڈ ڈیوڈ آف ڈری مائرہ قرار پایا! آہ اُس کا بے نام و ننگ اور ننگ باپ! ع

تو و قطعِ مناز لہا، من و یک لغزشِ پائے!

(۴)

امارت و مناصب!

جیمس ثانی اگرچہ بادشاہ تھا لیکن خود بدولت کو جنرل بننے کا شوق تھا! تختِ شاہی پر نشست حاصل کر لینے کے بعد ہر مرتبہ و مقام تک رسائی آسان ہو جاتی ہے! چنانچہ نوجوان فوجی افسروں کی جھرمٹ میں وہ جوشن و چار آئینہ میں ملبوس اور خود و زرہ سے محفوظ، اسپ خاصہ پر سوار نکلا کرتا تھا! لارڈ ڈیوڈ کا شاندار پیکر اُس کی آنکھوں میں کھبا جاتا تھا! وہ بیش از بیش اُس کی بانکی اور سجیلی طرح اُڑانے کی کوشش کیا کرتا! ساتھ جمہوریت کی یہ اک قیمتی متاع تھی جو لارڈ موصوف کی شخصیت کے وجود میں انگلستان کے بحال شدہ خانوادۂ شاہی کو خداداد ملی تھی!

لارڈ ڈیوڈ کو اب خوابگاہِ ہمایونی کا معتمد بنایا گیا، جو معراجِ قاب قوسین کی سمت میں اک بڑی پرواز تھی!

یہ غایت درجہ تکریم و نوازش کا منصب تھا۔ یہ عہدہ دار، شاہی بسترِ استراحت کے پاس ہی اک پلنگ پر سویا کرتا ہے، اور بارہ آدمی شب میں باری باری ایک دوسرے کو سبکدوش کیا کرتے ہیں!

لارڈ ڈیوڈ توشہ خانے کا بھی سپرد دار تھا، اور میرِ آخور بھی! اِن مزید فرائض کی بجا آوری کے صلے میں اُسے مزید مشاہرہ ملتا تھا۔ اصطبل کا تمامی عملہ اور اکثر شاہی پیشِ خدمت اُس کے ماتحت تھے۔ شرط کے گھوڑوں کی داشت و پرداخت کا کام بھی اُسی کو تفویض تھا۔ یہ سلطانی تربیت گاہِ اسپ مقام نیو مارکیٹ میں واقع تھی۔ صَرفِ خاص کے جس صیغے سے اُمراء و اعیان کو خلعت عطا کئے جاتے تھے وہ بھی لارڈ ڈیوڈ ہی کے زیرِ اہتمام تھا۔ بادشاہ سلامت کی بیشی خاص کے سر رشتہ کے سارے وابستگان اُس کو کورنش بجا لاتے تھے۔ انگلستان کا پُر شوکت دربار، مہمان نوازی میں اپنی نظیر آپ تھا۔ لارڈ ممدوح اِن شاہی ضیافتوں کا سربراہکار اور پذیرائی کی صحبتوں کا پُر زور داعی بھی ہوا کرتا تھا۔ بیشتر پبلک تقریبات میں وہ ذاتِ شاہانہ کی عین پس پُشت کھڑا ہوتا تھا! لارڈ ڈیوڈ ہی پنجشنبہ مبارک کے دن اُن بارہ فقیروں کو حضورِ ہمایونی میں پیش کیا کرتا تھا جن کو ظلِ سبحانی اپنی مدتِ جلوس کی سالوں کے ہم تعداد نقرئی سکے ارزانی فرمایا کرتے تھے! جب کبھی نصیبِ دشمنان بادشاہ سلامت بسترِ علالت پر ہوتے تو یہ فرض بھی اُسی کا ہوتا کہ وہ پادریوں کو شاہی اطاقِ علالت میں حاضر کیا کرے اور مجلسِ مملکت کی منظوری کے بغیر اطبا کو باریابی و مزاج پرسی کی اجازت نہ دے!

لارڈ ڈیوڈ اسکاچ رجمنٹ میں لفٹننٹ کرنل کے عہدے پر بھی فائز تھا اور اس حیثیت سے متعدد معرکوں میں دادِ شجاعت دے چکا تھا۔ وہ بے نظیر سپاہی تھا، اک خوشرو انسان اک خوش پیکر جوان، اور اک فیاض و دریا دل امیر! وہ بیک وقت رفیع المنزلت اور بلند قامت واقع ہوا تھا!

ایک دفعہ ایسا موقع آیا کہ لارڈ ڈیوڈ کو چشم بد دور وہ منصب عطا کیا جانے لگا جس کا ایک فریضہ شاہِ ذیجاہ کو قمیص زیبِ تن کرانا بھی ہوتا تھا! لیکن اس امتیاز کے لئے شہزادگی یا فصل درجہ، درجۂ اول کی امارت کی شرط تھی۔ اِس عطائے امارت کا معاملہ بہت نازک تھا۔ اِس سے بہت سے اُمیدواروں کے درمیان رقابت اور عداوت کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ اس اعزاز کی غلط بخشی سے اگر بادشاہ کو ایک طرف اک ممنون و مکرم، جان نثار امیر ہاتھ آتا تو دوسری طرف دل برداشتہ اُمراء کے حلقے میں سَو دُشمنانِ جانستان پیدا ہو جاتے! اس قباحت سے بچنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ امارتوں کے انتقال سے کام لینے کی جدت اختراع کی گئی۔ اِس طریقے سے بادشاہ کو اپنی غایتِ مقصود بھی حاصل ہو جاتی تھی اور دربار کے آئین میں کسی اصولی و انقلابی تبدیلی کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوئی تھی!

اِسی راہ سے لارڈ ڈیوڈ کو دربارِ شاہی کے طبقۂ علیا میں پہنچا دینے پر امکان بزمِ سلطانی کو کوئی اعتراض یا شکایت نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اب بادشاہ لارڈ مذکور کو مستقل امارت دے کر اپنی اک محبوب دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کے کسی موقع کا منتظر تھا!

(۵)

بہت جلد یہ حالتِ منتظرہ بھی ختم ہو گئی اور اک موقع رونما ہو گیا۔

لارڈ کلینکارلی کی موت کا اعلان گوشش زد ہُوا، لارڈ متوفی کی وفات نے "قید حیات" اور "بند غم" دونوں سے آزاد کر دیا!

کلینکارلی کی رحلت کے چند روز قبل اور چند روز بعد کے واقعات پر مختلف لوگوں نے مختلف خیال آرائیاں کیں۔ مگر یہ سب از قسم افسانہ تھیں۔ اگر ان بادِ ہوائی قصوں پر اعتبار کیا جائے تو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ لارڈ کلینکارلی اپنی زندگی کے آخری دَور میں اور بھی خالی جمہوریت پرست ہو گیا تھا! یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اُس نے زینب بریڈشا نامی اک عورت سے شادی بھی کی تھی! اور اِس عورت کے بطن سے اک لڑکا بھی پیدا ہُوا تھا! روایتِ عام کی بنا پر وضعِ حمل کے وقت خود ماں جاں بحق ہو گئی تھی! اگر یہ حکایات صحیح تھیں تو اِس لڑکے کو لارڈ کلینکارلی کا جائز وارث ہونا چاہیئے تھا! لیکن خبریں سخت مُبہم اور باہم متضاد تھیں اور اُن پر بجائے خبروں کے افواہوں کا اِطلاق زیادہ موزوں تھا! سوئٹزرلینڈ کے واقعات و واردات اُس عہد کے وسائلِ رسل و رسائل کے لحاظ سے انگلستان کے لئے ویسی ہی دور کی باتیں تھیں جیسے کہ آج اُنیسویں صدی کے آواخر میں مشرقِ بعید و چین کے حوادث برطانیہ کے لئے! لارڈ کلینکارلی کا نکاحِ ثانی، ولادتِ فرزند، اور اِن ہر دو وقوعوں پر اُس کی عمر کا مزعومہ تعین، اگرچہ یہ سب باتیں غیر ممکن نہ تھیں تاہم غیر اغلب ضرور تھیں! لوگوں کا یہ بھی بیان تھا کہ کلینکارلی کا نوزائیدہ بچہ ایسا ہی سُرخ و سفید اور وجیہہ و شکیل ہے جیسا کہ اک امیر ابنِ امیر کو ہونا چاہیئے!

لیکن آخرکار اِن سب یادہ گوئیوں اور داستان سرائیوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا، اور ایک دن اک خوشنما منظر صبح کی ساعتِ خوش طالع میں شاہ جیمس نے جریدۂ سلطانی میں یہ "فرمانِ قضا جریان" شائع کرایا کہ:-

"چونکہ لارڈ کلینکارلی کا انتقال ہو گیا ہے،
اور اُس کا کوئی اور بیٹا نہیں ہے، لہٰذا لارڈ
ڈیوڈ اُس کا تنہا فرزند، اُس کا وارث قرار
دیا جاتا ہے، اور اپنے باپ کے جملہ خطابات، القاب
اور حقوق و مراعات کا حقدار بنایا جاتا ہے!"

مگر یہ استحقاقِ وراثت اک خاص شرط سے مشروط تھا! اور وہ یہ کہ لارڈ ڈیوڈ عند الوقت ایک لڑکی کو اپنے حجلۂ عروسی کی صدر نشین بنائے جو ابھی گہوارۂ شیر خوارگی میں جھول رہی تھی اور جسے بادشاہ نے اِس مجوزہ رشتے کے اعلان کے ساتھ ہی "ڈچز" "ڈیوک بیگم" بنا دیا تھا!

اِس نسبت و کشاد کے متعلقہ "رموز مملکت" بادشاہ ہی کو معلوم تھے، یا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اک "رازِ فاش" تھے:

یہ ننھی بچی "ڈچز جوزیانہ" کہلاتی تھی!

بہت سے عظیم حوادث کی تہ میں اِس چھوٹی سی لڑکی کا وجود کارفرما تھا! اِس وقت وہ خود امیر تھی، جب اُس کی شادی ہوگی اُس کی امارت اُس کے شوہر کو منتقل ہو جائیگی۔ عزّ و افتخار دو خانوادوں کے امارت کے دو ہونہ امتیازات کے قِران کا مظہر ہوگا!

لیڈی جوزیانہ کی ذاتی دولت و حشمت بھی بڑی گراں قدر اور بلند مرتبت تھی۔ اِس کا بیشتر حصہ اُن عطیات سے ملا تھا جو مادام ساآن کوین نے ڈیوک آف یارک کو عنایت کئے تھے۔ یہ مؤخر الذکر بیگم بہت ہی رفیع الشان خاتون تھی فرانس کے دربار میں ملکۂ معظمہ کے بعد اُسی کی پایگاہ سمجھی جاتی تھی۔

(۶)

شاہانِ چارلس و جیمس کے بعد لارڈ ڈیوڈ نے شاہ ولیم کا دَورِ حکومت دیکھا! اِس عہد میں اُس کا اعزاز و اکرام اور بھی المضاعف ہو گیا! اُس کے یعقوبی معتقدات اِتنے قوی نہ ثابت ہوئے کہ وہ شاہ جیمس کی جلاوطنی کے ایام میں اُس کی رفاقت کرتا! باوصف شاہ معزول کی ساری اِرادت و عقیدت کے وہ اِتنا وقت شناس ضرور تھا کہ اُس نے غاصبِ تاج و تخت ولیم سے سرتابی اختیار نہ کی! ع

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود!

لارڈ ڈیوک اک مثالی فدائی شاہان تھا! وہ اک ہرفن مولا افسر بھی تھا اب اُس نے اپنی خدماتِ فوجِ برّی سے عساکرِ بحری میں منتقل کرالیں، جہاں جیشِ ابیض میں منسلک ہو کر اُس نے خاص امتیاز حاصل کیا۔ اک مختصر سی قامت کے جہاز کے کپتان کی حیثیت سے اُس نے صیغۂ بحریہ تمام بالائی مدارج و مناصب پر سرافرازی پائی۔

وہ محل کے اندر اک دلفریب شخصیت تھا۔ حسین گُناہوں سے چند اں

اجتناب نہ رکھتا تھا! شعر و سخن سے بھی بلاشبہ ذوق تھا! سب سے زیادہ یہ کہ وہ ازل سے قربِ سلطانی و امیر کے لئے مخلوق ہوا تھا! وہ اک "مادر زاد شاہ پرست تھا! بادشاہوں اور شہزادوں کے لئے بہترین ندیم تھا۔ دعوتوں اور ضیافتوں، جلسوں، اور جلوسوں کے اہتمام و انصرام کی صفِ اول میں نظر آیا کرتا تھا خواتین کی پذیرائی و دلداری کے محل میں وہ ہمہ تن شیر و شہد تھا! وہ بزم کا مسند نشین تھا اور رزم کا علَم بردار! بڑا یار باش اور مجلس طراز تھا۔ اپنے دوست احباب سے بہت متواضع تھا لیکن بحیثیت امیر کے بڑا پُر نخوت و رعونت! وہ پہلی ملاقات میں تو بے تکلفی اور زود آشنائی کا اظہار کرتا تھا مگر پھر جلد اپنے سر کے گرد اک "ہالۂ عظمت" قائم کر لیتا تھا! بادشاہوں کا بڑا مزاج داں تھا اور اُن کے "تسلامے رنجیدن" اور "بدشنامی خلعت دادن" کی مطلق العنانیوں اور طفلانہ ادائیوں کا پورا محرم راز! بادشاہ کی مرضی پاکر آگ میں کود پڑنا، اور سلطانی اشارۂ چشم و اَبرو پر نوکِ شمشیر پر اپنا سینہ رکھ دینا! ان سب فرض شناسیوں میں وہ خوب طاق تھا!

لارڈ ڈیوڈ اپنے ماتحتین و متعلقین پر بڑے بڑے عتاب کر لیتا تھا۔ لیکن دل آزاری اور غریب کُشی کا ارتکاب اُس سے ناممکن تھا! علمِ مجلس میں مہارتِ تام رکھتا تھا۔ وہ اوپر سے "خواجہ تھا، اور اندر سے "خواجہ سرا"!

اب اُس کی عمر "چہل سالگی" سے متجاوز تھی، لیکن قُویٰ کی تازگی کے اعتبار سے بالکل جوانِ رعنا معلوم ہوتا تھا!

لارڈ ڈیوڈ فرانسیسی غزلیں بڑے والہانہ آہنگ سے گایا کرتا تھا اور شاہ چارلس اُس کے اِس تفنّنِ طبع سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ وہ فصاحت و بلاغت کا ذوق آشنا تھا، ادبی محاسن کا لذت کُش تھا، اور اُن خطباتِ تعزیت کا بڑا مدّاح تھا جو باسویٹ نے جنازوں کی تقاریب پر دیئے ہیں!

اُس کی ماں کا ترکہ —— ۱۰ ہزار پونڈ سالانہ —— اِس قدر کافی تھا کہ وہ بافراغت امیرانہ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن اپنی شاہ خرچیوں کے خمیازے میں وہ معتدبہ طور پر مقروض ہو چکا تھا۔ تزک و احتشام، کرّ و فرِ جملہ لوازمِ امارت، اُن کی جدت و ندرت، اور عام اسراف و تبذیر میں کوئی امیر اُس کا حریف نہ تھا۔ پھر جونہی کسی نے اُس کی طرح اُڑائی اور اُس نے اُسے ترک کر دیا! وہ گھوڑے کی سواری میں ذرا کھیلتے ہوئے بوٹ استعمال کیا کرتا تھا!

اُس کے ہیٹ کی ہیئت اپنی نظیر آپ تھی! اُس کی کلاہ کے طُرّے اور قبا کے دامنوں کی سنجابیں ایسی ہوتی تھیں کہ کہیں دیکھیں نہ سنیں! اور یہ سب خصائص و نوادر اُس کے "ایجاد بندہ" تھے! الغرض وہ امتیازِ فائق کا مظہر بننا چاہتا تھا جو زبانِ خلق سے بہ خراجِ تحسین حاصل کر سکے کہ ؏

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی!

(۷)

ڈچیز جوزیانہ!

۱۶۸۸ء کا سال ہے۔ لیڈی جوزیانہ کا سنِ چشم بد دور اب اگرچہ ۲۳ سال ہے اور لارڈ ڈیوڈ کی عمر ۴۴ سال، لیکن ہنوز شادی کا انعقاد نہیں ہوا ہے! بہترین دلائل اِس التوا کے مؤید تھے!

کیا اُن کے درمیان محبت نہ تھی؟ حاشا وکلا! لیکن بات یہ ہے کہ جو چیز اپنی ہو جاتی ہے اُس پر کلی قبضہ و تصرف کے لئے انسان کے دل میں کوئی اشتیاق یا عجلت باقی نہیں رہتی! جوزیانہ ابھی دوشیزگی کی آزادی سے اور لطف اندوز ہونا چاہتی تھی! اور لارڈ ڈیوڈ بھی ابھی جوان رہنا چاہتا تھا! عقدِ نکاح کی تاخیر کو وہ توسیعِ شباب سمجھتا تھا! متوسط عمر کو پہنچے ہوئے کنواروں کا یہ خاص دور تھا:

ہر زمانہ و زمین میں "فیشن ایبل" مناسب باتوں سے بالا سمجھا جاتا ہے۔ لارڈ ڈیوڈ اک جلیل الشان جوان تھا، لیکن جمال و جلال کے ساتھ اکثر یہ خطرہ لاحقِ حال رہا کرتا ہے کہ آدمی کہیں "ٹھس" نہ ہو جائے! تاہم لارڈ ڈیوڈ اِن عام بدانجامی و بدمذاقی سے محفوظ تھا۔ وہ آزادانہ قمار بازی کرتا، بے تکلفانہ "باکسنگ" کھیلتا، اور لااُبالیانہ اپنے اوپر قرضے کے انبار لگاتا! کتوں، گھوڑوں، اور گوناگوں کھیلوں میں اُس کی خرچیوں اور زرپاشیوں سے جوزیانہ بہت مرعوب تھی! لارڈ ڈیوڈ، ڈچیز موصوفہ کے اِس حسنِ ظن پر شاکرانہ آداب بجا لاتا، بہ پیرایۂ:—

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ؟!

اِس دوشیزہ کے عذارِ صبیح، طلعتِ مہتاب سے زیادہ بے داغ تھے مگر اپنی عالی منشی اور شاہانہ دماغی میں وہ آفتاب سے زیادہ پُر جلال تھے! اُس کی ذات محفل پر فرماں روائی کرتی! اُس کے حضور میں ہر امیر و ریاست والی سے ہونٹوں میں بھی لرزہ براندام ہو جاتی! لارڈ ڈیوڈ بھی اپنے عاشقانہ جذبات میں جوزیانہ

کے ساتھ صرف "تشبیب" کی جرأت کرسکتا تھا! ان "متشابت تغزل" کو کبھی کبھی اس
ناطورۂ خائم فریب کی زبان ناز سے پڑھے جانے کا افتخار نصیب ہوا کرتا! اپنے ان اشعار
ترانوں میں لارڈ ڈیوڈ اکثر اس طرف کنایہ کیا کرتا تھا کہ جوزیانہ سے ہم آغوش
ہونا گویا ستارۂ زہرہ کی معراج حاصل کرنا ہے! ـــ مگر یہ عشق سال بسال
معرض التوا میں پڑتی چلی جاتی تھی! ہر نئی سال کی تقویم جو اس "جوزائے محبت"
کے وصال کے "آثار سعد" سے خالی پائی جاتی اک "تقویم پارینہ" نظر آتی! ع

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض؟
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے!

لارڈ ڈیوڈ اگرچہ جوزیانہ کے حریم دل کا مالک تھا، لیکن وہ اس حرم محترم
کے اندر بلا اذن داخل ہونے کی بے ادبی نہ کرسکتا تھا، بلکہ خادمانہ و نیازمندانہ
اس کے سنگ آستان پر جبہہ سائی ہی پر اکتفا کیا کرتا تھا! دربار کے حلقوں میں عاشق
و معشوق کی اس خودداری کو وہ ہجر و فرقت کے لطیف ذوق کی بڑی داد دی جاتی تھی
لیڈی جوزیانہ کہا کرتی تھی کہ "یہ بڑی بدمذاقی ہوگی اگر مجھے ازدواج عشق کے بے
تکلفانہ دعوت دی گئی! میں اک غیر معلومہ مدت تک اس کے ساتھ بجائے ثقیل
حبالۂ زوجیت کے، ریشمی رشتۂ محبت ہی سے وابستہ رہنا چاہتی ہوں!"

جی بھر کے بزم عیش میں ارمان نکالنا اوچھا سا اک خیال پریشاں سا خواب ہے
حسرت نکل گئی تو ہے ناکامیاب دل، حسرت نکل رہی ہے تو دل کامیاب ہے

جوزیانہ اک کشیدہ قامت پیکر نسائیت تھی۔ اس کے دامگاہ محبت
زلف و کاکل کے بالوں کا وہ رنگ تھا جو لغات حسن میں "طلائی سرخ" کہلاتا ہے!
اس کے اعضائے بدن تر و تازہ، سیراب و شاداب، ملائم و گداز تھے! اپنی تابانی تن
میں وہ سچ مچ "زرّین پردہ" واقع ہوئی تھی! پھر اپنی صورت و سیرت میں بھی اس کی
مصداق کہ ع

از خوئے ناخوش و ز رخ نیکو وز روئے دلکش نکو لقائے!

وہ بڑی ذہین و فطین اور شوخ و شنگ تھی۔ اس کی آنکھیں اک
بلیغ زبان کی آئینہ دار تھیں! وہ بادشاہ غرور و تمکنت سے صرف خرام ہوتی
اس نے اپنی بارگاہ حسن میں کسی عاشق کو نوازا تھا نہ عصمت و عفت کا کوئی
سوال پیدا ہوا تھا! اس کا عاشق کوئی انسان ہو، معاذ اللہ! ـــ دیوتا

اس کے خریدار ہوتے تو ہوتے! اگر باکرامتی کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی
ایسی چیز کی حفاظت کی جائے جو بجائے خود ناقابل رسائی ہو، تب تو بیشک اس نسوانی
وصف کا انتساب اس کے ساتھ کیا جا سکتا تھا! وہ "جمال دل فروز" بلا شبہ
اک "مہر نیمروز" تھی اور قطعاً "نظارہ سوز"!

تاہم وہ معصومیت سے بالاتر بھی نہ تھی! وہ دربار کی سازشوں اور
محل کی ریشہ دوانیوں سے خواہ مخواہ کچھ ذوق نہ رکھتی تھی، لیکن کسی ساز باز
میں ملوث کئے جانے پر وہ کسی تنفّض کا اظہار بھی نہ کرتی تھی! ـــ بشرطیکہ
اس میں اس کی جد و جہد کا مقصود کوئی ایسی شے ہو جو اس کی بلند نظری و عالی حوصلگی
کے غیر شایان شان نہ ہو! وہ اپنی نیکنامی کی چنداں پروا نہ کرتی تھی، لیکن وہ
اپنی جلالت قدر اور شان امتیاز کو بہرحال ملحوظ رکھتی تھی! بظاہر بہت
دل نواز اور مائل بہ التفات ہوتا، مگر عملاً اپنی پاکی دامن کو ورائے رسائی رکھنا
تکمیل نسائیت کے معیار کی معراج ہے! جوزیانہ اک پرجبروت شہنشاہ جمال
تھی! اس کے حسن کی ماہیت ہی جداگانہ تھی، بجائے "مسحور" کرنے کے وہ "مرعوب"
کرتی تھی! وہ ایسی تختۂ زمیں پر محو خرام ہوتی جس پر یکسر دلوں کا فرش ہوتا! "زیر
قدمت ہزار جان ست" کی نزاکت اس کی مستقل خصوصیت خرام تھی! وہ
دل نوازی سے ایسی عاری تھی کہ بمشکل اپنے سینے میں دل کے وجود کو تسلیم کرتی تھی
وہ دل کے لئے اک "ذرۂ درد" کو اک ایسا ہی خارجی عنصر سمجھتی تھی جیسا کہ آنکھ کے اندر
کسی ریزۂ خاک یا پرکاہ و خاشاک کا پڑجانا وہ حکیم لاک کے فلسفے پر تقریر کیا کرتی
اور لوگوں کو شک تھا کہ وہ عربی بھی جانتی تھی! ع

ہر لحظہ بہ رنگ دگر آں یار بر آمد!

الغرض نفسی و اخلاقی سیرت میں لیڈی جوزیانہ اک ایسی طرفہ معجون چیز تھی۔ کون جانتا
تھا کہ مشکی شاخ بلور ایسی گردن، تختۂ سیمیں ایسے سینے، جلوۂ قمر ایسی طلعت، المنابرف
ایسی آنکھوں، درہائے غلطان ایسے دانتوں، اور چہرے کی عام ملکوتی شان تجلی
کے نقاب کے نیچے اک مبہم و موہوم، معمّا آمیز و اسرار خیز قسم کی عجیب الخلقت
روح پردہ نشین ہے جو شاہانہ زندگی میں مزید مسخ ہو کر اک عفریت کی ہم فطرت بن گئی ہے!
یہ اک فوق العادت جوہر نسائیت تھا جو جوزیانہ کے نہاں خانۂ توہمات کے اعماق کے اندر
غرق پیچیدگی و ژولیدگی ہو گیا تھا!

انسان المخلوقات سب سے بڑا عجیب المخلوقات ہے!

مورِ ضعیف

خدا کی شان تو دیکھو کہ ایک مورِ ضعیف میں اُس کے ذوق کشاکش کی کیا کروں تعریف
بہ ایں قوائے نحیف و نزار و زار و نحیف پہاڑ سامنے ہو تو کہے مزاج شریف

نظر کا نقش جہاں ہے۔ اُچٹ نہیں سکتا
قدم ہے سست۔ مگر بڑھ کے ہٹ نہیں سکتا

جو پانی آئے تو تنکوں کا پُل بنا کے بڑھیں ملے ذرا سی لگز بھی تو ڈگمگا کے بڑھیں
ہزار فصل پہ ہو فصل۔ پھیر کھا کے بڑھیں نہو جو راہ سرنگیں لگا لگا کے بڑھیں

یہ ایک ایک جری خیل سے نہیں رُکتا
کہ جیسے شیر کا موُنھ سیل سے نہیں رُکتا

قطار باندھ کے جاتا ہے اِس طرح لشکر کہ جیسے جا کے اُلٹ دے گا گنبدِ خضر
یہ مُنھ میں دانے ہیں یا ہیں بھرے ہوئے گوہر سروں پہ بوجھ نہیں پھول رکھ لئے سر پر

ہے دُھن بندھی ہوئی مقصد سے لو لگائے ہوئے
ہوائے شوق لئے جاتی ہے اُڑائے ہوئے

آغا شاعر

یزدانیوں کے عیسائیت پر حملے

سید اختر علی تلہری

اگرچہ انگلستان کا نامور حکیم لاک صحیح معنوں میں "یزدانی" نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ "الہام و وحی" کا منکر نہیں ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے افکار میں یزدانیت (Deism) کے جراثیم پورے طور سے موجود تھے وہ "استدلال" کو "روایتی اور نقلی" قوتوں پر ترجیح دیتا تھا۔ اس نے اسے نہایت وضاحت سے ثابت کیا تھا کہ انسانی علم تجربہ سے ماخوذ ہے اس کے نزدیک "عقیدہ" بالکل عقل کے ماتحت تھا وہ انجیل کے الہامات ضرور مانتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ اگر الہامات عقل کے فیصلوں کے مخالف ہیں تو انہیں مسترد کر دینا چاہیئے۔ اس کے نزدیک الہامات سے اتنا قطعی علم نہیں حاصل ہو سکتا جتنا کہ عقل سے ہو سکتا ہے۔ وہ وحی و الہام کے سامنے سر جھکانے کو موجود تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ کہتا تھا کہ اس کا علم کیونکر ہو کہ حقیقۃً یہ چیز وحی و الہام بھی ہے۔؟

"وحی و الہام" کی حیثیت اس قدر مشتبہ ہو جانے کے بعد "یزدانیت" تک پہنچنے کے لئے فاصلہ ہی کتنا رہ گیا؟

ٹھیک اس زمانہ میں کہ جب لاک "عقل" کو "نقل" پر ترجیح دینے کی سعی میں مصروف تھا اور "عیسائیت" کو موافق عقل ثابت کرنے کے متعلق اس نے ایک کتاب لکھی تھی جان ٹولینڈ "یزدانیت" (Deism) کے علمبردار کی حیثیت سے نمودار ہوا جان ٹولینڈ یزدانیوں (Deists) کی جماعت کا زبردست مفکر سمجھا جاتا ہے اس نے اس سلسلہ میں "عیسائیت مجموعہ اسرار نہیں ہے" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو عیسائیت کی نگاہ میں اس سلسلہ کی بہت ہی خطرناک کڑی ہے۔ اس کتاب کا مرکزی خیال "مذہبیت" کے لئے بظاہر کچھ زیادہ خطرناک نہیں معلوم ہوتا لیکن جس عنوان سے اسے ثابت کیا گیا ہے اور اس ضمن میں جو بحثیں کی گئی ہیں وہ عیسائیت کے لئے سم ہلاہل سے کم نہیں ہیں۔

جان ٹولینڈ نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ انا جیل میں کوئی ایسی شئی نہیں ہے جو عقل کے مخالف ہو یا عقل کی حکومت کے ماوراء ہو۔ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ عیسائیت حق ہے لیکن اس میں ایسی چیزیں نہیں ہو سکتیں جو ہماری فہم کے دائرہ میں نہ سما سکیں۔ اگر خدا با فہم ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ الہامات مبہم ہوں اور ہمیں سمجھانے کے بجائے دوسری الجھنوں میں مبتلا کریں۔

جان ٹولینڈ نے یہ دعوےٰ کر کے کہ عیسائیت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جو ہمارے دائرۂ فہم میں نہ سمائے تمام معجزات کی جڑ کاٹ دی اور الہامات کی یہ خصوصیت بتا کر کہ وہ معمانہ ہوں اور وہ ہمیں سمجھانے کے بجائے دوسری الجھنوں میں مبتلا نہ کریں وحی و الہام کے اعتقاد کی عمارت گرا دی۔

تشدد کا نتیجہ خطرناک نفاق کی صورت میں

ے ہم نے "یزدانیوں" کا لفظ (Deists) کی جگہ پر استعمال کیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو وجودِ خدا کے قائل ہوں لیکن وحی و الہام کے منکر ہوں۔ منہ

ان ارباب فکر کی طرف سے عیسائیت کی حمایت کے لئے اس قسم کے جو عنوانات اختیار کئے جا رہے تھے اُن سے حقیقت میں مذہب کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ رہا تھا بلکہ اُس کی جڑیں اس طریقہ سے اور زیادہ ہلتی جارہی تھیں کیونکہ عیسائیت کے توہمات و مہمل میں حکڑ سے اس کی صلاحیت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ عقل کی محک پر ٹھیک اُتر سکیں

اس سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیئے کہ زمانہ متذکرہ میں عقل و نقل کی معرکہ آرائی کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ عقل کے یہ تمام پرستار (فرانس کے اٹھارویں صدی کے ممتاز فلسفیوں کو مستثنےٰ کرتے ہوئے) مذہب کی صداقت کا زبان سے اعتراف کرتے تھے لیکن اُن کا انداز استدلال اس نوعیت کا ہوتا تھا کہ اُس سے انھیں عقائد کو صدمہ پہونچے جن کی صداقت کے وہ مدعی تھے ممکن ہے ان حکما و مفکرین کا اسلوب اس سانچہ میں ڈھل چکا ہو اور اُن کے بحث و نظر کا ظاہری عنوان اُن کے حقیقی معتقدات کے مخالف نہ ہو لیکن قرائن یہ بتاتے ہیں کہ اُن کی اس روش میں صداقت نہ تھی اُن کے اس طریق کار کا ذمہ کسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ جواب صاف ہے کلیسا کی غیر رواداری اور سخت گیری کی پالیسی۔

عیسائیت کے ذمہ داروں نے دار و گیر کا جو مسلک اختیار کر رکھا تھا اُس کا نتیجہ ہی یہ ہونا چاہیئے تھا کہ مروجہ عیسائیت کے مخالف اپنے خیالات کے اظہار میں فرزانگی و پرکاری سے کام لیں۔

ذیل کی سطروں سے مسیحی رہنماؤں کی دراز دستیوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکیگا۔

مسیحی تشدد کی دراز دستیاں

عیسائیت قیام امن کی مدعی بن کر آئی تھی صلح و آشتی کی تبلیغ اُس کا نقطۂ نظر تھا لیکن ستم ظریفی دیکھیے اُس نے اُنھیں عقائد کی حفاظت کے لئے اس قدر خون بہائے ہیں کہ اُن کے تذکرہ سے بھی دل لرز اُٹھتا ہے عیسائیت کے مخالف خیالات روکنے کے لئے پاپائے روم کی حکومت کے محکمۂ احتساب عقائد (انکویزیشن) قائم کیا تھا۔ اس خوفناک محکمہ کی خونین سرگرمیوں کے متعلق ڈریپر مصنف معرکہ مذہب و سائنس رقمطراز ہے

"عام الفاظ میں انکویزیشن کا مقصد یہ تھا کہ تخویف و ترہیب کے ذریعہ سے مذہبی اختلافات کا استیصال کیا جائے اور بدعت و زندقہ کو نہایت خوفناک سزاؤں سے وابستہ کیا جائے اس کے یہ معنی تھے کہ ارباب محکمۂ احتساب عقائد ہی کو بدعت و زندقہ کی تعریف و تعین کا اختیار حاصل ہو اس طور پر معیار حق انکویزیشن کے ہاتھ آگیا اور پاپا کی طرف سے یہ محکمہ مجاز کیا گیا کہ اُن ملاحدہ و زنادقہ کی نسبت بعد سراغ برآری تجویز مناسب صادر کرے جو شہروں مکانوں تہ خانوں جنگلوں غاروں اور کھیتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔

اغراض مذہبی کے تحفظ کی اس خدمت کی انجام دہی میں اس محکمہ نے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ ۱۴۸۱ء سے لیکر ۱۸۰۸ء تک اُس نے تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں اور اشخاص سزا یاب میں سے تقریباً بتیس ہزار نفوس زندہ جلائے گئے۔ اول اول جب عام خلائق کو اُس کی وحشیانہ سزاؤں کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی جرأت اور مجال نہ تھی تو بسا اوقات ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ امرا اہل قلم قسیس راہب اور ہر طبقہ کے عوام الناس الزام عائد ہوتے ہی بلا اس کے کہ اُنھیں اپیل کا موقع دیا جائے اُسی دن مار ڈالے جاتے تھے ارباب فکر و دانش کی جدھر نظر پڑتی تھی اُنھیں بھیانک اور ڈراونی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کوئی شخص بلا خوف سزا یابی آزادانہ رائے کے اظہار پر قادر نہ تھا"

حکیم برونو محکمۂ احتساب کے شکنجہ میں

سولھویں صدی میں برونو کوپرنیکس کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ برونو کوپرنیکس کے نظام کا حامی تھا اور اپنے خیالات کے اظہار میں بے باک۔ ابتدا میں برونو کا قصد تھا کہ اپنی زندگی کلیسا کی خدمت گزاری کے لئے وقف کرے چنانچہ ڈامنیکین فرقہ کے راہبوں میں بھی داخل ہو گیا تھا لیکن [illegible]

عشائے ربانی" اور مسئلہ استقرار حمل بحالتِ دوشیزگی پر غور کرنے سے اُس کا ایمان سبدن مشکوک ہوگیا۔ چونکہ اُس نے اپنے خیالات کے پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی لہذا اُسے بہت جلد پیشوایانِ دین کا مورد عتاب ہونا پڑا اور اُن کے پنجۂ عقوبت سے بچنے کے لئے اول سوئٹزرلینڈ پھر فرانس پھر انگلستان پھر جرمنی میں پناہ لینا پڑی لیکن انکویزیشن کے یہ خونخوار تازی کتے جن کی قوتِ شامہ بلا کی تیز تھی برابر اُس کے پیچھے لگے رہے اور آخر جب وہ اٹلی واپس آیا تو اُس کا کھوج لگا کر رہے۔ وینس میں وہ گرفتار کیا گیا اور بیامبی کے جیل میں چھ سال تک اس سختی سے قید رکھا گیا کہ نہ اُسے لکھنے کے لئے قلم دوات کاغذ دیا جاتا تھا نہ پڑھنے کے لئے کوئی کتاب دی جاتی تھی اور نہ اُس کے کسی دوست کو اجازت تھی کہ اُس قیدِ تنہائی میں آکر گھڑی دو گھڑی کے لئے اُس سے ملے اور اُس کا غم غلط کرے۔

پیشوایانِ مذہب کے مطالبہ پر برونو وینس سے روما کو منتقل کیا گیا اور اس الزام کی پاداش میں کہ وہ ملحد ہی نہیں بلکہ رئیس الملاحدہ ہے انکویزیشن کے محبس میں قید کیا گیا سب سے بڑا الزام اُس پر یہ تھا کہ وہ تعدد عوالم جیسے ناپاک مسئلہ کا قائل ہے جو کتب مقدسہ سیاق و آیاتِ الہامی خصوصاً اُن آیات سے تناقض کلی رکھتا ہے جنھیں انسان کی سبیلِ نجات سے تعلق ہے۔ دو سال تک قید کاٹنے کے بعد وہ حاضر عدالت کیا گیا اور حکامِ عدالت نے اُس پر فرد قرارداد جرم لگا کر اُسے مسیحی برادری سے خارج کر دیا اور جب مقدس عدالت کے اس حکم کی تعمیل سے اُس نے ازراہِ فاثت شرافتِ نفس انکار کیا کہ اپنے گناہ سے توبہ کرے تو کارفرمایانِ قضا و قدر یعنی حکام انکویزیشن نے اس سفارش کے ساتھ اسے دنیوی حکام کے سپرد کر دیا کہ اُسے نہایت نرمی سے سزا دی جائی اور یہ خیال رکھا جائے کہ اُس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے۔ عدالت انکویزیشن کے اس خوفناک فقرہ کا مطلب ایسے موقعوں پر یہ ہوا کرتا تھا کہ مجرم کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چونکہ برونو اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے دشمن اگرچہ اس کے جسم کو فنا کر سکتے ہیں لیکن اُس کے خیالات کی اشاعت نہیں روک سکتے اس نے اپنے ججوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تمہارے اس فیصلے کو سُن کر میرے قلب پر اُس خوف کا عشر عشیر بھی طاری نہیں جو خود تمہارے دل میں یہ فیصلہ صادر کرتے وقت پیدا ہوا ہوگا۔ اس فیصلہ کی تعمیل فروری ۱۶۰۰ء میں ہوئی اور برونو زندہ جلا دیا گیا۔ (معرکۂ مذہب و سائنس ڈیپر)

انصاف کا مقام ہے کہ اس قسم کے ہولناک منظر خونیں تشدد کی موجودگی میں اربابِ فکر و دانش اپنے خیالات آزادی سے کیونکر ظاہر کر سکتے تھے؟

ان حالات میں مخالف خیالات رکھنے والوں کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ وہ عیسائیت کا لبادہ جسم پر ڈالے رہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عیسائیت سے اُن کی کھلم کھلا بغاوتیں اتنی ہرگز مضر نہیں ہو سکتی تھیں جتنی کہ ان کی حمایتیں ہوئیں۔ ان کے افکار و آرا نے عیسائیت کی دیواروں میں خوفناک سوراخ پیدا کر دیئے۔ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرتے رہے کہ اُن کے نظریئے عیسائیت کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ عقیدہ اور دلیل کی حدیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ وہ الہامی کتابوں پر براہِ راست کسی قسم کا اعتراض نہیں کرتے تھے لیکن مخفی راستوں سے انھیں فضول و بےمعنی ثابت کرتے تھے۔ "مذہبی کٹرپنے" کے احترام کا انھیں برابر ادعا رہا لیکن زبان و قلم سے ایسے خیالات ادا ہوتے رہے جن سے اس جذبۂ احترام کو کوئی مناسبت ہی نہ ہو سکتی تھی۔ عقل جن امور کی غلطیوں کا پردہ فاش کرتی تھی وہ انھیں مذہب کے دائرہ میں صحیح بتاتے تھے اس عصر کی ادبیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان امور کا قدم قدم پر ثبوت ملے گا۔

عیسائیت کے متعلق بائیل کی روش

بائیل حکیم لاک کا معاصر تھا۔ وہ امسٹرڈم میں رہتا تھا۔ اس نے وہیں سے اپنی "فلسفیانہ لغت" شائع کی تھی۔ وہ بالکل آزاد خیال تھا لیکن مذہب کا لباس اُس نے کبھی اپنے سے علیحدہ نہیں کیا۔

عیسائیت کے بنیادی قوانین و اصول کے خلاف جو اعتراض منکرین کی طرف سے کئے گئے تھے انھیں باقاعدہ طور سے درج کرنے میں اسے نہایت مسرت ہوتی تھی۔ حضرت داؤد کے متعلق عیسائیت جن واقعات کو بیان کرتی تھی اُن کی مجرمانہ حیثیت اُس نے نہایت بیدردی سے نمایاں کی اور بتایا کہ خدا کا یہ عزیز بندہ عیسائی روایتوں کے بموجب ایسا شخص تھا جس سے مصافحہ کرنے میں عامی سے عامی شخص کو عار معلوم ہونا چاہئے۔ اُس نے اس خصوص میں جو اندازِ بیان اختیار کیا وہ انتہا پسندانہ تھا۔ عیسائی دنیا اس بیباکانہ اظہارِ خیال پر برہم نہ ہوتی ناممکن

تھا۔ اُس کی طرف سے اس گستاخی کے خلاف احتجاج ہوا اور زبردست احتجاج ہر طرف ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ عیسائیت کے قہر و غضب کی بجلیاں قریب تھا کہ اُس کی ہستی کا خرمن پھونک دیں کہ وہ سنبھلا اور اُس نے مذہب اور عقل کی حدوں کی علیحدہ ہونے کی بحث چھیڑ کر مسیحی دنیا کے بگڑے ہوئے تیوروں کے درست کرنے کی کوشش کی

بائبل کے نزدیک مذہبی فضیلت

اُس کے خشم و عتاب کے شعلوں کو اس دلچسپ نظریے کے چھینٹوں سے بجھانا چاہا کہ عقیدہ کی مذہبی فضیلت اِس میں ہو کہ الہامی صداقتوں کا اعتقاد تنہا خدا کی شہادت پر کیا جائے۔ اگر تم دلائل کی بنا پر روح کے غیر فانی ہونے کے قائل ہو تو اس میں شک نہیں کہ تمھیں کٹر مذہبی کہا جا سکتا ہو لیکن جس چیز کا نام عقیدہ ہے اُس کا تمھیں کوئی حصہ نہیں ملا ہو۔ جس قدر الہامی صداقتیں انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں اُسی قدر ناقابلِ فہم اور دلائل کے خلاف ہوں گی ہمیں اُسی قدر اُن کے تسلیم کرنے میں اپنے فہم و ادراک کی قربانی کرنا ہوگی اور ہماری اطاعتِ خدا کا درجہ اتنا ہی اونچا ہو جائیگا۔

بائبل نے عقیدہ کی عظمت کا جو معیار قرار دیا ہو وہ بالکل سفسطہ آمیز ہو غور فرمائیے جو مذہب جس قدر زیادہ خرافات و مزخرفات کا مجموعہ ہوگا اُس کے تسلیم کرنے میں اُسی قدر عقل کی قربانی دینا ہوگی اور اس لئے بائبل کے مذاق کے بموجب اُن کے تسلیم کرنے میں اتنا ہی اطاعت خدا کا درجہ بڑھتا جائیگا گویا مزخرفات و خرافات کے انبار کے سامنے عقل کا سربسجود ہونا ہی ربانیت و روحانیت کے اعتراف کا پیش خیمہ ہوگا کوئی فہمیدہ شخص اس صورتِ حال کے تسلیم پر راضی نہیں ہو سکتا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہو کہ بائبل نے اس نظریہ کے ذریعہ سے ایک طرف تو عقیدہ کا لطیف پیرایہ میں مضحکہ اُڑایا ہو اور دوسری طرف عیسائیت کے انتقام کے چنگل سے اپنے کو بچایا ہو۔ اور اگر بائبل نے سنجیدگی سے اس خیال کا اظہار کیا ہو تو منکرین کی جماعت میں اُس کا پایہ نہایت ہی پست ماننا پڑتا ہو۔

منکرینِ خدا کے اخلاقی فضائل کا اعتراف

بائبل نے اپنی فلسفیانہ لغت میں منکرینِ خدا کے اخلاقی فضائل کا بھی اعتراف کیا تھا۔ یہ بات بھی مذہبی حلقوں میں ناپسند ہونا چاہیئے تھی چنانچہ ناپسند ہوئی اور اچھی طرح ناپسند ہوئی۔ اُس کے اس نقطۂ نظر کو سختی سے موردِ اعتراضات بنایا گیا۔ اُس نے ان اعتراضات کے جواب میں جو ستم ظریفانہ روش اختیار کی ہو وہ بھی میرے سابق خیال کی مؤید ہے بائبل میں لکھا ہو۔

"اگر اُسے خدا کے اُن منکرین کا علم ہوتا جن میں اخلاقی برائیاں پائی جاتی ہوتیں تو وہ اُن کا ضرور تذکرہ کرتا لیکن بدقسمتی سے وہ ایسی جماعتِ ملاحدہ سے واقف نہیں ہو جن میں اخلاقی رزائل پائے جاتے ہوں۔ وہ تاریخی مجرمین جن کے جرائم کے تذکرہ سے انسان کانپ اُٹھتے ہیں ہمیشہ مذہبی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی غیر مقدس زندگیاں اُن کی مذہبیت کا ثبوت ہیں۔ مذہب کا یہ مسلمہ عقیدہ ہو کہ شیطان خدا کا منکر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور وہی درحقیقت جرائم و معاصی کی طرف لوگوں کو ترغیب دلاتا ہو اس لئے انسان کی شرارت کو شیطان کی شرارت سے مشابہ ہونا چاہیئے اور انہیں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ انسان کی شرکت شیطان کے ساتھ خدا کے اعتقاد میں لازمی ہو۔ بدترین سیاہ کاروں کا منکرینِ خدا نہ ہونا اور ایمانداری کے وصف سے ایزد ناشناسوں کا زیادہ متصف ہونا خدا کی غیر محدود عقلمندی کا ثبوت ہو۔ اس نے تمام اُس نے انسان کے بگڑنے کی حدیں مقرر کردی ہیں کیونکہ اگر انکارِ خدا اور اخلاقی شرارت ایک ہی جماعت میں موجود ہو جائیں تو پھر دنیا کی انسانی سوسائٹیاں جرائم و معاصی کے طوفان سے ہمیشہ زیر و زبر رہتیں۔"

ان ستم ظریفانہ جوابات کی جو حیثیت ہو وہ ظاہر ہو۔ اگر فی الواقع انہیں کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتا ہو تو اُس کی فکری سادہ لوحی میں کیا شک ہو؟

اصل یہ ہو کہ خوش کرداری اور لامذہبیت میں کسی قسم کا لزوم نہیں ہو

بائبل نے جس عنوان سے ان میں ازدم دکھانا چاہا ہی وہ "مضحکہ خیز خطابت" کے تحت میں آجاتا ہی۔ یہ امر اور زیادہ عجیب وغریب ہی کہ اُسے اُن منکرینِ خدا کا علم نہیں ہی جن میں اخلاقی بُرائیاں پائی جاتی ہوں۔ ہمارے سامنے آج بھی ایسے منکرینِ مذہب موجود ہیں جن میں مسلماً اخلاقی ضوابط و قوانین کے لحاظ سے برائیاں پائی جاتی ہیں اور جن کی زندگیاں کسی سے پاکیزہ نہیں ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہی کہ منکرینِ مذاہب خوش کردار اور پاکیزہ سیرت ہوتے ہی نہیں۔ یقیناً ایسے لامذہب اشخاص ابھی موجود رہے ہیں جو نیک کرداری اور خوش سیرتی کے لحاظ سے ممتاز رہے ہیں۔ اُن کے دل میں ملک وملت کا درد ہوتا ہی جس سماج سے اُن کا تعلق ہوتا ہی اُس کی معاشرتی حالت درست کرنے کی انھیں فکر رہتی ہی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہی کہ اُن خوش کردار لامذہبوں کی ان اخلاقی ومعاشرتی صلاحیتوں کا "چشمۂ لامذہبیت" کے منبع سے نہیں پھوٹتا ہے۔

غرضیکہ بائبل کی حمائت عیسائیت کے لہجہ کا عام انداز یہی ہی۔ ظاہر ہی اس حمائت سے عیسائیت کیا فائدہ اٹھا سکتی تھی؟ ان دلائل سے تو وہ اور زیادہ خلافِ عقل ثابت ہوتی جاتی تھی اور اُس کی مقبولیت کی دیواریں گرتی جاتی تھیں بائبل کی تصنیفات کا اثر انگلستان اور فرانس پر اچھی طرح پڑا۔ انھوں نے ان دونوں ممالک میں مخالفین عیسائیت کے لئے اسلحہ مہیا کر دیئے۔

برطانوی یزدانیوں اور کٹر عیسائیوں کے مباحثے

ابتدا میں اس حملہ کو نہایت سرگرمی سے برطانوی یزدانیوں English Deists نے جاری رکھا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعے عیسائیت کی بنیادیں بہت کچھ ہلا دیں۔ ان یزدانیوں اور کٹر عیسائیوں میں یہ سوال زیر بحث رہا کہ آیا خدا کا وجود عیسائی تصور کے ماتحت عقل سے ثابت کیا جا سکتا ہی اور آیا وہ خدا عیسائی الہامات کا موجد ہو سکتا ہی۔

یزدانیوں کے نزدیک اس کا اثبات بالکل غیر ممکن تھا۔ دلائل سے جس خدا کا وجود ثابت ہوتا ہی اُس کی سیرت کے یہ بالکل مخالف ہی کہ وہ نام نہاد عیسائی الہامات کا اختراع کرتا۔ عیسائیت کے حامیوں نے بھی ان یزدانیوں کے مقابلہ میں دلیل ہی پر اعتماد کیا اور اس سلسلہ میں بہت سے عیسائی اپنے عقائد سے ہٹتے گئے

توحید فی التثلیث کے متعلق عجیب عجیب خیالات ظاہر کئے گئے۔ اُس زمانہ میں اخلاقیات پر ہر گروہ نے خصوصیت سے زور دیا۔

عیسائیت کا یہ خیال تھا کہ آخرت کے ثواب وعقاب کا اصول اخلاقی اصلاح کے لئے ضروری ہی۔ ان یزدانیوں کا خیال تھا کہ اخلاق کی بنیاد محض عقل پر ہی موجودہ الہامات میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو صحیح اخلاقی قوانین کے بالکل مخالف ہیں ان یزدانیوں نے اسپنوزا کے اس خیال کو کہ الہامی کتابوں کی بھی دوسری کتابوں کی طرح تاویل کرنا چاہیئے اپنا خاص اصول قرار دے لیا تھا وہ قانون کی زد سے بچنے کے لئے اپنے یہ خیالات ہلکے ہلکے پردوں میں چھپا چھپا کر پیش کرتے رہے۔

مذہبی آزادی سلب کرنیوالے قوانین

لیکن اب تک ۱۶۶۲ء کا پریس لائسنسنگ ایکٹ موجود تھا۔ وہ اس قسم کے لٹریچر کی اشاعت کامیابی کے ساتھ روکتا رہا۔ ۱۶۹۵ء میں یہ قانون منسوخ ہوا اور اُس وقت اس "یزدانی ادب" Deistic Literature، کا ظہور قوت کے ساتھ شروع ہوا تاہم اب بھی قوانین کفر والحاد موجود تھے ان کے ماتحت سزا ہو سکتی تھی۔ ان قوانین میں اتنی طاقت بہرحال تھی کہ اُن کے ذریعے مخالفین عیسائیت کا سر کچلا جا سکے ۱۶۹۸ء میں حسب ذیل ایک جدید قانون اور بنا دیا گیا تھا کہ اگر کوئی شخص جس کی تعلیم عیسائی مذہب میں ہوئی ہی تحریراً تقریراً یا طباعتہً تثلیث کے اقانیم ثلثہ میں سے کسی کی "ربوبیت" کا بھی انکار کریگا یا ایک خدا سے زیادہ خداؤں کا عقیدہ ظاہر کریگا یا عیسائیت کی صداقت کا منکر ہوگا یا قدیم وجدید اناجیل کی ربانی حیثیت تسلیم نہ کرے گا تو وہ مجرم قرار دیا جائیگا۔ پہلے جرم پر پبلک ملازمتوں کا استحقاق اُس سے چھین لیا جائیگا اور دوسرے جرم پر اُس کے شہری حقوق ضبط ہو جائیں گے اور تین سال کی قید جھیلنا ہوگی۔

قانون ہٰذا کا منشا بتاتے ہوئے صاف صاف ظاہر کر دیا گیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے کھلم کھلا عیسائیت کے اصولوں کے خلاف ملحدانہ گفتگوئیں کرنے اور خیالات شائع کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا ہی۔

آزاد خیالی استعاروں کی آڑ میں

یہ قانون فلسفیانہ آزاد خیالی کے لئے پر امضرتناک تھا لہٰذا اُس کی زد سے بچنے کے لئے آزاد خیالوں نے بہت سے طریقے اختیار کئے۔

منافقانہ عنوان سے مذہبی امور میں بحث کے طریقے کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس مقام پر ایک دوسرے طریقے کا ذکر منظور ہے۔ آزاد خیالوں نے مقدس کتابوں کی استعاروں کے پردے میں حسب منشا تاویلیں شروع کر دیں۔ اُنھوں نے صاف صاف لکھنا شروع کیا کہ ان کتب مقدسہ کے لفظی ترجموں پر اگر اعتماد کیا جاتا ہے تو بہت سی مہمل باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ ایسی بہت سی چیزیں تسلیم کرنا ناگزیر ہو جاتیں گی جو خدائی حکمت و انصاف کے بالکل منافی ہیں اس لئے ان عبارتوں کا مجاز و استعارہ پر محمول کرنا لازمی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ ایک حد تک عقل کے موافق ہے۔ مجاز و استعارہ کا استعمال تمام زبانوں میں رائج ہے لیکن اس کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا اور جو بات ذرا سی بھی اپنی عقل کے خلاف معلوم ہو اُسے بعید سے بعید مجازات پر محمول کر دینا مذہب کے ساتھ خیانت ہے۔

اگر کسی مقدس کتاب کی کوئی تعلیم ہمیں عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور ہم اُسے کسی طور سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تو خواہ مخواہ مضحکہ خیز مجازات کی عمارت تعمیر کر کے اُس کے ڈانڈے عقل سے ملانا دیانت نہیں ہے۔ لیکن یہ آزاد خیال اس روش کے اختیار کرنے پر عیسائیت کی طرف سے مجبور کر دیئے گئے تھے۔ اگر مذہبی حلقے حریت فکر کے دشمن نہ ہوتے تو آزاد خیالوں کی ایک جماعت کو اس کی ضرورت نہ پڑتی کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مذہب کو استعارات و مجازات پر محمول کرنے کے طریقہ سے کام لے۔

اس میں شک نہیں کہ ان حملوں کی حیثیت شبخون کی تھی اور عیسائیت کو ان سے کافی نقصان پہونچا مگر اس کی ذمہ دار خود مذہبیت ہے۔ ان یزدانی مفکروں نے یہ بحثیں اس عنوان سے چھیڑی تھیں کہ اُن کے پڑھنے والے ان الہامی کتابوں کے بیانات کی طرف سے بددل ہوتے گئے اور اُن کے دلوں سے اُن کا وقار اندر ہی اندر کم ہوتا گیا۔

معجزوں کی بحث۔ کالنز اور وولسٹن

معجزوں کی بحث اس زمانہ میں تیزی سے چھڑی رہی۔ کالنز اور وولسٹن نے انجیلی معجزوں اور پیشین گوئیوں کی ظاہری حیثیت کے خلاف سختی سے تنقیدیں کیں۔ اُنھوں نے نہایت فرزانگی کے ساتھ معجزات وغیرہ کے فی نفسہ ممکن ہونے یا نہ ہونے کی بحث کو سرے سے نظر انداز کر دیا البتہ بہت سے معجزات کو فرداً فرداً لے کر یہ کہا کہ یہ چیزیں مہمل ہیں یا معجزہ دکھلانے والے کے شایان شان نہیں ہیں۔ ان معجزوں اور پیشین گوئیوں کی ظاہری حیثیتوں کو اس طرح مقدوح کرنے کے بعد اس نظریہ پر زور دیا کہ یہ معجزات درحقیقت استعارہ ہیں حضرت مسیح کے اُن عجیب وغریب و غیر قابل فہم تاثیرات و اعمال کے جن کی انسانی روح میں وہ برابر تخلیق کرتے رہتے ہیں۔

کالنز کو اپنے خیالات کی اشاعت کے سلسلے میں زیادہ مشقتیں جھیلنا نہیں پڑیں البتہ وولسٹن مسیحی معجزات کے متعلق کتاب لکھ کر مصیبت میں مبتلا ہو گیا وہ سڈنی سکس کالج کیمبرج کا فیلو تھا۔ اُس سے یہ اعزاز چھین لیا گیا اور اُس پر لائبل کیس چلایا گیا جرمانہ اور ایک سال قید کی سزا اُسے دی گئی۔ وہ جرمانہ ادا نہ کر سکا اور جیل ہی میں مر گیا۔

ایک دلچسپ واقعہ

وولسٹن نے اس سلسلہ میں جو رسائل لکھے تھے اُنھوں نے عام پبلک پر اچھا خاصا اثر ڈالا تھا۔ اُس کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس سے خالص مذہبی طبقہ کتنا برہم تھا!

وہ ایک مرتبہ خراماں خراماں کہیں گھومتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک خوش وضع نوجوان عورت اُسے ملی۔ بجائے اس کے کہ وہ سلام کرتی اُس نے یہ سوال کیا کہ او بڈھے شیطان تجھے اب تک پھانسی نہیں ہوئی۔ وولسٹن یہ عجیب وغریب سوال سُن کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے حیرت سے دریافت کیا کہ اے نیک خاتون میں تم سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ میں نے تمہاری برہمی کی کونسی بات کی ہے؟ آخر تم مجھ سے اس قدر ناراض کیوں ہو؟ اُس عورت نے بگڑ کر جواب دیا کہ تم نے میرے معین و نجات دہندہ کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ اس سے بڑھ کر برہمی کی کونسی بات ہو سکتی ہے!

برطانیہ کے مشہور تشکیک فلسفی ڈیوڈ ہیوم پر بھی قریب قریب یہی واقعہ گذرا ہے وہ غریب بھی غالباً کسی گڑھے میں گر گیا تھا۔ اُس نے مدد کے لئے پکارا۔ ایک شخص کا ادھر سے گذر ہوا۔ اُس کا تعلق بھی غالباً صنفِ نازک ہی سے تھا۔ اُس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ جس وقت ہیوم نے اپنا نام بتایا تو اس شخص کی طرف سے کہا گیا کہ تو کسی اعانت کا مستحق نہیں ہے تو معجزات کا منکر ہے۔ اگر اپنے اس گناہ سے سچے دل سے تائب ہو جائے تو اس مصیبت سے تجھے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ ہیوم نے ہنس کر اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اس مصیبت سے رہائی حاصل کی۔

ہیوم کا ذکر بیان ضمناً آگیا تذکرہ دولسٹن اور کالنز کا تھا۔ یہ دونوں نئی جماعت میں کچھ بڑے پایہ کے مفکر نہ تھے۔ اوسط درجے کے فہم و دانش کے انسان تھے مگر انھیں اپنے خیالات کی اشاعت میں بہت زیادہ انہماک تھا اس لئے وہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب رہے۔

الہامات پر حملہ

اُس زمانہ میں میتھو ٹنڈل نے ذرا زیادہ وسیع نقطۂ نظر سے الہامات پر حملہ کیا۔

۱۷۳۰ء میں اُس نے کرسچینٹی از اولڈ اکریئیشن، نامی کتاب لکھ کر یہ ظاہر کیا کہ انجیل بطور ایک الہامی چیز کے محض فضول ہے کیونکہ اس سے انسان کے اُس فطری مذہب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جسے خدا نے سب سے پہلے ہم پر عقل کے توسط سے القا کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ جو لوگ الہامی مذہب (عیسائیت) کی اس لئے حمایت کرتے ہیں کہ وہ فطری مذہب کے منافی ہے اور اس طرح عقل و نقل دونوں کی دوہری حکومت قائم کرتے ہیں وہ ایک عجیب استدلالِ مخمصۃ دور میں گرفتار ہوتے ہیں ایک ہی وقت میں وہ ان مقدس کتابوں کی صداقت سے اُن نظریات و قوانین ثابت کرتے ہیں جو اُس میں موجود ہیں اور پھر اُن نظریات کی صداقت کا نتیجہ اس واقعہ سے نکالتے ہیں کہ وہ ان کتابوں میں موجود ہیں۔

انجیل کے متعلق بحث

انجیل پر تفصیلی تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اسے غلطیوں سے پاک ثابت کرنے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ جہاں کہیں مخالفِ عقل بیانات ہوں ان کے لئے لفظی معنی ذبح کئے جائیں اور حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف آیا جائے تاکہ استدلال و برہان کی خلاف ورزی نہ ہو۔ انجیلوں میں جو واقعاتی اور طبیعیاتی غلطیاں بیان کی جاتی ہیں اور جن سے اس کتاب مقدس کے محفوظ عن الخطا ہونے پر صدمہ پہونچ سکتا ہے اُن کا جواب دیتے ہوئے ایک بشپ نے لکھا تھا کہ انجیل میں خدا انسانوں کے خیالات اور تصورات کے مطابق گفتگو کرتا ہے کیونکہ وحی والہام کا یہ کام نہیں ہے کہ ان معاملات میں اُن کے ادراک کی تنقید کرے۔ ٹنڈل نے اس کا جواب حسبِ ذیل دیا ہے۔

"اس جگہ دو دام ہیں ایک تو ہماری غلط منطق اور فصاحت و بلاغت کی اصلاح نہ کرنا اور دوسرے یہ کہ خود اُن کا استعمال کرنا دوسرے لفظوں میں ایک بات تو یہ ہوگی کہ ان چیزوں کے متعلق ہمارے غلط تخیلات کی اصلاح نہ کرنا اور دوسرے یہ کہ انھیں کے مطابق گفتگو کر کے اُن کو اور مضبوط بنا دینا۔ اس مقدمہ کی تمہید کے بعد وہ نہایت بیباکی سے یہ پوچھتا ہے کہ اس دوسری صورت کا استعمال خدا کیوں کرتا ہے؟ کیا غیر محدود و غیر متناہی عقل اس ذلیل تدبیر کا استعمال کئے بغیر انسانوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔"

ٹنڈل نے عیسائیت کے تنہا ناجی ہونے کے نظریہ کی بھی سختی سے تنقید کی وہ کہتا ہے "کیا ایسے شخص کے متعلق جو بہشت کا دروازہ اُن لوگوں کے لئے بند کرتا ہے جو دلیل و برہان کے فتووں کی پابندی کرنے والے ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نجات دہندہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔"

ٹنڈل نے انجیل کی اس قسم کی بہت سی باتوں کی جن سے خدا کے وجود ہونے پر دھبہ آتا ہے تنقید کی ہے۔

وولسٹن اور کالنز کے مقابلہ میں ٹنڈل زیادہ نکتہ رس اور دقیقہ سنج تھا۔ اُس کی تنقیدوں میں زیادہ وزن تھا اس لئے اُس کی تحریروں سے مذہب کو نقصان پہونچا۔ گو عیسائیت کی بنیاد ڈھیلا ہونا شروع ہو گئیں اور تیزی سے نئی جماعت کے خیالات کو فروغ ہونے لگا۔

نغمۂ زندگی

Longfellow

از لانگ فیلو

ترجمہ ایم، اے شیخپوروی

غم آگین لہجہ میں تم مجھ سے یہ نہ کہو ۔۔
زندگی ایک بے کیف خواب ہے!
اور روح موت کی نیند سو جاتی ہے!
اور دنیوی اشیاء درحقیقت ویسی نہیں جیسی بظاہر نظر آتی ہیں۔
نہیں بلکہ زندگی حقیقت ہے، ایک مبین حقیقت،
اور عالم وجود کا ایک ضروری عنصر!
اور فنا اس کی منزل مقصود نہیں،
اور روح کی آواز ہرگز یہ نہیں ہے کہ
تم مٹی سے بنے ہو اور مٹی میں مل جاؤ گے
خوشی اور غم
نوشتۂ تقدیر نہیں، بلکہ سعی عمل
اور ہماری آفرینش کا منشاء
شاہراہ ترقی پر ہر نقش قدم اول نمایاں کرنا ہے،
کیونکہ ہر "آج" جلد ہی "کل" ہو جائے گا۔
کام بہت زیادہ ہیں،
اور رخش وقت تیز گام،
ہمارے دل اگرچہ قوی ہیں،
لیکن اس ڈھولک کی مانند
جو کوچ کا نقارہ
ہر ساعت قبر سے قریب تر پیٹ رہا ہے۔
دنیا کے وسیع میدان کارزار میں،
غلامی کی سنہری زنجیروں میں مقید،
اور ایک معصوم بھیڑ کی طرح قید بند ہیں
جبکہ ہمیں رہنا چاہیئے۔
بلکہ ایک اولوالعزم اور ایک نامور ہیرو کی طرح
میدان کشمکش میں"

زندگی کو زریں اور خوشگوار بنانا چاہیئے۔
کیونکہ قوم کی بہبود اور فلاح کا مدار اسی میں ہے
مستقبل کی درخشانی پر امید نہ رکھو،
اور ماضی کا غم خواب پریشاں کی طرح بھول جاؤ۔
زمانۂ حال میں وسعت تخیل اور علوہمتی سے نمایاں کام انجام دو۔
اور مسلسل جد و جہد کرو اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دو۔
مشاہیر عالم کی سوانح حیات
ہمیں درس دیتی ہیں کہ ہم اپنی زندگی خوشگوار بنا سکتے ہیں
اور اپنی داستان معاشقہ کے رنگین اوراق
اور اپنے علوئے تخئیل و جلال و تمکین کے گیت
اور اپنی عظمت و الوہیت کے طمطراق
اور اپنے نقوش پا،
زمانہ کی ریگ زار پر انہیں کی طرح چھوڑ سکتے ہیں۔
شاید کوئی خستہ دل انسان،
زندگی کے بے پایاں سمندر پر
ان نقوش پا کو دیکھ کر اپنی شکستہ ہمت پھر استوار کر سکے!
اس لئے ہمیں علوہمتی اور جانبازی سے میدان عمل میں گامزن ہو جانا چاہیئے۔
اور قسمت کے اوراق کو الٹنے کے لئے مقابلہ کرنے والا دل پیدا کرنا چاہیئے۔
اور نتیجے کا استقلال سے انتظار کرنا لازمی ہے۔

ہمیں حصول مقصد کے لئے مسلسل جد و جہد کرنا چاہیئے۔
ہماری آرزوؤں اور تمناؤں پر رنگین پھولوں کی بارش ضرور ہوگی۔
اس لئے پھر اب یہ نہ کہو کہ
زندگی ایک بے کیف خواب ہے، اور صرف خواب پریشان۔

کل کی بات

یہ جناب فراق گورکھپوری کے آنجہانی والد کا کلام ہے اور اسے تبرکاً اس لئے شائع کیا جارہا ہے کہ اس میں وطن پرستی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اور وہ چیز ہے جو ہر محبِ وطن کے لئے مفید ہے۔ (مدیر)

نہ قصہ ہے یہ کابل، بُت شکن کا　　نہ ہے ماجرا ملکِ چین و ختن کا
نہ روما کا ذکر اور نہ باغِ عدن کا　　سناتا ہوں میں حال اپنے وطن کا
کبھی تھا یہ ہندوستاں رشکِ جنت
یہاں جگمگاتا تھا تاجِ حکومت

ہر ایک ملک پر اس کو حاصل تھی عظمت　　کھٹکتی تھی ہر آنکھ میں اس کی دولت
نہ تھی قوم فاتح کی تابع رعیت　　یہیں کا تھا حاکم یہیں کی حکومت
اسی کی ہر ایک ملک میں گفتگو تھی
ہر اک باغ میں اک اسی گل کی بو تھی

نہ یاں اہلِ جور و ستم کا گزر تھا　　نہ بادِ مخالف کے جھونکوں کا ڈر تھا
فقط ہندیوں کا یہاں کر و فر تھا　　نہ کھٹکا نہ خطرہ نہ فتنہ نہ شر تھا
بہت مطمئن تھی یہاں زندگانی
ٹپکتی تھی ہر شکل سے شادمانی

خود اپنا ہی جاہ و حشم دیکھتے تھے　　شجاعت کی تیغِ دو دم دیکھتے تھے
شرافت کا اونچا علَم دیکھتے تھے　　رذالت کے سر کو قلم دیکھتے تھے
شگفتہ رعایا کے دل کا کنول تھا
گلے تھے، نہ شکووں کا کوئی محل تھا

یہیں کے بخارات اٹھتے تھے پیہم　　یہیں ابر بن کر برستے تھے چھم چھم
مویشی بھی آزاد تھے مثلِ ضیغم　　ہرے جنگلوں میں وہ پھرتے تھے ہر دم
ہر اک سمت تھیں کھیتیاں لہلہاتی
مچلتی تھی ذروں میں روحِ نباتی

یہیں کاٹتے تھے یہیں ہم تھے بوتے　　یہیں کے تھے سامان یہیں با فر ہوتے
یہیں جاگتے تھے یہیں ہم تھے سوتے　　یہیں ہم تھے ہنستے یہیں ہم تھے روتے
حریفوں میں لُٹتا تھا سونا نہ غلّہ
کسی کا بھی اونچا نہ تھا ہم سے پلّہ

گرانی نہ تھی یاں نہ تھی خشک سالی　　نہ ابرِ بہار کی یہ گھٹائیں تحبّیں کالی
نہ تھا عدلِ شاہانہ وعدے خیالی　　یہ تھی سلطنت ہند کی بھولی بھالی
ہوا امن کا تھی بھرپور ارزانی
رعایا تھی جنگل میں منگل مناتی

نہ تھا سخت قانون کا تازیانہ　　نہ کھٹکے میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
ہر اک عدل و انصاف میں تھا یگانہ　　ہر اک بزم تھی غرقِ چنگ و چغانہ
تکلف سے آزاد ان کا چلن تھا
عجب ان کے انداز میں سادہ پن تھا

نہ فتنوں کے پیدا نشاں تھے کہیں پر　　نہ بے وجہ پڑتی شکن بھی جبیں پر
نہ تکرار ملت میں حجت نہ دیں پر　　گڑا صلح کل کا تھا جھنڈا زمیں پر
لگدکوبِ دوراں سے محفوظ تھے وہ
اخوت کے سائے میں محظوظ تھے وہ

زباں پر کسی کی شکایت نہیں تھی　　نظر میں کسی کی حقارت نہیں تھی
بھلائی سے گذریں یہ عادت نہیں تھی　　برائی پہ آئیں یہ خصلت نہیں تھی
وہ منشائے فطرت کو پہچانتے تھے
غنیمت شرافت کو وہ جانتے تھے

اگرچہ یہاں ہوتی تھی بت پرستی　　مگر سایہ افگن تھی رحمت خدا کی
ہرے کھیتوں میں لہلہاتی تھی کھیتی　　نہ پالے سے مرتی نہ سوکھے سے جلتی
ہمیشہ برستا تھا رحمت کا پانی
کسانوں کو پڑتی نہ تھی خاک چھانی

پرائے دھنوں پر نہ ان کی نظر تھی　　نہ مائل طبیعت سوئے سیم و زر تھی
غلامی سے وہ زندگی بے خبر تھی　　توکل پرستی پہ طبع بشر تھی
سلف میں یہی ہندیوں کا چلن تھا
اسی سادگی میں چھپا بانکپن تھا

جو اس ملک کی جاہ و ثروت بڑی تھی　　تو آنکھ اس کی غیبا فلک کی کڑی تھی
ترقی دولت یہاں ہر گھڑی تھی　　ہر اک قوم میں کھلبلی سی پڑی تھی
تمنا تھی لوٹوں سے گھات پاکر
دھرو بیاں کی دولت کو گھر میں اٹھا کر

منشی گورکھ پرشاد آنجہانی عبرت گورکھپوری

کلیم پر تنقید

خود کلیم کے لئے

مرزا "صادق"
بی اے

ادارۂ کلیم خواہشمند ہے کہ کلیم کے مطالعہ کرنے والے اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ جہاں تک کہ راقمِ سطورِ ہذا کا تعلق ہے اس کی حیثیت محض ایک طالب علم کی ہے۔ کسی ایسے مہتم بالشان رسالہ کے مضمونوں اور مضمون نگاروں کے بارے میں اظہار رائے کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ تاہم بایں امید کہ شاید ذیل کے خیالات ادارۂ کلیم سے تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سطورِ ذیل سپردِ قلم کی جاتی ہیں۔

(۱) حضرتِ جوش کی نظمیں

جس وقت کلیم کے اجراء کا اعلان ہوا ہے اور یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے مدیرِ خصوصی حضرتِ جوش ہوں گے۔ نہ صرف میں بلکہ بہت سے حضرات جن سے میں واقف ہوں۔ رسالہ کے شائع ہونے کے بےچینی سے منتظر ہو گئے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ اس ذریعہ سے حضرتِ جوش کی رنگیں نوائیوں کے تازہ شاہکار پڑھنے کی اُمید تھی۔ لیکن افسوس کلیم کے قریب ایک سال کے اجراء کے بعد بھی اس اُمید نے واقعہ کی صورت نہیں اختیار کی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ جوش نے اپنی نظموں کے ذریعے سے اُردو شاعری میں ایک تخیلی انقلاب پیدا کر دیا ہے، اُنھوں نے اس داغ بیل جو نظیر اکبر آبادی۔ حالی، اور اقبال نے ڈالی تھی ایک شاہراہ بنا دی۔ ہمارا دیکھتے ہی دیکھتے شعرائے اردو کا رجحان غزل۔ قصیدہ، اور مثنوی سے ہٹ کر اس صنفِ شاعری کی طرف ہو گیا ہے۔ جس کو اصطلاحاً نظم کہتے ہیں۔

خیالات کی ندرت، الفاظ کی رنگینی، بندشوں کی جدت۔ طرزِ ادا، نرالا پن مضامین کا انتخاب، شاعری میں مصوری، انقلاب کا پیام۔ وطن کا ترانہ، غرض کسی بات کو لے لیجئے۔ حضرتِ جوش امتیازی جگہ پر نظر آتے ہیں اُن کی کوئی نظم اُٹھا کر دیکھئے۔ بار بار پڑھئے، ہر بار ایک نیا لطف آتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہوتی ہے کہ وہی نظمیں جو اخبارات و رسائل میں عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہیں، کلیم میں دوبارہ نکل رہی ہیں۔

(۲) حضرتِ جوش کے "اشارات"

جہاں تک کہ نثر نگاری کا تعلق ہے، حضرتِ جوش نے میرے خیال میں اس میں کوئی خاص شہرت نہیں حاصل کی ہے۔ اِن کا وہ خطیبانہ تحریر جو ہر ماہ کے کلیم میں "اشارات" کے تحت نظر آتا ہے۔ میری را-

میں بہت کچھ اصلاح کا محتاج ہے۔ اس کو پڑھکر مجھے مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کی خشک نولیسیاں اور پند آفرینیاں یاد آتی ہیں۔ دونوں طرز تحریر یکساں طور سے طبیعت کو منغص کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ طبیعت اس لئے منغص نہیں ہوتی کہ اپنی زندگی کی بد اندیشی اور بے راہ روی یاد آتی ہے ——— اگر ایسا ہوتا تو پھر شکایت ہی کیا تھی ——— بلکہ اس لئے منغص ہوتی ہے کہ خطیب اپنے مخاطب کو کندۂ ناتراش اور جاہل محض تصوّر کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا فلسفے کی رفعتوں اور تاریخ کی بلندیوں سے پیغمبرانہ شانِ الوہیت سے گھرا ہوا اپنے ان ہم جنسوں سے خطاب کر رہا ہے جو نیچے، بہت دور، دنیا داری، طلبِ منفعت، کوتاہ بینی، اور خود غرضی کے قعرِ مذلت میں پڑے ہیں، لیکن ہیں ہمہ تن گوش۔ یہ طرزِ ادا اُس مقصد میں معاون نہیں ہو سکتا جس کے لئے "اشارات" تحریر کئے جاتے ہیں۔ حضرت جوش اہلِ ملک سے اُن کی پست خیالیوں کی وجہ سے متنفر ہیں۔ اُن کو امرار، علمار، شعرار، یا کسی دوسرے گروہ میں ترقی کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ اس بات کا احساس اُن کے دل میں نہایت شدّت اور انتہائی جوش کے ساتھ پایا جاتا ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹا واقعہ جو اہلِ ملک کی بے راہ روی کی وجہ سے مفادِ قومی کے خلاف رو نما ہوتا ہے۔ حضرتِ جوش کے خون کو کھولا دیتا ہے اور اُن کے دل کی گہرائیوں میں خار کی طرح چبھتا ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کا سا حسّاس اور حبِّ وطن سے بھرا ہوا دل ہر اُس شخص کا ہو جائے جس کو اُن کے خیالات کا علم ہو، یہی وہ باتیں ہیں جو "اشارات" کے مطالعہ کرنے والے کے دل میں پیدا ہوتی ہیں اور بس۔ اُن کے خیالات تخریبی ہیں تعمیری نہیں۔ افسوس کہ وہ مقصد جو "اشارات" کی تحریر میں پنہاں ہے پورا نہیں ہوتا، یعنی قارئین کی حالت کو درست کرنے میں "اشارات" مطلق معاون نہیں ہوتے۔ میرے خیال ناقص میں اس کے لئے اُن کی شاعرانہ ذہنیت ذمہ دار ہے۔ مسائلِ دنیا کو شاعر جس انداز میں بیان کرتا ہے، اسی انداز کو انھوں نے نثر میں قائم رکھنا چاہا۔ "نقادِ سخن"، "ذاکر سے خطاب" اور "خاتونِ مشرق" ایسی نظمیں ہیں جو اُردو کی کلاسیکی شاعری میں جگہ پانے کی مستحق ہیں، لیکن اگر وہی اندازِ بیان جو ان نظموں میں اختیار کیا گیا ہے، نثر میں اختیار کیا جائے تو وہ نثر یقیناً کسی سنجیدہ مزاج آدمی کے پڑھنے کے قابل نہ ہوگی۔

کلیم کے مطالعہ کرنے والوں میں، میرے خیال میں، زیادہ تر اس گروہ کے لوگ ہیں جو نئی روشنی والوں کا گروہ کہا جاتا ہے۔ نئی روشنی والوں میں عقل اور منطق دلائل اور استخراجِ نتائج بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس گروہ میں واعظ اور خطیب کا گزر نہیں۔ اس لئے اگر حضرتِ جوش اپنے خطیبانہ اور واعظانہ اندازِ تحریر کو بدل کر وہ رنگ اختیار کریں جو دل کے بجائے دماغ پر اثر کرے تو اُن کا مقصدِ اصلاح بدرجۂ اتم پورا ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے، گو ابھی تک حضرتِ جوش نے "اشارات" میں اپنے مخاطب کو "تم" سے خطاب نہیں کیا ہے، لیکن اگر یہی اندازِ بیان قائم رہا تو کسی نہ کسی دن اس ذلت سے بھی سامنا کرنا ہوگا۔ مولانا شبلی، ابو الکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی سے لے کر معمولی سے معمولی مصنف یا مضمون نویس کتاب یا مضمون کے پڑھنے والے کو "تم" سے خطاب کرتا ہے۔ اس سے ہم پڑھنے والوں کے جذبۂ خودداری کو سخت ضرب پہونچتی ہے۔ اس طرزِ خطاب سے جو روحانی تکلیف پہونچتی ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے ہو سکتا ہے، ایسے مصنفین اور مضمون نگاروں سے میں سوال کرتا ہوں کہ اگر کوئی آپ میں سے کسی سے یہ کہے کہ "تم نے مضمون بہت خوب لکھا" تو آپ اُس شخص کے متعلق کیا خیال کریں گے، بس وہی خیال ہمارے دلوں میں بھی پیدا ہوتا ہے۔

یہ الفاظ محض بہ خیالِ حفظِ ماتقدم عرض کر دئے گئے۔

(۳) مُلّا رموزی

جب کسی انگریزی کتب خانہ میں مجھے پروفیسر میکس مولر کی موٹی موٹی کتابیں نظر آتی ہیں تو میرے دل میں ایک وحشت آمیز جذبۂ نفرت پیدا ہوتا ہے اور منتظمینِ کتب خانہ کی بد مذاقی پر متاسف ہو کر میں جلد سے جلد کتب خانے سے رخصت ہوتا ہوں یا جب انجمن ترقیٔ اردو کی کتابوں میں "ملا وجہی" اور "سبرس" قسم کی کتابیں دیکھتا ہوں تو بھی میرے دل میں ناموافق جذبات کا ہیجان شروع ہو جاتا ہے، اسی طرح جب میں اردو رسائل یا اخبارات میں

ملّارموزی کا کوئی مضمون دیکھ لیتا ہوں ——— ملّا صاحب مجھے معاف فرمائیں ——— تو میرا توازنِ دماغی قائم نہیں رہتا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اب تک ملّائے موصوف اخبارات اور رسائل کے حلقۂ ادارت میں سجدہ گاہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ملّا رموزی بہت مقبول تھے، لیکن اب بفضلہٖ اُردو ظرافت نگاری اور طنز نویسی کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے، اور ملّا رموزی اب بھی "اندر اس کے کے" "بیچ اس کے ہیں" "یہاں بہمہ وجوہ خیریت ہے" اور "دیگر احوال یہ ہے" کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ظرافتِ ذہنی، طنزِ شگفتہ، اور مضحکاتِ شیریں کا شائبہ نہیں پایا جاتا ہے۔ جن معاملات پر وہ نکتہ چینی کرنا چاہتے ہیں اُن کا انتخاب بعض اوقات ناموزوں ہوتا ہے۔ اِس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ ملّا صاحب اس ذہنی انقلاب کے ساتھ ساتھ نہیں چل رہے ہیں، جو ملک میں عرصے سے رُونما ہے، اور بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخبارات و رسائل کے ادارت خانے ملّا صاحب کو قلم برداشتہ لکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور نتیجہ ظاہر ہے۔ الفاظ اور پوشاک، طرزِ تحریر اور اندازِ پوشش میں قوموں کی ترقی کا راز مضمر نہیں ہے۔ تہذیب و تمدن، زبان و مذہب اِن سب کی بقا کا راز عمل اور صرف عمل میں ہے، لکھنے والوں کے فقدان سے مجبور اور ملّائے موصوف کی گزشتہ شہرت سے مرعوب ہو کر ادارۂ کلیم نے بھی اُن کے ——— بقول اہلِ پنجاب ——— "شاہکاروں" اور "جواہر پاروں" کے لئے جگہ نکالی لیکن انتخاب کچھ موزوں ثابت نہیں ہوا۔ ملّائے موصوف اپنے ایک مضمون میں تاجروں اور دوکانداروں کے سائن بورڈوں پر بہت ناراض ہیں۔ لیکن جو لوگ اشتہار نویسی کی نفسیات سے واقف ہیں وہ تاجروں کی پابندیوں اور مجبوریوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تاجر خواہ اردو کی ترقی اور ترویج پر جان دیتا ہو، لیکن وہ اپنا اشتہار یا سائن بورڈ ان لوگوں کے واسطے تیار کرائے گا، جو اس کے خریدار ہیں۔ ولایت کے کسی پیٹنٹ دوا کے بکس کو کھولئے، دوا کی ترکیب استعمال اور اس کا اشتہار آپ کو ہندوستان کی ایک درجن زبانوں میں نظر آئے گا۔ دُور کیوں جائیے، ہندوستانی دواخانہ نے اردو ناگری اور انگریزی میں اپنے یہاں کے پمفلٹ شائع کرنا شروع کردئے ہیں۔ ایسا کرنے سے اشتہار دینے والا یا دوکاندار ہرگز اپنی زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ لیکن ملّا رموزی کو انھیں لوگوں کے کاندھوں پر اُردو کا جنازہ نظر آتا ہے۔ دہلی کے بعض تاجروں کے سائن بورڈ دیکھ کر اُن کا توسنِ فکر چراغ پا ہوتا ہے۔ وہ خدا جانے کیا کیا لکھ مارتے ہیں۔ تاجروں کے سائن بورڈوں اور طلباء کی انگریزی آمیز گفتگو میں ان کو اردو کی موت نظر آتی ہے، اِس قدر نا اُمید ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ایسے فضول اعتراضات اُردو کی ترویج میں معین ہو سکتے ہیں۔ میں نے ایک بار پروفیسر اشتیاق حسین ——— نام مجھے صحیح طور سے یاد نہیں ہے ——— کا لکچر فتحپوری ہال میں سُنا تھا جب وہ تازہ ایران سے واپس تشریف لائے تھے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ایران کے بازاروں میں جو زبان بولی جاتی ہے اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ اہلِ ایران گفتگو میں بکثرت فرانسیسی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر مصری اخبارات ہمارے ملّا صاحب کے مطالعے میں ہیں تو ان کو احساس ہوا ہوگا کہ اطالوی فرانسیسی اور انگریزی الفاظ کس طرح رفتہ رفتہ مصری زبان میں داخل ہوتے جا رہے ہیں۔ آج کل جب دنیا کی طنابیں روز بروز کھنچی چلی جا رہی ہیں، ریل، ہوائی جہاز، تار، لاسلکی، سینما، وسندیو تمام ممالک کو ایک شہر بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں ایسے زمانے میں یہ اُمید کرنا کہ کوئی زبان خالص رہے اور دوسری زبان کی دست نگر نہ ہو ایک مضحکہ خیز خیال ہے، دراصل افراط و تفریط ہر موقع پر اور ہر جگہ غیر مفید ہیں۔ ہمارے ملک میں دو گروہ ہیں جن سے مجھ کو بغض للّہی ہے، ایک وہ جو ہندوستانی ہوتے ہوئے خود کو بالکل انگریز تصور کرتا ہے، اور دوسرا وہ جو دنیا کا باشندہ ہوتے ہوئے خود کو صرف ہندوستانی سمجھتا ہے، دونوں غلطی پر ہیں۔ آخر الذکر گروہ ہر ممکن طریقے سے ان لوگوں کا مضحکہ اُڑاتا ہے جو انگریزی داں ہے، شاید وہ اس طرح اپنی انگریزی سے عدمِ واقفیت پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی انگریزی داں "لالٹین رکھی ہے" کے بجائے "لین ٹرن رکھی ہے" کہے تو ملّا رموزی اور ان کے ہم خیال اُردو کی موت کی پیشین گوئی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی عربی داں اُردو میں گفتگو کے دوران میں عین کی آواز حلق سے نکالے یا صاد کا تلفظ لبوں کے درمیان میں زبان لا کر کرے تو ملّا صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور یہی وہ ہندوستانیت ہے جس پر مجھے اعتراض ہے۔

گفتگو میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی ملائے موصوف کے نزدیک اُردو کو گلا گھونٹ کر قتل کرنے کے مرادف ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ جو جس فضا میں رہتا یا تربیت پاتا ہے اس کا اثر اس کی گفتگو پر بھی پڑنا ضروری ہے۔ انگریزی مدارس کے طلباء قدرتاً اردو گفتگو میں بھی ضرور انگریزی الفاظ استعمال کریں گے۔ یہی حال عربی مدارس کا ہے۔ عربی مدارس کے طلباً کے گروہ میں اگر آپ بیٹھ جائیں مگر ہوں آپ عربی سے ناآشنا تو آپ کو ان کی گفتگو سمجھنے میں بہت دقت ہوگی۔ طلباء بعض اوقات انگریزی اردو یا عربی فارسی ہی پر قانع نہیں رہتے ہیں۔ اکثر اپنے گوناگوں خیالات کو الفاظ میں لانے کی خاطر وہ نئے الفاظ اختراع کر لیتے ہیں جو آپ کو کسی زبان کی لغت میں نہیں ملیں گے اور اگر ملیں گے بھی تو ان کے وہ معنیٰ نہ ہوں گے جن معنوں میں طلباء بولتے ہیں۔ جن لوگوں کو علیگڈھ کالج یا یونیورسٹی میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے ان کو بکثرت ایسے الفاظ معلوم ہوں گے مثلاً چھاپنلزم۔ لفٹ دینا، بھیا سوسائٹی، ٹیٹو کلب وغیرہ وغیرہ۔ اسی قسم کے الفاظ چلا پانے کے بعد زبان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً زید بڑا بدھو ہے یا بکر تو بالکل ڈوٹ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بدھوؔ اور ڈیوٹؔ کے الفاظ مذکورۂ بالا معنیٰ میں ابتدا سے نہیں بولے جاتے ہیں بلکہ رفتہ رفتہ زبان نے ان کو قبول کر لیا۔ الفاظ کے استعمال کو بالائے طاق رکھئے۔ کسی انگریزی داں کی اردو عبارت کا موازنہ کسی غیر انگریزی داں کی عبارت سے کیجئے۔ خواہ تمام الفاظ اردو ہی کیوں نہ ہوں لیکن آپ کو طرزِ ادا میں بیّن فرق نظر آئے گا پھر بہت سے الفاظ بھی ایسے ہوتے ہیں جن کو بلا قبول کئے ہوئے کام نہیں چلتا ہے۔ پروپیگنڈا اور ریڈیو کے الفاظ آج کل ہر شخص کی زبان پر ہیں لیکن کسی اردو کے بہی خواہ نے اردو کے ایسے الفاظ نہیں بتلائے جو ان کی جگہ استعمال کئے جا سکیں اور سندِ قبول حاصل کر سکیں۔

یوں نہیں تو ملا رموزی کا پارۂ مزاج سب سے اونچے درجہ پر پہونچ جاتا ہے جب وہ انگریزی پوشاک کی تضحیک پر قلم فرسائی فرماتے ہیں۔ صرف ملا رموزی ہی پر منحصر نہیں بلکہ اکثر قدامت پرست حضرات اس مضمون پر گہر فشانی فرمانے میں ظرافت اور طنز کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ پوشاک کے متعلق بہت سے ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس موقع پر زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے تاہم بعض ضروری امور کے متعلق گزارش لازمی ہے۔ اگر پوشاک کی تدریجی اور ارتقائی ترقی کا افسانہ اس وقت سے شروع کیا جائے جب چھال اور پتے ستر پوشی کا کام دیتے تھے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف قسم کی پوشاکیں استعمال ہوتی رہی ہیں۔ اور ابتدا سے اب تک برابر تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ جو پوشاک اس وقت قدامت پرستوں کے گروہ میں مقبول ہے گزشتہ صدی کی پیداوار ہے۔ اگر پوشاک تبدیل ہوتی رہتی ہے تو ملا رموزی اور ان کے ہم خیال حضرات کیوں ترقی پسند گروہ کی راہ میں اپنے مضحکات و طنزیات کا روڑا اٹکا کر اپنی قدامت پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ سوسائٹی کے بعض افراد پر سراسر ظلم کر رہے ہیں۔ ملا صاحب چاہتے ہیں کہ ایک کسان جب وقت کھیت پر ہل لے کر جائے یا مزدور کسی کارخانے میں کسی مشین پر کام کرنے جائے تو وہ پاجامہ پہنے ہو، اچکن ڈانٹے ہو، کاندھے پر رومال پڑا ہو، اور ایک کشتی نما فتی کی ٹوپی سر پر رکھے ہو۔ یا کالج یا اسکول کے لڑکے جب ہاکی یا فٹ بال کھیلنے نکلیں تو جبہ و دستار سے مزین ہوں، یا فوج کا یا پولیس کا سپاہی جب قوا عد کرنے کے لئے میدان کی طرف رخ کرے تو اس کے کرتے کا دامن زمین بوسی کرتا ہوا چلے۔ اگر وہ ایسا نہیں چاہتے ہیں تو وہ میرے ہم خیال ہیں۔ اور اگر وہ میرے ہم خیال ہیں تو پھر ان کی تمام ظرافت آفرینیاں بے سود ہیں۔

کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے لیکن میں بہ ادب ملا صاحب سے عرض کروں گا کہ پوشاک کا جمالیاتی پہلو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانے میں مخترعینِ پوشش نے اس پہلو کو بھی ضرور پیش رکھا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انگریزی پوشاک پر جو اعتراض کرتے ہیں وہ قدامت پرستی سے مجبور ہو کر ایسا کرتے ہیں یا حقیقتاً وہ خوبیاں اس پوشاک میں نہیں پائی جاتیں جو ہونی چاہئیں۔ اس کا فیصلہ میں ملا صاحب پر چھوڑتا ہوں۔

ہمارے ملک میں نوجوانوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو پوشاک میں نسوانیت کا قائل ہے جس طرح گروہ صوفیا میں ایک اسی قسم کا گروہ تھا ملا صاحب اس گروہ کے بہت خلاف ہیں اور گو ان کے حملے ناموزوں اور طنز بھدے ہوتے ہیں تاہم عمومی حیثیت سے میں ملا صاحب کا بالکل ہم نوا ہوں۔ ایسی پوشاک میں جائز سمجھتا ہوں جو مردانہ حسن کو چار چاند لگائے لیکن ایسی پوشاک جو نوجوانوں کو ہیجڑا کہے جانے کا مستحق قرار دے سراسر مذموم ہے۔

کچھ عرصہ سے ملائے موصوف نظم کی طرف مائل نظر آتے ہیں لیکن میں

یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی نظمیں ابھی کلیم میں جگہ پانے کے قابل نہیں ہیں کسی دریا پر جانا، گھاٹ پر یا راستے میں کسی حسینہ سے مڈبھیڑ اُس کی شرمائی اور دبی للچائی ہوئی نظروں کی مواصلت، ساڑی کا ڈھلکنا، ماتھے کی بندی، پھولوں کا گجرا یا فال، ایک فرسودہ اور پامال شدہ مضمون ہے۔ ملا صاحب کلیم کے ایک نمبر میں اس پر طبع آزمائی فرماتے ہیں، اور نباہِ لفظی کے لئے ایک مصرع دوسرے مصرع کا محتاج رہتا ہے۔ اظہارِ مفہوم کے لئے الفاظ تلاش کئے جاتے ہیں اور نہیں ملتے تشبیہات بھدی ہیں خیالات منتشر ہیں لیکن وہ نظم کلیم کے رسالے میں شائع ہوتی ہے

(۴)

اردو از مولانا محمود علی ماہر

زبانِ اردو کی تشبیہ ایک دولہن سے ——— شاید یہ حضرت آزاد کی جدت تھی۔ ان کے بعد بہتوں نے اسی تشبیہ کو اردو کا ذکر کرنے میں اختیار کیا۔ یہاں تک کہ اب اگر اس کا اعادہ کسی مضمون میں کیا جاتا ہے تو اس کے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کلیم کے ایک پرچے میں ماہر صاحب نے پھر وہی داستان دہرائی ہے۔ اردو کو نئی نویلی دولھن بنایا ہے۔ اس کے سہاگ کی رات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے شباب اور جوانی کا نقشہ کھینچا ہے ——— وہی پرانا قصہ۔ وہی فرسودہ کہانی حضرت آزاد نے شاہجہان کے زمانے سے ابتدا کی۔ کسی صاحب نے اس کو خلجی بادشاہوں تک پہونچایا۔ کسی نے محمود غزنوی کو اردو بولتے سنا ابھی بعثتِ رسول سے ہم زمانہ ثابت کرنے والے پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے کہ کلیم کے مضمون نگار نے مہاراجہ بکرماجیت کے زمانے میں عربی اور فارسی الفاظ کا اس زمانے کی زبان میں داخل ہونا بیان کیا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ دعویٰ غلط ہے اس لئے کہ یہ ایسا مضمون ہے جس پر میرا خود سر دماغ غور کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوتا ہم دلیل محتاجِ ثبوت تھی صاحبِ مضمون کو پرتھی راج راسا جس کا حوالہ دیا ہے اکا اقتباس دینا تھا۔ اور بفرضِ محال اگر اس وقت فارسی یا عربی کے دو چار لفظ استعمال بھی کئے گئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ ہندوستان اور عرب و ایران میں تجارتی تعلقات قائم تھے۔ وقتاً فوقتاً اہلِ ایران سے لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ممکن ہے کہ دو چار لفظ رواج پاگئے ہوں، لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ زبان کی ابتدا بھی اسی زمانے سے ہوئی۔ اردو کے قیام اور اس کی زیست کے لئے اس کی قدامت کوئی دلیل نہیں ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اردو کی ابتدا کسی قدیم ترین زمانے سے ثابت کر دیں تو یہ بات اُس کے بقا میں معاون ہوگی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اگر زبان میں صلاحیت زیست ہے تو کسی قسم کا پروپیگنڈا اس کو مردہ نہیں کر سکتا اور اگر اُس میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو اس کی تاریخ کی انتہائی قدامت بھی اس کو زندہ نہیں رکھ سکتی۔

(۵)

آربندو گھوش

ہم میں سے جو لوگ گزشتہ صدی عیسوی میں پیدا ہوئے ہیں ان کی یاد میں اربندو گھوش نے پہلے پہل قضیۂ تقسیمِ بنگال میں شہرت حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ان کا ذکر محض پانڈیچری کے سنیاسی کی حیثیت سے باقی رہ گیا ہے۔ دنیا اور مسائلِ دنیا کے متعلق ان کا نظریہ کیا ہے سیاسیات میں ان کی روش کیا ہے۔ مذہب کے متعلق ان کے خیالات کیا ہیں، فلسفہ کی گہرائیوں میں وہ کہاں تک پہونچے ہیں۔ ان تمام سوالات کے جوابات سے اردو دان طبقہ میری رائے میں قطعی نابلد ہے اُن کے مضامین کے ترجمے بہت شگفتہ ہیں۔ نہایت سلیس ہیں لیکن اس شخص کے ذہن میں جو آربندو گھوش کے نقطۂ نظر سے ناواقف ہے بکثرت سوالات ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کے جوابات ان مضامین میں نہیں ملتے ہیں۔ اگر مضامین کی ابتدا سے قبل آربندو گھوش کی زندگی اور ان کے خیالات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جاتا تو یہ وقت باقی نہ رہتی۔ خیر یہ کمی اب بھی پوری کی جا سکتی ہے

(۶)

مردِ مُضحک

مردِ مضحک کے مترجم کو داد دینے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ ایسا شگفتہ، ایسا سلیس، اور اس قدر بامحاورہ ترجمہ کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس کی

روح ترجمے میں بدستور موجود ہے۔ لطیف طنز اسی قوت سے اردو میں بھی نمایاں ہے تفصیلات کے بیان میں ترجمے نے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی۔ ادبی خوبیاں اصل اور ترجمے میں برابر پائی جاتی ہیں۔ یورپی زبانوں سے اس قسم کے افسانوں کے ترجمہ ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے فسانہ نگار باوجود گزشتہ زمانے کی غیر معمولی ترقی کے اب تک اس معیار سے بہت دور ہیں جو یورپ نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ہمارے بعض فسانہ نگار بڑے شد و مد سے اعلان کرتے ہیں کہ ان کا فسانہ تحلیل نفسی کا شاہکار ہے، سیرت نگاری کا در بے بہا ہے۔ رنگینی اور آرٹ کا بہترین نمونہ ہے، یا تخلیق کردار کا انمول موتی ہے۔ لیکن دراصل یہ ہے کہ کسی یورپی زبان کے فسانہ کو اردو کا جامہ پہنا کر ہندوستانی پس منظر کا غازہ لگا کر پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر فسانہ کو پڑھیئے تو ان سب خوبیوں سے کوسوں دور نظر آئے گا جن کے وجود کا اعلان کیا گیا ہے۔ ہمارے فسانہ نگار اب تک واقعات کو سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ مطالعۂ عمیق کی ہر طرف کمی نظر آتی ہے۔ منشی پریم چند نے دیہات کے زندگی کے مطالعہ میں اپنی عمر ختم کر دی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع بھی تھا اور عمیق بھی، لیکن مرد مضحک کے مصنف کے برابر نہیں۔ طوفان کی کیفیت کشتی کا سین، اہل کشتی کے حالات، برف باری کا منظر غرض سب کچھ وسیع اور عمیق مطالعے کا نتیجہ ہے۔ بحر شمالی سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر پڑھنے پر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام واقعات ہماری نظروں کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ ضرورت اور اشد ضرورت ہے کہ ہماری زبان میں اس قسم کے افسانوں کے ترجمے کئے جائیں لیکن مترجم بھی ویسے ہی ہوں جیسے مرد مضحک کے مترجم۔

(۷) حکیم عبدالوالی کا خط

لکھنؤ کے اطبائے جھوائی ٹولہ کے خاندان کے تین افراد کے ناموں میں ـــــ اصحاب متعلقہ معاف فرمائیں ـــــ مجھے ہمیشہ دھوکا ہوتا ہے حکیم عبدالقوی، حکیم عبدالولی، اور مسٹر یا حکیم عبدالوالی۔ میں ایک کو بجائے دوسرے کے سمجھنے لگتا ہوں۔ بہر حال ان تینوں صاحبان میں سے جو صاحب میرے ذہن میں ہیں میں ادارۂ کلیم سے درخواست کروں گا کہ جو معاوضہ بھی ممکن ہو پیش کر کے ان صاحب کو یا تو حلقۂ ادارت میں یا حلقۂ مضمون نگاران میں شامل کر لیا جائے۔ خیالات کی جدت، تحریر کی سادگی، طرز ادا کا بے ساختہ پن عبارت کی شوخی، قدامت سے نفرت، فلسفیانہ موشگافیاں، مضامین کی ہمہ گیری ظرافت ذہنی کی افراط ـــــ غرض کوئی توصیف ایسی نہیں ہے جس کے جوہر ان کا قلم نہ دکھاتا ہو۔ اتنا لکھنے کے بعد میں نے اپنی ایک غلطی محسوس کی۔ ان کو حلقۂ ادارت میں شامل تو ضرور کیا جائے لیکن ان کو انتظامی معاملات سے الگ رکھا جائے۔ ہر ذہین آدمی کی طرح وہ بھی سیماب صفت معلوم ہوتے ہیں۔ میری یاد میں آسمان صحافت پر ان کا ستارہ بارہا طلوع ہوا اور بڑی آب و تاب سے چمکا لیکن .... نتیجہ سب جانتے ہیں۔

(۸) ڈاکٹر اشرف

خواہ آپ کی رائے سے ہمیں اتفاق نہ ہو لیکن یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے خیالات سلجھے ہوئے ہیں، طرز ادا متین ہے۔ عبارت سلیس لکھتے ہیں، درحقیقت کلیم کے سے رسالے کے واسطے ایسے ہی مضمون نگاروں کی ضرورت ہے۔ آپ سوشل، اقتصادی اور سیاسی مسائل کو اس عینک سے نہیں دیکھنا چاہتے ہیں جس سے ہمارے آبا و اجداد سالہا سال سے دیکھتے آئے ہیں۔ پرانی تاریخی کہانیاں اور ان کے متعلق بے سر و پا لاف زنی سنتے سنتے طبیعت اکتا گئی۔ ہر شخص کسی نئے نقطۂ نظر کا متلاشی ہے۔ اور واقعات عالم کو کسی نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف اور عبدالوالی صاحب کے سے مضمون نگار سوچنے اور غور کرنے کے لئے کافی مواد اکٹھا کر دیتے ہیں غالباً ڈاکٹر اشرف پہلے شخص ہیں جنھوں نے سر سید کے متعلق اپنی رائے کا اظہار نہایت جرأت سے کیا ہے۔ سر سید نے اپنے وقتوں میں مصالح ملکی و قومی کا لحاظ رکھتے ہوئے جو کچھ بھی کیا ہو اس کا تجزیہ اور تحلیل کسی مورخ کے لئے چھوڑنا چاہیئے لیکن یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ ان لوگوں کا رویہ کہاں تک حق بجانب ہے جو سر سید کی پالیسی اب بھی سراہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اب بھی لوگ اسی پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔ ہمارا ملک ایک دور انقلاب سے گزر رہا ہے جو مطمح نظر ملک کی ہر جماعت نے قائم کیا ہے اس کے حصول کے لئے اشد ضروری ہے کہ وہ سیاسی غلط فہمیاں اور اقتصادی کج رویاں

منظرِ عام پر لائی جائیں جنھوں نے ایک صدی سے ہماری قومی زندگی کو مصیبت بنا دیا ہے اور ترقی کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں۔

۹ دتاتریہ کیفی

آپ ہماری زبان کے لئے نہایت ٹھوس کام کر رہے ہیں۔ مطالعۂ عمیق آپ کے تمام مضامین کی جان ہے۔ آپ نے اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے مسائل پر کافی غور کیا ہے۔ کوئی مضمون ایسا نہیں ہوتا جس میں کوئی نہ کوئی اچھی اور سودمند تجویز موجود نہ ہو۔ خصوصاً نئے الفاظ کے اختراع میں آپ کو خاص ملکہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ کی تمام تجاویز کو سندِ قبول نہیں حاصل ہو سکتی۔ لیکن پھر بھی بکثرت تجاویز ایسی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے اردو زبان میں قوت، شگفتگی، سادگی، اور زور پیدا ہونے کی قوی امید ہے۔ اسماء سے افعال بنانے کا سوال پرانا ہے۔ وحید الدین سلیم اس کے زبردست موید تھے اور آپ ان کے ہم خیال ہیں۔ مضمون زیر بحث میں بھی آپ نے "سلکانا" اور "آبدوزنا" دو مصدر مشتق کئے ہیں۔ لیکن اردو داں طبقے نے ابھی تک اس قسم کی تجاویز کو عملی جامہ نہیں پہنایا ہے۔ حیدرآباد میں ضرور یہ طریقۂ اشتقاق بہ نسبت شمالی ہند کے زیادہ رواج پانے لگا ہے۔ مگر امید ہے کہ ضرورت بہت جلد شمالی ہند والوں کو بھی اس کو اختیار کرنے پر مجبور کر دے گی۔

۱۰ اردو شاعری از حضرت احتشام رضوی

اردو شاعری کے جدید رجحانات کے متعلق پر مغز اور قابلِ غور مضمون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعرائے قدیم ایک ایسے دور کی پیداوار تھے جب یا تو عیش پرستی کا دور تھا یا اس عیش پرستی کے دور سے رخصت ہو جانے کے غم کا زمانہ تھا۔ شعراء کا دائرہ فکر محدود تھا۔ سوسائٹی جس میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی محض درباری زندگی اور اس کے پر تکلف اور بناوٹی رسم و رواج کی زنجیروں میں مقید تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیگر اصنافِ ادب کی طرح شاعری بھی ایک محبوس قفس پرند کی طرح اپنے تنگ دائرہ میں محدود رہ گئی۔ جتنی جتنی سوسائٹی کی وہ بندشیں دور ہوتی جاتی ہیں، پرانے رسم و رواج کے قیود ٹوٹتے جاتے ہیں۔ قفس کی تیلیاں ٹوٹتی جاتی ہیں۔ شاعری بھی اپنا روپ بدلتی جا رہی ہے۔ اب شاعری شاہی تکلفات کو بھول چکی، ایران کے شعراء کی تقلیدِ کورانہ کا خیال شعراء کے ذہن سے نکلتا جا رہا ہے۔ لیکن اب بھی میری رائے میں ہماری شاعری کم از کم مضمون یا پس منظر کے انتخاب میں، طرزِ ادا میں، خیالات میں، عوام سے دور ہے۔ بعض شعراء اس جانب متوجہ ضرور ہیں لیکن ان کی توجہ کا نتیجہ محض یہ ہے کہ بعض اوقات وہ عوام کے لئے شاعری کرتے ہیں لیکن عوام کی شاعری نہیں کرتے۔ ہندی میں پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے دیہاتی گیتوں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ اردو میں بھی عظیم کریوی بعض اوقات انھیں گیتوں کا ترجمہ اور شاید کبھی کبھی کوئی نیا گیت شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ شعراء کے طرزِ ادا، طرزِ تخیل، انتخابِ الفاظ، اور زاویۂ نگاہ میں اور ان لوگوں کی انھیں باتوں میں کیسا بیّن فرق ہے جنھوں نے ان گیتوں کو نظم کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کا مقابلہ ان گیتوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن اس سے ہم کو کم از کم اس بات کا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ ہماری شاعری ابھی عوام سے کتنی دور ہے۔ ہماری شاعری کا میدان وسیع ہو گیا ہے۔ ہمارے شعراء کو خود قائم کردہ قیود سے آزادی حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی نظریں کشادہ ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کے خیالات کی پرواز انھیں پروین و ثریا سے ہٹ کر دنیا کے گوشوں میں پہنچا رہی ہے۔ لیکن ابھی صرف ابتدا ہے۔ تصنع اور تکلف کی کثافتوں سے اب تک ہمارے شعراء گلوخلاصی نہیں کر سکے۔ لیکن جیسا حضرت احتشام رضوی نے فرمایا ہے کہ ہماری شاعری کا رجحان اس طرف بھی ہے۔ امید ہے کہ جتنی جتنی تعلیم عام ہوتی جائے گی علم کی شعاعیں جس قدر اکنافِ ملک میں پہونچتی جائیں گی اتنی ہی ہماری شاعری بھی اس جانب ترقی کرتی جائے گی۔

۱۱ کلیم کی عام حالت

کلیم کی عام حالت بہت سے چوٹی کے رسائل سے بہتر ہے۔ البتہ تصاویر کے انتخاب میں کسی قدر اصلاح کی ضرورت ہے۔ میرا منشا عریاں پسندی

کے خلاف احتجاج کرنے کا نہیں ہے۔ میں ان حضرات کا ہم نوا نہیں جنھوں نے بعض تصاویر کے "اخلاق سوز" مناظر کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ تصاویر کا انتخاب فنی اعتبار سے نہیں ہوتا۔ کوئی ایسی تصویر جس میں کوئی خصوصیت نہ ہو کلیم میں شائع نہیں ہونی چاہئیں۔ نیز تصاویر کے بلاک تیار کرانے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ بعض تصاویر میں وہی خد و خال موہوم نظر آتے ہیں جن کو سب سے زیادہ روشن ہونا چاہیے تھا۔

۱۲ تجاویز

ادارۂ کلیم کے پیش نظر جو مقصد ہے اس کا خیال کرتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کے مسائل دلچسپ طریقہ سے اور آسان زبان میں پبلک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ حسب ضرورت تصاویر کے ذریعہ سے بھی ان مسائل کو سمجھایا جائے۔ مختلف ممالک اور ہندوستان کی ادبی، اقتصادی، سوشل اور سیاسی تاریخ کے ابواب جدید طرز پر تحریر کئے جائیں جن میں بادشاہوں اور جنگوں کا ذکر تو کم ہو لیکن مختلف ملکوں میں جو سائنٹیفک انقلابات ہوئے ہیں ان کا ذکر زیادہ ہو۔ جغرافیائی معلومات دلکش پیرایہ میں پیش کی جائیں قطبین کے دریافت اور پہاڑوں کی چوٹیوں یا سمندروں کی گہرائیوں میں پہونچنے کے لئے جو جو قربانیاں کی گئیں اور کی جا رہی ہیں ان کا مفصل بیان مع تصاویر کے شائع کیا جائے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے سفر جن لوگوں نے کئے ہیں ان سے وہاں کے لوگوں کے حالات قلمبند کرائے جائیں۔ اقتصادیات اور سیاسیات میں جو نئے نئے اور جدید نظریئے قائم کئے جا رہے ہیں ان کے متعلق ماہرین سے مضامین حاصل کر کے شائع کئے جائیں۔ اس طور سے کلیم اپنے مقصد سے قریب تر ہو جائے گا۔ اور ادارۂ کلیم کو ملک اور ادب کی صحیح خدمت کرنے کا فخر حاصل ہو گا۔

مغموم ہوں ذوق خوشدلی کی سوگند
ہر سانس ہے موت زندگی کی سوگند
ہر چیز نظر آتی ہے دھندلی دھندلی
قدرت کی ادا بس چاندنی کی سوگند

جوش

آپ کا چندہ ختم ہو گیا

حسب ذیل خریداروں کا چندہ مارچ نمبر کے بعد ختم ہوتا ہے لہٰذا استدعا ہے کہ وہ اپنا اپنا زرِ چندہ بذریعہ منی آرڈر مرحمت فرمائیں تاکہ وی پی کی زحمت اور صرفہ نہ ہو۔

سکریٹری صاحب میونسپل کمیٹی	راولپنڈی
تفسیہ کلب	لوہارو
مسٹر ایف ایچ گل محمد	بمبئی
قاضی مبارک علی صاحب	مردان
وانی ولاس انسٹی ٹیوٹ	بنگلور
کے۔ اے۔ مختار صاحب	نئی دہلی
ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول	نوبٹ بنگلور
حسن محمود خاں صاحب	لکھنؤ
میر طاہر علی صاحب	حیدرآباد دکن

مکتبہ جامعہ ملیہ نے اسے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے - لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب، کاغذ نہایت دبیز، صفحات ۲۹۴ جلد بہت خوبصورت اور باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف عہ/ رکھی ہے

"م م"

پستالوزی کا فلسفۂ تمدن و تعلیم

پستالوزی، اٹھارویں صدی عیسوی کا مشہور جرمن مفکر ہے جس نے قومی تعلیم کے مسئلہ پر ایک نئے زاویہ سے نظر کی تھی اور ایک ایسا عملی نظریہ یورپ کے آگے پیش کیا تھا جس نے بعد کو یورپ کے تعلیمی نظام میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے نزدیک جدید مغربی تمدن کی تکمیل اور جامعیت کا راز، محض افراد کی ذہنی تربیت میں تھا، اور ذہنی تربیت کا مدار صرف تعلیم پر ہو سکتا تھا - ——— اعلیٰ تعلیم پر نہیں، ابتدائی تعلیم، اور ایسی تعلیم پر جو قوم کے نونہالوں کے نظری جوہر نکھار دے، انکی صلاحیتوں کو جلا دیدے، انکی خداداد قابلیتوں کے نشو و نما کا ذریعہ بن جائے۔ کیونکہ ذہنی تربیت جس آسانی سے بچوں کی ہو سکتی تھی اس آسانی سے بڑوں کی ناممکن تھی اور مستقبل میں تمدن کی تکمیل کا واحد ذریعہ وہ قوم کے انہی ہونہاروں کو سمجھتا تھا۔

اسے اپنی زندگی میں یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ اپنے اس نظریہ کو عملی حیثیت سے بھی آزما دیکھے۔ چنانچہ اس نے اپنے مقرر کردہ اصولوں کے ماتحت ایک یتیم خانہ اور مدرسہ بھی جرمنی میں قائم کیا تھا اگرچہ بعض وجوہ کی بناء پر یہ مدرسہ زیادہ دنوں نہ چل سکا لیکن اسکا تعلیمی نظریہ نہ صرف اپنی جگہ قائم رہا بلکہ اس عملی تجربہ سے اس میں جلا آگئی اور رفتہ رفتہ اس نے انیسویں صدی کے آخر تک سارے یورپ کے نظام تعلیم کو متاثر کر لیا۔

پستالوزی بہ حیثیت فلسفی کسی بڑی شہرت کا مالک نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں وہ فلسفی تھا بھی نہیں۔ اس نے دنیا اور اس کے مسائل کو فلسفیوں کی طرح کبھی منطق اور ریاضی کے روکھے پھیکے مقررہ قواعد کے ماتحت حل کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ایک بے تعلق بحث کی عدم اس نے چند مقدمات سے ایک بے لاگ نتیجہ مستنبط کرنے کی کوشش کی۔ وہ دراصل ایک "فری تھنکر" ایک دردمند مصلح قوم تھا، جو دنیا میں ایسا ایک خاص مشن لیکر آیا تھا۔ قدرت نے اسے نہایت حساس، دردمند اور مخلص دل عطا کیا تھا اور اسی کی مدد سے وہ اپنے دور کی تمدنی کمزوریوں کا تجربہ کرنے اور انکا علاج تجویز کرنے میں کام لیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے اس مشن میں اسقدر کامیاب ہوا کہ اسکا نظریۂ تعلیم آج بھی یورپ اور امریکہ میں یکساں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جرمنی میں جو اسکا وطن عزیز ہے آج بھی اسکی قبر پر عزت و احترام کے پھول چڑھائے جاتے ہیں -

"کوئی قوم اسوقت تک صحیح معنوں میں بڑی نہیں
کہی جا سکتی جب تک اس میں ایک پستالوزی نہ
پیدا ہو چکا ہو"

یہ موجودہ جرمنی کے سب سے بڑے محقق اور ماہر تعلیم پروفیسر سپرانگر کا اعتراف ہے جس سے پستالوزی کی شخصیت اور اسکے مشن پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید زبیری بی اے (جامعہ) ام اے پی ایچ ڈی نے اس کتاب میں نہایت جامعیت سے پستالوزی اور اس کے فلسفہ تمدن پر روشنی ڈالی ہے اور اس عنقا کے ساتھ یہ کتاب ملک کے آگے پیش کی ہے کہ پستالوزی اور اسکا نظریہ تعلیم ہندوستان کے لئے چراغ ہدایت کا کام دے اور کوئی ایسا پستالوزی ہندوستان میں بھی پیدا ہو جائے جو یہاں کے مردہ نظام تعلیم پر توجہ کرے اور کروڑوں

ہندوستانی بچوں کو جسمانی ذہنی اور اخلاقی تباہی سے بچالے ——
فاضل مصنف کی اس تمنا میں یقیناً ہر محب قوم ہندوستانی شریک ہے۔ خدا کرے ہندوستان کے بھی جلد دن پھریں اور وہ بھی ایک "بڑی قوم" کہلائے جانے کی مستحق قرار دی جائے آمین!

لکھائی چھپائی دیدہ زیب، سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۲۱۶ قیمت صرف ۱۲؍ منیجر مکتبہ جامعہ سے مل سکتی ہے۔

("م م")

شمع راہ

جناب محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی مرحوم پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن و رکن رکین جامعہ عثمانیہ و ترقی اُردو کے چار خطبات جو مختلف مجالس میں پڑھے گئے تھے، جناب صفوۃ اللہ بیگ صاحب صوفی نے شمع راہ کی صورت میں مرتب فرما کر شائع کئے ہیں۔

پہلا خطبہ کعبہ کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت کو واضح کرتا ہے اور پروفیسر صاحب کی مذہبی تلاش کا حامل ہے۔ زبان بھی سادہ استعمال کی ہے۔

خطبۂ دوم رسوم شادی اور متاہل زندگی پر خطبۂ سوم ذکر میلاد پر اور خطبۂ چہارم تعلیم پر ہے۔ جو پہلے خطبہ ہی کی طرح تحقیق و تفتیش کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

لیکن کتاب میں کتابت کی بے انتہا اغلاط ہیں اور ان غلطیوں نے کتاب کی معنوی خوبیوں پر بظاہر پانی پھیر دیا ہے۔

بہر حال معنوی خوبیوں کے لحاظ سے کتاب نہایت خوب ہے اور قیمت بھی ۸؍ زیادہ نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ :- دفتر کتابت صفوۃ اللہ بیگ صوفی (۲) بلبشرا سجاد منزل دھلی۔

(وفا فرخ آبادی)

رسید

حسب ذیل کتب بھی بغرض ریویو موصول ہوئی ہیں :

۱۔ تنقیدات عبدالحق مرتبہ محمد تراب علی خاں باز سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۱۸۰۔ قیمت ۱۲؍ - ملنے کا پتہ: کاشانہ باز۔ بازار گھانسی۔ حیدرآباد دکن۔

۲۔ باز کے سو شعر۔ سائز ۲۰×۳۰/۳۲ صفحات ۳۲ - قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ۔ ایضاً

۳۔ آغا شاعر کے سو شعر۔ سائز ۲۰×۳۰/۳۲ صفحات ۳۲ - قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ۔ نگارستان ایجنسی کشمیری دروازہ دہلی۔

۴۔ خسرو ذیشان یعنی شہنشاہ جارج پنجم کے حالات زندگی از سعید احمد صاحب انصاری سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۰۰ قیمت ۱۰؍ ملنے کا پتہ۔ ایس ایم نذیر احمد گلی ۲۳ بیڈن پورہ قرول باغ دہلی

۵۔ ہدیہ اخلاص بحضرت اقبال از محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ صفحات ۴۲۔ قیمت ۳؍ ملنے کا پتہ عبداللطیف اعظمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرول باغ۔ دہلی +

رفتارِ وقت

ادارۂ کلیم

انتخابات کے نتائج

جدید آئین کے ماتحت صوبائی اسمبلی اور کونسلوں (اپر چیمبر) کے انتخابات پچھلے مہینہ میں ختم ہو گئے۔ چونکہ اسمبلی کے تمام نتائج کا اعلان بھی ہو گیا ہے۔ اور اسی مجلس کو ملک کی سیاست میں زیادہ اہمیت اور دستور میں زیادہ اختیارات حاصل ہیں اس لئے ہم اسمبلی کے صوبہ وار نتائج درج ذیل کرتے ہیں۔

یوپی

کانگریس	۱۳۳
غیر متعلق مسلم	۲۹
مسلم لیگ	۲۷
نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی	۱۸
غیر متعلق ہندو	۹
زمیندار	۶
یورپین	۳
ہندوستانی عیسائی	۲
اینگلو انڈین	۱
ہندو سبھا	۰
میزان	۲۲۸

مدراس

کانگریس	۱۵۹
جسٹس پارٹی	۱۶
پیپل پارٹی	۱
مسلم لیگ	۱۰
مسلم پروگریسو پارٹی	۱
غیر متعلق مسلم	۸
یورپین	۷
انڈین کامرس	۱
اینگلو انڈین	۲
دیگر	۱۰
میزان	۲۱۵

سی پی

کانگریس	۷۱
رؤف شاہ جہلم پارٹی	۸
شریف مسلم پارٹی	۵
غیر متعلق مسلم	۱
غیر برہمن	۳

امبیڈکر پارٹی	۴
نیشنلسٹ	۲
راجہ پارٹی	۱
یورپین	۱
اینگلو انڈین	۱
ہندو سبھا	۱
دیگر	۱۴
میزان	۱۱۲

بمبئی

کانگریس	۸۸
مسلم لیگ	۲۰
غیر متعلق مسلم	۱۰
یورپین اینگلو انڈین اور عیسائی	۸
انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی	۱۲
غیر برہمن	۸
ڈیموکریٹک سوراج پارٹی	۵
کسان پارٹی	۲
دیگر	۲۲
میزان	۱۷۵

بہار

کانگریس	۹۷
مسلم یونائٹڈ پارٹی	۶
مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی	۱۶
مسلم احرار پارٹی	۳
دیگر	۳۰
میزان	۱۵۲

اڑیسہ

کانگریس	۳۶
یونائٹڈ پارٹی	۵
نیشنل پارٹی	۴
غیر متعلق	۱۱
دیگر	۴
میزان	۶۰

آسام

کانگریس	۳۵
غیر متعلق ہندو	۱۰
یونائٹڈ پیپلز پارٹی	۳
آسام ویلی مسلم پارٹی	۵
برہما ویلی مسلم پارٹی	۵
مسلم لیگ	۹
پرجا مسلم پارٹی	×
غیر متعلق مسلم	۱۴
یورپین	۹
انڈین کرسچین	۱
غیر متعلق نسواں	۱
پسماندہ اقوام	۹
ہندوستانی باغبان	۲
لیبر	۴
میزان	۱۰۸

پنجاب

یونینسٹ	۹۹
کانگریس	۲۹

خالصہ نیشنلسٹ پارٹی	۱۳
ہندو الکشن بورڈ	۱۲
احرار مسلم	۲
مسلم لیگ	۱
کانگریس نیشنلسٹ	۱
اتحاد ملت مسلم	۲
غیر متعلق	۱۴
میزان	۱۷۵

سرحد

کانگریس	۱۹
ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی	۷
مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی	۲
غیر متعلق مسلم	۲۱
غیر متعلق ہندو	۱
میزان	۵۰

بنگال

کانگریس	۴۳
اچھوت اقوام	۳۱
غیر متعلق ہندو	۲۲
مسلم لیگ	۵۰
پرجا مسلم پارٹی	۳۵
کرشک پارٹی	۵
غیر متعلق مسلم	۳۳
یورپین	۲۵
اینگلو انڈین	۴
انڈین کرسچین	۲
میزان	۲۵۰

سندھ

یونائیٹڈ مسلم پارٹی	۲۳
کانگریس	۷
آزاد مسلم پارٹی	۳
مسلم پارٹی	۳
ہندو سبھا	۴
غیر متعلق	۱۷
یورپین	۳
میزان	۶۰

مذکورۂ بالا نتایج پر ایک نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ صرف کانگریس اور مسلم لیگ دو ایسی جماعتیں ہیں جو تمام صوبوں میں ایک جماعت کی حیثیت سے انتخاب میں شریک ہوئیں۔ لہذا اِن دو جماعتوں کا مجموعی نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

نام صوبہ	کانگریس	مسلم لیگ	دیگر	میزان
یوپی	۱۳۳	۲۷	۶۸	۲۲۸
مدراس	۱۵۹	۱۰	۴۶	۲۱۵
سی پی	۷۱	×	۴۱	۱۱۲
بمبئی	۸۸	۲۰	۶۷	۱۷۵
بہار	۹۷	×	۵۵	۱۵۲
اڑیسہ	۳۶	×	۲۴	۶۰
آسام	۳۵	۹	۶۴	۱۰۸
پنجاب	۲۹	۱	۱۴۵	۱۷۵
سرحد	۱۹	×	۳۱	۵۰

بنگال	۴۳	۵۰	۱۵۷	۲۵۰
سندھ	۷	×	۵۳	۶۰
میزان	۷۱۷	۷۱۷	۷۵۱	۱۵۸۵

آپ کو ان اعداد سے اندازہ ہوگا کہ چھ صوبوں میں کانگریس کی خالص اکثریت رہی یعنی تمام دوسری پارٹیوں کے ممبروں کی مجموعی تعداد سے کانگریس پارٹی کے ممبر وہاں زیادہ ہیں - البتہ پانچ صوبوں میں کانگریس اقلیت میں رہی - یعنی اسام - پنجاب - سرحد - بنگال - اور سندھ انہیں سے آسام اور بنگال کے صوبوں میں یورپین عنصر زیادہ ہے اور بنگال - پنجاب - سرحد اور سندھ میں مسلم آبادی زیادہ ہے - اس لئے کانگریس کو وہاں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہوئی - بہرحال مجموعی طور پر ۱۵۸۵ نشستوں میں کانگریس نے ۷۱۷ نشستیں حاصل کرلیں - اور یہ کامیابی کسی پارٹی کے لئے کچھ کم قابل فخر نہیں ہے -

کانگریس کے بعد صرف مسلم لیگ ایک ایسی جماعت ہے جس نے ہندوستان کے تمام صوبوں سے اپنے امیدوار کھڑے کئے اور ایک حد تک اسے کامیابی بھی ہوئی - مسلم لیگ کا نظام کانگریس کے مقابلہ میں نہایت ناقص ناممکل اور کمزور ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ درحقیقت اس کا کوئی مستقل نظام نہیں ہے - یہ بھی صرف انتخابات کے زمانہ میں ہنگامی طور پر اس نے ایک عارضی نظام ترتیب دے لیا تھا اور یوں کچھ نہ کچھ نتیجہ برآمد بھی ہوگیا - علاوہ ازیں عملی اعتبار سے بھی مسلم لیگ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی - ڈرائنگ روم کی سیاست کے علاوہ مسلم لیگ نے کبھی مسلمانوں کی عملی سیاست میں کوئی رہنمائی نہیں کی اور سالانہ جلسے کرنے - چند تجاویز پاس کر دینے یا چند بیانات شائع کر دینے کے علاوہ کبھی کوئی عملی کام نہیں کیا - اس کے باوجود مسلم لیگ کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ اسکا پتہ دیتی ہے کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جس میں سیاسی بیداری کے آثار نظر آرہے ہیں - حالانکہ یہ بھی واقعہ اور افسوسناک واقعہ ہے جو موجودہ انتخابات سے اور زیادہ واضح ہوگیا ہے کہ مسلمانوں میں رجعت پسند طبقہ ابتک بااثر اور با اقتدار ہے - جو مسلم حقوق کی آڑ لیکر اپنے ذاتی اغراض کو پورا کرتا ہے اس لئے قطع نظر اس چیز کے کہ کانگریس یا مسلم لیگ اچھی جماعتیں ہیں یا نہیں اور مسلمانوں کو انمیں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں اس چیز کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے کہ مسلمانوں میں رجعت پسند طبقہ کا اثر و اقتدار کم ہو اور ترقی پسند طبقہ آگے بڑھے اور منظم ہو کر قوم و وطن کے تمام کاموں میں برابر کا شریک ہو ورنہ یقین رکھئے کہ ہمارا رجعت پسند طبقہ ہمیشہ غریبوں سے ناجائز فائدہ (Exploit) اٹھاتا اور اپنے اغراض پورے کرتا رہیگا - اور مسلمان ملک کی سیاست میں صدیوں پیچھے رہ جائیں گے -

---

ہندوستان کا میزانیہ

حکومت ہند کا سالانہ میزانیہ جو ممبر مالیات نے اسمبلی کے اجلاس میں پیش کیا سالقہ میزانیہ کے ساتھ ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے -

سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء کا میزانیہ

متوقع آمدنی	۸۳۱۴	لاکھ
متوقع خرچ	۸۳۰۸	لاکھ
متوقع بچت	۶	لاکھ

مذکورہ بالا میزانیہ نظرثانی کے بعد

آمدنی	۸۱۳۶	لاکھ
خرچ	۸۳۳۳	لاکھ
خسارہ	۱۹۷	لاکھ

سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء کا میزانیہ

متوقع آمدنی	۷۹۹۹	لاکھ
از ریزرو فنڈ	۱۸۴	لاکھ
متوقع خرچ	۸۳۴۱	لاکھ
متوقع خسارہ	۱۵۸	لاکھ
نئے ٹیکسوں کی آمدنی	۱۶۵	لاکھ
متوقع بچت	۷	لاکھ

(م - ع - خ)

مصری جدید برقعہ دو حصوں میں منقسم

تشریح بالائی حصہ

سر سے شروع ہو کر ہاتھوں کی لبان تک رہتا ہے اس میں نہایت خوبصورت چُنٹ دار ٹوپی ہے جس کے پہننے سے نہ سر کا شیپ ظاہر ہو اور نہ کسی قسم کی تکلیف

تشریح زیرین حصہ

کندھے سے شروع ہو کر پیر کے ٹخنے تک رہتا ہے۔ اس کی وضع مثل اُوَر کوٹ کے ہے۔ کمر کے اوپر خوبصورت پلیٹ پڑے ہیں پہلو میں جیب ہے۔ کالر بھی مثل اُورکوٹ ہے۔

بشرط واپسی منگائیں۔ ناپ کندھے پیر کے ٹخنے تک اور سر کی گولائی، تاگا ناپ کر روانہ کریں۔
قیمت سوتی ۷ روپے ٹسری ۱۲ کریب سلک ۱۶ ناپسند ہونے پر اُسی دن واپس کرنا لازمی ہے

پتہ یہ ہے **خاتون اسٹور نمبر ۹۱ فتح پوری بازار دہلی**

طبقہ نسواں میں زندگی کی لہر دوڑانے والا اور اسکا سچا حامی

ماہوار مصور نامہ

جہان آرا

گزشتہ اعلان کے مطابق جہان آرا بالکل نیا ہو چکا ہے؛ صرف رجسٹر نمبر کا انتظار ہے نمبر ملنے پر فوراً پرچہ روانہ کر دیا جائیگا۔ بھیجنے سے انتظار کیجئے۔

ملک کی اہل قلم مستورات کے گرانقدر مضامین بیش قیمت نظمیں اور دیگر مواد جو ایک نسوانی پرچے کا زیور ہے؛ کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت دیدہ زیب ٹائٹل مصور، ضخامت چالیس صفحات علاوہ اشتہارات۔ قیمت سالانہ ۸ ر لیکن شاہد کے موجودہ خریداروں کو اور ان حضرات کو جو اس ماہ شاہد کی خریداری منظور فرمائیں گے مفت پیش کیا جائے گا۔ لیکن تین آنے کے ٹکٹ محصولڈاک کے لئے آنا ضروری ہیں۔

منیجر شاہد دار الادب بریلی

ہفتہ وار **اسد** لکھنو

(اودھ کے اُردو اخبارات میں سب سے کثیر الاشاعت اخبار)

کا **محرم نمبر** بالتصویر

اخبار "اسد" کا محرم نمبر جو ہر سال انتہائی شان و اہتمام سے بالتصویر شائع ہوتا ہے اور اس قدر مقبول ہوتا ہے کہ اُس کی ایک کاپی بھی دفتر میں نہیں بچتی امسال بھی یکم محرم الحرام کو شائع کیا جائگا۔ حادثہ کربلا کے متعلق ملک کے مشاہیر اہل قلم کے فاضلانہ مضامین اور نظمیں بلا امتیاز مذہب وملت اس مخصوص نمبر میں درج کی جائینگی اور مقامات مقدسہ کی نادر اور نایاب تصویروں سے اس مخصوص نمبر کو زینت دی جائے گی۔

وہ حضرات جو اخبار اسد کے خریدار نہیں پانچ آنے کا ٹکٹ فی کاپی بھیجکر طلب فرماسکتے ہیں۔

مشتہرین کے لئے نادر موقع۔ اُجرت اشتہار فی صفحہ ۱۵ ر نصف صفحہ ۸ ر سائز ۲۰×۳۰ / ۴

المشتہر اخبار "اسد" لکھنو

اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز!

رسالہ ساربان لاہور

رسالہ ساربان اردو زبان میں ایک بلند پایہ ماہوار رسالہ ہے جس میں ذہنی اصلاح و تہذیب کے مدِ نظر سبق آموز نظموں اور علمی مقالات کے علاوہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر زبردست مضامین لکھے جاتے ہیں ان وجوہات کی بنا پر ملکی جرائد اور مشاہیر قوم نے ساربان کو اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا ہے۔ رسالہ ساربان میں عشقیہ غزلیں یا ایکٹریسوں وغیرہ کی تصاویر قطعاً شائع نہیں کی جاتیں۔ سالانہ چندہ صرف تین روپیہ

منیجر رسالہ ساربان لاہور

ایک آخری رعایتی اعلان

ہفتہ وار گلفروش دہلی کا اشتہار تین ماہ سے کلیم میں برابر شائع ہو رہا ہے جہاں اس رعایتی اعلان سے صدہا ناظرین کلیم نے فائدہ اٹھایا ہے وہاں ہمیں بہت سے ایسے خطوط ملے ہیں جو قلتِ وقت کی وجہ سے رعایتی قیمت پر گلفروش نہ جاری کرا سکے اس لئے اب اعلان کیا جاتا ہے کہ ۲۰ مارچ تک گلفروش صرف ۲؎ سالانہ میں جاری کر دیا جائے گا اور ان پہلے دس اصحاب کو جن کا زرِ چندہ ۱۵ مارچ تک بذریعہ منی آرڈر موصول ہوگا ایک ایک جلد شاعر کی ماتیں مولفہ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی بالکل مفت دی جائے گی یہ آخری رعایتی اعلان ہے۔

۲۰ مارچ تک ہفتہ وار گلفروش صرف ۲؎ سالانہ میں غرباء۔ طلباء اور قومی لائبریری کو د[illegible] گا۔ جلدی کیجئے کیونکہ رعایتی قیمت پر اخبار جاری کرانے کا یہ آخری موقعہ ہے نمونے کا پ[illegible] ار کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائے گا۔

منیجر ہ[illegible] وار گلفروش ضمیر گگی دہلی

جامِ جم کا ظہور

گر وہ جامِ جم، نہیں جسے جمشید نے مٹی سے تیار کرایا تھا، اور جو حوادث روزگار کے ایک معمولی سے جھٹکے میں دنیا سے ناپید ہوگیا بلکہ وہ

جامِ جم

جو عمدہ کتابت، طباعت کے ساتھ ہر ماہ مہر پریس اسٹریٹ دہلی سے خاص رسالہ کی صورت میں شائع ہوتا ہے جس میں زمانہ سابق و حال کے نامور شعراء ادباء، حکماء اور فضلاء کے نوادرات اور روزگار شاہکار موجود ہوتے ہیں جو دوسری جگہ ہرگز دستیاب نہیں ہو سکتے۔ جس کی ادارت و ترتیب ملک کے نامور جدید نگار، افسانہ نگار، شاعروں اور ادیبوں کے ہاتھ میں ہے اور ان تمام خوبیوں کے باوجود [illegible] کی خدمت میں پورے سال بھر تک

بالکل مفت

حاضر کیا جاتا ہے صرف [illegible] کے [illegible] ٹکٹ بھیجکر [illegible] صاحب [illegible] بھر [illegible] نام جاری [illegible] رسالہ کے ساتھ ہی [illegible] جامِ جم [illegible] حاصل کر سکتے ہیں [illegible] قابل قدر ذخیرہ ہے [illegible] ٹکٹ [illegible] سال [illegible] کرا لیجئے۔ ضروری نوٹ:- [illegible] آخر تک [illegible] جامِ جم ایک [illegible] نہیں [illegible] مشتہرین کے [illegible] نادر موقع ہے۔

منیجر جامِ جم دہلی

نقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی وجد آفرین نظموں کا مجموعہ ——— جو مندرجہ ذیل ابواب پر منقسم ہے

(۱) نگار خانہ (۲) خمریات (۳) تاثرات (۴) مطالعۂ فطرت (۵) نسیب

ہر نظم اپنی جگہ مکمل، مرصع اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور اس کے مسحور کن نغمے دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون، اور روح کے لئے ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں۔ لکھائی چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے۔

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)، مجلد دو روپے (عا)

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

شاعر کی راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے جنھیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مست رات	بدمست رات	راز و نیاز کی رات	انتظار کی رات
اندھیری رات	چاندنی رات	جوانی کی رات	تصورات کی رات
التفات کی رات	جدائی کی رات	اشکوں کی رات	برسات کی رات
بیہودگی کی رات	بیخودی کی رات	سرشار رات	بھیگی ہوئی رات

تصورات کی رات بچپن رات چھابن ناگن کالی رات

قیمت صرف آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

پیغمبر اسلام

خواجۂ دوجہاں سرور کائنات آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کی ولادت اور رسالت پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قیصر کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ نبوت پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل قاطع کے سامنے ادراک منطق چھاننا بھول جاتا ہے ——— شاعر انقلاب پر جب ایک خاص سرشارت کا عالم طاری ہوا اسی وقت انھوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی۔ عالم بیخودی میں جیار روز کی یا ئت نشاۂ و یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا جب تک نظم مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے۔ قیمت صرف آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

ماء اللحم خاص الخاص

یونانی دوافروشوں کا بھلا ہو. چند تولیں اور چند لوٹے ہوئے مرتبان رکھ کر ہر شخص ماء اللحم سازی کا اعلان کرتا ہے. کوئی قانون نہیں کہ ان کو جھوٹ بولنے سے روک سکے **حکیم اجمل خاں مرحوم** کا خدا بھلا کرے جنہوں نے **ہندوستانی دواخانہ دہلی** قائم کر کے طب یونانی کی حفاظت کی اور شخصی نفع کی لعنت جو لالچی دوافروشوں کا شیوہ ہو چکی تھی. اس سے دواخانہ کو پاک رکھا،

ہندوستانی دواخانہ

کی آمدنی طبیہ کالج دہلی پر صرف کی. آج ہم اس مرحوم کے نام لیوا ان کی روح کو شرمندہ نہیں کرتے بلکہ ان کے مقصد کو پورا کر رہے ہیں. ماء اللحم کی ہر ایک بوتل اس کی تصدیق کرے گی منگائیے اور استعمال کیجئے. سردی کا موسم اس کے استعمال کا صحیح وقت ہے.

قیمت فی بوتل (۲۱ خوراک) پانچ روپے. **ترکیب استعمال**:۔ روزانہ صبح کے وقت پانچ تولہ ماء اللحم میں مصری ایک تولہ ملا کر پیا جائے

ملنے کا پتہ

ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس نمبر ۲۲

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو



منتخب کر سکوں تعمیلِ حکم کیلئے فردوس شال کشمیر جنت نظیر
سوئٹزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ اور گلپاش مرغزاروں میں نکتہ چینی کی گئی،
جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں
پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر
مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حُسن شناس نگاہوں کو تکلیف
ہوئی مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی. کھانا
پینا ترک کر دیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا، اور وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے **اصغر علی محمد علی** سے عطر منگوانے کو کہا،
رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا جب عطر آیا تو مہارانی کا شبابِ رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آ گیا۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ۔

REG. L. No. 3694

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

شعلہ و شبنم

شعلہ و شبنم ہندوستان کے شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی مدیر کلیم دہلی کی پرجوش اور [illegible] نظموں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو آتش کدے کی شعلہ افشانیوں [illegible] اسلامی شان [illegible] خون کھولا دینے والے [illegible] کی سرمستیوں اور کیف [illegible] فطرت کے [illegible] نغمہ [illegible] کا موقع دے گی۔ شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار [illegible] مطبوعہ [illegible]

کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما [illegible]

قیمت صرف تین روپے

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا [illegible] ترجمہ مکتبہ [illegible] نے شائع کیا ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب لندن کے ایک پبلشر نے چھاپی تھی اور شائع ہوتے ہی [illegible] ہزار [illegible] ہو گئی۔ اردو میں ہندوستان [illegible] زبانوں سے پہلے چھپی۔ ترجمہ [illegible] سلیس اور شگفتہ ہے۔ [illegible] ہندوستان کے تمام اخبارات رسائل [illegible] اردو کے بہترین تراجم میں شمار کیا ہے۔

کتاب [illegible] صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ [illegible] تصویریں [illegible] ہیں۔ قیمت مکمل [illegible] چار روپے۔

تاریخ فلسفۂ اسلام

مشہور جرمنی فلسفی [illegible] بوئر کی [illegible] تصنیف [illegible] ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی [illegible] یہ کتاب اس سے قبل بھی جامعہ کی اردو اکاڈمی کی جانب سے شائع ہو چکی تھی۔ اب بہت [illegible] ترمیم و اضافے اور نظر ثانی کے بعد [illegible] سائز پر نہایت خوشنما [illegible] شائع کی گئی ہے۔ اس میں اسلامی فلسفہ کی نشو و نما، یونانی عربی علوم، فلسفہ [illegible] یونانی و اسلامی حکماء، مشرق میں فلسفہ کا اختلاط [illegible] فلسفی [illegible] مباحث ہیں۔

قیمت دو روپے (عہ)

پستالوزی

[illegible] صاحب بی اے (جامعہ) ایم اے پی ایچ ڈی (برلن) [illegible] یورپ کے عہد جدید میں کوپرنیکس نے ہیئت کی ہیئت اور کولمبس نے جغرافیہ کا نقشہ بدل دیا۔ [illegible] نے [illegible] اور کانٹ نے فلسفے کا استحالہ کر دیا۔ اسی طرح پستالوزی نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی زندگی اس کے فلسفۂ تمدن، اس کے تعلیمی نظریئے اور تعلیمی کارنامے اور ان کی تفصیل سلیس زبان اور [illegible] زبان میں ملاحظہ فرمائیے۔ جو مشرقی شاعر کے اس شعر کی مغز ہے سہ درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے ؛ جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را۔ قیمت مجلد عہ

مکتبۂ جامعہ قرول باغ دہلی

بنام قوت و حیات

کلیم

دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صدحیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں سے فسانہ اپنا
بھولوں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۳ — نمبر ۵

فہرست مضامین مئی ۱۹۳۷ء

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مدیر	۳۸۶
۲	تنہائی (نظم)	جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی	۳۹۱
۳	تاریخ کو منقلب کر دینے والے کرشمے	جناب اسرائیل احمد خاں صاحب	۳۹۳
۴	نیند کی حقیقت	جناب محمد کشور صاحب یوسف	۳۹۷
۵	... راحیات (فسانہ)	جناب ابتا حزین صاحب بہاولپور	۴۰۱
۶	فیڈرل فنانس	جناب عبدالرحیم صاحب شبلی بی کام	۴۰۹
۷	غزل مسلسل (فارسی)	جناب برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی	۴۱۵
۸	(ترجمہ اردو)	جوش ملیح آبادی	۴۱۵
۹	خدمت وطن	جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری	۴۱۶
۱۰	میر فرینک (فسانہ مسلسل)	جناب اسرائیل احمد خاں صاحب	۴۱۷
۱۱	حسین مبکارن (نظم)	جناب رفیع احمد صاحب صبا متھراوی	۴۲۳
۱۲	ایک شاعر دوست سے (نظم)	جناب احسان بن دانش صاحب	۴۲۴
۱۳	زندگی کا استہزا (فسانہ)	جناب ل احمد صاحب اکبرآبادی	۴۲۵
۱۴	بہار آزادی (نظم)	جناب مشتاق احمد صاحب شارق	۴۲۸
۱۵	ہندوستانی عورتیں	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار	۴۲۹
۱۶	قدرت کی فیاضیاں	جوش ملیح آبادی	۴۳۳
۱۷	عدالت (فسانہ)	جناب کوثر چاندپوری	۴۴۰
۱۸	طنزیات (نظم)	جناب الحق صاحب سیہوندوی	۴۳۷
۱۹	فلسفۂ کائنات	جناب سید علی اکبر صاحب بھوپال	۴۴۱
۲۰	فیضانِ ساقی (نظم)	جوش ملیح آبادی	۴۴۸
۲۱	غزل گوئی	جناب نقاد	۴۴۹
۲۲	میں دیکھ رہا ہوں	جناب ضیاء الدین احمد صاحب باہری	۴۶۰
۲۳	پیر مغاں دیکھ (نظم)	جوش ملیح آبادی	۴۶۲
۲۴	نقد و نظر	ادارۂ کلیم	۴۶۵
۲۵	رفتار وقت	ادارۂ کلیم	۴۶۹
۲۶	اشتہار	مشتہرین	۴۷۳

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محمد حسین برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم انگریزی اکیڈمی روڈ قرولباغ دہلی سے شائع کیا)

اشارات

(۱) ایک خطرناک مشورہ

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا
کارِ طفلاں خراب خواہد شد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر تاریخ نے حال ہی میں وہاں کے طلاب کو جو مشورہ دیا ہے، وہ اِس قدر خطرناک ہے کہ اُس پر خاموش نہیں رہا جاسکتا۔

وہ ایک طرف تو مسلم یونیورسٹی کے طلاب میں فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف اُن کی تمنا یہ ہے کہ طلاب، سیاسیات، واقتصادیات سے بیگانہ رہیں، یعنی بالفاظِ دیگر ـــــ ایک طرف تو مسلم کی حیثیت سے وہ اپنے کو غیر مسلموں سے علیحدہ رکھ کر ہندوستان کی قومیت کو کمزور بنا دیں، اور دوسری طرف کالج کے باہر کی دُنیا سے، جو حقیقی دُنیا ہے، اور جس سے عنقریب اُنھیں سابقہ پڑنے والا ہے، بیگانۂ محض رہتے ہوئے، اپنے دل کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔

یہ بھگوان، اور رحمٰن کے ناموں پر کٹ مرنے والا ہندوستان عجیب ملک ہے ـــــ یہاں جو کچھ بھی ہو، کم ہے ـــــ یہی وہ ملک ہے، جہاں بیسویں صدی میں بھی ایسی خلافِ عقل باتیں زبان سے نکالی جاسکتی ہیں۔

حیرت تو یہ ہے کہ پروفیسر ہونے کے باوجود، علی گڑھ کے پروفیسر صاحب کو اب تک شاید یہ علم ہی نہیں کہ "طالب علم" کہتے کسے ہیں، اور طالب علم کے فرائض کس قدر وسیع واقع ہوئے ہیں ـــــ اور یہ غلطی غالباً اِس امر پر مبنی ہے کہ پروفیسر صاحب کو حقیقت میں "علم" کے معنی ہی نہیں معلوم ہیں۔

اُن کے نزدیک "علم" اُن تمام نرم وگرم، معقول وغیر معقول اور سنجیدہ وخرافات مضامین کے اندر محصور ہوتا ہے جو نصاب کے اندر مُدوّن ہوتے ہیں۔

حالانکہ ایک مشہور یونیورسٹی کے ایک ذمہ دار رکن کی حیثیت سے اُنھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ "علم" کے معنی ہیں "دانستن" یعنی "جاننا" اور یہ "دانستن" وہ شئے ہے، جس کا احاطہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لا زوال

میں کتابی "علم" کا پُورا پُورا احترام کرتا ہوں اور "صحیح علم" تک پہونچنے کا اِسے ایک ناگزیر ذریعہ سمجھتا ہوں، مگر یہ خیال کہ "علم" کتابوں کے اندر ہی محصور ہے، ایک ایسا افسوسناک اور محدود خیال ہے، جس کی تائید کرنا اپنے کو گمراہی میں مبتلا کر دینے کے برابر ہے۔

"کتابی علم" محض ایک علامت ہے، جس کے ذریعے سے ہم حقیقی علم تک پہونچ سکتے ہیں۔

بیشک نقشے (اٹلس) کا مطالعہ نہایت ضروری ہے لیکن نقشے کو صرف نقشے کی خاطر دیکھنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا ـــــ نقشے کو دیکھ کر یہ تصور تو ضرور پیدا ہوتا ہے کہ فلاں فلاں مقامات، فلاں فلاں حصّوں میں

گئے، اور فلاں فلاں حصوں میں فلاں فلاں دریا بہتے ہیں۔

لیکن زندگی نام ہے عمل کا، یہاں صرف تصورات سے کام نہیں چل سکتا ــــــ اگر کوئی شخص نقشے کی مدد سے دُنیا کی سیاحت نہیں کرتا ہے اور اُن ملکوں، پہاڑوں، اور دریاؤں کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہے جو نقشے میں درج ہیں، تو اُس کا نقشے علم کوئی معنی ہی نہیں رکھ سکتا۔

اگر کوئی نقشے کو بچھا کر اُس پر بیٹھ جائے، اور یہ دعوے کرنے لگے کہ دُنیا اُس کے زیرِ نگین ہے، اور وہ سیاحِ بحر و بر یا فاتحِ عالم ہے، تو کیا ایسے شخص کو مجنون نہیں سمجھا جائے گا؟ یہی حال "کتابی علم" کا ہے، اگر کوئی شخص حیات اور اسرارِ حیات سے مُنھ موڑ کر صرف کتابوں ہی کا ہو کر رہ جائے تو کیا کوئی دانا اُسے "عالم" کا خطاب دے سکے گا؟

لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ جنت نشان ہندوستان عجیب ملک ہے۔ یہاں کے "پروفیسر" اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ وہ حیات اور اسرارِ حیات، مُلک اور حالاتِ مُلک سے بیگانہ رہتے ہوئے صرف کتابوں کے کیڑے بنے رہیں۔

دوسرے، یا یوں کہئے کہ زندہ ممالک میں طُلّاب کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے اندر ہی اپنے مُلک کے تمام سیاسی، اقتصادی، اور معاشرتی مسائل سے بخوبی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اور جب کالج سے نکلتے ہیں تو اپنی قوم اور اپنے مُلک کے حق میں ایک سعادت و برکت بن کر نکلتے ہیں ــــــ کیا ہمارے طُلّاب سے کہا جاتا ہے، بار بار کہا جاتا ہے، اور بڑے بڑے مقاماتِ بلند سے کہا جاتا ہے کہ خبردار، حقیقی دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھنا، تمہارے واسطے صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ ہندوستان ایک جزیرہ نما ہے جو ایشیا کے جنوب میں واقع ہے، اور برطانیہ کے ماتحت ہے، اور ہم سب اسی کے وفادار محکوم ہیں۔ اپنے مُلک کے حالات سے ذرہ برابر دلچسپی نہ لینا، ورنہ "امنِ عامّہ" اور "نظمِ عالم" میں اختلال واقع ہو جائے گا اور تمہارے بیدار ہونے سے، ہمارے "شریف شہریوں" کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔

آخر اس سرزمین پر یہ اُلٹی گنگا کیوں بہتی ہے، یہاں تمام دُنیا کے مسلّمہ قواعد کے خلاف عمل کیوں کیا جاتا ہے؟ ــــــ کیا اس تہ میں کوئی راز، اور اس پردۂ زرنگاری میں کوئی "معشوق" چھپا ہوا ہے؟

یا اس مُلک کے حالات کی نوعیت ہی ایسی خطرناک ہے، کہ اگر نوجوانوں کو اس کا علم ہو جائے گا تو اُن کا گرم خون کھولنے لگے گا، اور وہ چشم زدن میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیں گے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو خدا کے واسطے بتلائیے کہ ہندوستان کے طالب علموں کو مُلک کے حالات سے قطعی بے خبر رکھنے کی اس سعیٔ پیہم کی تہ میں کونسا راز پوشیدہ ہے؟

طُلّاب نام ہے مُلک کی نئی نسل اور نوجوان جماعت کا ــــــ اور نوجوان ہی دراصل زمانۂ آئندہ کے امین، اور مستقبل کے وارث ہوتے ہیں۔ اگر انھیں اس سختی کے ساتھ مُلک کے سیاسیات وغیرہ سے ناواقف رکھا جائے گا، تو ذرا انصاف سے بتلائیے کہ زمانۂ آئندہ کی امانت، اور مستقبل کی وراثت پھر کس مسخرے کے سپرد کی جائے گی؟ اور مُلک کی حیاتِ نو کا آفتاب کس قبرستان کے اُفق سے بلند ہوگا؟

میری یہ مُراد ہرگز نہیں کہ طالبِ علم کتاب اور کالج چھوڑ چھاڑ کر مُلک کے دیگر مسائل میں اس طرح مستغرق ہو جائیں کہ علم حاصل کرنے کے امکانات ہی باقی نہ رہیں۔ میں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ جس طرح ایک طالب العلم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے نصاب پر حاوی ہو، اُسی طرح اُس پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے مُلک سے بھی بخوبی واقف ہے اور اگر موقع آ جائے تو اپنے نصاب کو اپنی قوم پر قُربان کر دے۔

بعض "سالخوردہ" اور "تجربہ کار" اپنی عینکوں کو ماتھوں پر سرکا سرکا کر فرماتے ہیں کہ طالب علموں کا خون بہت گرم ہوتا ہے، وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں، انھیں سیاسیات کی طرف دعوت نہ دینا چاہئیے۔

وہ شاید طالب علم سمجھتے ہیں صرف آٹھ آٹھ دس دس برس کے بچوں کو ــــــ کوئی خدا کا بندہ اُنھیں مطلع کر دے کہ کالج کے طالب علم بچے نہیں ہوتے، جوان اور نوجوان ہوتے ہیں، جاہل نہیں ہوتے، پڑھے لکھے ہوتے ہیں، وحشی نہیں شائستہ ہوتے ہیں ــــ خود ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جانا تو بڑی بات ہے، اُن میں اس قدر صلاحیت ہوتی ہے کہ چھوٹے درجے کے طُلّاب کو بھی اپنے قبضے میں رکھ کر مشتعل نہ ہونے دیں۔

اس کے علاوہ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ ٹھنڈے خون کی دانائیوں کے تمام انبار کو گرم خون کی ایک نادانی پر نچھاور کیا جا سکتا ہے۔

زمانہ دراز سے یہ رونا رویا جا رہا ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم نہایت ہی خراب ہے، لیکن کسی کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی —— ہماری تعلیمی مصیبت مکمل ہے۔ صرف ہمارا نصاب، اور طرز تعلیم ہی خراب نہیں، ہمارے اساتذہ، اور ہمارے پروفیسر بھی ناامیدی کی حد تک خراب واقع ہوئے ہیں۔

ہندوستانی پروفیسروں کو پروفیسر کہنا دراصل پروفیسری کی توہین ہے۔ اِس مُلک میں جہاں لاکھوں باتیں تعجب انگیز ہیں، وہاں یہ بھی ایک نہایت ہی حیرتناک بات ہے کہ اِس جہالت آباد میں کسی کو یہ علم تک نہیں کہ پروفیسر کہتے کسے ہیں، اُس کے علمی، اخلاقی اور ذہنی خصوصیات کیا ہونا چاہئیں، اور اِس بزرگ ترین پیشے کے واسطے کون کونسے شرائط ناگزیر ہیں۔

پروفیسری ایک ایسا قابلِ احترام مرتبہ بلند ہے جس کے سامنے حکومت کا جھکنا، پروفیسری کی نہیں، خود حکومت کی عزت ہے۔

لیکن اِس مُلک میں ہر بی اے، اور ہر ایم اے یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار کی جوتیاں سیدھی کر کے بغیر شرم و حیا کے پروفیسری کی کرسی پر جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ نہیں پوچھا جاتا کہ درخواست گزار اِس منصبِ جلیل کا اہل ہے کہ نہیں، دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ آیا درخواست گزار اچھے توڑ جوڑ کر سکتا ہے کہ نہیں، خوشامد کی ایک کثیر مقدار حسبِ مطالبہ پیش کرنے پر آمادہ ہے کہ نہیں، طالب علموں کو وطن، اور حبِّ وطن سے بیگانہ رکھنے میں کامیاب ثابت ہو سکتا ہے کہ نہیں، اور ہماری سازشوں میں ایک اچھے آلۂ کار کی طرح استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ نہیں —— اگر درخواست گزار اِس کسوٹی پر پورا اُترتا ہے تو آنکھیں بند کر کے اُس کی درخواست منظور کر لی جاتی ہے۔ اور اُسے لائسنس دے دیا جاتا ہے کہ اپنی جہالت، دنارت اور وطن دشمنی کے تمام حربے استعمال کر کے نئی نسل کی مٹی پلید کر دے۔

ہمارا پروفیسر کلاس میں اِس جذبۂ شریف کے ساتھ لکچر نہیں دیتا کہ اُسے اپنے نونہالوں کو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اُبھارنا، اور اُنھیں صحیح انسان بنانا ہے۔ وہ تو صرف ڈبل روٹی اور مکھن کھانے، اور پیر سوپ سے مُنہ دھو سکنے کی خاطر کلاس میں بے تکان چلاتا رہتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے علیم پروفیسر صاحب سے ذرا دریافت تو فرمائیے کہ جنگِ عظیم کے موقع پر انگلستان، فرانس، اور جرمنی کے طلّاب کہاں تھے؟ وہ اُس موقع پر "امنِ عامہ" اور "نظم و نسق" (Discipline) کے نام پر کسی مدرسے کی خاطر لکچر دیتے ہوئے پروفیسر کی ہوا میں اُڑتی ہوئی رنگین ٹائی کا نظارہ کر رہے تھے، یا پر ہیم جنگ کے خونک سائے میں برستے ہوئے گولوں سے کھیل رہے تھے؟

دور کیوں جائیے، پوچھیے آج اسپین کے طلّاب کہاں ہیں؟ وہ کالجوں کی کرسیوں پر بیٹھے فرسودہ تاریخ کا درس لے رہے ہیں، یا خندقوں میں لیٹے اپنے خون سے ایک نئی تاریخ لکھ رہے ہیں؟

(۲) ایک طالبِ علم کی خودکشی

بات میں بات یاد آتی ہے۔ علی گڑھ کے پروفیسر صاحب ذرا غور سے سُنیں، عبرت کے کانوں سے سُنیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو شاہ جہان پور تشریف لے گئے تھے، اور وہاں آپ کی تقریر سُننے کی خاطر ایک طالب علم جلسے میں شریک ہوا تھا —— جس کی پاداش میں اُسے برسرِ عام کوڑے مارے گئے تھے۔ اور اِس علانیہ بے عزتی کی تاب نہ لا کر اُس غیور طالب علم نے خودکشی کر لی تھی۔

طالب علم کا جُرم آپ کو معلوم ہے؟ وہ صرف اپنے قومی راہنما کی تقریر سُننے گیا تھا۔ اُس کی سزا آپ کو معلوم ہے؟ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں اُس کی پُشت پر کوڑے مارے گئے ——

اِس کا نتیجہ آپ کو معلوم ہے؟ طالب علم یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکا۔ اور اُس نے خودکشی کر لی۔

اِس موت کی ذمّہ داری کس پر ہے؟ طالب علم پر، یا کوڑے مارنے والے پر؟

ظاہر ہے کہ وہ طالب علم ہندوستانی تھا، وہ ہندوستان میں پیدا ہوا تھا، اور ہندوستان ہی میں اُسے مرنا تھا —— ہندوستان ہی میں جس کے باپ دادا پیدا ہوئے تھے، اور ہندوستان ہی کی خاک

میں وہ دونوں ہیں۔

وہ سن نئے ہندوستان سے محبت کرنا اُس کے خمیر میں داخل تھا۔ اُس نے پنڈت جی کا نام سنا، اور یہ بھی سنا کہ وہ میرے ملک کو نجات دلانا چاہتے ہیں، اور اُسی کے ساتھ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ شاہجہان پور آئے ہوئے ہیں، اور آج فلاں مقام پر اُن کی تقریر ہوگی ــــ چنانچہ یہ ایک قطعی قدرتی اور فطری بات تھی کہ وہ پنڈت جی کی تقریر سننے کے لئے جلسے میں چلا گیا۔

کیا طالب علموں کا اپنے وطن سے محبت کرنا، اور اپنے وطن کے رہبروں کی تقریر سننا کوئی جرم ہے!

اگر حبِ وطن کوئی جرم نہیں، تو پھر اس موت کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے؟

کاش طالب علموں کو سیاسیات کی سی قدرتی شے سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرنے والے اب بھی غور فرمائیں۔

(۳) رومان و افسانہ

انہیں صفحات میں بارہا اِس امر پر اظہارِ افسوس کیا جا چکا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر صرف رومان اور افسانے پر مٹے ہوئے ہیں، اور جب رومان یا افسانے سے فرصت ملتی ہے تو "مذہبیات" "الٰہیات" میں مستغرق ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اِس وقت آگ لگی ہوئی ہے، اور یارانِ طریقت ہیں کہ:-

خیالِ زلفِ جاناں کب ہمارے دل سے نکلے گا، الاپے چلے جا رہے ہیں۔

"نگار" کا رومانی اور افسانوی فائل ہمیشہ بھرا رہتا ہے، لیکن علمی اور عملی مضامین کا فائل جب دیکھئے سسکتا نظر آتا ہے۔

رومان و افسانہ دونوں اپنی اپنی جگہ قابلِ اعتنا اور درخورِ التفات ہیں، مگر یہ باتیں بزم کے شایانِ شان ہیں، ہندوستان تو اِس وقت رزم میں مبتلا ہے، اور ملک کا ہر گوشہ میدانِ جنگ بنا ہوا ہے، ایسے موقع پر رومان اور افسانے کی یہ بھرمار بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہے۔ ملک کی سیاسی، اقتصادی، اور معاشرتی حالت اِس قدر ابتر ہو رہی ہے کہ سب کام چھوڑ کر ہر صاحبِ قلم کو اِس طرف معروف ہو جانا چاہیئے۔ اور رومان اور افسانے میں بھی اِس چیز کو پیشِ نظر رکھنا اُن کا سب سے بڑا فرض ہے۔

ہر چیز وقت پر اچھی معلوم ہوتی ہے، جس وقت ہندوستان کو نجات حاصل ہو جائے گی، اُس وقت میں سب سے پہلے بزم آرائی کا غلغلہ بلند کروں گا، اور ایسے ایسے ترانے چھیڑوں گا جنھیں گوشِ فلک نے بھی کبھی نہ سنا ہوگا۔

(۴) شاعری اور مولوی

ایک نیک "مولوی صاحب" نے خدا انھیں نیک ہدایت دے، اور ان کے شعور کو کم سے کم اتنا ضرور ہی بیدار کر دے کہ وہ شعر سمجھنے لگیں ــــ "علمائے کرام" کے ایک غالباً سہ روزہ اخبار میں "موج در موج" کی سرخی کے تحت (موج در موج سے شاید پیش معانی مراد ہے) اِس بات پر نہایت ہی خشونت کا اظہار کیا ہے کہ آج کل کے اکثر و بیشتر شعراء بے دینی و الحاد کی اشاعت میں مصروف ہیں۔

"مولوی" اور نشرِ الحاد پر خشونت کا اظہار!

اُسے تو اِس سے خوش ہونا چاہیئے تھا کہ آخر کار ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو نشرِ الحاد میں اُس کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔

نشرِ الحاد میں تو وہ خود صدیوں سے مصروف ہے، وہ تو ایک مدت سے علانیہ اِس دھن میں لگا ہوا ہے کہ لوگ نمازیں تو پڑھیں، لیکن بے خضوع و خشوع صرف حوروں اور سونے چاندی کی خاطر ــــ روزے تو رکھیں، گر شرائطِ صوم سے قطعی بیگانہ ہو کر، صرف لوگوں کے دکھانے، اور افطاریاں کھانے کے لئے ــــ اور جہاد تو کریں، لیکن تلوار ہاتھ میں پکڑ کر باطل سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کو کافر کہہ کر ــــ

وہ ایک زمانۂ دراز سے ٹھونس ٹھونس کر لبدے، نیازوں کے حلوے کھا رہا ہے، سُنّت کے نام سے سُرمے لگا لگا کر عقد کر رہا ہے ــــ ڈھولوں پر قوالیاں سن رہا ہے، اور حال کے نام پر بڑے بڑے توندے اور بھدّے داڑھی والے مریدوں کو تھرکوا رہا ہے۔

اُس کا شعار ہے حکام کی خوشامد کرنا، مسلمانوں، ہندوؤں کو لڑانا

مخبری اور غداری کرنا، جھوٹے فتوے لکھنا، خلق اللہ کو اپنے پیٹ کی خاطر بصیرت سے محروم رکھنا، زنان بازاری، اور امردانِ خوش چشم سے ہاتھ پاؤں دبوانا، اور اُن تمام افعال کا کرنا جن سے دین کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں ——

یہ سچ ہے کہ وہ زبان سے الحاد کی تعلیم نہیں دیتا، کیونکہ اِس میں مردانگی کی ضرورت ہے، لیکن وہ تمام حرکات کرتا ہے، جو انسان کو مذہبیت سے نا فرمان بنا دیتے، اور خدا سے اُس کا دل ہٹا دیتے ہیں۔

اِس کے علاوہ "مولوی" ہی وہ بھلا آدمی ہے جس نے خدا کے تصوّر و تخیّل کو اِس قدر پست کر دیا ہے کہ وہ الوہیت کے مقامِ بلند سے گر کر انسانیت کی عام سطح پر آ گیا ہے۔

ہندو نے اگر علم کا مندر چھوڑا
مُسلم نے بھی راستی کا ممبر چھوڑا
پنڈت نے اگر بنا دیا بُت کو خدا
مُلّا نے خُدا کو بُت بنا کر چھوڑا

فتنۂ الحاد کے سلسلے میں شعرا، پر اظہارِ غضب کے بعد اُسی اخبار میں "مولوی" نے اِس بات پر بھی انتہائی تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ شعرا مذہب کی جانب کیوں رُجوع ہوتے ہیں، شاعری کو مذہب سے سروکار ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اور شاعری تو محض "گُل و بلبل" کا نام ہے۔ حقائق و معارف سے اِسے علاقہ ہی کیا ہے۔

یہ ہے ہمارے مولویوں کا شعور!

یہ بیچارے صرف اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں، اِس سے زیادہ کی اُن سے اُمید ہی نہیں کی جا سکتی۔

اِن غریبوں نے آنکھیں کھولیں تو غزل کی فضا میں، جس کے اندر "گُل و بلبل" "لیلیٰ مجنون" "یوسف زلیخا" "وامق و عذرا" "طور و موسیٰ" "وصل و ہجر" "رقیب و زاہد" اور "زلف و رُخ" کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔

اِن لوگوں میں اِتنی گہرائی کہاں تھی کہ وہ یہ سمجھ سکتے کہ غزل تو شاعری کی محض نقالی ہے۔ اصلی اور حقیقی شاعری کو اِن امور سے کوئی تعلق ہی نہیں —— اور اِسی کم فہمی اور بے بصری کا یہ نتیجہ ہے کہ آج کہا جا رہا ہے کہ شاعری کو حقائق و معارف سے واسطہ ہی کیا۔

خُدا کے اِن "نیک" بندوں سے کون کہے، اور کوئی کہے بھی تو یہ غریب سمجھیں کیونکر کہ شاعری کو زمین سے لیکر آسمان تک، عالمِ اجسام سے لیکر عالمِ ارواح تک، اور مادیات سے لے کر مجرّد تصورات تک سے ایک ایسا قوی رشتۂ تعلق ہے جسے زمان و مکان کی کوئی قوت توڑ نہیں سکتی۔

شاعر صرف "گُل و بلبل" کے واسطے نہیں پیدا ہوا ہے، وہ محض آلۂ دِل بستگی نہیں ہے۔

وہ تو انسانیت کا راہبر، زندگی کا پیغامبر، کرۂ ارض کا امین، اور کائنات کا وارث ہوتا ہے۔

"مولوی" کو شاعری کی بے پناہ وسعت اور ہمہ گیری کا علم نہیں، وہ شاعری کو محدود سمجھتا ہے۔ شاعر کو صرف "حُسن و عشق" کی داستان خیال کئے ہوئے، حالانکہ:۔

از زمین، تا بہ آسمان سخن است!

پامالِ غم انسان ہوا جاتا ہے
بیچارہ پریشان ہوا جاتا ہے
گھٹتا ہے تو ترا ہے فرشتوں کا جمود
بڑھتا ہے تو شیطان ہوا جاتا ہے

جوش

تنہائی

(شیلے کی ایک نظم سے متاثر ہوکر)

دھوپ میں اس قدر تمازت ہے
خامشی برسرِ حکومت ہے
آسماں یوں ہے ابر سے خالی
جس طرح روشنی سے تاریکی
رقص کرتی ہے موج دریا کی
برق کی ہے ضیا بھی، شوخی بھی
دوپہر کا جلال چھایا ہے
ڈر کے سائے نے منہ چھپایا ہے
اس قدر ہے شبک زمیں کی نمی
کہ شگوفے کھلا نہیں سکتی
ہے صدائے طیور میں نرمی
اور ہوائے بحور میں نرمی
شہر سے ہمہمہ نہیں اٹھتا
بند ہے سازِ زندگی کی صدا

سطحِ دریا ہے اس قدر ہموار
کہ نظر آرہی ہے تہ کی رسوار
موجِ ساحل میں نور کا ہے وفور
نور پر ہو رہی ہے بارشِ نور
آہ اس وقت بھی میں تنہا ہوں
سر جھکائے خموش بیٹھا ہوں

بحر اوڑھے ہے برق کی چادر
بجلیاں گر رہی ہیں دل پہ ادھر
جنبشِ موج میں ترانہ ہے
بیت لب پر یہ عاشقانہ ہے
"کوئی کافر جو مہرباں ہوتا
اور ہی رنگِ داستاں ہوتا"

میری ہمت جواب دیتی ہے — دل کی طاقت جواب دیتی ہے
نہیں آرام ہجر میں دم بھر — تہلکے میں ہے دل، فگار جگر
اب کہاں وہ سکون و صبر و قرار — جان اندوہگیں کا تھا جو شعار
ہیچ تھی ساری عشرتِ دنیا — رازداری میں غم کی تھا وہ مزا

دل کو ایک فتنہ گر نے لوٹ لیا — لطف کی اک نظر نے لوٹ لیا
آہ سرمایۂ اثر نہ رہی — لذتِ گریۂ سحر نہ رہی
ہے زمانے کو فکر شہرت کی — جاہ و حشمت کی عیش و راحت کی
میں ہوں اور اک جہانِ مایوسی — زندگی ترجمانِ مایوسی
اُن کو حاصل ہے لطف شربِ مدام — زہر سے ہے لبالب اپنا جام

سر سے آخر گذر گیا طوفان — اب نہیں وہ کشاکش تن و جاں
خارِ حسرت کی وہ خلش نہ رہی — دل وہی ہے مگر تپش نہ رہی
غم نہ اب انتشار رہتا ہے — موت کا انتظار رہتا ہے

مگر اُن کو خبر بھی ہو کہ نہ ہو
مژہ اشکوں سے تر بھی ہو کہ نہ ہو

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

تاریخ کو منقلب کر دینے والے کِرمہائے ضعیف

اسرائیل احمد خاں

وبائی امراض نے تاریخی واقعات کی رفتار میں زبردست انحرافات پیدا کئے ہیں؛ قرونِ مظلمہ میں ہمارے آباؤ اجداد دیو پیکر شیاطین سے ڈرا کرتے تھے۔ آج ہم "خورد بینی اجسام" سے لرزہ براندام رہا کرتے ہیں؛ کمزور اعصاب کے لوگ ازمنۂ متوسطہ میں جب سو کر اُٹھا کرتے تھے تو اپنے بستروں کو پلٹ کر بھوتوں پریتوں کو دیکھا کرتے تھے؛ ٹھیک جس طرح کہ اک مشہور قصے کی ایک کردار مس میٹی کرنیفرڈ اپنے گدیلے کے نیچے جیب نقب زنوں کی سراغ رسانی کیا کرتی تھی؛ اک زندۂ جاوید تاریخی عمارت کی دیوار پر وہ نشان آج تک ثبت ہے جو اِس طرح بنا تھا کہ مشہور مسیحی امام غیر مقلدین مارٹن لیوتھر نے اپنی دوات اولادِ آدم کے سیاہ قلب عدوِّ مبین "شیطان الرجیم" ——— کے مُنہ پر کھینچ ماری تھی!

سینٹ پال کے گرجا کی عمارت کے کارہائے شکست و ریخت کے دوران میں ایک قدیم قسم کی ناس دانی ملی تھی۔ یہ کلیسائے مذکورہ کے اندر ہی بطور بزرگانِ سَلَف کے اک تبرک کے رکھ دی گئی۔ مین (ڈین انج) نے یہ کسی قدر اجتہادی رائے پیش کی کہ اِس ڈبیہ کی موزوں تر جگہ گرجا کا کتب خانہ ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا انکشاف یہ تھا کہ یہ ظرفِ حقیر یعنی ڈبیہ جو ناس دانی ہے جس میں سے ایک "فقیر کی چٹکی" لے کر حضرت سینٹ دنسٹن باہیر لعین کی ناک میں چڑھا دیا کرتے تھے، جو وقتاً فوقتاً اُن کے اوقاتِ خاص میں آکر اُن کا ناک میں دم کرنا چاہتا تھا؛ ظاہر ہے کہ اس چیز کا تعلق سینٹ پال کی تاریخ سے تھا، اور کلیسا کا عجائب خانہ ہی اُس کا حقدار ہو سکتا تھا لیکن میرے ارکانِ جماعت نے میرے فتوے پر صاد نہ کیا۔ وہ تھوڑے سے تاریخی تخیل کی شئے لطیف سے عاری ثابت ہوئے۔

عہدِ حاضر کے مخصوص آثار و خصوصیات سے یہ بات شمار کئے جانے کے قابل ہے کہ ابھی حال میں ایک امریکی مصنف مسٹر زنسر نے پورے متین لب و لہجہ میں ایک کتاب شائع کی ہے جو "چوہے، مچھر، پسو اور اُن کا جنگنامہ!" ایسے بہتم بالشان نام و موضوع پر لکھی گئی ہے؛؛ اس علمی واقعۂ نادرہ پر میرے ذخیرۂ دماغ میں اُس عہدِ پاستانی کی یاد تازہ ہو گئی، جبکہ ایسی ناگفتہ بہ مخلوق کا نام لینا بھی شائستہ آدابِ مجلس کے خلاف سمجھا جاتا تھا!؏

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

چنانچہ کھٹمل کو استعارۃً "نارفک یا ورڈ" کہا جاتا تھا؛ ناگفتنی لفظاً "بگ" "جناب "نارفک" کے اسم گرامی سے یاد کیا جاتا تھا، تاہم بہر حال اُن کی ناقابلِ برداشت شخصیت پر اک پردہ ضرور ڈال دیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ پردہ اک خوشنما نقاب ہی بن گیا تھا!

واضح رہے کہ اشرف المخلوقات حضرت انسان کے لئے ان حقیر و ناچیز کیڑوں کوڑوں کی ہستی کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں؛ مسٹر زنسر امریکی نے اس کسمپرس مخلوق کی نسبت یہ بلند بانگ دعویٰ پیش کیا ہے کہ اُنھوں نے تاریخ بشری کے عظیم الشان حوادث پر فرماں فرمائی کی ہے؛ اُن سارے

جابرہ و فراعنہ اور آن تمام قہرمان جرنیلوں اور جہاں سوز فاتحوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر جو تاریخ عالم کی تماشا گاہ پر نمودار ہوئے ہیں! طاعون کے چوہے زرد بخار کے مچھر، اور ٹائفس کے پسّو نے بڑے بڑے عزودوں اور سامانوں کی قاہر قوموں اور جرار لشکروں کو عرصۂ ہستی سے محو کر دیا ہے۔

اب یہ تاریخی نظریہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ سکندرِ اعظم "ٹائفس" کے خوردبینی جرثومہ ہی کا صیدِ زبوں بنا تھا۔

اگر اس چھوٹے سے "کرمِ ذلیل" نے اس "بطلِ جلیل" کو نہ نگل لیا ہوتا تو کیا آخر الذکر نے معلومہ دنیا کے باقی حصے کو بھی اپنی نوکِ شمشیر پر نہ اٹھا لیا ہوتا؟ معلوم ہے کہ سکندر اس جوانمرگی کے وقت صرف تیس سال کا تھا! وہ اک بے پایاں حوصلہ مندی اور اک لامحدود روحِ عمل کا خزینۂ برقی تھا! غالباً وہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین حربی قائد ہوا ہے! کم از کم اس میں تو شک نہیں کہ اُس نے عرصۂ عالم کی چیدہ ترین افواج کی کماں داری کی! اگر وہ زندہ رہتا تو سیاسیات عالم کے دوسرے میدانوں کو کیسا کچھ زیر و زبر نہ کرتا! لیکن ؎

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود!

یا للعجب کہ عسکریت و حربیت کے اس دیو مہیب کو اک پسّو نے اپنی چٹکی میں لیکر مسل ڈالا! ؎

مرا اور ارسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی

سکندرِ اعظم نے تمام یونانی مستعمرات کو ملا کر ساری دنیائے یونان کے علمبردار کی شان سے اپنے کو مشرق و مغرب کے سامنے پیش کیا تھا! اس صورتِ حال کے نتائج بہت ہمہ گیر ہوتے! چنانچہ سسلی کے یونانی وہاں سے اہلِ قرطاجنہ کو نکال باہر کرنے کی غرض سے "مقدونی پرچمِ فتح" کو ضرور دعوت دیتے! پھر جنوبی اٹلی کے یونانی قابض بھی نوزائیدہ "رومی خطرے" پر سکندر کی عنانِ توجہ کو موڑتے! ایک مشہور رومی قوم پرست نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اہلِ رومہ کے مقابلے میں سکندر فیلقوسی کو منہ کی کھانا پڑتی۔

لیکن یہ صرف چھوٹا منہ بڑی بات ہے!

قرطاجنی ہنی بال روم پر فتح حاصل کرنے سے اس بنا پر ناکام رہا تھا۔ کہ وہ اس عظیم شہر کی دیواروں کے سامنے محاصرے کے آلات اور قلعہ شکن اسباب کے بغیر آیا تھا۔ لیکن مخفی نہیں کہ سکندرِ اعظم نے دنیائے عتیق کے تین مہیب ترین قلعوں ــــــ تھیبس، ٹائر، گازا۔ کو گرد بنا کر اڑا دیا! وہ یقیناً رومِ عظیم کی شہر پناہ کو ہفتہ عشرہ میں پاش پاش کر ڈالتا! اور پھر آپ کو خبر ہے کہ اس کے دُور رس نتائج مابعد کیا ہوتے؟!

غالباً آج ہم یونانی زبان میں گفتگو کرتے سنائی دیتے! کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ اطالیہ کی سرزمین پر نہ رومتہ الکبریٰ کی تختگاہ بلند ہوتی نہ حضرتِ پاپائے اعظم کا حرمِ محترم!! ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

بوالعجبی یہ کہ صرف ایک کرمِ ضعیف اس تمام عظیم و جسیم دفترِ تاریخی کو چاٹ گیا! تقدیرِ الٰہی کی ایک منحرف جنبشِ ابرو اقوام و ممالک کی تاریخ کو کس طرح زیر و زبر کر دیتی ہے۔

یہ قیاس بھی قریباً ایک مسلّمہ تاریخی نظریہ بن گیا ہے کہ "رومن ایمپائر" بھی اس وجہ سے تباہ ہوئی کہ "ملیریا کے مچھر" نے اس قصرِ سربفلک کی بنیادوں میں سرنگ لگانی شروع کر دی تھی! ممکن ہے کہ منجملہ دیگر اسبابِ ہلاکت کے یہ بھی اک خانہ برانداز عنصر ہوا! یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شہر ایتھنز جنگ پیلوپنیزین سے قبل ہی طاعون کی یورشوں سے بہت کچھ خستہ حال ہو چکا تھا، اور رومی سلطنت کی جم غفیر آبادیاں مارکس آریلیس اور جسٹینین قیاصرہ کے زمانوں میں عالم آشوب طاعونی دوروں سے غرقِ ہلاکت ہوئی تھیں!

چودھویں صدی کی وَبا ــــــ "مرگِ سیاہ" ــــــ نے ایک رُبع مقبوضہ سلطنت کو ویرانی کے منظرِ تاریک میں تبدیل کر دیا۔

اغلب یہ ہے کہ ایک ثلث آبادی براعظم یورپ کی اس قیامتِ صغریٰ میں لقمۂ اجل بنی!

اور صرف چند گمنام کرموں کی قتالیوں کے ہاتھوں!!

کرۂ ارض کے کتنے عظیم حصوں میں ان حوادث کے پھر معاشی مصائب نازل ہوئے ہوں گے!

خوردبینی اجسام نے بہت سی جنگوں کا "ثالث بالشر" بن کر فیصلہ کیا ہے! انہی جراثیم نے ایک خاص تاریخی موقعے پر بیت المقدس کو ویران کر دیا تھا، اگرچہ بعض دیندار مورخین اشوریوں کے قتل عام کو "ملک الموت" کی خون آشامی سے منسوب کرتے ہیں۔

یقین یا جوج و ماجوج کے سیلاب نے بالکل ممکن ہے کہ ۱۲۵ ق،م، میں شہر قسطنطنیہ کو غرقاب کر ڈالا ہوتا، اگر طاعون نے پھوٹ کر اس طوفان کی عنان گیری نہ کی ہوتی۔

حروبِ صلیبیہ کی اکثر یلغاروں کو عربوں کی مدافعت کے بعد اگر کسی چیز نے پسپا کیا تو وہ وبائی بیماریاں ہی تھیں جو صلیبی مجاہدوں کے کیمپوں پر حملہ آور ہوا کرتی تھیں۔

یورپ کی جنگ سی سالہ کے دوران کے دو معرکوں میں میدانِ کارزار میں اترنے سے پہلے ہی "ٹائفس" (تپ عفونتی) کے جراثیم نے فریقین کی افواج کی صفوف کو خالی کر ڈالا تھا!

نپولین نے ہیٹی میں اک سیاہ رنگ کرم وبائی کی جنگی چالوں سے شکست فاش کھائی! واقعہ یہ ہے کہ ۲۵ ہزار فرانسیسی افواج میں سے پورے ۲۲ ہزار کا سرخ خون تو زرد بخار کے کیڑے ہی نے بہا ڈالا۔

چند سال ہوئے میں نے جنگِ عظیم کے نقصانات پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ جنگِ عظیم ہی وہ پہلا محاربہ ہے ——— ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس و پروشیا کے بعد! ——— جس میں جراثیم نے نسبتہً بہت کم خراجِ جان وصول کیا۔

جنگِ ہفت سالہ (۱۷۵۶ء لغایت ۱۷۶۳ء) میں آسٹریا کی افواج کے نقصانات ۳۲ ہزار مقتولِ تیغ اور ۹۳ ہزار ہم سو قتیلِ امراض پر مشتمل تھے۔

"حروبِ نپولینی" میں فرانسیسی اتلافِ نفوس کے اعداد ناقابلِ اعتماد ہیں۔ نپولین کی شاہانہ دروغ بافیوں نے ان حسابات کو ساقط الاعتبار بنا دیا ہے۔

لیکن برطانوی افواج میں انہی ایام میں ۹۶۵ ۳۵ ہلاک اور ۱۹۳۸۵۱ فوت دکھائے گئے۔ بحری بیڑے میں بیس ہزار میدانِ کارزار میں اور ۲۰۰۰، بسترِ مرض پر نذرِ اجل ہوئے۔

جنگِ کریمیا میں انگریزی فوج کے صرف ۲۰۶۲ آدمی میدان میں کھیت رہے، درانحالیکہ ۱۷۵۸۰ امراض کی قربان گاہ پر چڑھے! فرانسیسیوں کے نقصانات جنگ و مرض دونوں ذیل میں علی الترتیب ۲۰ ہزار اور ۷۵ ہزار تھے۔

بوئروں کی لڑائی میں ۷۵۳۴ برطانوی سپاہی ہدفِ تیغ و تفنگ ہوئے اور ۱۴۳۸۲ مختلف امراض کا لقمہ بنے۔

جراثیمی امراض نے بعض غیر ترقی یافتہ اقوام کو مدتوں گرفتارِ ہلاکت و مصیبت رکھا ہے، تاہم اب وہ طبی طور پر "مامون" (Immune)

ہو گئی ہیں۔ ہر چاند کا گھٹنا جانا اک کو بکھنی اور جوئے شیر برآری سے کم نہ تھا۔ اگر قبل اس مہم کے آغاز کے ایک خاص قسم کے مہلک مچھر کے خلاف اک کامیاب معرکہ آرائی انجام دے لی جاتی! وسطی براعظم افریقہ کے وسیع خطے "مرض النوم" کا گہوارہ تھے۔ وہ بمشکل انسانی مسکن و مامن بن سکتے تھے۔ اگر وہاں بھی اسی طرح پیش بینی طور پر متعلقہ حشرات ارضی و فضائی سے میدان صاف نہ کر لیا جاتا۔ جنوبی ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کھونٹی کی شکل کا ایک کیڑا عرصے سے گلے کا ہدف بنا ہوا ہے، جو ان علاقوں کی خرابِ صحت کا اصلی سرچشمہ ثابت ہوا ہے، اگرچہ اک مدت تک یہاں کے باشندوں کی دائم المرضی کو ان کے ضعفِ قویٰ و فقدانِ توانائی سے منسوب کیا جاتا رہا۔

آسمان کے نیچے اک "بہشتِ ارضی" (Utopia) کی عملی تاسیس و تعمیر کے سارے مبشرین اُس کی فضا کو جراثیمِ امراض کے فتنے سے اک حرزاً آمنا "دکھاتے رہے ہیں! شیاطین کی خارج البلدی سے بھی پہلے اس غیر سماوی جنت کو جراثیم سے پاک کر لیا گیا ہے! میں کبھی حیرت سے سوچا کرتا ہوں کہ ہمارے ستارۂ ارض کی ایسی تطہیر زمین کے مستقبل کے کسی مرحلے پر بھی ممکن ہے؟ تعمیرِ جنت سے یہ تخریبِ جہنم بہرحال دشوار تر ثابت ہوگی۔

بہت سے قدیم امراض بلاشبہ اپنی قدامت کی نذر ہو گئے ہیں، یا انکا خراجِ جان کم ہو گیا ہے۔ لیکن بمشکل کوئی بیماری گم ہو کر لاولد ثابت ہوئی ہے! عموماً بعض جدید تر امراض اُس کے وارث بنے ہیں! تاہم وہ پرانی بیماریاں اپنی پرانی علامات و خصوصیات کے ساتھ ضرور روپوش ہو گئی ہیں۔ بعض تاریخی وباؤں کے حالات کافی صحت و احتساب کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں، لیکن موجودہ امراض میں سے کسی سے بھی وہ مماثل قرار نہیں دیے جا سکتے۔ مرض جذام مثلاً شائستہ ممالک سے قریباً معدوم ہو چکا ہے، چیچک اور سرخ بخار بھی اپنے پیچھے اک "لوحِ سادہ" چھوڑ گئے ہیں، اور "پسینہ" کون سا مرض تھا جس کا ذکرِ خیر کتبِ تاریخ میں پایا جاتا ہے؟ اُس کی اک عادتِ بد یہ تھی کہ وہ اہلِ فرنگ کو اپنی نظرِ انتخاب سے بہت نوازا کرتا تھا! ۱۴۸۵ء اور ۱۵۵۱ء کے درمیان ہمارے آباء و اجداد کو انہی متواتر قدم رنجہ فرمائی سے بہت رنجور رکھا! لیکن پھر اک پُراسرار طور پر وہ یکقلم غائب ہو گیا! ہنری ہفتم کے اولین سنہ جلوس میں اُس نے پایۂ تخت کے میرِ شہر اور ۶ ارکانِ بلدیہ کو ایک ہی ہفتے میں لقمہ بنا ڈالا! بالفشیدلہما

کہ جو لوگ اس جانستاں مرض میں مبتلا ہوتے تھے اُن میں سے ایک فیصدی بمشکل جانبر ہو سکتے تھے! بعض بعض شہروں میں نصف سے زیادہ آبادی ہلاک ہو کر انھیں نصفاً شہر خموشاں میں تبدیل کر دیتی تھی۔ تسروزبیری کے ایسے قصبے سے اُس نے چند دنوں کی مُہلتِ قلیل میں نَو سو جانوں کا گراں قدر خراج وصول کیا۔

دوسری طرف جیسا کہ مسٹر زنزنے اپنے اِستقصار سے معلوم کیا ہے گزشتہ دو عشراتِ سنین میں تین جدید متعدی امراض نے ظہور کیا ہے؛ ایک مرض اہم ہے جس نے انگلستان میں مُبصرین کی توجہ کو زیادہ جذب کیا ہے۔

ایک پریشان کن طبی نظریہ یہ ہے کہ "دوشیزہ سرزمینوں" کو یہ وبا سے زیادہ مَوردِ التفات بنایا کرتی ہے: اسی طرح جو خطّے حکیمانی حفظِ ماتقدم کی تدابیر کے ذریعے اُسے خارج البلد کر کے "مامون" ہو جاتے ہیں، اک عرصے کے بعد اپنی "امینت" (Immunity) سے پھر غیر مسلح ہو جایا کرتے ہیں!

جزائر فیجی میں ۱۸۷۵ء میں ڈیڑھ لاکھ کی آبادی میں سے پورے چالیس ہزار چیچک کے ناگہانی حملے سے صاف ہو گئے۔ اگرچہ اُس سے پہلے یہ مرض دُنیا کے اس خطّے میں قطعاً غیر معلوم تھا۔ سواحلِ آسٹریلیا سے جَست کر کے وہ ان ٹاپوؤں پر آ نازل ہوا۔

میکسیکو کے سُرخ ہندی چیچک کے سیاہ داغوں کی دستبُرد سے نابود ہو گئے۔ جزائر کینری کے "گانچے" لوگ ایک نامعلوم وبا سے ایسے فنا ہوئے کہ اب اس پوری نسل کا ایک فرد بھی یا درفتگاں میں رونے والا باقی نہیں۔

لیکن مسٹر زنزر کی کتاب کے رومان کا ہیرو (رئیس القصہ) ٹائفس کا پسو ہے! اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ جب بیشمار کتابیں بنی آدم کے کثیر التعداد قاتلوں ——— چنگیز سے لے کر لینن تک[1] ——— پر لکھی گئی ہیں تو ایک رزمیہ روح کُش "ٹائفس" کی قتالیوں کی داستانِ خونین پر کیوں نہ سپرد قلم کیا جائے!

ٹائفس اب انگلستان میں قریباً ناپید ہے۔ تاہم ہر بڑی جنگ کے درمیان وہ عموماً کو دپڑا کرتا ہے، اور پلٹ کر حملہ کر کے گویا تیغ و تفنگ کی کمک کرنے لگتا ہے۔

اب یہ اندیشہ کافی سنگین بن گیا ہے کہ مستقبل کی جنگ میں مغرب کی متمدن آب قومیں ایک دوسری کی غیر مُصافی آبادیوں میں مہلک امراض وبائی کے جراثیم کو پھیلانے کی خاص الخاص مسیحی سُنت کو انجام دیں گی۔ شاید موجودہ بین الاقوامی ذہنیتوں کے ظہور سے قبل کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ واہمہ نہ آسکتا تھا کہ محبۂ اُلنس انسان ایسی بربریت اور شیطنت پر اُتر سکتا ہے۔ (ترجمۂ لُوین اکج)

---

[1] "لینن تک" خوب کہا!" انکویزشن" کی "روایاتِ جمیلہ" رکھنے والے مسیحی مقتدایان کلیسا کا لینن اعظم کی "اصلاح بذریعہ اسلحہ" کے اس طرح مُنہ آنا اپنی معصوم بیخبری پر ہی دال ہو سکتا ہے! ؎
اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت + دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ!

ہر صاحبِ جنوں جو ہو کے بیباک سر کردے
فطرت کو زبوں کر کے زبوں تر کردے
افلاس کہ پہنچا ہے یہ ایماں کی طرف
سنجیدہ مسلسل ہو تو کافر کردے
جوشؔ

نیند کی حقیقت

محمد یوسف کشور

اعضاء انسانیہ میں ہر عضو کا وظیفۂ طبیعیہ مختلف ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے کان سنتا ہے، ہاتھ چھوتا ہے۔ ناک سونگھتی ہے۔ زبان چکھتی ہے۔ دماغ سوچتا ہے، وغیرہ۔ ان ہی وظائف کے اختلاف سے ان اعضاء کے ملذذات و مرغوبات میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ آنکھ خوش رنگ پھولوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ کان کو نغمائے شیریں خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ہاتھ نرم اور چکنی سطح پر پھسلنا چاہتے ہیں۔ ناک کو بوئے عطر سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ زبان کو غذائے لطیف سے ذوق ہے۔ دماغ دل خوش کن خیالات کا متلاشی رہتا ہے لیکن بدنی سکون اور آسائش و راحت خدا کی ایسی نعمتیں ہیں جن کے ساتھ تمام اعضاء کو دلبستگی ہے۔

بظاہر انسان کے بعض متیقظ یعنی بیدار اعضاء ہمیشہ اپنے وظائف میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ دل ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ شرائین کی حرکت ہمیشہ جسم میں تر و تازہ خون پہنچایا کرتی ہے۔ آلات تنفس کبھی معطل نہیں رہتے۔ لیکن درحقیقت ان کو بھی سکون و آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نبض کا ہر توقف ان کے غیر منقطع سفر کی منزل ہے، جہاں وہ آرام لیتا ہے۔ شرائین کے افعال بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ اس میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور اس وقت ان نازک رگوں کی دوڑ دھوپ بھی خدا کے اس فیض عام سے متمتع ہوتی ہے۔

نیند اسی راحت تام، و سکون کامل کا نام ہے۔ اس لئے وہ اعضاء انسانیہ میں ہر عضو کو محبوب ہے اور اسقدر محبوب کہ اس کے لطف وصل کو رشک و رقابت منغص نہیں کر سکتے۔ بس اس سے ہر عضو ایک ساتھ فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بستر خواب سے اٹھنے کے بعد تمام قوائے جسمانیہ کی تجدید ہو جاتی ہے جسم کے جو پُرزے چلتے چلتے تھک گئے تھے وہ اپنی اصلی حالت میں آجاتے ہیں اور تمام جسم ایک مسرت تازہ، ایک نشاط نو اور ایک انبساط جدید سے مسلح ہو کر اپنے وظائف طبیعہ کے لئے از سر نو تیار ہو جاتے ہیں۔

ضرورت اختراع و ایجاد کی ماں ہے، اس لئے انسان کا دماغ ہمیشہ اپنے راحت و آسائش کے علل و اسباب کی جستجو میں سرگرم رہتا ہے۔ ادویہ عقاقیر کے خواص و آثار اسی ضرورت نے دریافت کئے۔ انکشافات جدیدہ کے گنجینۂ پنہاں کی وہی کلید بردار ہے۔ زمین کے نشیب و فراز کو اس نے ہموار کیا۔ کل جو جنگل تھا وہ آج باغ ارم نظر آتا ہے۔ کل جن میدانوں میں درندوں کے بھٹ نظر آتے تھے آج وہی متمدن انسانوں کا مسکن ہے۔ دریا کی سطح جو کل تک تلاطم خیز طوفان برپا کر رہی تھی آج انسان نے خود اس کو مسخر کر لیا ہے کل تک جو چیزیں پردۂ غیب کا چھپا ہوا راز سمجھی جاتی تھیں، آج وہ افسانۂ بزم انجمن ہیں لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ نیند کی حقیقت اور اس کے علل و اسباب کا قلعہ ضرورت کی اس فاتحانہ عقدہ کشائی سے اب تک محفوظ ہے جس طرح وہ اس وقت غیر متعین تھے۔ جیسا ایک وحشی انسان غفلت کی نیند سو رہا تھا اسی طرح وہ اب بھی مجہول و مشتبہ ہیں۔ جبکہ ایک متمدن انسان

انکشافات واختراع کی دھن میں رات دن بھرجایا کرتا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس کی جستجو بیکار تھی، وہ خواب وغفلت کا زمانہ تھا لیکن اس بیداری کے زمانے میں بھی اب تک اس کی کوئی تسکین بخش تحدید نہیں کی گئی۔ جدید معدا کشافات کے علم برداروں نے اس کے متعلق جو کچھ تحقیق وتفتیش کی ہے وہ بھی زیادہ قابل وقعت نہیں۔ تاہم منزل مقصود کا اڑتا ہوا غبار بھی شوق جستجو کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس لئے ہم کو اس افسانۂ خواب وخیال سے کم از کم لطف سماع تو ضرور اٹھا لینا چاہئے۔

بعض علمائے جدید کا خیال تھا کہ نیند خون کی اس کثرت مقدار کا نتیجہ ہے جس کی رو لیٹنے سے انسان کے دماغ میں دفعتاً پہنچ جاتی ہے۔ خون کی اس حرارت کا نتیجہ ہے کہ انسان سوتے وقت گرمی کے احساس سے کپڑا اتار دیتا ہے لیکن تجارب علمیہ اس خیال کی تائید نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے برعکس ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی حالت میں دماغ کی معمولی مقدار خون بھی کم ہو جاتی ہے۔

ایک شخص ایام طفلی میں سر کے بل گر پڑا تھا۔ ہڈی کے ٹوٹنے سے اسکی پیشانی پچک گئی تھی لیکن جب وہ سوتا تھا تو پیشانی کا یہ پچکا ہوا حصہ اور بھی گہرا ہو جاتا تھا اور جاگنے کے بعد پھر ابھر آتا تھا۔ پس اگر دماغ حالت خواب میں بہ نسبت بیداری کے خون کی غیر معمولی مقدار سے لبریز ہو جاتا تو نتیجہ بالکل برعکس ہو جاتا۔

زیادہ کد وکاوش کی ضرورت نہیں، ہر شخص معمولی حالتوں میں اس کے خلاف تجربہ کر سکتا ہے۔ انسان اگر گھنٹوں چپ لیٹا رہتا ہے (خاص خاص حالتوں کے علاوہ) اس حالت میں نہ اس کو نیند آتی ہے اور نہ دماغ میں کسی جدید کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے بالکل اس کے برعکس رائے قائم کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عالم خواب میں دماغ خون کے معمولی حصہ رسدی سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ خون ہی دماغ کی غذا ہے جس سے وہ عمل کرتا ہے اور اسی کی حرارت سے فضلات دماغیہ کو تحلیل کر سکتا ہے۔ اس لئے خون کی اس قلت مقدار کی وجہ سے نہ تو اس کو خود خون کے اجزا میں کسی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ وہ اس کے ذریعہ فضلات ہی کو دفع کر سکتا ہے، بلکہ بالکل بیکار محض ہو جاتا ہے۔ اس تعطل اور بیکاری کا نام نیند ہے۔

لیکن درحقیقت یہ خیال بھی قابل وثوق نہیں۔ تجارب سے ثابت ہوتا ہے کہ سونے کے ساتھ ہی دفعتاً انسان کے دماغ میں معمولی مقدار سے زیادہ خون کی ایک رو پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیند کی حالت میں انسان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور چہرہ کی سطح ظاہری بھی کسیقدر ابھر آتی ہے۔

بعض علما نے آلات کے ذریعہ ایک آدمی کے دماغ میں خون کی مقدار زیادہ پہنچائی اور پھر اس کو کم کیا تو معلوم ہوا کہ نیند پر خون کی کمی یا بیشی کا کوئی اثر نہیں پڑتا....... ان دونوں خیالات کا دارومدار تمام تر اس پر تھا کہ نیند کا سبب خون کی مقدار کی کمی یا بیشی ہے لیکن بعض علماء کے نزدیک خون کی مقدار کا کوئی اثر خواب وبیداری پر نہیں پڑتا۔ بلکہ خون کی کیفیت میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہی نیند کی علت ہیں۔ کبھی کبھی تو ان میں اسقدر حرارت اور روانی پیدا ہو جاتی ہے کہ دماغ اس پر قابو نہیں پاتا اور حرارت خون کی وجہ سے دماغ کے اعصاب کی رطوبت خشک ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر دماغ کو جو چیز عمل کے لئے آمادہ کرتی تھی وہی اس کو بیکار کر دیتی ہے اور اس تعطل کا نام نیند ہے۔

ان علماء نے مختلف علائم اور آثار سے اس کی تائید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں تغیرات دمویہ کی وجہ سے جب انسان گہری نیند سے اٹھتا ہے تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا ہوتا ہے اور اس کی جلد میں بھی ایک ابھار سا پیدا ہو جاتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اگرچہ اعصاب کے جال نے تمام اعضاء انسانیہ کو دماغ کے ساتھ مربوط کر دیا ہے لیکن کبھی کبھی ایک خاص کیفیت عصبانیہ دماغ و اعضاء کے ان ارتباطات و تعلقات کو منقطع کر دیتی ہے جو دماغ و اعضاء میں حرکت کرتے رہتے تھے۔ ان تعلقات کے منقطع ہونے سے تمام جسم انسانی معطل ہو جاتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام نیند ہے۔ لیکن اب تک اس پر کوئی یقینی دلیل قائم نہیں ہوئی ہے البتہ دوسرے علماء نے اس کے قریب قریب یہ رائے قائم کی ہے کہ جن اعصاب کا وظیفہ طبعیہ تمام جسم میں خون کا پہنچانا ہے۔ ان میں اسباب خارجہ تغیرات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اور یہی تغیر خواب ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان اسباب کو نشاط انگیز ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ نرم بستر کو دیکھنے کے ساتھ ہی نیند آجاتی ہے۔

اور شور و غل ہم کو دفعتاً بیدار کر دیتا ہے قہقہوں کے سننے سے۔ بستر پر لیٹنے سے بچوں کو تھپکیاں دینے سے اس لئے نیند آجاتی ہے کہ یہ اسباب اعصاب میں ایک خوشگوار اور لطیف تموج پیدا کر دیتے ہیں۔

درحقیقت اس رائے کا سلسلہ بھی ان لوگوں کے خیال سے جا کر مل جاتا ہے جو دماغ میں خون کی کمی کو نیند کا سبب قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان تمام موثرات خارجیہ سے اعصاب میں ایک قسم کا سکون پیدا ہوتا ہے جو دوران خون کی سرعت کو کم کر دیتا ہے۔ لیکن ان تمام مذاہب کا رد (جو خون کی کمیت کیفیت کو نیند کی علت قرار دیتے ہیں) ایک دوسرے عملی تجربہ نے کر دیا ہے خود میرے ایک عزیز کے ہاں دو توام بچے پیدا ہوئے اُن میں ایک بیدار رہتا تھا اور دوسرا اسی حالت میں سوتا تھا حالانکہ دونوں کے خون کا ظرف ایک دوسرے سے متصل تھا۔ اگر خون کی کمیت و کیفیت اس کا سبب ہوتے تو دونوں کی حالت خواب و بیداری میں ضرور تلازم ہوتا۔

اسی طرح کیمسٹری کے اصول و قواعد نے نیند کی جو حقیقت بتائی ہے وہ ان خیالات سے کہیں زیادہ دلچسپ و اہم ہے۔ انسان کا جسم درحقیقت ایک ٹرین ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ لیکن جب کوئلہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ انجن میں راکھ بھر جاتی ہے تو اس کو مجبوراً رک جانا پڑتا ہے یہی حال انسان کے دماغ کا ہے۔ جب تک اس کو ایندھن ملتا رہتا ہے اور اس میں راکھ نہیں بھرنے پاتی اس وقت تک اپنے وظائف طبیعہ میں سرگرم رہتا ہے لیکن جب ایندھن ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ فضلات جمع ہو جاتے ہیں تو انجن کی طرح وہ بھی دفعتاً رک جاتا ہے اور اسی کو ہم خواب شیریں کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اعصاب دماغیہ اپنے وظائف عملیہ میں دو چیز کے محتاج ہوتے ہیں اوکسیجن (Oxygen) اور کروماٹوفیل (Chromatophill) اس لئے دماغ آکسیجن کا ایک معتدبہ ذخیرہ جمع کرتا رہتا ہے اور جس طرح اسٹیشن پر کوئلہ پانی لینے کو گاڑی ٹھہر جاتی ہے اسی طرح دماغ بھی آکسیجن جمع کرنے کے لئے ایک خاص وقت میں سو جاتا ہے، اس لئے نیند درحقیقت اس استعداد کا نام ہے جس کو انسان کا دماغ اپنے سفر کے لئے تیار کرتا ہے۔

کروماٹوفیل کی کافی مقدار ہمیشہ خلایائے عصبیہ میں جمع رہتی ہے اور نیند اس خزانے میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی ہے لیکن ریاضت شدیدہ اور اعمال شاقہ اس کو فنا کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سخت محنت کے بعد انسان کو نہایت گہری نیند آتی ہے۔

تجارب عملیہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ایک ایسے شخص کے دماغ کا طبی معائنہ کیا گیا جو مدت سے نہیں سویا تھا معلوم ہوا کہ اس کا دماغ کروماٹوفیل سے بالکل خالی ہے۔

لیکن جب انسان سرگرم عمل رہتا ہے تو صرف یہ اجزا فنا ہی نہیں ہو جاتے جو دماغ کے انجن کا کوئلہ ہیں بلکہ جس قدر فنا ہوتے ہیں۔ اسی نسبت سے اس میں فضلات بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کوئلہ جس قدر جلتا ہے انجن میں اسی قدر راکھ بھی بھر جاتی ہے۔

حالت عمل بیداری کے اندر اگرچہ دماغ میں اور بھی متعدد قسم کے زہر آلود فضلات پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کی حقیقت اس وقت تک غیر متعین ہے۔ اب تک صحیح طور پر صرف کاربونک گیس کا علم ہو سکا ہے، جو سخت محنت کی حالت میں بکثرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر نیند درحقیقت آکسیجن اور کروماٹوفیل کی قلت اور کاربونک گیس کی کثرت تولید کا نتیجہ ہے۔

نیند کی حقیقت کے متعلق یہی آخری مذہب ہے جو قریباً صحت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے روزانہ تجارب بھی بظاہر اس کی تائید کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہر شخص کو صاف نظر آتا ہے کہ وہ کسان جو دن بھر ہل جوتتا رہتا ہے اُس شہری سے زیادہ نیند کا لطف اٹھاتا ہے جو لہو و لعب میں اپنے وقت عزیز کو ضائع کر دیتا ہے .... لیکن یہ مذہب بھی اب تک شکوک اور اعتراضات سے خالی نہیں ہے عمل کیمیاویہ کے تمام نتائج لازمی ہوتے ہیں مثلاً کوئلہ کے ختم ہو جانے اور انجن میں راکھ بھر جانے سے گاڑی فوراً رک جاتی ہے اور پھر اس حالت میں کوئی طاقت اس کو نہیں چلا سکتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو سخت محنت کے بعد بھی اضطراری نیند نہیں آتی۔ حالانکہ دماغ آکسیجن اور کروماٹوفیل سے خالی ہوتا ہے اور اس میں کاربونک گیس بھی بھر چکی ہے۔ علاوہ بریں سخت محنت کے بعد بھی قصداً جاگنے کی ہر شخص قدرت رکھتا ہے۔ حالانکہ عمل کیمیاویہ کا اثر اضطراری ہوتا ہے۔ اس سے قوی تر اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ مذہب صحیح ہے تو اس کا اثر خواب و بیداری کے اوقات بھی ہونا چاہئے۔ مثلاً اگر ایک شخص آدھی رات کو سویا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سونے کے پانچ گھنٹہ پہلے اس کے دماغ میں آکسیجن اور کروماٹوفیل کی

جگہ کاربونک گیس کا وہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جو نیند کا اصلی سبب ہے۔ لیکن اب سونے کے پاؤ گھنٹہ کے بعد ہی نیند کاربونک گیس کے ان تمام اجزا کو فنا کر دے گی جو نیند سے پاؤ گھنٹہ پہلے پیدا ہو گئے تھے اور ان کی جگہ آکسیجن اور کرو ماٹوفیں کے اجزا پیدا ہو جائیں گے، جو بیداری کی علت ہیں۔ اس بنا پر اس شخص کو پاؤ گھنٹہ بعد ہی بیدار ہونا چاہئے۔ حالانکہ ہر شخص کا تجربہ اس کے خلاف شہادت دیگا۔

علماء موجودہ نے اس آخری مذہب پر بھی قناعت نہیں کی اور تحقیق جدید کے لئے دوسرے تجارب جمع کئے۔ چنانچہ انہوں نے چند کتوں کو مدت تک بیدار رکھا لیکن نہ تو ان کی جسم کی حرارت میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ کاربونک گیس کے اجزا میں کسی قسم کا اضافہ ہوا اور نہ ہی آکسیجن کی تولید میں کوئی نمایاں فرق نظر آیا خون کی رطوبت اور اس کی کمیت اور کیفیت بھی اپنی اصلی حالت پر قایم رہی البتہ دس دن کے بعد ان کی یہ حالت ہو گئی کہ ان کے اعصاب بالکل بےحس تھے اور کسی قسم کے اسباب خارجیہ کا ان پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس حالت نے ان کے اعصاب میں ایک ایسا اضطراری تموج پیدا کر دیا تھا جو کسی دوسرے طریقہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ جب وہ سو گئے اور پھر بیدار ہوئے تو تموج عصبی بالکل زائل ہو چکا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس دماغی اضطراب کی وجہ کیا ہے؟ تکان یا فضلات دمویہ کی تولید۔ اگر اس اضطراری نیند کا سبب خون کی کمیت و کیفیت اسباب خارجیہ کا اثر یا وہ فضلات دمویہ ہیں جن کو اوپر کے تمام مذاہب میں نیند کا سبب بتایا گیا ہے تو ہم ان کو آلات کے ذریعہ دوسرے حیوانات کے دماغ میں پہنچا سکتے ہیں اور اگر نیند ان کا لازمی نتیجہ ہے تو ان کو سو جانا چاہئے حالانکہ تجربہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔

چنانچہ ایک کتے کو چند دنوں تک بیدار رکھ کر اس کا خون حقنہ کے ذریعہ ایک دوسرے کتے کے جسم میں داخل کیا گیا اگرچہ اس احتقان سے اس کتے کی دوسری دماغی کیفیات اور آثار میں اختلاف پیدا ہوا لیکن خواب و بیداری کا اس پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس لئے خون کی کمیت اور کیفیت نیند کا سبب نہیں ہو سکتے۔

لیکن اس اختیار پر بظاہر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ نیند کا تعلق دماغ کے ساتھ ہے۔ اس بنا پر تمام جسم کا خون اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے ایک ایسے کتے کا خون جو چند دن بیدار رکھا گیا تھا ایک ایسے کتے کے دماغ میں پہنچایا جس کے اعصاب میں بیداری نے کسی قسم کا تغیر نہ پیدا کیا تھا۔ خون پہنچنے کے ساتھ ہی اس کتے پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ فوراً سو گیا۔ اس تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیند کا سبب خون یا وہ فضلات دمویہ نہیں بلکہ وہ سیال مادہ ہے جو عصبی اعصاب کے اطراف میں پھیلا ہوا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس مادہ کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے؟ قوانین فطرت نے ابھی تک اس راز کو اپنے خزانہ میں محفوظ رکھا ہے۔

اک اگن سی رہ رہ کے بھڑکتی ہے خسرو
سینے میں کلی سی اک چٹکتی ہے ضرور
واقف نہیں ہیں خدا سے لیکن اثر
دل میں اک پھانس سی کھٹکتی ہے خسرو

بہجت

ناگن بن کر ہمیں نہ ڈسنا بادل
بار بار کسی کی سدھ پہ برسنا بادل
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں پیا سے
اس دیس میں ابھی نہ برسنا بادل

بہجت

کشمکشِ حیات

امین حزیں بہاولپور

بعض اوقات، اس کا تخیل اس کی وسیع پریشانیوں میں گم ہوجاتا، اور وہ اپنے لئے حال یا مستقبل کی دنیا میں کوئی جگہ حاصل کرنے کے متعلق کچھ بھی سوچ سکتا، بعض اوقات وہ دنیا کی حدوں کو اپنے اوپر تنگ سمجھ کر، اپنی مجروح اور مایوس زندگی کو ختم کر دینے ہی میں نجات سمجھتا، لیکن پھر اسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آتا، جس کا اس وسیع اور عظیم دنیا میں کوئی بھی پرسانِ حال نہیں تھا،

وہ اس ہی تصور سے لرز اٹھتا ....." جبکہ اس کی ماں ...... مجبور اور بیکس ماں..... دنیا کے ہوس پرست اور گنہگار انسانوں کے دروازوں پہ ٹھوکریں کھاتی ہوگی، نامرادیوں اور ناکامیوں سے روشناس ہو کر بڑھاپے کی کٹھن منزلیں طے کرتی ہوئی نظر آئے گی ...... اگر وہ کسی کے سامنے دستِ سوال بھی دراز کرے گی، تو اس لامحدود آسمان کی رحمتیں بھی اس کی امداد سے مجبور ہوں گی۔"

آج بھی وہ اسی ہیجان آمیز کشمکش میں مبتلا تھا، اس کی بوڑھی ماں اس کے سامنے، ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے ہوئے زمانے کی سختیوں اور تقدیر کی نافرمانیوں کا ماتم کر رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے بوڑھے چہرے کی جھریوں میں لرز رہے تھے ..... اس نے بارہویں جماعت تک اپنے اس اکلوتے بیٹے کو اپنی بوڑھی ہڈیوں کی محنت اور کاوش سے پڑھایا تھا..... ...شاید ایک دن ترقی کے ابتدائی مدارج طے کر کے اس کے آخری ایام میں ایک سہارا ثابت ہو! شاید تقدیر اس پر مہربان ہو کر اس کی "غریب امیدوں" کو بار آور کرے! شاید بیٹے کی کامیابی، اس کی کمزور ہڈیوں کو محنت اور مشقت سے نجات دلا دے.... مگر آہ! آج اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر چکا تھا، امجد باوجود اپنی انتہائی کوششوں کے "ایف، اے" میں فیل ہو چکا تھا..... اور اب وہ اس کی تعلیم جاری رکھنے سے قطعاً قاصر تھی۔

"بیٹا" بڑھیا ایک مجروح آواز میں بولی "دنیا کے سمندر میں ـــ جس میں حادثات کے بڑے بڑے طوفان آتے ہیں، تباہی اور بربادی کی خوفناک لہریں اٹھتی ہیں ـــ بغیر کسی ناخدا کی امداد یا ناؤ کے کودنا، ایک خطرناک غلطی ہے ـــ کمزور حال کی بنیادوں پہ اپنے شاندار ماضی کی طرح مستقبل کی تعمیر، ایک محض لغزش ہے۔ زمانہ واقعی بلند عظمت کا متمنی ہے، لیکن یہ ناکام انسانوں پر سوائے طعن اور استہزا کے اور کوئی ہمدردی نہیں رکھتا، اس لئے ایک انسان کو کسی اہم مقصد کے لئے اتنے ہی اہم اہتمام کرنے پڑتے ہیں ـــ دنیا میں ایک آوارہ گرد کی زندگی لاحاصل ہے ـــ آؤ! ہم اکٹھے زندگی کی دوری کو عبور کریں

شاندار مستقبل نہ سہی، پرسکون حال ہی سہی...... میری زندگی اب تھک چکی ہے...... "بیٹا" بڑھیا کی آواز میں ایک کشش تھی، جیسے وہ اس دنیا کی قہر آفرینیوں سے گھبرا کر ایک آسمانی خواب دیکھ رہی ہو "میری درماندہ ہڈیوں کو زمانے کی آگ میں مت پھینکو!.... آؤ! ایک واقف اسرار یوگی کی طرح، اس جھونپڑی کے سکون میں دنیا کی لایعنی اور بے سود جنگ کا مطالعہ کرو.... ہاں! ابھی زندگی ہے... اور حسن کا نور تمہاری نگاہوں کو دوسرے نظاروں سے بے نیاز کر دے گا۔"

"امی"! نوجوان کے چہرے پر مسرت لرزاں تھی، اس نے ایک بلند آواز میں کہا "جب تک دنیا آرزوؤں اور کارناموں سے روشن ہے، ایک نوجوان کو اس کی منزل ہستی سے باز رکھنا، اسے خودکشی پر آمادہ کرنا ہے، حملہ کا بہترین وقت وہی ہے، جبکہ فوج میں غیر معمولی جوش ہو —— میری زندگی میں اب مہمات سر کرنے کی طاقت، جب یہ اس تگ و دو سے تھک جائے گی، میں خود بخود ہی اس جھونپڑے کی تنہائی اور سکون پر قانع ہوں گا!" نوجوان کی نگاہوں سے آگ اُبل رہی تھی "میرے دل میں ایک آگ ہے، خصوصاً اس امتحان کی ناکامی نے مجھ میں ایک غیر معمولی جوش اور ہمت پیدا کر دی ہے.... تقدیر، آہ! اگر یہ انسانوں کی آرزوؤں کے خلاف بھی ہو، تو اسے ظالم نہیں کہنا چاہئے.... دنیا کے سرد و گرم کا مزا چکھنا ہی زندگی ہے —— میں ان سست رفتار انسانوں میں سے نہیں ہوں، جو دنیا کی راہ میں ایک بار گراں ہیں.... میں نے زندگی کو ایک تباہ کن جنگ نہ سہی، ایک بے سود تماشا اور کھیل بھی نہیں سمجھا ہے"....

"بھولے امجد" بڑھیا نے ایک پردرد آواز میں مسکراتے ہوئے کہا، جیسے اس کا بیٹا معصومیت کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہے "تمہارا معصوم دماغ سمجھتا ہے، کہ دنیا اس جھونپڑے کے سکون سے تمہیں زیادہ راحت دے سکتی ہے؟ ٹھہرو! ذرا سوچو! آج تک تمہاری تمام کاوشیں محض امیدوں اور آرزوؤں کی بنیادوں پر تھیں —— آہ! جب تک انسان آرزوؤں سے آشنا ہے، اس کی خوشی اور راحت، ہمیشہ موت کے ہمراہ رہتی ہے....

امجد نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اور ایک بڑھیا کے نزدیک سوائے خاموشی، تنہائی، اور دل کے سکون کے اور زندگی میں کیا دھرا ہے؟ وہ حال میں رہتی ہے، مگر مستقبل کی تیز روشنی میں جب فرشتے آسمانوں سے اترتے ہیں، وہ سوائے دوسری غیر مادی دنیا کے خیال کے اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں لیتی.... زمین پر اس کا جسم ہوتا ہے، مگر آسمانوں پہ اس کی روح...

"امی"! امجد نے ایک پُرجوش مگر خوش آہنگ آواز میں کہا "دنیا ہزار بے سود سہی مگر میں دنیا کی ان نازنینوں پر اپنی زندگی کی منزلیں طے کرنے کے بعد سوچنا چاہتا ہوں، تمہیں سکون اور خاموشی پسند ہے، کیونکہ تمہاری ہڈیاں مزید کشمکش کی متحمل نہیں —— دھواں اس لکڑی سے اٹھتا ہے، جو سوکھی ہونے کے بعد آگ پر ڈال دی جاتی ہے..... افسوس اس دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے، جو اپنی پوری جوانی اور رعنائی کے وقت دنیا کی رنگینیوں سے محروم کر دیا جائے۔" اس کی آواز میں کچھ غصہ اور کچھ رنج تھا "مانا کہ، تمام دنیا کی فتح، فانی انسان کی قدرت سے باہر ہے، لیکن اپنی بساط تک اس "کشمکش حیات" اور تگ و دو میں حصہ لینا، ہر انسان کا ایک نہایت اہم فرض ہے... اور یہی فرض انسان کی تخلیق کا موجب ہے —— بڑھیا سرنگوں ہو کر کچھ سوچ رہی تھی "تم چاہتی ہو کہ میں امتحان میں فیل ہو جانے سے، دنیا کے تمام راستوں کو اپنے اوپر مسدود سمجھ لوں، بلکہ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں، کہ اس نے میری زندگی کے اہم ترین حصے کو —— جبکہ میری رگوں میں خون، روح میں جوش اور طبیعت میں توانائی ہے —— کالج کی مسموم فضا میں ضائع ہونے سے بچا لیا" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، ایک پُرجوش مقرر کی طرح، جو اپنے خدمات کی مدت سے دیوانہ ہو جاتا ہے، "آج تک میری امی! تمہیں معلوم ہے، کہ میں دنیا کے کسی امتحان میں ناکام نہیں ہوا، اس دفعہ میری ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے، کہ ان یونیورسٹی کے امتحانات کی وقعت ہی میرے نزدیک نہیں تھی، ایک نوجوان کو مجبور کرنا، کہ وہ اپنی زندگی کے "اہم ترین حصے" کو یونیورسٹی کے صدیوں کے مقرر کردہ نظام کے تحت چل کر، چند متفرق نصابوں کی نظر کر دے —— اور کسی میں بھی اس کا علم مکمل نہ ہو —— اس کی تمام عمر کو تباہی اور بربادی کے تاریک گڑھوں میں دھکیلنا ہے،

بڑھیا کے چہرہ پر مردنی چھا رہی تھی، اور ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح مایوس نگاہوں سے امجد کو دیکھ رہی تھی —— "اب میں آزاد ہوں —— ایک طائر کی طرح، جو طرح طرح کی رنگینیوں سے روشناس ہونے کے لئے، آشیانے میں اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا ہے —— اب میرا اس جھونپڑے کے خنک اور غیر دلچسپ سکون میں رہنا محال ہے —— مجھے اجازت دو! کہ میں دنیا کی رعنائیوں اور رنگینیوں سے

روشناس ہوں ـــــ پیاری امی ! میں تمہیں کسی حال میں بھی نہیں بھولوں گا"۔

"ہماری سرشت ایک سہی" اس نے اپنی آواز میں متانت اور سنجیدگی حلول کرتے ہوئے کہا، "مگر انجام مختلف ہیں، ہم ایک ہی درخت کی شاخوں سے تسبیح کے دانے بھی بناتے ہیں، اور نیزے بھی ـــــ ایک انسان جو تسبیح کے دانوں کو گننے پر قانع نہیں ہو سکتا، اسے نیزہ پکڑنے اور اس وحشی دنیا کے "خونخوار" درندوں" کا شکار کرنے پر ملعون نہیں کرنا چاہئے ـــــ ہر ایک اپنی اپنی شاہراہ پر گامزن ہے، ـــــ اور میری راہ مقرر ہو چکی ہے ـــــ جوانی کی سرسبز شاخوں کو مت کاٹو، ان پر رنگین پرندوں کو چہچہانے دو، ان کو کائنات کی وسیع فضاؤں میں رقص کرنے دو۔

اس کی بوڑھی والدہ، ایک بے چین و آزردہ خاطر انسان کی طرح کھڑی ہو گئی، اس کے چہرے کی جھریاں کانپ رہی تھیں، وہ غصے میں اپنے جھونپڑے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی الماری کے پاس گئی، اور چند روپے لاکر اپنے بیٹے کے سامنے پھینک دئیے، اس کی سُرخ آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے،

"جاؤ" اس نے ایک بھرائی ہوئی آواز میں کہا "خدا تمہیں کامیاب کرے"

"جب تک مرد کے بازوؤں میں طاقت اور قدموں میں چلنے کی ہمت ہے، وہ مٹی سے بھی روپیہ پیدا کر سکتا ہے" امجد نے ایک پُرزور آواز میں کہا "یہ تمہاری مجبور ہڈیوں کی کمائی ہے، ـــــ میں انھیں اپنے عزائم پر قربان نہیں کر سکتا۔ آج تک میری امی ! ـــــ پیاری امی ـــــ تم نے میری کافی امداد کی ہے ـــــ"

"اچھا!" اس چند لمحات کے توقف کے بعد کہا "میں انشاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہی تمہارے قدموں میں واپس آؤں گا"

وہ خاموش ہو گیا، اور ایک تیز حرکت کے ساتھ ماں کے قدموں میں جھکا، اور پھر جھونپڑے کے دروازے سے باہر نکل گیا اسی شام "کلکتہ میل" اسے اپنے دیار سے ایک دوسرے۔ بالکل اجنبی۔ شہر کلکتہ لے جا رہی تھی

(۲)

"زندگی میں میں نے کئی پریشان خواب دیکھے ہیں ـــــ مگر ایسا ہولناک خواب! الٰہی ؟"

امجد شہر سے باہر ایک بوسیدہ مسجد میں بچھی ہوئی چٹائی پر سے اٹھا اور آنکھیں مسلتے ہوئے، چاروں طرف حیرت سے دیکھنے لگا ـــــ وہ ایک غیر ارادی، مگر لرزتی ہوئی آواز میں بڑبڑا رہا تھا، "کیا میرا انجام بھی ایسی ناکامیوں کا حامل ہوگا ؟"

اسے دو دنوں کا فاقہ تھا، اس کے دماغ میں ایک انقلاب تھا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اُسے اس "پریشان خواب" نے مزید پریشانیوں میں ڈال رکھا تھا، اس کا یہ شبہ کہ ــ "شاید موت آوارہ اور بے خانماں ہی اسے اس جہان سے لے جائے گی اور وہ اپنی منزل مقصود کو کبھی بھی نہ پہونچ سکیگا"ـــ لحظہ بلحظہ یقین میں تبدیل ہو رہا تھا،

وہ ایک مجروح انسان کی طرح مسجد سے اٹھا اور ایک مایوس العلاج مریض کی طرح شہر کی طرف روانہ ہو گیا، ـــــ وہ دنیا کی جنگ میں ایک ایسا نبرد آزما تھا، جس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ـــــ اس کا دماغ مختل ہونا شروع ہو گیا، وہ اپنے آس پاس سے گذرنے والوں کو ایک عجیب حیرت سے تک رہا تھا ـــــ جیسے وہ ہر انسان میں محبت و ہمدردی تلاش کرنا چاہتا ہے، مگر وہ اسے کسی میں بھی نہیں ملتی ـــــ آہ ! اس کے بلند خیالات، جو وہ اپنے گھر سے لیکر چلا تھا، غربت کی سختیوں اور تنہائی کی پریشانیوں میں گم ہو رہے تھے،

وہ اسی بےخودی کے عالم میں چل رہا تھا، کہ اس کے سامنے ایک نوجوان اور حسین لڑکی ـــــ بغل میں کچھ کتابیں لئے ہوئے ـــ گذری، امجد نے پہلے اسے پر اشتیاق اور حیران نگاہوں سے دیکھا، اور پھر انھیں غلط انداز سے پلٹ کر اپنے تخیلات کے پریشان کن پھندوں میں پھنس کر رہ گیا،

"دولت اور استطاعت کے بغیر یہ زندگی انسان کے لئے موت سے بدتر ہے!" اس نے اپنے آپ میں ایک وارفتگی کے عالم میں کہا "میں کامرانیوں کی امیدیں لیکر چلا تھا، لیکن میرے لئے یہاں کوئی خوشی نہیں، ـــــ میرے دماغ نے میری زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے، اور مجھے محض نامکمل خوابوں کی دنیا میں دھکیل دیا ہے ـــــ آخر ہم کیوں کامیابی حاصل کریں، کیا اس لئے، کہ دنیا میں ہمارا نام روشن ہو ! اور دولت و ثروت سے چند انسانوں کی زندگیاں خرید سکیں، لیکن یہ سب کچھ سے کیا حاصل ! ایک وقت آتا ہے، کہ روشن ترین نام بھی، سوائے تاریخ کے فرسودہ اوراق کے اور کہیں جگہ حاصل نہیں کر سکتا ! ہم روزانہ لاکھوں انسانوں کو بغیر ان کا نام جہالت کئے دفن کر دیتے ہیں ! دنیا کتنی وسیع ہے! ہماری زندگی کس قدر محدود ! کیا ہم اس مختصر زندگی میں اپنے عزائم کی طویل مہمیں سر کر سکتے ہیں ! ـــــ ہم اپنے انجام کے لئے کتنی اہم اور مہنگی قیمت ادا کرنے کے بعد بھی کتنا غیر اہم اور معمولی انعام حاصل کرتے ہیں ؟! یہ سب کیا ہے ؟ کیا یہ سب بیوقوف لوگوں کا ہنگام بدتمیزی

نہیں، کیا یہ تمام کچھ خود غرضی اور مکاری کا مکروہ مظاہرہ نہیں! اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا، کہ وہ اس دنیا کی حدود سے گزر چکا ہے، اور یہاں کی ہر ایک چیز سے بے خبر ہے —

تین چار گھنٹوں کی مسلسل مسافت اسے ایک کوئیں پر لے آئی، — جس کے ارد گرد تین چار فٹ کی ایک پختہ مینڈھ تھی، اور جس کے پرلی طرف، تھوڑی دور ایک مندر، اپنی بلند عمارت اور قدیم طرز تعمیر کی وجہ سے تمام ماحول میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتا تھا، اور جس کے ارد گرد کافی دور تک سرسبز گھاس اگی ہوئی تھی — جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے — امجد پہلے تو ان سب چیزوں سے بے نیاز، مینڈھ کا سہارا لئے، کچھ دیر اپنے خیالات کے تلاطم میں غرق رہا، پھر یکدم — جیسے اس کے دل و دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی ہو، یا اسے اپنی محبوب — "غیر فانی" — دنیا میں پہنچنے کا ایک زینہ مل گیا ہو، — اُن سے چونک کر مینڈھ کے اوپر چڑھ گیا — اس کی روح تو اس دنیا کی سختیوں سے گھبرا کر، پہلے ہی پرواز کرنا چاہتی تھی، مگر اب اس کا جسم بھی غائب ہونا چاہتا تھا، وہ اس دنیا سے تھک چکا تھا،

اس نے چاروں طرف دیکھا، اور کوئیں میں چھلانگ لگانے کے لئے اپنے ہاتھ بلند کئے، اچانک کسی نے اس کا دامن پکڑا۔ اور پیچھے کی طرف کھینچا، امجد نیم بیہوشی کے عالم میں پیچھے مڑا، اور ایک نوجوان حسینہ کو کھڑے ہوئے پایا۔ جس کی نگاہیں اس کے قدموں میں بکھری ہوئی تھیں، اور جو اس کی ایسی مکروہ حرکت پر مسکرا رہی تھی، — "خودکشی؟!" حسینہ نے تنفر آمیز لہجہ میں کہا،

"کیا آپ کو ایسے ذلیل فعل پر ضمیر بھی ملامت نہیں کر سکتی؟"

امجد دم بخود تھا، اور مبہوت نگاہوں سے اپنے بچانے والی کو دیکھ رہا تھا — جیسے اس کا احساس مردہ اور طاقت گفتار سلب ہو چکی ہے — اس نے بہت مشکل سے زبان ہلائی جیسے ایک گونگا بولنے کے لئے زبان اور ہونٹوں کو لڑکھڑاتا ہے،

"دنیا... سب .... بے سو... د .... تماشا ہے"

"خوب! لیکن یہ سب کچھ بے معنی نہیں!" نوجوان حسینہ نے ذرا سنجیدگی سے کہا، اس کے دل میں، اس راندۂ ہستی اور غم نصیب انسان کے لئے رحم اور ہمدردی موجزن تھی، اس نے امجد کے خوبصورت چہرے اور سڈول جسم پر ایک نگاہ کی جیسے وہ دل میں کہنا چاہتی تھی — ایسا انسان دنیا سے بے سود ضائع ہونے کا حق نہیں رکھتا، اسے — ہاں! — اسے جینا چاہئے۔ جیتے رہنا چاہئے،"

امجد کو اپنی زندگی اور اس سے متعلق تمام خیالات بھولے ہوئے تھے، وہ ایک دوسری کش مکش میں پھنس گیا تھا، وہ اپنے دل سے کئی بار سوال کر چکا تھا، "میں بھول نہیں سکتا، — اس لڑکی کو میں نے سڑک پہ، ہاں — اس سڑک پر۔ چوراہے کے نزدیک۔ سکول جاتے ہوئے دیکھا تھا — ؟" مگر اسے اب اپنی آنکھوں پر یقین نہیں رہا تھا،

"آپ یہاں کس طرح آئیں؟" امجد نے ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ساجن! واقعی میری منزل یہ نہیں تھی، لڑکی کی آواز میں ایک قسم کی لڑکھڑاہٹ تھی جیسے وہ امجد کے اس سوال سے گھبرا گئی ہے، آہ! بعض اوقات ہمارا دل ہماری منزلیں تبدیل کر دیتا ہے، — میں یہاں کس طرح آئی — اس کا جواب میری قدرت سے باہر ہے"

(۳)

"تشریف رکھئے"! حسینہ ایک عظیم الشان ملاقاتی کمرے میں داخل ہوئی، اور اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "یہ میرے والد سیٹھ مالک رام کی کوٹھی ہے، آپ اسے "اپنا مکان" سمجھیں!" امجد کی سمجھ میں اب تک نہیں آیا تھا، کہ وہ کس طرح اپنی "محسنہ" کے احکام سے انحراف کرے، وہ ایک لوہے کے بُت کی طرح تھا، جو محض کلوں سے حرکت کر رہا ہو، وہ بلا عذر کرسی پر بیٹھ گیا، اس کی پریشانی اور حیرت حد سے تجاوز کر رہی تھی، — وہ اپنے آپ کو آسمانوں کے اوپر ایک فرشتے کی معیت میں محسوس کر رہا تھا.... اس کے لئے یہ ایک "دوسری غیر فانی" دنیا تھی... جہاں ظالم اور پر فریب انسانوں کی ہوس پرستی اور خود غرضی نام کو نہیں ہوتی، جہاں ہر شخص اپنے بھائی کا ہمدردی اور دوستی کے لباس میں مدفن نہیں بناتا، جہاں غریبوں کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک نہیں ہوتا، جہاں غریبوں کے بچے بھوک سے بلک بلک کر یا سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر جانیں نہیں دیتے — بلکہ یہ دنیا اس کے لئے ایک بہشت تھی،... بے سود ہنگاموں سے بھرپور نہیں، بلکہ محبت و آشتی کے نغموں سے گونجتی ہوئی فریب ہوس میں مبتلا نہیں، بلکہ نیک دلی اور ہمدردی کے ترانوں میں رقص کرتی ہوئی —

"اور۔۔۔ مجھے اپنا دوست سمجھیں!" حسینہ نے مسکراتے ہوئے مزید کہا،

"میں دوستی اور محبت کا تجربہ نہیں رکھتا" امجد تن کر ہو بیٹھا، جیسے ان سب پریشانیوں سے اس کے دماغ نے نجات حاصل کر لی ہو، اور ایک ہوشیار آواز میں بولا۔۔۔ "اس لئے۔۔۔"۔

"ہر چیز کی ابتداء کے لئے تجربہ ضروری نہیں" اس نے تیزی میں امجد کی بات کاٹتے ہوئے کہا" بعض اوقات اکثر چیزیں ہمارے تجربات کے خلاف وقوع پذیر ہوتی ہیں ۔۔۔ اور ۔۔۔ بعض اوقات زمانہ ہمیں بالکل اجنبی چیزوں سے روشناس کر دیتا ہے، جن کے لئے ہمیں مزید تجربات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔۔

امجد سرنگوں ہو کر کچھ سوچ رہا تھا،

"میں نے اولین نگاہوں سے دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا، کہ تمہاری زندگی تکالیف اور مصائب سے تھک چکی ہے، ۔۔ اور تم کوئی خطرناک اقدام کرنا چاہتے ہو۔ ۔ حسینہ نے خواہ مخواہ بات جاری رکھتے ہوئے کہا ۔۔

"آپ نے مجھے بچانے کی کوشش کیوں کی؟" امجد نے یکدم اپنا سر اٹھایا، اور ایک بے تابانہ انداز میں دریافت کرنے لگا جیسے اس نے حسینہ کی کسی بات پر توجہ نہیں دی ۔۔۔

"آہ دنیا میں کسی انسان کا دل بھی درد سے خالی نہیں!" حسینہ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا ۔۔۔۔۔ حسینہ نے ایک رنگین انداز سے کہا، میں نہیں سمجھ سکتی، کہ مجھے کیوں تمہارے حالات سے دلچسپی ہوتی جا رہی ہے؟ "ساجن! آخر کن حالات سے مجبور ہو کر، تم نے اپنے آپ کو گم کر دینے میں نجات سمجھی؟"

"حالات؟" امجد نے آہستہ سے کہا" آہ! ان سے کوئی مفید مطلب برآمد ہونا دشوار ہے!"

نہیں، ساجن! ہر انسان کی ماضی ایک مستقل فسانہ ہوتی ہے، دنیا کے فریب اور ظلم، غربت کی ناکامیوں اور غریبی کی سختیوں سے ہر انسان ابتداء میں تقریباً روشناس ہوتا ہے، ۔۔۔ اگرچہ تمام ایسے افسانوں میں ایک قسم کی یگانگت پائی جاتی ہے ۔۔۔ کیونکہ یہ تمام کائنات ایک مرکز کی طرف مائل پرواز ہے ۔۔۔ لیکن انسانی فطرت کو وہ رنگینی عطا ہوئی ہے کہ یہ ہر افسانے کو اپنے رنگ اور سانچے میں ڈھال کر ایک نئی دلچسپی اور نئی رنگت پیدا کر دیتی ہے ۔۔۔ ہاں! روح کی سیرابی، عزائم کی بلندی اور ہمت میں توانائی انہیں افسانوں سے ہوتی ہے" لیکن میری ناکام ہستی کی داستان غیر دلچسپ اور پارینہ ہے" امجد نے کرسی کی ٹیک لیتے ہوئے کہا،

"آپ اسے میری خاطر سمجھئے!" حسینہ نے ایک محبت آمیز انداز سے کہا،

امجد نے چند لمحات کے توقف کے بعد اپنی پیشانی کو مسلا، اور پھر مسکراتے ہوئے اس کے حسین اور نوجوان چہرے پر اپنی نگاہیں ڈال دیں،

"میں شمالی پنجاب کے ایک قصبہ سکندر آباد میں پیدا ہوا تھا، میرے والد ایک بلند مرتبت زمیندار تھے، میرے چچا برطانوی حکومت ہند کے سفیر کابل تھے، ہمارا خاندان افغانستان کے شاہی خاندان سے تھا، اس لئے تمام گرد و نواح اور قصبے میں ایک بلند حیثیت رکھتا تھا، اس طرح وہ تمام عیش و آرام، جو ایسے ماحول میں میسر ہو سکتا ہے، مجھے حاصل تھا" امجد نے ایک ٹھنڈی سانس لی" میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، کہ میرے والد بقضائے الٰہی فوت ہو گئے، ۔۔ بس! والد صاحب کی فوتیدگی نے دنیا کی وسعتوں کو ہم پر تنگ کر دیا، مصائب اور تکالیف کا ایک انبوہ ہم پر ٹوٹ پڑا ۔۔ آہ! ہم دو نفوس اس جہان کی فریب کاریوں کا شکار ہونے کے لئے تنہا رہ گئے ۔۔۔ یہ دنیا کے خونخوار بھیڑیئے، جنہیں ہم رشتہ دار یا عزیزوں کے نام سے پکارتے ہیں، چند مجبوریوں کی وجہ سے اپنی دشمنی یا، ہوس کو، محبت اور پیار کے رنگین حجابوں میں چھپائے رہتے ہیں، ورنہ جونہی وہ حجابات، وہ مجبوریاں اٹھ جاتی ہیں، وہ حیاداری کے ذریعہ غائب ہو جاتے ہیں، تو ان میں سے ہر ایک قاتل بن جاتا ہے، ہر ایک ہماری ہڈیاں تک چبانے سے گریز نہیں کرتا، وہ تمام محبت اور پیار اور ہمدردی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ۔۔۔ ہاں! مال و دولت کے لئے ان کے ہاتھ دور رس، ان کی خونی آنکھیں کتنی تیز، اور ان کی للچائی ہوئی خوفناک زبانیں کتنی دراز ہوتی ہیں! ۔۔۔

اس کی آواز میں غیر معمولی تیزی تھی، جیسے، ابھی وہ اپنے ظالموں سے ایک قہر آفریں انتقام لینا چاہتا ہے،

"ہم گھر اور زر رکھنے پر بھی بے خانماں اور مفلس تھے، ۔۔۔۔ آہ! ہم تمام و کمال میں دنیا کے رحم پر ہیں، ہماری تمام کائنات مال اور دولت سب بے معنی ہے، اگر اس دنیا کے رہنے والے ہمیں ان سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ نہ دیں ۔۔ میری عمر اس وقت بارہ برس کے قریب تھی، میری ماں پہلے تو جوش و خروش سے تنہا ان تمام مصائب کا مقابلہ کرتی رہی، مگر آخر کار عورت تھی ۔۔۔ اور وہ بھی بے یار و مددگار، ہمارا مکان شہری آبادی سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تھا، اگرچہ دیہاتی طرز تعمیر کا تھا، لیکن تمام دیہات میں وسعت اور عظمت کے لحاظ

سے واقف تھا، ایک رات کوئی دو بجے ہوں گے، سردی کا موسم تھا، ہم اندر کمروں میں محو استراحت تھے اس رات ہمارے متصل کمرے میں میری پھوپھی زاد بہن رضیہ سوئی ہوئی تھی — جو اسی شام موضع امین آباد سے میری والدہ کو ملنے کی غرض سے آئی تھی —

"دروازہ کھولو! — ورنہ یہاں سے گولی ماردی جائے گی"۔

ایک آہستہ مگر بہت تیز آواز آئی، ہم سب کھبلا کر اٹھ بیٹھے، رضیہ بھاگی ہوئی ہمارے کمرے میں آئی، اور انتہائے خوف سے کانپتی ہوئی والدہ صاحبہ سے لپٹ گئی، — میرا دماغ کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا، — والدہ صاحبہ کے چہرہ پر سنجیدگی برس رہی تھی، وہ مشکل، جیسے وہ یہ سارا معمہ سمجھنا چاہتی ہے — اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے آہستہ آواز میں کہنے لگی،

"ڈاکو ہماری ڈیوڑھی کی دیوار پھاند کر، اس کمرے کے دروازہ پر بول رہے ہیں، — امجد! تم ادھر آؤ! اس نے آخری تاریک کوٹھڑی کی طرف مڑتے ہوئے کہا:

میں پریشان حالت میں، اس کے پیچھے ہولیا، اس کمرے میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی تھی، جونہی میری والدہ نے مجھے اس پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا، میں بغیر کسی حیل وحجت کے — اس پر لیٹ گیا، والدہ صاحبہ نے بغیر کسی انتظار یا دیر کے پھٹی پرانی رضائیاں اور چٹائیوں کا انبار مجھ پر ڈالدیا، اور خود فوراً کوٹھری کا دروازہ بند کرکے باہر نکل گئی،

اتنے میں ڈاکو دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکے تھے —

اگرچہ میں اس غلیظ اور میلے انبار کے نیچے خوف سے کانپ رہا تھا۔ اور میری زبان اور روح پر ایک سکتہ سا طاری تھا لیکن میں ان کی تمام آوازیں سن رہا تھا۔

"خبردار! اگر آواز بھی بلند کی — پہلے امجد کا پتہ بتلاؤ اور پھر زیورات اور خزانے کی چابیاں — سمجھی! "امجد کل سے نوکروں کے ہمراہ شکار گیا ہوا ہے"۔ میری پھوپھی زاد بہن نے آگے بڑھ کر ایک تیز آواز میں کہا "اور چابیاں! — تم وحشی اور انسانیت کے خونیوں کو چابیاں — نہیں مل سکتیں"۔

یکایک ایک چیخ بلند ہوئی، اور دھڑام سے کوئی چیز زمین پر گری — میری پھوپھی زاد بہن اپنے پہلو میں چھرا لئے ہوئے زمین پر تڑپ رہی تھی، میری والدہ ان کی بے بسی کی پر بھی خاموش تھی، البتہ آنسو ہر لحظہ تازہ پانیوں سے اس کے رخساروں کو نہلا رہے تھے، اس نے بغیر کسی حیل وحجت کے چابیاں اس کے قدموں میں پھینک دیں، اور خود ایک درد سے وارفتہ انسان کی طرح ان کی سفاکیوں کا نظارا کرنے لگی — چابیاں لیکر وہ انسان نما حیوان چار زمین دوز خزانے کی تلاشی میں مصروف ہوگئے، اور میری تلاش میں بھی — وہ تین دفعہ میری چارپائی کے نزدیک آئے — مگر ناکام واپس لوٹ گئے — انہیں اس فرسودہ گدڑیوں کے انبار پر شبہ بھی نہ ہو سکا — ہماری یہ نگاہیں — جن پر ہم اس قدر مغرور ہیں، جن سے ہم بزعم خود علم اور عمل کے باریک ترین نقطے بھی پہچان سکتے ہیں، جن سے ہم اپنے "دشمنوں" کے جگر پاش پاش کردیتے ہیں، جن سے اس وسیع دنیا میں ظلم اور بے انصافی دیکھتے ہیں مگر ایک لمحہ کے لئے بھی شرمندہ ہو کر بند نہیں کرتے — کتنی ظاہر بین اور غلط بین واقع ہوئی ہیں، —

"معلوم ہوتا ہے، امجد واقعی شکار گیا ہے"، ایک ڈاکو نے مہین مگر بہت تیز آواز میں کہا،

"تم نے خوامخواہ اس کی بہن کو قتل کر ڈالا"! ایک نسوانی آواز بلند ہوئی

~~~~~~

حسینہ نے قریب پڑی ہوئی میز پر سے سگرٹ کیس اٹھایا، اور امجد کے سامنے پیش کیا، امجد نے شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے، کہ "میں اس سے بے نیاز ہوں" واپس کردیا، پھر ایک لمبا سانس لیکر اپنی داستان شروع کردی۔

"دوسرے روز میری ماں میری جان بچا کر، ایک آوارہ اور مجبور انسان کی طرح، ایسی منزل پر گامزن تھی، جس کی انتہا اسے خود بھی نامعلوم تھی، —

دو دن اور رات مسلسل گاڑی میں سفر کے بعد میری ماں سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں، ایک اسٹیشن پر بلا ارادہ اتر کھڑی ہوئی، رات کے بارہ بج چکے تھے، سخت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، — ہمارے پاس صرف ایک رضائی تھی، وہ ہم دونوں اوڑھ کر، سٹیشن کے مسافرخانہ میں دراز ہوگئے — میری امی مجھے اپنی چھاتی سے لگائے ہوئے تھی، اور ایک ایسے بادشاہ کی طرح تھی، جو اگرچہ تخت سے محروم ہوگیا ہو، لیکن تمام خزانہ اس کے پاس سلامت ہو، — وہ خوش تھی مگر تاریک مستقبل کا ایک خیال تھا، جو کبھی کبھی، اس کے چہرہ میں سنجیدگی پیدا کردیتا تھا —

صبح اٹھتے ہی ہم شہر کی آبادی میں جو سٹیشن سے تھوڑی ہی دور تھی پہنچے،
~~~~~~

وہاں ایک نیک اور خدا ترس بزرگ کی کوشش سے، ایک بوسیدہ، چھوٹا سا مکان ہمیں رہائش کے لئے، بہت معمولی کرایہ پر مل گیا۔

میری ماں مسلسل تین سال تک تنہا غربت اور مفلسی کی سختیوں سے دوچار ہوتی رہی —— ہماری اس تنہائی میں صرف وہی عبادت گذار بزرگ تھا، جو آڑے وقتوں میں ہمارے کام آتا رہا، اس نے مجھے ایک ہوٹل پر ملازم کرا دیا، تاکہ ہماری اس مجروح اور پرآلام زندگی کو بقا حاصل ہو، اور ہم اس دنیا میں مزید مصائب کے لئے زندہ رہ سکیں —— میں وہاں ہوٹل کے برتن مانجھا کرتا تھا —— اس بزرگ کی امداد، مجھے اپنی زندگی میں کبھی نہیں بھولے گی، —— آہ! کیا بھوکی اور خونخوار —— دنیا میں بھی بعض ایسی متبرک ہستیاں باقی ہوتی ہیں، جو غریبوں اور بے کسوں کے لئے اپنی جان تک نثار کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں —— یہ دنیا بھی کیسی عجیب ہے؟! ایک ہمارا مدفن بناتا ہے، ہمیں ذبح کرتا ہے، دوسرا ہمیں تسلیاں دیتا ہے، ہماری قبروں پر پھول چڑھاتا ہے، ایک ہمیں مجروح کرتا، ہمیں ناکامیوں اور نامرادیوں سے روشناس کرتا ہے، دوسرا ہمارے زخموں کو مندمل کرتا ہے، ہمارے برداشتہ دلوں کو ڈھارس بندھاتا ہے، کیا یہ سب اس لئے کہ اس وحشی دنیا میں ہماری زندگی وحشت اور بربریت کا شکار ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ عرصہ باقی رہے، ——

ایک دن میری ماں غیر معمولی طور سے مسرت کی گہرائیوں میں کھوئی ہوئی تھی، مجھے حیرت تھی کہ آخر وہ کونسی وجہ ہے، جس سے میری ماں آج اس قدر خوش ہے؟ میں نہایت سنجیدگی سے آگے بڑھا اور اس کے قریب ایک چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا —— میں نے ارادہ کر لیا تھا، کہ وہ خیال، جو مدتوں سے میرے دماغ میں ہیجان افروز ہے اپنی ماں کے سامنے اب ظاہر کر دونگا ——

"کیا میری تمام زندگی اسی ہوٹل کی نذر ہوگی؟ برتن مانجھتے ہوئے!"

میں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا، مبادا میری ماں کو ناگوار ہو —— کہ میں کام سے جی چراتا ہوں ——

میری ماں، میرے اس اظہار سے مسکرانے لگی "بیٹا! بلند عظمت کا نشہ ذلت کی زندگی میں بھی نہیں اترتا، اس نے ایک مدبرانہ انداز میں کہا "واقعی تم ایسی ذلیل زندگی پر قانع نہ رہ سکتے، تمہارا دل اور دماغ اپنے مرکز کی طرف جانا چاہتا ہے —— اچھا! اب تم کیا چاہتے ہو؟ اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے۔ واقعی تمہیں "کچھ" کرنا چاہئے! —— مجھے خود اس کا احساس تھا، اور آج ہی میں تمہیں اس کے متعلق کہنے لگی تھی، میں تمہارے مستقبل کے عظیم اور رنگین خواب دیکھ رہی تھی۔ —— میں چاہتی ہوں، کہ تم پھر سکول میں داخل ہو جاؤ —— جس طرح بھی ہوگا، میں محنت اور مشقت سے تمہیں پڑھاؤں گی"

دوسرے روز میں ہوٹل کی نوکری چھوڑ کر، ایک مقامی ہائی سکول میں داخل ہو گیا —— میری ماں پڑوس کے ایک متمول گھرانے میں خدمت پر مامور ہو گئی؛ متواتر چار سال تک ماں محنت اور مزدوری سے میری ہر طرح سے امداد کرتی رہی، —— میں اب میٹرک پاس کرنے کے بعد وہاں ایک کالج کی بارہویں جماعت میں پڑھ رہا تھا —— اس کی امیدوں کا واحد سہارا، محنت اور مشقت کا واحد انجام، —— اور اب اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے قریب تھا —— لیکن میری فطرت اور تقدیر میرے خلاف بغاوت پر آمادہ تھی —— میں باوجود انتہائی محنت کے بھی امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا،

اس ناکامی سے، دنیا اور اس کے ہنگاموں، کامیابی اور اس کی آسائشوں میں، میرے یقین کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں —— میں ایک ایسے انسان کی طرح تھا، جو ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو، اور جس کے لئے نہ زمین پر آنے کا راستہ ہو، نہ آسمان پر جانے کا ——

اگرچہ اس میں میرا قصور بھی نہیں تھا، لیکن اپنی بوڑھی اور بے کس ماں کی محنتوں اور امیدوں کا ایسی صورت میں نقش دیتے ہوئے، میرا ضمیر مجھے خود ملامت کرتا تھا،

آہ! ہماری زندگی کا کوئی لمحہ بھی اختیاری نہیں، ہم واقعات سے مجبور ہو کر اپنے راستوں کو تبدیل کر ڈالتے ہیں، اور ماحول سے تنگ یا مجبور ہو کر، اپنی فطرت کو نئے سانچوں میں ڈھالنے لگتے ہیں، —— دنیا دکھوں سے بھرپور ہے" امجد کی نگاہوں میں آنسو ابل رہے تھے" میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، ناکامیوں، نامرادیوں اور پریشانیوں کو اپنے سامنے پایا ہے —— آہ! یہ احساس بھی انسان کے لئے موت ہے! اس کے بغیر میں ہوٹل میں کام کرتے ہوئے بھی اپنی زندگی، امن اور سکون سے بسر کر سکتا تھا، مگر —— اب اس "احساس نے" میری زندگی کی کشتی کو بوجھل بنا دیا ہے، آہ! اب میں موت اور زندگی کے درمیان ٹکٹکرا رہا ہوں مجھے کوئی راستہ نہیں ملتا، کوئی علاج نہیں سوجھتا! —— سجنی! تم لوگ اتنے کیوں خوش ہو؟ کیا تمہاری سب آرزوئیں تمہاری منشاؤں کے مطابق بر آتی ہیں؟ کیا ہمیشہ عیش و مسرت

تمہارے ہمراہ رہتی ہی؟ آخر وہ کون سی چیز ہے، جو تمہاری زندگی کو رنگین اور دلچسپ بناتی ہی؟ —— آہ! تم نے مجھے بچاکر پھر اسی کس مکش میں مبتلا کر دیا ہے، جس سے میں نجات حاصل کرنا چاہتا تھا:" امجد نے ایک گہرا سانس لیا، جیسے اس کے دل میں ابھی جوش اور رنج کا طوفان باقی ہے، —— ایک آگ، جس کی شدت کی حامل اس کی زبان نہیں ہوسکتی ——

حسینہ کی نگاہوں میں آنسو تھے، مگر وہ عجیب طرح سے مسکرا رہی تھی —

تمہیں اپنی آرزوؤں اور امیدوں کی شدت اور زیادتی نے دیوانہ بنادیا ہے" وہ ایک رنگین انداز سے متکلم ہوئی" جو جیسے والہانہ اور بے تابانہ طریق سے اپنے عزائم کی پیروی کرتا ہے، یقیناً، اپنی زندگی کو دکھی بنا لیتا ہی —— اس دنیا میں ناکامی اور کامیابی پہلو بہ پہلو ہیں، اس لئے کسی انسان کو زندگی کی جنگ میں صبر و سکون ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے، —— ہم لوگ تمہیں بہت سکھی معلوم ہوتے ہیں، مگر ہمارا جگر چیر کر دیکھو —— اس میں چھلنی کی طرح چھید ہیں —— آہ! ہماری یہ تمام دولت اور مال ہمارے دکھوں کا صحیح معاوضہ نہیں، —— اس کی آواز میں سنجیدگی پیدا ہو رہی تھی" "تم لوگ ہماری زندگیوں پر رشک کرتے ہو، مگر، آہ! ہماری یہ عظیم مسندیں، حقیر رعنائیوں میں لپٹی ہوئی ہیں! — جب ہم ان پر کبھی نگاہ کرتے ہیں تو ہمارے دلوں سے دھوئیں اٹھتے ہیں، —— تم نہیں جانتے، ہماری ان مسندوں اور رنگینیوں میں کتنے آلام اور ذلتیں رقص کر رہی ہیں؟ خوشی کیا ہی؟ یہ ایک وہم ہے، جو محض احساس سے متعلق ہی، — اور جسے تم نے ابھی نہیں محسوس کیا ہی، —— یہ بعض اوقات ہماری شکستگیٔ طبع اور ناامیدیوں میں ایک شعاع امید پیدا کر دیتا ہے، اور چند لمحات کے لئے ہمیں ان مہمات کی کامیابی کا یقین دلا دیتے ہیں، ہم غیر ممکن کو ممکن سمجھنے لگتے ہیں —— ناپائدار کو پائدار —— ساجن!

اخلاق اور عزم کی پاکیزگی خیالات کے امن و سکون پر ہی، انہیں دنیا میں آکر اور پریشان چھوڑ دینا اپنی زندگی کو بربادی کے گڑھوں میں دھکیل دینا ہے —— مانا کہ بلند عزائم کے "یہ معصوم خواب" سایوں کی طرح ہماری زندگی کے گرد رہتے ہیں، —— اور دنیا میں کوئی انسان بھی ان سے خالی نہیں —— لیکن ان کی تعبیریں بہترین طور پر ہماری قوت بازو اور دل کے سکون پر منحصر ہیں' —— اسی کشمکش حیات میں گھبرانا مردوں کی ہمت سے بعید ہے، اس جنگ کا نام ہی زندگی ہے! کیا ایک دور افتادہ بیراگی کی زندگی، جو چٹانوں کی اوٹ میں — دنیا سے دور —— سکوت اور تنہائی میں گم رہتی ہی — یا ایک صوفی ریش دراز کی "حجرہ نواز" زندگی جو محض تسبیح کے دانوں پر ہی ختم ہو جاتی ہی — صحیح زندگی ہی؟ —— کیا خدا نے محض اپنی "بنانے اور مٹانے کی تفریح" کے لئے فضول اور بے فائدہ اس دنیا کی تخلیق کی ہی؟ کیا اس دنیا کے وہم، مکر و فریب، اور ظلم کی وسیع اور عظیم لہروں پر ہمیں نکموں، ناکاروں اور لنگڑوں کی طرح لڑھکنے کے لئے بھیجا گیا ہی؟ —— اگر ایسا ہی ہی تو حشرات الارض اور ہماری زندگی میں کیا فرق ہے؟ —— پھر انسان کی زندگی کی کامل ہم آہنگی کے لئے ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟ —— وہ ضرورت صرف ایک تندرست اور صحیح عقل ہی سے پوری ہوسکتی ہی؟ —— یہ عقلمندی" اس نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا" ہمیں سڑکوں اور خانقاہوں پر آوارہ پھرنے، زندگی کو محض مصائب سے گھبرا کر ختم کر دینے اور دوسرے لوگوں کے قائم کردہ مگر پامال اور فرسودہ راستوں پر چلنے سے نہیں مل سکتی!"

وہ اتنا کہہ کر مسکرائی اور اپنی کرسی سے اٹھ کر الگ کھڑی ہو گئی، امجد حیرت اور خاموشی سے اس کے حسین مگر پُر رعب چہرے کو تک رہا تھا، — "حسینہ! تم نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہی" امجد نے مسرت اور ہیجان سے دبی ہوئی آواز میں کہا، حسینہ اس کے اس حسین اعتقاد [illegible]



اب خواہش لذات نہیں ہو سکتی　　اب دن کے سوا رات نہیں ہو سکتی

در کس لئے کھٹکھٹا رہی ہے دنیا　　کہدو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

جوش

فیڈرل فنانس

مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مالیاتی تعلقات

عبدالرحیم شبلی
بی کام

گزشتہ سال کسی صاحب نے رسالہ کلیم میں ہندوستان کے نئے دستور اساسی پر ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا۔ لیکن قابل مضمون نگار نے آئین کے سب سے اہم جزو فیڈرل فنانس یا وفاقی مالیات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اب چونکہ اپریل ۱۹۳۷ء سے جدید آئین حکومت نافذ ہو چکا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ایک مبسوط تبصرہ فیڈرل فنانس پر بھی حوالۂ قلم کیا جائے۔

فیڈرل فنانس سے مراد وہ مالیاتی تعلقات ہیں جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان قایم کئے گئے ہیں۔ اِن جدید تعلقات کو کماحقہ ذہن نشین کرنے اور اُن کی تدریجی ترقی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اُن پیش ازیں تعلقات پر ایک سرسری نظر ڈالیں جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار میں پائے جاتے تھے۔

اصلاحات ۱۹۱۹ء سے قبل

۱۸۳۳ء سے لیکر ۱۸۷۱ء تک تمام مالیاتی اختیارات گورنمنٹ آف انڈیا یعنی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ہی تمام محاصل جمع کرتی تھی اور صوبوں کو اُن کے مطالبے کے مطابق کچھ رقم اخراجات کے لئے دے دیتی تھی۔

اس طریق سے صوبائی مالیات میں فضول خرچی اور کافی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے بد اطمینانی پیدا ہوتی تھی۔ اور مرکزی بجٹ میں کسی رقم کے تعین نہ ہونے کی وجہ سے عدم تیقن پیدا ہوتا تھا۔

سر جون اسٹریچی کے الفاظ میں "سرکاری آمد کی یہ تقسیم ایک جذبہ مسابقت بن کر رہ گئی جس میں بلا لحاظ معقولیت سب سے زیادہ شور مچانے والے کو ہمیشہ فائدہ ہوتا تھا۔" جس سے مراد یہ ہے کہ جو صوبہ اپنے مطالبات زیادہ شد و مد کے ساتھ پیش کرتا اور گنویسنگ میں بڑھ جاتا۔ اس کو رقم بھی سب سے

سلہ اس مضمون کی تیاری کے لئے میں نے مندرجہ ذیل کتب کی امداد لی ہے :۔
(۱) "ہندوستان کی صوبائی مالیات" مصنفہ بنیرجی
(۲) "صوبائی مالیات" مصنفہ ڈاکٹر امبیدکر
(۳) میسٹن کمیٹی رپورٹ
(۴) مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ
(۵) معاشیات ہند جتھاربیری ۱۹۳۶ء ایڈیشن
(۶) سائمن کمیشن رپورٹ
(۷) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

سلہ دیکھو کلیم ماہ جون و جولائی و ستمبر ۱۹۳۶ء

زیادہ وصول ہوتی۔

پھر اِس نظام کے مطابق صوبوں کے ہاتھ بالکل بندھ گئے تھے۔ وہ کوئی نیا کام بلا منظوری مرکزی حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک بہشتی بھی کسی صوبائی حکومت کو مقرر کرنا ہوتا تو اُس کی منظوری کے لئے مرکزی حکومت کو لکھنا پڑتا تھا۔ پھر جو روپیہ اُن کو دیا جاتا وہ بھی اُن کی ضروریات کے لئے قطعاً کفی نہ ہوتا۔ اور وہ کسی معاشی ترقی کرنے سے معذور رہتے تھے۔

لارڈ میو نے اِس نقص کو محسوس کیا۔ اور کوشش کی کہ صوبائی حکومتوں کی آسانی کے لئے کسی قدر عدم مرکزیت روا رکھی جائے یعنی کسی حد تک صوبوں کو مالی خودمختاری دے دی جائے تاکہ وہ اپنی اقتصادیات درست کر سکیں۔

۱۸۷۰ء میں اُس نے ایک "صوبائی بندوبست" مروج کیا جس کی رو سے بعض مقامی اہمیت کے محکمے از قسم پولیس۔ تعلیم۔ رجسٹریشن۔ ہسپتال۔ جیل سڑکیں وغیرہ صوبائی حکومتوں کے سپرد کر دیئے اور اُن کے اخراجات کے لئے امدادی رقومات مقرر کیں جو یکمشت صوبوں کو دیدی جاتی تھیں۔ اگر زائد روپیہ کی ضرورت ہوتی تو صوبوں کو اجازت تھی کہ وہ مقامی طور پر کوئی محصول لگا کر روپیہ جمع کر لیں،

اس نئے انتظام سے صوبائی اخراجات زیادہ مفید مدات پر صرف ہونے لگے اور اُن کو کسی حد تک مالیاتی آزادی بھی میسر ہو گئی۔

یہ انتظام ۱۸۷۷ء تک مروج رہا۔ آہستہ آہستہ اُس کے نقائص بھی منظرِ عام پر آنے لگے۔ اِس سے صوبوں کو کافی روپیہ حاصل نہ ہوتا تھا۔ ہر سال جو گرانٹ مرکزی حکومت کی دی جاتی تھی وہ اُس کی اپنی ضروریات پر منحصر ہوتی۔ اگر فاضلہ کافی ہو جاتا تو گرانٹ بھی بڑھا دی جاتی۔ ورنہ اگر مرکزی حکومت کو خود روپیہ کی ضرورت ہوتی تو گرانٹ بھی کم کر دی جاتی تھی۔

اس بندوبست کے ماتحت صوبوں میں کفایت کا جذبہ بھی چنداں پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ اگر اُن کو زیادہ روپیہ کی ضرورت ہوتی تو وہ کوئی نیا ٹیکس لگا سکتے تھے۔ جو اُس زمانہ کے حالات کے مطابق غریبوں پر مزید بوجھ اور بار کا باعث بنتا۔

۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے اپنے وزیر مالیات سر جون سٹریچی کی امداد سے عدم مرکزیت کے اصول کو ذرا وسیع کیا۔ اُس نے باقی ماندہ مدات کو بھی جو اکثر و بیشتر صوبائی طرز کی تھیں صوبائی مالیات میں منتقل کر دیا مثلاً مالگذاری چنگی۔ سٹیمپ۔ عام انتظام۔ قانون اور عدالت۔ سب مدات صوبائی بنا دیں

لیکن گزشتہ محکمہ جاتی آمد اور سالانہ گرانٹ بھی برقرار رہی۔

اس انتظام کے ماتحت آمد دو حصّوں میں منقسم کی گئی۔ مرکزی اور صوبائی۔ اگر صوبوں کی آمد میں کوئی فاضلہ ہوتا تو گورنمنٹ آف انڈیا اُس کے نصف کی حصہ دار بننے کی مجاز تھی۔ اِسی طرح اگر کوئی خسارہ پڑتا تو وہ نصف حصہ میں شریک ہوتی۔

باوجود اس کے معلوم ہوا کہ ہر سال امدادی رقومات کا دینا بھی ناگزیر تھا اور وہ اکثر اوقات جھگڑے کا باعث بنتیں جن محاصل میں صوبجات کو حصّہ نہ ملتا اُن کی تحصیل کے لئے وہ کسی سرگرمی یا جد و جہد کا مظاہرہ نہ کرتے۔

۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن نے میجر بیرنگ وزیر مالیات کی امداد سے ذرائع آمد کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ مرکزی۔ صوبائی و منقسمہ

مرکزی ذرائع آمد یہ تھے۔ افیم۔ نمک۔ درآمد برآمد تجارتی مہمات۔ وغیرہ۔

صوبائی ذرائع غیر مصافی محکمہ جات اور مقامی محاصل وغیرہ۔ نیز منقسمہ ذرائع میں چنگی۔ سٹیمپ۔ جنگلات۔ رجسٹریشن وغیرہ شامل تھے۔

بجائے مقررہ زرِ امداد دینے کے صوبجات کو مالگذاری کا کچھ فیصدی حصہ دیدیا جاتا تھا تاکہ اُن کی مالیات درست رہیں۔

اس نظام پر ہر پانچ برس کے بعد نظرِ ثانی کی جاتی تھی۔

اِس طریق کا نقصان یہ ہوا کہ ہر پانچ سال کی نظرِ ثانی سے مالیاتی دستور العمل میں یکسانیت نہ رہتی تھی۔ نیز صوبجاتی بجٹ میں اگر کوئی فاضلہ ہوتا تو اُس پر گورنمنٹ آف انڈیا قابض ہو جاتی تھی۔ پھر اگر کوئی صوبہ کفایت کر کے اخراجات میں کمی واقع کرتا تو اگلے سال کے لئے اُس کی گرانٹ اُسی کم خرچ کے معیار پر مقرر کی جاتی۔ اس طرح پر گویا صوبجات میں کفایت کی کوئی خواہش ہی نہ رہی۔

اِن نقائص کو دور کرنے کے لئے لارڈ کرزن نے ۱۹۰۴ء میں بندوبست عارضی کو مستقل کر دیا۔ یعنی صرف اُس وقت اُس پر نظرِ ثانی کی جاتی تھی جب بنیادی حالات میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی یا جنگ اور قحط وغیرہ ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو جاتے صوبجات کو بھی مرکزی گورنمنٹ کی مالی حالت کے مطابق مقررہ رقوم بغرض تعلیم۔ حفظانِ صحت اور پولیس وغیرہ بطور زرِ امداد دی جانے لگیں۔

۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ نے اس انتظام کو قریباً مستقل کر دیا اور ذرائع آمد کی مندرجہ ذیل تقسیم کی۔ مرکزی گورنمنٹ کے لیے افیم۔ ریلوے

حصّہ مدبرآمد۔ نمک۔ ٹکسال اور مبادلہ۔ ڈاک خانے اور تار گھر۔ فوجی محکمہ سے آمد اور دیسی ریاستوں سے خراج۔ صوبائی حکومتوں کے لئے جنگلات۔ چنگی۔ (صرف بمبئی اور بنگال میں) رجسٹریشن اور آمد از محکمہ جات تعلیم۔ قانون اور عدالت۔

علاوہ ازیں بعض ذرائع ایسے بھی تھے جن کی آمدنی مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی مثلاً مالگذاری۔ انکم ٹیکس۔ چنگی (سوائے بمبئی اور بنگال کے) آبپاشی اور اسٹیمپ۔ اخراجات کی تقسیم بھی کچھ اسی طرح ہی کی گئی صرف فوج کے مصارف کے لئے انتظام قدرے مختلف کیا گیا۔

الغرض یہ تھے مالی حالات جو ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے قبل مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان پائے جاتے تھے۔ ان میں مندرجہ ذیل نقائص تھے۔

(۱) جن ذرائع کی آمدنی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تقسیم کی جاتی تھی ان میں مرکزی حکومت گاہے بگاہے دخل اندازی کرتی رہتی جس کی وجہ سے صوبائی ترقی کو نقصان پہنچتا۔

(ب) چونکہ صوبجات کے لئے امدادی رقومات غیر متعینہ ہوتی تھیں اس لئے ان کا اثر صوبائی مالیات پر چنداں خوشگوار نہ پڑتا۔

(ج) ہر صوبہ کو مختلف زر امداد ملتا اس لئے صوبوں میں مالیاتی عدم مساوات پیدا ہوتی۔

(د) صوبائی حکومتوں کو زائد روپیہ کے لئے از خود محصول بندی اور قرضہ اٹھانے کے اختیارات حاصل نہ تھے۔

(ہ) صوبائی آمد و خرچ پر مرکزی حکومت زائد از ضرورت ضبط رکھتی مثلاً صوبجات کو خسارہ کے لئے بجٹ بنانے اور فاضلہ کو آزادانہ صرف کرنے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔

مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم ۱۹۱۹ء کے بعد

اصلاحات ۱۹۱۹ء کے بعد مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان مالیاتی تعلقات کو بالکل بدل دیا گیا۔ چونکہ صوبجات کو کسی حد تک خود مختاری دی جاتی تھی اور مالیاتی عدم مرکزیت کے اصول پر عمل کیا جانے لگا تھا۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ مقسومہ ذرائع آمد کو اڑا دیا جائے اور بجٹ کے اندراجات کو از سر نو کسی اور طریق سے ڈھالا جائے۔

چنانچہ آمد و خرچ کی تقسیم مندرجہ ذیل طریق پر کی گئی۔

مرکزی ذرائع آمد:- افیم۔ نمک۔ درآمد برآمد۔ انکم ٹیکس
ریلوے۔ ڈاک خانے اور تار گھر۔ فوجی محکمہ سے آمد۔

صوبائی ذرائع آمد۔ مالگذاری (مع آبپاشی)
ٹکٹ (عدالتی و تجارتی)۔ رجسٹریشن۔ چنگی اور جنگلات۔

اس تقسیم کے خلاف زیادہ تر بمبئی اور بنگال نے جو صنعتی صوبے تھے صدائے احتجاج بلند کی۔ کیونکہ انکم ٹیکس کو مرکزی ذریعۂ آمد بنا دینے کی وجہ سے ان کو سخت نقصان ہوا۔ اور ان کی صنعتی ترقی معرض خطر میں پڑ گئی۔

(فیصلہ میسٹن)

اصلاحات ۱۹۱۹ء کے مطابق مقسومہ ذرائع کو اڑا دینے اور مالگذاری اور اسٹیمپ ایسے ذرائع کو صوبائی بنا دینے کی وجہ سے مرکزی گورنمنٹ کو نو کروڑ تراسی لاکھ روپے کا خسارہ ہوا۔ اس لئے تجویز کی گئی کہ اس کمی کو صوبائی عطیات سے پورا کیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۲۰ء میں لارڈ میسٹن کے زیر صدارت ایک کمیٹی اس سوال اور متعلقہ مسائل پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ میسٹن کمیٹی کی تجاویز بالعموم میسٹن ایوارڈ یا فیصلہ میسٹن کے نام سے مشہور ہیں۔

اس فیصلہ کی رو سے قرار پایا کہ ہر صوبہ اپنی اس خوشحالی کی نسبت سے جو جدید تقسیم ذرائع آمدنی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ مرکزی گورنمنٹ کو کچھ چندہ دے تاکہ اس کا خسارہ پورا ہو۔ مثلاً مدراس کی خوشحالی بقدر پانچ کروڑ چھہتر لاکھ روپے بڑھی۔

چنانچہ اسے تین کروڑ اڑتالیس لاکھ روپیہ بطور چندہ مرکزی گورنمنٹ کو دینا پڑا۔ اسی طرح بمبئی کی خوشحالی صرف بقدر ترانوے لاکھ روپیہ بڑھی۔ اور اسے اسی نسبت سے صرف چھپن لاکھ روپیہ گورنمنٹ آف انڈیا کو نذر کرنا پڑا۔

صوبائی عطیات کی تنسیخ

میسٹن ایوارڈ نے کسی کو خوش نہ کیا۔ ہر صوبہ میں اس کے

حالات نامساعد کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مثلاً بمبئی اور بنگال تو انکم ٹیکس کی آمدنی کے ہاتھ سے نکل جانے پر غیر مطمئن رہے۔ اور مدراس۔ پنجاب اور یو پی ایسے زراعتی صوبجات ان عطیات کو اپنی طاقت سے باہر سمجھا۔

صوبائی مالیات پر عطیات کا بار اس لئے بھی زیادہ ہو گیا کہ میسٹن کمیٹی کی توقعات کے خلاف صوبائی بجٹوں میں بجائے فاضلہ کے خسارہ ہونے لگا۔ دوسرے جو ذرائع آمدنی ان کو تفویض کئے گئے تھے نہیں یا تو مالگذاری کی طرح گنجائش نہ تھی اور یا صوبائی ضروریات کے لئے مکتفی نہ تھے۔

اندریں حالات صوبجات کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ ان عطیات کو منسوخ کر دیا جائے۔

ادھر آہستہ آہستہ مرکزی حکومت کی مالی حالت سدھرنے لگی اور آخر ۱۹۲۰-۲۱ء میں پہلی دفعہ وزیر خزانہ کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ مرکزی بجٹ میں فاضلہ دکھائے جس کے بعد یہ ضرورت محسوس نہ ہوا کہ صوبائی عطیات کو برقرار رکھا جائے چنانچہ دو سال تک ان عطیات کو آہستہ آہستہ کم کر کے ۱۹۲۷-۲۸ء میں ان کو بالکل اڑا دیا گیا۔

مسئلہ فیڈرل فنانس

صوبائی عطیات کی منسوخی سے بھی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تعلقات کی بحث ختم نہ ہوئی۔ بمبئی اور بنگال ایسے صنعتی صوبجات کی شکایات بحال موجود تھیں اور ان میں سے بڑی شکایت یہ تھی کہ جہاں باوجود فوجی اخراجات اور مقروضات پر سود کے نسبتاً معترزہ رہنے کے مرکزی گورنمنٹ کے پاس انکم ٹیکس اور درآمد برآمد ایسے لچکیلے محاصل موجود ہیں وہاں صوبجات کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے علی الرغم ان کو مالگذاری اور چنگی ایسے غیر لچکیلے ذرائع آمد تفویض کئے گئے ہیں جہاں سے ان کو کافی آمدنی نہیں ہوتی۔

مثلاً لگان کا بوجھ پہلے ہی کافی تھا اس میں اضافہ کی گنجائش نہ تھی چنگی سے آمدنی کے اتنا گھٹنے کا امکان تھا کیونکہ شراب نوشی وغیرہ کے خلاف پروپیگنڈا روز بروز بڑھ رہا تھا۔ جنگلات کی آمدنی جب ہی بڑھ سکتی تھی اگر ان پر پہلے حکومت کافی سرمایہ لگاتی۔

سٹمپ فروشی ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جس کی شرح غالباً بڑھائی جا سکتی تھی لیکن اس مد سے بھی غیر محدود آمدنی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

دوسری طرف صوبجات کو تعلیم۔ حفظان صحت۔ زراعت وغیرہ ایسے تعمیری محکمہ جات کی ترقی کا ذمہ دار بنایا گیا تھا جن کے لئے ان کو اندھا دھند روپیہ کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ ذرائع آمد کے کافی اور "زرخیز" نہ ہونے کی وجہ سے مہیا نہ ہو سکتا تھا۔

اس مالی تنگی کو دور کرنے اور صوبجات کو مالیاتی معاملات میں خود مختار بنانے کے لئے فنانشل اٹانومی یا مالیاتی خود مختاری کی داغ بیل ڈالی گئی جس پر ایک حد تک یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے اور کچھ وفاق کے قیام کے بعد عمل کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں فیڈرل فنانس کا مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح صوبجات کو مالی معاملات میں آزاد بنایا جائے اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مالیاتی تعلقات میں کیسے توازن قائم کیا جائے کہ مالی یکسانیت پیدا ہو۔

۱۹۱۹ء کے نظام میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ آمد کے جو ذرائع صوبائی حکومتوں کو دئے گئے تھے ان کی آمدنی صوبوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر نہایت قلیل تھی۔ پس فیڈرل فنانس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس نقص کو دور کیا جائے اور صوبجات کی آمدنیوں کو ان کے اخراجات کے مطابق کیا جائے اسی طرح ۱۹۱۹ء کے نظام کی صورت میں مرکزی حکومت کے اخراجات ان ذرائع آمدنی کے مقابلہ میں بہت کم تھے جو اس نے اپنے قبضہ میں کر رکھے تھے۔ پس ضرورت تھی کہ ان میں بھی ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

جدید تفتیشات

مانٹیگو چیمسفورڈ کے ریفارمز کے مصنفین اس دعویٰ میں سو فیصدی درست تھے کہ اگر صوبجات کو خود مختاری دینی ہے تو ہندوستان میں ایک ایسے مالیاتی وفاق کے مروج کرنے کی ضرورت ہو گی۔ جس کے ماتحت کسی محتاط معیار کے مطابق مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان ذرائع آمد کی تعین و تحدید ہو سکے اور صوبجات کو اپنی ضروریات کے لئے کافی روپیہ میسر ہو۔ لیکن ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کس قدر ناکام رہیں۔

بعد ازاں سائمن کمیشن نے اس سوال کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اس کے مشیر مالیات سر والٹر لیٹن نے ایک سکیم بنائی جو انہی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تجویز اس قیاس پر مبنی تھی کہ دس سال کے عرصہ کے بعد

مرکزی گورنمنٹ کے بجٹ میں ساڑھے چودہ کروڑ روپیہ کا فاضلہ ہوگا جس کی وجہ سے صوبجات کی موافقت میں ذرائع آمد کی دوبارہ تقسیم کا امکان ہوسکے گا۔

اُس نے تجویز کی کہ ذاتی آمدنیوں پر محاصل کا نصف اور جنگی رشمولیت محصول نمک کا کچھ حصہ صوبجات کو ایک باقاعدہ پروگرام اور شرح کے مطابق منتقل کر دیا جائے اور یہ انتقال رقوم دس سال کے اندر ختم ہو۔ مزید براں صوبجات کو اپنے ذرائع کی توسیع کے لئے یہ اختیار دیا جائے کہ وہ بعض جدید ٹیکس لگانے پر قادر ہوسکیں۔ مثلاً زرعی آمدنیوں پر محصول یا انکم ٹیکس پر ایک زائد محصول یا اشیاء پر دستوری ٹیکس وہ لگا سکیں۔

یکسانیت قائم رکھنے کے لئے اُس کی تجویز یہ تھی کہ شرح جنگی کے رد و بدل کا اختیار صوبجات کے وزیران مالیات پر مشتمل ایک بین الصوبائی مجلس کی سفارشات پر مرکزی گورنمنٹ کو تفویض کیا جائے۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے سائمن کمشن کے متعلق سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنے ایک مراسلہ کے دوران میں سر والٹر لیٹن کی تجویز کو ضرورت سے زیادہ خوش آئند قرار دیا۔ اور درحقیقت بعد میں آنے والی عالمگیر کساد بازاری نے سر لیٹن کے متوقع فاضلہ کو خاک میں ملا دیا۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر پیل سب کمیٹی؎ (فیڈرل فنانس سب کمیٹی) متعین کی گئی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ جدید آئین حکومت کے ماتحت مالیاتی دستور العمل کے متعلق رپورٹ پیش کرے۔

تاہم سنہ ۱۹۳۲ء میں پرسی کمیٹی؎ یا فیڈرل فنانس کمیٹی کے لئے یہ ممکن ہوسکا کہ وہ مالیاتی لائحہ عمل پر ایک رپورٹ پیش کرے جس میں اُس نے ڈرتے ڈرتے یہ توقع ظاہر کی کہ انکم ٹیکس کی آمدنی کو صوبجات میں تقسیم کرنے کا امکان ہوسکتا ہے اور سفارش کی کہ مرکزی گورنمنٹ کی امداد کے لئے صوبائی عطیات کو از سر نو مروج کیا جائے۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں مشترکہ منتخبہ مجلس؎ نے مذکورہ صوبائی عطیات کی تجدید کے خیال کو آخری بار کے لئے رد کر دیا۔ اِس مجلس کے سامنے ایک اور مسئلہ بھی پیش تھا اور وہ سندھ اور اڑیسہ کے نئے صوبجات کے نتیجے میں خسارہ کا تھا۔ علاوہ ازیں ایک اور گتھی جو اُس نے سلجھائی تھی یہ تھی کہ اپنی حدود میں ایک وفاقی انکم ٹیکس لگانے کی اجازت دینے کے لئے ریاستیں تیار نہ تھیں۔ لہٰذا مجلس یہ سفارش کرنے پر آمادہ تھی کہ انکم ٹیکس کی جملہ آمدنی صوبجات کو دیدی جائے لیکن مرکزی حکومت کے لئے اِس قربانی کو برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔

آخر قرطاس ابیض میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انکم ٹیکس کی جملہ آمدنی مرکزی حکومت کو دیدی جائے جس میں سے ایک حصہ جو پچاس فی صدی سے کم اور پچھتر فیصدی سے زیادہ نہ ہو، صوبجات کو عطا کر دیا جائے۔ لیکن فیڈرل گورنمنٹ کو یہ حق دیا گیا کہ وہ تین برس تک ایک رقم اپنے پاس رکھ سکتی ہے جس کو وہ سات برس کے عرصے میں صفر تک کم کر سکتی ہے۔ اُس کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ انکم ٹیکس پر ایک زائد محصول لگا سکے اور اسی قدر حصہ ریاستوں سے وصول کر لے۔

جائنٹ سلیکٹ کمیٹی نے زائد محصول والی تجویز تو رد کر دی۔ لیکن قرطاس ابیض کی باقی تمام تجاویز کو منظور کر لیا۔ مثلاً صوبجات کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ زرعی آمدنیوں پر محصول لگا سکتے ہیں۔ اور مرکزی گورنمنٹ محصول برآمد، محصول نمک اور چنگیوں کی آمدنی کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر سکتی ہے

اِن تمام جدید تفتیشات اور بالخصوص جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا اثر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء (جدید آئین) میں جابجا ظاہر ہے اور اب ہم اُسی کی وضاحت کریں گے۔

آئین جدید میں مالیاتی دفعات

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں فیڈرل فنانس پر مندرجہ ذیل دفعات ہیں جن کا مفہوم سادہ زبان میں۔ قانونی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیان کر دیا گیا ہے:۔

دفعہ ۱۳۷ زرعی اراضی سے علاوہ تمام موروثی جائیداد (اسٹیٹ)۔ اور درآمد برآمد پر محاصل کی آمدنی مرکزی گورنمنٹ کی ملکیت میں نہیں ہوگی بلکہ وہ صوبجات اور ریاستہائے میں تقسیم کر دی جائے گی۔

دفعہ ۱۳۸ زرعی آمدنیوں کے علاوہ باقی تمام آمدنیوں پر محصول فیڈریشن یعنی مرکزی حکومت لگایا کرے گی۔ لیکن جمع کردہ رقم کا ایک مقررہ حصہ صوبجات اور ریاستہائے کو دے دیا جائے گا۔

Peel Sub-committee

Percy committee

Joint Select Committee

دفعہ [illegible]۔ فیڈریشن کے قیام کے بعد دس سال سے قبل فیڈریشن کو یہ اختیار نہ ہوگا۔ کہ وہ کسی وفاقی ریاست پر کارپوریشن ٹیکس لگا سکے۔

دفعہ ۱۴۰۔ محصول نمک چنگی اور درآمد و برآمد کے محصول کو لگانے اور جمع کرنے کا اختیار فیڈریشن کو ہوگا۔

دفعہ ۱۴۱۔ ماسبق دفعات یا ایسے محاصل میں جن میں صوبجات کا نفع و نقصان ہو رد و بدل کرنے کے لئے کوئی مسودہ بلا اجازت والسرائے فیڈرل اسمبلی میں پیش نہیں ہوسکتا۔

دفعہ ۱۴۲۔ فیڈریشن کے حصۂ آمدنی سے صوبجات کو حسب ضرورت زیر امداد دیا جاسکے گا۔

آئین جدید کے ماتحت تقسیم ذرائع

آئین جدید کے ماتحت فیڈرل گورنمنٹ یعنی مرکزی حکومت مندرجہ ذیل ذرائع سے اپنی آمدنی پیدا کرے گی:۔

(۱) دستوری محاصل جن میں محصول درآمد اور تمباکو اور ہندوستان میں مصنوعہ دیگر اشیاء پر چنگی باستثنائے مندرجہ ذیل شامل ہیں۔

(ا) شراب

(ب) افیم۔ ہندوستانی بھنگ و دیگر منشیات

(ج) طبی اور دیگر نہانے دھونے کا سامان جس میں الکحل یا ب میں متذکرہ اشیاء کا جزو ہو۔

(۲) کارپوریشن ٹیکس

(۳) محصول نمک

(۴) انکم ٹیکس باستثنائے زرعی آمدنی

(۵) زرعی۔ ذاتی یا کمپنیوں کی اراضی کے علاوہ املاک کی قیمت سرمایہ پر ٹیکس۔

(۶) زرعی اراضی کے علاوہ دیگر جائداد کی وراثت پر ٹیکس

(۷) ہنڈیوں۔ چیکوں۔ پرامیسری نوٹوں۔ بل آف لیڈنگ۔ لیٹر آف کریڈٹ۔ بیمہ کی پالیسیوں اور رسیدوں وغیرہ پر ٹکٹ

(۸) ریل یا ہوائی جہاز کے ذریعہ منتقلہ مال و متاع یا مسافروں پر سفر کے اختتام کا ٹیکس۔

(۹) ریلوں کے کرایہ یا محصول پر ٹیکس۔

صوبائی ذرائع آمد مندرجہ ذیل ہیں

(۱) مالیہ

(۲) مندرجہ ذیل اشیاء پر چنگی

ا۔ شراب

(ب) افیم۔ ہندوستانی بھنگ و دیگر منشیات

(ج) طبی اور دیگر نہانے دھونے کا سامان جس میں الکحل یا ب میں متذکرہ اشیاء کا جزو ہو۔

۳۔ زرعی آمدنیوں پر محصول

۴۔ آراضی عمارات۔ چولھوں اور کھڑکیوں پر ٹیکس

۵۔ زرعی اراضی کی وراثت پر ٹیکس

۶۔ کان کنی پر ٹیکس

۷۔ سر شماری کا ٹیکس

۸۔ ملازمتوں۔ تجارتوں۔ اور پیشہ جات پر ٹیکس

۹۔ جانوروں اور کشتیوں پر ٹیکس

۱۰۔ اشیاء کی فروختگی اور اشتہار بازی پر ٹیکس

۱۱۔ کسی شہر میں مال کے آنے پر محصول مقامی

۱۲۔ محصول تعیش جس میں تفریح اور جوئے کے ٹیکس شامل ہیں

۱۳۔ دستاویزوں پر ٹکٹ جن کا ذکر فیڈرل لسٹ میں نہیں آیا

۱۴۔ ملکی دریاؤں اور نہروں پر نقل و حرکت کرنے والے مسافروں اور اموال پر محصول۔

۱۵۔ سوائے عدالت کے اس فہرست میں کسی معاملہ فیس۔

وفادارانِ ازلی کا پیام[1]
شاہنشاہِ ہندوستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے، اے عالم پناہ — اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ
اے گداپیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار — بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار
اے ہمارے عالموں کے حامیٔ دینِ مُبیں — دَورِ سیّد کے "اولی الامر" و "امیر المومنیں"

اے رئیسِ پاک دل، اے شہریارِ نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجے سلام

راس، کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو — یُوں نہیں رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو
دل کے دریا نُطق کی وادی میں بہ سکتے نہیں — آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں
لیکن اِتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور — ہند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضور
آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں — تَن پر اک دھجی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں
تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں — شکریہ اُن روٹیوں کا اے شہِ گردوں نشاں
روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خدام نے — آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے؟
آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا — کھا بھی لیں گے آج اگر ڈٹ کر تو کل کھائیں گے کیا؟
صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام — کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام؟
آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قومِ نامراد — کھائے جاتا ہے اُسے خدامِ عالی کا عناد

---

[1] نوٹ: پورا رسالہ طبع ہو جانے کے بعد یہ نظم شامل کی گئی۔ اس لئے فہرست مضامین میں نہیں آسکی۔
[illegible] احسان الحق

معدہ محروم غذا ہے، کیسہ ہے محروم زر — آپ کے عمّال نے لوٹا ہے ہم کو اس قدر
آپ کے فرقِ مبارک کو دیا ہے جس نے تاج — آج اس بھارت کا سر ہے، اور تیغِ احتیاج
ہر جبیں پہ ہے شکن، اس کج کلاہی کی قسم — ہر مکاں اک مقبرہ ہے، قصرِ شاہی کی قسم
آپ کے سر پر ہے تاج، اے فاتحِ روئے زمیں — اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں

ہم وفا کیش، آپ کی نظروں سے بھی گر جائیںگے؟
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائیںگے؟

ہم سے، باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات — صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات
ہم تو موسیٰ بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے — پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں، بھوک سے دل تنگ ہیں — ذرّے ذرّے سے عیاں آثارِ حرب و جنگ ہیں
کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب — کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب
گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ — آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ
ہم وفادارانِ پیشیں، ہم غلامانِ کہن! — قبر جن کی کھُد چکی، طیار ہے جن کا کفن
تند رَو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں — نوجوانوں کی اُمنگوں کو دبا سکتے نہیں
مدح اب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی — جیسے کوئی دھار چھوتا ہو اُپلی تلوار کی
آپ سے کیونکر کہیں ہندوستاں پُر ہول ہے — آپ کا نام آگ ہے، اور کانگرس پٹرول ہے
وہ شررنگیں کھد رہی ہیں، الحفیظ و الاماں — صرف انگلستان کیا، یورپ سما جائے جہاں
نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی — صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی
آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عود کی — ہندیوں کی سانس سے آتی ہے بُو بارود کی
غور سے سن لیجئے اے خواجۂ عالی نژاد — آپ کو دھوکے میں رکھ سکتے نہیں ہم خانہ زاد
کیجئے درماں میں عجلت، ورنہ دل ٹوٹ جائیں گے — حاکم اپنے گھر چلے جائیں گے، ہم مر جائیں گے

چونکئے جلدی، ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے



مردِ مضحک (مسلسل)

اسرائیل احمد خاں

(۱۰)

کوئین این!

کوئین این - ملکۂ انگلستان - ایک متوسط الحیثیت عورت تھی - اس کی سیرت میں تمام صفات وخصوصیات بَیْن بین واقع ہوئی تھیں! جن میں سے کوئی بھی فضائل عالیہ یا شمائل شنیعہ کے انتہائی نقاط تک متجاوز نہوئی تھیں! وہ شگفتہ طبع وخوش خلق تھی - شاہانہ جلالت شان کی بھی چند شعائیں اُس کی ناصیۂ حکومت پر چمکتی تھیں! تاہم عموماً اُس کے مزاج میں ایک سطحیت اور ثقالت سی تھی! اُس کی ادا میں ایک بے ہنری نمایاں تھی - اعلاس کی نیکی میں ایک سادہ لوحی! بحیثیت بیوی کے وہ بے وفا بھی تھی - اور با وفا بھی! — بے وفا اس معنی میں کہ اغیار وغیر محرم بھی اُس سے کچھ ورا التفات تھے، اور با وفا اس تعبیر سے کہ شوہر کے ساتھ اُس کی وابستگی اور نباہ کی شگفتگی تا زیست قائم رہی، ع

معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق است

بحیثیت ایک مسیحی کے وہ متدین بھی تھی اور متعصب بھی! توحید فی التثلیث و التثلیث فی التوحید، حضرت مسیحؑ کی گلبانگ محبت بھی اور مذہب جیسی کی شورش منافرت بھی!

اُس کی سادگی بھری ہستی کے اندر صرف "ایک" "بینظیر گوشہ حسن تھا — یعنی اُس کی دل آویز گردن! باقی اُس کے پیکر کے دیگر حصہ معمولی تناسب سے بھی عاری تھے! اُس کا ناز نخرہ بھونڈا تھا! اُس کی جلد و رخسار اگرچہ سرخ وسفید تھے، لیکن بیشتر اس رسوا کُن خوبی کے مصداق کہ ع

دست مرہون حنا، رخسار رہن غازہ تھا!

ملکۂ این اُس چنپا کلی کے فیشن کے رواج کا شرف اولیت رکھتی ہے جو بڑے بڑے موتیوں کی سلک جواہر سے بنائی جاتی تھی اور جو گلے سے چسپیدہ کرکے پہنی جاتی تھی،

ملکۂ عالم کی پیشانی ضرب سے تنگ واقع ہوئی تھی، رخسار پُر گوشت تھے، آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں، اور لبوں کی ساخت شہوانی مزاج کی غماز! آنکھوں کی کلانی کے باوجود وہ چشم بد دور کم نظر بھی تھی! یہ کم نظری اُس کے دماغ تک سرایت تھی! سہواً یہ تھا کہ کسی وقت بھی بیٹھے بیٹھے قہقہہ مار کر ہنس دیتی، اور پھر بے طرح گم صُم بھی ہو جاتی! اُس کے مُنہ سے الفاظ ایسے مبہم نکلتے تھے کہ سامع کے قیاس کو بہت کچھ خلا پُری کرنی پڑتی تھی! وہ ایک ظرفہ معجون تھی، جس میں ایک نیک خو نسائیت اور ایک شرارت پسند شیطنت دونوں کے عناصر موجود تھے! نسوانی فطرت کے اعتبار سے وہ عجائب پرست بھی تھی، مختصر یہ کہ این، اماں حوا کی کم وبیش سچی بیٹی تھی! یہ سرشت ایک عجیب اتفاق سے تخت وتاج کے ساتھ ہم رشتہ ہوئی! — جس کے مزید

پیچیدہ نتائج پیدا ہوئے! وہ مئے نوشی کی بھی عادی ہوگئی تھی۔

این کا شوہر اک عجیب الطرفین ڈینمارکی تھا، اپنے سیاسی مسلک میں وہ رجعت پسند واقع ہوئی تھی، تاہم حکومت وہ حزب الاحرار کے اشتراک سے چلاتی تھی! الغرض وہ اک عورت تھی، اور ہر عورت کی طرح اک پاگل عورت!

جس بھونڈے طریقے سے وہ مہمات سلطنت کی سربراہی کیا کرتی تھی وہ اک ناگفتہ بہ منظر ہوتا تھا! واقعات وحوادث کی باگ اُس نے واقعات وحوادث ہی کے ہاتھ میں دے رکھی تھی! ان پر اپنے کسی انسانی تصرف سے کام لینا اُس کے دماغ کی رسائی سے پرے اک تصور تھا، اُس کے سارے اندازِ حکومت مجنونانہ تھے! اپنی کج روی، بدتمیزی، اور عاقبت نااندیشی سے وہ ذرا ذرا سے معاملات کو حادثات کی نزاکت میں تبدیل کر دیتی تھی! جب اقتدار پرستی کا بھوت اُس پر سوار ہوتا تو خواہی نخواہی کوئی سخت آتش افروزی کی حرکت کر بیٹھتی اور نتائج سے تلخ کام یا لطف اندوز ہوتی!

ملکۂ این اپنے عہد کے مشہور مذاق "تفنن" سے بھی بدقسمتی سے بہرہ یاب تھی! وہ ادبی ظرافت اور شاہانہ ستم ظریفی ہر دو سے شغل رکھتی تھی! اگر اپا آلودیوتا پر بھی اسے اختیار حاصل ہوتا تو وہ اُسے بھی کوزہ پشت بنا دیتی! لیکن پھر شاید وہ اُس کے مقام اُلوہیت کا خیال کر کے اُس کا معالجۂ پشت بھی کراتی، نسوانی رحم دلی کے اقتضا سے وہ کسی کو مایوس تو نہ کرتی تھی، لیکن زنانہ شوخ فطرتی کے ایما سے چھیڑتی ہر ایک کو تھی! کبھی کبھی کوئی دل خراش کلمہ اُس کی زبان سے نکل جاتا، لیکن پھر جلد ہی وہ عذر معذرت کر لیتی، اور یاد ش بخیر ملکۂ ایلزبیتھ کی طرح اپنی نیک نیتی اور صاف دلی کی قسم کھا لیتی! ؎

شوم فدائے دروغے کہ راست مانند است!

کبھی وہ اپنی قبا کی جیب سے اک ڈبیہ نکالتی، جس پر اُس کا شاہانہ اسم گرامی حروف مقطعات (۰ ا ، ہ) میں منقوش تھا، اور اُس میں سے تھوڑا سا گلگونہ لیکر اُس سے اپنے لبوں کو رنگین کرتی، اور اسی ہیئت کذائی سے پھر یکبارگی حاضرین کے سامنے آکر کھلکھلا کر ہنس پڑتی! لطف یہ کہ ملکۂ موصوفہ کو اپنی فربہی پر بھی ناز تھا! "ہر عیب کہ سلطان بپسندد ہنر است"!

ملکۂ این اگرچہ انگلستان کے حلقۂ دُنا دین داخل تھی لیکن باوصف اِس کے تھیٹر کی دل دادہ واقع ہوئی تھی! اُس کے دربار میں اک مہمل سی قسم کی علمی مجلسِ موسیقی تھی، جس کے آداب ومشاغل میں فرانس کا اندھا سید ھا تتبع کیا گیا تھا! ۱۷۰۰ء میں ایک فرانسیسی فارٹروفنے نامی کو بھی اک تجویز دربارۂ تعمیر سٹرکس کے معاملہ میں پیرس میں سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا، یہ شخص انگلستان آیا اور کوئین این کی بارگاہ کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا، ملکۂ معظمہ فوراً اس خیال کی مشتاق بن گئیں کہ لندن میں اک عظیم الشان تھیئٹر بنایا جائے، جس میں مشینی آلات سے کام لیا جائے، اور جس کے اندر اک زریں اسٹیج شہنشاہ فرانس کے پایۂ تخت کے اسٹیج سے بھی زیادہ شاندار ہو!

لوئی چہاردہم کی طرح وہ سواری میں گھوڑوں کی جنون سامان دوڑ سے لطف اندوز ہوتی تھی! بعض اوقات مرکب شاہی لندن اور ونڈسر کے درمیان کی مسافت کو سوا گھنٹے سے بھی کم عرصہ میں طے کر لیتا تھا!

ملکۂ این کے آئین سیاست کے تحت کسی جلسے کے انعقاد کی اجازت دو اعزازی مجسٹریٹوں کی منظوری کے بغیر نہ مل سکتی تھی، اگر ایک درجن آدمی بھی کسی جگہ اس غرض سے بھی جمع ہوتے کہ وہاں شراب وکباب کا شغل کریں تو یہ مباح اجتماع بھی اس قدر قبیح وشنیع قرار پاتا کہ تمام حریفانِ بادہ پیما کی جائداد ضبط کر لی جاتی! ملکہ کا دَورِ حکومت اگرچہ ویسے پُرامن وآشتی پسند واقع ہوا تھا لیکن ان ایام میں بھی برطانوی بیڑے کی مزید تعمیر اور بحری اقتدار کی روز افزوں توسیع کا کام شد و مد سے جاری رہا اس مسلسل حکمت عملی سے یہ فیصلہ کیا جانا چاہئے کہ انگلستان کی ملک کے اک فرد پر "شہری" کے بجائے "رعیت" کے خطاب کا اطلاق اِس زمانہ میں زیادہ موزوں تھا! صدیوں تک یہ ملک اُس ظلم رانی اور مطلق العنانی کا تختۂ مشق بنا رہا جس نے برطانوی "منشورِ حریت" کو اک تقویم پارینہ میں تبدیل کر دیا تھا، یہ کاروبار فرانس کے لئے بھی وجہ شکایت ہوتے رہے اور جن پر وقتاً فوقتاً وہ صدائے احتجاج بھی بلند کرتا رہا۔ فرانس کے دستورِ حکومت کو اس دور میں انگلستان پر فضیلت حاصل تھی، اگرچہ اس فضیلت کو اس بنا پر اک داغ لگ گیا تھا کہ جو استبداد انگلستان میں بحری قوت کے سلسلہ میں کیا جاتا تھا وہی فرانس میں بری عسکریت کے معاملہ

میں معمار رکھا جاتا تھا!

ملکۂ این اپنے ملک وقوم کی عموماً ہردل عزیز تاجدار تھی، انگلستان زنانہ فرماں رواؤں کو محبوب رکھتا ہی، لیکن فرانس صنف نازک کے کمزور ہاتھوں میں عصائے حکومت دیکھنا پسند نہیں کرتا! انگریزوں کا قومی مزاج اس بارے میں دلچسپ تاریخی مظاہر رکھتا ہی، انگریز مؤرخین کی نظروں میں الزبیتھ شوکت وصولت کا پیکر کامل ہی، اور این خوش خوئی ونیک نہادی کا مظہراتم لیکن حقیقت یہ ہی کہ ان دونوں حکمران خواتین کی سیرتوں کے مرقعوں کے خطوط بھدے اور بھونڈے واقع ہوئے ہیں، جن میں آن بان اور بانکپن نام کو نہیں! لیکن لاریب کہ ان ہر دو دختران حوا کا "بے داغ کیرکٹر" انگلستان کے لئے مایۂ نازش ہی! کسی کو اس میں مجال دم زدن نہیں!

ایلزبیتھ اک سدابہار دوشیزہ تھی، جس کے گل دوشیزگی کو تیسیکہ اک نغمۂ نوبہار سنایا کرتا تھا، اور این اک منکوحہ شاہ بیگم تھی، جس کے حجلۂ عصمت پر بولنگ بروک کے ہاتھوں اک حجاب خاص کی آفت عمل میں آئی ہی!

(۱۱)

ملکۂ این کو ڈچیز جوزیانہ کی ذات سے اک عناد سا تھا! اس کی دو وجہیں تھیں ایک یہ کہ ڈچیز موصوف اک حسین وجمیل پیکر نسائیت تھی۔ دوسری یہ کہ جوزیانہ کا منگیتر بھی مردانہ جمال وجلال کا اک بالا بلند بت تھا! رشک وحسد کے ایک پھوڑ دو تو سبب ایک عورت کے لئے کافی سے زیادہ ہیں! ـــ اور اک بادشاہ بیگم کیلئے تو ایک بھی بہت ہے!! اس پر طرہ یہ کہ جوزیانہ این کی بہن بھی تھی، اور جذبۂ حسد کو اس خیال نے مزید تحریک باہم پہنچائی تھی کہ ایک ہی شاخ خاندانی کے دو گل رنگ وبو میں ایسا غیر معمولی .... تفاوت رکھتے ہیں!

این عورتوں کی خوبصورتی سے چڑنے سی لگی تھی! اس کے نزدیک صنف نازک کا حسن، قبح میں داخل تھا! وہ عورتوں کے حسن صورت کو اُن کے حسن سیرت کے منافی سمجھتی تھی! اور خود چونکہ اس شے لطیف سے بے نصیب تھی اس لئے اسی بات کو اپنے اخلاق نسوانی کے لئے اک ضمانت شمار کرتی تھی! تاہم اگر قسام ازل کی تقسیم پر ملکۂ موصوفہ کو اختیار ہوتا تو اُس چیز کو وہ اپنے لئے کبھی منتخب نکرتی جو تقدیر سے اُس کے حصے میں "بستم" آگئی تھی! بدصورتی کے ساتھ اُس کو جو حسن ظن ہو گیا تھا وہ اس کا کلمۂ ایمان سا بن گیا تھا! جوزیانہ جو جمال جسمانی اور حسن ذہنی کا عطر مجموعہ تھی، این کے لئے اک مستقل سامان کوفت تھی! تاج شاہی کے ظل الٰہی کے نیچے اک نامطبوع چہرہ بھی کیا طرفہ مصیبت ہی!!

(۱۲)

بارکلیفڈرد!

لوگ جو جو کرتے رہتے ہیں اُس سے واقفیت حاصل کرنا اک دلچسپ مطالعۂ علمی ہی! انسانوں کے کاروبار پر کم وبیش تجسس رکھنا معلومات عامہ کا اک اہم شعبہ ہی!

جوزیانہ نے لارڈ ڈیوڈ پر اک چھوٹے سے آدمی کو نگراں مقرر کردیا تھا جو اُس کا اک معتمد تھا، اُس کا نام بارکلیفڈرڈ تھا، دوسری طرف لارڈ ڈیوڈ نے بھی اسی نام کا اک یکساں قابل اعتماد سراغ رساں ڈچیز جوزیانہ کے پیچھے لگا دیا تھا! لیکن تیسری طرف ملکۂ این نے لیڈی جوزیانہ اور لارڈ ڈیوڈ ہر دو کی حرکات وسکنات پر خاص اپنا اک جاسوس تعینات کر رکھا تھا لطف یہ ہی کہ اس تیسرے مخبر کا نام بھی بارکلفیڈرد تھا! کتنا دلچسپ مثلث سیاسیات! ع

عشق است وہزار بدگمانی!

قمار عشق کی اُس بساط پر جس کے گرداگرد ڈچیز جوزیانہ، لارڈ ڈیوڈ، اور ملکۂ این نشست رکھتے تھے اس عیار بارکلیڈرد کی انگلیاں مصروف کار تھیں، اک مرد، دو عورتوں کی باہمی ریشہ دوانیوں کے تار پود میں دو طرفہ ہم رشتہ تھا! اس طرفہ ماجرے میں کیا کیا دلچسپ صورتیں نہ پیدا ہوئی ہوں گی! کس طرح متعدد روحوں کی کاوشوں کے درمیان قدر مشترک ایک ہی وجود بنا ہوا تھا! بارکلیفڈرد کو عمر بھر ایسی نادر سعادت تثلیث نصیب نہوئی ہوگی کہ بیک وقت تین کانوں میں سرگوشی کرے! یہ شخص ڈیوک آف یارک کا اک قدیم الخدمت ملازم تھا، ایک وقت اُس نے سررشتۂ کلیسا کے اندر بحیثیت پادری کے داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن یہ باب حرم اس پر وا نہوا تھا، ڈیوک آف یارک جو اک مخلوط النسل انگریزی درواجی شہزادہ تھا، روما کی پاپائیت اور انگلستان کی سرکاری مسیحیت کا مجمع

بجز تین واقع ہوا تھا! وہ دینِ عیسوی کے ہر دو مذاہب، رومن کیتھالک اور پروٹسٹنٹ کا حلقہ بگوش تھا، وہ بارکلفیڈرڈ کو ان دونوں مسلکوں کے گروہوں میں سے کسی نہ کسی منبرِ امامت پر بٹھا سکتا تھا، لیکن بارکلیڈرڈ غیرے شانِ نزول تھا اس آیت کی کہ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ!

یہ بارکلفیڈرڈ ہمیس دوم کے حالات بیان کر کر کے، شاہ جنت آشیانی کا محبوب نام لے لے کر اس عہدِ میمنت مہد کے امراء کی وفاکیشیوں کے "لطیف و دراز" قصے سنا سنا کے، اور دوسرے بہت سے اثرآفرین نیز درد انگیز حرف و حکایات زیبِ داستان کر کر کے سامعین کو محظوظ کیا کرتا تھا!

جوزیانہ کو اس آدمی سے بہت دل بستگی ہو گئی تھی، وہ ایک طرف غربت و مسکنت اور دوسری طرف ذہانت و ظرافت کا اک مخلوط مظہر تھا، اگرچہ ان دونوں عناصر کی یک جائی کم و بیش عموماً اک اجتماعِ ضدین کی حیثیت رکھتی ہے!

لیڈی جوزیانہ نے بارکلفیڈرڈ کو لارڈ ڈیوڈ کی خدمت میں پیش کیا، اسے حاشیہ نشینان ملازمت میں داخل کر لیا گیا، اور محل کے اندر اک گوشۂ عافیت اسے عنایت ہوا، جوزیانہ اس کے حال پر بہت نوازش کرتی تھی، اور کبھی کبھی از راہ ذرہ نوازی اس سے ہم کلام بھی ہوا کرتی تھی! بارکلفیڈرڈ کا افلاس کافور ہو گیا، سردی و گرسنگی کے متعلق اس کے واردات قلب اس کی لوح دل سے دُھل گئے! رفیع الدرجات خاتون جوزیانہ کی بندہ نوازی کا وہ غیر معمولی طور پر ممنون تھا، وہ اس سے ضمیر حاضر واحد سے خطاب کیا کرتی! ع

یہ نصیب، اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!

بارکلفیڈرڈ کے لئے یہ رسائی و تقرب "کلاہ گوشۂ دہقان بآفتاب رسید" کی سی معراج تھی وہ جوزیانہ کے "تو" اور "تیرا" اور "تجکو" پر اپنے تئیں "طورِ دربار کا کلیم" محسوس کرتا تھا! یہ وہ عزت اور مکرمت تھی کہ بخیال اس کے "میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا" جوزیانہ کے بارگاہ ناز کی یہ باریابی بارکلفیڈرڈ کے لئے اک بہشتی خواب تھی جسے وہ عالم بیداری میں دیکھا کرتا تھا! بالکل اسی تشکیک آمیز تحیر کے ساتھ کہ ع

انچہ می بینم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب؟!

بارکلفیڈرڈ ان وسائل سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اپنے رسوخ کے حربے سے وہ اک نہایت بلند پایگاہ پر ضرب رسید کرنا چاہتا تھا! اس آخری ہدف کو زد میں لانے کے لئے وہ اب شہنشاہ بیگم کی عرش کلاہ سعود کرنے کا ضرور تمند تھا! فی الحال اس منزل مقصود کا درمیانی مرحلہ پیشِ جوزیانہ کا آستانہ تھا جو ملکۂ آین کے دربار کا زینہ تھا! ریشہ دوانیوں کی زمین دوز سرنگوں سے اگر وہ کام نہ لیا جائے جو اُن کی غایت مقصود ہے تو یہ ساری نیک انجام زحمت کشی "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے ہم معنی ہو گی!

(۱۳)

ایک دن بارکلفیڈرڈ نے لیڈی جوزیانہ سے عرض کیا:

"کیا جناب عالیہ اس خاکسار ذرۂ بے مقدار پر کچھ مہربانی فرمائیں گی؟"

"تیرا منشا کیا ہے؟"

"کوئی ملازمت!"

"ملازمت! تیرے لئے؟"

"جی ہاں، اور کیا؟"

"خوب! کیا خوب!! تو ملازمت مانگتا ہے، تو کہ کسی قابل نہیں!"

"جی بس یہی تو وجہ ہے!"

جوزیانہ کھلکھلا کر ہنس پڑی!

"اچھا جن کاموں کی کوئی اہلیت تجھ میں نہیں ہے اُن میں سے تو کون سا کام چاہتا ہے؟"

"سمندر کی بوتلوں کے ڈاٹ کھولنے کا کام!"

جوزیانہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی!

"کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا مجھے بیوقوف بنا رہا ہے!"

"توبہ کیجئے حضور!"

"خیر ہے تو یہ مذاق ہی، لیکن لطف لینے کے لئے میں متانت کا لہجہ قائم رکھوں گی! اچھا مجھے بتا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ پھر کہہ!"

"سمندر کی بوتلوں کے ڈاٹ نکالنے کا کام!"

بادشاہوں کے ہاں کس چیز کی کمی ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ

کیا اس نام کی کوئی نوکری شاہی سررشتۂ نظم ونسق کی دنیا میں وجود بھی رکھتی ہے؟!"

"ہاں، رکھتی ہے حضور!"

"اگر ایسا ہے تو میرے لئے یہ اک نئی خبر ہوگی!"

"حضور ایسی نوکری کے وجود میں کچھ بھی کلام نہیں!"

"اچھا اپنی روح کی قسم کھا — اگرچہ ظاہر ہے کہ تجھ میں روح کہاں!"

"قسم ہے اپنی روح کی جو مجھ میں نہیں ہے!"

"مجھے اعتبار نہیں!"

"شکریہ!"

"اچھا تو پھر کہہ نا کہ تیری درخواست کیا ہے؟"

"حضور وہی سمندر کی بوتلوں کے ڈاٹ کھولنے کا کام!"

"مگر غالباً یہ بہت آسان کام ہوگا — قریباً ایسا ہی آسان جیسی کہ اس رنجی گھوڑے کی سائیسی کی خدمت جس کا ذکر ہم کہانیوں میں سنا کرتے ہیں!"

"جی ہاں کچھ ایسا ہی ہے!"

"ہاں شاید اس میں قطعاً کوئی کام نہ ہوگا۔ اچھا ٹھیک یہی ہے ایسا ہی عنقا صفت کار بیکاری تیرے لئے موزوں بھی ہے!"

"مگر قصور معاف، حضور کو معلوم ہونا چاہئے کہ بندہ بالکل ناکارہ بھی نہیں ہے اور بعض خاص کاموں کی خاص صلاحیت اس ہیچمدان میں موجود ہے!"

"اچھا یہ بکواس تو رہنے دے اور مجھے ٹھیک ٹھیک بتا کہ وہ نوکری کونسی ہے؟"

بار کلینڈ رد نے معاً اک ممتاز قسم کا انداز متانت اختیار کر لیا!

"خاتون محترم!" اس نے کہا "سمندر میں تین قسم کی چیزیں ہیں: ایک تو وہ جو سمندر کی تہ میں ہوتی ہیں، دوسری وہ جو سطح آب پر تیرتی پھرتی ہیں، تیسری وہ جن کو سمندر کی موجیں ساحل پر پھینک دیتی ہیں!"

"اچھا پھر؟"

"یہ تینوں قسم کی چیزیں موضوع ہیں، تین سرکاری صیغوں کی جو برطانوی امیر البحر اعظم کے ماتحت ہیں!"

"اچھا آگے؟"

"اب آگے حضور خود سمجھتی ہیں!"

"ہرگز نہیں!"

"تمام تہ نشین چیزیں، تمام تیرتی ہوئی چیزیں، اور تمام وہ چیزیں جنہیں سمندر نکال کر سواحل پر ڈال دیتا ہے، امیر البحر انگلستان کی ملک ہیں"۔

"یہ سب چیزیں! سچ مچ؟! اچھا پھر؟"

"ان میں سے صرف ایک چیز مستثنیٰ ہے! — یعنی اسٹرجن مچھلی، جو شاہ انگلستان کا حق خصوصی ہے!"

"میں تو سمجھتی تھی صرف وہی چیزیں اک واحد استثنا رہ جائیں گی جو سیارۂ نیپچون کی مملکت میں داخل ہیں!"

"اجی نیپچون تو محض اک احمق ہے! اس نے ہر چیز سے دستبرداری دے رکھی ہے، اور انگلستان کو موقع دیا ہے کہ تمام چیزوں کا مالک کل ہو جائے!"

"اے جوکر تجھے کہنا ہے کہہ بھی چک!"

"ان چیزوں کا نام ہے "معدنِ بحر کے لعل و الماس"!"

"ایسا ہی سہی! "گو تو خوش باش کہ اگوش، احمق نہ ہیم"! — بہرحال مزید تفصیل؟"

"یہ ذخائر بے حد و بے پایاں ہیں! ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز سطح بحر پر تیرتی ہوتی ہے، اور کوئی نہ کوئی ساحل بحر پر پھینکی جاتی رہتی ہے! یہ وہ خراج ہے جو بحر اعظم۔ انگلستان کے خزانہ کو نذر کیا کرتا ہے!"

"آمنّا و صدّقنا! لیکن بندہ اس بات کو ختم کر، اور حرف مطلب پر آ!"

"آنحضور غالباً سمجھتی ہوں گی کہ اس سلسلہ میں سمندر نے خشکی پر اک مستقل سررشتہ قائم کر لیا ہے!"

"یہ تختۂ زمین کے کس گوشہ میں واقع ہے؟!"

"برطانوی امارت بحری کے اندر!"

"اس اعجوبۂ روزگار محکمے کا نام کیا ہے؟!"

"صیغۂ اموال بحر!"

"خوب!"

"اس صیغے کے تین شعبے ہیں، جو درجات سہ گانہ کی الگ الگ

ہشیار سے متعلق ہیں، اور ہر شعبہ اک جداگانہ عامل کے سپرد ہے۔"

"اِس تعداد کی کچھ اور تفصیلات یا عجائبات بھی ہیں؟!"

"بحر ظلم کا مصروفِ سفر جہاز پر اک افتاد کے بارے میں، اُن حکام و عمّال کو تحریری اطلاعات دیتا رہتا ہے جو ساحل پر تعینات ہوتے ہیں! یہ اطلاعات مختلف جزئیات کے متعلق ہوا کرتی ہیں؛ مثلاً یہ کہ جہاز اس وقت فلاں عرض البلد میں ہے، یہ کہ اُس کو فلاں بحری درندے کا سامنا ہوا، یہ کہ اب اُس کو ساحل نظر آنے لگا ہے، یہ کہ وہ اب معرضِ خطر میں ہے، یہ کہ وہ عنقریب غرق ہونے والا ہے، یا یہ کہ وہ تباہ ہو چکا ہے؛ وغیر ذالک!..... اِس اطلاع دہی کا طریقہ یہ ہے کہ کپتان (امیر جہاز) بوتل لیتا ہے اور اُس کے اندر وہ پرزۂ کاغذ رکھتا ہے جس پر اطلاعی تحریر لکھی ہوتی ہے؛ پھر بوتل کی ڈاٹ لگا دیتا ہے اور بعد ازاں اُسے امواجِ بحر کے حوالے کر دیتا ہے!........ اِس بوتل کے تین حشر ہوتے ہیں: یا تو وہ ڈوب کر تہ نشین ہو جاتی ہے، یا سطحِ آب پر تیرنے لگتی ہے، یا کنارے پر جا لگتی ہے! ان ہر سہ صورتوں میں اُس کا تعلق شعبہ جات سہ گانہ کے متعلقہ افسروں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ ہوتا ہے!"

"اچھا تو تُو ساحل والے شعبے کا سپُردار بننا چاہتا ہے؟"

"بس اُسی کا!"

"اور غالباً یہی وہ ملازمت ہے جسے تو "سمندر کی بوتلوں کے کاگ کھولنے" سے تعبیر کرتا ہے!"

"جی حضور! اور اِس نام کا اک باضابطہ سرکاری عہدہ موجود بھی ہے!"

"میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اِس طرح جو بوتلیں عدالت بحر میں آتی ہیں کیا ان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے؟"

"نہیں یہ بوتلیں ہوتی تو عموماً کم ہیں، لیکن اُن کے کم و زائد ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اِس لئے کہ محکمہ بہرحال قائم ہے اور دفترِ بحری کی عمارت میں ایک کمرہ اُس کے نگران کار افسر کے لئے مخصوص ہے! اسی دفتر سے ملحق اُس کی سرکاری قیام گاہ بھی واقع ہوئی ہے!"

"لیکن جس نوکری میں کام اِس طرح بمنزلۂ صفر کے ہو اُس کے لئے خزانۂ شاہی کس طرح مستقلاً اک تنخواہ دیتا ہے؟!"

"تنخواہ اُس کی سَو گنی سالانہ ہے!"

"تو اتنی سی حقیر رقم کے لئے تو مجھے تکلیف دینا چاہتا ہے؟!"

"میرا ظرف بھی تو اتنا ہی ہے نا؟!"

"لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ سَو گنی سالانہ کی کیا ہستی ہے؟!"

"حضور کا فی منٹ جو شاہانہ خرچ ہے وہ اِس بندۂ بے درم کا سال بھر کا بافراغت گزارہ ہے! غریبوں کو اپنی زندگی میں یہی تو فائدہ ہے!"

"اچھا تجکو یہ نوکری مل جائے گی!"

"ایک ہفتے کے اندر، لیڈی جوزیانہ کی نوازش و سفارش سے اور لارڈ ڈیوڈ کے اثر و رسوخ کے زور سے بارکلفیڈرو کو اپنی پُرمصیبت زندگی سے مخلصی مل گئی، وہ اپنی فاقہ کشی و بے نوائی سے نجات پا گیا۔ اِس کے قیام و طعام کا سرکاری بندوبست ہو گیا۔ سَو گنی سالانہ کی تنخواہ ملنے لگی۔ اور صیغۂ بحری کے اندر معلومہ عہدے پر اُس کا تقرر ہو گیا!

گر روح میں باب کفر و ایماں مسدود
وہ فہم کی وحشت کہ یہ دانش کا جمود
یہ رنگِ اثر، بہ ایں دماغِ کمزور و علیل
یہ زورِ اثر، بہ ایں تعقلِ ضعیف و محدود

جوشؔ

حسن بھکارن

جس نظم یا مضمون میں آزادی کی خفیف سی جھلک بھی ہیں اس کے ادبی حسن و قبح سے بیگانہ ہو کر اس کی اشاعت پر مجبور ہو جاتا ہوں تو لوگ کچھ ہی کہیں

آسماں سے یہ گرا ہے ٹوٹ کر تارہ کوئی
آتشِ فطرت کا یا چمکا ہے انگارہ کوئی

یا سراپا ہے یہ سورج کی شعاعوں کا ہجوم
یا مجسم ہے محبت کی نگاہوں کا ہجوم

یا تجلی پاشِ عالم چودھویں کا چاند ہے
کہکشاں کی روشنی بھی جس کے آگے ماند ہے

موجزن ہے حسن کے دریا میں طوفانِ شباب
یا اُتر آیا زمیں پر آسماں سے آفتاب

یا فضاؤں پر مسلسل ارتعاشِ نور ہے
یا نظر کے سامنے جنت کی کوئی حور ہے

اک سراپا حسنِ رنگیں اک مجسم رنگ و بو
اک پیامِ کیف دوشیں اک بہارِ روبرو

تھرتھراتی کپکپاتی جا رہی ہے اشکبار
ہے ہجومِ رنج سے اس کی جوانی سوگوار

دم بخود اور نیچی نظریں ہاتھ پھیلائے ہوئے
اپنی خودداری سے دنیا بھر کو ٹھکرائے ہوئے

ہاتھ میں جھولی بدن پر گرد آلودہ لباس
زہر کھانے تک کو اک پیسہ نہیں ہے اس کے پاس

اس کی نظریں کہہ رہی ہیں داستانِ زندگی
آہ یہ بھی ایک دن تھی گلستانِ زندگی

یہ بہارِ زندگی ہے زندگی کی لاج ہے
آج لیکن پیسے پیسے کے لئے محتاج ہے

آبرو اللہ ہی رکھیگا دماغِ حسن کی
تھرتھراتی ہے فضا میں لو چراغِ حسن کی

آہ اے ہندوستاں تجھ پر یہ نکبت کا اثر
آہ اے ہندوستان تجھ پر یہ ذلت کا اثر

آہ تیری صنفِ نازک اور یہ رسوائیاں
اُف تری محکومیاں۔ اللہ رے ناداریاں

جس کو ہونا چاہئے تھا، انتخابِ زندگی
اُف لٹاتی پھر رہی ہے وہ شبابِ زندگی

جس کو ہونا چاہئے تھا، نازشِ رنگِ حیات
آہ وہ تسلیم کی جاتی ہے ننگِ کائنات

جس کو ہونا چاہئے تھا، نو بہارِ زندگی
زندگی ہے آج اُس کی خارزارِ زندگی

جس کو ہونا چاہئے تھا، اہلِ عالم کا سکوں
آہ اس کو ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا سکوں

جس کو ہونا چاہئے تھا، بزمِ ہستی کا چراغ
اُف ہجومِ یاس سے تاریک ہے اس کا دماغ

آہ اس کی ہر صدا ہے اک پیامِ انقلاب
چپکے چپکے ہو رہا ہے اہتمامِ انقلاب

رفیع احمد صبا متھراوی

ایک شکاری دوست سے

اے انیسِ دشت، اے میرے بہادر ہم معاش!
شیرنی اور پھر دو نالی سے گرادی زندہ باش!

لیکن اس منظر سے میرا دل ہوا جاتا ہے شق
اس جواں مرگی سے اس کی ہے مجھے بے حد قلق

اس کا یہ نازک شکم، یہ زرد مخمل کا گلو،
آہ یہ چھکڑے کے پہیوں پر جوانی کا لہو،

اس کا نر فرقت میں اس کی باؤلا ہو جائے گا
حال بچوں کا نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گا

بھیڑیا ہو، ریچھ ہو، چیتا ہو، یا خونخوار شیر،
جنگلوں تک سورما ہیں نیستانوں تک دلیر،

یہ کبھی آبادیوں میں آکے غراتے نہیں!!
یہ کسانوں اور مزدوروں کا حق کھاتے نہیں!

دیکھ کس رفتار سے چلتی ہے نبضِ روزگار!
اب ضرورت ہے کہ کھیلا جائے شہروں میں شکار

ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں نہیں واقف ہے تو!
چوس لیتے ہیں جو مزدوروں کی شہ رگ کا لہو

ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں جو از کیدِ ریا!!
گھونٹ دیتے ہیں عدالت میں صداقت کا گلا!

ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں بشکلِ راہبر
دن دہاڑے لوٹ لیتے ہیں جو بیواؤں کے گھر

ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو ظالم خرقہ پوش
منبروں پر دندناتے ہیں بصد جوش و خروش

ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو باصد احتشام
کالجوں میں نوجوانوں کو بناتے ہیں غلام!

ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو بن کر سرگروہ
لیڈروں کے بھیس میں پھرتے ہیں باشان و شکوہ

ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو پوشش دیکھ کر
اپنے مفلس ہمنشینوں سے چراتے ہیں نظر

ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو عشرت کے لئے
دام پھیلاتے ہیں بیواؤں کی عصمت کے لئے

ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو زر کے واسطے
باعثِ تکلیف ہیں نوعِ بشر کے واسطے

لاکھ حیواں ہوں اخوت کو یہ کھو سکتے نہیں
شیر چیتے ایسے بے انصاف ہو سکتے نہیں

احسان دانش (کاندھلہ)

زندگی کا استہزا

ل۔ احمد
اکبرآبادی

رام پیاری اندر سے بیمار تھی اور باہر سے تندرست دکھانے پر مجبور، عالمگیر مندے نے اس کی تجارت کو بھی بہت گرا دیا تھا، اور ظاہر ہے کہ مانگ نہ ہوگی تو بھاؤ کم ہو ہی جائے گا۔ اس لئے اس کی آمدنی سے خرچ زیادہ ہوتا رہا اور اندوختہ ختم ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ بیمار پڑ گئی اور علاج معالجے میں زیور بھی ٹھکانے لگ گیا۔

جوانی کے مدہ کو اگر حسن میں شمار نہیں کیا جا سکتا تو رام پیاری حسین تو ویسے بھی نہ تھی، لیکن ان اسباب و حالات نے اس کی جوانی کی دلکشی بھی غارت کر دی۔ غرض بیماری کا گھن اور اس پر مفلسی کا بسولا ——— رام پیاری موت کی تمنا پر مجبور تھی۔

آج اس کی طبیعت بہت خراب تھی، لیکن وہ تیسرے پہر پلنگ سے اٹھی اور گلی میں جو کھڑکی کھلتی تھی وہاں بیٹھ کر کنگھی چوٹی کی ——— بگڑی تقدیر یعنی بری صورت کو بنانا چاہا۔ آج کل کا جوبن سنگھار اس کام میں بڑی مدد کرتا ہے۔ جیسے شام چلے دو آدمی وارد ہوئے۔ رام پیاری آنکھیں بند کئے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی ——— یا کہئے کہ بے خیالی میں۔

"بھلا سونے کا یہ کونسا وقت ہے؟" ایک بولا

"عورت ہے کہ کوئی زنخا!" دوسرے نے کہا

رام پیاری نے اٹھ کر بیٹھ جانا چاہا لیکن کمزوری نے اجازت نہ دی۔ "میں سو نہیں رہی تھی" وہ بولی۔ لیکن ارادے کے باوجود مسکرا نہ سکی۔

"عجیب بے ڈھنگی عورت ہے، سلام و لام کچھ بھی نہیں!" ایک نے کہا

"اس سے تو بھڑوے زیادہ تمیز دار ہوتے ہیں۔" دوسرے نے اضافہ کیا

ان فقروں کو سن کر رام پیاری کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اسے سخت غصہ آیا۔ پھر شاید مجبوری کے احساس سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں کیونکہ یہ اس قسم کی توہین ہے جس کی کوئی قیمت بھی نہیں دی جاتی۔ اور ہر عیاش آدمی ایسی توہین کرنے کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ رام پیاری چاہتی تھی کہ بیماری کا حیلہ کر کے ان کو ٹال دے۔ لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے اور بیماری کا تو نام لینا بھی جوکھوں سے خالی نہ تھا۔ بالآخر اس نے اپنے دل کا خون کیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آئیے، بیٹھئے" اس نے ایک افسردہ تبسم کیساتھ کہا

"بیٹھئے آپ کو ہماری قسم"

"چلو جی، چھوڑو اس گھوڑی کو۔" ایک نے کہا

ان کے چلے جانے کے بعد رام پیاری کپڑے پھاڑ ڈالنا چاہتی تھی۔ مقدر کہئے یا سماجی قانون، آپ اسے جس نام سے چاہیں یاد کریں لیکن رام پیاری اس وقت ان مظالم کا شدید احساس کر رہی تھی۔ پہلے تو اسے کمرو بنایا اور پھر ایسے پیشے پر مجبور کی گئی جس میں صورت پہلے دیکھی جاتی ہے اور اب اسے مٹی کا ڈھیر نادر کر کے منہ پر توہین کی جاتی ہے۔ وہ شدت گریہ سے

محسوس کر رہی تھی کہ ایک آدمی بیمار ہے، اسے طبیعت پر قابو نہیں لیکن محض اس اعتبار پر کہ وہ خریدی جا سکتی ہے، چاہا جاتا ہے۔ کہ وہ ویسی نظر آئے جیسی کہ خریدار کی پسند ہے، وہ ویسا برتاؤ کرے جیسا کہ خریدار کو پسند ہے، وہ جان سے بیزار ہو تو ہوا کرے، خریدار کو اس کی کیا پرواہ، پیسے لیکر جو آتا ہے وہ اسے انسان ہی کب سمجھتا ہے۔ چونکہ وہ کسبی ہے اس لئے اگر اس ضابطے کے مطابق خریدار کی آؤ بھگت نہ کرے گی جو خریداروں نے ہی بنا دیا ہے تو اُسے اس کی اہانت کا پورا حق حاصل ہے —— اور ایک آبرو باختہ کی اہانت کا مفہوم ہی کیا!

صدمے کے احساس نے رام پیاری کو تھوڑا سا فلسفی بنا دیا تھا اُس نے اپنی زندگی پر نظر ڈالی اور اسے تکلیف دہ احساس ہوا کہ اگر اس کی شادی ایک بوڑھے سے نہ کرائی جاتی تو وہ پڑوسی جوان کا شکار نہ ہوتی۔ اگر وہ جوان اُسے بھگا نہ لے جاتا اور پھر نکال نہ لیتا تو وہ پیشہ کرنے پر مجبور نہ ہوتی۔ اگر ایک بیمار آدمی اسے نہ ملتا تو وہ بیمار نہ ہوتی۔ اگر وہ بیمار نہ ہوتی تو اسے یہ باتیں نہ سننا پڑتیں۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ اس شخص کی بیوی اگر ویسی ہی حالت میں ہوتی جس میں رام پیاری تھی، تب بھی وہ شخص اپنی بیوی سے وہ باتیں نہ کہتا حالانکہ وہ بھی اُسی کی طرح ایک عورت ہے۔ اور اگر بیویاں عزت کی مستحق ہیں تو کسبیاں محنت کی سزاوار کیوں سمجھی جائیں؟ دونوں ایک ہی سی خدمت انجام دیتی ہیں۔ بیوی کی ذمہ داریاں بیشک کچھ زیادہ ہیں لیکن کیا ایک شخص دو خدمتوں پر مامور نہیں ہوتا؟ رام پیاری کو اس خیال سے جنت تکلیف پہنچی کہ بیوی قابل احترام ہے اور کسبی مستحق ملامت۔ کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ بیویوں کو محترم بنانے میں خود کسبیوں کی کوشش کو بھی دخل ہے۔ اگر کسبیاں معدوم ہو جائیں تو محترم بیویوں کی پاکدامنی شبہے میں پڑ جاتی ہے۔ رام پیاری اس نتیجے پر پہنچی کہ سماج جس شے کو عورت کی عفت و عصمت کہتی ہے وہ دراصل کسبی کی قربانی کی بدولت ہے!

اسی سوچ اور صدمے کی حالت میں رام پیاری سو گئی اور سوتے میں خواب دیکھنے لگی اس نے چمکتے اور کھنکتے ہوئے روپیوں کے انبار دیکھے روپئے کی یہ خوفناک چمک اور کھنک ناقابل بیان تھی۔ وہ دولت کے خواب دیکھ رہی تھی —— دولت جو نفس انسانی کی غلاظت ہے جو روح انسانی کو کچل دیتی ہے، جو قلب انسانی کا گلا گھونٹ دیتی ہے! وہ دولت جو کائنات کی ہر شئے کو اپنے معیار پر لے آتی ہے یعنی ہر شئے کا وزن کرتی اور اس کی قیمت لگاتی ہے —— حتیٰ کہ عفت اور عشق کی بھی! وہ دولت جو ہر چیز کو متحرک کر دیتی اور پھر اسے ذبح کر ڈالتی ہے۔ یعنی جو ایک ہی وقت میں حیات بھی ہے اور موت بھی! خوفناک معمہ —— دولت اس اندر سے بیمار اور باہر سے تندرست سونے والی سے

اسی دولت کا طلسم کھول جا رہا تھا سونے کے کناروں کے درمیان گرم خون کی ندی بہ رہی ہے۔ یہ ندی مزدوروں اور کسانوں —— غریب انسانوں کے مشقت سے کھولتے ہوئے خون سے بھری گئی ہے۔ یہ بہتا ہوا خون دفعتاً سونا بن جاتا ہے۔ خود رام پیاری کی عصمت بھی سونے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہر چیز سونا بن جاتی ہے یہاں تک کہ شاعر کی تخئیل جس وقت مصروف پرواز تھی، اچانک اس کے پر پرواز بھی سونے کے ہو جاتے ہیں، اور وہ سونے کے بوجھ سے گر کر زمین کی کثافتوں سے ملوث ہو جاتی ہے! ہر طرف سونا ہی سونا ہے وہ کہرباجو خود کھنچنا نہیں جانتا! اور گدا سے لیکر شاہ اس زندہ و غالب کل معبود کی پرستش کر رہا ہے!

رام پیاری نیند میں کروٹ لیتی ہے۔ گلی کی لالٹین کی روشنی میں اس کا بے حسن اور بے کشش چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ اس وقت وہ گم کردہ منزل زندگی کا ایک مظہر تھی! آہ عورت —— غریب عورت!

گھنٹہ گھر کی بھاری بھرکم آواز نے ایک بجایا اور اس کی گونج شہر کی خموشی اور پرسکون فضا میں غائب ہو گئی۔ یعنی ایک اور گھنٹا اس فنا میں جا ملا جس کا ذکر اب ماضی کے نام سے تاریخ کی کتابوں ہی میں ہوگا۔ یہ گھنٹا شہر بمبئی کا تھا۔ جہاں ایک ہی شہر میں بیسیوں بادشاہ سماتے ہوئے ہیں: یہ تنبو والا بادشاہ ہے تو یہ چھاتے والا بادشاہ! اور یہ ماچس والا بادشاہ ہے تو یہ روئی والا بادشاہ! مگر اتنے بادشاہوں کی راجدھانی بمبئی اور اس کے اتنے پوٹے، اتنے بچے اتنی عورتیں بیماریوں میں پڑے پاؤں رگڑ رہے ہیں، اور بھوک سے جانیں دے دیں! ان بادشاہوں کی دولت بڑی سڑا رہی ہے اور شہر میں فاقہ ڈوبا کا راج ہو! جی ہاں وہی شہر سیم و طلا بمبئی! اسی شہر محلات میں رام پیاری ایک تاریک کوٹھری میں خواب دیکھ رہی ہے۔

سازوں کی دل آویز موسیقی سے فضا گونج رہی ہے۔ بجلی کی تیز اور شفاف کرنیں ہال کو بقعۂ نور بنا رہی ہیں۔ ایوان لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ صدر میں ایک پُر تکلف اور دولت زبان مسند پر ایک نواب زادہ متمکن ہے۔ روشنیوں کی تجلی کے ساتھ نازک رنگوں کی نیرنگی اس طرح ہم نوا ہے کہ اس کی ہم آہنگی بجائے خود ایک غیر محسوس علوی نغمہ محسوس ہو رہی ہے۔ نشاط و طرب کے اس دربار میں جتنی عورتیں ہیں، سب پری جمال اور اپسرا روپ ہیں: گلاب سے چہرے، نرم نگاہیں، گدرائے ہوئے بدن اور لچیلے جوڑ بند! یوں کہیے کہ انسانی چمن کے شاداب و شگفتہ پھول ہیں!

رقص ہونے لگتا ہے۔ ناچ کا ایک شاندار سماں ہے۔ جس میں سے وہ بلاس اُبلا پڑتا ہے۔ ناچ کی پیچ و خم حرکتیں لوگوں کی رگوں کے اندر خون کی روانی میں طوفان پیدا کر رہی ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ اندر کا اکھاڑا زمین پر اُتر آیا ہے یا کرشن کی گوپیوں نے پھر ایک دفعہ برج کو آباد کیا ہے۔ ناچ کیا ہے شاعر کے سندر سپنوں نے روپ دھار لیا ہے! اس کی گتیں اور توڑے نسیم کا اٹھلا کر چلنا ہے۔ دریا میں بھنور کا پڑنا ہے!

ایسے دلوں کے لئے جن کی منھ بند کلی کو جذبات کی ہوا نے چھیڑا نہیں ہے، اس ناچ کا بھاؤ نرت پانی کا وہ ریلا ہے جو دیواروں کو ڈھا دیتا ہے۔ جس طرح چنگیز نے شہر نشاط بغداد کی دیواریں ڈھا کر اپنے وحشی گلوں کے لئے راستے کھول دئے تھے۔ اسی طرح یہ رقص طلسم بند دلوں کے لئے روح سحر ہے ـــــــ یہ ایک ایسی طلسم کشائی ہے جو حیات آفرین ہے۔ جو اکسیر حیات ہے!

ناچنے والیوں کے جھرمٹ میں سے نکل کر ایک شہزادی آگے بڑھتی ہے۔ یہ شہزادی خود رام پیاری ہے۔ وہ ان سب میں زیادہ حسین ہے، زیادہ جوان اور چنچل ہے ـــــــ ایسی جوان اور چنچل کہ اس کی اڑتی ہوئی مسکراہٹ پر ہونٹوں کی ایک ہلکی سی کپکپاہٹ پر سیکڑوں مرد بھینٹ چڑھائے جا سکتے ہیں۔ ساتھ والیاں ناچنا بند کر دیتی ہیں اور صرف رام پیاری نواب زادے کی مسند کے سامنے کر دہ ناچنے لگتی ہے۔

سونے والی رام پیاری کے مرجھائے ہونٹوں پر ایک منوہر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کے اس مسکرانے میں سکون تھا اور اطمینان کی مسرت ـــــ اس میں ایسی پُر خلوص محبت تھی جسے ایک بار جان لینے کے لئے سو مرتبہ مرنے کی تکلیف اٹھائی جا سکتی ہے۔ جلنا پوری قیمت نہیں ہو سکتا۔

خواب دیکھنے والی کو سوتے میں ایک پھریری آئی۔ اس کا خواب جاری تھا:۔

وہ ناچ رہی ہے۔ ناچتے ناچتے نواب زادے کی مسند کے پاس آتی اور پھر رم جاتی ہے۔ اس کی نگاہیں نواب زادے کی پُر شباب صورت پر جمی رہتی ہیں: وہ اس کا شہزادہ گلفام ہے! اب اس کے اور نواب زادے کے درمیان ایک رشتہ قایم ہو گیا ہے۔ دونوں کے اختلاط کا وہ نازک رشتہ جو محسوس نہیں ہوتا مگر جس کی گرہ تانت کی گرہ ہے! ایک مرتبہ وہ ناچتی ہوئی آتی اور نواب زادے کے سامنے سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے: کولوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیتی اور سازوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہلورین لینے لگتی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی مگر ناچ رہی ہے۔ اس کے حسن اور جوانی کی موجیں نواب زادے کے دل و جان کو رقصاں کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس وقت کے سماں سے اس کا چہرہ دمک اٹھا ہے۔ آنکھوں سے نگاہیں نہیں نکلتی بلکہ کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ وہ اس وقت شکھ بلاس کی دیوی بنی ہوئی ہے!

وہ اچانک جھکتی ہے۔ ایسی بیتابی کے ساتھ جھکتی ہے جیسے کوئی اضطراری حالت میں اپنے محبوب کا بوسہ لینے کو جھک جاتا ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں اس طرح پیچھے ہٹتی ہے گویا وہ اپنے عاشق کی گود سے نکل بھاگنا چاہتی ہے۔ وہ سیدھی کھڑی ہو کر فرش کو نرمی کے ساتھ ٹھکراتی ہے۔ اُس کے پاؤں کے گھنگرو دلوں کے ساز بجانے لگتے ہیں۔ اس کی ہنس کی سفید گردن میں ویسا ہی خم پیدا ہے۔ اس کے ناچ کا اثر ہے کہ تماشائی بیٹھے بیٹھے محسوس کر رہے ہیں کہ کسی پرستانی کنج میں شہزادہ گلفام سو رہا ہے اور چاند اپنی کرنیں اس پر نچھاور کر رہا ہے۔ عین اسی حالت میں سبز پری گھنگرو بجاتی ہوئی اترتی ہے اور شہزادہ بیدار ہو کر اس کے ساتھ رقص کرنے لگتا ہے ـــــــ ان کا یہ رقص محبت کی کیفیتوں کا

رقص ہے جس کی حرکت سکون ایک خموش موسیقی ہے!

رقص موقوف ہوتا ہے تو تماشائی پھر محویت سے نکل کر اسی بے حس و کم کی دنیا میں آجاتے ہیں۔ اب گلفام ایک مرد اور رام پیاری ایک عورت بن کر باہم گر محبت کرتے نظر آتے ہیں۔ رام پیاری گویا بہار کی ایک سہانی رات میں برسات کا سہانا خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ محسوس کر رہی ہے کہ اس کے محبوب کو احساس ہے کہ ساری دنیا کی محبت اور اس کے تمام پہلو رام پیاری کی ذات میں مجسم ہو گئے ہیں! یہ احساس رام پیاری کو ایک استہزا میں تبدیل کر جاتا ہے۔ یہ دونوں میٹھی اور نرم باتیں کرتے ہیں اور ان کی آوازیں مل کر ایک ایسی موسیقی بن جاتی ہے جسے شیریں خوابوں سے مشابہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ محبت ایک سہانا نغمہ ہے۔ ایک سہانا گیت ہے۔ نقرئی گھنٹیوں کی بجنے کی نرم آواز ہے۔ —— نسیم سحر کا اختلاط آمیز خرام ہے!

خواب کا منظر بدل جاتا ہے: مجلس اور ایوان، شہر اور ساری دنیا پتھر اور دھات کی ہے، آسمان و زمین لوہے کے ہیں، خدا بھی فولاد کا ہے! نہیں خدا ہی نہیں! اگر کچھ ہے تو روپیہ یا بھوک اور دھتکار! رام پیاری بیدار ہو گئی تھی۔ وہ بہت بھوکی تھی، بہت نحیف تھی —— اس کا جی ڈوبنے لگا۔

حالت جب یہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس قسم کا خواب برداشت نہیں ہو سکتا یا یوں سمجھ لیجئے کہ اسے مرض کا گھن کھا چکا تھا۔ صدمہ دفعتاً ہنسے رام پیاری کی آنکھیں مُند گئیں اور پھر نہ کھل سکیں۔

سو مظلوم ہستی آرام سے سو۔ اب دولت کی طاقت مفلوج ہے کیونکہ اب وہ نہ تو تجھے راحت پہنچا سکتی ہے اور نہ تکلیف! اب سماج کی قوت سلب ہے کیونکہ اب وہ نہ تیری توہین کر سکتی ہے اور نہ تجھے خرید سکتی ہے۔ سو اور ہمیشہ کے لئے سو!

مردہ رام پیاری کے چہرے سے فسردگی مفقود تھی اور سکون چھایا ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک ایسی خفی مسکراہٹ کا انداز تھا جو دولت اور سماج پر استہزا کرتا محسوس ہوتا تھا۔

بہارِ آزادی

لہرا کے صبا پھر آئی ہے پیغام مسرت لائی ہے
پھر روح پہ مستی چھائی ہے پھر زیست پہ ہستی چھائی ہے
رگ رگ میں تڑپ ہے کیا کہئے! بدمست چمک ہے کیا کہئے!
رَو دوڑ رہی ہے بجلی کی لیتا ہے کوئی یوں چسکی سی
فطرت ہے کہ بہکی جاتی ہے ہستی ہے کہ بہکی جاتی ہے
ہر چیز پہ طاری ہے مستی ہر ذرہ میں ساری ہے مستی
اک جوش سراپا ہے فطرت مدہوش سراپا ہے فطرت
سبزہ کا لہکنا کیا کہئے! پھولوں کا مہکنا کیا کہئے!
اللہ مری دنیائے وطن! ہر ذرہ ہے رشک صد گلشن!
یہ حال ہے اس محرومی پر یہ رنگ ہے اس محکومی پر
کیا ہوگی بہار آزادی؟

مشتاق احمد شارق

ہندوستانی عورتیں

سیّد رضا قاسم مختار

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

بلادِ اسلامیہ کی خواتین سے ہمارے ملک کی مسلمان عورتوں کا تقابل کیا جائے تو رات اور دن کا فرق نظر آئے گا۔ ہماری عورتیں چار دیواری کے اندر گولر کے کیڑوں کی طرح قید رہ کر اسی کو ساری دنیا تصور کرتی ہیں۔ ہر شریف کا گھر گویا ان کی عورتوں کا قید خانہ ہے، جہاں اُن کو بے رحم مردوں سے کام پڑتا ہے۔ اور جب تک اسلامی ممالک کی تہذیب جو درحقیقت اسلامی تہذیب کا چربہ ہے ان میں نہ پھیلے گی اُن کی یہی حالت رہے گی۔

ہندوستانی مسلمان زیادہ تر اپنی عورتوں کے حق میں ظالم ثابت ہوئے ہیں۔ وہ یہ سمجھکر کہ اُن کی عورتیں نہ کہیں جا سکتی ہیں، نہ کسی سے اپنا درد دکھ کہہ سکتی ہیں اور نہ معاملات وغیرہ سمجھ سکتی ہیں۔ اُن کے حقوق غصب کرکے ان کی کمزوریوں سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھانے کو تیار رہتے ہیں اور اکثر خاندانوں میں تو ان کو اُن کے جائز ترکوں سے بھی محروم رکھ کر زبردست طور پر اُن کی حق تلفی کی جاتی ہے۔ وہ کسی کام میں اپنی عورتوں سے مشورہ نہیں لیتے۔ اس میں شک نہیں کہ اب وہ کسی مشورہ کے قابل بھی نہیں رہیں، کیونکہ ان کو ایسی تعلیم ہی نہیں دی جاتی کہ وہ مشیر کار بن سکیں۔ ان سے اگر کبھی مشورہ بھی لیا جاتا ہے تو صرف اُنھیں جاہلانہ رسوم کے نفاذ میں جو ہماری کمزوریوں کی بنیاد ہیں۔

طلاق اور عقدِ ثانی کی رسمیں ہمارے ملک میں رائج نہیں ہیں۔ لیکن ان رسوم کا دستور اسلام نے جن عیوب کے مٹانے کے لئے قائم کیا تھا وہ اب اس ملک میں کم و بیش گھر گھر پائے جاتے ہیں۔ طلاق نہیں دی جاتی کیونکہ یہ شرافت کے منافی ہے۔ مگر بے لطفی رہی تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ رہا عقدِ ثانی کا مسئلہ سو وہ تو بدترین عیوب کے مترادف ہے۔ یوں گھر میں چاہے کتنی ہی ناگفتہ بہ بدعنوانیاں کیوں نہ رونما ہوں اور انتہا درجے کے کریہہ عیوب کا عمل درآمد ہوتا ہو۔ مگر متذکرہ بالا دونوں حرکات یعنی طلاق اور عقدِ ثانی کا مرتکب ہونا ہی اصل شرافت کے اسناد سمجھے جاتے ہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ جن باتوں پر اسلام نے زور دیا ہے وہی مسلمانانِ ہند نے چھوڑ دی ہیں اور جن باتوں سے منع کیا ہے وہی اختیار کرلی ہیں اور ہماری معاشرت میں اس قدر مغائرت پیدا ہوگئی ہے کہ ؎

گر سلف دیکھیں ہمارے زندہ ہوکر اب ہمیں
آئے نسبت اور قرابت سے ہماری ان کو عار

نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہماری عورتوں کے صرف شوہر ہی بے رحم نہیں ہوتے محض اُن کے بچے ہی اُن کی تعظیم میں کوتاہی نہیں کرتے بلکہ ان کے باپ بھائی وغیرہ بھی ان کے حقوق کی نگہداشت میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں اور ہمیشہ دندانِ طمع تیز رکھتے ہیں۔ مالی، ملکی، اعزازی غرض اُن کے کل حقوق غصب کئے جاتے ہیں۔ نتیجتہً معاشرت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور برائیاں محض عورتوں ہی تک محدود نہیں رہتیں۔ مائیں جب لونڈیوں سے بدتر حالت میں چوپایوں کی طرح گھر میں رہتی ہیں تو فطرتاً ان کی اولاد بھی وہی کمزور خیالات ان سے ورثہ میں پاتی ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے اس امر کا پتہ ملتا ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں زیادہ تر اپنی ماؤں ہی کی قابلیت کی وجہ سے آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکے۔ علاوہ ازیں یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ گہوارۂ مادر کی تربیت کا اثر آخر عمر تک باقی رہتا ہے۔ نیز تعلیم کے اثر پر غالب رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ حضرات کے علم میں وہ رونق نہیں ہوتی جو دوسرے ملک کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

ایرانی، عراقی اور شامی عورتیں ہماری عورتوں سے بدرجہا اچھی حالت میں ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پا رہی ہیں۔ دنیا کا ہر علم سیکھتی ہیں۔ ان کے معلومات کا دائرہ مردوں کے برابر وسیع ہوتا ہے، وہ اپنی سلیقہ شعاری کی بدولت ہماری عورتوں سے کہیں زیادہ عمدگی اور صفائی سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کی اعلیٰ تعلیم، آزادی اور سیاحت نے انھیں نہایت روشن خیال بنا دیا ہے، وہ سماج میں نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ خود اپنے حقوق سے واقفیت رکھتی ہیں اور ان کے مردوں کو اُن کی حق تلفی کا کبھی کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا۔ گویا ان کی حالت اکابرینِ اسلام کی خواتین سے اشبہ ہے، زمانۂ سابق کی طرح یہ بھی اپنے مردوں کے ہمراہ دور و دراز کا سفر اختیار کرتی ہیں، حضر و سفر میں ساتھ رہتی ہیں، ملکی اصلاحی و معاشرتی امور میں اپنے مردوں کی معاون ہوتی ہیں۔ تاریخ داں حضرات پر ظاہر ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کی یہی حالت تھی۔

یہ روایت جو بیان کی جاتی ہے کہ اسلام عورتوں کو چوکھٹ سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، ہرگز قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ اگر فی الحقیقت اسلام نے یہ حکم دیا ہوتا تو فریضۂ حج مردوں کے دوش بدوش عورتوں پر یکساں کبھی عاید نہ ہوتا۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ نبی اکرم صلعم تو جنگ کے مواقع پر بھی اکثر اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کو اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔ اسلام نے یقینی پردے کا حکم دیا ہے مگر اس کا مفہوم ہرگز وہ نہیں ہے جس پر مسلمانانِ ہند کاربند ہیں۔ ہمارے پردے کی نوعیت قطعی جداگانہ ہے جو مجموعی حیثیت سے اسلام کے احکام کی مطابقت تو درکنار بلکہ صریح طور پر بانیانِ اسلام کی سیرت کے خلاف ہے۔ آیت پردہ سے کل نامحرموں کے سامنے بے تکلفانہ آمد و رفت کا نہایت سختی سے انسداد کیا گیا ہے۔ اس کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہماری عورتیں بیکار محض بن کر گھر کے اندر چچازاد، خالہ زاد وغیرہ بھائیوں اور دیگر ایسے غیر محرم اعزا سے جلیس رہ کر جن سے اسلام نے عقدِ مناکحت جائز قرار دیا ہے یعنی گفتگو کیا کریں۔ ہماری موجودہ معاشرت میں ہماری عورتوں کا یہ رویہ پسندیدہ طور پر رائج ہونے کے باوجود شرعی و نیز اخلاقی نقطۂ نظر سے ہرگز مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ اس قسم کا طرزِ عمل اکثر و بیشتر نفسانی جذبات کی برانگیختگی کا محرک ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اس میں شک نہیں کہ ہماری موجودہ معاشرت بخیال تحفظ عصمت و عفت عورتوں کو چوکھٹ سے باہر کہیں نقل و حرکت کی اجازت نہیں دیتی اور محض اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے اتفاقاً اگر ان کو کہیں آنا جانا بھی پڑتا ہے تو ڈولی محافہ وغیرہ کے ذریعے سے پردے کا زبردست اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں کسی انسانی نگاہ کا تو کیا ذکر ہوا کی آمد تک کا انسداد نہایت استحکام کے ساتھ کیا جاتا ہے، مگر اپنی چار دیواری کے اندر بہت سے ایسے افراد سے جن کو مذہب نے نامحرم قرار دے رکھا ہے اور جن سے پردے کا قطعی حکم دیا ہے کسی قسم کا پردہ تو کجا حجاب تک نہیں کیا جاتا۔ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہماری عورتوں کا موجودہ پردہ بالکل ویسا ہی ہے جس طرح بے وضو کی نماز یا نجاست کی حالت میں روزہ۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حامیانِ پردہ اس کے استحکام و بقا کے لئے دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ فصیح و بلیغ مقالے لکھتے ہیں۔ مگر اب تک کسی نے متذکرۂ بالا وبائی رواج کے انسداد کی کوشش نہ کی جو شریعت کے سراسر خلاف ہونے کے باوجود ہر شریف گھر میں پسندیدہ معاشرت متصور ہوتی ہے ؏

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری عورتوں کے موجودہ پردے کی خوبی اور بہتری کی نسبت جو یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ "صرف یہی ایک ذریعہ ہے جو انھیں افعالِ شنیعہ و اعمالِ قبیحہ کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے" کہاں تک قابلِ اعتبار ہے، جبکہ تجربے سے اچھی طرح ثابت ہے کہ گھر کے اندر مقید رہنے کے باوجود جرائم شرعی و اخلاقی کا ارتکاب ہوتا ہے اور ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلا جاتا ہے۔

اس بحث سے ہمارا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ رسم پردہ بالکل اٹھا دیا جائے

اور ہم اپنی عورتوں کو مغربی روشنی کے زیر اثر ہر قسم کی آزادی دیدیں۔ البتہ تنی آزادی ضرور دیدیں جتنی شرع نے روا رکھی ہے اور پیغمبر اسلام نے جس قدر اپنی عورتوں کو دے رکھی تھی۔ ہماری موجودہ معاشرت میں یقیناً اصلاحات کی ضرورت ہے اور شرعی احکام کا لحاظ رکھتے ہوئے مروجہ پردے میں ترمیم نہایت ضروری واجبی ہے۔

اسلام نے عورتوں کے حقوق کی جتنی حفاظت کی ہے اس کی نظیر کسی اور مذہب میں کم ملے گی۔ لیکن ہمارے ملک میں اُن کے جملہ حقوق صرف کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہیں، اور عملی زندگی میں شاید ہی کسی دوسرے ملک کی مسلمان عورت ایسی مظلومی اور بے کسی کی زندگی بسر کرتی ہوگی جیسی کہ ہماری عورتیں۔ یہ درست ہے کہ ہر ملک کے ماحول کا اقتضاء مختلف ہوا کرتا ہے، لیکن اسلام کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ اس کے قوانین و اصول ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے موزوں ہوتے ہیں اور یہی اس کی عالمگیر شہرت و دوامی اثر کا باعث ہے، ہرگز کسی شخص کو اس کے احکام و قوانین میں رد و بدل کرنے کا مجاز نہیں، اس لئے اسلام کی اس اٹل خصوصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی مسلمان ہندوستان کے موجودہ پردے کے متعلق یہ دلیل پیش نہیں کرسکتا کہ ہمارا موجودہ اصول محض ملکی ماحول کے اقتضاء کا اثر ہے جس کو ہمیں مجبوراً برتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جب اس قسم کے پردے کو روا رکھا جاتا ہے اور شرعی نقطۂ نگاہ سے ہرگز کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تو پھر اُن مسلمانوں پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جو اپنے طرز معاشرت مقتضائے ماحول کے زیر اثر ریش و بروت کی صفائی کو غیر شرعی تسلیم کرتے ہوئے محض رفتارِ زمانہ سے مجبور ہو کر بجا و روا قرار دیتے ہیں۔ یہ مسلہ ہے کہ کلیہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے، کبھی یہ نہیں ہوسکتا کہ مذہباً ایک غیر مذہبی شے کو روا رکھا جائے اور دوسری کو ناروا ؂

یا تو بیگانہ ہی رہیئے ہو جیئے یا آشنا
یہ ادا کیا آشنا کا ہے، کبھی نا آشنا

اسی ضمن میں ہم اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ آج کل اس ملک کے مسلمانوں میں جس قسم کا معاشری پردہ رائج ہے وہ ہرگز واجب نہیں ہے اور یہ کسی حال میں اسلامی نقطۂ نظر سے اس قسم کے پردے کو مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ ہمارے خیال میں تو عورتوں کے حقوق غصب کرنے کا یہ ایک خودساختہ قانون ہے جس کی رُو سے اُن کو پردے کے اندر رکھ کر کبھی چوکھٹ کے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔

تجربہ سے ثابت ہے کہ مہذب قوموں میں ہمیشہ عورتوں کی عزت کی گئی ہے اور عزت کے ساتھ اُن کی آزادی اور بہبودی کا ہمیشہ خیال کیا گیا ہے، اور گری ہوئی قوم کی عورتیں ہمیشہ گری ہوئی حالت میں رکھی جاتی ہیں۔ اس بنا پر یقینی ہمارا موجودہ رویہ ہماری قومی نکبت کا سبب ہے اور جب تک اپنی موجودہ طرزِ معاشرت کو ہم مایۂ ناز سمجھتے رہیں گے اُس وقت تک ہماری حالت سنبھل نہیں سکتی۔

مزید برآں اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرسکتا ہے کہ ہر قوم کی ترقی اس کی عورتوں کی ترقی پر منحصر ہے۔ اسلام نے بھی اسی اصول کو پیش کیا ہے اور شارع اسلام کا اسی پر عمل درآمد تھا۔ چنانچہ عرب میں جب تعلیم پھیلی تو مردوں اور عورتوں میں برابر پھیلی، اگر جہالت رہی تو دونوں میں، علم کا چرچا پھیلا تو دونوں میں۔

ہمارے ملک میں عورتوں کی تعلیم کی مخالفت اب تک قائم ہے، نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہم لوگ بانیٔ اسلام کے افعال و اقوال سے بھی واقفیت نہیں رکھتے، تحصیلِ علم کے متعلق خود ارشاداتِ نبوی ہیں کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ۔ اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ چنانچہ آج کل جس طرح اسلامی ممالک کی عورتیں ذی علم و باسلیقہ ہیں اسی طرح مسلمان بیبیاں پہلے زمانے میں تھیں۔ اسی لئے اس قدر ترقیاں مسلمانوں نے کی تھیں جس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ زمانۂ سابق میں مسلمان عورتیں محدث فقیہہ، شاعر، مدبر اور سبھی کچھ تھیں، سلطنتوں کے انتظام انھوں نے کئے ہیں۔ اور بڑے بڑے کارہائے نمایاں ان کی بدولت انجام پائے ہیں۔ مگر افسوس ہم نے تو اپنی عورتوں کو موم کی گڑیا بنا رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک عالم کو جاہل بیوی سے کیا اُنس ہوسکتا ہے۔ ایک ذی علم شوہر کو کندۂ ناتراش عورت کے ساتھ کوٹھری میں بند کر دینا یقینی طوطی را با زاغے قفس کردن کا مصداق ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ خدائی اور بندے کی بندگی بغیر علم کے دل پر نہیں جمتی۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے ؎

کہ بے علم نہ تواں خدا را شناخت

بعض ممالک اسلامیہ کی خواتین کی نسبت میرا ذاتی علم ہے کیونکہ عرصہ چار پانچ سال کا ہوتا ہے کہ راقم الحروف خود عراق و ایران وغیرہ گیا تھا۔ وہاں کی

عورتیں علاوہ اپنی مادری زبان فارسی وعربی کے ترکی روسی اور فرانسیسی زبانوں سے بالعموم واقفیت رکھتی ہیں۔ اور بعض تو انگریزی بھی جانتی ہیں اگرچہ وہ مصر اور ترکی کی عورتوں سے نسبتاً تعلیم میں پیچھے ہیں۔ تاہم ہماری عورتوں سے بدرجہا سلیقہ مند، ذی شعور اور فرزانہ ہوتی ہیں۔ سوسائٹی میں اُن کی عزت کی جاتی ہے۔ مالی، ملکی، اعزازی، غرض کسی امر میں اُن کے حقوق غصب نہیں کئے جاتے اور وہ کل معاشرتی و اصلاحی امور میں حصہ لیتی ہیں اور ہماری عورتوں سے کہیں اچھے درجے میں ہیں۔ مگر صد حیف ہم نے اپنی عورتوں کو بیکار محض بنا رکھا ہے مزید برآں ہم ان کو کسی شمار و قطار میں نہیں رکھتے، اُن کی ہستی کوئی ہستی نہیں سمجھی جاتی، ان کا وجود کوئی وجود نہیں خیال کیا جاتا۔ افسوس ؎

بحیرتم کہ سرانجام من چہ خواہد بود

نظر بر امور بالا ہم کو اپنی موجودہ طرزِ معاشرت میں اصلاح کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ترقی کی طرف ہم قدم اُٹھا سکیں اور سب سے ضروری اصلاح یہی ہے کہ ہم اپنی عورتوں کی تعلیم میں کوشش بلیغ کریں اور ان کے موجودہ طریق پردہ میں جائز ترمیم کرکے حسب احکام شرعیہ رواج دیں اور ان کو پورے طور پر مذہبی آزادی دے کر ہم ان کے جملہ حقوق کو غصب کرنے سے کلیتاً اجتناب کریں اور اسی میں ہمارے لئے فلاحِ دارین کا راز مضمر ہے۔

ہم کو اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ ہماری بے زبان عورتیں نہایت صابر، حلیم، بچوں کی پرورش میں بے مثل ساعی اور شوہروں کی بے حد فرماں بردار ہوتی ہیں۔ مگر ان خوبیوں کے باوجود جب مردوں کا جابرانہ و ظالمانہ برتاؤ ان کے ساتھ دیکھا جاتا ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اعتدال ہر شے کا اچھا ہے۔ ہماری عورتوں نے ان خوبیوں میں حد سے تجاوز کیا ہے جس کی وجہ سے مردان کو جزوِ ضعیف سمجھکر ہر طرح اُن کے حقوق کو پامال کرنے کی فکر کرتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ مسلمانانِ ہند بیدار ہوں اور اب بھی اپنی آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھائیں، اپنی تنگ نظری کو روشن دماغی سے مبدل کریں اور اسلامی ممالک کے نقش قدم پر چل کر اپنے کو دنیا میں ایک زندہ قوم شمار کرانے کی جد و جہد کریں۔

ممکن ہے میری یہ تحریک بعض قدامت پرست حضرات کی نظروں میں ناگوار اور مکلف ثابت ہو، کیونکہ اگر عورتوں کو اتنی آزادی دے دی جانے کی جتنی کہ خدا نے اُن کے لئے حکم دیا ہے اور اکابر اسلام نے ان پر عمل پیرا ہو کر دکھایا ہے تو ایسی حالت میں مردوں کی حکمرانیوں اور آرام و آسائش میں خلل واقع ہونا لازمی ہے اور شاید وہ اس کو گوارا نہیں کریں گے۔ مگر اسلامی احکام کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں ان کی مخالفت کو حرکت مذبوحی پر محمول کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر انقلاب میں کچھ نہ کچھ نقصان ہونا بدیہی ہے مگر معمولی سے نقصان کو بڑے فائدوں کے حصول کے لئے نظر انداز کرنا ضروری ہے اور یہی دنیا کا اصول رہا ہے۔ ہم اس کلیے سے مستثنیٰ کیونکر ہو سکتے ہیں۔

اسلامی احکام عورتوں کے باب میں کیا ہیں؟ ہم اس کے معلوم کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے اور اگر کسی صورت سے معلوم بھی ہو جاتے ہیں تو ہم ان کے متعلق تاویلات پیش کرکے اپنی ہی خود ساختہ اور لغو معاشرت کا مظاہرہ کرنے اور اس کو بہترین ثابت کرنے کی کوشش میں مصروفِ عمل رہتے ہیں اور جب کبھی کوئی حساس شخص قوم میں بیداری پیدا کرنا چاہتا ہے تو شور و غوغا کے ساتھ مذہب کی مخالفت کا پرانا حیلہ پیش کرکے ہم اپنی بدبختی کا ثبوت پیش کرتے ہیں ؎

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

پھر دل میں میاں خوشی کا راج دیکھا ہے
پھر ذوقِ جنوں تیرا تاج دیکھا ہے
لیکن جب سے [illegible] کے بعد
اپنی کائنات میں سحر آج دیکھا ہے

قدرت کی فیاضیاں

جوش ملیح آبادی

(۱)

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

اُس کا سب سے پہلا احسان تو یہ ہے کہ اُس نے مجھے ایک ایسے نامور و مقتدر خاندان میں پیدا کیا جو مرتبے میں بلند، علم و ادب میں ممتاز، دلیری و سیر چشمی میں یکتا، صورت شکل میں نمایاں، سیرت و کردار میں بے نظیر، وجاہت و اقتدار میں لاثانی اور بذل و سخا میں بیباک و جری تھا۔ جو ہر صاحبِ حاجت کو سلام کرنے میں سبقت کرتا سوال سے پیشتر حاجت روائی کرتا، اور احسان کرنے کے بعد شرما جاتا تھا ٭

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۲)

بہتر ماؤں سے زیادہ شفقت کرنے والے باپ نے میری طفلی کو اُس معصوم بچّۂ آہو کی طرح بنا دیا تھا جو جھومتی ہوئی گھٹاؤں کے لوٹتے ہوئے سائے میں چوکڑیاں بھرتا اور پھولوں سے لدی ہوئی وادیوں میں کلیلیں کرتا پھرتا ہے — جو محبت کے موقع پر مجھے سونے کا نوالہ کھلاتا، اور تربیت کے وقت شیر کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۳)

جب میں جوان ہوا تو اُس نے مجھے ایسی تند و تیز اور گرجتی گونجتی جوانی عطا فرمائی، جس کے سامنے طوفانوں کی سانس اُکھڑ جاتی، اور بپھرے ہوئے عناصر کی نبضیں چھوٹ جاتی تھیں۔

اُس نے میری جوانی کو مناظر کے سپرد کر کے اُن سایہ دار راستوں سے گزارا جو باغوں، چشموں، اور برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی طرف مُڑتے ہیں۔ جہاں کوئلیں کُوکتی، مور ناچتے، ہوائیں گنگناتی، کلیاں چٹکتی، شاخیں جھومتی، نالے شور کرتے ہیں۔ اور جہاں دوشیزگانِ صحرا اپنے غیر محسوس حُسن برشتہ کے نشے سے سرشار ہو کر برسات کی ہواؤں کے ساتھ جھومتی ہوئی چلتیں، اور دُور کی تلخ و شیریں بانسری کی لَے پر اس طرح سر دھنتی تھیں کہ اُنکی زلفیں بار بار سینے پر یوں لہرانے لگتی تھیں جیسے خون میں عنفوانِ شباب کی اُمنگیں، یا کسی دوشیزہ سینے میں ع "کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است" کا مبہم سا سوال —

اسی یکا دوش بدوش اُس نے میرے شباب کو علم و بصیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی خاطر اِس نیلے آسمان، اور اس خاکی زمین پر ایسی درسگاہیں کھول دی تھیں جہاں کتابوں کے عوض طلوع و غروب کے اوراق، اور لالۂ و گل کی تحریریں تھیں ———
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۴)

وہ جن کا جمال فرشتوں کی پیشانیاں، اور حوروں کی آنکھیں جُھکا دیتا تھا، اور جن کے متعلق جواں مرگ عرفیؔ آنحا کہ آہوان حرم را کنند صید" کہہ چکا ہے، جب میرا شباب اُنکی جانب دیکھتا تھا اور اُن کے تیوروں سے مجھے پتا چل جاتا تھا کہ وہ سب " در آرزوئے ناوکِ صید افگن من اند" کے مصداق ہیں، تو دُنیا کے کسی جوان کا سر مجھے اپنے سر سے اونچا نظر نہ آتا تھا۔
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۵)

لیکن کامران محبت کے ساتھ ساتھ اُس نے مجھے انسان بنانے کی خاطر میری حیات معاشقہ میں انتہائی دیدہ دری کے ساتھ ایسے دل میں ترازو ہو جانے والے تیر بھی رکھے تھے، جو سینے کو فگار، اور آنکھوں کو اشکبار کر دیتے ہیں اُن تیروں نے مجھے عشق کی بیچینیوں، اور محبت کے آنسوؤں سے بہرہ مند کر دیا ——— یہ کوئی کم احسان تھا ؟ اِس لئے کہ دردِ دل، اور اشکِ غم کے بغیر محبت ہی نہیں بلکہ خود حیات بھی ایک جسمانی کھیل، اور حیوانی جست و خیز کے سوا اور کوئی معنے نہیں رکھتی۔
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۶)

اِسی کے ساتھ اُس نے مجھے وہ رفیقۂ حیات بخشی جس میں زلیخا کی سی شیفتگی، اور چاند بی بی کا عزم ہے ——— ہرچند وہ تُند خو اور شعلہ مزاج ہے، اور مجھے مقیّد رکھنے میں ایسے ہولناک مبالغے کے ساتھ مصر رہتی ہے کہ میری قوتِ برداشت کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں۔ لیکن اگر وہ ایک ایسا زبردست دھانکا بریک (Brake.) نہ ہوتی تو خُدا جانے میں اپنی زندگی کی مشین کو کس چٹان سے ٹکرا کر کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۷)

سر سے شفیق باپ کا سایہ اُٹھتے ہی، عین اُس آن جبکہ یہ ننھا سا مگر حد سے زیادہ شریر ستارہ جسے دُنیا کہتے ہیں میری ناز و نعم میں پلی ہوئی نوجوانی پر وار کیا ہی چاہتا تھا، کہ یکا یک مجھے ایک دور دراز مقام پر قصرِ شاہی میں پہونچا دیا گیا ——— ہُنر شناس، اور معارف پرور سُلطان کے تاج کی کرنیں میری نوجوانی پر پڑیں، اور چشم زدن میں میری تقدیر کا آسمان جگمگانے لگا ——— عصائے شاہی ہوا میں بلند ہوا، میرے ماحول کی چٹان پر ضرب لگائی ——— اور پتھروں سے میٹھے پانی کے متعدد چشمے پھوٹ نکلے۔
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۸)

میں ایک زمانۂ دراز تک قصرِ سُلطانی میں رہا۔ جہاں اربابِ حاجت کی خدمت میرا محبوب ترین مشغلہ تھا ——— اور جب اُس نامعلوم قوت نے جو اس کارخانۂ عالم کو چلا رہی ہے، یہ دیکھا کہ قصرِ شاہی میں میرا مزید قیام مناسب نہیں رہا ہے تو مجھے دور بہت دُور ایک قطعی مختلف اور سراسر تنگ و تار ماحول میں ہاتوں ہات پہونچا دیا۔ اوّل اوّل تو مجھے

اس تبدیلی سے سخت وحشت ہوئی ــــــ میں گھبرا گیا۔ خوف زدہ ہوگیا۔ کیونکہ میں اُس وقت ع "چندان کہ خدا اغنیٰ ست من محتاجم" کا کامل مصداق تھا ـــ طفلانہ مزاج، اور شاہزادانہ بھنیا نری اگر میرا بازو نہ تھام لیتی تو میں لڑکھڑا کر گر پڑتا، اور گرتے ہی چور چور ہو جاتا ـــــ لیکن اس سے پیشتر کہ تباہی مجھ پہ بھرپور وار کرسکے، اور میں بیٹرپا سوسائٹی کا نوالہ بن جاؤں ایک قطعی غیر متوقع سمت سے ایک " مردِ غیب " رام و لچھمن کے خاندان کا چشم و چراغ، عزیزِ مصر کی طرح نمودار ہوا، اور مجھے غلام بنا کر نہیں، بلکہ آقا و سردار بنا کر اپنے محل میں اُٹھا کر لے گیا۔

مہربان بادشاہ کے دربار سے اخراج کے وقت (خدا بادشاہ کو سلامت رکھے) مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا منجنیق میں بٹھا کر مجھے دہکتی ہوئی آگ میں پھینکا جا رہا ہے۔ لیکن جیسے ہی میں اُس آگ میں گرا، کیا دیکھتا ہوں کہ دہکتی ہوئی آگ مہکتے ہوئے پھولوں اور اُبلتی ہوئی شراب میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۹)

ابھی مجھے اپنے "عزیزِ مصر" کے جوار میں ایک سال ہی گزرا تھا کہ میری حیات کے اُفق پر دُور سے ایک سبز روشنی نمودار ہوئی ـــــ اور میں اُس روشنی کی طرف روانہ ہوگیا ـــ ابھی کچھ دُور ہی گیا ہونگا کہ ایک موڑ پر وہ روشنی غائب ہوگئی، اور ایک بھیانک غار سامنے آگیا ـــــ ایسا ہولناک غار کہ الحفیظ والامان ــــــ لیکن اس درماندگی کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ ایک سانولے رنگ کا دوسرا "مردِ غیب" کرشن جی کی طرح مُرلی بجاتا ہوا سامنے آیا۔ اور خضر کی سی محبت کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں لے آیا، جہاں سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں۔

(۱۰)

میں اُس سبز روشنی کے حلقے میں اپنے خضرِ راہ کے ساتھ ایک مدت تک انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ رہا۔ لیکن کچھ روز کے بعد میرے خضرِ راہ کے چہرے پر وحشت و رمیدگی کے آثار پیدا ہو چلے، اور اُس کے انفاس سے مجھے بے تعلقی کی بُو آنے لگی، میں نے اِن آثار کو وحشت کی نظروں سے دیکھا، اور ابھی کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اِس اثناء میں ایک صبح دیکھتا کیا ہوں کہ میرے خضرِ راہ کا حُجرہ خالی پڑا ہوا ہے اور وہ مجھے تنہا چھوڑ کر بھاگ چکا ہے ــــــ لیکن ابھی میں آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ یکایک ایک جلوس کے باجوں کی آواز سے تمام فضا گونج اُٹھی، اور میں قافلہ سالار کے رفیقوں میں شامل ہو کر اس مقامِ تنگ و تار سے ایک گلستانِ رنگ و بو میں پہونچ گیا۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۱۱)

خود ستائی ایک بُری چیز ہے۔ مگر بولنے کے موقع پر چُپ رہنا اُس سے بھی بُرا ہے، اور بالخصوص اظہارِ شکر کے موقع پر بخشش کرنے والے کے ایک ایک احسان کو کھول کھول کر نہ بیان کرنا صرف بُرا ہی نہیں بلکہ ناشکری، کمظرفی، اور تنگدلی کی علامت ہے ــــــ اس لئے میں قدرت کے اُن احسانوں کو بھی بیان کرونگا جن کا تعلق میری سرشت اور میرے ضمیر سے ہے۔

میں اِس کہنے میں نہ جھجکوں گا کہ میرے پہلو کو دو تاروں کا سا دل ودیعت فرمایا گیا ہے ــــ وہ دل جو ہر جاندار و بے جان کی محبت سے معمور، اور جذبۂ نفرت سے قطعیً بیگانہ ہے وہ دل جو دشمنوں تک پر قربان ہو جانے میں وہ انوکھی مسرت محسوس کرتا ہے، جو انسان کو اُس لمحۂ اول میں محسوس ہوتی ہے

جب کہ اُس کی کسی ہوئی بصارت یکایک عود کر آتی ہے — اسی کے ساتھ ساتھ میرا دل دلیر بھی ہے اور بیباک بھی — جس پر دولت کا طنطنہ، سوسائٹی کا اقتدار، اور شاہوں کا دبدبہ ذرہ برابر بھی اثر نہیں کرتا — وہ دل جو بنی نوع انسانی کی الم ناکیوں پر ہر آن دھڑکتا رہتا اور وطن کی درماندگیوں پر خون کی بوندیں ٹپکاتا رہتا ہے۔

اِس کے علاوہ مجھے وہ زندہ دلی اور وہ خاطرِ مجموع عطا فرمائی گئی ہے جو ہر تلخی کو شیریں بنا دیتی ہے، ہر مصیبت کے ساتھ مسخرگی کرتی ہے، اور ہر بلائے آسمانی کی کلائی موڑ کر رکھ دیتی ہے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

(۱۲)

آخر میں اپنے جوہرِ ذاتی کا ذکر کرونگا — جس کا سلسلۂ نسب، نبوت و رسالت سے جا کر مل جاتا ہے — وہ جوہر، جس کا ہر جُزو، ارض و سما پر بھاری ہے — اور جو خاک میں اُلوہیت پیدا کر دیتا ہے۔

یہ وہ جوہر ہے جو انسان کو وہاں پہونچا دیتا ہے جہاں اسماء و اشکال کے چہروں کی نقابیں اُٹھی ہوئی ہوتی ہیں، جہاں خیر ہے، نہ شر، پستی ہے، نہ بلندی، موت ہے، نہ حیات، روح ہے نہ مادہ، اہرمن ہے، نہ یزدان، اور جہاں بندہ ہے نہ خدا —

یہ کیسا اُلوہی استغنا ہے جو میرے سینے میں سانس لیتا رہتا ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارض و سما کے تمام خزانے میری ٹھوکروں کی زد پر ہیں۔ اور یہ سارا نظامِ شمسی میرے پاؤں چوم رہا ہے۔

ہاں سچ ہے کہ وہ چاندی سونے اور تانبے کے سکے جن پر ان زمین کے کمزور بادشاہوں کی تصویریں کندہ ہوتی ہیں، میرے پاس نہیں ہیں، لیکن کون یقین مانے گا کہ یہ مردِ مفلس اگر اپنی جیب کو جھاڑ دے تو روئے زمین پر زر و گوہر اور شمس و قمر کا مینہ برسنے لگے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کیا بخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

وہ کفر کی تکرار سے تھک جاتا ہے
یہ دین پہ اصرار سے تھک جاتا ہے
سر عرش ہے انکار پہ ٹیکا ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار سے تھک جاتا ہے

جوش

عدالت !

از کوثر چاندپوری

(۱)

پورن بقال اپنی خوبصورت، حسین اور نازآفریں بیوی کے ساتھ سکون واطمینان، اور راحت ومسرت سے آگرے میں رہا کرتا تھا، اس کا کچا مکان جسکی دیواریں قدآدم سے زیادہ بلند نہ تھیں پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا مکان کے بیرونی حصے میں پورن آٹا دال فروخت کیا کرتا تھا، اگرچہ بظاہر غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن نہایت غیور، خوددار اور ذی حمیت انسان تھا؛ اسکی بیوی سرستی حسن و جمال، رعنائی ودلفریبی کے باوجود عصمت مآب اور عفت شعار عورت تھی، پورن اور سرستی میں شروع ہی سے کافی محبت تھی، اور انکی حیاتِ ازدواجی اپنی تمام مذہبی خصوصیات کے ساتھ عشق وخلوص اور شیفتگی ودلدادگی کی آئینہ دار تھی، نفاق اور کدورت، بغض وعداوت کے زنگ سے انکے دلوں کے آئینے بالکل صاف تھے، خانۂ عشق، حسن کی نورانی توجہات سے جگمگا رہا تھا اور ایوانِ حسن، عشق کی نیازمندیوں سے متأثر ہوکر اپنی وسعتوں میں اُسے جذب کرنے کے لئے سرنگوں ہو رہا تھا۔

پورن پہلے ایک گاؤں میں رہا کرتا تھا لیکن جب ہمایوں' شیرشاہ افغان سے مغلوب ہوکر آوارہ وطن ہوا اور سلطنت کے انقلاب نے نظامِ حکومت میں برہمی، افغانوں کی سنگدلی وقساوتِ قلبی کی مبالغہ آمیز داستانوں نے اہلِ ہند کی پُرامن زندگی میں بےچینی پیدا کر دی تو وہ گاؤں کی سکونت ترک کرکے شہر میں اپنے اعزہ کے پاس آگیا۔ اور اس نے دیکھ لیا کہ شیرشاہ کی حسنِ تدبیر اور سطوتِ شاہی نے بہت جلد اُس سیاسی بحران" کو رفع کر دیا جو ایک بادشاہ کے مغلوب اور دوسرے بادشاہ کے غالب آنے کے وقت لازمی طور پر جسمِ سلطنت میں نمودار ہو جاتا ہے، شیرشاہ کی رعیت نوازی، معدلت گستری نے ہمایوں کی نرم دلی اور فیاضی کو رعایا کے دلوں سے محو کر دیا، اس طرح افغان بادشاہ کی طرف سے جو بدگمانی عام طور پر پیدا ہوگئی تھی وہ بھی نسیًا منسیا ہوگئی، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ مغل خاندان کے سب سے زیادہ رحمدل اور نیک تاجدار ہمایوں کی طرف مائل تھے وہ شیرشاہ کے گرویدہ ہوگئے' ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک آزادی واطمینان سے آمد ورفت ہونے لگی، مال واسباب اور زروجواہر سے لدے ہوئے اونٹ دن رات سنسان جنگلوں، ویران پہاڑوں اور ہیبت ناک ریگستانوں میں سفر کرتے اور چوروں کو ہمت نہ ہوتی کہ ان پر دستِ تطاول دراز کریں، قافلے اپنے قیمتی سامان تجارت کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے اور اس سلسلہ میں انھیں خطرناک گھاٹیوں، وحشت خیز بیابانوں ولق دق

صحراؤں سے گذرنا پڑتا لیکن ان کے اسباب میں سے ایک تنکا بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہوتا، مجارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک بڑھیا سونا اچھالتی چلی جاتی اور رہزنوں کی ہوسِ سیم وزر ان میں جرات غارتگری پیدا نہ کرتی، پنجاب سے بنگال تک اور آگرہ سے سندھ تک پختہ سڑک تیار ہو گئی تھی جس کے دونوں کناروں پر کھڑی کے سایہ دار درخت اپنی ٹھنڈی آغوش کھولے مسافروں کے منتظر رہا کرتے تھے اور ہر ایک کوس کے فاصلہ پر کنواں اور سرائے کی تعمیر نے سفر کی تمام صعوبتوں کو راحت انگیز اطمینان میں تبدیل کر دیا تھا، پھر سرائے کے ایک دروازے پر مسلمانوں کو، دوسرے دروازے پر ہندوؤں کو کچا اور پکا کھانا بھی تقسیم ہوا کرتا تھا جس سے بھوکے اور تھکے ہوئے مسافروں کو راستہ میں گھر کا سا آرام حاصل ہو جاتا تھا، غرض ہندوستان میں بسنے والوں کو وہ تمام نعمتیں اور آسودگیاں حاصل تھیں جنکو جنت کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے، تمام کاروبار بدستور جاری ہو گئے تھے، داد وستد، خرید وفروخت اور حمل ونقل کی جملہ سہولتیں ہر شخص کو حاصل تھیں۔

پورن کا سرمایہ عرصہ سے زمین میں مدفون تھا، جس کو افغانوں کی چیرہ دستیوں کے خوف سے ابتک اس نے نہ نکالا تھا، لیکن اس نادر موقعہ سے فائدہ اُٹھائے بغیر وہ بھی نہ رہ سکا اس نے شہر کے ایک آباد محلہ میں غلہ کی دوکان کھولدی، جو بہت کامیاب ہو گئی، اسکی نئی دوکان پر ہر وقت خریداروں کا ہجوم رہنے لگا، اور روزانہ سیکڑوں روپے کی بکری ہونے لگی مگر اسی کے ساتھ ایک نقصان بھی ہوا کہ وہ اس تجارتی مصروفیت میں سرستی کی بادہ ریز آنکھوں، میفروش لبوں، اور گلپاش رخساروں سے دور ہو گیا، اس کا دل جو دن میں دس بار بھی بیوی کو دیکھکر سیر نہ ہوتا تھا اب صرف نظارۂ صبح وشام کا منتظر رہنے لگا، ہر چند ایک بقال کی نظر میں محبت کا یہ بادۂ تند کسی طرح روپے کے ڈھیر سے قیمتی نہ ہونا چاہئے مگر پورن وہ شخص نہ تھا جو محسوساتِ قلب ودماغ کی روحانیت کو سونا چاندی یا لعل وجواہر کی مادی چمک کے مقابلہ میں غیر دقیع خیال کرتا، اس نے ہمیشہ محبت کے اضطراب کو سرمایہ داری کے سکون سے قیمتی سمجھا تھا اور حسن کی نازآفرینیوں کو مال وزر کی بے کیف زندگی پر ترجیح دی تھی، اور اب بھی وہ اپنے کاروبار کی روز افزوں ترقی کو محبت کی گوشہ نشینی سے اچھا نہ جانتا تھا اور سرستی اُسے مجبور نہ کرتی تو وہ پھر اپنے مستقبل کو سمیٹ کر گھر کی کوٹھڑی میں لے آتا، جہاں ابتک اس نے لطف ومسرت کے ساتھ تین چار سال تک کام کیا تھا، لیکن سرستی نے پسند نہ کیا کہ پورن محض اس کی ذات کے لئے اپنے شاندار مستقبل کو ٹھکرا کر گھر آبیٹھے اور اس طرح اس کے مردانہ عزائم کی توہین کا الزام اسکے سر آئے ـــ

(۲)

پورن روزانہ صبح کو سویرے ناشتہ کر کے دوکان پر چلا جاتا اور ایک پہر رات گئے واپس آتا سرستی چولھے کے سامنے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی ہوئی اسکا انتظار کیا کرتی اور اسکے آتے ہی گرم گرم کھانا پیتل کے صاف اور دھلے ہوئے برتنوں میں اتار کر اس کے سامنے رکھدیا کرتی، اسی طرح کئی مہینے بسر ہو گئے -

ایک دن حسب معمول پورن دوکان پر گیا اور سرستی گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

جاڑوں کے دن تھے، آگرے کی آگ برسانے والی فضا روح کو جلا دینے والی ٹھنڈی ہواؤں سے معمور تھی، دن کے گیارہ بجے تھے، مکان کے وسیع صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی، جس نے سرستی کو اسکے چکٹے ہوئے بالوں اور کثیف کپڑوں کی طرف متوجہ کر دیا، اور وہ سردھونے کے لئے تیار ہو گئی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اس نے بالوں کا جوڑا کھولا پھر پانی سے بھرا ہوا گنگا قریب رکھکر نہانے بیٹھ گئی، تنہائی کا یقین رکھنے کے باوجود نسوانی شرم وحجاب کے اثر سے بدن کو سمیٹتے اور نگاہیں چراتے ہوئے سرستی نے کپڑے اتارے ابھی وہ جسم پر اچھی طرح

پانی بہانے بھی نہ پائی تھی، کہ دفعتہً اسکی نگاہ اُٹھی اُسی وقت دیوار کے قریب سے ایک ہاتھی گزر رہا تھا اور چاندی کی جڑاؤ عماری کے اندر ایک خوبصورت نوجوان شاہانہ تزک و احتشام سے بیٹھا ہوا تھا، اس کے گلے میں موتیوں کی خوبصورت مالا پڑی ہوئی تھی، ٹوپی میں چمکدار ہیرے جڑے ہوئے تھے جو سورج کی کرنوں سے چراغ کی طرح روشن ہو گئے تھے، نوجوان پہلے سے سرستی کو دیکھ رہا تھا، سرستی کی شرماتی ہوئی نگاہیں اسکی مشتاق نگاہوں سے ٹکرائیں، اور فوراً جھک گئیں، جیسے آواز گنبد سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہے، مگر آواز انھیں الفاظ کو لے کر آتی ہے جنکو لیجاتی ہے لیکن سرستی کی نگاہیں، ایک آگ لے کر آئیں جو آنکھوں کو جلاتی ہوئی اس کے سارے تن بدن میں پھیل گئی، اور سرستی کے بال بال سے چنگاریاں جھڑنے لگیں، جیسے جلتے ہوئے انار سے پتنگے اڑا کرتے ہیں، —— یہ وہ وقت تھا جب حسن اپنی تمام شوخی و بیباکی، اور اثر و نفوذ سے قطع نظر کر کے یکسر شرم و حیا میں تبدیل ہو گیا تھا اور حیا کی یہ سرخی سارے جسم سے کھنچکر سرستی کی شربتی آنکھوں میں آگئی تھی جیسے بادۂ سرجوش کا خمار صراحی و ساغر سے نکل کر، اور اسکی مائیت سے جدا ہو کر پینے والے کے سر میں سمٹ آتا ہے، نوجوان کے قلب و دماغ اور اعصاب پر اس منظر کا خاص اثر پڑا، اس کا دل دھڑکا، نگاہوں میں بجلیاں کوندیں، اعصاب میں شعلے اُٹھتے ہوئے محسوس ہوئے رگوں میں شباب کی حدت نے تشنج پیدا کیا، خون حسن کی گرمی سے کھولنے لگا، اسی عالم میں اس نے پان کا ایک بیڑا سرستی کی طرف پھینکدیا[1] وہ جو نتی کے پیڑ کی طرح مرجھا گئی، اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ شرارے نکل رہے تھے۔

(۳)

خلافِ معمول بارہ بجے پورن بھی آگیا، اور دروازے کی زنجیر ہلائی، جس کی آواز سے سرستی کے دل اور اسکی سامعہ میں نشاطِ وصل کی وہ ہلکی سی جنبش پیدا کی جس کو خوشی کی کپکپی یا مسرت کے ارتعاش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن احتیاط اور دور اندیشی نے ہاتھوں کی قوت سلب کر لی وہ کواڑوں کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی —— پورن، جو سرستی کے پیروں کی آہٹ سن چکا تھا باہر سے بولا، —— کھولو جلدی کواڑ کھولو میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے! سرستی نے کواڑ کھولائے، پورن نے دیکھا سرستی کی آنکھیں جو ہر وقت شراب کے چھلکتے ہوئے پیالوں کی طرح بادہ چکانی کیا کرتی تھیں غم و ہراس، رنج و ملال اور سوگواری و بیقراری کے انگارے برسا رہی ہیں، چہرہ جو گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ رہتا تھا سورج مکھی کی طرح زرد ہو گیا ہے، ہونٹ جو مرجان کی سُرخی اور صدف کی چمک کو شرمایا کرتے تھے، سیاہ ہو گئے ہیں، جیسے احتراقِ خون کا عارضہ ہو گیا ہو وہ ان ناگوار مناظر کو دیکھکر ٹھٹک گیا اور گھر میں قدم رکھتے ہی اضطراب کے ساتھ سوال کیا —— تمھیں بخار تو نہیں آگیا! سرستی نے زبان کی قوتِ کلام اور لبوں کی طاقتِ گفتار کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا —— بخار نہیں مجھے آج موت آگئی! اور تم دیکھ لوگے کہ کل ہونے سے پہلے میں مر جاؤنگی!! یہ کہہ کر اس نے نوجوان کا پھینکا ہوا بیڑا پورن کے ہاتھ میں دیدیا، پورن حیران رہ گیا اور واقعہ کی نوعیت پر عجلت و اضطراب کے عالم میں غور نہ کر سکا اس نے ہوئے آتش دیدہ کی طرح پیچ و تاب اور پگھلے ہوئے سونے کی مانند چرخ کھاتے ہوئے پوچھا —— اسکا کیا مطلب ہے؟ سرستی نے پورا ماجرا شوہر سے بیان کر دیا اور یہ بھی کہدیا کہ اس ذلت کے بعد میں زندہ نہیں رہ سکتی، جلد کسی نہ کسی طرح اپنے آپکو ہلاک کر لونگی، میں تمھاری محبت سے شرمسار ہو رہی ہوں میرا دل مجھے ملامت کر رہا ہے کہ اب تک کیوں زندہ رہی، اور تمھیں کیوں اس گناہ میں مبتلا کیا کہ تم ایک ذلیل عورت کو پیار سے دیکھ رہے ہو!

پورن نے اُسے مطمئن کیا اور بڑی مشکل سے اس کے

[1] تاریخی ثبوت اور حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۱۶۰-۱۰۱ اور ہمارا مضمون "شیر شاہ سوری" مطبوعہ رہنمائے تعلیم لاہور۔

خوفناک انداز سے کو بدلا۔

(۴)

شیرشاہ، رعب و جلال، شان و تمکنت، ہیبت و سطوت کے ساتھ دربارِ شاہی میں جلوہ افروز تھا، وزراء اور اعیانِ سلطنت اپنے رتبے کے موافق ادب سے سینہ پہ ہاتھ رکھے سرو قد ایستادہ تھے، بادشاہ کی داڑھی سفید ہوگئی تھی، رخساروں پہ جھریاں پڑگئی تھیں، مگر آنکھوں سے شاہانہ عظمت اور سلطانی شوکت نمایاں تھی، سامنے فریادی کھڑے ہوئے تھے، عین اسوقت جب شیرشاہ نے فریادیوں کی صف پہ نظر کی ایک خوبصورت اور نوجوان بقال ہاتھ میں پان کا بیڑا لئے مستغیثوں کے گروہ سے نکلا، اور شیرشاہ کے سامنے پہونچکر اپنا استغاثہ پیش کیا —— یہ پورن تھا جو اپنی بے عزتی اور آبرو ریزی کی فریاد لے کر عدل گستر بادشاہ کے ایوان عدالت میں آیا تھا تحقیقات سے فوراً ہی معلوم ہوگیا، کہ ولیعہد سلطنت اور فرزند اکبر شہزادہ عادل خاں ہے، —— جبین انصاف پہ بل پڑے معدلت پژوہی نے بادشاہ کے دل کی حرکت کو تیز اور چہرے کے رنگ کو شہاب ثاقب کی طرح سُرخ کر دیا، فرض شناسی اور جہانبانی کی ذمہ داریوں نے واقعہ کی نزاکت و اہمیت سے آگاہ کیا اور بقال و فرزند کا باہمی تفاوت قطعًا مٹ گیا، غصہ سے بادشاہ کے مُنہ میں کف بھر آئے اور بیٹے کی خیانتِ مجرمانہ سے وہ زخمی شیر کی طرح بپھر گیا، اسی عالم میں جو الفاظ اس کے مُنہ سے نکلے وہ یہ تھے —— بقال کو ہاتھی پہ سوار کرکے عادل خاں کی بیوی کو حاضر کیا جائے تاکہ مستغیث اس بیڑے کو اس پہ پھینک کر اپنی آبرو ریزی کا انتقام لے —— درباریوں پر لرزہ طاری ہوگیا وزراء حکم شاہی کو سُنتے ہی کانپ گئے اور معافی کی التجائیں شروع کر دیں جو قبول نہیں ہوئیں بادشاہ نے مکرر حکم دیا کہ عدالت کے وقت عزیز اور بیگانہ کی ہماری نظر میں ایک حیثیت ہے اور فیصلۂ عدالت میں اس بنا پہ کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی کہ ملزم ہمارا فرزند ہے۔

طنزیات

مجکو خدمت میں کرے کون قبول — بُت، سو یہ یخ کہ مسلمان ہوں میں
ڈارون ہیں مرے کنبے کے بزرگ — لوگ کہتے ہیں کہ انسان ہوں میں
دوسروں کا میں بنوں کیا ہادی — خود تو اپنے لئے شیطان ہوں میں
"پھیکے پن" پہ ہے مرے شہر گواہ — اونچی دوکان کا پکوان ہوں میں

سبے کہتے ہیں آزادی خوشامد سے نہیں ملتی — لکھا ہے لکھنے والے نے یہ جملہ نوک خنجر سے
ہو لئے "سر" میں سودائی صفت پھرتا ہوں شہر میں — جو "سر" جائے تو شاید جائے یہ سودا مرے "سر" سے
عدم آباد کو پانی میں ہو کر بھی ہے اک ستا — اگر چاہیں تو کرزن پوچھ لیں فرعون و کچنر سے
کوئی آساں نہیں نادان قطع راہِ حریت — یہ وہ منزل ہے جسمیں جانیوالے جاتے ہیں سر سے

(احمق) پھپھوندوی

فلسفۂ کائنات

تشکیل مادّہ

سید علی اکبر (بھوپال)

مادّہ و روح کی زمانۂ حال کی تعریفات یا تشخیص ذاتی کے متعلق غور و فکر در اصل دماغی افکار کی بڑی پیچیدہ گتھیاں ہیں اور فطرت کا یہ سرکش فرزند (انسان) برف کی چٹانوں کے پاس بیٹھکر چقماق سے آگ نکالتے ہوئے طبیعات و مابعد الطبیعات میں اُلجھنے کے بجائے، ہاتھی اور گینڈوں سے زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ ہزاروں برس تک انسان کو پیٹ بھرنے اور نسل بڑھانے کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ جسد و روح کا امتیاز اور حیات و موت کے متعلق اسکے خیالات اِس قدر محدود تھے کہ دن رات ستارہ سمندر اور سب نقل و حرکت کرنیوالی ہستیاں اُسکے نزدیک زندہ اور حساس تھیں۔ گویا ہزاروں برس تک انسان عملی طور پر بالکل حیوان بنا رہا۔ کہ دفعتہً کرۂ ارض کے بعض گوشوں میں اُسکے دماغ نے نیا قالب اختیار کیا۔ اور اُسکے خیالات کی کایا پلٹ گئی۔ وہ غور کرنے لگا کہ انسان کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کہاں ہے؟ یہ بیداری دو ہزار برس قبل مسیح ایک چھوٹے سے ملک یونان میں ہوئی (جو اُس وقت ایشیائے کوچک میں شامل تھا) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بیداری کی وجہ کیا تھی۔ دماغی ترقی کے اسباب کیا ہوتے ہیں اور کیوں دماغ تخلیات کا مرکز ہے۔ وہ بیداری یقیناً تدریجی ترقی کا نتیجہ نہ تھی۔ جو کسی نسل میں رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں دماغی قابلیت ترکہ اور میراث کے لحاظ سے کوئی وقیع چیز نہ تھی۔

بہر حال اس سوال کا جواب دشوار ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ بیداری مشرق و مغرب کے سنگم میں پیدا ہوئی۔ اور ٹھیک اُس وقت جب مصر کی بندرگاہیں یونانیوں کے لئے کھلی ہوئی تھیں یونانی تجارت کو بڑی رونق حاصل تھی۔ اور مقابلتاً دنیا کے ہر حصے وہاں کے بازاروں میں زیادہ چہل پہل تھی۔ یونانی جزائر اور ساحل پر خوبصورت بالوں والے شمالی وحشیوں سے۔ سیاح اور جہانگرد مصریوں سے۔ ہیئت دان اہل بابل سے اور سمندر میں گھومنے والے فونیشن سے یونانیوں کا اتحاد و اختلاط رہتا تھا۔ اور اسی چھوٹے سے قطع زمین اور اُسکے ملحقہ جزائر میں اہل یورپ سے ایشیائی باشندوں سے اور اہل افریقہ سے باہم میل جول اور شادی

بیاہ ہوتے تھے۔ غالباً دنیا کی تاریخ میں اُس سے قبل کبھی خیالات کا ایسا تصادم اور بین الاقوامی ازدواج نہ ہوئے ہونگے۔

علم الحیات اور علم الاخلاق کے قانون کے مطابق بھی یقیناً ایسے بین الاقوامی اتحاد اور میل جول کا نتیجہ ایسی ہی دماغی بلندی اور اخلاقی پستی ہونا چاہئے تھا۔ اور اسی مفروضہ سے ایسی اچانک دماغی ترقی وتنزل کی تاویل ہوسکتی ہے۔

اہل مونگریل اکثر دماغ والے اور قوی ہونیکے علاوہ بہت سی حیثیتوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ لیکن بلحاظ قانون توریث انکی اولاد سپوت نہیں ہوتی۔ اسی طرح 'چکا گو' اور 'نیویارک' میں ہم دماغی نقل وحرکت کے ساتھ اخلاقی پستی اور ایسی صفات دیکھتے ہیں جو اگر ایک نسل میں ظاہر ہوتے ہیں تو دوسری نسل سے معدوم ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ اُس زمانہ میں یونانی دماغ کی یہ زرخیزی خاصکر بین الاقوامی میل جول کیوجہ سے تھی۔ اور یہ محض فطری طور پر نسلی ترقی کی ایک مثال یا لطفونکے اختلاف کی پیدا ہوئی ذہانت اور طباعی تھی۔ تاہم یہ بیداری بادی النظر میں جیسی معلوم ہوتی ہے ویسی اچانک بھی نہ تھی۔ یونانی دماغ اِس کے لئے آمادہ تھا۔ یونانی زبان اور یونانی علم الاصنام ایسی طباعی کا پتہ دیتے ہیں جو کافی ترقی یافتہ ہو۔ اور یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اہل بابل اور اہل مصر کافی متمول اور علم اقلیدس اور علم ہئیت میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ بہرحال وجوہ جو کچھ بھی ہوں۔ یونان میں ایسے عالی دماغی، ایسی ذہانت اور ایسی طباعی ظاہر ہوئی کہ دنیا کی تاریخ اُس سے ناآشنائے محض تھی انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑکر اپنے ماحول کو دیکھا۔ دیکھا اور حیرت میں ڈوب گئے۔ اب ہاتھی اور گینڈے کے شکار کا شغل نہ تھا۔ اور عالی دماغی کے ساتھ اُس سے کام لینے کی فرصت بھی مہیا تھی بابل۔ مصر اور تھیبز غرض جہاں کہیں بھی قدیم تہذیب رونما ہوئی۔ وہ مقامات ہیں جہاں آب وہوا کی جملہ خوبیاں میسر تھیں۔ اور یونانی فلسفی تو اس خوبصورت قطعۂ زمین میں پیدا ہوئے جو بلحاظ آب وہوا ربھی اپنا آپ ہی جواب تھی۔ جہاں ترقی کا موقع حاصل تھا۔ اور عقل کو نشوونما پانے کی فرصت مہیا تھی۔ اب پرانے معقولے اُنکے افق علم سے گرگئے۔ فرسودہ تفصیلات ساقط الاعتبار ٹھہریں۔ اور راز کا ررفتہ دیوتا اُن تشنگانِ صداقت کی پیاس بجھانے سے قاصر رہے۔ انھوں نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ یونانی جزائر نیلے سمندر میں چمک رہے تھے۔ متناسب الاعضا اور سڈول مرد۔ پُرشباب عورتیں تھیں۔ اسلئے اُنکی گہرائیوں میں احساس حُسن پیدا ہوچکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے حَسین حَسین مجسمے بنانے شروع کردیے۔ اور طویل طویل نظمیں کہنی شروع کیں۔ وہیں ہومر بھی پیدا ہوا وہیں فیثاغورس نے بھی جنم لیا۔ وہیں یوریپڈس، وجود میں آیا۔ اور وہیں، سوفکلیس، کا مسقط الراس قرار پایا۔ انھوں نے پھر بغور اپنے ماحول کو دیکھا۔ اپنے عقب میں پیدائش کو اور اپنے سامنے موت کو دیکھا۔ راز ہستی کو سمجھنے کے لئے فلسفیوں کے گروہ پیدا ہونے لگے وہیں افلاطون بھی پیدا ہوا۔ وہیں سقراط، بھی۔ وہیں، دیمقراطیس بھی ہوا اور وہیں ہری قلاطوس بھی۔

دراصل یہ ساز وسازندہ کا معاملہ تھا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار برس سے انسانی دماغ وہاں موجود تھا۔ اور ایک لاکھ پچاس ہزار برس سے ستارے اور سمندر ساز چھیڑے جانے کے منتظر تھے۔ لیکن ساز اب جاکے موسیقار کے قابل ہوا اس میں شک نہیں کہ دورِ حجریت کا انسان بھی نقاشی اور صنعت وحرفت میں ماہر تھا کیونکہ اس زمانہ کے ہرن۔ سانڈ اور ہاتھیوں کے مجسمے ہاتھی دانت اور سینگو نیز اکثر نظر آتے ہیں۔ لیکن دورِ حجریت افلاطون اور فیڈیلیس کو پیدا نہ کرسکا۔ اسلئے کہنا پڑتا ہے کہ چھ سو برس قبل مسیح کا یونانی دماغ تاریخ عالم میں ایک 'جدت' تھا۔ دورِ حاضرہ کا انسان اپنے روز کے دھندوں میں مشغول رہتا ہے۔ اور بہت سی حیثیتوں سے اُس کا دماغ ترقی یافتہ اور باخبر کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ستاروں کی طرف سے وہ پھر بھی بے پروا نظر آتا ہے۔ وہ ان اشیاء کے متعلق اپنے کمزور تجسس اور اشتیاق کو مطمئن کرنے کے لئے کافی معلومات بھی رکھتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا کی مشاغل میں سے غیر متعلق چیز ہے۔ لیکن یونانی فلسفی کے لئے یہ بات نہ تھی۔ اُسکے لئے دنیا عجیب وغریب شے تھی۔ اس میں ہر چیز اپنا راز تھی۔

آتے تھے۔ اور وہ انکو سمجھنے اور حل کرنے کے پاک جذبہ سے بے چین تھا۔

سب سے پہلے جس معمہ نے یونانی دماغ کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ (Objectiveness) معروضی تھا۔ جسکو ہم تھوڑے سے تغیر کے ساتھ "مادہ" کہتے ہیں اور جس سے مادی کائنات تعمیر ہوئی ہے۔

غالباً انسان نے اول اول مادہ کو محض حساس فرض کیا اور غالباً اسی وقت تک مادہ کے مجہول ہونے کی اختراع انسانی دماغ نے نہیں کی تھی۔ وہ مادہ اور اس کے خواص میں امتیاز نہ کرتا تھا (Subjective + Objective) معروضی اور موضوعی کے فرق سے آشنا تھا، لیکن رفتہ رفتہ مادہ، مادیت اور مابعد الطبیعات کا مجموعہ خیال کیا جانے لگا۔ یہ موخر خیال یا صحیح اور غلط ہو یا وہ ترقی یافتہ طبائع کے نزدیک قابل قبول ہو یا نہ ہو ہم یہاں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ اس خیال کو اب بھی عام مقبولیت حاصل ہے۔ اور موجودہ مادہ کا یہی نظریہ تھا۔ جو یونان کے عہد زریں میں بھی مقبول تھا۔

تو پھر یہ مادہ اور وجودی الخارج والا مادہ کیا شے ہے؟ جس سے جمادات۔ نباتات۔ حیوانات۔ فلکیات مرکب ہیں؟ دنیا کیا ہے جو قدیم ہے یا مخلوق؟ خوبصورت اور قدیم روایات سے اکتا کر ان فلاسفہ نے ماہیت اشیاء عالم کی نئی نئی توجیہات کرنی شروع کیں۔ مثلاً (Thales) تھیلس نے مصری فلسفہ سے متاثر ہو کر خیال کیا کہ موجودات کائنات کی اصل پانی ہے۔ اور اس کے شاگرد (Anaximander) اناکسی مندر کا رجحان یہ قائم ہوا کہ اشیاء عالم کی علت مادی اور عنصر اولیہ Infinity "اینفنٹی" ہے۔ (Theophrastus) تھیوفراسٹس لکھتا ہے کہ "پراکسیادس کا بیٹا اینا کسی مندر جو Militus ملیٹس کا رہنے والا اور Thales تھیلس کا ہموطن اور اسکے متعلقین میں تھا۔ اشیاء عالم کی علت مادی 'اینفنٹی' کو تسلیم کرتا ہے اور وہ پہلا انسان ہے جس نے علت مادی کے لئے یہ نام روشناس کیا۔ وہ کہتا ہے کہ فلکیات اور جملہ عالم کی اصل نہ پانی ہے اور نہ ان میں سے کوئی چیز ہے جسے ہم عنصر کہتے ہیں۔ بلکہ تمام عالم کی خلقت 'لامتناہی' سے ہوئی ہے۔ دراصل یہ قول دور حاضرہ کے نظریہ Urstoff یعنی عنصر اولیہ کی بڑی دلچسپ دوربینی ہے

(Apollonia) اپالونیا کا دیوجانس اور ملیٹس کا اناکسی مندر اشیاء عالم کی حقیقت 'ہوا' سے خیال کرتے ہیں۔ اس نظریہ سے 'ارونے' کے عہد تک علم الاجسام متاثر رہا۔ Theophrastus تھیوفرسٹس نے دیوجانس کے نظریہ کو یوں بیان کیا ہے: "اس کا قول ہے کہ کائنات کا عنصر اولیہ 'ہوا' ہے۔ جو غیر محدود اور قدیم ہے جس کے عمل ترقیق و انجماد اور تغیر حال سے اشیاء عالم وجود میں آئی ہیں۔

ہرقلاطوس Heraclitus کائنات کا ماخذ 'آگ' کو اور فیثاغورس نے 'اعداد' کو تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ امپیڈکلس Empedocles ماخذ عالم اربعہ عناصر یعنی آب و آتش خاک و باد کو مانتا تھا۔ اور اس نظریہ کو کم و بیش زمانہ حاضرہ تک مقبولیت حاصل رہی ہے۔

یہ نظریے ہمیں اب احمقانہ نظر آتے ہیں۔ لیکن صورت واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اور وہ اکثر سنجیدہ، مستحکم، پرمغز فلسفیانہ استدلال پر مبنی ہیں۔ یہ کہ اعداد کائنات کا ماخذ ہیں ناممکن معلوم ہوتا ہو۔ لیکن اسی بیسویں صدی میں ریاضی دان طبقہ کی ریاضیات نے مادہ اور مادیت کو محدود کر کے مساوات ریاضی سے کچھ ہی زیادہ ثابت کر دکھایا ہے۔ اور اسی طرح کائنات کا ماخذ 'آگ' کا ہونا بھی محال معلوم ہوتا ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ وہ آتشیں 'نبولا' Nebulae ہی ہے جس پر موجودہ سائنس نے نظام شمسی کو مبنی قرار دیا ہے۔ اور یہ کہ 'حدت' اور 'قوت' کا باہمی تعلق موجودہ سائنس کا وہ زبردست راز ہے، جس کا ابتک انکشاف نہیں ہو سکا۔ علاوہ بریں اگر ہرقلاطوس کا طرز استدلال دیکھیں تو حیرتناک حد تک اسکو مستحکم اور مدلل پائینگے۔ اسکا نقطہ نظر ایڈورڈ کلاڈ (Edward Clodd) نے اپنی کتاب پائنیرس آف اوالیوشن Pioneers of Evolution

ہی اس طرح بیان کیا ہے " حرکت ہی وہ نظام موجودات ہے جو ہر جگہ جاری وساری ہے۔ اور باوجود تضاد و قوت Opposition of forces جو اشیاء کو منظم کئے ہوئے ہے۔ موجودات میں ایک رابطۂ اتحاد قائم ہے۔ پھر یہی کائنات کے عنصر اولیہ کی جستجو کے وقت جس کے آثار مختلف اور نمایاں ہیں وہ آگ میں اوس کے صفات دیکھتا ہے۔ کیونکہ شعلہ کے اندر جو آہستہ آہستہ جلتا ہے۔ اُسکی مقدار یکساں رہتی ہے اور شعلہ وہی ہے جسکو ہم ایک شئے قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ مادہ جس سے وہ مشتعل ہے۔ برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ برابر دھواں بنکر اُڑتا ہے اور اُسکی جگہ اس ایندھن یا اس چیز سے پُر ہوتی ہے جس سے وہ روشن ہے۔ اگر دنیا کو ایک غیر فانی آگ تسلیم کرلیا جائے۔ تو ٹھیک یہی صورت کائنات پر منطبق ہوتی ہے۔ اور یہی نظام تمام اشیاء میں جاری ہے جو تخلیق کے لحاظ سے نہ کسی انسان کا مرہون منت ہے۔ اور نہ کسی دیوتا کا۔ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ آگ کس طرح دیگر اشیاء میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ جبکہ دیگر اشیاء ہمیشہ آگ میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔" یہ استدلال یقیناً مدلل مستحکم اور قرین قیاس ہے۔

آؤ اب یہ بھی دیکھ لیں کہ دیوجانس اپنے نظریہ 'ہوا' کی کیا توجیہ کرتا ہے۔ "وہ کہتا ہے میرا نظریہ اختصار کے ساتھ یوں سمجھنا چاہئے۔ کہ تمام چیزیں ایک ہی چیز کے اختلافات ہیں۔ لہٰذا ایک ہی چیز ہیں"۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے۔ کیونکہ اگر آب و آتش و باد و خاک یا کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز دوسری سے مختلف ہوتی یعنی اس طرح مختلف کہ کسی چیز کے لئے کوئی مادہ مخصوص اسی کے لئے ہوتا۔ اور تمام اشیاء ایک ہی شئے کی اشکال مختلفہ نہ ہوتیں تو اشیاء کا ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب پانا ناممکن ہوتا۔ اور اُنکے ترکیب پانے سے جو مفید یا مضر اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ وہ ناممکن ہوتے۔ لہٰذا انسان ہوا یا حیوان، نباتات یا کوئی اور شئے اسکا وجود میں آنا اسوقت تک ناممکن تھا جب تک موجودات عالم بلحاظ حقیقت و اصلیت ایک شئے قرار نہ پائیں۔ اُسی ایک شئے سے تمام اشیاء کی خلقت ہوئی ہے۔ بلکہ تمام اشیاء ایک ہی شئے کے اختلافات ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف اشکال اختیار کرلیتے ہیں۔ اور پھر اُسی شئے یعنی اپنے اصل میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی میرے نزدیک یہ بھی مسلم ہے کہ وہ شئے جو ماخذ کائنات ہو عظیم و برتر۔ قدیم و غیر فانی اور غیر محدود علم کی مالک ہے اگر ایسا نہ ہو تو ایسے صحیح تناسب کے ساتھ موجودات عالم میں اونکا ہونا کہ گرمی۔ سردی۔ ساعت و دن۔ بادو باراں اور خوشگوار موسم کے توازن کا قائم رکھنا ناممکن ہوگا۔ نظام عالم ایسی تکمیل کے ساتھ قائم ہے۔ کہ جو شخص بھی نظر بالغ سے کام لے اور ماہیت اشیاء پر غور کرے۔ تو معلوم کرسکتا ہے کہ ممکن سے ممکن بہتر صورت میں وضع کی گئی ہیں۔

دیوجانس کا استدلال بھی یقیناً پرمغز۔ مدلل مستحکم اور منطقیانہ ہے۔ یونانی دماغ محض مادہ کی حقیقت ہی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے مادہ کی فطرت اور تسلسل پر بھی غور کیا ہے۔

تسلسل مادہ کا سوال بادی النظر میں خالص فلسفیانہ اور منطقیانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں سے بہت سی ایسی علمی شاخیں پھوٹتی ہیں جنکے حل پر تقریباً تمام موجودہ سائنس کی کارگزاری منحصر ہے۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ مجموعی حیثیت سے یونانی فلسفہ اس نظریہ پر قائم ہے کہ مادہ ایسے غیر محدود اور ناقابل تجزیہ اور غیر مرئی ذرات سے مرکب ہے جس کے درمیان خلاء ہے۔ اور قدیم یونانی فلسفہ میں کچھ نہ کچھ دور حاضرہ کے ذراتی نظریہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

گمپرز کہتا ہے کہ جب اناکسی مندر نے اپنے عنصر اولیہ کی اشکال کے اختلافات ذریعہ عمل ترقیق و انجماد بیان کئے ہیں اور جہاں انہوں نے سمجھا ہے کہ عنصر اولیہ کی ابتدائی ہر تغیر مابعد از خود گزرتی ہے تو لازمی طور پر اس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہی ہوگی کہ چھوٹے چھوٹے غیر مرئی ذرات سرگرم عمل رہتا ہے جو کبھی ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں اور کبھی جدا ہوجاتے ہیں۔ پھر جب ہرکلیٹس نے اپنے نظریہ تسلسل تشکیل اشیاء کی

اشاعت کی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ ایک متناہی نہ ہونے والی انفرادی ہستی کے وجود کی طرف جوذہن منتقل ہوتا ہے۔ وہ درحقیقت ایک فریب ہے۔ جو جدید ذہات کو پہلے ذرات کی جگہ پر کرنے کے تسلسل عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ تو یقیناً وہ مادے کے غیر مرئی ذرات کی موجودگی اور انکی غیر مرئی حرکت کو تسلیم کر رہا ہے۔ اور سب سے آخر میں جب ایک عورت نے ہمارے احساسات کی کمزوری کی شکایت کرتے ہوئے ہر جسم کو بیشمار Seeds یعنی چھوٹے چھوٹے اجزائے اولیہ سے مرکب ظاہر کیا ہے۔ کہ ترکیب جسمی میں اسی قسم کے اجزاء کا غلبہ ہے۔ تو وہ بھی گو یا مبہم الفاظ میں اسی نظریہ کو بیان کرتا ہے جس کے تنہا نتیجے نے ہمیں اسکے دو پیشرو مینکے نظریے کے مفہوم سمجھنے کے قابل بنا دیا۔

بہرحال ان فلاسفہ نے تو ذراتی نظریہ کے محض حوالے ہی دیئے تھے۔ لیکن فصاحت کے ذراتی کلیہ قائم کرنا لوسی پس اور ڈیماکریٹس کے حصہ میں آیا۔ ارسطالیس کا بیان ہے کہ "ڈیما کریٹس اور لوسی پس کہتے ہیں کہ تمام اشیاء نا قابلِ تجزیہ اجزائے مرکب ہیں۔ جو بلحاظ کثرتِ تعداد و اشکال غیر محدود ہیں نیز ان اشیاء کا اختلاف ان عناصر کی نشست اور ترتیب پر منحصر ہے جنسے وہ مرکب ہیں۔ Theophrastus نے لوسی پس کے نظریہ کی اپنے الفاظ میں یوں تشریح کی ہے " وہ بے شمار اور دائم متحرک ذرات کا جو atoms کہلاتے ہیں قائل ہے اور چونکہ ان ذرات کی ایک ہی قسم کے ہونے کی کوئی وجہ موجود نہ تھی۔ نیز اس لئے کہ اُسنے اشیاء اور اختلاف اشیاء کا ایک تسلسل قائم دیکھا اُسنے ان ذرات کی بیشمار قسمیں کی ہیں۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ 'شے' کا وجود 'لاشئ' سے زیادہ حقیقی نہیں ہے۔ اور تخلیق موجودات میں یہ دونوں برابر کے سبب ہوتے ہیں۔ کیونکہ اپنے خیال کے مطابق وہ ان ذرات کو جب وہ خلا میں پیدا اور ساکن ہوں تو 'شی' کہتا ہے اور متحرک ہوں تو 'لاشئ' سے تعبیر کرتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دور حاضرہ کے نظریہ اور اسکے توضیح سے کتنا ملتا جلتا ہے۔

غالباً ذراتی نظریہ کا موجد لوسی پس ہوا ہے۔ لیکن اوسکے یکا چیدہ چیدہ اقوال ہیں۔ جو فی زمانہ دستیاب ہیں۔ اور نظریہ تمامتر ڈیماکریٹس کے نام کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے جنے اپنے نقطۂ نظر کو کمانی فصاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مسٹر لیعث نے اوس کے بنیادی اصول حسب ذیل بیان کئے ہیں:

(۱) کوئی شے نیست سے ہست یا عدم سے وجود میں نہیں آسکتی اور جو موجود ہے (لہذا مادہ بھی) وہ فنا نہیں ہو سکتی نیز ہر تغیر محض ترکیب پانے اور منتشر ہونے کا نام ہے۔

(۲) کوئی شے اتفاقات یا حوادث کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ہر شے کا سبب اور ضرورت ہوا کرتی ہے۔

(۳) 'ذرات' اور 'خلا' کے علاوہ ہر چیز سبب نہیں ہے 'وجود' نہیں۔

(۴) مرئی کائنات ذرات کی حرکت۔ تصادم یا نتائج حرکت سے وجود میں آتی ہے، جو بلحاظ تعداد و اشکال غیر محدود ہیں۔

(۵) اشیاء کا اختلاف محض ذرات کے اختلاف ترتیب، تعداد اور صورت کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ جن سے وہ مرکب ہیں۔ نہ کہ اُن ذرات کے مزاجی اور خواصی اختلاف کی وجہ سے جو ایک دوسرے پر دباؤ اور تصادم سے عمل کرتے ہیں۔

(۶) جوہر مثلاً آگ گول چکنے۔ متحرک اور سریع السیر ذرات سے مرکب ہے۔ جنکی حرکت سے زندگی ظہور میں آتی ہے۔

ان اصول میں چوتھا اور چھٹا اصول نہایت اہم ہے اور گو بالکل خام اور نظری ہیں۔ تاہم جن دعاوی پر موجودہ سائنس کی بنیاد قائم ہے اُنکی پیشین گوئی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دو ہزار برس سے سائنٹفک خیال اُن سے متاثر ہوتا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کی سائنٹفک تحقیقات و تصنیفات محض اُن اصول کی فصاحت اور تشریح ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صرف

فیضانِ ساقی

آجکل پھر بخششِ پیرِ مغاں کی دھوم ہے
دولتِ بیدار و بختِ کامراں کی دھوم ہے

پھر خروشِ مطرباں و جوشِ یاراں کے طفیل
لحنِ رنگین و شرابِ ارغواں کی دھوم ہے

باغ میں پھر جلوۂ گل سے ہے اک محشر بپا
بزم میں پھر شوخیٔ چشمِ بتاں کی دھوم ہے

پھر فلک پر ابرِ گوہر بار کے ہیں غلغلے
پھر زمیں پر کاکلِ عنبر فشاں کی دھوم ہے

بزم میں پھر خندۂ عشاق کے ہیں زمزمے
باغ میں پھر بلبلِ افسانہ خواں کی دھوم ہے

حلقۂ رنگینِ یارانِ محبت پیشہ میں
پھر کسی کے التفاتِ بیکراں کی دھوم ہے

پھر مچلتی چاندنی کے نُقرئی آغوش میں
پیچ و خم کھاتے ہوئے آبِ رواں کی دھوم ہے

پھر کہیں رُکتا نہیں رخشِ مزاجِ دلبری
پھر کسی نوشہسوارِ خوش عناں کی دھوم ہے

پھر گھنی پلکوں کے آئینِ تکلم کا ہے شور
پھر سیہ آنکھوں کے اندازِ بیاں کی دھوم ہے

آدم و حوا کے جرمِ اولیں کی یاد میں
جشنِ زیرِ تاک و رقصِ گلرخاں کی دھوم ہے

عطر سے مہکے ہوئے ایوانِ رقص و رنگ میں
لمسِ شیرینِ حریر و پرنیاں کی دھوم ہے

پھر کھنکتے ہیں پیالے، گنگناتا ہے شباب
پھر شرابِ کہنہ و حسنِ جواں کی دھوم ہے

جوش کے انفاس سے مہکی ہوئی ہے زندگی
دُور تک اِس شاعرِ ہندوستاں کی دھوم ہے

جوش

غزل گوئی

نقاد

جناب حکیم آزاد انصاری نے رسالۂ جامعہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۵ء میں اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی تقریب سے اک مقدمہ نما مضمون "غزل کی حمایت" میں شائع کرایا ہے۔ میرا زیرِ آغاز تبصرہ اسی کی تنقید پر مبنی ہے۔

"غزل کی حمایت"! ــــــ کیا میں عرض کروں کہ یہ فقرہ زبان کا غلط استعمال ہے! حقیقتہً جو الفاظ قابلِ اطلاق ہیں وہ "غزل کی حمایت" کے بجائے "غزل کا قصیدۂ مدحیہ" یا "غزل کا مرثیہ الیمہ" ہیں! لیکن قصیدے کی روح پوری ہو، یا مرثیے کا ایصالِ ثواب، کوئی تدبیر بھی اب "پیر زالِ غزل" کو شعر کی "عروسِ رعنا" نہیں بنا سکتی! شاید عالمگیرِ اعظم کے ہمزبان ہو کر ہمیں کہنا چاہیئے کہ دربار کی موسیقی کی طرح، مشاعروں کی متعارف غزل سرائی کے تابوت کو بھی اتنا گہرا دفن کرنا چاہیئے کہ اس کے "حشر جسد" پہ مُہر ہو جائے! خس کم جہاں پاک!

زیرِ تنقید مضمون کی نقل سے پہلے مدیرِ جامعہ کا یہ مختصر تعارفی نوٹ ہے:

"ذیل کا مضمون حکیم آزاد انصاری صاحب کے مجموعۂ کلام کے مقدمے کا اک حصہ ہے جو ہنوز زیرِ طبع ہے":

میں "مجموعۂ کلام" کی عبارت سے بھی تعرض کرنا چاہتا ہوں! ــــــ مجموعۂ کلام ہے یا صرف دیوانِ غزلیات! پھر اس اڈیشن کا "مقدمہ" ہے یا "معذرت"؟

حقیقت یہ ہے کہ مُدۃ العمر کی "غزلیاتی یا تغزلیاتی" یاوہ گوئی کو اک پشتارۂ ردی میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھنا فطرۃً ناقابلِ برداشت تھا! کوئی انسان اپنے تمامی ماضی کو اِس طرح یکسر ضائع و دور از کار تسلیم کر لینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا! اِتنا خود شکن جگر وہ کہاں سے لائے کہ بے تکلف کہہ ڈالے کہ "ع این دفتر بیمعنی غرقِ مے ناب اولیٰ"! شعراء اپنے مجموعۂ غزلیات کو اپنا "ادبی صدقۂ جاریہ" بنا کر اپنے پیچھے چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔ اُسے اپنا سیاہ اعمالنامہ بنانا نہیں چاہتے! یہ انقلاب اتنا عاجلانہ نہیں ہو سکتا! غزل گو شعراء کی غالباً تیسری پُشت اِس پشتارۂ ذِل پر لعنت بھیجنے کے لئے تیار ہو سکے گی! یہ حجابِ غلیظ اِس سے پہلے چھٹتا دکھائی نہیں دیتا!

آزاد صاحب کا جلالی "افتتاحِ کلام" اِس طرح ہوتا ہے:،

"بعض کور مذاق، اپنی زبان اور اپنے شعر و ادب کے دشمن، کچھ عرصے سے اِس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ غزل کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا جائے!"

نازم برین "خوش مذاقی"! ــــــ "کور مذاق، دشمنِ زبان و ادب، قاتلِ غزل"! ــــــ چھوٹتے ہی گالیوں کا یہ "تبرّا خوانی"؟! ہم نے سُنا ہے کہ آزاد صاحب کے تراوشِ قلم میں "ذم کا پہلو" اک ازلی ناگزیری کے ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے! کیا یہ زبان و خطاب اُسی کا ثمرِ اوّلین ہے؟!

پھر "صفحۂ ہستی سے" کی ایک ہی کہی! کیا دلی و لکھنؤ کے ناگفتہ بہ مشاعروں کی تنگ و تاریک گلیاں پورے "صفحۂ ہستی" کی ہم وسعت ہیں کہ وہاں

کی مقام گیر چیز کی بخشش کے لئے ایسی آفاق گیر معرکہ آرائی کی ضرورت لاحق ہو؟! مغالطے کی بھی اک حد ہوتی ہے۔ غزل، اُردو ہندوستان کے ماضی کے قصۂ پارینہ کا اک ورقِ کرم خوردہ ہے، کسی جنگی جہاز کا عرشہ نہیں! لوگ بھی اپنی کیسی کیسی خود ساختہ حلقوں میں رہا کرتے ہیں!

مروجہ غزل گوئی جن اعتراضات و ایرادات کی ہدف ہے اُن کی مُلخّص فہرست پیش کرتے ہوئے بزرگ منش صاحبِ مضمون فرماتے ہیں:۔

"یہ دلائل بظاہر تو نہایت وزنی اور قطعی مُسکت نظر آتے ہیں، مگر درحقیقت بالکل بے وزن، بیحد فریب دہ، اور محض لچر و لوچ ہیں، اور پیداوار و نتیجہ ہیں صرف مغرب زدگی کا"!

یہ ایک ہی سانس میں مرعوب اعتراف اور تحدی خیز ابطال کی غیر متوازن زبان و بیان کا اک دلچسپ مظاہرہ ہے، جو غالباً خمیازہ ہے غالی "مشرق زدگی" کا! کیا "مغرب زدگی" ہی کی عامیانہ دُہائی آزاد صاحب کے معرکہ آرا و بلند آہنگ رَد کا "طبلِ غازی" ہے؟! اس کلام میں علانیہ "روشنی" سے زیادہ "گرمی" نظر آتی ہے! لیکن یہ اپنے زور میں خود بچھڑ جانے کا طریقِ گشتی ہے! ؎

دلیل قوی باید و معنوی
نہ رگہائے گردن ز غصہ قوی!

عام اُردو غزل گوئی کی مصطلحہ زبان میں مذکر ضمائر و افعال کے بدنام استعمال کے جواز میں حکیم صاحب کی دلیلِ اول یہ ہے:۔

"مرد صنفِ قوی ہے، اور عورت صنفِ نازک، اور ہر امر میں صنفِ قوی کا لحاظ زیادہ رکھا جاتا ہے"! فلہٰذا پیامِ شادی میں بھی اک مرد، بتقاضائے تقدمِ مردمی، اک مرد ہی کو ترجیح دے گا! شاید دُنیا کی سب سے زیادہ مردانہ شریعتِ اسلام بھی "کُفو" کی اس بے پناہ وسعت کی تاب نہ لا سکے گی۔ چاہے اُس کی مسندِ صدارت پر خدا اور رسول دونوں ہی مرد کیوں نہ ہوں! تاہم اس میں شک نہیں کہ تغزل کی پیشانی پر "ادبی لواطت" بخطِ جلی و بسیاہی غلیظ لکھی ہوئی نظر آتی ہے! اور "صنفِ قوی کا ہر امر میں" کتنا ہی لحاظ رکھا جائے، خلافِ وضعِ فطری ارتکاب کبھی شریعتِ شعر کے بابِ "رخصت" میں نہیں آ سکتا! صنفِ قوی جب اپنی قوتِ جنسی سے ایسا مجرمانہ فائدہ اٹھانے لگے تو اُس کا "لحاظ" کہاں تک رکھا جائے گا! کیا خود اس صنفِ ثقیل کو اپنے وقار کا احساس نہیں! کیا اس نے اپنا شعورِ شرم صنفِ لطیف ہی کے حوالے کر رکھا ہے، اور خود چھوٹ ہو کر یہ

نعرۂ مردانہ لگانا چاہتا ہے کہ:۔

"حیا چہ کُتّی ست کہ پیشِ مرداں بیاید"!

آزاد صاحب اِس تقریر کے ضمن میں آگے لکھتے ہیں:۔

"اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ افعال و صفات مذکر کو افعال و صفاتِ مونث پر ترجیح ہے، اور یہ دونوں صنفوں کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں"؛

گویا اِن "دونوں صنفوں" کی رعایت غزل گویاں [illegible] نعرہ لگا ہے! اور بداہتہً اس لئے کہ اِس کار و بارِ ناگفتہ بہ کا اک [illegible] شعبہ "امرد پرستی" ہے! کتنی حسبِ حال ہے یہ "چیز غزل" کے جس کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے کہ وہ عبارت ہے "عورتوں کے ساتھ حرف [illegible]" سے! آزاد صاحب اک خطرناک قسم کے وکیل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی [illegible] کے لئے عصمتِ کامل کے دعوی کے ساتھ اُٹھتے ہیں لیکن مدعی سے زیادہ چُست بن کر اک مزید سنگین تر الزام کا اقبال کرنے لگتے ہیں! کیا ہر دوست [illegible] اک قابلِ پناہ طلبی دشمن ہی ہوا کرتا ہے؟!

مزید گلفشانی ملاحظہ فرمائیے:۔

"جب کوئی ایسا عام حکم دیا جاتا ہے جو مرد و عورت دونوں کو حاوی ہو اُس وقت بھی افعال و صفات مذکر ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس [illegible] جو شخص اس رستے سے گزرے گا اُس کو دس روپیہ جُرمانے کی سزا دی جائے گی، فعل مذکر ہی استعمال ہوا ہے، مگر صرف اِس بنا پر کہ اِس حکم میں فعل مونث "گزرے گی" استعمال نہیں کیا گیا عورت کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا"۔

آزاد صاحب کو یہی نہیں کہ صحیح جواب معلوم نہیں، انھیں صحیح معنٰی میں اعتراض کی بھی خبر نہیں! اعتراض یہاں عورت کے عدمِ امکانِ شمول پر نہیں، مرد کے غلبۂ قیاس شرکت پر ہے! آپ فرماتے ہیں کہ عورت کو غزل گوئی کے عمومی، حاوی بر صنفین بیانات و مخاطبات سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ غرض یہ ہے کہ مرد بھی کب مستثنیٰ رہ سکتا ہے؟! فرقِ طرفہ تماشا ہو گیا کہ لونڈا "ہیجڑے" سے بدل گیا! یا اس دو طرفہ ابہام و اشتباہ میں مقتضائے مشکل ہے! استدلال کا یہ نتیجۂ صریح ہمارے خیال میں صورتِ حال کو کچھ بہتر نہیں بناتا، اُسے پیچیدہ تر یا شاید شنیع تر کر دیا ہے!

اور سُنیے:۔

"یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے قوانین حکومت میں تمام وکمال افعال صفات مذکر ہی استعمال کئے گئے ہیں جو مرد و عورت دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کتنی قانون تو ادر دلیل ہے! گویا تغزل کا ادب لطیف تعزیرات ہندی زبان میں لکھا گیا ہے! جس کا گفتہ بہ حشر لازمہ استعارہ — خلافِ وضع — کا دوسرا نام ہے! اللہ، اللہ، دفترِ غزلیات اور ضابطۂ تعزیرات، یک نگ گرداننہ ٹھہرے ہیں! کیوں نہو! ہم بھی غزل کو کچھ ایسا ہی مجرمانہ ادب سمجھتے ہیں! آزاد صاحب کا انتقال ذہنی معنی خیز ہے! غزلیات اور تعزیرات! خوب! ع

تبیل ہیں کہ قافیہ تنگ شود لسبی مت!

اسی ترنگ میں اور :۔

یہی سبب ہے کہ عورتیں بھی جب غزل کہتی ہیں، تو وہ بھی افعال صفات مذکر ہی کو ترجیح دیتی ہیں "

منقولۂ بالا بیان میں اگر وہ شدید پہلو سے ذم موجود نہوتا جو قارئین پر پلہ بے نقاب و رسوا ہو گیا ہو گا تو ہمارے لئے جواب دینا زیادہ آسان ہوتا! بہرحال جواب سنیئے! —— جناب والا! عورتوں کا علانیہ و بے محابا غزل سرائی کرنا، اور قیس و کوہکن کی شان سے عشقبازی کے اکھاڑے میں آنا، اور مردانہ زبان و ضمائر استعمال کرنا سب اسی طرح یکساں مضحکہ خیز ہے، اور ہمارے مرد شعراء کی لغویت کا مثنیٰ! جو لوگ اپنے نام و تخلص اور اپنے معاملۂ تعشق کی رازداری کرنی نہیں چاہتے وہ اپنے موضوعِ عشق کی صنف و جنس کی پردہ داری پر کیوں مصر ہیں!! پھر پردہ داری بھی ایسی جو حقیقتہً پردہ دری سے بدتر ہے۔ یعنی یک نہایت سنگین نوع کا غیر اخلاقی بحث!

آزاد صاحب یہاں تک بخیالِ خویش، فاتحانہ قلم فرسائی فرماکر اک مختصر جشنِ فتح منانا چاہتے ہیں! فرماتے ہیں :۔

"اگر یہ کہا جائے کہ جناب! آپ کے استدلال کو افعال و صفات مذکر کی حد تک تو قبول کیا جا سکتا ہے مگر . . . . . :

کامیاب وکالت کے اس سرٹیفکٹ پر جو حضرت آزاد نے حضرت آزاد کو ارزانی فرمایا ہے سوائے اک ترحم آمیز تبسم کی اور کیا کیا جا سکتا ہے جناب! آپ پہلے اپنی مدافعت سے تو عہدہ برآ ہو لیجئے، اس کے بعد حریفوں کے دعاوی سے ہمدردی کا اظہار کیجئے گا! ؎

تو کار زمین را نکو ساختی!
کہ با آسمان نیز پرداختی!

آزاد صاحب اپنے منقولۂ بالا تخیئے کو یوں مکمل فرماتے ہیں :۔

اگر یہ کہا جائے کہ جناب! آپ کے استدلال کو افعال و صفات مذکر . . . . . مگر ستم یہ ہے کہ غزل میں "سبزہ خط"، "دستار"، "ترک بچہ" اور "ہندو بچہ" وغیرہ جیسے مخصوص بہ صنف قوی الفاظ بھی تو پائے جاتے ہیں . . . ! تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت! آپ اسے مرد کا مرد کے ساتھ عشق جتا سکتے ہیں! ممکن ہے اس میں عورت کے جذبات عشق ظاہر کئے گئے ہوں! بالفاظِ دیگر کوئی معشوقہ، مادرِ مشفقہ بن کر اک "ہندو بچہ" یا "ترک بچہ" سے سرپرستانہ عشق فرما رہی ہو! یا کوئی دلدادہ تلافی کسی ملاجی کے بچے کے ستائے کے عشق بیچان میں پھنس گئی ہو! یا کسی نازنین رقیبہ نے "سبزہ خط" سے خطاب کر کے اپنی حرمان نصیبانہ آہ کا اسے پر تو قرار دیا ہو جس کا انتقام "آمدِ خط" کی معشوقانہ "سرد بازاری" کے بعد وہ اپنی "نسبت" کی گرم بازاری کے ذریعے لینا چاہتی ہو! اور اپنے چیلنج کا یوں فاخرانہ اعلان کر رہی ہو کہ ع

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد کیا بازار دوست!

آزاد صاحب احتساب فرماتے ہیں، کہ :۔

" ایسے اشعار کو برے معنی پہنانے کس کا قصور ہے؟ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایک مرد نے اک مرد کے حسن کی تعریف کر دی ہے، اور بس!"

"اور بس" نہیں! یہ معاملہ ۱۴ برس کے جیلخانے تک طوالت پذیر ہو سکتا ہے! پھر اس اصول کی وسیع المشربی کے تحت گنتی، بندر کے ساتھ تشبیب بھی قابلِ قبول ٹھہرے گی، اس لئے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ کسی "تشنگیا" یا بندریا کا دل اپنے ہمجنس "تشتیاں" پر نہ آگیا ہوگا، اور اردو کے کسی ترجمانِ انس و جن اور ہمزبانِ وحوش و طیور غزل گو نے ان نیکبختوں کے جی میں اپنا جی ڈال کر ان کے وارداتِ دل کی تصویر کھینچ دی ہو گی! اردو غزل گوئی کا یہ ممکن ارتقاء، اس "ڈارونیت" کے ظہور کی بشارت ضرور دے رہا ہے!

آزاد صاحب اسی گفتگو کی تقریب سے ایک جگہ یوں کہتے ہیں :۔

"آپ اس عیب (تعشق مابین زن و مرد یا مرد و مرد!) کو اپنی دیگر اصنافِ سخن، مثنوی اور نظم وغیرہ میں، تو جائز رکھیں، اور بیچاری "غزل" ہی کو اس بنا پر گشتنی و گردن زدنی قرار دے دیں؟!

...سے وہ بھی ممکن ہے! اسی بیچاری غزل کے طفیل میں ہم بیچارے شاعروں کی شاعری قائم ہے! ہم کو حضرت کا سہل الوصول اور اُستاد کا بلند مقام خطاب ملا ہوا ہے! ورنہ عجائب زار ہند کے سوار دنے زمین کا کونسا خطہ ہے جہاں گھنڈی، شاعری کہلاتی ہو!! لیکن ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ غزل سرا اساتذۂ کرام سے غزل کو اسی طرح چھین لینا چاہیئے جس طرح جاہل وجاہد علمائے سوء سے امامت نماز اور طلبرداری وعظ کو! آج نماز باجماعت اور مشاعرہ، محراب مسجد جامع اور کرسیٔ صدارت محفلِ شعراء، آمین اور واہ واہ ڈو ڈو یکساں متقابل شرمناکیاں، بازی گریاں، اور خنکارآفگنیاں ہیں! دورِ جدید کی صبح صادق جلد از جلد اس شپرگانہ شبستانِ عشرت کی بساط اُلٹ دے گی!

آزاد صاحب کی اک ترمیم سُنیئے:-

"اگر مرد جذباتِ عشق ظاہر کرے تو اُس کو افعال وصفات مؤنث ہی استعمال کرنے چاہئیں، مگر غزل میں نہیں، بلکہ دیگر اصنافِ سخن، مثنوی و نظم، وغیرہ میں!"

گویا غزل گوئی میں خلطِ مبحث، دوغلیت، مخنثیت، ہیجڑیت غزل کا ناگزیر شمار ہیں! غزل کو کم از کم "نہ ادبی زنان نہ ائے مردان" کا مصداق ضرور رہنا چاہیئے! کیا غزل گو شعراء کی مجہول الحال جنسیت کو اس ابہام وایہام سے کوئی خاص ربط ہے؟!

آزاد صاحب کی "دلیل چہارم" چرخِ چہارم تک پرواز کر گئی ہے! فرماتے ہیں:-

"دنیا بھر جانتی ہے کہ متغزلین کی شاعری، مجازی شاعری تک محدود نہیں ہوتی۔ اُن کو حقیقی شاعری یعنی متصوفانہ شاعری بھی کرنی پڑتی ہے، اور معشوقِ حقیقی مذکر ہے، اُسے مؤنث نہیں بنایا جاسکتا، اس لئے غزل میں افعال وصفات مذکر کا استعمال صرف بہتر ومناسب ہی نہیں، ضروری وناگزیر بھی ہے!"

کیوں نہو! غزل گوئی کا ہرجائی پن تو لونڈے بازی سے لے کر ؏

فرشتہ صید، پیمبر شکار یزداں گیر

تک پہنچا ہے! ؎

بنگلے زدیم وبہر آنا الحق شد آشکار!
ما را ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود!

تاہم شکر یہ ہے کہ اس سلسلے میں "اللہ میاں" کی صنفیت کی تحقیق پوری طبیابہ تشخیص کے ساتھ ہو گئی! پھر ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خدا یگانہ مردمی اس وجہ غیر متزلزل واقع ہوئی ہے کہ اُسے کسی طرح مؤنث نہیں بنایا جاسکتا!

غزل کے مطالب کی فرسودگی وپامالی کے متعلق حکیم صاحب کی حکیمانہ معذرت یہ ہے:-

"آخر بیچارے غزل گو حضرات نئے جذبات واحساسات لائیں کہاں سے؟ بڑے سے بڑا متغزل بھی صرف اتنا ہی کرسکتا ہے کہ اُنہی جذبات واحساسات کو اپنی قوتِ متخیلہ اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے مدد لے کر اک نئی، انوکھی، دلکش اور حسین تر صورت میں پیش کر دے اور بس، اسی کا نام شاعری اور کمالِ شاعری ہے!"

تُف برایں شاعری! ولعنت برایں کمالِ شاعری!! ...... آہ "بیچارے غزل گو حضرات"! یہ حضرات جب تک پیرِ فرتوت بنے، بیٹھ گئے۔ کوچۂ عشق وجانبازیٔ عشق کی رزمگاہ میں قدم نہیں رکھ سکتے! اگر رکھیں گے بھی تو اُن کے ممکنات اس سے زیادہ وقیع نہیں ہوسکتے کہ بخیالِ مولانا حالی ؏

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی! ان بزرگوں کو قال سے پرے کوئی حال نصیب نہیں! لیکن حقیقی ونفس الامری شخصی احوال وواردات کے ساتھ تو رنگِ تنوع لازم وملزوم ہے! جو لوگ دوسروں کے حجابہائے عروسی کی داستانیں بیان کیا کرتے ہیں اُن کی وابستگی دوسروں کی روایات کے ساتھ ناگزیر ہے! ——— "اُستاد یوں ہی طرح باندھ گئے ہیں" کی بانگِ بے ہنگام میں ہم بھی "ہزماسٹرز وائس" ہی سُنا کرتے ہیں! یہ کیسے قاہر وقاتل اُستاد ہیں جنہوں نے ہمارے شعرائے کرام کے چشم وگوش، زبان ودہان، دل وروح، اور اُن کے حرمِ خلوت تک پر پہرے بٹھا دیئے ہیں! ہم تو اس کے قائل ہیں کہ ؎

میانِ عاشق ومعشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست!

اگر غزل سرا عشاق کو بیچ بیچ کسی نگاہِ دل جو کی معیت نصیب ہوتی تو "ہر لحظہ برنگِ دگر آں یار برآمد" کی جدت وندرت قدم قدم پر مسموع ہوتی مگر یہاں تو۔

اُن کی حالت وہ ہے جیسے کوئی بزدل خواب میں
"چور آیا، چور آیا!" چیختا ہے چونک کے

اور گھر کے جس قدر ہیں در و دیوار ہیں وہ زرد
اپنے اپنے بستروں پہ پڑتے ہوں جوں بیمار زار

آزاد صاحب یہ فرماتے ہیں:۔

"غزل اگر صنفِ سخن سے محو کر دی جائے تو بہر حال ان جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے کوئی دوسری صنفِ شعر تلاش کرنی پڑے گی۔ جب ایسا ہی ہے اور ضرور ایسا ہی ہے، تو پھر غریب غزل ہی نے کیا قصور کیا ہے جو آپ اس کو حلال کر ڈالنا چاہتے ہیں؟"

جواب سنیئے:۔ یہ دوسری صنفِ سخن اپنے بیرونی قالب میں اپنے اندرونی قلب کے ساتھ فطری ربط رکھے گی اور غزل کی مطلوبہ اصلاح عمل میں آجائے گی! غزل و تغزل کو مٹانا یا اس کو حلال و حرام کر ڈالنا کون چاہتا ہے! اس کی [illegible] جیسے غزل و شعر اہی مسخ کر رہے ہیں، [illegible] سے تا دمِ تبدیلیٔ لباس، [illegible] کوئی ضروری و اہم اصلاح، ادب نہیں!؟

آزاد صاحب کا شکوہ ہے کہ:۔

"دشمنانِ غزل ہیں کہ ان تشبیہات (غنچۂ دہن، موئے کمر، شمشاد قد، صراحی گردن وغیرہ) کا اک خوفناک مجسمہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم غزل سے نفور ہو جائیں؟"

خاطر جمع رکھیئے جناب! مروجہ مسخ غزل سے آپ اس وقت تک نفور نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کی یہ مختل و مضحکہ خیز فطرت آپ کے شاملِ حال ہے! نیز جب تک کہ غزل گو یا نہ تکبندی کو شاعری بلکہ استادی کی آسان فتحمندی نصیب ہے! تاہم یاد رہے کہ آپ گزشتہ نسل ہی کے باقیات سیئات کے اندھوں کی محفلِ مشاعرہ میں شمعِ مشاعرہ بن سکتے ہیں! اندھوں میں کانوں کا راج اب کے دن کا مہمان ہے! "ہمدوشِ پیمبری شاعری" کب تک ردیف و قافیہ کی بازیگری کے ہم معنی بنی رہے گی!! ؎

دہانِ یار کجا و زبانِ سوسن کو
نہ ہر کسے کہ بخندد، مقرری داند!

ایک طرفہ نکتہ سنیئے:۔

"شعراء کے ساتھ متشاعرین (غزل گو) کا وجود بھی اسی طرح لازم و ضروری ہے جس طرح نور کے ساتھ ظلمت کا۔"

گویا غزل کی لغویتیں، غزل کی دلربائیوں کو نمایاں کرنے کے لئے ارادۃً قائم رکھی جاتی ہیں، ایک حسینہ کی ٹھگی ناک جیسے خط و خال چہرہ کو چمکانے کے لئے شاید ایک کلیہ مشاطہ گری کا ہے!

آزاد صاحب فرماتے ہیں:۔

"متشاعرین کے برخلاف حقیقی شعراء ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں..... بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پیغمبروں کی طرح عند الضرورت کبھی کبھی مبعوث ہوا کرتے ہیں!"

کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ! ردِ غزل گوئی میں جوش نے جن حشرات الارض کے ہم نشینِ شعراء کا حوالہ دیا ہے وہ شاید عہدِ عتیق کے سارے انبیائے سابقین ہیں جو ختمِ نبوت کے علی الرغم ابھی پنپ رہے ہیں! ہر صدی کا آغاز ایک لاکھ، ان چوبیس ہزار انبیاء کے حصے میں تو فی نبوت ایک ایک لمحہ بھی نہیں پہنچے گا! پھر آپ ان میں سے کس کس کو مفتری و دجال کہہ سکیں گے؟ مشاعرے کی لنکا میں کسی کی پیمائش باون گز سے کم نہیں!!

آزاد صاحب مسندِ صدارتِ مشاعرہ سے شمعِ مشاعرہ کی روشنی میں تنبیہ فرماتے ہیں:۔

"ایسے بلند فطرت شعراء کو پست خیالی اور بوالہوسی کی اشاعت کا ذمہ دار قرار دینا چاند سورج کو نشرِ ظلمت کا ذمہ دار ٹھہرانے سے ہرگز کم نہیں:

ہم تو بلا شبہ انہیں بوالہوسی سے بھی متہم نہیں گردان سکتے! بھلا ہفتاد سالہ استادانہ غزل سرائی کے اندر تجربے کی بھی کہاں گنجائش ہے! سوائے شیطان کی مار کے! ٹیگور نے پیری کے نزولِ اجلال پر اک خیر مقدمی سپاسنامہ لکھا ہے جس کے اک سادہ اردو ترجمے کے بعض شعر یہ ہیں:۔

دریائے زندگی میں بلا کا تھا پیچ و تاب
دھارے پہ جا رہی تھی مری کشتیِ شباب

امواج کی کشاکشِ پیہم سے جوشِ شوق
مصروفِ دید تھی یہاں نظارہ ہائے آب

جتنے قویٰ نے جسم تھے بے حس سے مشتعل
آرام کی تھی سُدھ، نہ خیالِ سکون و خواب

اب ختم ہو گئی ہے جوانی کی کشمکش
وہ شورشِ شباب ہے بالکل سکوں مآب

یعنی دورِ جسم ختم ہوا، دورِ جاں ہے یہ
آیا ہے اب دماغ مرا بر سرِ شباب!

زیرِ حجاب جتنے معانی تھے اس سے قبل
وہ اب نگاہِ شیب کے آگے ہیں بے نقاب!

پیری کو میں سمجھتا تھا ہے شامِ زندگی
اس نے کیا ہے ایک شبستان کا فتح باب!

دریائے پُرخروشِ شباب اب ہے اک سراب
طالع ہے ابرِ تیرہ سے تابندہ آفتاب!

صد شکر دن وہ بیت گئے جب بزورِ شوق
ہر صبح اضطراب تھی ہر شب تھی اک عذاب!

وابستۂ دماغ ہوں اب دل کو چھوڑ کر
اب ڈر ہے آشنائی پہ ساحل کو چھوڑ کر!

اگر تفاوت رہ کو دیکھنا ہو کہ از کجاست تا بکجا" ہے تو ایک ایرانی غزل گو شاعر اک صمیمہ زیادہ ہو تسکین کا حسب ذیل نمونہ علاوہ بشباب ملاحظہ فرمائیے! ۔ ؎

گر چو پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر تا سحر گہ ز کنار تو جوان برخیزم!

آزاد صاحب کی شاعرانہ مردم شماری کی رپورٹ کا ایک اقتباس سنیے!:۔

زمانہ حال کے بلند فطرت اور بلند خیال شعراء کی فہرست حسب ذیل ہے۔

جناب بیخود دہلوی، حضرت جگر مرادآبادی، مولانا وحشی شاہجہانپوری، مولانا حسرت موہانی جناب آرزو لکھنوی، جناب صفی لکھنوی . . . . جناب سالک مدیر انقلاب لاہور!

استغفر اللہ! استخوان فروش اُستادان عتیق حضرت بیخود دہلوی کو عہد حاضر کے شعراء

خدا نخواستہ اپنا میر مشاعرہ کیوں بنانے لگے! آزاد صاحب کی طرف سے اس تجویز صدارت میں خود بعد میں معنوی اعزازی بنانے کی پیشبندی کا کام کر رہی ہو تو اور بات ہے! لیکن دوسروں کے لئے حضرت بیخود کی تاجپوشی کیونکر طالب اطاعت ہوسکتی ہے! حضرت آزاد اور حضرت بیخود کے درمیان یہ سمجھوتا بالکل قدرتی بات ہوگی کہ ؏

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو!

پھر وحشی، آرزو، صفی، حتٰی کہ حسرت کو بھی کون عہد جدید کا شاعر کہتا ہے! یہ سب اسی کہنہ تغزل قدیم کے مجاوران جدید ہیں بننے کو سمجھ کی بندو رو، روئیدگی گل نخستین بہار نہیں ہوسکتی! رہا جناب سالک، مدیر انقلاب، کے سر استادی کا سہرا، تو ممکن ہے کہ یہ اس حساب دوستاں در دل کی داد و ستد ہو کہ جناب سالک نے شاید بلا اخذ اجرت اشتہار حضرت آزاد کے بعض غزلیات پر تقریظ لکھی ہیں

جناب آزاد نے اس سلسلۃ الذہب میں حضرت فانی بدایونی کا نام نامی بھی لیا ہے! ہم حیران ہیں! ارے لوگو، کیا فانی بھی! مرگھٹ کا رونے والا فانی بھی!! ؏

دریغا آبروئے شعر گر فانی سخنور شد!

البتہ حضرت جوش پر مفت کرم داشتن کی وجہ ہماری سمجھ میں نہ آئی! ؎

ہر کسے را نام معشوقے کہ ہست

می بُرد، معشوق ما را نام نیست!

جوش پر خروش کے نزول اجلال کی تاب بھلا یہ دقیانوسی بزرگ کیا لاسکیں گے! ؎

ہوشیار! اپنی متاع رہبری سے ہوشیار!

ای خلش نا آشنا پیری و شیب ہرزہ کار!

غزل کا قصیدہ سے

غزل کا ہر شعر بجائے خود اک مختصر نظم ہوتا ہے!

غزل کے ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو بھی کیوں متدست و گریباں کیا جائے، اور کیوں نہ ہر مصرعے کو بجائے خود اک مختصر تر نظم بنا دیا جائے! جی ہاں، اُستادوں کا تو اک اک حرف اک جہان معنی اپنے اندر رکھتا ہے! ہمیں خوف ہے کہ متغزلین کا یہ اختصار و ایجاز، یہ اشارے اور کنائے" اپنے آئندہ ارتقائے بلاغت میں کہیں گونگوں کی غائیں غائیں نہ بن جائیں! اور ہر حرف ناتمام کہیں یہ بس ہزار داستان در آغوش نہ ہونے لگے! ـــــ داستان اُن کی جیسی غیر ناطقی" کی!

آزاد صاحب کا کہنا ہے کہ اختصار بیان کے لئے ہم نے تقریباً ایک درجن اصناف سخن میں سے صرف غزل کو چُن لیا ہے!

ہم نے مانا، لیکن سوال یہ ہے کہ تفصیل بیان کے لئے کون کونسی کثیر التعداد اقسام نظم کا انتخاب عمل میں آیا ہے! جو فہرست پیش کی گئی ہے وہ برائے بیت ہے! قطعہ، مثنوی وغیرہ یہ متقدمین کا میدان تھا، یا موجودہ غیر متغزلین کا! غزل گویوں کو تو ہم غزل ہی کے ساتھ وابستہ دیکھتے ہیں! وہ غزلیات کا پورا دیوان۔ از ردیف الف تا یا ـــــ انشا کر ڈالتے ہیں اور اگر عمر اور تضییع اوقات کی ہمت رفاقت کرتی ہے تو بار دیگر اک دوسرا دیوان سیاہ کرنا شروع کر دیتے ہیں! حضرت فانی کا تو اولاً ایک دیوان ضائع ہی ہوگیا تھا لیکن غزل نویسی میں اُن کی روانی "واختصار بیانی" دیکھیے کہ انھوں نے جلدی جلدی اک دوسرا دیوان غزلیات دھر گھسیٹا! اور گزشتہ معنی خیز حادثۂ تقدیری کو چیلنج کرتے ہوئے اُس کا نام "باقیات فانی" رکھا! جو شاعر اپنے زندہ دل و جگر کے اک پوری ارژنگ چین کو فانیات فانی تسلیم کرلے، معلوم ہے کہ باقیات کی بھی اُس کی نظر میں کیا وقعت ہوگی! اجی گھر کی کھیتی ہے خود روئیدگی ہے! اگر تھوڑی گاؤ خورد ہوگئی تو پروا کیا ہے!

آزاد صاحب غزل کی مزعومہ خصوصیت، ایجاز بیان، پر زور دیتے نہیں تھکتے۔ لیکن حرف و حکایات تغزل میں اور اجمال بیان! ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ؏ افسانہ آں شبے کہ بیار گزشت۔ والی حکایت لذیذ بھی کیا اس قابل نہیں کہ اس کے بیان میں "دراز تر گفتن" سے کام لیا جائے!! خدا جانے مکالمہ با معشوقہ و غزل کے راوی اپنی زندگی کی دلچسپ ترین سرگزشت کی تفصیل سے کیوں اس قدر گریز کرتے ہیں! اختصار و ایجاز کا پردہ وہ کس خشک بیانی گفتہ واردات پر ڈالنا چاہتے ہیں!! کیا ہم فرض کرلیں کہ دیکھنا ہے سرو پا جانی کا راز

پیدا کر سکے

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ؛
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں ۔ !

تاہم آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ اگر قافیہ تنگی نہ کرے تو غزل کے اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں !!

وائے بر حالِ شاعری و قادر الکلامی جو قافیے کے رحم پر ہو ! پھر کہنے والے کیا غلط کہتے ہیں کہ غزل میں صرف ردیف و قافیے کے لئے مطالب و مضامین لائے جاتے ہیں نہ کہ مطالب و مضامین کے لئے ردیف و قافیہ !

مثنوی کی تعریف و تنقیص بیک وقت ملاحظہ فرمائیے ! ارشاد ہوتا ہے :

" مثنوی تو ہماری شاعری میں وہ ہمہ گیر و کارآمد صنف ہے جس میں ہر قسم کے چھوٹے سے بڑے اور طویل سے طویل خیالات ، بلکہ افسانوں ، داستانوں ، اور تاریخوں تک کو نظم کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے اور ایسی تمام اصنافِ سخن جن میں طویل یا حقیر خیالات و واقعات تسلسل کے ساتھ منظوم کئے جاتے ہیں یقیناً نظم ہی کہلانے کی مستحق ہیں " :

سبحان اللہ ! طویل یا حقیر خیالات و واقعات !! ——— مثنوی سحر البیان ، مثنوی گلزارِ نسیم ، مثنوی معنوی ، فردوسی کا شاہنامہ ، ہومر کی ایلیڈ حقیر خیالات و واقعات کا پشتارہ ہیں !! آپ کی خبط و بے ربط غزلیں کوئی ٹکے سیر بھی نہیں پوچھتا ، حالانکہ مذکورہ بالا مثنویاں بین الاقوامی ادبیات کے شاہکار کہلاتے ہیں ، اور یہ مثنوی گو شعراء " پیمبرانِ شعر " !

پھر ہم حیران ہیں کہ ابھی چند صفحات اُدھر تو ہمیں بتایا گیا تھا کہ نظم بخلافِ غزل کے " تقسیمِ طاقتِ خیال " اور " پستیٔ مرتبہ شعریت " کا خمیازہ رکھتی ہے ۔ لیکن اب وہ " ہمہ گیر صنف " ہو گئی ؟ اور " انتشارِ قوتِ خیال " اور " زوالِ منزلتِ شعر " کا آمرا بھی بن گئی ! ——— یہ فقدانِ حافظہ کبر سنی کا نتیجہ ہے یا کسی اور علت کا لازمہ ؟ !
پھر سوچئے تو کہ " بار بار گزشتہ افسانۂ شب " کی روایت بالا ایجاز آخر کیا معنی رکھتی ہے ؟ ! ؎

بیخودی بے سبب نہیں غالب کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے !

ہمارے جذبۂ حیرت کو کسی طرح تسکین نہیں ہوتی کہ ایجاز و اختصار کے لئے منتخب کیا جاتا ہے غزل کو ؟ ! گویا " حکایتِ لذیذ " کو کوتاہ بیانی کے لئے ! لیکن پھر اسی ایجاز و اختصار کا انتقام آپ اک بے پناہ تکرار و اعادے سے لیا کرتے ہیں ، اور دو غزلہ و سہ غزلہ کی دراز نفسی شروع کر دیتے ہیں ! بلکہ الف سے لے کر یا تک ساری ابجد کے وسیع میدان کو اپنے ماشاء اللہ مختصر دواوین میں قطع کر دیتے ہیں ! پھر غضب سے دیوان پر دیوان کا طومار تیار ہوا کرتا ہے ! یہ ایجاز و بلاغت ہے کہ پابے نتیجہ بے معنی گوئی ؟ ! جس سے آپ کا مضمون برابر تشنہ رہتا ہے اور آپ کو " ٹمیٹری " کی طرح بار بار غزل کے تالاب میں سر مارنا پڑتا ہے ؟ ! آپ کے ہاں یہ " دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من " کی کیا بوالعجبی ہے ؟ ! آیا شعرائے کرام خود بھی اپنے حقیقی وارداتِ قلب سے آگاہ ہیں ؟ !

خیال کا اک دلچسپ پلٹا دیکھئے ! فرماتے ہیں :۔

" ہم مانتے ہیں کہ کسی خیال کو ربط و ضبط کے ساتھ مسلسل ادا کرنے میں جزئیات کا احاطہ کرنا پڑتا ہے ، اور جزئیات کا احاطہ بھی کوئی آسان کام نہیں " !

یہی جزئیات کے " احاطے " کا کارِ دار کا کارنامہ ہے جس کی نسبت آزاد صاحب قبل ازیں یہ طعن فرما چکے ہیں کہ نظم گو شاعر بھی کون سا تیر مارتے ہیں ! کیا اُستادانہ اصولِ جنگ بھی یہی ہے کہ اپنے اور فریقِ مقابل ہر دو کے دلائل باوقاتِ مختلف کام لیا جائے ؟ ! کیا جس مورچے کو آپ بزعمِ خویش مسمار کر چکے ہیں اُسی کے پیچھے اب پناہ لینا چاہتے ہیں ؟ ! ہاں ٹھیک ہے :۔ غزل گو شعراء کی غزل کے مختلف اشعار کا جس طرح مسلسل و ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں اسی طرح اُن کے شاعرانہ استدلال کا باہم مربوط ہونا بھی کیوں لازمی ہو ! بقول جگر کے " غزل کا مقام زمان و مکان سے پرے واقع ہوا ہے " !

اب حضرت آزاد اک صفِ ماتم پر منتقل ہو جاتے ہیں اور اس طرح نوحہ کرتے ہیں :۔

" ماتم کرنے کی جگہ ہے کہ مغرب زدگی نے مخالفینِ غزل کے ذوقِ صحیح و وجدانِ سلیم کو اس درجہ مسخ و مفلوج کر دیا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

بلاشبہ مروجہ غزل و تغزل ماتم کرنے کی چیز ہے ! " مغرب زدگی " کی تپٹنٹ دلیل سے کام نہ چلے گا ! ہم آپ کو کیسے بتائیں کہ " مشرق زدگی " اس سے زیادہ شیطان کی مار ہے ! مغرب تو صرف اک جنوں ساماں جوان ہے لیکن مشرق تو اک متعفن لاش ہے ! ؎

مغرب خراب و مشرق ازاں بیشتر خراب !

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ !

آزاد صاحب اک ماہرِ مشرق و مغرب بلکہ لیکن اک مغرب ہی کی ساختہ عینک

فرماتے ہیں۔

کہ ہمارے حضرات غزل کو جو ایک خالص ایشیائی چیز ہے، مغربی عینک لگا کر کیوں دیکھتے ہیں؟

واضح ہے کہ غزل اگر حرف و حکایتِ محبت ہے تو وہ ایک مشرقی و مغربی، آفاقی گیر انسانی عنا صرِ عمل در رہا ہے، اور ہندوستان یا ایشیا کے لئے مخصوص نہیں! بشر طیکہ ایشیا کے ہر خطے کے حدود دار ہو، غزل گویا جزیرے میں دلی و لکھنؤ کی چند گلیاں نہوں، جو شاعروں کے اڈے ہیں! سبحان اللہ، محبت کی گفتگو اور تغزل محض اور خالص، بالخصوص تو یہی ہے، ایک ایشیائی چیز!! سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مشرق، بالخصوص ہندوستان، اپنی مروجہ مجلسی معاشرت کے نتیجے میں اُن صحبتوں اور رنگین مکالموں سے بیگانہ ہے جو تغزل کا ساز و برگ، اور آب و رنگ ہیں! ؎

گرگِ دہن آلودہ و یوسف نہ دریدہ!

حکیم آزاد صاحب کے، شاید بحیثیتِ طبیب کے، بعض خاص تجربات سنیئے۔

خاص خاص حالتوں میں اکثر مشاہدے میں آیا ہوگا کہ انسان وقت واحد میں رو بھی رہا ہے اور ہنس بھی رہا ہے! (بتقریبِ توجیہہ انتشار بیاتی غزل!)

ایسا انسان ہماری تشخیص میں تو کوئی بڑا ہی عجیب الخلقت حیوان ہے جسے کسی نے کبھی کبھی کسی دار المجانین یا باغِ وحوش میں دیکھا ہوگا؟

اسی ضمن میں آزاد صاحب ہمیں مزید دعوتِ نظر دیتے ہیں کہ اکثر دیکھا ہوگا کہ جب بچھڑے ہوئے دو عزیز مدت کے بعد ملتے ہیں تو بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں، اور جب تک دلوں کی بھڑاس نکل نہیں جاتی اس گریۂ مسرت کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا!

تاہم ہم نے کبھی یہ نہ دیکھا ہوگا کہ گلے ملنے والے ایک ہی سانس میں روتے بھی ہوں اور ہنستے بھی! غالباً یہ مشاہدہ بھی غایت درجہ غیر اغلب ہے کہ وہ ایک سانس میں آہ کرتے ہوں، اور دوسری سانس میں واہ! یہ اختلاطِ جذبات نہ ہوگا، اختلالِ حواس ہوگا! رونے والے جب تک روئیں گے تو روئیں گے ہی اور جب ہنسیں گے تو ہنسیں گے ہی! ہم انسانی جذبات کی ہمواری سے تو واقف لیکن "تداخلِ جذبات" سے نہیں! ہمارے نزدیک یہ تو ممکن ہے کہ ؎

خندہ در دہن و گریہ در گلو باشد!

تاہم دہن و گلو کا مکانی فصل اور نتیجۃً زمانی وقفہ بہر حال باقی رہے گا! خود آزاد صاحب بے خبر اور اس حقیقت سے با خبر ہونے کا اظہار کرتے ہیں جبکہ وہ اس خبر کا التزام کرتے ہیں کہ جب تک دلوں کی بھڑاس نکل نہیں جاتی!

—— لیکن اگر بفرضِ محال خدا نخواستہ غزل والا معاملہ ہونے لگے تو شعر جیسے ایک گروہ گرد ان چھوڑ کر بھاگ جائے گا! بے تکلف ہر طرف تماشا اک نیا جنوں وہی ان نفسیاتی حرکاتِ مذبوحی کی آشفتہ رفتار کا تماشا دیکھئے۔ ارشاد ہوتا ہے!۔

ہم ایک ایسا شعر پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے ایک انسانی دل و دماغ بیک وقت چار چار یا چار سے بھی زیادہ متضاد خیالات و جذبات کے متمول ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا ہے؟

نہایت ادب کے ساتھ ہم، محض بتقاضائے اعلانِ حقیقت، اس تنگ نوائی پر مجبور ہیں کہ چار کیا چالیس خیالات و جذبات کا بوقتِ واحد کسی ماؤف دماغ پر مسلط ہو جانا طبی امکانات سے خارج نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے دماغوں کی رسنیابی امراضِ دماغی کے اسپتالوں سے باہر بھی ممکن ہے؟ آپ ایک شعر کو اپنا سنگِ بنیادِ حجت بنانا چاہتے ہیں، لیکن ایک فرسودہ و کرم خوردہ استادِ غزل کی نفسیت انسانی دماغ کا کوئی اچھا نمونہ نہیں! البتہ اگر کسی دماغِ مختل کے سازِ شکستہ کے ایک ایک پھٹے پردے سے بیک وقت اگر ۱۰، ۲۰، ۳۰، ۴۰ بے پرواہ نکلنے لگیں تب بھی محلِ تعجب نہیں!

آزاد صاحب ایک لاجواب سوال قایم کرتے ہیں۔

"اگر بوقتِ واحد ایک سے زیادہ خیالات و جذبات کسی انسانی دل و دماغ میں نہیں سما سکتے تو فرمایئے کہ اتنے کیفیات کا حامل یہ منقولہ بالا شعر کیونکر موزوں ہو گیا!!"

کتنی قابلِ رحم خوش فہمی! گویا شعر ردیف و قافیہ کے بہم پہنچ جانے سے موزوں ہو گیا!! آپ سے کون کہے کہ ذوقی ہمنوائی کے علاوہ ایک ذہنی ہم آہنگی بھی ہوا کرتی ہے جو شعر لکھنے کی طرف اشعر کے چلنے کے لئے بھی ناگزیر ہے! اچھا فرمایئے آپ استاد ناسخ کی اس بیت موزوں میں کون سا موزوں شعر نکال سکتے ہیں؟ ؎

ٹوٹی دریا کی کلائی، زلف اُلجھی بام میں!
مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں!

ارشاد ہو کہ یہ شعر آپ کے پیش کردہ شعر سے کم موزوں ہے؟!
لعنت بریں موزونیت!!

آزاد صاحب کی اک دلیل دویم ملاحظہ فرمائیے:۔

"کہ غزل صرف ایک سانس یا آنِ واحد میں تو لکھی نہیں دی جاتی، اس کے سوچنے اور لکھنے کے لئے بعض اوقات دس دس دن، پندرہ پندرہ دن کی طویل مدت درکار ہوتی ہے!"

اللہ اللہ! ہمارے کہنہ مشق و قادر الکلام اساتذۂ کرام ۱۰، ۱۵ دن کے فاقوں میں ایک غزل فرمایا کرتے ہیں! اگر مشاعرے کا تازیانہ نہ ہوتا تو تلاشِ مضمون میں وہ شاید عمر بھر ایک غزل کی تکمیل بھی نہ کر سکتے: اُن کی غزل کی پس پشت کوئی "افسانۂ آن" ہے کہ بایں گزشت تو ہوتا نہیں، اُس کے پیشِ نظر تو غوغائے آن ہم ہی ہوتا ہے جو "در مشاعرہ گزشت"! ـــــ یا للعجب! انسان، اور شاعر ایسے ہمہ تن شعور انسان، کے نصف نصف مہینے کے بیشمار و گوناگوں واردات و کیفیات، اور سب ایک واحد غزل کی تنگناتے میں سر کھپائے پڑے ہوئے ہوں! محض اس وجہ سے کہ ایک ہی ردیف و قافیہ کے "مزے" اور موڑے بیسے باندھ دیئے گئے ہیں! مناسب ہو کہ ہمارے شعرائے متغزلین اپنی غزل کو معلق ہی رکھا کریں اور کبھی اُس کا مقطع نہ لکھا کریں! کیوں نہ پندرہ دن کو گھٹا کر کے ساری عمر طبیعی پر وسیع کر دیا جائے، اور اپنے جشنِ ولادت، جوانی، جوبلی، اور وفات حسرت آیات سب کو ایک ہی غزل میں سمیٹا جائے! ـــــ پھر یقیناً اُس کا ایک ایک مصرعہ "ہزار داستان در آغوش" ہو گا!

آزاد صاحب کا اسی سے پیوستہ فقرہ یہ ہے:۔

"جب ایسا ہے اور فی الواقع ایسا ہی ہے، تو اس سے بالبداہت ثابت ہوتا ہے کہ . . . :"

اس "فی الواقع ایسا ہی ہے" سے دانیش مشاعرہ کو اندازہ کر لینا چاہیئے کہ محفلِ شعراء کے انعقاد سے کتنے دن پہلے انھیں "مصرع طرح" کا اعلان کر دینا چاہیئے! "بالبداہت" یہ مدت نصف ماہ سے زیادہ ہونا چاہیئے! شعرائے عظام کی دماغ سوزی اور ذہنی فاقہ کشی اور صرف ایک عدد مولودِ غزل کے ایامِ حمل و وضع حمل کی کمترین مدت ۱۵ دن ہے: طُوبیٰ لَکُمْ یَا تَلَامِیْذَ الرَّحْمٰن!

حکیم آزاد صاحب کی، اپنے ہی دل و دماغ کی تشخیص و امتحان ملاحظہ فرمائیے!

"انسانی خیال مطلق بے لگام و بے مہار ہوتا ہے! . . ... بے لگامی اور بے مہاری اُس کی فطرت میں داخل ہے! اگر اس کو بجبر و کوشش روکا نہ جائے تو ٹھیک ایک سکنڈ کے لئے بھی وہ ایک مرکز پر قایم نہیں رہ سکتا!"

متعارف غزل ہی حقیقتہً اک بادِ ہوائی تیر اندازی ہے جہاں ردیف و قافیہ کی چہار طرفہ ہوائیں مختلف ابیات کو شش جہت میں پھینکتی رہتی ہیں! پس بے لگام گھوڑا اور بے مہار شتر ہو گی، آپ کی غزالۂ غزل، نکہ خدانخواستہ انسانی خیال و دماغ! ایسے انتشارِ ذہنی کی حالت میں کوئی شاعر کمہ مانرہ قلم چھو نیگا نہیں، تا آن کہ اُس کی فکر یا اُس کا احساس ایک نقطۂ ماسکہ پر مرکوز ہو کر نزرہ جائے، جس سے اُس کو اک طویل سیر حاصل نظم لکھنے کے بعد بھی بمشکل نجات ملتی ہے! آغازِ خامہ فرسائی سے قبل شاعر کی نفسی یکسوئی اور قلبی جذب و انجذاب کا عالم یہ ہوتا ہے: (جوشش کی دو وارداتی نظموں کے مطلعے!)

(۱)

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں! اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں!

(۲)

اُف! دفعتہً یہ کس سے ہماری نظر ملی! مدت کے بعد لذتِ زخمِ جگر ملی!

دل و روح کی یہ گرفتاری اُس آوارگی اور ہرزہ گردی کا موقع کہاں دے سکتی ہے جو گرزِ مشاعرہ غزل بازشعراء کی مصیبت ہے؟! غزل سازیں تکبندوں کا نفسی تازیانہ سوائے مشاعرے کے اعلان کے کوئی اور چیز بھی ہے؟! یہ ہمارے "پیمبرانِ سخن" کا خیر سے "لمحۂ شاعرانہ" ہے! جس کی بشارت ۱۵ دن پہلے سے مل جانی چاہیئے! اور پھر دیکھئے اندازِ گُل افشانیٔ گفتار!

غالب نے جس شاعرانہ "کانِ جواہر" اور جس "معدنِ جگر" کا ذکر[1] کیا ہے اُس کی متاع کُش مخز ہمارے عام متغزلین کے ہاں یہ ہے: (بروایت جناب آزاد!)

"ہر ادیب کو، خواہ وہ ناظم ہو یا ناثر، کبھی معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، اور کبھی الفاظ کے لئے معانی!"

گویا اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا، صرف فضول گوئی کے لئے فرضی مافی الضمیر کا اک ڈھونگ ہوتا ہے! کیا معنی و خیال کی یہی وہ بازیگری ہے

---

[1] سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے؟
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو! — غالب

[illegible] ہزار [illegible] ریں ہے !!

[illegible] ان مہ آغوش، یا دس ہزار باطل پرور دوش ؟!

الغرض ساری غزل گوئی ردیف و قافیہ ہی کی ہے اور اپنی تمامی تعدیلو تغیروں میں انہی کے رحم پر! شاعر ان کا محض اک بے جان آلۂ کار ہے خود یہ مقولہ و کمالات اس کے اسلحہ خانہ نہیں !! پھر سخن گفتن چہ سود ؟! و خیالاں پختن چہ حاصل ؟! مطلب یہ ہے کہ شاعر کو جانا کہیں بھی ہو، چلنا پڑیگا اُسے شعر کے قوافی و خوا رتم کی ہی پیشگی طے شدہ راہوں پر ؟! پھر چاہے وہ اُسے اپنے گھر پہنچا دیں! یا کسی جنگل میں "اندھا جیسا" بنا کر چھوڑ دیں! . . . . . . یہ شاعری "بال جبریل" ہوگی یا غول بیابانی ؟!! ہمارے غزل طراز اساتذہ کے لئے تو بھوتوں کا یہی چکر بہترین شغل ہے بقول

ہزار روزگار مشغلہ بہ در را تماشا کن !

آزاد صاحب کہتے ہیں :-

"ایک اعتراض غزل پر یہ ہے کہ غزل کا وجود فارسی و اُردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا"

بلاشبہ یہ اعتراض ہے، لیکن مُطلقاً غزل پر، اپنے وسیع ترین تصور میں، نہیں! بلکہ متعارف و مُتداول غزل پر! بے ربط و بے آہنگ غزل پر! متضاد و باہم متصادم غزل پر!، مونے کر دکوہ بر ترین والی غزل پر!، اپنے ہجر دوام اور رقیب روسیہ کے غلبۂ مدام والی غزل پر! قاتل شیوہ و قصاب پیشہ محبوب والی غزل پر! ــــ لکہ اُس غزل کی جو ہے ع

افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت ! ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست!

غزل کے بیشمار رقیبوں اور اُن کیساتھ دن رات جوتی پیزار کے معاملۂ رنگین کی تاویل آزاد صاحب اِس طرح فرماتے ہیں :-

"بات یہ ہے کہ انتہائے عشق میں عاشق کے احساسات بہت نازک ہوجاتے ہیں۔ وہ انسان تو انسان، ہوا، گھٹا، دریا، پہاڑ، چاند، سورج باغ، صحرا، طوطا، مینا، کنگھی، آئینہ وغیرہ وغیرہ جس جس چیز کی طرف معشوق کی نگاہ التفات جاتی ہے، سب کو اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے !"

محبوب کے "اسباب خود بینی" کی طول طویل فہرست کی اِس مہیب صف آرائی سے اتنا کاننے کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی! کیا غزل گو شاعر و عاشق کالی گھٹا اور بے ہنگم پہاڑ سے بھی بڑھ کر سیاہ فام و بدہیئت واقع ہوا ہے !! اور طوطا مینا سے بھی زیادہ ناچار و دبلے پر !! سارے کو مم عاشقان میں وہی کیوں محروم ترین، مظلوم ترین، مقہور ترین، مجبور ترین، مبغوض ترین، اور مغضوب ترین، پایا جاتا ہے ؟! کیا غزل گوئی میں کوئی ایسی ازلی و ابدی سیہ بختی و سوختہ نصیبی ہے جو اُس کی قسمت کی باتا ری پر مہر کر دیتی ہے ؟! در اصل یہ غزل کی روایاتی میراث خبیث ہے جو اک متغزل عشق باز کے سارے عاشقانہ مطلعے کو تاریک کر دیتی ہے! اِل یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل باز عاشق کا رقیب روسیہ شاید یہی کالی گھٹا ہے جس سے یہ بیچارہ غالباً ایسا ہی ڈرتا رہتا ہے جیسا کہ رفیو لی بارش سے تاہم دریا اور چاند، شانہ و آئینہ کے اندر تو شاید کوئی تاریک پہلو نہیں! مگر غزل گوئی کی تعلیمِ بزدلی شاعر کا دل دہلاتی رہتی ہے۔ وہ اپنے سایئے سے ڈرنے لگتا ہے، نہ کہ اُس سایئے سے جس کا ذکر ہم یہاں پاتے ہیں کہ ع

با سایۂ ترا نمی پسندم عشق است و ہزار بدگمانی!

غزل کی بے ربطیٔ مضامین کی "داد" حکیم آزاد یوں دیتے ہیں :-

"شاعر کوئی فلسفی یا مورخ نہیں ہوتا کہ اُس کے کلام میں یکرنگی و توافق کا نہ پایا جانا عیب میں داخل ہو !"

لیکن وہ کوئی فاتر العقل ہستی بھی نہیں ہوتا کہ مربوط و ہم آہنگ گفتگو کی اُس سے توقع نہ کی جائے! شاعر فلسفی نہو لیکن فلسفی سے بمراحل زیادہ عارفِ کائنات ہوتا ہے! مورخ نہو لیکن مورخ سے بدرجہا زیادہ ماہر دار حقائق اور نباض حوادث ہوتا ہے! دماغی چولوں کے ایسے ڈھیلے ہونے کی صورت میں شاعر وہ ژرف نگاہی اور بالغ نظری کہاں سے لائے گا جو شاعری کو "جزوے از پیغمبری" بناتی ہے !!

آزاد صاحب اک اور تنقیح پیش کرتے ہیں :-

"چوتھا اعتراض یہ ہے کہ غزل گو، غزل میں اپنے اصلی جذبات پیش کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اُس کو یہ جذبات یا تو اپنے اوپر بہ تکلف طاری کرنے پڑتے ہیں۔ یا پھر اُسے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات حوالۂ قلم کرے !"

ہم کہتے ہیں کیوں نہ کرے ؟! اساتذۂ سلف و خلف ایسا ہی باندھ گئے ہیں ! اساتذہ نے تو محاورات و ضرب الامثال کے حسلا و

اُن کے حسنِ [illegible] خدوخال، ترتیب و نسبت کی
دلفریبی، غمزہ و ادا، اُن کی دلکش شکل و صورت پر دھیان، اور سارے واردات عشق
اور تمامی نفسیاتِ عاشقانہ کو معین و منضبط کر دیا ہے! اب ہمارا غریب غزل گو
تنہا شعر و عاشق گو اس لب و لہجہ Reproduce میں نہ کرے
تو کیا کرے کہ ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں می گویم!

لیکن آزاد صاحب کے "دو گونہ جواب" کا جزوِ اول یہ ہے :۔

اول تو یہ غلط ہے کہ غزل گو غزل میں اپنے جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا!

انکار کس طرح ممکن ہے! ردیف و قافیہ اور شاعرِ متغزل کے درمیان قبل ازیں، سارا اقدام و اختیار اول الذکر کے لئے تسلیم کر لیا گیا ہے!

جواب کا جزوِ دوم سُنیئے :۔

"شاعر کو ترجمانِ عالم کہا گیا ہے، اُس کے لئے اُس کے اپنے خیالات و احساسات تو اک پیش پا اُفتادہ چیز ہیں! اُس کو تو چرند و پرند ....
... غرض ہر چیز کی زبان سے بولنے کی قدرت ہوتی ہے"!

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو یہ امر تسلیم ہے کہ شاعرِ متغزل اپنی ذاتی ترجمانی نہیں کیا کرتا! بلکہ "چرند و پرند" کی عشقبازیوں میں اُن کی عاشقانہ مراسلت کی وکالتاً کتابت کیا کرتا ہے، اور ایسے کمال "نقل مطابق اصل" سے کہ بھیڑ بکری، طوطا مینا ہر جانور کی بولی بولتا ہے! پھر آپ "حیوان ناطق" کی اِسے کوئی تیر تنزلی و رجعتِ قہقری نہ سمجھئے! یہ شاعرانہ "قدرتِ کلام" کا طغرائے امتیاز ہے! ؏

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

پھر غزل سازِ بلند اور "ترجمانِ عالم"!! ـــــ اے سبحان اللہ! مینڈکی کو بھی زکام ہوا! ؏

آنچہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب؟!

کبھی آپ نے اِس منصبِ بلند کا خواب بھی دیکھا ہے؟ یا یہ غزل طرازی کی اُس سنتِ ادبی کی طرف کنایہ ہے جو "سرقۂ مضمون" کا عنوانِ جلی رکھتا ہے! لیکن اک حقیقی شاعر کی متاعِ فکر تو غزل گو ریزہ چینیوں کی کمند کوتہ، اور "تہارو ئے سنت" کی رسائی سے کہیں "بلند اک بام" پر محفوظ ہے!

"ترجمانِ عالم" بھی شاید آپ نے سُن پایا ہے! لیکن آپ بزرگوں کو کون بتائے کہ محفلِ مشاعرہ کی طفلانہ خودنمائی اور عالم کی حکیمانہ ترجمانی کے مابین کتنا ناقابلِ عبور خلا واقع ہے! ؏

قصور عرش پہ ہے، اور سر ہے پائے ساقی پر!

کیا ہمارے غزل گو شعرائے عظام مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی زبان کا یہ خراجِ تحسین قبول فرمائیں گے :۔

جب اُن پہ ہوتا ہے مضمونِ مُبتذل وارد — تو گویا عرش سے اُتری چمار کو بیگار!
ہے ابلہی میں پڑا اک سڑا ہوا مُیتا — اور اُس پہ ٹوٹ رہا اک لشکرِ ناچار!
وہ پشہ خود کو سمجھتا ہے اک امیرِ جبار — اور نابدان کو کہتا ہے قلزمِ ذخار!

آزاد صاحب نے مولینا حالی علیہ الرحمۃ کا نام اپنے مضمونِ زیرِ تنقید میں کئی جگہ استشہاداً لیا ہے کیا ہم فرض کریں کہ آزاد صاحب غزل گوئی کی پامالی و پستی کی طرح اپنے اُستادِ معظم کے مسلکِ ادبی کی بلندی و پاکیزگی سے بھی واقف نہیں؟! بہر حال اگر حکیم صاحب مولینا حالی کی زبان کھلوانا چاہتے ہیں تو ذرا جگر تھام کر بیٹھ جائیں! ہم اُن کا محاکمہ نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں حالی مرحوم فرماتے ہیں :۔

خلف اُن کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں — فصاحت میں مقبول پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہور ہندوستاں ہیں — وہ کچھ ہیں تو لے دے کے ہزل گو یہاں ہیں
کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ اُن کی "غزلیں" مجالس میں گائیں!

مولینا حالی ہی کی نظروں میں شعرائے متغزلین کا جو مصرف ہے وہ بھی سُن لیجئے :۔

جو سقے نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب
ہو میلا جہاں گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب
جو ٹھہر جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے!

"نقاد"

میں دیکھ رہا ہوں

ضیاءالدین احمد سلہری

میں دیکھ رہا ہوں
اس دُنیا میں
مہذب و ترقی پسند دنیا میں
امراء کی وجاہت
اور اُن کا طمطراق
اُن کی رنگینیاں اور اُن کا سامانِ تعیش
اور اُن کی فلک بوس عمارات
جس کی ایک ایک اینٹ
اُن کی عزت کا نشان ہے۔
لوگ بھی انھیں دیکھ رہے
قدر اور منزلت کے جذبے کے ساتھ
اور سراہ رہے ہیں
اُن کے مذاقِ سلیم کو
اُن کے اعلیٰ طرزِ معاشرت کو
مگر اُن کی آنکھیں
اِن اینٹوں کی پوشیدگی میں
اُس مسلے کو نہیں دیکھ سکتیں

جن میں ایوانوں کی استواری
اور محرابوں کی مضبوطی کا راز مضمر ہے۔
آہ وہ مسالہ عبارت ہے
غریبوں کے کچلے ہوئے گوشت سے
اور اُن کے بہتے ہوئے خون سے۔
ہاں ان محلات کا استحکام
اُس کی شان
مزدوروں اور اپاہجوں کی رگوں سے خون خشک کرنے پر
قایم ہے ——
یہ عمارتیں نہیں
غرباکے جسموں کے ڈھانچے ہیں
یہ موسیقی کی لے نہیں۔
اُن کی آہوں اور چیخوں کا ایک غلغلہ ہے۔

~~~~~~

دُنیا اندھی ہے
جو ان مکانوں کے مکینوں کو
اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ حسنہ کا جامع قرار دیتی ہے
~~~~~~

یہ جبار و قہار
فخر و غرور کے پروردہ
کو چوں پر نہیں
بلکہ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے
سینوں پر بیٹھے اُن کا دم گھونٹ رہے ہیں۔
اور میں دیکھ رہا ہوں
انھیں عمارتوں کے عقب میں
اور شمالی جانب
شام کے جھٹپٹے میں
ایک مفلوک گروہ کو آتے ہوئے
جانوروں کا ایک گلا
لہنگوں میں ننگی عورتیں
اور دھوتیوں میں عریاں مرد
سروں پر ٹوکریاں اور پھاوڑے اٹکائے ہوئے
اُن کے چہرے قبر کی مٹی کی طرح افسردہ ہیں
جن میں نہ رنگ ہے
اور نہ جان
عورتوں کی خشک چھاتیوں سے چمٹے ہوئے بچے
کمزوری سے خاموش ہیں
دودھ پینے کے مردہ خواہش کو دبائے ہوئے۔
ماں
ایک غریب مزدور ماں
جس کی آنکھیں عدم کا نشان ہیں
جس کے پپوٹے غبار سے اٹے ہوئے ہیں
اور جس کے آنسوؤں میں اتنی نمی باقی نہیں
کہ پلکوں سے اُتر گالوں پر بہہ سکیں
آہستہ آہستہ
اپنی زندگی کے آخری سہارے کو
آہوں کی لوریاں دئے چلی جا رہی ہے۔

اور میں دیکھ رہا ہوں
ان انسانوں کی جھونپڑیوں میں
قبروں کی ایک لامتناہی قطار کو
ایک خوش نصیب گلی میں
جس کا چولھا گرم ہے
چند لڑکے باہر کھڑے ہیں
آنکھیں پھاڑے ہوئے
اُن بھوکے اور مریل کتوں کی طرح
جو گھروں کے باہر ہڈی پر آس لگائے بیٹھے ہیں
امرا بھی جی رہے ہیں
اور یہ غربا بھی جی رہے ہیں
قدرت، اور یہ ستم ظریفی!
اور میں دیکھنے کو زندہ ہوں
دو انسانی گروہوں کی زندگی
اور ایک خالق کی حکومت کو!
یہ کیسا عدل ہے؟
یہ کیسی خدائی ہے!

کاغذ مہنگا ہوگیا یعنی تقریباً ایک روپیہ فی ریم قیمت بڑھ گئی۔ اس کی تلافی کی صرف دو صورتیں ہیں یا تو چندہ بڑھایا جائے یا خریداروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جائے۔ ناظرین اچھی طرح واقف ہیں کہ ہم نے توسیع اشاعت کے لئے ابتک کوئی درخواست نہیں کی۔ لیکن اب ہم یہ گذارش کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر مئی اور جون میں خریداروں کی تعداد اتنی نہ بڑھ گئی کہ اس نقصان کی تلافی ہو سکے تو ہم یکم جولائی سے چندہ بڑھا دیں گے۔ لہٰذا ہمارے وہ کرمفرما جو یہ چاہتے ہوں کہ چندہ نہ بڑھے اس کی کوشش کریں کہ ان دو مہینوں میں کلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار پیدا کئے جائیں۔ نیز وہ حضرات جو خریدار بننے کا خیال رکھتے ہوں عجلت سے کام لیکر چھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اُنھیں اضافہ شدہ چندہ ادا کرنا پڑے۔

پیرِ مغاں — دیکھ!

ہاں دیکھ، ہر اک ذرہ ہے اک باغ جہاں دیکھ
ہر خارِ مغیلاں پہ ہے جنت کا گماں دیکھ
گلشن پہ ہے گھنگھور گھٹاؤں کا دھواں دیکھ

اور اس پہ یہ لب تشنگیٔ بادہ کشاں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

یوں سایۂ کاکل میں ہے، اک روئے کتابی
جس طرح گھٹاؤں میں جھلکتی ہو گلابی
دے جام کہ ایماں کی ہو خانہ خرابی!

تسنیم کی سوگند سوئے تشنہ لباں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

دن ڈوب چلا، مشعلِ امید جلا دے
اُٹھ پائے صراحی پہ جبینوں کو جھکا دے
کہہ قلقلِ مینا سے کہ تکبیر سنا دے!

ہے وقتِ اذاں وقتِ اذاں وقتِ اذاں دیکھ!!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

ہر دیدۂ گریاں میں تبسم ہے پرافشاں
کیوں کشمکشِ سود و زیاں سے ہے پریشاں
ہر درد کے آغوش میں ہے پیسلیٔ درماں!

ہر چاک ہے اک کارگۂ بخیہ گراں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

مانا کہ مناظر ہیں تبسم ہی تبسم
گو دید کے قابل ہے یہ جلوؤں کا تلاطم
لیکن جو مناسب ہو تو از راہِ ترحم

اِس سمت بھی اے قبلۂ صاحب نظراں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

ہر آن ترانے سے برستا ہے ترانہ
بیتاب ہے، بدمست ہے بےخود ہے زمانہ
کوکو ہے اُدھر اور اِدھر چنگ و چغانہ

یہ نغمۂ نوخیز، وہ گلبانگ جواں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں، پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

ہم چپ ہیں تو مدہم ہیں حسینوں کے بھی جلوے
ہم بہکیں تو چٹکیں گے یہ گلرنگ شگوفے
دانا ہے تو پہلے ہمیں دو گھونٹ پلا دے

پھر عشوۂ ترکانۂ خوبانِ جواں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

خورشید طرب ہے اُفق گل سے نمودار
گاتے ہیں ہواؤں سے لچکتے ہوئے اشجار
آتی ہے گھنی چھاؤں سے پازیب کی جھنکار

رنگ چمن و عربدۂ زہرہ وشاں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

خود پی کے حریفوں کو بھی اک جام پلا دے
وہ جام کہ تفصیل کو اجمال بنا دے
گلرنگ کی اک سامنے دیوار اٹھا دے

کونین کو آ نیم عیاں، نیم نہاں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں، پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

اب نیم نفس بھی نہیں تاخیر گوارا
ہاں جلد پلا، جلد پلا، جلد خدارا
بھرنے ہی پہ ہے ابلقِ ایام ترارا

قبلے سے برستا ہوا آتا ہے وہ پانی!
شوخی ہے، شرارت ہے روا روہے روانی
ہر سو ہے جدائی ہی جدائی ہی جدائی

مستوں کی طرف ہیں ترے مستوں کی نگاہیں
ہاں بہرِ خدا کھول بھی دے رقص کی راہیں
بے جام تو کج ہوں گی نہ رندوں کی کلاہیں!

نغموں سے کوئی ماہ لقا جھوم رہی ہے
شانوں پہ گھنی زلف دوتا جھوم رہی ہے!
یا سروِ خراماں پہ گھٹا جھوم رہی ہے

آموں کی گھنی چھاؤں ہے، کوکو کی صدائیں
سرشار فضا، مست چمن، سرد ہوائیں!
پستی میں گل و لالہ، بلندی میں گھٹائیں!

مُڑنے ہی پہ ہے قافلۂ عمرِ رواں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

گردوں کی نظر ہے سوئے گیتی نگراں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

بانکا ہے تو ایمائے خمِ آبِ رواں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

آ نہرِ جناں، باغِ جناں، حورِ جناں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

برنائی سلمائے جہانِ گزراں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

جوش ملیح آبادی

تاہمکہ اسکے آخری مرحلۂ استدلال میں، جہاں غالب کا اصل نکتۂ نغز ہاتھ میں آکر بیر کھو دیا گیا ہے! ایسے سخن سنج بزرگ غالب کے درپے ہونگے ہیں! کیا ایک یورپین نقاد کا یہ قول کوئی مبالغہ ہے کہ "ہر موضوع پر اک ضخیم تصنیف لکھنے کے لئے وہی لوگ تیار ہوجاتے ہیں جو اسپر قلم اٹھانے کے سب سے زیادہ نااہل ہوتے ہیں"! (ا۔ا۔غ)

(۳) **داغ** چھوٹی کتابی قامت، ۲۱۰ صفحات ضخامت، کاغذ وکتابت وطباعت اوسط،

مؤلفۂ جناب نوراللہ محمد نوزی، مراکز بہمرسانی: (۱) غلام دستگیر، چادرکمان، حیدرآباد، (۲) مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد قیمت عہ

نوراللہ صاحب کی یہ کتاب، داغ دہلوی کی زندگی اور اُنکے غزل گویانہ امتیازات وعام ادبیانہ خدمات پر قرار واقعی بلند آہنگی والتزام تنقیدی کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ یہ "اُستادِ داغ" پر اک سیر حاصل، ہمہ جہت تبصرہ ہے، جو قابل داد سلیقہ و اہتمام سے انجام دیا گیا ہے۔ داغ کے کلام کا تجزیہ، بلحاظِ اصنافِ سخن و بلحاظِ مضامین، داغ کا فلسفۂ زندگی و مسلک ادبی، داغ کی شاعری میں مقامی عنصر، داغ کا اسلوب بیان، داغ کا ہندوستانی زبان میں تعمیری حصہ، ایسے عنوانات ہیں جنکی تصور میں نُدرت بھی ہے اور جنکا اثبات بھی معقولیت و متانت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں شعراء کی سوانح نگارانہ زندگی کے لئے جدید العہد سیرت نویسوں کی رہنمائی کے واسطے یہ اک اچھا نمونہ ہے، اور ہم اک مخلصانہ احساس خوشگواری کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں!

داغ کا مقام اردو شاعری میں کیا ہے؟ لوگ اُن کو "دورِ متاخرین کا خاتم الشعراء" کہتے ہیں۔ لیکن وہ اجمالاً عہدِ جدید کی شاعری کا تجزیہ فتح یاب کرنے والے بھی ہیں! یہ خیال قدرے مستبعد معلوم ہوگا، لیکن داغ یقیناً اس خراجِ تحسین کا حقدار ہے! پہلی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے زمانۂ زوال و اضمحلال کی اک جولاں و رقصاں و خنداں ہستی تھا، ادب میں اس حیات پرور روح کی سرایت اُس کو اک جاں داری وجاں بخشی عطا کرتی ہے! اسی وصفِ سیرت کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ داغ اپنے تغزل میں اخلاص مندی، بیباکی، اور سرمستی کا اک خوش ساز آہنگ رکھتا ہے! اُردو غزل کو اُنھوں نے کوئی نیا سازو برگ نہیں دیا، لیکن اک تازہ بتازہ و نوبنو آب و رنگ ضرور بخشا! ہمارے خیال میں میر کا "اول" داغ کی "آخر" کے ساتھ اک "نسبتِ" خاص رکھتا ہے۔ دونوں اپنے قلب و زبان میں مخلص، و بے تکلف واقع ہوئے ہیں، قطع نظر اس سے کہ ایک "جگر خوار" "سوز" ہے، اور دوسرا "گُل نواز" "ساز"! غالباً اسی رنگِ اخلاص کا تقاضا تھا کہ داغ نے "مثنوی" و "قطعہ" کی قدیم اصناف کو اپنے قلم پر تازہ کیا، اگرچہ یہ چیزیں ہمارے شائقینِ غزل اساتذۂ جامد کے ہاں عملاً ٹکسال باہر ہوچکی تھیں! داغ کے یہ عناصر، جدید العہد فطری شاعری کے لئے درجۂ اول کے جواہر بہم پہونچاتے ہیں، اور یہ بات محض اک اتفاق نہیں کہ اردو شاعری کا بلند بانگ فاتح باب اقبال، داغ سے کسبِ فیضان کرتا ہے! داغ کا سارا راز اور امتیاز اقبال ہی کی زبانی سُنئے:

لکھی جائینگی کتابِ دل کی تفسیریں بہت ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچیگا لیکن عشق کی تصویر کون مرگیا ناوک فگن، ماریگا دل پر تیر کون

(ا۔ا۔غ)

---

(۴) **داستان**: ناول سائز، مجلد، ضخامت ۲۰۴ صفحات، کاغذ وکتابت وطباعت بدرجۂ دوم، "ترجمۂ خاکسار مترجم"، نشر کردۂ ہاشمی بک ڈپو، ریلوے روڈ، لاہور۔ قیمت درج نہیں:

داستان —— "دُنیا کا سب سے رنگین رومان"! —— اُنیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے اک سرمستِ شباب فرانسیسی ادیب، پیرلوئی کے شاہکار "افروڈائٹ" کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب بلاشبہ بڑی رنگ پاش اور رومان چکاں ہے، اور اس گلستان رنگ وبو کو سرزمینِ فرانسیسی سے ارضِ ہندوستانی میں نقل ونصب کرنے کی مترجمانہ "قلم کاری" بھی غالباً قابل داد ہے!

ناول کا موضوع "عہدِ عتیق کے اسکندریہ" کی رندانہ زندگی و تمدن کی پوست کندہ نقش طرازی ہے۔ فرانسیسی رومان نگاروں کا یہ محبوب مضمون ہے، جس سے وہ سیر ہوتے نظر نہیں آتے! ع

جاہ وجلالِ عہدِ وصالِ بُتاں نہ پوچھ!

"لوئی نے ہمیں زندگی کی مسرتوں سے دوچار کرنے کی صناعانہ

کوشش کی ہے۔ اُس نے اک رومانی دُنیا تخلیق کی ہے، جس میں داخل ہوکر ہم کچھ دیر کے لئے اپنی بے کیف زندگی کی اُکتا دینے والی ساعتوں کو بھول جاتے ہیں!

توئی کا اک ہمعصر نقاد لکھتا ہے:

"اس کتاب کی فنکاری بیمثال ہے! زبان بیداغ ہے، اور اُسلوب بیان پختہ کارانہ! اُسکے ایک ایک لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف نے یونانی اور لاطینی ادبیات کا سیر ہوکر دودھ پیا ہے! باوجود اِسکے تکلف و تصنع اُس سے چھُوا بھی نہیں ہے! کتاب دراصل اک حقیقت کی مظہر ہے، اک صداقتِ اصیل کی تمثیل!"

توئی اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی ادبی حلقوں میں شمعِ محفل بنگیا، لیکن اِس پختہ مغزانہ سلامتِ ذوق کو دیکھیے کہ کم و بیش اُس کے بعد ہی اُس نے اپنے رہوارِ قلم کی عنان روک لی اور بالکل دم بخود ہوگیا، اگرچہ اُسکی دو ایک ہی ابتدائی جُنبشہائے قلم نے اُسکے جلوسِ عظمت کو شہرتِ دوام کی شاہراہ پہ ڈال دیا!

ترجمے کا "نقاب" بھی اِس "شوخ" کے مُنہ پر کچھ کم نہیں "کھلا"!۔ ضرور پڑھئے! (ا-ا-خ)



(۵) آیاتِ جلی: تقطیعِ کتابچہ: مجلد، ضخامت ۶۲ صفحات، کاغذ آرٹ پیپر،

کتابت خطاطانہ، طباعت (بلاک) صناعانہ، مُرتبہ و شائع کردہ "ادارۂ علیگڑھ" وزیرآباد، قیمت عہ،

"آیاتِ جلی" کے نام سے اگر اِس کتاب کی ضخامتِ (عظیم) کے بارے میں کوئی واہمہ قارئین کو لاحق ہو تو اُسے اپنے دماغ سے نکال ڈالیں! تاہم یہ کتابی گلدستہ "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کی اک دلپسند مثال ہے! اور لفظ "قیمت" بھی یہاں "قیمت" اور "قدر و قیمت" دونوں مدلولات پر مشتمل ہے۔

"آیاتِ جلی" حضرتِ علیؓ کے اقوالِ حکیمانہ اور فرموداتِ مرشدانہ کی اِک "دُرجِ جواہر" ہے، جسکو مولانا جامی علیہ الرحمۃ نے ساختہ و پرداختہ کیا ہے، اور جسکی فنکارانہ کتابت اک نامور تاریخی کاتب شیخ نظام نے کی ہے، اور آثار و قبائل کا سلسلۃ الذہب (زنجیرِ زریں) اک نادرہ کار صناع اجاغنیم کا شاہکار ہے! طباعت میں اِن سارے خط و خال کی نوک پلک اور آب و رنگ بجنسہ منتقل ہوگیا ہے، چنانچہ اب "زیور انطباع پوشیدہ" کے بعد بھی وہ خطاط و نقاش کے اصلی قلم، وہ قلم کا تازہ و زندہ وجود، وہ خطوط و نقوش محسوس ہوتا ہے!

شروع میں ایک طویل الذیل مقدمہ اصل کتاب اور اُس کے قلمی نسخے کی دستیابی، اُس کی تاریخی زندگی، کاتبِ متن و جدول نگار کی صناعانہ منزلت، ادبیاتِ عالم میں "مقولوں" کی اہمیت و نوعیت، اور حضرت علیؓ کی حیاتِ طیبہ و سیرتِ مبارکہ پر داخلِ کتاب کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد اصل کتاب کا متن ہے۔

مولانا جامی نے یہ التزام کیا ہے کہ حضرت کے ہر عربی جواہر پارۂ حکمت کے عنوان کے بعد بصورتِ قطعہ اُسے فارسی میں معنًا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ "باب مدینۃ العلم" کی مشہور "نوائے ایمان بالغیب" — لوکشف الغطاء ما ازددت یقینًا — کو اِس طرح فارسی میں منتقل کیا گیا ہے:

همه خلد و جحیم و النّعم — به یقین آنچنان که می باید
که حجاب از میانه بردارند — بر یقین ذرۂ نیفزاید

کتاب بیکوقت خطاطی، نقاشی، حکمت، ادبیت، اور حسنِ طباعت و جلائے جلدبندی کا ایک بوقلموں مرقع ہے اور ہر خوش مذاق لائبریری کے لئے ناگزیر سامانِ زینت!

(ا-ا-خ)

رفتارِ وقت

ادارہ

بنیادی حقوق اور کانگریس!

"کیمونل ایوارڈ" راونڈ ٹیبل کانفرنس کے "حلقۂ شر" سے پھینکی ہوئی سب سے مکروہ استخوانِ نزاع تھی! قدرتاً وہ اپنے فتنۂ افروزانہ مقصد میں کامیاب ہوئی، اسلئے نہیں کہ اُس نے اقوامِ ہند کی کسی ضروریات کو بہم پہونچایا، بلکہ اسلئے کہ سرکار کی زبان، چاہے وہ کیسی ہی ازلی وابدی فریب ہو، اُن عوام کالانعام کے کانوں میں بشاراتِ آسانی سے کم نہیں ہوا کرتی جن کی خیرگیٔ سماعت وجہالت اُسی سرکارِ زنگر مدار کی پیدا کردہ ہے!

لطف یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی میقاتِ کراچی منعقدہ ۱۹۳۰ء کا اعلانِ تعینِ حقوق اہلِ ہند، رُسوائے زمانہ کیمونل ایوارڈ پر زمانتاً مقدم بھی ہے، معناً ہمہ گیر بھی، اور سنداً بمراحل زیادہ قابلِ اعتماد بھی، لیکن یہ حقیقی "منشورِ حریت" اک "صدا بصحرا" ثابت ہوا، اور "ڈاسن کا جوتا چل گیا"!

کانگریس کو حقوق بین الملل کا احساس حکومت سے کہیں زیادہ رہا ہے۔ "کیمونل ایوارڈ" تو "وہائٹ پیپر" کے کسی "تاریک" گوشے ہی کا مضمون ہوگا، لیکن یہ اعلان نیشنل کانگریس کے دستورِ اساسی کا سنگِ بنیاد ہے! اول الذکر، اغیارِ فریب کار کا اک وقتی منصوبہ وسازش ہے، کانگریس کا یہ ایمانِ وطن ہے، جو اک زندہ وپائندہ چیز ہے! فرقہ وارانہ تقسیم نائۂ حقوق، مسٹر جناح کے ۱۴ نکات اور اِسی قبیل کے جتنے اغراض ومصالح ہیں کانگریس نے اُن سب کے صالح، اُصولی، اساسی، اور وطن نوازانہ عناصر کو کبھی کا اپنے آئینِ مستقل میں جذب کر لیا ہے، اور آج وہ بلاخوفِ تردید کہہ سکتی ہے کہ ؎

من ز قرآں مغز را برداشتم　　اُستخواں پیشِ سگاں انداختم!

تاہم، مبادا کہ ہم بھول نہ جائیں، کانگریس کے صدر دفتر واقع الہ آباد کا تازہ پمفلٹ (بزبان اُردو) ملخصاً یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ وہ لوگ جنہوں نے یہ عہد نہیں کر لیا ہے کہ "قائل ہونگے ہی نہیں"، اس سے اپنا اطمینان کر لیں، اور نیشنل کانگریس کی عظیم وجلیل تحریک میں شریک ہوں، (ا-ا-خ)

بنیادی حقوق اور فرائض

(۱) ہر باشندہ ہندوستان کو حقوق ذیل حاصل ہوں گے۔ یعنی اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرنا، اور اشتراک عمل وباہمی اختلاط میں مکمل آزادی، اور امن کے ساتھ بغیر اسلحہ کے ایسی اغراض کیواسطے مجتمع ہونا جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہوں

(۲) ہر باشندہ ہندوستان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہو گی۔ اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کر سکے گا۔ اور اپنے مذہب

کے فرائض و رسوم آزادی سے برت سکے گا۔ بشرطیکہ اس سے انتظام عامہ اور اخلاق میں کوئی نقص نہ واقع ہو۔

(۳) ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور اُن کی زبان اور رسم تحریر محفوظ ہونگے نیز ملک کے وہ مختلف رقبے جو باعتبار اختلاف زبان کے قائم ہیں اُن کا تحفظ ہوگا۔

(۴) تمام باشندگان ہندوستان بلا امتیاز مذہب و مسلک یا ذات و قوم یا جنسیت کے قانون کی نظر میں برابر ہونگے۔

(۵) کوئی باشندہ ہندوستان خواہ مرد ہو یا عورت بوجہ اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کے کسی پبلک ملازمت یا عہدے یا اعزاز سے یا کسی تجارت یا پیشہ سے ممنوع نہیں سمجھا جائیگا۔

(۶) تمام باشندگان ہندوستان کو متعلق استعمال آب چاہ اور تالابوں کے نیز تعلیم گاہوں اور مقامات تفریح عامہ کے استعمال کے متعلق کہ جن کی برقراری اور انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے یا لوکل فنڈ (ڈسٹرکٹ و مینوسپل بورڈ) سے ہوتا ہو یا جن کو پرائیویٹ اشخاص نے پبلک کے فائدے کے واسطے مخصوص کر دیا ہو مساوی حقوق حاصل ہونگے۔

(۷) ہر باشندہ ہندوستان کو ہتھیار رکھنے اور لگانے کا حق اُن قواعد اور ضوابط کے تحت میں جو اس بارہ میں مقرر کر دیئے جائیں حاصل ہوگا۔

(۸) کسی شخص سے اوس کا حق آزادی چھینا نہیں جا سکتا اور نہ اوس کے کسی مکان یا جائداد میں مداخلت کی جا سکتی ہے اور نہ وہ ضبط اور قرق کی جا سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ قانون کے مطابق ہو۔

(۹) مذہب کے معاملہ میں اسٹیٹ (حکومت وقت) غیر جانبدار رہے گی۔

(۱۰) حق رائے دہندگی ہر عاقل و بالغ کو حاصل ہوگا۔

(۱۱) مفت جبری ابتدائی تعلیم کا انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے ہوگا۔

(۱۲) اسٹیٹ (حکومت وقت) کی جانب سے کوئی خطاب نہیں دیا جائیگا۔

(۱۳) ہر باشندہ ملک کو حق حاصل ہوگا کہ ملک بھر میں جہاں اوس کا جی چاہے جائے، نیز یہ کہ جہاں اوس کا جی چاہے سکونت اختیار کرے۔ جائداد حاصل کرے یا کوئی تجارت یا پیشہ وہاں کرے۔ اور اوس کے خلاف قانونی کارروائی یا اوسکا قانونی تحفظ ہندوستان کے ہر حصہ میں مساوی طور پر ہوگا۔

مزدوری پیشہ اشخاص

(۱) (الف) مزدوری پیشہ جماعتوں کا اقتصادی نظام اصول انصاف کے مطابق ہوگا جس کی سب سے بڑی غرض یہ ہوگی کہ ایسے اشخاص کے طرز رہائش کا معیار اب سے بہت بہتر ہو جائے۔

(ب) اسٹیٹ (حکومت وقت) کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کرتی رہیگی اس طور پر کہ مناسب قوانین کے ذریعہ سے نیز اُن کے سوا دوسرے ذرائع سے اون لوگوں کے لئے ایک معقول مزدوری، اُنکی صحت کا مناسب انتظام، کام کرنے کے مقررہ گھنٹے، اور مناسب انتظام درصورت نزاع درمیان مالکان کارخانہ اور کام کرنے والوں کے منضبط ہو جائیگا۔ نیز یہ کہ بوڑھاپے بیماری اور بیکاری کی صورت میں ایسے لوگوں کی امداد کس طریقہ سے کیجائیگی۔

(۲) بیگار اور ایسی مزدوری کہ جو بیگار سے قریب ہو بالکل بند کر دی جائے گی۔

(۳) مزدور عورتوں کے تحفظ کا خاص خیال رکھا جائیگا۔ علی الخصوص زمانہ زچگی کی رخصت کا خاص انتظام کیا جائے گا۔

(۴) تعلیمی سن کے بچے کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(۵) کسانوں اور دیگر مزدوری پیشہ لوگوں کو پورا حق حاصل ہوگا کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے واسطے یونین (اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے انجمنیں) قائم کریں۔

رفتارِ وقت

یورپ اک عالمِ رستخیز میں!

جمہوریت یا فاسیت؟

عملاً تمام یورپ اک گرم و رقیق میدانِ کارزار میں تبدیل ہو گیا ہے۔ فرزندان و دُختران آدم خدا کی اِس دنیا میں اک قابلِ سکونت جگہ کے لئے کشمکش کر رہے ہیں!

اُنکا جہد و جہاد اس نزاع پر مرکوز ہے کہ وہ بیرحم ریاستوں کی بیدست و پا رعایا نہ بنائے جائینگے! بیحس مشینوں کے بیجان پُرزوں کی اُنہیں صورت نہ دیجا سکیگی!، قہار و جبار ڈکٹیٹروں کے غلام بیدام ہو جانا اُنکے لئے گوارا نہو گا!، اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ اُس آیندہ محاربۂ عظیم کے صیدِ زبون نہ بنینگے جو شاید اک قیامتِ صُغریٰ ثابت ہونے والا ہے!!

یہ کسی قدر بلند بانگ الفاظ معلوم ہوتے ہیں، لیکن جو "طوفانِ خون" پردۂ غیب میں ہے اور مستقبل قریب میں عالمِ بشری کے سر سے گزر جانے والا ہے، اُسکا اک سادہ تصور پیش کرنیکے لئے یہ کمترین کلماتِ تعبیر ہیں!

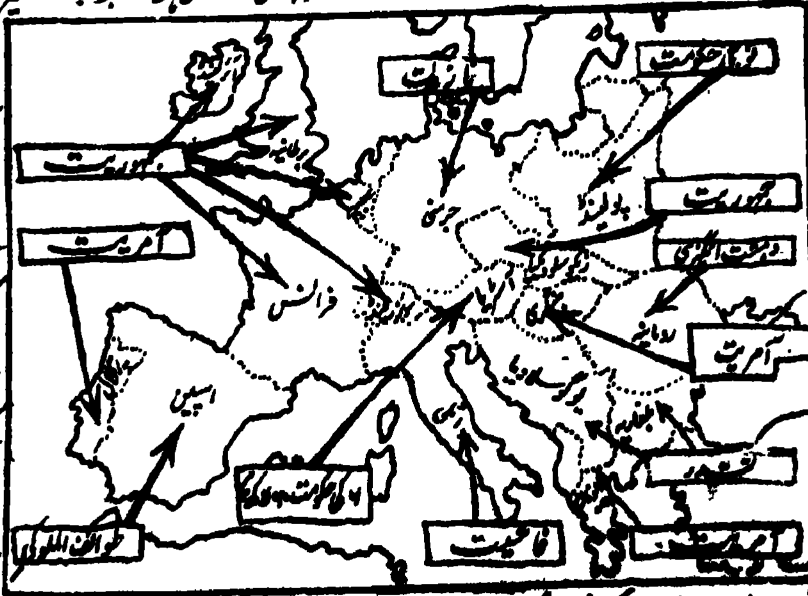
یورپ کی عام خلق اللہ بھی مغرب کے عفریتہائے طاقت و طلبِ منفعت کی شاید اُسی سے دو صدیوں ہی زیادہ مظلوم و محروم ہے جسکا تختۂ مشق رنگین اقوام کے اعالی وآدانی ہر دو کو بنایا گیا ہے! یورپ کے مزدور کی عرق ریزی اور کاشتکار کی خوں سوزی بھی تاریخ کی طویل صدیوں میں کچھ کم نہیں رہی ہے!

آخر کار عمومیت و جمہوریت کی تحریکوں نے یورپ کے مختلف گوشوں سے اپنا پرچم بلند کرنا شروع کیا۔ عوام الناس کی سطح میں قدرے بلندی تو پیدا ہوئی لیکن وہ اس سے زیادہ نہ تھی کہ اب وہ عہدِ جاگیرداری کے "مویشی" نہ سمجھے جاتے تھے!

قبل ازیں وہاں بھی اُنکی امیر و غریب کی ہموار جنت و دوزخ کچھ یونہی واقع ہوئی تھی کہ:

گلستاں میں جو تن گل و یاسمن کا — سماں زلفِ سنبل کی تاب و شکن کا
قدِ دلبرِ باسرو و رنا رون کا — رُخِ جاں فزا لالۂ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کی ہر رنگ بو سب — کمیروں کے خوں سے ہیں یہ تازہ رو سب

تاہم بیسویں صدی کے آغاز تک بیشتر ممالک یورپ جمہوریت کی شاہراہ پر آ گئے تھے۔ عوام الناس نے اک راحت کی سانس لی تھی، جہالت کے جو اندھیرے گوشے، اور فلاکت کے جو تاریک غار ارضِ قومی میں بکثرت نظر آتے تھے اُنکی تنویر و خلا پُر ہونے لگی تھی، اور جا بجا مساوات — سیاسی نیز معاشی — کی کافی سطح مستوی پیدا ہونے لگی تھی۔



بلاشبہہ کار و بارِ جمہوریت کے لئے بعض اقطاعِ یورپ سے زوہا

اسپین، جرمنی، اٹلی وغیرہ اتنے سازگار نہ ثابت ہوئے۔ وہاں نارسائی فہم تھی، نقدانِ مہارتِ کار، اداروں و اختیارات کا غلط و ناجائز استعمال، طبقۂ بالا کا تسلط و اجارہ، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اتنی جُدائی ناگزیر تھی! یہ اک دَورِ عبوری تھا! یہ وہ قیمت تھی جو عوام کو عمومیت کی ادا کرنی تھی!

جمہوریت کی یہ تخریب بعض لوگوں کو اصولی طور پر سنگین نظر آئی۔ اُنھوں نے عمومیت اور طوائف الملوکی کو لازم و ملزوم محسوس کیا۔ اب اُنکی زبان پہ، باختلافِ مقامات و حالات، دو نعرے جاری ہوئے: فاسیت یا قومی اجتماعیت!

مصیبت یہ ہے کہ ہم نے جمہوریت کا غلط استعمال کیا، اور فاسیت و قومی اشتراکیت کو غلط تعبیری کا نشانہ بنایا! آخر الذکر سیاسی مسلکوں کے اندر مجلسی و معاشی مساوات کے جو جراثیم ہیں اُنکے انکار ناممکن ہے! فاسیت و نازیت نے بعض خدمات بھی انجام دی ہیں، اور چند اُن امراض کا علاج کیلئے جنکے کم از کم غیر معاشی جمہوریت عہدہ برآنہ ہو سکی تھی۔ ان تحریکوں کے بعض علمبردار طبقۂ عوام سے اُٹھے بھی ہیں!

تاہم نظریۃً یہ دونوں سیاسی مذاہب غلط ہیں! اِن میں استبداد کی روح جاری و ساری ہے! اُنھوں نے لوگوں سے بڑے بڑے کام بلاشبہ لئے ہیں، لیکن یقیناً نہیں جانوروں کے پابزنجیر گلّے بناکر!

اُنھوں نے عامۂ خلائق کو اپنے پاؤں کی جوتی بنا ڈالا، لیکن خود اُنکے طفیل میں دیوتا ہو گئے ہیں! وہ انسانی آزادی و ترقی کے جلوسِ رواں میں سنگِ گراں بن گئے ہیں! وہ بین المللی جنگ و جدل اور غرور و تفاخر کی سنتِ دیرینہ تازہ کر رہے ہیں! انسانی انفرادیت و شخصیت ختم ہو رہی ہے، اور بنی آدم ریاست کی آہنی کارگاہ کے پُرزے بن رہے ہیں!

پھر اِس چیز نے رونما ہوتے ہی اک سرکشی اور شانِ مبارزی شروع کر دی! جبر و جنگ، غضب و نہب اُنکا اوڑھنا بچھونا ہے! اُنھوں نے روم، برلن، اور ٹوکیو کو ایک ہی حصارِ حربیت کے تین بُرجوں میں ڈھال لیا ہے! اُنھوں نے بحرِ شمال سے لیکر بحرِ متوسط تک اور بحیرۂ اسود سے لیکر بحر الکاہل تک اک طوفان خیز تند اور تموج برپا کر رکھا ہے!

تاہم حقیقت یہ ہے کہ آکیہ کے یہ دہشتناک مناظر اُن جلیل الشان طرب کا پیش خیمہ بننے والے ہیں! وسیع المشرب، انسانیت نواز سیاسی مسلکوں کی مزاحمت میں تنگ نظر، تنگ دل قوم پرستی تحریکیں ہمیشہ صف آرا ہوئی ہیں! وہ قوم پرست ہونگی، لیکن عوام کُش بھی ضرور ہوتی ہیں! موجودہ کشمکش اسقدر قوموں اور حکومتوں کے درمیان نہیں جسقدر کہ غیر ارضی نظریاتِ حیات کے مابین ہے!

یورپ اِسی دَور سے دوچار ہے! براعظم کے عمومی میدان جنگ کے محاذ اگرچہ متعدد ہیں، لیکن "جنگ" ایک ہی ہے!

یونان — وہ قدیم گہوارۂ عمومیت — اُسپر ابھی حال میں اک آمریت مسلط کر دی گئی ہے! بلگیریا میں معدودے چند فوجی افسر اور تعلیمیافتہ لوگ غالب آگئے ہیں، اور عوام الناس کے سیلابِ حریت و طاقت کو بزورِ شمشیر روک دینے کی قسمت آزمائی کر رہے ہیں! رومانیا میں تو اک چنگیزی وحشت و بربریت کا بازار گرم ہے: اخبارات جلائے گئے ہیں، یہودی شب میں قاتلانہ حملے کئے گئے ہیں، یہودیوں کو تختۂ مشقِ ستم بنایا گیا ہے، مزدوروں اور کاریگروں کو ہیبت زدہ کیا گیا ہے، عسکریت کے جلوسوں کی قاہرانہ نمائش کی گئی ہے تاکہ عوام دم بخود ہو جائیں! یوگوسلاویا میں یہ ہنگامہ پورے ۸ برس سے برپا ہے، جس کی نذر ایک تاجدار بھی ہو چکا ہے! آجکل یہ فتنہ اپنی معراج پہ ہے! پولینڈ کا ماجرا بھی اپنی ستم ظریفی میں کسی سے کم نہیں، ایک مختصر فوجی جتھے نے ۳۰ ملین کی اک قوم کو مسلوب الاختیار کر ڈالا ہے! آسٹریا میں ۷ آدمیوں کا راج ۷ ملین خلقت پہ ہے! اٹلی، جرمنی، اور اسپین کا حال تو بالائے ظلم ہے ہی!

اس عظیم میدانِ کارزار کے دونوں فریقوں میں کسی کا جھنڈا بھی نہ بالکل سفید ہے، نہ یکسر سیاہ! بعض اوقات کیونزم کی ادائیں فاشزم سے بُری طرح ملنے لگتی ہیں! تاہم تنقیح اپنے عمومی خط و خال میں صاف و واضح ہے: عمومیت یا استبدادیت؟

میں مسرت کر گئی ہے، اور گیرائی ہر فرد بشر کا مقدر بن گئی ہے! ع ہو چکے ختم کہیں قصہ ہو کیسو اپنا!

ا-ا- غ- (ماخوذ)

نقش و نگار

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی وجد آفریں نظموں کا مجموعہ جو مندرجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے

(۱) نگارخانہ (۲) خمریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) نسیب

ہر نظم اپنی جگہ مکمل، مرصع اور کیفیاتِ شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے مسحورکن نغمے دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں۔ لکھائی چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے!

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے (عہ)

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

شاعر کی راتیں

شاعرِ انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفریں اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے جنھیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مست رات	مدست رات	راز و نیاز کی رات	انتظار کی رات
اندھیری رات	چاندنی رات	جوانی کی رات	تصورات کی رات
التفات کی رات	جدائی کی رات	اشکوں کی رات	برسات کی رات
ریوڑنگی کی رات	بیخودی کی رات	سرشار رات	بھیگی ہوئی رات
تصور کی رات	بےچین رات	پیا بن ناگن کالی رات	

قیمت صرف آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

پیغمبرِ اسلام

خواجۂ دوجہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس کے لافانی منادکر کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل قاطع کے سامنے ادراک منطق چھانٹنا بھول جاتا ہے ——— شاعرِ انقلاب پر جب ایک خاص سرشاریت کا عالم طاری ہوا، اسی وقت انھوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی۔ عالمِ بیخودی میں کئی روز کی ریاضتِ شاقہ اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا۔ جب تک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے کچھ کھایا نہ پیا اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے۔

قیمت صرف آٹھ آنے (۸؍)

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی



مستند اور مجرّب ادویات

ہندوستانی دواخانہ دہلی سے طلب کیجئے۔ جسے ملک وقوم کے شیدائی طبی دنیا کے شہنشاہ حضرت مسیح الملک حکیم حافظ اجمل خاں صاحب مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں قائم کیا تھا اور جو اب آپ کے خلف الرشید عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب کی سرپرستی میں بدستور جاری ہے۔

ہندوستانی دواخانہ نے اپنے پینتیس سالہ دورِ زندگی میں ملک میں بہترین مجرب دوائیں پیش کرکے جو عزت و وقار حاصل کیا ہے اُس کے لحاظ سے یہ دیسی دواؤں کا لاجواب کارخانہ ہے۔ علاوہ ازیں اس دواخانہ کا ایک خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے کسی کا ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے، بلکہ یہ ملک وقوم کی ملکیت ہے، اس کا منافع جو تقریباً دو لاکھ روپیہ سالانہ ہے مردانہ و زنانہ طبیہ کالج اور اس کے متعلقہ شفاخانوں پر خرچ ہوتا ہے۔

ہندوستانی دواخانہ کی ہزارہا مستند و مجرب دواؤں میں سے مندرجہ ذیل چار دوائیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔ ان کو طلب کرکے فائدہ حاصل کیجئے۔

جمیلان

جریان اور رقت و سرعت کی لاجواب دوا ہے۔ مادۂ تولید کی اصلاح کرتی ہے۔ اور قدرتی امساک پیدا کرتی ہے

ترکیب استعمال۔ دو قرص صبح کو نہار منہ دودھ کے ساتھ کھائیں۔ تیل ترشی اور گرم چیزوں سے پرہیز رکھیں۔

قیمت فی شیشی ۳۲ قرص چار روپے آٹھ آنے

قرصِ مفاصل

گٹھیا (جوڑوں کا درد) عرق النساء (ٹانگ کا درد) کیلئے نہایت مفید ہے۔ یہ بیماریاں خواہ کیسی ہی پرانی ہوں اس دوا کے ایک روز کے استعمال سے بالکل دور ہو جاتی ہیں۔

ترکیب استعمال۔ ایک قرص رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے کھائیں۔ تیل ترشی اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز۔ قیمت فی شیشی ۲۱ قرص ۱۲ آنے

قرصِ جدید

غذا کو ہضم کرتے ہیں۔ بھوک لگاتے ہیں ریاح کو خارج کرتے اور نفخ و قراقر کو زائل کرتے ہیں۔

ترکیب استعمال

ایک قرص دونوں وقت بعد غذا کھائیں۔ قابض، بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز۔ قیمت ۱۰۰ سو قرص ایک روپیہ دو آنہ

قرصِ بواسیر

بادی بواسیر کے لئے نہایت مفید دوا ہے، اس کے چند روزہ استعمال سے یہ مرض بالکل دور ہو جاتا ہے۔

ترکیب استعمال۔ اس کے دو دو قرص صبح و شام پانی سے کھائیں۔ قابض، بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز۔

قیمت چونسٹھ قرص دو روپیہ

ملنے کا پتہ: منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶
تار کا پتہ ہمیڈی سنز دہلی



ہمایوں

۱۔ ہمایوں اتنا پابندِ وقت ہے کہ جنوری ۱۹۲۲ء سے لے کر (جب یہ جاری ہوا تھا) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی۔ اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی۔

۲۔ ہمایوں آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مدِ نظر نہیں رکھی جاتی۔

۳۔ ہمایوں کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں فحش اشتہارات، عریاں تصاویر، اور مخربِ اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر طلبہ اور خواتین کے ہاتھوں میں دیا جا سکتا ہے۔

۴۔ ہمایوں کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا، کے قابل ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمایوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذبِ توجہ ہوتا ہے۔

۵۔ ہمایوں کے مضامین محض پُر از معلومات ہی نہیں ہوتے بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہمایوں اپنی نظیر آپ ہے۔

۶۔ ہمایوں صحتِ زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔

۷۔ ہمایوں میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

۸۔ ہمایوں ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے اور ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

۹۔ ہمایوں کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ ہمایوں کے سالگرہ اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زائد قیمت نہیں لی جاتی۔

چندہ سالانہ [illegible] ششماہی [illegible]

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں۔ تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں تعمیل حکم کیلئے فردوس مثال کشمیر جنت نظیر سوئزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا، اور وزرا سے مشورہ طلب کیا، مہتمم توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے



کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

REG NO L 3694

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

شعلہ و شبنم

شعلہ و شبنم ہندوستان کے شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی مدیر "کلیم" دہلی کی پرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ ہے، جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں اسلامی شان و حریت کے خون کھولا دینے والے واقعات، بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگِ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا۔ شاعرِ انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے

کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گردپوش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپے

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب لندن کے ایک پبلشر نے چھاپی تھی اور شائع ہوتے ہی ساٹھ ہزار فروخت ہوگئی۔ اردو میں ہندوستان کی اور سب زبانوں سے پہلے چھپی۔ ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔ اور ہندوستان کے تمام اخبارات و رسائل اور اصحابِ علم نے متفقہ طور پر اردو کے بہترین تراجم میں شمار کیا ہے، کتاب ایک ہزار صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے

بلاک کی چودہ تصویریں ہیں اور دو خوشنما جلدوں میں شائع ہوئی ہے

قیمت مکمل مجلد چار روپے

تاریخ فلسفۂ اسلام

مشہور برمنی فلسفی ٹ ج دی بوئر کی مقتدر تصنیف کا اردو ترجمہ از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، یہ کتاب اس سے قبل بھی جامعہ کی اردو اکاڈیمی کی جانب سے شائع ہوئی تھی، اب بہت کچھ ترمیم و اضافے اور نظرِ ثانی کے بعد چھوٹے سائز پر نہایت خوشنما جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے اس میں اسلامی فلسفہ کی نشو و نما، یونانی عربی علوم، فلسفۂ فطرت، یونانی و اسلامی حکمار مشرق میں فلسفہ کا انحطاط، عرب اور سوفسطی پر کار آمد مباحث ہیں۔

قیمت دو روپے

پستالوزی

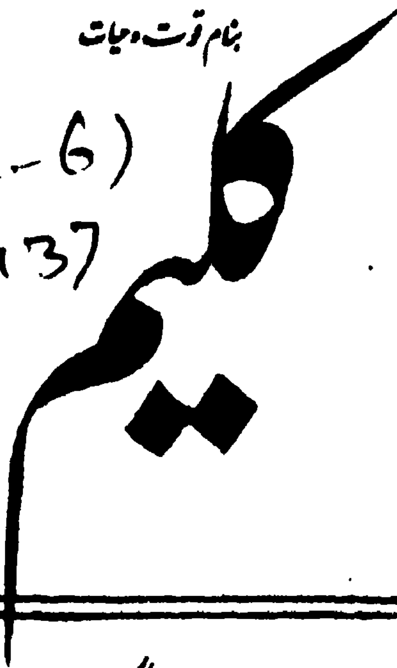
از ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب بی اے (جامعہ) ایم اے، پی ایچ ڈی (برلن) جس طرح یورپ کے عہد جدید میں کوپرنیکس نے ہیئت کی ہیئت اور کولمبس نے جغرافیہ کا نقشہ بدل دیا۔ ڈالٹن نے کیمیا کی کایا پلٹ اور کانٹ نے فلسفے کا استحالہ کر دیا۔ اسی طرح پستالوزی نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی زندگی اس کے فلسفۂ تمدن، اس کے تعلیمی نظریے اور تعلیمی کارنامے اور ان کی تفصیل سلیس زبان اور دلکش انداز بیان میں ملاحظہ فرمائیے، جو مشرقی شاعر کے اس شعر کی مغز ہے ؎

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے — جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ قرول باغ دھلی

بنام قوت وحیات



آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آ گے گئی صدیوں سے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

دہلی

جلد ۴ | فہرست مضامین ماہ اگست ۱۹۳۷ء | نمبر ۲

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مدیر	۲	۱۴	گناہ (افسانہ)	جی لے مجتبیٰ الہ آباد یونیورسٹی	۵۵
۲	گھٹا (نظم)	جوش ملیح آبادی	۱۲	۱۵	سنو، سنا (نظم)	جناب حکیم محمد علی خاں صاحب آہر اکبرآبادی	۵۶
[illegible]	پانسو مذاہب کی سرزمین	مترجمہ جناب محمود علی خاں صاحب بی اے (جامعی)	۱۳	۱۶	رباعیات خیام	جناب علامہ الطاف اللہ باری	۵۷
۴	پیام وطن (نظم)	جناب حکیم آزاد صاحب انصاری	۱۷	۱۷	ہندمیں تجارت کی پستی	جناب رامیش نرائن ماتھر ایم اے آگرہ	۶۳
۵	مبتلائے محبت ہونے پر	مترجمہ معین الدین حسن صاحب بی اے کاکوروی	۱۹	۱۸	علم کیمیا	جناب محمد یوسف صاحب کشور کلکتہ	۶۵
۶	اقوال حکیمانہ	جناب ڈاکٹر غلام سرور صاحب ایم اے پی ایچ ڈی	۲۴	۱۹	دنیا (افسانہ)	جناب سید خورشید علی تنویر لکھنوی	۶۹
۷	نیا ڈیا ٹلکراؤ (افسانہ)	جناب خواجہ غلام السیدین صاحب	۲۵	۲۰	تاثرات کشمیر	جناب نجم آفندی	۷۲
۸	شاعر کی تمنا (نظم)	جناب علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی	۲۹	۲۱	عورت، مرد، محبت (افسانہ)	جناب مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب لکھنوی	۷۳
۹	غزل مسلسل	جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی	۳۲	۲۲	خلوت رنداں (نظم)	جناب ضیاء الاسلام صاحب ضیا بی ایس سی	۷۹
۱۰	اردو کی شستگی و نفاست میں کرکٹ	جناب ل۔ احمد اکبرآبادی	۳۳	۲۳	محبت (افسانہ)	جناب جی لے مجتبیٰ۔ الہ آباد	۸۰
۱۱	شراب پرتگالی (نظم)	جوش ملیح آبادی	۴۲		نقد و نظر	ادارۂ کلیم	۸۱
[illegible]	دو انگریز جعفری شہزاد اردو کی خدمت میں	جناب سید رضا قاسم مختار جیلانی آر۔آر	۴۴		رفتار وقت	ادارۂ کلیم	۸۴
۱۳	شہید وطن (ڈراما)	جناب امین حزین بہاول پور	۴۹		اشتہارات	مشتہرین	۹۰

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم جنتی فواش گنج دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

ہندوستان کی تازہ عزّت افزائی

آزادی کتنی زبردست برکت ہے، اور کس قدر بے پایاں سعادت،
——— آزادی، ایک ایسی لازوال بلند اقبالی، اور ایک ایسی ہر آن رُو بہ ترقی جوان بختی ہے جس کے محض تصور پر ہزاروں جنتیں قربان کر دی جا سکتی ہیں،

آزادی کس زبردست بنیادی قوت کے ساتھ انسانی سر کو بلند، اور انسانی ہمّت کو اُستوار رکھتی ہے۔

اس میں جلال و جمال کا عُنصر ایک ایسے مُدبرانہ تناسب کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ اس کا نظارہ خود اُلوہیت کے واسطے ایک طرف تو موجبِ لذّت اور دوسری طرف باعثِ رشک ہو سکتا ہے۔

آزاد قوموں کے جسم توانا، رگیں قوی، چہرے شگفتہ، پیشانیاں بے شکن، سینے کُشادہ، دل مطمئن، ولولے بے زنجیر، اور ذہنیتیں "نظر گزار" (ایسی شفاف چیز جس سے نظر گزر جائے) ہوتی ہیں۔

کسی قوم کے اندر یہ سینوں کی گرہیں کھول دینے والا احساس کہ میں آزاد ہوں ایک ایسا تُند و تیز شراب سے ملتا ہوا احساس ہوتا ہے، جس کے آغوش میں ولولے پروان چڑھتے اور اُمنگیں نو بہ نو جوانیاں حاصل کرتی چلی جاتی ہیں۔

آزادی کی ہر راہ "گُل گشتِ مُصلّے" اور آزادی کا ہر ساحل "آبِ رُکنابا" کے مانند ہوتا ہے۔

مدیر

آزادی کی ہوا میں سانس لینا ایک ایسے عجیب شرحِ صدر سے بہرہ اندوز ہونا ہے جو صرف دیوتاؤں ہی کو میسّر آ سکتا ہے۔

یہی نہیں کہ آزاد قوم صرف اپنے ہی مُلک میں عزّت کی حامل ہوتی ہے، وہ دوسرے ممالک، اور اجنبی سرزمینوں میں بھی عزّت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

آزاد قوم کا کوئی فرد جب سیاحت کے لئے نکلتا ہے تو سنموں کی طرح وہ بھی "بہ کوہ و دشت و بیابان غریب" نہیں ہوتا۔ وقار اُس کی راہ میں آنکھیں بچھاتا، اور عزّت اُس کا استقبال کرتی ہے۔

جب اجنبی ممالک میں اُس سے اُس کے وطن کا نام پُوچھا جاتا ہے تو وہ کافی پُر زور لہجے میں اسمِ اعظم کی طرح اپنے وطن کا نام زبان پر لاتا ہے، اور اُس کے وطن کا نام سُنتے ہی لوگوں کی آنکھوں میں وقار جھلکنے لگتا ہے۔

وہ اپنی کسی سیاحت میں "غریبِ شہر" کی حیثیت سے "سخن ہائے گفتنی دارد" کا شکوہ سنج نہیں ہوتا۔

آزاد قوم کی عزّت ایک سانس لیتی ہوئی متحرک اور قابلِ سفر عزّت ہوتی ہے، اور جن جن سرزمینوں سے وہ گزرتی ہے اُس کی عزّت بھی اس کے دوش بدوش سفر کرتی رہتی ہے ——— کسی آزاد قوم کے کسی عازمِ سفر کی عزّت کو "سخت بے مہری کہ بے ما می روی" کی شکایت کرتے ہوئے آج تک کبھی نہیں دیکھا گیا ہے۔

لیکن محکوم قوم، بدبخت محکوم قوم کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے ——— یہی نہیں کہ وہ ممالکِ غیر ہی میں حقارت کی نگاہ سے دیکھی

جاتی ہے، بلکہ بدبختی کی یہ انتہا ہے کہ وہ خود اپنے مُلک اور خود اپنے گھر میں بھی ذلیل سمجھی جاتی ہے۔

محکومیت و غلامی ایک ایسی بے درماں زُبوں حالی، اور ایک ایسی شدید لعنت ہے کہ وُہ دمانِ شیطانی کے سب سے بڑے شریر و شقی رُکن تک کو اس پر ترس آتا ہوگا۔

محکومی کا جسم لاغر، رُوح مُردہ، چہرہ زرد، پیشانی پُرشکن، سینہ تنگ، دل سرد، ولولے پا بزنجیر، اور ذہنیت پست و ٹکندر ہوتی ہے۔

کسی قوم کے اندر یہ سینوں کا کھینچ دینے والا احساس کہ میں محکوم ہوں ایک ایسا آہستہ دوڑنے والا زہر ہوتا ہے جس کے اثر سے اُس کے ولولے ایڑیاں رگڑتے اور اُس کی اُمنگیں دم توڑتی رہتی ہیں۔

محکومی کی ہر منزل، "منزلِ اول"، اور محکومی کا ہر نفس "نفسِ آخر" ہوا کرتا ہے۔

محکوم کا حضر اور سفر، دونوں مساوی طور سے ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ حضر کی حالت میں، فاتح قوم کی حکومت اُس کی عزت کو سر اُٹھانے کا موقع نہیں دیتی۔ اور سفر میں دوسری آزاد قومیں "تو کا ہر زمیں را کو ساختی"؟ کے تحت اُس کی پرچھائیں کی بھی روادار نہیں ہوتیں۔

جب اُثنائے سیاحت میں پیچھے پیچھے داغ آگے آگے رسوائی ہوا کرتی ہے کسی عرق میں ڈوبے ہوئے غلام فرد سے اُس کے ملک کا نام پوچھا جاتا ہے، اُس وقت اُس پر ایک ایسی نارِ جہنم سے ملتی ہوئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا تجربہ صرف اُس لمحۂ بیکسی میں کیا جا سکتا ہے۔ جب رات رات بھر زدو کوب کا سلسلہ جاری رکھنے والی پولیس کے بے اماں شدائد سے تنگ آکر کوئی شخص کسی بدترین جرم کے ارتکاب کا اقرار کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے — اور جب آزاد قوموں کے کانوں میں اس غلام کے وطنِ حقیر کا نام پڑتا ہے تو ان کی آنکھوں میں "بخدا کہ لازم آمد زِ تو احتراز کردن" کے ڈورے اُبھر آتے ہیں — اور اگر کوئی ذِیعت قسم کا غلام (جس کی متعدد نظیریں موجود ہیں) آزاد قوم کو کوئی مشورہ دینا چاہتا ہے تو وہ "تو بہ خویشتن چہ کردی؟" کے تحت، سننے سے قطعی انکار کر دیتی ہے۔

ہم ہندوستانی محکوم و مغلوب ہیں، اور چونکہ قوانینِ قدرت کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا کرتے، اس لئے ہم بھی اُن تمام بے عزتیوں میں مبتلا ہیں جن سے ایک محکوم قوم دوچار رہتی ہے۔

بیرونِ ہند اب تک ہماری جو جو بے عزتیاں اور رسوائیاں ہو چکی ہیں، اور خود اندرونِ ہند اس مئی ۳۶ء سے پیشتر تک جن ذلتوں میں ہم مبتلا کئے جا چکے ہیں۔ ان تمام بیرونِ در، اور اندرونِ خانہ بے عزتیوں کو میں اس وقت دُہرانا نہیں چاہتا۔

البتہ اس بیسوی صدی کی مئی ۳۶ء کے ایک شرمناک اور اہانت آمیز واقعے سے آپ کو مطلع کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

ہر چند ہمارے پا بزنجیر بر اعظم میں یہ اہانت آمیز واقعات ایسے ہنگامے ہوا کرتے ہیں کہ ذیل میں ہزاروں بار پیش آ چکے ہیں، اور جس واقعے کو میں ابھی بیان کرنا چاہتا ہوں، اپنی نوعیت کی سنگینی میں کچھ ایسا عجیب واقعہ بھی نہیں ہے جس کی اس سرزمین پر کوئی نظیر نہ مل سکتی ہو۔

لیکن اب، جب کہ "اپریل فول" والی یکم اپریل کو وفاق کے ایک حصے کا ہندوستان میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا جا چکا ہے اور ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم عنقریب اپنے ملک کی زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لینے والے ہو، عین اس دورِ مسعود، اور اس عہدِ مبارک میں کسی معمولی سے واقعے کا بھی پیش آجانا جس سے ہندوستانی قوم کی ذلت ہوتی ہو۔ انتہائی خوف، نفرت، غیظ اور مایوسی کے ساتھ محسوس کئے جانے کے قابل ہے۔

اب وہ واقعہ سنئے۔

ہندوستان ٹائمز (۱۳ مئی ۳۶ء) وقائع نگارِ جبل پور اطلاع دیتا ہے کہ اسٹیشن مذکور پر دو یورپین مسافروں نے جو بمبئی میل سے سفر کر رہے تھے، ایک ہندوستانی، آئی، سی، ایس، آفیسر مسٹر دی کا ستھ، سب ڈویژنل آفیسر نرسنگ پور کو فرسٹ کلاس میں داخل ہونے سے جبراً روک دیا۔ نہ صرف روک دیا۔ بلکہ ان دونوں یوروپینوں نے (جو پورے درجے کے بلا شرکتِ غیرے مالک تھے) مسٹر کا ستھ کی شریفانہ اور جائز درخواست پر اُن کے ساتھ نہایت اہانت آمیز برتاؤ بھی کیا — اور اسٹیشن کے خداوندانِ نظم و نسق سے جب امداد کی درخواست کی گئی تو وہ سب کے سب، کامل اتفاق کے باوجود مسٹر کا ستھ کی دستگیری کے معاملے میں قطعی بے دست و پا ثابت ہوئے۔

غور فرمائیے یہ ہے ہماری عزت اور یہ ہے خود ہمارے گھر کے اندر ہمارا احترام۔

ریلیں ہمارے ہی روپے سے چلتی ہیں۔ ریل کی پٹریاں ہمارے ہی مزدور بچھاتے ہیں، اور ہماری ہی زمین پر بچھاتے ہیں۔ اسٹیشن بھی ہمارے ہی خون سے تعمیر کئے گئے ہیں، اور ریلوے کے اعلیٰ و ادنیٰ ملازم بھی ہماری ہی جیب سے تنخواہیں پاتے ہیں، لیکن جب ہم اُس ریل میں، مفت نہیں، ٹکٹ کے پورے دام دے کر سفر کرنا چاہتے ہیں تو غیر ملک کے دو مردک ہمیں درجے میں داخل نہیں ہونے دیتے، صرف یہی نہیں بلکہ ہمیں ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں، خود ہمارے بھائیوں کے ایک گروہِ عظیم کے سامنے ذلیل بھی کرتے ہیں، اور ایسے الفاظ زبان سے نکالتے ہیں جس سے نہ صرف ہماری ذاتی عزت و خودداری مجروح ہوتی ہے، بلکہ ہمارا تمام ملک ذلت میں غرق ہو جاتا ہے، اور جب اسٹیشن کے اربابِ بست و کشاد سے داد رسی کی جاتی ہے تو وہ ہماری امداد میں "قطعی بے دست و پا" ثابت ہوتے ہیں۔

چیست یارانِ طریقت! بعد ازیں تدبیرِ ما؟

میں جبل پور کے اسٹیشن ماسٹر صاحب اور دیگر عالی مرتبت ریلوے عمال سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا، یعنی کسی وسیع درجے میں صرف دو ہندوستانی ہوتے، اور وہ فرسٹ کلاس کے نہیں بلکہ تھرڈ کلاس کے انگریز مسافر کو اپنے درجے میں آنے سے جبراً روک دیتے، اور اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے وہ اُس کی اہانت بھی کرتے، اور وہ انگریز ان حضرات کی بارگاہ میں جا کر فریاد کرتا تو اُس موقعے پر ان کا طرزِ عمل کیا ہوتا؟

کیا وہ انگریز بہادر کی دستگیری کے معاملے میں بھی ایسے ہی "قطعی بے دست و پا" ثابت ہوتے؟ یا پھر یہ ہوتا کہ پولیس کے مشہورِ خلائق اور ہر دل عزیز ڈنڈے کی مدد سے وہ انگریز تو بصد احترام درجے میں بٹھا دیا جاتا، اور ان دونوں "غیر مہذب" و قانون شکن "ہندوستانیوں کو اسی اسٹیشن پر بے عزتی کے ساتھ اُتار کر حوالات میں بند کر دیا جاتا؟

اگر امریکہ، جرمنی، یا فرانس وغیرہ میں اس قسم کا کوئی واقعہ کسی انگریز کو پیش آ جاتا تو برطانیہ کے سفارت خانے سے لے کر پارلیمنٹ کے ایوان تک میں زلزلہ آ جاتا، اور دفعتہً بر و بحر حکومتِ برطانیہ زخمی شیرنی کی طرح چنگھاڑنے لگتی، اور جب تک اس کی تلافی نہ کر دی جاتی انگریزی حکومت اور انگریزی قوم پر خواب و خور حرام رہتا ——— اور اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی تلافی نہیں کی جا سکتی ہے تو انگریزی بڑی فوج خشکی پر، اور بحری بیڑے سمندر میں خوفناک صورت سے حرکت کرتے نظر آتے۔

لیکن یہ تمام خامہ فرسائی، اور یہ تمام رونا دھونا بیکار ہے۔ قدرت کے احکام کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ قدرت کا حکم ہے قوی رہو، ورنہ پیس ڈالے جاؤ گے، آزاد رہو، ورنہ ہر سانس میں موت کا مزا چکھو گے۔

لیکن بدقسمتی سے ہم کمزور بھی ہیں اور محکوم بھی۔ خطا ہماری ہی ہے۔ ساری خطا ہماری ہے۔ قاتل کو میں بُرا نہیں کہتا، کیونکہ یہ خود مقتول ہے۔ جو قاتل کو اس کا سر اُڑا دینے کا لائسنس دیا کرتا ہے۔

اس دنیا میں ظالم ہونا کوئی عیب ہو کہ نہ ہو، لیکن مظلوم ہونا مسلّم طور سے عیب اور سب سے بڑا عیب ہے۔

ہاں ہم محکوم ہیں، اور برضا و رغبت محکوم ہیں۔ اور یہ محکومی ہمیں اس قدر عزیز ہے کہ اُس کے ناپاک شعلوں کو ہم اپنی باہمی آویزشوں کے دامن سے برابر ہوائیں دیتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس ہوا دینے کے شغل سے کبھی نہیں تھکتے۔

یہ ہمارے شعلہ ہائے محکومی کو ہوائیں دینے والے "پوتر" ہندو، اور "مقدس" مسلمان کتنے عجیب انسان ہیں۔

ہندوستان وہ زبوں قسمت برِ اعظم ہے جس کی عظیم پہنائی کے اندر سب کچھ موجود ہے۔ مگر ایک "ہندوستانی" نہیں پایا جاتا۔ یہاں تو بستے ہیں گائے، باجے، مسجد، مندر۔ گردوارے۔ مدحِ صحابہ اور تبرّے کی سی چیزوں پر کٹ مرنے والے ہندو، مسلمان، سناتن دھرمی، آریہ سماجی، سکھ۔ وہابی، حنفی، سُنی اور شیعہ ——— جن میں ایک بھی "ہندوستانی" نہیں ہے۔

کیا ان مذاہب گزیدہ اور ادیان خوردہ ہندو مسلمانوں کی کھوپڑیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ انھیں صرف ناخن ہی سے اٹھایا جا سکتا ہے؟ کیا ان اللہ کے نیک بندوں کی عقلیں اتنی دُبلی ہیں کہ خوردبین کے بغیر انھیں دیکھا ہی نہیں جا سکتا؟ اور کیا ان مقدس روحانی گروہ کی ذہنیت، اس درجہ لاغر و موہوم ہے کہ ہمارے بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے غزل گو شعرا کی طرح ایک ایسا غیر مرئی "مادِ بستر" بن کر رہ گئی ہے کہ اجل سرہانے آتی ہے، اور اپنے شکار کو موجود نہ پا کر ناکام واپس چلی جاتی ہے؟

میں پوچھتا ہوں، اے خدا کے نیک بندو! اگر تم اس قدر گرم المزاج اور غیرت مند واقع ہوئے ہو کہ گائے، باجے، مدحِ صحابہ اور تبرّے کی سی باتوں پر جامے سے باہر ہو جاتے ہو تو خدارا بتاؤ کہ جس وقت تمہارے ملک کی اہانت کی جاتی ہے، تمہارے آباؤ اجداد کو گالیاں دی جاتی ہیں اور براہِ راست خود تمہاری ناک پر بھی حملہ کیا جاتا ہے اُس وقت تمہاری گرم المزاجی اور تمہاری غیرت مندی کس چوہے کے بِل میں جا کر روپوش ہو جاتی ہے؟ اور اُس وقت سراپا برق و آتش بن جانے کے عوض تم برف کی قاش سے بھی زیادہ ٹھنڈے کیوں ہو جاتے ہو؟

میں حیران ہوں کہ جس موقعے پر تمہیں بجلی بن جانا چاہیئے اس موقعے پر تم یخ پارہ بن جاتے ہو، اور ایسا یخ پارہ کہ اگر اسے کرۂ زمہریر کے آغوش میں رکھ دیا جائے تو سردی کی شدت سے تمام کرّے کو جُوڑی آجائے۔

ببیں تفاوتِ رہ، از کجاست تا بکجا!!

کیا تم مجھے اپنے متعلق یہ رائے قائم کرنے کی اجازت نہ دوگے کہ تمہارا گائے اور تبرّے پر کٹ مرنا، غیرت مندی اور بہادری پر نہیں، بلکہ اُس مخصوص شرارت پر مبنی ہے جو ہر غلام قوم کی فطرت میں اُبھری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور تمہارا اپنے ملک کی اہانت کے موقعے پر خاموش رہنا، رواداری و شرافت پر نہیں بلکہ اس مخصوص بے حیائی و بزدلی پر مبنی ہے جو ہر محکوم قوم کی سیرت میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے؟

ہماری صحافت

آخر ہماری صحافت، سمجھ میں نہیں آتا، اس قدر شریر و فتنہ پرور کیوں واقع ہوئی ہے۔

ہماری صحافت کو دُنیا بھر کے تمام نام، تو دیئے جا سکتے ہیں، لیکن اُن تمام ناموں میں سے جو نام اُسے کبھی نہیں دیا جا سکتا۔ وہ بدقسمتی سے صحافت اور صرف صحافت ہے۔

صحافت، نام ہے قوموں کو صحیح راستے پر چلانے کا ——— صحافت کا کام ہے اقوام کے عروج و زوال کے خفیہ اسباب کی پیمائش، اور ابنائے زمانہ کے رجحانات کی جانچ پڑتال۔ نیز ضروریات و مقتضیاتِ وقت کا گہرا مطالعہ ——— صحافت کا فرض ہے کہ وہ افراط و تفریط سے دامن کشاں رہتے ہوئے صراطِ مستقیم پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی قائم رکھے وہ ایک اعلیٰ نبّاض کی طرح قوم کے امراض کی تشخیص کرے، اور ایک حاذق طبیب کی صورت ایسا نسخہ استعمال کرائے کہ ازالۂ مرض ہو جائے۔

لیکن ہماری صحافت ایسا نہیں کرتی، کیونکہ ایسا کر نہیں سکتی جس کے متعدد وجوہ ہیں۔

(۱) ناقص اور غلط تعلیم، گمراہ کُن تربیت، اور علمِ صحافت سے عدمِ واقفیت، ہمارے ایڈیٹروں کو اندھا بنائے ہوئے ہے۔

(۲) اس کوچے میں وہی قدم رکھتے ہیں جن کی ناکارہ ہونے کی وجہ سے کہیں پرسش نہیں ہوتی، اور مفلس و نااہل ہونے کے باعث کوئی دوسرا پیشہ بھی نہیں کر سکتے۔

(۳) صحافت کو روٹی کی خاطر اختیار کرنے سے بے اصولی پیدا ہوتی ہے جو ایڈیٹر کی افادیت کو معدوم کر دیتی ہے۔

(۴) اکثر اخبارات، سرمایہ داروں، خوشامدیوں، جاہ پرستوں، اور غداروں کے روپے یا دوسرے خفیہ سرمایوں سے چلتے ہیں، جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ملک میں فساد و فتنہ برپا کر کے حق کو کمزور، باطل کو قوی اور اپنے کو زردار بناتے رہیں۔

(۵) پریس ایکٹ، زبانی زجر و توبیخ، اور ضمانت طلبی، ہماری صحافت کا گلا گھونٹے رہتی ہے، اور ان حالات میں جادۂ صحیح پر گامزن رہنا صرف جواں مردوں کا کام ہے، جو اس محکوم قوم میں تقریباً معدوم ہیں۔

(۶) سیاسی حالات نے لیڈری کا شوق ہر دل میں پیدا کر دیا ہے، قوم کا ہر فرد لیڈر سے نیچے درجے کا تصور ہی نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری صحافت انہی خود ساختہ فاطر العقل لیڈروں کا میدانِ جنگ بن کر رہ گئی ہے۔

(۷) بعض اخبارات ایسے ہیں جن کا نام کچھ اور ہے اور پالیسی کچھ اور، یعنی اگر پرچے کا نام "خیر" ہے تو پرچے کی پالیسی "شر" ہوتی ہے، اور اگر نام "آزاد" ہے تو پرچے کی پالیسی "قید و محکومی" ہوتی ہے۔ اس صفتِ تضاد نے بھی پبلک کو دیوانہ سا بنا رکھا ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم اپنی بیمار اور رنگین صحافت کی جانب توجہ مبذول کریں۔ جاہل و خود غرض ایڈیٹروں کو کرسیٔ ادارت

سے گرادیں؟ اور پبلک مذاق کو اس قدر بلند کرنے کی سعی کریں کہ شر پسند قسم کے اخبار خود اپنی ہی موت مرجائیں!

ہر قوم کی باگ اُس کے مفکروں اور ایڈیٹروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، لیکن ہماری حالت بالکل اس کے برعکس ہے، یہاں مفکروں، اور ایڈیٹروں کی باگ قوم کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔

اکثر ایڈیٹروں کو یہ کہتے سُنا گیا ہے کہ کیا کریں، خود ہم اپنی تحریروں سے بیزار ہیں، لیکن اگر ہم اس کے خلاف روش اختیار کریں تو پبلک ہمارا اخبار خریدنا چھوڑ دے۔ یہ کتنی خطرناک صورتِ حال ہے، اور اس کے نتائج کس قدر خوفناک ہیں!

آئے دن ہمارے اخباروں میں چھپا کرتا ہے کہ

"فلاں مسلمان نے فلاں ہندو کو ذبح کرڈالا"

"فلاں ہندو نے فلاں مسلمان کو تہِ تیغ کرڈالا"

"ہندوؤں مسلمانوں میں جنگ ہوگئی"

"ایک مسلمان ایک ہندو دیوی کو لے کر بھاگ گیا"

"ایک ہندو نے ایک مسلمان لڑکی کی بے آبروئی کی"

"ایک مسلمان گٹھڑی چُراکر فرار ہوگیا"

"ایک ہندو ایک تھیلی لے کر غائب ہوگیا"

"ایک مسلم غنڈے کے کرتوت" اور "ایک ہندو لفنگے کی حرکتیں"

ذرا ان فتنہ پرور ایڈیٹروں سے دریافت فرمائیے کہ آپ کیا کسی خبر کو "ہندو" "مسلم" "سُرخی سے علیحدہ کرکے شائع ہی نہیں کرسکتے"؟

آخر ہر بات میں "ہندو" "مسلمان" کیوں آجاتا ہے؟

کیا کوئی خبر اس سادے اور فطری انداز سے شائع نہیں کی جاسکتی کہ

"ایک آدمی چوری کرکے بھاگ گیا"

"ایک شخص نے دوسرے شخص کو مارڈالا"

"ایک بدمعاش کے کرتوت" اور "ایک غنڈے کی حرکتیں"؟

آخر یہ "ہندو" اور "مسلمان" لکھے بغیر ہمیں مزا کیوں نہیں آتا؟

کیا "ہندو" "مسلم" الفاظ کے باہر ہم میں سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے؟

ہم شاید اس سب سے بڑی حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔ اگر ہم اسے نہ بھول چکے ہوتے تو ہر موقع اور ہر محل پر اپنے کو "ہندو" "مسلمان" ہی کے نام سے کیوں پکارتے۔

یا بات یہ ہے کہ انسان کا لفظ ہماری نگاہوں میں اس قدر حقیر ہوچکا ہے کہ ہم اپنے کو انسان کہنے سے شرمانے لگے ہیں۔

اگر کوئی فرانسیسی کسی تانگے والے سے لڑپڑے اور ہمارے ایڈیٹر صاحبان کو اس خبر کے چھاپنے کی ضرورت ہو تو کیا وہ اس خبر کے شائع کرنے سے پیشتر اس فرانسیسی آدمی کے پاس اپنا نمائندہ بھیجکر یہ معلوم کریں گے کہ تو "رومن کیتھولک" ہے یا "پروٹسٹنٹ" اور جب تک اس کی تحقیقات نہ ہوجائے گی وہ اس خبر کی اشاعت کو معرضِ التوا ہی میں رکھیں گے اور کیا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے سرخی اگر قائم ہوسکتی ہے تو اسی طرح کہ "ایک رومن کیتھولک" یا "پروٹسٹنٹ" کی جھڑپ ایک "آریہ سماج" یا "وہابی" تانگے والے سے" اور کیا یہ خبر "ایک فرانسیسی کی تانگے والے سے لڑائی" کی سُرخی سے شائع نہیں کی جاسکتی؟

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ خدانخواستہ ہندوستان پر مذہب اس قدر غالب ہے کہ یہ محکوم پر اعلم کسی شخص کو محض انسان کہنے پر قناعت نہیں کرسکتا اور جب تک کسی کے مذہب اور اُس کے انفرادی عقائد کا نام نہ آئے اُس وقت تک اس کی مذہب زدہ ذہنیت کو آسودگی ہی محسوس نہیں ہوسکتی۔

یہ ہر بات میں مذہب کا دخل، اور ہر شخص کے ساتھ "ہندو" "مسلم" کی تخصیص محض اس کینہ ذہنیت پر مبنی ہے کہ ہندو مسلم اکھاڑے قائم کئے جائیں۔ تسبیح و زنار کو اُلجھایا جائے۔ داڑھی اور چوٹی کی کشتیاں دیکھی جائیں، اور دھوتیوں پائجاموں کو دست و گریبان کردیا جائے۔ تاکہ اس ہنگامے سے ہمارا اخبار ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو، ہمیں خطابات ملیں۔ چندے حاصل ہوں ہر موقع پر کثرت سے ووٹ ملیں، اور ہماری لیڈری مسلّم ہوجائے۔

کیا آپ اُس قوم کو عجیب الطرفین اور شریف و صالح سمجھنے پر تیار ہیں، جس کے عوام نہیں بلکہ خواص تک اپنے ذاتی اغراض پر اپنی قوم کا خون بہا دینا جائز سمجھتے ہیں؟

ہمارے یتیم خانے

یتیم خانوں کے قیام کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ بچے جو والدین سے محروم ہو چکے ہیں، پالے جائیں۔ اور انھیں صحیح تعلیم و تربیت سے آراستہ کرکے اس قابل بنادیا جائے کہ وہ جوان ہوکر کم سے کم بھوکوں نہ مریں۔

یتیم خانے میں رہنے والا یتیم، اُس بدقسمت بچے کو کہتے ہیں جو والدین کی شفقت سے محروم ہوکر خوش قسمتی سے اپنی قوم کا فرزند ہو جاتا ہے۔ اور یتیم خانہ اُس ادارے کو کہتے ہیں جو ایک باپ اور ایک ماں سے محروم ہو جانے والے بچے کے واسطے کئی لاکھ باپ اور کئی لاکھ مائیں مہیا کر دیتا ہے۔

لیکن ہمارے بدبخت ہندوستان کے تمام اداروں کی طرح یہ کئی لاکھ باپوں، اور کئی لاکھ ماؤں والا ادارہ بھی اس قدر مفلوج و ناکارہ ہے کہ اِس سے ہمارے یتیموں کی بدبختی میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں ہوتی۔ معاملہ اگر صرف یہیں تک ہوتا تو شاید کچھ دن صبر بھی کر لیا جاتا، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے اس ادارے سے یتیموں کی بدبختیوں میں کمی ہونا تو درکنار اُن کی بدبختیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔

اس بات کے کہنے میں جھجکنا نہ چاہیئے کہ ہمارے مذہبی ملک میں یتیم خانے تک اُن بزرگواروں کی چراگاہیں بنے ہوئے ہیں جن کی مقدس دوکانوں میں "خدا" و "رسول" تک نمائشی بکس (Show-case) میں "برائے فروخت" رکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

کسی یتیم خانے کے بانی، یا مہتمم ہونے کے لئے صرف اس کی ضرورت ہے کہ سفید ڈاڑھی کو ذرا سا مہندی سے رنگ لیا جائے، پاجامہ کسی قدر ٹخنوں سے اُونچا کر دیا جائے، اور ہر جامع مسجد سے لے کر ہر دروازے پر یتیموں کی بیکسی و ناچاری کا رونا رو دیا جائے، اور جب بھولے بھالے خدا ترسی سے لرزنے والے جاہل مسلمانوں سے روپیہ اینٹھ لیا جائے، اور مستقل چندے مقرر ہو جائیں تو تمام روپے کو اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش پر صرف کرتے ہوئے کاسۂ گدائی کو ہمیشہ بلند رکھا جائے اور یتیموں کے متعلق آیاتِ قرآنی پڑھ پڑھ کر نیز یتیموں کے باب میں شعراء کی نظمیں گا گا کر نئے دن نئے نئے دفینہ ہائے سیم و زر کے کھودنے میں مسلسل مصروف رہا جائے لیکن اس تمام پدرانہ محبت اور مادرانہ شفقت کے کاروبار میں اُس شئے پر سب سے کم توجہ مبذول کی جائے جن پر یتیم خانے کی بُنیاد واقع ہوئی ہے۔

جس یتیم خانے میں نکل جایئے آپ یہی اندھیر پائیں گے کہ یتیموں کو نہ تو اچھی غذا ہی دی جاتی ہے، نہ اچھی پوشاک، نہ اچھی تعلیم ہی دی جاتی ہے، نہ اچھی تربیت۔

ارباب یتیم خانہ ہمارے بچوں کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے بڑے شہروں کے چالاک گداگر اپنی ٹانگ کو۔ اُس بے داغ ٹانگ کو جسے وہ گھٹنوں تک پٹیوں سے لپیٹ کر جاہل کے جذبۂ رحم کو یہ دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اُن کی ٹانگ سڑی ہوئی ہے۔

اس دنیا کا نظم و نسق ہی ایسا واقع ہوا ہے کہ یہاں ہر شر میں خیر، اور ہر خیر میں شر کا عنصر موجود رہتا ہے۔ ہمارے یتیم خانے بھی اس محکم قانونِ عالم سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اپنی بے شمار خرابیوں کے باوصف، یہ غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لاوارث بچوں کو دھوپ اور بارش سے بچانے کے لئے ایک چھت میسر آجاتی ہے۔ بھوک کے شدائد سے بچنے کی خاطر ایک وقت کا بُرا بھلا سیٹھا پھیکا کھانا مل جاتا ہے، اور ستر پوشی کے واسطے چیتھڑے پرکھنے کپڑے بہم پہونچ جاتے ہیں۔ یہ افسوسناک صورتِ حال برداشت کرلی جاتی، اگر اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ نہ دیکھتے کہ بچوں کو یہ معمولی آسانیاں نہ کہ آسائشیں، بہت بڑی قیمت دے کر خریدنا پڑتی ہیں۔ بچوں کو ان معمولی آسانیوں کے خریدنے میں جو غیر معمولی قیمت دینا پڑتی ہے وہ اُن کی صحت تعلیم و تربیت، اور اُن کی خودداری ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات تو اِن ارزاں آسانیوں کی قیمت اس قدر گراں ہو جاتی ہے کہ بچوں کو انھیں اپنے اخلاق، اور اپنے چال چلن سے خریدنا پڑتا ہے۔

ایک بڑے مشہور شہر کے لڑکیوں کے یتیم خانے کو خود میں نے دیکھا تھا۔ جہاں پہونچتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں ایک بڑے چکلے میں آگیا ہوں، اور جس وقت یتیم خانے کے "مولوی صاحب" کا سامنا ہوا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں ایک مردِ نائکہ کی ملاقات کا شرف حاصل حاصل کر رہا ہوں۔

یہی حال لڑکوں کے یتیم خانوں کا ہے جہاں بدچلن صحبتوں کے نمایاں افراد اکثر و بیشتر نزولِ اجلال فرماتے رہتے ہیں جس سے خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔

ان ہولناک عیوب کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ یتیم خانوں کے ارباب حل و عقد، یتیموں کے جلوس نکالا کرتے ہیں۔ اس حالت میں کہ اُن کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں ہوتے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یتیموں میں سے بعض کے پاس خیراتی جوتے ہوتے ہیں۔ مگر جلوس کے وقت انھیں جوتے پہننے سے اس لئے ٹھکا روک دیا جاتا ہے۔ تاکہ دیکھنے والوں کے دل پسیج جائیں، اور وہ یتیم خانے کے فرش پر زر و گوہر کی بارش کر دیں۔ اور اس سونے چاندی کی بارش کا تمام پانی ارباب یتیم خانہ کے کھیتوں میں دے دیا جائے۔

شاید ایک ہفتہ ہوا ہوگا دوپہر کا وقت تھا، آپ کو معلوم ہے کہ یہ شدید گرمی کا زمانہ ہے، نہایت سخت لُو چل رہی تھی کہ یکایک میں نے اپنے زنانے مکان کے صحن میں کئی بچوں کے قرآن گانے کی آواز سُنی۔

باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ لاہور کے کسی یتیم خانے کے بچے ہیں جنھیں ارباب یتیم خانہ نے اس چلچلاتی دھوپ میں برہنہ پا در در بھیک مانگنے کے لئے باہر نکالا ہے۔

یہ دیکھکر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ معصوم بچے اس دھوپ میں در در بھیک مانگتے پھر رہے ہیں، اور اِن کے ارباب حل و عقد اس وقت ان کی بدولت خَس خانوں میں لیٹے ہوں گے۔

لعنت ہے ایسے یتیم خانوں پر، اور تُف ہے اِن یتیم خانوں کے ارباب بست و کشاد پر!

جو قوم اپنے یتیموں کو ننگا بھوکا رکھتی ہے۔ جو قوم اپنے یتیموں کو ننگے پاؤں پھرواتی ہے جو قوم اپنے یتیموں کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھتی ہے۔ جو قوم اپنے یتیموں کو دوسروں کے گھروں میں بے اجازت درآنہ گھس پڑنے کی تعلیم دیتی ہے۔ جو قوم یتیموں میں یہ ذہنیت پیدا کرتی ہے کہ وہ آیات قرآنی سے کاسۂ گدائی کا کام لیں۔ جو قوم اپنے یتیموں کو بھیک مانگنے کی انتہائی شرمناک عادت ڈلواتی ہے، جو قوم اپنے یتیموں کو اپنی معاش کا ذریعہ بناتی ہے اور جو قوم اپنے یتیموں کو اپنی نفسانی خواہشوں کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانے کا ارتکاب کرتی ہے۔ وہ قوم، وہ قدرت کی مبغوض و مغضوب قوم اس قابل ہے کہ اسے ہلاک کر دیا جائے۔ اُس کی ہڈیوں تک کو توڑ ڈالا جائے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں میں آگ لگا دی جائے اور پھر اُن ناپاک ہڈیوں کی راکھ کو دوزخ میں جھونک دیا جائے۔

ہماری پولیس

جرائم کے سلسلے میں پولیس کا اس قدر، اور صرف اس قدر فرض ہے کہ وہ کسی جرم کی رپورٹ ملتے ہی، پہلے تو اس کی تحقیقات کرے کہ آیا رپورٹ صحیح ہے کہ غلط، اور اگر صحیح ہے تو اس کا پتا چلائے کہ کس شخص یا کن اشخاص نے اس کا ارتکاب کیا ہے۔

اثنائے تحقیقات میں پولیس کے پیش نظر یہ خیال سب سے زیادہ شدت کے ساتھ رہنا چاہئے کہ دس ہزار مجرموں کا رہا ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ کسی ایک معصوم کو سزا ہو جائے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ پولیس کو چاہئے کہ وہ اس نظریئے کو بھی ہمیشہ یاد رکھے کہ ہر شخص، قانون کی نظر میں بے خطا ہے۔ جب تک اُس کی خطا بدیہی طور سے ثابت نہ ہو جائے۔ نیز جب پولیس کامل ایمانداری، اور خالص غیر جانبداری کے ساتھ تحقیقات کر چکے تو اُس کا یہ ایک نہایت ہی صحیح، مفید، خوشگوار اور راہبرانہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کے تمام کمزور و قوی، مشتبہ و یقینی، منفی و مثبت، اور تاریک و روشن پہلوؤں کو ایک خالص تحقیقات کنندہ اور کامل جویائے صداقت و معدلت ادارے کی حیثیت سے ایسی عاقلانہ، احتیاط آمیز اور شریفانہ تفصیل و ترتیب کے ساتھ عدالت کی میز پر رکھ دے کہ جج معاملے کے ہر پیدا و پنہاں رُخ کو دیکھکر ایسا فیصلہ کرے کہ اُس کا قلم انصاف کے کانٹے پر سونے کی طرح تُل جائے۔

مگر یہ دیکھکر ماتم کرنے اور اپنے سر کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر پھینک دینے کو دل چاہتا ہے کہ ہماری پولیس کبھی، اور کسی معاملے میں بھی، بلکہ ایک بار بھی ایسا نہیں کرتی۔

ہماری پولیس تو منھ کھولے یہ دیکھا کرتی ہے کہ کسے شکار کیا جائے، اور کس خدا کے نیک بندے کو سُولی پر چڑھوا کر منصب اور گریڈ بڑھوا لیا جائے۔

ہماری پولیس کی اس شرمناک اور شقاوت آمیز روش کے مختلف اسباب ہیں۔ جن میں دو سبب نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہماری پولیس کے چوکیدار، محرر، کانسٹبل، ہیڈ کانسٹبل، سب انسپکٹر

اور انسپکٹر وغیرہ ہندوستان کے پست اور چھوٹے طبقوں سے تعلق رکھنے والے چیلار ہوتے ہیں جو حق و انصاف کے عوض، معدہ و منصب ہی کو دیکھا کرتے ہیں۔

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ محکمۂ پولیس کی یہ روایت ایک مدّتِ دراز سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے کہ جو پولیس والا پبلک کو سب سے زیادہ ستاتا ہے، لوگوں کے سب سے زیادہ چالان کرتا ہے اور ملزموں کو سب سے زیادہ سزائیں دلاتا ہے وہی سب سے زیادہ اور سب سے جلد ترقی کر جاتا ہے۔ اور جو پولیس افسر ایسا نہیں کرتا اُسے ترقی نہیں ملتی، اُس کے سر پر تنبیہ و تخویف کے بادل گرجتے رہتے ہیں۔ اور اگر وہ اصول پر مصر رہتا ہے تو اُسے ملازمت سے علیحدہ کر کے برباد کر دیا جاتا ہے۔

پولیس کے جور و ستم کے متعلق حکومت کو بارہا توجہ دلائی جا چکی ہے اور یہ فریاد کا غلغلہ کہ پولیس، پبلک پر حد سے گزری ہوئی سختیاں کرتی ہے، غریب مخلوق کے حلقے سے نہیں، بلکہ سرکاری عدالتوں کی حلق سے ہزار بار بلند ہو چکا ہے، لیکن حیرت ہے کہ حکومت ان فریادوں کو ایک کان سے سنتی ہے، اور دوسرے کان سے اُڑا دیتی ہے۔

ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۴ رمئی ۱۹۳۵ء میں "جبریہ اقرارِ جرم" کی سُرخی سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہماری پولیس "تحقیقات" کے سلسلے میں کیا کیا شدائد روا رکھتی ہے۔

اس مضمون کے بعض حصوں کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے۔

"ہائی کورٹ نے پولیس کی معروف روش پر جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے، اکثر اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن آج تک حکومت یہ بتانے کے لئے سامنے نہیں آئی ہے کہ اُس نے ان اعتراضات کو سُنا یا جانچا ہے، یا یہ کہ وہ اس کی اصلاح کر رہی، یا اُس نے کسی خاص پولیس افسر کو اس کی بدعنوانیوں کی یہ سزا دی ہے۔

اب جب کہ بلند بانگ "پراونشل اٹانمی"

( ) بعض صوبوں میں، کسی نہ کسی طرح کام کر رہی ہے، کیا یہ امید کرنا حد سے متجاوز ہونے کے برابر ہوگا کہ حکومت اب اُن لوگوں سے باز پُرس کرنے میں پس و پیش نہ کرے گی، جو اقتدار و تحکم کے باعث مردم آزادی پر ہر وقت کمر باندھے رہتے ہیں!

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ نے ایک لڑکے کے قتل کے مقدمے کے سلسلے میں جو تھوڑے ہی دن ہوئے کہ اُن کے روبرو پیش ہوا تھا، یہ لکھا ہے کہ اس وارداتِ قتل میں پولیس نے چند چاروں پر شبہ کیا، اور انہیں تحقیقات کی خاطر پولیس کی نبرداری کے حوالے کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شے سے دو چار ہو کر جسے "شدید تحقیقات" کہا جاتا ہے آخر کار ایک چار نے اقرار کر لیا کہ وہ قاتل ہے۔

لیکن تحقیقاتِ مابعد نے عدالت پر یہ ثابت کر دیا کہ قتل کرنا تو درکنار چار اس بات سے بھی واقف نہیں ہے کہ واقعہ دراصل کیا تھا۔

وہ تحقیقات کس قدر "شدید" ہوگی جس کی تاب نہ لا کر ایک معصوم و بے گناہ انسان اُس جرم کا اقرار کر لیتا ہے جس سے وہ آگاہ تک نہیں ہوتا۔ اور ایسے ہولناک جرم کا اقرار کر لیتا ہے جس کی سزا موت ہو سکتی ہے!

پولیس کی ان "کارگزاریوں" کا بس لوگ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس امر سے واقف ہیں کہ اس ملک میں یہ محکمہ کیا کیا سختیاں کرتا رہتا ہے۔

سر ڈگلس کے نزدیک ایسا شبہ کرنے کے بہت سے دلائل موجود ہیں کہ صرف اسی مقدمے میں نہیں، بلکہ اکثر و بیشتر مقدموں میں مجرموں سے جبریہ اقرارِ جرم کرایا جاتا ہوگا۔

سر ڈگلس، پولیس کی اس روش کے نتائج کو سخت خطرے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ اس سے یہ شدید خطرہ ہے کہ مقدمات کی عمارتیں غلط بُنیادوں پر قائم ہو جائیں گی اور اُس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ معصوم و بے خطا لوگ پھانسی کے تختوں پر لٹک جائیں گے۔

آگے چل کر ہز لارڈشپ تحریر فرماتے ہیں کہ معدلت گستری کا یہ ایک زرّیں اصول ہے کہ ملزم کو اُس وقت تک برابر معصوم سمجھا جائے جب تک کہ اُس کا جرم روزِ روشن کی طرح نہ ثابت ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی عدالتوں میں اس نظریے پر بھی کوئی توجہ نہیں کی جاتی کہ پولیس اور وکیل سرکار کا کام یہ نہیں ہے کہ ملزم کو اقراری مجرم بنا لیا جائے۔ یا عدالت کو ایسے مغالطے دئے جائیں کہ وہ دھوکا کھا کر ملزم کو سزا دیدے؛ بلکہ اس کے برخلاف پولیس اور وکیل سرکار کے ذمّے صرف اس قدر کام ہے کہ تمام ممکن الحصول واقعات کو بجنسہٖ عدالت کے روبرو پیش کر کے فیصلہ جج پر چھوڑ دے۔

ہندوستان میں، انگلستان کی بہ نسبت، اِن دونوں متذکرہ بالا اصولوں کی مٹّی پلید کرکے زیادہ عزت افزائی کی جاتی ہے

جرائم کی تحقیقات میں، صداقت دریافت کرنے کے عوض، تحقیقات کرنے والوں کی تمام قوتیں اسی پر صرف ہو جاتی ہیں کہ ملزم کو کسی نہ کسی طرح مجرم ٹھیرایا جائے۔

اس شرارت کا سدِّ باب صرف اس ایک صورت سے ہو سکتا ہے کہ حکومت اس کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جائے۔

پولیس سے یہ صاف صاف کہہ دیا جائے کہ تیری ڈیوٹی صرف اِس قدر ہے کہ تو واقعات کی اصلیت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے، اور صحیح مجرم کا صحیح طریقوں سے پتا چلائے۔ یہ کس کور باطن نے تیرے کان میں پھونک دیا ہے کہ تو آنکھیں بند کرکے کسی ایک شخص کو پکڑ لے، اور اس پکڑ لینے کے عمل کے بعد تمام ایڑی چوٹی کا زور اس پر صرف کر دے کہ اُس غریب کو خواہ مخواہ اقرار کر لینا پڑے کہ وہ سارق، ڈاکو، اور قاتل ہے۔

اس امر سے بھی پولیس کو آگاہ کر دیا جائے کہ جان بُوجھ کر جھوٹ بولنے، اور عدالت کو گمراہ کرنے کی پاداش میں اُسے عبرتناک سزائیں دی جائیں گی:

یہاں تک تو لاہور کے چیف جسٹس کا ریمارک تھا، اب آئیے، لگے ہاتھوں اِسی سلسلے کی ایک اور چیز بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بائیسویں مئی ۱۹۳۶ء کے ہندوستان ٹائمز میں یہ واقعہ شائع ہوا ہے کہ ایک شخص نے اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی خاطر اپنے کو روپوش کر لیا، اور اِس طرح روپوش کیا کہ پولیس کو اُس کے دشمنوں پر یہ شبہ ہو گیا کہ اُنھوں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔

بس یہ شبہ ہوتے ہی ایک قیامت برپا ہو گئی، شرارت آمیز اُچھل کُود شروع کر دی گئی اور اضافۂ منصب و مال کی اُمیدیں دلوں میں کروٹیں لینے لگیں ——

پولیس نے اپنے مخصوص "آلاتِ تحقیقات" اُٹھا لئے، اور جادو کی لکڑی گھمانا شروع کر دی —— یہاں تک کہ مقدمۂ قتل اپنے تمام ثبوتوں اور اپنی تمام شہادتوں کے ساتھ عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

مفروضہ مقتول کے خون آلود کپڑے اور خون میں لتھڑا ہوا گنڈاسا عدالت کے روبرو پیش کیا گیا اور خون آلود اُسی کے ساتھ ساتھ دو گواہ بھی پیش کر دئے گئے جنھوں نے اس واقعۂ "قتل" کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ الغرض واقعاتی اور عینی تمام شہادتوں کے ذریعے سے یہ بات ثابت کر دی گئی کہ روپوش آدمی قتل ہو چکا ہے، اور اس روپوش کے وہی لوگ قاتل ہیں جنھیں پولیس نے گرفتار کیا ہے۔

لیکن ہنوز مقدمے کی سماعت کا کاروبار جاری ہی تھا، اور پولیس اپنے ایماندارانہ فرائض میں سرگرمی سے مشغول تھی کہ "مقتول" عدالت کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اور چشم زدن میں یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ یہ تمامتر مقدمہ پولیس کی تخیلِ خوانی کے ایک ادنیٰ سے کرشمے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

تصوّر کیجئے اس ہولناکی کا۔ اور ماتم کیجئے اس شقاوت پر۔

اگر "مقتول" عدالت میں حاضر نہ کر دیا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟

اور اگر "مقتول" اپنے "معصوم" قاتلوں" کے سُولی پا چکنے کے بعد نمودار ہوتا تو دنیا کی وہ کون ایسی زبردست قوت تھی جو انصاف کے دل کو ٹوٹ جانے اور معدلت گستری کے سینے کو شق ہو جانے سے بچا لیتی؟

کاش حکومت کسی صورت سے محسوس کر سکتی کہ وہ پولیس جو اُس کی نظروں میں بہت زیادہ عزیز ہی نہیں بلکہ اُس کی چہیتی اور لاڈلی بیٹی ہے جو "باغیوں" اور سرکشوں کے سروں پر لاٹھی چارج کرکے ہندوستان کے مشہور خلائق امنِ عامہ کو قائم رکھتی ہے اور "دہشت انگیزوں" کے سروں پر آرے چلا کر وطنِ عزیز کے نیک نام نظم و نسق کو بحال رکھتی ہے۔

وہی پولیس، ہندوستان کے باشندوں کے حق میں ایک ایسی ہولناک وبا بنی ہوئی ہے کہ ہر طرف سے یہ دردناک صدائیں چلی آ رہی ہیں کہ یا تو پولیس کی اصلاح کر دو یا پھر ہم سب کو چوراہوں پر سُولیاں کھڑی کرکے پھانسی پر لٹکا دو۔

ایک معذرت

"کلیم" کے مئی نمبر میں "غزل گوئی" پر جو مضمون شائع ہوا ہے ہر چند جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے، میں اُس سے کلیتہً متفق ہوں، لیکن جہاں تک کہ اس مضمون کے لہجے کا تعلق ہے میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں

مجبور ہوں کہ مجھے اُس سے شدید اختلاف ہے۔

اور اس اختلاف میں شدّت کا عنصر اس وجہ سے اور زیادہ ہوگیا ہے کہ اس کا رُوئے سخن میرے قابلِ احترام دوست حضرت حکیم آزاد انصاری کی طرف ہے، جو میری نگاہوں میں قابلِ احترام ہی نہیں بلکہ عقیدت و محبت بھی ہیں۔

اس کے علاوہ جن جن حضرات کو اس کے لہجے سے تکلیف پہونچی ہو میں اُن تمام حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں۔

آزاد صاحب سے اس لئے معافی کا طالب نہیں ہوں کہ میرے اُن کے تعلقات ان امور سے بالاتر واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ میری رُوح سے بخوبی واقف ہیں۔

اگر یہ مضمون اشاعت سے قبل میری نظر سے گزر جاتا تو اس کا لہجہ بالکل مختلف ہوتا۔ لیکن مئی نمبر کی ترتیب کے وقت میں کچھ ایسے حالات میں گرفتار رہا کہ بعض مضامین جن میں یہ مقالہ بھی ہے میری نظر سے گزر ہی نہیں سکے۔

اس کے علاوہ میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ آزاد جس شاعری کے حامی ہیں وہ روشِ عام سے اس قدر مختلف واقع ہوئی ہے کہ عام شعراء کو اُس کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ اور میرے اور آزاد صاحب کے نظریئے میں یہ اختلاف ہے کہ وہ نیک نیتی سے محض غزل کی اصلاح چاہتے ہیں اور میں نیک نیتی سے انعدام۔

آگ اور پانی

آئی ہیں گھٹائیں نغمہ خوانی کے لئے — سو رنگ لئے ہوئے جوانی کے لئے
دے بادہ کہ سب سے بڑھ کے موزوں ہے ندیم — یہ آگ، برستے ہوئے پانی کے لئے

بوندیں

بیلوں پہ جھلک رہی ہیں بوندیں، ساقی — خوشوں سے ٹپک رہی ہیں بوندیں، ساقی
دے جام کہ برگہائے سبز و تر پر — رہ رہ کے کھنک رہی ہیں بوندیں، ساقی

مستوں کی بادشاہی

ہنگامۂ انوارِ الٰہی دیکھو — گل رنگ ہے رات کی سیاہی، دیکھو
پہلو میں صنم ہے، اور سبو میں صہبا — دیکھو، مستوں کی بادشاہی، دیکھو

جوش ملیح آبادی

گھٹا

اُٹھی گھٹا، وہ، رنگ و بُو کا کارواں لئے ہوئے ۔۔۔ جلو میں کائنات کی؛ جوانیاں لئے ہوئے
لئے ہوئے پیامِ جاں، ہر ایک رَس کی بُوندمیں ۔۔۔ ہر ایک رَس کی بُوندمیں، پیامِ جاں لئے ہوئے
لئے ہوئے ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں ۔۔۔ ہوا کے نرم بازوؤں پہ، بوستاں لئے ہوئے
دُھواں دھواں لئے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی ۔۔۔ بلندیوں پہ چرخ کی، دُھواں دُھواں لئے ہوئے
زمینِ تشنہ کام کی جماہیوں کے سامنے ۔۔۔ شرابِ لالہ رنگ کی گلابیاں لئے ہوئے
وفورِ نشو وساز میں، ہجومِ پیچ و تاب سے ۔۔۔ رقیق و نرم دامنوں میں بجلیاں لئے ہوئے
ہر ایک سُو رَواں دَواں، کبھی یہاں، کبھی وہاں ۔۔۔ مُیتانِ شوخ و شنگ کی سی، شوخیاں لئے ہوئے
صدائے برق و رعد میں، ہوائے تند و تیز میں ۔۔۔ نزاعِ جوش و ہوش کی کہانیاں لئے ہوئے
ہوا میں اینڈتی ہوئی فضا میں جھومتی ہوئی ۔۔۔ تحمل و شکیب کی تباہیاں لئے ہوئے
بہشتِ حسن وعشق کو، جہانِ رقص وکیف کو ۔۔۔ فضائے آب و رنگ میں کشاں کشاں لئے ہوئے
حریمِ کیف و سرخوشی میں، پردہ ہائے رنگ میں ۔۔۔ سُبو بدوش مغبچوں کی مستیاں لئے ہوئے
ادا و ناز و دلبری کی رنگ بیز چھاؤں میں ۔۔۔ نئی نئی جوانیوں کی جھلکیاں لئے ہوئے
لئے ہوئے ہواؤں پر سیاہ و سرخ کشتیاں ۔۔۔ ہوائے تند کشتیوں کے بادباں لئے ہوئے
لئے ہوئے بلندیوں پہ وَلولے حیات کے ۔۔۔ حیات بخش ولولے بلندیاں لئے ہوئے
سیاہیوں کے سلسلے میں، تیرگی کی موج میں ۔۔۔ جنُونِ عرفروش کا کلوں کی داستاں لئے ہوئے

کدھر ہے جوش؛ بدلیاں رواں ہیں سوئے میکدہ
سیاہیوں کے حاشیے پہ سُرخیاں لئے ہوئے

جوش ملیح آبادی

پانچ سو مذاہب کی سرزمین

چمن لال صاحب سیاحِ جاپان
ترجمہ محمود علی خاں

دنیا میں اگر کوئی ملک مذہبی رواداری کی زندہ مثال ہے تو وہ جاپان ہے، جہاں ایک ہی گھر میں عیسائی مذہب، بودھ مت، شنٹو دھرم اور کمیونزم کے پیرو ایک خاندان کے افراد اور بھائی بھائی کی حیثیت سے رہتے ہیں، وہ لوگ ہندوستان کی طرح مذہب کو آلہ کار نہیں بناتے، جاپان میں مذہبی جھگڑوں کا کبھی نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ مجھ سے اکثر حضرات دریافت کرتے ہیں کہ ہندوستان کے مذہبی دیوانے آخر جاپان والوں کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ میرا جواب صاف ہے یعنی "مختلف مذاہب کے خود ساختہ لیڈر حکومت کی امداد اور سرپرستی میں اپنے ذاتی اغراض کے لئے مذہب کو ایک بہانہ بناتے ہیں اور عوام میں ابھی تک یہ احساس پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ ان نام نہاد مذہبی پیشواؤں کو ملک کا حقیقی دشمن سمجھ سکیں: اگر آپ پوچھیں کہ جاپان کا مذہب صرف ایک لفظ میں بتاؤ تو میں بلا تامل بول اٹھوں گا، وطن پرستی:

ہندوستان کی طرح جاپان میں وطن پرستی محض ایک جذبہ کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ یہ اُن کا مذہب ہے، خواہ اُن کے روحانی عقائد کچھ بھی ہوں۔ اور خواہ وہ بودھ ہوں یا عیسائی یا شنٹو، لیکن وہ اپنے وطن سے انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ اور اپنی جانیں بھی اُس پر سے قربان کر دینے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

مذہبی عقائد کے لحاظ سے ان میں بے شمار فرقے ہیں، اور شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ اب ان کی تعداد پانچ سو تک پہونچ گئی ہے، اس عرصے میں جاپانیوں کے مذہبی عقائد میں عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئی ہیں اور آئے دن مختلف اضلاع سے نئے نئے مذاہب کی اطلاع آتی رہتی ہے، یہاں تک کہ محکمہ تعلیم کے مذہبی بیورو کے پاس اوسطاً ہر ہفتہ ایک نئے مذہب کے جاری ہونے کی اطلاع آجاتی ہے، مقامی گورنروں نے اس صورتِ حال کی تحقیقات کی اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ عوام تو مالی مشکلات کی وجہ سے کسی معجزے یا عجیب و غریب چیز کی تلاش میں رہتے ہیں اور تعلیم یافتہ حضرات موجودہ مذاہب سے مطمئن نہیں ہیں، اس لئے تلاشِ حق میں سرگرداں رہتے ہیں اور وہ سپاہی جو منچوریا سے صحیح و سالم واپس آگئے ہیں سمجھتے ہیں کہ وہ کسی قدرتی ہاتھ یا مذہبی فیض کی امان میں رہے اور بخیر و عافیت واپس آگئے غرضکہ ان تمام چیزوں سے مل جل کر نئے نئے مذاہب کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس وقت جاپان میں کوئی پانچ سو مذاہب یا فرقے ہیں، بعض مذاہب کے تو صرف معدودے چند پیرو ہیں۔ یہ لوگ اپنی عبادتگاہوں میں جو روپیہ نذر کرتے ہیں اس سے بھی ایک بڑی رقم جمع ہو جاتی ہے، دراصل بعض مذاہب کا مقصد ہی صرف روپیہ جمع کرنا ہے۔ ان میں سے سات مذاہب تو ایسے ہیں جو لمیٹڈ کمپنی کے انداز پر چلائے جاتے ہیں۔ ان مذہبی فرقوں اور جماعتوں کی نگرانی کے لئے ایک قانون بھی ہے، لیکن اس میں اصلاح کی کافی ضرورت ہے، اس لئے مسٹر مسوداوزیر تعلیم کا ارادہ ہے کہ اُن کی معقول اور مکمل نگرانی کے لئے عنقریب ایک مؤثر قانون بنائیں۔

اگرچہ جاپان کے مذاہب کے متعلق کتابوں پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن اس مختصر سی کتاب میں تفصیل کے ساتھ ان سب کا تذکرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے میں وہاں کے تین خاص خاص مذاہب کا ذکر کروں گا۔

شنٹو مذہب

شنٹو مذہب کا خاص اصول نیچر اور بزرگوں کی پرستش کرنا ہے، ان کے کوئی اسی لاکھ دیوی دیوتا ہیں۔ لیکن خاص الخاص سورج کی دیوی ہے، جو شاہی خاندان کی جد امجد تصور کی جاتی ہے، اور جس کی نسل ہزار ہا برس سے مسلسل جاپان پر حکمرانی کرتی رہی ہے۔ اگرچہ اس مذہب میں سمندر کی دیوی، ندیوں کی دیوی، پہاڑوں کی دیوی، ہوا کی دیوی، آگ کی دیوی، سب تسلیم کی جاتی ہیں، اور قوم کے جانباز سپاہیوں اور شاہی خاندان کے وفادار خادموں کی بھی پرستش ہوتی ہے۔ لیکن شنٹو مذہب کا اصل اصول شاہی خاندان کی سب سے پہلی بزرگ دیوی، اس کے رشتہ داروں اور اس کی اولاد کی پوجا کرنا ہے۔ اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ جاپانی اپنے بادشاہ کے سچے وفادار اور اس پر دل و جان سے فدا ہیں۔

شنٹو عبادت کا خاص اصول پاکیزگی ہے، اس لئے مذہباً یہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ کہ عبادت سے پہلے منہ ہاتھ دھو لئے جائیں، شنٹو پروہت اور پیرو اکثر و بیشتر غسل کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی اسی پاکیزگی اور صفائی کے مذہبی اصول کا ثبوت ہے۔ لاش، انسانی خون اور برے خیالات کو ناپاک تصور کیا جاتا ہے، ہر قسم کے قدرتی حوادث مثلاً طوفان، منڈی، وبا، آندھیاں زلزلے وغیرہ سے اور قومی آفات مثلاً تیرھویں صدی کے منگولیا کے حملہ وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لئے خدا سے دعائیں کی جاتی ہیں۔

شنٹو میں عبادیات مذہب کا کوئی باضابطہ نظام نہیں ہے، دراصل یہ صحیح معنوں میں کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ ایک حلقہ ہے، جس میں تیرہ فرقے ہیں۔ یہ انسانی ضمیر کو دیوتا تصور کرتا ہے، اور اس کا خاص حکم یہی ہے کہ اپنے اندر کی سچی آواز کی پیروی کرو۔ عالم جاودانی کی بھلائیوں اور عالم فانی کی برائیوں کی نسبت اس کی تعلیم واضح نہیں ہے، لیکن یہ صاف صاف تسلیم کیا گیا ہے کہ روح اس دنیاوی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ شنٹو مذہب میں رہبانیت کو دخل نہیں ہے، اس کے پروہت بھی عوام کی طرح ازدواجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور گوشت کھانے سے پرہیز نہیں کرتے، عورتیں بھی مندروں اور مزاروں پر ناچتی گاتی ہیں، لیکن فقیری نہیں لیتیں، دیوتاؤں کو عموماً چاول، پھل، ترکاریاں اور خاص خاص مواقع پر کپڑا بھی چڑھایا جاتا ہے۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں جاپان خاص میں آئسے کے بڑے مندر سے لے کر چھوٹے چھوٹے مندروں تک ہر قسم کے کل ۱۱۰۲۴۳ مندر تھے۔ شنٹو کے تیرہ فرقوں میں تیشہ فرقہ اور تنری فرقہ زیادہ مقبول ہے۔ ان میں سب سے بڑا یک کے ۴۳ لاکھ سے زیادہ پیرو ہیں۔ اس کے بعد آئی تنگ فرقہ کے ۲۰ لاکھ پیرو ہیں، پھر سفکو ہی اور شنٹو فرقوں کا نمبر ہے، جن میں سے ہر ایک کے دس لاکھ پیرو ہیں۔ غرضکہ باقی آٹھ فرقوں کو شامل کر کے شنٹو مذہب کے پیروؤں کی مجموعی تعداد ۴۷،۳۴۰،۵۰،۲۷۲،۱ ہے۔

بودھ مت

بودھ مذہب ۵۵۲ء میں جاپان میں آیا، جب کہ کوریا (کوریا) کے بادشاہ نے اپنے یہاں کی طوائف الملوکی سے پریشان ہو کر جاپان کی امداد چاہی۔ اور جاپان کے بادشاہ کنی کو سوتر (مقدس کتب) اور مورتیاں تحفہ میں پیش کیں، علماء نے ان کتابوں کو پڑھا اور ان پر عمل شروع کیا۔ اور صناعوں اور کاریگروں نے ان مورتیوں کو دیکھا اور فن سنگ سازی میں ان کی پیروی کی، بادشاہ نے خود اپنے وزیر کو ہدایت کی کہ اس نئے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ پھر کوئی پچاس برس کی سخت جد و جہد کے بعد شاہ سوئیکو کے دور میں (۵۹۲ء تا ۶۲۸ء) شہزادہ شنٹوکو نے بودھ مذہب کو تمام سلطنت میں مقبول و مستحکم بنایا، بودھ مت کو جاپان میں مقبول عام بنانے کے سلسلے میں شنٹوکو نے وہی خدمت انجام دی جو ہندوستان میں اشوک نے اور سلطنت روما میں عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں قسطنطین نے انجام دی تھی، اسی لئے اکثر اسے جاپان کا قسطنطین کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلا بودھ فرقہ ۶۲۵ء میں شروع ہوا، اس کے بعد اور فرقے بنے، لیکن ۱۳۰ برس تک ان کا تخیل بالکل چینی رہا۔ پھر شائع بانی تندئی فرقہ اور کوکئی بانی شنگن فرقہ نے اسے قومی رنگ دیا

یعنی شنتو مذہب کے دیوتاؤں کو بودھ اور بودھستو کا مظہر مان لیا، اس طرح بودھ اور شنتو مذہب ایسے مل جل گئے گویا ایک ہی مذہب کے دو رُخ ہیں اس کے بعد بودھ مت نے پورا عروج حاصل کیا، اور اس کے دو مرکز بن گئے نارا کے قریب کویا پہاڑ کی خانقاہ میں شنگن فرقے کے مخفی فلسفے کی تعلیم دی جاتی تھی، اور کیوٹو کے پاس ہیئی پہاڑ کی خانقاہ میں تندائی فرقہ کی تلقین کی جاتی تھی۔

۱۹۲۸ء میں بودھ مت کے پیروؤں کی تعداد ۴۸۰۷۰۹۰۰۰۰۰ اور مندروں کی تعداد ۷۲۲۰۷۰ تھی۔ اب سب سے بڑا فرقہ شن ہے، جس کے ایک کروڑ تیس لاکھ پیرو ہیں۔ اس کے بعد زین فرقہ کا نمبر ہے جس کی تین شاخیں اور ۹۰ لاکھ پیرو ہیں۔ پھر شنگن فرقہ ہے جس کے ۸۰ لاکھ پیرو ہیں۔ پھر جودا اور نچیرن ہے، جس میں سے ہر ایک کے تیس لاکھ ماننے والے ہیں۔ اس میں سے ہر فرقہ کے مبادیات بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ اول الذکر اور آخر الذکر (شن اور نچیرن) فرقے سب سے زیادہ جمہوریت پسند ہیں۔ بہرحال ہندوستان کے علماء نے اکثر یہ کہا ہے کہ ہندوستان میں جہاں مہاتما بدھ نے جنم لیا تھا اُن سے اتنی عقیدت کا اظہار نہیں کیا گیا جتنا جاپان میں ہوا۔

جاپان والے مذہب کے پابند ہیں، اور اپنے مندروں اور مزاروں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ آپ جہاں جائیں مندر اور مزار ضرور ملیں گے، اس کے باوجود بعض سیاح یہ کہتے ہیں کہ وہ مذہب کی زیادہ پروا نہیں کرتے، عبادت کے لئے کوئی خاص دن مقرر نہیں ہے۔ اس لئے عموماً ساتوں دن دوکانیں کھلی رہتی ہیں، اور کاروبار جاری رہتا ہے، البتہ بعض دوکانیں مہینہ میں دو بار بند ہوتی ہیں۔ تاکہ ملازمین کو آرام کا موقع مل جائے، مندروں میں عیسائیوں کی طرح عبادت کا کوئی باضابطہ طریقہ مقرر نہیں ہے، لوگ اکثر تنہا یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں درشنوں کے لئے جاتے رہتے ہیں، شنتو مندر میں تو یہ طریقہ ہے کہ لوگ خاص دروازے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ گھنٹی کی ڈوری کھینچ کر اسے بجاتے ہیں۔ پھر تین بار تالی بجا کر گویا دیوتا کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ نذرانہ صندوقچی میں ڈالتے ہیں، سر جھکا کر دعا کرتے ہیں اور واپس چلے آتے ہیں۔ بودھ مندر میں پہلے ایک چھوٹی سی لکڑی سے گھنٹہ بجاتے ہیں، تاکہ دیوتا اُن کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اُن کے ہاتھوں میں ایک گلدستہ ہوتا ہے اُسے گھماتے جاتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں، اس میں صرف آدھا منٹ صرف ہوتا ہے اور بظاہر اس سے ایک لاپرواہی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چاہے شنتو مندر ہو یا بودھ مندر، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ان کا بے انتہا احترام کرتے ہیں۔ کوئی بودھ جب شنتو مندر کے سامنے سے گزرتا ہے تو اپنی ٹوپی اُتار کر ایسے ہی جھک جاتا ہے جیسے وہ بودھ مندر کے سامنے جھکتا ہے۔ اسی طرح ایک شنتو جب بودھ مندر کے سامنے آتا ہے تو بالکل اپنے مندر کی طرح اُس کا بھی احترام کرتا ہے۔

جاپانی اپنے مذہب کے بڑے پابند ہیں، لیکن اُس کے ساتھ دوسرے مذہب والوں سے انتہائی رواداری کا سلوک کرتے ہیں، ہر بہار و خزاں کے زمانے میں یاتریوں کے غول کے غول صاف شفاف کپڑے پہنے ہوئے مندروں کے درشن کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ منظر بھی کتنا خوشگوار ہوتا ہے۔

جاپانی اُن ہزاروں لاکھوں مندروں اور مزاروں کو اپنی پشت پناہ تصور کرتے ہیں، اور خواہ وہ روزانہ درشن کے لئے نہ جائیں لیکن عقیدہ یہی رکھتے ہیں کہ یہ مقدس مقامات مختلف دیوتاؤں کے اور ان کے درمیان کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سالانہ مذہبی تیوہاروں اور مختلف تقریبوں کا بڑے ذوق شوق سے انتظار کرتے ہیں، کیونکہ اُن سے مذہبی ہدایات کے علاوہ ایک جگہ جمع ہونے، گھومنے پھرنے مختلف چیزیں خریدنے، غرضکہ خود تفریح کرنے اور بچوں کو بہلانے کا اچھا موقع ملتا ہے۔

عیسائی مذہب

تقریباً ایک صدی تک یعنی ۱۵۴۹ء سے ۱۶۳۸ء تک رومن کیتھولک مشنری جاپانیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کرتے رہے، ۱۵۴۹ء میں سوسائٹی آف جیزس کے ایک بانی فرانسس اکسیوئر یہاں آئے تھے، اور ۱۶۳۸ء میں تمام مشنری یہاں سے نکال دئے گئے، ۸۹ برس کے اس عرصے میں تقریباً دو لاکھ جاپانی عیسائی ہو گئے ان میں بڑے بڑے جنرل اور اعلیٰ طبقے کی تعلیم یافتہ خواتین بھی شامل تھیں، شروع شروع میں نوبوناگا

نے ان کی حمایت کی، پھر ہدے یوشی نے ان پر چند پابندیاں عائد کیں، اس کے بعد آئیے یاسو نے اُن کی تمام سرگرمیاں سختی سے روک دیں، بالآخر وہ جاپان سے خارج کر دیئے گئے۔ ۱۶۳۷ء میں کیوشو کے ۲۰ ہزار عیسائیوں نے طرح طرح کے مظالم کے خلاف بغاوت کی، یہ شمابارا کے غدر کے نام سے مشہور ہے۔

اس کی وجہ کچھ تو مقامی بدنظمی تھی، اور کچھ مذہبی اختلافات، چونکہ عیسائی مشنریوں نے غیر معمولی جوش و خروش کا اظہار کیا، اس لئے خواہ مخواہ بادشاہوں کے رویہ میں سختی پیدا ہوتی تھی۔ بہرحال ۱۶۳۸ء میں عیسائیوں کے قتل عام کے بعد یہ غدر ختم ہوا، اس واقعہ سے ظاہری طور پر جاپان میں دو صدی کے لئے عیسائیت کا قلع قمع ہو گیا۔ کیونکہ ہسپانوی اور پرتگالی مشنریوں کے بنائے ہوئے رومن کیتھولک عیسائیوں کے سوا اس وقت وہاں اور کوئی عیسائی نہ تھے، بالآخر ۱۶۳۹ء میں عیسائیت کا خاتمہ کر دیا گیا، اس کے بعد جو عیسائی بچ رہے اُن پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے، سینکڑوں کو صلیب دی گئی، اور ہزاروں کو زندہ جلا دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود کیوشو کے علاقہ میں عیسائیت کبھی بیخ و بنیاد سے فنا نہیں ہوئی، بلکہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ۱۸۶۵ء میں ناگاساکی میں رومن کیتھولک گرجا تعمیر ہوا، اور عیسائیوں کی تلاش شروع ہوئی تو ہزاروں عیسائیوں نے اپنے اس مذہب کا علی الاعلان اقرار کیا، جسے وہ پشتہا پشت سے اپنے دلوں میں محفوظ رکھے چلے آئے تھے۔

اس کے بعد ۱۸۵۹ء میں پھر رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنریوں کو اپنا کام شروع کرنے کی آزادی ملی۔ لیکن شروع شروع میں اُنھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ۱۸۷۳ء میں عیسائیت کے خلاف تمام امتناعی احکامات واپس لے لئے گئے۔ بالآخر ۱۸۸۹ء کے آئین کے مطابق سب کو مکمل مذہبی آزادی مل گئی۔

۱۹۳۰ء میں جاپان میں عیسائیوں کی تعداد ۲۰۵۴۰۳۰۸ تھی، اُن میں زیادہ تر رومن کیتھولک ہیں، اب ان کی مالی حالت بھی اچھی ہے، اور اُن کے تمام گرجا فارغ البال ہیں۔

کاش ہمارے مذہبی پیشوا ایک مرتبہ جاپان کا دورہ کریں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہاں کتنی مذہبی رواداری ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں اُن کی بدولت مذہب کس طرح بدنام ہو رہا ہے۔ اگر جلد اُنھوں نے اپنے اطوار نہ بدلے تو اندیشہ ہے کہ یہاں کے لوگ بھی روس کی طرح مذہب سے متنفر ہو جائیں گے۔

لا جام مے تشنہ لب پلا دے ساقی
آنکھوں سے حجابات اٹھا دے ساقی
جب جلوے کی مشتاق ہے چشم بیدار
اس جلوے کو بے پردہ دکھا دے ساقی

سید محمد علی خاں اثر اکبرآبادی

جاگے ہوئے فتنوں کو سلا دے ساقی
سوئی ہوئی قسمت کو جگا دے ساقی
اک جام گراں سے مجھے بیخود کر دے
غم ہائے دو عالم سے چھڑا دے ساقی

سید محمد علی خاں اثر اکبرآبادی

پیغامِ وطن

طبقۂ حکام رَس کی خدمت میں

اے معزز طبقۂ حکام رَس   اے گروہِ کامگار و کام رَس
اے حکومت کی نظر میں لائقو   اے وفاکیشی میں سب پر فائقو
اے اصولِ زرکشی پر عاملو   اے حصولِ منفعت میں کاملو
اے خوشامد کے ہنروں سے واقفو   اے غلامی کے گُروں سے واقفو
اے اجانب سے وفا پر مائلو   اے وطن کی مخلصی کے حائلو
اے خلاصی کی لگن کے دشمنو   اے خود اپنے ہی وطن کے دشمنو
اے بدیسی چال سے ناواقفو   اے خود اپنے حال سے ناواقفو
اے ہمارے دشمنوں کے دوستو   اے ہمارے گوشتو اے پوستو

میں نے یہ مانا کہ تم لائق بھی ہو   فرد بھی، ممتاز بھی، فائق بھی ہو
تم خطابوں سے بھی سرافراز ہو   معتقد رعہدوں پہ بھی ممتاز ہو
تم کسی سے مال میں بھی کم نہیں   اوج یا اقبال میں بھی کم نہیں
ملک کے صاحب وقاروں میں بھی ہو   سلطنت کے دوستداروں میں بھی ہو
موردِ الطافِ سرکاری بھی ہو   آلۂ کارِ ستمگاری بھی ہو
اختیاراتِ ستم رانی بھی ہیں   فوجداری بھی ہیں دیوانی بھی ہیں
اِس طرف تقدیرِ سیم و زرفشاں   اُس طرف صاحب بہادر مہرباں
ٹھیک ہیں، جو جو اُمنگیں جی میں ہیں   خوبیِ قسمت سے پانچوں گھی میں ہیں
لیکن اک تشویش اک اُلجھن میں ہوں   کیا اجازت ہے کہ اتنا پوچھ لوں

تم میں سو گُن، تم میں لاکھوں رکھ رکھاؤ ۔۔۔ تم سبھی کچھ ہو، مگر یہ تو بتاؤ
لب پہ آؤ سرد بھی ہے یا نہیں ۔۔۔ دل میں قومی درد بھی ہے یا نہیں
قوم مدت سے ذلیل و خوار ہے ۔۔۔ مُلک مدت سے مصائب زار ہے
ابتلا پر ابتلا ہے، اور ملک ۔۔۔ از دحامِ صد بلا ہے اور ملک
آفتیں ہیں اور دُنیا ئے وطن ۔۔۔ شامتیں ہیں اور ابنائے وطن
جس کو دیکھو، بندِ آفت کا اسیر ۔۔۔ جس کو پوچھو بینوا، مفلس، فقیر
کوئی بیکاری کے غم سے جاں بلب ۔۔۔ کوئی ناداری کے سَم سے جاں بلب
مُلک کا مُلک آفتوں سے اَدھ مُوا ۔۔۔ قوم کی قوم اور غلامی کا جُوا
دوستو! وہ پاسِ عزت کیا ہوا ۔۔۔ وہ سراحساس عزت کیا ہوا
یوں نہ بے شرمی کی ٹھانی چاہیئے ۔۔۔ اب تمھیں بھی غیرت آنی چاہیئے
شرم کھو کر وقت ٹالا بھی تو کیا ۔۔۔ پت ڈبو کر پیٹ پالا بھی تو کیا
زیست کا لطف آبرو کے ساتھ ہے ۔۔۔ اور اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے
خودکشی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ۔۔۔ جیتے جی مرنے سے کچھ حاصل نہیں
جَورِ باطل سے نہ ڈرنا چاہیئے ۔۔۔ حق پہ جینا، حق پہ مرنا چاہیئے
قوم کے یارو مدد کا وقت ہے ۔۔۔ مُلک کے پیارو مدد کا وقت ہے
آؤ کارِ نیک میں سبقت کریں ۔۔۔ آؤ مُلک و قوم کی خدمت کریں
آؤ قومی درد کا درماں کریں ۔۔۔ آؤ مُلکی مشکلیں آساں کریں
آؤ ہر بندِ فلاکت کاٹ دیں ۔۔۔ آؤ ہر غارِ ہلاکت پاٹ دیں
آؤ پھر تا منزلِ مقصد بڑھیں ۔۔۔ آؤ پھر تا بامِ آزادی چڑھیں
آؤ پھر بل بُل کے جانیں اَڑ دیں ۔۔۔ آؤ پھر عزت کے جھنڈے گاڑ دیں
آؤ قومی غم کی شب دن کر دکھائیں ۔۔۔ آؤ ناممکن کو ممکن کر دکھائیں
دوستو! آزاد نے بالکل کھلا ۔۔۔ تم کو پیغامِ وطن پہونچا دیا

اب قبول و رَد کے تم مختار ہو
اپنے نیک و بد کے تم مختار ہو

از: آزاد انصاری



مبتلائے محبت ہونے پر

مترجمہ معین الدین حسن بی اے، کاکوری

(رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے ایک دلپذیر اور دلکش مضمون) کا ترجمہ)

"میرے مالک یہ فانی انسان بھی کیسے احمق ہوتے ہیں" (شیکسپیر)

انسان کی زندگی کا صرف ایک سانحہ ایسا ہے جو اُس کے بنے بنائے اصول کو آن کی آن میں مٹا کر اُسے واقعی حیرت و سراسیمگی میں مبتلا کر جاتا ہے اور بھی ہزاروں واقعاتِ زندگی ہیں، لیکن نہ تو ان میں کوئی غیر متوقعہ پریشان کن بات ہوتی ہے اور نہ وہ کسی گہرے شدید جذبے کے ماتحت ہوتے ہیں، زندگی کے لیل و نہار میں یک رنگی اور ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے مشابہ ہوتا ہے، ہم راہ و رسم دوستی میں اپنے محبوب دوستوں کی حیلہ نوازیوں اور غفلت شعاریوں کے خوگر ہو جاتے ہیں اور جب کوئی ایسی بات پیش آجاتی ہے تو اُس کے لئے ہمہ تن تیار۔ لیکن راز محبت کی کنہ و حقیقت نہ تو ذہن رسا اور نہ دوسروں کے تجربوں ہی سے ایک حق جو کی سمجھ میں آسکتی ہے، میرا خیال ہے کہ محبت کے مسئلے پر ایک انسان جب تک خود دل پر چوٹ نہ کھائے نہ تو صحیح طور پر کچھ سوچ سکتا اور نہ لکھ ہی سکتا ہے، ایک فرانسیسی فلسفی کے بارے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے، ایک دفعہ وہ اپنے حلقۂ احباب میں محبت کے موضوع پر مصروف بحث تھا، اُس کے دوستوں نے اس پر اعتراض کیا کہ حضرت آپ تو محبت سے ہنوز ناآشنا ہیں، یہ سُننا تھا کہ وہ دوستوں کے مجمع کو چھوڑ چھاڑ چل کھڑا ہوا، اس تہیے کے ساتھ کہ اب وہ آئے گا تو چوٹ ہی کھا کے آئے گا، تھوڑی دیر کے بعد وہ یہ کہتا ہوا نمودار ہوا کہ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ بحث کے سلسلے کو جاری رکھ سکوں، شاید اُس نے عشق کے مسئلے پر ایک غائر اور عمیق نظر ڈالنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی، بہرحال یہ واقعہ ہمیں صحیح طور پر فکر کی دعوت دیتا ہے، اور اس مضمون کے ناظرین کے لئے نہایت ہی سبق آموز،

آخر کار جب چشم باطن سے پردے اُٹھ جاتے ہیں اور انسان کی آنکھ عاشق ہو کر کھلتی ہے تو وہ اپنی قلب ماہیت سے حیران اور سراسیمہ ہو کر رہ جاتا ہے، ابھی تک تو اُس کے احساسات میں سکون اور جذبات میں اعتدال قائم تھا، لیکن محبت کے بعد بزم ہستی میں اک طوفان برپا ہو جاتا ہے، قلب میں وہ تڑپتی ہوئی تمناؤں اور بے قرار آرزؤں کا ہجوم، ایسے ایسے محتاج اثر درد و شوق اور خلشِ غم کے امکانات پاتا ہے کہ جن کا گمان اور تصور بھی کبھی اُسے نہ ہوا ہوگا، اس دنیا میں ہر شے منطق اور استدلال کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ تنہا محبت کی کرشمہ سازیاں اور فسوں کاریاں عقل و منطق کے فریبوں سے بے نیاز اور بالاتر ہیں۔ محبت کے اثرات اور وجوہ بے حد حیرت افزا اور تحیر خیز ہوتے ہیں۔ دو ہستیاں ممکن ہے کہ ان میں سے ایک بھی نہ محبت کے کرنے کے قابل ہو، نہ بہت قبول صورت، آپس میں یک جا ہوتی ہیں۔ ذرا دیر باہم محو تکلم رہتی ہیں۔ اک دوسرے سے نظر سے نظر ملا کر واردات قلب کا جائزہ

یتے ہیں اور عاشق محبوب کی اداؤں اور اُس کے حُسن کی کافرانہ جزائی سے مسور ہو کر پکار اُٹھتا ہے۔

ہم نے پالا مدتوں پہلو میں، ہم کوئی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر سے دل تمہارا ہو گیا (تسلیم)

ایسے مواقع اُن کی زندگی میں بارہا آئے ہوں گے، بغیر کسی خاص نتیجے کے، لیکن اس مرتبہ تو دلوں کی دُنیا ہی بدل جاتی ہے، اور وہ اُس عالم میں پہونچ جاتے ہیں، جہاں ایک کی ہستی دوسرے کی مرکزِ تمنا۔ اُس کی تمناؤں کا حاصل بلکہ کل کائنات کی وجہ تخلیق بن جاتی ہے اور آن کی آن میں عمر بھر کے اصول اور جان سے زیادہ عزیز نظریوں کو اپنے برق پاش تبسم سے خاک میں ملا دیتی ہے ؎

پھر آ کے اُس نے کفر کا اقرار لے لیا
مدت ہوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہوئے (جوش)

ہمارے خیالات اور مشاغل زندگی اپنے پیکرِ محبت سے کچھ اس طرح منسلک اور وابستہ ہو جاتے ہیں کہ زندگی کی ادنیٰ ادنیٰ سی مصروفیتیں ہماری نظر میں ایک خاص اہمیت رکھنے لگتی ہیں، زندگی سے خود لطف پیدا ہو کر دل میں یہ تمنا مچلنے لگتی ہے کہ کاش اپنے محبت آفریں کے ساتھ ہمیشہ دقفِ نشاط اور اس گلشنِ حیات میں ہمیشہ مصروفِ گلگشت رہیں۔

یا زندگی سے الفت پیدا ہونے کے خیال کو ظالم جگر کس انداز سے ادا کر گیا ہے ؎

ترے حُسنِ حیات افروز کو جس دن سے دیکھا ہے
بہت مجھ کو عزیز اُس دن سے اپنی زندگانی ہے

اس رنگینی و شوخی کے عالم میں جب دو روحیں مصروفِ راز و نیاز ہوتی ہیں، اک دوسرے کو داد عشق دیتی ہیں تو اُن کے دوست آشنا آپس میں متعجب ہو کر اُن کی آشفتگی عشق پر انگشت بدنداں ہوتے ہیں۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں، کوئی کہہ اُٹھتا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں عورت میں کیا خاص بات دیکھی، یا فلاں عورت اس شخص پر کیوں اس طرح جان چھڑکنے پر آمادہ ہے، اکثر یہ نکتہ چیں حضرات پوچھ بھی بیٹھتے ہیں ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

میں سچ کہتا ہوں کہ میری سمجھ میں خود یہ بات نہیں آتی کہ صنفِ نازک کو کیا ہو جاتا ہے اور وہ کس طرح اس جنونِ محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اگر اپالو (سورج کا دیوتا) با صد ہزار رعنائی و زیبائی اپنے اوجِ رفعت کے تخت سے اُتر کر اُسی شانِ خداوندی کے ساتھ اس دنیا میں جلوہ گر ہو جائے تب یہ ایک حد تک ممکن بھی ہے، ورنہ یہ کریہ المنظر، قابلِ نفرت انسان۔ تو بہ کیجئے! بھلا اس میں کوئی تو محبت کے قابل ہوتا! کسی کتاب میں بھی میری نظر سے نہیں گزرا، کہ عالمِ شباب میں ([illegible]) گو نٹے، اور لی نارڈو ڈی ونسی کے علاوہ انسانوں میں کوئی محبت کے قابل ہوا ہو۔

ہاں عورتوں کی سیرت و صورت کے متعلق میری رائے اس کے بالکل برعکس ہے، لیکن یہ شاید اس وجہ سے کہ قدرت نے مجھے مرد بنا دیا۔

بہت سے زندگی کے امور ایسے ہیں جن میں آپ قضا و مشیت پر بھی ایک حد تک قادر ہو سکتے ہیں۔ بلند خیالی، ذوقِ سرفرازی، اور عالی حوصلگی، ایک شخص کو اُس کے دلی مقاصد اور آرزوؤں سے ہم کنار کر سکتی ہے، لیکن مبتلائے عشق ہو جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں خصوصاً وہ زرد چہروں والے لاغر اندام اور فیشن پرست حضرات جو بعد شانِ دو قار اس کرّے کو آباد کئے ہوئے ہیں، اُن میں ایک بھی اس قابل نہیں کہ اُس سے محبت کی جا سکے۔ سچ عرض کرتا ہوں، ایک بھی نہیں جس طرح ایک بھیگے کپڑے پر آگ دکھانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا جس طرح ایک کورچشم سے یہ امید کہ وہ رومانی اور رنگین مناظر سے لطف اندوز ہو سکتا ہے ایک خیالِ محض ہے، اسی طرح ان حضرات سے یہ اُمید رکھنا کہ ان میں عشق و محبت کی بھی صلاحیت ہو سکتی ہے، اک خیالِ خام ہے، علاوہ بریں اکثر محبت کرنے والی ہستیاں اک دوسرے سے محروم ملاقات رہتی ہیں، اور اگر ملتی بھی ہیں تو اُس وقت جب اُن کا ستارا موافق نہیں ہوتا، پھر اگر نیک ساعت میں یہ عشق والے ملے بھی تو اظہارِ محبت کی نازک اور فیصلہ کُن گھڑی کا سامنا ہوتا ہے، محبت کے بہت سے واقعات فطری شرمیلے پن یا موقع نہ ملنے کے باعث اظہارِ محبت سے پہلے ہی تمام ہو جاتے ہیں، ایک ذی عقل ہے جو موقع اور محل دیکھ کر اظہارِ عشق کرتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے، دوسرا ہے کہ رفتہ رفتہ

دل گیر ہوتا ہے اور امرا سیم سے آغوشِ قبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ شاید ہی صنفِ نازک میں کوئی ایک ایسی ہستی ہو جو ایسے شخص سے شادی کرنا پسند نہ کرے۔ بیشک وہ شخص قابلِ قدر ہے جس میں ثابت قدمی کی صلاحیت ہو، اس لئے کہ یہ شادی کی انتہائے بیم کچھ اخلاق کو گرا دیتی ہے، اور اکثر ایسے زر پرستی کی شادیاں کامیاب بھی نہیں ہوتیں، دو محبت کرنے والی ہستیوں کو جذبۂ عشق سے از خود رفتہ ہو کر دوسرے کے لئے آغوش وا کر دینا چاہیئے۔ معراجِ محبت یہی ہے کہ دو ہستیاں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے شاہراہِ محبت پر مصروفِ خرام ہوں۔ ہاں! بالکل اسی طرح جیسے کسی تیرہ و تاریک کمرے میں دو بچے ناہموار اور مبہم احساس کے ساتھ ایک دوسرے کے لئے گرمِ تلاش ہوتے ہیں، ملنے کے لئے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہیں ؎

رہنما کی کیا ضرورت شوق کامل چاہیے
دل جہاں تڑپے سمجھ لینا وہیں ہو کوئے دوست

ایسے مواقع پر اظہارِ عشق کی چنداں ضرورت نہیں۔ اُن کے خیالات میں ایسی ہم آہنگی ہو جاتی ہے کہ جو ایک کے دل پر گزرتی ہے، اُس کی اطلاع معاً دوسرے کو بھی ہو جاتی ہے، ایک کے جذبات کا پرتو دوسرے کے دل پر نظر آتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا — غالب

زندگی کا آفتاب جس وقت لبِ بام ہوتا ہے، جوانی کی دوپہر ڈھل کر بڑھاپے کی پُر ماتم اور المناک رات کی ابتدا ہوتی ہے، جذبات میں افسردگی، عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا، اُس وقت محبت کی شرابِ رنگیں، جذبات کو از سرِ نو جگا دیتی ہے، یہ وہ دولتِ بیدار ہے جو پژمردہ قلب میں رنگین خیالات اور تازہ اُمنگیں پیدا کر دیتی ہے، تازہ بتازہ و نو بنو آرزوؤں کا سیلاب دل میں اُمنڈ آتا ہے، اور نت نئی تمناؤں کی یورش سے دل میں ہلچل سی مچ جاتی ہے، محبت کی چوٹ سے پیشتر انسان، احساسِ درد سے بے پروا، سوزِ غم سے ناآشنا رہ کر جہانِ رنگ و بو کی لطافتوں سے اس طرح بے نیاز ہوتا ہے گویا دنیا میں اُن کا کہیں وجود ہی نہیں ہے، اس طرح وہ زندگی کی پُر شور گزرگاہ میں اس دنیا کی دلفریب دلچسپیوں سے دُور رہتے ہوئے ایک احساسِ پندار کے ساتھ اپنی دنیا آپ تعمیر کر لیتا ہے، لیکن نیشِ عشق سے تڑپ اُٹھنے کے بعد اُس کے خیالات کی دُنیا میں ایسی ہی تبدیلی ہو جاتی ہے، جیسے سینٹ پیٹر کے خیالات میں عیسائیت قبول کرنے کے بعد انقلاب برپا ہو گیا تھا۔

دل جو کچھ مدت پیشتر اپنی معمولی رفتار سے جنباں تھا، یہ یک جنبش زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے، نبضوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور اُسے یہ محسوس ہوتا ہے گویا اس سے پہلے اُس میں احساسِ شنوائی تھا اور نہ بینائی کی طاقت۔ حضرتِ جوش نے جوشِ محبت کے کیفیات و واردات کتنے دلکش انداز اور کتنے دھڑکتے ہوئے لفظوں کے لباس میں اپنی نظم "جوانی کی ستم رانیوں میں" ادا کیا ہے، مجھے اجازت دیجئے کہ اس کے چند اشعارِ رنگیں آپ کو سنا دوں ؎

کسی کے مسکراتے ہی یکایک دیکھتا کیا ہوں
کہ میں گویا ہزاروں بجلیوں کی زد میں بیٹھا ہوں
کلیجہ ہل رہا ہے اشتیاقِ کامرانی کا
وہ عالم ہے غرورِ حسن پندارِ جوانی کا
نظر سے حال اوجھل ہو گیا ماضی نے منہ ڈھانپا
سنی آوازِ مستقبل، اُڑے اوسان، دل کانپا
یکایک بزمِ ہستی میں وہ طوفاں ہو گیا برپا
جو کانوں نے سنا تھا اور نہ آنکھوں ہی نے دیکھا تھا
نرالا درد، انوکھی کشمکش ناآشنا ہلچل
نظر ملتے ہی میرے دل میں گرجے سینکڑوں بادل
جہاں کا ذرہ ذرہ دیدۂ حیراں نظر آیا
میں خود اپنے کو اک بدلا ہوا انساں نظر آیا
وہ بھڑکی آگ سینے میں رگ و پے کو تپا ڈالا
زباں سے میری یہ بے ساختہ نکلا "جلا ڈالا"
دکھائی اک نئی دنیا نے کچھ یوں اپنی بربادی
یکایک آئے چشمِ کور میں جس طرح بینائی

"الغرض زندگی کے گزشتہ واقعات ماضی کے نقوشِ خیال کے پردۂ سیمیں پر

ایک بھولے ہوئے خواب کی طرح نظر آجاتے ہیں، قلبِ احساس درد سے اتنا چور، وفورِ عشق سے اس قدر بے چین اور بیتاب ہو جاتا ہے کہ انسان کو ان کے برداشت و ضبط کا یارا نہیں رہتا۔ بسا اوقات طرح طرح کی وارفتہ ادائیں اور انوکھے مشاغل اختیار کر لیتا ہے، اکثر تنہائی کے لمحات میں مستیٔ عشق کے کیف سے پہروں آپ ہی آپ مسکرایا کرتا ہے، اور کبھی کسی خیال میں کھویا ہوا گھنٹوں چاند اور ستاروں کی طرف تکتا رہتا ہے، یہ ایک نثر نگار کے اختیار میں کہاں کہ وہ اس والہانہ جذبے کا مرقع الفاظ کے ذریعے سے کھینچ سکے۔ ٹینی سن (   ) اور ہین (

نے اپنی پُر جذبات نظموں میں۔ اس کیف رنگین کو کامیاب انداز میں ادا کیا ہے، رومیو اور جولیٹ بھی انتہائی وارفتگی کے ساتھ ایک دوسرے پر فریفتہ تھے، غرض اس موضوع پر شاعری میں تشنگانِ ذوق کے لئے سامانِ سیرابی مہیا ہے، اگر ہمارا سازِ دل مضرابِ محبت کی جنبش کا منتظر ہے، اور عشق کے نغمے اس کے تاروں سے نکلنے کے لئے منتظر اور بے چین ہیں تو پھر ہم وادیٔ محبت کی پُر لطافت فضا، اور دیارِ عشق کی رعنائی اور زیبائی کا نظارہ کرتے ہوئے خوش آیند امید دل۔ دھڑکتی ہوئی تمناؤں اور لطف آمیز خلشِ غم کے مزے لُوٹ سکتے ہیں۔

پہلی ہی نظر میں جو احساساتِ عشق دل میں گھر کر لیتے ہیں، اُن کی شعوری ذرا مشکل ہے، زندگی کے ہر پہلو میں مسرت اور سرور کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ چاہے خواب ہو کہ بیداری، حرکت ہو کہ سکون، محبت کے خیالات رنگین دل کی دنیا کو بسائے رہتے ہیں، محبت کی تڑپ، نیشِ عشق کی سوزش سے کچھ محبت کرنے والوں ہی کو سزا نہیں ملتی بلکہ اس محبت کے جادو سے محبت کرنے والی ہستیاں اس جذبے کو ایک عالم میں پھیلا دیتی ہیں اور پھر لمحاتِ راز و نیاز میں موسم نو سہانا اور خوشگوار ہوتا ہی ہے بقول جگر ؎

یہ موجِ دریا، یہ ریگِ صحرا، یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

وہ اس خیال میں مست رہتے ہیں کہ یہ آفتاب منور اور ضیا رپاش ہے تو صرف اُن کی محبت کی بدولت اور اس نیلگوں آسمان کی نیلگونی کو ثبات ہے تو صرف اُن کی محبت کے سبب سے۔

ایک گرفتارِ عشق بھی بھی بڑی حسین نگاہ سے صنفِ نازک سے پیش آیا ہے، لیکن اس انداز میں کچھ احساسِ غرور و خودی بھی شامل ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر انسان دنیوی عز و شان کے بلند ترین مناصب مثلاً ڈیوک کا خطاب یا کلیسا کا سب سے بلند مرتبہ حاصل کر لے تو اس کے دماغ میں سودائے تمکنت اور احساسِ پندار پیدا ہی ہو جاتا ہے، عشق سے بڑھ کر سر پھرانے کا سودا اور کوئی نہیں، اگر شخص سے جو شدید جذبۂ عشق میں گرفتار ہو سادہ مزاجی بہت مشکل ہو جاتی ہے، معلوم نہیں عورتوں کو مردوں کا یہ انداز پسند ہوتا ہے کہ نہیں۔ ہزاروں واقعاتِ عشق کو دیکھنے کے بعد میری تو آج تک سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کا معیارِ پسندیدگی ہے کیا؟

محبت کرنے والے دوسروں کے افسانہائے محبت کو بڑے شوق سے سنتے ہیں اور چاہتے ہیں اور ان کی داستانِ محبت بھی چھیڑی رہے، عشق کی یہ فسوں کاریاں اور محبت کی یہ کرشمہ سنجیاں اُن لوگوں کے لئے بھی باعثِ لطف و تفریح ہوتی ہیں جو خود اس مزے سے نا آشنا، اور خلشِ عشق سے بیگانہ ہوتے ہیں، وہ لوگ جنھیں کاروبارِ ہستی سے سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ہوتی وہ بھی غروبِ آفتاب کے کافر دلفریب نظارے سے بیتاب ہو ہی جاتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اُس شخص کے پہلو میں دردمند دل کے عوض برف کی اک قاش ہے، جسے اس دلفریب جنون سے ہمدردی اور اس جذبۂ رنگین کی ادا نوازیوں سے دلچسپی نہ ہو۔ آپ یوں چاہے کتنے ہی بے حس اور امن نواز کیوں نہ ہوں، لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی جنگ کی شورش کا حال سنکر آپ کی رگوں میں خون کی گردش تیز نہ ہو جائے یا دو روحوں کو کسی کنج میں مصروفِ راز و نیاز دیکھ کر آپ کا دل دھڑکنے نہ لگے۔

یہ احساسِ عشق دوسروں کے لئے مفید ہو یا نہ ہو، لیکن خود ان پرستارانِ الفت کے لئے تو ضرور سامانِ راحت اور پیغامِ مسرت ہوتا ہے، اس دردِ شوق کی تفسیر اور اس کے جذبات کا تجزیہ کیجیے ہو، پیکرِ محبت کی اک نگہِ بندہ نواز، اس کے پُر تسکین اور پُر محبت دستِ رنگین کی خفیف سی تھپک متاعِ صبر و شکیب کو غارت کر کے دل میں سوئے ہوئے محسوسات کو جگا دیتی ہے، محبت کے بعد ہماری زندگی تو پھر

مشاغلِ رنگین میں بسر ہونے لگتی ہے، جسم کی آرائش و زیبائش کا خیال، حلقۂ احباب میں بہ ہزار انداز و طمطراق جاہ و بیانی کا شوق، غرض ہر وہ صورت جو اُسے دوسرے کی نظروں میں بڑا ثابت کرسکے وہ اختیار کرتا ہے۔ ان محبوب مشغلوں سے اُس کا واحد مقصد اپنی ذات کی آرائش و زیبائش نہیں بلکہ ان سب کو وہ "بارگاہِ حسن" میں بطور انتساب پیش کرتا ہے۔ آخر یہ محبت کا جذبہ بڑھتے بڑھتے عاشق کو سراپا بے نیاز ربط و ضبطِ حسن و عشق کردیتا ہے، اور وہ خشک تکلفات کی حدیں توڑ کر اپنے ذات و صفات کی پنہاں حقیقتوں کو اپنے پیکرِ محبت اور جانِ جان کے سامنے بے نقاب کرکے یہ چاہتا ہے کہ محبوب اس سے اس کی خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اُس کی ذات سے محبت کرے۔ حسن و عشق کی رنگین داستانوں کا بیان بہت دشوار لیکن اس سے مشکل ترکیفیاتِ دلی اور جذباتِ پنہاں کی ترجمانی ہے۔ ہمارے الفاظ کے معنی کچھ کے کچھ پہنائے جاتے ہیں، اور اغیار ہمارے اصل مطلب و منشا سمجھنے کے عوض غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اور ہم بھی اسے گوارا کرلیتے ہیں، لیکن محبت کے بعد عاشق کی ہر نظر التجائے مجسم ہوکر اور اس کی ہر ادا شکوۂ پیہم ہوکر اپنے محبوب کے دل سے گردِ کدورت مٹانے میں کوشاں اور منہمک ہوجاتی ہے۔

زمانۂ گزشتہ کی یاد تازہ اور گزری ہوئی لطافتوں اور رنگینیوں کا تصور رکھتے ہوئے دل میں بڑا درد ہوتا ہے، عاشق کا یہ تصور کہ اُس کی زندگی کے کچھ ماہ و سال اُس پیکرِ محبت اور اُس جانِ تمنا کے بغیر صرف ہوئے یا یہ خیال کہ اُس کی ملاقات سے پہلے اُس کے محبوبِ دلنواز نے کسی دوسرے کو نگاہِ محبت سے دیکھا تھا، ایک ایسا بار ہے جو اُس کی عزتِ نفس اور احساسِ خودداری سے اُٹھ نہیں سکتا۔ اور اُسے صرف اپنی ہی زندگی اپنی نظر میں نہیں کھٹکتی، بلکہ محبوب کے عہدِ ماضی کی یاد بھی اُس کی روح پر ایک خلشِ دوام بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ احساس تو اذیت رساں ہی ہے کہ اُس نے اپنی فراق کی زندگی کے تلخ اور ناخوشگوار دن کسی نہ کسی طرح گزار دئے، لیکن یہ کس قدر درد ناک تخیل ہے کہ وہ معشوق جو عاشق کی آرزوؤں کا تنہا مرکز، اُس کی زندگی کا واحد مقصد ہے، وہ کسی دوسرے کی تمناؤں کا خواب بن کر رہ چکا ہے۔

بہت سے لوگ جذبۂ رشک کو تصنع آمیز اور تکلیف دہ جذبے سے تعبیر کرکے اُسے لائقِ ملامت سمجھتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ جذبۂ رشک جس جذبے کے ساتھ پیدا ہوتا ہے وہ محبت اور صرف محبت کا جذبہ ہے۔ محبت بھی رشک کی طرح اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب فطرتِ انسانی اپنے کمال پر ہوتی ہے، محبت اور حبِ وطن کے احساسات قلب میں اُس وقت موجزن ہوتے ہیں جب شباب کی رُکتی ہوئی امنگوں میں بربط و چنگ و ستار کا جوش و خروش پیدا ہوجاتا ہے، محبت تاریخی واقعات کی جہاں بینی کی تاب نہیں لاسکتی۔ اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے۔ بہرحال رشک آلِ الفت ہے اور آپ اس سے چاہے خوش ہوں یا ناخوش، اس کی موجودگی یقینی ہے۔

جب ہم عاشقی کے زمانۂ ماضی کا تصور کرتے ہیں تو ہمیں اپنی معشوقہ کی طرف سے طرح طرح کے وہم پیدا ہوجاتے ہیں کہ کہیں اُس نے ہم سے پیشتر تو کسی سے معاشقہ نہیں کیا ہے، اُسے خط نہیں لکھے ہیں۔ اور وہ کسی اور کے آغوش کی گرمی تو نہیں بن چکی ہے، ان اوہام سے دل میں کھٹک اور خلش پیدا ہوجاتی ہے، اور پھر ہم یہ تمنا کرنے لگتے ہیں کہ کاش ہماری زندگی کے دَور کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا ہوتا۔ کیونکہ اُس وقت ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کو سمجھنا سہل تر ہوتا اور اُس وقت نہ ایسے واقعات پیش آتے نہ ایک دوسرے کے خیالات کسی دوسرے کی طرف بھٹکنے پاتے، اور نہ محبت کی رو میں رکاوٹ پڑ سکتی۔ دل کو اطمینانِ کامل ہوتا کہ معشوقہ کی زندگی ہمارے ہی ساتھ بسر ہوئی ہے۔

اکثر لوگوں کو یہ خوف شب و روز، آٹھوں پہر لگا رہتا ہے کہ کہیں موت کے بے رحم ہاتھ ہمیں ہمیشہ کے لئے محبوبۂ حیات آفریں کی محبت سے محروم نہ کردیں۔ کسی نے کیا خوب لکھا ہے کہ محبت کے اثر سے انسان روح کو لافانی اور زندگی کو جاودانی سمجھنے لگتا ہے، اس لئے کہ اس مختصر عرصۂ حیات اور اس تھوڑی سی زندگی میں اس جذبۂ بے پایاں کی سمائی نہیں، محبت کرنے والوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ عشق کے تند و تیز جذبات صرف چند ماہ و سال کے لئے ہیں اور بس۔ لیکن مختلف واقعات سے یہ بات ہماری سمجھ میں آجائے گی کہ فی الواقع عشق جاودانی کی لذید دیتا ہے اور یہ خیال ہمارے دل کو ڈھارس دئے رہتا ہے کہ ہم نہ صرف اس دنیا میں بلکہ ایک غیر فانی عالم میں بھی اس جذبۂ شوق سے ہم کنار اور

نوشِ عشق سے لذت یاب ہوں گے،

وہ تیر و کمان والا، نوخیز اور اندھا لڑکا جسے لوگ کیوپڈ کے نام سے یاد کرتے ہیں متبسم باغوں کے بلند گوشوں سے ہنس ہنس کے ہمارے رواں اور فانی قافلۂ حیات پر تیر پہ تیر چلانے میں مصروف ہے، جس سُرعت سے وہ مصروفِ تیر اندازی ہے، اتنی ہی شتاب روی سے نسلِ انسانی کا کھیل بھی تمام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ابھی ایک نے پیکانِ الفت کی لذتِ خلش اُٹھائی بھی نہ تھی کہ دوسرا نوشِ عشق کی لذت سے پیشتر ہی فنا کے گھاٹ اُتر گیا۔ ابھی یہ زد پہ آیا ہی تھا کہ اسے پیچھے وہ جاتا رہا، ابھی ایک تازہ بسمل کو نیشِ عشق گوارا کرنے کی مہلت ملی بھی نہ تھی کہ ان سب زخم خوردگانِ عشق کی زندگیاں بھولے ہوئے فسانے ہو گئیں ؎

ایک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

جب زندگی کی شام فنا کی رات میں تبدیل ہو جاتی ہے، جب وجود عدم کے دامن میں پناہ لیتا ہے جب بازی گاہِ عالم سے ہی سامانِ حیات اُٹھا لیا جاتا ہے اور حیات، موت کے دوش پر رختِ سفر باندھتی ہے اُس وقت آپ بجا طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ وہ نشۂ عشق سے چور ہستیاں جو محبت کو فنا کے نام سے منسوب و موسوم کرنے پر برافروختہ اور چیں بہ جبیں ہوتی تھیں، آج کہاں گئیں، اُن کے لمبے چوڑے محبت کے دعوے اور لافانی محبت کے جذبات کدھر چلے گئے، اس کے جواب میں عشاق کیا پیش کر سکتے ہیں، گزری ہوئی محبت کے چند گیتوں اور عشق کے چند پُر سوز نغموں کے سوا اُن کے پاس باقی ہی کیا رہ گیا ہے؟ کچھ جوانی کے رنگین نقوش کا تصور اور کچھ اپنی شکل و صورت کی جیتی جاگتی تصویریں یعنی چھوٹے چھوٹے بچے جن کے عادات و اطوار اپنے والدین کی زندہ مثالیں ہیں، اور بس!

اے محبت! ہے تری لے دے کے اتنی کائنات!!

اقوالِ حکیمانہ

(ڈاکٹر غلام سرور ایم اے، پی ایچ ڈی)

(۱) میں نے کتابِ محبت کا مطالعہ بہت دقتِ نگاہ سے کیا ہے، اُس کے مسرت بخش و سرور انگیز صفحات بہت ہی کم تھے، گویا تمام اوراق حسرت خیز و اندوہ فزا واقعات سے پُر تھے۔ وصال کی فصل بہت معمولی اور مختصر اور فراق کی نہایت اہم اور طویل تھے۔ لیکن کشتگانِ عشق و جانبازانِ مہرِ جاناں کی سرگزشت بے پایاں تھی۔ "گوئٹے"

(۲) حکیم معروف سیسرو نے جب تجرد سے تاہل اختیار کیا تو اُس کے احباب نے اِس تغیرِ مسلک کا سبب پوچھا، اِس پر اُس نے کہا "حکمت طائفہ نسواں سے امتزاج نہیں رکھتی"

(۳) ایک نیک سیرت اور خوش اخلاق بیوی کا حصول بیشک ایک بڑی سعادت ہے، اگر مجھے اس بات کا علم ہو جائے کہ میں ایسی گرانبہا نعمت کے حصول میں کامیاب ہو جاؤں گا تو میں کل ہی تلاش میں مشغول ہو جاؤں۔ "لافونٹین"

(۴) ازدواج لاٹری یا جُوئے کے کھیل سے مشابہ تھے، اس کھیل میں مرد اپنی آزادی اور عورتیں اپنی نیک بختی ہارتی ہیں۔ "میڈم ڈوریو"

(۵) ایک کشتی تصور کیجئے، جس کے ملاح صرف دو ہیں۔ اگر وہ متفق ہو کر چپو چلائیں تو کشتی بآسانی تند و تیز موجوں کو کاٹتی ہوئی چلی جاتی ہے، اور اگر وہ اپنے کام میں متفق نہ ہوں تو دریا کا تلاطم نہ فقط کشتی کو لرزا دیتا ہے بلکہ اکثر اوقات اسے تباہ بھی کر دیتا ہے، میری عزیز بیٹی! یہ کشتی ازدواج ہے اور اس کا عملہ زن و شوہر ہیں۔ جو دریائے زندگانی کی سطح پر سیاحت کرتے ہیں۔ اگر دورانِ کار میں وہ ایک دوسرے سے متفق نہ ہوں گے تو اُس کا لازمی نتیجہ عدمِ توازن ہوگا اور وہ انواع مصائب سے دوچار ہوں گے۔ "کیمرہ"

(۶) اقوامِ متمدنہ کے لئے قانونِ طلاق احتیاجاتِ ناگزیر میں سے ہے۔ "مونٹیسکیو"

(۷) ازدواجِ ناموافق کی زحمتِ ابدی سے ہمیشہ کے لئے نجات پانے کا بہترین چارۂ کار طلاق ہے۔ "الفونس کار"

(۸) جس قدر ایک مردِ خردمند حمق و جنون سے ڈرتا ہے اُسی قدر ایک عورت زوالِ حسن و جمال سے ہراساں ہے۔ "پوپ"

نیاؤ یا ٹھکرائی؟[1]

خواجہ غلام السیدین

تو بہ فرمایاں، چرا خود توبہ کمتر می کنند؟

موٹر بہت تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ مگر باتوں کی رفتار اس سے بھی زیادہ تیز تھی۔ مدت کے بعد دونوں دوستوں کی ملاقات ہوئی تھی، ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا سننا تھا۔ ایک دوسرے کے خیالات کو ٹٹولنا تھا۔ دنیا بھر کے مسائل کی چھان بین کرنی تھی، سوچا تھا کہ اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ شکار کو چلیں اور روزمرہ کے معمول اور دوستوں کی ملاقات اور مداخلت اور ظاہرداری کے اخلاق اور گفتگو سے بچ کر جنگل کی تنہائی میں شکار بھی کھیلیں اور باتیں بھی کریں۔ خیر شکار تو ابھی ہی دا ابھی ہوا تھا، لیکن دل کھول کر باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا، اب وہ گھر کی طرف واپس ہو رہے تھے، شاہد موٹر چلا رہا تھا اور کلیم اس کے برابر بیٹھا تھا، نوکر پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا، موٹر کے سامنے دور تک تارکول کی سڑک تھا جس پر ابھی تک بارش کا اثر باقی تھا، کسی حبشی کے تندرست رخساروں کی طرح چمک رہی تھی، دونوں طرف ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے اور آسمان پر ہلکے بھورے رنگ کے بادل دوستانہ انداز میں کشتی لڑ رہے تھے، کبھی کبھی دور سے کسی دیہاتی گیت کی تان سنائی دیتی تھی، جو بہت جلد موٹر اور ہوا کے شور میں گم ہو جاتی تھی۔

شاہد کہہ رہا تھا:

"مگر میں تو اس بات کو نہیں مانتا، ہماری ساری تہذیب کی بنیاد ظلم اور ناانصافی اور زبردستی پر قائم ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، ہر معاملے میں روپے، اثر، رسوخ، قوت انھیں چیزوں سے کام چلتا ہے، حق اور انصاف کی کوئی پوچھ نہیں۔"

کلیم نے بیچ میں ٹوک کر کہا۔ "پھر آخر قانون کس مرض کی دوا ہے، آخر قانون تو سب لوگوں کے ساتھ ایک سا سلوک کرتا ہے۔"

شاہد: "بیشک قانون ایک ہے، اور اس کی نظر میں امیر غریب، ظالم مظلوم، کمزور اور قوی سب برابر ہیں، لیکن یہ تو محض احمقوں کو دھوکا دینے کی باتیں ہیں، یہ سب برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور انھیں برابر سمجھنا اور ان کے ساتھ ایک سا سلوک کرنا کہاں کا انصاف ہے؟! ایک شخص کے پاس دولت ہے، اچھا کھانا، اچھے کپڑے، مکان، سیر و تفریح سب کچھ میسر ہیں، اور دوسرے کو صبح کا کھانا نہیں ملا۔ اور شام کو ملنے کی امید نہیں، اور بیوی بچے اسی بے بس پر آس لگائے بیٹھے ہیں، وہ محنت مزدوری کرنے کو تیار ہے، لیکن کام نہیں ملتا، اب قانون کا انصاف دیکھیے، قانون کیا ہے؟ جو شخص کسی کی جیب کترے گا وہ امیر ہو یا غریب، بدہضمی کا مریض ہو یا بھوکا، قید میں جائے گا، اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کا خوش حال، خوش پوشاک، خوش خوراک دوست کیوں کسی راہ چلتے کی جیب کترے گا، یہ جرم تو اسی غریب سے سرزد ہوگا، جس پر خدا کی دنیا میں اور تمام راستے بند ہو گئے ہیں، جس کے اس "جرم" پر اس کی بیوی بچوں کی فاقہ کشی کا انحصار ہے، مگر انصاف آنکھوں پر پٹی باندھے بالکل

[1] انصاف، یا بے انصافی

غیر جانبداری کے ساتھ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گا، اور جو کوئی جیب کترنے کے جرم میں پکڑا جائے گا، اسے جیل خانے کے سپرد کیا جائے گا بھلا اس میں امیر اور غریب کی تمیز کرنے کے کیا معنی؟ قانون دونوں کے لئے ایک ہی ہے: اب یہ بے چارے جج اور ڈپٹی کا کام نہیں کہ وہ قانون کے اصول کی چھان بین اور اپنے فیصلے کے تمام نتائج پر غور کرے، اگر وہ ایسا کرنے لگے تو عدالتوں کے کاروبار کا خاتمہ ہی ہو جائے؛ وہ کوئی خدائی فوجدار نہیں کہ مجرم کے بیوی بچوں کا حال معلوم کرتا پھرے اور ان کا پیٹ بھرنے کی فکر کرے، وہ تو ایک مشین ہے کہ چلتی رہتی ہے، اگر کوئی حماقت سے اس کے اندر ہاتھ ڈالے گا تو اس کا ہاتھ کٹ جائے گا۔

کلیم۔ مگر تم نے پھر حسب عادت ایک لکچر دے ڈالا۔ آخر یہ تو معلوم ہو کہ تم چاہتے کیا ہو، کیا چوروں، اچکوں، جیب کتروں، لفنگوں، بدمعاشوں کسی کو سزا نہ دی جائے؟ انھیں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اپنا کاروبار کھلم کھلا اور بے روک ٹوک انجام دیا کریں۔ پولیس انھیں گرفتار نہ کرے اور اگر کبھی ایسی غلطی ہو بھی جائے تو عدالت پولیس کو ڈانٹ ڈپٹ کر اور آئندہ کے لئے اس سے نیک چلنی کی ضمانت لے کر انھیں معذرت اور ہرجانے کے ساتھ رہا کر دے، آخر تمہارے ذہن میں سوسائٹی کا تصور کیا ہے؟

شاہد۔ سوسائٹی کا تصور تو ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس کو میں موٹر میں بیٹھے بیٹھے حل نہیں کر سکتا، علاوہ اس کے تمہیں پھر شکایت ہوگی کہ میں نے ایک لکچر دے ڈالا۔ لیکن میں کم از کم دو باتیں ضرور چاہتا ہوں۔ اول تو یہ کہ چوروں، اچکوں، جیب کتروں، لفنگوں، بدمعاشوں کی جو جماعت تم قائم کرتے ہو، اس میں ہر قسم کے چور اچکے، جیب کترے وغیرہ شامل ہوں، میں اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اگر کوئی جاہل، بدنصیب، فاقہ زدہ آدمی جس کے پاس ایک میلی دھوتی کے سوا کچھ بھی نہ ہو کسی کی جیب میں سے ایک روپیہ نکال لے تو اس کو چھ مہینے کے لئے جیل بھیج دیا جائے اور پولیس ہمیشہ کے لئے اس کی دشمن اور نگراں بن جائے، اور اگر کوئی شریف، سفید پوش، موٹر میں بیٹھنے والا کمپنی کھولنے کے نام سے ہزاروں آدمیوں کا روپیہ لے کر اس کو چالاکی کے ساتھ ہضم کر جائے یا بازار میں غریبوں کی روزی اور کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ جوا کھیلے تو اس کا بال بیکا نہ ہونے پائے، بلکہ اگر وہ اپنی چوری کی دولت کے ذریعے حکام سے اچھے تعلقات رکھے تو اُسے خان بہادر کا خطاب مل جائے، اور آنریری مجسٹریٹ بنا دیا جائے؛ چور، اُچکے، جیب کترے تو ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جو شخص ایک وقت کی روٹی چلانے کی خاطر ذرا سی چوری کرے تو وہ مجرم قرار دیا جائے، اور جو شخص کاروبار کے نام سے نہ صرف لاکھوں روپے کے وارے نیارے کرے بلکہ لوگوں کی زندگیاں تباہ کر دے وہ سوسائٹی کا مفید اور معزز رکن سمجھا جائے۔

کلیم۔ اچھا آپ کا ایک تو چھوٹا سا مطالبہ یہ ہے کہ ہر قسم کے کاروبار کا گلا گھونٹ دیا جائے، اور دوسرا؟

شاہد۔ واہ میں نے یہ کب کہا کہ ہر قسم کے کاروبار کا گلا گھونٹ دو اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ آج کل ہر طرح کا کاروبار اسی قسم کا ہے اور اس میں مردم آزاری لازمی ہے، تو تم مجھ سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ہو.... مگر خیر اس بحث کو چھوڑو۔ دوسری بات میں یہ چاہتا ہوں کہ مجرم کو سزا دیتے وقت اس کے تمام حالات کا، اور اس کے ماحول کے اثرات کا لحاظ رکھا جائے۔

کلیم۔ یعنی

شاہد۔ یعنی یہ کہ جہاں تک ممکن ہو یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس کے ذاتی اور خاندانی حالات کیا ہیں، وہ کیا واقعات تھے جنھوں نے اس جرم کرنے پر مجبور کیا یا جرم کی رغبت دلائی، اگر جرم کرنے کی اصل وجہ بیکاری یا بھوک یا جہالت یا کوئی دماغی خرابی ہے تو جیل خانے میں رہنے سے ان سب چیزوں کا علاج کیسے ہو سکتا ہے، سوسائٹی کا محض یہ کام نہیں کہ لوگوں کو سزا دیا کرے، ظاہر کو دیکھے اور اسباب کی طرف سے نظر پھیر لے، اس کا کام تو دراصل یہ ہے کہ تمام لوگوں کے لئے ایک ایسا ماحول ترتیب دے کہ وہ مفید، مشغول اور خوشی کی زندگی بسر کر سکیں اور انھیں جرم کرنے کے لئے کوئی معقول عذر ہی نہ ملے، ورنہ جب تک آج کل کی سی حالت رہے گی اور لوگوں کو افلاس اور جہالت سے نجات نہ ملے گی، جرم کا سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ اور قانون جرم کو کم کرنے کے عوض اس کو اور بڑھاتا رہے گا۔

کلیم اس پیش گوئی کو سُن کر چپ ہوگیا اور دونوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے۔ اس اَن دیکھی دنیا کا تصور کرتے رہے جس میں سے افلاس، جہالت اور جرم کو شہر بدر کر دیا جائے گا۔ بہت دور افق کے قریب دو تین بیل گاڑیاں قسمت کی چکی کی طرح آہستہ آہستہ چلتی دکھائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کلیم نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

مگر یہ تو بتاؤ کہ ایسی دنیا کس طرح وجود میں آسکتی ہے۔

شاہد نے جواب دیا "بھائی یقین اور تفصیل کے ساتھ تو یہ بتانا بہت مشکل ہے، لیکن میں جہاں تک سمجھتا ہوں اس کے لئے ایک زبردست انقلاب کی ضرورت ہوگی جو ایک طرف تو بہت سے خارجی حالات اور انتظامات کو بدل دے گا، اور دوسری طرف لوگوں کے دل اور دماغ کی کایا پلٹ کر دے گا، جب تک لوگ روزی کی خاطر پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف رہیں گے اور ذاتی نفع کی خاطر دنیا کی ساری اچھی چیزوں کو قربان کرنے پر آمادہ ہوں گے، ان میں حقیقی تہذیب اور انصاف پسندی اور روحانیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی، اور یہ قصہ اس وقت تک چلے گا جب تک سوسائٹی کا موجودہ نظام قائم ہے۔ جس میں مل جُل کر کام کرنے اور اپنی محنت سے خود پورا فائدہ اُٹھانے کا موقع نہیں جس میں ایک کا فائدہ دس کا نقصان ہے، ہمیں تعلیم کے ذریعے اور صحیح خیالات کی اشاعت کے توسط سے ملک کا اقتصادی نظام تبدیل کرکے لوگوں کی خود غرضی، رقابت، حسد، اور تنگ نظری کو دُور کرنا ہوگا۔ ان کے لئے ایسے حالات مہیا کرنا ہوں گے جن میں وہ محسوس کریں کہ سب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایک کی ذلت اور نقصان سب کی ذلت اور نقصان ہے، جب تک سوسائٹی میں ایک بھی ایسا شخص موجود ہے جو اپنے جائز انسانی حقوق سے محروم ہے، سوسائٹی بیمار اور ناقص ہے، اور باقی سب لوگوں کی تہذیب و شائستگی، علوم و فنون، عیش و آرام، دولت اور فراغت، چوری اور ریاکاری کا نتیجہ ہیں۔ دنیا میں انصاف کی حکومت قائم کرنے کے لئے انسانی شخصیت کا احترام سکھانے کی ضرورت ہے، یعنی یہ کہ ہم دوسروں کے دُکھ درد اور ان کی ضرورت کو اتنا ہی اہم سمجھیں جس قدر اپنے دُکھ درد اور ضرورت کو سمجھتے ہیں۔

شاہد۔

دفعتہً ایک دردناک اور بھیانک چیخ سنائی دی اور ایک آٹھ نو برس کا لڑکا ہوا میں اُچھلا، اور لُڑھکتا ہوا سڑک کے ایک طرف جا گرا۔ پیچھے سے نوکر نے گھبرا کر کہا "میاں گاڑی روکنا، لڑکا موٹر سے ٹکرا گیا ہے" شاہد نے سفر رفتار کم کی، لیکن پیچھے سے بیل گاڑی والوں کی وحشت زدہ اور غضبناک آوازیں سنائی دیں، اس نے پھر موٹر کا پٹرول بڑھا دیا، اور موٹر فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔

کلیم نے بدحواسی کے لہجے میں کہا "شاہد، شاہد گاڑی روک کر دیکھنا چاہیئے، کیا ہوا ہے؟"

شاہد۔ "نہیں اس وقت رُکنے کا کوئی موقع نہیں، اگر ہم رُک گئے تو یہ گاڑی والے لاٹھیاں لے کر ہم پر پل پڑیں گے، اور موٹر کے بھی ٹکڑے کر دیں گے۔"

"مگر شاید لڑکے میں کچھ جان باقی ہو ہم اُسے تو اسپتال پہنچا سکتے ہیں۔"

نوکر پیچھے سے بولا "نہیں میاں جان کیسے باقی ہوگی۔ گاڑی چالیس پینتالیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی اور لڑکا بالکل موٹر کے سامنے آگیا تھا، ٹکر سے اس کے بدن کی ہڈی ہڈی چورا ہوگئی ہوگی" شاہد چپ چاپ گاڑی چلا رہا تھا، کبھی کبھی مڑ کر پیچھے دیکھ لیتا تھا کہ کہیں گاڑی والے بیلوں کو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھگاتے اس کو پکڑنے کے لئے تو نہیں آرہے ہیں۔ کچھ دیر بعد بولا۔

"آخر تم ہی بتاؤ کہ اس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں نے گاڑیوں کے پاس سے گزرتے وقت کئی دفعہ ہارن بجایا۔ گاڑیاں ایک طرف ہٹ گئیں، لیکن جب میں بالکل ان کے برابر سے نکل رہا تھا، لڑکا دو گاڑیوں کے بیچ میں سے ہوکر دفعتاً سامنے آگیا، جب تک میں اسے بچانے کی کوشش کروں وہ موٹر سے ٹکرا چکا تھا۔"

"نہیں شاہد اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ آخر ان لوگوں کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرسکیں، اگر کوئی خودکشی پر آمادہ ہو تو کوئی اسے کیسے بچا سکتا ہے، تم نے اپنی سی پوری احتیاط کرلی تھی، اور کیا کرسکتے تھے" مگر اس کے ضمیر میں ابھی کشمکش باقی تھی، اور اُسے دُور کرنا ضروری تھا، بولا

"اور کلیم میں اُسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچا دیتا، لیکن اس

میں تو کچھ باقی ہی نہ رہا تھا، اور خواہ مخواہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے اور چا ہزار کی موٹر توڑ دانے سے حاصل؟ اتنے میں پیچھے سے ایک ہارن کی آواز آئی اور ایک دوسری گاڑی بہت تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی، دونوں کا رنگ فق ہو گیا اور دل کی حرکت بڑھ گئی۔ لیکن گاڑی برابر سے گزر گئی۔ ان کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، اب انھیں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں گاؤں کے لوگ کسی دوسری موٹر والوں سے کہہ کر ان کا پیچھا نہ کرائیں مگر شاہد نے خود ہی یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ موٹر کا پتہ چلانا دشوار ہے۔

کلیم بولا: اگر کسی موٹر والے نے نمبر دیکھ لیا اور گواہی دے دی تو،

شاہد نہیں اتنی تیز رفتار پر نمبر کون پڑھ سکتا ہے: مگر احتیاطاً اس نے گاڑی کو سڑک پر سے اُتار کر تھوڑی دیر کیچڑ میں چلایا، تاکہ نمبر پلیٹ کیچڑ سے ڈھک جائے لیکن نئی دنیا کے ان بہادر سواروں کو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ رُک کر دیکھتے کہ اس کوشش میں کامیابی ہوئی ہے یا نہیں۔۔۔۔۔۔

موٹر تیزی کے ساتھ میلوں کو نگلے جا رہی تھی، اور شاہد موٹر کو ایک دوسرے راستے سے گھما کر گھر کے قریب پہنچ گیا تھا۔ شکار کا پروگرام خلاف توقع طور پر پورا ہوا تھا۔ شہر کی روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آ رہی تھیں،

دونوں دوستوں کی وحشت اور پریشانی بھی بہت کم ہو گئی تھی، شاہد نے ذکر کو مخاطب کر کے کہا۔

- میں میرے خیال میں لڑکا مرا تو نہیں ہوگا؟

- نہیں میاں۔ مرا نہیں۔ صرف چوٹ آئی ہوگی، گاڑی تو اس وقت مشکل سے پندرہ بیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی، اور گاڑی کا مڈگارڈ اس کے کندھے میں لگا تھا، شاید کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو؟

کلیم، ہاں امید تو یہی ہے، یہ گاؤں کے لڑکے بہت سخت جان ہوتے ہیں، لوٹ پوٹ کر کسی نہ کسی طرح اچھے ہو جاتے ہیں، ان کی ہڈی بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے، اس لئے چوٹ کو اچھی طرح جھیل لیتے ہیں، یہ تو امیروں کے بچے ہیں، جن کو ہر وقت بسم اللہ کے گنبد میں رکھ کر نازک اور کمزور بنا دیا جاتا ہے۔

موٹر شہر کی ناہموار سڑکوں پر اُچھلتی کھڑکھڑاتی چلی جا رہی تھی، اور شاہد اسے بہت احتیاط سے دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا رہا تھا، مرغی بھی سامنے آتی تو گاڑی روک لیتا تھا، دُور سے کسی کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

نیائے نہ کین، کین ٹھکرائی

کین ٹھکرائی ـــــ کین ٹھکرائی ـــــ ـــــ

تاثراتِ کشمیر

مسلمِ کشمیر

دُور تجھ سے جلوۂ جانانۂ کشمیر ہے
مُسلمِ کشمیر تو بیگانۂ کشمیر ہے

تجھ کو بزمِ عیش کی حاصل نہیں پروانگی
تو مگر بے بال و پر پروانۂ کشمیر ہے

وہ کہاں شامِ نشاط و صبحِ شالامار میں
جو ترے افلاس میں افسانۂ کشمیر ہے

شاہی چشمہ کو دیکھکر

چاندی سونا پگھل رہا ہے تو کیا
محلوں میں چراغ جل رہا ہے تو کیا

اہلِ کشمیر سیر و سیراب نہیں
شاہی چشمہ اُبل رہا ہے تو کیا

نجم آفندی

شاعر کی تمنّا

بزم میں آئے ہیں آج اک بات کہہ جانے کو ہم ایک گُر بھولا بھُلایا پھر سے بتلانے کو ھم
یہ نہ سمجھے کوئی ہیں جذبات بھڑکانے کو ہم وہ نہیں جو یاس کے بیٹھیں لے افسانے کو ھم
ہم نہیں وہ جن کی امیدوں کا مرقد دل میں ہے
ہم کو حاصل منفعت ہر سعئ لاحاصل میں ہے

السلام اے نکتہ سنج اے شاعرِ شیوا بیاں ! اے کہ نغموں سے ترے معمور ہے سارا جہاں!
اے تخیُّل کے دھنی! اے والئے علم و زباں آج کرنی ہیں تری خدمت میں کچھ گستاخیاں
ہم تمنّا پر تری اک تبصرہ کرنے کو ہیں
آج تیری آرزو کا تجزیہ کرنے کو ہیں

سب سے پہلے تو یہی ہے ایک تیرے دل کی چاہ مشعرے میں شعر پر تیرے ہو شورِ واہ واہ!
سب کہیں مضموں نیا، اسلوب کی دلکش ہے راہ درد ہو تو اس قدر۔ ہو سامعیں کے لب پر آہ!
تیرا اک لفظ بیٹھے دل میں اہلِ بزم کے
تذکرے ہوں بزم کے یا معرکے ہوں رزم کے

پھر یہی ہے، نا۔ تمنا تیری اے معجز رقم ہو رسالوں پر ترا اور تجھ پہ ہو اُن کا کرم
اور پھر یہ چاہتا ہے تُو۔ مرے اہلِ قلم صاحبِ دیواں بھی ہو جائیں کہیں جلدی سے ہم
جب تلک پُڑیوں میں بندھ جاتا نہیں تیرا کلام
تُو سمجھتا ہے کہ ہے محروم البقائے دوام

داعیہ تیرا بلند، اونچا ہے تیرا حوصلہ یہ تمنّا ہے ترے دل کی۔ یہی ہے ولولہ
ہر کہیں دنیا میں ہو تیرے سخن کا غلغلہ مات چُورن والے کی بانی ہو جس سے برملا
تجھ سے سما کے ستاروں کی بھی شہرت ماند ہو
چرخِ پُرتشہیر کے تُو چودھویں کا چاند ہو

تجھ کو اُٹھتی ہے تصوف کی بھی ہُڑک گاہ گاہ اولیا اللہ کا بن بیٹھتا ہے خضرِ راہ
جو سُنا ہے یا پڑھا، کرتا ہے خوب اس کا نباہ تُو خدائی اور خودی دونوں کو کرتا ہے تباہ
مادیت کی ترے پیروں میں گو زنجیر ہے
پر سخن دیکھو تو قرآں وید کی تفسیر ہے

تُو غلو سے کام لے، اے دوست! یا مطلق نہ لے راہ پر تُو واقعیت کی۔ کہ فطرت کی چلے
گائے یا دکھلائے تُو کتھک کے فن کے چونچلے یہ جو کچھ بھی ہیں، فقط ہیں ابتدائی مرحلے
ابتدا ناقص ہے تیری، انتہا بھی نادرست
مبتدا بے ربط ہو، تو ہو خبر کس طرح چست

وہ تمنّا کیا ہے جو ہو فرض سے ناآشنا برق رفتاری وہ کیا جب بوجھ کندھے سے گرا
نغمہ وہ کیسا ہے بادی سُر ہو جس کا بے پتا کیا وہ نقاشی ہے جب ہو کارٹون اس پر فدا
تُو ہی کہہ وہ کیفیت جو تجھ پہ وارد ہی نہیں
کیا سروکار اس کی عکاسی سے تجھ کو نکتہ بیں

یہ ترے افعال اور ایسی تمنائیں فضول تجھ کو ٹھہرا کر رہیں اس جُون میں اپریل فُول
ایک ہی چھینٹے میں بہہ جائیں گے یہ کاغذ کے پھول کام کی اک بات بتلاتے ہیں، سُن، اس کو نہ بھول
تجھ کو حاصل ہے وہ فن جادو کا ہے جس میں اثر
چھوڑ دہ وہمی تمنّا۔ آ ادھر، کچھ کام کر

تجھ کو تو تخئیلِ عالی پر بہت کچھ ناز ہے — سرمستی کا در ترے منہ پر ہمیشہ باز ہے
جذب اور تاثیر سے بھی تجھ کو سوز و ساز ہے — چھینے میں دل کے تیرا کلک سحر انداز ہے

اُٹھ! یہ میدانِ عمل ہے، دوست، تیرے سامنے
قوتوں سے اپنی خدمت میں وطن کی کام لے

حریت قطعاً سیاسی اور ملکی ہی نہیں — حریت دنیاوی آزادی و دینی ہی نہیں
حریت ایمان کی اور اعتقادی ہی نہیں — حریت خود اختیاری، اقتصادی ہی نہیں

حریتِ تخئیل کی بھی اک حقیقی چیز ہے
اس کو حاصل کر اگر تجھ کو ذرا تمئیز ہے

یہ تمنا جب ترے سینے میں گھر کر جائے گی — جو تشخص کی تجھے حسرت ہے وہ مر جائے گی
کُل فضا پیارے وطن کی امن سے بھر جائے گی — جو بُری ساعت وطن پر ہے، مقرر جائے گی

کاش یہ دھن ہو تجھے، اور یہ تمنا دل میں ہو
جوشِ اخوت اور حُب کا دیس کی محفل میں ہو

سچ جو پوچھو، سچے شاعر کی تمنا ہے یہی — کر دے جو کوثر سے مستغنی وہ صہبا ہے یہی
جس سے روشن ہو جہاں وہ طورِ سینا ہے یہی — مست کر دے انس و جاں کو، وہ ترانہ ہے یہی

اُٹھ ہلا دے تو عزیزوں کے دلِ بے جوش کو
صورِ اسرافیل کر دے بربطِ خاموش کو

حضرت کیفی دتاتریہ

مذہب کی نگاہ میں خدا خالق ہے
حکمت کی نظر میں یا مادہ خالق ہے
لیکن کسے معلوم یہی خالق ہیں
یا اور کوئی ان کے سوا خالق ہے

سیکر آزاد انصاری

غزل مسلسل

کوئی اس طرح ساون گا رہا ہے — دلِ ناشاد اُمڈا آ رہا ہے
سُروں میں ڈوبا لہرایا نسری کا — قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے
ہُوکے دے رہی ہیں بھیگی تانیں — کلیجا منھ کو پیہم آ رہا ہے
پپیہا ٹیرتا ہے کہہ کے پی ہو — یہ پاپی اور بھی تڑپا رہا ہے
اُدھر آواز میں لگتی ہے پیتی — اِدھر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے
بھری برسات اور یہ گھُپ اندھیرا — اندھیرا آپ سر ٹکرا رہا ہے
کسی کو تیل میں جیسے ڈبو دو — یوں ہی سینے میں دم گھبرا رہا ہے
اندھیری رات میں کوندا لپک کر — دبی جو آگ تھی بھڑکا رہا ہے
اُدھر جھنکھاڑتے ہیں مور، اِدھر دل — پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھا رہا ہے
چمکتے اب نہیں جگنو ہوا میں — فلک چنگاریاں برسا رہا ہے
مسلسل نغمہ تھی جھینگر کی جھنکار — دل اب آزار جس سے پا رہا ہے
سہاگن رات کا ڈھلتا ہے کاجل — مرا اک رُواں تھرّا رہا ہے

یہ رات اور یادِ آثر اک بے وفا کی
بس اب رہنے دو، رونا آ رہا ہے

آثر لکھنوی

اُردو کی شستگی و نفاست میں آگرے کا حصّہ

ل، احمد اکبر آبادی

مغربی تمدن کی ترقی کے ساتھ علوم و فنون نے جو ارتقائی مدارج طے کئے ہیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔ محض روایت کو ناکافی و غیر مفید دیکھ کر تاریخ نویسی کا دستور قدیم مسترد ہوا، اور اس کی بنا درایت پر مستحکم کی گئی، ہمارے مورخوں نے بھی قدیم طرز واقعہ نگاری کی شکایتیں کیں، اور جدید اسلوب اختیار کر لیا۔ مگر جب ہم زبانِ اردو کے جدید مورخین کی تالیفات پڑھتے ہیں تو سخت حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ قدیم تذکرہ نویسوں سے اگر کچھ فروگزاشتیں ہوئیں تو ان کی طرف سے متعدد و معقول عذر لائے جا سکتے ہیں۔ لیکن عہد حاضر کا واقف فن لسانی مورخ اپنی تنگ نظری و فقدان درایت کی کیا توجیہہ پیش کر سکتا ہے؟

اس مقالے میں ہم اس فروگزاشت کی تصریح اور ازالے کی کوشش کریں گے کہ اردو کے ارتقاء، شستگی و صفائی میں آگرے کی ارباب علم و ہنر نے ہر دور میں نہایت معقول حصہ لیا ہے، اور اس ذیل میں آگرے کی خدمات نہایت وزنی ہیں، لیکن ایک صفیر بلگرامی کے سوا ہمارے مورخوں نے ارتقائے اردو کی تاریخ قلمبند کرتے وقت آگرے کی ان خدمات کو نظر انداز کیا ہے۔ اور اگر کہیں یہ ذکر ناگزیر طور پر آ گیا ہے تو اس طرح بیان کیا ہے کہ آگرے کا نام نہ آنے پائے۔ متقدمین میں سے ہم مثال کے طور پر میر امن دہلوی کے دیباچہ، باغ و بہار سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی و فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آ کر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدا جدا تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرنے کے لئے ایک زبان اُردو مقرر ہوئی"۔

ہر چند میر امن نے یہ عبارت مورخ کی حیثیت سے نہیں لکھی، لیکن وہ ایک تاریخی بیان ضرور ہے، ہمیں اُن سے تعرض نہیں کہ اُنھوں نے اکبر کے پایۂ تخت کا نام لینا کیوں روا نہ رکھا، وہ فی الحقیقت کوئی تاریخ مرتب نہیں کر رہے تھے، اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید فنِ تاریخ نویسی سے واقف بھی نہ تھے، لیکن اگر عہد حاضر کا کوئی مورّخ اس فروگزاشت کا اعادہ کرے تو بازپرس لازمی ہو جاتی ہے، اس کی ایک مثال ہم شعر الہند سے دیتے ہیں۔

"..... تیمور کے بعد شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدرتی اختلاط کے علاوہ اکبر کے زمانے میں مختلف قوموں کے اختلاط کا ایک مصنوعی سبب اور پیدا ہو گیا، یعنی اکبر نے قلعے میں ایک زنانہ بازار قائم کیا......"

ہمیں تسلیم ہے کہ صاحب شعر الہند کی نیت بخیر تھی، لیکن اس عبارت کے پڑھنے سے یہ سوال از خود پیدا ہوتا ہے، کہ اکبر کا یہ قلعہ جہاں وہ بازار قائم ہوتا تھا، کس مقام پر واقع تھا؟ اور جب یہ ظاہر ہے کہ وہ مقام آگرے

کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تو ہمارے مورخ کو آگرے کا نام لیتے کیا قباحت محسوس ہوتی تھی؟

ہمارے اس بیان سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ ہمارا مدعا آگرے کا تفوق قائم کرنا یا اس کی مرکزیت تسلیم کرانا ہے، اس سے ہمارا مقصود صرف ایک تاریخی فروگذاشت کا ازالہ کرنا ہے۔

اردو کی تاریخوں کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند میں زبان کا وہ دَور تو متعین ہے، جب مختلف زبانوں کے الفاظ مخلوط ہو رہے تھے، اور نصف ہندی و نصف فارسی اشعار کی مثالیں بھی بہم پہنچ گئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ڈھلی ڈھلائی اور صاف شستہ زبان میں اساتذۂ دورِ اول کے دیوان ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ امیر خسرو کی مثالوں کے بعد مخلوط زبان کے دس پانچ شعر ملتے ہیں، اور پھر دفعتاً دکنی شعرا، کا کلام پیش ہو جاتا ہے۔ شمالی ہند میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں، اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مخلوط زبان زبان کی حیثیت پا کر صاف و شستہ کہاں ہوئی، اور وہ کونسا مرکز تھا جہاں یہ عمل ہوتا رہا کہ جس نے دَورِ اول کے اساتذہ مہیا کر دیے؟

اگر بعض فلاسفہ کی اس رائے کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ واقعات کے اخذ و التقاط میں ایک مورّخ اپنے رجحانِ طبع و پسند کو ترک نہیں کر سکتا اور اس لیے تاریخ ایک فردِ واحد کی رائے اور مذاقِ طبیعت کا آئینہ ہونے سے زیادہ نہیں، تو ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ آگرے کو نظر انداز کر دینے کا سبب سوا اس کے دوسرا نہیں ہو سکتا کہ دہلی و لکھنؤ کی مرکزیت کا خیال ہمارے مورخین زبان و ادب کے دماغوں میں عصبیت کی حد تک راسخ ہو گیا ہے، اور اُن کو اس ذیل میں کسی تیسرے مقام کا نام لینا بھی گوارا نہیں۔

تاریخی مباحث سے گفتگو کرتے وقت "پسند و رجحان" کے کلیے سے ہم اپنے آپ کو بھی محفوظ نہیں سمجھتے، لیکن بایں ہمہ یہ حق ہم کو ضرور حاصل رہتا ہے کہ ہم ایک مورّخ کے کسی واقعے کو قلمبند کرنے یا قلم انداز کر دینے پر جرح و تعدیل کر سکیں۔

یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اردو کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس کی جنم بھومی بننے کا فخر دکن کو حاصل ہے، یا پنجاب کو، لیکن اس کے آغاز کے متعلق چند اشارات ناگزیر ہیں، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کے تداخلِ ہند کے ساتھ جس مخلوط زبان کی بنا پڑی اس نے عملی صورت اختیار کرنا کب سے شروع کیا؟ اگر غور کی نظر ڈالی جائے گی تو اردو کے عملی جامہ پہننے کی ابتدا اس وقت سے نظر آئے گی، جب سکندر لودھی نے آگرے کو پایۂ تخت بنایا اور ہندوؤں نے فارسی زبان سیکھنا شروع کیا، منتخب التواریخ سے اس عہد کے بیان میں ہمیں پنڈت ڈونگرمل کا نام ایک فارسی گو شاعر کی حیثیت سے ملتا بھی ہے جو غالباً فارسی کا پہلا ہندو شاعر تھا۔

بہرحال اس امر کے ثبوت میں کافی و وافی شہادت ملتی ہے کہ اس مخلوط زبان نے عہدِ اکبری میں ایک شکل اختیار کرنا شروع کر دیا تھا جس میں اکبر کا مینا بازار معقول حد تک ممد و معاون ثابت ہوا، یہ حقیقت ہمارے پیشِ نظر ہے کہ قریب قریب اسی عہد میں یہی کام دکن میں بھی جاری تھا، اور کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی تشکیل میں مغلیہ و قطب شاہی درباروں کو برابر کا درجہ حاصل ہے، لیکن وقتِ نظر کے ساتھ دیکھنے پر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو جس زبان کا نام ہے وہ برج بھاشا کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اس کی تشکیل آگرے ہی میں ہو سکتی تھی، کیونکہ آگرہ خود برج میں داخل ہے، دکن میں جو زبان بن رہی تھی اس کی بنا برج بھاشا نہیں بلکہ اس وقت کی "دکنی بولی" ہو سکتی ہے، ہمارا خیال ہے کہ مولّفِ آبِ حیات کو اس معاملے میں مغالطہ ہوا اور مورخین مابعد آنکھ بند کرکے ان کا اتباع کرتے رہے۔ "نہ سپہر" میں امیر خسرو کے بیان سے یہ بات مصدق ہے کہ دکنی ایک جداگانہ بولی تھی، یہ بھی ایک دوسری بحث ہوگی کہ آیا دکنی اور بھاشا میں کوئی تعلق تھا یا نہیں اور دکنی شاعری اردو شاعری میں کب اور کیسے مدغم ہو گئی؟

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہ ہونا چاہیے کہ شاہجہان نے دہلی آباد کرکے جب اپنا پایۂ تخت آگرے سے وہاں منتقل کر لیا تو اس کے بعد بھی بہت عرصے تک آگرہ نہ صرف علمی و ادبی مرکز بنا رہا، بلکہ سیاسی چالوں اور ریشہ دوانیوں کا تماشا بھی آگرے ہی کے اسٹیج پر کھیلا جاتا رہا۔ اور اس امر کی شہادت بھی تلاش کرنا نہ پڑے گی کہ دکن میں اورنگ زیب کی وفات تک دہلی برائے نام پایۂ تخت تھا، ورنہ تمام سیاسی واقعات و امور آگرے ہی میں رونما ہوتے اور طے پاتے رہے، اور اربابِ فضل و کمال

کی جو محفل عہدِ اکبری سے قائم تھی وہ اس وقت تک آگرے ہی میں جمی رہی، اس لئے ناگزیر طور پر یہ مستنبط ہو جاتا ہے کہ شمالی ہند میں تشکیل اردو کا عمل اسی مجلس کے ہاتھوں سرانجام پاتا رہا، یہ ہمارے محقق مورخوں کا کام تھا کہ ان تاریخی واقعات پر نظر کرتے، شواہد کی جستجو کرتے، اور اس کڑی کو شمالی ہند ہی کے اندر ڈھونڈھ نکالتے۔ اگر آگرے کے ساتھ یہ بے اعتنائی نہ برتی گئی ہوتی تو ہمارا خیال ہے کہ ارتقائے زبان کی یہ گم شدہ کڑی منطقی نتائج کی صورت میں از خود مل گئی ہوتی۔ بہر حال ایک لسانی محقق کے لئے یہ میدان آج بھی کھلا ہوا ہے،

اُردو زبان کے ارتقار کا مختصر خاکہ ذیل کے اقتباس میں پیش کیا جاتا ہے، صغیر بلگرامی جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں۔

"امیر خسرو نے اس طفل نوخیز کو نظر توجہ سے دیکھا، مگر اکبر نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور چاہا کہ اس کو سرفرازی کا خلعت بخشا جائے اور اس خلعت کی طیاری میں مصروف ہوا، راجاؤں کی بیٹیاں گھر میں لایا، ہزاروں سہیلیوں سے اپنا محل بھر دیا۔ علماء سے ہندی کتابوں کا فارسی ترجمہ کرایا، ہنود کو دربار میں دخل دیا اور اُن سے بات چیت کا موقع ہر طرح رکھا، بیربل کی شوخیاں مشہور عام ہیں۔ مکانات اور اوقات اور اشیار کے نام ہندی یا ہندی فارسی آمیز رکھے، اور محل میں (مینا) بازار جوایا، یہ سب خلعت اردو کے سامان ہیں، مگر اس کو بھی زندگی نے مہلت نہ دی کہ ابھی خلعت ناطیار تھا کہ اکبر تمام ہوا، حقیقت میں جیسی توجہ بدل اکبر نے ہندیوں کی طرف کی تھی، اگر وہ اور زندہ رہتا تو اردو کی صورت اسی وقت میں سب کو نظر آتی، اور دربار میں بھی یہی زبان شائع ہو جاتی، مگر یہ بھی واضح رہے کہ اکبر نے اپنا پایۂ تخت اکبر آباد میں مقرر کیا تھا اور وہیں رہتا تھا، دہلی کو اس فیضِ اکبری سے چنداں حصہ نہ ملا؛"

——— جلوۂ خضر کے صفحہ نمبر ۵۵ پر درج ہے۔

"جہانگیر کے وقت میں بھی مینا بازار قائم رہا۔ شاہجہاں کے دور میں اور ترقی ہوئی کہ یکایک اکبر آباد سے شاہجہاں کا دل اُچاٹ ہوا، اور دہلی جا بسایا۔ آگرے میں شاہجہاں کے وقت میں اردو کی صورت قائم ہونا اچھی طرح ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ کے دربار و دفتروں کی زبان فارسی تھی مگر اردو اس کے عہد میں زبانوں پر آچلی تھی۔۔۔۔ میں نے شاہجہاں کی ایک تحریر اردو دارا شکوہ کے نام دیکھی ہے جو اس وقت یاد نہیں؛"

اب ہم مخلوط زبان کے چند ایسے شعر پیش کرنا چاہتے ہیں جو اردو کی تشکیل کو مصدق کرنے کے ساتھ اس کا بھی ثبوت ہیں کہ آگرے میں مغلیہ دربار قائم رہنے تک زبان میں روانی آچلی تھی اور اس منزل میں تھی جس کے بعد دورِ اوّل کے شعرار کا کلام ہونا مستبعد نہیں رہتا، اور یہ کہ شمالی ہند میں اردو کا استحکام بلا واسطہ ہوا، اور اس میں دکنی شعرار کا کوئی حصہ نہ تھا،

صاحبِ جلوۂ خضر نے تزکِ جہانگیری کے حوالے سے اکبر کی ایک رباعی نقل کی ہے جو اس نے جہانگیر کی درخواستِ معذرت پر لکھدی تھی،

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہِ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں۔ خوش ہر ساعت

خندۂ گل کے مولف نے ملا ابوالحسن دو پیازہ کا ذیل کا شعر نقل کیا ہے،

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھونا
ایسا لگے ہے مجھ کو جوں کھانڈ کا کھلونا

مغل اور اردو میں جلوۂ خضر کے حوالے سے نور جہاں سے بھی دو شعر منسوب ہیں۔

دیں جگہ زخمِ وفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اُس بتِ بیباک میں ہم
نقشِ پا کی طرح اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

خمخانۂ جاوید میں پنڈت چندر بھان برہمن کے اکبر آبادی جو دارا شکوہ

کے میر منشی تھے، کچھ شعر نقل کئے گئے ہیں۔ ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے،

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

مغل اور ابرو میں جلوۂ خضر کے حوالے سے زیب النسا سے منسوب تین شعر درج ہیں۔ ایک شعر میں پیش کیا جاتا ہے۔

جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسو کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

اسی سلسلے میں کہ دکن کی شاعری کے دہلی میں متعارف ہونے سے قبل شمالی ہند میں شعر کس درجے پر تھا، اور بھی چند مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میر حسن نے اپنے تذکرے میں ایک شاعر متخلص بہ خاکی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دہلی میں درویشانہ زندگی گزارتا تھا، صاحب گلِ رعنا کا قول ہے کہ "اس وقت تک دلی میں اردو شاعری کا سراغ نہیں ملتا" لیکن بقول صاحب گلِ رعنا سید محمد بن جمال الدین قادری متخلص بہ خاکی کا ایک ردیف وار مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانے میں ملتا ہے اور دیوان کے علاوہ خاکی کی ایک مثنوی موسوم بہ فیض عام مورخہ ۱۱۲۰ھ بھی ہے۔ صاحب گلِ رعنا کا خیال ہے کہ میر حسن نے جس خاکی کا ذکر کیا ہے وہ یہی خاکی ہے، جس کے تین شعر ہم گلِ رعنا سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

جائز نہیں تھیں ہجر کے شب کی شکائتیں
مجھکوں حصول آج تو نقد وصال تھا

اپنے معشوق سنگ ہو رہنا ایک دل ایک رنگ ہو رہنا
خوش یہی حال ہے فقیری کا نفس و دل بیچ جنگ ہو رہنا

مرزا عبدالقادر بیدل کے دو شعر اکثر تذکروں میں آئے ہیں، ایک شعر یہ ہے۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

قزلباش خاں اُمید کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

در و دیوار سے اب صحبت ہے یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں عہد عالمگیری ہی میں اردو زبان شعرائے دکن کی محمد شاہی عہد کی زبان سے کہیں زیادہ صاف و شستہ تھی، ولی کی اس زبان سے بھی جب کہ اُس نے دہلی کا اثر قبول نہ کیا تھا، یہاں یہ فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ اگر شاعری اس وقت دکن ہی میں تھی تو دہلی میں وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی طرف شاہ گلشن نے ولی کو توجہ دلائی۔ اور وہ کیا شے تھی، جس کے اختیار کرنے سے زبان اس قدر نکھر گئی؟

اب ہمیں اس بات کو دیکھنا ہے کہ زبان میں یہ سلاست و روانی پیدا ہو جانے کا مرکز کہاں تھا؟ جس قدر تلاش و جستجو کی جائے گی، جتنی شہادت فراہم ہو سکے گی، اس سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ وہ مرکز آگرے کے سوا دوسرا نہیں تھا، ورنہ پھر سوال یہ پیدا ہو گا کہ آبرو، مضمون، آرزو، اور مظہر نے زبان کہاں حاصل کی اور ان کے مذاق شعری نے کہاں تربیت پائی کہ دہلی پہنچکر صدر بزم شعر و ادب بن سکے؟

محمد شاہ کے عہد سلطنت میں ظاہر ہے کہ آگرے کا اجتماع قائم نہ رہ سکتا تھا، کچھ لوگ شاہجہاں کے ساتھ گئے، کچھ اورنگ آباد کے دربار میں جا پہونچے، رہے سہے اب دہلی پہونچنے لگے، کیونکہ آگرہ درباری سرپرستی سے محروم، اور وہاں کے اربابِ فن قدر دانی سے مایوس ہو گئے تھے، جن لوگوں کو کس مپرسی ناپسند اور وطن کی گوشہ گیری نامطبوع تھی وہ رفتہ رفتہ دہلی کو آباد کرنے لگے۔

شاہ مبارک آبرو عالمگیری عہد کے لوگوں میں سے تھے، شعر و ادب کے پرستاروں میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نقلِ وطن کیا، اسی زمانے میں میاں شرف الدین مضمون، مولوی عبد الرب، نواب اسدیار خاں وغیرہ باری باری سے دہلی جا پہونچے، اُس وقت، دہلی میں زبان و شعر کی حیثیت جعفر زٹلی کے کلام سے متعین ہو سکتی ہے، لیکن جب آبرو و مضمون نے وہاں پہنچ کر شعر و سخن کی بساط بچھائی تو دہلی میں زبانِ اُردو نے تشخص حاصل کیا، اور بلا ریب دہلی کی بزم زبان و ادب کے بانی یہی لوگ تھے، اور شعر اردو کا دَورِ اوّل انھیں ہستیوں سے عبارت ہے، یہ بتانے کے لئے کہ اس دَور میں اِن بزرگوں کو کیا مرتبہ حاصل تھا، اُردو کے

مستند تذکرہ نویسوں کے چند اقتباس پیش ہیں۔ آبرو کے ذکر میں میر تقی نکات الشعرا میں فرماتے ہیں۔

"شاعرے نادرہ گوے ریختہ، میگویند کہ طبع شوخے داشت
غرض مستغنی وقت خود بود"

میر حسن لکھتے ہیں:۔

"از ابتدائے جوانی مشق سخن میکرد۔ شاعرے خوش گوئی
در وقت خود بود"

آب حیات میں ہے۔

"یہ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت شاعر زبان ریختہ کے
اور صاحب ایجاد نظم اردو کے شمار ہوتے تھے"

گل رعنا کی عبارت ہے:۔

"اور حق تو یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ
آغاز انھیں سے ہوا"

میاں شرف الدین مضمون کے متعلق نکات الشعرا کا بیان ہے،

"حریف ظریف، بشاش بشاش، ہنگامۂ گرم کن مجلسہا،
ہر چند کم گو بود، لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ
زیادہ"

میر حسن فرماتے ہیں۔

"از اکبر آباد آمدہ بشاہجہاں آباد، و در زینت المساجد
استقامت ورزید، ہر چند کم گو لیکن خوش گو"

جب ان باکمالوں نے دہلی میں شعر و ادب کی محفل ترتیب دی تو وہاں کے جوہر قابل کو بھی ابھرنے کا موقع ملا، دور اول میں جن دہلوی شعرا کے نام چمکے، اُن میں تاجی، یکرنگ و احسن نمایاں ہیں، ان حضرات کے متعلق اردو کے مستند تذکرہ نویسوں کی رائیں پیش کی جاتی ہیں، تاجی کے ذکر میں میر حسن کا خیال یہ ہے:۔

"مردے ظریف بود، اکثر لطائف و ظرائف آں مردماں
را بخندہ می آورد۔ خود نمی خندید تبسمے میکرد، تلاش
صنعت ایہام بسیار داشت"

نکات الشعرا میں ہے:۔

"مزاجش بہ ہزل مائل بود"

شعر الہند کا بیان ہے:۔

"اُن کی حیثیت جعفر زٹلی سے زیادہ نہ تھی"

تذکرۂ قدرت کے الفاظ ہیں:۔

"ہر چند پر گو اما بسیار پوچ گو است"

گل رعنا کی عبارت ہے:۔

"کہن سال و کہنہ مشق تھے، مگر باوجود اس کے حضرت مظہر
رحمۃ اللہ علیہ کو کلام دکھلانے آتے، مشورہ سخن کرتے تھے،
مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق
وہ خان آرزو اور ایک قول کی بنا پر شاہ مبارک آبرو
کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں"

آبرو مضمون کے زمانے ہی میں آگرے سے نقل وطن کرنے والوں میں خان آرزو و مرزا مظہر جانجاناں کے نام بھی ہیں۔ اُردو کے استحکام و شستگی میں، دور متقدمین، جو مرتبہ سراج الدین علی خاں آرزو کو حاصل ہے وہ ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہے۔

"سراج الدین علی خاں آرزو بعد امیر خسرو دہلوی چنیں
صاحب کمال پر گو و خوش گو، بسامع عالمیان نرسیدہ
ہفت دیوان داد کہ ہر یکے پہلو بہ نظیری و فغانی می زند،
فکر صائب اور تزلزل ورد کان مضامین مبتذل انداختہ
شاعر فارسی، عالم فاضل شہرہ آفاق، در سخن فہمی طاق،
استادان ریختہ شاگرد اویند" (تذکرہ میر حسن)

"ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آن بزرگوارند"
(نکات الشعرا)

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے
جو کہ ارسطو کو فلسفہ منطق پر ہے، جب تک کہ کل منطقی ارسطو
کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے
عیال کہلاتے رہیں گے۔ خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے
دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند پرورش پا کر
اُٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور

جس شاعری کی بنیاد حکایت اور ذومعنی لفظوں پر تھی
اُسے کھینچ کر فارسی ادائے مطلب پر لے آئے، یعنی
مرزا جانِ جاناں، مرزا رفیع۔ میر تقی، خواجہ میر درد"
(آبِ حیات)

مرزا مظہر جانِ جاناں کے متعلق میر حسن کی رائے یہ ہے،
"مرزا مظہر از فصحائے زماں و بلغائے دوراں شاہ ولیست
مقدس و بزرگ، خوش تقریر برتبہ الیست کہ در تحریر
نمی گنجد۔ یقین و حزیں شاگردان اویند"
مولف آبِ حیات کی عبارت ہے:۔
"زبان کی اصلاح و انداز سخن اور تحریر کی ایجاد
میں انھیں ایسا ہی حق ہے، جیسا کہ سودا و میر کو"
تذکرۂ قدرت کے الفاظ ہیں۔
"میگویند کہ اول کسے کہ طرز ایہام گوئے را ترک
نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلی شاہجہاں آباد
کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ
مرزا مظہر جانجاناں متخلص بہ مظہر مردیست فرشتہ صفت"
گلِ رعنا کی رائے ہے،
"مرزا جانِ جاناں مظہر نے اس خار زار کو ایسا چھانٹا
کہ شاعری ساحری بن گئی، پھر اپنی زورِ طبع و خدا داد قابلیت
سے اچھوتے مضمون اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے
دلکش محاوروں کو اس طرح پر ترتیب دیا اور وہ خوبی
پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی
دوہروں کی بنیاد تھے اُسے سب بھول گئے۔ حزیں، ہدایت
حسرت، فقیہہ، درد مند نے اُن کے سامنے زانوئے
تلمذ تہ کیا اور میر و مرزا وغیرہ نے ان کا تتبع کرکے اردو
شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا، یہ اردو شاعری کے
مورخ کی سخت بے انصافی ہے کہ اس نے مرزا صاحب
کے اس احسان کا اعتراف نہیں کیا، بلکہ اُن کی کمال
شاعری کو دبانے کی ہر جگہ بے سود کوشش کی ہے"

ان باکمالوں کے بعد میر تقی کا نام آتا ہے، اس خدائے سخن کے متعلق
کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے، میر نے اردو شعر میں وہ شے شامل کر دی جس کے
بغیر شعر شعر نہیں ہو سکتا تھا،

اس پر مرزا رفیع سودا کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن کو
آبحیات میں شاہ حاتم کا شاگرد بتایا گیا ہے، لیکن آبِ حیات کے اس بیان
کی تائید کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی، البتہ اس بات کو متعدد مورخوں
نے لکھا ہے کہ مرزا سودا نے خان آرزو سے استفادہ کیا۔ ہر چند اس وقت
تک سودا فارسی میں مشق سخن کرتے تھے، لیکن اردو میں شعر کہنے کا مشورہ
ان کو خان آرزو ہی سے ملا تھا،

سودا نے اپنے کلام میں شاہ حاتم کی شاگردی یا تقلید کی طرف
کہیں اشارہ نہیں کیا ہے، البتہ آبرو و مضمون کے طرز کے معترف نظر آتے ہیں:

اسلوبِ شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ
مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

میر کے ذکر کے بعد ہی مرزا غالب کا نام لینا پڑتا ہے کہ پیغمبر سخن تھے،
غالب کے ذکر میں ہم صرف ایک اشارہ کریں گے اور وہ یہ ہے کہ اُن کے
رنگ شاعری کی آج پرستش ہوتی ہے اور امتدادِ وقت کے ساتھ اس
پرستش میں خشوع و خضوع بڑھتا جائے گا، غالب کی شاعری کے بغیر اردو
شاعری جس مرتبے کی ہوتی اُس کا اندازہ بآسانی ہو سکتا ہے، اردو نثر
میں مرزا غالب نے جو انقلابی بنیاد رکھی وہی اس تعمیر کی تکمیل بھی تھی، کہ آج
تک اس سے زیادہ سلیس زبان کا تصور نہیں بندھ سکا ہے، اس ذکر
میں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ غالب کے رقعات کی تاریخ ۱۸۶۰ء ہے
لیکن غالب کو رقعات مرتب ہونے سے چار سال پہلے خان بہادر ذوالقدر
خواجہ غلام غوث اکبر آبادی کے خطوط جو ویسی ہی سادہ و سلیس زبان
میں ہیں مرتب ہو چکے تھے، لیکن ان کی اشاعت ۱۸۹۵ء سے قبل نہ ہو سکی،
اور خواجہ غلام غوث ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے اصل میں عودِ ہندی کو
جمع و مرتب کیا ہے،

مولوی عبد الرب صاحب اکبر آبادی کا نام اوپر لیا جا چکا ہے
یہ عہد محمد شاہی میں آگرے سے دہلی پہونچے اور ۱۱۳۶ھ میں شاہی رصد گاہ
میں بیٹھ کر علمِ مساحت پر ایک کتاب اردو میں لکھی، مگر اس سے بھی قبل وہ

ایک رسالہ ریاضی پر لکھ چکے تھے، اور اس طرح اردو نثر کے اولین مصنف ہونے کا استحقاق مولوی عبد الرب کو پہنچتا ہے،

شیخ قلندر بخش جرأت بھی اُن ہنرمندانِ آگرہ میں سے ایک ہیں، جنھوں نے ترکِ وطن کر کے شعر و سخن میں اپنا درجہ قائم کیا ہے، جرأت کے متعلق مولانا آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ وہ صاحبِ طرزِ ایجاد تھے، اور آج تک ان کا طرزِ بیان ان ہی سے مخصوص ہے۔

ہم نے بخیالِ طوالت متقدمین و متوسلین شعرائے اکبر آباد کے تلامذہ کے ذکر کو قلم انداز کر دیا ہے۔ لیکن ایک جستجو کرنے والے کو تذکروں کے مطالعے سے بآسانی پتا چل سکتا ہے کہ ان باکمالوں کے دریائے فیضِ سخن نے کتنی ندیاں اور نہریں جاری کر دیں اور ان ندیوں اور نہروں نے کتنے بڑے رقبے کو سیراب کیا۔ یہاں ہم میر تقی کے ہم عصر اساتذہ و ادبائے اکبر آباد کے چند نام لیں گے۔ جو آگرے سے باہر نہیں گئے۔

میر امجد علی اصغر صاحبِ دیوان تھے، صاحبِ گلشنِ بیخار نے تذکرہ کیا ہے۔

میاں نظیر اکبر آبادی	
قاضی واجد علی خاں واجد	نغزِ عندلیب میں ذکر ہے
میاں محمدی بیدار	صاحبِ دیوان تھے اکثر تذکروں میں ذکر آیا ہے،
مرزا اکبر علی	تذکرہ میر حسن
شرف الدین علی پیام	"
جنون	"
میر محمد سجاد، سجاد	" میر تقی ان کی شاعری کے بڑے مداح تھے،
محمد محسن، محسن	"
محمد عارف، عارف	"
مجرم	گلشنِ بیخار
سید حسن خاں محو	نغزِ عندلیب
بقاء اللہ بقا	تذکرۂ سرخوش



میاں نظیر اکبر آبادی کی خصوصیاتِ شاعری پر اس عہد میں کچھ توجہ ہوئی ہے، مگر ان کے متعلق ہنوز بہت کچھ کام ہونا ہے۔

اس مضمون میں یہ اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ آج سے کم و بیش سو سال قبل میاں نظیر نے اس صنفِ کلام کی بنا ڈالی، جو اس زمانے میں باوجود اس قدر مقبول ہونے کے اتنی مکمل صورت اختیار نہیں کر سکی ہے۔ فطرت نگاری کو ابھی اتنا حقیقی اور سچا ہونے میں دیر لگے گی جس مقام پر اس کو نظیر پہنچا گئے ہیں، ہماری آنکھیں اس زمانے کو دیکھ رہی ہیں جب اردو زبان کے بولنے والے متقدمین میں تنہا ایک نظیر کو اردو کا فطری و حقیقی شاعر مانیں گے، نظیر کے متعلق ایک مزید اشارہ شاید بے محل نہ ہو اور وہ ان کی فرہنگ سے متعلق ہے، نظیر کے یہاں ہمارے خیال میں الفاظ کی اتنی کثرت اور بہتات ہے، جو کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہ ملے گی، نظیر کا مطالعہ کرنے والے کے لئے ان کی فرہنگ ایک مفید موضوعِ تحقیق ہو سکتا ہے، اس ذیل میں ہم ایک نکتہ اور پیش کریں گے، آج لکھنوی زبان کی خصوصیات میں زری بعنی زرا شٹیٹ لکھنؤ کا لفظ باور کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ نظیر کے یہاں بار بار استعمال ہوا ہے، اور اس کے علاوہ بھی بعض الفاظ اور محاورے نظیر کے کلام میں ملتے ہیں جو آج لکھنؤ کی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

عہدِ غالب میں ان کو ہم عصر اساتذۂ اکبر آباد میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

خلیفہ اسیر خلف میاں نظیر اکبر آبادی	صاحبِ دیوان تھے،
مرزا اعظم علی بیگ اعظم	صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔
انہام اللہ انہام و ساحر	خمخانۂ جاوید میں تذکرہ ہے
شیخ نیاز علی پریشاں	مصنف مثنوی سرمایۂ عشق و واسوخت و تذکرۂ شعر و سخن
سید مدد علی نیش	مصنف خزینۃ القواعد و جغرافیہ منظوم
مولوی نبی بخش حقیر	صاحبِ دیوان تھے اور سخن فہمی کے لئے غالب کے ممدوح ہیں
مہاراجہ بلوان سنگھ	صاحبِ دیوان تھے۔
مرزا خانی رنج	واسوخت و مثنویاں یادگار ہیں
غلام محمد رہا	صاحبِ دیوان
سید باقی زر	دو دیوان دو واسوخت اور مثنوی موسیٰ و فرعون یادگار ہے،

قطب الدین خاں باطنؔ	صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ تذکرہ گلستانِ بیخزاں، نسخۂ تقویم مرآۃ خیال، مثنوی غمِ دلربا اور خمسۂ مثنوی میر حسن کے مصنف ہیں۔
احمد خاں شیفتہ	مثنوی یادگار ہے، نغمۂ عندلیب میں ذکر ہے۔
منشی جواہر لال جواہرؔ	مثنوی جواہر البیان یادگار ہے اور زبدۃ التاریخ کے نام سیر المتاخرین کا خلاصہ بھی لکھا ہے۔
میر سعادت علی سعیدؔ	صاحبِ دیوان تھے۔
مولوی اصغر علی اصغرؔ	مصنف مثنوی شورشِ عشق، مثنوی بہارِ خوش، وقائع منصور الزماں۔ نیرنگِ فرہنگ، مفتاح المفرالنفس، لغات اصغر علی وغیرہ۔

اس مقالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اساتذۂ اکبر آباد یا صرف میرؔ و غالبؔ کے ہم عمر شعراء و ادبا کو کلام نظم و نثر کا دوسرے مرکزوں کے اساتذہ سے مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لئے ایک پورے دفتر کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم دو چار بزرگوں کے متعلق چند اشارات کافی سمجھتے ہیں، ان میں ایک ہستی میر اعظم علی اعظم کی ہے، یہ میر امنؔ کے ہمعصر ہیں، اور جس زمانے میں باغ و بہار چھپی اس سے آٹھ سال قبل اعظم اسی قسم کا ایک افسانہ موسوم بہ فسانۂ سرور افزا لکھ چکے تھے، لیکن افسوس کہ یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔ لیکن اعظم کا کارنامہ ایک دوسری کتاب ہے جس میں اُنھوں نے اس وقت تک کی فارسی و اردو کتابوں پر تبصرہ کیا تھا، مگر حیف کہ وہ کتاب بھی مسودے کی ہی صورت میں رہی۔

دوسرا نام قطب الدین خاں باطنؔ کا ہے، جو صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ تذکرہ گلستانِ بیخزاں یا نغمۂ عندلیب اکے مؤلف ہیں، یہ تذکرہ نواب شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں لکھا گیا تھا، کیونکہ شیفتہ نے میاں نظیرؔ کا ذکر اہانت آمیز لہجہ میں کیا تھا، اس تذکرے کی قدر و قیمت مطالعے کے بعد معلوم ہو سکتی ہے، باطنؔ نے اس کے علاوہ بھی کئی تصنیفیں چھوڑی ہیں۔

پھر مولوی اصغر علی اصغرؔ کا نام آتا ہے جو کم و بیش ستر کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں نصف کے قریب غیر مطبوعہ رہیں۔ وقائع منصور الزماں سات جلدوں میں بجواب بوستانِ خیال لکھی تھی، لیکن اس کی صرف پہلی جلد شائع ہو سکی، غالباً یہ کتاب پہلی نہیں تو چند پہلی کتابوں میں سے ہے جو سادہ غیر مقفّیٰ زبان میں تصنیف ہوئیں۔ ورنہ اس وقت تک اردو نثر مقفّیٰ و مسجع عبارت ہی میں لکھی جاتی تھی۔

یہاں تک کے بیان سے یہ بات واضح ہو جانا چاہیئے کہ آغازِ اردو سے لے کر اس وقت تک جب کہ شعرار دو مضمون و تخیل کے اعتبار سے شعر بنا، آگرے کے ہنرمند و اہلِ کمال نہ صرف پیش پیش رہے، بلکہ ہر عہد میں اردو کا پرچم انھیں کے ہاتھوں میں لہراتا رہا ہے، لیکن مورخوں نے آگرے کی ان خدمات کو ایسی ہٹ دھرمی کے ساتھ پامال کیا کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سا بزرگ بھی بیتاب ہو گیا، مقدمہ نکات الشعراء میں مولانا شروانی لکھتے ہیں۔

> "دہلی و لکھنؤ کی ہنگامہ آرائیوں میں آگرہ گرد و رگلو ہے مگر اس کی بے زبانی صاف کہہ رہی ہے کہ تیسرے دور تک جو بلاکشانِ محبت بزمِ سخن میں آئے اُن میں سے اکثر کے دماغ اس کی بادۂ کہن سے پُرکیف تھے، شاہ مبارک آبروؔ، شرف الدین مضمونؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ، مرزا مظہر قدس سرہٗ، میر تقی کی ذات پر اہلِ اکبر آباد کو ناز ہے، اس کے بعد دہلی و لکھنؤ کو، جب مرزا غالب بھی بزم آرا ہو جائیں پھر آنکھ ملانا آسان نہیں رہتا۔

اب ہم ایک اقتباس مولانا شرر مرحوم کے مضمون سے دیتے ہیں جو نقاد مئی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا،

> "واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان آگرہ و دہلی میں پیدا ہوئی، اردوئے معلیٰ میں نشو و نما پا کے اُس نے اپنی موجودہ صورت پیدا کر لی، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، اور سعادت علی خاں کے زمانوں میں دربارِ دہلی کی کمزوری و بے استطاعتی اور لکھنؤ کے نوابی دربار کی دولتمندی و قدر دانی کی وجہ سے تمام صاحبانِ کمال لکھنؤ پہنچ گئے، مرزا رجب علی بیگ سرورؔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے، وہیں

وہیں نشو ونما پایا، ناثر بے ہمتا بننے کے بعد لکھنؤ میں گئے"۔

صفیر بلگرامی کی رائے بھی سن لیجیے۔ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں ۔

"نثر میں لکھنؤ نے بہت کم محنت کی، سرور کے بعد کوئی ایسی تحریر نظر میں نہیں آتی جس کی مثال دی جائے، ہاں قبل غدر ایک رسالہ حدیقۂ شہدا مولوی امیر علی شہید کے واقعے کا بطور نمونہ فسانۂ عجائب لکھا گیا، اور ایک لوتن ہجو رسنے لکھا"

فسانۂ عجائب کا قبول عام اس سے ظاہر ہے کہ بہت مدت تک تالیف و تصنیف میں وہی طرز انشا اختیار کی جاتی رہی، اور جس طرح آبرو و مضمون آرزو و مظہر وغیرہ نے دہلی پہنچ کر زبان کو زبان اور شعر کو شعر کے درجے پر پہنچا دیا، اسی طرح سرور نے آگرے سے کانپور پہونچ کر فسانۂ عجائب لکھی، اور اس کے ذریعے سے لکھنوی زبان کی اساس قائم کر دی ۔

جاٹوں کی ترکتاز نے آگرے کی جو خانہ ویرانی کی وہ تاریخوں سے ظاہر ہے، اور اس کے بعد علمی و ادبی مشاغل کا پتا آگرے میں ڈھونڈھنا فضول ہے، متاخرین کے زمانے میں آگرے کی مجلس علم و ہنر قطعاً برہم ہو گئی تھی، لیکن صدر نظامت کے باعث ایک اُجڑی اجڑائی محفل ضرور رہتی، جب ہائیکورٹ بھی آگرے سے الہ آباد کو منتقل ہو گیا تو عدم سرپرستی و ناقدر دانی نے آگرے کی مخلوق کو ہر قسم کے علمی و ادبی مشغلے سے بے پروا کر دیا۔ لیکن اس ہمت شکن و حوصلہ فرسا زمانے میں بھی آگرے میں شعر و سخن اور علم و فن کی پرسش موقوف نہ ہوئی، اس عہد کے بعض بزرگوں کے نام یہ ہیں، جن کو زمانے نے اُبھرنے کا موقع نہ دیا۔

مولوی احمد علی خاں شوقی	صاحب مینا بازار
مولوی جمیل الدین ہجر	صاحب آرسی مصحف
مولوی نثار علی بیگ	مصنف قواعد فارسی و اُردو وسفرنامہ حجاز و یورپ
مرزا خادم حسین رئیس	صاحب دیوان
ماسٹر یوسف حسین واصف	صاحب دیوان
مولوی محسن اللہ خاں ثاقب	صاحب قند پارسی
کالے خاں سخی وغیرہ	

رئیس، واصف اور نثار اپنے وقت کے اساتذہ میں سے تھے، قلت وقت ہمیں ان کے کلام پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی باز رکھتی ہے، لیکن ان کا مرتبۂ شاعری اس سے ثابت ہے کہ مولوی نجم الغنی رامپوری جو متعدد کتابوں کے مصنف اور مشہور بزرگ ہیں، اپنی تصنیف بحر الفصاحت میں ان بزرگوں کو داغ سے بہتر شاعر مانتے ہیں، ان کی یہ تصنیف فن عروض پر ہے، اس کتاب میں انھوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رعایت لفظی جو کسی زمانے میں اُردو شعر اور اس طرح لکھنؤ اسکول کا طرۂ امتیاز تھا، اور جو امانت و ناسخ کے عہد میں بد مذاقی کی حد کو جا پہنچی، در اصل شعرائے اکبر آبادی ہی کی ایجاد و اختراع تھی، اس کی تائید میں صاحب تصنیف نے اکبر آبادی اساتذہ کے کلام کی مثالیں بھی پیش کی ہیں، جن کی اس زمانے کے دہلوی شعرا تقلید کرتے تھے۔

فن صحافت کے ذریعے سے زبان کی جو خدمت ہو سکتی ہے، اس میں بھی اہل آگرہ بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، ہم صرف میر اکبر علی فیروز آبادی ایڈیٹر ادیب اور خواجہ یوسف علی اکبر آبادی کے نام پیش کریں گے، ادیب اردو کے اولین رسالوں میں سے ہے، جس کے مضمون نگاروں میں مولوی چراغ علی اور مولوی ذکاء اللہ کے نام نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے کے بزرگوں میں مولوی عبد الرزاق صاحب البرامکہ و نظام الملک طوسی، مرزا عرفان علی بیگ مصنف الخاتون، مولوی سعید احمد مصنف مرقع اکبر آباد، اُمرائے ہنود و بوستان اخبار کے نام ہیں۔

عہد حاضر میں جو آگرے کا تاریک ترین دور ہے شاہ نظام الدین دلگیر مرحوم ایڈیٹر نقاد کی خدمات ادب مخفی نہیں۔ مولانا سیماب اکبر آبادی کی قدرت و کمال شاعری سے کون واقف نہیں؟ حضرت عاشق حسین بزم اکبر آبادی اس وقت محاورات زبان کے ماہر اور مرثیہ گوئی میں اعلیٰ مرتبے کے مالک ہیں۔ مرزا انجم آفندی کے قصیدے اس زمانے میں اُن کو برترین منصب کا سزاوار بناتے ہیں۔ مفتی انتظام اللہ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مؤلف و مصنف وسیع المطالعہ بزرگ ہیں۔ محمد محمود مخمور اکبر آبادی کی ادبیت مسلم ہے، اور خادم علی خاں احقر اکبر آبادی، شوخ اکبر آبادی، رعنا اکبر آبادی و حضرت محمد علی شاہ مسکین کہنہ مشق و مخصوص شعرا میں سے ہیں۔

ضرورتِ اختصار نے اس مضمون کو نہایت تشنہ رکھا ہے، لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو مکمل صورت دے کر اسے ایک کتاب کی شکل میں پیش کیا جائیگا، مگر جن حضرات کو تحقیق و جستجو کا ذوق ہے، اِن الثلاث کی مدد سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے تک بآسانی پہنچ سکیں گے کہ اگر یہ کے ارباب فن نے اُردو زبان کی نہایت قابل قدر خدمت کی ہے، اور اس کا اعتراف نہ کیا جانا سخت نا انصافی ہے۔

شرابِ پرتگالی

گھٹائیں وہ اُٹھیں قبلے سے کالی
اُمورِ شرع کا اللہ والی

خطا کیا ہے، اگر میں جام بھر کر
غمِ دُنیا سے دل کرتا ہوں خالی

بہار آئی ہے اُٹھ لے بادہ کش اُٹھ
برغمِ توبہ فرمایانِ عالی

شرابِ تلخ میں، آ، غرق کر دیں
خطیبِ شہر کی شیریں مقالی

دو عالم کی جوانی پر ہے بھاری
مئے انگور کی پیرانہ سالی

نہ جانے کون تھا وہ مومنِ پاک
یہاں جس نے بنائے کفر ڈالی

خدارا پھینک دے تشریفِ ناموس
بوضعِ عاشقانِ لااُبالی

ترے اشعار کے شیشوں سے اے جوشؔ
چھلکتی ہے شرابِ پرتگالی

جوشؔ ملیح آبادی

وہ انگریز جنھوں نے اُردو کی خدمت کی

سید رضا قاسم مختار جیلا

ستمبر ۱۹۶۰ء کے کلیم میں صفحہ ۲۱۷ پر محترمی مسٹر آصف علی ایم اے کا ایک مضمون بعنوان بالا نظر سے گزرا جس میں فاضل مقالہ نگار نے محض چند یورپین ادیبوں کا ذکر کیا ہے، موضوع کے اعتبار سے موصوف کا وہ مضمون بالکل ہی تشنہ رہ گیا ہے، چنانچہ ناچیز اردو زبان کے دیگر یورپین شعراء اور ناثرین کے حالات بیان کر کے ایک گونہ اس مضمون کو مکمل کر دینا چاہتا ہے۔ راقم آثم - رضا قاسم

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

ہمارے برادران وطن کے زعم ناقص میں" اردو زبان مسلمانوں کی زبان ہے مسلمان بادشاہ اس کو دوسرے ملک سے اپنے ساتھ لائے، ان کا مذہبی صحیفہ یعنی قرآن کریم اسی زبان میں لکھا جاتا ہے اور محض مسلمانوں کی کوشش سے ہندوستان میں اس زبان کی ترویج ہوئی" ان کے یہ خیالات محض تعصب اور کوتاہ بینی پر مبنی ہیں، اور وہ ملک میں اس قسم کی غلط فہمی پھیلا کر اردو زبان کو اس سرزمین سے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے ہیں ع

نیست یارائے سخن ورنہ سخن بسیار است

بُرا ہو تعصب کا، خدا نہ کرے کوئی اس کا بندہ بنے، یہ ناپاک جذبہ جس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے، اُس کی عقل و دانش یک قلم مفقود ہو جاتی ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے جس کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ مسلمانوں پر اس قسم کا الزام تو اُس وقت صحیح ہوتا جبکہ وہ اپنے شاہانہ اقتدار اور حاکمانہ طاقت سے کام لے کر عربی زبان کو اس ملک کی کاروبار کی زبان قرار دیدیتے۔ اردو زبان تو درحقیقت اسی ملک کی پیداوار ہے، اور ہندوستان کی مختلف قوموں نے اس کی ترقی و ترویج میں مساویانہ حصہ لیا ہے، اور مسلمانوں نے بھی کاروباری لحاظ سے اس میں سہولت محسوس کی، اس لئے ہندوستان کی اس زبان کو سیکھ لیا، اور اس طرح زبان اردو رعایا اور راعی دونوں کی چہیتی زبان بن گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ فارسی، ترکی اور ہندی اختلاط اور صدیوں کے میل ملاپ سے بھاشا نے کیچلی اُتار کر جو صورت اختیار کی اسی کا نام اُردو ہے۔ چمن اردو مختلف قسم کے گل بوٹوں سے مزین ہے، یاسمن اور حنا کی ٹہنیوں کے ساتھ ساتھ صرف چمپا اور چنبیلی ہی کے تختے نہیں بلکہ نائی کرٹن بھی لگے ہوئے ہیں، یہ ایک ایسا چمن ہے جو ہرگز کسی ایک باغبان کا آراستہ کیا ہوا نہیں ہے، اور نہ کسی ایک قوم کی ملک ہے بلکہ اس کی بالیدگی اور افزائش حسن میں ہندو مسلمان اور یورپین سبھوں نے اس کی گوناگوں رنگینیوں سے متاثر ہو کر نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ کوششیں کی ہیں۔ اس کی داستان صدر درجہ جاذب توجہ اور مختلف قوموں کے اتحاد و اتفاق کی دلچسپ کہانی ہے،

کچھ دنوں قبل تک اتحاد و اتفاق کا یہ عالم تھا کہ ہندو مسلمان اور یورپین سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، مشاعروں کی کثرت تھی اور شعر و سخن کا شغلہ رہتا تھا، غرضکہ ہر جگہ یہی باتیں تھیں، ہر سر میں یہی سودا تھا، بچہ بچہ اس کا دلدادہ و شیدائی تھا اور زبان اردو پال پوس کر بڑھائی جا رہی تھی، اور کل قومیں اُس کو بنا سنوار رہی تھیں مگر افسوس آج ہمارے بعض نا عاقبت اندیش وطنی بھائی اُسی چمن کو جو کہ اُن کے ہی پیشروؤں کی محنت کے سبب اتنا سرسبز و شاداب نظر آ رہا ہے مسلمانوں کی مذہبی شے قرار دے کر اس کے ویران کرنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

دہلی کی سلطنت مٹنے پر جب ہندوستان کی سلطنت بدلی اور انگریزی حکومت کا دور دورہ ہوا تو بقول نواب نصیر حسین خیال مرحوم کسے معلوم تھا کہ اردو پھر بھی یوں راج رچے گی۔ سرکاری حکم اور خرچ سے فورٹ ولیم کلکتہ میں اردو کالج قائم ہوا، اور ڈاکٹر جون گلکرائسٹ کی نگرانی میں اس کا سکہ چلنے لگا، صرف یہی نہیں بلکہ اردو زبان کی وسعت و ہمہ گیری پر نظر کر کے اُسے سلطنت کی زبان بنانے کی فکر ہونے لگی، اور ۱۸۳۷ء میں جب فارسی زبان دفاتر سے متروک ہو گئی تو اس کی جگہ اردو ہی کو منتخب کیا گیا، حکومت کی نظر میں کل دیسی زبانوں میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان اس قابل نہیں سمجھی گئی کہ وہ دفاتر کی زبان بن سکے۔ صدر عدالت دیوانی سے حکم نافذ کیا گیا کہ اس کی کل ماتحت عدالتوں میں اردو کو رواج دیا جائے، اردو تصانیف پر حکومت کی طرف سے انعامات مقرر کئے گئے اور مدارس میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دی گئی، چنانچہ ہندو مسلمان اور یورپین سبھوں کی متفقہ مساعی جمیلہ کے باعث اردو زبان سارے ملک میں رائج ہو گئی۔

یورپ سے جو لوگ سب سے پہلے اس ملک میں آئے وہ پرتگالی تھے۔ انکی حکومت بہت قلیل مدت کے لئے اس ملک میں رہی پھر اُس کا خاتمہ ہو گیا، لیکن اردو زبان نے پرتگالی اثر قبول کر لیا، یہاں تک کہ متعدد پرتگالی الفاظ مثلاً الماری۔ گملا، آلپن، تولیا، تمباکو، بوتام، بوتل، کمرا وغیرہ اس زبان میں داخل ہو گئے، نیز فرانسیسی اور ڈچ زبانوں کا بھی اردو زبان پر اثر پڑا، ان قوموں کے بعد انگریز اس ملک میں آئے، دیسی باشندوں سے میل ملاپ کے باعث یورپین حضرات کو بھی اردو زبان سیکھنے کی ضرورت پڑی، زبان کی تحصیل کے بعد وہ اس کی شیرینی و لطافت اور ہمہ گیری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اُن کو اس زبان میں کتابیں لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا، چنانچہ سب سے پہلا یورپین جس نے اردو زبان کے صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی وہ جان جاشوا کٹلر تھا، یہ ڈچ قوم کا تھا اور اپنی حکومت کی طرف سے شاہ عالم اور جہاندار شاہ، شاہان دہلی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا، اس کی اس کتاب کا سنہ تالیف ۱۷۱۵ عیسوی ہے، (جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا) اس کے بعد ۱۷۷۲ء میں مسٹر ہیڈلے نے اردو زبان کے صرف و نحو کی ایک کتاب شائع کی۔

کٹلر صاحب کی متذکرہ کتاب کی اشاعت کے ایک سال بعد یعنی ۱۷۴۴ء میں فادر شلیزے نامی ایک پادری کی اردو صرف و نحو کی ایک کتاب شائع ہوئی۔

مسٹر فرگوسن نے ۱۷۷۳ء میں اردو زبان کی ایک لغت لکھی، اس کے بعد ۱۷۸۷ء سے اردو زبان کے بہت بڑے محسن ڈاکٹر جون گلکرائسٹ کے تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا، ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان پر متعدد قابل قدر کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) انگریزی ہندوستانی لغت مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۰ء لغات ۱۷۹۶ء

(۲) مشرقی زبان بشمول انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت (جس میں ہندوستانی زبان کے ابتدائی مسائل بیان کئے گئے ہیں) مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء

(۳) قصص مشرقی (یعنی قدیم حکایتوں اور قصوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں) مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء

(۴) مذکورہ بالا کتاب کا خلاصہ بعض اضافوں کے ساتھ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۲ء

(۵) رہنمائے زبان اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۴ء

(۶) ہندوستانی انگریزی فرہنگ، یہ کتاب اڈنبرا میں ۱۸۱۰ء میں شائع ہوئی۔

(۷) مکالمہ انگریزی ہندوستانی مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

اس کے بعد جان شکسپیر نے ایک ہندوستانی لغت لکھی جو ۱۸۱۷ء میں چھپی، بعدہٗ مسٹر ڈنکن فاربس کی ہندوستانی لغت ۱۸۴۸ء میں بمقام لندن طبع ہوئی، جان ولیم میلی (علم طبعیات اور کیمیا کا ماہر) آگرہ کالج میں پروفیسر تھا اس نے (مع نقشہ جات) آلات طبعی کے استعمال کے متعلق ۱۸۵۰ء میں اردو زبان میں ایک کتاب لکھی تھی جو آگرے کے مطبع مصور میں ۱۸۵۲ء میں طبع ہوئی۔ جان پارکس لیڈلے (جو آگرہ میں سرکاری مترجم تھا) اردو زبان سے نہایت دلچسپی رکھتا تھا، اور اردو کا ایک مطبع بھی قائم کر رکھا تھا۔ اُس نے علم الاقتصاد پر انگریزی سے ترجمہ کر کے اردو زبان میں ایک کتاب موسومہ "دستور المعاش" تالیف کی تھی جس کو اپنے ہی مطبع میں ۱۸۵۲ء میں طبع کرایا تھا، مسٹر برٹرینڈ نامی ایک فرانسیسی نے بھی اردو زبان کی ایک لغت لکھی تھی جو ۱۸۵۸ء میں پیرس میں چھپی تھی۔

مسٹر جانس کی لکھی ہوئی ایک اردو انگریزی لغت ۱۸۴۶ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فیلن ایک زبردست محقق اور جید فاضل تھا، ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اُس سے اچھی طرح واقف ہے، اُس نے یوں تو کئی لغات لکھے مگر اس کی دو لغتیں اُردو سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو بہت مشہور ہیں۔ ان تصانیف میں اس نے جس قدر محنت، جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے وہ اُسی کا حصہ تھا، یہ دونوں لغتیں نہایت مستند مانی جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اُن سے بہتر ڈکشنریاں آجتک تصنیف نہیں ہوئیں، ڈاکٹر موصوف ایک مدت دراز تک دہلی، آگرہ، الہ آباد، متھرا اور دوسرے بڑے شہروں میں رہا۔ وہ جہاں بھی رہا گلی کوچوں میں پھرا، دیہاتوں میں گیا، بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے ملا، اور اُن سے لفظوں کی تحقیق کے متعلق گفت وشنید کرتا رہا۔ ہر ایک لفظ کو تولا، پرکھا، اُس کے معنی کے متعلق تحقیق کر لینے کے بعد اپنی لغت میں درج کیا، اُس نے اپنی اس تصنیف کے دیباچے میں اردو زبان پر محققانہ بحث کی ہے نیز بعض ہندوستانی شعراء کا ذکر کیا ہے، اُس کی نظر انتخاب کبیر داس اور نظیر اکبرآبادی پر خصوصیت کے ساتھ پڑی ہے، نظیر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس کے کلام کی خوبیوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے، اور جو اعتراضات نظیر پر کئے گئے ہیں اُن کا نہایت مدلل جواب دیا ہے۔

گارسن دتاسی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے، وہ فرانسیسی تھا اور گو وہ ہندوستان کی کئی زبانیں جانتا تھا لیکن اردو زبان میں اس قدر کمال حاصل کر لیا تھا کہ اس زبان کا محقق مانا جاتا تھا، اور پیرس یونیورسٹی میں اُردو کا پروفیسر مقرر ہوا تھا، وہ نہایت فخر کے ساتھ اردو میں خط وکتابت کرتا تھا، چنانچہ اُس کے اردو خط کے نمونے ابتک پیرس کے کتب خانۂ ملی میں محفوظ ہیں، پروفیسر موصوف نے بہت سی اردو کتابوں کے ترجمے فرانسیسی زبان میں شائع کر کے اپنے ملک اور قوم کو اردو تصانیف سے روشناس کیا ہے، غرضکہ پروفیسر موصوف کو اُردو زبان سے سچا عشق تھا، اور باوجود اس کے کہ وہ ہندوستان سے ہزاروں میل پر تھا، مگر پھر بھی اُردو زبان سے صرف درس تدریس ہی تک دلچسپی نہ لیتا تھا، بلکہ اس زبان میں تصنیف وتالیف بھی کرتا تھا، اُس کی تصنیفات وتالیفات کی فہرست بہت طویل ہے، جن میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں،

(۱) انتخاب کلام میر معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۲۶ء (۲) اردو زبان کا ابتدائی رسالہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۳ء (۳) مسلمانانِ مشرق کا علم عروض مطبوعہ پیرس ۱۸۳۲ء (۴) انتخاب از گل بکاؤلی معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۵ء (۵) انتخاب کلام ولی معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۴ء (۶) ذکر تذکرہ جات شعراء ومصنفین اردو مطبوعہ پیرس ۱۸۵۴ء (۷) ایک ہندوستانی ڈرامے کا انتخاب مطبوعہ پیرس ۱۸۵۸ء (۸) مؤلفین ومصنفین اردو کے حالات اور اُن کی تصانیف کا ذکر مطبوعہ پیرس ۱۸۶۸ء

یہ تو اردو نثر کا حال تھا، لگے ہاتھوں اب ذرا شاعری پر جو اردو زبان کی مایۂ ناز کائنات ہے نظر ڈالئے تو ایسے وقت میں جبکہ یہ زبان آجکل کی سی ترقی یافتہ اور پاکیزہ اردو نہ تھی، تاہم اپنی شیریں بیانی، دلکشی اور نرم گفتاری کی بدولت نہ صرف دیسی باشندوں بلکہ سات سمندر پار کے بسنے والوں کو اپنا مداح بنالیا، اور دیسی باشندوں کے ساتھ مخلصانہ تعلقات نے اس قدر یکجہتی اور اتحاد پیدا کردیا کہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہی اکثر یورپین حضرات نے اردو زبان میں اشعار کہنے شروع کر دئے تھے، جن میں سے بعض شعرا کے مختصر حالات معہ نمونۂ کلام درج ذیل کئے جاتے ہیں، یقین ہے کہ ناظرین کرام اُردو زبان کے ان مغربی شعراء کے کلام کی پاکیزگی، زبان کی صفائی اور الفاظ کی بندش ملاحظہ فرما کر نہ صرف محظوظ ہوں گے، بلکہ اُس کو اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت، جاذبیت اور قدردانی پر محمول کر کے اپنی پوری توجہ اور متفقہ قوت کے ساتھ اس زبان کی نگہداشت کریں گے، اور بادِ مخالف کے زہریلے جھونکوں سے بچا کر اپنے اسلاف کی یادگار کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے اس کی ترویج وترقی کی سعیٔ بلیغ کریں گے، اور اس طرح سچے اخلاف ہونے کا عملی ثبوت پیش کریں گے ؎

شہیدانِ تیغِ سخن کیسے کیسے　　زمینِ سخن پر پڑے سو رہے ہیں　　سیفؔ بلگرامی

(۱) **شائق** تخلص، اصل نام جان فانٹم، یہ فرانسیسی تھا اور ہندوستان میں مختلف فوجی عہدوں پر مامور رہا، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اچھی قابلیت رکھتا تھا، ۱۸۲۲ء میں بمقام بھرت پور انتقال کیا، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

کیا کیا جفائیں ہم نے سہیں تیرے واسطے　　جورِ رقیب ومنتِ دربان وطنزِ غیر

(۲) **مفتوں** تخلص، اصل نام آگسٹن ڈی سلوا، پرتگالی تھا، اور آگرے میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ مرزا عنایت علی ماہ کا شاگرد تھا۔ کلام ملاحظہ ہو ؎

نکالوں کس طرح پہلو سے ٹکڑا اس کے پیکاں کا
کہ مدت میں گزر دل میں ہوا ہے آج مہماں کا

(۳) **واکر** تخلص، پورا نام جان واکر، انگریز تھا، اور کلکتہ میں کسی عالی عہدے

پھائز تھا، اُردو سے نہایت اُنس رکھتا تھا اور لب و لہجہ بھی نہایت صاف اور درست تھا، نمونۂ کلام یہ ہے ؎

اوطالبِ دنیا تجھے عبرت نہیں آئی کھائی دہنِ خاک نے فغفور کی ہڈی
گر راست ہو قسمت ہو کبھی باعثِ دولت مشہور ہے کج پاؤں میں تیمور کی ہڈی

(۴) صبا تخلص، نام جو ہانس۔ اُردو ادب سے کافی دلچسپی رکھتا تھا اور شاعری میں اچھا دخل تھا، میرزا زیر علی صبا کا شاگرد تھا، بطور نمونہ ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا مجھکو پہناتے ہو زنجیر یہ زنجیر عبث

(۵) فلاطون تخلص، اصل نام جمیز جونسٹن۔ حیدرآباد دکن میں ملازم تھا، پیشہ ڈاکٹر تھا، اردو اور فارسی دونوں میں اشعار کہتا تھا، مرزا ابھدی حسن حنا کا شاگرد تھا، نمونہ کلام حسبِ ذیل ہے ؎

کیوں خزاں میں سر پٹک کر مر نہ جائے عندلیب ہے بقائے گل سے وابستہ بقائے عندلیب

(۶) آزاد تخلص، اصل نام الگزنڈر ہیڈلی۔ اُردو زبان سے خاص شغف تھا اور اگرچہ ریاست الور میں بعہدہ کپتان ملازم تھا، لیکن پھر بھی شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رکھتا تھا، ۱۸۷۸ء میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ابرو نہ ہو تو تیغِ ستم ریز کھینچیے مژگاں نہ ہو تو خنجرِ بُراں نکالئے

(۷) اسفان تخلص، پورا نام جارج اشمن۔ قیام زیادہ تر دہلی میں رہا، منشی خوب چند ذکا نے اپنے خاص دوستوں میں لکھا ہے، اردو شاعری سے نہایت دلچسپی تھی، اور ہمیشہ شعرا کی صحبت میں نشست رہا کرتی تھی، نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

خط کا یہ جواب آیا، لکھا جو کبھی پھر خط کر ڈالوں گا اک دم میں ترے آن کے پرزے

(۸) فراسو تخلص، پورا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اردو ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ اور بہ سلسلۂ ملازمت مستقل قیام دہلی میں رہا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گلستاں میں رہ کر گلوں سے دلچسپی نہ ہوتی، چنانچہ دہلی ہی میں شاعری کا شوق پیدا ہوا، اور خیراتی خاں دلسوز کی شاگردی اختیار کی، نمونتہً ایک شعر درج ذیل کیا جاتا ہے، جس میں مسٹر فراسو نے اپنے محبوب کے قد کی تعریف کی ہے، ملاحظہ ہو ؎

قمری کے مانند وہ پہنے محبت کا طوق باغ میں گر قد تیرا سرو کو دکھلائیے

(۹) شور تخلص۔ پورا نام جارج برلس شور، اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اچھی مہارت تھی۔ علی گڑھ میں قیام تھا، صاحبِ دیوان تھا، دو دیوان [illegible]ء میں میرٹھ کے مطبع ممتاز المطابع میں طبع ہوئے تھے، مگر اب نایاب ہیں، منشی کریم الدین پانی پتی اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں لکھتے ہیں کہ میرے مکان پر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور ان مشاعروں میں پڑھنے کے لئے شور اپنی غزلیں اکثر بھیجا کرتے تھے، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

دیر و حرم میں نے نہیں ترجیح زاہدا سر جس طرف جھکا یا وہی سجدہ گاہ تھی

(۱۰) طوماس تخلص، پورا نام جان ٹوس، انگریز تھا، دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اور اُسی شہر کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا، نصیر دہلوی جیسے ماہرِ فن سے شرفِ تلمذ تھا، بطور نمونہ ایک شعر درج ذیل کیا جاتا ہے ؎

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار زار زار

(۱۱) جمیت تخلص، پورا نام معلوم نہ ہو سکا، میجر آرچین کی بیوی تھی، اور اپنے شوہر کے ساتھ آگرے میں قیام پذیر تھی، اردو خوب جانتی تھی اور کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیا کرتی تھی، نمونۂ کلام یہ ہے ؎

روٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے اس واسطے رہتی ہوں میں مضطر کئی دن سے

(۱۲) لارڈ مین ماؤتھ تخلص معلوم نہ ہو سکا، اُردو کا بہت بڑا مداح تھا اور اس زبان کی ہمیشہ تعریف کرتا تھا، شاعری کا از حد شوق تھا، مگر مذہبی تعصبات کا جذبہ بہت غالب تھا، جس کا شائبہ کلام میں بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ ایک مصرعہ ملاحظہ ہو،

دینِ اسلام گھٹے دینِ مسیحا بڑھ جائے

جس کا کسی منچلے شاعر نے مصرعۂ ثانی میں یوں جواب دیا ہے ع

گر براقِ نبوی سے خرِ عیسیٰ بڑھ جائے

(۱۳) صاحب تخلص، اصل نام الوسس رین ہارڈٹ، فرانسیسی جنرل سمرو کا فرزند تھا، اُس کی شاعری کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ دہلی میں اُس کے مکان پر اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے، اور شہر کے ممتاز و مشہور شعرا اُن مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے، خیراتی خاں دلسوز کا شاگرد تھا، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہے زلف حلقہ زن خطِ دلبر کے آس پاس یا اژدہا ہے فوجِ سکندر کے آس پاس

(۱۴) عبری تخلص، پورا نام آئزک عبری، مذہباً یہودی تھا، کلکتہ آکر بس گیا تھا، اُردو زبان سے بڑی محبت تھی، ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اشک مے، شیشہ جگر، چشم میخانہ بنے دیکھئے اب ہمہ تن غیرتِ میخانہ ہوا

(۱۵) صاحب تخلص، اصل نام جارج فانٹوم۔ اس کا باپ برنارڈ فانٹوم نواب نظام الملک والئ دکن کی سرکار میں فوجی کپتان تھا، اور خود اس کا تعلق ریاست رامپور سے تھا، شعر و سخن میں میر نجف علی شفقت سے مشورہ لیتا تھا، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا اور اچھا کہتا تھا، صاحب کے علاوہ کبھی جرجیس بھی تخلص کرتا تھا، نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

یہ آرزو ہے تیرے آنے کی مجھے اے شوخ کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

(۱۶) ملکہ تخلص، نام مس آئمین شلیر، شلیر صاحب پولیس کپتان متعینہ شہر کلکتہ کی بیٹی تھی، اردو زبان کی زبردست مداح اور اس کی شیرینیت کی دلدادہ تھی، کبھی کبھی اشعار بھی کہہ لیا کرتی تھی، مولف سخن الشعراء منشی عبدالغفور نساخ سے اصلاح لیا کرتی تھی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

ہوگئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام میں نے نالہ جو کسی رات سر شام کیا

(۱۷) شاکر تخلص، اصل نام ڈانیال گارڈنر، ضلع ایٹہ میں مقیم تھا، اس کا باپ وہیں سرکار انگریزی میں کسی معزز عہدے پر مامور تھا، پہلے جوزف بنسلے متخلص بہ فنا کی شاگردی اختیار کی تھی، مگر بعد کو مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی سے مشورۂ سخن کرنے لگا تھا، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

پہنچا ہے بعد مرگ فلک پر مرا غبار رتبہ بلند خلق میں ہے خاکسار کا

(۱۸) ایرن تخلص، پورا نام ایرن جیکوب، گورکھپور میں سکونت پذیر تھا، حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم سے شرف تلمذ تھا، نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

یہ کیا چپکے چپکے شکایت ہے اے دل خبردار کس کا گلہ ہو رہا ہے

(۱۹) خفی تخلص، مسٹر بلیک کی بیٹی تھی، اردو سے خاص دلچسپی رکھتی تھی، اور کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیا کرتی تھی، اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

اے خفی اپنے اشک بے تاثیر مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

(۲۰) اسیر تخلص، اصل نام جون بلیتھرز، اردو کا اچھا شاعر تھا، جنرل سومبر کے بیٹے متخلص بہ صاحب (مندرجہ مضمون ہذا ۱۵) کے خاص دوستوں میں تھا، اور شاہ نصیر دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھا، بطور نمونہ ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

شمع فانوس میں در پردہ جلی ہے دیکھو شعلۂ آہ نکالے ہے جگر سے باہر

یہاں تک تو ان یوروپین حضرات کا تذکرہ تھا جنھوں نے اردو زبان کی خدمت بذریعۂ تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کی ہے، اب چند ایسے یوروپین حضرات کا بھی ذکر کر دینا ہرگز بیجا نہ ہوگا جنھوں نے اس زبان میں شاعری یا تصنیف و تالیف تو نہیں کی، تاہم اردو زبان سے بیحد دلچسپی رکھتے تھے، اردو اچھی طرح لکھ پڑھ لیا کرتے تھے اور فصیح اردو میں گفتگو کر سکتے تھے۔

سر ولیم جونس ۱۷۸۳ء میں فورٹ کلکتہ میں جج ہو کر آئے تھے، آپ ہی "ایشیاٹک سوسائٹی" کے دراصل بانی ہیں، اٹھائیس زبانوں کے ماہر تھے، اردو میں بڑی اچھی استعداد تھی، ۱۷۹۴ء میں ہندوستان ہی میں انتقال کیا۔

ڈیوک آف کناٹ ملکہ وکٹوریا کے صاحبزادے، اردو نہایت خوب لکھتے اور نہایت روانی کے ساتھ بولتے تھے۔

فریڈرک پین کوٹ اردو محض جانتے ہی نہ تھے، بلکہ اس زبان میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔

لیڈی چیمسفورڈ اردو کی نہایت دلدادہ تھیں، چنانچہ ہندوستان آکر شملے کے ایک زنانے جلسے میں اردو ہی میں تقریر کی جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کو بھی ساٹھ سال کی عمر میں اردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور آگرے کے مولوی برکت اللہ مرحوم موصوفہ کو اردو پڑھانے کے لئے لندن بھیجے گئے۔ موصوفہ نے تھوڑے ہی عرصے میں اچھی طرح اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ چنانچہ اپنا ایک روزنامچہ بھی اردو ہی میں لکھا ہے ۱۸۸۹ء میں شاہ ایران کی سیاحت انگلستان کے موقع پر وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ

"آج کا دن بہت اچھا رہا، شاہ پرشیا معہ چند وزیروں کے آئے تھے، کھانا ہمراہ کھایا، سوا تین بجے لندن گئے۔"

یہ تھی کچھ دنوں قبل تک اردو زبان کی محبت کہ نہ صرف ہندوستانی قومیں بلکہ اہل مغرب بھی اس کے دلدادہ اور اس کی الفت میں سرشار تھے، ایسی حالت میں چاہئے تو یہ تھا کہ ملک کی ساری آبادی متفقہ طور پر ایسی روش اختیار کرتی کہ حکومت بھی عہد گزشتہ کی طرح اس وقت بھی اردو زبان کی ضرورت محسوس کرتی ؎

گر۱۔ ہرکس از دست غیر نالہ کند
سعدی از دست خویشتن فریاد

ہمارے بہت سے نا عاقبت اندیش اور مذاقِ سلیم سے بے بہرہ انگریزی زدہ حضرات کا یہ قول ہے کہ "بدُون حصول زبانِ انگریزی ہمارا کسی قسم کا کوئی کام ہی نہیں چل سکتا۔ اور چونکہ حکومت کو ہماری زبان سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس لئے حکومت کی توجہ اس کی طرف مبذول کرانے کی سعی کرنی نہایت ہی مضحکہ خیز ہے" جن حضرات کا یہ خیال ہے ان کو معلوم ہونا چاہئیے کہ حقیقت اس کے خلاف ہے اور اس بے بنیاد خیال کی لغویت ظاہر ہے، کیونکہ مطلب کی بات جب گونگے بہرے کر بھی سُن سکتے ہیں تو وہ حکومت جو تیس کروڑ نفوس پر حکومت کر رہی ہے کیوں نہ سُنے گی، اس کے ثبوت میں اگر چند سال قبل کے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ حکومت کی طرف سے جن ہندوستانیوں پر باغیانہ تحریر یا تقریر سے متعلق مقدمات چلائے گئے تھے ان میں اکثر و بیشتر اُردو ہی زبان سے متعلق تھیں، ناچیز کی اس دلیل کی صداقت میں اگر کسی کو شک ہو تو وہ عملی تجربہ کرکے دیکھ لے کہ حکومت اُس کی زبان سمجھتی ہے یا نہیں اور وہ جیل خانہ بھیجا جاتا ہے یا نہیں، یہ خیال کہ حکومت اگر سُنتی ہے تو صرف اپنی ہی زبان میں، اور اس بنا پر ہم کو اپنی ساری قوت انگریزی دانی پر صرف کرنی چاہئیے بالکل ہی لچر اور پوچ ہے، اور اس قسم کے خیالات محض ہماری غلامانہ ذہنیت پر مبنی ہیں، اسی مہمل اور لغو خیال کا نتیجہ ہے کہ بہت سے کوتاہ بین اور دشمن قوم اپنے بچوں کی تعلیم میں اردو علم ادب کی طرف چنداں توجہ نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے لاکھوں گریجویٹ چند سطریں صحیح اردو نہیں لکھ سکتے۔ ہماری اس غفلت کا لازمی نتیجہ ہماری زبان کی تباہی ہے اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جس قوم کی زبان مٹ جاتی ہے وہ قوم بھی یقیناً فنا ہو جاتی ہے۔

بہ حیرتم کہ سرانجام من چہ خواہد بود

ہماری بدبختی کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتا ہے کہ دوسری قوموں کے عملی اقدام کے برعکس اکثر اردو داں حضرات کا خیال ہے کہ "اردو زبان ابدیت حاصل کر چکی ہے اور ہرگز فنا نہیں ہو سکتی ہے، پھر اس کی ترویج و ترقی میں کسی قسم کا جد و جہد یا شور و شغب کرنا تحصیل حاصل ہے، تو جواباً گذارش ہے کہ سے

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے ۔۔۔ تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

ان حضرات کا یہ خیال تاریخ گزشتہ پر عدم اطلاع کا آئینہ دار ہے، تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ دنیا کی ہزاروں ترقی یافتہ زبانیں محض اہلِ زبان کی بے توجہی اور غفلت شعاری کی بدولت ایسی تباہ و برباد ہو گئیں کہ آج اگر ان کی تحریریں کہیں دستیاب ہوتی ہیں تو باوجود تلاش و جستجو کے ان کا جاننے والا کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

خدا ہی کو معلوم ہے کہ اردو کے ایسے سچے ہمدرد جو باوجود اُردو جاننے کے غیر کی زبان کو اپنے روزانہ کے کاروبار اور تقریباً کل ضروریاتِ زندگی میں استعمال کرنا قابلِ فخر سمجھتے ہیں یک بیک کونسی قوت جسیم اردو میں ودیعت فرما دینگے جس سے وہ دم توڑنے کی حالت میں بھی کثرتِ رواج اور غلبے کا مقابلہ کرسکے گی ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

حکومت تو حکومت تعجب تو یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی انگریزی کمپنیاں تجارت کرتی ہیں وہ کل اردو زبان کے عوض اپنی ہی زبان استعمال کرتی ہیں، کیا ستم ہے کہ تجارت تو کی جائے ہندوستان میں اور زبان استعمال کی جائے انگلستان کی۔ "وائٹ وے لیڈلا"، "ہال اینڈ انڈرسن"، "وسٹ اینڈ واچ کمپنی" وغیرہ کی ایک بھی فہرست اردو زبان میں موجود نہیں، ان کے کارندوں کو اس کی فکر نہیں ہے کہ خریدار انگریزی جانتا ہے یا نہیں۔ مگر اس میں ان کا زیادہ قصور نہیں، بلکہ یہ ہماری ہی غفلت اور بے پرواہی کا نتیجہ ہے،

اس لئے گذارش ہے کہ اگر وہ کل حضرات جن کی مادری زبان اردو ہے متفقہ طور پر عہد کرلیں کہ جب بھی کسی انگریزی دوکاندار یا ریلوے کمپنی سے خط و کتابت کریں گے تو اپنی مادری زبان کے سوا ہرگز دوسرے کی زبان استعمال نہیں کریں گے تو انگریز سوداگر ضرور یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ اردو جاننے والے اس ملک میں کثرت سے بستے ہیں تو پھر اُردو زبان میں یقینی طور پر کاروبار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے سے

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی ۔۔۔ جو بڑھ کر خود اٹھالے ہات میں مینا اسی کا ہے

ایسی حالت میں جبکہ اردو زبان کی بیخ کنی کی کوششیں کی جارہی ہیں بلا اختلاف مذہب و ملت ہر اردو داں کا فرض ہے کہ آپس کے اختلاف رائے کو خیرباد کہہ کر متفقہ طور پر اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لئے عملی جد و جہد کرے کیونکہ اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے اتحادِ عمل اور لگاتار کاوشوں کی از حد ضرورت ہے، بنگال کی سبق آموز مثال ہماری نظروں کے سامنے ہے، مگر افسوس ہماری انگریزی نوازی پر، جو ہمیں اپنی مادری زبان سے جس قدر بھی غفلت و بے اعتنائی برتنے پر مجبور نہ کرے کم ہے سے

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو می گویم ۔۔۔ تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

[redacted]

کون کہتا ہے کہ ہم کمزور ہیں؟



جاپان کی بہادر عورتیں

دست بکار، دل بهار



محب وطن جاپانی عورتین

او ملال

شہیدِ وطن ایک ایکٹ کا ڈرامہ

امین حزیں، بہاول پور

افرادِ ڈرامہ

رومیو	مفرور شدہ انقلاب پسند نوجوان سلطنت کا ملکی وارث
سرقیس	رومیو کی ماں
شارنین	رومیو کی بہن
برنیل	رومی افواج کا سپہ سالار
کپتان	اور سپاہی وغیرہ

پہلا سین

پہاڑی منظر ——— تاریک رات

ایک بلند پہاڑی کے اوپر ایک تنہا بوسیدہ مکان ہے جس میں سرقیس اور شارنین ایک چھوٹی سی پتھریلی انگیٹھی کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی ہیں۔ انگیٹھی میں آگ جل رہی ہے، ان کے بائیں جانب ایک پرانے صندوق پر مٹی کا ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے،

شارنین۔ (بیتابی سے) اماں! کیسی غضب کی سردی پڑ رہی ہے، سرد تیز ہوا کس طرح اس خاموشی کا سینہ چیر رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سردی کے دیوتا، دنیا پر اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ نازل ہو گئے ہیں....

(چند لمحات کی خاموشی کے بعد)

امّی! اگر بھائی اس سردی اور تاریکی میں آرہا ہو..........!

سرقیس (مصنوعی مسکراہٹ سے) نہیں بیٹی! وہ اتنا بیوقوف نہیں ہے.... بھلا اس سردی میں۔؟

شارنین۔ اماں! ممکن ہے!......... میرا خیال ہے کہ چراغ کھڑکی میں رکھدوں، تاکہ اس تاریکی میں روشنی اس کی رہنمائی کر سکے.....؟

چراغ کھڑکی میں رکھنا چاہتی ہے، کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی زور سے کھڑکی کی چوکھٹ پر لگتی ہے۔ شارنین دوڑ کر ماں سے لپٹ جاتی ہے۔

یکدم گولیوں کی بوچھاڑ سے کھڑکی نیچے گر جاتی ہے دور پہاڑی کی ڈھال سے اُترتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آرہی ہے۔ شارنین استفسارانہ نگاہوں سے ماں کو دیکھنے لگتی ہے۔

دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ سرقیس بیٹی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کرتی ہے، وہ سہمی ہوئی اُٹھتی ہے اور دروازے کی طرف جاتی اور اُسے کھولتی ہے۔ ایک طویل القامت نوجوان جو زرق برق فوجی لبادے میں

---

[1] مسز فرگسن کا "کیبل آف کلو" میں نے فروری ۳۲ء میں پڑھا تھا۔ اس سے جو تاثرات میرے دل پر ہوئے اُن سے مجبور ہو کر میں نے جنوری ۳۳ء میں "شہیدِ وطن" لکھا۔ ممکن ہے اس میں "کیبل آف کلو" کی کہیں کہیں جھلک نظر آئے۔ گر اسے اس کا چربہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ حزیں

ملبوس ہے، تیزی اور جوش سے اندر داخل ہوتا ہے،
شارنین خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹتی ہے۔ پھر آگے بڑھ کر تیزی
سے دروازہ بند کرنا ہی چاہتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر
اُسے اُٹھا لیتا ہے، اور اُسے اپنے گھوڑے کے آگے
ڈال کر مخالف سمت وادی میں غائب ہو جاتا ہے۔
شارنین امداد کے لئے چلّانے لگتی ہے۔

شارنین۔ ہائے ...... ہائے ...... بھائی! پیارے بھائی رومیو!
...... مجھے وحشی درند ......

آگے کچھ بولنا چاہتی ہے کہ سوار اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ
دیتا ہے۔

سوار۔ بیہودہ چھوکری! میرے زبردست ہاتھوں میں پھنس کر امداد کے
لئے چلّانا، اپنی روح کو ناحق پریشان کرنا ہے ......
بے سود اپنے دماغ کو اُلجھنوں میں نہ ڈال! ...... اب
تیری حیات اور موت کا میں واحد مالک ہوں۔

گھوڑا بدستور سرپٹ جا رہا ہے، جس کے ٹاپوں کی آواز
کہسار کی خاموش فضا میں ایک تلاطم برپا کر رہی ہے،
یکایک گولی چلنے کی آواز آتی ہے ...... سوار گر
پڑتا ہے اور لڑکی پتھریلی زمین پر آ رہتی ہے اور بیہوش
ہو جاتی ہے، چند لمحات کے بعد قریب کی جھاڑیوں
سے ایک نقاب پوش نمودار ہوتا ہے، اور اس لڑکی
کو لے کر مخالف سمت بھاگ جاتا ہے۔

دُوسرا سین

منظر ———— دوسری رات

جھونپڑے میں شارنین، سرقیس اور رومیو بیٹھے ہوئے ہیں
آگ بدستور جل رہی ہے۔

شارنین۔ بھائی جان! آپ نے گذشتہ رات مجھے خوب بچایا! ......
ورنہ میں ...... (سر جھکا لیتی ہے)
بھائی جان! آپ وہاں کیسے پہنچے؟

رومیو۔ اندھیری رات میں جب برف پورے زور سے پڑ رہی تھی ...
اور ہوا دیوانوں کی طرح سرگرداں چل رہی تھی ...... میں اکا
سڑک کی پتلی پگ ڈنڈی سے گھر کی طرف چلا آ رہا تھا ———

شارنین۔ (چلبلے پن سے بات کاٹ کر) دیکھو اماں! میں کہتی نہ تھی کہ بھائی
چلا آ رہا ہوگا۔ (مگر سرقیس بے اعتنائی سے سر ہلا کر پھر رومیو کی طرف
متوجہ ہو جاتی ہے) کیونکہ میری تلاش میں بہت جاسوس گشت
لگا رہے تھے، اور میں اُن سے بچ کر اپنے گھوڑے کو آہستہ
آہستہ چلا رہا تھا ——— یکایک مجھے گھوڑے کی ٹاپوں
نے چونکا دیا، میں فوراً اپنے گھوڑے کو ایک درخت سے
باندھ کر ایک قریب کی جھاڑی میں چھپ گیا۔ اور رائفل سے
فائر کر دیئے ......

سرقیس۔ بیٹا! اب یہاں ہماری جانیں خطرہ سے خالی نہیں ......
بہتر ہے کہ ہم کسی اور جگہ کو اپنا مسکن بنائیں ......

رومیو۔ نہیں امی! مجھے صبح ہونے سے پیشتر یہاں سے دو سو میل کے
فاصلہ پر ہونا چاہیئے ...... اور مارسے کی بندرگاہ پر
مجھے اُن سے ملنا ہے ——— اگر میں نے وعدہ خلافی
کی، تو ان سب کو اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑے گا ...... جو
...... جو خطرہ سے خالی نہیں ...... پھر مسکن بدلنا
یا نہ بدلنا ہمارے اختیار سے باہر ہوگا۔

شارنین۔ پیارے بھائی! آزادی کی راہ ...... اتنی دشوار گزار اور
پُرخار جھاڑیوں سے وابستہ ہے ——— یہاں پتھر
کا کلیجا، کوہ فگن ہمت اور غیر فانی جرأت و استقلال کا
کام ہے ...... !

رومیو۔ (بات کاٹ کر) بھولی بہن! اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟
——— کیا میں ان مصیبتوں کے طوفان سے گھبرا کر اپنے عزم
غیر متزلزل کے جھنڈوں کو سرنگوں کر دوں؟ ——— آزادی
کی غیر فانی اور حسین زندگی کو غلامی کا مکروہ جامہ پہنا کر مسخ کر دوں
اپنے آزاد ضمیر کو دوسروں کا تابع فرمان کر دوں؟ ......
یہ مجھ سے کسی صورت نہیں ہو سکتا ......

شازمین:- پیارے .... دیکھو! تم میرے تنہا بھائی ہو .... اور ...... اب تک ہم نے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں ......

رومیو:- بھولی بہن! ایسی بے معنی گفتگو سے دماغ کو پریشان نہ کرو ....

سرقیس:- بیٹی خاموش رہو ....

(دیکایک دروازے پر دستک ہوتی ہے)

ایک آواز:- شاہِ روم زندہ باد!

دوسری آواز:- دروازہ کھولو!

رومیو بلا کسی خوف و تردد کے تمام وہ چیزیں جن سے اس کی موجودگی کا شبہ ہو سمیٹ کر دوسرے ایک تنگ و تاریک کمرے میں چھپ جاتا ہے، لڑکی دروازہ کھولنے کو جایا ہی چاہتی ہے کہ والدہ اُسے اشارے سے روک کر خود جاتی ہے اور دروازہ کھول دیتی ہے۔ ... ...

سالارِ اعظم کپتان اور چند سپاہی اندر داخل ہوتے ہیں۔

سالارِ اعظم برنیل:- (سرقیس کے سامنے ٹھہر کر اس پر قہر آلود نگاہیں ڈالتے ہوئے) بوڑھی کُٹنی! اس سے پیشتر تو نے ہمیں زبردست دھوکے دئے ہیں ———. ممکن تھا کہ ہماری زندگیاں ہی ان دھوکوں کی نذر ہو جاتیں! ....

کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کچھ سوچنے لگتا ہے، اور ٹہلنے کے ارادہ سے قدم بڑھانا چاہتا ہے، کہ ایک ٹین کا چمچہ اُس کے پاؤں سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتا ہے۔

برنیل:- (اسے اُٹھا کر مصاحبوں کو متوجہ کرتے ہوئے) دغاباز ...... عیار ...... رومیو! اب ہمارے ہاتھوں سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے؟ ... .. (کپتان سے) وہ یقیناً یہیں موجود ہے، اس نے کھانا کھایا ہے ----

کپتان:- (سپاہیوں سے) گھر کی تلاشی شروع کر دو ....

سرقیس:- (نفرت آمیز لہجہ میں) نشۂ اقتدار میں مست انسانو! کیوں اس قدر بدگمانی کرتے ہو۔ اس میں میں نے کھانا کھایا ہے .... آپ ناحق گھر کی تلاشی نہ لیں، میرے اور بیٹی کے سوا یہاں اور کوئی نہیں ....

برنیل:- بڑھیا! تو اُن کی نگاہوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہے جو بال کی کھال اُتارنے، آثار سے نتائج مرتب کرنے، لاینحل گتھیوں کو سلجھانے میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں، ہمیں کامل یقین ہے کہ اب کی دفعہ ہمارا مطلب حل ہو کر رہے گا۔

تھوڑی دیر بعد سپاہی رومیو کو رسیوں میں جکڑے ہوئے اندر سے برآمد ہوتے ہیں۔

برنیل۔ آہاہا! خوب!! چالاک بڑھیا! .... کیوں، یہ فریب! دغاباز عورت سُن! تُو نے ہمارے پنجے سے اپنے بیٹے، سلطنتِ روما کے غدار بیٹے کو بچانے کی بہت کوشش کی ..... مگر ہماری دوربین نگاہوں نے تیرے پردۂ راز کو تار تار کر کے حقیقت کی زبردست آندھیوں کی نذر کر دیا ہے۔ ہم نے تیرے فرسودہ خیالاتِ آزادی کے فلک بوس قلعوں کو ناکامی کی آتش سے جلا کر خاکستر کر دیا ہے .... تُو آج دیکھے گی کہ تیرا لختِ جگر تیرے سامنے ذبح کر ڈالا جائے گا:

شازمین:- نہیں نہیں! میرے پیارے بھائی کی قیمتی زندگی کسی قیمت پر بھی ضائع نہیں کی جا سکتی .... ظالمو! رحم کرو (نصف بے خودی کے عالم میں) میں اپنی دنیائے غربی و بیکسی کے غبار آلود آسمان پر صرف یہی ایک ستارہ رکھتی ہوں ...... جو میری قسمت کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جو اپنی مدہم روشنی سے میری تنہائی اور سوگوار راتوں کو راحت اور عشرت سے بدل دیا کرتا ہے ...... نہیں نہیں! میں اپنے بھائی کو ہرگز .... ہرگز جدا نہ ہونے دوں گی .... اس کے بغیر میری دنیائے تمنّا میں تاریکی کے ہیبت ناک طوفان چھا جائیں گے۔ (روتے ہوئے) ظالمو! تمہارے ظالم ہاتھ ہم پر کیوں زندگی تنگ کر رہے ہیں؟ تم نے ہمیں بستیوں سے دُور جنگلوں اور پہاڑوں کی ناقابلِ برداشت سردی اور طوفانوں میں رہنے پر مجبور کیا ہے، ..... تم نے ہمیں تمام دنیوی عیش و آرام سے محروم کر کے تنہائی اور بیکسی کے ذلت آمیز غار میں ڈھکیل دیا ہے .... آخر یہ سب کس لئے ہے؟ کیا اس لئے کہ میرا بھائی تخت کا حقیقی وارث ہے؟ کیا اس لئے

کہ ہماری آزاد گردنیں، ایک کمینہ خصلت، لالچی، خواہشوں کے غلام
اور جذبات کے فرمانبردار چچا کے آگے نہیں جھکنا چاہتیں؛ ظالمو!
خدا سے ڈرو...... ڈرو....... ڈرو اور دیوتاؤں کے
عذاب سے ڈرو! پیشتر اس کے تمہارے ظالم ہاتھ ٹوٹ جائیں
......تمہاری خونی آنکھیں پھوٹ جائیں......... آہ!
دیوتاؤں کے نام پر، میری عصمت کے نام پر معاف کر دو.....

برنیل :- (کپتان کی طرف شرارت آمیز ہنسی سے دیکھتے ہوئے) تمہارے
جذبات کی آواز انتہائی دردناک ہے........ میں واقعی اس سے
متاثر ہوا ہوں...... ہاں! تمہارے بھائی کو معافی مل سکتی
ہے...... مگر ایک شرط پر.......

برقیس۔ کیا ایک شرط پر میرے بچے کی رہائی؟

شارتین :- ایک شرط؟!

برنیل :- ہاں! ایک شرط.......

شارتین :- وہ کیا؟

برنیل :- وہ یہ کہ جو تمہارے بھائی سے پوچھا جائے، اس کا جواب بلا
کم و کاست صحیح صحیح دیا جائے.......

(سپاہی رومیو کو سالارِ اعظم کے سامنے لاتے ہیں)

برنیل :- دیکھو! رومیو!! تم کو اس مقام کا بخوبی علم ہے، جہاں تمہارے
ساتھی پناہ گزین ہیں...... وہ شاہی مجرم ہیں...... اس لئے
تمہیں اس جگہ کا پتہ دینا ہے، اور اپنی باغی جماعت کے متعلق واقفیت
ہمیں بہم پہنچانی ہے.......

(برنیل جواب کا منتظر رہتا ہے، رومیو خاموش رہتا ہے)

کپتان :- خاموش کیوں ہو؟ سالارِ اعظم کے سوال کا جواب دو!

رومیو۔ (بے اعتنائی سے) جواب؟ آہ! مجبور ہوں، میرے دل کے
خلاف میری زبان جنبش کرنا بھی گناہ سمجھتی ہے......!

برنیل :- دیکھو! اس ضد کو، جو عقل کے اندھے رہتا، اور جذبات کی
فرسودہ خصلت ہے...... چھوڑ دو...... اور اپنی زندگی
کو موت کی آہنی گرفت سے بچالو.......

رومیو۔ آہاہا! زندگی اور موت...... زندگی کی قیمت آزادی
سے اور موت کی عزت وطن پر قربانی سے ہے...... تمہارے
خیالات جو تمہاری روحوں کا فریب آمیز، مگر رنگین جامہ ہیں،
عزت کے بازار میں آزادی کا سودا نہیں جانتے...... آزادی
کے علمبردار موت کی دہشت کے سامنے اپنے سربلند علم نگوں نہیں
کیا کرتے........

برنیل۔ بیوقوف چھوکرے! ذی ہوش انسان زمانے کی تبدیلیوں کے
ساتھ اپنے ارادوں اور خیالات میں بھی تبدیلی کرتے چلے آئے ہیں،
(قدرے نرمی سے) بہتر ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری پر اپنی قیمتی زندگی
قربان نہ کرو.......

رومیو۔ لیکن میں اپنی ناتجربہ کاری کو آپ کی تجربہ کاری کا سیاہ جامہ
پہنانا نہیں چاہتا، اور اپنی "قیمتی زندگی" کی قربانی کے لئے اسی
"ناتجربہ کاری" کو ہی خوش آمدید کہتا ہوں........ میں اپنے
"ارادوں اور خیالات" میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا اپنے عقائد کے خلاف
جنگ، فطرت کے خلاف دشمنی، عزت کے لئے تباہی سمجھتا ہوں
...... آپ میرے سمجھانے کی بے سود کوشش نہ کریں....
ہم جن فرائض کی انجام دہی پر مامور کئے گئے ہیں انہیں کے اتمام
کے لئے ہماری زندگیاں ختم ہونی چاہئیں....... ہم دونوں
کی راہیں مختلف ہیں۔ آپ کی کامیابی ایک آزاد روح کو غلام
بنانا ہے، اور میری کامیابی اپنی اور اپنے وطن کی آزادی
کے لئے جان کی قربانی کرنا ہے۔

برنیل، کپتان کی طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتا
ہے۔ کپتان سپاہیوں سے اشارہ کرتا ہے، سپاہی
اس کو دوسرے کمرے میں لے جاتے ہیں۔ شارتین بھی
بیتابانہ اپنے بھائی کے ساتھ چلی جاتی ہے، اب سالار
برقیس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

برنیل۔ (نرم لہجے میں) دیکھو بڑی بی! تمہاری آرزوؤں کا روشن
انجام، شفقتِ مادری کا حسین راز۔ تمہاری بوڑھی ہڈیوں کا
سہارا رومیو اور صرف رومیو ہے....... بہتر ہے کہ اسے دنیا
کی رنگینیوں سے محروم نہ کرو، اور اپنی بوڑھی حیات کو چین سے

گزارو...... میرے مشورے سے فائدہ اُٹھاؤ اور اس ضدی
چھوکرے کو سمجھاؤ۔

سرقیس۔ میں آپ کے مشورے سے فائدہ اٹھانا، ایک لعنت آمیز گناہ کا
ارتکاب سمجھتی ہوں.......

برنیل۔ دیکھو! ہم نے بہت سی توقعات تم سے وابستہ کی ہیں۔

سرقیس۔ فضول توقعات سے دل و دماغ کو دھوکہ نہ دو......

برنیل۔ ہیں؟

سرقیس۔ ہاں!

برنیل۔ (دانت نکالتے ہوئے) بڑھیا پاگل ہو گئی ہے!

کپتان۔ آخر بڑھاپا ہے!........ آپ سمجھائیں، سمجھ جائے گی...

سرقیس۔ میری شامِ زندگی کا مذاق اُڑانے والے! اندھو!! اپنی عقل
کا جائزہ لو...... تمہاری قلمرو میں جن میں سچائی مردہ،
ناموس گُم، اور جذباتِ آزادی فنا ہو چکے ہیں۔ میرے بوڑھے
مگر آزاد دل کو دیکھ کر بھسم کیوں نہیں ہو جاتیں،......
جو مصائب کے طوفانوں کا، حوادث کی دوزخ کا، تمہارے
مظالم کے فریب آلودہ کارناموں کا ہنستے ہوئے مقابلہ کر سکتا
ہے...... موت؟...... آہ! تم میرے نوجوان...
آزاد نوجوان...... بیٹے کی موت کا سامان کر رہے ہو!
...... کیا تمہیں ہماری کس مپرسی اور بیکسی پر رحم نہیں آتا...
...... آہ! مظلوموں کی آہوں کے شعلے تمہیں خاکستر کر دیں گے
...... رحم کرو!...... رحم!.....

برنیل۔ (غصے اور بے چینی سے) زبان دراز! ذلیل!!...... تو
ہماری مہربانیوں سے غلط فائدہ اٹھا رہی ہے، تیری بیہودہ
باتیں، تیری مزید بکواس، ہمارے آہنی عزائم میں کسی قسم کی تبدیلی
کرنے سے قاصر ہے!...... ہمارے زبردست ہاتھوں میں پھنس کر
تمہارے لئے صرف دو ہی راستے ہیں...... موت یا حیات
...... اور بس!......

سرقیس۔ فرعونیت اور شوکت کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے انسان!
کچھ ہوش کی خبر لے...... موت شہیدانِ آزادی کے لئے ایک
ایسی ابدی زندگی اور راحت ہے جس کی تمہارا گمراہ دماغ کوئی
قیمت نہیں سمجھتا۔

برنیل۔ (شدتِ غصہ سے) بس! اب نتائج کے انتظار کی ہم میں مزید تاب
نہیں...... پھینک دو اس نابکار کو برف پر اور اس کے ملعون
بیٹے کو لاؤ۔

دو آدمی لپک کر سرقیس کو اٹھاتے ہیں، اور کھڑکی سے
باہر پھینک دیتے ہیں۔ ایک خوفناک چیخ بلند ہوتی ہے،
پھر مکمل سکوت چھا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد رومیو سامنے
لایا جاتا ہے۔ اسے کتے کی موت مار دو!

سپاہی بندوقیں اٹھاتے ہیں اور اُن کا منہ رومیو
کی طرف کرتے ہیں، شازنین بے تحاشا برنیل کے قدموں
پر گر جاتی ہے۔

شازنین۔ (ملتجیانہ آواز میں) رحم...... رحم...... رحم

برنیل۔ تمہاری رحم کی آواز کے لئے میرے کان بند ہیں۔

شازنین۔ کس لئے...... کیوں؟......

برنیل۔ بس اسی لئے کہ تمہارا بھائی میرے کانوں کو اپنے افشائے راز
سے کھولنا نہیں چاہتا......

شازنین۔ (پریشانی میں چاروں طرف مبہوت نگاہوں سے دیکھتی ہے)
آہ! مجبور ہوں...... ایک طرف بھائی کی حسین زندگی......
دوسری طرف سینکڑوں زندگیاں...... اور وطن......
ظلم اور فساد سے آزادی!...... کیا کروں؟...... کچھ سمجھ
میں نہیں آتا......!

برنیل۔ سپاہیو!

شازنین۔ نہیں!...... نہیں!...... ٹھہرو!

برنیل۔ کس لئے؟

شازنین۔ میں بتائے دیتی ہوں......

کپتان۔ شاباش!...... بھائی کی محبت!!...... واقعی تم
بہت اچھی بچی ہو......

شازنین۔ مگر ایک وعدہ!

برنیل ۔ وہ کیا؟

شارنین ۔ میرے بھائی کی جان بخشی .... وعدہ کرو!

برنیل ۔ تم مجھ سے قسم لے سکتی ہو ....

شارنین ۔ اچھا!

(سالار اور کپتان شارنین کے نزدیک آجاتے ہیں)

شارنین ۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ یہاں سے دُور .... مغرب کی طرف .... وہ اُس پہاڑی کی وادی کے پرلے سرے پر .... اس دریا کے اُس طرف بندرگاہ سے آدھ میل کے فاصلے پر ....

برنیل ۔ بندرگاہ سے مشرق کی طرف؟

شارنین ۔ (سر ہلاتی ہے)

برنیل ۔ ہاں! ہاں!! اب میں سمجھ گیا (سب کو اشارہ کرتا ہے، سب جانا چاہتے ہیں)

شارنین ۔ (راستہ روک کر) میرے پیارے بھائی کی زندگی، اب تو محفوظ ہے نا؟

برنیل ۔ بیشک! ہمیشہ کے لئے محفوظ ....

شارنین ۔ لیکن آپ اسے لئے کہاں جا رہے ہیں؟!

کپتان ۔ کہیں نہیں! دروازے کے باہر اسے چھوڑ دیں گے۔

سب دروازے سے گزر کر باہر جاتے ہیں، شارنین اپنے بھائی کے انتظار میں کھڑکی سے جھانکنے لگتی ہے،

یکایک گولی چلنے کی آواز آتی ہے، سرقیس باہر سے لڑکھڑاتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے۔ شارنین گھٹنوں میں سر دئے سسکیاں بھر بھر کر رو رہی ہے۔

سرقیس ۔ قاتل دنیا کے مجرم غلاموں نے آزادی کی پوری روح کو پامال کر دیا .... میری آرزوؤں کا رنگین خواب ختم ہو گیا۔ میری غریب اور تباہ دنیا کے افق پر میرا چاند اپنی آخری کرنیں سمیٹ کر غروب ہو گیا .... بیٹی نہ رو! .... ہم تو یہ بندوقوں کے فائر اس وقت تک سنتے رہیں گے جب تک سامنے والی پہاڑیوں پر چرواہوں کی بانسریوں اور ان کی بھیڑوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں ہمیں یہاں سنائی دیتی رہیں گی .... صبر کرو! .... آنکھوں سے جاری ہونے والے چشموں کو رومیو کے ماتم میں خشک کر دو! .... وہ آزادی کا ایک رنگین خواب تھا .... وطن کی محبت اس کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی .... تاریخ کے صفحات پر تمہارے بھائی کی زندگی اور اس کی قربانی سنہری حروف میں لکھی جائے گی .... آزادی کے علمبردار اس کی اس دلیرانہ موت پر فخر کریں گے، .... دنیا کی مائیں اپنے بچوں کو ایسا بننا سکھائیں گی .... (آگے بڑھتے ہوئے) اُٹھ! بدنصیب بھائی کی بدنصیب بہن!! اُٹھ! تیرے بھائی کو اندر لے آئیں، باہر سردی پڑ رہی ہے!

عالم کی بنا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو
اصلِ و سر کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو
مذہب کا خدا کون ہے، یہ تم جانو
حکمت کا خدا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو

حکیم آزاد انصاری

گناہ؟

جی، اے مجتبیٰ الہ آباد یونیورسٹی

جاڑا پورے شباب پر تھا، کرسمس کی چھٹیاں ہونے والی تھیں، میرا ارادہ تھا کہ شہر جا کر کچھ تحفہ خرید لاؤں، آخر جب چھوٹی روزی دوڑتی ہوئی گاڑی تک آئے گی اور مجھ سے چمٹ جائے گی تو میں اُسے کیا دونگا، اور جب شریر جولیا میرا بیگ چھین کر بھاگے گی اور سوغات کی اُمید میں میرے سارے کاغذات فرش پر بکھیر دے گی تو اُسے کیا ملے گا، کچھ تو ضرور ہونا چاہئے۔ شہر کی خوشنما چیزیں قصبے میں کہاں ملا کرتی ہیں۔

〰〰〰

شام کا وقت تھا، سردی بھی زیادہ پڑ رہی تھی، میں نے اپنا اوورکوٹ لیا اور شہر کی طرف پیدل روانہ ہو گیا، اگر پورا دو میل کا چکر بھی رہا ہو تو کیا بُرا ہے ——— میں نے شاہراہ چھوڑ کر گلیوں کا پُر پیچ مگر کم فاصلہ راستہ اختیار کیا، ہر طرف دھواں سا چھایا ہوا تھا، میونسپلٹی کے زرد نحیف روشنی والے لیمپ کہیں کہیں راستے میں ٹمٹماتے ملتے تھے، میں دل ہی دل میں تعطیل کو بہترین طریقے سے صرف کرنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا ——— مُرغابیوں کا شکار میرے لئے کتنا مسرت آفریں خیال تھا ——— جولیا پروں کے لئے جان دیتی ہے، اس نے دو بڑے بڑے تکئے بنا لئے ہیں۔ ابکی بار جب تک وہ میرے لئے بھی پروں کے تکئے بنانے کا وعدہ نہ کرے گی میں اُسے شکار چھونے بھی نہ دونگا، ——— شریر جولیا۔ بوڑھے چوکیدار پول کی موٹی بیوی اپنے "ماسٹر" کے آنے سے کتنا خوش ہوتی ہے، جھُریاں پڑا ہوا چہرہ مسکراہٹ سے شگفتہ ہو جاتا ہے۔

اِنھیں خوشگوار خیالات سے لطف اندوز ہوتا میں سنسان گلیاں طے کر رہا تھا کہ ایک ہلکی سی سیٹی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

〰〰〰

میں نے دیکھا کہ شام کے دھندلکے میں وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی، اُس نے مجھے ہاتھ ہلا کر بلایا، اور جب میں اُس کے قریب گیا تو اُس نے آنکھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا، میں نے اُس کے اشارے کی تعمیل کی، مگر نہیں بتا سکتا کیوں؟ وہ رخساروں اور ہونٹوں پر بہت زیادہ سُرخی لگائے ہوئے تھی، اُس کا لباس چُست اور بہت شوخ رنگ کا تھا۔ کمرے میں بہت معمولی قسم کا فرنیچر تھا۔ صرف ایک لیمپ جل رہا تھا جس میں سے دُھواں نکل رہا تھا، وہ میرے نزدیک بیٹھ گئی، خود ایک سگرٹ جلایا اور مجھے بھی پیش کیا، اُس نے میرے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہا، مگر میں نے کہدیا کہ میں سیاح ہوں اور دو ایک دن میں شہر کے آثار قدیمہ دیکھکر چلا جاؤں گا۔ میں نے کیوں اپنی شخصیت چھپائی، میں نہیں کہہ سکتا ——— شاید یہی کہ میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں کون ہوں؟

اُس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھکر کہا، یہاں سردی ہے، آئیے، دوسرے کمرے میں چلیں، وہاں آتشدان میں آگ روشن ہے۔

——— "آئیے نا" اُس نے میرے کاندھوں کو دباتے ہوئے کہا، میں ٹھٹکا۔ کمرے میں اندھیرا تھا، آگ کی دھیمی سُرخ روشنی میں صرف ایک پلنگ نظر آ رہا تھا، اُس نے میرے چٹکی لی اور ہاتھ پکڑ کر

اندر رہ گئی۔

میرا سارا بدن کانپ رہا تھا، میں نے جوتے کا فیتہ تک نہیں باندھا، اور کوٹ لے کر میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کدھر جا رہا تھا، سخت جاڑے کے باوجود میں پسینے میں شرابور تھا، میرے دونوں کان جل رہے تھے ——— ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرا دم گھُٹ جائے گا ——— اور میں اپنے ضمیر سے پُوچھ رہا تھا، کیا گناہ اسی کو کہتے ہیں؟

نسخۂ شفا

کنگ جارج ہاسپٹل لکھنؤ کا ایک مشاہدہ

جہاں انسان سوتا ہے بچھا کر موت کے بستر
جہاں زورِ مرض سے زندگی ہوتی ہے مشکل تر

جہاں مُردوں کی صورت زندہ پیکر سانس لیتے ہیں
جہاں جراح کے ہاتھوں میں نشتر سانس لیتے ہیں

جہاں اک مردنی سی چار جانب چھائی ہوتی ہے
جہاں ہر صبح، شام مرگ کی انگڑائی ہوتی ہے

جہاں ملتی ہے دوزخ کی سزا موجِ تنفس کو
جہاں زہر آب ہوتا ہے عطا موجِ تنفس کو

وہاں تُو اے مجسم زندگی کیوں کر چلی آئی؟
یہ تیری نوجوانی اور یہ رنگین رعنائی!

شہابی کوٹ پر چہرے کا یہ پرتو گلابی سا
یہ لب سورج کی قاشیں سی، یہ ماتھا ماہتابی سا

یہ شوخی اور اُس پر بے حجابی واہ کیا کہنا
پھر اُس پہ ہر طرف فتنہ خرامی آہ کیا کہنا

خبر تجھکو نہیں، کیونکر نظر پہ چھائی جاتی ہے
تجھے معلوم کیا، تو کتنے دل برمائے جاتی ہے

وہ میرا دیکھنا مُڑ مُڑ کے تیری نوجوانی کو
وہ تیرا چھیڑنا رہ رہ کے سازِ زندگانی کو

نہ اپنا ہوش ہے تجھکو نہ اپنی نوجوانی کا
ابھی سربند ہے شیشہ شرابِ ارغوانی کا

پلائے جا مریضوں کو مئے صحت پلائے جا
یونہیں اِس غمکدے میں پھُول بن کر مسکرائے جا

شفا جن کو نہیں ملتی کہیں، اُنکی شفا تُو ہے
خدا رکھے مریضانِ محبت کی دوا تُو ہے

خانصاحب حکیم محمود علیخاں ماہر

رباعیاتِ خیام

عطاء اللہ پالوی

بیاورید گر اینجا بود سخندانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد (غالب)

فی زمانہ ہماری غلامانہ ذہنیت نے اس قدر ترقی کر لی ہے، اور موجودہ دور میں ہمارے معیار کو مغربیت نے اس قدر پست یا بلند کر دیا ہے کہ ہم مغرب کے مقابلے میں مشرق کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتے، شکسپیر کا ساحرانہ کلام پڑھ کر تو ہم جھومنے لگتے ہیں، لیکن انیس کی جادو بیانی ہم پر کوئی اثر نہیں کرتی، ملٹن و بائرن کا کلام پڑھ کر تو ہماری رگیں پھول اور رُو بھر جاتی ہیں، لیکن اقبال و جوش کے اشعار ہمارے جامد خون میں ہیجانی کیفیت نہیں پیدا کرتے، اپیکوریس کے عیش پسند خیالات ہمیں مخمور کر دیتے ہیں لیکن ریاض خیرآبادی کے کلام کی شیرینیت ہمیں مسرور نہیں کرتی، "آشنشیمن" میں تو ہماری دلچسپی کے سامان بہت نظر آتے ہیں، لیکن "احسان" و "انقلاب" میں ہم کوئی جاذبیت نہیں محسوس کرتے، حالانکہ اگر انگریزی اور اردو ادبیات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، تو ہمیں اردو زبان میں بیشتر جواہر پارے ایسے ملیں گے جن پر ہم بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں، اور انگریزی ادبیات میں بعض چیزیں ایسی ملیں گی جو غائت سربلند ہونے کے باوجود بھی ہر طرح ناقص ہیں، مثال میں "رباعیاتِ خیام" کو لیجئے، باوجودیکہ خیام یورپ کا مقبول ترین شاعر ہے، مگر اب تک وہ کلیۃً سمجھا نہیں گیا ہے، اور باوجودیکہ خیام کی رباعیات یورپ میں معراجِ قبولیت حاصل کر چکی ہیں، مگر اُن کا اصلی حسن نہیں نکھرا ہے۔ برخلاف اس کے اردو زبان میں رباعیاتِ خیام اپنی ساری رعنائیوں اور تمام سحر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی ہیں، مگر اس کا کیا جواب کہ ہم مغربی ادبیات کی عالمگیری سے اس قدر مرعوب اور غلامانہ ذہنیت سے اس درجہ مغلوب ہیں کہ اُسے پیش کرتے یا مغربی ادبیات کے ناقص نسخوں کے خلاف زبان ہلاتے ہوئے ڈرتے ہیں، بہرکیف آج اس امید میں کہ

کیا عجب میری نوا ہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے (اقبال)

میں اس عنوان پر کچھ لکھنے بیٹھ گیا ہوں، اور اگر مواقع نے اجازت دی تو آئندہ بھی اس موضوع پر روشنی ڈالوں گا۔

انگریزی ادب نے بیشک معراجِ کمال حاصل کر لیا ہے، اور یورپ نے تحقیق و تدقیق میں لاریب عدیم المثال کامیابی حاصل کی ہے، مگر اس کے باوجود عمر خیام کے معاملے میں یورپ کی ساری تحقیق و تدقیق اب تک بمنزلہ صفر ہے، مثلاً اگر یہ سوال کیا جائے کہ عمر خیام کب اور کہاں پیدا ہوا، کب اور کہاں مرا، وہ کس مشرب کا آدمی تھا اور اُس کی

رباعیات تعداد میں فی الحقیقت کتنی ہیں تو یورپ کوئی جواب نہ دے سکے گا حالانکہ یورپ میں سب سے زیادہ شرف قبولیت خیام ہی کو حاصل ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یورپ کا کوئی گھر ایسا نہیں جس میں رباعیات عمر خیام کے متعدد ترجمے موجود نہ ہوں، یا یہ کہ یورپ میں جو قبول عام عمر خیام کو حاصل ہوا وہ کسی ایشیائی شاعر کو نصیب نہ ہوا۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ وہ اپنے محبوب ترین اور مقبول ترین شاعر کے متعلق بھی کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی ہر بات پر ایمان لے آنا یا یہ کہ اُن کی ہر چیز کے مقابلے میں اپنی چیز کو خواہ مخواہ ناقص خیال کر لینا کس قدر افسوسناک اور شرمناک بات ہے؟

یورپ کو نظر انداز کیجئے، آج ساری دنیا میں کوئی مہذب زبان ایسی نہیں جس میں رباعیات خیام کے متعدد ترجمے موجود نہ ہوں، عربی ترکی، جرمنی، فرانسوی، لاطینی اور روسی غرض ہر زبان میں کئی کئی ترجمے موجود ہیں جس کی مختصر فہرست جناب میر ولی اللہ اپنی تصنیف "کاس الکرام" میں اور طویل فہرست جناب کاشی پریاگی اپنے مضمون "عمر خیام" میں پیش کر چکے ہیں، لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دوسری کل زبانوں سے زیادہ ترجمے انگریزی زبان میں ہیں، چنانچہ حضرت آغا شاعر اپنی تصنیف "خمکدۂ خیام" میں اپنا ایک واقعہ اس طرح لکھتے ہیں۔

"جب راقم الحروف نے صرف ایک جلد انگریزی ترجمے کی دیکھنے کی غرض سے طلب کی تو "ٹی" وہین رہیں میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ منیجر کتب خانہ نے ایک لمبی چکلی میز صرف عمر خیام کے ترجموں سے بھر دی جو مختلف ڈیزائن اور مختلف مذاق کی تصویروں سے آراستہ تھے۔"

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان میں "رباعیات خیام" کے جتنے ترجمے ہوئے ہیں اور کسی تصنیف کے نہیں ہوئے، ان بیشمار تراجم میں صرف ایڈورڈ فنز جرلڈ ہی (   ) کا ترجمہ ایسا ہے جسے تنہا اولیت وافضلیت اور عدیم المثال مقبولیت حاصل ہے، چنانچہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ خیام کو یورپ سے روشناس کرانیوالا پہلا شخص ایڈورڈ فنز جرلڈ ہے۔

اس سلسلے میں شاید یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں نے بھی رباعیات خیام کے ترجمے انگریزی زبان میں کئے ہیں، جن میں سب سے بہتر ترجمہ "رابندرا ناتھ ٹیگور" کا ہے، مگر جہاں ہر دماغ پر "فز جرلڈ" کی قابلیت کا سکہ جما ہوا ہو اور جہاں غلامانہ زندگی نے دماغی توازن ہی بگاڑ دیا ہو وہاں "رابندرا ناتھ ٹیگور" کی دماغ سوزیوں کی کون قدر کر سکتا ہے، رابندرا ناتھ کا ترجمہ ہزار بہتر سہی، ہم جرلڈ کے ترجمے پر اُسے محض اس لئے فوقیت نہیں دے سکتے کہ وہ ایک "مشرقی" شاعر کے دماغ کی پیداوار ہے، اور مشرقی شاعر کسی طرح قابل اعتنا نہیں ہو سکتا۔

ایڈورڈ فنز جرلڈ کی بلند حوصلگی اور اُس کا علمی تبحر مُسَلَّم اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ جرلڈ کا ترجمہ بعض وجوہ سے دیگر تراجم پر فوقیت رکھتا ہے، لیکن نہ تو یہ صحیح ہے کہ یورپ سے خیام کو روشناس کرانے والا پہلا شخص جرلڈ ہے اور نہ یہ کہ وہ رباعیات خیام کا سب سے بڑا اور سب سے بہتر مترجم ہے، کیونکہ جرلڈ سے بہت قبل عمر خیام کے خیالات یورپ میں پیش کئے جا چکے تھے، خود جرلڈ کے استاد پروفیسر ایڈورڈ بائیلز کوول نے اس قدر بہتر طریقے پر یہ خدمت انجام دی ہے کہ اُسے فراموش نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس قدر یقینی صحیح ہے کہ جرلڈ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے "رباعیات خیام" کا منظوم ترجمہ پیش کیا، بس! رہی ترجمے کی خصوصیت تو اس کا حال یہ ہے کہ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے اور ترجمہ کی تمام خصوصیات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ترجمے کے لحاظ سے جرلڈ کا ترجمہ سب سے زیادہ مہمل اور ناقص ہے، کیونکہ "جرلڈ" نے ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ خیام کے خیال کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یورپ نے خیام کو خوش آمدید کہا، ورنہ اگر صحیح معنی میں ترجمہ ہوتا تو شاید اسے وہ مقبولیت نہ حاصل ہوتی، جو اس وقت ہے۔

اس سلسلے میں جرلڈ کی "ایمانداری" بھی خاص طور سے مثالاً پیش کی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اُس نے خیام کے کلام کے ساتھ ایمانداری برتی، یعنی اُسے "خیام کا خیال" کہہ کر پیش کیا، ورنہ اگر وہ اس موقع پر خاموشی اختیار کر لیتا تو دُنیا اس کو اُسی کے دماغ کی پیداوار سمجھتی، ممکن ہے یہ حسن ظن صحیح ہو، مگر میں سمجھتا ہوں کہ جرلڈ ایمانداری کا لحاظ کئے بغیر بھی لیتا

کبھی نہ کرتا، کیونکہ اُس کا کلکتہ رس دماغ سمجھتا تھا اور اُس کی باریک بین آنکھیں دیکھتی تھیں کہ زبانوں کا عروج و زوال قطعی ہے، ایسی صورت میں جب کسی دوسری زبان کی ترقی کا دَور آئے گا، یہ بھانڈا پھوٹ کر رہیگا، اور ظاہر ہے کہ اس وقت جو سُبکی ہوگی وہ اس دَور کی شہرت سے بدرجہا بدتر ہوگی۔

بہرکیف ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ بجز زبان کے اور کوئی چیز بدلنے نہ پائے، اندازِ بیان، لب و لہجہ اور الفاظ و خیال اُسی طرح رہیں جس طرح اصل میں ہیں، پھر زبان کی خوبی بھی اپنی جگہ اٹل ہے، ورنہ اگر ترجمے کی زبان ناکارہ ہوگی تو ترجمہ کبھی مقبول نہ ہوگا، غرض مترجم اُسی وقت تک مترجم ہے جس وقت تک کہ وہ مصنف کے طریقۂ تخاطب، اسلوب نگارش اور دروبیان غرض اصل تصنیف کے کل محاسن کو برقرار رکھے، ورنہ اگر مترجم نے اس سے آگے قدم بڑھایا تو پھر وہ مترجم نہیں ہے، اور جرلڈ کا ترجمہ اسی طرح کا ہے، اُس نے رباعی کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ رباعی کو دیکھکر اُس خیال کا ایک دھندلا سا عکس اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف صحیح راستہ سے بھٹک گیا ہے بلکہ اُس نے غلط سلط ترجمہ کرکے خیام کے حسنِ کلام کو اس طرح غارت کر ڈالا ہے کہ استغفر اللہ۔ بہرکیف جرلڈ کے ترجمے کے متعلق جناب میر ولی اللہ فرماتے ہیں، کہ

فز جرلڈ کے ترجمے کو تو عام اصطلاح میں ترجمہ کہہ ہی نہیں سکتے۔ فز جرلڈ کی ایک انگریزی رباعی دیکھئے، اور پھر رباعیات عمر خیام میں وہ رباعی ڈھونڈھئے جس کا وہ ترجمہ ہے، بڑی کوشش اور کاوش کے بعد کوئی قریب قریب خیال کی رباعی مل جائے، تو ملجائے اور بعض صورتوں میں تو بالکل کوئی رباعی عمر خیام کی ایسی نہ ملے گی جس کا اس انگریزی رباعی سے دُور کا بھی تعلق ثابت ہوسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جرلڈ کی ایک رباعی بھی ایسی نہیں ملے گی جسے خیام کی رباعی کا صحیح ترجمہ کہا جاسکے، مثالاً چند رباعیاں ملاحظہ ہوں،

عمر خیام کی ایک رباعی ہے ؎

صبح خوش و خرم است خیز اے ساقی   در شیشہ کُن شراب از شب باقی

جامے بن ارو خوش غنیمت سید ان   این یکدم عمر را کہ فردا خاکی

جرلڈ نے اس رباعی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے

Ah, fill the Cup: what boots it to repeat
How Time is slipping underneath our feet
Unborn Tomorrow, dead Yesterday
Why fret about them if Today be sweet

یہ رباعی تو خیر ایک حد تک ملتی جلتی ہے بھی، لیکن جرلڈ صاحب کی ستم ظریفی دوسری جگہ ملاحظہ ہو، خیام کی ایک رباعی ہے،

یک چند بکودکی باستاد شدیم   یک چند باستادی خود شاد شدیم

پایانِ سخن شنو کہ ما را چہ رسید   از خاک برآمدیم و برباد شدیم

جرلڈ اس رباعی کا اس طرح ترجمہ کرتا ہے

With them the seed of wisdom did I saw
And with my own hand laboured to grow
And this was all the harvest that I reaped—
"I came like water, and like wind I go"

استغفر اللہ، یہ ہے ترجمہ اور یہ ہے سب سے بڑے مترجم کی تضیع اوقات کا نتیجہ، کوئی مصرع بھی ایسا نہیں جو صحیح ترجمہ کے تحت آتا ہو، مزید لطف یہ ہے کہ جرلڈ کو یہ بھی خبر نہیں کہ جس رباعی کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ خیام کی رباعی ہے بھی یا نہیں؟ کیونکہ باد نیٰ تفاوت، یہ رباعی دیوانِ مولانا روم میں اس طرح درج ہے۔

یک چند بکودکی باستا دشدیم   یک چند بروے دوستاں شاد شدیم

پایاں حدیث ما تو بشنو کہ چہ شد   چوں ابر درآمدیم و چوں باد شدیم

جرلڈ کا مصرعۂ آخر خیام کی رباعی کا تو نہیں، لیکن مولانا روم کی رباعی کے مصرعۂ آخر کا ترجمہ البتہ کہا جاسکتا ہے،

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو، خیام کہتے ہیں

لہ جرلڈ کی رباعیاں بجنسہٖ انگریزی زبان میں پیش کی گئی ہیں، تاکہ ان کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے، ترجمہ اس لئے نہیں پیش کیا گیا کہ اس سے وہ بات جاتی رہتی جسے میں دکھانا چاہتا ہوں۔ (عطاء اللہ)

امشب مئے جام یکمنی خواہم کرد | خود را بدو جام مے غنی خواہم کرد
اول سہ طلاق عقل و دیں خواہم گفت | پس دخترِ رز را بزنی خواہم کرد

اس کو تو نظر انداز کیجئے کہ ترجمہ درست نہیں، جتنی رباعیاں منتخب کی گئی ہیں وہ سب کی سب معمولی درجے کی ہیں۔ عمر خیام کی ایک بھی اچھی رباعی ایسی نہیں جو جرلڈ نے چنی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو جرلڈ خیام کو خوشنام نہیں کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس کی شوخ رباعیوں کا ترجمہ کر کے اس کو سنجیدگی و متانت سے بے نیاز ثابت کرنا چاہتا تھا، یا پھر یہ کہ اُسے فارسی زبان سے ذرا بھی مس نہ تھا۔ آخر میں یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جرلڈ کا ترجمہ "ترجمہ" نہیں ہے بلکہ خیام کے خیالات کا ایک ادنیٰ خاکہ ہے جو اصل رباعی سے الٹا کر بھل طریقے سے پیش کیا گیا ہے اور اس لئے اُسے رباعیات خیام کا سب سے بڑا مترجم نہیں کہہ سکتے۔

جس طرح دوسری زبانوں میں "رباعیاتِ خیام" کے ترجمے ہوئے ہیں، اردو زبان میں بھی اُن کی رباعیاں ترجمہ ہوئی ہیں، اور متعدد رفقا خود اکثروں نے اس میدان میں گھوڑے دوڑائے ہیں، مگر شہسواری ہر شخص کا کام نہیں، پھر کامیابی ہو تو کیسے؟ جناب کاشی پریاگی (الٰہ آباد) نے رباعیاتِ خیام کا جو ترجمہ کیا ہے وہ بہت مشہور ہے، لیکن مجھے نہ تو ان کا ترجمہ پسند ہے اور نہ ان کی تحقیق سے اتفاق ہے، کیونکہ اُنھوں نے خیام کی پیدائش "۱۱ء اور ۴۰ء ق کے درمیان" بتائی ہے، یہ ایک ایسی تحقیق ہے جس پر ایک بچہ بھی ہنس دے گا، ساری دنیا جانتی ہے کہ خیام "مسلمان" تھا، اور اُس کی پیدائش حضرت محمد صلعم کی ہجرت سے چار سو سال بعد یقینی ہے، پھر ایسی صورت میں حضرتِ کاشی پریاگی کی تحقیق کے آگے کس طرح سرِ تسلیم خم کیا جا سکتا ہے؟

ترجمہ کا حال یہ ہے کہ کہیں کہیں لفظ تو لفظ پورا پورا مصرع اسی طرح رکھ دیا گیا ہے، کہیں فارسی کا لفظ اس طرح لایا گیا ہے کہ ترجمہ کی لطافت غائب ہو گئی ہے، اور کہیں ایسا بھی ترجمہ کیا گیا ہے کہ جرلڈ کے ترجمہ کی طرح بعض مفہوم یا خیال ادا کر دیا گیا ہے۔ مثلاً چند رباعیاں ملاحظہ ہوں، کاشی صاحب نے خیام کی ایک رباعی اس طرح لکھی ہے۔

شیخے بزن فاحشہ گفتا مستی | ہر لحظہ بدام دگرے پابستی
گفتا شیخا ہر آنچہ گوئی ہستم | اما تو ہر آنچہ می نمائی ہستی

حالانکہ یہ رباعی اس طرح ہے۔

شیخے بزنے فاحشہ گفتا مستی | کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمائم ہستم | تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟

اس رباعی کا ترجمہ کاشی صاحب اس طرح کرتے ہیں۔

اک شیخ نے رنڈی سے کہا مست ہے تو | گرماتی ہے ہر گھڑی نیا اک پہلو
کہنے لگی جو کہتے ہو سب کچھ ہوں میں | تم میں تو حقیقت کی نہیں نام کو بو

اس ترجمہ میں "فاحشہ" کا ترجمہ "رنڈی" کیا گیا ہے جو صحیح تو ضرور ہے، لیکن اچھا نہیں معلوم ہوتا، بجائے اس کے "فاحشہ" ہی رہنے دیا جاتا تو بہتر تھا، نیز مصرعۂ ثانی و چہارم ایسا ہے جو کسی طرح بعید تاویلوں کے بعد بھی ترجمہ کی تحت میں نہیں آتا۔

کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی

کا ترجمہ۔ ع

گرماتی ہے ہر گھڑی نیا اک پہلو

اور۔ ع

تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟

کا ترجمہ ع

تم میں تو حقیقت کی نہیں نام کو بو

میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسی طرح خیام کی ایک رباعی کاشی صاحب نے اس طرح لکھی ہے۔

در کارگہ کوزہ گری رفتم دوش | دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ناگاہ یکی کوزہ برآورد خروش | کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

حالانکہ یہ رباعی اس طرح ہے

در کارگہ کوزہ گرے بودم دوش | دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ہر یک بزبانِ حال با من گفتند | کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

کاشی صاحب نے اس رباعی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے،

آدسے میں جو کل رات گیا رفتہ ہوش | دیکھے ان گنت کوزے گویا و خموش
نالہ کیا اک کوزے نے با جوش و خروش | کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

"کارگہ کوزہ گرے" کا ترجمہ "آدسے" کیا گیا ہے جو اگر درست نہیں تو غلط بھی نہیں ہے۔ لیکن "دوش" کے معنی جو "کل رات" بتایا گیا ہے وہ یقینی غلط ہے، پھر دوسرے مصرع میں "دو ہزار" کا ترجمہ "ان گِنت" تو واد سے مستغنی ہے، تیسرا مصرع معلوم نہیں حضرت کاشی نے کہاں سے لاکر لکھا؟ پھر ان سب پر مزید "رفتہ ہوش" "گویا و خموش" اور "کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش" کا علی حالہٖ استعمال سونے پر سہاگہ ہے۔ غرض سارے ترجمے کا یہی حال ہے، ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت کاشی پریاگی رباعیاتِ خیام کے کامیاب مترجم ہیں۔

~~~~~~~~

سنہ ۱۹۳۲ء میں جناب آغا ظفر علی بیگ قزلباش شاعر دہلوی نے "رباعیاتِ خیام" کا ترجمہ "خمکدۂ خیام" کے نام سے شائع کیا ہے، اس خمکدۂ میں دو سو رباعیوں کے ترجمے دلّی کی ٹکسالی زبان میں پیش کئے گئے ہیں، جو ہر طرح قابلِ ستائش ہیں، حقیقت یہ ہے کہ آغا شاعر نے امید سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے، اُن کے جتنے ترجمے ہیں وہ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اس قابل ہیں کہ اُنھیں سب سے بہتر ترجمہ کہا جا سکے اور آغا شاعر نے جس صلاحیت کا ثبوت اس ترجمے میں دیا ہے وہ اس بات کی مقتضی ہے کہ اُنھیں رباعیاتِ خیام کا سب سے بڑا مترجم کہا جا سکے، مثلاً چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

(خیام)

در دیدۂ تنگ مور نور است از تو
در پائے ضعیف پشہ زور است از تو
ذاتِ تو سزا است مر خداوندی را
ہر وصف کہ ناسزا است دور است از تو

(شاعر)

چیونٹی کی ذرا سی آنکھ میں تیرا نور
مچھر کے ضعیف پاؤں میں تیرا زور
بیشک ہے خداوندی کے لائق تری ذات
جتنی کہ برائیاں ہیں سب تجھ سے دور

علاوہ اس کے کہ پوری رباعی کا بالکل سلیس اور بامحاورہ ترجمہ اُسی بحر میں موجود ہے، تیسرے مصرع کا زور بدستور قائم ہے۔ "مر" میں جو زورِ پنہاں تھا "بیشک" میں وہی زور کارفرما ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اصل رباعی کا سارا حسن ترجمہ میں موجود ہے۔

~~~~~~~~

(خیام)

مارا گویند دوزخی باشد مست
قولیست خلاف دل در و نتواں بست
چوں عاشق مست دوزخی خواہد بود
فردا بینی بہشت ہمچوں کفِ دست

~~~~~~~~

(شاعر)

سب کہتے ہیں مجھکو دوزخی ہے مستاں
دل کو نہیں لگتی بات، یہ ہے بہتاں
جب عاشقِ مست دوزخی سب ٹھہرے
کل دیکھنا جنت کو بھی چٹیل میداں

اس کو تو جانے دیجئے، کہ رباعی کا سارا زور ترجمہ میں موجود ہے الفاظ کا صحیح ترجمہ ملاحظہ کیجئے، دوسرے مصرعے کا ترجمہ کس قدر صحیح اور برجستہ کے ساتھ ساتھ بامحاورہ ہے؟ پھر چوتھے مصرعے میں "ہمچوں کفِ دست" کا ترجمہ "چٹیل میداں" داد سے مستغنی ہے، یہ ہے ترجمہ اور یہ ہے کمالِ فن!

~~~~~~~~

(خیام)

ہشدار کہ روزگار شور انگیز است
ایمن منشیں کہ تیغ دوراں تیز است
در کام تو گر زمانہ لوزینہ نہند
زنہار فرو مبر کہ زہر آمیز است

~~~~~~~~

(شاعر)

ہشیار ذرا! زمانہ ہے شور انگیز
بے فکر نہ بیٹھ، تیغ دوراں ہے تیز
حلوے کا بھی لقمہ دے زمانہ منہ میں
ہرگز نہ نگلنا اُس کو ہے زہر آمیز

اس رباعی کے ترجمے میں خوبی یہ ہے کہ ایک ایک لفظ کا ترجمہ کردیا گیا ہے، پھر اس خوبی کے ساتھ کہ کہیں بھی کوئی لفظ بھدا نہیں معلوم ہوتا، البتہ تیسرا مصرع ایسا ہے جو پڑھتے وقت ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، مگر اس کی وضاحت چوتھے مصرعے سے بخوبی ہو جاتی ہے، درحقیقت "درکام تو
~~~~~~~~

گر زمانہ سوزینہ نہد" کا ترجمہ علاوہ کامیابی لقمہ دے زمانہ منہ میں" سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا۔

(خیام)

طور الیست کہ صد ہزار موسیٰ دیداست
دیر الیست کہ صد ہزار عیسیٰ دیداست
قصر الیست کہ صد ہزار قیصر بگذشت
طاق الیست کہ صد ہزار کسریٰ دیداست

(شاعر)

وہ طور ہے دہر، لاکھ موسیٰ دیکھے
وہ دیر ہے، سو ہزار عیسیٰ دیکھے
اس قصر میں سو ہزار قیصر آئے
اس طاق نے لاکھ لاکھ کسریٰ دیکھے

اصل رباعی کے پہلے مصرعہ میں "دہر" محذوف تھا، مترجم نے اس کو ظاہر کرکے اصل رباعی میں چار چاند لگا دئے ہیں، اصل رباعی کے ہر چہار مصرعوں میں لفظ "صد ہزار" غلط تو نہیں لیکن بڑا مضروزمعلوم ہوتا تھا، ترجمہ میں یہ عیب بھی جاتا رہا، پھر "سو ہزار" اور "لاکھ" کے لفظی فرق نے رباعی کے ظاہری حُسن میں جو خوبی پیدا کردی ہے، لائق ستائش ہے، اور میں یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ "ترجمہ" اصل سے کہیں بہتر ہے۔

غرض اسی طرح آغا شاعر کے، سارے ترجمے ایک سے ایک ہیں جنھیں فرداً فرداً نہ تو گِنا یا جاسکتا ہے اور نہ اس کا موقع ہے پھر بھی آئیے یورپ کے سب سے بڑے شاعر "فِز جیرلڈ" اور "شاعر" کا مقابلہ کرکے دیکھ لیجئے کہ درحقیقت کون سب سے بڑا مترجم ہے، خیام کی ایک رباعی ہے،

آں قصر کہ بہرام درو جام گرفت
آہو بچہ کرد و شیر آرام گرفت
بہرام کہ گور می گرفتے ہمہ عمر
بنگر کہ چگونہ گور بہرام گرفت

دیکھی آپ نے فضول کی بکواس؟ رباعی میں نہ تو کہیں "جمشید" ہے اور نہ اُس کی شراب نوشی کا ذکر، مگر جرلڈ صاحب "جمشید" کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ اس رباعی کا سارا حُسن لفظ "گور" کی رعایت میں ہے، ظاہر ہے کہ یہ حُسن انگریزی میں باقی نہ رہ سکتا تھا، لہٰذا اس کا انتخاب فضول تھا، مگر اس کورذاقی کا کیا جواب کہ اس رباعی میں لفظ "جام" دیکھا اور کھینچ تان کر ایک مفہوم پیدا کرنے کے لئے اُس کو چُن لیا؛ برخلاف اس کے آغا شاعر کا ترجمہ سنئے۔

جس قصر میں بہرام نے ہے رنگ جما
اب شیر کا کھٹ ہے وہ ہرن کا باسا
بہرام جو کرتا تھا سدا گور شکار
اب دیکھ، اُسے گور نے کھایا کیسا؟

سبحان اللہ! یہ ہے وہ ترجمہ جس میں اصل کی ساری رعنائیاں، ساری خوشنمائیاں اور سارا حُسن موجود ہے، پھر زبان کا تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے، اب اس کے بعد بھی یہی کہا جائے، کہ "رباعیاتِ خیام" کا سب سے بڑا مترجم" آغا شاعر دہلوی" کی بجائے "ایڈورڈ فِز جرلڈ" ہے تو ایسے کہنے والے کو میرا سلام، میری ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ ہے اور میں بہانگِ دہل یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ "رباعیاتِ خیام" کا سب سے بڑا، سب سے بہتر، اور سب سے اعلیٰ مترجم دہلی کا مایۂ ناز شاعر ہے۔

تاثراتِ سرِ شب

پھولوں سے جگہ جگہ نشیمن دیکھے
جگنو ہیں کہ گلشن دیکھے
شبنم کے موتی انسانوں کی قسمت دیکھی
[illegible] سے مدفن دیکھے

([illegible])

چونکہ فِز جیرالڈ کے ترجمہ کی یہ رباعیات ہزاروں جگہ شائع ہو چکی ہیں اس لئے ہم نے اُن کا لکھنا مناسب نہ سمجھا

ہند میں تجارت کی پستی

رامیش نرائن ماتھر، ایم اے آگرہ

شکایت زمانہ کے موضوع پر ہر شاعر نے دلچسپ پیرایہ میں طبع آزمائی کی ہے اور اکثر اوقات اُن کا بیان حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے لیکن اِس نازک موقع پر جبکہ تمام سرزمین ہند اور دنیا میں مجموعی طور پر ایک عجیب تحیّر خیز ہیجان واقع ہوا ہے، فلک کج رفتار کی ظلم شعاری اور اپنی بے کسی و لاچاری کا حالِ زار بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔

ہر ایک ملک میں آجکل بیکاری کا دور دورہ ہے، تجارت تنزل پر ہے، کاروبار کے مختلف شعبوں میں بے چینی نظر آتی ہے، سیاسی، تمدنی اور مالی حالت خراب و خستہ ہے۔ گویا تمام مصائب ایک بلائے ناگہانی کی طرح سے ہر ایک ملک پر نازل ہوئے ہیں۔ لہٰذا میرا مقصد ان سب اسباب کا اجمالاً ذکر کرنا ہے جس کی وجہ سے یہ باتیں ظہور پذیر ہوئیں اور ایسے کارآمد مشورے بھی پیش کرنے ہیں جو مفادِ قومی کے ضامن و حامی ہوں۔

متمدن دنیا میں اس بلا کو ہم رستخیز بیجا سے تعبیر کرتے ہیں، پہلا اثر اس انقلاب کا یہ ہے کہ صنعتی حرفتی اشیاء و نیز زراعتی اشیاء کی قیمتوں میں زبردست تخفیف ہوئی ہے جس کی وجہ سے تجارت میں تنزل واقع ہوا اور کاریگروں کی افلاس میں ترقی ہوئی۔ دنیا میں آجکل بیکاروں کی تعداد چالیس کروڑ ہے۔ کلکتہ کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں چالیس فیصدی تخفیف ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اشیاء کی قیمت میں کمی مختلف اسباب سے ہوئی۔

پہلا سبب یہ تھا کہ بیرونی تجارت کے لین دین میں ہمارے روپیہ کے سکہ کو انگلستان کے رائج الوقت سکہ سے اس طرح منضبط کر دیا گیا کہ قیمت کا تعین اُسی سے ہوتا ہے، انگلستان کے سکہ کی قیمت روز بروز گھٹ رہی ہے، اور اس کی قوتِ خرید بہت کم ہو گئی ہے، اس لئے اس کو ڈپریشیڈ کرنسی (   ) کہتے ہیں اس لئے ہمارے روپیہ کی بھی قوتِ خرید گھٹ گئی۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ انگلستان نے ہندوستان سے تجارتی معاہدہ کیا ہے جس کو میثاق ہند و برطانیہ (   ) کہتے ہیں۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور اُس کی زراعتی پیداوار کے سب سے زبردست خریدار غیر برطانوی ممالک ہیں، لیکن اس تجارتی معاہدہ کی رُو سے ہندوستان غیر برطانوی ممالک کی پیداوار یا صنعتی و حرفتی اشیاء پر بہت زیادہ ٹیکس لگا دیا جس کا ہندوستان کی ہی تجارت پر نہایت ناخوشگوار اثر پڑا، ہندوستان کی تجارت صرف انگلستان تک محدود ہو گئی اور چونکہ زراعتی پیداوار کی رسد مانگ سے زیادہ ہے، اس لئے قیمت میں بہت زیادہ ارزانی واقع ہو گئی۔

جس کا کہ پیشتر ذکر ہو چکا ہے کہ یہ رستخیز بیجا صرف ہند کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے ممالک کو محیط ہے۔ اس لئے ہم کو اس کے اسباب کا ذکر کرنا چاہیئے۔ مجلسِ اقوامِ عالم کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوک فروشی

میں اشیاء کی قیمتوں میں تخفیف تقریباً فیصدی واقع ہوئی اور زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں ۶۰ فیصدی کمی واقع ہوئی، صنعتی کارخانوں نے قیمت کی کمی کا تو بار اٹھا لیا لیکن زراعتی پیداوار کی کمی کا بار کسانوں سے نہ اٹھ سکا۔ اسی بنا پر پروفیسر کیسیٹر نے کہا کہ اگر حرفتی کاروبار میں پستی نہ ہوتی تو زراعتی کاروبار میں بالضرور ہوتی۔

مسٹر کیسے کا خود بیان ہے کہ گزشتہ صدیوں میں ایسی بلائے ناگہانی سے کبھی سامنا ہوا تھا اور دنیائے متمدن کی سیاسی و مالی حالت اس قدر خستہ جیسی کہ موجودہ زمانہ میں ہے کبھی نہ ہوئی۔

۱۹۲۵ء میں جنگِ عظیم کی وجہ سے جو تباہی ہوئی اُس کی تلافی مکمل طور پر ہوگئی تھی، سلطنت کی ترقی ہوئی، تجارت، صنعت و حرفت کی ترقی سے تمام ممالک متمول ہوگئے۔ ہر ایک ملک طلائی معیار پر قائم رہا، ساٹھ فیصدی ایسے سکے استعمال کرتے تھے جو طلائی معیار سے ملحق تھے، جب کہ سیاسی و تمدنی حالت اس طرح سے مستحکم ہو رہی تھی، یکایک وال اسٹریٹ امریکہ میں ایک ایسا تجارتی طوفان آیا جس کو اسپیکولیشن (سٹہ بازی) کہتے ہیں اُس نے دنیا کی حالت تباہ کر دی۔

سٹہ کے بازار میں منافع کی اُمید پر تجارت ہوئی، کروڑوں آدمیوں نے لاکھوں روپیہ غارت کر دیا اور بالآخر ۱۹۲۹ء میں یہ سٹہ بازی ناکامیاب ہوئی۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ زرِ رائج کے معیار میں پیچیدگیاں اور دشواریاں پیدا ہوئیں اور کرنسی کی دقتوں نے تجارت کو پست کر دیا۔ اسی وجہ سے انگلینڈ اور امریکہ نے طلائی معیار ترک کر دیا، ڈالر اور انگلستان کے سکہ کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی رہی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ تجارتی سامان کثرت سے تیار ہوا اور زراعتی اور صنعتی و حرفتی پیداوار کی رسد مانگ سے زیادہ ہوگئی اور قیمتوں میں بیحد کمی واقع ہوگئی۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ چاندی کی قوتِ خرید بہت گھٹ گئی جس سے چین اور ہندوستان کو بہت نقصان ہوا۔ چوتھی بات مختلف ممالکِ عالم میں زر کی مساوی حصوں میں تقسیم نہ ہونے سے ظہور پذیر ہوئی اُس کو ہم مال ڈسٹری بیوشن آف گولڈ (سے تعبیر کرتے ہیں، فرانس اور امریکہ نے خود غرضی سے ۲/۳ حصہ سونے کا اپنے قبضہ میں کر لیا اور سونے کو دیگر ممالک میں نہ جانے دیا۔ پانچویں بات یہ ہوئی کہ جنگِ عظیم میں جو روپیہ امریکہ و فرانس سے بطور قرض لیا گیا تھا، اس کی ادائیگی کا تقاضہ ہونے لگا، مجبوراً دوسرے ممالک نے ٹیکس بڑھا دئے، ان کے سامانِ تجارت پر ٹیکس بڑھ جانے سے اور امریکہ و فرانس کی روپیہ کی ادائیگی سونے میں چاہنے سے بین الاقوامی تجارت کو زک پہنچی۔

اسبابِ متذکرہ بالا نے دُنیا کی مالی حالت کو تباہ کر دیا ہے کسی کو جرأت نہیں کہ اپنے روپیہ کا صحیح استعمال کر سکے، باوجودیکہ امریکہ میں سب سے زیادہ زر ہے، تاہم وہ اس بلائے ناگہانی کا شکار بنا ہوا ہے، لہٰذا ہم کو معلوم ہونا چاہئے کہ کیا مناسب باتیں عمل میں لائی جائیں، جن سے دنیا ازسرِنو متمول اور خوشحال ہو جائے۔

میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ اشیاء کی قیمتیں ۱۹۲۹ء کے درجہ تک بڑھا دی جائیں، تاکہ تجارت میں پھر جان آ جائے، لوگ بہت سے بڑے بڑے کارخانے کھولیں اور نفع اُٹھائیں۔ دوسرا یہ کہ لوگ فلاحِ عام کے لئے کام کریں خود غرضی کو برطرف رکھدیں، محبت اور ہمدردی کے جذبہ کو کام میں لائیں، سونے کو آزادی سے ایک ملک سے دوسرے ملک تک جانے دیں، ممالکِ غیر کے سامانِ تجارت سے محصول ہٹا کر قدرتی طور پر تجارت کو چلنے دیں، بین الاقوامی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھ کر اپنی قومی خودغرضی کو ترک کر دیں۔ ایسا کرنے سے ممالک کی سیاستِ مدنی میں بڑی ترقی ہوگی۔ تیسرا یہ کہ زراعتی قیمتوں میں اضافہ ہو جانا چاہئے۔

اگر ان مشوروں پر عمل کیا جائے اور ایک عام کرنسی معیار قائم ہو جائے جو بین الاقوامی ہو تو امید قوی ہے کہ دنیا میں پھر سے وہی تازہ روح آ جائے، اگر بین الاقوامی محبت کے اصلی جذبات ہمارے دلوں کو مشتعل کر دیں۔ اگر ہمدردی کے اعلیٰ خیالات ہماری رگوں میں سما جائیں، اگر ملکی و دنیاوی بہبودی ہمارے پیشِ نظر ہو، اگر خودغرضی ایثار میں مبدل ہو جائے تو مجھے کامل یقین ہے کہ تجارتِ دنیا ہی نہیں بلکہ ہند کی بھی ازسرِنو تازہ ہو جائے گی، اور بیکاری کا مسئلہ باکاری سے حل ہو جائے گا ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

علم کیمیا

محمد یوسف کشور کلکتہ

اگر علوم جدیدہ کی کوئی تاریخ ترتیب وار لکھی جائے تو اس میں سب سے پہلا باب تقسیم علوم کا ہوگا ——————

قدما کی ایک بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ علوم کی کوئی صحیح تقسیم اور اُن کے حدود کا صحیح تعین نہ کرسکے تھے۔ اور طبعیات کو جسے فی الحقیقت تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ ہونا تھا ان چیزوں سے ملا دیا جو محض زمانۂ قدیم کے ابتدائی اوہام باطلہ اور قیاسات ذہنیہ کا نتیجہ تھیں۔ متاخرین کو نئی راہ کا سُراغ مل گیا، اور اُنھوں نے سب سے پہلے علوم کی تقسیم اور صحیح تعین حدود میں کامیابی حاصل کی۔ در اصل یہی اولین کام حکمائے جدید کو ممتاز حیثیت دینے کا باعث ہوا۔ اب علوم کے اقسام کا نقشہ بالکل بدل گیا ہے، اور گو بہ نسبت انحصار قدیمہ کے بیشمار نئی نئی شاخیں پیدا ہوگئی ہیں تاہم اصولاً ان کی تقسیم و حدود ایک صحیح بنا پر قایم اور اپنی مختصر تعداد کے باوجود ان تمام علوم کا احاطہ کئے ہوئے ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ میں تمام علوم دس بارہ غیر اصولی حصص کی جگہ صرف ان تین حصوں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں۔

(۱) علم حیوانیہ (۲) علم نفسانیہ (۳) علم طبعیہ۔

ان تینوں قسموں میں سے میرا موضوع بحث علوم طبعیہ کا پہلا باب کیمیا ہے۔

اُمم قدیمہ میں سے جن جن قوموں کی تاریخ میں ہمیں علم کیمیا کا تذکرہ ملتا ہے وہ مصری، فنیقی، یہودی، یونانی، رومی اور عرب ہیں۔ ان قوموں میں سے مصری سب سے پہلے گزرے ہیں۔ اس لئے غالباً فن کیمیا کا اولین سرچشمہ مصر ہی ہے۔

کیمیا کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کا بیان ہے کہ کیمیا "کیمی" سے مشتق ہے، جس کے معنی سیاہ زمین ہے، قدیم زمانے میں مصر کا یہی نام تھا اور چونکہ اس فن کا گہوارہ مصر تھا، اس لئے اس کا بھی یہی نام پڑ گیا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کیمیا کو فارسی میں فنِ مصری بھی کہتے ہیں، مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک عبرانی نژاد لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی راز یا اخفاء کے ہیں۔

اصل میں یہ لفظ غالباً شامان ہے۔ اہل یونانی مصر کو سام ابن نوح کی نسبت سے شامیا کہتے تھے۔ ایک تیسری جماعت کو ان تینوں رایوں سے اختلاف ہے، اسکے نزدیک یہ لفظ در اصل ستیمیا تھا۔ ستیمیا کے معنی بھی اخفاء اور پوشیدگی کے ہیں، بہر نوع کیمیا کا مشتق خواہ کچھ بھی ہو اور اس کے معنی خواہ سیاہ زمین ہوں یا اخفاء، اس قدر یقینی ہے کہ یہ ایک پوشیدہ فن تھا جسے صرف علماء مذہبی ہی جانتے تھے، اور اُس کی دلیل یہ ہے کہ خود ہیکلوں اور عبادت خانوں کے اندر یا ان کے قرب و جوار میں کیمیا دی وار العمل ([illegible]) نکلے ہیں جس طرح

دنیا میں تمام علوم کی ابتدا افرادِ انسانیہ کی غیر منضبط اور توہم آمیز معلومات سے ہوئی ہے اور رفتہ رفتہ تمدن و عمران کی ترقی نے ان میں ترتیب اور انضباط پیدا کیا ہے اسی طرح فنِ کیمیا کی بھی ابتدا ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ اس فن کی ابتدا ایک خاص اور غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ شاید ہی کسی علم کی ابتدا اس درجہ توہمات اور خلافِ مقصد کوششوں سے آلودہ رہی ہو جس درجہ کہ اس نہایت قیمتی اور ضروری فن کی تاسیس نظر آتی ہے۔ اس کی ابتدا نہ صرف غلط بنیاد پر غلط مقاصد کی تکمیل کے لئے ڈالی گئی جیسا کہ انقلاب ماہیت معدنیات کی کوشش سے ظاہر ہوتا ہے، بلکہ بہت کچھ انسانی جرائم و معاصی کی ان افسوسناک سرگزشتوں سے بھی اس کا تعلق رہا ہے، جو دنیا کے گزشتہ تاریخی زمانوں کی وحشت انگیز یادگاریں ہیں، اور جن سے افسوسناک صداقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ بہتر سے بہتر اور اشرف سے اشرف آلہ و وسیلہ بھی انسان کے بہیمی جذبات کے ماتحت بدترین لعنت و عذاب بن جاتا ہے۔

فنِ کیمیا کے جو ابتدائی تجارب ہیں وہ دنیا نے صرف دو طریقوں پر حاصل کئے ہیں (۱) بہت سے لوگوں کا خیال پیدا ہوا کہ ادنیٰ درجہ کی دھاتوں کو کسی خارجی ذریعہ سے اعلیٰ درجہ کی دھاتوں میں منقلب کر دیا جائے، مثلاً تانبے کو سونا بنا دیا جانے یا قلعی اور پارہ کو چاندی کی صورت اور خواص میں بدل دیا جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی علمی اور تجاربی کوششیں شروع ہوئیں اور صدیوں تک بڑے بڑے علماء اور علمی ادارے عملی تجربے کرتے رہے۔ وہ اپنے مقصد میں تو کامیاب نہ ہو سکے، لیکن ان کے تجارب کی روشنی میں ضمناً بہت سے قیمتی انکشافات ہوئے، جو فنِ کیمیا کے لئے ایک بہترین ابتدائی سرمایہ ثابت ہوئے۔

یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس فن کی ابتدا کیوں کر ہوئی، اب یہ بتانا ہے کہ غلط مقاصد کی تکمیل کا خیال، اور ارتکابِ جرائم کیوں کر اس فن کے حصول کا باعث ہوئے (جس کی جھلک ایک محقق کو عصرِ جدید سے لے کر ازمنۂ مظلمہ کے بعد تک برابر نظر آتی ہے) تاریخ کے مطالعہ سے ان شریر اور جرائم پیشہ اشخاص اور جماعتوں کا پتہ چلتا ہے جو اپنے علم و حکمت کو اس راہ میں صرف کرکے اپنے بڑے بڑے ذاتی فوائد حاصل کرنا چاہتی تھیں، یہ جماعتیں اور اشخاص وہ تھے جو اپنے ذاتی اہم مقاصد کے خلاف طاقتور دشمن رکھتے تھے اور اُن کو مخفی اور ناقابلِ گرفت ذرائع سے ہلاک کرنے کے لئے نئے نئے زہروں اور قاتل ادویہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ بڑی بڑی اقتدار طلب اور حکومت خواہ جماعتیں تھیں جو ایسی ادویات اور مرکبات تیار کراتی تھیں جن کے ذریعے ان تمام طاقتور اشخاص کو پوشیدہ ہلاک کر سکیں، جن کا وجود ان کے حصولِ مقاصد میں حارج ہے، متعدد بت پرست اقوام کی مذہبی جماعتیں اور ان کے بعد قرونِ وسطیٰ کے متعصب اور جرائم پیشہ گوشہ نشینانِ خانقاہ بھی اس سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہیں۔ جنھوں نے اپنے گرجوں اور قلعہ نما خانقاہوں کے تہ خانوں میں انسانی ہلاکت اور وحشیانہ جرائم کو صدیوں تک قائم رکھا، اور جن کے مظالم کی لعنت سے صرف چند صدی پیشتر ہی دنیا کو نجات ملی ہے، زمانۂ گزشتہ کی پُر اسرار کہانت اور مذہبی پیشواؤں کی خوفناک قوتیں بھی بہت کچھ اس فن کے پوشیدہ تجربوں کی معاون تھیں، یہ لوگ پہاڑوں کے غاروں کے اندر اور قلعوں اور تہ خانوں کے گرجوں میں اپنے علم و تلاش کو ان چیزوں کے لئے صرف کرتے تھے، جن کے خواص عام طور پر اس زمانہ میں معلوم نہ تھے، اور پھر ان کے ذریعہ خود کو غیر معمولی اور پُر اسرار قوتوں کا مالک ظاہر کرتے تھے، روم اور جرمنی کے قدیم پادریوں، اور رومن کیتھولک راہبوں کی خوفناک قوتوں کا تفصیلی تذکرہ تواریخ میں موجود ہے۔ ان کے پاس عجیب عجیب قسم کے قاتل زہر ہوتے تھے، جو مختلف غیر محسوس طریقوں اور مقررہ ساعتوں کے اندر مقدس جماعت کے دشمن کو ہلاک کر دیتے تھے۔

روم میں کارڈینل پادریوں کے گروہ کی (جن میں سے نیا پوپ منتخب کیا جاتا ہے) عجیب الخواص ادویاتِ مہلکہ کے لحاظ سے پوشیدہ اور علمی جرائم کی ایک پوری تاریخ ہے ان میں سے جو لوگ اپنے تئیں پوپ اور روم کا تاجدار قرار دینا چاہتے تھے، ان کے بڑے بڑے پوشیدہ حلقے موجود تھے، اور انھوں نے اس عہد کے پوشیدہ علوم و حکمت کے جاننے والوں کی مدد حاصل کرکے ایسے مرکبات معلوم کرلئے تھے، جن کے استعمال کے نتائج اس عہد میں بالکل غیر معلوم تھے۔

مسلمانوں کے بعد اسپین میں مسیحی حکومت قائم ہوئی اور اس سے مشہور و معروف عدالتِ روحانی ( ) کے ذریعہ

انسانوں کے لئے سب سے بڑی مسیحی لعنت کا وحشت ناک سلسلہ شروع ہوا۔ اس عدالت کے خوفناک کارندے اور ممبر تمام مسیحی یورپ میں پھیل گئے تھے۔ اور ان کے خوفناک اقتدار کا ذریعہ منجملہ مخفی اسباب و علل کے فنِ کیمیا کے غیر معروف تجارب بھی تھے، اس چودھویں صدی عیسوی سے لیکر سولہویں صدی کے اواخر تک روم اور جرمن میں پادریوں کی اس مخفی اور خوفناک عدالت کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے ممبر اور کارندے پوشیدہ پوشیدہ تمام یورپ میں منتشر ہو گئے تھے اور بادشاہوں سے لے کر عام باشندوں تک پر کافی اقتدار رکھتے تھے۔ ان کی نسبت بیشمار شہادتیں موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ہلاکت کے لئے بہت سے کیمیائی عروق کا انھیں علم تھا۔ اور اس کی تجربہ گاہیں اس عہد کے ویران قلعوں بڑے بڑے گرجوں اور خانقاہوں میں موجود تھیں۔ وہ طرح طرح کے خوفناک طریقوں سے مفردات اور عناصر کی ترکیب و تجزیہ کا تجربہ کرتے تھے اور انھوں نے ایسے ایسے آلات بھی ایجاد کرلئے تھے جو آج کل کیمیائی تجارب کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ زہریلے جانوروں کے اعضا سے زہر نکالتے اور درندوں کو زندہ لٹکا کر اُن کے پیٹ چاک کرکے طرح طرح کے حیوانی اور منرالوں کے عرق کھینچتے تھے، یہ ایک وحشیانہ اور خونخوارانہ تجربہ تھا، لیکن اسکی وجہ سے فنِ کیمیا کے اکثر راز معلوم ہو گئے اور گو پوشیدہ علم کی پُراسرار معلومات ہونے کی وجہ سے اُن کا بڑا حصہ غیر معلوم ہی رہا، تاہم جس قدر بھی معلوم ہوسکا وہ اس فن کی ابتدائی معلومات کا تحقیقی ذخیرہ ہے۔

دنیا میں جب تک کوئی شے زندہ رہتی ہے اس وقت تک برابر اس میں تغیر و انقلاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لیکن جب وہ مر جاتی ہے تو یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ یہی حالت علوم کی بھی ہے، جب تک زندہ رہتے ہیں، اس وقت تک ہمیشہ اس میں حذف و اضافہ ترمیم و اصلاح ہوتی رہتی ہے۔

یہ مضمون کیمیا کی مکمل تاریخ نہیں بلکہ اس کا صرف ایک سرسری مطالعہ ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ صرف علم کیمیا کے اہم دوروں کو لے کر اسی پر نہایت اختصار اور اجمال کے ساتھ بحث کروں۔

دورِ اوّل

اس دور میں لوگوں نے علمی یا کم از کم باقاعدہ تجارب کے ذریعہ کیمیاوی ظواہر و آثار کا مطالعہ نہیں کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صحیح نتیجہ پر نہ پہونچ سکے۔ اس دور میں لوگوں کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ جس طرح ہو سکے کم قیمت دھاتوں کو قیمتی دھاتوں مثلاً سونا۔ چاندی وغیرہ کی صورت میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ کوشش اہلِ مصر میں پہلی صدی عیسوی تک جاری رہی، یہاں تک کہ کہا جانے لگا کہ کیمیا اس علم کا مقام ہے جس کے ذریعے سونا اور چاندی بنائی جاسکے۔ اس کے بعد عہدِ علمی شروع ہوا، اور اس میں بھی گو ابتدا میں اس غلط خیال کی اشاعت ہوئی اور اس کا سلسلہ برابر قائم رہا لیکن انھیں کے حکمائے محققین نے پہلے اس کی تغلیط بھی کی اور فنِ کیمیا کو اصلی مقاصد اور علمی شکل میں مدوّن کرنا چاہا۔ مگر یورپ میں یہ دور سولہویں صدی عیسوی تک برابر جاری رہا۔ چاندی سونے کے مدعی ہزارہا انسانوں کو دھوکا دے کر لوٹتے رہے۔

دورِ ثانی

اس کو ہم دورِ طبّی بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس دور میں ماہرانِ فنِ کیمیا کے مقاصد مختلف اور بجائے اس کے کہ ارباب فن کا مقصد علاوہ چاندی اور سونے کے ساتھ مخصوص ہونا اب اُن کے پیشِ نظر صرف ادویہ کی تیاری تھی، اس دور میں طب اور کیمیا پہلو بہ پہلو تھے، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ صحت و مرض تغیرات کیمیاوی ہی کا نام ہے۔ اس لئے جب کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کی صحت یابی کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے بدن میں کوئی ایسا کیمیاوی اثر پیدا کیا جائے جو ان تغیرات کو اُن کی اصلی حالت پر لاسکے۔

سیر اسلس (   ) سب سے پہلا شخص ہے جس نے اس اصول کا صُور پھونکا۔ اس زمانے کے لوگوں میں وین ہلمینٹ جیسے زبردست عالم تک نے اس مذہب کو قبول کر لیا تھا۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مرکبات کیمیاویہ خصوصاً فلوزی مرکبات ایجاد ہوئے۔ یہ دور سترہویں صدی کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور دور میں کامیابی کا سہرا تمام تر مسلمانوں کے سر رہا۔

دورِ ثالث

اس کو ہم دورِ احتراق (Philogistion period) کہہ سکتے ہیں۔

عربی میں اس کو عصر السعیر کہا جاتا ہے، یہ سترہویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر اٹھارہویں صدی کے آخر میں ختم ہو جاتا ہے، اس عرصہ میں بہت سے علمائے کیمیا نے اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دینے کی کوشش کی، اس لحاظ سے کیمیا کی تاریخ روبرٹ بوائل (Robert Boyle) کے وقت سے شروع ہو جاتی ہے، روبرٹ بوائل کا یہ کلیہ تھا کہ یہ فن محض ترکیبِ اجسام کی معلومات کا مخزن ہے۔

اس دَور میں اربابِ بحث و تحقیق کے خیالات چند خاص مسائل کے حل کرنے میں منہمک تھے جن میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ احتراق کا ہے اور اس لئے میں نے اس دَور کا نام "دورِ احتراق" رکھا ہے، اس دَور کے علمائے کیمیا کا یہ اعتقاد تھا کہ جب کوئی شے جلتی ہے تو اس میں سے ایک عنصر جلتا ہے جسے فلوجسٹن (Phlogiston) کہتے ہیں۔ فلوجسٹن ایک فرضی شے ہے جس کے متعلق فرض کیا گیا ہے کہ وہ خالص آگ ہے، اور آتشگیر اجزا سے مملو ہے، یہ اعتقاد عرصے تک قایم رہا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور کیمیاوی عالم (Lavoisier) نے اس خیال کو باطل کر دیا، اور اُس وقت سے چوتھا یعنی موجودہ دور شروع ہوا۔

دَورِ رابع

یہ دَور" لویذیر کے عظیم الشان کارناموں سے شروع ہوتا ہے، اس جلیل القدر ماہرِ کیمیا نے اپنے تجارب سے ثابت کر دیا کہ اشیاء کے جلنے میں ہوا کو بہت بڑا دخل ہے، نیز یہ کہ احتراق اور فلوجسٹن کے متعلق قدمائے جو اعتقادات تھے وہ محض وہم سے زیادہ نہیں۔ اس ایک اصول کے دریافت ہو جانے سے دفعتاً نظریۂ احتراق کی بنیادیں اس طرح ہل گئیں کہ پھر قائم نہ رہ سکیں۔ درحقیقت لویذیر نے وہ عظیم الشان خدمت اس فن کی انجام دی ہے جس کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ تاریخ کیمیا کے صفحات میں محفوظ رہے گا۔ اس کے اس کارنامے کی عظمت کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ اہلِ فن نے اس موجودہ فن کیمیا کا "موجدِ حقیقی" کا لقب دیا ہے، مگر افسوس قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا، انقلابِ فرانس کے عہدِ کشت و خون میں حکومت فرانس نے اسے قتل کرا دیا۔ لویذیر ہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے ترکیبِ اجسام کے نقشے کی ترتیب کی۔

اس عہد کے اربابِ فن میں ڈالٹن (Dalton) اور برزیلیوس (Berzelius) بھی ہیں، اول الذکر ایک انگریز حکیم ہے جس نے ذرات کا وہ عظیم الشان نظریہ وضع کیا جو آج علوم کیمیاویہ کا سب سے بڑا محور ہے۔ ثانی الذکر سویڈن کا باشندہ تھا، اس کا سب سے بڑا کارنامہ مختلف عناصر کے جو آج تقریباً ۹۰ کے قریب ہیں (کا اُن اوزان کا جو ذرات (Atomic Theory) سے پیدا ہوتا ہے) اندازہ کرتا ہے۔ اس کے بعد عہدِ آخر کے اربابِ کمال کی جماعت ہے جس میں سویڈن کا اربی نس (Arrhenius) ہالینڈ کا وانٹ ہوف (Van't Hoff) جرمنی کے برزرٹ (Bernweiger) اور اسٹوالڈ (Ostwald) انگلستان کا فرینک لینڈ (Frankland) اور سر ولیم ریمیز (Sir William Ramsay) مشہور صنادید فن ہیں۔ ان میں سے چار اول الذکر علماء نے کیمیا کی ایک نئی شاخ کی بنیاد ڈالی جس کو کیمیائے طبعی (Physical Chemistry) کہتے ہیں۔ کیمیائے طبعی میں مرکبات کے خواص طبعی اور ترکیب کیمیاوی کے باہم تعلق سے بحث ہوتی ہے۔

---

[1] اس نظریے کی بنا، پندرہویں اور سولہویں صدی کے وسط میں پڑی تھی، لیکن لویذیر نے اس کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ لکڑی یا دیگر جلنے والی اشیاء کے جلنے سے اُن کے اوزان میں کمی ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے اوزان میں کمی کے بجائے زیادتی ہو جاتی ہے۔ مثلاً تانبے کو جب ہوا میں پھونکا جائیگا تو اُس کا وزن قدرے بڑھ جائے گا۔ اس تجربے پر دیگر تجربوں سے لویذیر نے ثابت کر دیا ہے کہ فلوجسٹن کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ ہر چیز کے جلنے میں ہوا کو دخل ہے۔ یعنی جلنے سے یا تو کسی چیز سے کاربون کا وہ حصہ جو اس میں موجود ہوتا ہے اس چیز سے نکل کر ہوا میں مل جاتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ کسی چیز کے جلنے کے بعد ہوا کے اندر کاربونک ایسڈ گیس کی زیادتی ہو جاتی ہے۔) یا اس میں ہوا کی آکسیجن جذب ہو جاتی ہے جس سے اُس کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ تانبے کو اگر پھونکا جائے تو وہ کیوپرس آکسائڈ ( ) بن جائے گا جو تانبے کے وزن سے زیادہ ہوگا!

(بقیہ مضمون نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

دنیا

شور لکھنوی

چندوسی کے اسٹیشن پر ایک غریب سادھو گاڑی میں چڑھنے لگا، ایک سیٹھ صاحب کا سامان ڈبے میں بھرا ہوا تھا۔ سیٹھ صاحب نے اسکو اندر آنے سے روکا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ سادھو نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا :میری لڑکی سخت بیمار ہے میں اُس کو دیکھنے جا رہا ہوں، صرف کھڑے ہونے کی جگہ دیدیجے۔ اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔ ایشور آپ کا بھلا کرے گا۔

سیٹھ :۔ بھلا کیا خاک کرے گا، جو ہے وہ اسی میں، جو ہے وہ اسی میں، کیا گاڑی بھر میں کہیں اور جگہ نہیں۔

سادھو :۔ جگہ تو ضرور ہوگی۔ مگر دیکھئے میں ایک بوڑھا آدمی ہوں بڑی مشکل سے یہاں تک پہونچا ہوں۔ یہ ایک معمولی گاؤں ہے۔ یہاں صرف دو منٹ گاڑی ٹھہرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے ڈبے کی تلاش میں گاڑی چھوٹ جائے اور میں اپنی لڑکی کو دیکھنے سے محروم رہ جاؤں۔

سیٹھ :۔ تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ سامان کو تو اٹھا کر نیچے پھینک دوں اور آپ کو یہاں جگہ دے دوں، کیوں ؟

سادھو۔ نہیں بابو جی آپ کا سامان میں اپنے سر پر رکھ لوں گا آپ کو مطلق تکلیف نہ ہوگی، ایک کونے میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ صرف ایک ہی اسٹیشن کی تو بات ہے۔ پھر تو مجھے اُترنا ہی ہے۔ دیکھئے بابو جی گاڑی چل چکی ہے، دروازہ کھول دیجئے، کھول دیجئے۔

سیٹھ ۔ کھول دیجئے۔ بڑا آیا وہاں سے ـــــ اچھا مجھے زور ـــــ اُدں ـــــ تو لے ـــــ

اس جد و جہد میں کمزور ہاتھوں سے سلاخ چھوٹ گئی اور وہ کافی اونچائی سے پتھر پر گرتا ہے۔ (خون نے پتھروں کو رنگ دیا۔ اُس کی تمنا۔ اُس کا اشتیاق۔ اُس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اُس کی پیاری بیٹی ایک میلے کچیلے بستر پر پڑی اُس کو بلا رہی ہے، اور وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ وہ کس اُمید میں گھر سے نکلا تھا۔ کس بیچینی سے اپنی لڑکی کو دیکھنے چلا تھا جس کی زندگی کا سہارا جس کی مسرت اور آسائش کا مرکز صرف ایک لڑکی ہے وہ اس کو دیکھنے سے پہلے اس دنیا سے جا رہا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ؎ اس کا بانی مبانی جیسا کہ نفس مضمون سے ظاہر ہے۔ ڈولٹن ہے۔ اس نظریئے کے مطابق دنیا کی ہر وہ چیز جو حالت عنصر پر ( ) میں ہے بہت چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنی ہے۔ یہ ذرے اس قدر باریک ہیں کہ بہترین خوردبین بھی ان کو دائرۂ بصارت میں لانے سے قاصر ہے۔ یہ ذرے کسی عنصر میں زیادہ ہیں اور کسی میں کم یہی وجہ ہے کہ مختلف عناصر کے خواص میں فرق ہے۔ لیکن موجودہ نظریئے کے مطابق یہ چھوٹے چھوٹے ذرے ریم ( ) ا بھی شکستی ہیں اور ہر ذرہ ان چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنا ہے۔ جن کو الکٹرون و پروٹون (برقی پارے) ( ) کہتے ہیں۔

جاڑوں کا زمانہ ہے۔ بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ آثار قدیمہ کی ایک شکستہ عمارت میں لوگوں کی کثیر تعداد بارش سے بچنے کے لئے پناہ گزین ہے۔ ایسے وقت میں ایک خاکروب ہاتھ میں جھاڑو لئے ایک پھٹی دھوتی گھٹنوں تک باندھے ایک پھٹا کوٹ پہنے جو بارش سے بالکل بھیگ گیا تھا، آتا ہے، اس کا جسم جاڑے کی وجہ سے کانپ رہا ہے، اُس کے دانت سردی کے باعث بج رہے ہیں۔ وہ عمارت کے اندر داخل ہونا چاہتا ہے، لوگ اس کو روکتے ہیں۔ ہائیں، ہائیں، یہاں کہاں آرہا ہے۔ دیکھتا نہیں یہاں پر سب شریف آدمی کھڑے ہیں۔

خاکروب۔ سرکار میں سردی کے مارے مرا جا رہا ہوں۔ پاس کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں بارش سے بچ سکوں۔ ذرا دھیمی ہو جائے تو چلا جاؤں گا۔

ایک نیک دل۔ اچھا ایک طرف کھڑا ہو جا۔

ایک خاں صاحب۔ واہ جناب واہ! آپ بھی کمال کر رہے ہیں۔ ایک بھنگی اور ہم لوگوں میں کھڑا ہو جائے۔ آپ کو کہتے وقت اتنا بھی خیال نہ ہوا۔ چل ہٹ یہاں سے۔ نہیں تو ....

خاکروب۔ حضور! اس وقت میں کہاں جاؤں، اگر اندر نہیں آنے دیتے تو دیوار کے پاس ہی کھڑا ہو جانے دیجئے۔

دوسرا۔ آخر تو سامنے پیڑ کے نیچے کیوں نہیں چلا جاتا۔

خاکروب۔ سنتا ہوں کہ پیڑوں پر بجلیاں گرتی ہیں، میں ہی اپنی بوڑھی ماں کا سہارا ہوں۔ اُس کی خدمت کرنے والا اور کون ہے؟

خاں صاحب۔ نامعقول کہیں کا، ابے جب کہہ دیا کہ یہاں جگہ نہیں ہے تو جاتا کیوں نہیں۔ مار کا بھوت بات سے تھوڑی ہی بھاگتا ہے، ہوش و حواس درست کر دوں کیا؟

(اُن لوگوں کی آنکھیں بند تھیں، مگر خداوند دیکھ رہا تھا، وہ ایک غریب کو بارش سے بچنے کے لئے بھی جگہ نہیں دیتے، تو خدا اُن کو اپنی پناہ میں کیوں رکھے) بجلی گری اور اُس کے ساتھ ساتھ مکان کی بوسیدہ چھت بھی گری۔ آیئے دیکھئے ایک ذلیل انسان کے چاروں طرف کتنی شریف، کتنی اعلیٰ مرتبہ ہستیاں پڑی ہیں، جو کبھی اپنے قیمتی لباس کو اس کے گندے کپڑوں سے مس بھی نہ ہونے دیتے تھے، آج اُنھیں کپڑوں کو بھنگی کا گندہ پیپ خراب کر رہا ہے۔ جو کبھی اس کے جسم کو اپنے جسم سے ملنے میں ایک بڑا گناہ سمجھتے تھے، آج بدن کا ہر حصہ اُن سے ملا ہوا ہے۔ ایک رُوح نکل جانے کے بعد بھی امتیازی حیثیت قائم رہتی ہے؟

امین آباد پارک لکھنؤ میں ایک غریب ایک جوڑی جوتہ لئے سڑک کے کنارے کھڑا تھا، شہر کے شرفاء کا ایک گروہ ادھر سے گزرا۔

ایک۔ کیوں میاں اس کی کیا قیمت ہوگی؟

وہ۔ لیجئے دیکھئے تو۔

دوسرا۔ اماں یار تم بھی کہاں ٹھہر گئے۔ کیا یہ گنوارو جوتہ خریدو گے!

ایک۔ یار تم بھی بالکل بے وال کے بودم ہو۔ (آہستہ سے) قیمت معلوم کرنے میں کیا ہرج ہے۔

ہاں بھائی تو قیمت ایک ہوگی۔

غریب۔ آپ اسے دیکھیں تو آپ سے کیا زیادہ لوں گا۔ دیکھئے کتنا پائدار ہے، میں نے تین دن کی محنت میں بنایا ہے۔

دوسرا۔ اور پھر بھی اتنا بھدا!

غریب۔ تو حضور یہ ہاتھ مشین تو نہیں ہو سکتے، آپ میری محنت دیکھئے، چمڑا اور پائداری دیکھئے۔ صرف خوبصورتی پر مت جائیے، میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ اُن مشین کے جوتوں سے زیادہ چلے گا جو دیکھنے میں تو خوبصورت ہوتے ہیں، مگر بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔

پہلا۔ جانتا ہوں، دوکانداری کی باتیں خوب جانتا ہوں۔ اب آپ قیمت بتلایئے قیمت۔

غریب۔ جناب پانچ روپیہ ہوں گے۔

دوسرا۔ پانچ روپیہ (قہقہہ لگا کر) بھئی واللہ کمال کر دیا۔ پانچ روپیہ۔ یہ بھی ایک ہی رہی۔ ارے بھائی اس میں پانچ روپیہ کی کیا بات ہے۔ ابھی حضرت بس رہنے بھی دیجئے۔ کیوں ہمارا اُلّو بنانا چاہتے ہیں۔ پانچ روپے میں تو جناب کو پانچ جاپانی جوتے مل سکتے ہیں، فرمایئے کیا ضرورت ہے، (قہقہہ) چلو بھی یار۔ کہاں وقت ضائع کیا۔ (مڑ کر) کیا آپ بارہ آنے پر قناعت فرمائیں گے؟

غریب۔ بارہ آنہ۔ تین دن کی محنت اور بارہ آنہ، نہیں جناب

معاف کیجئے۔ یا خدا تیرا شکر ہے۔

بارش نہ ہونے کی وجہ سے ریاست جے پور میں ہیضہ پھیل گیا ہیلتھ آفیسر کا حکم نامہ آیا کہ فوراً شیخاوالی چلا جاؤں اور وہاں اس مرض کے تدارک کی کوشش کروں، چنانچہ حسب الحکم وہاں پہونچا، پتہ چلا کہ اراولی پہاڑ کی وادی میں ایک چھوٹی سی بستی ہے وہاں یہ واقعات زور شور سے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ فوراً ضروری سامان اونٹ پر لاد کر اور خود بھی ایک ہنڈل بنا ہوا اونٹ پر لد گیا، پیچھے پیچھے اردلی اور میں، اونٹ پر ہچکولے کھاتا بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ خطرناک تھا، دونوں جانب گھنے جنگل تھے، جن میں کثرت سے شیر تھے، ایک تو دھوپ کی شدت دوسرے اونٹ کی سواری عجیب مصیبت تھی۔ شام ہوتے ہوتے چھٹی کا دودھ یاد آگیا، آخر تھک کر اتر پڑا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا مندر تھا، رات گزارنے کے خیال سے وہیں رُک گیا۔ اردلی نے کھانے کی فکر شروع کر دی۔ اور میں حواس درست کرنے کی خاطر مندر کے چبوترے پر ٹہلنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ دور کچھ آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے پہاڑ کے ایک غار میں جا رہے ہیں۔ بہت سوچنے پر بھی میں کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکا کہ آخر وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس لئے ارادہ کیا کہ چل کر دیکھنا چاہئے، میں اردلی سے یہ کہہ کر کہ کھانا تیار کرو میں ابھی آتا ہوں، غار کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ببول کے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں سے ہوا ٹکرا کر ایک عجیب آواز پیدا کر رہی تھی۔ آسمان بالکل سیاہ تھا اور دُور تک پہاڑوں کی دھندلی دیوار پھیلی ہوئی تھی، جیسے جیسے میں غار کے قریب ہوتا جاتا تھا ڈھول کی آواز تیزی سے میرے کانوں میں آتی۔ میں قریب پہونچا اُس وقت سب اندر داخل ہو چکے تھے غار میں بالکل اندھیرا تھا۔ میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا، تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک کشادہ جگہ پر بہت سے راجپوت جمع ہیں اُن کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں اور سر درگا دیوی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ ڈھول بند ہوا اور پجاری نے جو دیوی کے قدموں میں کھڑا تھا کہا، ہیضہ تمام گاؤں میں پھیل چکا ہے روزانہ چالیس پچاس آدمی مرتے ہیں۔ یہ اُس وقت تک کم نہ ہوگا جب تک کہ دیوی پر (نربلی) نہ دیا جائے گا، اس لئے آپ لوگوں کو یہاں بلایا گیا ہے جو شخص خوشی سے اپنے آپ کو دیوی پر قربان کرنا چاہے وہ باہر آجائے اس کی وجہ سے ہم لوگ مصیبت سے بچ جائیں گے، اور ایشور اُس کو سُورگ میں جگہ دے گا: چاروں طرف خاموشی طاری تھی، ایک شخص مجمع سے باہر نکلا اور دیوی کے قدموں میں جُھک گیا، پھر اُس نے خوشی سے اُٹھ کر کہا، "میں خوشی سے قربان ہونے کو تیار ہوں" اُس کی لڑکی اُس سے آکر لپٹ گئی اور روتے ہوئے کہا، "پتا جی! آپ کو کیا ہو گیا، آپ مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہیں"؟

پتا ۔ ایشور پر بیٹا! تم نہیں جانتیں، مذہب کے لئے، وطن کے لئے، گاؤں کے آرام اور چین کے لئے اگر میری جان جاتی ہے تو کچھ پروا نہیں، موت ایک نہ ایک دن ضرور آتی ہے، بیٹا پھر کیوں نہ وطن پر جان دے دی جائے، جس سے ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں نام رہے۔ اور دوسری دنیا میں بھی جا کر آرام اور سکون نصیب ہو، بیٹا تم اِن آنسوؤں کو پونچھ ڈالو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کو دیکھ کر تمہاری محبت، وطن اور قوم کی محبت پر غالب آجائے۔

بیٹی ۔ مگر پتا جی۔ آپ کے بغیر میں کب زندہ رہ سکتی ہوں۔ اگر آپ دیوی کے پاس جاتے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لیتے چلئے۔ میں کیسے دیکھ سکوں گی۔ نہیں پتا جی آپ نہیں جا سکتے ہیں۔ آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گی۔

پتا ۔ صبر کرو بیٹا، تم سمجھتی ہو، موت مجھکو تم سے جدا کر دے گی نہیں بیٹا محبت کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا، دنیا ایک جنگل کا کنواں ہے۔ جس پر مسافر آتے ہیں اور اپنی پیاس بجھا کر چلے جاتے ہیں۔ میں تم سے ایک نہ ایک دن ضرور جدا ہوتا۔ اب ان آنسوؤں کو روکو، تم نہیں جانتیں، جو شخص قوم اور وطن کے لئے جان دیتا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اُس کا نام سنہری حرفوں سے صفحۂ تاریخ پر لکھا جاتا ہے، اور سدا اُس کے گھروں میں چرچے رہتے ہیں۔ تم کو تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارا پتا ایک ایسا کام کر رہا ہے جس سے سیکڑوں کی جانیں بچ جائیں گی، اس لئے بجائے اس کے کہ تمہارے آنسو گریں تم مسکراؤ، تاکہ اس دنیا سے جاتے وقت میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ہو" (لڑکی خاموش ہو جاتی ہے، اُس کے آنسو رُک جاتے ہیں)

پتا ۔ (گلے سے لگا کر) ایشور تم کو سدا خوش رکھے۔ اس کو کبھی نہ بھولنا، اور دوسرے ایشور اپنے پتی کی سیوا کو اپنا دھرم سمجھنا، کیونکہ یہی

کی خدمت ہمارے لئے نجات کا باعث ہوگی۔ اچھا بیٹا تم کو ایشور کے سپرد کیا۔ بھاری سنے دعا پڑھی، بہادر راجپوت نے کھانڈا اٹھایا، اور ایشور کا نام لے کر ایک ہاتھ میں اپنی گردن اُتار کر دیوی کے قدموں میں ڈال دی۔

یہ ہے قومی محبت کی سچی اور چشم دید مثال، علم سے بے بہرہ، تہذیب سے ناواقف، ایسے اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم لوگ جس قدر تعلیم یافتہ ہوتے جاتے ہیں انسانیت کا مادہ فنا ہوتا جاتا ہے، خود غرضی اور بے مروتی ہر طرف پھیلی ہے، اپنے مطلب اور غرض کے سوا اور کچھ نہیں سجھائی دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے، کیا اسی کا نام ترقی ہے۔ آئے دن کی لڑائیاں، آئے دن کے جھگڑے، ذرا ذرا سی باتوں پر دشمنی، غرض دنیا بھر کی بُری باتیں ہم میں ہیں۔ جو شخص جس حال میں ہے اُس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

اے ہندو والو! اب جاگ جاؤ، تفرقہ چھوڑو۔ سب ہندی ایک ہیں، بھائی بھائی ہیں۔ مذہب خدا تک پہونچنے کی راہیں ہیں، جو شخص جس راہ پر چلتا ہے چلے، مگر ناقوس و اذان کی مشترکہ آواز پر سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں۔

کیا یہ باتیں ہماری گزشتہ شہرت کو واپس نہیں لاسکتیں؟

تاثراتِ کشمیر

شاعر کی دُعا

پھولوں کا چمن میں آشیانہ کر دے　　اللہ حقیقت کو فسانہ کر دے
انسان کے ہاتھوں اِسے برباد نہ کر　　کشمیر کو فردوس روانہ کر دے

سرزمینِ گُل

بہار خطۂ کشمیر اے معاذ اللہ　　گلوں کا ایسا خزانہ کہیں نہیں دیکھا
نظر کو جان بچاتے ہوئے نہیں پایا　　زمیں کو لعل اُگلتے ہوئے نہیں دیکھا

صبحِ کشمیر

چشمے کی طرح صبح اُبلتی ہوئی دیکھی　　سُورج کی کرن برف پہ چلتی ہوئی دیکھی
مشرق کے مسافر نے جہاں آنکھ دکھائی　　چاندی سی پہاڑوں پہ پگھلتی ہوئی دیکھی

بسم آفندی

عورت، مرد و محبّت

عبدالوالی فرنگی محلی

ہر کتاب پُرانے زمانے میں خدا کے نام سے شروع کی جاتی تھی، اُس کی برکت حاصل کرنے کے لئے اس کے بعد یہ طریقہ نکلا کہ کسی بڑے مگر بیوقوف آدمی کے نام معنون کی جانے لگی، اُس سے مالی مدد حاصل کرنے کے لئے۔ فریب دینے والے سب کو فریب دیتے ہیں، خدا کو اُس کی حمد و ثنا کرکے، اور اُمرا جو ظل اللہ ہیں اُن کو کتاب معنون کرکے، میں اپنے اس چھوٹے سے قصّے کی ابتدا ایسے شخص کے نام سے کرتا ہوں جو نہ بڑا ہے نہ بیوقوف، میرا ممدوح وہ ہے جس کی ذات اُن تمام خطاؤں سے مملو ہے جو انسان کو دلچسپ انسان بناتی ہیں۔ وہ ہے جسے اچھا کہنے والے شاید دو ہی چار ہوں، یا نہ بھی ہوں۔ لیکن دلچسپ کہنے والے بہت ہیں، خوش مذاق ہے، لطیف ذہن رکھتا ہے، اکثر بہت مزے کی باتیں کرتا ہے، بس اور کیا چاہئے، کوئی کسی کو بخشوانے تو جاتا نہیں! انسان عبادت کے لئے خلق کیا گیا ہے، کیا مزے کی باتیں کرنا یا مزے کی باتیں سننا عبادت نہیں ہے؟ جو نہ سمجھتے ہوں نہ سمجھیں میں تو اسے عبادت سمجھتا ہوں۔

انھیں خیالات کی بنا پر میں اپنے اس قصّے کی ابتدا محمد علی ردولوی کے نام سے کرتا ہوں، جو انسانیت کو فرشتگی سے جدا، کہنے والا، مزے کی باتیں کرنے والا، اور نکاح پر نکاح کرنے والا ہے، خدا اُس کو حاجی سے ناجی کرے، جیسے راجہ جہانگیر آباد ہی، ایس، آئی، سے کے، سی، آئی، ای ہوئے، اور مجھ عبادت گزار کو زیادہ عبادت گزار بنائے،

آمین یا مجیر

گذارش

خیال مکان و زمان کی قید سے بری ہے، خیال کی تصویر میں بھی مکان و زمان نہ ڈھونڈا جائے، کوئی یہ نہ پوچھے کہ کس زمانے کی سوسائٹی یا کس جگہ کی سوسائٹی کی تصویر اس قصے میں کھینچی گئی ہے، کیونکہ یہ ایک خیال کی تصویر ہے، ایک خیال کے خدوخال اس میں دیکھو، کسی سوسائٹی کے خدوخال دیکھنے کا قصد نہ کرو۔

خیال کا ایک رُخ پیش کیا جاتا ہے، پڑھنے والوں کو پسند آیا تو ان کی اور میری دونوں کی نجات کا سلسلہ قائم ہوجائے گا، ورنہ میری عبادت تو جاری رہے گی، جو لکھنا ہے لکھتا رہوں گا، جو نہیں پسند کرتے پڑھکے معصیت میں نہ گرفتار ہوں، جو گانا کانوں کو بھلا لگے رُوح میں ارتعاش پیدا کرے اُس کا سننا ثواب، اور جو کانوں کو بھلا نہ لگے اور رُوح کو پژمردہ کرے اُس کا سننا عذاب ہے، (عاصی عبدالوالی)

پہلا رُخ

رقیہ۔ خسرو نے میری تصویر کیسی ستیاناس کر ڈالی۔ میں کیا جانتی تھی، جب میری شکل بن چکی تھی اُسی وقت اُن سے چھین لاتی تو اچھا ہوتا، یہ تصویر اب میری نہیں رہی، کسی اور چیز کی تصویر ہوگئی۔ میری شکل صرف اس میں آ گئی ہے۔

نایاب بیگم، کیسی حسین تو تصویر ہے، تم کہتی ہو تصویر کو ستیاناس کر دیا، تمہیں بدلی کا چاند کرکے دکھایا ہے،

رقیہ - مگر میری تصویر تو نہیں رہی، بدلی کے چاند کی ہو یا بہار کی۔ رقیہ کی تصویر نہیں ہے، کوئی اسے دیکھ کے کہے گا کہ رقیہ کی تصویر ہے؟ رقیہ تو تصویر کا ایک خفیف سا جزو ہے،

نایاب - عالم بہار کا تمہیں جزو بنا کے دکھایا ہے، اس پر بھی تم خفا ہو، ایسی لاجواب تصویر کی تم نے یہ قدر کی۔

رقیہ - بہار مجھ پر چھا گئی ہے۔ اس نے مجھے فنا کر دیا ہے، اس کے روپ کے آگے میرا روپ مٹی میل ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصور کو بہار کے روپ کی زیادہ فکر تھی، میرے روپ کی فکر نہ تھی۔ تصویر میں میری شکل تو ہے، مگر میں نہیں ہوں، میں تصویر کی برائی نہیں کرتی، یہ کہتی ہوں کہ خسرو نے تو میری تصویر بنانے کو کہا تھا، یہ میری تصویر کب ہے، درخت کے پتوں کی سبزے میں جان ہے، بادلوں کے اودے پن میں جان ہے، نہیں ہے تو میری شکل میں، خسرو کو مجھ سے غرض نہیں، میرے حسن سے سروکار ہے، میرے حسن کو مجھ سے الگ کرکے دکھایا ہے، آگ لگے اس حسن کو، میری شکل اور میرا حسن ہے مگر میں ندارد، تصویر سے صاف غائب، خسرو! کیا کوسوں تجھے اور تیرے کمال کو، کیسا میرا دل دکھایا ہے۔

نایاب دل میں خوش ہوتی ہے، ایک نئی حقیقت اس پر افشا ہو رہی ہے، دنیا جانتی تھی کہ خسرو اور رقیہ ایک دوسرے کے عاشق ہیں، یہ ایک نیا راز کھل رہا ہے، کہ خسرو کے دل میں رقیہ نہیں ہے، خسرو کی جان کو سبز پتیوں اور اودے بادلوں سے زیادہ تعلق ہے کہ پتیوں اور بادلوں کی تصویر میں خسرو کی جان کی لپک پہونچ جاتی ہے، اور ان بے جان چیزوں کی تصویر اس کی جان سے جان پکڑ لیتی ہے، رقیہ کی تصویر بناتا ہے اور اس کی جان کی آگ شعلہ نہیں دیتی، کوئی لپک اس تصویر تک نہیں پہنچتی۔ نایاب کی خوشی کا باعث یہ تھا کہ خسرو کو وہ اپنا کرنا چاہتی تھی۔ گو وہ جانتی تھی کہ اس کی صورت میں وہ آب و تاب اور وہ کشش نہیں ہے جو رقیہ کی صورت میں ہے۔ پھر رقیہ کے ذہن و ذکاوت کا بھی وہ کسی ہیچ سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، مگر وہ یہ خوب جانتی تھی کہ خسرو کے ذہنی ہیجان اور اس کے صنعی احساسات کی دہکتی آگ کو سکون اور ٹھنڈک اگر کوئی عورت پہنچا سکتی ہے تو وہ۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ خسرو کے لئے ایسی عورت کی ضرورت ہے جو اس کے پیچھے اپنے کو تج دے۔ خسرو کو چاہنے والی عورت کی ضرورت ہے، چھوانے والی عورت کی نہیں۔ جذبات کی آگ سے وہ اپنے صنعی احساسات کو گداز کرتا ہے کہ تخلیقی صناعی کرے، خلاقی قدرت دکھائے کسی عورت کے واسطے جذبات کی آگ میں پھسلنا اس کا کام نہ تھا۔ کوئی عظیم کام کرنے والا جذبات کی آگ میں نہیں پھاندے گا، دور سے خالی تماشہ دیکھے گا، جذبات جسم و ذہن دونوں کو بھسم کر دینے والی چیزیں ہیں۔ جذبات کی آگ ذہن کو تیز اور جسم کو محرک کر سکتی ہے، جب مقدار ان کی مناسب اور موزوں ہو۔ مقدار بڑھ جانے سے ذہن و جسم دونوں کو ختم کر دے گی، جذبات سے کھیلنا آگ سے کھیلنا ہے، صنعتگر یا کوئی بڑا کام کرنے والا یہ کھیل نہیں کھیل سکتا۔

نایاب کم علم تھی کم فہم نہ تھی، اس کو یہ سب باتیں دھندلی دھندلی دکھائی دیتی تھیں۔ مگر اس کی سمجھ جو کچھ اسے سمجھاتی تھی وہ اسے اپنا کر لیتی تھی، اور اپنی زندگی کے دستور العمل میں انھیں داخل کر لیتی تھی۔ لطیف و نازک ذہنی نکات اس کی سمجھ سے باہر تھے، اس لئے ان پر کبھی غور بھی نہیں کرتی تھی۔ رقیہ صنعتگر شاعرہ تھی، نزاکت میں ذہن رکھتی تھی، حسن و عشق کو اپنی دنیا بنا رکھا تھا۔ اپنے حسن کی شمع کے گرد پروانے دیکھنا چاہتی تھی، اور خود بھی حسن کی قدر کرتی تھی، جسے اپنے خیال میں وہ عشق سمجھتی تھی۔ نایاب کو حسن و عشق کے رموز سے کوئی واقفیت نہ تھی، وہ زندگی کو سمجھ سکتی تھی، کیونکہ اسے محسوس کرتی تھی، اپنی زندگی کو بامراد بنانے کی خواہش اس میں شدت کے ساتھ تھی۔ اور ہمہ وقت اسی کی کوشش میں رہتی تھی، زندگی کو بامراد کرنے کا اس کے ذہن میں سیدھا سادہ راستہ یہی تھا کہ ایک عظیم ہستی رکھنے والا مرد اسے ملے، اسے اپنی مرضی کا بنائے اس مرد سے اولاد پیدا کرے، پھر ان کو اپنی مرضی کے موافق بنائے، وہ اپنی نسائی طاقتوں سے بے خبر نہ تھی، اور انھیں کامل طور سے استعمال کرنا بھی جانتی تھی۔ رقیہ سے اس کو رشک و حسد نہ تھا، کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ رقیہ اور وہ دو مختلف قسم کی عورتیں ہیں، رقیہ کا راستہ دوسرا ہے اور اس کا بالکل دوسرا۔ اس سے اور رقیہ سے تصادم

ہو سکتا نہیں سکتا۔ رقیہ کو وہ سمجھ گئی تھی، ایسا مرد درکار ہے جو اُس پر فریفتہ ہو، اُس کی پرستش کرے۔ اسے ایسے مرد کی تلاش ہے جس پر یہ فریفتہ ہو، اور اپنی مرضی کا بنائے۔ اس کی نظر انتخاب خسرو پر اس لئے پڑی کہ بغیر دلیل اسے کسی طرح یہ پتہ چل گیا کہ خسرو اپنے جذبات کا مصرف یہ نہیں سمجھتا کہ عشق عاشقی کی جائے، وہ اپنے جذبات کو صنعتگری میں صرف کرنا چاہتا ہے، اُسے خسرو کے حُسن سے مطلب تھا نہ ذہنی کمالات سے بلکہ خسرو کی ذات سے اسے غرض تھی۔ کسی طرح اُسے یہ یقین ہوگیا تھا کہ خسرو کو وہ اپنا کرکے چھوڑے گی۔ اس لئے پرسش کے اور سمجھ کے کہ خسرو کا دل رقیہ کی طرف نہیں مائل ہے، وہ اپنے یقین اور خیال کی ایک سیڑھی پر گویا اوپر چڑھ گئی۔

جب نایاب نے رقیہ کو بہت افسردہ خاطر دیکھا تو سمجھانے لگی اور کہا۔ تصویر کون بڑی اہم چیز ہے، جس پر اتنے غم اور غصے کا اظہار کرتی ہو؟ رقیہ نے جواب دیا "نایاب! تم نہیں جانتیں میرے دل کی کیا حالت ہے، تم اسے ذرا سی بات سمجھتی ہو، میرے لئے زندگی کا یہ اہم واقعہ ہے، میری اس میں کوئی خطا نہیں کہ میری طبیعت حساس واقع ہوئی ہے" نایاب نے کہا "حساسی کو جتنا بڑھاؤ گی بڑھتی جائے گی، طبیعت کو بے لگام کیوں چھوڑو۔ طبیعت ہمارے قابو میں ہونا چاہئیے نہ کہ ہم طبیعت کے قابو میں۔ زندگی کی تکلیفوں کی جڑ، میرے خیال میں طبیعت کا بے قابو ہونا ہے" رقیہ بولی "تم کیا جانو، بے قابو طبیعت زندگی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے، زندگی کی پوری شاعری اور پورا مزہ اسی تڑپ اور بے قابو پن میں ہے" نایاب رقیہ کا جواب پاکے چپ ہورہی۔ اتنے میں خسرو اور ناصر آگئے۔

خسرو۔ کہو اس وقت کس مرد کا ذکر ہے؟ تم عورتوں کو تو ہر وقت مردہی کا رونا رہتا ہے۔

رقیہ۔ کیسے مرد کا رونا عورتیں نہ روئیں، عورتوں کو پرلطف خواب سے تم لوگ چونکا دیتے ہو، ان کی بہشت کو دوزخ بنا دیتے ہو، چاہ اور پیار سے اُن کا دل لے لیتے ہو، اور جب وہ دل کھو بیٹھتی ہیں تو دامن جھٹک کے الگ کھڑے ہوجاتے ہو۔

خسرو۔ میری پیاری شاعرہ! تو مرد و عورت کے باہمی تعلقات پر اپنی شاعری کیوں ضائع کرتی ہے، اپنے پاکیزہ ذہن کو اس آلائش وگندگی میں ڈال کے کیوں ناپاک کرتی ہے، ایسا حسن اور ایسا ذہن رکھنے والی عورت مرد کا رونا روئے یہ اس کی شان کے خلاف ہے،

رقیہ۔ کوئی شان کو لے کے کیا کرے، جب زندگی کی مراد پوری نہ ہو، شان کو دیکھے یا مراد کو۔ بے شان کی زندگی لطف کے ساتھ گزر سکتی ہے، لیکن نامراد زندگی قہر و عذاب ہے۔

خسرو۔ شاعری کی مراد زندگی شعر ہے۔ اُس کی نامرادی شعر کا نہ نکلنا، اور خیال کا نہ آنا ہے۔ حافظ نے سمرقند و بخارا ایک کالے تل پر نثار کیا تھا، شاعر اپنے خلق کئے ایک شعر اور ایک خیال پر دونوں جہان کی نعمتیں نثار کردے تو بھی کم ہے، تم پر اس وقت عورت پن غالب ہے، یہ عورت پن یہ باتیں تم سے کہلا رہا ہے، دیکھو تصویر میں میں نے تمہارا عورت پن کیسا چھپایا ہے، بادلوں میں اسی لئے دکھایا ہے کہ تمہیں خاکی سے افلاکی کردوں (تصویر پر نظر پڑتی ہے، اُٹھالیتا ہے) یہ دیکھو! میری حسین رقیہ کتنی بلند ہے، بلکہ بلندی سے بلندی پر جانے کے لئے آمادہ ہے، عرش سے خیال لاکے بادلوں کی بلندی میں شعر پیدا کرے گی، اور کثرت ارضی آدمیوں کے دماغ منور کرنے کو نیچے پھینک دے گی۔

رقیہ۔ خدا کے لئے تصویر کا ذکر نہ کرو۔ اس تصویر اور ان باتوں سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ میں اس خواب وخیال میں تھی کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ میں کیا، دنیا یہی سمجھتی تھی۔ اس ناشاد و نامراد تصویر نے مجھے ایک مزے کے خواب سے جھنجھوڑ کے جگا دیا۔ جو دنیا میرے خیال نے بنائی تھی پاش پاش ہوگئی۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میری تصویر بنانے کو کہا اور نہ معلوم اپنے کس خیال کی تصویر بنا دی۔

خسرو۔ میں نے دھوکا نہیں دیا، تمہاری ہی تصویر بنانے بیٹھا تھا۔ پہلے تمہاری ہی شکل کنوس پر بنی تھی۔ پھر نہ معلوم کیا ہوا۔ میں نہیں جانتا کون تصویر میرے دماغ میں تھی، جو کنوس پر آگئی۔ تم جانتی ہو صناع اپنے اوپر قابو نہیں رکھتا۔ اُس سے حکم دے کے کوئی چیز نہیں بنوائی جاسکتی۔ وہ تو دل کی رَو کے تابع ہے جو رَو آئی اُسی پر چلنے کے لئے مجبور رہے، یہ بات تمہیں خود سمجھ لینا تھی۔

رقیہ۔ مگر مجھے یہ کیا خبر تھی کہ حقیقۂ خسرو کے دل میں نہیں ہے، صرف زبان پر ہے۔ رقیہ تو یہ جانتی تھی کہ خسرو کے دل کی رُو رقیہ کے قابو میں ہے، کس شوق اور کس تلک سے میں تصویر لائی، کہ اپنے کو تمہارے ہاتھ سے بنا ہوا دیکھوں۔ یہ دیکھوں کہ خسرو کی رقیہ کیسی ہے، میرے دل پر کیا گھونسہ پڑا ہوگا بخیال کرو، جب میں نے یہ دیکھا کہ تصویر سے میں غائب ہوں، جو شکل دکھائی گئی ہے میری لاش تک کی نہیں ہے، میری صورت سے ملتی جلتی کسی فرشتے یا جن کی تصویر دکھلا دی گئی ہے، خسرو تم نے مجھ پر ایسا ظلم کیا جس کی تلافی ناممکن ہے۔

خسرو۔ خسرو کی رقیہ تو اس تصویر میں موجود ہے، البتہ وہ رقیہ نہیں ہے جو سونے والے کمرے میں لٹکائی جائے۔ رقیہ عزیز کو جنسی معاملات جنھے محبت کے نام سے پکارا جاتا ہے اس میں کیا رکھا ہے، جس طرح پانی میں کنکری پھینکنے سے دائرے پر دائرے بننے لگتے ہیں، اسی طرح لفظ منہ سے نکلنے سے خیالات کے دائرے پر دائرے بننے لگتے ہیں، محبت کا لفظ منہ سے نکلا کہ معانقے چمٹنے، پیار کرنے دوسرے جسم کو دبوچنے کے خیال آنے لگے، اور ہیجان بڑھا تو ایک طرف سے انکار دوسری طرف سے اصرار، گوشے اور کونے ڈھونڈھنا، پھر گندگی اور آخر کار۔ ناپاکی دور کرنا، یہ سب خیالات لفظ محبت کے گرد دائروں کی صورت میں چکر لگانے لگتے ہیں، محبت ایک مادی حاجت کا شاعرانہ نام ہے، ویسی ہی حاجت جیسے کھانا کھانا، آنتوں سے غیر ضروری چیز خارج کرنا وغیرہ۔ شاعری یا کسی اور صنعت کو عشق و محبت پر صرف کرنا صنعت کی ستیاناسی نہیں تو اور کیا ہے، کھانا کھانے کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے مگر طعام کا عشق کسی کو ہوتے نہیں دیکھا، اسی طرح پانی پر کسی کو عاشق ہوتے نہیں دیکھا، گو پانی پیاس بجھا کے بعد تفریح جسم کو پہنچاتا ہے، کھانا کھانے کا کام بجائے خود کوئی پُر لطف کام نہیں، گو نتیجہ اُس کا جسم کے لئے مفید ہو، اگر منہ میں چبا ہوا کھانا کوئی دیکھے تو غیر ممکن ہے کہ گھن نہ آئے، عشق و محبت کا آخری نتیجہ بھی کس قدر گھنونا ہے اور بالکل آخری نتیجہ بچہ پیدا ہونا کوئی دلکش منظر نہیں پیش کرتا۔

رقیہ۔ کس طرح کی واہیات باتیں تم کر رہے ہو،

ناصر۔ کہاں لطائف ذہنی اور کہاں یہ گندی باتیں۔

خسرو۔ یہی تو کہتا ہوں، کہ لطائف جس کا سر اسر گندگی ہیں، منہ سے نکالو یا نہ نکالو۔ اس پر خاموشی کا پردہ ڈال کر اپنے ذہنوں کو دھوکہ دو،

ناصر۔ فطرت کے تقاضوں پر پردہ ڈالنے اور نہ ڈالنے سے کوئی فرق نہیں آتا۔

خسرو۔ ناصر کیا ظلم کرتے ہو، فطرت کی طلب میں بھی جانتا ہوں، ناگزیر ہے تم اس طلب کو ذہنی لطائف سے سجا کر اس کی گندگی کو بھی چھپاتے ہو، مجھے اس پر اعتراض ہے، نر و مادہ دائمی اور لابدی حقائق ہیں، جانور اور انسان دونوں اس سے واقف ہیں، مگر جانور اسے روحانی فعل نہیں بناتا، اس کے گرد ذہنی لطائف کے دائرے نہیں قائم کرتا، شاید اُس کی گندگی سے باخبر ہے، تم اس کی گندگی پر پردہ ڈالتے ہو، طلب کو طرب بناتے ہو، پوری انسانی صنعت اس پر صرف کرتے ہو، نتیجہ اس کا عورتوں عورتوں کی بدکاری، مردوں مردوں کی بدکاری، امراض، نامردی، کمزوری، موت۔

رقیہ۔ مجھے قائل کرنے کی کوشش نہ کرو، تمہاری باتیں جراحت پر نمک کا کام دے رہی ہیں، مجھے تم سے نفرت ہو گئی،

خسرو۔ صرف تم کو نہیں، ناصر کو بھی نفرت ہو گئی ہوگی، کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ نفرت کی کیا وجہ ہے، یہی نا کہ تمہارے حُسن کو تم سے الگ کرکے جو دکھایا!! اپنی شہوانی خواہشوں کو اس میں شریک نہیں کیا، اس وجہ سے؟ رقیہ تم اپنے کو اس درجے گرا رہی ہو کہ مرد کی شہوانی خواہشات سے اپنے حُسن کی جانچ کرتی ہو، جہاں تک عورت کا تعلق ہے مرد باد کے بندے ہیں، ان باد کے بندوں کی آنکھ سے تم اپنے حسن کو دیکھنا چاہتی ہو، میں تمہارے حسن کو صنعت کی روشنی میں دیکھتا ہوں، اگر کسی دوسری روشنی میں دیکھوں تو وہ حسن میرے لئے حُسن نہ رہے، ہر بچہ دینے والی مادہ کی طرح تم بھی ہو جاؤ۔ جو تکلیف و مایوسی میں اپنی تصویر دیکھ کے ہوئی وہی تکلیف اور دُکھ مجھے ہو، اس سے مجھے انکار نہیں کہ دوسری عورتوں کی طرح تم بھی ایک عورت ہو حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی ذہن مادی عالم سے ایک غیر مادی عالم پیدا کر سکتا ہے، اسے دل فریب دھوکا سمجھو، لیکن اس حقیقت کے وجود سے تم انکار نہیں کرسکتیں، جسے ایسا ذہن عطا ہوا ہو کہ یہ دلفریب دھوکے پیدا کرسکے،

توانائی سے کیوں نہ مزے اٹھائے۔ شہوانی خواہشات سے چھٹکارا اتنا ہی مشکل ہے جیسے بھوک یا اجابت کی ضرورت سے، ان فطری خواہشوں کو ذہن کی مدد سے تیز اور دھار دار کرنا جب ذہن اور لطائف بھی پیدا کرسکتا ہے حماقت نہیں تو اور کیا ہے، میں اپنی شہوانی خواہشات کی مدد سے نہیں ایسا بنا دیتا کہ ہر مرد کی تم پر رال ٹپکتی تو کیا تم خوش ہوتیں؟

بادہ پرست مرد اور بادہ پسند عورت دنیا بس تیری ہے! تیرے ہی گیت دنیا گاتی ہے، مگر مجھے بادہ کے گیت گانے کی فرصت نہیں، میں معاف کیا جاؤں۔

رقیہ۔ تم سے کون بات کرے، تم تو ایک جملہ کے جواب میں داستان کی داستان سنانے لگتے ہو۔

خسرو۔ اب مجھ سے نفرت تو نہیں ہے، ناصر سے پوچھو وہ کیا کہتے ہیں۔

ناصر۔ جو عورت تم سے محبت کرے اس کی مٹی خراب ہے،

خسرو۔ اس چھوٹے سے جملے میں معانی کی دنیا پنہاں ہے۔

(رقیہ کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے، مگر منہ پھیر کے چھپا لیتی ہے)

ناصر۔ معانی پنہاں نہیں بالکل آشکار ہے، ذہن کے نازک نکات اور ان کے لطائف کے پیچھے تم پھرو۔ اور تمہارے پیچھے وہ بدبخت عورت، ایسی عورت کی زندگی برباد نہیں تو آباد ہوگی؟

خسرو۔ مجھے اپنی فکر سے چھٹی نہیں، دوسروں کی آبادی یا بربادی کی ذمہ داری کیسے لوں۔ میرے لئے عورت عذاب ہے،

نایاب۔ اچھا یہ قصہ کبھی ختم بھی ہوگا، اپنی فکر اگر تمہیں ہے تو پہلے جان و جسم کی خبر لو، تین دن سے گھر میں کھانا نہیں کھایا ہے، ہوٹلوں میں کھانا کھا کے صحت قائم رہ سکتی ہے؟ پھر ٹھیک وقت نہیں، صبح کا کھانا دوپہر کو، دوپہر کا شام کو، کپڑوں کو دیکھو، تین مہینے سے ایک ہی سوٹ پہنے پڑے ہے، نازک ذہنی نکات کے لئے یہ باتیں بھی کیا ضروری ہیں؟

خسرو۔ یہ بالکل دوسری قسم عورت کی ہے، رقیہ سے بالکل مختلف نایاب قسم کی عورت نہایت خطرناک ہوتی ہے، رقیہ قسم سے تو پیچھا چھڑانے کی فکر کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ وہ از خود خفا ہو کے الگ ہو جاتی ہے

لیکن دایا عورت جسے مرد کے کھانے اور کپڑے کی فکر ہو وہ اس اژدہے کی طرح ہے جو لپٹ کے ہڈی پسلی توڑ دیتا ہے، جو عورت شفقت مادرانہ کرنے پر آمادہ ہو جائے اس کی پناہ نہیں ہے، (نایاب سے) آپ کو میرے سوٹ اور میرے پیٹ کی فکر کیوں ہے؟

نایاب۔ فکر کیسے نہ ہو، ایک شخص ہے کہ اپنی جان گنوائے دے رہا ہے، کچھ خیال نہیں کرتا، اگر صحت خراب ہو گئی تو آپ کے ذہنی نکات سب غائب ہو جائیں گے۔

خسرو۔ اچھا تو انسانی ہمدردی کا جذبہ جوش زن ہے، لوگو آؤ، اور ان ہمدرد انسان عورت کا نظارہ کرو! نایاب زندہ باد! انسانی ہمدردی زندہ باد!

نایاب۔ مجھ پر تمہاری ان تیزابی باتوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ تمہاری کوشش بیکار ہے۔

خسرو۔ یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ ہمدرد انسان عورتیں بہت خطرناک ہوتی ہیں جس کو تاکیں اس کو ماریں اور ایسا ماریں کہ اٹھ کے پانی نہ پئے۔ اچھا نایاب! کچھ کھانے کو دو، بہت بھوکا ہوں۔

نایاب۔ میں سمجھ گئی تھی، یہ تیز و ترش باتیں بھوک کا نتیجہ ہیں۔ میں نے چہرہ دیکھ کے معلوم کر لیا تھا، ذہن کے بہت سے کرشمے معدہ کی کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

خسرو۔ دایا عورت حقائق مادی سے خوب آگاہ ہوتی ہے، مادی قوانین اس کی گرفت میں رہتے ہیں۔ اسے ذہن کی تراوشوں سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

نایاب۔ ناشتہ تیار ہے۔ سب لوگ کھانے کے کمرے میں چلیں گے یا یہیں برآمدہ میں منگایا جائے۔ اماں نے دوپہر کو کھانے کے وقت انتظار کیا، جب تم نہیں آئے تو کہا کہ ناشتے کا پورا انتظام کرلو۔

خسرو۔ ایک اہل اللہ اپنے زعم میں کہہ اٹھے تھے "جو میں چاہتا ہوں وہی خدا کرتا ہے" ان بزرگ کا تو خالی خولی زعم تھا، مگر نایاب بغیر کہے وہی کراتی ہے جو چاہتی ہے: "اماں نے دوپہر کو کھانے کے وقت انتظار کیا، یہاں تک ممکن ہے ٹھیک ہو، مگر یہ کہ "کہا کہ ناشتے کا پورا انتظام کرلو" اس میں ایسا نازک اور لطیف دروغ ہے کہ جس کی پناہ نہیں ہے، نایاب

کی اتا کو میری صورت سے نفرت ہے مجبور ہیں، گھر سے نکال نہیں سکتیں، بیگم خالہ ہیں بھانجے کو کیسے نکالیں، نایاب! کیا انھیں اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تم میری خاطر اور میرا خیال کرتی ہو، مگر سنگ آمد و سخت آمد کا معاملہ ہے جو تم چاہتی ہو اُن سے کرا لیتی ہو، یہ بھی تم نے کہوا لیا ہوگا کہ ناشتہ تیار رکھو، نایاب قسم کی عورت اپنی مرضی نہیں ظاہر کرتی، کسی سے کہتی نہیں کہ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ وہ ایسی صورتیں پیدا کر دیتی ہے کہ اُس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو ہی نہ سکے وہی ہو جو اُس کی مرضی ہے۔

نایاب تیری پناہ نہیں ہے! آنکھوں والو دیکھو! کانوں والو سنو! نایاب کہتی ہیں خالہ اتا کے حکم سے میرے لئے ناشتے کا انتظام ہوا ہے، جو نایاب دکھائے، اور جو سنائے، ہمیں دیکھنا اور سننا ہے! (رقیہ و ناصر ہنستے ہیں نایاب کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ ہے مگر فاتحانہ مسکراہٹ) یہ عورت خلاق صنعتگر ہے، اس کی صناعی کا مال مسالہ وہ نہیں ہے جو شاعروں مصوروں اور بُت تراشوں کا ہوتا ہے، اس کا مال مسالہ مرد ہے اس کے بعد بچے۔ اس کو مرد حاصل کرنے کی فکر ہے۔ ایسا مرد جس پر وہ اپنی صنعتگری صرف کرے، اُس کو جیسا چاہے ویسا بنائے۔ اپنا مال مسالہ وہ خود ڈھونڈ کر حاصل کرنا چاہتی ہے دوسروں کا دخل اس کام میں نہیں چاہتی۔ مرد پا کے اُسے بنائے گی جیسے حوّا نے آدم کو بنایا تھا۔ خدا کی خالی حمد و ثنا کرنے والے، مناظرِ قدرت سے مست ہونے والے، خیالات میں محو رہنے والے آدم کو دنیا دار گنہگار، خاطی، نسل پرور آدم بنایا تھا۔ نایاب پوری حوّا ہے، اپنی قسم کا نمونہ ہے۔ وہ مرد جن کے دماغ آسمان کی بلندیوں تک اُڑنے والے ہیں، نایاب قسم کی عورت اُنھیں اپنی کاریگری کا مال مسالہ سمجھتی ہے جیسے معمار اینٹ چونے کو، کمہار مٹی کو، لوہار لوہے کو، مصوّر رنگ اور کنوس کو، لوگو، ڈرو اور پناہ مانگو!!

نایاب۔ یہ لستانی کبھی ختم بھی ہوگی یا عورتوں کا رونا روتے ہی رہوگے۔

رقیہ۔ جب تشریف لائے تھے تو یہ فرماتے آئے تھے کہ عورتوں کو ہر وقت مردوں کا رونا رہتا ہے، اب تو میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ مردوں کو عورتوں کا رونا رہتا ہے۔

خسرو۔ اس وقت دو مختلف النوع عورتیں اکٹھا ہیں۔ اس لئے خیالات کو تحریک ہوئی۔

رقیہ۔ دو مختلف النوع مرد بھی تو اکٹھا ہیں، عورتوں کے خیالات کو بھی تحریک ہو تو کیا بیجا ہے، ایک مرد وہ جو اپنے سوا دوسر کی چھان نہیں دیکھتے، دوسرے وہ جو اوروں کے لئے اپنی پروا نہیں کرتے،

خسرو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں، ایک قسم کا نمونہ خسرو دوسرے قسم کا نمونہ ناصر۔

رقیہ۔ میں اقسام کا ذکر کرتی ہوں، افراد کا نہیں۔

خسرو۔ ناصر! تمہارے لئے اپنی دلی مرادیں حاصل کرنے کا زرّیں موقع ہے،

بازے چنیں بدست وشکارے منی کُنی

رقیہ۔ ناصر ایسے نہیں ہیں کہ اپنے دل کی باتیں ہتھیلی پر لئے پھریں۔

خسرو۔ ہاں یہ رموزِ عشق ہیں، دل کی باتیں دلوں سے ہوتی ہیں۔ زبان پر اُن کا آنا عشق کو رسوا کرنا ہے، یہی بات ہے نا! عشق کو عشق کہو، کسی دوسرے نام سے نہ پکارو، اس کو رسوائی سے بچاؤ! مسجد کو اینٹ چونے کا مکان کہنا اس کی رسوائی اور توہین ہے، بُت کو پتھر کہنا اُس کی رُسوائی ہے، انسان جس چیز کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلیل کرے۔

رقیہ۔ وہی سلسلہ پھر شروع ہو گیا، نایاب بہن اِنھیں جلدی کچھ کھلا دو۔ منہ چلے تو زبان بند ہو۔

سب لوگ کھانے کے کمرے میں ناشتے کے لئے گئے، خسرو واقعی بھوکا تھا، ناشتے پر ٹوٹ پڑا، اسے ناشتے پر اس طرح ٹوٹتے دیکھکر ناصر نے کہا "خسرو! انسان باہ کا بندہ ہے یا پیٹ کا؟"

خسرو۔ کیا دونوں باتیں صحیح نہیں ہو سکتیں؟

ناصر۔ میں تو ایک ہی بات صحیح جانتا ہوں کہ انسان پیٹ کا بندہ ہے، کیونکہ ہر بات اس کے بعد آتی ہے، مذہب، تہذیب، صنعتگری حسن پرستی، یہ سب پیٹ بھرے پن کے ڈھکوسلے ہیں، ذہن کے کرشمے اور کرتوت پیٹ میں غذا پہنچنے کے تابع ہیں۔ انسان کے لئے سب سے پہلا مسئلہ روٹی کا ہے۔

خسرو۔ مسائلِ انسانی سلسلے اور انتظام کے تابع نہیں، میں کسی مسئلے کے متعلق اول و آخر کہنا ٹھیک نہیں، جس چیز کی شدت احتیاج ہو اسی کا مسئلہ مقدم ہے، علمی کتابوں میں ترتیبِ مسائل جو ہوتی ہے اُس سے ہم سب دھوکہ کھاتے ہیں۔ اول و آخر کی بحث میں پڑ جاتے ہیں، وہ ترتیب صرف سمجھانے اور ذہن میں اتارنے کے لئے ہے، بات چیت میں صغریٰ و کبریٰ کی ترتیب نہیں ہوتی، بھوکوں کے لئے روٹی کا مسئلہ یقیناً مقدم ہے، مگر جن کو روٹی آرام سے اور کثرت سے ملتی ہے اُن کے لئے یہ مسئلہ مقدم نہیں ہے، ناصر کے لئے رقیہ کا مسئلہ مقدم ہے، نایاب کے لئے خسرو کی خبر گیری کا مسئلہ مقدم ہے، میرے لئے پیٹ بھرنے کا مسئلہ اس وقت مقدم ہے، کسی عورت کا بچہ رو رہا ہو اس کے لئے دودھ پلانے کا مسئلہ مقدم ہے، کسی کو زور کا پیشاب لگا ہو اس کے لئے پیشاب کا مسئلہ سب سے مقدم ہے، ناشتہ کرنے کے بعد مجھے اپنی تصویر جس کی رقیہ تحقیر کرتی ہیں جان سے زیادہ عزیز ہو جائے گی، انسان کے لئے اس کی زندگی کی مراد حقیقی چیز ہے، اور باقی سب چیزیں آنے جانے والی ہیں، آؤ ہم سب اپنی اپنی زندگی کی جے منائیں۔

خود را نہ پرستیدی و ایماں چہ شناسی
کافر نہ شدی لذتِ عرفاں چہ شناسی

(شاعر کی روح میری ترمیم سے نہ شرمائے، میری راہ دوسری ہے اُس کی راہ دوسری تھی)

(دوسرا رُخ آئندہ)

خلوتِ رنداں

جی پور چل کہ یار غزل خواں ہے آجکل
یعنی چراغِ خلوتِ رنداں ہے آج کل

اپنی جفاؤں پہ وہ پشیماں ہے آجکل
تجدیدِ اشتیاق کا ساماں ہے آج کل

پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آجکل
پھر ہوش و عقل شعلہ بداماں ہے آج کل

ساقی نے پھر بلائے ہیں احبابِ بادہ نوش
یعنی شکستِ توبہ کا فرماں ہے آج کل

آزاد ہیں زمان و مکاں کے قیود سے
ہر لحظہ سجدۂ درِ جاناں ہے آج کل

ساقی کے التفات سے مستی فضا میں ہے
ہر اک گدائے میکدہ سلطاں ہے آج کل

اُس شاہدِ خیال کی رنگینیٔ خرام
قدموں میں جس کے ایک گلستاں ہے آج کل

اللہ رے اُس مُغنیٔ آتش نفس کی لے
توبہ! کہ اِس سے رُوح بھی رقصاں ہے آج کل

کیا پوچھتے ہو رنگِ ضیا اہلِ میکدہ
سجادہ و قبائے زر افشاں ہے آج کل

محمد ضیاء الاسلام ضیا بی۔ ایس۔ سی
بجنور

محبّت

جی، اے، مجیبیؔ، الہ آباد

مست بھونرے نے نیم باز کلیوں کے بوسے لئے، ان کے گرد منڈلا منڈلا کر محبت کے گیت گنگناتا رہا ــــــ اُس نے کلیوں سے بڑی عاجزی کی ــــــ بہت گڑگڑایا ــــــ معصوم کلیاں اُس کے دم میں آگئیں۔ انھیں پہلے پہل محبت کا راز معلوم ہوا تھا، وہ بیخودی میں سب کچھ بھول گئیں، شرم و حیا سب بیخودی نے جذب کر لیا۔ خزاں کا کچھ بھی خوف نہ رہا ــــــ محبت میں سرشار نوشگفتہ کلیاں ــ انھوں نے اپنی پنکھڑیاں کھول دیں اور ہوا میں جھومنے لگیں ــــــ بالکل اسی طرح جیسے ایک سانپ بین کی آواز پرست ہو جاتا ہے۔

سیاہ بھونرے نے ان کی پنکھڑیوں کو چھوا، اپنے پروں کی ہلکی ہلکی ہوا سے ان کو پنکھا جھلتا رہا ــــــ پھر وہ ان پر بیٹھ گیا ــــــ پھولوں کے بیچ میں۔ اس نے دھوکا دے کر اُن کا سارا رس چوس لیا، اور پھر ــــــ پھر وہ اُڑ گیا ــــــ اپنی کامیابی پر گنگناتا اور محبت کے پُرانے افسانے دھراتا ہوا۔

کلیاں بہت دنوں تک اس کا انتظار کرتی رہیں۔ مگر وہ واپس نہ آیا۔ اُنھوں نے سمجھ لیا کہ سخت فریب کھایا، بھونرے نے ان کو جُل دیا ــــــ انکا سب کچھ لُوٹ کر چلتا بنا۔ اُنھیں بہت صدمہ پہونچا ــــــ وہ بہت روئیں اور اس وقت تک روتی رہیں جب تک کہ بادِ خزاں کے تند جھونکوں نے اُن کی پنکھڑیوں کو ہوا میں منتشر نہ کر دیا۔

محبت صرف کمزوروں کو ستاتی ہے۔ مرد صنف نازک سے محبت کرتا ہے ان کو کھلونا سمجھ کر ایک وقت تک کھیلتا رہتا ہے ــــــ پھر اُنھیں چھوڑ دیتا ہے ــــــ وہ بالکل بھول جاتا ہے کہ اس کی دلچسپی کا ذریعہ کون تھا ــــــ مگر عورت ــــــ اس کی محبت لازوال ہے، ــــــ وہ اُس پر قربان ہو جاتی ہے۔

تاثرات ـ کشمیر

ہے تیرے عروج میں بھی پستی کشمیر
تکلیف بھی راحت بھی ہے ہستی کشمیر
جنگل ترا فردوس ہے بستی دوزخ
اعراف ہے گویا تری بستی کشمیر

انجم زندی

نقد و نظر!

(ادارہ)

طنزیاتِ مانپوری ( ) : حصہ اوّل، مجلد، ناول سائز ضخامت، ۱۴۱ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بدرجۂ اوسط، قیمت عمر۔ ملنے کا پتہ، منیجر ندیم، گیا (بہار)،

میرزا غالبؔ نے اپنے ایک مکتوب میں کسی جگہ کہا ہے کہ "اگرچہ ظرافت کو میری دیکھا دیکھی سارا ہندوستان لے اڑا ہے، لیکن آج تک یہ چیز، بلا شرکت غیرے، میری ہی متاعِ ادب بنی ہوئی ہے"! (بروایت بالمعنیٰ!)

ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ کا یہ خیال اک نہایت وسیع حقیقت کا عنوان ہے، یہی چیز ہے، جس نے اک مغربی نقاد کی زبان پر یوں اظہار پایا ہے کہ، "ہر موضوع پر اک ضخیم تصنیف لکھ ڈالنے کی جرأت عموماً وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو اُس موضوع پر قلم اٹھانے کے سب سے زیادہ نا اہل ہوتے ہیں"!

حافظؔ کا مشہور نوحۂ نقالی اسی بے مایہ شغلِ "میمونیت" پر وقف ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
دہانِ یار کجا و زبانِ سوسن کو؟ نہ ہر کہ گل کہ بخندد مقرری داند
ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجا ست نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند

اور یہی حقیقت ہے جو اپنی پوری رفعت، نیز اپنی پوری شدت میں اس طرح اک صدائے غفلت شکن بنتی ہے کہ ؎

قیامت ہے کہ احمق اس جگہ بھی دوڑ جاتے ہیں
فرشتوں کے قدم جس سرزمیں پر ڈگمگاتے ہیں!

اردو طنزیاتِ جدیدہ میں جناب رشید صدیقی اور پروفیسر پطرسؔ کے بعد مشکل کسی قابلِ ذکر نام کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ملا رموزی نے تو ما شاء اللہ اس میدان میں عالمگیر فتوحات کا پھریرا اڑانا چاہا، لیکن بہت جلد اُن کی ہمہ جہت دست افشانی و پاکوبی، "طَلَبُ الکُلِّ فَوتُ الکُلّ" کی مثال بن کر رہ گئی، لیکن وہ ہیں کہ طنزیات پر کتابیں کی کتابیں تصنیف کئے جاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو! الا آں باشد کہ چُپ نہ شود!

معلوم ہوتا ہے کہ اب حضرت مانپوری اسی معرکہ گاہ میں اس بلند آہنگ داعیۂ طبع آزمائی کے ساتھ اُترنا چاہتے ہیں کہ ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

کیسی رونے کی بات ہے کہ جس شخص کو دیکھئے ذرا شوق چرّایا، اور لبوں پر لک آورد کا تبسم طاری کیا۔ اک فرمائشی قہقہہ لگایا، اپنے شانے پر "بھاندوں کا کھنا کھنا" رکھا ——— جو عبارت ہے اُن کے خانۂ ظرافت شمامہ سے! ——— اور ادبی بذلہ سنجی کی بزم خاص میں دَر آیا! اب مان نہ مان، میں تیرا مہمان! . . . . ہمیں خوف ہے حضرت "مان پوری" بھی اس ضیافتِ طبع کی دعوت گاہ کے کچھ ایسے ہی "ناخواندہ مہمان" ہیں! مناسب ہو کہ وہ اپنی جولانیِ طبع کے لئے کوئی اور موزوں تر گوشہ منتخب کریں! ہم کو اک دوسرے شخص کی سی شہرت کی آرزو ہو سکتی ہے، لیکن اس کا میدانِ عمل ہمارا میدانِ عمل نہیں ہو سکتا، یکساں درجے کے کارنامے مختلف ماخذوں پر بھی انجام دیئے جا سکتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے

کہ ایک میدان کا مرد دوسرے میدان میں بچوں کی طرح گھٹنوں کے بل چلنے سے بڑھکر کچھ نہ کرسکے گا، جو بزرگ اپنے موضوع ذوق کو نہیں پہچانتے، امتیاز و شہرت کبھی اُن کو نہ پہچانیں گے، ع ہر کسی را بہر کارے ساختند!

مانپوری صاحب نے کچھ شعر گوئی بھی فرمائی ہے —— بھلا ممکن ہے کہ ہندوستان کا مسلمان ہو، اور شاعر نہ ہو؟! الغرض اکبر الہ آبادی مرحوم پر، بزعم خویش، اک "نقشِ ثانی" بہم پہنچاتے ہوئے "فیشنیات" کے تحت وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

فیس، فیشن نہیں اب چاکِ گریباں ہونا
سیکھ اب عقل کے دیوانوں سے عریاں ہونا

مگر اُردو طنزیات کی قلمرو کے "اکبر اعظم" کی مسند نشین پر قابض ہونا اتنا آسان نہیں جتنا ہمارے "آسان پسند" بزرگوں نے فرض کر رکھا ہے!

اکبر حسین مرحوم کی یہ شوخی کوئی کہاں سے لائے گا کہ ؎

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا سوں کا
جو پھاڑتے تھے جامہ، اب کوٹ سی رہے ہیں

(ا۔ا۔خ)

( ) اسٹوڈینٹس ٹری بیون (انگریزی) جونڑا

رسالہ جاتی سائز، ضخامت ۵۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت اعلیٰ، عام گیٹ اَپ مفا عانہ، متعدد تصاویر ارباب ادب و صحافت و سیاست، مقام اشاعت لاہور، قیمت فی کاپی ۸/

"اسٹوڈینٹس ٹری بیون" ہندوستان کے نوجوان طالبعلموں اور نوخیز جوانوں" کا آرگن ہے، جس کی گرمی زندگی اور پیام رستخیز کی بلند بانگی میں جواہر لال کے با اقبال سنین صدارت کانگریس وقیادتِ قوم نے برق در عدکے سے منتا ہر پید اکر دیئے ہیں؛ ہم بحیثیت اک مستقل قلمی معاون کے بھی "راشٹراپتی" کے قلمِ جواہر رقم کو "ٹری بیون" کے صفحات میں جولاں پاتے ہیں! مہاتما گاندھی بھی اس مرقع میں جلوہ گر ہیں! مزید براں رابندر ناتھ ٹیگور اپنے شانتی نکیتان (مسکنِ امن) کی "وادی امن" سے اکثر اپنے "پیامات کلیمی" سے روح پروری کرتے رہتے ہیں! رسالہ قدرۃً ہندو مسلم کی تفریق سے بالا و برتر ہے، اور اسکی بزم قلم ورقم میں ہر مذہب و ملت کے زندہ دلوں کی نمائندگی نظر آتی ہے، بشرطیکہ وہ غیرت و حریت، عزیمت و سبقت کے کلمۂ مشترک کے قائل ہوں!

رسالہ اِک نعمتِ غیر مترقبہ نظر آتا ہے۔ وہ سیاست و معیشت ہی کے ذکر و فکر پر محدود نہیں؛ وسیع صحافت اور ہمہ گیر ثقافت کے ادبیات سے بھی ہم آغوش ہے! طالبعلموں سے ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ اِس کی ایک کاپی امتحاناً خرید لیں، اور وہ دیکھینگے کہ وہ بیک نظر اس کے دائرہ شیدا ہو گئے ہیں! ہمیں خوف ہے کہ اگر ہم یونہی غائبانہ اُس کی صوری و معنوی خوبیوں اور گیرائیوں کی تصویریں کھینچینگے تو اگرچہ وہ محض اظہارِ حقیقت ہونگی لیکن مبالغہ کی طرح ممنوع ہونگی! ضرورت "شخصی مس" کی ہے۔ (ا۔ا۔غ)

دیوانِ غالب

"طاہر ایڈیشن" مجلد باتصویر غالب و منظر مزار و عکس تحریر قلمی مرزا مرحوم و مغفور، ضخامت ۴۰۰ صفحات، کتابت اعلیٰ نستعلیق نوک پلک کی، طباعت بعضی بلاک کی۔ کاغذ دبیز، سفید، چکنا، نام کتاب منقوش بخط زر برلوح، عام گیٹ اَپ دیدہ زیب، قیمت ۲ ؎۔ ملنے کا پتہ۔ آغا طاہر نبیرۂ مولینا محمد حسین آزاد مرحوم، کوچہ چیلان، دہلی۔

اُردو کتابوں کی طباعت، اور اشاعتی ہئیت اک رُسوا کُن معاملہ رہا ہے! حد یہ ہے کہ لوحِ محفوظ کا قرآنِ عظیم جب زمین پر نازل ہوتا ہے تو بکثرت صورتوں میں ایسے کاغذ وجلد کے پیکر میں کہ اس سے زیادہ توہین "الہامِ محمدی" کی دنیا کے سارے بدزبان بے ادب لوگ اور پُر عناد نقاد اپنی تمامی زہر چکانیوں اور حریفانہ کاوشوں میں بھی نہیں کرسکتے؛ بلاشبہ اس کا ذمہ دار مسلمانوں کا افلاس، بے ترتیبی، اور عام بد مذاقی و فقدانِ ذوقِ جمال ہی ہے، تاہم تمام مسلمان قوم یکسر ایسی نہیں، اور اُن کے اک خاص حلقے کی خدمت وضیافتِ طبع کے لئے باسلیقہ وخوشنما کتابوں کی اشاعت و فراخت کے کافی

مرقعے ہیں، مگر ان مستثنیٰ صورتوں میں بھی ہیں عام ناشرینِ اردو کی دونِ ہمتی و پست فطرتی مایوس کر دیا کرتی ہے، وہ گھاس کی فراہمی اور اس کی بکثرت بکری کی گرم بازاری میں ایک مختصر ترین "تختۂ زعفران" بھی بہم نہیں پہنچاتے، ان حالات میں جو لوگ اس کسمپرسی ضرورتِ ذوق کو پورا کرنے کا اقدام کرتے ہیں، یہی نہیں کہ شاہراہِ عام سے انحراف کے مرتکب بنتے ہیں۔ بلکہ سرد بازاری کے اک خطرے کو بھی دعوت دیتے ہیں! ——— آغا طاہر صاحب کا یہ کارنامہ ایسی ہی خطرناک قسمت آزمائی ذوق و تکلف ہے!

دیوانِ غالب کے "طاہر ایڈیشن" کے خصوصیات و امتیازات مختصر اسرنامے میں بتائے گئے ہیں۔ ان میں سرِ مو مبالغہ کو دخل نہیں البتہ تو یہ ہے کہ ہمیں خوف ہے کہ ان مجمل تفصیلات سے آیا قارئینِ کرام اس بامرہ نوازِ عروسِ ادبی کی قرار واقعی صورتگری اپنی لوحِ دماغ پر کرسکیں گے یا نہیں۔ بیشتر اردو کتابیں جب ناقد کے سامنے آتی ہیں تو یکسر اک تنغص کا پیام ہوتی ہیں۔ بہت کم ایسی ہوتی ہیں جو اپنی اشاعت کی کم و بیش اک معذرت سی ہوتی ہیں! لیکن شاذونادر ایسی جلدوں کی زیارت نصیب ہوا کرتی ہے، جو اردو ادبیات کے "سیاہکار" اداراتِ اشاعت و طباعت کی پوری تلافی کر دیتی ہیں؛ دیوانِ غالب کا زیرِ تبصرہ "طاہر ایڈیشن" اسی نوازشِ دل و نظر کی اک نظیر ہے! بلاشبہ آغا صاحب تمام خوش ذوق اردو کتاب خوانوں کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ اور ناقدین کی جانب سے مبارکباد کے حقدار! ع

اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی!

بعض چیزیں حسنِ قبول کی ملتجی بن کر محتسب کے سامنے آتی ہیں۔ لیکن خود محتسب کو اُس کے تمام اسلحہ خانۂ نقد و جرح سے غیر مسلح کر دیتی ہیں۔ اور اگرچہ آتے ہوئے اک "سائلِ نظر" ہوتی ہیں۔ لیکن جاتے ہوئے اک "فاتحِ قلب و روح" ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے پاس دیوانِ غالب "طاہر ایڈیشن" کی آمد و شد کا ماجرا ایسا ہی عجیب رہا۔

غالب مرحوم کی جو تصویر دی گئی ہے وہ اپنے خط و خال میں انفرادیت و اصلیت کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔ قبرِ غالب کا فوٹو ہر دیوان خواں کو اک روحی کیف اور ادبی سعادت بہم پہنچائے گا، اور غالبِ اعظم کے خط کی عکسی شبیہ تو دیکھنے والوں کو غالب کی شاعرانہ زندگی کے اُن مخصوص و نادر لمحوں سے وابستہ کر دیگی جن کی شانِ نزول یہ ہوتی ہے کہ ع

انگلیوں پر اک جلالی شان آتی ہے نظر!

محولۂ بالا تحریرِ غالب کے قلم سے حضرت سید ذوالفقار الدین حیدر الموسوی المعروف بہ حسین مرزا کے متعلق ہے جو غالب کے مشہور جامع کلام و مرتب انتخاب ہیں (بتصریحاتِ اردوئے معلیٰ) یہ بزرگ، آغا طاہر صاحب کے براہِ راست اجداد میں سے ہیں! اُنکا یہ نسخہ آغا صاحب کے خاندانی تبرکات کا نقشِ نگین ہے۔ غالب کی دیباچہ نما تحریر اُن کے دستخط و مہر سے مزین ہے، صاحبِ تحریر کا خاتے کا یہ شعر آج کتنا حسبِ حال اور عبرت انگیز ہے کہ ؎

یکون الخط فی القرطاس دھرا
وکاتبہٗ رمیم فی التراب

(ا۔ا۔غ)

"تیج" کا افسانہ نمبر

"تیج" کا افسانہ نمبر جس آب و تاب سے شائع ہوا ہے، میں اُس پر اپنے دوست گپتا صاحب کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں ——— رسالہ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں سے بدرجۂ اتم آراستہ ہے ——— افسانوں کا انتخاب نہایت اعلیٰ اور تصویریں بھی نہایت موزوں ہیں ——— علامہ کیفی اور لطیف احمد صاحب اکبرآبادی کے رشحاتِ قلم پر "تیج" جس قدر ناز کرے کم ہے ——— اہم مضمونوں کے باوجود اس کی قیمت صرف دو آنے ہے۔ جو ہر لحاظ سے بہت کم ہے۔ "نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز"! افسوس کہ وقت بہت کم ہے۔ اس لئے اس پرچہ پر حسبِ مراد تبصرہ نہیں کیا جاسکتا ——— میں قارئین سے پُرزور سفارش کرتا ہوں کہ اگر انہیں اعلیٰ افسانے اور اپنے بلند پایہ ادیبوں کے دیگر ادبی شاہکار کے مطالعے کا شوق ہے تو وہ "تیج" کے افسانہ نمبر کو ضرور پڑھیں۔

"مدیرِ کلیم"

رفتارِ وقت

ادارۂ کلیم

مسئلہ سرحد

سرحد کا سیاسی اضطراب، حربی خلفشار، اور ہندو شرفاء کی لڑکیوں کا بعض اہلِ قبائل کے ہاتھوں اغواء، گزشتہ دو ایک مہینوں کے اندرونِ ہند کے اہم حوادث رہے ہیں۔ جن کی وقعت و نزاکت کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ خود کانگریس پریذیڈنٹ۔ پنڈت جواہر لال نہرو، کی توجہ کو اُس نے منعطف کیا۔ جنھوں نے اک مُفصّل اور نقادانہ بیان اِن واقعات و مسائل پر شائع کرایا۔

مسئلۂ سرحد، برطانوی سلطنتِ ہند کے جسم کا اک ناسور ہے، جو کم و بیش تین ربع صدی سے رِس رہا ہے۔ یہ مظہرِ سیاسی اک مستقل آزار تھا، جس کے لئے اک اصولی، بنیادی معالجے کی ضرورت تھی۔ برٹش گورنمنٹ کے "میڈیکل ہال" میں اس کا جو نسخۂ شفا رہا ہے اُس کے اجزا رہیں: وقتاً فوقتاً فوجی کارروائیاں، تادیبی مہمیں، سردارانِ قبائل کے نذرانے، اور کبھی کبھی اِس نرم طریقے کا رَدِّ عمل اتنی گرمی سے کہ پٹھان مُلکوں کو پیشکش کئے جانے والی اشرفیوں کا ذائقہ ثانوی اُن جسم پاش اور خانہ برانداز ہوائی جہازوں کے گولوں سے جس کا آماج کوہستان نشین قبائلی دیہات کی آبادیاں اور جھونپڑیاں بنتی رہی ہیں! ؎

درکینہ وروزی تفسیدہ دشتے
درمہربانی بُستاں سرائے

یہ طریق جتنا طول طویل، جتنا خونریزہ و زرپاش، اور جتنا پیچیدہ و ژولیدہ رہا ہے، وہ اُس کی غلط روی و گمرہی کو اُس کی ساری عُریانی میں بے نقاب کرتا ہے! لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامراج اپنی طینت و سرشت ہی میں کجروی و بد تدبیری کے رگ و ریشے رکھتا ہے اور وہ اُس کی ہستی و زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں! حد یہ ہے کہ یہی چیزیں اُس کی ترقی و بالیدگی کے بھی ساز و برگ ہیں۔ جوع الارض اور الحاقِ اقطاعِ زمین، قیصریت کی غذائیں بھی ہیں اور اُس کے زہر بھی! جہانگیریت اک بلانوش اور پُر لحم و شحم جسم ہے! وہ جس چیز سے موٹی تازی ہوتی ہے اُسی سے ضعف کا معنوی ہُزال بھی اخذ کرتی ہے! ایک قہرمان سلطنت اپنے جن بھاری بھرکم بر و دوش سے کمزور قوموں کو ڈرایا کرتی ہے، وہی بالآخر خود اُسے انحطاط و انہدام کے خطرۂ جانستاں میں گرفتار کر دیا کرتے ہیں! حکمت زارِ فطرت کی عدل گاہ میں اسی طرح ہر غلط کاری کی پاداش ایسی ہی لازم و ملزوم ہے جیسی کہ زہر خوری کا خمیازہ خودکشی!

وسیع و عریض "ماورائے بحر" کوہسار سلطنتِ برطانیہ کے عوجِ بن علق کے سے جسم ابوالہول کے ایک ایک رگ و ریشہ میں آج جو درد، سوزش، ورم، دمبل، اور سرطان نمایاں ہیں وہ ماشاء اللہ اُسی "نیک تنی" کے اثمارِ شیریں ہیں، جس پر انگلستان کے کشورکشاؤں اور "وسعت پسندوں" کو ناز رہا ہے! ؎

نہ ہو خوش فربہیٔ تن سے غافل
تنک کرتی ہے مُردے کو گرانی

سلطنت۔ عالمگیری اختیار کرکے وہ "سلطنۃ الافزارہ" نہیں بنا کرتی جس پر "آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا"! وہ۔ وہ گرانبار جسم بنتی ہے جو اپنا

تواں سری ز Top-heaviness کے نتیجے میں اپنا مرکزِ ثقل کھو کر جب لڑکھڑاتا ہے تو رعایا و برایا کے مفلس، بھنچے طبقوں کی پتلی ٹانگیں اُسے ہرگز سادھ نہیں سکتیں اور لے ڈوبتی ہیں! ؎

خواجہ در بند ذیبِ ایوان است

خانہ از پائے خویش ویران است

ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر جُز ز یہی کیفیت اُس سامراجی کارنامے سے ظہور میں آئی ہے جسے حکومتِ ہند کی "فارورڈ پالیسی" کا عنوان بھی دیا جاتا ہے!

کیسی بوالعجبی اور ستم ظریفی ہے کہ سرحد پر آئے دن کے فوجی تصادم، شورہ پُشت آزاد قبائلِ افغانان کی دراندازیوں اور امن سوزیوں کے نتیجے کہے جاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ خود اِن نیم وحشی قبائل بنوں و کوہاٹ کو علمبرداران تہذیب کیمبرج و آکسفورڈ سے عین یہی شکایت کہیں زیادہ منطقی دلائل کی بنا پر ہے! "پیشقدم حکمتِ عملی" کیا ہے، اگر "مداخلتِ بیجا بیجانہ" کی سیاسی تعبیر نہیں ہے؟!

لیکن تاریخ انسانی کی عبرتوں نے تمام دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اپنی جلوہ نمائی کی ہے! انگلستان کی سیاسی و حربی پالیسی کے جیسے معکوس نتائج سرحد پر ظہور میں آتے ہیں وہ ایک دیدنی سبق رکھتے ہیں۔ انگریز نے اُن سرحدیوں کو مغلوب و پابزنجیر کرنا چاہا جن کی ناممکن التسخیری سکندر اعظم کے سے کشور کشا کے وقت سے مسلّم، غیر مجروح ہے! جن جنات صفت لوگوں نے شہاب الدین محمد غوری کا چراغِ حیات ایک پھونک میں گُل کر دیا! جنھوں نے اکبر اعظم کی فوج ظفر موج کو حشرات الارض کی طرح تتر بتر کر دیا! جن سرحدی اہلِ قبائل کا اک شاعر ـــــ خوشحال خاں خٹک ـــــ اپنے چند ہمنفس و دلدادۂ حریت و استقلال نوجوان رفیقوں کے سامنے اس طرح اپنا سینۂ غیرت عُریاں کرتا ہے کہ:-

کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات؟

وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند

اُڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ

مُغل شہسواروں کی گردِ سمند

اور ہاں جس علاقۂ آزاد کا اک بچہ برطانی حکومتِ ہند کی قہرمان ہوائی طاقت کے عقاب جیسے ـــــ ہوائی جہازوں ـــــ کے متعلق کہہ دیتا ہے کہ ہم تمہاری "چڑیا" سے ڈرتے نہیں۔

الغرض "پٹھان" کا "گُرگے" میں قلبِ ماہیت ہو جانا آسان ہی نہ تھا! انگریز اس بے سود کاوش میں آج بھی گرفتار ہے!

پھر دیکھیے کہ حریفوں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ سرحد کو انگلستان نے اپنی سلطنتی افواج کی تربیت کے لیے اک "ٹریننگ گراؤنڈ" کی طرح استعمال کرنا چاہا۔ لیکن اس عمل نے خود پٹھان کو عہدِ جدید کا پورا پورا بالِ ماہر پیکار بنا دیا ـــــ ایسا کہ اُس کے شاہدِ عادل ہندوستان کے برطانوی کمانڈر انچیف تک رہ چکے ہیں۔

انگلستان نے سرحد کے دامنوں میں گرفت حاصل کر کے رُسوائے عالم "روسی خطرے" کا سدِّباب کرنا چاہا، لیکن یہ خطرہ خطرناک تر ہو گیا، اور اپنی جدید العہد نمو میں اُس نے اک اور سمت سے دھمکی دینی شروع کی ہے، جس کے نتیجے میں گورنمنٹ ہند کو اپنا محاذ کچھ تبدیل کر کے اور کچھ وسیع کر کے گلگت کے برفانی وحشت زار میں اک فوجی ناکہ قائم کرنا پڑا ہے!

برطانیہ نے خوفناک "فاذی راولزاہ" کا نام لے لے کر ہندوستان کے ہندوؤں کو خوب ڈرانا چاہا، لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سرحد نے اپنی امن پسندی اور ہندوستان دوستی کے مظاہرے میں اپنی خاک سے اک "سرحدی گاندھی" کو کھڑا کر دیا!

خواتین کے اغوا کے پُراسرار حوادث کی تشہیر کی زہر پاشی سے ہندو مسلمانوں کے قلوب میں ایک ناقابلِ عبور خلیج پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن یادش بخیر ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے بکثرت محترم و بارسوخ افغان سردار دوستوں نے ہندوؤں کی مصیبت زدہ لڑکیوں کو "اپنی محبوب بیٹیاں" کہکر خطاب کیا، اور خاص اسی اسپرٹ میں اُن کے معاملے میں دلچسپی لی، اور اُن کی بازیافت میں کاوش کا ثبوت دیا!

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

پھر اگر ایک طرف بھائی پرمانند کے سے ہندوؤں کے نادان دوست ان واقعات پر مختل الحواس ہو گئے تو دوسری طرف پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی پوری "جنگجویانہ دیوانگی" پر اپنی تمامی "مدبرانہ فرزانگی" کو مستزاد کر کے اس سارے خطرناک ڈرامے کا پردہ چاک کر ڈالا! الغرض کہ

مدد شود سبب خیر گر خدا خواہد!

ہمارے ہندو برادرانِ وطن کو معلوم ہونا چاہئے کہ خود مسلمان سرحد کے ان مجنونی جرائم کو اسلام کے لئے اس سے بدراجہا زیادہ مضرت رساں سمجھتے ہیں جتنے کہ وہ ہندو بھائیوں کے لئے دل خراش ہوں گے! لیکن ہم ساتھ ہی اس کے اُن پر یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ یگانہ و بیگانہ کے درمیان فرق کرنا سیکھیں: انگریزی "پریس" دورانِ جنگِ عظیم میں خود "مسیحی جرمنوں" کے افریقہ کے بعض مسلم علاقوں پر توڑے جانے والے خالص مذہبی ظلم و ستم پر اپنے گویا مسلمان "ہم مذہبیوں" کی اتنی ہمدردی و دلسوزی فرما چکا ہے کہ سرحد کے ہندوؤں کو ابھی وہ مقامِ معشوقیت نصیب بھی نہیں ہوا ہے ——— حالانکہ یہی برطانوی اخبارات تھے جنھوں نے بغداد و بیت المقدس کی تسخیر اور حجاز و حرمین شریفین کی تخریب پر بغلیں بجائی تھیں!! ——— اور ان کارناموں کو بیک وقت مسلمان سپاہیانِ افواجِ ہند کا "جہاد" اور برطانوی گوروں کی "فتحِ صلیبی" کا نام دیا تھا:

پھر شاید آپ کو اس بات کا تو یقین بھی نہ آئے کہ جنگِ عظیم ہی کے دوران میں ترکوں کی شرکتِ جنگ کے بعد ایک دفعہ محی الملۃ و شریعت پناہ حضرت پالونیئر نے انور پاشا اور طلعت بے کی جرمن تعلیم و تربیت اور نتیجۃً اُن کے الحاد پرستانہ اور اسلام فروشانہ میلانات پر شریف مکہ کے لب و لہجہ میں ماتم کیا تھا! انگریزی اخبارات تو ہماری خوش قسمتی سے ہماری ماؤں سے بھی زیادہ ہماری پیاری مائیں (کُٹنیاں) واقع ہوئے ہیں!

فتنے سب سچ ہی قیامت کے
لیکن آگے تمہاری قامت کے؛! (۱-۱-خ)

مسئلۂ فلسطین

فلسطین کے برطانوی کمیشن کی رپورٹ شائع ہو چکی ہے۔ حسبِ توقع اس نسخۂ سیاست کا عنوان "ہو الشافی" وہی "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" ہے! برطانوی "کاتبانِ تقدیرِ اقوام" کے لئے یہ کتنا شباب دلانہ کھیل ہے، کہ تمام سامی ادیان کی "ارضِ مقدس" اور "مشترک قبلۂ شریعت" کی محراب کی یوں اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے! اور بدترینِ عالم کے مشاعرے پر داد طلبانہ نظریں ڈالی جائیں گے

مؤقر ہندوستانی (انگریزی) جریدۂ ہندوستان ٹائمز کے روشناس مشرق و مغرب کارٹونسٹ ——— شنکر ——— نے اخبارِ مذکور کی ہمروزہ اشاعت میں برٹش جسٹس کے اس کارنامے کی کیا خوب مرقع کشی کی ہے، جب کہ اُس نے اک خنجر بکف جلاد کی تصویر بنائی ہے، جس کے دوسرے ہاتھ میں اک لرزاں و ترساں شیر خوار بچہ ہے۔ جسے دو برابر حصوں "یا اپنے تیغے" سے تقسیم کر دینے کا حکم اک چنگیز صورت انسان دے رہا ہے، اور جو اپنے فرمان کی تفصیل یوں کرتا ہے کہ "آدھا بچہ پاس کھڑی ہوئی دو عورتوں (مُدّعی ماؤں) میں سے ایک کو دیدو اور آدھا دوسری کو"! ——— یہاں جلاد "فلسطین کمیشن" ہے، فرمان فرما "برطانوی امپیریلزم" بچہ "فلسطین" ہے، اور مائیں "عرب و یہود"! جان نواز سرنامہ اس منظرِ ہوشربا کا ہے، "عدلِ سلیمانی"!

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

اور پھر اربابِ کمیشن صاحب لوگوں کی نظریں اسلامی دُنیا کی محفلِ سیاسیات پر اس طرح پڑ رہی ہیں جو ان آدابِ تماشا کی تلقین کرتی ہیں کہ ؎

رہے نہ جان تو قاتل کو خونبہا دیجیے!
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے!

معاملے کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ہم یہاں اس ماجرے کے متوقع انجام کی نسبت اپنے اس ایمان و حق الیقین کا اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ مشرق کی تاریخ میں بیسویں صدی تفرقہ و تفریق کے "ارتکاب" کا دَور ہو، تفرقہ و تفریق کے "کامیاب" ہونے کا دَور نہیں! ——— تقسیمِ بنگالہ، تقسیمِ ایران، تقسیمِ مصر و سوڈان، تقسیمِ ترک و عرب، تقسیمِ عرب و ایران، تقسیمِ سعودی عرب و یمن، تقسیمِ اعراب و قبائل کرد (در عراق) تقسیمِ ہندو و مسلم (در ہند) وغیرہ وغیرہ عموماً اسی تاریخی نتیجے پر منتج ہوئے ہیں کہ ؎

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!

پس "خواجۂ اہلِ فراق" اقوام و ممالکِ عالم کو پارہ پارہ کرنے کی جتنی ہی عرق ریز سعی و کاوش کرے۔ اُس کے کاروبار کے مآل کا تعین اسباب

سنتِ الٰہی کے تحت عمل میں آئے گا، کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ؛

فلسطین کا قضیۂ نامرضیہ بلاشبہ اس سرزمین کے عربوں کے مطالبات کے لئے آسان نہیں ہے، لیکن وہ اس مصنوعی "وطن الیہود" کے صیہونیوں اور برطانوی جہانگیریت پرستوں کی آرزومندیوں کے لئے بھی کوئی ناز جی کی آغوش نہیں ہے! اعرابِ فلسطین کی راہ میں جو سنگِ راہ ہے وہ برطانی "استقامت" نہیں، برطانی "پابستگیٔ سازش و ریشہ دوانی" ہے! انگلستان نے مشرقی بحرالروم اور مشرق قریبہ میں اپنی غافلانہ کجروی سے جن خطرات کی "مالامال فصل" اُگائی ہے، وہ یہ نہیں کہ اُسے دھمکی نہیں دے رہی ہے، بلکہ مشکل یہ آپڑی ہے کہ اگر وہ اس "دھمکی" کی رعایت کرے تو براہِ راست اک "مرگِ مفاجات" کا جامِ زہر اپنے ہونٹوں سے لگائے؛ اس دوگونہ رنج و عذاب میں اُس نے مرضِ مہلک کے سرلیع السیر تسلسل کو اختیار کرلیا ہے، اور مستقبلِ قریب کی ناگزیر موت سے اک "عارضی مہلت" لیلی ہے! ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے!

حیفہ کی حریفِ مارسیلز بندرگاہ، قائم مقامِ اسکندریہ مستقرِ بحری، موصل کی پائپ لائن کی نکاسی کے دہانے، انگلستان کی یوروپی ایشیائی ہوائی لائنوں کی شہرگ کے مرکز گلو والے نقطے، نہرِ سویز کے نقشِ ثانی "حیفہ بصرہ" والی ہوائی و بری نہر کے نقطۂ آغاز وغیرہ وغیرہ کی گوناگوں حیثیتوں اور اہمیتوں اور مصلحتوں کی بنا پر انگلستان، فلسطین سے عربوں کو کتنا ہی مدت دراز تک محروم رکھے، اتنی ہی مدت دراز تک اعرابِ فلسطین اور ملحقہ پس پشت کی عربی دنیا، نیز عام عالمِ اسلامی انگلستان پر اُس کا سیاسی خواب و خور حرام رکھے گا۔ ممکن ہے مدتوں کے بعد فلسطین، برطانیہ کے پنجے سے چھوٹے۔ لیکن پھر جب چھوٹے گا تو انگلستان کے نہ معلوم کتنے کثیر التعداد اہم قویٰ کو قطع و برید کرتا ہوا الگ ہوگا! "مقروض سیاست" انگلستان شوق سے "دیونِ ڈگری" کو ٹالے۔ لیکن وہ اپنی میزانِ قرضہ و ہرجہ کو بھی المضاعف کر رہا ہے! ممکن ہے وہانۂ مشرق پر واقع ہونے والے فلسطین کا معاملہ جب طے ہو تو ساتھ ہی سارے مشرقی اعمال نامہ کا حساب بھی انگلستان کو چکانا پڑے! پس پورے شوق و عزم و ایمان بالغیب کے ساتھ فلسطین کے آغشتۂ خاک و خون عرب بھی انگلستان سے کہہ رہے ہیں کہ ؎

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو وہ بھی نہ سہی

دیکھیں "مخذول و منکوب، مغضوب و مقطوع فی الارض یہودی قارون" برطانیہ کے "منجات دہندہ" ثابت ہوتے ہیں یا بے سر و سامان لیکن سرشار اُسوۂ موسوی عرب مجاہد اُس کے حادیٔ مشرق و مغرب سامراج کے "جاز ہاء" بنتے ہیں! ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

قضیۂ فلسطین کا جو تاریخی "پس منظر" ہے اُسے اک نامور انگریزی مدبر "مسٹر بالفور، سابق مشیر مالیات ایران، و مصنف کتاب شیونِ ایران و مشرقِ قریبہ بایام بعد جنگِ عظیم" کی زبان حق ترجمان ——— نیز قلمِ الہام رقم؛ ——— سے سنیئے۔

"یہودی ریشہ دوانیوں کے جال میں پورا فلسطین پھنس گیا ہے اور اس دامِ سخت میں مرغِ بسمل کی طرح پھڑک رہا ہے؛ تجویز یہ ہے کہ "ارضِ مقدس" کو یہودیوں کا "قومی نشیمن" بنایا جائے گا۔ اور اس سلسلے میں انگلستان کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ اس یہودی وطن کی تعمیر کے اخراجات کے ایک معتدبہ حصے کی فراہمی میں برطانوی ٹیکس دہندوں کو شرکت کی سعادت نصیب ہوگی! سوال یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کی یہ ہدایت یافتہ اُمت بیت المقدس کی طرف اس ہجرتِ عظمیٰ کا ثواب آخر کیوں کمانا چاہتی ہے؟ نہایت معقول جواب یہ ہے کہ قومِ یہود کی یہ متفقہ اور عالمگیر تمنا ہے کہ ارضِ یہودا کے اُجڑے گھر کو پھر بسائیں۔ لیکن عرض یہ ہے کہ اس "بستی" کے ساتھ موجودہ اہلِ خانہ کی جو "خانہ ویرانی" لازم و ملزوم نظر آتی ہے اُس کے لئے کیا سندِ جواز ہے؟ کسی ملک میں توطن پذیرانہ حیثیت سے قدم رنجہ فرمانے کی صرف آرزو اُس ملک کا "ملکیت نامہ" تحریر نہیں کراسکتی! دنیا پوچھنا چاہتی ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی دعوت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے کون سے دلائل و براہین ہیں؟

"اگر اہلِ مغرب کو خدا نے ایسی ہی توفیق دی ہے تو "حق بحقدار رسانیدن" کی اس مہم کو کسی دوسری جگہ سے شروع ہونا چاہیئے؛ قبل اس کے کہ یہودی بابِ بیت المقدس میں داخل ہوں، مراکش کے موریش عربوں کو

قرطبہ و غرناطہ میں، اور امریکہ کے سرخ ہندوستانیوں کو واشنگٹن و نیویارک
میں قدم نماءِ فرود آکہ خانۂ خانۂ تست
کی صلائے شیریں دینا چاہیئے! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں اور امریکنوں کے جذبات معدلت گستری و محروم نوازی کی رگ یہاں حرکت میں نہیں آتی! آہ بیچارے سورش عرب اور "ریڈ انڈینز" یہودیوں کی طرح دنیا کے صرافے پر تو قابض نہیں ہیں، جس کے زور پر وہ سلطنتوں اور حکومتوں کے نظارہائے خارجہ کے ایوانوں میں بیٹھکر ملکوں اور قوموں کی تقدیریں کی املا کرایا کرتے ہیں۔

"برطانیہ ماشاء اللہ اس بات کا پورا مسکن قلب اطمینان دلاتی ہے، کہ وہ فلسطین میں عدلِ نوشیروانی کا سکہ چلائے گی، لیکن ابھی تک تو یہ تمام بشارتیں "دروغ مصلحت آمیز" سے بہتر ثابت نہیں ہوئیں۔ فلسطین کے عربوں پر اس "یہودشاہی" میں جو بیت رہی ہے وہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے، ہم فلسطین کے عربی وفد کے اظہارات و معروضات کے اہم نقاط کو (ملخصاً) یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں۔ ارکانِ سفارت نے کہا تھا،

"واضح رہے کہ ہم اعرابِ فلسطین اپنے قلوب میں کسی قسم کے منافیٔ "سامیت" جذبات نہیں رکھتے؛ واقعہ یہ ہے کہ ہم یہودیوں کے لئے اُس وقت مأمن و ملجا رہے ہیں جب کہ مغرب کے مسیحی ممالک میں وہ کشتنی و سوختنی سمجھے جاتے تھے؛ ہمارے لئے جو چیز ناقابلِ برداشت ہے وہ یہودیت کے بجائے "صیہونیت" (Zionism) ہے، جو فلسطین کے اندر مہمان بن کر آنا نہیں چاہتی، مالکانہ بلکہ فاتحانہ حیثیت سے داخلہ چاہتی ہے۔

"عبرانی زبان جو مشکل سے ملک کی ایک فیصدی آبادی کی بولی ہوگی فلسطین کی سرکاری زبان بنائی جاتی ہے؛ صیہونی نووارد مزدور، عرب مزدور کو ان کی قوت لایموت سے محروم کرتا ہوا آتا ہے؛ وہ عرب کے مقابلے میں نصف کام کرتا ہے اور ڈبل اجرت پاتا ہے۔ تعمیراتِ عامہ کے قریباً سارے ٹھیکے یہودی سرمایہ داروں کی اجارہ داریاں ہیں، جن کے سامنے غریب عرب "نرخ بالاکن" کی منادی میں ٹھہر نہیں سکتا۔ فلسطین کا ہائی کمشنر، معتمدِ قانونی، خزینہ دار، ذخائر ملکی، ڈائرکٹر تجارت و حرفت اور صیغۂ ہجرت کا افسر اعلیٰ سب یہودی ہیں، اور صیہونی مسلک و مشرب کے یہودی اسی طرح تمام دفاتر و محاکم میں نو آموز و ناتجربہ کار یہودیوں کی یورش ہے؛ سارا دفتر تشریعی یہود نوازی اور عرب کشی کی روح سے معمور ہے؛ حق گو اخبارات کی ناطقہ بندی کی جاتی ہے۔ حبِ وطن اور دلسوزیٔ ملک کا نعرہ بلند کرنے والے عرب قائدینِ ملت کو اس عذر پر طوق و سلاسل میں جکڑ بند کیا جاتا ہے کہ ان کی سرگرمیاں امن عامہ کے لئے خطرہ ہیں؛ اُن مزارعین و فلاحین سے جو صحیح معنوں میں نسلاً بعد نسل، قرنہائے قرن سے "فرزندانِ زمین" بنے ہوئے ہیں، یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اراضیات کا بیعنامہ حکومت کے نام کردیں، اس لئے کہ ترکی سلطنت کے جائز وارث کی حیثیت سے جملہ حقوقِ زمین نئی حکومت کے حق میں منتقل ہوگئے ہیں؛ یہ بیعنامہ نما ضبطی، بعد میں یہودی کاشتکاروں اور زمینداروں کے لئے "عطیۂ جاگیرات" بنا کرتی ہے۔

"شریعتِ اسلامیہ کے مسلّمہ و اعلان کردہ آئین کو پامال کر کے صیہونیت مآب یہودی حکومت فلسطین کے اسلامی اوقاف کے نظم و نسق میں بیجا مداخلت کے درپے ہے؛ یونانی راسخ الاعتقاد کلیسا کے وہ تمام اوقاف جن کو ترکوں نے "مالِ خدا" سمجھ کر کبھی ہاتھ نہ لگایا، آج بحق حکومت ایک ضبط شدہ جائداد قرار پاتے ہیں؛ اور سرکاری کمیشن کے زیر اہتمام عمداً اتنی بڑی بڑی مقداروں میں دائر نیلام کئے جاتے ہیں کہ سوائے یہودی قارونوں کے کوئی دوسرا اُن سے عہدہ برآ نہ ہوسکے۔

"اور یہ محض اک مشتے نمونہ از خروارے ہے، عرب روزانہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی ایسی بیشمار کارستانیاں اور ریشہ دوانیاں دیکھتا ہے، جس سے اُس کے قلب کے اندر خون اُبال کھاتا ہے:

"عرب لوگ انگلستان اور ساری مہذب دنیا سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آیا اُن کی یہ ساری تلخ نوائیاں شکوہ ہائے بیجا ہی ہیں؟

باوجود یکطرفہ ہونے کے یہ سارے بیانات حق بجانب ہیں؛ برطانوی پبلک کو بالکل تاریکی میں رکھا گیا ہے، ورنہ سیاہ و سفید کے مختار لوگ اتنا اندھیر کرنے میں ذرا متامل ہوتے! لیکن "ڈاؤننگ اسٹریٹ" (برطانوی دارالوزارت عظمیٰ) میں یہودیوں کو جو رسوخ حاصل ہے وہ اس اپیل کو اب بھی بیسود رکھے گا؛ متمدن دنیا کے "دارالعدل" میں جو استغاثہ کیا گیا ہے یقیناً وہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوگا؛ بیشتر مغربی ممالک بظاہر امن،

کا ہنگ مے کے سلسلے میں درحقیقت اپنے اپنے ہاں کی آبادی کے اُس عنصر سے کو خوش کرنے کی فکروں میں ہیں۔ جو اُن کے لئے صدیوں سے ایک لعنت بن رہا ہے! پھر اس سے بڑھکر کیا بات ہوگی کہ برطانیہ تنہا "خونِ دو عالم" اپنی گردن پہ لینے کو تیار ہے! تاہم "کشتوں کا یہ خون" مستقبل قریب میں بڑے ہولناک طریقے سے رنگ لائے گا۔ اور اُس وقت برطانوی حکومت کے موجودہ کارپردازوں کو معلوم ہوگا کہ وہ کونسی مہلک راہ پر گامزن تھے۔

"کیسی بوالعجبی ہے کہ یہ سلوک عربوں کو جنگِ عظیم کی اُن فتوحات کا انعام ہے جن کے حصول میں اصل فاتحکار آلِ عربوں کی "جان و ایمان" کی وہ قربانیاں تھیں جو اس فریب خوردہ قوم نے اتحادیوں کو عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً پیش کی تھیں!

"انگریزی وزارت جو پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے وہ یقیناً بہت ہی اندوہناک ہے! بیت المقدس کے اک برطانوی افسر سے جب میں نے اس بارے میں مبادلۂ خیالات کیا تو اُس نے فی الفور کہا۔

"یہ نہ سمجھئے کہ فلسطین کے سات لاکھ عرب ستر ہزار یہودیوں کے مظالم و مفاسد کا غیر معین زمانے تک اپنے کو تختۂ مشق بنائے رکھیں گے! اُن کی یہ قومی مصیبت بلاشبہ ناقابلِ برداشت ہے اور جلد یا بدیر اُن کی تلوار سے اک قتلِ عام کا فوارۂ خونی بہ نکلے گا!" بدقسمتی یہ ہے کہ یہ آفت یہیں تک محدود نہ رہے گی، جواب میں یقیناً برطانوی جنگی بیڑہ حرکت میں آئے گا، اور برطانوی سنگینیں فلسطین کے تمام عربوں کو ذبح کرڈالیں گی۔ ملحقہ ممالک عرب اور نیز اسلامی ہندوستان کے سطح پر ان خونچکاں حوادث کا جو عکس پڑے گا اُس کو چشمِ تخیل بآسانی دیکھ سکتی ہے!

"برطانیہ میں جتنے لوگ "ماہرینِ مشرق" کہلانے کی اہلیت رکھتے ہیں اُن کا بیشتر حصہ اس روش کو سخت مخدوش کہتا ہے۔ لارڈ سنہم نے اُس تقریرِ تیغ کے دوران میں جو فلسطینی وفد کی آمد کے وقت اُنھوں نے کی تھی، کہا تھا۔

"لارڈ بالفور نے صیہونی یہودیوں کو اپنے مشہور اعلان میں جو گلدستہ پیش کیا ہے وہ اس جماعت کے لئے اک "ڈائنامیٹ کا گولہ" ثابت ہوگا، فلسطین کے خرمنِ امن میں اس حرکت سے جو شرارہ لگے گا وہ تمام مشرق میں اتنی وسیع آتشِ جدال و قتال مشتعل کرے گا کہ ہمارے سارے وسائل اسے سرد کرنے میں سوخت ہو جائیں گے!"

(۱-۱-خ)

تبلیغ و تحقیق

تبلیغ کی دھن میں ہے ریاضت حیراں
تحقیق میں مصروف ہے شاعر کی زباں
تبلیغ ہے سنتِ رسولانِ سلف
تحقیق ہے سنتِ خدائے دوجہاں

حنیف



جاپان

مصنفہ [illegible]

مترجمہ محمود علی خاں [illegible]

آج سے صرف اسی برس [illegible] جاپان [illegible] کا نام روشن ہے [illegible] مختصر مدت میں اس نے [illegible] دنیا کی زبردست طاقتوں [illegible] کی داستان اس تصنیف میں [illegible] ڈاکٹر [illegible] جاپان کے متعلق سب سے [illegible] ہے۔ صفحات ۲۰۰ بلاک کی [illegible] تصاویر [illegible] ۱۱ تصاویر [illegible]

کائنات

مصنف محمود علی خاں [illegible]

اس کتاب میں [illegible]

حضرت حکیم آزاد انصاری کا پہلا مجموعہ کلام

جو غزلوں مسلسل غزلوں نظموں، قطعوں، اور رُباعیوں پر مشتمل ہے

وہ حضرات جو اردو شاعری کے ہر دَور، اور ہر دَور کے طرزِ بیان کا گہرا مطالعہ کرچکے ہیں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ حکیم آزاد اردو میں جس طرزِ بیان کے موجد و خاتم ہیں اس کی نظیر ولی سے لے کر اس وقت تک کی اردو شاعری میں کہیں نہیں مل سکتی۔

اگر آپ بالکل انوکھے طرزِ بیان کا مطالعہ فرمانا چاہتے ہیں تو آج ہی آرڈر دیجئے، اس مجموعے میں آپ کو تغزل، تفلسف، حسن و عشق، رندی و سرمستی، اور رنگینی و رعنائی ہر شعر کے اندر جھلکتی ملے گی، اور ہر رنگ اتنا گہرا ہوگا کہ آپ کے دل و دماغ پر ایک سُرور سا چھا جائے گا۔

کاغذ چکنا، طباعت و کتابت روشن۔ سائز کراؤن صفحات ۱۵۶

قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible]

ملنے کا پتا

منیجر کلیم بک ڈپو، جبنتی نواس نمبر ۴ دریا گنج، دہلی

بلاک برائے فروخت

دفتر کلیم میں وہ تمام بلاک جو اب تک ہر ماہ کلیم میں چھپ چکے ہیں برائے فروخت موجود ہیں [illegible]

اور اگر کوئی صاحب کسی بلاک کو کرایہ پر لینا چاہیں [illegible]

[illegible]

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو، کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں، تعمیلِ حکم کیلئے فردوس شمال کشمیر، جنت نظیر سوئزرلینڈ شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی، جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے، کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی کھانا پینا ترک کردیا، مہاراجہ کو فکردامنگیر ہوا، اور وزراء سے مشورہ طلب کیا مہتمم توشہ خانہ نے



اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر

اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

REG.NO.J691

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی

کی

تازہ ترین تصنیف

جُنونُ وحِکمت

یعنی

(مجموعۂ رُباعیّات)

رُباعی، تمام اصنافِ سخن میں وہ تنہا رنگین، عمیق، اور فلسفیانہ صنف ہے جو عظیم شعرا کی مشاقی کے نقطۂ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے، اور کسی شاعر کو اُس وقت تک حقیقی رُباعی گو شاعر کا پُرشکوہ خطاب نہیں مل سکتا، جب تک کہ اُس کی بے پناہ جنون پرور تخیّلی قوت بلند ہوتے ہوتے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہمدوش نہیں ہو جاتی۔ بدبخت ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رباعی بھی ہر چہ گیرد علتی، علت شود کے زمرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، یارانِ طریقت نے، بزعمِ خود، یہ سمجھ رکھا ہے کہ، رُباعی نام ہے رُباعی کی بحروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا۔ اور بس ——— حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رباعی شاعرانہ مطالعہ، شاعرانہ تفکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینیٔ خیال، اور شاعرانہ حکمت کا ایک ایسا جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی بھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔

اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تمنّا پیدا ہوئی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیّام پیدا ہوا ہوتا تو آپ کا یہ اوّلین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں **جُنونُ وحِکمت** "کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاضِ قدرت نے آخرکار آپ کے ہندوستان میں بھی ایک خیّام پیدا کر دیا ہے ——— اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اُس کی قدر نہ فرمائیں۔

آپ کے اور ایران کے خیّام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیّام کو ایک "فیٹز جیرلڈ" مل گیا تھا جس نے اُسے ایک زندہ قوم سے روشناس کرا دیا تھا لیکن آپ کا خیّام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مُردہ اور غلام ہے۔ اور غلاموں کو صرف یہی نہیں کہ کوئی "فٹز جیرلڈ" نہیں ملا کرتا، بلکہ خود اُس کی قوم بھی اُس کی قدرشناسی کے واسطے آسانی سے طیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون و حکمت مندرجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے، (۱) معارف (۲) خرابات (۳) حسن و عشق (۴) پیرانِ سالوس (۵) متفرقات۔

قیمت غالباً تین روپے مقرر کی جائے گی۔ اور بڑی تقطیع پر تقریباً سوا دو سو صفحے ضخامت ہوگی

کتاب زیرِ طبع ہے، جو صاحب ابھی سے خریدار و نکے رجسٹر میں اپنا نام درج کرا دیں گے انکے ساتھ کچھ رعایت کی جائیگی } مینیجر کلیم بکڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۴ دریا گنج، دہلی


کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی

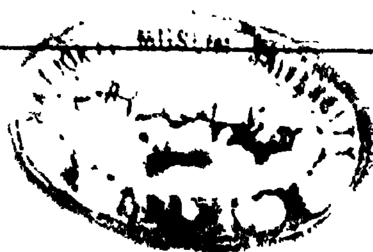
شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا

تازہ ترین شاہکار

فکر و نشاط

نقش و نگار اور شعلہ و شبنم کے بعد یہ شاعرِ انقلاب کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جس میں بالکل نئی نظمیں شامل کی گئی ہیں، یہ تمام نظمیں نباضِ فطرت اور حساس شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ ہیں، ایک ایک شعر میں مسائلِ حیات اور دُنیا کے رنگا رنگ واقعات پر ایسا رنگین تبصرہ کیا ہے جس کی تشریح و تفسیر دفتروں میں نہیں سما سکتی، اور بیان کی شگفتگی و شادابی پر ہزاروں چمن نثار ہیں، شاعرِ انقلاب نے اپنے پیام کے ذریعے اپنے مخاطب کو فکر کی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ اُسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے، دماغ کو اُلجھنوں میں نہیں ڈالا ہے، بلکہ سازِ دل کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے، اور اُن سے وہ موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالمِ وجد طاری ہو جاتا ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ نہایت اعلیٰ ہے، سائز بڑا، صفحات ۱۲۵ - سرورق خوشنما رنگین، کتاب مجلد ہے، اور قیمت صرف ایک روپیہ

منیجر کلیم بک ڈپو، چشتی نواس نمبر ۴، دریا گنج، دہلی





قدیم یونانی رقص

بنام قوت وحیات



آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سُنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۴ | فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مدیر	۹۸
۲	دور پیشین کی تقویم پارینہ	جناب اسرائیل احمد خاں صاحب	۱۰۵
۳	فیض حُسن (نظم)	جناب محمد ضیاء الاسلام صاحب بی۔ایس سی، پی ٹی، ایس بجنور	۱۱۳
۴	گنبد (افسانہ)	جناب ابرار حسن خاں صاحب ملیح آبادی	۱۱۴
۵	رکشہ والا (افسانہ)	جناب سعد منیر صاحب کانپوری	۱۱۷
۶	نظیر اکبرآبادی (نظم)	جناب منظر صدیقی اکبرآبادی	۱۱۹
۷	مراق و مالیخولیا کی فلسفیانہ تشریح	مدیر	۱۲۱
۸	برہمن سے خطاب (نظم)	جناب عبدالواسع صاحب عصری چک نگوری (مونگیر)	۱۲۸
۹	نظیر اکبرآبادی پر ایک سرسری نظر	جناب نواب جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی	۱۲۹
۱۰	ازالۂ غلط فہمی	جناب عطاء اللہ صاحب پالوی	۱۳۴
۱۱	کرب کی آواز (نظم)	جوش ملیح آبادی	۱۴۱
۱۲	پولیس کا جبلا	ایک مسافر	۱۴۲
۱۳	جو ہم اہل ہمت کی راہ ہو نگے (نظم)	جناب حکیم آزاد صاحب انصاری	۱۴۴
۱۴	غزل گوئی اور پروفیسر فراق	نقاد	۱۴۵
۱۵	رباعیات	جوش ملیح آبادی	۱۶۶
۱۶	جبتک باقی ہے (نظم)	جناب نواب جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی	۱۶۷
۱۷	عبادت کا مزدور (نظم)	جناب باسط صاحب بسوانی	۱۶۸
۱۸	رفتار وقت	ادارہ	۱۶۹
۱۹	نقد و نظر	ادارہ	۱۷۵
۲۰	اشتہارات	مشتہرین	۱۷۷

اشارات

مُدیر

میرے ایک "اللہ والے" دوست

مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ میرے بھی ایک دوست ہیں "اللہ والے" جن سے مجھے محبت بھی ہے۔ اور ہمدردی بھی۔

یہ میرے دوست، یادش بخیر، ایک زمانے میں صاحبِ فکر، اور صاحبِ نظر نوجوان تھے۔ انھیں فلسفے کا بھی شوق تھا، اور ادبیات کا بھی۔ وہ ایک فطری انسان کی طرح ہشاش بشاش رہا کرتے، اور اربابِ علم و ادب کی صحبتوں میں وقت کا کافی حصہ صرف کیا کرتے تھے، اُن کے تحقیقی میلانات کے تیور ایسے خوش آیند تھے کہ ہندوستان کے ذہنی مستقبل کو اُن سے بڑی بڑی امیدیں پیدا ہو چلی تھیں ——— کہ یکایک وہ "اللہ" کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

چنانچہ اب اُن کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآنی تعلیم، یعنی کارخانۂ عالم میں تدبّر و تفکّر کو کفر سمجھتے ہوئے "شبانہ روز" اوراد و وظائف" ہی میں مُبتلا نظر آتے ہیں۔

کثرتِ طاعت نے اُن کے جسم کو کاہیدہ، چہرے کو خشک و تُرش، اور معدے کو برباد کر دیا ہے ——— اور ترکِ لذّات کی نَے اِس قدر بڑھ چکی ہے کہ وہ "اللہ" کی بخشی ہوئی "حلال اور طیّب" نعمتوں تک سے گریز کرتے ہیں، اور "کلوا والشربوا" سے سرتابی کا ذوق یہاں تک پرورش پا چکا کہ اگر شوربہ لذیذ ہوتا ہے تو اُس کی لذّت کو مجروح کرنے کی خاطر وہ اس میں پانی ملا دیتے ہیں۔

"اللہ" کی محبّت بھی کتنی کرورشے ہے کہ اِدھر لذیذ شوربے کا ایک لُقمہ معدے میں گیا، اُدھر "اللہ" کی محبت دل سے نکل گئی۔

کیا "اللہ" کی محبّت ایکلیے کی جڑ سے بھی زیادہ کمزور، اور ہندوستانی ریاستوں کی نوکری سے بھی بڑھ کر ناپائدار (?) واقع ہوئی ہے!

مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا نمونہ پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ مبارک ہے۔

کیا رسولِ اکرم نے کثرتِ طاعات، اور ترکِ لذّات کا ارتکاب کرکے اپنے جسم کو لاغر، چہرے کو خشک و خوفناک، اور اپنے جسمِ مبارک کے جوڑوں کو بہ آسانی ہلنے سے محروم فرما دیا تھا؟ اور کیا رسولِ اکرم بھنے ہوئے گوشت میں نمک، اور کھجوروں میں مٹی کا تیل ملا لیا کرتے تھے!

اس کے علاوہ اِسلام ایک عسکری مذہب ہے۔ کیا عسکری مذہب کے کسی پیرو کو اِس کا لائسنس دیا جا سکتا ہے کہ وہ کثرتِ طاعت، اور ترکِ لذّت کی غیر شرعی بے اعتدالی میں مُبتلا ہو کر ایسا کمزور ہو جائے کہ اسلام کی بہترین عبادت یعنی جہاد کے وقت چار آدمی اُسے گھوڑے پر بٹھائیں، اور ایک آدمی اُس کی دُبلی کلائی پکڑے رہے، تاکہ وہ تلوار کے وزن سے مُڑ کر نہ رہ جائے؟

کاش اِن حِلّوں کی مرطوب ہوا میں سانس لینے والے "اللہ والوں" کو

کوئی یہ بات سمجھا سکتا کہ علیل آدمی کی رُوح بھی علیل ہوتی ہے۔ اور کوئی علیل رُوح، اتنی طاقتور نہیں ہو سکتی کہ معرفت کے منازل کو بہ احسن الوجوہ طے کر سکے۔

تندرستی، سب سے بڑا ایمان، اور بیماری سب سے بڑا کفر ہے ——— اسلام، طاقت چاہتا ہے، اور شمس و قمر کو مسخر کرنے کی طاقت چاہتا ہے، اور شمس و قمر کو مسخر کر لینے کی طاقت چاہتا ہے، اس لئے اُس کے دائرے میں طاقت بہترین دین ہے، اور ناطاقتی بد ترین بے دینی۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ جو شخص اپنے کو درست نہیں رکھ سکتا، وہ دوسروں کو کیا خاک درست رکھ سکے گا۔ اور جو نہ اپنے ہی کام آسکتا ہے، نہ دوسروں ہی کے، سوسائٹی کو ایسے شخص کی قطعاً ضرورت نہیں۔

مذہب کا کام بھی سوسائٹی ہی کو درست حالت میں رکھنا ہے، جو شخص سوسائٹی کے کام کا نہیں، مذہب کی نگاہ میں بھی ناکارہ ہے۔

میرے "اللہ والے" دوست ایک زمانۂ دراز سے سوسائٹی کو فراموش کر چکے ہیں، اور اُنھیں اس سے بھی کوئی سروکار نہیں رہا ہے کہ اِن کا وطن، اور اُن کے ابنائے وطن زندہ بھی ہیں، کہ مر گئے ——— اب تو وہ ہیں، اور گوشے سے جھکا ہوا حجرہ، اور رُوحانی عیاشیاں۔

ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ میں نے اُن سے میاں نظیر اکبر آبادی پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی ——— آپ کو معلوم ہے اُنھوں نے کیا جواب دیا؟ سُنئے!۔

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص "کلامِ بے نظیر" میں محو ہو، وہ، وہ کسی "نظیر" پر کیا لکھے۔

آپ اِس عارفانہ تمسخر آمیز جواب کا مفہوم سمجھے؟ آیئے میں سمجھاؤں، میں اپنے دوست اور اِس قبیل کے تمام عارفانِ عالی مقام کی ذہنیت کو خوب سمجھتا ہوں۔

میرے "مولانا" دوست نے بہ الفاظِ دیگر یہ جواب دیا ہے کہ جو لوگ "اللہ والے" ہو جاتے ہیں، وہ "اللہ" کے بندوں کو اِس قدر حقیر، اور ناقابلِ التفات سمجھنے لگتے ہیں کہ اُن کی طرف دیکھنا بھی اُنھیں اہانت آمیز معلوم ہوتا ہے۔

[illegible] یہ بات یاد آتی ہے، تحصیل ملیح آباد میں ایک ٹھاکر صاحب دفعہ ایک سو دس کے بد معاش تھے، لیکن جنگِ عظیم کے موقع پر اپنے "خدماتِ جلیلہ" کے باعث آزیری مجسٹریٹ بنا دئے گئے تھے۔ آزیری مجسٹریٹ بنا دئے گئے تھے۔ آزیری مجسٹریٹ بننے کے بعد اُنھوں نے اپنی برادری والوں تک سے گفتگو کرنا ترک کر دیا۔ اور جب اُن کے اقرباء نے اعتراض کیا تو وہ بگڑ کر بولے کہ ہم جس مُنھ سے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے باتیں کرتے ہیں، اُسی مُنھ سے تم سے کیونکر باتیں کریں۔

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میرے "کلامِ بے نظیر کے دلدادہ" دوست "کسی نظیر" کی جانب اسی متذکرۂ بالا دلیل کی بناء پر متوجہ ہونا پسند نہیں فرماتے؟

یہاں یہ سُوال بھی اُٹھایا جا سکتا ہے کہ جو شخص "اللہ" سے رشتہ جوڑ لیتا ہے، کیا اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ "اللہ" کے بندوں سے تمام تعلقات منقطع کر لے؟

اگر ایسا ہے تو پھر نبوت و رسالت کے باب میں کیا رائے قائم کی جائے؟ کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ نبوّت و رسالت "اللہ" کے بندوں سے اِس قدر شدّت کے ساتھ وابستہ رہتی ہے کہ اُس کا ہر قول، ہر فعل، یہاں تک کہ اُس کے تمام تصورات تک اُنھیں سے وابستہ، اور اُنھیں کے واسطے وقف رہا کرتے ہیں۔

اِس کے علاوہ قاعدہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے، اُس کی گلی کے کتّوں تک سے اُسے محبت ہوتی ہے، لیکن یہ "اللہ" کے چاہنے والے دُنیا سے نرالے ہیں کہ "اللہ" کو تو چاہتے ہیں۔ اور "عیال اللہ" کے نام تک سے اُنھیں وحشت ہوتی ہے۔

ابراہیم ادھمؒ کے متعلق مشہور ہے کہ اُنھوں نے ایک روز فرشتوں کو خواب میں دیکھا، جو ایک زرّیں رجسٹر لئے ہوئے تھے ——— ابراہیم نے پوچھا یہ رجسٹر کیسا ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا عاشقانِ الٰہی کا۔ ابراہیم نے کہا اس میں میرا بھی نام ہے؟ ——— فرشتوں نے کہا "نہیں" ——— ابراہیم نے کہا اچھا تو پھر بندوں کے دوستوں کے رجسٹر میں میرا نام درج کر لو ——— دوسرے دن فرشتے پھر آئے، اور ابراہیم یہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑے کہ عاشقانِ الٰہی کے رجسٹر میں اُنکا نام زرّیں حروف میں سب سے اُوپر لکھا ہوا ہے ———

یہ ہے "اللہ" کے بندوں سے محبت کرنے والوں کا مقام!

میرے "اللہ والے" دوست! اب بھی سویرا ہے، بللہ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنائیے کہ یہی بہترین عبادت ہے، اور "اللہ" کے درماندہ بندوں کی دستگیری فرمائیے کہ یہی اعلیٰ ترین بندگی ہے۔

جو شخص "دین" اور اہلِ زمین سے رشتۂ اخوّت و محبت منقطع کرلیتا ہے، "عرش و کرسی" والے اُس سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ اور جو "اللہ" کے بندوں کے دُکھ درد میں شریک نہیں ہوتا، "وحدہٗ لاشریک اللہ" اُس کی عبادت کو قبول نہیں فرماتا۔۔۔۔

یہ یاد رکھئے، بلکہ گرہ میں باندھ لیجئے کہ اگر حشر و نشر کوئی شئے ہے تو آپ کا یہ رند قدح خوار، مالکِ یوم الدین کے سرِ حشر اپنے اس قول کی تصدیق کرادوں گا کہ خدمتِ خلق، کائنات کا سب سے بڑا دین ہے، اور خدمتِ خلق سے رُوگردانی کرکے ایک کاہل انسان کی طرح "اوراد و وظائف" کے مزے لُوٹتے رہنا، دنیا کی سب سے بڑی عیاشانہ خود کامی اور دنیا کا سب سے بڑا شیطانی مسخرا پن ہے۔

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست!

ایک دوستانہ خط

غلام احمد صاحب پرویز نے حضرت اسلم جیراجپوری کے بات موسم گرما میں ایک خط بھیجا تھا، جس کا خلاصہ ہجومِ مشاغل کے باعث اب شائع کررہا ہوں۔ علیحدہ جواب دینے میں طوالت ہوتی اور وقت بھی صرف ہوتا، اس لئے خط کے اندر ہی جواب کے طور پر چند سطریں جابجا لکھدی گئی ہیں۔

پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"کلیم" بابت مارچ ۱۹۵۲ء کے اشارات میں آپ نے قوم کے مُفکرین کو دعوت دی ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ انسانوں کو یہ سبق دیں کہ نیکی۔ نیکی کی خاطر کرنی چاہئیے۔ نعمائے جزا کی ترغیب اور عقوبات و سزا کی تخویف، نیکی کرنے اور بُرائیوں سے مجتنب رہنے کی محرک نہ ہونی چاہئے۔ لیکن مذہب کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ عاید ہوتا ہے کہ اس میں نیکی کرنے اور بدی سے روکنے کے لئے جنّت کے لالچ اور جہنّم کے خوف کو کام میں لایا گیا ہے۔ حالانکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ جب سے "کلیم" جاری ہوا ہے، آپ اس میں مسلسل اپنی قوم کے لوگوں کو متنبہ کرتے چلے آرہے ہیں، کہ۔۔۔۔ اگر تم نے یہ نہ کیا، وہ نہ کیا، تو فطرت تمہیں۔۔۔۔ ذلت کے گڑھے میں گرادے گی۔ کیا آپ کا مسلسل وعظ یہی نہیں کہ آپ لوگوں کو عزت و وقار کا لالچ دے کر انہیں نیک اعمال کرنے پر آمادہ کرتے ہیں؛ فرمائیے آپ یہی کہیں تو وہ عین علم و بصیرت ہو، لیکن مذہب یہی کہے تو وہ یکسر دقیانوسیت و کورمغزی ہو۔

بسوخت عقل ز حیرت۔۔۔۔۔۔۔"

جواب

پہلا جواب تو یہ ہے کہ آپ کا سوال محض اعتراضی جواب ہے، اور اعتراضی جواب کے متعلق دُنیا جانتی ہے کہ وہ کس قدر کمزور ہوا کرتا ہے۔ جب کسی کا اعتراض اُٹھائے نہیں اُٹھتا تو پھر یہ ترکیب کی جاتی ہے کہ خود معترض کی روش پر اعتراضات وارد کئے جانے لگتے ہیں۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ تو فلاں بات کس مُنہ سے کہے گا، تو بھی تو فلاں فلاں باتیں کرتا ہے۔۔۔ اور اس ترکیب سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ معترض اپنے عیوب پر مطلع ہو کر اعتراض ترک کردے گا، یا یوں کہئے کہ جب یہ امر واضح ہوجائے گا کہ معترض بھی وہی فعل کرتا ہے جس پر اُسے اعتراض ہے، تو وہ فعل قدرتی طور سے صحیح ثابت ہوجائے گا۔۔۔۔۔۔ فرض کیجئے زید، بکر پر یہ الزام لگاتا ہے کہ تو ریاکار ہے، اور بکر اپنی صفائی پیش کرنے کے عوض زید سے بگڑ کر یہ کہتا ہے کہ تو خود بھی تو ریاکار نہیں ہے؟ ۔۔۔۔۔ اور کیا ضمنی طور پر اس سے یہ بھی مترشح نہیں ہوتا کہ جب زید کا بڑا آدمی بھی ریاکار ہے، تو زید کا سا مردِ حقیر اگر ریاکار ہے تو اُس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟

اب دوسرا جواب ملاحظہ ہو۔۔۔۔۔

انسان کو نیکی کی طرف مائل، اور بدی سے نافر کرنے کی صرف دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) یا تو اُس سے کوئی حاکمِ اعلیٰ یہ کہے کہ اگر تو نیکی کرے گا تو میں تجھے پچاس روپیہ دوں گا، اور اگر بدی کرے گا تو سو کوڑے ماروں گا۔

(۲) یا دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی اُس کا بھائی اُس سے یہ کہے کہ اگر تو نیکی کرے گا تو خود نیکی کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تجھے سربلند کر دیگی، اور اگر بدی کرے گا تو خود بدی کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تجھے ذلیل کر دے گی۔

لیکن دو صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں نیکی بدی کی ماہیت دوسرا اس کے تمام تصورات سے بیگانہ محض رہتے ہوئے، انسان، ترغیب کی خاطر نیکی کرتا اور تخویف کے باعث بدی سے مجتنب رہتا ہے، یعنی یا تو وہ نیک بنتا ہے، اس لالچ میں کہ اُسے اچھی مزدوری ملے گی، یا بدی سے بھاگتا ہے، اِس بزدلی کے باعث کہ اُسے مارا جائے گا۔

اور جس وقت ترغیب و تخویف کا سحر کسی صورت سے باطل ہو جاتا ہے، تو پھر انسان، نیکی و بدی کے تمام قوانین سے آزاد ہو کر بہائم کی سی زندگی بسر کرنے لگتا ہے جس کے بیشمار شواہد ان لوگوں کی زندگیوں میں پائے جاتے ہیں، جن کے قلوب پر مذہبی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

لیکن دوسری صورت میں یہ خطرناک حالت پیدا نہیں ہو سکتی، کیونکہ اِس صورت میں نیکی بدی کی ماہیت اور اُس کے قدرتی نتائج کی واقفیت کی بنا پر انسانی نفس میں ایک ایسا قومی اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ نیکی بدی کو ایک کاروباری، اور تاجرانہ متاع کے طور پر نہیں، بلکہ اپنی اور اپنی نوع کی فلاح و بہبود کا آلہ سمجھکر اختیار کرتا ہے —— اور یہ اخلاقی شعور اُس کے نفس میں اِس قدر محکم و استوار ہو جاتا ہے کہ مذہب کی تبدیلی، یا سرے سے لامذہبی بھی اُس کی بُنیاد کو ہلا نہیں سکتی۔

یہ صحیح ہے کہ انسان ایک خود غرض و خودکام حیوان ہے، اور اُس وقت تک کسی فعل کے ترک و اختیار کا ارادہ نہیں کرتا، جب تک وہ یہ نہیں سمجھ لیتا کہ فلاں فعل کے ترک و اختیار سے میرے یا میرے خاندان کو یہ یہ فائدہ حاصل ہوں گے۔

لیکن نیکی بدی کی تعلیم کی، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، صرف دو ہی صورتیں ہیں —— پہلی صورت تو وہی سیدھی سادی صورت ہے کہ کسی "قوتِ اعلیٰ" کا تصور پیدا کر کے انسان کو سزا و جزا کے چکر میں ڈال دیا جائے۔

لیکن اِس صورت میں، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے یہ بڑا خطرہ ہے کہ جیسے ہی "قوتِ اعلیٰ" کا تصور کمزور پڑ جائے گا اُسی وقت آزادمنش و سرکش انسان نیکی بدی کے دباؤں کو توڑ کر چوکڑیاں بھرنے لگے گا۔ اور دُنیا اخلاقی قوانین سے یکسر آزاد ہو کر رہ جائے گی۔

لیکن دوسری صورت میں اِس کا مطلق اندیشہ نہیں ہے، کیونکہ اِس دوسری صورت میں محض دوجزا اور عقوبت دہر کا تعلق کسی "قوتِ اعلیٰ" سے نہیں، بلکہ خود نیکی بدی کی حقیقت و ماہیت اور اُس کے قدرتی نتائج سے ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان جب کسی شے کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے تو پھر اُس سے منحرف ہونے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

فرض کیجئے کوئی باپ اپنے بچے سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم روز صبح کو ایک فرلانگ دوڑا کرو گے تو میں تمھیں دو لڈو دیا کروں گا —— چنانچہ بچہ روز دوڑتا اور روز دو لڈو حاصل کر لیتا ہے —— ہر چند بچے کی صحت کو باپ کے دو لڈوؤں کے باعث، روزانہ دوڑنے سے وہی فائدہ پہونچتا ہے جو ورزش سے پہونچنا چاہئے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بچہ صرف لڈوؤں کی خاطر دوڑتا ہے، اور اِس حقیقت سے قطعی واقف نہیں ہوتا کہ خود دوڑنا ایک اعلیٰ درجے کی ورزش ہے، اور ہر ورزش سے انسانی صحت کو کثیر فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور بچے کے اس جہل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب استدادِ زمانہ کے باعث اُس کے دل میں لڈوؤں کا شوق، یا باپ کی اطاعت کا خیال باقی نہیں رہتا، تو وہ دوڑنے کی مشق ترک کر کے اپنی صحت کو خود اپنے ہی ہاتھوں بگاڑ لیتا ہے۔

اب اس کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا پرویز صاحب میرے کلیم کے اشارات میں سے، جنھیں وہ "وعظ" کا خطاب دیتے ہیں، ایک کلمہ بھی ایسا نکال کر دکھا سکیں گے جس میں میں نے اپنی قوم سے یہ وعدہ کیا ہو کہ اگر وہ خودداری، جفاکشی، خودشناسی، اور آزادی کے میدان میں سعی کریں گے تو میں اُنھیں یہ یہ انعام دیا کروں گا۔ ہر سال ملیح آباد کے اِتنے آم، اور لکھنؤ کے اِس قدر خربوزے عطا فرماؤں گا، اور اگر اُنھوں نے میری یہ بات نہ مانی تو میں اپنے تمام ملیح آبادی پٹھان بھائیوں کو جمع کر کے اُنھیں پٹواؤں گا؟

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر آپ کے اِس اعتراض میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ میں بھی وہی کہتا ہوں جو مذاہب تعلیم دیتے ہیں۔

نیکی کو نیکی کی خاطر کرنے کے سلسلے میں ایک مجموعی سی کوشش یا اُفتاد بات اور غور طلب ہے۔

فرض کیجئے ایک شخص اپنی محرمات پر اس لئے ہات نہیں ڈالتا کہ اُس کے بچوں کی صحت اور اُس کے اخلاقی شعور کے حق میں اُس کے نزدیک یہ فعل نہایت مضر ثابت ہوگا۔ اور دوسرا شخص اپنی محرمات پر صرف اس لئے ہات نہیں ڈالتا کہ دیکھ لیا گیا تو اُسے زدوکوب کیا جائے گا۔

اِن دونوں شخصوں میں کیا فرق ہے؟ کیا اول الذکر شخص ایسا معتبر نہیں ہے کہ محرمات کی عصمت کے باب میں اُس پر کامل بھروسا کیا جائے، اور کیا ثانی الذکر اِس قدر خطرناک نہیں ہے کہ موقعے پاتے ہی محرمات پر ہات ڈال دینے میں باک نہیں کرسکتا ہے۔ دونوں میں بہتر کون ہے۔ پرویز صاحب ہی فیصلہ کریں۔

آگے چل کر پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "کیا آپ نے کبھی ایسا کیا ہے کہ بداعمالیوں کے فطری عواقب کو سامنے لائے بغیر، اُن برائیوں سے اجتناب کی تلقین کی ہو، یا نیک اعمال کے لازمی نتائج کو اُجاگر کئے بغیر، نیک اعمال کرنے کی ترغیب دی ہو"؟

جواب

پرویز صاحب، یہاں تو آپ میری پوری پوری حمایت فرمارہے ہیں، یعنی آپ خود ہی اِس کے مُقر ہیں کہ میں نے "بداعمالیوں کے فطری عواقب" اور "نیک اعمال کے لازمی نتائج" کو پیش نظر رکھ کر اپنی قوم کو تعلیم دی ہے، کیونکہ یہی ایک حکیمانہ اور فطری طریقۂ تعلیم ہے ـــــ میں نے اس کے عوض اپنی قوم کو نیکی بدی کے "لازمی نتائج" اور "فطری عواقب" سے بیخبر رکھتے ہوئے یہ کہکر نیکی کی طرف کبھی نہیں بُلایا کہ میں یہ جزا دوں گا، اور بدی سے یہ کہہ کر باز نہیں رکھا کہ میں یہ سزا دوں گا۔

پرویز صاحب پھر تحریر فرماتے ہیں!

البتہ مذہب کا اِتنا مقصود ضرور ہے کہ وہ انسانی زندگی کو عناصر کے اِسی ظہور ترتیب تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ انسان کی موجودہ ہیئت وحیات، اِس کائنات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہیں، بلکہ اُسے اور بھی منازل طے کرنے ہیں، اس لئے مکافاتِ عمل کا قانون صرف اِسی زندگی تک ہی محدود نہیں.............."

جواب

مذہب اور مذہب کا فرمودہ سرآنکھوں پر، ہم سب کے آباء و اجداد، اور ہم سب کی کتابیں یہی کہتی چلی آئی ہیں، لیکن اگر کوئی بدبخت دلائل و براہین کی روشنی میں ان اُمور کی تصدیق کرنا چاہتا ہے تو آپ اُسے مذہب کُش کا لقب کیوں دیتے ہیں۔

طبائع مختلف ہوتے ہیں کوئی کسی بات کو محض اس بنا پر تسلیم کرلیتا ہے کہ ہمارے خاندان کی فلاں محترمہ نے اِس کی تصدیق کی تھی، اور کوئی کسی بات کو اِس بنا پر تسلیم کرتا ہے کہ فلاں مولوی صاحب نے ایسا فرمایا ہے، یا فلاں "نورنامے" یا فلاں "راہِ نجات" میں ایسا لکھا ہوا ہے، آپ اِن میں سے کسی کو بُرا نہیں ٹھہراتے، لیکن اگر کسی کمبخت کے دماغ کی ساخت اِس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ وہ کسی بات کو اُس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ تفکر و تدبر اور دلائل و براہین کی رُو سے وہ بات اُس پر واضح نہیں ہو جاتی، تو آپ اُسے دشمن خدا و رسول کہہ کر کیوں مطعون فرماتے ہیں!

آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی سمجھ میں یہ بات آچکی ہے کہ "عناصر کیا ہیں، اُن کی ماہیت اور تعداد کیا ہے"، "انسان کی موجودہ ہیئت وحیات اِس کائنات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہیں" اور یہ کہ "مکافاتِ عمل کا قانون صرف اِسی زندگی ہی تک محدود نہیں......"

میں بدبخت ہوں کہ "عناصر" "کائنات" "دیگر منازل" اور "مکافاتِ عمل" کی حقیقت، اور اُن کی ترتیب کا مجھے اب تک پتا نہیں چلا ہے۔

آپ مجھے سمجھانے کی سعی فرمائیں، نہ سمجھوں تو میرے حق میں دعا کریں، لیکن ہرگز مناسب نہیں کہ آپ مجھ سے خفا ہو جائیں، اور مجھے ہادم ادیان کے نام سے پکارنے لگیں۔

آپ جواں بخت ہیں کہ منزل تک پہونچ چکے ہیں، میں بدقسمت ہوں کہ ہنوز راہوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں، لیکن اسے کبھی نہ بھولئے کہ مجھ کو بھی اُس منزل کی تلاش ہے جو آپ کو ہر شے سے زیادہ محبوب ہے۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

"نیکی نیکی کی خاطر — آرٹ، آرٹ کی خاطر — اور اس قسم کے چند ایک اور بھی محض نظری کھلونے ہیں ------------------------------

--------------"

"مفکرین کے استادانِ ازل یعنی حکمائے مغرب، مشرق کی طرف اس قسم کے نظری کھلونے لڑھکاتے رہتے ہیں کہ بچے اِن سے جی بہلاتے رہیں۔"

جواب

یہ بحث بہت طویل ہے، جس کی اشارات میں گنجائش نہیں نکل سکتی، بہرحال دُنیا میں دو گروہ دو روش بہ روش پائے جاتے ہیں، ایک گروہ نیکی کو نیکی کی خاطر — اور آرٹ کو آرٹ کی خاطر، کا نظریہ رکھتا ہے، اور دوسرا گروہ نیکی کو کام کی خاطر، اور آرٹ کو فائدے کی خاطر، کا قائل ہے۔

آپ نے اپنے مکتوبِ گرامی میں صرف اپنا عقیدہ بیان فرمادیا ہے، اور بس — اپنے قول کے ثبوت میں دلائل نہیں پیش کئے ہیں — اِس لئے جواب اِس قدر ہو سکتا ہے کہ صاحب آپ کو آپ کا اعتقاد مبارک ہو۔

ہاں اتنا اور اضافہ کردینا چاہتا ہوں کہ نیکی کو نیکی کی خاطر نہیں بلکہ سزا و جزا کی خاطر اختیار کرنا نفسِ انسان کی انتہائی توہین کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔

پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"البتہ اگر نیکی — نیکی کی خاطر سے یہ مراد ہو کہ نیکی کر، دریا میں ڈال، یعنی نیک اعمال کی وجہ سے کبھی دل میں غرور و تکبّر، نخوت و نخوت نہ پیدا ہو، لوگوں پر اپنے زُہد و تقدّس کا احسان نہ جتاتا پھرے، تو یہ چیز بھی مذہب ہی نے سب سے پہلے پیش کی ہے۔"

جواب

آپ کا یہ بازپایا میرے موضوع سے کسی حد تک خارج ہے، اِس لئے اس پر زیادہ خامہ فرسائی کو ضروری نہیں سمجھتا،

البتہ صرف اِس قدر عرض کردوں گا کہ مذاہب نے تو سرے ہی سے نیکی کو نیکی کی خاطر کا سبق ہی نہیں دیا ہے، بلکہ جنّت، دوزخ، اور خوشنودیٔ خدا کی خاطر نیکی کی تلقین فرمائی گئی ہے — یعنی جو شخص جس قدر زیادہ نیکی کرے گا اُسی قدر خُدا اُس سے خوش ہوگا۔ اور اسی مقدار سے وہ قُربِ خدا حاصل کرتا جائے گا — چنانچہ جو لوگ اپنے خیال میں کثرت سے نیکیاں کرتے رہتے ہیں، اُن کے دل میں اس خیال کا آنا بالکل ایک قدرتی چیز ہے کہ خدا اُن سے خوش ہے اور وہ قربِ خُدا حاصل کر رہے یا کرچکے ہیں — اور یہ خوشنودیٔ و قُربِ خدا کا خیال، ظلوم و جہول، اور ضعیف البُنیان انسان کی کمزور فطرت کے حق میں ایک ایسی تُند شراب ہے جو غرور و نخوت کا نشہ پیدا کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔

قُربِ خدا تو بڑی چیز ہے — جن لوگوں کو اِس دُنیا میں قُربِ سلطانی حاصل ہو جاتا ہے اُن میں سے کتنے ہیں جن کے ہوش و حواس درست رہتے ہیں؟

اس لئے نیکی کو کسی قُوّتِ اعلیٰ کے تقرّب کا ذریعہ بنانا انسانی سیرت کے حق میں نہایت ہی مُضر چیز ہے۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

"معاف فرمایئے اگر میں اتنا عرض کرنے کی بھی جرأت کروں کہ مذہب کی بوسیدہ عمارت کی تخریب کے لئے جو حضرات اس قدر بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ اُٹھتے ہیں، اُنھوں نے از خود مذہب کا مطالعہ بہت کم کیا ہوتا ہے --------؟"

جواب

آپ کے حسبِ مُراد جو زبان کھولے وہ عالم، حسبِ مراد جو کلام نہ کرے وہ عامی ——

یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے — میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

"اگر آپ کو (معاف بفرمائید) مذہب کے نام سے ایسی ہی چڑ ہو تو

پیدا ہو گئی ہو؟

جواب

حاشا کہ مجھے مذہب کے نام سے کوئی "چڑھ" نہیں پیدا ہو چکی ہے۔

مذہب کوئی انسان نہیں جس نے مجھے کبھی دُکھ پہونچایا ہو، نہ حیوان ہے جس نے کبھی مجھے سینگ مارا ہو ——— مذہب تو عقائد و احکام کے ایک مجموعے کا نام ہے، اِس سے "چڑھ" کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟

اگر تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہو جائے گا کہ مذہب نے ہمیشہ انسان کا خُون بہانے کے عوض اُس کی خدمت کی ہے تو میں وہ پہلا شخص ہونگا جو مذہب کو سب سے پہلے بڑھکر گلے لگائے گا۔

آپ مطمئن رہیں جو دل اپنے "دشمنوں" تک سے محبت کرتا ہے وہ ایک نظر ہے یعنی مذہب سے کیونکر عداوت رکھ سکتا ہے۔

سب سے آخر میں پرویز صاحب فرماتے ہیں

آپ ایک اچھے شاعر ہی ہو سکتے ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک ادیب، لیکن ہمارے ہاں یہ مصیبت ہے کہ جونہی کوئی شخص کسی ادبی رسالے کا ایڈیٹر ہوا لوگ اُسے ہر قسم کا لیڈر بننے پر مجبور کر دیتے ہیں ...... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا اصلی راستہ کھو بیٹھتا ہے .... یہی غلطی نیاز فتحپوری نے کی اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ بھی اس پر مجبور کئے جا رہے ہیں، اور وہ دن افسوسناک ہوگا جب یہ سُننے میں آئے گا کہ ایک اچھا شاعر مُفت میں چھن گیا"

جواب

میں آپ کے لہجے کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے مفہوم کو نہایت شائستہ پیرائے میں بیان فرمایا ہے ——— لیکن اِس کا یقین فرمائیے، بلکہ میں قوت و حیات کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے نہ تو یہ شوق ہے کہ میں لیڈر تسلیم کیا جاؤں نہ میری یہ تمنا ہے کہ میری سوسائٹی مجھے ہمہ داں سمجھ لے۔

میں اِن دونوں باتوں کو نہایت ہی پست و حقیر سمجھتا ہوں۔

میں آپ کو کیوں کر اپنا دل کھول کر دکھاؤں کہ اسرارِ کائنات کی جستجو نے میرا کیا حال کر رکھا ہے اور یہ اسرارِ کائنات کی جستجو کا شوق ہی نہیں، بلکہ جنون ہے جو میرے قلم سے ایسی باتیں لکھاتا، اور میری زبان سے ایسے کلمات نکلواتا ہے جو میرے بعض احباب کے دلوں میں یہ شبہ پیدا کر دیتے ہیں کہ میں مذاہب کا مخالف یا خُدا کا منکر ہوں، یا مجھے لیڈری کے ساتھ ساتھ یہ شوق بھی چرایا ہے کہ میرے اہلِ ملک مجھے لیڈر یا ہمہ داں بھی سمجھ لیں۔

اِسی کے ساتھ آپ اس کا اندیشہ بھی ہرگز نہ کریں کہ میں ایک شاعر کی حیثیت سے مفقود ہو جاؤں گا۔

پرویز صاحب اوّلاً تو ابھی یہ فیصلہ بہت قبل از وقت ہے کہ میں درحقیقت شاعر بھی ہوں کہ نہیں، یہ فیصلہ تو آئندہ، زمانہ ہی کر سکے گا ——— اور اگر میں یہ خیال ابھی سے قائم کر لوں کہ آپ کے حسبِ قول میں شاعر ہوں تو اِس کا یقین رکھئے کہ کوئی شاعر مفقود نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اسرارِ کائنات کی جستجو اور تفکّر و تدبّر ایسی چیزیں بھی نہیں ہیں جنھیں شاعرانہ مذاق یا شاعرانہ تخیلات کے منافی و مخالف سمجھا جائے۔

اگر کوئی شخص شاعر ہے، تو یہ اُس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ حقائق کی جستجو نہ کرے، اور اِس کا مزاج حکیمانہ نہو جس طرح بجلی کے پازیٹو اور نیگیٹو کرنٹ ملنے سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اُسی طرح شاعرانہ جنون اور حکیمانہ تفکر کے نقطۂ اتصال سے شعر پیدا ہوتا ہے ——— حکمت و شعر دو متخالف و متضاد چیزیں نہیں ہیں کہ آپ کی موجودگی میں دوسرے کی بقا کو ناممکن سمجھ لیا جائے ——— بلکہ اِس کے برخلاف اِن میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

میں ایسے "شاعر" کو شاعر ماننے پر طیار نہیں ہوں جس کا جنون حکمت سے خالی ہو۔ اور جس کا دماغ حقائق کی جستجو میں صرف نہ ہوتا ہو۔

پرویز صاحب، ہر شاعر حکیم ہوتا ہے، لیکن ہر حکیم شاعر نہیں ہو سکتا ———

~~~~~~~~

[illegible] ہستی خاموش

[illegible] بستی خاموش

[illegible]
~~~~~~~~

دَورِ پیشیں کی تقویمِ پارینہ

انقلابِ فرانس کا سب سے زیادہ متین و غیر جذباتی مطالعہ!

ترجمہ از اسرائیل احمد خان

۱۸۵۶ء میں، یعنی الیگزس ڈی ٹاک وِل کی کتاب "جمہوریۂ امریکہ" کی اشاعت کے اکیس سال بعد، فاضل موصوف کی دوسری عظیم تصنیف ــــ "عہدِ انقلاب سے عین ماقبل کا لمحہ" ــــ منصۂ صحافت پر نمودار ہوئی۔ اس آخر الذکر کتاب کا انگریزی ترجمہ اِس طویل الذیل عنوان کے تحت شائع ہوا ــــ "انقلاب ۱۷۸۹ء سے پہلے فرانس میں ہیئتِ اجتماعیہ کی حالت، اور اُن اسباب کی تصریح جو تاریخ کے اِس سانحۂ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئے!" ــــ اگر تمام و کمال نہیں، تو قریب قریب ضرور اِس کتاب نے اپنی پیش رَو کی مقبولیت حاصل کی، "انقلابِ فرانس" کے متعلق جو صحیح و صالح تصور، فلسفۂ تاریخ کے دماغ نے بعد میں قائم کیا، یہ کتاب اُس حکیمانہ تشخیص کی صحیح بسم اللہ تھی؛ دفاترِ تاریخ میں اِس کی اہمیت یہی ہے! یہی تصنیف ہے جس کے صفحات میں پہلی مرتبہ یہ نکتہ واضح کیا گیا کہ، جدید العہد فرانس کی مرکزیت انقلابِ فرانس کی پیداوار نہ تھی! بلکہ یہ خیر سالقۂ ملوکیت کے ثمر کا ثمر تھی! نیز یہ کہ فرانس کے طبقۂ امارت کے خلاف جو بربھی برپا ہوئی تھی اُس کا محرک [illegible] اُنکا اقتدار نہ تھا جس قدر کہ اُنکا فقدانِ اقتدار! علاوہ بریں کہ اس تحریک کی علمبرداری بالکل بے بال و پر عامتہ الناس نے نہیں کی، بلکہ اُن عوام الناس نے کی جو پہلے ہی سے حاملینِ ملکیت بن چکے تھے، ڈی ٹاک وِل وہ پہلا صاحبِ قلم ہے جس نے اُنیسویں صدی کے نیمۂ اول کی راسخ الاعتقاد حریتِ فکر کے تصورات کو ایک جاذبِ نظر صورت میں پیش کیا۔ ٹاک وِل کی یہ دونوں نگارشیں غالباً سیاسیات کے ادبیاتِ عالیہ کے زُمرے میں شمار کی جائیں گی!

(۱)

دَورِ جاگیرداری کے ایامِ آخرین!

فرانسیسی قوم نے ۱۷۸۹ء میں وہ عظیم ترین جد و جہد انجام دی جس کا اقدام نسلِ بشری کے کسی قبیلے نے زمانِ تاریخی کے کسی عہد میں کیا، اور جس کا مقصود یہ تھا کہ یہ قوم اپنی شاہراہِ تاریخ کے اِس مرحلۂ خاص پر اپنے مقدرات کو گویا دو واضح و قاطع حصوں میں تقسیم کر دے! اور اِن دو حصوں کے درمیان ایک فراخ خلیج حائل کر دے! ہمارا رُوئے سخن جس پہلے حصے کی طرف ہے وہ تو وہ حالات تھے جن میں یہ قوم ابھی تک ــــ رہی تھی، اور دوسرا حصہ وہ مجوزہ

تنظیمِ حیاتِ عمرانی تھا، جس کا فتح باب وہ کرنا چاہتی تھی۔

مثلاً جاگیرداری! امارات نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں جرمنی کے بڑے قصبوں اور شہروں کو مرفہ حال اور دلکش خیال جمہوریتوں میں تبدیل کر دیا تھا، وہ اب اٹھارہویں صدی میں بھی علیٰ حالہٖ قائم تھے۔ تاہم یہ صورت صرف برائے بیت تھی۔ یہ ادارات اپنے ماضی کا محض اک پیکرِ بیجان رہ گئے تھے۔

قرونِ متوسطہ کی وہ تمام دیگر قوتیں بھی جو ہنوز بقیدِ حیات تھیں، اِسی عارضے سے ماؤف معلوم ہوتی تھیں! سب کی سب ایک ہی قسم کے اضمحلال و زوال کی مورِد نظر آتی تھیں!

پھر جہاں جہاں صوبجاتی مجالس نے اپنا دستورِ قدیم سلامت و باامانت رکھا تھا، وہاں بھی وہ الٹی، تہذیب کے تقدم میں سنگِ راہ ثابت ہو رہی تھیں، نہ کہ اُس کی شمعِ راہ!

قرونِ مظلمہ میں مُلوکیت کی جو شان رہی تھی اُسے اِس دَور کی شاہی سے کوئی نسبت نہ تھی۔ بلاشبہ اُسے دوسرے مخصوص مراعات حاصل تھے۔ وہ اک مختلف مُوقف و منصب کی حامل تھی۔ اک مختلف رُوح سے دمساز تھی، نیز مختلف جذبات کی روح پروری کرتی تھی۔ لیکن بہرحال یہ چیزیں اک بدلے ہوئے عالم سے تعلق رکھتی تھیں! مرکزی ریاست کا نظم و نسق ششِ جہت میں اپنی شاخیں پھیلا رہا تھا، اور یہ سارا نو تعمیر قصر، سابقہ مقامی اقتدار و حکومت کے مسمار شدہ قلعوں کے ملبوں پر بُن رہا تھا! جدید العہد پیلک حکام کا اک آراستہ پیرا تھا، جو اُمرائے ذیشان کی فرماں فرمائی کو بیدخل کر رہا تھا۔

صورتِ حال کا یہ مُرقع، جو برِاعظم یورپ کے تمامی طول و عرض میں بھی بعینہٖ اُسی طرح جاری و ساری تھا جس طرح کہ فرانس کی حدود کے اندر، اُس شے کے فہم و احاطہ کے لئے ناگزیر تھا جو پردۂ غیب سے ظہور میں آنے والی تھی! اِس لئے کہ جس شخص نے فرانس کی سرگزشت کے اس مخصوص لمحے کا جائزہ کماحقہٗ نہ لیا ہو، وہ میرا دعویٰ ہے کہ انقلابِ فرانس کی مُورّخانہ نیا مِنی نہیں کرسکتا!

سوال یہ ہے کہ اِس انقلاب کی حقیقی علّت اور غایت کیا تھی؟ اُس کی مخصوص ماہیت کیا قرار دی جاسکتی ہے؟ یعنی کونسا منطقی محرک اُس کے پس پشت واقع ہوا ہے؟ پھر جس شے کو وہ معرضِ وجود میں لایا وہ سچ مچ کیا تھی؟ — انقلابِ فرانس کی غرض یہ نہ تھی، جیسا کہ بعض مبصرین کا مفروضہ ہے کہ اعتقادِ دینی کے استناد کے ستون کو منہدم کر دیا جائے! سارے فریب انگیز ظواہر و قرائن کے علی الرغم وہ اک اجتماعی اور سیاسی انقلاب ہی تھا! اور اپنے ان اجتماعی و سیاسی ادارات و تشکیلات کے چہار گوشے کے اندر اُس نے کسی ایسے منطقی میلان کا ثبوت نہ دیا جو بدعملی و طوائف الملوکی کو تقویت یا مداومت بخشنے والا ہو، یا جو — جیسا کہ انقلابِ فرانس کے اک شدید دشمن نے اسے متہم کیا ہے — صرف بدنظمی میں اک انضباط پیدا کر دینے والا ہو!

انقلابِ زیرِ بحث کتنا ہی انقلاب انگیز رہا ہو مگر اُس کی جدّت کاریاں حقیقتہً اُس سے بدرجہا کم تھیں جتنی کہ عامیانہ طریقے سے فرض کر لی گئی ہیں! میں اِس تاریخی مسامحت کو آئندہ بے نقاب کروں گا! جو کچھ صداقت و دیانت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے جہدِ عمیق کے اُس راسخ نظامِ ہیئتِ اجتماعیہ کے قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، جس کا سنگِ بنیاد امارت و جاگیرداری کے ہیولیٰ سے بنا تھا! انقلابِ فرانس کا یہ فاتحکار کارنامہ اب بھی جاری ہے! اِس لئے کہ اُس کا عملِ شکست و ریخت ابھی اِتمام کو نہیں پہنچا ہے۔

لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ۱۷۸۹ء کا یہ انقلاب، جس کے کوندے اُس وقت کے یورپ کے ہر ملک کے اُفق پر لپک رہے تھے، اُس کا نزلہ سب کو چھوڑ کر فرانس ہی پر کیوں گرا؟! اک دوسرا ذیلی قضیہ یہ بھی ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ اُس نے بعض مخصوص مظاہر ایسے پیش کئے جو برِاعظم کے دوسرے خطوں میں نمودار نہ ہوئے، یا اگر ہوئے بھی تو اُن کی نمود محض جزوی نظر آتی ہے؟!

اک ماجرا ایسا ہے جو بیک نظر دیکھنے سے حیرت طاری کرتا ہے! انقلاب جس کا مخصوص مقصد یہ تھا، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرونِ متوسطہ کے ادارات حیات کے باقیات کو جہاں جہاں وہ ملیں، محو کرتا چلا جائے۔ اُس کا نزول اُن ممالکِ یورپ میں نہ ہوا جن میں یہ ادارات بہتر حالتِ حفاظت میں تھے، اور جہاں لوگ اُن کی عائد کردہ قید و بند اور اُن کے پیدا کردہ مفاسد و شدائد سے نسبتہً کہیں زیادہ نالاں تھے! بلکہ اُس کا مورِد برِاعظم کا وہ گوشہ بنا جہاں اذیت کا یہ سامان کمتر واقع ہوا تھا! بالفاظِ دیگر جس جگہ بارِ مصائب خفیف ترین تھا وہیں وہ سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت محسوس ہو رہا تھا! یہ کیا بوالعجبی تھی؟!

مثال کے طور پر اس بات کا ذکر کیا جاسکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے خاتمے تک بھی جرمنی کے کسی علاقے میں رسمِ غلامی کا استیصال کامل نہ ہوا تھا

لیکن فرانس اِس قسم کی ہر لعنت کے وجود سے مدتِ مدید سے ناآشنا ہو گیا تھا! اپنی جو کہ آراضی پر کاشتکار کی آمد و شد خرید و فروخت، محنت و مشقت، بے قل و غش جاری تھی۔ وہ اپنی اِس محدود قلمرو یا قلمروِ میں اپنے کو "شہرِ خود و شہر یار خود" محسوس کرتا تھا! فرانس کے جن گوشے میں غلامی کے آخری باقیات سئیات پائے بھی جاتے تھے تو وہ اِس مملکت کے وہ مشرقی صوبے تھے، جن کا بذریعہ تسخیر، فرانس سے الحاقِ عمل میں آیا تھا! تاہم یہاں بھی یہ منظا ہر اپنی اک نہایت تنگ ہی نمود رکھتے تھے، جن کو اک متجسس نظر ہی دیکھ سکتی تھی! باقی فرانس کا چپہ چپہ اِس ناشدنی علت سے پاک ہو چکا تھا! فرانسیسی کاشتکار، نہ صرف یہ کہ اک غلامِ بیدام نہ رہا تھا، بلکہ وہ "مالکِ زمین" ہو گیا تھا!

عرصۂ دراز سے یہ اعتقاد راسخ ہو گیا ہے کہ فرانس کے اندر حقیقتِ آراضی کی تقسیم در تقسیم کا سر آغاز ۱۷۸۹ء کا انقلاب ہے۔ نیز یہ کہ یہ چیز بلاشرکتِ غیرے اُسی کا عطیہ تھی! لیکن ساری تاریخی شہادت اس سے عین برعکس نتیجے کا استنباط کراتی ہے!

اُس وقت مالکانِ آراضی کی تعداد اپنے موجودہ شمار کے مقابلے میں نصف اور دو ثلث کے درمیان تھی۔ اچھا اب یہ چھوٹے چھوٹے "کاشتکار زمیندار" اپنے قطعاتِ زمین کی کاشت کے کاروبار میں گوناگوں چھیڑ خانیوں اور نیش زنیوں کا تختۂ مشق تھے! اُنھیں کثیر التعداد محاصل و "ابواب" ادا کرنے پڑتے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی "محبوبۂ زمین" سے دست بردار نہ ہونا چاہتے تھے، اس لئے لامحالہ اِن تعزیری قسم کے مطالبات کو برداشت کیا کرتے تھے، تاہم قدرۃً بُری طرح جز بز تھے!

تاریخِ فرانس کی زبان میں جس چیز کا نام "دورِ پیشیں" ہے وہ اگرچہ زمانۂ ہم سے ابھی بہت ہی قریب ہے، لیکن پھر بھی کم لوگ اِس سوال کا پورا جچا تُلا جواب دے سکیں گے کہ "انقلابِ ۱۷۸۹ء سے قبل فرانس کے زرعی اقطاع کا نظم و نسق کس قسم کا واقع ہوا تھا؟"

اٹھارویں صدی میں کلیسا کے تمام معاملات کا اہتمام چند کلیسائی عمال کو تفویض تھا۔ یہ بات اب اک قصۂ ماضی ہو چکی تھی کہ یہ لوگ اُمرا کی جاگیروں کے بس کا رندے ہوں! اب اُن کا انتخاب و تقرر بھی اِن خداوندانِ ارضی کی بارگاہ سے ہوا کرتا تھا! اِن میں سے بعض لوگوں کی نامزدگی حاکمِ صوبہ کی طرف سے عمل میں آیا کرتی تھی۔ اور باقی دوسروں کے انتخاب کنندگان خود کاشتکار ہوتے تھے! عمالِ سرکاری کا فرض یہ تھا کہ وہ تشخیصِ محاصل کریں، گرجاؤں کی مرمت کرائیں، مدارس تعمیر کرائیں، اور حلقۂ کلیسا کے ارکان کی مجالس کا انعقاد اور اُن کی صدارت فرمائیں! وہ گرجا کی جائداد کی بھی نگرانی کرتے تھے، مصارفِ اوقاف کا تعین کرتے تھے۔ وہ کلیسا کی جائداد کے "اُمنا" کی طرح دوسروں پر ضروری دعوے کرتے تھے، اور دوسروں کی عدالتی چارہ جوئی کے مدعا علیہم بھی اِسی حیثیت سے وہی ہوا کرتے تھے!

نہ صرف یہ کہ جاگیر کا خداوندِ زمین اب چھوٹے چھوٹے مقامی اُمور کا انتظام نہ کرتا تھا، بلکہ اِن کاروبار پر اُس کی نگرانی و احتساب بھی ختم ہو گیا تھا! تمام کلیسائی حکام کا طبقہ، حکومت یا مرکزی اقتدار، یا سلطنت کے تحت آ گیا تھا، جیسا کہ آئندہ سطور میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی، واقعہ یہ ہے کہ حقیقت نفس الامری کچھ اس نوبت سے بھی متجاوز ہو گئی تھی! یعنی کلیسا کی قلمرو میں امیر جاگیر کے، ترجمانِ تاج والے، منصب کا سازِ موت بج چکا تھا! شاہ و رعایا کے درمیان اُس کی حاجب و برزخ کی شان بھی اب اک تقویمِ پارینہ تھی!

اب اگر ہم کلیسا کے حدودِ حرم کا تخلیہ کر دیں، اور ملک کے وسیع تر زرعی خطوں کا جائزہ لیں، تو یہاں بھی ہم اِسی صورتِ حالات سے دوچار ہوں گے! اب مملکت کا کوئی گوشہ یا شعبہ ایسا نہ تھا جس میں انصرامِ اُمور کی عنان امرا کے ہاتھوں میں رہ گئی ہو! جماعتی یا انفرادی ہر حیثیت سے اب وہ اک "حلقۂ بیرونِ در" ہو گئے تھے!

یہ نقشہ فرانس کا مخصوص مرقع تھا!

فرانسیسی امارت کے تمام غیر معمولی اقتدارات و مراعات کی طویل فہرست اعزاز سے سیاسی عنصر اب مفقود ہو چکا تھا! البتہ مالی حلقہ اچھوتا رہ گیا تھا! بعض صورتوں میں اس حلقے کے حدود میں مزید وسعت بھی پیدا ہو گئی تھی!

(۳)

عمومیت کا اک سایہ!

اٹھارویں صدی کے اک فرانسیسی کاشتکار کو اپنی چشمِ تصور کے سامنے لائیے! تاریخی دستاویزات جس طرح اُس کی آئینہ داری کرتی ہیں، اُسی ہیئت میں اُسے لیجئے! وہ اپنے قطعۂ آراضی سے والہانہ وابستگی رکھتا ہے! وہ اپنے

کشتہا ہے پامالی‌ہے کا ایسا دلدادہ ہے کہ وہ اپنی پس انداز کی ایک ایک کوڑی کو اُسے "گلزار" بنانے کے لئے صرف کر دے گا! اور پھر باوجود اس کے "باد زرخ" کو بھی وہ "ابر ذاتی علوی" سمجھتا ہے! پھر دیکھئے کہ دستاویز بیع و شری کے تکملے کے سلسلے میں اُسے کون کون سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں! "قدمِ اول" یہ ہے کہ اُسے اک محصول ادا کرنا چاہیئے ـــــ لیکن سرکار کو نہیں، بلکہ قُرب و لوازم کے دوسرے خداوندانِ زمین کے خزانۂ عامرہ کو! اگرچہ یہ آخرالذکر بزرگ بیاک معاملات سے اسی طرح کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے، جس طرح کہ وہ خود! پھر اُنکا اثر و اقتدار بھی بشکل اُس سے زیادہ واقع ہوا تھا! بہرحال، وہ کسی نہ کسی طرح اک تعصّبِ اراضی کا دامنگیر ہو جاتا ہو! اور اِس شانِ صبر و ضبط کے ساتھ کہ جب اپنے کھیت میں بیج ڈالتا ہے تو اپنی اک "قاشِ دل" بھی اُسی کے ساتھ سپردِ زمین کر دیتا ہے! یہ تنگ ترین گوشۂ زمین جو تمامی کائنات میں اُس کی تنہا متاع ہے، اُسے شہنشاہِ ہفت اقلیم کا فخر و غرور بخشتا ہے: وہ اُس کی آزادی و استقلالِ ذاتی کی تخت گاہ ہے!ـــــ

"اک حقیر چیز، لیکن میری اپنی"!

باایں ہمہ بھی اُس کے ہمچشم ہمسائے اُسے اُس کے کشت زار سے جب چاہتے ہیں کھینچ بُلاتے ہیں، اور جس وقت وہ کھیتی باڑی پر کام کر رہا ہے، وہ مجبور کیا جاتا ہے کہ "بیگار" بھر کے اپنے "خونِ گرم" سے دوسروں کی خاک کی شیر خورانی کرے! وہ اپنی نورس کاشت و فصل اِن منت خوروں کی تخریبوں سے بچانا چاہتا ہے، لیکن اپنے "چراغ تہِ داماں" سے بُری طرح گرفتارِ کشمکش ہے! دیہات و مواضع کے اندر چھوٹی چھوٹی نقل و حرکت کے دوران میں جب وہ کسی ندی پر سے گزرتا ہے، خداوند ان فوجدار محصول عبور عاید کر کے ندی کے پُل کو پُل صراط کی دُشوار گزار بنا دیتے ہیں! پھر وہ اِن موذیوں سے بازار میں دوچار ہوتا ہے، جہاں قبل اِس کے کہ وہ کوئی داد و ستد کرے اپنی ہی جنس کی فروخت کا حق اُن سے خریدنے پر مکلف ہوتا ہے۔ اور جب وہ اِس خرابیٔ بسیار کے بعد اپنے گھر واپس آتا ہے، اور اپنے گیہوں کا بچا کھچا تبرک اپنے قوتِ لایموت کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے ہی اناج کو ـــــ اُس اناج کو جس کی تخم ریزی اُسی کے ہاتھوں سے ہوئی، اور جس کا ایک ایک ریشہ اُسی کی پدرانہ آنکھوں کی نگرانی کی آغوشِ گرم میں بڑھا اور پلا! ـــــ [illegible] تاکہ وہ اُسے اپنی ٹھیکیداروں کی پن چکیوں میں پسوا نہ لے، [illegible] اسی طرح اُسے اپنی حقیر سی پونجی کی

"جیب" بڑی بڑی گر کے اِن "غارتگروں" کی نذر کر دینی پڑتی ہے! پھر اِن مطالبات کا نہ ارتفاع ہے، نہ انکا جانستان تقاضا کبھی ختم ہوتا ہے۔

اُمرا جس طرح اپنے گزشتہ اقتدارات سے محروم ہو گئے تھے، اپنی گزشتہ ذمہ داریوں سے بھی بَری ہو گئے تھے! کم از کم طبقۂ امارت، اِس انقلاب حال کے سود و زیاں کو اِسی رنگ میں دیکھتا تھا! اُمرا نے اِس منصب امانت کو خالی کر دیا تھا، اور اُن کے بعد اُن کی اِس نشست کو کسی نے پُر نہیں کیا تھا، عام اِس سے کہ وہ کوئی مقامی حاکم ہو، یا کاؤنسل ہو، یا کوئی صوبجاتی یا کلیسائی مجلس! قانون کی بارگاہ سے اب کوئی واحد وجود اِس امر کا مکلف نہ تھا کہ زرعی اضلاع کے مزارعوں کا پُرسانِ حال ہو! صرف مرکزی حکومت نے یہ بارِ گراں اپنے دوش پر اُٹھا رکھا تھا، اگرچہ اِس عزیمت میں اُس کا تمام و کمال اعتماد اپنے ذاتی وسائل ہی پر تھا! ع

لے لیا اپنے جگر پر میں نے اپنا تیرِ غم!

ہر سال سلطانی مجلس ہر صوبۂ مملکت سے مخصوص رقوم منسوب کیا کرتی تھی، جو محاصلِ ملک کی عام آمدنی سے حاصل ہوتی تھیں۔ اِن محاصل کا تعین متعلقہ صیغے کا ناظر کیا کرتا تھا، اُنھیں مختلف حصص زمین پر حصہ رسدی تقسیم کر دیا کرتا تھا۔

بعض اوقات ایسے نظائر بھی دیکھے گئے کہ مجلسِ سلطانی نے افرادِ ملک کو بالاصرار اِس بات پر مجبور کیا کہ وہ بعض مرفہ حالی کے کاروبار کی طرف توجہ کریں۔ ایسی سلسلہ جنبانیاں ہوئیں ضرور، لیکن یہ دوسری بات تھی کہ لوگ اُن پر صدائے لبیک بلند کر سکے یا نہیں! بے شمار ایسے فرمانِ واجب الاذعان صادر ہوئے، جن میں اہلِ حرفہ کو اِس بات کا پابند کیا جاتا تھا کہ وہ بعض خاص قسم کے مصنوعات تیار کریں، یا اُن کی ساخت و پیدائش میں خاص طُرقِ صناعت کو کام میں لائیں! لیکن چونکہ سرکاری نگراں کاروں کے پاس اِن گوناگوں منہ ابلہ شرائط کے نفاذ کی ضمانت حاصل کرنے کے لئے وقت نہ تھا۔ اِس لئے اب اِس کا تدارک یوں کیا گیا کہ سررشتۂ صنعت و حرفت کے انسپکٹر جنرل مامور ہوئے کہ وہ صوبجات میں دَورے کریں اور احکامِ متعلقہ کی بجا آوری پر اصرار کریں!

الغرض اِس طرح حکومت کے نظام میں اک ایسا انقلاب باعثِ ظہور میں آگیا تھا کہ وہ بجائے ذاتی ملک کے متوَلّیٔ اہلِ ملک ہو گئی تھی!

فرانس میں شہری و بلدیاتی آزادی، نظام جاگیرداری [illegible] کے بعد بھی باقی رہی! خداوندانِ زمین کے زرعی قلعہ [illegible]

کے بعد بھی عرصۂ دراز تک شہروقصبات کو حکومتِ خود اختیاری کا حق حاصل رہا۔

بیشتر صورتوں میں شہروں کا ایوانِ حکومت دو مجالس پر مشتمل ہوتا تھا۔ بڑے بڑے بلاد کا نظم و نسق ایسا ہی واقع ہوا تھا، لیکن بعض چھوٹے قصبے بھی اِس نظامِ کار سے متمتع تھے۔ اِن مجالس میں سے پہلی مجلس بلدیاتی عُمّال سے مرکب ہوتی تھی جو متعلقہ مقام کی آبادی کی کثرت یا قلت کے اعتبار سے کم و زائد ہوا کرتے تھے۔ میونسپلٹیوں کے اِن حکام کو اپنی خدمات کے لئے کبھی کوئی مُعاوضہ نہ ملتا تھا، تاہم اُن کے ساتھ "حسابِ دوستاں در دل" یوں رہا کرتا تھا کہ وہ عام محاصل سے مستثنیٰ رکھے جاتے تھے، نیز اُن کو بعض اور خاص مراعات حاصل تھیں:

دوسری مجلس، جو مجلسِ عمومی کہلاتی تھی، وہ ارکانِ کارپوریشن کا انتخاب کیا کرتی تھی، اور یہ اُن مقامات پر، جہاں وہ ہنوز اصولِ انتخاب کے تحت واقع ہوئی تھی۔ یہ مجلسِ ثانوی، شہر کے نظم و انتظام کے مہماتِ اُمور کی سربراہی میں شریک ہوا کرتی تھی!

اگر ہم شہر سے اپنی توجہ ہٹا کر اُسے دیہات کی طرف منعطف کردیں تو یہاں ہم کو مختلف قسم کے طریقہائے نظم و نسق اور متعلقہ عمّال کے مختلف نوع کے اختیارات سے سابقہ پڑے گا۔

اٹھارویں صدی میں کلیسائی آئمہ کی تعداد اور اُن کے مناصب کے نام مختلف صوبجات میں مختلف پائے جاتے تھے۔ بیشتر کلیساؤں میں یہ عمّال گھٹ کر صرف دو منصبوں کے اندر محدود ہو گئے تھے —— ایک کا نام "کلکٹر" (محصل محاصل) تھا، اور دوسرے کا "سنڈک"، عام طور پر یہ کلیسائی عمّال منتخب کئے جاتے تھے، یا منتخب شدہ سمجھے جاتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ عوام کے وکلاء کے بجائے حکومت کے آلۂ کار بن گئے تھے! کلکٹر، سرکاری نگراں کے براہِ راست احکام کے تحت عام محاصل عائد کیا کرتا تھا۔ سنڈک جو نگراں کار افسر کے ماتحت فرستادے کی روزمرہ نگرانی میں رکھا جاتا تھا، اُن جملہ اُمور میں اِس عامل کا ترجمان ہوا کرتا تھا جو امنِ عامہ اور کاروبارِ حکومت سے متعلق ہوا کرتے تھے، وہ فوجی خدمت، کارہائے رفاہِ عام اور مملکت کے عام قوانین کے نفاذ کے معاملے میں حکومت کا وکیلِ مطلق بن گیا تھا!

انقلاب کی عین ساعت تک فرانس کے کلیسائی حلقہائے نظم و نسق کو حکومت کی وہ روح کا وہ عنصر نصیب رہا جو اُنھوں نے قرونِ متوسطہ

میں حاصل کیا تھا، کلیسا کی مجلسِ شوریٰ اپنی خواہشات کا اعلان کرسکتی تھی، لیکن اپنی مرضی کے نافذ کرنے کے اختیارات اُسے اِس سے زیادہ حاصل نہ تھے، جتنے کہ شہروں کے اندر مجالسِ جمہور کو ہوا کرتے ہیں: مثلاً وہ اُسی وقت لب کشائی کرسکتی تھی جب کہ اُس کا قفلِ دہن توڑ دیا جاتا تھا! —— ہمارا روئے سخن اِس حقیقت کی طرف ہے کہ مجلسِ مذکور کا اِنعقاد قانوناً اُسی وقت ہوسکتا تھا کہ سرکاری افسرِ نگرانِ کار کی اجازت حاصل کرلی جائے!

(۳)

قصرِ امارت کا انہدام

اگر انقلاب سے پہلے کی فرانسیسی ہئیتِ اجتماعیہ کی حالت کا ہم بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو ہم کو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ہر حصۂ ملک میں، مختلف طبقاتِ جماعت کے لوگ، کم از کم وہ لوگ جو عوام کالانعام کی سطح سے بلند تر واقع ہوئے تھے، مناصب و مدارج کے سارے اختلافات کے علی الرغم، روز بروز ایک دوسرے سے ہم رنگ ہوتے جارہے تھے!

وقت، جس نے اُن مراعات کو قیام و دوام بخشا تھا، نیز بہت سی صورتوں میں سنگین تر بنایا تھا، جو اُن دو مدارجِ جماعت کی حدِ فاصل بناتے تھے، اُسی "وقت" نے تمام دوسرے اعتبارات سے، اُنھیں یکرنگی بہم پہنچانے میں بھی بڑے قوی اثرات پیدا کئے تھے!

مُسلسل کئی صدیوں سے فرانس کا طبقۂ امارت برابر اک زوالِ دولت کی گردش میں گرفتار تھا۔ ایک فرانسیسی امیر نے ۱۷۵۵ء میں اک غمناک آہنگ میں یہ الفاظ سپردِ قلم کئے:

"امارت، اپنے سارے اقتدارات و مراعات کے علی الرغم، اک نکبت و ہلاکت میں مبتلا ہے! متوسط طبقے کے لوگ معیشتِ قومی کے بڑے حصے پر قابض ہوتے جاتے ہیں!"

تاہم جن قوانین کے تحت اُمرا کی جاگیرات کی حفاظت و صیانت کی جاتی تھی وہ بدستور باقی رہے۔ چنانچہ طبقۂ امارت کی معاشی حالت میں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی! لیکن جس قدر اُن کی سیاسی طاقت میں کمی آتی گئی اُسی قدر اُن کی اقتصادی منزلت میں پستی پیدا ہوتی گئی۔ سیاست و معیشت میں اک باہمی رشتۂ تاثیر و تاثر ثابت ہوا!

ان معاملات کی خبر لینے والی اگر کوئی جماعت تھی تو وہ صرف مرکزی حکومت تھی، لیکن یہ جماعت اہلِ دیہات سے چونکہ اک دور دراز فاصلے پر مکین تھی، نیز ابھی اُسے آخر الذکر کی ذات سے کوئی خطرہ بھی پیش نہ آیا تھا، اس لئے اس کی تنہا خبر گیری بھی اُن سب کے معاملے میں اس سے زیادہ نہ تھی کہ اُن کی رگہائے خشک سے مالگذاری کے قطراتِ خون ہی نچوڑا کرتی تھی! سہ

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا
ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر!

اب کاشتکار کے شترِ صابر کی پشت پر اک اور تنکے کا اضافہ ہوا، سڑکوں کی مرمت کا یہ سرشتہ جاری کیا گیا کہ یہ کام تمام و کمال "بیگار" سے ہی انجام پایا کرے گا! اس کے معنی فصیح تر زبان میں یہ تھے کہ بے معاوضہ عرق ریزی کی یہ ساری سعادت مظلوم و محروم کسان ہی کے حصے میں آئے گی! "آسمانِ ایوان حکومت" سے نازل ہونے والی یہ "بلا" زمینِ دیہات پر پہنچنے سے پہلے پہلے یہی پوچھنے لگی کہ ع

خانۂ انوری کجا باشد!

ملک کی سڑکوں کو پتھر اور پانی کے بجائے سوختہ بخت کاشتکار کے گوشت و خون کے آب و گل سے تعمیر کرنے کی یہ تجویز اتنی جدت نواز اور فاتح کار سمجھی گئی کہ ۱۷۳۸ء میں فرانس کے کنٹرولر جنرل آلی نے یہ فرمان نما گشتی شائع کر دی کہ یہ جدید انکشاف دستور ملک کے سارے طول و عرض میں جاری کیا جاتا ہے! کیوں نہو؟! سہ

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی
چرا بگردنِ حافظ نمی نہی رسنے!

اس مرحلۂ حالات پر ملک کی زرعی آبادی کی جو اندوہناک حالت ہو گئی تھی اُس کا بیان کسی زبان کے لئے آسان نہیں! ہیئتِ اجتماعیہ کے سیاسی رستہ کی یہ کتنی ستم ظریفانہ چال ہے کہ اس کے پہیوں کی گردش جتنی جتنی دوسرے طبقوں کا معاشی و عمرانی دور دورہ لایا کرتی ہے، اُتنی ہی اُتنی کسان کو روندا کرتی ہے! آہ کہ جس دُخترِ تہذیب کو وہ اپنا خونِ جگر پلاتا ہے وہی اُس کی سوتیلی ماں بن جاتی ہے!

بیگار کی یہ مصیبت بدیر ایک حق شاہانہ بن گئی! چنانچہ رفتہ رفتہ اس ... کو آزادی گیا! اور رفتہ رفتہ تمام میٹوں کے

کارہائے تعمیر اسی ذریعے سے انجام پانے لگے! ۱۷۶۹ء کے سالِ مسعود نے تو یہ منظر دکھایا کہ فوجی بارکوں کا معمار بھی "بیگار" ہی ہے! شاہی فرمان واجب الاذعان کے الفاظ یہ تھے کہ "مُنا برکلیسا کے متعلقہ حلقوں کو اپنے بہترین کاریگر بھیجنا ہیں! تمام دیگر فرائض و امور راستہ خالی چھوڑ دیں گے، اور ان مجوزہ تعمیرات کا جلوس، راہ سے بے غل و غش گزرے گا!"

اسی بیگار میں پکڑے ہوئے آدمیوں سے یہ کام بھی لیا گیا کہ وہ اپنے ہرکاروں کی زیرِ نگرانی مجرمین کو جیل خانوں کے دار المحن تک پہنچائیں، اور دریوزہ گردوں کو کارگاہوں تک! جب کبھی فوجیں اپنی چھاؤنیاں بدلتی تھیں تو اُنکا خیمہ و خرگاہ بھی گاڑیوں میں لاد لاد کر یہی بیگاری مطلوبہ مقامات پر منتقل کیا کرتے تھے! یہ اک ویدنی زحمت تھی! اُن ایام میں فوجوں کے "پس خیمے" شیطان کی آنت ہوا کرتے تھے! ان کارہائے حمل و نقل کی لپیٹ میں کثیر التعداد گاڑیاں اور بیل اور "عوام کالانعام" کسان اور مزدور آیا کرتے تھے! سہ

تا "عزمن قنع" شدہ نقشِ نگیں ترا!
دارند اہلِ فقر ز دستِ تو صد جزع!

(۴)

اصلاح کی تعمیر و تخریب بالازم و ملزوم!

صورتِ حالات کے مرکب کا ایک اور عنصر —— جو اہم ترین عنصر ہے —— اب منتظرِ بیان باقی ہے! یہ وہ ہمہ گیر بے اعتقادی ہے جس کی زد میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں، اعتقادِ دینی کا ہر مظہر آگیا تھا! انقلاب میں جس چیز کی سب سے زیادہ کارفرمائی نظر آتی ہے وہ بلاشبہ یہی چیز ہے! لاریب کہ "انقلابِ فرانس" کی پیشانی پر جو تحریر بخطِ جلی لکھی ہوئی نظر آتی ہے وہ اسی حقیقت کا مُغزیٰ ہے!

لامذہبی نے عوام الناس کے انبوہ میں اک بے پناہ فتنہ پیدا کر دیا تھا! جس وقت مدنی قوانین کا استیصال ہوا اُسی کے ساتھ ساتھ احکامِ شریعت بھی چونکہ منسوخ ہو گئے، اس لئے لوگوں کے دل و دماغ یکسر درہم برہم ہو گئے! اب وہ اک لنگر گسستہ کشتی تھے جسے نہ اپنی بندرگاہ معلوم تھی نہ اپنا ساحلِ مراد! اس سلسلے میں انقلاب کاروں کی اک ایسی نوعِ سعی ظہور میں آئی کہ

دیکھی گئی تھی نہ سنی؛ اِس گروہ کا بحران جوش بالکل نقطۂ جنون تک پہونچ گیا تھا؛ اِن جنات کو کوئی قدرت جیران کر سکتی تھی نہ اصولِ اخلاق کی کوئی قید اُن کی عنان گیری؛ کوئی منصوبہ ہو اُسے عملی جامہ پہناتے ہوئے اُن کے پائے اقدام کو ذرہ برابر جنبش نہ ہوتی تھی؛

یہ خیال خام بھی کسی کو نہ ہو کہ یہ نو بجز انسانی وجود اِس لمحۂ خاص کی کوئی آنی وفانی، منقطع اور سطحی نشو ونما تھے، جس کے لئے یہ مقدر تھا کہ اپنے وقت متعلقہ کے ساتھ خود بھی رفت وگذشت ہو جائے؛ نہیں، اِن لوگوں نے پیدا ہو کر اپنی اک مستقل نسل کی بنیاد ڈالی، جو نسلاً بعد نسلٍ آج تک چلی آتی ہے؛ زمان کے ساتھ وہ مکان پر بھی حاوی ہے، اور متمدن دنیا کے ہر گوشے میں جا پہنچی ہے؛ ہر جگہ اُس کی ایک ہی صورت ہے، اور ایک ہی سیرت!

جن قوتوں کو میں نے بیان کیا ہے، نیز روح دینی کے جس فقدان کا ذکر کیا ہے، وہ جب بلوغ کو پہنچیں تو میرا یقین ہے کہ اُسی لمحے سے یہ بنیادی انقلاب جس نے اپنے مشترک دامنِ تباہی وتخریب میں فرانسیسی ادارات کے بیک وقت بہترین و بدترین عناصر دونوں کو لے لیا تھا، ناگزیر ہو گیا تھا! جو قوم بالذات عمل کے لئے اپنی آمادگی وتیاری میں ایسی سنگین خامیاں رکھتی ہو، وہ اک ہمہ گیر تخریب کے بغیر اک ہمہ گیر ——— مختلف محاذوں پر بیک وقت شروع ہونے والے! ——— انقلاب کا عَلَم بلند ہی نہ کر سکتی تھی! ؎

آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل!

تاہم، قبل اِس کے کہ ہم خاتمۂ سخن پر آئیں، اک آخری عنصر کا آئیے اور جائزہ لیتے چلیں: فرانس کے عوام الناس ۱۴۰ سال سے اوپر تک پبلک معاملات کی جلوہ گاہ پر نمودار نہ ہوئے تھے! پس کسی شخص کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ اِس منصب کو کبھی بارِ دگر اختیار کر سکیں گے! وہ اک عالم بیہوشی میں پڑے نظر آتے تھے! اُن کے سر کے اطراف میں نہ کان دکھائی دیتے تھے نہ کانوں کے اندر سماعت پائی جاتی تھی؛

"وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُم بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ!"

نتیجہ یہ تھا کہ جو لوگ اُن کے واردات و حالات میں دلچسپی لینے لگے تھے وہ اُن کا ذکر اُنہی کے سامنے اِس پیرائے میں کیا کرتے تھے کہ گویا وہ وہاں موجود ہی نہ ہوں! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِن حروف وحکایات کی فہم کے مقام بلند تک وہی لوگ کچھ پرواز کر سکیں گے جو عامۂ خلائق سے بالاتر واقع ہوئے ہیں! البتہ تنہا اندیشہ صرف یہ تھا کہ اعلیٰ طبقوں کے اعیان کہیں اُن کی پوری پوری سماعت کی اہلیت کا ثبوت نہ دینے لگیں!

لطف یہ ہے کہ عین وہ بزرگ جو گرفتار آزارِ خلق اللہ کے غیظ وغضب کا سب سے پہلا ہدف بننے کے مستوجب تھے، اِنہی دل جلوں کی موجودگی میں، اُس تعدی و بیدردی پر بہانگ دُہل تبرّی کیا کرتے تھے جس کی مسلسل آماجگاہ آخر الذکر لوگ بنے ہوئے تھے! وہ ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر اُن ہولناک مفاسد وشدائد کی طرف انگلیاں اُٹھاتے تھے جو ہیئتِ اجتماعی کے زیریں طبقوں کو پیسے ڈالتے تھے! وہ مزدوروں کے مدل بیحال کچھول کے گھٹائے جانے، اور عام خلقت کی زار وزبوں حالت کی مُرقع کشیوں میں اپنا سارا سوزِ بیان صرف کر دیتے تھے! ؎

دگر ز سادہ دلیہائے یار نتواں گفت!
نشستہ بر سرِ بالینِ من ز درماں گفت!

یہ گوہر فشانیاں اگرچہ وہ لوگوں کی تالیفِ قلوب کے لئے فرمایا کرتے تھے، لیکن اُن سے قدرۃً اور بھی پیدا ہوتی تھی! ؎

فتنے سب سچ ہی قیامت کے
لیکن آگے تمہاری قامت کے؟

(۵)

انقلاب کی صبحِ قیامت کی عین ماقبل ساعت!

انقلاب فرانس کے عین لمحے کے ظہور کے وقت فرانس کے ملک وقوم کی یہ حالت تھی: لیکن جب میں خود فرانسیسی قوم کے قصے پر غور کرتا ہوں تو میں خیال کرتا ہوں کہ وہ جتنی عجیب الخلقت واقع ہوئی ہے اتنا خرق العادت اُس کی تمامی تاریخ وسرگذشت کا ایک واقعہ بھی نہیں ہے!

سوال یہ ہے کیا تختۂ زمین پر ساعتِ ازل سے لے کر اِس لمحۂ حال تک کبھی کوئی قوم بطنِ گیتی سے ایسی نکلی ہے جو فرانسیسی قوم کی طرح انتہا پسندی کا مورد اور اجتماعِ متضادین کا مظہر ہو؟! جس پر جذبات واحساسات [illegible]

فرماں روائی ہو، اور افکار و اصول کی ایسی شُبک اڑی! جس سے ہمیشہ دیکھنے والوں کی توقعات سے بدتر حرکات سرزد ہوتی ہوں یا بہتر اعمال سرانجام پاتے ہوں؛ جو کبھی حیوانیت کی سطح سے جا لگتی ہو، اور کبھی بشریت سے بمراحل بلندتر پرواز کر جاتی ہو! جو اِس درجہ تغیر ناپذیر واقع ہوئی ہو کہ وہ تین ہزار برس پہلے کے قرنِ عتیق میں جو اُس کے حالات وفاترِ تاریخ میں پائے جاتے ہیں۔ اُن کے آئینے میں اُس کی آج کی سیرت کے خط و خال بھی پہچانے جا سکتے ہوں؛ جو اپنے روزانہ مزاج اور روزمرہ کے مذاق میں ایسی وارستگی و بیباک وحشی کی شان رکھتی ہو کہ خود اپنی ہی چشمِ حیرت کے لئے اک تماشا بن گئی ہو! جو اپنے کرتوتوں پر خود اتنی ہی حیران ہوتی ہو جتنی کہ اقوامِ غیر؛ جو ایسی طفلِ خانہ اور بچۂ عادت ہو، لیکن پھر ایک مرتبہ اپنی خاکِ وطن سے توڑ لئے جانے پر اور اپنے اشغالِ صبح و شام سے بچھڑا دیے جانے پر، آخری اکنافِ زمین تک دوڑتی چلی جانے، اور ہر ممکن و ناممکن کام پر اقدام کر جانے کے لئے پا بر رکاب بھی ہو!

اریب کہ اک ایسی ہی قوم ایسے انقلاب کو اپنے بطنِ حبت سے ولا[illegible] بخش سکتی تھی جو اتنا ناگہانی ہو، اتنا اساسی ہو، اپنی رفتار میں اتنا بے پناہ [illegible] ـــــــ اور پھر، اِس کے علی الرغم؛ ـــــــ اتنے مظاہرِ ردِّعمل سے لبر[illegible] ہو! اتنے متضاد حوادث سے مملو ہو! اور اتنی منافی یکدگر شاروں کا نیرنگ [illegible] ساز مُرقع ہو!!

جن اسباب و علل کا میں نے ذکر کیا ہے اُن کے بغیر فرانسیسی لوگ زن[illegible] کبھی "انقلابِ فرانس" کے محشر کو جگا نہ سکتے تھے! تاہم اِس حقیقتِ نفز کا بھ[illegible] اعتراف کرنا پڑے گا کہ اگر یہ سارے محرکات و مؤثرات بھی کسی سرزمین میں [illegible] یکجا کر دیے جاتے، لیکن وہ سرزمین فرانس کی خاکِ پاک نہ ہوتی، تو علل کا [illegible] یہ تمامی مجموعہ وہ معلول پیدا نہ کر سکتا جو فرانسیسی قوم ہی کی مرز بوم کا مخصو[illegible] ثمر تھا! ع

نا کاشتہ می روید یک دانہ چنیں باید!

(ترجمہ)

فیضِ حسن

مُحبّت میں ہم نے جوانی لُٹا دی — جوانی ہی کیا زندگانی لُٹا دی
ترے عشق میں زندگانی لُٹا دی — تری یاد میں نوجوانی لُٹا دی
تری مست آنکھوں کے فیضِ رواں کو — جو دیکھا مئے ارغوانی لُٹا دی
مگر تیرا کوچہ ہے فردوس منظر! — تری راہ میں نوجوانی لُٹا دی
جوانی تھی اک خوابِ رنگین و دلکش — نہ معلوم پھر کیوں جوانی لُٹا دی
وہ شامِ محبت وہ رنگین منظر! — کہ قدموں میں ترے جوانی لُٹا دی
وہ نورِ سحر میں تری مُسکراہٹ — یہ کس نے مئے ارغوانی لُٹا دی
ضیا کی محبت کو ٹھکرا کے اُس نے — نہ معلوم یوں کیوں جوانی لُٹا دی

محمد ضیاء الاسلام بی۔ ایس سی
بی۔ سی۔ ایس۔ ایجوکیشن

وہ کائیں قائم ہوگئیں۔

مسادھوؤں اور فقیروں کی سینکڑوں جھونپڑیاں بن گئیں۔ یا ہُو اور رامے رام کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اذان اور ناقوس کا دَور دَورہ ہوگیا۔ گھنٹے بجنے لگے۔ عیسائی مشنری کی سرگرمیاں جاری ہوگئیں۔ گنبد کا طلائی ہوجانا، روزانہ ہزاروں روپے اور منوں مٹھائیوں کا چڑھاوا چڑھنا ایسا نہ تھا کہ حریص طبائع اس کی تاب لا سکیں۔ چنانچہ دلّی کے ایک بزرگ جو اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے کئی مرتبہ سزائے قید بھگت چکے تھے اپنے لمبے لمبے بال اور گھنی ڈاڑھی لے کر پہونچے اور اپنی کرامت کا وہ زور دکھایا کہ آخرکار اس گنبد کے مجاور اور بعد میں سجادہ نشین ہوگئے۔ خانقاہ تیار ہوگئی۔ سالانہ عرس بھی شروع ہوگیا۔ ہر مذہب کے مبلغ پہونچ گئے، اور ان لامذہب گاؤں والوں کو ان کا پرانا مذہب یاد دلایا۔ مندر گرجا اور مسجد سب کچھ نئے بن کر تیار ہوگئے۔ مواضعات خوشحال تھے مبلغین کی خوب خوب دعوتیں ہوئیں۔ مبلغوں نے اپنے اپنے گروہ قائم کرلئے۔ روزانہ تقریریں ہوتی تھیں۔ کوئی عیسائی ہوگیا کوئی مسلمان، اس پر آئے دن جھگڑے ہونے لگے۔ ہر جمعہ کو جو گاؤں والوں کا مجمع ہوتا تھا اسمیں بھی کمی ہوگئی۔ ایک دوسرے میں وہ اگلا سا خلوص مفقود تھا۔ اس کے علاوہ سجادہ نشین صاحب نے کچھ ایسے ضابطے بھی بنا دئے تھے جس سے گاؤں والوں میں عام بددلی پھیل گئی تھی۔ زمانہ اسی حالت میں گزرتا گیا پیداوار آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ گاؤں والوں میں مفلسی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ایک دوسرے کی بدخواہی کرنے لگا۔ خلوص اور محبت کے کل رشتے ٹوٹ گئے۔ خانقاہ کے اندر چاندی اور سونے کے ڈھیر لگے تھے اور خانقاہ کے باہر مفلسی چھائی ہوئی تھی۔ نہ کسی کی دعا میں اثر تھا نہ کسی کی آہ میں تاثیر۔

چونکہ گنبد کے قریب چار بزرگ دفن تھے اس لئے سال میں چار عرس ہی ہوتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس خانقاہ کی آمدنی دوسری خانقاہوں سے بہت زیادہ تھی۔

چنانچہ چوتھا عرس شروع ہوگیا۔ ہندوستان کی منتخب طوائفیں، بھانڈ والی اور امرا سب پہونچ گئے۔ حال و قال کی مجلسیں گرم ہونے لگیں۔ ہر مذہب پیشوا اور مبلغ اپنی اپنی ٹکڑیاں لئے ہوئے خیمہ زن ہوگیا۔ گاؤں والے بھی پہونچے۔ مگر اس مرتبہ گاؤں والوں کو ایک خاص بات محسوس ہوئی، یہ لوگ بیلوں اور جھاڑیوں کے مہکتے ہوئے پھول توڑ کر بطور تبرک اپنے گھر لایا کرتے تھے۔ چنانچہ دو ایک بوڑھی عورتوں اور مردوں نے جو پھول توڑے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان کی خوشبو زائل ہوچکی تھی ان لوگوں نے گھبرا گھبرا کر پھر پھول توڑنا شروع کئے۔ مگر کسی میں خوشبو کا نام تک نہ تھا۔ سب بڑے بوڑھے جمع ہوئے، سب نے پھول سونگھے۔ کل گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔ بوڑھے بچے جوان سب موقعے پر پہونچ گئے۔ پھول توڑ توڑ کر سونگھنا شروع کیا، مگر ان میں خوشبو مفقود ہوچکی تھی۔ سب نے چیخیں مار مار کر رونا شروع کیا۔

اپنے پیروں اور پیشواؤں پر یکایک حملہ آور ہوگئے۔ ہر شخص رو رو کر کہتا تھا تم سب دغاباز اور جھوٹے ہو۔ تم نے ہمیں برباد کیا۔ ہم اپنے بزرگوں سے نسلاً بعد نسلاً سنتے چلے آئے ہیں کہ ان بیلوں اور جھاڑیوں کے قریب جب جھوٹے لوگ آجائیں گے تو ان کے پھولوں کی خوشبو جاتی رہے گی جیسا کہ آج اس کا تجربہ ہوگیا۔ عرس میں شریک ہونے والوں کی تعداد لاکھوں کی تھی۔ گاؤں والوں کی یہ گستاخی دیکھ کر پیر طریقت یعنی سجادہ نشین صاحب نے عام حملے کی اجازت دیدی۔ عرس کی پوری خلقت گاؤں والوں پر ٹوٹ پڑی اور انھیں زدوکوب کرنا شروع کردیا۔ یکایک آندھی اٹھی اور تاریکی پھیل گئی۔ ہوا کے جھونکوں نے خانقاہ کے کنگروں اور جھنڈوں مثل کاہ کے اُسے اُڑا دیا۔ زمین میں جنبش پیدا ہوئی اور اتنی زور کا زلزلہ آیا کہ پہاڑی شق ہوگئی۔ پانی اُبلنے لگا۔ گنبد اور خانقاہ زمین میں دھنس گئے۔ اور جتنے آدمی پہاڑی پر موجود تھے وہ سب غرق ہو گئے۔ اس وقت سے پھر وہ پہاڑی اور مواضعات کبھی سرسبز اور شاداب نہ ہوئے۔

~~~~~~~~~~

کبھی پروردگار سرِ نا شنیداں
دولت اپنی پہ نثار کرنا شنیداں
نہ اس کی خباثت سے ہو جو ہو بیتاب آگاہ
سرِ سجدہ نہیں بہ ہر سرِ پیشیداں
~~~~~~~~~~

رکشہ والا

سعد منیر، کانپوری

رات کا وقت تھا، گیارہ بجنے والے تھے۔ رکشہ والا ننگے بدن میلی دھوتی باندھے، سینما گھر کے پاس سواری ملنے کی اُمید میں خاموش کھڑا اٹھا، وہ اُمید بھرے دل کے ساتھ سینما گھر کے برقی قمقموں سے جگمگ جگمگ کرتے ہوئے مرمریں فرش کے برآمدے کی طرف للچائی نظریں جمائے ہوئے تھا، بازار کی تمام بڑی بڑی دوکانیں بند ہو چکی تھیں، صرف حلوائی، تنبولی اور بیڑی والوں کی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ کبھی کبھی موٹر، یا گاڑی کے چلنے سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز یا رکشہ کی ٹنٹناہٹ خاموشی کو توڑ دیتی تھی، باوجودیکہ شام سے اس وقت تک اُسے کچھ بھی آمدنی نہیں ہوئی تھی پھر بھی ظلمت مایوسی میں اُمید کی ایک دھندلی سی کرن اُسے وہاں ٹھہرائے ہوئے تھی کہ شاید تماشہ ختم ہونے پر کوئی سواری مل جائے۔ رکشہ والا نوجوان تھا۔ لیکن غریبی اور مفلسی اس کے بشرے سے ظاہر تھی۔ جیسا کہ عموماً بیکاری کی لعنت سے ہندوستان کے نوجوانوں کی اکثریت پر طاری رہتی ہے۔ اُن چند نوجوانوں کے چہروں پر نہیں جو امیر اور دولت مند والدین کے آرام پسند نورِ نظر ہوتے ہیں اور جو صرف مسرت و انبساط کی جستجو میں اپنے غریب اور بے کس ہموطنوں کی مصیبت اور تکالیف سے بے پروا، بلکہ اُن کثیر نوجوانوں کے چہروں پر جنھیں فطرت کے ستم ظریف ہاتھوں نے غریب والدین کی آغوش میں لاڈالا ہے، جو ایک وقت پیٹ بھرنے کے لئے دُور دُور کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور جنھیں ہندوستان کے عیش پرست امرا حقیر و ذلیل ہی نہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ وہ اگر ایک طرف فطرت کی ستم ظریفی کا شکار ہو رہا تھا تو دوسری طرف سنگدل قوی انسانوں کے خود غرضانہ شر سے بھی محفوظ نہ تھا۔ مونگیر کے خوفناک و تباہ کن زلزلے نے جہاں صاحب ثروت اور دولت مند حضرات کے فلک بوس محلات اور اونچی اونچی شاندار عمارتوں کو منہدم کرکے ویران کھنڈروں میں تبدیل کر دیا تھا وہیں بیچارے غریب اور محنت مزدوری کرکے پیٹ بھرنے والوں کے کچے مکانات اور جھونپڑوں کو بھی اپنی تباہ کاریوں میں لپیٹ لیا تھا، رکشہ والا بھی انھیں مصیبت زدوں میں سے ایک تھا، اُس کے گھر کے تمام افراد مکان کے اندر دب دبا کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، ایک تنہا وہی تھا جو کسی نہ کسی صورت سے غم کا ناقابلِ برداشت بوجھ اٹھانے کے لئے موت کے خونی پنجوں سے بچ گیا تھا۔ مونگیر کے خوفناک اور دہشت خیز مناظر اور زلزلے کا خوف اُسے کلکتے بھگا لایا تھا، کلکتے میں مفلسی نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہ رکشہ کھینچنے پر مجبور ہو گیا۔ حسب معمول وہ رکشا لے کر آج بھی اڈے پر آیا تھا، اور سب رکشوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے پانچ اور رکشا وہاں موجود تھے۔ اس لئے اُس کا چھٹا نمبر تھا۔ کافی عرصے تک کھڑے رہنے کے بعد جب پانچواں رکشہ بھی چلا گیا تو اُس کی باری آئی۔ اول تو بہت دیر تک کوئی سوار ہی آئی ہی نہیں، اگر کسی نے آواز بھی دی تو قبل اس کے کہ وہ وہاں پہونچے تو دوسرا رکشہ والا تیزی سے رکشہ گھسیٹ کر سواری کے پاس پہونچتا اور بٹھا کر گھنٹی بجاتا ہوا چلا جاتا۔ وہ بیچارہ منہ تکتا رہ جاتا۔ جانے والے رکشہ کی آواز بتدریج آہستہ ہوتی جاتی اور اس کے دل کو زخمی

کرنی جاتی۔ آخرش وہ غمگین و اُداس سر جھکا کر بیٹھ گیا، اُس کے بعد سے کوئی سواری ہی نہیں آئی۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ سینما گھر کے پاس آیا تھا۔

کھیل ختم ہوا۔ فلم نے آخری قومی گیت گایا، اندھیرے ہال میں روشنی ہوئی تماشائی اپنی کرسیوں کو چھوڑ کر باہر نکلے۔ بڑے بڑے امیر و دولت مند گاڑیوں اور موٹروں پر اپنے گھروں کو چل دئے۔ بعض پیدل ہی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ رکشہ والا ہر ایک کو دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اُسے پکارے، مگر سینما گھر بالکل خالی ہوگیا۔ اُس کے پھاٹک بند کر دئے گئے۔ سڑک بالکل سنسان ہوگئی۔ اور وہ بیچارہ وہاں کھڑا کا کھڑا ہی رہ گیا۔ اُس کی اُمید دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ اُس نے ٹھنڈے سانس بھرے مایوسانہ انداز سے رکشہ اُٹھائے اور اپنے گھر کا رُخ کیا، صبح سے اس وقت تک ایک پیسہ بھی اس کے مُنہ میں نہیں گئی، اب رات کو بھی فاقہ سے سامنا کرنا تھا۔ وہ قسمت کے خلاف کر ہی کیا سکتا تھا۔ جو تقدیر میں لکھا تھا وہ بھگت رہا تھا، وہ سڑک پر اپنی پھوٹی قسمت پر دل ہی دل میں روتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

او رکشا رکشا۔ کسی نے آواز دی۔

وہ مایوسیوں اور ناکامیوں میں اتنا گھرا ہوا تھا کہ آواز سنائی نہ دی، وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا، جب پکارنے والے نے دوبارہ آواز دی تو اُس نے گھوم کر دیکھا، تھوڑے فاصلے پر کوئی شخص اُسے پکار رہا تھا اُس کی من مانی مراد بر آئی۔ اُس نے اپنا رُخ اُدھر پھیرا، بھوک کی وجہ سے اُس کا بدن جو نیم مردہ ہو رہا تھا اُس میں چستی و چالاکی کی لہر دوڑ گئی، وہ آن واحد میں پکارنے والے کے پاس پہونچ گیا۔

پکارنے والا ایک ہندوستانی انگریز تھا، وہ نشہ میں سرشار تھا، اُس کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے، زبان بَرائی ہوئی تھی، "پا، پا، پارک سرکس" صاحب نے رکشہ کی گدی پر دھڑام سے گرتے ہوئے کہا۔

رکشہ والے نے چابکدستی سے رکشہ اٹھایا، مزدوری ملنے کی خوشی سے اُس کا دل بڑھ گیا تھا، اب وہ پیٹ بھر سکے گا، وہ جلدی جلدی دوڑنے لگا، وہ لوٹا دوڑتا، پُوچھتا، گھپتا، چکر کھاتا بڑی دقتوں کے بعد وہ پارک سرکس پہونچ گیا۔

"اُدھر روک لو" ایک گلی کی طرف اشارہ کرکے صاحب نے نشہ کے خمار سے چونک کر کہا۔

اُس نے رکشہ رکھدیا، وہ پسینے سے شرابور زور زور سے ہانپ رہا تھا، لیکن اُس کا دل خوش تھا، کیونکہ اب اُسے پیسے ملنے والے تھے، وہ صاحب کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوگیا۔ صاحب اُترے، اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جھومتے لڑکھڑاتے ہوئے بغیر مزدوری دئے چلے۔

"میری مزدوری تو دیتے جائیے صاحب" رکشہ والے نے کہا لیکن صاحب واہی تباہی بکتا چلا ہی جا رہا تھا، رکشہ والا ہاتھ پھیلائے اُس کے پیچھے گیا اور مزدوری طلب کرنے لگا۔

"ہم تمرا پیسہ دیدیا ہے، سور کا بچہ، بدمعاش" صاحب نے کہا۔

بھوک کی تیزی، محنت کی تھکن، مزدوری ملنے کی مایوسی، اس پر صاحب کی گالی، رکشہ والا غصّے سے بھر گیا۔ اُس نے صاحب کا ہاتھ تھام لیا، اور سختی سے مزدوری طلب کرنے لگا، صاحب اپنی انگریزیت، اور اپنے سوٹ بوٹ پر نازاں تھا، ہندوستانی اُس کے غلام تو ہیں ہی، اُس نے رکشہ والے کے ایک سخت ٹھوکر رسید کی، ٹھوکر اُس کی پسلی پر لگی، وہ گر پڑا اور ضرب کی شدت سے کراہنے لگا۔ صاحب نے اپنا راستہ لیا، نیم شب میں جو تین چار آدمی جمع ہو گئے تھے، وہ بھی بغیر کچھ خیال کئے ہوئے اپنی راہ لگ گئے، رکشہ والا ایک طرف پڑا تھا۔ عالم خواب میں محو تھا، آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے انسانوں کا حیوانی سلوک دیکھ رہے تھے۔

انسان! اے درندے انسان!

ہندوستان، اے بدبخت ہندوستان!

انساں کو فرشتہ سے حیواں کر دے

مجبور کو صد خار بہ داماں کر دے

دولت کو [illegible]

[illegible] پشیماں کر دے

نظیر اکبر آبادی

(یہ نظم ۱۰ اگست ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ ہو چکی ہے)

بزمِ ہستی کر رہی ہے یاد وہ دورِ کہن ! نور سے محروم تھا جب مطلعِ شعر و سخن !
جب حقیقت تک نگاہِ شاعری پہونچی نہ تھی برقِ شعریت عیاں ہو کر کہیں چمکی نہ تھی
ذہن شاعر کی طرح نغمے رسا ہوتے نہ تھے قلب تاثیرِ سخن سے آشنا ہوتے نہ تھے
ہر نوا گر بادۂ بے روح سے سرشار تھا یوں تو سب کچھ تھا مگر ناواقفِ اسرار تھا
حسن کے ناظر تو اکثر تھے، کوئی ناقد نہ تھا کارواں تھے سیکڑوں لیکن کوئی قائد نہ تھا
کیف و کم ناآشنا تھے زندگی کے جام سے پھول چن سکتے نہ تھے گل خانۂ الہام سے

ناگہاں اک شاعرِ شیریں نوا پیدا ہوا
یعنی اک نقاشِ فطرت انجمن آرا ہوا

اے سخن کی مملکت کے تاجدارِ اولین اے نظیر، اے شاعرِ اعظم ادیبِ بہترین
سب سے پہلا میکشِ میخانۂ فطرت ہے تو عہدِ پیشیں کی نوائے روحِ شعریت ہے تو
بد مذاقی نے زمانے کی بھلایا تھا تجھے اور کچھ اہلِ وطن نے بھی مٹایا تھا تجھے
طلعتِ حور و رنگ بن کر ہو گیا تو جلوہ گر ترجمانی کر رہے ہیں اب تری شمس و قمر
خود ترے الہام پاروں نے جگایا ہے تجھے مسندِ علم و ادب پر لا بٹھایا ہے تجھے
تیرے قدموں پر ہے سجدہ ریز لیلائے ادب حشر تک احساں ترے مانے گی دنیائے ادب

ہیں ترے اشعارِ سادہ ہر زباں پر آج بھی
چھا رہا ہے تُو زمین و آسماں پر آج بھی

اے نظیرؔ اے سرزمینِ تاج کے ماہِ تمام
ثبت دامانِ ادب پر ہے ابھی تک تیرا نام

تیرے نغموں کی جہاں میں گونج باقی ہے ابھی
کائنات افروز تیری خوش مذاقی ہے ابھی

زندگی کے ہر بلند و پست کا ناظر ہے تُو
شاعرِ فطرت ہے نبضِ دہر کا ماہر ہے تُو

گلشنِ اُردو کا ہے تو باغبانِ اوّلین
تُو زبانِ سادہ کا ہے ترجمانِ اوّلین

دی جلا تُو نے مذاقِ شعریت کو عمر بھر
بارہا پہونچی حقیقت تک تری عالی نظر

زور حاصل تھا تجھے عکاسئ جذبات پر
سینکڑوں گلکاریاں فرمائیں حسیّات پر

گوہرِ انوار سے ہستی کا دامن بھر دیا
چیر کر ذرّوں کا دل ہر راز ظاہر کر دیا

تھا نگاہوں میں تری ہر منظرِ شعر و ادب
مانتے ہیں سب تجھے پیغمبرِ شعر و ادب

اپنی فطری شاعری کا موجد و بانی ہے تُو
اعترافِ دہر فانی ہے کہ لافانی ہے تُو

ہر مذاقِ زندگی کو تُو نے روشن کر دیا
ڈھال کر اشعار میں ذرّوں کو امین کر دیا

دنگ ہے دُنیا تری جادو بیانی دیکھکر
عقل حیراں ہے تری گوہر فشانی دیکھکر

اے نظیرؔ نامور پیدا نہیں ہمسر ترا
تا ابد چرچا رہے گا دہر میں گھر گھر ترا

تُو نے وہ موتی چنے ہیں دامنِ الہام سے
شاعری زندہ رہے گی صرف تیرے نام سے

آج بھی جمنا کی موجیں گیت گاتی ہیں ترے
تاج کی رعنائیاں نغمے سناتی ہیں ترے

منظر صدیقی اکبرآبادی

مراق و مالیخولیا کی فلسفیانہ تشریح

میں جب مندرجۂ ذیل مضمون کا ترجمہ کرنے بیٹھا تھا، اُس وقت یہ بات میرے حاشیۂ ذہن تک میں نہ تھی کہ اثنائے ترجمہ میں اس موضوع کے متعلق میں بھی اپنی طرف سے کچھ لکھوں گا۔ لیکن تھوڑا سا ترجمہ کرتے ہی میرا دماغ کھل گیا، اور مراق و مالیخولیا کے متعلق میرے ذہن میں خیالات کا ایسا ہجوم ہوگیا کہ میں اس بات پر مجبور ہوگیا کہ یا تو اسی موضوع پر علیحدہ ایک مضمون تیار کرلوں، یا پھر اس ترجمے کے اندر ہی اپنے خیالات کو کھپا دوں۔

چونکہ ترجمے کے ذریعے سے میرے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تھی، اس لئے ادبی دیانت نے اس کی اجازت نہیں دی کہ میں علیحدہ مضمون لکھوں۔ بلکہ یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس ترجمے کے اندر اپنے خیالات کا اضافہ کردوں۔ چنانچہ جہاں جہاں مناسب معلوم ہوا میں نے صرف سطریں کی سطریں ہی نہیں، صفحے کے صفحے اس میں شامل کردئے۔ اس طرح کہ قارئین کو یہ پتا نہ چل سکے کہ اصل مضمون کتنا ہے، اور مترجم کے اضافے کی مقدار کیا ہے۔

میں نے یہ تمہیدی چند سطریں اس لئے لکھدی ہیں کہ اگر کبھی کوئی میرے اس ترجمے کو اصل مضمون سے ملائے تو اس کشمکش میں مبتلا نہ ہوسکے۔ ترجمے سے زیادہ جو جو عبارتیں اور تصرفات ہیں وہ کہاں سے اور کیوں کر آئے ہیں۔

(مُدیر)

رابرٹ برٹن

مُدیر

(۱)

شائستہ قارئین! میں اپنا اصلی نام نہیں بتانا چاہتا، اور میرا خیال ہے کہ آپ میں سے ہر فرد یہ جاننے کے لئے بیچین ہوگا کہ یہ گستاخی سے دوسری شخصیت کے نام کے ساتھ آنے والا کون حیلہ ساز بازی گر، یا ایکٹر ہے، جو اس بیباکی سے عالم کے فکر و نظر کے مشترک و آفاقی تھیٹر میں داخل ہوگیا ہے۔ یہ دراصل کہاں کا باشندہ ہے، اُس نے اپنے کو پس پردہ کیوں رکھا ہے، اور یہ کہنا کیا چاہتا ہے؟

لیکن اُس شئے کی تلاش نہ کیجئے جو مخفی ہے — کتاب کے مضامین اگر آپ کو پسند آئیں تو فرض کرلیجئے کہ اُس کا مصنف زمین پر نہیں، آغوشِ قمر میں ہے۔ آپ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کریں، میں اپنے کو ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔

میں نے اپنے کو ڈیماکرٹیس صغیر کے نام سے پکاروں گا، تاکہ زیادہ آزادی کے ساتھ گفتگو کرسکوں۔

ڈیماکرٹیس کی کتاب کا موضوع تھا "مراق و مالیخولیا" جس کے چاروں طرف ہزاروں بہایم کی لاشیں پڑی رہتی تھیں جنھیں وہ چیرا پھاڑا کرتا تھا۔ — اِس چیر پھاڑ سے اُس کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ قدرت کی تحقیر کرے، بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ حیوانات

کے جسم میں اِس عظیم کبیدگی کا محل وقوع معلوم کرلے، جسے مراق اور مالیخولیا کہتے ہیں، اور اِس ذریعے سے یہ بات دریافت کرلے کہ یہ موذی مرض نوعِ انسانی کے اندر کیوں کر پیدا ہو کر نُمو حاصل کرتا ہے۔ تاکہ وہ سب سے پہلے تو اپنا علاج کر سکے، اور پھر اپنی ذات پر تجربہ کرنے کے بعد تحریر کے ذریعے سے دوسروں کو بھی بتا سکے کہ وہ کیونکر اِس بلا سے محفوظ رہ سکتے ہیں ——— اور یہی وہ نیک نیتی ہے جس کی رُو سے اِس کتاب کا مصنف (جو اپنے کو ڈیماکریٹس صغیر کے نام سے پکارنا چاہتا ہے) اِس بات پر کمرِ ہمت باندھ رہا ہے کہ وہ ڈیماکریٹس کبیر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُس کی ناتمام تصنیف کو تمام کرکے ایک نئی شکل میں پیش کردے۔

میں داد نہیں چاہتا، بلکہ بھلے آدمیوں کی لعنت و ملامت سے خوفزدہ ہوں ——— پھر بھی اللہ کے نیک بندوں کی کریا نہ پسندیدگی پر نگاہ رکھتے ہوئے اپنی مشقت کا نچوڑ پیش کررہا ہوں۔ لیکن اُن تمام ہرزہ بازوں، لاعنوں، بہتان تراشوں اور یاوہ گویوں کو ٹھکرا دینا چاہتا ہوں جو ہر نئی کتاب پر بے تکان بھونکنے لگتے ہیں۔ ابھی جو کچھ کہ میں نے کہا ہے اگر اِس کی ضرورت، یا اہمیت پر کسی کو اعتراض یا شک ہے، تو میں اُسے یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اِس عالمِ کون و فساد کا تھوڑا سا جائزہ لے، اور جیسا کہ "سایپرس" نے "ڈونیٹ" کو مشورہ دیا تھا، اگر وہ یہ فرض کرے کہ وہ کسی نہایت ہی اونچے منارے پر پہونچا دیا گیا ہے جہاں سے وہ اِس لرزہ براندام دنیا کا شور و غوغا سُن رہا اور اِس بوکھلائی ہوئی زمین کے حوادث دیکھ رہا ہے ——— تو مجھے یقین ہے کہ وہ یا تو نوعِ انسانی پر قہقہے مارے گا، پھر اُس پر ترس کھا کر آنسو بہانے لگے گا، اِن دو باتوں کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ شخص جو دلِ آگاہ، اور چشمِ بینا رکھتا ہے، اُس کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی قطبین کے درمیان، خوشامدوں، فریب کاریوں، اداسیوں، مراقوں، شقاوتوں اور جنوں انگیزیوں کا ایک ہنگامہ برپا ہے۔ اور یہ دُنیا کچھ نہیں، مگر ایک وسیع پیمانے پر تعمیر کیا ہوا پاگل خانہ جس کے لئے ہر پاگل باون گز سے کم کا ہوتا ہی نہیں ——— اور اس کی شدید ضرورت ہے کہ اس پاگل مخلوق کی اصلاح، اور اس پاگل خانے کی ازسرِنو تعمیر کی جائے ———

سلطنتیں، اور حکومتیں پاگل ہیں ——— شہر اور قصبے پاگل ہیں۔ جرگے کے جرگے، اور خاندان کے خاندان پاگل ہیں ——— ہر صاحبِ نمو مخلوق اور ہر ذی حس و معقول ہستی پاگل ہے۔ تمام انواع، تمام طبقات، تمام نسلیں، بلکہ تمام سنین و شہور اور تمام صدیاں پاگل رہی ہیں، اور سب ہی پاگل ہیں۔ حواس باختہ ہیں، بے سُرے ہیں، اور مجبوط۔ اور یہ پاگل پن اِس قدر مزمن و محکم ہے کہ عرش کے کنگروں سے لے کر فرش کے کنگروں تک سب کو، بلا استثنا سب کو دوا اور معالج کی شدید احتیاج ہے۔

اس کُرے پر دماغی مریض کون نہیں ہے؟ اے اُلٹی کھوپڑی کے عہد، اے مجبوط انسانو! اور اے مجنون اعمال! میں تمہیں کیا کہہ کر پکاروں؟ اور میں تمہیں راہِ راست پر کیوں کر لاؤں؟ اگر آج ڈیماکریٹس زندہ ہوتا اور ہمارے عہد کے اوہام، ہمارے مذہبی جنون، ہمارے مدّعیانِ مذہب کی بے دینی، ہمارے ہشیار زریں اقوال، ہمارے برائے نام نیک اعمال، ہمارے واعظوں کا اس قدر ہجوم، اور ہمارے افعال کی اِتنی پستی کا تماشا دیکھتا تو خدا جانے اُس نیک دل شخص کا کیا حال ہوجاتا۔

اگر وہ یہ دیکھتا کہ نوعِ انسانی صرف اس قدر خون بہا رہی ہے کہ اُس سے پن چکیاں چل سکتی ہیں، اور آدمی ایک دوسرے سے یوں گتھے پڑے ہیں گویا کسی بادشاہ کو مینڈھوں کی لڑائی کا تماشا دکھا رہے ہیں، اور یہ تمام ہنگامے کسی مقصدِ عظیم یا کسی امرِ خیر کے واسطے نہیں بلکہ اوہام اور مذہبی جنون کے سوا اِن کی اور کوئی بنیاد ہی نہیں تو وہ غیظ و غم کی شدت سے دیوانہ ہوجاتا۔

یہ ہمارے شائستہ اور تربیت یافتہ انسان جو احتیاط کے ساتھ پروان چڑھائے گئے ہیں، جن کے جسم توانا، اور دماغ قوی ہیں، مذہبی وسوسے اور روایتی اوہام انھیں شائستہ انسانوں کو قتل و غارت کی طرف للکارتے ہیں۔ اور وہ رحم و انسانیت کے تمام جذبات سے عاری ہو کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگتے ہیں، اور شیطان کو غذا بہم پہنچانے کی خاطر آنِ واحد میں لاکھوں گردنیں کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

اگر صرف ایک مرتبہ آنِ واحد میں لاکھوں گردنیں کاٹ کر ان ظالم مراقیوں کی آنکھیں کھل جاتیں تو بھی غنیمت تھا، مگر یہ رسم دوامی،

اور وہم و خرافات پر مبنی "مقدس جنگیں" سالہا سال تک جاری رہتی ہیں۔ کوئی عہد اور کوئی دَور ان سے بچا نہیں رہتا، صدیوں اور قرنوں تک یہ کاٹ چھانٹ، یہ شقاوت و قصاوت، یہ شکست و ریخت اور یہ توڑ پھوڑ جاری، اور برابر جاری رہتی ہے۔

یہ کون ہے جس نے اِس "امن پسند" "حلیم" "صاحبِ مہر و محبت" اور "پیدائشی رحمدل" "انسان کو اس بات پر مامور کر رکھا ہے کہ وہ ہمیشہ بہائم کی طرح خون بہاتا، اور خود اپنی ہی تباہی کے سامان مہیا کرتا رہے؟

ہمارے حلقے میں کتنے قانون ساز اور کتنے قانون داں ہیں۔ مگر کس حقیر مقدار میں معدلت گستری کی جاتی ہے۔

ہمارے دائرے میں کس قدر خواتین ہیں، مگر کتنی بدنظمی پھیلی ہوئی ہے

ہماری سوسائٹی میں کتنی مخصوص عدالتیں ہیں، مگر وہ عدالتیں کتنی بے شمار بھول بھلیاں تعمیر کرتی رہتی ہیں۔

ہمارے دادرسی کے ایوانوں میں گو مسند پر فردِ جرم لگائی جاتی ہے، اور گرگ سزا کا حکم سناتا ہے۔

یہ ہے ہمارا مشہورِ عالم انصاف! ہمارے بازار کیا ہیں؟ صرف ایسے مقامات جہاں ایک دوسرے پر دام ڈالا جاتا ہے۔ اور جہاں ہر قدم پر چوہے دان کی طرح "انسان دان" لگے ہوئے ہیں۔

بازاروں کا کیا ذکر، خود ہماری یہ دنیا کیا ہے؟ ایک وسیع شور و غوغا کا مقام۔ ایک مسلسل و متصل بربادی و ابتری کا محل، ایک ہولناک دغا بازی کا عظیم تھیٹر۔ ایک لفنگے پن کا کارخانہ، ایک غرّاتا اور بھونکتا ہوا بانا، اور ایک شر و فساد کا غضبناک ادارہ!

یہ دُنیا ایک میدانِ جنگ ہے، جہاں یا تو یہ لازمی ہے کہ تم کسی کو ہلاک کر ڈالو، یا کوئی تمہیں ہلاک کر ڈالے۔

یہ کرۂ ارض خود کامیوں کا ایک ایسا میدان ہے جہاں ہر شخص صرف اپنے لئے جیتا اور صرف اپنے ہی لئے مرتا ہے —— اس کرے کے بسنے والوں میں رحم، ہمدردی، دوستی، یگانگی، اُنس، اتحاد، اور محبت کا نام تک نہیں پایا جاتا۔

ہماری معبود تو صرف زر دیوی ہے، اور کوئی نہیں —— اور اسی کی قربانگاہ پر ہم اپنے بھائیوں کے سروں کو بھینٹ چڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ دنیا لیاقت، نیکی، دانش، جوہر، شجاعت، علم اور تدیّن کی بنا پر کسی کی عزت کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتی —— البتہ اِس کے روبرو اگر زر، زمین، زن، دولت، حکومت اور اقتدار پیش کر دو تو وہ دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑے گی۔

تمام دنیا پاگل ہے، اِس کا ہر رکن پاگل ہے، اس کا بچہ بھی پاگل ہے، اس کا جوان بھی پاگل ہے، اور اِس کا بوڑھا بھی پاگل ہے۔

اگر میں کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس قدر کہ اپنے اور دیگر ابنائے زمانہ کے معالجے کی خاطر کسی حاذق طبیب کو تلاش کر کے نفسِ انسانی کو مراق کی بیماری سے نجات دلا دوں۔

مراق کے اسباب

(۲)

نوعِ انسانی کی مصیبتوں اور بربادیوں کا بنیادی اور تحریکی سبب غالباً آدم و حوا کا گناہِ اولین تھا۔

لیکن آدم و حوا کو گناہ پر کسنے اُکسایا تھا۔ اِس کا جواب کیا ہے؟ شیطان نے؟ تو پھر شیطان کو گناہ پر اُکسانے کی اجازت کس بارگاہ سے ملی تھی!

اس کے علاوہ ہمارے ماں باپ یعنی آدم حوا میں گناہ پر اُکسانے والے کی بات مان لینے کا میلان کس قوت کا بخشا ہوا تھا؟

بہرحال ہماری بربادیوں اور مصیبتوں کا بنیادی سبب جیسا کہ کہا جاتا ہے، آدم و حوا کا اولین گناہ، یا اُن کی پہلی مراق زدہ سرتابی و سرکشی تھی۔

آدم و حوا کی اِس مراق زدہ سرتابی و سرکشی کو شیطان کے اندر نہیں بلکہ خود آدم و حوا کی فطرت کے اندر تسلیم کرنا چاہئے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ آدم و حوا نے یہ مراق اور یہ مالیخولیا اپنے بچوں کو وراثت میں دیا ہے، اور اِن بچوں نے، دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح اُسے نشو و نما دے کر کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم میں ایک فرد بھی ایسا نہیں جو کسی جسمانی یا نفسی نقص میں مبتلا نہ ہو۔

اس دنیا میں بے شمار بیماریاں ہیں، حادہ و مزمن، خفیف و تند، صحت پذیر و مہلک، غلط کار و آوارہ، پیچیدہ و سادہ، محدود اور مطلق۔ اور ان تمام بیماریوں میں مالیخولیا سب سے زیادہ شدید مرض مانا گیا ہے،

کیونکہ یہ دیوانگی اور سگ گزیدگی وغیرہ سے بھی زیادہ قوی مرض ہے۔

مالیخولیا کا مریض اکثر و بیشتر افسردہ منفعل، اور اُداس ہی رہا کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے رقص و غنا میں بھی ایک پنہاں افسردگی کام کرتی رہتی ہے،

مالیخولیا یا تو مزاجی میں ہوتا ہے یا عادات میں۔

مزاجی مالیخولیا وہ وقتی و آنی مالیخولیا ہوتا ہے جو کرب و غم کے ہر مختصر سے لمحے میں آتا جاتا رہتا ہے۔

ہم اُس شخص کو صید مالیخولیا کہتے ہیں جو سُست، غمگین، خلوت پسند، بوجھل اور بدمزا ہوتا ہے، اور یہ وہ طبیعت انسانی کی اُفتاد ہے جس سے کوئی آدمی مستثنیٰ نہیں۔ کوئی خواہ کتنا ہی عقلمند، صابر، خوش مزاج، وسیع القلب، یا دیوتا نما ہو، اس نوع کے مالیخولیا کے آنی حملوں سے اپنے کو کبھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

مالیخولیا، یا مراق آمیز افسردگی، ایک سرد و خشک اور غلیظ و سیاہ قسم کی ترشی رطوبت ہے، جو طحال سے خارج ہوتی ہے، اور دو گرم رطوبتوں، یعنی خون اور صفرے کو روک کر اُنھیں ہڈیوں کی خوراک پر لگا دیتی ہے،

وہ افراد جو ضرورت سے زیادہ گرم یا سرد آب و ہوا میں رہتے ہیں یا وہ جو طبعاً خلوت گزیں ہوتے ہیں یا وہ زبردست طالب علم جو ہمیشہ مطالعہ و تفکر میں مصروف رہتے ہیں، یا وہ جو بے عمل زندگی بسر کرتے ہیں سب کے سب مالیخولیا سے وابستہ رہتے ہیں۔

اطبا کے حلقے میں مالیخولیا کے اسباب خصوصی کے متعلق چھ چیزوں کا بہت چرچا رہتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر کوئی مالیخولیا یا مراق، یا بالفاظ دیگر افسردگی وغیرہ میں گرفتار ہے، تو اُس نے مندرجۂ ذیل چھ چیزوں میں سے کسی ایک کو ضرور مجروح کیا ہوگا۔

(۱) خوراک (۲) ہوا (۳) ورزش (۴) خواب (۵) بیداری (۶) دماغ۔

کاہلی جو شرفا کا طرۂ امتیاز ہے، اور عدم ورزش جو جسم و دماغ کی نحوست، روگ کی دایا، شرارتوں کی موجد، تمام شرعی عیوب کی ماں، بیماریوں اور روگوں کا گھر، اور شیطان کا بالش و بستر ہے، یہ دونوں چیزیں مالیخولیا کو سب سے پہلے دعوت دینے والی ہوتی ہیں۔

اور وہ تمام افراد بھی کوئی کام نہیں کرتے، ضرورت کے وقت بھی محنت سے جی چراتے ہیں۔ ایک آدھ خط لکھنے کے علاوہ ہر کام سے بھاگتے اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں، کسی حالت میں بھی مراق و مالیخولیا کے حملے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس مرض کی زد پر سب سے زیادہ وہ امرا رہتے ہیں جن کی پوشاکیں نرم اور ڈھیلی ہوتی ہیں۔ جو سہریوں پر سوتے اور تیز سواریوں پر سوار ہوتے ہیں۔ جن کے سامنے سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کا کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ جن کے لیے کاہلی میں بسر ہوتے ہیں۔ ہر اس نعمت کو پا لیتے ہیں جو اُنھیں مرغوب ہوتی ہے، اُن کی قسمت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی خوش نہیں رہتے، نہ اُن کا جسم ہی درست ہوتا ہے، نہ دماغ۔ وہ جماہیاں لیتے، کراہتے، آہیں بھرتے، بدگمانیوں میں گرفتار رہتے، بسُورتے، اور اُونگھتے رہتے ہیں، اُن کی طبیعت ہر وقت بدمزا رہتی ہے اور اپنی جان کے خوف میں گھلا کرتے ہیں۔ اور آخرکار مراق میں مبتلا ہو کر دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں۔

نیز وہ افراد جو حسد، بغض، نفرت، انتقام، خوف، آزردگی اور شرم میں مبتلا رہتے ہیں۔ آخرکار مراق کی بدولت اپنے جسم اور دماغ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں، اپنے کو پاش پاش کر دیتے ہیں، اور خود اپنی روحوں کا خون بہا دیتے ہیں۔

یہ مراق، جرگوں، گروہوں، اور خاندانوں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ فیل نشینوں سے لے کر گاڑی بانوں تک میں حسد و بغض کے جراثیم پرورش پاتے رہتے ہیں۔ جہاں تین آدمی موجود ہوتے ہیں۔ وہاں کی چوتھی چیز بھی معاندانہ جذبات ہوا کرتے ہیں۔ اور دلوں میں آگ لگی رہتی ہے۔

یہی نہیں، ہر زمانے کے بڑے بڑے وہ زبردست اہل قلم بھی اگر یکجا ہو جاتے ہیں تو اُن کے دلوں کو رشک و حسد کی آگ جلانے لگتی ہے۔

اور جب ہمارا یہ عالم ہے کہ غربا سے لے کر اُمرا تک، اور جاہلوں سے لے کر علما تک سب کے سب بد مزاج، چڑچڑے، گمراہ، گستاخ، بد زبان، شریر، مغرور، وہم پرست، سازشی، حاسد اور خونی ہیں۔ اور ہم ایک دوسرے کو چیرتے، پھاڑتے، اور جھنجوڑتے رہتے ہیں۔ اور اپنے کو غیظ و غضب، کرب و الم، پریشانی و درماندگی کے ابدی جہنم میں جلاتے رہتے ہیں——

تو ان مراقی حالات میں ہم تہذیب و تمدن اور شائستگی و ثقافت کا کس منہ سے نام لے سکتے ہیں؟

(۳)
مراق و مالیخولیا کا علاج

معلوم نہیں کہ اس مرضِ موذی سے نجات حاصل کرنے کے لئے شیطان سے مدد طلب کی جائے یا خدا سے، بھُوتوں سے رحم کی درخواست کی جائے کہ روحِ پاک سے۔

صحیح علاج کی طرف رہنمائی کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے، تاہم اگر بہتر غذا، صاف پانی، پاکیزہ ہوا، اُجلے کپڑے، ہوادار مکان اور باقاعدہ ورزش کے ساتھ ساتھ کسی طبیبِ حاذق سے، جو طب کے ساتھ ساتھ نفسیات کا بھی عالم ہو، رجوع کیا جائے ——— اور مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہونے، اور گاہ گاہ کسی اچھے رفیق کی معیت میں دلچسپ سفر کرنے کا بھی اہتمام کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ایک طرف تو دوا اور غذا اور ورزش وغیرہ کے اثر سے، اور دوسری جانب تفریحی مشاغل، اور کثرتِ مطالعہ کے باعث آہستہ آہستہ اس مرض سے نجات حاصل ہو جائے۔

کیا کسی کو اس حقیقت سے انکار ہے کہ خوش جمالوں کے چہروں کا آب و رنگ بہتے ہوئے دریا کا خرام، لچکتے ہوئے پودوں کا رقص، اُبھرتے ہوئے سورج کی زرافشانی اور چمکتے ہوئے چاند کی سیم باری مراق کو بہ آسانی دُور کر سکتی ہے؟

اِسی طرح اعلیٰ درجے کی کتابیں، نفیس بُت سازوں کے مجسّمے، رنگین نقاشوں کے نظر فریب نقوش، جوان مطرباؤں کے نغمے، اور بلند خیال شعراء کے شاہکار بھی ایسے تیر بہدف معالج ہیں جن کے سامنے مراق کا رنگ اُڑ کر رہ جاتا ہے۔

اگر تم سے بُرا سلوک کیا جا رہا ہے تو تم اُس بُرے سُلوک کو خاموشی سے برداشت کر لینے کی عادت ڈالو، اور بُرا سلوک کرنے والے کے نفسیات پر غور کرنا شروع کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم بہت جلد اِس نتیجے پر پہونچ جاؤگے، کہ بُرا سلوک کرنے والا دماغی مریض ہے، اور اس دماغی مرض سے مجبور ہو کر وہ تم سے بُرا سلوک کر رہا ہے، اور جب یہ بات سمجھ میں آ جائیگی تو تم پر اس کے بُرے سلوک کا کوئی بُرا اثر نہ پڑ سکے گا، اور تم اس شخص سے نفرت کرنے کے عوض اس پر ترس کھانے لگوگے۔

اگر کوئی تم پر مستقل اعتراضات کر کے تمہیں تکلیف پہونچانا چاہتا ہے، اُس کے باب میں وہی نفسیات پر غور کرنے والا عمل کرو، اگر تم ایسا کروگے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کم سے کم اُس کا مذاق یا اُس کی افتادِ مزاج تم سے مختلف واقع ہوئی ہے، اور جب یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی تو اِس خیال سے کہ ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے، تمہیں اُس کے اعتراضات سے ذرّہ برابر بھی صدمہ نہ پہونچ سکیگا۔

لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں مجرم، بدنام، رُسوا، بے عزت، شکستہ دل، بدقسمت، محروم اور مبغوض و مغضوب ہوں ——— یہ صرف مجنونانہ وسوسے، احمقانہ خطرے، اور مراقیانہ اوہام ہیں، اور کچھ نہیں ———

اگر تم مجرم و روسیاہ ہو، تو تمام دنیا مجرم و رُوسیاہ ہے، اور اگر تم بدقسمت و محروم ہو تو تمام عالم بدقسمت و محروم ہے۔

جب حمّام میں سب ننگے ہیں تو پھر شرمانے اور آنسو بہانے سے فائدہ کیا؟

لیکن تم روسیاہ یا بدقسمت کیونکر ہو سکتے ہو؟ روسیاہ اور بدقسمت تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں صرف وہ روسیاہ اور بدقسمت ہے جسے یہ وہم ہو گیا ہے، کہ میں روسیاہ و بدقسمت ہوں۔

میں پُوچھتا ہوں یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس وہم میں مبتلا ہو؟ کیا تمہارا معدہ خراب ہے، تم کاہل و بیکار آدمی ہو؟ تو پھر حساب یہ ہے کہ اپنا معدہ درست کر لو۔ کاہلی چھوڑ دو، اور کتاب و حیات کے ذریعے سے اپنی چشمِ تنگ کو فراوانی مطالعہ و کثرتِ نظارہ سے وا کر کے دیکھو، اُس وقت تمہیں پتا چلے گا کہ تم کس قدر خوش نصیب ہو، اور قدرت نے تمہیں کیا کیا خوبیاں عطا فرمائی ہیں۔

حسدے دل، اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مراقِ محبت

میں جانتا ہوں محبت کو میں نے "مراق" کہا ہے، اور اس سے اکثر حضرات کے ماتھوں پر شکنیں پڑ جائیں گی، اور وہ کہیں گے کہ میں نے ایک اُرفع شئے کو اس کے مرتبے سے گرا دیا، اور ایک آسمانی چیز کو زمین پر پٹک دیا ہے،

محبت کے کھلونوں سے بہارے بڑے بڑے آدمی کھیلا کرتے ہیں ـــــ بڑے بڑے بڑے فلسفی اس کے ساحل پر سیپیاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہرچند جلوت میں وہ اس کے مخالف کی صورت سے سامنے آتے ہیں۔ لیکن خلوت میں اس کے زانو پر سر رکھ کر سوتے ہیں۔

اس ظالم مراقِ محبت، اور اس کے ظلم و جور پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے میں خوف سے کانپنے لگتا ہوں۔ یہ خطرناک اور مہیب مراق کتنے نظر فریب چہروں کو مکروہ، کتنے بھرے گھروں کو ویران، اور کتنے سلجھے ہوئے دماغوں کو ماؤف کر چکا ہے۔ اس کے مظالم کی انتہا نہیں۔ اگر تم اس مراقِ محبت کے کوچے میں قدم رکھو گے تو تمہارے قدم کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی خدا کی بنائی ہوئی زمین پر نہیں پڑے گا، کیونکہ اسی راہ میں شہیدانِ محبت کی لاشوں کے مختلف اجزا اس کثرت سے ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوئے ہیں کہ زمین کا ایک ذرہ بھی نظر نہیں آتا۔

اس دائرۂ مراق میں ایک بات ایسی عجیب نظر آتی ہے جو اور کہیں مل ہی نہیں سکتی، اور اس کے عجیب ہونے میں اس بات سے اور بھی حیرتناک اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس کی علت بہ آسانی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

وہ عجیب اور نادر بات یہ ہے کہ شہزادے محبت میں پچاسی فیصدی سے زیادہ آپ کو وہ لوگ ملیں گے جن کا ذہن ہزاروں سے بہتر، اور جن کا دل لاکھوں سے وسیع تر ہوتا ہے۔

آخر یہ مراق اس قدر نفاست پسند اور عالی خیال کیوں واقع ہوا ہے کہ ہمیشہ بلند و برتر ہی قسم کے آدمیوں کا شکار کرتا رہتا ہے، چونکہ اس مرض کے بیشمار اسباب ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا علاج بھی بے شمار طریقوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاج کے مختلف طریقوں میں سے ایک علاج یہ بھی ہے کہ مریضِ محبت کو کسی ایسے حکیمانہ مزاج رکھنے والے کی مستقل نگرانی میں دے دیا جائے جو خالص حکمت کی رو سے اسے ہمیشہ سمجھاتا بجھاتا رہے، اور اس پدرانہ شفقت اور پیرانہ بصیرت کے ساتھ سمجھائے کہ مریض کو وحشت و ضد نہ پیدا ہونے پائے۔

یہ خیال رہے کہ مریضِ محبت اول اول نصیحت سنکر بڑی شدت کے ساتھ چیخیں مارے گا۔ اور ناصحِ مشفق کی صورت سے بیزار ہو کر کسی قریب کے جنگل کی طرف بھاگ جانے پر تُل جائے گا۔ لیکن اگر انتہائی ضد سے نصیحت کا عمل جاری رہے، اور اس طرح کے مریض کو نصیحت کا احساس بھی نہ ہو سکے۔ کبھی کبھی اس کے جذبات سے ہم آہنگی بھی کی جائے۔ گاہ گاہ اس کے ولولوں کا ساتھ بھی دیا جائے۔ اور اسی اثنا میں ایک آدھ کلمہ ایسا بھی کہہ دیا جائے جو مریض کو اس مراق کے خلاف تھوڑا بہت سوچنے پر بھی مجبور کر سکے تو ممکن ہے کہ مریض کے اندر آثارِ صحت پیدا ہونے لگیں۔

اگر اس سے کام نہ چل سکے تو پھر ایسی مدبرانہ چالیں چلی جائیں کہ مریض کو اپنے معشوق کی سیرت پر اعتماد باقی نہ رہے ـــــ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مریض کو اپنے معشوق کی سیرت سے اگر نفرت نہیں تو خوف تو ضرور ہی پیدا ہو جائے۔

اگر اس سے بھی کام چلتا نظر نہ آئے تو پھر یہ چاہیئے کہ قربِ محبوب اور ازدواج کے تمام عیوب کھول کھول کر بیان کئے جائیں ـــــ یہ حقیقتِ کبریٰ مریض کے ذہن نشین کی جائے کہ محبوب کا قرب، محبت کو ذبح کر ڈالتا ہے، اور صرف محبت ہی کو ذبح نہیں کر ڈالتا، خود محبوب کو بھی قتل کر دیتا ہے۔

مریض سے کسی ایسے اچھے موقع پر جس وقت کہ اس پر دورے کی شدت نہ ہو نرمی کے ساتھ یہ سوال کیا جائے کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ دولتِ عشق، جو مہربان قدرت نے تمہیں ودیعت فرمائی ہے، یکسر تم سے چھین لی جائے اور تم صرف ایک معمولی انسان بن کر رہ جاؤ ـــ اور کیا تمہاری یہ خواہش ہے کہ یہ قلبِ رقیق، اور یہ چشمِ گریاں جس کی شیریں تلخیاں تمہیں اس دنیا کے جہنم میں جنت کے باغ عطا کئے ہوئے ہیں۔ تم سے واپس لے لی جائے! اور کیا تم اس بے پایاں شقاوت، اور ایسی نامحدود خود کامی کو پسند کرو گے کہ محبوب کی قربت حاصل کر کے صرف تم ہی نہیں، بلکہ اپنے محبوب کو بھی ہر حیثیت سے ہلاک کر دو ـــــ اگر یہ باتیں، جن کی طرف میں نے ہلکا سا اشارہ کیا ہے، پوری منطقیانہ اور فلسفیانہ تشریح و توضیح سے بیان کر دی جائیں تو بہت ممکن ہے کہ مریض شفایاب ہو جائے۔

اس سلسلے میں معالج کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ازدواج کی تمام برائیاں بھی مریض سے بیان کر دے ـــــ اور اس پر ثابت کر دے کہ ازدواج نام ہے ایک دائمی غلامی، اور ایک ابدی لعنت کا ـــــ جو انسانی ولولوں اور امنگوں کے حق میں زہر کا حکم رکھتی ہے۔

وہ جو گھر کے اندر ایک عدد بیوی رکھتا ہے، گھر کے باہر نکل نہیں سکتا۔ یہ وہ چٹان ہے جس پر چڑھ کر لاکھوں آدمی ہمیشہ کے لئے گم ہو چکے ہیں، اِس طرح کہ آج تک اُن کا کوئی سُراغ نہیں مل سکا۔

ایک ذہین، طبّاع، اور آزادہ منش انسان کے واسطے یہ زیبا نہیں کہ وہ اِس زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈال لے، کیونکہ یہ زنجیر صرف اُس وقت کٹ سکتی ہے، جب سانس کا ڈورا منقطع ہوتا ہے۔

اُسے یہ بات بھی سمجھائی جائے کہ اگر بیوی تُند خُو ہے تو گھر کی چار دیواری کے اندر ہمیشہ چلّانے اور غُرّانے کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ اگر پڑھی لکھی اور سند یافتہ ہے تو اُس کا غُرور اور فیشن گھر کو تباہ کر ڈالتا ہے، اگر جاہل ہے تو اُس کی گندگیاں اور بدسلیقگیاں گھر کو ناقابلِ سکونت بنا دیتی ہیں۔ اگر غریب گھرانے کی ہے تو بچوں کی ذہنیت اور گھر کے در و دیوار کو پست و زُبوں حالت میں لے آتی ہے۔

اگر امیر گھرانے کی ہے تو دوستوں اور عزیزوں کی مہمانداریوں اور دیگر فضول خرچیوں کے باعث شوہر کا دیوالہ نکال دیتی ہے۔ اگر عمر میں بڑی ہے تو چند ہی مہینوں میں ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے، اور اگر شوہر سے عمر میں بہت کم ہے تو پدرانہ فرائض ادا کرنا پڑتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ رقیبوں کا ڈر بھی لگا رہتا ہے، اور ننانوے فیصدی رقیب ہی غالب آکر رہتے ہیں۔

اِس کے علاوہ اُسے یہ بھی سمجھا دینا چاہیئے کہ جس طرح اُس کُرۂ ارض پر انسانوں کی صورت، چال ڈھال، وضع قطع، اور لب و لہجہ ایک دوسرے سے قطعیٔ مختلف ہوا کرتا ہے، اُسی طرح اُن کے مزاج، سیرت، اور سرشت میں بھی شدید اختلافات ہوتے ہیں۔ جب یہ حالت ہے تو ہم اپنی زوجہ سے یہ توقع کیونکر کرسکتے ہیں کہ زندگی کی ہر راہ، اور تدبیرِ منزل کے ہر دائرے میں وہ ہمارا ساتھ دے سکے گی؟ اختلافات رُونما ہوں گے، اور یقینی رُونما ہوں گے، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آگے چل کر ہماری زندگی برباد اور ہماری عافیت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔

اِسی کے ساتھ ساتھ مریض کو یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ محبت کا ازدواج ہمیشہ ناکام ہوا ہے، اور اس کی تاریخی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ شوہر کے عشق کی گرمی، اور زوجہ کے حُسن کی لطافت، کثرتِ قُرب اور ہجومِ مشاغل و تدبیرِ منزل کے باعث زیادہ مُدّت تک قائم نہیں رہا کرتی ـــــ اور جب حُسن و عشق کے جذبات فنا ہو جاتے ہیں، اُس وقت شوہر یہ دیکھکر دنگ رہ جاتا ہے کہ پھول تو کُملا چکا ہے، لیکن اُس کے کانٹے کی خلش تا دمِ مرگ محسوس ہونے کے لئے باقی رہ گئی ہے۔

اگر یہ تدبیر بھی کام نہ دے تو چاہیئے کہ مریض کے واسطے کسی وقتی حسینہ کا بندوبست کر دیا جائے، جو اُس کے جذبات و جسم کو کمزور بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دے۔

اگر یہ تیر بھی خطا کر جائے تو پھر سب سے زیادہ مناسب صورت یہ ہے کہ اُسے کسی بہانے سے طویل سیاحت میں مبتلا کر دیا جائے اور اِس قدر پے بہ پے سفر کئے جائیں، اور اِس بے دردی سے وقت ضائع کیا جائے کہ سیر و سیاحت میں کم سے کم دو ایک برس تو ضرور ہی گزر جائیں۔

چونکہ وقت ہر زخم کا مرہم، اور ہر چاک کا رفوگر ہے۔ اس لئے اس تدبیر سے بہت قوی اُمید ہے کہ مریض کو کامل شفا ہو جائے گی۔

تجھے جراحتِ دل کی ہے فکر کیوں اتنی
کہ خود ہے وقت کی فطرت میں ذوقِ بخیہ گری

اور اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سُن لیجئے۔ ؎

طولِ فرقت سے بہت بیتابیاں کم ہو گئیں

اور اگر مریض اِن تمام تدابیر کے بعد بھی لا علاج ثابت ہو، کسی طرح معشوقہ کو فراموش نہ کرے، اور آزادی کی فردوس سے نکلکر پابندی و غلامی کی دوزخ ہی میں جانے پر مصر ہو تو اللہ کا نام لے کر معشوقہ سے اُس کی شادی کر دو۔ اور نتیجے کو بھی اللہ ہی کے سپرد کر دو۔ ؎

کشتی خدا پر چھوڑ دو، لنگر کو توڑ دو

〰〰〰〰〰〰〰〰〰〰

جراحتِ سینۂ تیر آزما تسکیں ہے؟
[illegible] بنا ہے [illegible] تسکیں ہے؟
سرزمیں سے [illegible] تسکیں ہے محفلِ حیات
سرزمینِ خود [illegible] تسکیں ہے [illegible] تسکیں ہے؟
([illegible])

برہمن سے خطاب

اے برہمن! یاد ہوگا وہ تجھے ماضی کا حال — اپنے بھارت کے لئے تھا تو کبھی وجہ جمال

قوم نے سمجھا تھا تو اس دیس کا اوتار ہے — جو تری سیوا کرے بس اس کا بیڑا پار ہے

گرم ہو جاتا تھا خوں رگ رگ میں تیری دید سے — شانتی ہوتی تھی ہر دل کو تری تقلید سے

تیری کٹیا ایک عالم کے لئے تھی درس گاہ — وید بوسی سے تجھے فرصت نہ تھی شام وپگاہ

فی الحقیقت ہند میں تھی معتبر ہستی تری — کیا ہوا اب کونسی اُفتاد تجھ پر آ پڑی

دیکھتے ہیں جہل کی جانب ہی مائل تر تجھے — جب پرکھتے ہیں صداقت کی کسوٹی پر تجھے

عربدہ سازی کا تیری علم سب کو ہوگیا — قدر تیری کم ہوئی تو، قوم کا دشمن بنا

چھوڑ کر مذہب کو تو نے جب سیاست کو لیا — قوم کو رُسوا کیا اور دیس کا اننیا کیا

اے برہمن! کوچ کر اب وقت تیرا ہو چکا — رازِ مکاری کا تیری آشکارا ہو چکا

راجپوتوں کو ترے ہی مکر نے رُسوا کیا — پرتھوی کا راج تو نے ہی تہ و بالا کیا

تیری غداری ہی سے جے چند نے کھائی دغا — ورنہ مٹنا اس کا اور اس طرح، ناممکن سا تھا

عہدِ عالمگیر میں تو حاملِ اعزاز تھا — برہمیٔ سلطنت کا بس یہی اک راز تھا

رام راجا کو اُبھارا قوم مسلم کے خلاف — خوب مذہب کا چڑھایا اُس کی طینت پر غلاف

آہ سلطان کی ہوئی کیا مرمت میسور میں — سازشوں سے کس کی کھوئی سلطنت میسور میں

جعلسازی کا نہیں یہ وقت ہے ایثار کا — امن کا دے کر سبق ان سارے جھگڑوں کو مٹا

ہوش میں آ، پیکرِ ہندوستاں کی جان بن

اے برہمن دیوتا! انسان بن، انسان بن

عبدالواسع عسکری، چکمگلور

نظیر اکبر آبادی پر ایک سرسری نظر

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

جس طرح اُردو غزل کا باوا آدم ولی دکنی ہے، اُردو نظم کی اولیت کا سہرا نظیر کے سر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ولی سے پہلے اردو میں غزل اور نظیر سے پیشتر نظم کا وجود نہ تھا۔ صرف یہ مقصود ہے کہ یہ چیزیں تکمیل کے اس درجے تک نہیں پہونچی تھیں، جہاں سے ایک مستقل شاہراہ نکلتی ہے۔ نظیر سے قبل بھی اُردو میں بیانیہ شاعری کے نمونے ملتے ہیں، مگر ان کی حیثیت منتشر یا ضمنی تھی۔ نظیر نے اس قسم کی شاعری کو خاص موضوع بنا کر دادِ سخن دی۔ سودا کی طرح نظیر نے بھی جب قلم اُٹھایا ہے تو متانت اور تہذیب کو بالائے طاق رکھدیا ہے، مگر سودا کا مقصود ہجا تھا اور نظیر نے محض واقع نگاری کی ہے، اور اس طرح نہ صرف اخلاقی محاسبے سے بری الذمہ ہوگیا ہے، بلکہ ہم حق بجانب ہوں گے، اگر یہ دعویٰ کریں کہ وہ ایمیل زولا، موپاساں اور دیگر یورپین حقیقت نگار اسکول کے علمبرداروں کا سرخیل ہے، جن کا نقطۂ نظر ہے کہ قبیح اور شرمناک اخلاقی کمزوریوں اور خامیوں کو اس قدر واضح کرو کہ اُن کی عُریانی دیکھکر طبیعت خود بخود متنفر ہو جائے۔ آرٹ سے نکل کر آجکل معاشرت میں بھی یہی آزادانہ اصول کارفرما ہے۔ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ نظیر پہلا شخص ہے جس نے اِن تحریکات کا بیج بویا۔ اس امر کی چھان بین دلچسپ ہوگی کہ آیا یورپین مفکرین کے دماغ میں یہ خیال نظیر سے علیحدہ پیدا ہوا یا اُسی کی صدائے بازگشت ہے، حقیقت جو کچھ ہو افضلیت کا سرتاج نظیر ہی کے سر پر رکھا جائے گا، کیونکہ یورپ نے دوبارہ وہی دریافت کیا جو نظیر پیشتر پا چکا تھا۔

سودا کے علاوہ اُردو کا دوسرا شاعر انشا ہے، جس میں اور نظیر میں مماثلت ہے، یہاں ہم یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتے کہ دونوں میں کس کو تقدم حاصل ہے، مگر سوسائٹی کا فرق مراتب یہاں بھی نمایاں ہے، گو آرٹ کے نقطۂ نظر سے نظیر منفرد ہے، کیونکہ سودا یا انشا نے جو کچھ لکھا تفنن طبع، تضحیک یا محض مسخرے پن کی بنا پر لکھا، لہٰذا مبالغے سے کام لیا۔ ان کے علی الرغم نظیر کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں معمولی اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو شاعر کی فن کاری نے صنعت کا بہترین مرقع بنا دیا ہے۔ جس عنوان پر قلم اُٹھایا ہے، اس خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہے کہ تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے، اور جس طرح عمدہ شاہکارِ مصوری یا بُت تراشی دیکھکر خواہ وہ عریاں ہی کیوں نہ ہو۔ نفسانی خواہشات میں ہیجان اور ردِّ عمل کے طور پر نفرت نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ نقوش کی رعنائی، خطوں کا تناسب، رنگوں کی متنوع ہم آہنگی اور دوسری خوبیاں جاذب توجہ ہوکر دیکھنے والے کو ایسا مسحور کردیتی ہیں کہ وہ خود پیکر حیرت و انبساط بن کر رہ جاتا ہے اسی طرح نظیر کی عریاں نظموں میں بھی کشش ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ تصویر یا مورت میں اعضا کے صرف نقش ہوتے ہیں نام نہیں آتے، مگر شاعری میں نطق ناگزیر ہے اور تہذیب اُن الفاظ کو زبان پر جاری کرتے ہوئے ابا کرتی ہے، یہ شاعری کا عیب نہ ہوا کیونکہ اگر آپ کسی برہنہ تصویر یا مجسمے کے اعضا کی تشریح کرنا چاہیں تو یہی صورتِ حال رونما ہوگی اور یہی مشکل پیش آئے گی۔ اس صورتِ حال سے قطع نظر ایسی نظموں میں جہاں تک آرٹ اور حقیقت نگاری

کا تعلق ہے اپنی آپ مثال ہیں۔ علاوہ بریں یہ مسئلہ ہمیشہ مابہ النزاع رہا ہے اور شاید رہے گا کہ آرٹ کو اخلاق کا پابند یا اس کے مطالبات سے بالکل آزاد و بے نیاز ہونا چاہیئے۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ حقیقی آرٹ کتنا ہی عریاں کیوں نہ ہو مخرب اخلاق نہیں ہو سکتا، یہ بات اور ہے کہ کوئی پہلے ہی سے بدکار و بداطوار ہے یا بدکاری کی طرف مائل ہے، اور آرٹ کی اشاراتی ادا کاریاں اُسے جامے سے باہر کر دیتی ہیں۔ اس کی ذمہ داری خود اُس کی طبیعت پر ہے، آرٹ کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ آرٹ کی شوخ نگاریوں کے بغیر بھی گمراہ تھا یا گمراہ ہوتا۔ ؎ اور نگتے کو ٹھیلتے کا بہانہ! میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ جو نام نہاد آرٹ دراصل اخلاق پر بُرا اثر ڈالے وہ آرٹ ہی نہیں، اُس میں کہیں نقص یا خامی ہے۔ ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے، آرٹ سے بُرا اثر وہی لے گا جو آرٹ کا اداشناس نہیں ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو آرٹ سے درستیٔ اخلاق کی توقع رکھتے اور آرٹ کی شوخیوں پر چشم نمائی کرتے ہیں۔ اُن کو چاہیئے کہ آرٹ کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور دخل در معقولات نہ دیں۔ آخر ملّا، خطیب، واعظ کس لئے ہیں، اُن سے کسبِ فیض کریں اور آرٹ کو بخشیں۔

ہاں! تو فحشیات کو نظرانداز کر دینے کے بعد نظیر کا باقی کلام من حیث المجموع رنگین اور پاکیزہ خیالوں کا لہلہاتا ہوا باغ ہے، جہاں ایک سچے اور حقیقت آشنا شاعر کے جذبات و محسوسات خود بخود، بلاتکلف و تصنع منظوم نغموں میں ڈھلتے نکلتے اور فضائے رنگ و بُو پر چھا جاتے ہیں۔ اور سننے والے کو بھی اپنی نشاط میں غرق کر دیتے ہیں۔

نظیر نے غزلیں بھی کہی ہیں، مگر ان میں کوئی امتیازی شان پیدا نہیں کر سکا۔ البتہ سادگی اور صفائی نے کہیں کہیں جاذبیت، اور طبیعت کی شوخی نے تازگی و شگفتگی بہم پہونچا دی ہے۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ نظیر پر کوئی سیر حاصل مقالہ سپردِ قلم کروں، اُس کے کمالِ فن کے صرف دو نمونے پیش کرکے اس مضمون کو جس کی تشنگی و بے مائگی کا اعتراف ہے ختم کر دوں گا۔

ایک شاعر کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اُس کی تخلیقی قوت مافوق الفطرت واقعات وضع کرنے کے بعد اُس کے مناسب ماحول قائم کرے اور پھر اُن واقعات کو اس خوش اسلوبی سے ضبطِ تحریر میں لائے کہ اُن قائم کردہ اصول کے تابع ترین

قیاس اور حقیقت سے مطابق ہو جائیں۔ فردوسی، انیس، ہومر، ڈانٹے، شیکسپئر، ملٹن وغیرہ کی افضلیت کا راز اسی اختراعی قدرت کے کمال میں مضمر ہے، مثال کے طور پر ڈانٹے کو لیجئے، سیر دوزخ میں دور سے کچھ عالی شان گنبد نظر آتے ہیں۔ ورجل سے پوچھتا ہے کہ یہ کون خطّہ ہے۔ ورجل جواب دیتا ہے کہ فاصلے نے تجھے دھوکا دیا۔ یہ گنبد نہیں بلکہ دیو پیکر انسان ہیں۔ جن کا صرف کمر سے اوپر کا حصۂ جسم نمودار ہے، باقی زمین میں دفن ہے۔ تاہم اتنی دور سے بھی اونچے گنبد معلوم ہوتے ہیں۔

غور فرمائیے کہ اس اسلوبِ ادا نے ان لوگوں کی جسامت کس قدر بڑھا دی خصوصاً نصف جسم کو ڈھکنے کی ترکیب سے۔

ان میں سے ڈانٹے نمرود کا حلیہ بیان کرتا ہے، قد و قامت اور گھیر میں اُس صنوبر کے درخت سے مشابہ جو روما تہ الکبریٰ میں سینٹ پیٹر کے گرجے پر چھایا ہوا ہے!

اسی قبیل کی مثالیں ہومر وغیرہ میں بھی ملتی ہیں۔

ڈانٹے کی ٹکر کا بلکہ اُس سے بدرجہا بہتر نظیر کا مندرجۂ ذیل بند ہے، اس تقابل سے امید ہے کہ ناظرین کو نظیر کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ ہو، مہادیوجی پاربتی کو بیاہنے چلے ہیں۔ دیوتا کے ساتھ براتی بھی بلوان چاہیئے، ذرا اُن کی شان ملاحظہ فرمائیے:۔

پھر ساتھ ہزاروں اور چلے جو بھوت، پریت اور راچھس تھے
ڈیل اونچے اُن کے برج تن، اور سیس بھی اُن کے گنبد سے
ہر نکڑا اُن کا سومن کا، اور موٹے رسّوں کے پٹکے
اور نکڑوں پر مُگروں کی طرح تھے، سالکھو ابرکے بر۔ رکھے
کوئی ننگے سر اور بال اُس کے، جوں بانس کھڑے، دس دس گز
کوئی منڈ کوئی رنڈ اور کوئی بن پاؤں ناچے اور کودے
کوئی ہاتھی رکھے کاندھے پر کوئی اونٹ بغل بیچ دبکائے
کوئی ارنا بھینسا گود لئے، کوئی گینڈا سر پر بٹھلائے
کوئی سانپ گلے میں لپٹائے، بچھو اُن کے دم پر دم چڑھے
کچھ لمبے سونٹے لوہے کے، کچھ ہاتھ لئے بھاری لکڑے
کوئی گا دے پہاڑ گلا دبتا، کوئی اُبڑت کرے، چک پھیر چلے
کوئی شور کرے خوشحالی سے، پانی جیسے ہاتھی چنگھاڑے

کوئی ہاتھ ہلا دے رہ رہ کر، کوئی نین خوشی سے مٹکا دے
کوئی لمبے لمبے ڈگ رکھے، کوئی دس دس گز کی جست کرے

~~~~~~~~

کچھ رنگ عجب، کچھ ڈھنگ نئے، سب ہنس ہنس دھج دکھلاتے تھے
وہ دھوم مچاتے رستے میں، ہر آن اُچھلتے جاتے تھے

~~~~~~~~

ایک تو بھوت، پریت اور راچھس یوں ہی ڈراؤنے نام ہیں، پھر ایسے لمبے بے ڈول کہ جسم پر ہشت پہل بُرج کا دھوکا ہو، ہشت پہل کہنے سے جسم کا کاواک، بعد لسیلا اور گومڑے دار ہونا کس خوبی سے واضح ہوا ہے۔ سروں کو گنبد یا اس کی بگڑی ہوئی شکل گمٹ نہیں کہا بلکہ ایک ثقیل مرادف گمٹ لایا، (گمٹی اسی کی تصغیر ہے) جس نے سروں کو بجائے کھوکھلا ہونے کے ٹھوس بنا دیا، کہ اس وزن کے بلا تکلف متحمل ہی نہ ہو سکیں بلکہ پڑ کا دیکھیں جس کا تذکرہ بعد کو ہے۔ ان سروں پر سو سو من کے پگڑ بندھے ہوئے ہیں۔ کہ پٹکے موٹے موٹے رسّوں کے ہیں اور زینت کے لئے پورے پورے ساکھو کے درخت طرۂ دستار ہیں۔

"ساکھو، بڑکے بڑ، رکھے" اس ٹکڑے کی ترکیب اور نشست الفاظ ایسی ہے کہ ہر لفظ پر سامع کی حیرت و استعجاب میں پے در پے اضافہ ہوتا ہے، ساکھو! بڑکے بڑ!!! رکھے!!!

اس کے بعد خیال اُن کی طاقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ جس طرح ہم آپ پھول توڑ توڑ کر پگڑی میں لگا لیتے ہیں یا لگا لیتے تھے یہ لوگ اسی سہولت سے ساکھو کے پیڑ جڑ سے اکھیڑ کر اپنے پگڑوں میں گھڑس، یا نظیر کی زبان میں اڑس لیتے ہیں۔

متخیلہ کو پھر دھچکا لگتا ہے کہ شاعر نے ساکھو نے تناور درختوں کو کس آسانی سے پھولوں کے طرّوں میں منتقل کر دیا۔ خیال جھر جھری لے کے اُن قدوں کی طوالت کا اندازہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے جن کے سروں کے مقابل ساکھو کے لمبے لمبے درخت طرۂ دستار کے برابر ہوں۔ کیا یہ ادعا مبالغہ ہوگا کہ نظیر کی تخئیل سے دانتے کی تخئیل لگا نہیں کھاتی؟

تصویر یوں ہی کیا کم رُعب آفریں تھی مگر نظیر کا آرٹ قناعت نہیں کرتا۔ اور کچھ مسر جھاڑ منھ پہاڑ لوگوں کو شامل کرتا ہے، جن کے بال بانس کی طرح اور وہ بھی دس دس گز کے لمبے بانسوں کی طرح کھڑے اور موٹے اور الجھے ہوئے ہیں۔ جن کے بال اتنے لمبے تھے، اُن کے قد کتنے ہوں گے؟ سامعت کا انحصار آپ کے خیال کی جولانی پر ہے۔ اس پر بھی ترقی کرتا اور ایسے لوگ لاتا ہے جن میں بعض ننگ دھڑنگ تھے اور بعض کے چار ابرو کا صفایا تھا: کوئی بن پاؤں ناچے اور کودے۔ یہ ٹکڑا بداعت اسلوب کا ایسا شاہکار ہے جس کی تعریف ناممکن ہے۔ در اصل یہی وہ مقام ہے جہاں نظیر کی تخئیل دانتے پر سبقت لے گئی ہے کیونکہ اس نے مُردوں سے چلنے پھرنے کی صلاحیت یہ کہہ کر سلب کر لی کہ کمر تک مٹی میں ٹنپا ہوا تھا، نظیر نے اس دشواری پر بھی عبور حاصل کیا اور ایسے مسٹنڈوں کو بھی ناچتا کودتا دکھا دیا، لیکن "بن پاؤں" کہہ کر مافوق الفطرت عنصر کو شاندار اور معرکہ آرا طریقے سے قائم رکھا، گویا اونچے اونچے پہاڑ اُچک رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ منظر کی ہیبت کو اس "بن پاؤں" کے ناچ نے دوبالا کر دیا۔ نظیر کی تخئیل اب بھی نہیں تھکتی، اجزائے تنوع بڑھاتی اور ان لوگوں کی طاقت اور جسامت کو یہ کہہ کر پہلے سے بھی زیادہ نمایاں کرتی ہے، کہ کوئی کاندھے پر ہاتھی بٹھائے تھا، کوئی بغل میں اونٹ دبائے تھا، کوئی ارنا بھینسا گود میں لئے تھا، کوئی گینڈے کو سر پر چڑھائے تھا، کسی کے گلے میں سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ اور مشعل اُن کے پھن پہ جلتا تھا، فن کا کمال دیکھئے کہ جس جانور کو جس حصۂ جسم سے متعلق کر دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے لئے خلق ہوا تھا، بعد ازاں ان لوگوں کی شوقین مزاجی دکھانے کو کسی کے ہاتھ میں لوہے کا لمبا سونٹا اور کسی کے ہاتھ میں بھاری لکڑا دیدیا ہے، براتی ہیں لہٰذا خوشی کا اظہار ضروری ہے۔ اور یہ "زندہ جنگل، گلا پھاڑ پھاڑ کے گاتا، ناچتا اور چکر گھنی کھاتا ہے" یہاں کمال فن نے پھر معجز نمائی کی۔ گلا پھاڑ کے گانے کا اثر نہیں دکھایا، نہ اس کی تشبیہ کسی چیز سے دی، کیونکہ ممکن ہی نہ تھی۔ مگر تخئیل اعتراف عجز کے بجائے اس طرح مظفر و منصور نکلتی ہے کہ چیخ کا ایک نچا درجہ یعنی خوش فعلی کی قلقاری لے لی۔ یہ ایسی تھی جیسے ہاتھی کی چنگھاڑ۔ اسی پر گلا پھاڑ کر گانے کے بھیانک کو قیاس کر لیجے۔ ہاتھوں کی جنبش، آنکھوں کی گردش اور اونچی اونچی پھلانگوں نے اس دل دہلانے والے منظر کی منظم بے ترتیبی اور عفریتیت پر ڈراپ سین کا کام دیا، بلکہ یوں کہئے کہ متحرک فلم کے پردے پر اکیڑ قریب آتے رہے اور بڑے ہوتے ہوتے یکایک غائب ہو گئے!

دیگر نظموں کے علاوہ کوئی تہوار، کوئی میلا، کوئی موسمی کیفیت ایسی نہیں

ہمیں کی نظیر کے نادرہ کار قلم نے مصوری سی کی ہو اور بلا تفریق مذاہب۔

ہولی ملاحظہ ہو:-

جب آئی ہولی رنگ بھری سو ناز و ادا سے مٹک مٹک
اور گھونگھٹ کے پٹ کھول دئے وہ روپ دکھایا چمک چمک
کچھ مکھڑا کرتا دمک دمک، کچھ ابرن کرتا جھلک جھلک
جب پاؤں رکھا خوش وقتی سے تب پائل باجی جھنک جھنک
کچھ اُبھریں سینیں ناز بھری، کچھ کودیں آہیں تھرک تھرک

اس بند بلکہ پوری نظم میں نظیر نے اجتہاد سے کام لیا ہے جتنے الفاظ کاف پر ختم ہوتے ہیں اور مکرر آئے ہیں اُن میں لفظ ما قبل کا کاف ساکن کے بجائے متحرک کر دیا ہے، مثلاً پہلا مٹک بروزن نظر (یا فعل) نہیں بلکہ بروزن کیف (یا فاع) ہے، یوں نہ پڑھئے گا تو مصرعے موزوں نہ ہوں گے۔ اس تصرف نے نہ صرف ہولیاروں کا لہجہ پیدا کر دیا بلکہ منظر میں حرکت کے ساتھ کھلکھلاہٹ، تھاپ اور موسیقی بھر دی۔ نیز یہ ذرا اضافہ کیا کہ الفاظ کی اصوات سے معلوم ہونے لگا، جیسے ہڑک بج رہی ہے، جبڑے برا رہے ہیں، ناچ گانا ہو رہا ہے، گردن کا ڈورا ہل رہا ہے۔ آنکھیں مٹک رہی ہیں، بھویں پھڑک رہی ہیں اور بیچ بیچ میں "ہولی ہے" اور "ارزرا کبیرا" کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ دوسرا شاعرانہ نکتہ یہ ہے کہ ہولی ہی کو ایک شوخ چنچل معشوقہ بنا کے پیش کر دیا ہے۔ اس طرح ایک غلغلہ، ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور یہی ہڑبونگ ہولی کا طرۂ امتیاز ہے۔

بقیہ نظم سنئے مگر پہلے بند اول کو پھر ایک مرتبہ مزے لے لے کے اور پہلی مٹک تھرک وغیرہ کو پنجابی لہجے میں بسکون اوسط ادا کیجئے، ورنہ موزونیت رخصت ہو جائے گی۔

(۳)

یہ روپ دکھا کر ہولی نے جب نین رسیلے ٹک مٹکے
منگوائے تھال گلالوں کے، بھر ڈالے رنگوں سے مٹکے
پھر سانگ بہت تیار ہوئے، اور ٹھاٹھ خوشی کے جھرمٹ کے
غل شور ہوئے خوش حالی کے اور ناچنے گانے کے کھٹکے
مردنگیں باجیں، تال بجے، کچھ کھنک کھنک، کچھ دھنک دھنک

(۴)

پوشاک چھڑکواں سے ہر جا تیاری رنگیں پوشوں کی
اور بھیگی جا گہ رنگوں سے ہر کنج، گلی اور گوشوں کی
ہر جانب زر د لباسوں سے ہوئی زینت سب آغوشوں کی
سو عیش و طرب کی دھومیں ہیں، اور محفل میں مینوشوں کی
مے نکلی جام و گلابی سے، کچھ لہک لہک، کچھ چھلک چھلک

(چونکہ شراب کا ذکر ہے، لہک اور چھلک میں جو نرمی ہے اس کا موازنہ مٹک وغیرہ کی کرختگی سے کیجئے اور نظیر کو موتی الفاظ کے سلیقۂ انتخاب کی داد دیجئے)

(۴)

ہر چار طرف خوش وقتی سے دف باجے راگ اور رنگ ہوئے
کچھ دھومیں فرحت عشرت کی، کچھ عیش خوشی کے رنگ ہوئے
دل شاد ہوئے خوش حالی سے، اور عشرت کے سو ڈھنگ ہوئے
یہ جھمکی رنگت ہولی کی، سب دیکھنے والے دنگ ہوئے
محبوب پری رو بھی نکلے، کچھ جھمک جھمک، کچھ ٹھمک ٹھمک

(۵)

جب خوباں آئے رنگ بھرے، پھر کیا کیا ہولی جھمک اٹھی
کچھ حسن کی جھمکیں ناز بھری، کچھ شوخی ناز و اداؤں کی
سب چاہنے والے گرد کھڑے نظارہ کرتے ہنسی خوشی
محبوب نشے کی خوبی میں، پھر عاشق اُوپر گھڑی گھڑی (اوپر بسکون دوم)
ہیں رنگ چھڑکتے سُرخی کے، کچھ لپک لپک، کچھ جھپک جھپک

(۶)

ہے دھوم خوشی کی ہر جانب اور کثرت ہے خوش وقتی کی
ہیں چرچے ہوتے عشرت کے اور فرحت کی بھی دھوم مچی
خوباں کے رنگیں چہروں پر ہر آن نگاہیں ہیں پڑتی
محبوب بھگوئیں عاشق کو اور عاشق ہنس کر ان کو بھی
خوش ہو کر ان کو بھگو دیں ہیں، کچھ اٹک اٹک، کچھ ہٹک ہٹک

(۷)

وہ شوخ رنگیلا یاں آیا جب ہولی کی کرتیاری
پوشاک سنہری زیب بدن اور ہاتھ پچکی پچکاری

کی رنگ چھڑکنے میں کیا کیا اُس شوخ نے ہر دم عیاری
ہم نے بھی نظیرؔ اُس چنچل کو پھر خوب بھگویا ہر باری
پھر کیا کیا رنگ بہے اُس دم، کچھ ڈھلک ڈھلک، کچھ چھپک چھپک

ہولی پر ایک اور بہت دلکش نظم ہے۔ اس تہوار میں گالیاں بکنا جائز ہے۔ نظیرؔ نے مکمل تصویر کھینچی ہے، مگر اس قدر عریاں کہ بس توبہ ہے۔ فحش بند خارج کر دیے گئے۔ جو صاحب چاہیں اصل کتاب میں پڑھ لیں ؂

(۱)

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم، شیشے، جام جھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۲)

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی، کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے، کچھ عیش کے دم منھ چنگ بھرے
کچھ گھنگھرو، تال چھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۳)

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا
وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا
اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۴)

گلزار کھلے ہوں پریوں کے اور مجلس کی تیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
منھ لال، گلابی آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اور وہ رنگ بھری پچکاری انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۵)

اس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منھ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو، ہر آن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو، بے ہوشی ہو، "بھڑوے" کی منھ میں گالی ہو
بھڑوے بھی "بھڑوا" بکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۶)

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھوّیوں کے لڑکے
ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں، کچھ گھٹ گھٹ کے، کچھ بڑھ بڑھ کے
کچھ ناز جتاویں لڑ لڑ کے، کچھ ہولی گاویں اڑ اڑ کے
کچھ لچکے شوخ کمر پتلی، کچھ ہاتھ چلے، کچھ تن پھڑکے
کچھ کافر نین مٹکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۷)

یہ دھوم مچی ہو ہولی کی اور عیش مزے کا جھکڑ ہو
اس کھینچا کھینچ گھسیٹ اوپر بھڑوے رنڈی کا پھکڑ ہو
معجون، شرابیں، ناچ، مزا، ٹکیا، سلفا، ککڑ ہو
لڑ بھڑ کے نظیرؔ بھی نکلا ہو، کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ ہو
جب ایسے عیش مہکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

قدرت، انساں سے برسرِ جنگ نہیں
میدانِ جہاں وسیع ہے تنگ نہیں
شاید ان سرکشانِ دوراں کا مزاج
قدرت کے مصالح سے ہم آہنگ نہیں

جوشؔ

ازالۂ غلط فہمی

عطاء اللہ۔ پالوی

یہ مضمون جس وقت آیا، اتفاقاً "کشاف" صاحب بھی آگئے، اور انھوں نے اِسے پڑھکر ایک نوٹ لکھدیا جو اس مضمون کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔ فیصلہ قارئین پر چھوڑا جاتا ہے۔ (مُدیر)

گذشتہ ماہ کلیم کے مئی نمبر میں "غزل گوئی" پر ایک انتقامی مضمون شائع ہوا ہے جس میں مضمون نگار نے حضرت آزاد انصاری پر بارش عنایات کی ہے، صاحب مضمون کون ہیں؟ یہ بتانا مشکل ہے، کیونکہ جب خود مضمون نگار کی عصمت مآبی نے اُنھیں اپنا نام ظاہر کرنے کی اجازت نہ دی اور وہ "نقاد" کا نقاب ڈال کر تشریف لائے ہیں تو اب کس کو غرض پڑی ہے جو اس کی تفتیش میں سرگرداں ہو؟ مضمون کیسا ہے اور کس جوش وخروش کے ساتھ لکھا گیا ہے یہ صرف دیکھنے ہی سے تعلق ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اُس کے جواب میں "خاموشی" اختیار کی جاتی، لیکن حضرتِ فراق کی منچلی طبیعت نہ مانی، اور اُنھوں نے "خاموشی" پر "دنداں شکن جواب" کو فوقیت دیا، چنانچہ ان کا یہ مضمون "نگار" جولائی نمبر میں شائع ہوا ہے اور گو یہ مضمون بھی گرمی سے خالی نہیں مگر جو چیز قابلِ التفات ہے وہ فراق کی قوتِ تنقید ہے، رآبرٹس نے "تنقید" کی تعریف یہ کی ہے کہ "تنقید انسانی معلومات کے تمام شعبوں کے متعلق مقابلہ کرنے یا خیالات کے ٹکرانے کے عمل کو کہتے ہیں" بلاشبہ یہ تعریف فراق کے تنقیدی مضمون پر صادق آتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

حضرتِ فراق کا (اُن کے مضمون میں) خیال یہ ہے کہ "نقاد" اور جوش کے مضمون (سلسلۂ غزل گوئی) میں غیر معمولی شباہت ہے، نیز اُن کے الفاظ "حضرتِ جوش نے اپنے نام سے غزل گوئی کے خلاف ایک مضمون سپردِ قلم کیا تھا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں "نقاد" کے پردہ میں خود جوش کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُن ہی کا خیال صحیح ہو، اس لئے جب تک ہمیں اصل حقیقت کی خبر نہ ہو حضرتِ فراق کے اس قول کی تکذیب کرنی حماقت ہے۔ لیکن جہاں تک ہم نے دونوں کا موازنہ کیا ہمیں کوئی قوی دلیل نہ مل سکی۔ نیز جہاں تک جوش کی طبیعت کا اندازہ مجھے ملا ہے، یا یہ کہ جوش جس قدر بیباک اور آزاد خیال واقع ہوئے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں کو دو الگ ہستی سمجھیں۔ اور اگر واقعی یہ حقیقت ہے کہ "جوش" اور "نقاد" ایک ہی ہیں تو میرے خیال میں حضرتِ جوش کو یہ عروسانہ حجاب زیب نہیں دیتا۔ ع

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

والی ترکیب ایک شاعرِ انقلاب کے لئے اگر حد درجہ نامناسب نہیں تو مہمل ضرور ہے۔ بہرکیف کلیم جون وجولائی کے مشترک نمبر میں بھی ایک "انتقادی" مضمون شائع ہوا ہے جس کی سُرخی ہے "اقبال وپیامِ اقبال" اس مرتبہ آزاد کی بجائے اقبال نشانۂ ملامت بنائے گئے ہیں۔ اور شرمیلے مضمون نگار "کشاف" کا لقب اختیار کر کے "تنقید" کے اکھاڑے میں بدانست خود اس طرح کود رہے ہیں کہ

کود اکوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا

اور پھر اقبال کی بزعم خود وہ یوں کھولی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ اقبال کی پول وہ شخص کھولنے کی کوشش کر رہا ہے جو اپنا نام تک کھولنے سے شرماتا ہے، بہرحال [illegible] کی نوعیت کہہ رہی ہے کہ صاحب

مضمون صرف ذہین ہی نہیں بلکہ ان کے سینے میں جوشِ تنقید اس طرح موج مار رہا ہے کہ گویا دَورِ حاضرہ کے تمام مشاہیر شعرا پر (بجا نا درست نہیں) ایسی تنقید کریں گے جو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ تنقید نگار پر رعب طاری ہے۔ ایسی صورت میں اگر غیر مناسب نہ ہو تو ہم نہ صرف حضرتِ کشّاف بلکہ حضرتِ جوشؔ کی خدمت میں بھی مودبانہ کچھ عرض کریں۔

حضرت جوشؔ مدیر کلیم نے "کلیم" کے اجرا کے جو مقاصد گنائے ہیں اور اس کی توسیع اشاعت کی کوشش کر جن وجوہ سے بمنزلۂ فرض کے ضروری قرار دیا ہے اُن میں درجۂ اولیت صرف اس مقصد کو ہے کہ

"اس کے ذریعے سے جن خیالات کی اشاعت کی جاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ افراد تک پہونچ سکیں"

اگر واقعی حضرتِ جوشؔ اپنے اس قول پر ثابت قدم ہیں تو اُن کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر کلیم کے خیالات کی اشاعت حضرت "کشّاف" کی اس زبان میں ہوئی جو اُن کے مضمون میں جلوہ دکھا رہی ہے تو زیادہ سے زیادہ پانچ فیصدی اردو داں اِسے سمجھ سکیں گے ورنہ کس کو غرض پڑی ہے کہ کلیم کی خریداری کے ساتھ ساتھ ایک ایسے شخص کی تلاش میں بھی زحمت اُٹھائے جو اُسے پڑھکر سمجھائے؟ یا کسی کا سر پھرا ہے جو اس وقت جب کہ پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا۔ کلیم کی خریداری کے ساتھ ساتھ ایک اچھی لغت بھی خریدے؟ کیونکہ حضرتِ کشّاف کے مضمون کی شاید ہی کوئی سطر ایسی ہو جس میں بڑے بڑے الفاظ و تراکیب کے استعمال سے آزاد و نیازؔ کو بدالنست خود شکست فاش نہ دی گئی ہو۔ حد تو یہ ہے کہ حضرتِ کشّاف نے ایک جگہ "حجابِ غلیظ" لکھکر "غلیظ" کے عربی لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے جس معنی میں عربی میں مستعمل ہے، یعنی "موٹا" کے، کیا ایسی صورت میں جب کہ اردو زبان کو آسان سے آسان تر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ کلیم کا یہ طرزِ عمل خود اُس کے حق میں مفید ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے دَور میں جب کہ ہماری قوم میں تعلیم ہی کی کمی ہے ایسے "ادق" مضامین کی اشاعت لوگوں کے دلوں میں کلیم کی خریداری کا جذبہ پیدا کر سکے گی؟ بہر حال! جوشؔ کے بعد جنابِ کشّاف سے یہ عرض ہے کہ کیا انھیں فرانس کے مشہور تنقید نگار سینٹ بیوؔ کے اس قول کی کہ "پڑھنا، سمجھنا، محبت کرنا اور دوسروں کو بھی اس پر مجبور کرنا تنقید کہلاتا ہے"، تردید کرنی منظور ہے! یا وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی عربی اور فارسی دانی کا سکہ لوگوں پر بیٹھ جائے! تنقید کا یہ طریقہ ایک دم غلط ہے، کہ اُسے ایک ایسا گورکھ دھندا بنا دیا جائے جو تنقید نگار اور پبلشر کے سوا اور کوئی سمجھ ہی نہ سکے، مخصوص ایسے مشاہیر پر، جن کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہونچ چکا ہے۔ تنقید کرنے میں وہ "زبان ہرگز نہ استعمال کرنی چاہیئے جو ایک خاص حلقہ تک محدود ہو۔ کیونکہ جو چیز وہ دکھانا یا پیش کرنا چاہتا ہے وہ اُس وقت تک قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ عام فہم نہ ہو، بہر حال یہ ایک مشورہ تھا جو مخلصانہ عرض کیا گیا اب ع مرضی تری پسند نکر یا پسند کر

حضرتِ کشّاف تمہیدِ مضمون میں فرماتے ہیں ——————

"آج ہم اقبال پر مرعوبیت اور نیز تعصب سے خالی ہو کر خالص تنقید کی غرض و غائت سے ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں"

اِس تمہید کے بعد اقبال پر جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ ——————

"اقبال ہندوستانی وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے ملک کی محفل ادبی میں داخل ہوئے، اور اس بلند آہنگی سے کہ

یونان و مصر و رُوما سب مٹ گئے جہاں سے
باقی ہے لیکن اب تک ہندوستاں ہمارا

لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اقبال کے ساز کے اس پردہ کا سازِ موت بج گیا۔ اور وہ ایک گوشۂ تخصیص میں آکر بڑے واضح و قاطع اسلامی شاعر بن گئے"

مکمل آٹھ صفحے کا مضمون اسی اجمال کی تفصیل ہے، اور گویا یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اقبال کی وطنیت سے علیحدگی ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی شرمندۂ معافی نہیں ہو سکتا۔ اب قبل اس کے کہ ہم اقبال کی وطنیت کے متعلق کچھ عرض کریں ضرورت اس کی ہے کہ اس تمہیدی اقتباس پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

"تنقید" کا لفظ استعمال کرنے کے بعد حضرت کشّاف نے اقبال کی وطنیت پر جو اعتراض کیا ہے اور فصاحت و بلاغت کے جو دریا بہائے ہیں، اُس سے

عام میں یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا ڈر ہے کہ تنقید کے معنی اعتراض کرنے کے ہیں لہٰذا التماس یہ ہے کہ جو صاحب ایسا سمجھتے ہیں وہ "بازاک" کے اس قول کی تصدیق کر لیے ہیں کہ

"تنقید نگار وہی لوگ ہیں جو ادب اور فنونِ لطیفہ میں
کوئی درجۂ کمال حاصل نہیں کر سکتے"

حالانکہ دراصل بقول حضرتِ ژور

"تنقید اُس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کی حرکات و
اقوال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں
یا یہ کہ صحیح اور غلط، اچھے اور بُرے اور حق و باطل کے
درمیان فرق کرنا دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ
کر دکھانا تنقید ہے"

اب اگر یہ صحیح ہے تو اِس قول کے مطابق حضرتِ کشاف کی حیثیت "تنقید نگار" کی نہیں بلکہ تنقیص نگار کی ہوئی جاتی ہے۔ اب آئیے اصل موضوع کی طرف حضرتِ کشاف کا سارا کشف "اقبال کی وطنیت سے بیزاری" پر اظہارِ خفگی میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا پامال مضمون ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے حضرتِ کشاف کو نہ معلوم ہو تو یہ دوسری بات ہے، ورنہ اور لوگ جانتے ہیں کہ اور تو اور خود حضرتِ اقبال سیالکوٹی کے ہم وطن حضرت تاثر سیالکوٹی نے "اقبال کی وطنیت سے بیزاری" پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ

مجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے مانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمین سے سلوک تیرا مخاصمانہ

اور پھر آگے چل کر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

تو فخرِ ہندوستاں نہیں ہے تو شاعرِ ایشیا نہیں ہے
تو فرقہ پرور ہے فتنہ زا ہے برنگِ اعجازِ شاعرانہ

اور پھر اُس پر مدیر نے جو حاشیہ آرائیاں کی ہیں وہ تو دیکھنے ہی کی چیز ہے، غرض اسی طرح اکثر و بیشتر اس عنوان پر لکھا جا چکا ہے اور اس موضوع پر اتنی بحثیں ہو چکی ہیں اور سوال و جواب میں اس قدر مقالے لکھے جا چکے ہیں کہ اب اس عنوان پر کچھ لکھنا اگلے ہوئے نوالے کو دوبارہ چبانا ہے جس میں کوئی لطافت و نفاست نہیں۔ رہا یہ کہ حضرتِ کشاف نے اقبال کی شخصیت سے مرعوب نہ ہو کر جی کھول کے اعتراض کیا ہے تو بلاشبہ یہ بہت اونچی قدر و قابلِ ستائش ہے، ابھی ہم میں ایسے لوگوں کی بقائت کمی ہے، جو ذاتی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر ایمانداری و دیانتداری سے کسی باوقعت شخصیت کی کمزوریوں پر بھی روشنی ڈال سکیں۔ اور اسی لحاظ سے حضرتِ کشاف کا اقدام قابلِ تقلید ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی گذارش ہے کہ جناب حضرتِ کشاف کا یہ قول حقیقتاً اپنی جگہ اٹل ہے کہ

"اقبال کے متعلق معلوم نہ حرف غلط کی غیر معمولی شہرت ہے
جس نے لوگوں کی قوتِ نقد و نظر پر ایک حجابِ غلیظ
پیدا کر دیا ہے، خواص تک اُس کی لپیٹ میں ہیں"

وہاں کسی کا یہ کہنا بھی صریحاً غلط نہیں کہ:۔

"آج کل ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر اقبال پر
اعتراض کرنا فیشن سا ہو گیا ہے، ہر وہ شخص اعتراض کرنے
پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے جس نے تھوڑی بہت بھی کتابیں
دیکھ لی ہیں، اس سے اور کچھ نہیں تو اتنا فائدہ ضرور
ہو جاتا ہے کہ معترض زینۂ شہرت کی دو چار سیڑھیاں
ضرور طے کر لیتا ہے"

میں مانتا ہوں کہ "حضرتِ کشاف" پر یہ اعتراض کسی طرح عاید نہیں ہو سکتا کہ وہ شہرت کے خواہاں نہیں، کیونکہ اگر انھیں نام و نمود کی خواہش ہوتی تو وہ میدانِ صحافت میں حجابِ عروسی کو خیرباد کہہ کر تشریف لاتے، پھر بھی اس قدر ضرور ہے کہ جنبشِ قلم کا سبب فیشن کے سوا اور کچھ نہیں۔

بہرحال، اقبال پر اعتراض کیوں کیا گیا! میرے منہ میں اتنے دانت نہیں کہ ہم ایسا کہیں، اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ ہم اقبال کی حمایت بیجا میں ان کی غلطی کو بھی بزعمِ خود صحیح ہی سمجھیں، مگر چونکہ اس جگہ حقیقت سے زیادہ غلط فہمی کارفرما نظر آ رہی ہے۔ اس لئے غیر مناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں ہم بھی کچھ عرض کر دیں۔

سب سے پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اقبال محفلِ ادب میں وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے داخل ہوئے کیونکہ اقبال ملک کی محفلِ ادب میں کبھی بھی ہندوستانی وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے داخل نہیں ہوئے بلکہ جس طرح عام شعراء مشرقی غزلگو کی حیثیت سے محفلِ ادب میں داخل ہوئے



آبشار

گھر دو تو اقبال بھی پیدا ہوئی آئے، اب یہ خدا کی قدرت ہے جو مشاعرہ میں ۲۲ سالہ اقبال کی سب سے پہلی غزل کا ایک شعر ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

سن کر لوگ پکار اٹھے کہ "اقبال غالب کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے" اور آخر میں یہ پیشین گوئی صحیح بھی ثابت ہوئی۔ اسی لئے یہ کہنا کہ وہ محفلِ ادب میں ہندوستانی وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے داخل ہوئے ہرگز صحیح نہیں، ہاں بلاشبہ کچھ دن بعد جب ان کی طبیعت نے جولانی دکھائی تو "ترانۂ ہندی" میں وہ یہ کہہ اٹھے کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک ان کی تعلیم یہ رہی انہیں شاعرِ اسلام کسی نے نہ کہا، تا آنکہ وہ اسلامی تعلیم کے مجذوبِ اعظم ہو کر یہ نہ پکار اٹھے کہ۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بیشک "وطن" ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان کو عزیز ہے، اقبال تو اقبال بقول خود حضرتِ کشاف پیغمبرِ صلعم کو بھی بحیثیت انسان اپنا وطن پیارا تھا۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ جب وہ بحیثیت پیغمبر مبعوث ہوئے تو اسلام کی اس تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کہ اسلام میں وطن کوئی چیز نہیں، انہیں اپنے وطن کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔ اس کے بعد قرآن مجید کو لیجئے، جس پر اسلام کا دار و مدار ہے، اس کی کوئی آیت اور کوئی سورت ایسی چیز ہوتی جو اسلام، اسلامی کتاب، اسلامی ہادی و رہبر اور اسلامی نظام کے لئے ضروری تھی تو قرآن مجید اس سے کبھی بھی خالی نہیں ہو سکتا تھا ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

مگر ایسی صورت میں جبکہ قرآن مجید اس سے خالی نظر آتا ہے مسلمان اُسے اسلامی چیز نہیں سمجھتے۔ اور جب وہ اسلامی چیز نہیں ہے تو شاعرِ اسلام سے یہ مطالبہ کہ وہ "وطنیت" سے بیزار کیوں ہے۔ محض غلط ہے۔ تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کا موقع نہیں۔ اس لئے صرف اس جگہ اس نظم کو نقل کئے دیتا ہوں جو حضرت میر نور بخش ماتر سیالکوٹی کی نظم کے جواب میں حضرت ثاقبؔ نے کہی تھی، وہ یہ ہے

اسلام کا جہاں میں کوئی وطن نہیں ہے
یہ شمع پائے بندِ یک انجمن نہیں ہے

سیل ہوا نہیں ہے ابنِ فضائے صحرا
موجِ بہار، اسیرِ صحنِ چمن نہیں ہے

ذرّوں کی ہمتوں کی پستی، وطن پرستی
سورج کی روشنی کا کوئی وطن نہیں ہے

نکہت کا آشیانہ شاخِ سمن ہے لیکن
نکہت کبھی اسیرِ شاخِ سمن نہیں ہے

اسلام لامکاں ہے، کیوں ہو مکاں کا خوگر؟
طوفاں رہینِ سطحِ گنگ و جمن نہیں ہے

روحی وطن ہے اسلام، اسلامیوں کا یعنی
غیروں کی طرح اِن کا خاکی وطن نہیں ہے

محدود کیوں ہو وسعت اسلام کی فضا کی؟
شاہیں، ہم نگاہِ زاغ و زغن نہیں ہے

اسلام کی نظر میں یکساں ہیں ہند و ایراں
ہر ملک ہے وطن اور، کوئی وطن نہیں ہے

قوم و وطن کے بت ہیں دنیا میں روز افزوں
افسوس ہے کہ کوئی اب بت شکن نہیں ہے

جو مل کہ آسمانِ اسلام کے مکیں ہیں
ان کو دماغِ فکرِ خاکِ وطن نہیں ہے

اسلام کا وطن کیا؟ کہہ دیں گے ہم بیانگ
کوئی زبان نہیں ہے، کچھ پیرہن نہیں ہے

قومیں ہیں طفلِ ناداں، ان کے وطن کھلونے
پرطارقانِ دیں کا ایسا چلن نہیں ہے

ناز سے کوئی کہہ دے اقبال کی طرف سے
اک بحر کی پرستش حسنِ سخن نہیں ہے

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

رہا یہ دیکھنا کہ اقبال کو شاعرِ اسلام کی حیثیت سے نہ سہی ایک انسان کی حیثیت سے "وطن" واقعی عزیز ہے یا نہیں تو حضرت کشاف کی خدمت میں گذارش ہے کہ اقبال کو اس سے ہرگز علیحدہ نہیں کہا جا سکتا۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ

"دورِ حاضرہ کے خلاف تبرّائی بازی کرکے اور اس کے سامان سے مقدس صحائف بالِ جبریل و ضربِ کلیم کے انبار تعمیر کرنے سے کہیں بہتر تھا، کہ ہم اُس کی کیمیا ساز آگ میں خوب تپتے اور قائم النار ہو جاتے"

تمام تر نتیجہ ہے اُس وطن کی محبت کا جو اقبال کے سینے میں موجزن ہے،

۱؎ رسالہ زمانہ، لاہور جولائی ۱۹۳۵ء

۲؎ منبرا میں "ی" کی ضرورت نہیں

۳؎ انبار تعمیر کرنا، دہلی میں معلوم نہیں بولا جاتا ہے یا نہیں۔

عطاء اللہ

کلیم صاحب جو چاہیں کہیں اُنھیں اختیار حاصل ہے، لیکن ہمیں بھی اعتراف ہے کہ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم بقولِ نیاز و شہاب ہیروں میں تولنے کے قابل اور ایک ایسی غیر فانی تصنیف ہے جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ بالِ جبریل و ضربِ کلیم دونوں میں مسلمانوں کی غلامی پر طنز ہے، اور یہ طنز یا بالفاظ دیگر یہ تعلیم کہ مسلمان غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار کر جلد از جلد پھینکیں" وطن کی محبت کے تحت نہیں تو اور کس جذبہ کی تحت ہے؟ کیا وطنیت کے اظہار کے لئے ایک ہی صورت ہے کہ وہ بار بار یہی چیخا کریں کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ضربِ کلیم میں اُن کی خدا سے یہ شکایت کہ ؎

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

اور اُن کی یہ دعا، کہ ؎

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

وطن کی محبت میں نہیں تو اور کس جذبہ کے تحت ہے؟ اُن کی یہ تعلیم کہ

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

کیا صرف اس لئے نہیں ہے کہ سرزمینِ وطن غلامی سے آزاد ہو؟ برادرانِ وطن بندگی و بیچارگی سے مخلصی حاصل کریں؟ اور ہندوستان غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکال ڈالے؟

اقبال پر یہ اعتراض کہ اب اُسے اپنے وطن سے محبت نہیں، محض سطحی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اب اُن کی تعلیم اس قدر بلند ہے کہ مجھ جیسے کی سمجھ سے بہت دُور ہے۔ اور چونکہ ہماری محدود العلمی اقبال کی تعلیمات سمجھنے سے قاصر ہے، لہٰذا ہمیں اختیار حاصل ہے، کہ ہم جو چاہیں کہیں ورنہ اقبال نہ پہلے وطن سے برگشتہ تھے، نہ اب ہیں اور نہ شاید آئندہ ہوں گے اور اس لئے اس وقت بھی جبکہ اقبال ترقی کے تمام تکمیلی مدارج طے کر چکے ہیں اُن سے یہ بھی استدعا کہ "اقبال پھر سنا دے ہندوستاں ہمارا" ایک طفلانہ ہٹ سے زیادہ وقیع نہیں۔

رہی ان کی شہرت تو صرف ان ہی پر کیا موقوف ہے، جوش، سیماب حسرت، اصغر، فانی، جگر، ساغر وغیرہ جیسے مشہور شاعر ہیں، جو اپنے وقت کے شاعر ہیں بلا وجہ تو مشہور نہیں، وہ ناخن سے پڑھ کر کون... نقاد ہو سکتا ہے پھر آخر کچھ تو ہے جسے دیکھ کر زمانے نے اقبال کو یہ درجہ دیا ہے؟ مگر دیکھئے کہ اس رتبہ کے باوجود بھی اقبال نے خود کبھی کوئی فخر نہیں کیا، اور وہ برابر یہی کہتے رہے کہ

خوش آگئی ہو جہاں کی قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے
(بالِ جبریل)

پھر بھی لوگ یہ کہہ ہی اُٹھے کہ ؎

ڈال دی تیری نوائے آرزو نے زندگی
ملتِ مسلم رہے گی حشر تک ممنوں تری

جناب عطاء اللہ صاحب پالوی نے اپنا یہ مقالہ، کلیم کے مشترکہ نمبر بابتہ جون و جولائی کے مطبوعہ تنقیدی مضمون ـــــ اقبال اور پیام اقبال ـــــ کے جواب میں بھیجا ہے! اگر ناگوار خاطر نہو ـــــ اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ ناگوار خاطر ہوگا! ـــــ تو ہم اتنا عرض کریں کہ ایسی مضطرب و نیم بار د وکالت اقبال کی، خود اقبال کے لئے موجب توہین ہے: چنانچہ ہم اس محترمہ کی اشاعت در کلیم کو اقبال کی اتنی خدمت نہیں سمجھتے جس قدر کہ حضرت پالوی کی! اگر علامہ اقبال کی ذاتِ گرامی کے احترام سے اس نقد النقد کو مسترد کر دیا جاتا تو بلاشبہ یہ اُن کے حفظِ مراتب کا اک تقاضا ہوتا، لیکن جناب پالوی صاحب یقیناً اسے اقبال کی حمایت و شفاعت کی وستاویز نہ کہ "زریں ترین ورق کی سیہ گشتگی" سے تعبیر کرتے! الغرض علامہ اقبال کو جناب عطاء اللہ صاحب کی یہ "ناخواندہ خدمتِ معکوس" برداشت کرنی ہی پڑے گی! اگرچہ یہ اک کھلا ہوا راز ہے کہ اگر قبل از اشاعت یہ مسودہ حضرتِ اقبال کو دکھانے کے مواقع میسر ہوتے تو حضرت موصوف اُسے دفتر کلیم میں واپس فرمانے کے بجائے اغلباً جناب عطاء اللہ صاحب ہی کے نام "ری ڈائریکٹ" کر دیتے!
ـــــ اس نوٹ کے ساتھ کہ "علائے" تو یہ لقائے تو! ؎

صائب! دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس را

ہمارا عقیدہ تو یہی کہ اس بارے میں کسی سخن شناس کی ...

[illegible] پھر جا ہے ہم پر بھی اک "دندان شکن جواب" کی ضرب پڑتی! ہم قوت ہم خود سے پنجہ کشی میں جو لطف ہے اُسے اہل ذوق ہی جان سکتے ہیں:ـــہ

اے خدا! یک زندہ مردِ حق پرست
لاقے باید کہ یا بم در شکست!

اقبال کی جلالتِ قدر تو اقبال ہی کی ہے، سچ یہ ہے کہ خود میں اکشام پالوی صاحب کے اس نیم جان، "اختلاج قلب زدہ جواب" کو اپنے مضمون کے شایانِ شان نہیں سمجھتا! اک متین و سنگین انتقاد پر یہ طفلانہ زبان کج مج بیان!!ـــہ

ذوق! بازیگہِ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
عاقبت "بچوں" کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو!!

ناظرینِ کلیم تو عطاء اللہ صاحب کے اس مضمون کی سست رگیوں اور غلط بازیوں سے لطف اٹھائیں ہی گے، تاہم آئیے ہم اِن حرکاتِ مذبوحی کا تماشا دیکھنے کے لئے بعض رموز لوں اور رخنوں کی سرسری نشاندہی کر دیں۔

(١) عطاء اللہ صاحب پالوی کے "جذبۂ باصرہ نوازی" کی آسودگی میں "کشاف" کا "حجابِ عروسانہ" بُری طرح سنگِ راہ ہے! وہ اِس ناکام نقاب افگنی میں ایسے ناشکیبا ہیں کہ گویا چیخ رہے ہیں کہ ؏

پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے!

لیکن ہم پالوی صاحب کو اُن کے خطرناک ذوق پر متنبہ کرنا پسند کریں گے! وہ کسی "حجابِ عروسی" کے فریبِ نظر میں مبتلا نہ ہوں! ہمیں خوف ہے کہ اپنی "شبِ زفاف" کی کامیڈی میں اُنھیں کہیں اس "ٹریجیڈی آف ایرز" سے دو چار نہ ہونا پڑے کہ ؏

شبِ اول عروسی نزگر دد!

پھر پوچھنے کی بات یہ ہے کہ آپ حریفانہ تنقید و استدراک کی وادیٔ متعب میں اُتر رہے ہیں یا کسی حجلۂ عروسی کے دروازے پر خوشہا نہ دستک دے رہے ہیں؟! اپنے مضمون میں آپ کا جو انجام ہوا ہے، غالباً وہ اسی کم سن پسندی کا خمیازہ ہے! ؏

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد!

آپ کو اس سے کیا کہ "کشاف" کے زیرِ حجاب کون ہے؟ تنقید کا اُصولِ اول تو یہ ہے کہ "اُنظُر اِلیٰ مَا قَالَ، وَلَا تَنظُر اِلیٰ مَن قَالَ!"ـــ

اس سے "ذاتیات کا زنبور خانہ" بھی مُقفل رہتا ہے، جو ہمارے علمی مناظروں کی بدنام خصوصیت ہے! لیکن ممکن ہے آپ اسی چیز کے جویا ہوں! اِس اشتیاق کی ستم ظریفیاں دیکھئے کہ "کشاف" کے حجاب کے نیچے کبھی آپ کو کوئی "عروسانہ رُخِ جمیل" نظر آتا ہے، اور کبھی خان صاحب جوش کا "چہرۂ جلیل"! ہ

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است!

ہاں اِس تاریکی میں میت سے مسلّم الثبوت نقادوں اور سخن شناسوں کی "سخن فہمی" غلط ہالہ بھی تو "معلوم" ہوتی ہے! ہمیں خوف ہے کہ آپ اور پروفیسر فراق شاید اپنے اعزہ و اقربا کی آوازیں بھی پسِ دیوار سے نہ پہچانتے ہوں گے، جبکہ آپ کو "کشاف" اور جوش کے بُعد المشرقین رکھنے والے اسلوبہائے بیان میں ایسا مغالطہ ہوا! ایسے لوگ اقبال کے مرتبہ دان بننے چلے ہیں!ـــہ

اے بندہ بہ دست و پائے در گِل ہُشدار
اے دوختہ چشم و قفل بر دل ہُشدار!

(٢) جناب نے اپنے مسودے کے چار پانچ طویل صفحے اِس شیون اور بین کے نذر کئے ہیں کہ "کشاف" کا مضمون اپنے لسانی اغلاق اور معنوی تعقید کی وجہ سے یکسر ناقابلِ فہم ہو گیا ہے، جس کے سمجھنے کے لئے آپ کو اک عربی فارسی لُغت کی ضرورت ہے، جس کی خریداری کے لئے آپ کی گرہ میں دام نہیں! کاش ہم آپ کو ایسا "مفلس علم و درم" سمجھنے پر مجبور نہ ہوتے: تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ چند ساعت ہی کے بعد آپ کے عجوبہ ذہنی کی گرہیں کھُلنے لگتی ہیں! آپ اِس مضمون کو مُغلق کے بجائے صرف "اَدَق" (باریک) کہنے لگتے ہیں! اور پھر تو یکے بعد دیگرے ایسے کشفِ حجابات ہوتے ہیں کہ یہی سنگلاخ مقالہ "فصاحت و بلاغت کا بہتا دریا" بن جاتا ہے جو عام فہم کیا معنی "عوام فہم" تک ہو جاتا ہے! ؏

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

غالباً "بلاغت و فصاحت، اور عام فہم و عوام فہم" اِن الفاظ کے معنی آپ کسی "لغت کی خریداری اور قرضے کی زیر باری" کے اندیشہائے دور و دراز کے بغیر سمجھتے ہوں گے، اور اُن کے اور "مغلق و ادق" کے درمیان کے "تفاوتِ راہ" کی پیمائش بھی کر سکیں گے!

(٣) "تنقید التنقید" یا علی الاطلاق تنقیدِ ادب کے متعلق آپ خود

کچھ [illegible] نہیں کرتے، اور باوصف اپنی "بینقاب مردمی" کے کبھی بلاک کے پس پشت کھڑے ہوتے ہیں، اور کبھی پروفیسر "زور" کے بل بوتے پر کچھ چند سطری لب کشائی کرتے ہیں! لیکن اس سارے "بچکانہ لہو ولعب" میں اس سنگین حقیقت کو صاف بھول جاتے ہیں کہ آپ پر اک سخت "مبارزت" کے ادعا کو پایۂ استناد تک پہنچانے کا بارِ ثبوت تھا، جو شاید آپ کے خواب وخیال میں خود ہی اتر گیا! ع

کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں!

"کشاف" کو آپ پہلے "ذوق رسوائی کا خوگر اک مریض" کہتے ہیں، جس کی "خوردہ گیریٔ اقبال، اک افسوسناک ناشناسی اور اقبال کی فلسفیانہ مشکل پسندی کا حریف نہ ہونے کی معذوری کا مظہر" ہے! لیکن چند ہی صفحوں کے فصل نے جو "ضعفِ حافظہ" عارضِ حال کیا اس کا کرشمہ یہ ہے کہ (بالفاظ پالوی صاحب) "حضرت کشاف کا یہ قول حقیقتہً اپنی جگہ اٹل ہے کہ (ملخصاً) اقبال کی مقبولیت اک مشہور حرفِ غلط ہے، جس کے اثر سے خواص تک کا علم ونظر اک حجاب اکبر بن گیا ہے!" ——— قارئین کلیم کو معلوم ہے، اور ہمارے پالوی صاحب کا اعتراف ہے، کہ کشاف کا بقیہ مضمون اسی تمہیدی اجمال کی تفصیل ہے! اب اسی کو عطاء اللہ صاحب تسلیم کئے لے رہے ہیں! یہ ضدٌ فی ضدٌ انکار کے بعد ضدٌ فی ضد اقرار کی کیسی طرفہ مثال ہے! ع

کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو!

اسی طرح "کشاف" پر قبل ازیں اک "نسائیانہ جذبۂ نمائش" طاری تھا، لیکن اب وہ "اس شبہ کے اطلاق سے بالاتر" ہو جاتا ہے، اور (از روئے منطقِ پالوی صاحب) اسی "نقاب پوشی کی بے نیازیٔ نام ونمود" کی بنا پر! پہلے اقبال پر حرف گیری "آفتاب پر خاک اڑانا" تھا، اس لئے کہ اقبال اک "آفتابِ نصف النہار" ہے! لیکن جلد ہی اس "مہر نیم روز کو گہن" لگ جاتا ہے، ان میں "غلطیاں" نظر آنے لگتی ہیں جن کی "بیجا حمایت" اک "زعمِ باطل" بن جاتی ہے! ساتھ ہی "زنانہ مزاج کشاف" کی "غیر مرعوب" نکتہ چینیٔ اقبال "بلاشبہ اک لائقِ قدر وقابل ستائش، اور بغایت کمیاب ہمت ودیانت" ہو جاتی ہے اور اک "قابلِ تقلید اقدام"!!! ——— پھر بقول بلاک اگر "تنقید نگار اصولاً وحتماً بے ہنر ومحروم کمال لوگ ہوا کرتے ہیں" تو دوسری طرف "بفرمودۂ حضرتِ "زور" ناقد، ادبیات کے حسن وقبح کا جوہری، اور اس کے حق وباطل کا فارق اعظم ہوتا ہے!" ——— ان "قرآن ووطنیت" کے ذکر سے خاموش، اور "اسلام قومیت" کے تصور سے بیگانہ ہیں، جب اس بنا پر اقبال ایسے اسلامی شاعر سے ان عقائد ومقاصد کی ترجمانی یا ہمنوائی کی امید قطعاً بے محل ہے!" لیکن پھر چند ہی سطروں کے بعد اقبال اپنے شرعی منصب کو بھول بھی جاتا ہے، اور "قرآنی نظریے" کو مسترد کر دیتا ہے اور ساری ناممکن توقعات کو بڑے بیر حاصل تقریبات میں پوراکرنے لگتا ہے، جبکہ پالوی صاحب، ان کے "وطن پرور، قومیت نواز، مشرق دوست، حریت مآب" اشعار نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں!

یہ ساری بدحواسیاں اور خود فراموشیاں اس وقت ہیں کہ پالوی صاحب کو اک "زیرِ نقاب عروسِ شرمگیں" ہی سے سابقہ پڑا ہے! اگر سچ مچ کبھی کسی "مرد" سے مقابل ہوئے تو اک "مرگِ مفاجات" ہی سے ہمکنار ہو جائیں گے! ؎

این زناں ہمتِ مرداں بہیں محدود داست
زنِ از پردہ بروں آید وکارے بکند!

(۴) "تاز سیالکوٹی" کی معترضانہ نظم متعلق اقبال کی نظیر کو تازہ کرنے کے بعد پالوی صاحب نے جن "حضرت فکری" کی معترفانہ نظم "درباره وسیع المشربیٔ اقبال" کی طرف دعوتِ نظر دی ہے، وہ اگر ابلہ فریبی نہیں ہے تو خود فریبی ہے! اقبال کی "فراخیٔ مسلک" کا کون شاکی ہے؟ مگر یہ کون سی "شاعرانہ جہانگیریت" ہے جس کا قلعہ "کاشانۂ وطن کے ملبے" پر تعمیر ہوا ہے؟!

اس قدر دشمنِ اخوانِ وطن ہو جانا؟!

"ترکِ وطن" اگر اسی بنا پر "سنتِ محبوب الٰہی" ہے کہ آنحضرتؐ کو با دلِ ناخواستہ مکۂ معظمہ کے وطنِ مالوف کو خیرباد کہنا پڑا تو آپؐ کو خانۂ کعبہ کا بھی اسی طرح اور اسی کے ساتھ ساتھ تخلیہ کرنا پڑا تھا! پس کیا "ترکِ بیت اللہ" بھی "محبوب الٰہی" کی اک "محبوب سنت" ہو گی، جس پر عمل پیرا کر اکر ہندی مسلمان کو یہ دعوتِ حقہ دی جائے گی کہ ؎

دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی!

(۵) کشاف کے مضمون متعلق اقبال کے صرف ایک جزو ——— وطنیت کا اختیار و ترک ——— ہی سے پالوی صاحب نے بحث کی ہے، اور اسی کے الٹے سیدھے جواب پر انکاء انداز [illegible]

کو پہنچ جاتا ہے: اگر دوسروں کی غلط فہمی کو دور کر کے وہ خود اک غلط فہمی میں گرفتار نہیں ہو گئے ہیں تو ہمیں، اُن کے ساتھ ساری ہمدردی کے باوجود، یہ تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ بقیہ حصہ اکثریت، مضمون کا جس پر اُنھوں نے کوئی جرح و قدح نہیں کی ہے، اُنھیں "غیر متنازعہ فیہ" نظر آیا ہے، اور اُن کے نزدیک مسلّم و منظور ہے! ——— کیا فرماتے ہیں جناب پالوی صاحب بیچ اس مسئلے کے؟!

(۶) اقبال کا اک وطن پرست شاعر کی حیثیت سے ہندوستان کی محفلِ ادبی میں داخلہ جناب پالوی صاحب کو تسلیم نہیں! وہ اُن کے شاعرانہ مرتبے کے اولین اعتراف کو اک غزل سرا قافیہ بند کی حیثیت سے منوانے پر مُصر ہیں! پالوی کو صرف دو مغالطے عارض حال ہیں جنھوں نے اس بارے میں اُنھیں کشاف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے پر مجبور کیا۔ پہلی بات یہ ہے کہ اقبال کے "پیام" سے بحث تھی، اُن کا "کلام" مرکزِ نظر نہ تھا! اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ "غزل" کون سے سیاسی یا تمدنی یا معاشی "پیام" کا آرگن ہوتی ہے؟! ——— دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کشاف کے نزدیک جدید ہندوستان کی محفلِ ادبی، اور قدیم ہندوستان کے مشاعروں کی بھانڈوں کی محفل، میں تھوڑا فرق ہے! ؏

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست!

(۷) پالوی صاحب دغیرہم کے یہ واہمہ در پئے آزار معلوم ہوتا ہے کہ آج کل لوگ اقبال پر فیشن کے طور پر تنقید کیا کرتے ہیں اور مقصود اک آسان شہرت ہوتی ہے! ——— بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی خال خال، تقریباً الشاذ کالمعدوم قسم کی مخالفت، فیشن کی اکثریت و عمومیت سے ہنوز بمراحل بعید واقع ہوئی ہے، اور بجز مبارک، مجتہدانہ نقد کے کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کی جا سکتی! البتہ ہمارے عہد کا ہر تعلیم یافتہ و نیم تعلیم یافتہ شخص اس وبائے عام کا شکار ضرور ہے، کہ اقبال کی آشنایانہ یا ناشناسانہ "تعریف" کیا کرے! ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے!

(کشاف)

کرب کی آواز

ابنِ آدم کی شادکامی کا مسئلہ ہے عجیب زہرہ گداز
آدمی کھُل کے ہنس نہیں سکتا غم نہ بخشے اگر پرِ پرواز
ایک کلفت کا عارضی انجام ایک وقتی طرب کا ہے آغاز
سبزۂ نرم و بسترِ سنجاب خار و خس کا ہے فرشِ پا انداز
جس میں پنہاں نہو خراشِ الم کونسا ہے طرب کا وہ انداز
ایک پژمُردگیٔ نامحسوس دہر کی ہر شگفتگی کا ہے راز
ایک مبہم سا نوحۂ ابدی چھیڑتا ہے مسرتوں کا ساز
قہقہے تک میں جوش غلطاں ہے ایک دھیمی سی کرب کی آواز

جوش

پولیس کا بُلبلا
(سب انسپکٹر)

ایک مسافر

سنہ ۳۴ء کی بات ہے۔ ایک داروغہ جی، بابیوں کے ہنے حکومت کے ایک چھوٹے ہوئے سانڈ صاحب، اپنے دو دو پیسے کے کانسٹبلوں اور ہیڈ کانسٹبلوں کے حلقے میں کانپور کے اسٹیشن پر فرعونی ٹھلنے سے ٹہل اور ہامانی جبروت سے "احکام" نافذ فرما رہے تھے۔ مندرجۂ ذیل مضمون اُسی مطالعے کا نتیجہ ہے۔

~~~~~~~

آؤ میاں بُلبلے، آؤ، میرے درجے میں چلے آؤ۔ تم اکڑ کر چل رہے ہو۔ زمین شق ہو جائے گی۔ تم گرج کر کلام کر رہے ہو۔ فضا کا پتّا پھٹ جائے گا۔ آؤ، آؤ، سانس لیتے ہوئے میاں بُلبلے! تم سر اُٹھا رہے ہو۔ آسمان میں سوراخ ہو جائے گا۔

اللہ، اللہ، میاں بُلبلے، تمہاری حکومت، اور شوکت کی کوئی تھاہ نہیں۔ کیا مجال، مچھر تمہارے کان پر بھنبھنا سکیں۔ پتنگے تمہارے قریب آسکیں، اور خس و خاشاک تمہارے بالوں میں اُلجھ سکیں۔

میاں بُلبلے تم بہت مغرور واقع ہوئے ہو، اور کیوں نہ ہو، تمہارے غرور کی جڑیں پاتال تک پہونچی ہوئی ہیں۔ اِس لئے کہ تم تاج کے غلام ہو، اور تاج نے تمہیں بنے بنار سُشتر کی طرح چھوڑ رکھا ہے۔ ہر چند تاج کے غلاموں میں تمہارا مرتبہ سب سے گھٹیا ہے، جسے سوچ کر میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ مگر،

گرچہ خوردیم، نسبتیست بزرگ

کے لحاظ سے تم بھی ایک بڑی چیز ہو۔ اور ہاں اے میاں بُلبلے، تمہارے فرائض کی نوعیت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ تم بڑے اطمینان سے بے دست و پا مخلوق کو ستا سکتے، اور معصوموں سے مار دھاڑ کے ذریعے ارتکاب قتل کا اقرار کرا کے اُنھیں بہ آسانی تمام سُولی کے تختے پر لٹکوا کر حکّام بالا کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہو۔ اِس لئے تمہیں حق پہونچتا ہے کہ تم غرور کے مارے زمین پر پاؤں نہ رکھو!

میاں بُلبلے! تمہاری ٹوپی کا سِرا تمہارے داہنے کان کو چوم رہا ہے۔ اِتنا شدید بانکپن کتنا مہیب، اور مہیب ہونے کے ساتھ ساتھ کتنا سفیہانہ ہے ——— میاں بُلبلے! "سفیہانہ" کے معنی تم نہ سمجھے ہوگے، اِس لئے کہ تمہاری تعلیم و تربیت آنسو بہانے کی حد تک محدود ہے ——— "سفاہت" کہتے ہیں "چھچھورے پن" کو۔ اب سمجھے؟

اے میاں بُلبلے، خدا لگتی بات کا بُرا نہ ماننا، میں نے تمہیں چھچھورا کہا ہے۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہیں۔ اِس لئے کہ تمہارا بُلبلا گھر یعنی تمہارا خاندان، اور پھر تمہاری کیچڑ یعنی تمہارا ماحول، اس قدر پست ہے کہ تم چھچھورے پن پر مامور ہو کر رہ گئے ہو۔

ہاں تو اے میاں بُلبلے! تمہاری ٹوپی کا سِرا، تمہارے داہنے کان کو چھو رہا ہے، شاید قدرت اس پہ ... یہ اِشارہ کر رہی ہے کہ
~~~~~~~

مخفی نفسانیت کی چُٹکی کو اِسی طرف آنا چاہیئے۔ اور تمہارے سر کے بائیں طرف والے گھونگر والے بال، اے میاں بُلبلے، ٹوپی سے باہر نکلے ہوئے ہیں جن کی نوکیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ شاید تمہارا ہر بُنِ مُو آسمان کی طرف منہ کر کے اس کی فریاد کر رہا ہے کہ ہمیں اِس خیرہ سر کی کھوپڑی پر کیوں جمایا گیا ہے؟

میاں بُلبلے، دھوکا نہ کھاؤ، تم خوبصورت نہیں، بلکہ مہیب ہو۔ تمہاری آنکھوں کے اندر ایک گھٹیا قسم کا درندہ یعنی ریچھ ناچ رہا ہے۔

کمر سے۔ طوقِ غلامی کی سُرخ پیٹی، یعنی کارتوس کی پیٹی لگائے ہوئے میاں بُلبلے! اکڑو، اکڑو، خوب اکڑو، کیونکہ یہ چوہوں اور خرگوشوں ہی کے اکڑنے کا موسم، اور بُزدلوں ہی کے فخر کرنے کی سُہالگ ہے، لیکن اے بدہیئت میاں بُلبلے! بُلبلوں کی یہ ایک خوفناک خاصیت ہے کہ وہ اکڑتے ہی پھول جاتے ہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے؟ پھولنا بُلبلوں کے حق میں موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے، اِس لئے کہ وہ پھولتے ہی پھٹ جاتے ہیں۔

دیکھو، سانس کی موہوم و ناقابلِ اعتبار موجوں پر تیرنے اور اِترانے والے میاں بُلبلے! دیکھو، اِس قدر دُھوم نہ مچاؤ، ہوا کی ٹکر، پہاڑ دل کی ٹکر ہوا کرتی ہے، جس سے بُلبلے ایک نفس کے اندر ایسے معدوم ہو جاتے ہیں کہ خوردبین سے بھی دریافت نہیں کئے جا سکتے۔

کمر سے کارتوس کی پیٹی لگائے، اور جسم پر وردی کا چار جامہ کسے ہوئے غلام قسم کے آقا نُما غدّار بُلبلے! اِس سے پیشتر کروڑوں بُلبلے پھٹ چکے ہیں۔ تم سے دس حصے بڑے بُلبلے۔ بڑی بڑی آنکھوں والے بُلبلے۔

تمہارے دادا بُلبلوں میں سے اے میاں پوتے بُلبلے، اکثر تم سے جسامت میں بہت بڑے تھے۔ وہ بھاری بھرکم بُلبلے تھے۔ پیٹ خوب نکلے ہوئے۔ خوب اونچے اونچے، چاروں طرف سے گول گول، قبّوں کی شکل کے ہم شبیہ شمایل بُلبلے، جن کے پھُنگے لٹکے رہتے تھے، اور سینے طباقوں کے سے چوڑے تھے۔ وہ جب بات کرتے تھے تو بدلگام گھوڑوں کی ہنہناہٹ کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ مگر سُنا اے میاں بُلبلے! کہ چکا ہوں ہوا کی ٹکر پہاڑ کی ٹکر ہوا کرتی ہے، چنانچہ ہوا اُن سے ٹکرائی اور وہ دفعتہً پھٹ کر رہ گئے ـــــ میاں بُلبلے ہاتھ اُٹھاؤ اُن کی فاتحہ خوانی کی خاطر، اور مٹھائی منگاؤ اُن کی نیاز کے واسطے۔

شاندار لیکن شرارت آمیز وردی پہنے ہوئے میاں بُلبلے! تم بھی ماشاءاللہ کافی پُر رعب بُلبلے ہو، گھوڑوں کی سی نہ سہی، مگر تمہاری آواز بھی گیدڑوں سے کچھ کم خوفناک نہیں ہے۔ تمہارے ہونٹ غرور سے کھنچے ہوئے ہیں، تمہارے پپوٹے بھی خاصے ورم آلود ہیں، تمہاری آنکھیں بھی آنکھوں خاک نہایت لال پیلی ہیں، تمہاری آدھی ترشی ہوئی نوکدار مونچھیں بھی صوفیانے کہار کی زُلفوں کی قسم نہایت ہی کرخت معلوم ہو رہی ہیں۔ اور تمہاری ناک بھی خدا کے فضل سے کافی سُرخ ہے، اِس کے علاوہ تمہاری ناک کے بال، نتھنوں سے سر نکالے ایک خاص رُعب آفریں انداز سے جھانک رہے ہیں، اِسی کے ساتھ تم جو پان چبا رہے ہو، وہ بھی نہایت سُرخ ہے، اور تمہاری پان چبانے کی ادا میں ایک ایسا طنطنہ پایا جاتا ہے گویا تمہارا چبانے کا انداز زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ اے اہلِ دُنیا! اگر موقعے سے گھُٹ گئے تو کچا ہی چبا ڈالوں گا۔ لیکن اے پھکنا سے میاں بُلبلے! تم سے کہیں زیادہ بڑے پھُکنے اِس حیات کے سمندر میں ٹوٹ چکے ہیں۔

میاں بُلبلے! تم خاکی نیکر، اور چھوٹا سا کوٹ پہنے ہوئے جامے میں نہیں سماتے، تمہارا جیب سے جھانکتا ہوا فاونٹین پن کتنا حاکمانہ طور سے شاندار ہے۔ یہ وہی شاندار قلم ہے جو روئے زمین پر سب سے زیادہ جھوٹ اُگلا کرتا ہے،

لیکن اے میاں بُلبلے، دروغ برگردنِ راوی، سنتا ہوں بُلبلوں کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے، جب ہوا اُن سے ٹکرانے کا ارادہ کر لیتی ہے تو اُن کی نیکریں اور اُن کے فاونٹین پن یا اُن کا چھوٹا سا خاکی کوٹ، کوئی چیز بھی اُنھیں ہلاکت سے نہیں بچا سکتی۔

اے میاں حلقہ بگوش اڈّے پھُکنے بُلبلے! اِس سمندر میں بڑے بڑے بُلبلے، جو سورج سے آنکھیں لڑاتے تھے آنِ واحد میں ٹوٹ کر فنا ہو چکے ہیں۔

خواہ سر پر تمہاری ٹوپی کتنی ہی ٹیڑھی کیوں نہ رکھی ہو، اور خواہ اُس کا پھندنا، لال لال ٹوپی کا کالا کالا پھندنا، تمہارے کان کی لَو کو کتنی ہی شان سے کیوں نہ ہو چھُو رہا ہو، مگر اے میاں نیم رنگین، اور نیم خونخوار بُلبلے! ہوا کی ایک ذرا سی گوشمالی سے بڑے سے بڑا بُلبلا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

پولیس کے سپاہی خورے بُلبلے! یہ بھی معلوم ہے کہ ہر بُلبلا ٹوٹنے ہی کے لیے

اُبھرتا اور ہر غرور کا آخر کار سر نیچا ہی ہو کر رہتا ہے!

سمندر کے پرانے تجربہ کار مگرمچھ، اور بڑی بوڑھی مچھلیاں، رات کا کھانا کھانے کے بعد جب اپنے تجربے بیان کرتی ہیں، تو اس موقع پر اکثر یہ کہتی ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ زیادہ گڑبڑ مچانے والے ببلے بہت جلد ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔

اس لئے اے میاں ببلے! ٹھنڈے پانی پر ٹھنڈے ٹھنڈے تیرو، زیادہ گڑبڑ نہ مچاؤ۔ اتنی ڈون کی نہ لو۔ کیونکہ زیادہ ہلنے ڈولنے، اور زیادہ گڑبڑ مچانے سے، سمندر کا بیان ہے کہ ببلے بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔

اچھا! کیا میاں ببلے! تم مجھ پر آنکھیں نکال رہے ہو؟ کیا واقعی تم مجھ پر آنکھیں نکال رہے ہو؟ مجھے یہ دیکھ کر کتنا افسوس ہو رہا ہے! کیونکہ ببلا جب ٹوٹنے کے قریب آتا ہے، تو آنکھیں مزور نکالنے لگتا ہے، اچھا میاں پولیس کے ببلے! خدا حافظ، کل جب تم ٹوٹ چکے ہوگے، تو میں سمندر کے کنارے آؤں گا، اور بڑی بوڑھی مچھلیوں کے اس قول کی تائید میں قہقہے مارونگا۔ کہ زیادہ گڑبڑ کرنے والے ببلے بہت جلد ٹوٹ جایا کرتے ہیں!!

سلام، اے میاں ببلے، سلام!

جو ہم اہلِ ہمّت کی اولاد ہوں گے

جو ہم اہلِ ہمت کی اولاد ہوں گے ۔۔۔ تو ہمت کریں گے اور آزاد ہوں گے
اُٹھو ہِل کے بندِ ستم توڑ ڈالیں ۔۔۔ کہ ہوں گے تو کوشش سے آزاد ہوں گے
اُٹھو مُلک و ملّت کی عزت بچالیں ۔۔۔ کہ مِل جُل کے دیوارِ فولاد ہوں گے
جو سب فتحیابی کے گُر جان لیں گے ۔۔۔ تو سب فتحیابی سے دلشاد ہوں گے
جو سب باہم امداد کی ٹھان لیں گے ۔۔۔ تو سب بے نیازِ ہر امداد ہوں گے
وہ دَورِ عجیب و غریب آرہا ہے ۔۔۔ کہ سفّاک ہوں گے نہ جلاد ہوں گے
وہ عہدِ ہمایوں قریب آرہا ہے ۔۔۔ کہ فرعون ہوں گے نہ شدّاد ہوں گے
ہم اُس سرزمیں کی طرف جارہے ہیں ۔۔۔ جہاں صید ہوں گے نہ صیّاد ہوں گے
ہم اُس بادشاہی میں در آرہے ہیں ۔۔۔ جہاں کید ہوں گے نہ کیاد ہوں گے

نہ روکو اب آزاد ہم کو نہ روکو:
ہم آزاد ہوں گے ہم آزاد ہوں گے!

[illegible]

غزل گوئی اور پروفیسر فراق!

"نقاد"

بیدل! آں گوہر نایاب سراغ — مجھلے ست کہ پرسیدن نیست
عکس اُفتادہ در آئینہ ہوش — گُل تو اں گفت، دلے چیدن نیست!
نسبہا در بغل وفہم محال! — جلوہا در نظر و دیدن نیست!

"دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کے عنوان سے پروفیسر فراق نے اک مبسوط مقالہ، ماہ مئی کی اشاعت کلیم کے شائع شدہ مضمون —— غزل گوئی —— کے استدراک (Comment) میں نگار کے جولائی نمبر میں تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالے پر نگار کے باب تعارف (ملاحظات) میں مدیر نگار کا اک نوٹ بھی ہے۔ ہرچند کہ ایڈیٹر کی طرف سے اس قسم کے سفارشی نوٹوں کا لکھا جانا، ادبیات و تنقیدات کی عدالت میں توہینِ عدالت سے کم نہیں، اس لئے کہ اس محل اور قبل از وقت مداخلت در معقولات سے اِن قضایا میں اصلی قاضی —— تعلیم یافتہ پبلک —— کی آزاد رائے کو متاثر کرنے کا اک ارتکاب متصور ہو سکتا ہے! تاہم اس بے ضابطگی کی ہم چنداں پروا نہیں کرتے! یہ صرف منصب ادارت کی اک مصلحت ہے، ہماری کوئی غرض نہیں! یہ غیر معمولی طریقے اپنی بزرگوں کے مقدمے کی کمزوری کی غمازی کرتے ہیں! ہمارا کوئی نقصان نہیں کرتے! ہمیں تو بہر حال اپنے اوپر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینا ہے۔ —— یہ اعتراضات ایک منہ سے نکلیں یا ایک سے زیادہ سے! پھر یہ آوازیں الگ الگ گونجتی ہیں، یا ایک دوسرے کی ہمنوا بن کر! تاہم منفردانہ مبارزت" Single D[illegible] ، کی کھلاڑی پن کی اسپرٹ مگر یہ بات منافی ضرور ہے! مزید براں پروفیسر فراق ایم اے، گورکھپوری کی پُشت پر حضرت نیاز فتحپوری کچھ اچھی پُشت پناہی بھی نہیں! ضعف الطالب والمطلوب!

حضرت نیاز چونکہ پروفیسر فراق اور ہمارے بیچ میں کود پڑے ہیں، اِس لئے پہلے ہمیں اُنہی کو دفتر نگار کا راستہ بتانا ہے! تاکہ فریقین جنگ کے درمیان کوئی تیسرا فریق حائل نہ رہے! اس طرح گویا ہمارا "سیمی فائنل" (Semi-final) حضرت نگار سے ہوگا، اور فائنل "شریت رگھوپت سہائے جی" سے! پروفیسر صاحب بالقابہ کو اپنے "دوہرے دوہرے خطوطِ مدافعت" (Double Line of Defence) مبارک ہوں اور ہمیں اپنے تنہا دست و بازو! ؏

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پُشتِ من!

اک مردِ عارف نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "مرید کو مرشد اپنے ظرف کے مطابق ملا کرتا ہے" بس —— ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر فراق کو اک "وکیل" تک کی دستیابی میں اِس سخت گیر معیار سے سابقہ پڑا ہے! اُنکا "قلب لشکر" جتنا کمزور ہے "عقب" کچھ اُس سے زیادہ مستحکم نہیں! نیاز کے سرٹیفکٹ نے فراق کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا ہے جتنا کہ نقصان! ؏

مرا بخیر تو اُمید نیست شر مرساں!

حضرت نیاز، کلیم کے "نقاد" کی ناگزیر گرم نوائی پر فرماتے ہیں:-

"نہ صرف آزاد، بلکہ تمام غزل گو شعراء کا ذکر لب لعل نگر غالب سے کیا گیا ہے!"

شاید آپ بعلِ شکر خا، کو جنا استحقاقِ استعمال، خدا و رسول، جملہ انبیار اور تمامی بزرگانِ دین، ہی کے خلاف ہے، جو حضرت مجتہد العصر نیاز کے سالہا سال تک شخیر شہد باری و شکر خائی، رہ چکے ہیں؟! شعرائے متغزلین سے یہ انتقام گیری تو اُس وقت سے واجب الوصول ہو گئی ہے کہ مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم نے "مُر دجہ و متداول" غزل گوئی کے "آداب بے ادبی" پر مذمت ہو ئی کہا تھا۔

عزیب شیخ پہ ہر دم دو لتیاں جھاڑیں — کریں مساجد و کعبہ سے دُم دبا کے فرار!
جمالِ یوسفی یا نطقِ عیسوی جو ہو — ہیں اُن کی گندہ دہانی کے سامنے سب خوار!
نہ کچھ خدا کا لحاظ اور نہ انبیار کا ادب — یہ اُن کی لوز بھری شاعری خدا کی مار!

نگار کے پیدا کئے ہوئے دفاترِ ادب پر عبور رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس بارۂ خاص میں شعرار کی "لوز بھری شاعری" سے حضرتِ نیاز کے اشعار منثور کچھ کم پُر لوز نہیں رہے ہیں: آج اُن کے اندر اُن کا جذبۂ شیریں کلامی ایسا "ریشۂ خطمی" پیدا کر رہا ہے؟! کیا اُن پر کچھ بلوغ کے آثار رونما ہو رہے ہیں؟! کیا وہ اپنے "ذہنی بچپنے" کی ساری گالیاں بھول گئے؟! کیا "جنّ" سورۂ جنّ کی تلاوت کے لئے لب کُشا ہونا چاہتا ہے؟! ؎

آنچہ می بینم، بہ بیداری ست یا رب یا بخواب؟!

کلیم کے مرکزِ بحث مضمون ـــــ "غزل گوئی" ـــــ کے متعلق جناب نیاز فرماتے ہیں:۔

"آخر کار فراق اِس کے لئے طیار ہو گئے کہ وہ اِس کا جواب لکھیں"

"آخر کار" کا لفظ کِتنا معنی خیز اور غماز واقع ہوا ہے! گویا بڑے بڑے عزم اور فسخِ عزم، ہمت اور شکستِ ہمت، پیشقدمی و پسپائی، تذبذب و تردُّد کے مراحل پیش آئے! اور پھر بمصداق "نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد" وہ آخر کار اِس کے لئے طیار ہوگئے!" ؏

پسینا پونچھئے اپنی جبیں سے!

آگے سُنئے:۔

"پھر اگر یہ جواب صرف اُسی طرح کی "دُشنام طرازی" پر مشتمل ہوتا جو نقاد کے مقالے کی اصلی "بیک گراؤنڈ" ہے تو شاید میں اُسے شائع نہ کرتا"

اِس جملے میں "شاید" کی معنویت کو دیکھئے! گویا یہ امر "مشتبہ" ہوتا کہ آیا اک "دشنام نامہ" صفحاتِ نگار کی "زینت" بن سکتا ہے یا نہیں؟! [illegible] اگر اُس کا "قبول" یقینی نہ تھا تو "رد" بھی قطعی نہ تھا! بالفاظِ دیگر "ہجائی نامے" بھی نگار میں امکاناً شائع کئے جا سکتے ہیں! فیصلہ کُن عنصر یہاں زیرِ بحث مسودہ کا "دُشنام" یا "شریفانہ کلام" نہیں ہوا کرتا، بلکہ کسی "ہمارے عزیز دوست" کی خدمت یا کسی مبغوض "دشمنِ دیرینہ" کی عداوت ہے! ـــــ نازم بریں جوہر شناسی "انتقاداتِ عالیہ"!! ؎

تا غزّ من قبح شدہ نقش نگیں تُرا
دارند اہلِ فقر ز دستِ تو صد بُزغ!

بالآخر جنابِ نیاز عزم بالجزم کر لیتے ہیں کہ:۔

"میں اُسے شائع کرتا ہوں، اور تمام اپنی جذباتِ تشکر و امتنان کے ساتھ جو بصورتِ "خراج" مجھے جنابِ فراق کی خدمت میں پیش کرنا چاہیئے!"

گویا یہ اک "حسابِ دوستان در دل" کا معاملہ تھا! ـــــ یعنی "میں اپنا رسالے کا "اسٹیج" تم کو اُدھار دیتا ہوں، تم اپنا نزلۂ ادب میرے سامنے نہ کرو!" ـــــ یعنی "تو مرا "رئیس التحریر" بگو، و من ہفوات ترا "انتقاداتِ عالیہ" می گویم!"

اب اک بات ضمناً، لیکن حقیقتہً جانِ سُخن، نیاز صاحب فرماتے ہیں۔

"فراق کی غزل گوئی پر میں جون کے رسالے میں اک سرسری نگاہ ڈال چکا ہوں جس سے قارئینِ نگار کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ذوق کے لحاظ سے اُن کی شاعری میں کتنی پاکیزگیاں پائی جاتی ہیں!"

"اک سرسری نگاہ" اور قارئین کو پورا "اندازہ" ہو جانے کا "شرحِ صدر" ـــــ گویا آنجناب کی "نیم نگاہی" کے "مَسِ پارس" کا وہ اعجازِ انقلاب ہے جس کی التجا بھولے فراق کی نیازمندی یوں کیا کرتی ہے کہ ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند؟!

حضرتِ نیاز اب حُدودِ ارض کو بالکل چھوڑ کر طبقاتِ سماوی کے عازم ہوتے ہیں! اُن کی پیغمبرانہ پرواز دیکھئے:۔

"اک بلند معیار کے نقد و تبصرہ کے لئے ذہن میں [illegible] (Equilibrium) کو چاہتا [illegible]

بیت تخیل واقع ہوا ہے؟"

بے شک جس طرح کہ فلسفہ طرازی اور رُطب اللسانی کی زبان کے کمالات کے اظہار کا نے ہیں آنجناب بہت مشرف واقع ہوئے ہیں! ——— اللہ اللہ آہا حضرت نیاز کے قلم حکمت رقم کی ایک جنبش سے "اِقتصادِ فطرت" کا ناموس اعظم ("Economy of Nature") کتنی آسانی سے متزلزل بلکہ باطل ہو گیا! ——— آہ، فطرت کے مبدءٔ فیاض کی تنگی، اور اعلیٰحضرت نیاز بے نیاز کی دریا دلی جس سے کسب فیض کر کے الوہیت کا معیار اپنی تکمیل نہیں کرتا:۔ ؎

رب العزت کے لئے بھی کوئی رہنے دو خطاب!
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی!

خدا جانے یہ جوہر "توازن و تعادل" جناب نیاز کے کاسۂ سر کو بخشنے میں بھی فطرت نے کسی سیر چشمی کا ثبوت دیا یا نہیں؟ اُن کا دماغ مبالغۂ غلو کی جس رستخیز کی جولانگاہ نظر آتا ہے اُس سے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ فطرت یہاں "بخیل ترین" ثابت ہوئی ہے!

ہاں اسی ترنگ میں اور سُنئے:۔

"معلوم نہیں کتنے ہزار ذہین دماغ پیدا کرنے کے بعد انتہائی پس و پیش کے ساتھ، وہ کسی ایک کا انتخاب اس ودیعت کے لئے کیا کرتی ہے!"

لیجئے، یک نشد دو شد! ابھی تک تو فطرت بخیل ہی تھی، اب اُسے ضعفِ ارادہ اور تلون مزاجی کا مرض بھی عارض حال ہو گیا! غالباً یہاں بھی عالی جناب نیاز کو اپنے ضرب المثل تاریخی آہنی استقلال اور کوہ تمکینی سے کارفرمائے کائنات کی دستگیری کرنی پڑے گی"! ——— واللہ یہ بھی عالم کی کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اُس کے (نعوذ باللہ منہا) ناقص خالق اور مذبذب رب کی تکمیل و تکملہ کے لئے اک نیاز کیش، بلکہ مجسم "نیاز" بندہ موجود ہے، اور بوقتِ ضرورت کام آ سکتا ہے! ؏

مارا ازین گیاہِ ضعیف این گمان نبود!

اور ترتیب کا بند:۔

"مجھے یہ ظاہر کرنے میں قطعاً تامل نہ کرنا چاہیئے کہ اس وقت فراق ہی تنہا ان چند لوگوں میں سے ہیں جو قدرت کے اس عطیے پر فرقی کی زبان میں ناز کر سکتے ہیں۔

در آں دیار بہ سودا رود دلم کہ دہند
جوئے طلال بصبر ابد بہ بسیاری!"

حضرت نیاز کے یہ مشاہدات و مکاشفات شاید اُس وقت خاص سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی شانِ نزول یہ ہے کہ "لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل"! ——— ہاں اک ایسے ہی وقت و ساعت میں جناب "فراق" کو بھی "وصال" الٰہی نصیب تھا، اور جناب نیاز تو "فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر" ہی کے "مقام محمود" پر فائز تھے! ہاں اللہ میاں بدستور کچھ راضی کچھ نیم راضی تھے؛ تاہم انتہائی پس و پیش کے بعد پروفیسر فراق کا انتخاب اِس ودیعت (توازن و تعادلِ ذہن) کے لئے آخر کار ہو گیا! ——— اور اگرچہ یہ از اوّل تا آخر "حدیثِ معراج" ہی ہے، جس کے شاہد بلا شرکت غیرے حضرت نیاز ہی ہیں! لیکن وہ ازراہِ ذرہ نوازی، اہلِ عالم کی مخلوقِ سفلی کو "اپنے اعتماد میں لیتے ہیں"! اور بلا کسی تامل کے قطعاً اُس حقیقتِ حقہ کا اعلان فرماتے ہیں کہ جناب فراق کے فرقِ مبارک پر "تعادل و توازن و تعادل" کا تاجِ زریں رکھ دیا گیا! اور ؏

حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند!!

بہر حال اب عرفی کا (منقولۂ بالا) شعر پڑھنے کے لئے جناب فراق صاحب، سالکِ باخبر حضرت نیاز کی طرف سے "صاحبِ اجازت" بنائے جاتے ہیں! ——— اگرچہ بدبخت عرفی اپنی قبر میں پیچ و تاب کھا رہا ہوگا کہ اُس کے شعر کی یوں مٹی پلید کی جا رہی ہے! ——— آہ، شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد؟! ؏ تحریر و مُدیرانِ مسئول و اربابِ انتقاداتِ عالیہ

مدارِ روزگارِ سفلہ پرور را تماشا کن!

فضیلت مآب جناب نیاز کے چند اور حیرت بار انکشافات ملاحظہ فرمائیے:۔

"آپ یہ سُن کر غالباً حیرت کریں گے کہ انتقادی ذوق، شعر گوئی سے بالکل علیحدہ چیز ہے!"

جی ہاں، آنجناب کے تو سارے ملفوظات ماشاء اللہ چشم بد دور، ایسے ہی حقائق نادرہ و نکات عجیبہ ہوا کرتے ہیں، جنہیں سنکر آپ کے مخاطبین و سامعین "غالباً حیرت" کریں؛ دوسروں کو حیرت ہو یا نہ ہو آپ کو اپنے "خوارق العادۃ کمالات" پر حیرت ہونا لازمی ہے! اللہ اللہ اس کمال کا بھی

کچھ ٹھکانا ہے جو خود "حاملِ کمال" کو حیرت زدہ کردے!؟ ——— خیر مالیجا!!
ہم آپ کے "محیر ت بلیاقت اور آنجناب کے خرقِ عادات انکشافات پر غالباً غیر
زدہ ہوں "یا" غالباً غیر حیرت زدہ" ہم مانے لیتے ہیں کہ ہم آپ کے اِس ہیبت
ملاہرۂ دانش فروشی پر منزور بالعزور مبہوت ہو گئے! ط

گر تو خوش باش کہ ما گوش بہ احمق نہ بہیم!

مناسب یہ ہوگا کہ نگار صاحب جب کچھ "نگارش" فرمایا کریں تو حیرت
زدہ ہونے "یا حیرت زدہ نہ ہونے کا معاملہ قارئین ہی پر چھوڑ دیا کریں! یہ کچھ
اچھے آدابِ مجلس نہیں کہ راستے میں کسی شریف ہمچشم سے دوچار ہونے پر، بجائے
السلام علیکم کے آپ "وعلیکم السلام" کہہ اُٹھیں! اور اس طرح سلسلۂ سخن جاری
فرما دیں کہ "اجی بندہ کس لائق ہے! یہ سب آنجناب کی جوہر شناسی اور
قدردانی ہے!" وغیرہ وغیرہ! ——— "اپنی عزت آپ کرو" والے اخلاقی
اصول کا یہ بُرا استعمال ہے! ط

خودستائی عیب ہے لے خودستا!

اور ہاں وہ "مظہر العجائب" حقیقت کیا ہے؟ نیاز صاحب سے سُنئے!
"ایک بہترین شاعر بھی اِس کا مُدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ اچھا "نقاد" ہے!
اور غالباً اِس وجہ سے کہ اِس وصف کا "داخل خارج اور رجسٹری
قبل ازیں اک "بہترین نثار" کے نام ہو گئی ہے!

بلاشبہ یہ بیان اک مجسم بوالعجبی چیز ہے کہ "ایک بہترین شاعر بھی
.... نقاد ہے!" ——— نامور و بے بدل نقاد "آسکر وائلڈ"
نے عین اسی مسئلے کو بار بار چھیڑا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اک اچھا آرٹسٹ اور
اک اچھا نقاد لازم و ملزوم، ہم معنیٰ، بلکہ ایک ہی واحد شے کے دو نام ہیں!
ناممکن ہے کہ ایک ہو اور دوسرا نہ ہو، یا بالعکس! حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ
اک صناع، عین اپنے عملِ صنعت کے دوران میں، اپنے ذہن کے اندر اک
داخلی عمل نقد انجام دیتا جاتا ہے! اچھا آرٹ خود نقد ہی کا مولودِ صلبی ہے!
فن اور انتقاد شانہ بشانہ چلتے ہیں! .... نقاد اپنی صدی کی
"بہترین تصنیف" ہوتا ہے!!"

"انتقاداتِ عالیہ" کے لئے خدائے بخشندہ کی بخشیدہ "کمیاب ترین
ودیعت" سے بہرہ یاب ارباب کی "از راہِ کرم" نظر سے خوش گذرنے!؟
آسکر وائلڈ کا تو خیر یہ محبوب موضوع ہے، لیکن یہ حقیقت اتنی
عام ہی کہ تعجب ہوتا ہے "فن کاری" سے علمی شغل رکھنے والے اِس سے ناآشنا
ہوں! ہمارے اُردو ہندوستان کے کرم خوردہ "قدیم غزل گو" یہاں تک
"اُستاد" اِس نکتے سے محرم ہونے کا ثبوت دیتا ہے جب کہ وہ کہتا ہے
کہ ؎

بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر؛
ہُنروَر اپنے ہی عیب و ہُنر کو دیکھتے ہیں!

فارسی ادب میں اس "نقد آشنائی" کی زیادہ معنی خیز مثالیں ملیں گی
یہاں آپ دیکھیں گے کہ بدترین حریفانہ کاوش کرنے والے رقیبوں کے برخود
غلط اعتراف و تسلیم کے بعد بھی اک حقیقی "ناقدِ خویش" سخنور اپنے کو مطمئن
نہیں پاتا! وہ گویا "ادبی احتسابِ نفس" کے ذرۂ ضمیر سے پیچ و تاب کھا
رہا ہے! ؎

رُستم ز مُدعی "بقبولِ غلط"، ولے
می تابم از شکنجۂ طبعِ سلیمِ خویش!"

Favourable Critique

"مُدعی" کے مقابلے میں "دوستدار" (
کی طرف سے "قبولِ غلط" کے قدرۃً زیادہ موقعے ہوا کرتے ہیں! ———
خاص کر ایسے "پیشہ ور ناقدینِ عظام" کے سلسلے میں جن کے ہاں علمی دوستی
یا علمی دشمنی کا "مغزائے جلی ہے" "انتقاداتِ عالیہ کا سلیقہ"! ط

تفو! بر تو اے چرخِ گرداں، تفو!!

ہمیں فراق صاحب سے اُمید نہیں کہ وہ اِس شعر کے پڑھنے کی اخلاقی
جُرأت بہم پہنچا سکیں گے کہ ؎

رُستم زِ دوستے "بقبولِ غلط"، ولے
می تابم از شکنجۂ طبعِ سلیمِ خویش!

لیکن پھر ہم اُنھیں چیلنج کریں گے کہ ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہرِ خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیقِ خرے چند!

کاش ہم پروفیسر فراق کو سمجھا سکتے کہ اک ایسے "دوست کی تعریف"
جو اپنے پرواجب الاداء خراج "انکار، جوابی، مثلاً، سطر یہ یا کے معاوضہ
میں اپنے "نقد و انتقاد" کو گروی کر چکا ہو، حقیقتہً کتنی مذمت سے کم ہم
معنی ہے! ؎

جواب: دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسینِ ناشناس، و سکوتِ سخن شناس!

"بہلا نیاز صاحب کو اپنا "شاہکار" قلم پھر چھوڑنے دیجئے! وہ فرماتے ہیں:۔
"میر کو دُنیا خدائے سخن مانتی ہے، لیکن جب یہ خدائے سخن خود اپنے کلام کا انتخاب کرتا ہے تو وہ پیغمبری کے درجے سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے! اور خود اُسے مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس کے بہترین اشعار کون سے ہیں!"

سب سے پہلے تو "نیاز بے نیاز" کو یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ جس شاعر کو "دنیا خدائے سخن مانتی ہے" اُس کی خدائی سخن پر اُن کے لئے ایمان لانا ممکن بھی ہے؟! "نیاز ناز آفرین" دنیا کے اور کون سے خدا کے قائل ہوئے ہیں کہ "دنیا کے خدائے سخن" کے سامنے سرِ عبودیت جھکائیں گے؟! اُن کا نعرہ، پروفیسر فراق وغیرہم ایسے "مومنین اولین" کی صفِ نماز کے سامنے، تو یہی ہوا کرتا ہے کہ:۔

"اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى!"

جب حال یہ ہے کہ "بالائے کبریائی اُلوہیت" ذاتِ نیاز "ساری دنیا کے خالق و مالک خدا" ہی کو کبھی خاطر میں نہ لائی تو بھلا اک ایسا "تھرڈ کلاس عبدِ ذلیل" اُن کی آنکھ میں کیا جچ سکتا ہے جو پیغمبری کے درجے سے بھی گرا نظر آتا ہو!ـــــ یاروا کچھ حد ہے اِس پستی و پسماندگی کہ کہ انسان پیغمبری سے بھی "بالا" نہو!

ہمارا خیال ہے کہ یہ بات چنداں عجیب نہیں کہ "خدائے سخن میر کو اپنے بہترین اشعار معلوم نہیں" جبکہ ماورائے اُلوہیت نیاز کو خبر نہیں کہ اُن کی نخوت و رعونت کے "سیاہکار ترین شاہکار" کون سے ہیں؟! ؎

اِتنی نہ بڑھا پاکیٔ دامن کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ!

اسرار کی مزید و مسلسل بارش کا اک اور قطرۂ نیساں (دُرِ مکنونِ صدفِ حقیقت) ملاحظہ فرمائیے! حضرت نیاز فرماتے ہیں:۔

"یہ راز میرے سوا شاید کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اُن (فراق) کا ذوقِ تغزل "نازی" چیز ہے، اور یہی چیز جو قدرت نے اُن کو عطا کی ہے، وہ غیر معمولی مسلک و اعتقاد ہے!"

ہمارا خیال ہے کہ راز بھی ہمیشہ ایسے "راز ہائے سربستہ" نہیں ہوا کرتے، اور دوسرے لوگوں کو بھی کم و بیش معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ "از دو سازند محفلہا"! چنانچہ خود جناب نیاز کا یہ جزوی اعتراف یہاں موجود ہے کہ کم از کم "چند لوگ" اِس راز سے واقف تھے! تاہم ایسے "اسرار" پر وقوف پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں جو بجائے "اسرار" کے "توہمات" واقع ہوسکے ہوں! یہاں "محرم رازی" کے بجائے "خود فریبی" کی ضرورت ہوگی! اگر حضرت نیاز کے علاوہ کم لوگ اِس "خود ساختہ واہمے" کا شکار ہوئے تو ہمارے وطن کی تعلیم یافتہ پبلک کی عقلی زندگی کے لئے یہ اک فالِ نیک ہے! اگر یہ متعدی مرض قطعاً نیاز تک محدود رہتا تو ہمارے "شہر علم و ہنر" کے اندر بہتر صفائی و پاکیزگی (Sanitation) کی علامت ہوتی! کسی پر کیا مصیبت پڑی ہے کہ عریاں رُسوائیوں کی جگہ "مقدس اسرار سربستہ" کے "شیخ چلی" کے سے خواب دیکھے، اور پھر خود ہی "صاحب الاسرار" بنجائے؟! "جنتِ ابلہاں" کی تعمیر بھی بعض اوقات کیسی "خوش طرح" ہوا کرتی ہے! حضرت نیاز و جناب فراق کے باہمی راز و نیاز "من ترا ناقد بگویم تو مرا فاضل بگو" پر ہم اِن بزرگانِ "گرفتار کید گر" کو کس طرح متنبہ کریں کہ علم و اعتقاد صحیح و صالح کے مستقبلِ قریب کی صبحِ سعادت میں اُن کے "حجاب اکبر" کیسے چاک ہوں گے! ؎

بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شبِ دیجور!

علامہ نیاز کے علم کا پٹارا پھر کھلتا ہے۔ فرماتے ہیں (اور اپنی ازلی شانِ ہمہ دانی و "علّامُ الغیوبی" کے ساتھ!)

"مجھے فراق کی اِس خصوصیت کا علم آج نہیں، بہت عرصے سے تھا، اُسی وقت سے جب اول اول میں اُن سے یہاں لکھنؤ میں ملا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اُن کے اِس ذوق کا کسی نہ کسی دن پختہ ہوکر ظاہر ہوجانا لازم ہے، اور آخر کار آبگینے کو "تندیٔ صہبا" سے پگھل جانا پڑا"!

کیوں نہ ہو! ؎

دُور بینانِ ازل، کوریٔ چشمِ بدبیں!
ہم در اینجا نگرند آنچہ در آنجا بینند!

تاہم یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ "سیلانِ صہبا" نتیجہ ہوا "تندیٔ صہبا" کا یا "آبگینیتِ مینا" کا؟!ــــــ یعنی یہ "لطافتِ لسانی" تھی یا "دریدہ دہنی"؟!

... اپنے "فانی عشق" کی تحریک، بازار مصر میں لے آئی، یا "چاہ کنعان" کے کسی یوسف کے "حسن مہ و تر افزوں" کی مسلسل تازیانہ زنی اُس کے "پردۂ عصمت" کی دریدگی کی علتِ اصلی تھی؟!

ہمارا خیال ہے کہ اگر "شُدنیٔ صہبا" کافی "شُدنی" نہ بھی ہوتی تب بھی "آبگینے" کو "گُداختہ" ہو جانا پڑتا، محض اِس وجہ مُوجہ سے کہ جناب نیاز کی "مُخبری صادق" ایسا ہی چاہتی تھی! ہمیں ایک بزرگ اِس وقت بُری طرح یاد آ رہے ہیں، جو مرحوم حکیم اجمل خاں صاحب کے "دربارِ مطب" میں بیٹھا کرتے تھے، اور "مسیح الملک" کے "خواہ مخواہ طبی مُشیر" بنے رہتے تھے! مریضوں کے امراض کی تشخیص وہ ماشاء اللہ حکیم صاحب سے بھی دو قدم پہلے فرما دیا کرتے تھے! لیکن اُن کی تحقیقِ طبی کا خاص گوشہ مریض کے گزشتہ اعمالنامے کی "پیغمبرانہ قرأت" ہوتی تھی! ایک دن کا ذکر ہے کہ اک شریف صورت و ثقہ سیرت مریض، حکیم صاحب سے دوچار ہوئے۔ حکیم صاحب کے اپنی "نفسِ ناطقہ" نے حسبِ معمول اِس غریب کے بھی بے تحاشا بخیئے اُدھیڑنے شروع کر دئے، چنانچہ اب ایک "رازِ فاش" یہ بھی تھا کہ "آپ کو آتشک بھی ہوئی ہے!" غریب حواس باختہ مریض نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ "حضرت! میں آتشک کو جانتا تک نہیں! یہ بیماری مجھے نہ کبھی ہوئی ہے نہ اِس وقت ہے!" ــــ مجسمۂ اعتماد علی النفس "مشیر طبی" نے چھوٹتے ہی کہا: "اچھا اب ہو جائیگی!!" ــــ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم!

اب کچھ "السنۂ مشرقیہ" کے متعلق "اجتہاداتِ عالیہ و تصرفاتِ غالیہ" سے شادکام ہو جئے! نیاز صاحب گلفشاں ہوتے ہیں:-

"اِس سے انکار ممکن نہیں کہ اِس فرض (بہ جہت تنقید و تنقیحِ غزل گوئی!) سے عہدہ برآ ہونے میں اُنھوں (فراق) نے "وسعت و گہرائی" (دادین ہمارے ہیں! ــ "نقاد") کی کسی حد کو مَس کئے بغیر نہ چھوڑا!"

ہم کہتے ہیں کہ "اِس سے بھی انکار ممکن نہیں" کہ علامہ نیاز نے اِن منقولہ بالا سطور کے اک خاص موقعے پر زبان و ادب کی لمبائی چوڑائی اور گہرائی کی کسی حد کو مس کئے بغیر نہ چھوڑا! ــــ وہ قطعاً مختلف اللسان الفاظ ــــ "وسعت، گہرائی" ــــ کو اِس طرح اک واحد ترکیب (وسعت و گہرائی) میں عربی و فارسی حرفِ عطفِ تفسیری ــــ "و" ــــ سے

ہر رشتہ کرنا، اور ملبیا کر کے "اِن" قواعدِ زبان کے لحاظ یا عدم لحاظ کی "مکمل تکمیل" کا ثبوت دینا، کیا یہ ایسی عظیم "زبان دانی، شعر فہمی و سخن سنجی" کا بیّن قابلِ قدر "مظاہرہ" ہے جس کے سامنے مخالفانہ سخن تیز پیغمبری کے دعوے بھی گرد نظر آتا ہے!! ــ

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی!!

پروفیسر فراق اور جناب نیاز کی بعض دوسری ترکیبیں ــــ مثلاً "معرکتہ الآرا" وغیرہ! ــــ بھی بہت معرکہ آرا واقع ہوئی ہیں!

(۴)

فراق کے مقالۂ "انتقاداتِ عالیہ" کے جواب بحیثیت ناقد کے ساتھ اِس قدر لفتیانہ شور و شورش کے بعد اب جناب نیاز اصلی بحث کے میدان میں اُترتے ہیں، اور غالباً صحیح سمت مطالعہ اختیار کر کے متعارف "نظم" اردو کی حقیقی نوعیت متعین کرنے کے لئے اُس کے تاریخی ظہور و بروز کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ "نظم کی ابتدا کا زمانہ اردو شاعری میں اُس وقت سے ہوتا ہے کہ جب مُلک انتہائی ذلت و نکبت کے دور سے گزر رہا تھا! ------- گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ نظم نگاری کی بُنیاد کا سبب احساس کی وہ ضرب کاری تھی جس نے دفعتہً اربابِ وطن کو ایک جگہ ٹھہر کر سوچنے، اور زندگی کے ہر شعبے میں عمل کی نئی راہیں ڈھونڈنے پر مجبور کر دیا! اِنہی سوچنے والوں میں ایک جماعت شعرا کی بھی تھی! .... بجائے غزلوں کے قومی نظموں کی طرف عام توجہ پیدا ہو گئی! اسی سلسلے میں آہستہ آہستہ محاکاتی، جذباتی، اور غنائی نظمیں بھی لکھی جانے لگیں!"

یہ حرف بحرف صحیح، تاریخی تبصرہ "نظم" کی پیدائش، حالاتِ پیدائش، محرکاتِ پیدائش، اور اِس ادبی مولود کے عناصر مزاجی کا ہے! تاہم حضرت نیاز سے ہمیں اک سنگین فروگزاشت کی شکایت ہے! وہ صرف "نیم صداقت" ("Half - truth") پر قانع رہے! اِس کے ساتھ ضمناً وہ "غزل" (ما سکوت اول غزل [illegible]) ... و ہوا، موسم و فصل، تخم و بیخ، گل و ثمر وغیرہ کا بھی [illegible] اِتنی ہی آسانی ہے کہ اگر

آفتابِ اندیشہ مندی بجائے وسیاب!

"نظم" اگر "غزل" کا تذبذب تھی اور اس انقلابِ متبلی کا ثمرِ شیریں تھی جس نے اہلِ وطن کے دماغ و نفس کی سرزمین میں احساسِ ذلت و نکبت، بیداریِ فکر و تدبر، اک ضربِ کاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی روح و قلب کی شکستگی، کا تخمِ حیات بو دیا تھا، تو کیا اسی کا نتیجۂ صریح یہ حقیقت بھی نہ تھی کہ ہماری قدیم شاعری تمام و کمال موجودہ دور دیدہ "غزل" اُس شجرۂ خبیثہ کا ثمرِ زقوم تھی، جو زوال و انحطاط، سلبِ حکومت و حریت، نشو و نمائے جہل و ظلمت، پروریشِ جمود و ہلاکت، طوفانِ غلط کاری و زشت عملی، دونِ ہمتی و پستیِ فطرتی، بحرانِ یاس و حرمان، تمام و کمال غلبۂ حسرت، بلکہ احاطۂ قنوطیت، مفقودانِ احساس و غیابِ غیرت وغیرہ وغیرہ کے رگ و ریشہ سے اپنا معجونِ تنہ و بیخ بنا چکا تھا!؟ ——— سبحان اللہ! آفتابِ عظیم کی صبحِ سعادت!

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند ... واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند!
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے ... آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند!
من اگر کامروا گشتم و خوشدل چہ عجب ... مستحق بودم و اینہا بہ زکاتم دادند!
بعد ازیں روئے من و آئینۂ حسنِ نگار ... کہ در آنجا خبر از جلوۂ ذاتم دادند!
شکرِ شکر بشکرانہ بیفشاں اے دل! ... کہ نگارِ خوش و شیریں حرکاتم دادند!
ایں ہمہ قند و شکر کز سخنم میریزد ... اجرِ صبریست کزاں شاخِ نباتم دادند!
بحیاتِ ابد آں روز رسانید مرا ... خطِ آزادگی از حسن بساتم دادند!

ہمتِ حافظ و انفاسِ سحر خیزاں بود
کہ ز بندِ غمِ ایام نجاتم دادند!

بلاشبہ یہ نوزائیدہ اُردو نظم کا شادیانۂ ولادت بنایا جا سکتا ہے!

"غزلِ مرحوم" کے انفاسِ آخریں میں کہے ہوئے کلماتِ مشئوم اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو قدیم تاریخ کے "امام باڑے" اور "عاشور خانے" کے در و دیوار اب بھی اُس کے ریکارڈوں سے گونجتے ہیں! مثلاً:۔

ساقیا برخیز و در ده جام را ... خاک بر سر کن غمِ ایام را!
چہ زنم دمِ عشق و ہوسِ عیش و وصالِ چہ ... تا خلف باشم اگر من بجوے نفروشم!
آسمان بارِ امانت نتوانست کشید ... قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند!
خوش ولایتی داغ نہ زد ... آہ گر گشت ہجر کدام است وصل چیست؟

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں ... ما نمی خواہیم ننگ و نام را!
صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا! ... ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند ... گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش!
بزار قصرِ تو بنیاد و محکمی دارد ... ولے چہ سود؟ کہ بنیادِ عمر محکم نیست!
تو شبانہ می نمائی، بہ برِ کہ بودی امشب ... کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد!
تو بخوابِ ناز بودی و من از رقیب پنہاں ... کفِ پات بوسہ دادم، ز حنا شنیدہ باشی!

یہ مثالیں فارسی غزل کی ہیں، اور اس کے متعدد ابیاتِ حافظ سے بھی ماخوذ ہیں، لیکن حافظ کی زبان سے اک روح پرور زمزمہ سننے کے بعد معلوم ہوا کہ یہی اہنی کے دل و دماغ پر جب "بوم غزل" بسیرا لینے لگتا ہے تو اُنہی کے ساز سے کیسا آہنگِ مرگ نکلنے لگتا ہے! اُردو میں ان منقولات کے بالمقابل بیشمار حوالجات مل سکتے ہیں! اگر ضرورت ہو تو مشتے نمونہ از خروارے "سُن لیجئے":

ہم اک جو یہ سارا جہاں بیچتے ہیں!

جو بار آسماں و زمیں سے نہ اُٹھ سکا! ... تو نے بُرا کیا دلِ ناداں اُٹھا لیا!
کسی پرمٹ کے ریجانا ہے حسرت: ... ہمیں کیا کام عمرِ جاوداں سے؟!
کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے! ... میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں!
پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ... پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے!
ہم فقیر اپنی فقیری میں شب و روز ہیں مست ... تجھ کو اے شاہ مبارک رہے شاہی تیری!

چھپر کھٹ کے عوض لازم جنازے کا بنانا ہے!

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو ... دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے!
لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی ... تو مجھے آزمائیگا کب تک؟!

آخری شعر کے بارے میں پروفیسر فراق کو یہ شکایت ہے کہ حضرت جوش اسے بے غیرتی کی مثال بتاتے ہیں! ——— بلاشبہ جوش صاحب کی یہ بڑی زیادتی ہے! ابھی اس شعر کا موضوع محبوب تو عشق کی وہ حُرمت و حمیت ہے جس کا بیان اب بھی تشنہ رہ گیا ہے! اور جس کی پوری معراجِ ارتقا اُس وقت حاصل ہوتی کہ مومن خاں مرحوم اس شعر میں تصرف کر کے یوں لکھتا کہ ؎

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی
اور "شبِ قدر" اُسے بھی مانی!!

"ذوقِ فرقت کے اربابِ حال ہیں" رقیب روسیہ "کی بخشی ہوئی اِن تیرہ بختیوں کے لذت آشنا ہیں! ؎

پنہاں صفرِ ابرو تو غزل ما کے صبا، زنجیرِ پاست!!

یہ نہ سمجھئے گا کہ مومن کے عہد کی یہ "غیر تسندیاں" اب "قبرِ ماضی" میں دفن ہو چکی ہیں! نہیں یہ عفریت آج بھی اپنے "سینگ" دکھایا کرتا ہے! حسرت، جو پروفیسر فراق کے "انتقاداتِ عالیہ" کی روسے دورِ حاضر کے کامل و اکمل شاعر بے بدل ہیں، اور جن کا "اسٹائل" اساتذۂ اردو کے صدیوں اور قرنوں کے اسالیبِ بیان کو کوٹ کر بنایا گیا ہے (ملاحظہ فرمائیے مقالۂ پروفیسر صاحب موصوف، ص۳۵، نگار، جولائی) آج بھی "طفیلِ غزل" کو لہو کے بیل کے چکر کے اُسی نقطے پر ہیں، جس کی نشاندہی مومن کا مذکورۂ بالا شعر کرتا ہے! چنانچہ فرماتے ہیں:۔

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں، وہ شب کو ہم سے
رسم پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے!
حیرتِ حُسن نے مجبور کیا ہے حسرت
وصلِ جاناں کی یونہی رات چلی جاتی ہے!

غالباً:۔

رسمِ اُسلاف نے مجبور کیا ہے ایسا وہ "ہزل" آج بھی دن رات چلی جاتی ہے!

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ راسخ الاعتقاد غزل کا قدیم ڈھانچا ہی کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اُسمیں بے اختیار "دَنائت و خودکشی" حلول کر جاتی ہے! مولینا محمد علی جوہر ایسے شیر نرّاں کو دیکھئے کہ "غزل" کی "بانسری" میں اُنکا صورِ رجز کیسا پست آہنگ ہو جاتا ہے! ؎

جو صحبتِ اغیار میں اس درجہ ہو بیباک اُس شوخ کی سب حرم و حیا میرے لئے ہے!

اِس شعر کو اِسی غزل کے دوسرے اِس شعر سے کیا مناسبت ہے!

یہ حورِ بہشتی کی طرف سے ہے بُلاوا لبیک کہ مقتل کا صلہ میرے لئے ہے!!

دوسرا شعر "نظم" والے نشاۃِ ثانیہ کے "دَور" کی نوائے حیات ہے، اور پہلا "غزل کے عہدِ پارینہ" کا سخت جان ورثہ!

جنابِ نیاز چاہیں تو "عہدِ جدید" کے اُس "ذخیرۂ غزلیات" کی حقیقت معلوم کر لے سکتے ہیں جو عہدِ نَو کے دفترِ منظومات سے مقدار میں "بدرجہا زیادہ" واقع ہوا ہے! ——— مقدار کی اِس زیادتی سے کسی کو انکار نہیں، لیکن عہدِ نَو کے اندر کسی چیز کے بکثرت ہو سکنے سے وہ عہدِ نَو کی [illegible] نہیں ہو سکتی! کتنے بکثرت خس و خاشاک ہیں جو موسم پروش پاتے ہیں، لیکن وہ فصل کی روئیدگی نہیں ہوا کرتے! آپ نے دیکھا ہوگا کہ [illegible] کے کھیت [illegible] کے اندر اُس کی جڑوں سے کچھ نَر دارتم کے بگّے نکلتے ہیں، جنھیں کسان "پیڑی" کہا کرتے ہیں۔ مگر نہ یہ باضابطہ "فصلِ نیشکر" کہلاتی ہے نہ عموماً قند سیاہ کے بنانے کے کام آتی ہے! بجائے انسانوں کے استعمال [illegible] وہ مویشیوں کے چارے کے مصرف میں آتی ہے، یا کبھی یونہی اُکھاڑ کر پھینک دی جاتی ہے! ——— کَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ! ——— غزل کا جو گیا ہستان "اب اُردو" کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد اب بھی خود رو پیدا ہو رہا ہے، وہ ہماری "نو بہار شعر و انشا" کا کاشت کردہ "چمنستان" نہیں! ——— بس وہی مُردہ ماضی کی بخت میروراثت! ——— تاہم "اک خاص نفسیاتی نکتہ" ہر نشو و نمائے لطیف کے متعلق ارزانی فرمانے والے فضلا و حکما اِن باتوں کو نہیں جانتے!

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پُرس!
کیں حال نیست صوفیٔ عالیمقام را!!

اور یہی ناقابلِ رشک حقیقت اُن "حیرت انگیز انقلابات" کی ہے جو پروفیسر فراق کو اپنی مور خانہ عینک سے نظر آتے ہیں، اور جو مملکتِ اردو کی ساری قلمرو میں برپا ہو چکے ہیں! مولینا حالی نے سیفِ غزل کے تازہ ترین خلعت ہی کی "جدت" نیز "گندگی" کے متعلق یہ فرمایا تھا۔

خلعت اُن کے جو یاں کہ جادو بیاں ہیں بلاغت میں مقبولِ پیر و جواں ہیں،
فصاحت میں مشہورِ ہندوستاں ہیں وہ کچھ ہیں تو لے دے کے اس کی یہاں ہیں

کہ جب شعر میں عمر ساری کھپائیں
تو "بھانڈ" اُن کی غزلیں مجالس میں گائیں!

پھر جس طرح سال خوردہ "پیرزالِ غزل" کا اعادۂ شباب ہونا اب ناممکن ہے، اسی طرح "نوعروسِ غزالہ نظم" اب تخیل کی ساری بینائیوں، نیز تغزل کی بھی ساری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ آرا ہو گئی ہے! خود جناب نیاز کا اعتراف ہے کہ "قومی نظموں" کے عام فروغ کے ساتھ، "آہستہ آہستہ [illegible] جذباتی، اور رعنائی نظمیں بھی لکھی جانے لگیں!" ——— [illegible] نظم کے اِس گلِ صد برگ کو ہاتھوں ہاتھ لیں، اور غزل [illegible]

مکیں جو تھا کالک با حریم تہ نشین بشین!

آفتابِ تازہ پیدا اِلبطنِ گیتی سے ہوا — آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام — دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک!

پروفیسر فراق اُردو غزل کے اندر جن "حیرت انگیز انقلابات" کا ذکر کرتے ہیں ان کی جلوہ گاہ اُن کے راتوں کے خوابوں کے اُفق کے سوا کہیں نہیں: غزل میں حقیقت تو یہ اصلاحی تبدیلی کا قدمِ اوّل یہ ہونا چاہئے کہ وہ مسلسل و مربوط ہو جائے! بغیر اِس ربط و ضبط کے "ڈاک" "سرِ راہ کھڑے ہوئے آدمی" ("the man in the street") کے ساتھ ہمارا ملتا ہوا اختلاط بھی بامعنی نہیں ہو سکتا! کجا "پردہ نشینوں کے ساتھ حرف و حکایاتِ محبت"!! —— "حیوانِ ناطق و عاقل" —— انسان —— کی گفتگو کی یہ شرطِ اولین ہنوز ناپید ہے! پھر پروفیسر فراق کا بشارت دادہ "انقلابِ غزل" ہم کہاں ڈھونڈیں؟! ؎

میں بے نیاز کروں تو کروں جستجو کہاں؟
اتنا مجھے بتا دے کہ ملتا ہے تو کہاں؟!

کیا شب و روز کی کسی صحبت میں ہماری گفتگو ایسی ہی "رجماً بالغیب" ہوا کرتی ہے جو ہماری متعارف بے ربط و خبط غزل کا معلوم لب و لہجہ ہے؟! کیا ہم حسینوں کے رعبِ حُسن سے ایسے حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ "آئیں بائیں شائیں" الاپنے لگتے ہیں؟! اور اُسے "آہنگِ غزل" کہتے ہیں؟! ؎

یوں کہتے تھے یہ کہتے وہ کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا!

"نشاۃِ ثانیہ" کے پورے بال و پر والے غزل گو، حسرت، شاید اِس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، جبکہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"بےزبانی" ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں!

ہاں پھر کیا ہم اپنے جانِ جاں معشوق کو خط بھی یونہی "زبانِ گنگ و لسانِ عاقل و دل" میں لکھا کرتے ہیں؟! ہم پر "اعجازِ ایجاز" کا آفتاب ہی غالب رہتا ہے؟! اور ہم "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے "بحرانِ شوق" سے کبھی اس شخص فن کو عارضی نہیں کر دیتے؟! آخر "خدائے سخن" میر اپنی "نثر" کی زبانِ فطری میں بہ جنابِ الطف کو کس طرح خط لکھا کرتا تھا؟! ؎

خط لکھتے لکھتے میر نے "دفتر" کئے رواں!
افراطِ اشتیاق نے آخر بڑھائی بات!

ہمیں "غزل کے ظرفِ تنگنائے" کی مزعومہ "لامحدود وسعتوں" (مقالۂ فراق، ص۳۳، سطر اوّل) کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ہے! مان لیجئے کہ لسان الغیب غالب اپنے اِس "مجوزہ مسلکِ ادبی" (Poetic Creed) میں قابلِ اعتماد نہیں تھا کہ ؎

"بقدرِ شوق" نہیں "ظرفِ تنگنائے غزل"
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے!

آپ اپنے اِسی دعوے پر اصرار کئے جایئے کہ غزل کا ایک ایک مصرع "ہزار داستاں در آغوش" ہوتا ہے! اور شاعر کا دیوان و کلیات "کائنات بر دوش"! اس لئے کہ جیسی کہ آپ دعوتِ نظر دیتے ہیں، غزل اِک ہمہ گیر "صنفِ شعر و فکر" ہے جو تمامی تخیلات و جذبات، علوم و معارف، ارشاد و ہدایت وغیرہ پر حاوی واقع ہوئی ہے! —— ہمارا جواب یہ ہے کہ اول تو غزل کی "ہزار داستانی" اُس کی بے ربط بیانی کی تلافی و نعم البدل نہیں! ہم ایک "وسعت" کو ایک "عیب" کی قیمت میں نہیں خرید سکتے! قطعِ نظر اس سے، سوال یہ ہے کہ آیا غزل کی ہمہ دانی و ہمہ بیانی سرے سے کوئی خوبی بھی ہے؟! غزل "اوّلاً و آخراً، ازلاً و ابداً" اِک "داستانِ حسن و عشق" تھی! فلسفہ طرازی، اخلاق آموزی، تصوف گوئی، الٰہیات فروشی، معارف باری، سائنس ترجمانی، سیاسیات تراشی، نفسیات نوائی وغیرہ وغیرہ "بزمِ حُسن" اور "کوئے یار" کو "مسندِ حکمت، مدرسۂ اخلاقیات، تکیۂ درویشاں، منبرِ مسجد، کرسیٔ پروفیسر، دارالتجربۂ طبیعیات، معمل کیمیائیات، میزِ ایڈیٹر، اور تجربہ گاہِ تحلیلِ نفسی" تو بنا نہیں سکتا! —— اس لئے کہ یہ اُس کے بس کی بات نہیں —— البتہ حریمِ جمال اور کوچۂ جاناں کی فضائے لطیف و رنگین کو مکدر و مسخ ضرور کر سکتی ہے!

چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار — علم کا اِن نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار!
"تد شانی" میں کہیں کھلتی ہے "موجِ ماہتاب"! — کیا کوئی "اوراقِ گل" پر طبع کرتا ہے "کتاب"!
سارے عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا جواب — "کاکلِ افسانہ" ہو "دوشِ حقیقت" پر سوار!
حُسن کا آغوشِ رنگیں، دلفریب و دلربا — علم سے بجائے "اقلیدس" کا صحن اک [illegible]
مصحفِ روئے کتابی، روکشِ نازِ گلاب — اور بجائے "لُغت" یا "دفترِ علمِ حساب"!
"نغمۂ شیریں" کے دامن میں ہو "شورِ کارخانہ" — "بزمِ کاوش" میں جلے "شمعِ شبستانِ شباب"!

تُجھ کو خوش بحث ہو غنچے کھلانے کے عوض
ورنہ دیں موجیں صبا کی گنگنانے کے عوض!

نصیب کہ غزل یا مشرقی امنہ غزال مشرقی (ایشیائی عورت) یکسر ہم سیرت واقع ہوئی ہیں!

"جمالیت" پسند، متعارف غزل گو "غزل" کو "انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا" بنا دینا چاہتے ہیں!

غزل کی "بزمِ خاص" کے "گوشۂ خلوت" میں "لامحدود وسعتیں" پیدا کرنے والے اربابِ تغزل شاید اک بُتِ خوشخط، اور اک صنمِ خوش اندام پر یہ نیک تنی کی وہ نوبت لانا چاہتے ہیں جس کے تحت اُس کے ناخُن ہلال نُما اور اُس کے خوش نُما سبزۂ خط کا یہ منظر ہو جائے گا ؎

ناخُن ہمہ بالیدہ شدہ شُم گشتہ!
ریشش زعقب برآمدہ دُم گشتہ!!

الغرض "حسن و عشق" کے حدود کو "پامال" کر کے اُن سے "متجاوز ہونا" غزل کی "بالیدگی" نہیں ہے، اُس کے اعضاء کے نمو کی بیراہہ روی ہے! تن درستی نہیں، "تو" نادرستی"!!

ظریفۂ تغزل کی اس مضحکہ خیز بوالعجبی پر بھی مزید بوالعجبی یہ ہے کہ نیازؔ صاحب پروفیسر فراقؔ کو "استاداتِ عالیہ" کا سرٹیفکٹ دے رہے ہیں! ——— درآنحالیکہ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ اول الذکر بزرگ نے جناب اصغرؔ گونڈوی کی غزلیات پر تنقید کرتے ہوئے اُن کے مشہور میلانِ "تفلسف و تصوف" پر اُن کے خلاف بار بار سخت ایرادات کئے تھے، اور غزل کو "مثنوی مولینائے روم" بنانے کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا! اب "استاداتِ عالیہ" کی یہ کیسی قلابازی ہے؟! گو "محاذ کی اس تبدیلی" میں اصل کار فرما عنصر ممکن ہے کسی "عزیز دوست" کی محبت ہو اور نیز کسی مبغوض دشمن کی عداوت! ——— سچ ہے "اک بلند معیار کے نقد و تبصرہ کے لئے ذہن جس توازن و تعادل کو چاہتا ہے اُس کے عطا کرنے میں فطرت بہت بخیل واقع ہوئی ہے!" (نگار، جولائی، ص۴۵ سطر ۹ - ۱۰)

ہم اس پر اتنا ہی اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ "فطرت کے اس بخل" کے قفل کے کھولنے میں حضرتِ نیازؔ و جنابِ فراقؔ کی آرزو مندیاں اور خود بینیاں بھی کچھ "کلید" نہ ثابت ہوئیں! ؎

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں؟!

غزل کو چاہئے کہ حسن و عشق کے تنگ گھروندوں میں ذرا دیر گزار [illegible]
اور اُسے کونین کا نعم البدل جاننے! ؎

من ایں مقام بہ دنیا و آخرت ندہم!

ستم ظریفی یہ ہے کہ اہلِ غزل نے اس گوشۂ حسین کو حقیقتاً کبھی محسوس نہیں کیا ——— وہ صدیوں سے اس کا پردہ والہانہ طواف [illegible] ہیں، شانِ باریابی انہیں نصیب نہیں ہوئی! ——— [illegible] طرف انہوں نے اُن میدانوں میں بیہودہ دراندازیاں کیں جو رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، بلکہ مرثیہ تک کے "مخصوص و محفوظ" علاقے تھے ؎

تو کارِ خود وت را نکو ساختی؟
کہ با دیگران نیز پرداختی؟!

انسانی منطق یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک غزل کس بنیاد و اساس پر "اک واحد تسوید" کہلاتی ہے؟! اگر مختلف، متفاوت، متباین، متضاد، متصادم، باہم دست و گریباں شعر بھی ایک ہی غزل کے "اجزائے لاینفک" ہو سکتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ماشاء اللہ غزل "خُتنِ سخن" کی ایسی غزالِ جمیل ہے جو مصر کی (Sphinx) (ابوالہول) کا ہندوستانی مثنیٰ واقع ہوئی ہے! کیا صرف ایک ہی وزن و بحر اور ردیف و قافیہ کی "انفرادیت" کے لئے کافی ہے؟ لیکن ہر چیز کی بیرونی صورت کے ساتھ ساتھ اک معنوی سیرت بھی لازماً ہوا کرتی ہے ——— اور غزل ایسی عزیز و محبوب "داخلی" شاعری میں تو یہ شے "عین بیت الغزل" ہونی چاہئے! ——— ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ "قالب" کے بعد اس "قصب" میں ایک جُدا و علیحدہ غزل کا منفردانہ مابہ الامتیاز کیا ہے؟ یقیناً ایسی کوئی اندرونی وحدت و تشخص معرضِ وجود میں نہیں! اک بظاہر واحد و مستقل غزل حقیقتاً اک چوں چوں کے مُربّے کا مرتبان ہے، یا اک بھان متی کا پٹارا، یا سارے جہان کا اک چڑیا خانہ!!

لیکن نہیں، ذرا ٹھہرئے! ابھی ایک معیارِ تقسیمِ غزل کا باقی ہے یعنی مشہور و ذہنی یہ حقیقت ہے کہ ایک غزل کا طول یوں تو پا جا سکتا ہے کہ ابھی [illegible] ۵ یا ۷ یا ۱۱ شعر ہوتے ہیں! ——— اس ضابطے میں [illegible] (Phonetics) [illegible] بن جاتی ہے جہاں قافیہ پیمائی کرتے کرتے مشاعرے کی [illegible]

دیکھا منزل ہے جہاں ٹھہرے حیاتِ گزراں!

کہیئے رازِ فناکونی "دو فرسخ ہے رحیل"!

ممکن ہے جو بصیرتِ لفس و ثباتِ ہوش اس کا انکار کر سکتا ہے کہ غزل درا صل اک غیر مجنس دنا ہموار مواد (heterogeneous mass) خیالات و حسیات کا ہے، جس کے مختلف اشعار بجائے "ایک غزل کے ابیات" ہونے کے، گو یا سودہ زلیس کے "منتشر فردیات" ہیں، جنہیں اس کے "افکار پریشان" اطلاع ہوئے ہیں:ـ

من "قماشِ فروش" دلِ صد پارۂ" خویشم!

ہم دیکھتے ہیں کہ غزل آج تک اِس ریزہ نگاری کی "سُنّتِ سلف" کے "قلادۂ غلامی سے گلو خلاص نہیں ہوئی! پھر ہم حیران ہیں کہ اُن "حیرت انگیز انقلابات کے محشر کو کس "چوہے کے بل" میں ڈھونڈیں جو بقولِ پروفیسر فراق، غزل کی دنیا میں گزشتہ نصف صدی سے گرج رہا ہے؟!ـــــــــ

"وادیٔ نمل" کے اندر ایک "مورِ ضعیف" آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ، لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ!!

ـــــــ ہمارا خیال ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ اس ننھی سی منادی پر سوائے اس کے کیا کر سکتے تھے کہ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا!!ـ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا!

ہم اِن بزرگوں کی مصیبت کو سمجھتے ہیں! اُن کا نعرۂ جنگ یہی تو ہے کہ إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَيْهِ! وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ!

افسوس ہے کہ ہم کو اِس کا جواب سوائے اس کے نہیں نظر آتا کہ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ؟! ع

ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد!

باایں ہمہ، نیازؔ صاحب، اپنے اک "عزیز دوست" کے واجب الادا "اخراج" کی ادائی میں، اور اپنے اک "دیرینہ دشمن" کے بارے میں اپنے جگر سوزِ عناد" کی آسودگی میں (!!)، غزل کا "قصیدۂ مدحیہ"، نظم کے "ہجو نامے" کے پہلو بہ پہلو، یوں تصنیف فرماتے ہیں:ـ

"آہنگِ نظم اک ملکیتِ عامہ کی شکل رکھتی ہے، اور آہنگِ غزل بالکل خاص کی چیز ہے! (اِس بیان میں بہترین "صنعتِ تضاد" موجود ہے!ـــ

غزل، اِس کے قطعاً علی الرغم، اک "نجایتی نغمہ سرائی" کا نام ہے!ـــ "نقاد" اُس کا مقصود دوسروں کے کانوں تک پہنچنا ہے! اس کا صرف "اپنے سامعہ" کو متاثر کرنا (جو "اپنا سامعہ گم گشتہ" خود فراموش غزلگو کو مشاعرے کے حاضرین کے پچاس ہزار کانوں کے اندر جا کر ملتا ہے! نازم بریں خطابِ سامعۂ خویش! ستم ظریفی دیکھیے کہ شعرائے کرام اپنا، اپنا کان، اپنی کنپٹی پر، پکڑ کر دیکھتے نہیں، اور اس افواہ پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ "کوا آپ کا کان لے گیا"!ـــ شاید اب ہمارے "کان کھول دینے" سے اِن بزرگوں کے "کان ہو جائیں"!

ـــــ "ن" اُس میں ہنگامے کی کیفیت ہے، اِس میں "سکون" کی (جو عبارت ہے مشاعرہ گاہ کے "شور نشور" ــــ "ن") وہ ایک رائے زنی ہے جو انتقاد و تبصرہ چاہتی ہے، اور یہ اس سے بے نیاز ہے (غالباً حضرتِ نیازؔ بدیہیات کے اعتراف سے بھی "بے نیاز" واقع ہوئے ہیں، مشاعروں میں شمعِ مشاعرہ سامنے رکھنے والے غزل سرا شاعر کے یہ تکیہ ہائے کلام کہ "ملاحظہ فرمائیے، شعر عرض کیا ہے!" اور بعد آمدِ طوفانِ داد "آداب، آداب!" کے کلمات اور غیر مختتم تسلسل سے "جھکنے" کے حرکات وغیرہ لاریب کہ "بے نیازیٔ انتقاد و تبصرہ" ہی کے "آیاتِ بیّنات" ہیں!!ــــــ "ن") اُس میں تحریک پیدا کرنے کے لئے دوسروں کے جذبات کی شرکت ضروری ہے، اور اِس میں کسی خارجی تحریک کی ضرورت نہیں (اس لئے کہ مشاعرے کا "مصرعِ طرح" کا اعلان، بشرحِ "ردیف و قافیہ"، تو اعماقِ قلب کی اک "داخلی تحریک" ہے! جس پر ہمارے شعرائے استغنا شیوہ دور دراز مقامات میں منعقد ہونے والے "بازارہائے عکاظ" مشاعرہ میں بسواری ریل و موٹر و ٹانگہ و چھکڑا رواں، دواں، پراں چلے جاتے ہیں! سبحان اللہ بریں "بے نیازیٔ تحریکِ خارجی"!ـــ "ن") اُس کی تکمیل کے بعد اک صدائے بازگشت پیدا ہوتی ہے، اور اِس کے تجزیہ کے بعد صرف اک کراہ (جو اِتنی دل دوز اور زیر لب ہوا کرتی ہے کہ "ہمہ تن گوش" ہو جانے اور چندہ" مالکرو فون" استعمال کرنے پر شعراء کے "دنگل" کے سامعہ نواز "شور و شغب" میں سنائی دیتی ہے!ــــــ "ن")..........

وہ بغیر "خیال" آورد کے از خود وجود میں نہیں آتی، اور یہ صرف "آمد" ہے جس میں بسا اوقات قصد و ارادہ کو بھی خبر نہیں ہوتی (گو یا ع گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو!ـــــ لفظ "آمد" میں کتنی "آورد" ہے! کیوں نہو! مشاعروں کے مسلسل "مشتہرہ مصرع ہائے طرح" اشعار آورد کے مرہونِ منت]

پڑھوں میں شعر ہے یوں راگ سے جیسے "باجا" اک ذرا چھیڑیئے تو نکلے کیا ہوتا ہے! ـــــ "ن") ..... فنی رکھ رکھاؤ کا دونوں میں لحاظ رکھنا ...... ضروری ہے، لیکن اُس پر فن غالب آجاتا ہے، اور یہ فن پر! یہ ہوئی چوشک! ـــــ "کیا زبان ہے! کیا بیان ہے! واللہ کیا "محاورہ" باندھا ہے! سبحان اللہ یہ لفظ کیسا نباہا ہے!" وغیرہ وغیرہ "غلبہ بر فن" ہی کے تو مظاہر مذہشہ ہیں؟! ـــــ "ن")"

قصہ مختصر،

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں!

"منطق شکن منطق" کی اِس "دراز نفسی" کے بعد نیاز صاحب استنباط فرماتے ہیں کہ "الغرض نظم اور غزل میں بہت فرق ہے!" ـــــ مگر معاً بعد کے ہی جملے میں یہ "بُونِ لبعید" ایسے تشابہ و یگانگی میں منقلب ہو جاتا ہے جیسے کہ "ایک آغوش میں پلنے والے دو (توأم) بچے!" ـــــ اور پھر دوسری ہی سطر میں نظم و غزل کچھ ایسا من تو شدم تو من شدی کا تداخل حاصل کر لیتی ہیں کہ بالفاظِ نیاز صاحب "منظومات کے اکثر وہی اشعار نظر انداز ہوا کرتے ہیں، جن کو ہم نظم سے علیحدہ کر کے ہر وقت غزل میں شامل کر سکتے ہیں، اور غزل کے وہی ابیات مکمل سمجھے جاتے ہیں جو مجرد حسن و عشق کے حدود میں پہنچ کر وہی وسعت اختیار کر لیں، جس پر منظومات کی کامیابی کا انحصار ہے!"

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

آپ کو "نظم" کے متعلق نیاز صاحب کا لفظ "آورد" کا اطلاق یاد ہوگا، اب یہی نظم اُس "غزل" کے گلے میں باہیں ڈالے ایک ہی "گود" میں پل رہی ہے جو خالصتہً "آمد" واقع ہوئی ہے! کیا "آورد" کی پیداوار بھی مادرِ شعر اور پدرِ سخن کی "نجیب الطرفین اولاد" ہو سکتی ہے؟!

پھر ایک صفحہ اُدھر (ص۹، سطر ۱۱-۱۲) حضرت نیاز فرما چکے ہیں کہ بعض بڑے غزل گو "بہتر نظم گو" تھے، لیکن وہ؛

"جب واقعات و حالات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس وقت ہندوستان میں وہ شعراء بہتر نظم لکھنے والے ہیں جو کسی وقت، اور شاید اب بھی، بہترین غزل کہہ سکتے ہیں! اس لئے نظم کی کامیابی تو بغیر تغزل کے لگاؤ کے ممکن نہیں، اور غزل گوئی اس کی محتاج نہیں! یہ (غزل) اک دبستانی چیز ہے جو شاعر میں نظم لکھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اور اِس منزل سے گزرے بغیر مقصود تک پہنچنا دشوار ہے!"

یہ اعتراف اپنی تشریح خود کر رہا ہے! گویا "غزل" "تیاری" کا اک ابتدائی مرحلہ ہے، اور "نظم" شعر کی "منزل مقصود"! نظم میں غزل شامل ہے، غزل میں نظم نہیں! غزل طفلِ مکتب کی "دبستانی چیز" ہے، اور نظم "منتہی" کا مقام!!

مگر مسٹر نیاز کی "عربدہ جوئی" اور "پرخود پیچیدگی" کی پیمائش آسان نہیں! چنانچہ ارشاد ہوتا ہے (اور کاسٹنگ ووٹ کی شان سے!) کہ ـــــ "اگر مجھے مجبور کیا جائے کہ میں اِن میں سے کسی ایک کو ترجیح دوں تو میرا فیصلہ یقیناً غزل کے حق میں ہوگا، کیونکہ صحیح معنی میں شاعری کی ابتدا دنیا میں غزل سے ہوئی ہے!"

گویا

"اگر مجھے اختیارِ انتخاب دیا جائے کہ میں علم و معرفت کا کونسا مقام پسند کرتا ہوں تو میرا فیصلہ یقیناً "انفینٹ کلاس" کے حق میں ہوگا، اس لئے کہ حقیقت نفس الامری میں "درس و تدریس" کی "بسم اللہ" دنیا میں "انفینٹ کلاس" ہی سے ہوئی ہے!!

صَدَقْتَ یا "مجتہد العصر" حضرت نیاز! ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست!

(۳)

پروفیسر فراق کا مقالہ!

پروفیسر فراق نے چالیس صفحوں کا اک بدریا دریا، صحرا صحرا مقالہ لکھا ہے! اور شش جہت میں دست افشانی و پاکوبی، پیش قدمی و پسپائی، پیچ و تاب خوری و نعل در آتشی کا اک بوقلمون تماشا (Panoramic Melodrama) دکھایا ہے! معانی و مطالب کے شتر بے مہار انبار، اُس کی تکرار، اور اس پر اصرار، نیز حشو و زوائد کے انبار کا یہ حال ہے کہ دلائل ساطعہ کی اس ہنگامہ آرائی [illegible] کی اس آتش افروزی کی اگر تحلیل کی جائے تو اک حباب برق اور [illegible] سے زیادہ ثابت نہ ہوگا! اس مقالۂ طول طویل کے "بیل گرانڈیل" [illegible]

کہ آنکھ پر مارا قلم، نکالا جائے تو معلوم ہو کہ وہ اک موشگاف حقیر تھا! ؂

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے!

چنانچہ ہم اپنی تیز نظری و گرم نگاہی سے اُسے گداختہ کئے ڈالتے ہیں، اور اس تعبیرے چند قطرہائے خون نکلتے ہیں اُن کا "blood examination" (معائنۂ خون) کرتے ہیں! آپ دیکھیں گے کہ کہنہ سال پیرزال غزل کے متعلق پروفیسر رگھوپت سہائے کا یہ سارا طومار ہزل اور پشتارۂ ژٹل دو ایک ضربتوں میں گردن کر اُڑ جائے گا! ؂

ذرۂ عشقے جہانِ عقل را نار تگراست
پنبہ گر صد تو دہ باشد، آتش یک لنگراست!

پروفیسر فراق نے اپنے مضمون کا آغاز خالص پروفیسرانہ خود فراموشی کی اک مغالطہ خوری سے کیا ہے! آزاد صاحب انصاری کے جواب میں "نقاد" کا یہ دانشگاف جملہ اُن کے لئے اک چیستان بن گیا ہے کہ :۔

"بلا شبہ ہمیں (اردو و فارسی کی متعارف غزلوں پر) اعتراض ہے، لیکن مطلقاً غزل پر، اپنے وسیع ترین تصور میں، نہیں! بلکہ متعارف و متداول غزل پر! بے ربط و بے آہنگ غزل پر! متضاد و باہم متصادم غزل پر! موئے کمر و کوہ شرین والی غزل پر! اپنے ہجر دوام اور "رقیب روسیہ" کے غلبۂ مدام والی غزل پر! قاتل شیوہ و قصاب پیشہ محبوب والی غزل پر! ——— نکہ اُس غزل پر جو ہے "افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت!" ؏

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست! (کلیم، مئی ۳۸ء)

اس پر علت غزلگوئی کے سخن ناشناس، پروفیسر فراق فرماتے ہیں:۔

"موصوف آخر کہہ کیا رہے ہیں؟"

ہم :۔

"ممدوح آخر سمجھ کیا رہے ہیں؟!"

لاریب کہ یہ خواہ مخواہ کا مجہول المعنی بنایا ہوا جملہ اپنی وضاحت و صراحت و صفائیت میں اِس کا مصداق تھا کہ ؏

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!

تاہم ... پروفیسر اس کے سمجھنے سے لاعلاج حد تک قاصر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "نقاد" کا یہ جملہ اجتماع ضدین کا ایک لاینحل گورکھ دھندا ہے! اِسے قابلِ فہم بنانے اور اُس کے اندر ممکن و متوقع مفہوم پیدا کرنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ "غالباً جملے کے ابتدائی حصے میں "نہیں" کا لفظ تھا، یا ہونا چاہئے تھا! جسے "نقاد" نے فروگزاشت کر دیا اور یہ اُن کی پہلی بے سرو پا بیانی ہے!"

اِس اختراع کردہ فروگزاشت پر وہ سخت گلوگیر گرفت کرتے ہیں، اور اپنے طولانی "چہل ستونی" (دس صفحاتی!) مقالے میں کوئی چالیس ہی بار اِس پر وار کرتے ہیں، اور اپنے جذبۂ نقد و جرح کی آسودگی کرتے ہیں! ——— درآنحالیکہ یہ گم گشتہ "نہیں" کلیم میں بھی موجود تھا، حضرتِ فراق نے بھی آپ پڑھا تھا، اپنے مسودۂ مضمون میں بھی اُسے نقل کیا تھا، اور وہاں سے وہ نگار میں بھی بجنسہٖ منتقل ہوا ہے: بایں ہمہ دوسرے ہی پیراگراف تک پہنچتے پہنچتے اُس کی روشنائی اُڑ گئی! اور پروفیسر صاحب کی ساری "روشنئ طبع" اُن پر "بلا" ہو گئی! اب اُنھیں یہ "نہیں" نہیں ملتا پر نہیں ملتا! اُنکا "قیاس" لسانی اُسے فرض کرتا ہے، اُن کی "نحو" اُسے بہم پہنچاتی ہے! تاہم اُن کی آنکھ اُسے "پیش پا اُفتادہ" نہیں دیکھ سکتی! "چشم بند و گوش بند و لب بہ بند" کا "آسن" بہاشہ رگھوپت سہائے جی ترک کرنے کے لئے تیار نہیں! ؏

چہ گُنم با کہ تواں گفت کہ او
در کنارِ من و من مہجورم!

کیا یہ حضرتِ "فراق" کے تخلص کے معنی کا تصرف ہے؟! جس نے اُنھیں مشاہدات و بدیہیات سے بھی اک "ہجر و بُعد و حجاب" میں مبتلا کر دیا ہے؟! یہ "بغل میں بچہ، شہر میں ڈھنڈورا" کیسی طرفہ مصیبت ہے! ——— ہماری رائے ہے کہ تبدیلیٔ تخلص پروفیسر صاحب کے لئے اک قرینِ مصلحت بات ہوگی! ورنہ اُنکا ستارۂ قسمت ہمیشہ برجِ نحوست ہی میں رہے گا! "فراق" کو چھوڑ دیجئے! ؏

مزن "فالِ بد" کا ورد "حالِ بد"!

اچھا اب جوں توں کرکے ہمارے مصیبت زدہ دوست اِس چکر سے نکلتے ہیں، اور غزل گوئی کا صحیح تصور حاصل کرنے کے لئے اُس کا تاریخی جائزہ لینا شروع کرتے ہیں۔ تاہم اُن کی ابتدائی گفتگو، متعدد مضمون تک، حیران کن ہے! غالباً اُن پر "عصبیت" (nervousness) غالب آگئی ہے! وہ "لکھنؤ اسکول" پر بے طرح تبرّیٰ کرتے ہیں! "نیاز، نقاد" کے "لب لعل

[illegible] سے تربیت تیغ کام ہوئے ہیں، لیکن "چودھری رگھوپت سہائے"
[illegible] کے اس "گرامادؔ کا اُبال" بھی دیکھنے کی چیز تھی!
تاہم ہمارے "نقطۂ نظر" سے جناب فراق غیر معتدل نظر نہیں آتے!
[illegible] "اسکول" دراصل "محرمی اسکول" ہے! اور لکھنؤ اسکول کا صحیح تسمیہ
[illegible] اسکول" ہے! ع

ہاں کہ شغلِ گریہ "نصب العین" بن سکتا نہیں!

پروفیسر فراق نے لکھنؤ اسکول کے "امام باڑے" پر جب ضربیں لگانی شروع کیں تو بار بار ہم نے اِس دُعائیہ مصرعے کی تکرار کی: ع

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست وبازو کو!

بہرحال، پروفیسر صاحب کی یہ "با دوستاں خلاف وجنگ" اِس خود فراموشانہ بدحواسی ہی کی مصداق اک حقیقت ہے کہ "بھاگ کھڑا ہونے والا ہاتھی اپنی ہی (عشقی) فوج کو پامال کیا کرتا ہے"! اُن کے زیرِ قدم آکر جو "ہزارہا جانِ شعرا، کشتہ" ہوئی ہیں اُس کا اندازہ اُن کے اِس سخت زجر وتوبیخ سے کیجئے!

"اِس ذلیل قسم کی رقت سے نفرت پیدا ہوتی ہے! یہ سوز وساز نہیں ہے! یہ رونا نہیں ہے! یہ زخموں کی سینہ کوبی ہے! یہ اظہارِ غم نہیں ہے، یہ چھینک مارنا ہے!" (نگار، جولائی۔ ص۳۱-۳۲)۔

ہم انگشت بدنداں ہیں: ع

آنچہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب!!

خیر، وہ آگے بڑھتے ہیں، لیکن "لال پھیرا" (   )

اب بھی اُن کی وحشت کا سامان بنا ہوا ہے! چنانچہ اُردو غزل گوئی کے دوسرے مابعد دَورِ ارتقا کا تعارف کرتے ہوئے اُنہیں حسرت اور اقبال کے ایسے (بقولِ عام) "سید المتغزلین" اور "سرخیلِ عساکرِ شعر" کا کلامِ تغزل بھی نسبتہً کم ناکامیاب اور کم "مبتذل" نظر آتا ہے!

شریت رگھوپت سہائے جی بالکل مہاراجہ دھراج بنے ہوئے "انتقاداتِ عالیہ" کی راج گدی پر پورے "سلیقے" سے براجے ہیں! اور ع

زمیں کنیز ہے اور آسماں حلقہ بگوش!

لیکن بعد میں پھر جلد اُن کے حواس درست ہو جاتے ہیں اور اُنھیں ہوش آجاتا ہے کہ سے

نشیں چشمِ [illegible]
کس لئے آئے تھے ہم، کیا کر چلے!

مگر اب پچھتاوے کا موقع ہی ست ہے، غزل گوئی میں عیب "ابتذال و فرسودگی" کو وہ مُسترد نہیں کرتے، لیکن فرماتے یہ ہیں کہ "دقتِ قریب میں اُردو غزل نے "حیرت انگیز انقلابات" قبول کئے ہیں! تاہم بخیال اُن کے [illegible] ارتقا کا عمل اتنا پیچیدہ، اتنا ژولیدہ، اتنا غلک رہا [illegible] ہوا ہے کہ اُس کے فہم وشعور سے عہدہ برآ ہونے کے لئے غزل کا عمل [illegible] ہی درکار ہے! وہ فرماتے ہیں کہ "غزل بڑی دِق کرنے والی چیز ہے"!

یہاں اِتنی فرو گزاشت شاید ہم بہم پہنچا دیں کہ "غزل گوئی بڑا [illegible] کرنے والی بدپرہیزی ہے"!

ایسی زمین انکشافِ طلب میں اُن کی رفتار قدرۃً ناہموار، غیر مستقل، اُفتاں وخیزاں اور کبھی رَواں، دواں، اور پرّاں ہے! اِن میدانہائے تحقیق میں پروفیسر صاحب کو "فالو" (follow) کرنا، غزل بیابانی کے تعاقب سے کم دشوار نہیں! وہ شش جہت میں حرکت کرتے ہیں! ہر ممکن وناممکن سمت میں دامنِ تقریر پھیلاتے ہیں! پیش وپس، راست وچپ، بالا وپست، فوق وتحت جَست وخیز کرتے ہیں! وہ فلکیات کے "مخنہ متحیرہ" کی طرح اپنی عسیر التعین کجرویوں کی کسی حد کو مس کئے بغیر نہیں چھوڑتے!

وہ ایک قدیم شعر کہہ کر رفتارِ ترقی کا جائزہ لینا شروع کرتے ہیں، لیکن صراطِ مستقیم پر ایسی استقامت کے ساتھ کہ ایک "پُشت" آگے جاکر "تین قرن" پیچھے بازگشت کر جاتے ہیں! سے

یہ بات کیا ہُم رفتار بھولتی جاتی ہے؟
کہ اپنے سائے سے ٹکرا رہی جاتی ہے!

اور پھر اس طے منازل وقطعِ مراحل میں تسلسلِ ادب کے نظریئے کی یوں داد دی جاتی ہے کہ اگر اک اونٹ (کے نقشِ قدم) کے بعد کوئی لومڑی بھی ہاتھ پڑ گئی تو اُسی پر چیخ اُٹھے کہ "این ہم بچۂ شتر است"!

تاہم جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں اور اپنی "پُر خلوص پیچیدگی" کی کشاکش میں کہہ نہیں سکتے، وہ یہ کہ مسلسل اصلاح وترقی، نقوش ثانی [illegible] منازل پر منازل، مراحل پر مراحل، مراتب پر مراتب، اُردو غزل [illegible] سلک والوں نے پیچھے طے کئے ہیں [illegible]

ابھی ہیں شباب پر پہنچ گئی ہے!

لُطف ہے مرحمی کہ سچ ہے کہ اس دوران مات چوگنی بڑھ ہوتی پر!

اور حقیقت ہے، طاؤسِ نظم کے اس شستہ مور رقص پر!

لیکن عجیب تر یہ ہے کہ اردو شاعری کی ترقی معکوس کی اس پیمائش میں جو اُفتادہ پروفیسر فراق کے قلم تاریخ رقم سے اردو نظم پر پڑی ہے وہ یہ ہے کہ "اقبال کے "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کے شعبدہائے تازہ" اب گلِ پژمردہ بن چکے ہیں! "۔۔۔۔۔ یہ استغنائے اُن کی غزلوں کے! ۔۔۔۔۔ اس لئے کہ ماشاء اللہ "پیرزالِ غزل" تو وہ سدا بہار دوشیزہ ہے کہ "بوڑھی ہو گئی جگ موہ لیں!"

سچ ہے غزل بھلا کس طرح عمر سے اُتر سکتی ہے! ع

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است!

اور ہاں جوش کے فن پر جو آفت اس دورِ خوش ذوقی و حیات پروری میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ "کسان" اور "بغاوت" جیسی "نزکنوں" کی گرم لڑائیاں "سیاسی شور و شغب (کے بھوت کی) سامعہ خراشی سے زیادہ نہیں" (نگار جولائی)

تاہم وہ "جذباتی اسکول" کے "گورِ غریباں" والے ذوق سے تنافر ہونے سے انکار کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ اقبال اور جوش کچھ نہ سہی، لیکن وہ "بالکل دفن کرنے کے قابل نہیں سمجھے جا سکتے!" (ص ۳۳ و ۱۱م)

پھر غریب اقبال و جوش کے یہ شکوے کیا بیجا ہیں کہ۔

سن نوائے شاعرِ فرداستم! (اقبال)

قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا فسانہ اپنا! (جوش)

یا،

اندھوں سے حیف چھپا ہے زمانے میں شاعر　　اے جوش آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا!

اللہ اللہ جوش کی نشاۃ ثانیہ والی رستاخیز کی پیامبر نظمیں، اور وہ صرف سامعہ خراش سیاسی غوغا!!

بزدلی ہے بے غیرتی، کج بحثی، رسوائیاں　　تجھ پہ اتنی لعنتیں! افسوس اے ہندوستاں!
بڑھ چلیں ظلموں کی حد، بالکل خاموش، پرچم تا ندا!　　خونِ ہمدردوں کے دل میں، اور بچے ہیں گدا!
کون شہ زور سے کہے [illegible] دولت زار!　　اب بھی گرداں [illegible] پہ کیا تجھکو ہے ناز؟
کون [illegible] سے کہے [illegible] اعتبار!　　لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار!

کشتیٔ عشق کو جوشِ غزل میں کھینے کیلئے
کون بڑھتا ہے لہو تھوڑا سا دینے کیلئے! (جوش)

"غزل" کے جلال و کمال کے ذکر کی تر زبانی کے اس موقعے پر ہمارے اد "مکھوپت" ہمارے صاحب کا جلال دیدنی ہے! اُن کی ہیئت کذائی لطف لینے کے قابل ہے! اُن پر وہ عالم جذب طاری ہے کہ گویا ع

فرشتہ صید، پیمبر شکار، یزداں گیر!

وہ کہتے ہیں کہ "ابھی کتنی دفعہ کہوں کہ غزل بہت وقت کرنے والی چیز ہے! اُس کے ایک ایک شعر نے لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے! بڑے بڑے نظم گو شعراء کے اُس نے دانت کھٹے کر دئے ہیں، اور اُن کے چھکے چھڑا دئے ہیں! اُس کے ایک معیاری شعر میں جتنا کچھ ہوتا ہے اُس کے پیدا کرنے میں ہومر، فردوسی، دانتے اور ورجل کے دانتوں پسینا آجاتا ہے! اُردو کے نظم گو کس شمار میں ہیں!! صرف شیکسپیر کہیں کہیں اس باب میں کامیاب ہوتا ہے!" (نگار، جولائی ص ۵۲ و ۵۵ و ۹۰)

العظمتہ للہ! ؎

"بخلے" زدیم و سر انا الحق شد آشکار!
مارا ازیں "گیاہِ ضعیف" ایں گماں نبود!

حد یہ ہے کہ جب کسی طرح کام نہیں چلتا تو وہ I.C.S. کے امتحان کے اک پرچے کی دور کی کوڑی لاتے ہیں جس میں مضامین غزل کے "حسن و عشق" کے مشہور عام موضوع سے پرے نکل جانے کا اک کنایہ مشتبا ور ہوتا ہے! گویا اب سرکار دولتدار کے قانون کے ناموس اعظم کی شہادت، غزل کی جاں بخشی کے لئے لائی جائے گی! پروفیسر فراق اب سخن سنجی کی اُس مہیب رفعت کو پہنچے معلوم ہوتے ہیں جس کے ایک فائز کا رجز تغزل یہ ہے: ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا!!

پروفیسر صاحب کا عام طریق بحث و استدلال یہ ہے کہ وہ حریف کے محاذ کے سامنے اپنا بھی محاذ قائم کر لیتے ہیں، ان خطوطِ جنگ کو متصادم نہیں کرتے! اُنکا اسلحہ خانہ، غیر جارحانہ، دفاعی، بلکہ بعض اوقات قطعاً غیر جنگی ہوتا ہے! وہ اک متقابل صفِ جنگ تعمیر کرتے ہیں، میلوں تک، ملکوں تک، رقبۂ جنگ سے بھی متجاوز دور دور تک! لیکن تصادم کا شاذ و نادر

بھی مبلغ کرتے ہیں ! چنانچہ وہ بکثرت ملکہ میشا راتوال و امثال نقل کرتے ہیں، مگر عموماً بےمحل وغیر حسبِ حال ! وہ علماء، فضلاء، مصنفین، ناقدین کا کوسوں لمبا جلوس نکالتے ہیں۔ جس کے نقیب خود بن کر تماشبینوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں ! جس وقت وہ حوالوں، اقتباسوں، کتابوں، مصنفوں، ناموں کی فہرست سازی پر آتے ہیں تو ہمیں ملّا ودیا دہ کی وہ "بحث اثبِ البحر اور اثبِ الہدیٰ" کی جلدیں یاد آجاتی ہیں، جنھیں سیکڑوں گدھوں کی ملٹن کی فوج ظفر موج کی پیٹھوں پر لاد کر، مع اک شلہ مبقدار یمنز کے، اک ایرانی عالم کے مقابلے میں وہ اک معرکہ گاہ مناظرہ میں تشریف لے گئے تھے ! اور جہاں بات بات پر اُن کے استشہادات اس بلند بانگی سے گونجا کرتے تھے کہ۔

"دیکھئے اثبِ البحر کا دفتر ۵، صفحہ ۳۶۰۰۷۰۰ !

"ملاحظہ فرمائیے اثبِ الہدیٰ کی جلد ۵، صفحہ ۹۹۹۹۹۹ !

ہم علم وفن، فلسفہ و مابعد الطبعیات کے کلمات و اصطلاحات میں بھی "مجذوب کی بڑ" ہانک سکتے ہیں !! ع

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے !

الغرض وہ اقتباسات و حوالجات کے اپنے ہی اٹھائے ہوئے طوفانوں میں خود غوطے کھاتے ہیں ! علم و معلومات کی کثرت اُن کی "روشنیٔ طبع" کے لئے اک "بلا" ہوگئی ہے ! دوسروں کے خیالات کا ہمارے لئے علم کافی نہیں، ہمیں ضرورت ہے اُن کے "فہم" کی !؛ اور فہم کے نام سے "فہم" ہی کی، نکتہ "وہم" کی !! اِسی حقیقت کو نظر انداز کرنے سے علم "حجاب اکبر" بن جاتا ہے ! اِسی لئے کہا گیا ہے کہ "یک مَن علم را دہ مَن عقل باید !" جرمن حکیم نیٹشا کا جو قول ("رائے، خیال کی افیون ہے") اُنھوں نے نقل کیا ہے، ہمارے خیال میں اُس کا "مشار الیہ" بھی یہی نکتۂ نغز ہے ! "رائے" سے یہاں مراد وہی دوسروں کا (غیر مفہوم و غیر منہضم) قول ہے اور نہ اپنی رائے۔ اپنے اجتہادِ فکر کو نیٹشا افیون کہے ؟!

—— وہ نیٹشا جو بیک وقت اجتہادِ خیال اور جہادِ عمل کا اک "شیرِ خدا و رستمِ داستاں" واقع ہوا تھا۔ اور جس نے مغرب کے نظامِ تمدنی سے لے کر یورپ کے قصرِ دین تک کو اپنی "شرابِ فکر و رائے" کی طوفانی بارشوں سے مسمار کردیا تھا ! اور اس فاتحانہ شانِ تخریب کے ساتھ کہ بقولِ اقبال ع

"دیوانہ بکارگہِ شیشہ گر رسید !"

یہی حال "امرد پرستی" کی بحث کے سلسلے میں شیخ سعدیؒ کے اُس حوالے کا ہے جو پروفیسر فراق نے دیا ہے اور جس کی روشنی میں شیخ [illegible] کو "بچہ .... باز" ثابت کیا ہے ! حضرت فراق کو اپنی "شعر العجم" خوانی پر بڑا ناز ہے ! لیکن سعدی کے متعلق شعر العجم کے محدود و معدود صفحات کے علاوہ ہم نے مولانا حالی کی مفصل و مکمل جلد —— "حیات سعدی" —— بھی پڑھی ہے ! جس میں "شیخ" اِس "مزعومہ ذوقِ پاکبازی" پر [illegible] نقد و احتساب کرتا ہے !

گروہے نشینند با خوش پسر — کہ ما پاک بازیم و اہلِ نظر !
زمن پرس فرسودۂ روزگار — کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار !
چرا طفلِ یکروزہ ہوشش نبرد ؟ — کہ در صُنع دیدن چہ بالغ چہ خرد !

یہ ہے "مُشتے نمونہ از خروارے" اُس طریقِ تعبیر و استفادہ کا جو پروفیسر ممدوح، ارباب و اقطاب علم و فکر کے معاملے میں کام میں لایا کرتے ہیں ! ہمیں کتابوں کو اپنے دماغ کے انوار بنانا چاہیئے، اپنی پشت کے بار نہیں ! پروفیسر فراق کے چہل صفحاتی مقالے کا "قصرِ چہل ستون" کچھ اس ناقابلِ رشک حقیقت کا مصداق ہے کہ "More voluminous than luminous" (کلاں سر، تنگ روشن دماغ !)

"نقادؔ" کے مضمون —— "غزل گوئی" —— کو اُنھوں نے عِلّامس تک نہیں کیا ! وہ اس "حصنِ حصین" کے گرداگرد چکر ہی کاٹتے ہیں، اُس کے پاس پھٹکتے ہوئے اُن کے پَر جلتے ہیں ! ؎

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت !

اُنھوں نے کہنے کے لئے چند نقاط کو چھیڑا ہے۔ مثلاً غزل کی "بےربطی"، ردیف و قافیہ کی پابستگی، "مصرعِ طرح کی بدنام صلائے عام"، "تغزل کی تشنہ بیانی و رمز نگاری"، "رقیبِ روسیہ" کی مستقل صدر نشینیٔ بزمِ حسن ! اور استمراری اجارہ داریٔ خلوتِ محبوب ! وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اُنھوں نے نازک دماغی سے ان میں سے نہ کسی ایک کو سمجھا، نہ امانت داری کے ساتھ اُنھیں پیش کیا، اور نہ دقتِ نظر کے ساتھ کسی کا جواب دیا ! —— اُنھوں نے نقادؔ کے ہر خیال کے خط و خال کو مسخ کر ڈالا ! ہر اعتراض کی نوک پلک کو مجروح کردیا ! اور پھر اس "بہیئت چہرے" کو وہ ہدفِ تعریض بناتے ہیں [illegible] یہی تو بات ہے اختراعات و تصرفات سے [illegible]

کب تو مقابلِ آئینہ تھا؟

تم نے اپنی طرف نظر کی!

جو چیزیں لطافتِ نظر کی "خوردبین" سے دیکھنے کی تھیں، انھیں انھوں نے "غیر مسلح آنکھ" سے دیکھا ہے، اور جو باریک بال کی مانند "واچ میکر" کی "نازک چمٹی" سے اٹھانے کی تھی اُسے اُنھوں نے موٹی انگلیوں سے پکڑنا چاہا ہے! ع

آہستہ خرام، بلکہ مخرام زیرِ قدمت ہزار جان است!

ہمیں عموماً پہلے سے معلوم تھا کہ جواب دینا آسان نہیں! تاہم پروفیسر فراق سے ایسی آسان پسندی کی توقع نہ تھی! —— گو حضرت نیاز کو اُن سے اسی چیز کی پوری توقع ہو! " (نگار، ص۵۸، سطر۳) ڈاکٹر جیوگو نے اپنے اک ناول میں اک مردم بیزار، پیرمرد "قلندر" کا ذکر کیا ہے، جس کا ایک رفیق و شفیق بھیڑیا تھا، یہ گرگ باراں دیدہ اس قدر ہوشیار و بیدار، واقفکار و تجربہ کار تھا کہ بقول اُس کے "انسانی ہمزاد" کے وہ اک "پروفیسر" کہلانے کا مستحق تھا! لیکن چونکہ پروفیسر کا ازلی طور پر "شے لطیف" سے خالی ہونا ضروری ہے، اِس لئے بادلِ ناخواستہ پھر اس خطاب کو واپس لے لیا گیا!

نسنجا دربغل و فہم محال

جلوہا در نظر و دیدن نیست!

ہم بھی اپنی چند نقاط پر اکتفا کریں گے، ہر حرکتِ مذبوحی پر اک صدائے غفلت شکن رسید کرنا فی الحال ملتوی کرتے ہیں، بُنیا دیں منہدم کر دینے کے بعد چند محرابیں اور کنگرے اس ناشاد "قصرِ ثریا رس" کے باقیات صالحات کے طور پر بحیثیت آثارِ قدیمہ باقی رہنے چاہئیں! ——

برائے عبرت!

(۱) غزل کے "بحر و وزن، ردیف و قافیہ" کی بحث نسبتہً صاف تھی، لیکن تصویر کے چشم و اَبرو ہی کی رعایت اُن پر حرام ہے! چنانچہ مدہوشانہ وہم سے باز پرس کر جاتے ہیں کہ "آخر جوش کی نظموں میں اِن لوازمِ فن اور پرانے سازِ شعر کا کیوں التزام کیا جاتا ہے؟"

دراصل گذشتہ نزاع یہ نہ تھا! یہ تھا کہ "قافیے کے ہاتھ میں رہتی ہے اتو لوگوں کی باگ!" مزید وجہ اس تخصیص کی یہ تھی کہ آزاد صاحب نے ردیف و قافیہ ہی کو شعر کا سارا صورت گر بلکہ ڈکٹیٹر قرار دیا تھا! اُن کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ ردیف و قوافی ہی غزل کی پیشگی ظروف مقررہ و مقدرہ ہوتے ہیں۔ پس اُنہی کے سانچے میں جو خیالات و جذبات ڈھل سکتے ہیں، ڈھال لئے جاتے ہیں! باقی کو "دور باش" کی صدا سُنا دی جاتی ہے! —— قدرتاً اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند پیش پا اُفتادہ قافیے ہی اختیار کرلئے جاتے ہیں۔ اور اُنہی کے اندر اک اسقاموہوم مفہوم کو اک مزید ابہام کے ساتھ بھر دیا جاتا ہے! ظاہر ہے کہ غزل گو کا کوئی خاص مخلوق تو ہوتا نہیں! بیشمار پنچائتی خیالات اور پنچائتی محسوسات ہیں —— جو عبارت ہیں غزل کی آفاق گیر مملکتِ فکر و معنی و جذبہ سے! —— جو بھی ان میں سے "غزل طرح" میں سما جائیں، بس شاعری کی خاص الخاص "تلاشِ مضمون" ہے! شش جہت اُس کی بادہوائی تیراندازی کے لئے باز ہے، جدھر بھی تیر نکل گیا "تیر بہدف" ہی ہے! ماشاء اللہ! ع نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو!

قیامت ہے کہ اِتنی "لمبی رسی" ملنے پر بھی ہر غزل گو کو "قافیہ تنگ اور ناطقہ بند" ہونے ہی کی شکایت رہا کرتی ہے!

تاہم کمال یہ ہے کہ بالفاظ پروفیسر فراق، "قافیہ غزل کا طرۂ کمال ہے!"

(۲) "مصرعِ طرح" کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "اِس کے لغوی معنی پر غور کیجئے! طرح کے معنی ہی "نمونے" کے ہیں!" پھر وہ فرماتے ہیں کہ "ہر فنی عمل کا جُرم فنکار کے وجدان اور قوتِ مُمیزہ کی چیز ہے!" —— ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا "ہر فنکار غزلگو" کا وجدانِ ذاتی اور اختیارِ تمیزی، "مہتمم مشاعرہ کی "گولک" میں "گِرو" ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے اک "سیٹی" بجاتا ہے اور "شعرائے شہر" بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگتے ہیں؟! —— یعنی حسبِ "تحقیقِ انیقِ" پروفیسر فراق: "غزل کی موجِ ترنم، متعینہ بحر میں دو برابر ہلکورے لیتی ہے! بحر کے "ساحل" یعنی ردیف پر پہلی موج کو پیٹتی ہوئی دوسری موج ٹوٹی، مطلع بنا، اور غزل کا راگ مل گیا!" —— اور (بقولِ حسبِ حالِ ہمارے) حاضرینِ بانکینِ مشاعرہ نے اپنے طبلے اور مجیرے سنبھال لئے اور مشاعرے کی "ٹُھنکی" شروع ہو گئی! ع

حیف گر در پیِ امروز بُود فردائے!

(۳) غزل کے لئے اک مسلسل ربطِ معنوی کو اصولاً پروفیسر صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس اعتراف کے ساتھ ہی توہمات کی اک کائنات کا بھی اعتراف کرنے لگتے ہیں! وہ یہ راز سینہ بسینہ ہمیں بتاتے ہیں کہ گویا غزل

کا مجموعی سلسلہ ضبط، ہم آہنگی و یکجہتی، توافق و تطابق، تسلسل و تواتر، اتنا باریک، لطیف، دقیق، عمیق، غامض، ہوائی، موہوم، مبہم ہوتا ہے کہ نظم کی بلند بانگ ہم نوائیاں جن لوگوں کے سامنے کو خراب کر چکی ہیں، وہ "آہنگ غزل کی (بالخاظ حضرت فراق) خاص کی چیز" کے شعور اور لطف اندوزی کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے!—— گویا ع

ذوقِ افیوں تو ندانی بخدا تا نہ چشی!

کیوں نہ ہو! ——

زاہد نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی!!

گویا غزل کا ناقابلِ دید ربط و تسلسل بھی غزل کے معشوق کے دہن و کمر ہی کی طرح اک تیسرا عجوبہ ہے! ——

ساری دنیا میں پتا ملتا نہیں

تو ہی بتلا ہے رگِ گردن کہاں!!

حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ خود یہ بزرگ غزل کے اندر کسی معنوی تسلسل سے مایوس ہو چکے ہیں؛ چنانچہ اک دوسری جگہ حضرت فراق کا یہ اظہار کتنا معنی خیز ہے کہ "مسلسل غزل" اک تناقضی اصطلاح ("A contradiction in terms") ہے!——

"تناقضی اصطلاح" سے اُن کی مراد غالباً "اجتماعِ ضدین" ہے!

"غزل" کے اِس عیب کے اس "اِقبال" پر، "نظم" کے وصفِ ربط و ضبط کے اِس "معکوس اعتراف" کو بھی سُنیئے کہ "نظم ہنوز اک حسین طولِ عمل (یا طولِ امل؟) سے زیادہ نہیں"! (ص ۵) ——

ہنر بچشمِ عداوت بزرگتر عیبے ست

گل است سعدی و در چشمِ دشمناں خار است!

غزل کے نادیدہ و نادیدنی، غیر مرئی تسلسل کو تسلیم کرانے کیلئے اُنھیں بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؛ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ "بتایئے آم کے قد و قامت رنگ و بو، اور ذائقہ و لذت میں کیا ہم آہنگی ہے؟" (گویا سیندر دریا یا جوگیا آم کی قوسِ قزح نما رنگینی و بوقلمونی سے ظاہری آنکھ اُس کے "مختل" ہونے کا قیاس قائم کرتی!: "نقاد") "آسمان کے نظام شمسی میں کونسا نظم ہے؟" (گویا پروفیسر صاحب کے سبب پایاں علم کے حجاب اکبر کا یہ حال ہے کہ وہ نظم و تنظیم تو اچھے

سیارہ شمس و قمر، نجوم و کواکب کے بظاہر العجائب و بمعنی کا بند و بست اور ربط و ضبط سے بالکل بےخبر ہیں!—— "ن") "صحائف آسمانی کے بیانات میں ربط کیوں ہے؟!" (یہ علماء و مفسرین سے پوچھئے! لیکن اتنا ہم بتائے دیتے ہیں کہ خود قرآن کے "احسن القصص یعنی حدیثِ حسن و عشق یوسف و زلیخا" کی طرح میں کوئی بے ربطی نہیں!—— "ن") "شیکسپیر کے ڈرامے کیوں ایک [illegible] میں شیکسپیری جہانِ نیستان ایسے گئے ہیں؟ (یہ ناقد غالباً کوئی ایسا بہرہ یا بے "سلیقہ" انتقاداتِ عالیہ" ہوگا جسے "فطرت کی اک نادر الوجود خوش فعلی" ("freak of nature") سمجھنا چاہیئے!—— "ن")

اور ہاں یہ ہندی دوہروں اور اُردو فارسی رُباعیوں کے مضامین ایک دوسرے سے اتنے مختلف و متباین کیوں ہوتے ہیں؟" (گویا کبیر داس کے دوہے اور عمر خیام کا مجموعۂ رُباعیات ایک ایک واحد، طویل نظم کے "بند" ہیں، منفرد و مستقل اجزائے کلام نہیں؟!—— "ن")

ہائے ہائے! گویا زمین متزلزل ہو جائے! آسمان تہ و بالا ہو جائے! نظاماتِ شمس و کواکب درہم برہم ہو جائیں! تمامی قصرِ کائنات اڑا اڑا دھم ہو جائے! لیکن بلِلّٰہ ہماری کسی ممکن اینچا تانی، کسی ناممکن زور آزمائی، کسی جانگسل کاوش و کاہش سے غزل کی ہزل اور رذل کے اندر نستعلیق، اُقلیدسی خط و خال کا تناسب و جمال تسلیم کر لیجئے! مان لیجئے! رحم کیجئے!—— ہماری مدت العمر کی دماغ سوزیوں، اور ہمارے سلفِ صالح کی صدیوں کی مغز پاشیوں پر ترحم خسروانہ ہی کے صیغے میں ترس کھائیے، اور کسی طرح ہماری لاج رکھ لیجئے! قسم خدا کی میں کچھ آج لیکے اُٹھونگا کہ میں غریب ہوں، خواجہ معین غریب نواز ہوا

(۳) "مطلع و مقطع" پر بھی حضرت فراق شیخ چلیانہ توہم طرازیاں فرماتے ہیں؛ لیکن سوائے دیدہ بر دوختہ غزل بازوں کے، دنیا جانتی ہے کہ "مطلع" کسی معنی میں بھی "افتتاحِ غزل" نہیں ہوتا! وہ مطالبِ غزل کا پیامبر نہیں ہوتا! وہ اپنا ہی "نقیب" ہوتا ہے؛ اب رہا "مقطع" تو وہ "رسوائی تخلص" کے سلسلے اک "حیلہ" بہم پہنچانے کے سوا اپنی کوئی "معذرت" نہیں رکھتا! لیکن محرم رازِ غزل پروفیسر فراق سے سُنیئے کہ "مقطع میں غزل کے پورے احساسِ تغزل کی آواز بازگشت پوری تھرتھراہٹ (یا رقصِ جانکنی کی آخری پھڑک!—— "ن") کے ساتھ بھر دی جاتی ہے؛ یہاں زمزمۂ تغزل کی حد [illegible] جاتی ہیں! (اللہ اللہ! سکوتِ ابدی کے [illegible]

کی معاوف!! بہرحال غزل کا یہ خاتمہ بالخیر اچھا ہی ہُوا! ؎ شکر ہے آج عدو
چل تو بسا، خیر وہ داخلِ جنت ہی ہی! ——— (" ن ")

(۴) "رقیب روسیہ" کی مذمت پر جھنجلیں پروفیسر ہجو دہو جاتے ہیں!
وہ زبانِ حال سے یہ کہتے معلوم ہوتے ہیں کہ کیوں جناب! کیا وہ (رقیب) ہمارا "رفیقِ راہِ عشق" (Comrade-in-Love) نہیں؟
جب وہ خلوتِ صحیحہ میں اس نعمتِ غیر مترقبہ پر بلا شرکتِ غیرے فائز المرام ہوتا ہے کہ "چو خانہ خالی و معشوق مستِ ناز بود"! تو ہم شریف آدمیوں کی طرح دروازے پر "اٹینشن" کھڑے پہرہ دیا کرتے ہیں! اور آنے والی صبحِ سعادت کی ساعتِ نور و ظہور میں یہ بانگ مردانہ بلند کرتے ہیں کہ ؎

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی! تو مجھے آزمائے گا کب تک!!

حاشا و کلّا، کہ جوش صاحب کی طرح کوئی اس شعر کو بےغیرتی کی مثال بتائے! غیرت و حمیت کے مزید ارتقا کی اس میں ابھی بڑی گنجائش ہے! مثلاً شاید اگلی "معراجِ ناموس" یہ ہوتی: ؎

لے "شبِ وصلِ غیر" بھی کاٹی! اور "شبِ قدر" اُس پہ کبھی مانی!!

(۵) "امرد پرستی" کی حمایت حضرتِ فراق اس جوش و خروش، اس عزم و اذعان، اس "اخلاص" و "شرحِ صدر" کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہم تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتے ہیں! واللہ ہم کو خوف ہونے لگتا ہے کہ اُن کے کالج کا پرنسپل اُن کی حرکات و سکنات کا مطالعہ نہ شروع کر دے! اُن کے شہر کی پولیس اُن کی نقل و حرکت پر "نگرانی" نہ قائم کر دے!! اور کانگریسی حکومت کا وزیرِ تعلیم اپنے محکمے کی آئندہ اصلاحات میں اُن کی "تخفیفِ تنخواہ" کے بجائے اُن سے "تخفیفِ تصدیعہ" کی درخواست نہ کرے!! ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد!

وہ کامل دو صفحوں پر وسیع اک طویل و عریض فہرست اہلِ علم و فضل، اصحابِ ادب و انشاء، اربابِ سائنس و فلسفہ، اور اقطابِ تہذیب و شائستگی کی دیتے ہیں؛ جن کی زندگی میں عملاً، اور جن کی قلمکاریوں میں بصورتِ آئینہ داری، "امرد پرستی اُن کی حساس ترین رگِ سیرت و سرشت نظر آتی ہے!" (ص۶۲، نیچے سے تیسری اور چوتھی سطر!)

پھر وہ غریب نقاد کو چیلنج کرتے ہیں، "غزل گو چودہ سو برس کے جیل والی بات سے اس بحث (امرد پرستی) میں نہیں ڈرتا! حضرتِ نقاد: یہ بیسویں صدی ہے! تعزیراتِ ہند یا کسی ملک کے قانون میں "جہالت کے جو آثار" ابتک باقی ہیں وہ اُن سے مرعوب نہیں ہوتا! سُنئے: "جنسیات" پر ہیولاک ایلس سے لیکر اس وقت تک تمام ممالک میں جتنی علمی سنجیدہ، اور محققانہ کتابیں لکھی گئی ہیں، "سب امرد پرستی کے جواز" کو تسلیم کرتی ہیں! ——— انا للہ! ؎

علم را بر جاں زنی "یارے" بود
علم را بر تن زنی "مارے" بود! (رومی!)

پروفیسر فراق کا آفاق گیر مطالعہ اور جہاں پیما معلومات مستحقِ اعتراف و داد ہیں، لیکن اس مطالعے کی بے تنویری اور ان معلومات کی خانۂ دماغ کے دفاتر میں بد ترتیب نشست نے اُن کے بڑے سے کاسۂ سر کو "علم و دانا کی زنبیل" بنا رکھا ہے! اس ظرفِ لبریز و تاریک میں سے جب کبھی وہ کچھ نکالتے ہیں چشمِ بد دور ایسا ہی ہوتا ہے! چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "نقاد صاحب! اگر آپ کسی سے کہیں نہیں تو اک رازِ سربستہ آپ کو بتاؤں کہ اردو شاعری کی ۳ صدیوں کے تمام مجموعی دفاتر میں جوش صاحب کی نظم ——— "نامِزاجوانی" ——— امرد پرستی کے شوخ ترین رنگ سے شرابور ہے! ——— ہم فراق صاحب کو اُن کی "سخن فہمیٔ اہلِ مدرسہ" اور اُن کی "محرمانہ" راز داری پر بےاختیار داد دیتے ہیں: نازم بریں پردہ پوشی و رو پوشانہ گوشہ گیری! ؎

بسرِ منارہ اشتر رود و فغاں برآرد کہ نہاں شدم من اینجا مکنید آشکارم!

پھر وہ جوش صاحب ہی کی طرف روئے سخن کرتے ہیں کہ اک نظم گو شاعر بھی "ساری دُنیا کا بہنوئی یا داماد" بنا کیوں پھرتا ہے؟ اور کیوں ہر غیر محرم عورت کو اپنی "منکوحہ" کی طرح خطاب کرتا ہے؟!

فاضل پروفیسر کیا شریعتِ ادب کے "بابِ رخصت" کے علم سے سچ مچ ایسے معصوم ہیں؟! ؎

دو چیز مفت حلال است و ہم بشرع درست
سرود خانۂ ہمسایہ، حُسنِ رہگذرے!

مناسب ہو کہ وہ اپنے علم و فضل کی ہمہ فروش دُکان کے گودام (Universal Seller's Shop) کے اندر اک شیشے کا "شوکیس" (Show Case) بنا کر اس میں یہ ابیات محفوظ کر لیں اور اپنے ان مذکورۂ بالا توہمات کے دَورے کے وقت ان

وشبابت سے تصفیۂ افکار کر لیا کریں!

بعنائی خیال کو شہر الپ اگست او ۔۔۔۔ زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور
اگبدل نہ غلغلۂ آمچہ از نظر گذرد ۔۔۔۔ خوشا زہ وانئ عمرے کہ در سفر گزرد!

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے!

(۲) نظم اور غزل کے درمیان پروفیسر فراق کا مفروضہ یہ فرق کہ "اول الذکر خارجی و مادی عالم کی کرخت و ثقیل نقاشی ہے، اور آخر الذکر دُنیائے دل کی عمیق، داخلی راز نوائی" اک خود ساختہ خیال ان کی غزل سرایانہ خود بینی کا اِفشا کیا ہوا ہے: یہ اک راز فاش ہے کہ "نظم عبارت ہے روحِ شعری کی اُس لب کشائی سے جو اک لمحۂ شاعرانہ کی تحریک پر عمل میں لائے! بخلاف اس کے متعارف غزل گو یا اک گراں وزن ہے جو مشاعرے کی دوکان خود فروشی پر رکھا ہوا ہے، اور مصرعِ طرح کی آہنی سوئی سے جب کوئی چاہے اُسے چیخنے پر مجبور کر سکتا ہے!" ۔۔۔۔ "نظم" کی اس حقیقت کی روشنی میں وہ خارجی بھی ہو سکتی ہے اور داخلی بھی! عالمِ آب و گِل کی بھی نقاش ہوتی ہے، اور نہاں خانۂ روح و دل کی بھی ترجمان! رزمیہ بھی ہو سکتی ہے اور بزمیہ بھی! گرم بھی، اور نرم بھی، جلالی بھی، اور جمالی بھی! ۔۔۔۔ جوش کو ذرا یہاں اس مسئلے کی عقدہ کشائی کرنے دیجئے! ع

خود زبانِ شاعری سے شعر کی تفسیر سُن!

اپنے قرآن دیوان کی "فاتحۃ الکتاب" میں لکھتے ہیں۔

اے روحِ عصرِ حاضر و ہندوستانِ نو ۔۔ لایا ہے اک صحیفۂ "سخنداں" ترے لئے!
اِس مصحفِ عظیم کی اللہ ری وسعتیں ۔۔ ہر "مد" ہے مشرقین بداماں ...... !
لایا ہوں رزم و بزم کی "ارضِ تضاد" سے ۔۔ یہ لبلِ جنگ و سازِ شبستاں ...... !
کتنی شبوں کے طاق میں رکھکر "چراغِ دل" ۔۔ پڑھی ہے روحِ عالمِ امکاں ...... !
اس کی خبر بھی ہے کہ بنایا گیا ہے لحن ۔۔ کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ...... !
گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں خبر بھی ہے ۔۔ کن مہوشوں کی زُلفِ پریشاں ...... !
واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صرف ۔۔ کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ...... !
لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں کیا کہوں
کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے! (جوش)

بلاشبہ ہم اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جوش کے ہر آہنگ میں "نشاۃِ جدیدہ" کی اک بے پناہ اُمنگ و ترنگ گونجتی ہے! اُن کے آرٹ میں اک ناگزیر "اندازِ ترکانہ" اپنی "کجکلاہی" کے ساتھ موجود ہے! اُنکا تخلص "جوش" رسمی شعراء کی طرح محض برائے بیت نہیں!

لیکن جس طرح جوش میں آفتابِ نصف النہار کی شوکت ہے، مخمور (اکبرآبادی) میں، جو خود بھی اصولاً و اصلاً اک زندہ نظم گو ہیں۔ سوز و سازِ درد و حسرت، و یاس و حرماں کی دوسری فزائے دل زیادہ نمایاں محسوس ہوتی ہے! ہم اُن کی اک نظم یہاں (جزءً) نقل کرتے ہیں، اور پروفیسر فراق کو چیلنج کرتے ہیں کہ اِس سے زیادہ وہ اپنی مشہور و مطلوبہ "نشتریت" اور "بعیشتریت" اپنی ہی کسی "پُرفسوں غزل" میں بتائیں! یہ عشقِ ناکام کا اک مرثیۂ جاں سوز ہے، اور آپ کے ہم مشرب غزل باز شعراء کے "واسوختوں" کی جلی کٹی زہرناکی سے کتنا پاک ہے! اس فرق کو بس یوں سمجھئے کہ :-

اے صیدِ ہوس! آگ غمِ ہستی کی ۔۔ تجھ کو بھی جلا رہی ہے اور مجھکو بھی
میرے جلنے میں "عود" کی ہے خوشبو ۔۔ تُو تجھ میں ہے جلتی ہوئی "ہڈی" کی ؟؟!

ہاں تو مخمور کا شکرپاش نالۂ رنگین سنئے :-

نوید عشرتِ موہوم اب نہ چھیڑ مجھے ۔۔ اُمیدِ لذتِ معدوم اب نہ چھیڑ مجھے!
خوشی کے نام سے دل کی مصیبتیں نہ بڑھا ۔۔ دکھا کے جلوۂ راحت کسی کا جی نہ دُکھا!
گدازِ دل کی رفاقت بہت ہی میرے لئے ۔۔ نہیں وہ میری یہ حسرت بہت بھلی ہے لئے!
غزالگسار رہوں ناکام جستجوؤں کا ۔۔ نہ ذکر کر مری "مرحوم" آرزوؤں کا!
غمِ فراق ہے، ارماں کو دفن رہنے دے ۔۔ مجھے اب اُن کے تغافل کا رنج سہنے دے!
مرے شباب کی کاوش کا قصۂ دل دوز ۔۔ سُنا کے اور فزوں کر میرے صبر کا سوز!
خدا کے واسطے دے اب تو درسِ بیخبری ۔۔ کہ فاش ہو چکا عالم پہ رازِ چارہ گری!
یہ مدعا نہیں لیکن کہ دردِ ہجر مٹے ۔۔ غمِ فراق کی لذت دل و جگر سے چھٹے!
یہ آرزو ہے کہ وہ دردِ دل کا راز بنے ۔۔ مرے حریمِ محبت کی وجہ ناز بنے!
تپش کو اپنی رفیقِ شبِ محن سمجھوں ۔۔ میں سوزِ دل کو فقط شمعِ انجمن سمجھوں!
نہ آہِ نیم شبی باعثِ رسائی ہو ۔۔ نہ گریۂ سحری موجبِ رہائی ہو!
دعائے وقتِ سحر جب بلند ہونے لگے ۔۔ اثر خرابیِ قسمت پہ میری رونے لگے!
عیاں ہو جب کہ دوا و دعا کی بے اثری ۔۔ تو اِتنا یاد رہے اے دلِ پُر از بیخبری!
کبھی وہ حسنِ مجسم جو سامنے آئے ۔۔ اور اپنے جلووں سے خورشید و مہ کو شرمائے!
تو خوابِ یاس سے مجھکو ذرا جگا لینا
حجابِ دیدۂ مرحوم آنکھ سے اُٹھا لینا

اِس نظم کی ساری "نشتریت" کا راز شاعر کا کسی "لمحۂ شاعرانہ کا حال" ہونے کے بعد اس کا فطری تسلسل ہی ہے! وہ بیت بہ بیت مئے دو آتشہ و سہ آتشہ ہوتی چلی گئی ہے، تا آنکہ اک "کشتۂ اکسیر" بن گئی ہے! متعارف غزل کے شش جہت میں اُڑنے والے تیر تکے اِس نشو و نُما کو خارج از بحث بنا دیتے ہیں: وہاں نہ خیال کا "تقدم" (Progress) ہے، نہ احساس کا "عمل ضرب" (Multiplication)، نہ جذبے کی "اشتداد پذیری" (Intensification)، نہ کیف کا "اِسراع" (Acceleration)، نہ عمل شعری کا مجموعی "ارتقا" (Evolution)، نہ شاعرانہ ڈرامے کی "معراج" یعنی (Climax)! ع

رُکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلو باقی!

غزل کا ہر شعر اک "تیرِ نیمکش" ہے، جس کا سُننے والا اک "نیم بسمل"!

اُف رے بیدرد، ستم پیشہ و جاہل قاتل
نہ کیا ذبح، گیا چھوڑ کے "بسمل" قاتل!

وہن زخم پکارا کیا قاتل قاتل!

غزل چند "منتشر پَر" ہیں، نظم اک سالم "طاؤس"! غزل دو تین رنگوں کی "تنگ ظرف پیالیاں" ہیں، نظم، "آسمانِ شعر کی ہفت رنگ قوسِ قزح"! پروفیسر فراق کو اپنی مقطوع الاعضا غزل کے قطرۂ بیا یہ کے متعلق، اپنی اشک شوئی کے لئے یہ بمعل الملاق رکھنے والا قول مبارک ہو کہ "جزو، کل سے بڑا ہوتا ہے"!

مِل گئی جس کو "گانٹھ" ہلدی کی
اُس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری!

اہلِ یونان کے منقولۂ بالا قول کے بجائے نظم و غزل کے مشترک موضوع پر ہمیں اقبال کا یہ کلام زیادہ حسبِ حال معلوم ہوتا ہے۔

برگِ گُل "شد" چوں ز آئیں بستہ شُد
گُل ز آئیں بستہ شُد "گلدستہ" شُد!

"نغمہ" از ضبط صدا پیدا ستے
چوں "پریشاں" شد، صدا "غوغا" ستے!

یہی وجہ ہے کہ نسیم کی "محفل بگاڑ دی" اک "گلزارِ نسیم" بنگئی؛ اور میر حسن کی مثنوی اک "سحرالبیان"! ——— آپ کو میر حسن کا شکل سے کوئی غزل کا شعر یاد ہوگا! اور بیچارے پنڈت دیا شنکر کو تو شاعر کی حیثیت سے آج کوئی پہچاننے والا بھی نہ ہوتا، اگر اُن کی خوش ذوقی اور حسنِ "انتخابِ شعرا الہند" کے عجائب خانے میں اپنا یہ نادرہ کار تحفہ نہ رکھ جاتا! لیکن اب تو وہ اپنی قبروں سے فاخرانہ یہ نعرے لگا سکتے ہیں کہ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

اور ہاں یہ اک "مسلسل منظوم صحافت" ——— "مثنوی شاہنامہ" ——— ہی تھی، جس کے بَل پر فردوسی "دشمنِ محمود غزنوی" کے قہرمان گُرز گراں کو چیلنج کرتا ہوا، کہتا ہے: ؎

بنا کردم از خامہ کاخِ بلند
کہ از باد و باران "نہ دارد گزند"!

بایں ہمہ، ہمیں پروفیسر فراق اور حضرت نیاز (جنھوں نے نظم کے مقابلے میں غزل کو اپنی "بارگاہِ ناز" تک پہنچا کر، اپنے خدایگانہ پندار میں گویا "نظم کا اخراج جنتِ شعر سے" کر ڈالا ہے!) کے راہِ راست پہ آنے کی اُمید نہیں! اور ہو تو کیونکر ہو؟! پروفیسر بالقابہ غزل کی زبان کے تشنہ و کوتاہ ابیات کو "کُن فیکون" کی شان کا، "کائنات آفرینِ نطقِ یزداں" سمجھتے ہیں؛ اور جناب نیاز اس طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ" کو "انتقادات عالیہ کا مقالہ" فرماتے ہیں: ع

دو دل یک شود بشکند کوہ را!

اول بہ آخر نسبتے دارد، اس تحریر کو پروفیسر فراق کے ایک لطیفے کے ذکر سے شروع ہو کر پروفیسر فراق ہی کے ایک دوسرے "بُنڈلے" پر ختم ہونا چاہیے۔ "بادشاہ غزل" آتش کا شاید رنگِ تغزل سے شرابور ایک شعر پیش کرکے وہ اک مبہوت کن سُوال ہم سے کرتے ہیں کہ "فرمائیے! یہ شعر قطعے میں کھپے گا، یا رُباعی میں، یا کسی نظم میں، یا کہاں؟!" ——— شعر ہے،

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

ہمارا ناطقہ تو سچ یہ ہے کہ یہاں بند ہے! لیکن اپنی عقل پر بہت زور دے کر ہم اس کا شاید یہ جواب دیں گے کہ؛

"ناس گک اینڈ کو کے "Travellers' Guide

(ماہنامہ "سیاحتِ عالم" کے صفحات میں!)

پروفیسر فراق امید ہے ہمیں معاف فرمائیں گے! باہمی نوک جھونک کی اتنی بے پایاں گفت و شنید کے بعد جب آخر کار یہ قضیۂ نامرضیہ اب ختم ہونے کو آیا ہے تو کیوں نہ خوش ذوقی کا تھوڑا سا اہتمام کریں! مزید مناسبت یہاں یہ ہے کہ آتش کا یہ شعر تاریخی طور پر علی گڑھ کالج کے ایک کھلنڈرے نے مدت ہوئی اس پر تضمین کی تھی! ملاحظہ فرمائیے! خوش گزرے!

سفر کو نکلے ولایت سے چند نصرانی
خبر یہ تھی کہ ڈر پیشاور ملو میں ہے!
ارادہ جب ہوا ایسا تو ایک نے پوچھا
"اجی کہو! کوئی ہوٹل بھی یار راہ میں ہے؟"

ڈارون کا خلف الرشید اک شرغ فام فرنگی "رفیق طریق" یوں جواب دیتا ہے:

ہماری قوم کو ہے ہوٹلوں کی کیا حاجت؟
ہزار گشت مسلم جوار راہ میں ہے!
جو شب ہوئی تو اچک کر قیام کر لیں گے!
"ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے"!

کھلتے ہی گلاب خار ہو جاتا ہے
ہنستے ہی بس اشکبار ہو جاتا ہے
پیدا ہوتے ہی تیرہ قسمت انسان
اے موت! اشتراکی ہو جاتا ہے

(جوش)

وابستہ ہر ایک فرد آفات سے ہے
روزی سے پیٹ، ذہن خیالات سے ہے
تو جب کی طرف چلا ہے جا جب سے کب
جو ختم جہاں بھی اہل جہاں بات سے ہے

(جوش)

اک ذرۂ ناچیز کو صحرا سمجھا
اک موج خفیف کو تلاطم سمجھا
اس علم قلیل کو کہ ہے صرف اک بوند
انسان کے جاہلوں نے قلزم سمجھا

(جوش)

گر ہیں یہ کتابیں نغمہ خوانی کے لئے
ساز ان کے لئے ہوئے جوانی کے لئے
وہ بادہ کہ اب جس سے موزوں پیہم
ہیں آگ لئے ہوئے پانی کے لئے

(جوش)

جھجک باقی ہے

ساقیا جام، کہ بیدادِ فلک باقی ہے — آبلے پھوٹ بہے پھر بھی تپک باقی ہے
دھار دے آتشِ تر سے کہ نہ پھر چوٹ اُبھرے — ابھی توبہ کی مرے دل میں کسک باقی ہے
آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر کوئی اشارہ کردے — تیرے قرباں ابھی تھوڑی سی جھجک باقی ہے
پھر اُسی ناز سے اک خندۂ گلریز طرب — دل کے شیشے میں ابھی جس کی کھنک باقی ہے
پھر چھڑک دے سرِ انگشت حنائی سے شراب — شیشہ بازی کی ستاروں کو لپک باقی ہے
ہاں چھلک جائے لبِ جام سے وہ لعلِ مذاب — جس میں خورشید کی کرنوں کی جھلک باقی ہے
حل کئے صبح نے انفاسِ معطر جس میں — روح بالیدہ ہو اب تک وہ مہک باقی ہے
جس کو افشردہ کیا شام کی دوشیزہ نے — قطرے قطرے میں ستارے کی چمک باقی ہے
وہ زلال اُس کا ہی سب جس کو شفق کہتے ہیں — اُس کی تلچھٹ ہے فلک پر جو دھنک باقی ہے
عقدِ پرویں سے کوئی لمس کی لذت پوچھے — دانے دانے میں ٹپکنے کی للک باقی ہے
دیکھ لے پھر، میں تری نیم نگہ کے صدقے — نیند کی سی مری آنکھوں میں کھٹک باقی ہے

بات کرنے میں اُلجھ پڑتے ہو ایک اک سے اثرؔ
پیر ہو اور جوانوں کی سی جھجک باقی ہے

(اثر لکھنوی)

بھارت کا مزدور

(گیت)

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
مجھ سا کوئی نہیں مجبور   مجھ سا کوئی نہیں معذور
دکھ سے آٹھ پہر رنجور   سکھ سمپت[1] سے کوسوں دور
فاقہ مستی ہے دستور
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
کھانے پینے کا ہے کال   مجھ سا کوئی نہیں کنگال
بیوی فاقہ سے بے حال   بھوکوں تڑپیں میرے لال
دل کے زخم ہوئے ناسور
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
کیا بتلاؤں اپنا حال   ہر صورت سے ہوں پامال
روتے گزریں ماہ و سال   مجھ کو جینا ہے جنجال
بیشک مرنا ہے منظور!
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
جاڑا گرمی اور برسات   محنت کرتا ہوں دن رات
پھر بھی نیچی میری ذات   پھر بھی اوچھی میری بات
دیکھو دنیا کا دستور
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
دن بھر کرتا ہوں میں کام   صدہا سنتا ہوں دشنام
مجھ سا کوئی نہیں ناکام   گھر آتا ہوں وقتِ شام
دن بھر کی محنت سے چور
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
میرا دشمن ہے سنسار   مجھ پہ ہنستے ہیں زردار
میرا کوئی نہیں ہے یار   جگ میں کوئی نہیں غمخوار
تم ہو باسط کیوں رنجور؟
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

باسط بسوانی

[1] دولت

رفتارِ وقت

زُبان کا مسئلہ!

"زبان کا مسئلہ" ("Question of Language)

اِس نام سے پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس پریزیڈنٹ، کا ایک پمفلٹ، اُردو ہندی کے قضیے پر، کانگریس ہیڈکوارٹرز، الہ آباد، کی طرف سے ابھی حال میں شائع ہوا ہے، جسے عموماً تمام ہندوستانی انگریزی اخبارات نے بالاقساط اپنے کالموں میں نقل و نشر کیا ہے، ہم اِس پمفلٹ کا خلاصہ، مع اک مختصر و سرسری اظہارِ خیال کے، صفحاتِ کلیم میں دینا چاہتے ہیں۔ قرار واقعی نقد و تبصرہ کو کلیم کی آئندہ اشاعت کے اک مستقل، سیر حاصل مقالے پر ملتوی کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ مقالہ، ادارۂ کلیم کو کلیم کے کوئی محترم ناظر ہی بہم پہنچائیں! بہرحال، زبان اُردو کے مصالح و منافع (interests) کے لحاظ سے اک ایسی چیز کی ضرورت ہوگی! موجودہ تعرض، پنڈت نہرو کے اِس محاکمے سے، عموماً اُس کی تلخیص و ترجمانی ہی تک محدود رہے گا!

پہلی بات جسے پنڈت جواہر لال کی کسی تحریر یا تقریر کی قرأت یا سماعت کے وقت ملحوظ رکھنا چاہئے یہ ہے کہ وہ بالفاظ خویش "صفائے ذہن و صفائے فکر (clean mind & clear thought) کے داعی ہیں! آپ کو اپنے توہمات اور تعصبات کی رعائت کی توقع اِن سے نہ رکھنی چاہئے! یہ رحم وہ اپنی ذات پر بھی نہیں کیا کرتے! اپنی

ادارہ

"خودنوشت سیرت" میں اُنھوں نے معلوم کتنی جگہ لکھ دیا ہے کہ "کس کو خبر ہے کہ میرا ابھی یہ خیال ہے یا میرا جذبہ؟! میرے دماغ کی پیداوار ہے، یا میرے دل کا مولود؟!" ——— الغرض یہ خطرہ ہر انسان کیساتھ، بتقاضائے بشریت، لگا ہوا ہے کہ ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے!

تاہم ہمارے مُلک کے موجودہ و معلومہ معدودے چند خواص میں پنڈت نہرو ہی وہ دل و دماغ رکھتے ہیں جو حجاباتِ نفس اور خبثِ باطن کے خلاف مستقلاً معرکہ آرا رہا کرتا ہے! اور یہ خصوصیت، پنڈت جی کی اک خالص اخلاقی، بلکہ روحانی و صوفیانہ خدمت ہے! اعلانِ حق اور بیباکیٔ نقد میں وہ اک شمشیر برہنہ ہیں، اُن کی سوانحعمری کو دیکھئے کہ اُن کے احتساب سے نہ اُن کے پدرِ محترم ——— پنڈت موتی لال آنجہانی ——— محفوظ ہیں، نہ اُن کے مرشدِ طریقت، مہاتما گاندھی، مامون! وہ اِس "دُعائے مقبول" کا مظہرِ شیریں معلوم ہوتے ہیں کہ ؎

بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو!
سینوں میں اُجالا کر، دل صورتِ مینا دے!

قصہ مختصر اپنے اِن جواہر دل و دماغ کے ساتھ، وہ ہندوستان کی اک مطلوبہ "لسانِ عمومی" (Lingua Franca) کی بحث

میں کسی قسم کی بحث بطلقہ اور بیداغ قولِ فیصل تو کسی بشر کے امکانات میں
نہیں، لیکن شاید بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اردو ہندی۔ اور ہندوستان
کی دوسری زبانوں، اور اک مجوزہ آل انڈیا قومی زبان کے مسائل و قضایا
پر اس سے زیادہ صائب الرایانہ اور ثالث بالخیرانہ محاکمے کی کوئی نظیر ہمارے
اس وقت تک کے متنازعہ فیہ ادبِ لسانی میں موجود نہیں! معلوم قضیئے
میں یہ "آخری حرف" (Last Word) ہو، لیکن
جب تک اس پر کوئی "نقشِ ثانی" پیش نہ کیا جائے، اُسے اک غیر منسوخ کلمہ
ہی تسلیم کرنا پڑے گا! ——— خوشی کی بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے بھی،
اس پمفلٹ پر اپنے مختصر لیکن جامع "پیش لفظ" میں، اُس سے اصولاً و عموماً
اظہارِ اتفاق و خوشنودیٔ مزاج کیا ہے! حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ
گاندھی جی کبھی بھی اُن خیالات کے حامل اور اُن منصوبوں کے داعی نہیں
رہے ہیں جو ماضیٔ قریب میں اُن سے منسوب کئے گئے ہیں! رسالۂ کلیم کے
مشترک جون جولائی نمبر میں بھی، "رفتارِ وقت" کے باب کے تحت "مشترکہ قومی
زبان" کے عنوان سے جو نوٹ نکل گیا وہ گاندھی جی کی شائع شدہ تصریحات
کی ناقص فہم و تعبیر پر مبنی تھا۔ جنوبی افریقہ والی اپنی "فینکس کالونی" کے
ہندوستانی مدرسے میں مسلمان بچوں کے اردو معلم اور نستعلیق کے اُستاد،
اور ہندوستان کے اندر جیلخانے میں اک مسلمان عالم سے اردو سیکھنے
والے، اور سیکھ کر الفاروق و سیرت النبی کا مطالعہ کرنے والے، اور پھر
آج کل مولانا ابوالکلام کی تفسیر و ترجمان القرآن کی تلاوت کرنے والے
"موہنداس کرم چند گاندھی" کے متعلق اردو دشمنی کی بدگمانی کرنا، گاندھی جی
کی غیر متزلزل شہرت کو اس قدر نقصان نہیں پہنچا سکتا جس قدر کہ خود اردو
کے مقاصد و مصالح کو! ——— خیر، یہ اک جملۂ معترضہ تھا، اگرچہ اس
بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ موجودہ لسانی فتنۂ خوابیدہ کو جگانے کا بانی
و مبانی مہاتما جی کو کہا جاتا ہے، ہمارا مذکورۂ بالا ریمارک شاہراہِ مذاکرہ
سے کوئی انحراف بھی نہیں! ——— بہرحال آمدیم برسرِ مطلب!

پنڈت نہرو کے مقالۂ (مسئلۂ زبان) کے اہم مطالب اور اُس
کا سلسلۂ استدلال و بیان (ملخصاً) حسبِ ذیل ہے:-

"ہندوستان میں اردو ہندی کے قضیئے نے اپنی ساری روایاتی
فتنہ سامانیوں کے ساتھ پھر سر اٹھایا ہے! جو مسئلہ علماء و فضلاء، ماہرینِ فن
و مخصوصینِ زبان کے ذکر و فکر کا تھا، مسند یافتہ جہلاء نے اُسے گلی کوچہ و
شورش انگیزی کے بازار و قصابان میں گھسیٹ کر پہنچا دیا ہے! تاہم یہ صورتِ
حالات ناقابلِ اعتنا نہیں! پھر اس کی وجہ بھی یہ نہیں کہ بقولِ برخود غلط
کے ہندوستان، اک "ہزار داستان" سرزمین ہے! بخلاف ازیں عالمِ
بشری کی آبادی کے پورے خمس کی اس ناپیدا کنار دُنیا میں حیرت انگیز حد
تک، کم تعداد زبانیں پائی جاتی ہیں! مزید براں ہندوستان کو اک
عمومی قومی زبان بھی نصیب ہے، جس کے کلمہ گو کروڑہا کی شمار پر حاوی ہیں!

"تاہم اک کافی پیچیدہ مسئلہ ضرور پیدا ہوگیا ہے! اس کا مراد
فساد ہماری فرقہ پرستی اور سیاسیاتی ژولیدگی سے بہم پہنچا ہے:

"زبان کا مسئلہ اک قوم یا جماعت یا ریاست یا سلطنت کی موت
و حیات کا سوال ہوا کرتا ہے! زبان اک قوم کی آواز ہے، اُس کا دماغ و
دل ہے، اُس کی روح و جان ہے، اُس کی تہذیب و ثقافت ہے، اُس کے
ماضی و حال و مستقبل کی حامل و صورت گر و آئینہ دار ہے، اور اُس کی ساری
زندگی اور تمامی ہستی کی جلوہ گاہ! جو قوم ایک زبان بولتی ہے وہ ایک ہی
دماغ سے سوچتی ہے، ایک ہی دل سے ارادہ کرتی ہے، ایک ہی ہاتھ سے
کام کرتی ہے، ایک ہی قدم سے چلتی ہے، اور ایک ہی منزلِ مقصود پر گریزا
گریز پہونچ جاتی ہے! ——— تاہم زبان اک زندہ، نامی شے ہے،
وہ ساری قوم کی ترجمان ہے، نہ کہ اُس کے چند افراد کی اُنگلیوں میں اک
موم کی ناک! وہ کانفرنسوں کے پنڈالوں میں ریزولیوشنوں کے ٹھپوں
سے نہیں ڈھالی جاتی! وہ ساری قوم کے کاروانِ بزرگ کے نقوشِ
قدم ہوتی ہے!

"کراچی کانگریس نے اپنے منشورِ حقوقِ اساسی میں وطنِ عزیز کی
ساری ملتوں اور جماعتوں کی مادری و ثقافتی زبانوں کی بھی کافی و وافی
ضمانت کی ہے! اس نے "ہندوستانی" کو اپنی ہر دو صورتوں اور رسم الخطوں
میں، قومی زبان بھی تسلیم کیا ہے! صوبجاتی زبانیں کانگریس کے آئندہ دورِ
حکومت میں وہاں کے مقامی واسطہ ہائے تعلیمی ہوں گی! کانگریسی پیمانہ
متحدۂ ہند کے جدید الحدود صوبے درِ اصل ملک کے مختلف "لسانی رقبہ جات"
کے ہم معنی ہوں گے! اس وقت بھی اپنے سررشتۂ نظم و نسق و نشر و اشاعت
میں کانگریس ان وطنی زبانوں سے کام لے رہی ہے! واقعہ یہ ہے کہ

[illegible] میں جو کانگریس کے پیام کے ملک کے ایک ایک قریہ کی جھونپڑی تک پہنچانے والے سفیر بنے ہیں!

"یہ ہندوستانی" زبان کیا ہے؟ ہندی اور اُردو اسی ماں کی دو "ستاوتی اور نگوری" بیٹیاں ہیں! ——— اپنے دیوناگری اور فارسی خط کی "ساڑھی" اور "قبا" میں: بنگالی، گجراتی، اور مرہٹی وغیرہ ہندی کی "خالہ زاد بہنیں" کہی جا سکتی ہیں، جن کی تحریری پوشش بھی دیوناگری کی تھوڑی مختلف تراش و خراش ہے، جن میں بآسانی اک عام رسم الخط کی یکسانی خط و خال پیدا کی جا سکتی ہے! اسی طرح سندھی کو ہم اُردو سے وابستہ دامن کر سکتے ہیں؛ جنوبی ہند کی تامل، تلنگی، کنٹری اور ملیالی بلاشبہ اک قطعی اجنبیت و مغائرت کی دُوری پر واقع ہیں، اور یہ امر محل نظر ہے کہ وہ کہاں تک لسانی، لغاتی، یا کم از کم رسم الخطی اعتبار سے ہندی کے قریب لائی جا سکتی ہیں! اب مشرق میں آسامی و اُڑیا اور مغرب میں پنجابی و پشتو رہ جاتی ہیں ——— یہ تقریباً ایک درجن زبانیں ہیں جو برِاعظم ہند کی ساری ناپیدا کنار محفلِ انسانی کی ترجمان ہیں! "ہندوستانی" ان میں علانیہ اک "میرِ مجلس" کا موقف و منصب رکھتی ہے!

"ہندوستانی کے بالمقابل بعض لوگ انگریزی زبان کو یہ وظیفہ بخشنا چاہتے ہیں۔ لیکن انگریزی علانیہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ، دولتمند طبقے کی اک "خورد بینی اقلیت" کی زبان کا مع بیان سے زیادہ نہیں! مزید براں وہ ہماری تمامی تہذیبی روح کی ہمنفسی سے قاصر ہے! بلاشبہ ہمیں بیرونی تمدنی و علمی دُنیا سے اپنے روابط قائم رکھنے کے لئے انگریزی، اور شاید بعض اوقات انگریزی سے بھی زیادہ فرانسیسی، جرمن، روسی، اطالوی، جاپانی وغیرہ زبانوں کی ضرورت ہوگی! تاہم اُن کے اغراض و خدمات نہایت مخصوص و محدود ہوں گے، لیکن وہ ہندوستان کے طول و عرض میں "زبانِ خلق" کا "نقارۂ خدا" کہاں بن سکتی ہیں؟

"اِس کے بالمقابل ہماری "ہندوستانی" بالفعل ۱۲ کرور اہلِ ہند کی تو موجودہ مشترکہ زبان ہو ہی! چند اور کرور اُسے بلا ذہنی تکلف سمجھ سکتے ہیں، اور بقیہ آبادیٔ ملک بھی اُسے اک بالکل بیرونی زبان کے مقابلے میں بہت زیادہ آسانی سے حاصل کر سکتی ہے! بسہولت کے بعض مزید وعمیق وسائل اِن ساری ہندوستانی زبانوں کی اساسی لسانی ہم جنسی اور اک عام تہذیب و تمدن کی باہمی یکسانی ہے!

"اچھا ترکیب کے اعتبار سے "ہندوستانی" کی ماہیت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ فارسی نما اُردو اور سنسکرت نما ہندی کے درمیان وہ اک "خیر الامور اوسطہا" کی سعادت کی مایہ دار ہے! ——— بلاشبہ ملک میں اور بہت سی "بولیاں" بھی ہیں، لیکن دراصل یہ بے زبان عوام کالانعام کی زبانیں ہیں! عامۃ الناس کی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ان میں بعض اپنے مادرانہ سرچشموں میں مدغم ہو جائیں گی، اور کچھ آپس میں ضم ہو کر یک رنگی کی وحدت اختیار کر لیں گی!

"اب رسم الخط کے معاملے کو لیجئے! اُردو اور دیوناگری خط بہت متباین اور لاعلاج و ناگزیر حد تک ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں! اسی باہمی اجنبیت رسم الخط کے نتیجے میں دونوں زبانوں کو بعید یا قریب مستقبل انہیں اک "مجمع البحرین" بنا دے، لیکن اِس وقت تو یہ حصار ناقابلِ انہدام ہے! پس محفلِ قومی میں ہم نے با دلِ ناخواستہ دونوں کو مساوی طور پر باریاب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے!

"لاطینی رسم الخط کی سفارش اور حمایت و اختیار بھی ممالکِ مشرق میں ایک قوی تحریک بن رہی ہے، "ٹائپ رائیٹر، ڈوپلیکیٹر، اور دوسری طباعتی و اشاعتی ایجادات عہدِ حاضر سے فائدہ اُٹھانے کے لئے یہ تجویز بلاشبہ اپنے اندر اک زبردست اپیل رکھتی ہے! تاہم واضح رہے کہ رسم الخط ایک زبان کا "لباس و شعار" ہی نہیں ہے، وہ اُس کی "جلد بدن" ہے! نیز ماضی کے ساتھ واسطۂ تعلق کے اعتبار سے وہ زبان کی شہرگ ہے! مزید براں ہندوستان میں لاطینی خط ہمارے بیہر اجنبی حکمرانوں کی حکومت و استبدادیت سے ہم رشتہ واقع ہوا ہے، اور بدیں وجہ مبغوض سمجھا جاتا ہے!

"الغرض ہندوستانی کے دو مسلمہ رسم الخط ——— اُردو و دیوناگری ——— تو ناگزیر ہیں، لیکن ملک کی بقیہ زبانوں کی تحریریں کم و بیش کوشش و کاوش سے اِنہی دونوں کے اندر جذب ہو سکتی ہیں؛ خاص بے اطمینانی جنوبی ہند کی زبانوں کے متعلق نظر آتی ہے۔ ممکن ہے ماہرینِ اِس بارے میں ہماری تنویر افکار اور حلِ مشکل کی کوئی سبیل نکالیں!

"ہندی اور اُردو کے درمیان صرف و نحو، بیشتر ذخیرۂ الفاظ، اور عام اساسِ لسانی کی بہت سی اہم مشابہتیں ہیں! اُردو کو خارج مسلمانوں

[illegible] سے وابستہ سمجھنا سخت مہمل خیال ہوگا! اُردو میں سوائے اُس کے [illegible] کو بیرونِ ہند کی کوئی بات سمجھ نہیں ہے! وہ شمالی ہندوستان کے [illegible] کے مغل پایہ تختوں، درباروں، دفتروں اور شہری حلقوں کے گرد و [illegible] میں رواج پا جانے والی "فارسی آمیز ہندی" ہی کا دوسرا نام ہے! شمال کے [illegible] ہندو گھرانوں کی وہ بے تکلف زبان ہے! یہ زبان اصطلاحاً "ریختہ" بھی کہلائی! "ہندوستانی" بلکہ عین "ہندی" کا عام اطلاق مدتوں متعارف اُردو پر کیا جاتا رہا، اگرچہ وہ فارسی رسم الخط میں روزِ اول سے لکھی گئی!

"البتہ اُنیسویں صدی کا نیمۂ آخر اک دورِ انقلاب کے افتتاح کا زمانہ ہے! اُردو اور ہندی کی متداول صورتوں کے درمیان "ہٰذا فراق بینی و بینک" کا دوطرفہ پیام اسی وقت گوش زد ہوا! مغرب کی ضربِ شدید ہندو اور مسلمان دونوں پر پڑی! دونوں میں جدا جدا ایک نیم سیاسی، نیم مذہبی قوم پرستی کے جذبے کی پیدائش عمل میں آئی۔ ہندوؤں کو قدرۃً یہاں بھی سبقت حاصل تھی۔ اپنی زبان —— دیوناگری ہندی —— کی سربلندی کی حریفانہ کاوش شروع ہوئی، اور عدالتیں، دفاتر، اور مدارس مدتوں تک باہمی مسابقت کی جولانگاہیں بنے رہے! یہ بلاشبہ بیداری اور تعمیر کی سرگرمیاں تھیں، تاہم تنگ نظری، تنگ دلی، اور فرقہ پرستی بخطِ جلی اُن کی پیشانی پر منقوش تھی! تاہم وسیع تر، ہندوستان گیر، کُلی وطن پرستی اِس کے تعاقب ہی میں تھی! بلاشبہ اجنبیت و مغایرت بڑھی لیکن قومیت و وطنیت کا دھارا بھی اسی کے متوازی بہنے لگا! پہلی چیز نے اگر متعارف ہندی اور اردو کے مغائر و متصادم اُڈّے قائم کئے تو دوسری قوت نے مشترک و مخلوط "ہندوستانی" کا کیمپ جمایا! آج اِس سیاسی اور لسانیت کی ہمرشتگی کو دیکھ لینا بالکل آسان ہے! "متحدہ ہندوستان" کا علمبردار سیاسی مجاہد، لسانیات میں "ہندوستانی" کا ادیب ہوگا! اور دوسری طرف ہندی اُردو کی نزاع کے ایک حریف کا بیرونی روغن ذرا کھُرچ کر دیکھئے، فوراً نیچے سے اک فرقہ پرست، نیز اک سیاسی رجعت پسند ننگا ہو کر نکل آئے گا!

"مجمل طور پر اک دوسرا فرق اُردو اور ہندی میں یہ بھی ہے کہ اول الذکر عموماً شہری زبان ہے، اور آخر الذکر دیہاتی! پس اُردو اور ہندی کے درمیان لسانی وادبی قربت، شہر اور گاؤں کے باہمی معاشی [illegible] تقارب ہی کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہے!

تاہم آج کل کی "ترقی یافتہ" اُردوئے معلیٰ" اور "شدھ ہندی" کے درمیان بظاہر اک وسیع و مہیب ناقابلِ پل بندی خلیج حائل ہو گئی ہے اور ایسا نظر آتا ہے کہ اِن دونوں زبانوں کے لئے ہمیشہ کے واسطے ایک دوسرے سے منقطع ہو جانا مقدر ہو چکا ہے لیکن غائر مطالعہ اور عمیق تشخیص کچھ اور بتاتی ہے! ہندو مسلمانوں کی سابقہ علیحدگی، اک نہایت محدود بالائی طبقے کی تعلیم یافتگی، سیاسی رجعت پسندی، شہر و دیہات کی دوری، ادب و زندگی کی بے تعلقی وغیرہ عموماً یہ اسباب اِس لسانی صورتِ حال کے ناگزیر موجبات رہے ہیں! جدید حال اور مستقبل ان کے اثرات و آثار کا قاتل ثابت ہونے والا ہے! نتیجۃً دونوں زبانوں میں نزدیکی، تعلیم عام کی فراوانی، حریت پسندی، اک پر وقاری تہذیب و ثقافت کی ہمہ گیر خوانی، ادبیات و حیات کی باہم آمیزی، زبان کی بے تکلفی و آسانی و جانداری، اور بالآخر اک حقیقی لسانِ عمومی کے "آفتابِ ہندوستان" کا طلوع، یہ سب ناگزیر حوادث ہوں گے! عالمگیر بین الاقوامی روابط، ہمہ گیر انقلابی قوتیں، خود ہندوستان کے اندر وسائل و اعمالِ آمد و رفت کا المضاعف ہونا یہ مزید طوفانی عناصر ہمیں اپنی اپنی لسانی خلوتوں کی غاروں میں کہاں ٹھہرنے دیں گے! —— ایک آفاق گیر دھارا ہوگا، اور ہم سب اُس کی امواج میں بغلگیر!!

"اُردو ہندی کی موجودہ اجنبیت خیز رقابت نہ صرف ناگزیر ہے، بلکہ مفید و مستحسن بھی ہے! دونوں زبانیں کم از کم بیدار ہو گئی ہیں، مغربی ہند زبانوں کے تراجم سے اپنے پر اک "عملِ تقلیم" انجام دے رہی ہیں، اور اپنا "اعادۂ شباب" کر رہی ہیں، ہر قسم کے اذکار و مباحث اور ہر صنفِ ادب کے موضوعات سے اپنے اجسام کی بالیدگی کر رہی ہیں! اب صرف اُنھیں شہر سے نکل کر دیہات میں پہنچنا ہے، اور خلوتِ مصنوعیت کو ترک کر کے جلوتِ حیات و جہاد میں آنا ہے! وہ اب زیادہ مدت گزرے بغیر یہ کرنے والی ہیں، اور اِس منزل کو پہنچنے سے پہلے ہی نیمۂ راہ میں وہ کہیں ملاقی ہو جائیں گی!!

"حقیقت یہ ہے کہ جس قدر مواقع اِس وقت اُردو ہندی کو [illegible]

اپنے نہایت سہولت اور اُن کو باہمی قربت کے پیدا ہوگئے ہیں، بد قسمتی سے اُن سے ابھی پورا کام نہیں لیا جا رہا ہے: عام مصنفین اک نہایت محدود بزم خاص کے ساتھ ساز و نیاز میں مصروف نظر آتے ہیں! اخبارات تک کا پیام اک تنہا سے عام نہیں پایا جاتا! اگر ہم عامۂ خلائق کو اپنا مخاطب بنائیں تو وہ اُردو اور ہندی کے درمیان قدرِ مشترک ثابت ہوسکتے ہیں! اگر ہم اُن کی زندگی کے حالات و واردات کو اپنا موضوعِ ذکر و فکر بنائیں تو وہ اُردو ہندی کا شُہا الفہ کرا دے سکتے ہیں!

"بنگالی زبان نے اِس شاہراہِ حیات پر گامزنی کی ہے۔ صرف اک وجودِ واحد یعنی رابندرا ناتھ ٹیگور نے بنگالی کی قلب ماہیت اور نشاۃِ ثانیہ انجام دے ڈالی! اُس نے فکر و شعر کے عرش تک پرواز کی اور سہرِ بنگال کے قریوں کی معصوم بولی میں اپنی حُورِ شاعری کو گویا کر دیا! ٹیگور، دیہاتی کشت و باغ کی اک "کویل" ہے! ——— کہا جاتا ہے کہ گجراتی میں بڑی حد تک ایسا ہی خوشگوار انقلاب گاندھی جی کی پاکیزہ اور زندہ قلمکاریوں نے برپا کر دیا ہے! ——— کیا ہمیں اِن "سالکانِ باخبر" کی تقلید کی توفیق ہوگی؟!

"ہندوستانی" جن حدود کو حرام جانے گی وہ ذُو ہیں ———
اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط، اور مُلک کے مختلف "لسانی حلقوں" کی مقامی زبانوں کی انفرادیت! "ہندوستانی" گویا اِن تمام ثانوی وطنی زبانوں کے "دفترِ خارجہ" (Foreign Office) کی زبان ہوگی!

متعارف "ہندوستانی" کے حلقۂ اشاعت کو وسیع کرنے کے لیے ہم "اساسی انگریزی" (Basic English) کے کامیاب تجربے سے بھی اہم رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں! "اساسی انگریزی کا سارا تخیل اور طریقِ تعامل (Esperanto) سے مختلف واقع ہوا ہے! کوئی ۹۰۰ الفاظ کی کل کائنات رکھنے والی یہ زبان ہے! فنی و اصطلاحی فہرست اُس سے قطعاً خارج رکھی گئی ہے، صرف عام تمدنی بین الاقوامی افہام و تفہیم کا اک مختصر، لیکن پورا کارآمد ترجمان اک واسطہ ہے، صَرف و نحو برائے نام ہی اِس میں پائی جاتی ہے! تاہم قواعدِ زبان کو خواہ مخواہ پامال بھی نہیں کیا گیا ہے! عام انگریزی زبان سے اِس کی معرفت اِتنی آشنائی ہو جاتی ہے

کہ اُس کے آئندہ مطالعے اور ادبیات عالیہ کی سخن فہمی کے لیے گویا اک دروازہ کُھل جاتا ہے! "ہندوستانی" کے لغات کا اک باسلیقہ، ماہرانہ، ہنرمندانہ انتخاب، مع مُصرحۂ بالا شرائط و آداب کے ہمارے لیے اک "اساسی ہندوستانی" بنا دے سکتا ہے: حسبِ موقع یہ "اساسی ہندوستانی" عام ہندوستانی اور بشرطِ امکان بعد میں اعلیٰ اردو اور اُتم ہندی کے مراحل طے کرا سکتی ہے:

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را!

"تمام مباحث اور جملہ افکار کا خلاصہ، براہِ راست عملی تجاویز کی صورت میں (مستقبل قریب کے آزاد کانگریسی ہندوستان کی سیاسی، انتظامی، اور تمدنی زندگی کے لیے) حسب ذیل ہوگا:

(۱) ہر صوبے (لسانی حلقے) کی سرکاری، دفتری، اور تعلیمی زبان وہاں کی مخلوق کی غالب جماعتی زبان ہوگی! اِن اغراض کے لیے جو زبانیں مسلّمہ دستور ہوں گی وہ وہی قبل ازیں مذکورہ بالا بارہ زبانیں ہیں! اور اُردو و دیو ناگری دو رسم الخط (برائے "ہندوستانی")!

(۲) "ہندوستانی" کے علاقے والے صوبجات میں ہندوستانی مع اپنے دوگونہ رسم الخطوں کے نافذ ہوگی۔ سرکاری اطلاعنامے ہر دو رسم الخطوں میں جاری ہوں گے۔ مگر ہر اہلِ معاملہ کو اختیار ہوگا کہ کسی اک واحد رسم الخط میں عدالت سے خطاب کرے، دوسرے رسم الخط والی نقل کے اِدخال کا وہ مکلف نہ ہوگا!

(۳) مدارسِ سرکاری (واقع حلقۂ "ہندوستانی") میں ہر طالب علم کوئی ایک رسم الخط حسبِ مرضی اختیار کرے گا۔ البتہ دوسرے رسم الخط کی تحصیل کی صرف "ہمت افزائی" کی جائے گی! ور وہ بھی "ثانوی منزل اسکول" میں!

(۴) "ہندوستانی" چونکہ تمام ہندوستان کی عام سرکاری دفتری زبان بھی ہوگی، لہٰذا ہر حصۂ ملک میں وہاں کی صوبجاتی زبان کے علاوہ "ہندوستانی" میں بھی ہر شہری عدالت سے خطاب کرنے کا مجاز ہوگا!

(۵) بنگالی۔ گجراتی، اور مرہٹی رسم الخطوں کو دیو ناگری خط میں بطریقِ مناسب ضم کرنے کی کوشش کی جائے گی، تاکہ اِس مرکب رسم الخط سے ٹائپ اور چھاپے وغیرہ میں کام لیا جائے۔

(۶) اِسی طریق پر سندھی خط کو اُردو میں اِنہی اغراض کے لیے مُدغم

کیا جائے گا !

(۷) جنوبی ہند کی کسی قدر اجنبی زبانوں کے رسم الخطوں کو دیوناگری تحریر میں جذب کرسکنے کے امکانات کی ماہرین کے ذریعے تفتیش اک نہایت مستحسن و مفید قسمت آزمائی ہوگی !

(۸) لاطینی کا رواج، بحیثیت اک آل انڈیا یا قومی رسم الخط کے، بظاہر خارج از بحث نظر آتا ہے !

(۹) جدید العہد "اُردوئے معلّٰی" اور "شُدھ ہندی" کی موجودہ ترقی و ارتقا پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے، نہ اِسے مضر یا خوفناک یا غیر مستحسن یا غیر متوقع یا غیر فطری سمجھا جائے ! یہ دونوں باہم حلیف ہوں، نہ کہ حریف ! البتہ عالمگیر یکرنگی پیدا کرنے والی قوتیں اور خود اندرونِ ہند میں عامتہ الناس کی تعلیم از خود اک معیاری ہمواری پیدا کردے گی !

(۱۰) آئندہ ہندوستانی مصنفین کو اپنی تحریرات میں روئے سخن عام خلق اللہ کی طرف رکھنا چاہیئے ! اِس طرح اُن کے اُسلوبِ بیان سے قدیم درباری لب و لہجہ اور مرصع کلمات و ترکیبات از خود رُخصت ہو جائیں گے ! اردو ہندی بھی قریب تر آنے لگیں گی !

(۱۱) اک "اساسی ہندوستانی" کی ترتیب عمل میں آنی چاہیئے۔ یہ "عام ہندوستانی" سے اولین اور کمترین روشناسی ہوگی، تاکہ بعد کے مراحلِ تحصیل آسان اور مرغوب ہو جائیں !

(۱۲) خارجی زبانوں سے علمی و فنی اصطلاحات، انسب یہ ہے کہ عموماً بلا ترجمہ، بجنسہٖ اختیار کرلئے جائیں ! ہندوستانی زبانوں سے بھی ضروری مصطلحات حسبِ موقع اخذ کی جاسکتی ہیں، لیکن رفعِ ابہام کے لئے اشد ضرورت ہے کہ ماہرین اُن کی اک مسلّمہ و مصدقہ و مستند فہرست شائع و تشہیر کردیں۔

(۱۳) ہر لسانی صوبے میں اصولاً و عموماً وہاں کی مقامی زبان ہی میں تعلیم دی جائے گی، تاہم اگر اک کافی تعداد اک مختلف زبان کے طلبہ کی چاہے تو اک قابلِ رسائی مرکز کے میسر آنے کی صورت میں صرف ابتدائی تعلیم ان بچوں کو اپنی مادری زبان میں دی جائے گی ! تعداد طلبہ کے معتدبہ ہونے پر ثانوی تعلیم کا بھی یہ اہتمام کیا جاسکے گا ! تاہم صوبے کی مسلّمہ زبان کی تحصیل لازمی ہوگی !

(۱۴) "غیر ہندوستانی" صوبجات میں "اساسی ہندوستانی" کی تعلیم کا آغاز منزلِ ثانوی سے کیا جائے؟

(۱۵) یونیورسٹی کے مراحلِ تعلیمی میں مقامی زبان، ہندوستانی، اور ایک بیرونی زبان جبری مضامین میں داخل ہوں گی ! ثانی الذکر زبان، وطن کی عام تمدنی و مجلسی اشتراک کے لئے، اور آخر الذکر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے تجویز کی جاتی ہے !

(۱۶) اُردوئے معلّٰی، اُتم ہندی، اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی اعلیٰ قسمیں ثانوی منزلِ اسکول میں اختیاری، لیکن یونیورسٹی کے مرحلے میں لازمی ہوں گی ! انہی کے ساتھ کم از کم ایک خارجی زبان بھی شامل ہوگی ! ——— بغرض اعلیٰ مطالعۂ علم و فن !

(۱۷) ہمیں تراجم کی بھی ایک بڑی مُہم شروع کرنی چاہیئے ! ہماری وطنی زبانوں کو اِن سے ارتقا نصیب ہوگا۔ لسانی و ادبی و علمی قوت و حیات کے چشمے اُن کی رگ و پے میں بہیں گے، اور مہذب دنیا کے ترقی کُن علوم و فنون، اور رواں دواں تمدنِ عالم سے ہمارا رابطہ جاری رہے گا !

~~~~~~~~~~~~

[illegible]
~~~~~~~~~~~~

نقد و نظر!

ادارہ

نغمات } قامت، چھوٹی کتابی، ضخامت ۱۴۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد، معہ مخصوص جامعی "گرد پوش" مطبوعہ رفاہ عام پریس آگرہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ، قرول باغ، نئی دہلی قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے۔

"نغمات" ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی کے چند مختصر افسانوں (طبعزاد یا مترجمہ یا مختارہ!) اور ادبی شہ پاروں کا اک خوش سلیقہ گلدستہ ہے! لطیف صاحب اردو "انشائے لطیف" کے غالباً اولین "احسن الخالقین" ہیں! انکی دوشیزۂ جنبشِ قلم —— افسانۂ "لالہ رُخ" (اردو پیکر) —— نے انھیں اردو ادب لطیف کے "ارژنگ چین" کا مانی بنا دیا! "نغمات" ان کی مینا کارانہ ریزہ نگاری کا اک جواہر خانہ ہے! عام موضوع کے اعتبار سے وہ حسن و عشق ہی کی داستانِ رنگین کے نقاش ہیں، لیکن یہاں "نغمات" کی "عمومیت" اس قدر قابلِ ذکر نہیں جس قدر کہ ان کی "خصوصیت"! وہ "حریمِ حسن" کے بعض نادیدہ گوشوں پر سے زرکار پردے اٹھاتے ہیں۔ اور "نہاں خانۂ عشق" کے بکثرت تہخانوں کے اسرار کو سطح پر لاتے ہیں! ؎

بہ نازِ حسن کہ بند و نقاب در خلوت
بہ رازِ عشق کہ آید برہنہ در بازار!

لسانی مآخذ کے اعتبار سے بھی نغمات بہت متنوع اور بوقلموں واقع ہوئے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، جاپانی وغیرہ وغیرہ بکثرت لسانی و ادبی سرچشموں کی یہ اک "گنگا جمنی، جوئے آب" ہے، یا بین الاقوامی ادب و انشا کی اک "قوسِ قزح" —— جس پر کسی مزید رنگ و آہنگ کا اضافہ ناممکن نظر آتا ہے!

اکثر چیزیں واردات عشق و جمال کی "نقاشانہ معاملہ بندیاں" یا "Snap-shots" (فوری فوٹو) واقع ہوئی ہیں! چند جلوؤں پر نظر سے خوش گزرے:

(۱) میں اور وہ باغ میں رنگ و نکہت کی موجوں میں تیر رہے تھے! وہ اس طرح جھکی جیسے طرح شبو کی نازک شاخ لچک جاتی ہے اور گلاب کا ایک پھول توڑ لیا! ...... میں نے دیکھا کہ پھول اس کی سانسوں سے اور رنگین ہو گیا!

(۲) "وہ گاؤں کے باہر اس کی منتظر کھڑی تھی ...... مضطرب چشم انجم کی اک ارضی صورت! وہ آیا۔ یہ کچھ جھجکی! وہ بڑھا۔ یہ کچھ کھنچی، لیکن پھر دونوں ایک تھے، اک عالمِ خود فراموشی میں! سیاح نقاش آیا، اور اس تصویرِ جلب و سلب کو دیکھا ...... لیکن اس کے پاس کوئی رنگ ایسا نہ تھا جس سے وہ اس "روحِ معاشقہ" کو نمایاں کر سکتا! ع

بشکن اے نقاش اینجا خامۂ تصویر را!"

(۳) چینی و جاپانی شاعری کا "اعجازِ ایجاز" ضرب المثل ہے! اک نو وفات جاپانی بچے کا پورا مرثیہ اک "واحد نوائے حسرت" میں مرکوز دیکھئے!

"معلوم نہیں، چمکیلے بھونرے کے تعاقب میں آج وہ کتنی دور نکل گیا!"

نغمات کے آہنگِ سوز و ساز ایسے واقع ہوئے ہیں! (ا۔ا۔خ)

انمول جواہرات } مرتبہ ہرچرن لال، مبلغ رادھا سوامی مت، دیال باغ، آگرہ، ضخامت ۴۴ صفحات، سائز چوڑا رسالجاتی، کاغذ دبیز سفید، کتابت عمدہ قدرے جلی، طباعت صاف، قیمت ۸؍

"رادھا سوامی مت" کے روحانی پیام سے متعلق چند مقالات و مضامین کا یہ اک خوش سلیقہ مجموعہ ہے، جو کتابی صورت میں شائع ہوا ہے، دو ایک مضمون خارجی سرچشموں سے بھی ماخوذ ہیں، لیکن عموماً "سوامی مت" ہی کی دعوت کی ترجمانی "مت" کے منادیوں ہی کے قلم سے کی گئی ہے: "دیال باغ" کی نوآبادی رادھا سوامی مت کا اک ایسا تعمیری کارنامہ ہے جو اپنی نظیر آپ ہے! خیال تھا کہ اس کی پشت پر روحانی و اخلاقی تعلیم بھی اسی پایہ کی ہوگی: "انمول جواہرات" میں جو مواعظِ حسنہ نظر آتے ہیں، حاشا و کلا کہ ہم انھیں قطعاً کوئی ادنیٰ درجے کی چیز نہیں سمجھتے! تاہم بادب اتنا عرض کریں گے کہ ہمیں ان پاکیزہ تحریرات میں "روحانی خود بینی" کی اک مخصوص، گو خفیف، جھلک کو دیکھ کر اک گونہ صدمہ گزرا! ہمارے نزدیک مذہب، روحانی رفعت اور انسانی شرافت کا دوسرا نام

ہے! ہم اِن دونوں چیزوں کی بھی از حیثِ تبلیغ و تلقین کر سکتے ہیں۔ لیکن انھیں کسی طرح اپنی "خانہ ساز ملکیت" نہیں بنا سکتے! آفتاب عالمتاب حقیقت کے، ممکن ہے کسی دَور میں ہم ہی تنہا شاہد ہوں، تاہم آفتاب، دنیا کی اک عالمگیر متاعِ مشترک ہی رہے گا! مذہبی تبلیغ اور "روحانی اشتہار بازی" کے درمیان بھی فرق کرنا چاہیئے! باایں ہمہ ہمیں اعتراف ہے کہ "رادھا سوامی مت" والی اِس عام رَوش سے نسبتہً بہت زیادہ پاک ہیں۔ کہنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہمیں اُن سے اس سے زیادہ بلند و بے نیاز معیار کی توقع تھی! زیرِ تنقید کتابچے کے مضامین بہر حال اعلیٰ، پاکیزہ، کافی متنوع، خاصے فیاضانہ، اور عموماً اک روحانی کیف، البشری الفت، اور اک اخلاقی و اصلاحی اپیل کی اسپرٹ سے متحرک و جولاں ہیں! ہم ناظرین سے اُن کے پڑھنے کی تہ دل سے سفارش کرتے ہیں! (ملنے کا پتہ: سرن داس، پریم نگر، دیال باغ، آگرہ

(ا-ا-غ)

ماہنامہ عالمتاب (لاہور)

عام رسالجاتی سائز، ضخامت ۴۰ صفحات۔ کتابت و طباعت و کاغذ بدرجۂ اوسط۔

مُدیر۔ بسمل دہلوی، چندہ عار سالانہ

عالمتاب کی پہلی جلد کا یہ پہلا ہی نمبر ہے! ساری ہیئت و صورت عموماً "بے نوایانہ" ہی نظر آتی ہے، تاہم مضامین کی جدت، اور حضرتِ مُدیر کی طبعی حرارت و حدت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم اُس کے مستقبل کے متعلق شاید کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے ع

نے اُڑے بُلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز!

تاہم ابھی بڑی بہتری اور بالیدگی کی گنجائش ہے! ہمارا خیال ہے کہ حضرتِ بسمل کا مفرط سوز رسالے کے تعمیری ساز میں شاید حائل ہو جائیگا! خدا نہ کرے کہ ایسا ہو! ہم تہ دل سے دعا کرتے ہیں کہ اس قابل و اور روحِ تپش رکھنے والے ارگن کو کافی مادی ساز و برگ حاصل ہو جائے، تاکہ ع

ہم کو بھی وہ دکھائے کہ مجنوں نے کیا کیا!

اور کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ع

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا!

عالمتاب جدید اُردو ہندوستان کی ہمت افزائی اور دستگیری کا مستحق ہے! (ا-ا-غ)

کہکشاں، دہلی

عام سائز، ضخامت ۳۰ صفحات، کاغذ و کتابت و [illegible] [illegible] [illegible] طباعت [illegible] سالانہ چندہ ایک روپیہ

اک اوسط درجے کا عام ادبی و تمدنی رسالہ ہے۔ "شذرات" میں "پیامِ عروج" کی روحِ رواں دواں نظر آتی ہے، اور "شبد گل" اور "گل و ریحان" کی "دلفریبی" عنوان کے تحت، علی الترتیب دہلی اور اسلامی ہندوستان کی سیاسیات وشخصیات و ذاتیات سے متعلق تکلیف دہ "کلوخ اندازی و سنگ باری"! "اشبانُ المسلمین قاہرہ" پر اتنا سیر حاصل مقالہ ہے کہ قیاس ہوتا ہے کہکشاں اک "مصر کا مجلّہ" ہے! اور ہندوستان کی اسلامی سیاست و معیشت سے اُس کے صفحات اتنے معصوم ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اُس نے یہ کام کانگریس ہی کے نام تمام و کمال "ہبہ" کر دیا ہے! اُس نے صرف "اسلامی ثقافت" اور "اردوئے معلیٰ" کی بقا کے تحفظ کا مطالبہ کرکے بقیہ سب کچھ اُسی کے سپرد کر دیا ہے! ؎

از صحنِ خانہ تا بلبِ بام از آنِ تو
وز سقفِ خانہ تا بہ ثریا از آنِ من!

(ا-ا-غ)

گُل فروش، دہلی

اک ہفتہ وار مصور اخبار، چھوٹا اخباری سائز، ضخامت ۲۰ صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت معمولی، لوح مصور آرٹ پیپر کی۔ مع ایک دلچسپ تاریخی منظر کے نقش کے! چندہ سالانہ ؎ قیمت فی پرچہ ۱؎ — اک معمولی "ہفتہ وار" ہے۔ پالیسی بیکوقت "اشتراکی" و "خلافِ کانگریس" ہے! ہدفِ تعریض و ملامت بیکدم خواجہ حسن نظامی و مہاتما گاندھی ہیں! صف آرائی، بہ یک نفس، خواجہ صاحب کی "ننگِ وجود مجوزۂ جدید کانگریس" اور "انڈین نیشنل کانگریس" کے خلاف نظر آتی ہے! ع کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

اِتنی اندرونی دماغی کشمکش، "اتنا کج دار و مریز" اِتنا "دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" ہے کہ جب ہم سیاسیات کی بساط پر آئیں گے تو جو کچھ "طوفانِ بے تمیزی" برپا ہوگا بآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے! پر المیہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب مجسم و قدِ آدم پوسٹر بھی ہیں، اور باایں ہمہ کانگریس پر جب وہ اپنی "محفوظ کمین گاہ" سے تبرّیٰ بازی کرتے ہیں تو حیرت انگیز صاف گوئی و جرأت "پیشگی" کے مجسمۂ صدق و حق ہو جاتے ہیں!؟ —— بہر حال بے اصول و بدذوق مسلمانوں کے پڑھنے کے لئے اچھا اخبار ہے! (ا-ا-غ)

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی
کی

(۴) چار پُرانی تصانیف

حضرت جوشؔ نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرلئے تھے، لیکن ان کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ اُنھیں شائع کرتے۔ اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گزریں تو مناسب معلوم ہوا کہ ان کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کرکے انھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے،

(۱) جذباتِ فطرت حضرت جوشؔ کی وہ معرکہ آرا نظم ہے جس میں مظاہر قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کردیں۔ قیمت ۳ر رعایتی ار

(۲) اوراقِ سحر یہ حضرت جوشؔ کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۵ر رعایتی ۲ر

(۳) آوازۂ حق یعنی معرکۂ تسلیم و رضا کے سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو، اور جنگِ حق و باطل کے سب سے بڑے سادت حسینؑ ابن علیؓ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ۔ قیمت ۰ر رعایتی ۳ر

(۴) مقالاتِ زرّیں یہ حضرت جوشؔ کے نادر کلمات، فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطائف کا دلچسپ اور کارآمد مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۱ر رعایتی ۴ر

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۲ر۔ وی پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں، بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

پتہ: منیجر کلیم بک ڈپو، حسینی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

شاعر کی راتیں

شاعرِ انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے، جنھیں پڑھکر ہر شخص اپنے کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے، راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مست رات	بدمست رات	راز ونیاز کی رات	انتظار کی رات
اندھیری رات	چاندنی رات	جوانی کی رات	تصورات کی رات
انخات کی رات	جدائی کی رات	اشکوں کی رات	برسات کی رات
[illegible] کی رات	بیخودی کی رات	سرشار رات	بھیگی ہوئی رات
تصورات کی رات	بےچین رات	پیا بن ناگن کالی رات	

قیمت صرف آٹھ آنے

پیغمبرِ اسلامؐ

خواجۂ دوجہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفٰےؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہپارہ جس کی رفعت وعظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے، ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اُترتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کرجاتا ہے، اس کے دلائل قاطعہ کے سامنے ادراک منطق چھپا تنا بھول جاتا ہے، شاعرِ انقلاب پر جب ایک خاص سرشاریت کا عالم طاری ہوا اُسی وقت اُنھوں نے یہ نظم لکھنی شروع کردی، عالمِ بیخودی میں چار روز کی ریاضتِ شاقہ اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا۔ جب تک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرت جوشؔ نے کچھ کھایا نہ پیا، اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے۔ قیمت صرف آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ: منیجر کلیم بک ڈپو، حسینی نواس ۴ دریا گنج دہلی

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبر آبادی کے افسانے

اُردو ادب میں صاحب "لالہ رُخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں، اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمد نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے، اُن کا افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیاتِ حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے، اُن کا طرزِ انشا شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں ـــــ ل احمد صاحب کے افسانے بلا شائبۂ تغلیط ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے، جو اکثر نگار اور دیگر مجلات علمیہ و ادبیہ میں طبع ہو کر مقبولیت دوام حاصل کر چکے ہیں، اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاستِ زبان کے ساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے، اگر آپ ادب و شعریت کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کے لئے مکمل سامانِ سیرابی نظر آئے گا، طباعت و کتابت روشن، و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ضخامت نفیس جلد اور

قیمت صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک

نغمات

نثر کی شاعری

ادب اردو میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حُسن و عشق کی واردات اور نفسیات کو انتہائی مطالعۂ فکر کیساتھ اپنے ذاتی تاثرات و کیفیات کے ماتحت شعریت موسیقی یا موسیقیت بر نثر کی صورت میں صفحاتِ سادہ کو فردوسِ خیال بنا دیا ہے، اس مجموعہ میں جناب لطیف کے ساتھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جنھیں نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے، یہ کتاب بھی مکمل ترتیب و تہذیب کے بعد تیار ہو چکی ہے، اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگائیے، قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ملنے کا پتہ منیجر کلیم بک ڈپو چشتی نواس نمبر ۱۹ دریا گنج، دہلی

ساغر نظامی کا کلیات نظم و غزل

بادۂ مشرق

وہ تاریخی کتاب جس کے دیباچے مشرقی و مغربی علوم کے ماہرین و سربرآوردہ انشا پردازوں نے تحریر فرمائے ہیں، حجم ۶۰۰ صفحات، کاغذ دبیز، چکنا، ۴۰ پونڈ، شاعر و پیام مشرق کتاب ۱۲ ابواب میں منقسم ہے، ہر باب کا سرورق رنگین و مصور ہے، غیر مجلد ٹائٹل اُبھری ہوئی ڈائیوں سے مرصع ہے، اور مجلد ٹائٹل سنہری ڈائی سے مزین، جلد کا کور سنہرا۔ ساری کتاب ہندوستانی شاعری کے جدید پاکیزہ تخیل کی حقیقی تصویر ہے، زندگی اور جوانی، حبِ وطن اور آزادی کے وہ آتشیں نغمات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں، جنھوں نے قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی ہے، اس کے باوجود اس کی قیمت کتاب کے حسن و جمال اور ضخامت کے لحاظ سے بالکل حقیر ہے، یعنی

صرف پانچ روپے علاوہ محصول

۱۰۰
سو شعر کاسٹ

جوش، جگر، اصغر، حسرت، میر، درد، غالب، مومن، داغ

(کے)

ایک ایک سو بہترین اشعار

ہر شخص کو ہر شاعر کا سب کلام پڑھنے اور اُس کی شاعری کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے، اسی خیال سے یہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے، ہر کتاب میں دورِ جدید یا دورِ قدیم کے ایک ممتاز شاعر کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کر کے بہترین سو شعر دیئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، باوجود اختلافِ مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو اپنی پسند کے ملیں گے، جیبی سائز، کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب، سرورق خوشنما، جس پر ہر شاعر کی تصویر بھی ہے۔

قیمت فی کتاب چار آنے (۴)

ملنے کا پتہ منیجر کلیم بک ڈپو چشتی نواس نمبر ۱۹ دریا گنج دہلی

ہمایوں

(۱) ہمایوں اتنا پابندِ وقت ہے کہ جنوری ۱۹۲۲ء سے لے کر (جب یہ جاری ہوا تھا) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی، اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی۔

(۲) ہمایوں، آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے، اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حُسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مدنظر نہیں رکھی جاتی۔

(۳) ہمایوں: کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اس میں فحش اشتہارات، عریاں تصاویر اور مخرب اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں، یہ رسالہ بلاخطر طلبہ اور خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

(۴) ہمایوں، کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کے قابل ہاتھوں میں ہے، اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ "ہمایوں" کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذبِ توجہ ہوتا ہے۔

(۵) ہمایوں، کے مضامین محض پُر از معلومات ہی نہیں ہوتے بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے۔

(۶) ہمایوں، صحتِ زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔

(۷) ہمایوں، میں علمی و ادبی تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) ہمایوں، ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، اور ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

(۹) ہمایوں، کے کاغذ کتابت، طباعت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

(۱۰) ہمایوں، کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زائد قیمت نہیں لی جاتی۔

چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے مع محصول ہے۔

خاکسار، منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

معارفِ جمیل

حضرت حکیم آزاد انصاری کا پہلا مجموعہ کلام

جو غزلوں، مسلسل غزلوں، نظموں، قطعوں، اور رباعیوں پر مشتمل ہے!

وہ حضرات جو اردو شاعری کے ہر دور اور ہر دور کے طرزِ بیان کا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ حکیم آزاد اردو میں جس طرزِ بیان کے موجد و خاتم ہیں، اس کی نظیر ولی سے لے کر اس وقت تک کی اردو شاعری میں کہیں نہیں مل سکتی۔

اگر آپ بالکل انوکھے طرزِ بیان کا مطالعہ فرمانا چاہتے ہیں، تو آج ہی آرڈر دیجئے، اس مجموعہ میں آپ کو تغزل، تفلسف، حسن وعشق، رندی و سرمستی، اور رنگینی و رعنائی ہر شعر کے اندر جھلکتی ملے گی، اور ہر رنگ اتنا گہرا ہو گا کہ آپ کے دل و دماغ پر ایک سرور سا چھا جائے گا۔

کاغذ چکنا، طباعت وکتابت روشن، سائز کراؤن

صفحات ۳۵۶۔

قیمت مجلد ۲/۸، غیر مجلد ۲/-

ملنے کا پتہ: منیجر کلیم بک ڈپو، چینی لواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

اطلاع

جن صاحبان کے پاس پرچہ نہ پہونچے تو وہ دس تاریخ تک پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع کر دیں ورنہ بعد میں پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔ منیجر کلیم دہلی

مشرقی عظمت کا علمبردار

جاپان

مصنفہ: چمن لال سیاح جاپان

مترجمہ: محمود علی خاں (جامعی)

آج سے صرف اسّی برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہو وہ بالکل گمنامی میں پڑا تھا، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا۔ اس انقلاب کی داستان اس تصنیف میں ملاحظہ فرمائیے، جس کے متعلق ڈاکٹر سنڈرلینڈ (امریکہ) فرماتے ہیں کہ یہ کتاب جدید جاپان کے متعلق سب سے زیادہ پُراز معلومات کتاب ہے، صفحات ۲۵۰ بلاک کی ۳۰ تصاویر، مجلد عہ غیر مجلد ۱۱ تصاویر ہر

کائنات

مصنفہ: محمود علی خاں جامعی

اس کتاب میں علم ہیئت کے راز آسان سے آسان زبان اور سادہ سے سادہ اسلوب بیان میں بچوں کو ایسی مثالوں اور دلچسپ دلیلوں سے سمجھائے گئے ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کرۂ ارض کیا ہے، سورج و چاند ستارے کیا ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے، اور ایک دوسرے پر کیونکر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان سوالات کے نہایت کافی جوابات۔ متعدد نقشوں سے مزین صفحات ۸۰۔ قیمت چار آنے علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ: منیجر کلیم بک ڈپو، چینی لواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

مستند اور مجرّب ادویات

ہندوستانی دواخانہ دہلی سے طلب کیجیے. جسے ملک وقوم کے شیدائی، طبی دنیا کے شہنشاہ حضرت مسیح الملک حکیم حافظ اجمل خاں صاحب مرحوم نے سنہ ۱۹۰۳ء میں قائم کیا تھا، اور جو اب آپ کے خلف الرشید عالی جناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب کی سرپرستی میں بدستور جاری ہے۔ ہندوستانی دواخانہ دہلی نے اپنے پینتیس سالہ دورِ زندگی میں ملک میں بہترین مجرب دوائیں پیش کرکے جو عزت و وقار حاصل کیا ہے، اُس کے لحاظ سے یہ دیسی دواؤں کا لاجواب کارخانہ ہے، علاوہ ازیں اس دواخانہ کا ایک خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے کسی کا ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے، بلکہ یہ ملک و قوم کی ملکیت ہے، اس کا منافع جو تقریباً **دو لاکھ روپیہ سالانہ** ہے، مردانہ و زنانہ طبیہ کالج اور اُس کے متعلقہ شفاخانوں پر خرچ ہوتا ہے۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی کی ہزارہا مستند و مجرب دواؤں میں سے مندرجۂ ذیل چار دوائیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں، ان کو طلب کرکے فائدہ حاصل کیجیے۔

جمیلان

جریان اور رقت و سرعت کی لاجواب دوا ہے، مادۂ تولید کی اصلاح کرتی ہے اور قدرتی امساک پیدا کرتی ہے

ترکیب استعمال۔ دو قرص صبح کو نہار منہ دودھ کے ساتھ کھائیں، تیل، ترشی، اور گرم چیزوں سے پرہیز رکھیں،

قیمت

فی شیشی ۳۲ قرص چار روپے آٹھ آنہ

قرص مفاصل

گٹھیا (جوڑوں کا درد) عرق النسا (ٹانگ کا درد) کے لئے نہایت مفید ہے، یہ بیماریاں خواہ کیسی ہی پرانی ہوں، اس دوا کے ایک روز کے استعمال سے بالکل دور ہو جاتی ہیں

ترکیب استعمال، ایک قرص رات کو سوتے سوتے وقت نیم گرم پانی سے کھائیں، تیل ترشی اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز۔

قیمت فی شیشی ۲۱ قرص عہ

قرص جدید

غذا کو ہضم کرتے ہیں، بھوک لگاتے ہیں ریاح کو خارج کرتے ہیں اور نفخ و قراقر کو زائل کرتے ہیں۔

ترکیب استعمال۔ ایک قرص دونوں وقت بعد غذا کھائیں، قابض، بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز

قیمت

۱۰۰ قرص ایک روپیہ دو آنہ

قرص بواسیر

بادی بواسیر کے لئے نہایت مفید دوا ہے، اس کے چند روزہ استعمال سے یہ مرض بالکل دور ہو جاتا ہے،

ترکیب استعمال، اس کے دو دو قرص صبح و شام پانی سے کھائیں۔ قابض بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز

قیمت

۶۴ قرص دو روپیہ

تار کا پتہ ہیڈ کی شفر دہلی **مینیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی** ٹیلیفون نمبر ۵۵۹۶

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں، تعمیلِ حکم کیلئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں میں گُل چینی کی گئی، جب سب پھول دُور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مُرجھائے ہوئے تھے، کہ مہارانی کی حُسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی، کھانا پینا ترک کر دیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا، اور وزرا سے مشورہ طلب کیا، مہتمم توشہ خانہ



نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شبابِ رفتہ ایک بار

(پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا)

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

REG.NO.3694

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی



(کی)

تازہ ترین تصنیف

جُنُون و حِکمَت

(یعنی)

مَجْمُوعَہ رُبَاعِیَات

رُباعی، تمام اصنافِ سُخن میں وہ تنہا رنگین، عمیق، اور فلسفیانہ صنف ہے جو عظیم شعراء کی مشاقی کے نقطۂ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے، اور کسی شاعر کو اُس وقت تک حقیقی رُباعی گو شاعر کا پُرشکوہ خطاب نہیں مل سکتا، جب تک کہ اُس کی بے پناہ جنون پرور تخیلی قوت بلند ہوتے ہوتے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہمدوش نہیں ہو جاتی، بدبخت ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رُباعی بھی، ہر چہ گیرد علتی، علت شود کے زمرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، یاران طریقت نے بزعم خود، یہ سمجھ رکھا ہے کہ رُباعی نام ہے رُباعی کی بحروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا، اور بس ——— حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رُباعی شاعرانہ مطالعے شاعرانہ تفکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینیٔ خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک ایسا جوہر ہے کہ اُس کے ایک حرف کی بھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں، اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تمنا پیدا ہوئی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوا ہوتا تو آپ کا یہ اوّلین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں **جنون و حکمت** کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاض قدرت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں بھی ایک **خیام** پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشکری ہو گی کہ آپ اُس کی قدر نہ فرمائیں، آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک فیٹز جیرلڈ مل گیا تھا جس نے اُسے ایک زندہ قوم سے روشناس کرا دیا تھا، لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مُردہ اور غلام ہے، اور غلاموں کو صرف یہی نہیں کہ کوئی "فیٹز جیرلڈ" نہیں ملا کرتا، بلکہ خود اُس کی قوم بھی اُس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے طیار نہیں ہوا کرتی ——— جنون و حکمت مندرجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے ———

(۱) معارف (۲) خرابات (۳) حسن و عشق (۴) پیرانِ سالوس (۵) متفرقات

قیمت غالباً تین روپے مقرر کی جائے گی، اور بڑی تقطیع پر سوا دو سو صفحہ ضخامت ہو گی

کتاب زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کے اندر تیار ہو جائے گی، جو صاحب ۳۰ ستمبر ۳۳ء تک آرڈر بھیج دیں گے اُن سے پچیس فیصدی کی رعایت کی جائیگی

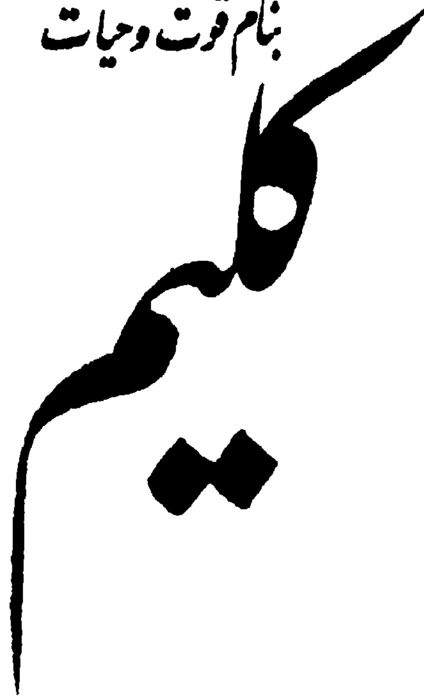
ملنے کا پتہ

مینیجر کلیم بک ڈپو، حسینی نواس، دریا گنج، دہلی


کلیم
مدیر:- جوش ملیح آبادی



زندگی کے سفر کا ھے آغاز



آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا

قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ

ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

دہلی

قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد (۴) — فہرست مضامین بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء — نمبر (۴)

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مُدیر	۱۸۶
۲	رباعیات	"	۱۹۰
۳	جاپان اور لازمی تعلیم	چمن لال سیاح جاپان	۱۹۳
۴	تخیلِ مزدور (نظم)	جناب عبداللطیف صاحب تبسم بھیروی	۲۰۱
۵	سورت کا قہوہ خانہ	جناب سید عباس صاحب جعفری حیدرآباد دکن	۲۰۲
۶	یادگارِ رات (نظم)	جناب سکندر علی صاحب وجد بی اے (عثمانیہ)	۲۰۶
۷	جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	جناب اسرائیل احمد خاں صاحب	۲۰۷
۸	کھری کھری باتیں (نظم)	جناب ارشد تھانوی	۲۳۳
۹	افسانے کا آغاز و انجام	جناب امداد صابری	۲۳۴
۱۰	ایک گدائے قوم کی آواز (نظم)	جناب حکیم آزاد صاحب انصاری	۲۴۳
۱۱	روح کا نغمہ	جناب آکام اکبرآبادی	۲۴۴
۱۲	راز و نیاز (نظم)	جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی	۲۴۶
۱۳	شاعرِ ہندوستان (نظم)	جناب باسط بسوانی	۲۴۷
۱۴	ترجیع شاہی	جناب عبدالرحیم شبلی بی کام	۲۴۹
۱۵	رفتارِ وقت	ادارۂ کلیم	۲۵۷
۱۶	نقد و نظر	"	۲۶۳
۱۷	اشتہارات	مشتہرین	۲۶۵
--		-	--

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم جینتی نواس نمبر ۳ دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مسلم لیگ

نہ ہم سمجھے ، نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

نہ تو میں سیاست کا ماہر ہوں، نہ قوم کا لیڈر، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں، اور اس جانے گا بیانگ دہل اعلان بھی کردینا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی سیاسیات میں جس عیش پسند جماعت کو "مسلم لیگ" کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے اور جو چند جاہ پسند، خطاب یافتہ اور خطاب خواہ بیرسٹروں، ایڈوکیٹوں، زمینداروں، خان بہادروں اور ٹائیوں، سگرٹوں، سگاروں، نیکروں، نائیٹوں، موٹروں، اور سہری والی حریر و پرنیاں میں لپٹی ہوئی، ایک کاہل، سست اور کام چور جمعیت ہے۔ اُسے ایک سخت ناکارہ جماعت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

یہ میں کیونکر جانتا ہوں؟ اس لئے اور صرف اس لئے کہ میری آنکھوں میں روشنی ہے اور سر میں مغز۔

مسلم لیگ اُن چیزوں میں سے نہیں ہے جن کے جاننے کے واسطے کسی خاص غور و فکر اور کسی خاص فنی معلومات یا بعض مخصوص سائینٹیفک آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔

"مسلم لیگ" تو ہر صاحب نظر کے سامنے ا۔
صورت ببیں حالت مپرس

مُدیر

کے نعرے لگاتی ہوئی آتی ہے —— یہ آج کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ قدیم زمانے میں بھی جب کبھی یہ عجوزہ سامنے آئی ہے، اُنھیں برہنگیوں کے ساتھ آئی ہے۔

مسلم لیگ کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ اب وہ قدیم زمانہ نہیں رہا ہے، جب ملک کے افراد سیاسی بصیرت سے محروم تھے —— اب ہندوستان کی بصیرت کم سے کم اس قدر تو ضرور ہی ترقی کرچکی ہے کہ اِدھر کوئی فرضی جماعت سامنے آئی، اور اُدھر اُس نے اُس کی حقیقت کو پہچان لیا۔

ایک حدیث ہے، عجیب و غریب حدیث، میں تو جب اس حدیث پر غور کرتا ہوں، پیغمبر اسلام کی فلسفیانہ عظمت کے سامنے سجدہ کرنے پر مائل ہوجاتا ہوں، یعنی "مومن کے سامنے آنے سے خوف کھاؤ" اس لئے کہ اُس کی بصیرت انسان کے پنہاں ترین عیوب کو بیک نگاہ معلوم کرلیتی ہے —— کتنی زبردست حقیقت بیان کی گئی ہے —— اگر کوئی مجھ سے کہے کہ اس حدیث کی صداقت پر دلیل پیش کرو، تو میں اُس سے یہ کہوں گا کہ اتنا تو غالباً ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر انسان کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک داخلی دوسرا خارجی۔

داخلی پہلو کے تحت انسانی سیرت، جبلت، سرشت، اور موروثی اثرات ہوتے ہیں —— اور یہ رُخ اِس قدر پیچیدہ و پُرفریب ہوتا ہے کہ سالہا سال کے باریک ترین مطالعے کے بعد بھی اس کے متعلق کوئی یقینی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

اِس کے مقابلے میں دوسرا رُخ ہے، جسے خارجی کہتے ہیں، اور یہ رُخ رفتار و گفتار، نشست و برخاست، عادات و اطوار، لب و لہجہ، مشاغل و میلانات، اور چشم و ابرو پر مشتمل ہوتا ہے ـــــ اور اپنے اندر انسان کے داخلی پہلو کے متعلق اس قدر روشن اور واضح علامتیں رکھتا ہے کہ ارباب بصیرت اُسے دیکھتے ہی بیک نگاہ معلوم کر لیتے ہیں کہ فلاں شخص کیسا ہے اور کیسا نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ چہرہ، کتاب دل کی فہرست مضامین نہیں ہوتا۔

اور کون ایسا اندھا ہے جو فہرست مضامین پڑھکر کتاب کی ماہیت نہ علوم کر لے۔

اگر قدرت انسان کے خارجی رُخ کو کافی اُبھار نہ دیتی، اور اس کے آئینے میں اُس کے داخلی رُخ کو جھلکاتی نہ رہتی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے بالغ نظر افراد نہ پیدا کر دیتی جو خارجی رُخ کے مطالعے سے اصلی رُخ کا احاطہ کر لیتے ہیں، تو انسانی سیرت، سرشت، نیت اور جبلت کے معاملے میں دُنیا ہمیشہ اندھی رہتی، اور کھوٹے کھرے میں قیامت تک امتیاز نہ ہو سکتا۔

یہ صورت حال فرد ہی تک محدود نہیں، جماعتیں بھی اسی حلقے میں داخل ہیں۔ جماعتوں کے بھی فرد ہی کی طرح دو رُخ ہوتے ہیں، اور وہ بھی اپنے خارجی رُخ سے پہچان لی جاتی ہیں۔

ایک یہودی کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ جیسے ہی اُس نے پیغمبرِ اسلام کا رُوئے مبارک دیکھا، یکایک چیخ اُٹھا کہ واللہ یہ شخص سچا پیغمبر ہے کیونکہ اس صورت شکل کا آدمی کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

کیا یہودی نے پیغمبرِ اسلام کی سیرت کا مطالعہ کیا تھا۔ یا آپ کی صحبت میں اُٹھا بیٹھا تھا؟ نہیں ـــ بلکہ پیغمبرؐ کے خارجی رُخ، یعنی چہرے میں اُس کی بصیرت نے اُن کا داخلی رُخ جھلکتا ہوا دیکھ لیا تھا، اور اسی بنا پر بے ساختہ چیخ اُٹھا تھا کہ اِس صورت کا آدمی جھوٹا ہو ہی نہیں سکتا۔

اِسی طرح ہرقل کا ایک واقعہ بھی بہت مشہور ہے، یعنی جب اُس کے شکست خوردہ افسر اُس کے سامنے اپنی فتح مندی کی ڈینگ مارنے لگے، تو اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اور وہ یکایک چلّا اُٹھا کہ تم جھوٹے ہو، اِس لئے کہ فاتحوں کے چہرے ایسے نہیں ہوا کرتے۔

بالکل اِسی طرح جب مسلم لیگ میرے سامنے آتی ہے، اسلام کا پرچم اُڑاتی، آزادیٔ وطن کا راگ گاتی، اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتی ہوئی تو اسی وقت میرے دل سے بیساختہ یہ آواز آنے لگتی ہے کہ قسم ہے دلوں کے پوشیدہ بھید جاننے والے کی کہ یہ جماعت نہ تو ہندوستان کو آزاد کرا سکتی ہے اور نہ مسلمانوں ہی کو نجات دلا سکتی ہے، کیونکہ کسی ملک یا ملت کے ناجیوں کے چہرے ایسے نہیں ہوا کرتے۔

ہندوستان کے زندۂ جاوید شاعر کبیر نے شاید مسلم لیگ ہی کے لئے یہ دوہا کہا تھا۔

(اصل)	(ترجمہ)
تورے دِیا دھرم نہیں تن ماں	تیرے دل میں نیکی اور سچائی نہیں
مُکھڑا کیا دیکھے درپن ماں	تو آئینے میں صورت کیا دیکھتا ہے
اینٹھی گینٹھی پگیا باندھے	ٹیڑھی ترچھی پگڑی باندھی ہوئی ہے
تیل چوئے جُلفن ماں	اور زلفوں سے تیل ٹپک رہا ہے
کہیں کبیر سُن بھائی سادھو	اے بھائی سادھو سُنو، کبیر کہتے ہیں کہ یہ
یُو کیا لڑیں رَن ماں	(نازنین) رَن میں کیونکر لڑیں گے؟

غلاموں کی نماز

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے
انساں کو بہر نوع دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنہ جو احمق اُن کو
بے رُوح نمازوں میں لگا دیتا ہے

میں نے اپنے متعلق صاحب صلاح و صلوٰۃ ہونے کا کب دعویٰ کیا ہے کہ مندرجۂ ذیل واقعے کے بیان کرنے سے شرماؤں۔

وہ شخص جس کی زندگی، پبلک لائبریری ہو وہ یہ کیوں نہ بیان کرے کہ میں کئی روز ہوئے کہ اپنے ایک نہایت ہی مخلص، مگر افسوسناک حد تک مذہب گزیدہ دوست کے یہاں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے معمولات شبینہ، اور اُن کی نمازِ مغرب کا وقت آگیا۔

میرے دوست حضرتِ ساغر نے (جو بالغ ہو جانے کے بعد بھی بیسویں صدی میں اِس پر مصر نظر آتے ہیں کہ اُنھیں اب بھی ساغرؔ نظامی ہی لکھا جائے) شاید اِسی موقعے کے لئے یہ شعر کہا تھا کہ:-

مجھے شرع سے کوئی ضد نہیں، پر اس اتفاق کو کیا کروں؟
کہ جو وقت بادہ کشی کا ہو، وہی عین وقتِ نماز ہو

غرضکہ نماز کا وقت آتے ہی، جس وقت کہ یہ رُباعی پڑھی جا سکتی ہے کہ :

ہم دونوں ہیں لے فقیہہ، دیوانے سے
مطلب ہے فقط دل کے بہل جانے سے
ہر شام و سحر کرتے ہیں عیاشی ہم
تو ظرفِ وضو سے، اور میں پیمانے سے

میرے دوست نے ظرفِ وضو اُٹھایا اور وضو کرنا شروع کر دیا۔ اور اُن کے وضو شروع کرتے ہی، تمام حاضرینِ بزم میں آمادگیٔ صلوٰۃ کی ایک لہر دوڑ گئی ـــــــ لوگ دھڑا دھڑ کرسیاں خالی کر کر کے نل کی طرف بھاگنے لگے، اور چشم زدن میں حضرتِ آزاد انصاری، اور میرے سوا کرسیوں پر ایک شخص بھی باقی نہیں رہا۔ گویا ع

ساری بستی میں یہ دو گھر تھے مسلمانوں کے

ہر چند حاضرینِ محفل میں سے اکثر کے چہرے نماز کے تصوّر سے گھبرائے گھبرائے سے نظر آرہے تھے۔ مگر میزبان کی خاطر، اُن کے اعضاء و جوارح وضو کی خاطر جلد جلد حرکت کر رہے تھے، کہ اتنے میں میزبان کی نگاہ ہم دو باغیوں، یعنی حضرت آزاد اور مجھ پر پڑی، ـــ جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ ہم لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر نہایت سکون کے ساتھ، اور قطعیٔ طور پر غیر متحرک بیٹھے ہوئے ہیں، تو وہ میری طرف بڑھے، اور بے پایاں خلوص کے ساتھ مجھ سے خواہش کی کہ میں بھی نماز پڑھوں ـــ جس کے جواب میں میں نے کہا کہ اگر یہ پیرِ دانا، اور یہ مردِ حکیم آزاد انصاری نماز پڑھنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں بھی پڑھ لوں گا۔ چنانچہ آزاد صاحب کو دعوتِ صلوٰۃ دی گئی، اور یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ وہ دعوت کی پہلی ہی ضرب میں سپر انداختہ ہو گئے اور وضو کرنے لگے، اثنائے وضو میں اُنھوں نے مجھ سے ہنسکر کہا آپ مجھے حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں، میں ابھی وطن سے آرہا ہوں، جہاں مُلّاؤں اور شاہ صاحبوں کے سوا میرے گرد و پیش کوئی بھی نہ تھا، اور اُن کے خوف سے وہاں ڈیڑھ ماہ تک برابر نماز پڑھتا رہا ہوں، جب ڈیڑھ ماہ تک ان مولویوں کی خاطر نماز پڑھی ہے تو ایک بار اگر اس وقت بھی پڑھ لوں تو کیا حرج ہے۔

جب معاملہ اس منزل پر پہونچا، اور میرے دوست نے اصرار میں اس قدر غلو فرمایا کہ خود لوٹا لے کر مجھے وضو کرانے کھڑے ہو گئے تو مرتا کیا نہ کرتا، چار و ناچار اُلٹا سیدھا وضو کر کے، حکیم آزاد کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا سب کے ساتھ مُصلّے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شخص اور مُصلّے پر کھڑا ہو جائے جو "گل گشتِ مُصلّے" سے پیمانِ وفا باندھ چکا ہو ـــــــ مُصلّے پر پہونچتے ہی میں نے آسمان کی طرف مُنھ اُٹھا کر کہا کہ اے "اللہ" تو جانتا ہے کہ مجھے تیری عبادت سے کوئی گُریز نہیں، لیکن تقلیدی عبادت، رسمی بندگی، اور بے رُوح نمازیں، اے نیتوں کے جاننے والے مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں ـــــــ "بارِ الٰہا"! تجھے معلوم ہے کہ یہ نمازیں نہیں، نمازوں کی مضحکہ انگیز نقّالیاں ہیں، اور یہ عبادتیں درحقیقت

"بازی، بازی، باریشِ بابا ہم بازی"

کے مصداق ہیں ـــــ اے "ربّ العزّت" میں رندِ آزاد مشرب ہوں، مجھ سے نہ تو رسمی عبادت ہی ہو سکتی ہے، نہ میں تیری جناب میں گستاخی ہی کی جرأت کر سکتا ہوں ـــ تو دیکھ رہا ہے کہ مجھ پر جبر کیا جا رہا ہے، میری اس میں کوئی خطا نہیں، تو گواہ رہنا۔

میرے اس دردناک احتجاج پر نماز سے شغل کرنے والوں نے ایک قہقہہ مارا، اور ایک بھوری سی ڈاڑھی اذان دینے لگی، ـــــــ اذان کے بعد صفیں مرتب کی گئیں اور نیتیں باندھ لی گئیں۔

لوگوں کے نیت باندھتے ہی میرے دل پر وہ کیفیت طاری ہو گئی، جس کے متعلق بہت کچھ لکھنے کے بعد بھی میں اُس کی شرح کرنے کے حق سے کسی طرح بھی عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا ـــ یکایک دیکھتا کیا ہوں کہ میرے ذہنی اُفق پر اسلامی نبوّت کا آفتاب طالع ہو گیا ہے، اور خود رسالتمآبؐ جن پر میرے ماں باپ قربان ہوں، ہماری طرف دیکھ کر ارشاد فرما رہے ہیں کہ لے ہندی مُدّعیانِ اسلام اے موت کے نام سے جی چرانے والے بُزدلو! تم نے میری شریعت کو پارہ پارہ کر ڈالا ہے۔ تم نے میرے برق و آتش سے کھیلنے والے اسلام کی عمارت کو مسمار کر کے رکھ دیا ہے، اور خود میرے کلمے کو بھی، میرے سب سے بلند کلمے کو بھی تم نے پست اور نہایت پست کر دیا ہے۔

خدا کی قسم کھا کر بتاؤ، کیا تم تک میرے یہ کلمات کسی نے اب تک

پہونچانے ہی نہیں ہیں کہ وہ غلام جو آزادی کی سعی سے دست بردار ہو کر غلامی پر قانع ہو جاتا ہے، اُس کی عبادت درگاہِ رب العزت میں مقبول نہیں ہوتی؟ تم کہ غلامی پر قانع ہو، اور باطل سے مصالحت کر چکے ہو، تمہیں نماز پڑھنے کا حق کہاں سے پہونچتا ہے۔ اور تم کس مُنھ سے نماز پڑھتے ہو؟

اے مُدعیانِ اسلام، احکم الحاکمین نے تو قرآن میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم مسلمان رہو گے تو ہم تم کو کسی کا محکوم نہیں بنائیں گے۔ تم اِس کے معنی سمجھے؟ اِس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ مسلمان کسی کا محکوم نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ اِس لئے خلق کیا گیا ہے کہ کرۂ ارض ہی پر نہیں، شمس و قمر تک پر حکومت کرے،

لیکن اِس کے برعکس تم محکوم و مغلوب ہو۔ جس کے صرف دو ہی معنی ہوسکتے ہیں، یعنی یا تو نعوذ باللہ خدائے بزرگ و برتر نے تم سے جھوٹا وعدہ کیا تھا، یا یہ کہ تم سرے سے مسلمان ہی نہیں ہو۔

اِن دونوں میں ایک بات ضرور صحیح ہوگی، یعنی یا تو تم مسلمان ہو اور نقلِ کُفر کُفر نباشد، خُدا جھوٹا ہے، یا تم مسلمان نہیں ہو: اور خدا سچا ہے۔

بولو، تم اِن دونوں باتوں میں سے کسے پسند کرتے ہو، کسے صحیح سمجھتے ہو؟

ہاں تم اِس بات کے کہنے پر مجبور ہو کہ خدا سچا ہے، اور جب خدا سچا ہے تو تم ادعائے اسلام میں جھوٹے ہو — اور جب تم ازرُوئے قرآن و ایمان تم مُسلم ہی نہیں ہو تو پھر یہ تمہارے حج، یہ تمہارے روزے، اور یہ تمہاری نمازیں خدائے قہار سے مسخرا پن نہیں تو اور کیا ہیں،

یاد رکھو جس وقت تم اسلام کا دعویٰ کرتے ہو، اُسی وقت غیر ملفوظ طور سے یہ شکایت اور اعلان بھی کرتے ہو کہ خدا نے تو ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمھیں کسی کا محکوم نہیں کریں گے۔ لیکن ہم مسلمان بھی ہیں اور محکوم بھی، اور ہم سے خدا نے جو وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا تھا۔ آہ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارا دعویٰ اسلام ایک ایسا کلمۂ کُفر ہے جسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔

اِس کے علاوہ قرآن کریم میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ نماز فواحش کو ترک کرا دیتی ہے، لیکن تم نماز بھی پڑھتے ہو، اور فواحش میں بھی مبتلا رہتے ہو، جس کے یہ معنی ہیں کہ تم یہ بات عملاً ثابت کر رہے ہو کہ نماز فواحش کو ترک نہیں کرا سکتی، اور قرآنِ مجید میں اُس کے متعلق جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ صریحی اور بدیہی طور سے غلط اور کس قدر غلط ہے۔

اے اپنے کو مسلمان کہہ کر اپنے خدا و رسول کو رُسوا کرنے والے غلامو! میں تم سے پھر ایک بار پُوچھتا ہوں کہ تم کس مُنھ سے نماز پڑھتے ہو، اور کس مُنھ سے مسلمان ہونے کے دعوے کرتے ہو؟

اگر میں کسی کے حق میں بد دعا کر سکتا تو سب سے زیادہ تم اُس کے مستحق ہو، اور اگر میں کسی پر لعنت بھیج سکتا تو سب سے زیادہ تم اُس کے سزاوار ہو۔ .... کہ تم نے میرے کلیجے میں سوراخ کر دئے ہیں۔ سوراخ! اور تم نے میرے دل میں داغ ڈال دئے ہیں، انگاروں کی طرح سرخ داغ،

یہ کہتے کہتے رسالت پناہ کا رُوئے مبارک سُرخ ہو گیا۔

زمین و آسمان گھومنے لگے، فضا میں کپکپی سی پیدا ہو گئی، در و دیوار ہلنے لگے، اور میرے ہر رونگٹے سے لَو نکلنے لگی۔ میں نے گھبرا کر نیت توڑ دی اور دیوانہ وار اُس مکان سے نکل کر سڑک پر آ گیا، اور تیز تیز قدم رکھتا ہوا وہاں پہونچ گیا، جہاں:-

اے بےخبر زلذتِ شُربِ مدام ما

کی نے پر آلامِ حیات کو "آبِ طربناک" میں غرق کر دیا جاتا ہے۔

سخن کوتہ، مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است امّا
ز ننگِ زاہد اُفتادم بہ کافر ماجرائے ہا

اِطلاع

[illegible] نمونہ کے پرچہ کے لئے ۹ [illegible]

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھا کیجئے، ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ دوسرے یہ کہ پتہ صاف اور خوشخط لکھا کیجئے، تیسرے یہ کہ پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت زیادہ سے زیادہ ہر مہینے کے پہلے ہفتہ کے اندر کرنی چاہیئے بعد میعاد تعمیل نہیں کیجائیگی۔ منیجر

معارف

(جوشؔ)

اوہام سے دل ڈرے ہوئے ہیں ابتک
سیں طرح حقیقتیں مسلے ہوئے ہیں ابتک
فرسودہ اسلاف کے باسی اقوال
کانوں میں یہاں بھرے ہوئے ہیں ابتک

کیا چیز ہے گوشہ نشیں ہے ابتک
کیا ایسی ہی مرتبہ زمیں ہے ابتک
انسان کہاں سے اُڑ کے پہونچا ہے کہاں
اور دین جہاں کل تھا وہیں ہے ابتک

یارب تری کا لوح ابد مضمون یہ کیا؟
صدیوں کیلئے ایک ہی معجون یہ کیا؟
ہر آن بدلنے والے انساں کے لئے
جو پھر نہ بدلنے والا قانون یہ کیا؟

ہاں تصور ہے تجربات کے بعد
موقع ہے طلوع صبح کا رات کے بعد
نادیدہ خدا کی یاد کرنے والو
ہے یاد کی منزل ہے ملاقات کے بعد

ہاں نوعِ بشر اتنی ہی پیچھے ہے جیسی ہے اب تک
انساں رہِ راست پہ نہیں ہے اب تک
اللہ کو ہو مژدہ کہ ہے شیطاں بندہ
تھا روزِ ازل جہاں، وہیں ہے اب تک

اک قاعدہ مستمر ہوا ہے، اور کچھ بھی نہیں
تخمین کا سلسلہ ہے، اور کچھ بھی نہیں
کہتا ہے جسے فخر سے انساں یقیں
اک وہم کا ارتقا ہے، اور کچھ بھی نہیں

قدسی ازل ازاں سے کہہ چکے ہیں گویا
اسرار کی آنچ، سہم کے چکے ہیں گویا
اسماء و صفات سے گزرنے والے
صحبت میں خدا کی رہ چکے ہیں گویا

ہاں فخر و عمل سیاہ کرتا ہوں میں
ہر سانس میں سو گناہ کرتا ہوں میں
اس پہ بھی ہوں قدسیوں سے بڑھ کر معصوم
فطرت! تجھ کو گواہ کرتا ہوں میں

جوش ملیح آبادی

حسنِ مجروح

یوسف کے کلیجے پہ جو سلی تھی کبھی
ہاں مصر میں پیمبر پہ چلتی تھی کبھی
وہ لہر گذر رہی ہے تیرے رخ سے
جو روئے زلیخا پہ مچلتی تھی کبھی

الفاظ میں غلطیدہ ہے جادو گویا
آواز بدل رہی ہے پہلو گویا
لہجے کا ترے درد عیاں اللہ اللہ
لفظوں سے ٹپکتے ہیں آنسو گویا

دل سینۂ نازک میں مچل جاتا ہے
چشمہ تری آنکھوں کا ابل جاتا ہے
اللہ رے سوزِ غم کہ تیرے آگے
پھولوں کا ترے رنگ بدل جاتا ہے

نغمے ترے فریاد ہوئے جاتے ہیں
دل کشتۂ بیداد ہوئے جاتے ہیں
راتیں یہ جوانی کی بہار اور یہ دن
افسوس کہ برباد ہوئے جاتے ہیں

آواز میں غلطاں ہیں نگاہیں گویا
گردن تری کیا ہے تری بانہیں گویا
ہیں کرب سے اٹھی ہوئی باہیں پیچاں
آنکھوں سے نکل رہی ہیں آہیں گویا

کیا عشق کا بھی اثر ہے اللہ اللہ
اپنے سے وہ بے خبر ہے اللہ اللہ
سرہانے سے زانو پہ ہے ارمان جبیں کا
قدموں پہ مرے وہ سر ہے اللہ اللہ

جوش ملیح آبادی

جاپان اور لازمی تعلیم

از چمن لال سیاح

مترجمہ محمود علی خاں (جامعی)

جاپان اسکولوں کا مجموعہ ہے، سارا جاپان خود ایک اسکول ہے یعنی علم و فن کے لحاظ سے وہ اقلیدس ثانی ہے۔ جاپانی قدیم یونانیوں کی طرح فطرۃً نہایت مستعد اور چست و چالاک ہوتے ہیں، اُن کی ذہنیت میں بڑی گنجائش ہوتی ہے وہ ہر چیز کو قبول کرنے کو تیار رہتے ہیں اور ہر نئی اور عجیب چیز کو سیکھنے کے شائق، یہ لوگ علم کی تلاش میں ایسے رہتے ہیں جیسے بطخ پانی کی تلاش میں۔

(ڈاکٹر نیٹوبے)

میں کوئی ماہر تعلیم نہیں ہوں اور نہ مجھے دعویٰ ہے کہ تعلیم کے سے اہم مسئلے پر رائے زنی کر سکوں گا، اس لئے میں ناظرین کے سامنے جاپان کی تعلیمی حالت کے متعلق چند ضروری اعداد و شمار اور خاص خاص واقعات پیش کر دوں گا تاکہ وہ خود یہ طے کر سکیں کہ صحیح تعلیم کیسی نعمت عظمیٰ ہے اور اس کی بدولت کس طرح جاپان ستر سال کے اندر اندر اس قابل ہو گیا کہ برطانیہ اور امریکہ جیسی عظیم الشان سلطنتیں بھی اُس پر رشک کرتی ہیں، بخلاف اس کے ایک سو اسّی سالہ برطانوی سرپرستی کے باوجود ہندوستان کی دنیا میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اس کی وجہ کچھ زیادہ بعید از قیاس نہیں ہے، جاپان کی لازمی تعلیم میں اس کا راز مضمر ہے جو بنگال میں کلایو کی فتح کے تقریباً ایک سو سال بعد وہاں جاری ہوئی تھی، لیکن ملاحظہ کیجئے کہ کیسے شاندار نتائج برآمد ہوئے، آج وہاں ننانوے فی صدی آبادی تعلیم یافتہ ہے۔ جب کہ ہندوستان میں تعلیم کا اوسط صرف نو فیصدی ہے۔

۱۹۳۱ء میں جاپان میں ۴۵۰۹۰ مدارس تھے، اس میں ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹیوں تک ہر قسم کے اسکول شامل ہیں، جن میں ۱۲۴۸۴۷۷۳۰ طلبا تعلیم پاتے ہیں یہ اسکول ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور اُن کا اوسط دس میل میں تین اسکولوں کا پڑتا ہے، طالب علموں کا اوسط آبادی کا بیسواں حصہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جاپان میں ایک گاؤں یا ایک قریہ بھی ایسا نہ ہوگا، جہاں لوگ پڑھتے ہوئے نہ ملیں اور غریب سے غریب طبقے میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو لکھ نہ سکتے ہوں۔ لازمی فوجی بھرتی کے سلسلے میں ہر سال جو امتحانات ہوتے ہیں اُن سے یہ چیز اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، اس موقعہ پر پتہ چلتا ہے کہ ملک کے نوجوانوں میں بہت کم ایسے ہیں جو پڑھنے لکھنے سے نابلد ہوں۔

سرسری طور پر دیکھنے والے متعجب ہوتے ہیں کہ جاپان کو امریکہ اور یورپ سے تعلقات پیدا کئے، ابھی صرف پچاس سال ہی گزرے ہیں، لیکن اس نے تعلیم میں اتنی سرعت کے ساتھ کیسے ترقی کر لی، بہرحال یہ چیز نظر انداز نہیں کی جا سکتی، کہ جاپان ایک قدیم ملک ہے اور جس وقت مغربی تہذیب شروع ہوئی اُسے قبول کرنے اور اُس سے استفادہ کرنے کی جاپان میں پوری اہلیت موجود تھی۔

۱۸۶۸ء سے قبل جاپان کے تعلیمی نظریئے بودھ اور دیگر اثرات کے ماتحت بدلتے رہتے تھے، اس لئے لوگ بیرونی تعلیمات کو قبول کرنے کے اہل تھے

چنانچہ انھوں نے اپنے قومی آئین اور مخصوص جذبات کی امداد سے اپنی ایک خاص تہذیب کی بنیاد ڈال لی، تیجی دور کے ابتدا میں جاپانی لوگ مغربی تہذیب کے اتنے شائق تھے کہ انھوں نے ہر مغربی چیز کو اختیار کر لیا تھا، اور طرح طرح کے اصولوں اور نظریوں کی پیروی شروع کر دی تھی، اس پر اکتوبر ۱۸۹۰ء میں تعلیم کے مسئلہ پر ایک شاہی فرمان جاری ہوا، جس میں ملک کی تعلیمی پالیسی کو بالکل واضح کر دیا گیا، اس کے بعد تمام اسکولوں نے ان اصولوں پر عمل شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا تعلیمی نظام قائم ہو گیا جو ہر طرح قومی ضروریات کے مطابق تھا۔

آج جاپان کا تعلیمی نظام مغربی ممالک کے نظام سے کسی حالت میں کم نہیں ہے اور اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں میں ایک امتزاج پیدا کر دیا ہے جس کی بنیاد ان کا قومی آئین ہے۔

مذکورۂ بالا شاہی فرمان کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اے ہماری وفادار رعایا تجھے معلوم ہو کہ:۔ ہمارے بزرگوں نے ہماری سلطنت کی بنیاد وسیع اور دائمی اصول پر ڈالی تھی، اور نیکی کا بیج بہت گہرا اور ہوشیاری سے بویا تھا، ہماری رعایا جو ہمیشہ وفادار اور سعادت مند رہی ہے، نسلاً بعد نسلاً اس کے حسن کو نمایاں کرتی رہی ہے یہی ہماری سلطنت کی شاندار خصوصیت ہے اور اسی میں ہماری تعلیم کا راز پوشیدہ ہے۔

تم۔ اے ہماری رعایا!! اپنے والدین کے سعادت مند رہو، اپنے بھائی اور بہنوں سے شفقت سے پیش آؤ، اپنی ازدواجی زندگی ہم آہنگی سے اور ایک دوسرے کے سچے رفیق کی حیثیت سے گزارو۔ حیا اور اعتدال کا لحاظ رکھو، ہر ایک سے فیاضی سے پیش آؤ، علم حاصل کرو اور فنون کو رائج کرو۔ اس طرح اپنی ذہنی استعداد اور اخلاقی قوتوں کو بڑھاؤ، علاوہ ازیں عام بہبود اور قومی مفاد کا خیال رکھو، ہمیشہ اپنے آئین کا احترام کرو اور قوانین کی پابندی کرو۔ اس طرح اپنے شاہی تخت کی عظمت کو برقرار رکھو اور اس کی حفاظت کرو جو تمہاری دنیا اور عقبیٰ کی ایک درمیانی کڑی ہے، تم محض ہماری نیک اور وفادار رعایا ہی نہ رہو بلکہ اپنے بزرگوں کی روایات کے علمبردار بھی بنو، یہ وہ شاہراہ ہے جو بلاشک و شبہ ہمارے شاہی بزرگوں نے بتلائی ہے جو ہر زمانے اور ہر موقع پر یکساں کارآمد ہے اور جس پر چلنا ان کی اولاد اور ان کی رعایا کے لئے یکساں لازم ہے، ہماری عین خواہش ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ ہم بھی اسے نہایت احترام کے ساتھ اپنے دل نشین کر لیں تاکہ ہم دونوں ایک سے محاسن پیدا کر سکیں اور ایک ساتھ منزل مقصود پر پہنچیں۔

۳۰ ماہ دہم سنہ ۲۳ میجی (شاہی دستخط و مہر)

جدید تعلیمی نظام ۱۸۷۲ء میں فرانس اور امریکہ کے اصولوں پر قائم ہوا تھا لیکن قدیم جاپانی نظام کی خوبیاں برقرار رکھی گئی تھیں، نئے دور کے چار سال بعد اور جاگیرداری کی تنسیخ کے ایک سال بعد ہی اس پر عمل شروع ہو گیا یعنی اس سال سے جب کہ لازمی فوجی تعلیم کا حکم نافذ ہوا۔

فی الحال جاپان کا سارا انتظام تعلیم حکومت کے ماتحت اور سرکاری محکمۂ تعلیمات کے زیر نگرانی ہے، لیکن اس کا کچھ حصہ مقامی بورڈوں کے بھی سپرد کر دیا گیا ہے، تاکہ مخصوص مقامی ضروریات کا لحاظ رکھا جا سکے، مختلف افراد کو بھی یہ اجازت ہے کہ وہ چند شرائط کے ماتحت نجی اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کریں۔ اس طرح جاپان میں مختلف نوعیت اور مختلف مدارج کے تقریباً ۴۵ ہزار اسکول ہیں، جن میں کوئی ایک کروڑ بیس لاکھ طلبا زیر تعلیم ہیں۔

ابتدائی تعلیم

جاپان میں لوئر اور اپر پرائمری اسکولوں کی تعداد ۲۵،۷۰۰ ہے جن میں ۹۸ لاکھ ۶۰ ہزار بچے تعلیم پاتے ہیں، لوئر پرائمری کی مدت تعلیم چھ سال ہے اور اپر پرائمری کی دو سال یا بعض حالات میں تین سال۔ ۱۹۰۷ء کے قانون کے مطابق ہر لڑکے اور لڑکی پر چار سال کے لئے یعنی چھ سال سے دس سال کی عمر تک مدرسے میں تعلیم پانا لازمی قرار دیا گیا، اس کے بعد اس مدت میں دو سال کا اور اضافہ ہوا، اور یقین ہے کہ عنقریب دو سال اور بڑھائے جائیں گے، ابتدائی مدارس میں مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے، اور شہر

چند مدارس کے سوا کہیں کوئی غیر زبان نہیں سکھائی جاتی۔ چھ سال سے بارہ سال کی عمر کے بچوں میں سے ۴۸ء ۹۹ فی صدی مدرسوں میں جاتے ہیں۔ یہ اوسط اتنا کافی ہے کہ دنیا کے ہر ملک سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کی اس حیرت انگیز اشاعت سے لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوگئی ہے۔ اس کا ثبوت لازمی فوجی بھرتی کے موقع پر ملتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں ان امتحان دینے والوں میں بے پڑھوں کا اوسط ۲۱ء ۰۰ فی صدی تھا لیکن سنہ ۱۹۳۱ء میں ۴۸ء ۰۰ رہ گیا۔

ہر شہر قصبہ یا گاؤں کا یہ فرض ہے کہ ایک دو اسکول ضرور قائم کرے اور چونکہ اس کے اخراجات گاؤں والے برداشت نہیں کر سکتے اس لئے حکومت معقول امداد دیتی ہے۔ شہروں میں تمام اخراجات کا آٹھواں حصہ تعلیم پر خرچ ہوتا ہے، لیکن قصبات اور دیہات میں یہ خرچ نصف تک پہنچ جاتا ہے۔ حکومت نے طریقۂ تعلیم اُستادوں کی قابلیت، حفظانِ صحت اور نصاب وغیرہ کا ایک خاص معیار مقرر کر دیا ہے، اگرچہ اُستادوں کو بہت کم تنخواہ ملتی ہے، یعنی اوسطاً ۵۰ ین سالانہ لیکن عام سول ملازموں کے مقابلہ میں اُنہیں پنشن بہت فیاضی سے دی جاتی ہے۔ غرضکہ جاپان کی ابتدائی تعلیم کا نظام اتنا اعلیٰ ہے کہ وہ اس پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

لازمی تعلیم کی برکات

لازمی تعلیم کے خوشگوار نتائج پیش کرنے کے لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر نیٹو بے مرحوم کی کتاب "جاپان" کے چند اقتباسات پیش کر دوں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک عالم متبحر اور مشہور و معروف اہل قلم تھے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"ہمارے نظامِ تعلیم میں ضرورت سے زیادہ تنظیم کے خواہ کتنے ہی نقائص موجود ہوں اور حکومت کا خواہ اس پر کتنا ہی اثر کیوں نہ ہو لیکن اس کے باوجود اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ اس سے حیرت انگیز نتائج مرتب ہوئے ہیں، مختلف صوبوں کی بولیوں میں جو زبردست اختلاف تھا اور ڈیمیو لوگ اپنے اپنے علاقے میں مقامی تنگ نظری کے پیشِ نظر جس کی تلقین کیا کرتے تھے اب وہ بالکل مٹ گیا ہے، زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ شمال کا ایک شخص جنوب کے اپنے ہم وطن کی بات سمجھ بھی نہ سکتا تھا، وہ دونوں ایک ہی زبان ایک ہی لغت اور ایک ہی قواعد استعمال کرتے تھے۔ لیکن لہجہ میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔

جس چیز پر لازمی تعلیم بجا طور پر فخر و ناز کر سکتی ہے وہ رسالوں اور اخباروں کی غیر معمولی تعداد اور اشاعت ہے، ان میں سے دو اخبار تو روزانہ ۱۵ لاکھ شائع ہوتے ہیں، جاپانیوں کی عام تعلیم کا ایک دوسرا بیّن ثبوت یہ ہے کہ تمام روزانہ اخبارات اپنے پہلے صفحہ پر صرف کتابوں اور رسالوں کا اشتہار دیتے ہیں۔

لازمی تعلیم کا سب سے اہم کارنامہ عوام کا ذہنی اور سماجی ارتقا ہے۔

ایک انگریز مصنف نے اس چیز پر بہم زور دیا ہے کہ جاپانی اسکولوں میں طالب علموں کے درمیان کوئی ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز نہیں کیا جاتا۔ یعنی دولت اور نسل کی بنا پر کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا۔ اسکول جمہوریت کی تعلیم دینے کا سب سے معقول ذریعہ ہے۔ یہ ضرورت وہ اس طرح انجام دیتا ہے کہ ایک طرف لڑکوں کے ذہنی ارتقا کا انتظام کرتا ہے اور دوسری طرف تمام طالب علموں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔ نہ تو جاپان کے امرا کبھی اس قسم کی شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے لڑکے غریب بچے اسکول میں حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ اکثر عالی خاندان شرفا اپنے بچوں کو امرا کے اسکول میں بھیجتے ہیں جو خاص طور پر اُن کے لئے قائم کیا گیا ہے، لیکن اس میں متوسط طبقے کے لڑکے اور لڑکیاں بھی داخل کی جاتی ہیں"

اس قومی نظام تعلیم کا قوم پر ایک یہ بھی احسان ہے کہ اس نے مقامی تنگ نظری کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

ثانوی تعلیم

۱۸ لاکھ لڑکیوں اور لڑکوں میں جو ہر سال ابتدائی تعلیم ختم کرتے ہیں تقریباً دس فیصدی لڑکے اور چھ فی صدی لڑکیاں ثانوی مدارس میں داخل ہوتی ہیں۔ لڑکوں کے ثانوی مدارس کی تعداد ۱۲۱۵ ہے جن میں ۵۵۸ مڈل اسکول اور ۶۵۷ فنی اسکول ہیں، مڈل اسکولوں میں پانچ سال کا نصاب ہے۔ جہاں علم الاخلاق، جاپانی زبان وادب، چینی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبان میں سے کوئی ایک زبان، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، علم الطبعیات، کیمیا، قانون، اقتصادیات، ڈرائنگ، موسیقی اور جمناسٹک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ فنی اسکولوں میں ۱۱۹ صنعتی اسکول، ۳۴۹ زراعتی اسکول، ۲۹۶ تجارتی اسکول، ۱۲ جہاز رانی کے اسکول اور ۱۹۱ دیگر فنون اور پیشوں کے اسکول ہیں۔ ان

سب کی مدت تعلیم مختلف ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً پندرہ ہزار فنی توسیعی اسکول ہیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کو معمولی ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین سال فنی تعلیم دی جاتی ہے، زنانہ ہائی اسکول کی مدت تعلیم جن میں لڑکوں کے مڈل اسکول کے برابر تعلیم دی جاتی ہے چار یا پانچ سال ہوتی ہے۔ کل ۹۷۰ زنانہ ہائی اسکول ہیں جن میں طالبات کی تعداد لڑکوں کے مڈل اسکولوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی ثانوی تعلیم پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے، بلکہ اس کی یہ وجہ ہے کہ لڑکوں کے لئے اور بہت سی راہیں بھی کھلی ہوئی ہیں۔ اس لئے ثانوی مدارس میں اُن کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ زنانہ ہائی اسکول کے نصاب تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُنھیں آداب معاشرت کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ جس میں چائے کی تقریب اور پھولوں کا سجانا بھی شامل ہے، اس مقصد کے لئے ہر مدرسہ نسواں میں جاپانی وضع کا ایک کمرہ ہوتا ہے، جسے "ہال آداب" کہتے ہیں۔ اب لڑکیوں کی شادی زیادہ عمر میں ہونے لگی ہے۔ یعنی عموماً بائیس تیئیس برس کی عمر۔ اس لئے تکمیل تعلیم اور شادی کا درمیانی وقفہ امور خانہ داری کی مشق میں یا خیاطی، موسیقی، چائے، کی تقریباً پھولوں کی آرائش، خانگی ضروریات وغیرہ کی تعلیم اور تجربہ میں صرف کیا جاتا ہے۔ فی زمانہ بڑے بڑے شہروں میں لڑکیاں دفتروں میں ملازمت بھی کرنے لگی ہیں۔

اعلیٰ اور مخصوص تعلیم

وہ نوجوان جو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں پہلے ہائی اسکول (کوٹوگاکو) میں داخل ہوتے ہیں، جہاں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں دو قسم کے نصاب ہوتے ہیں، امتیازی اور معمولی۔ معمولی نصاب کی مدت تعلیم سات برس اور امتیازی کی اس کے بعد تین برس ہے، جاپان میں کل ۳۲ ہائی اسکول ہیں جن میں سے ۲۹ میں صرف امتیازی نصاب کی تعلیم دی جاتی ہے، معمولی نصاب کے داخلے کے لئے اسی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے، جو مڈل اسکول کے داخلے کے لئے! لیکن امتیازی نصاب کے داخلے کے لئے یہ شرط ہے کہ یا تو مڈل اسکول کا چوتھا درجہ پاس ہو یا ہائی اسکول کا معمولی نصاب ختم کیا ہو، یا اسی کے برابر کی قابلیت رکھتا ہو۔ نجی یونیورسٹیاں بھی اسی قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہیں۔ یعنی اُن کے یہاں بھی یونیورسٹی کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے دو تین سال کا ایک ابتدائی نصاب ہوتا ہے۔

جاپان میں چھ سرکاری یونیورسٹیاں ہیں۔ یعنی ٹوکیو، کیوٹو، سنڈائی فیوکیوکا (کیوشو) اور سپورو (ہوکائڈو) اُن میں سے ہر ایک میں مختلف شعبے ہوتے ہیں، کوریا کی سیول یونیورسٹی اور فارموسا کی تائی ہوکو یونیورسٹی وہاں کی حکومتوں کی زیر نگرانی ہیں۔ ان کے علاوہ تیرہ سرکاری، دو پبلک اور چودہ نجی یونیورسٹیاں اور کالج بھی ہیں۔ جن میں سے کیو۔ واسیدا، چوو، میجی۔ نیہن۔ رکیو اور ہوسی ٹوکیو میں اور دوشیشہ کیوٹو میں زیادہ مشہور ہیں گویا کہ اعلیٰ تعلیم کی تمام درسگاہیں بڑے بڑے شہروں میں واقع ہیں۔

اعلیٰ نصاب کے فنی اسکولوں میں اٹھارہ صنعتی اسکول، گیارہ زراعتی اسکول، گیارہ تجارتی اسکول اور بحری تجارت کے اسکول ہیں۔ جن میں ثانوی مدارس کے پاس شدگان کو اُن مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں عموماً تین سال کا نصاب ہوتا ہے، اور یونیورسٹیوں سے ان کا درجہ کم ہوتا ہے۔ اس قسم کی بہت سی نجی درسگاہیں بھی ہیں۔

معلمی کی تعلیم دینے کے لئے عورتوں اور مردوں کے ایک سو پانچ معمولی نارمل اسکول، تین اعلیٰ نارمل اسکول، ٹوکیو، ہیروشیما اور نارا میں، اور ٹرینڈ ٹیچرس ٹریننگ اسکول ہیں۔ علاوہ ازیں چودہ سو کنڈرگارٹن اسکول، تہتر اندھوں کے اسکول، ایک سو بائیس گونگے بہروں کے اسکول اور ۸۰۰ متفرق اسکول ہیں۔

جاپانی تعلیم کی خصوصیات

اب میں جاپان کی تعلیم کی چند خصوصیات بیان کروں گا، وہاں کنڈرگارٹن سے لے کر یونیورسٹیوں اور تحقیقاتی درسگاہوں تک مدارس کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ اُن کا نصاب تعلیم اتنا جامع اور وسیع ہے کہ ہر اُس موضوع کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے جو انسان کے مفید مطلب اور مستقبل کے لئے کار آمد ہو سکتا ہے۔ سارے ملک میں ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہے، رفتہ رفتہ اس کا معیار بھی اعلیٰ ہو گیا ہے۔ چھ برس کے عمر کے بچوں کی تعداد جن پر اسکول جانا لازمی ہے ۱۰۰۰،۹۶،۳۰۰ ہے جن میں سے ۵،۰۱،۲۰۹ لڑکے اور ۴،۹۵،۰۹۱ لڑکیاں ہیں، ان بچوں کی صحت، زندہ دلی اور شگفتگی دیکھنے کے قابل ہے۔ سڑکوں پر جب وہ وردی پہنے باضابطہ لمبی لمبی قطاروں میں مارچ کرتے ہوئے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی منظم فوج جا رہی ہو،

گویا ہر طالب علم ملک کا ایک سپاہی معلوم ہے۔

ذریعۂ تعلیم

ہندوستان کے محب وطن ماہرین تعلیم ایک عرصہ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہندوستانی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ لیکن یونیورسٹیوں پر حکومت کا قبضہ ہے اور وہ اس طرف ذرا توجہ نہیں کرتی۔ بعض غلامانہ ذہنیت کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انگریزی زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم رہنا چاہیئے۔ میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ جاپان جا کر دیکھیں کہ وہاں ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ تک ذریعۂ تعلیم جاپانی زبان ہے۔ یونیورسٹیوں کے تمام شعبوں کی نصابی کتابیں جاپانی میں ہیں۔ اور تمام تحقیقاتی مقالے اور سائنس کے رسالے جاپانی میں لکھے جاتے ہیں۔ خود ہندوستان میں عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر ایک اعلیٰ مثال پیش کی ہے۔ پھر دوسری یونیورسٹیاں اس کی پیروی کیوں نہیں کر سکتیں؟

تعلیم کے اخراجات

۱۹۳۱ء میں تعلیم پر ۳۱۴،۷۶۶،۹۴۶ ین خرچ ہوتا تھا جس میں سے حکومت ۲۰۰،۲۰۳،۴۱ ین اور پبلک بورڈ وغیرہ ۹۲۴،۷۴۳،۶۰۴ ین دیتے تھے۔ درسگاہوں کی مجموعی تعداد ۸۹۸،۵ تھی، جن میں ۳،۷۷،۸۴۱ طالب علم زیر تعلیم تھے۔ ہندوستان میں ۱۹۲۹-۳۰ء میں ۱۷،۰۸۵،۲ سرکاری اور غیر سرکاری درسگاہیں تھیں جن میں ۱۲،۴۶،۵،۲۵۱ طالب علم تعلیم پاتے تھے کل خرچ ۸۰،۱۸،۲۴،۸۲۸،۷۲ روپیہ تھا جس میں سے ۴۴،۵،۳۴،۰،۹،۰۵،۷۱ روپیہ پبلک فنڈ سے دیا جاتا تھا۔ اس طرح ہمارے یہاں اوسط خرچ فی طالب علم ۳۴ روپیہ سالانہ پڑتا ہے۔ حالانکہ جاپان میں صرف ۷ ین سے ۸½ ین تک ہے ہندوستان میں زیادہ روپیہ اعلیٰ تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ انگریز پرنسپلوں اور پروفیسروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ لیکن جاپان میں تعلیم کا تین چوتھائی خرچ ابتدائی تعلیم پر کیا جاتا ہے۔

فرقہ وارانہ درسگاہوں کی لعنت

ہندوستان کی موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش کا سبب دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے مذہبی درسگاہوں میں تنگ نظری کے ماتحت تعلیم پائی ہے۔ پنجاب اس قسم کی درسگاہوں کا مرکز ہے۔ اس لئے وہاں فرقہ وارانہ کشیدگی بھی زیادہ ہے۔

لیکن ہمیں جاپان سے سبق سیکھنا چاہیئے جہاں نصاب تعلیم میں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عام مدارس میں کسی طرح کی مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ البتہ مذہبی انجمنوں کو اختیار ہے کہ وہ اپنے علیحدہ اسکول قائم کرلیں اور مروجہ نصاب تعلیم میں اپنے مذہبی اصولوں کی تعلیم بھی شامل کرلیں۔ پھر بھی وہ مذہبی جنون کی اشاعت نہیں کرتیں۔ نہ دوسرے مذہب والوں کے خلاف عدم رواداری اور نفرت کی تلقین کرتی ہیں، جیسا ہمارے فرقہ وارانہ درسگاہوں کا عام سلک ہے۔

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھے صرف ایک دن کے لئے ہندوستان کا ڈکٹیٹر بنا دیا جائے تو سب سے پہلا کام میں یہی کروں کہ ان فرقہ وارانہ درسگاہوں کو بند کردوں تاکہ لاکھوں نوجوان ان کے زہریلے اثرات سے برباد ہونے سے بچ جائیں۔

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان درسگاہوں نے تعلیم کی روشنی اور سیاسی بیداری پھیلانے میں کافی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انھوں نے قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بو کر اس سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور اس طرح ہندوستان میں برطانیہ کی غلامی قائم رکھنے میں ہمیشہ امداد کی اور اب بھی کر رہی ہیں۔

کالج کی تتلیاں

ہمارے زنانہ اسکول اور کالج آج کل محض خوشنما تتلیاں تیار کیا کرتے ہیں جو عموماً دق کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ گھر کا کام کاج یا محنت کرنا کسر شان سمجھتی ہیں۔ لیکن جاپان اپنی لڑکیوں کو صحیح قسم کی تعلیم دے کر نہایت تندرست، مضبوط، اور ذہین قوم پیدا کر رہا ہے۔ ملک کی قسمت کو بنانے میں ان لڑکیوں کا بہت حصہ ہے۔ یعنی نسوانی مدارس وطن پرست اور اہل مائیں تیار کرنے کے مرکز ہیں۔

لڑکیوں کو ہائی اسکولوں میں بہت سے کارآمد اور مفید کام سکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً کھانا پکانا کپڑے دھونا سینا پرونا کشیدہ کاری وغیرہ، اس کے علاوہ فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، رقص، ڈرائنگ اور پھولوں کی آرائش وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

لڑکیوں کے اسکول مقامی حالات کے لحاظ سے لڑکوں کے اسکولوں سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن اصل خصوصیت دونوں میں مشترک رہتی ہے۔

اُن کی مقبولیت طالبات کی کثیر تعداد سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو اس وقت اسّی ہزار کے قریب ہوگی۔ یہ لڑکیاں چودہ سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہی ہائی اسکول میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اور چار پانچ سال تک تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اعلیٰ طبقہ میں تو اسکول کی سند حاصل کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر معقول جگہ شادی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح چینیوں میں یہ رسم ہے کہ شرافت اور نجابت کے ثبوت کے طور پر دلہن کے جہیز میں کسی مشہور آرٹسٹ کا بنایا ہوا کیمونو یا اس کی صحیح نقل ضرور دی جاتی ہے۔ اسی طرح جاپانیوں میں کسی اچھے اسکول کی سند جہیز کا ایک خاص جزو بن گئی ہے۔

ہر شخص کو یہ تسلیم ہے کہ مستقبل قریب میں ذہنی اعتبار پر عورتیں کافی ترقی کریں گی۔ بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے واقعی حیرت انگیز ترقی کی ہے حالانکہ نظامِ تعلیم کا یہ مقصد نہ تھا کہ اُن کا معیار بلند کیا جائے۔ صنفِ نازک کی یہ بیداری تو نظامِ تعلیم کا ایک غیر متوقع نتیجہ ہے۔ عام طور پر لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی اور بعض کو ناگوار بھی ہوا۔ بہر حال اس سلسلہ میں ناانصافی ہوگی اگر عیسائی مشنریوں کی ان بیش بہا خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے جو انھوں نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

سارے ہندوستان میں کل پندرہ یونیورسٹیاں ہیں۔ لیکن صرف ٹوکیو شہر میں سولہ (۱۶) اور سارے جاپان میں ۴۶ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں سترہ سرکاری ہیں پانچ پبلک بورڈوں کے زیر انتظام ہیں باقی ۲۴ نجی ہیں ۱۹۳۱ء میں ان یونیورسٹیوں میں ۶۹۶۶۶ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ حالانکہ ۱۹۳۰-۳۱ء میں ہندوستان میں طلبا کی تعداد ۶۴۸۳۰ تھی۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہندوستان کی آبادی جاپان سے پانچ گنی ہے۔

جاپان کی یونیورسٹیاں ایک طرف تو مکمل علمی معیار پر نشو و نما کا انتظام کرتی ہیں۔ تاکہ نوجوان تحقیقی کاموں کے اہل بن سکیں اور دوسری طرف ملک کے مختلف اقتصادی اور صنعتی شعبوں کے لئے ہوشیار کاریگر پیدا کرتی ہیں۔

جاپانی غیر معمولی طور پر عملی لوگ ہیں اور محض معمولی تعلیم سے مطمئن نہیں ہوتے۔ اُن کے تمام نظامِ تعلیم کی تہ میں یہ اصول کام کرتا ہے کہ ہمارے بیشتر نوجوان غریب ہیں اور تعلیم کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے نہیں کر سکتے۔ اگر انہیں اپنی روزی کمانے کے لئے صنعت و حرفت کی معقول تعلیم نہ دی جائے۔ چنانچہ صنعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دو سال کا نصاب مقرر ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے نوجوانوں کو قبل از وقت کشمکشِ حیات میں مبتلا ہو جانا پڑتا ہے۔ اس لئے جو شعبۂ زندگی وہ اختیار کرتے ہیں اس کے لئے انھیں مزید تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے بھی توسیعی صنعتی اسکول کھول دئے گئے ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے اختتام پر ثانوی تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے، یہاں سے پھر کئی قسم کے نصاب شروع ہو جاتے ہیں تاکہ ہر شخص اپنے حسبِ منشا اور مجوزہ مستقبل کے مطابق کارآمد مضامین کا انتخاب کر سکے۔

جاپانی بڑے کفایت شعار ہوتے ہیں، وہ قانونِ فطرت کے اس اصول پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ اور ہر چیز کی اصلیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے، چاہے ظاہری طور پر وہ ناقص اور بے کار ہو جائے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ردّی چیزوں کو جو بیکار سمجھ کر پھینک دی جاتی ہیں کسی طرح کارآمد بنالیں۔ کالج کی تجربہ گاہوں میں آپ ردّی کاغذ کے ڈھیر دیکھیں گے، جو کوڑا گھروں سے جمع کر لئے جاتے ہیں۔ سائنس داں ان پر تجربات کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ ان سے پھر نیا کاغذ کیسے بن سکتا ہے۔
صنعتی اسکول جاپان کی صنعتی دنیا کو ماہر کاریگر مہیا کرتے ہیں ۱۹۳۱ء میں ایسے اسکولوں کی تعداد ۹۷۵ اور طالب علموں کی تعداد ۲۰۰۶۸۱ تھی۔

ہماری تعلیم کے نقائص

اب میں ہندوستان کے نظامِ تعلیم کے چند خاص خاص نقائص پیش کروں گا جو ایک مشہور ہندوستانی محبِ وطن نے ظاہر فرمائے ہیں۔

(۱) ہماری تعلیم کی ہندوستان کے باہر کوئی قدر و قیمت نہیں ہے خود ہندوستان میں یہ ہمیں حکومت کا دست نگر بنا دیتی ہے، یا ایسے پیشوں کا محتاج کر دیتی ہے جن کا تعلق نظامِ حکومت سے ہے۔ اور جو نیم سرکاری سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً وکالت، مدرّسی یا دفتر کی کلرکی وغیرہ۔ اس قسم کی تعلیم کی اچھائی برائی اس وقت تک نہیں معلوم ہوتی جب تک ہندوستان کے باہر کسی جگہ روزی کمانے کا اتفاق نہ ہو مثلاً اگر ایک ہندوستانی میٹرک الیف اے یا بی اے پاس امریکہ میں ہو اور اس کا ماہانہ خرچ گھر سے آنے میں دیر ہو جائے یا رک جائے

تو پھر روپیہ پیدا کرنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہیں ہوتی۔ بجز اس کے کہ وہ کسی ہوٹل میں برتن صاف کرے۔ بہرے کی خدمت انجام دے۔ گھروں میں اسی قسم کے ادنیٰ کام کرے یا کھیتوں اور سڑکوں پر معمولی مزدور کی حیثیت سے محنت مشقت کرے۔ یہاں بھی یہ ناقص تعلیم سدِّ راہ ہوتی ہے، کیونکہ اُسے دست و بازو سے محنت مشقت کرنا سکھایا ہی نہیں گیا۔ ہندوستانی اسکولوں اور کالجوں میں دس پندرہ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اپنے ہاتھ سے برتن صاف کرسکے، جھاڑو دے سکے۔ یا کھیتوں اور سڑک پر مزدوری کرسکے،

(۲) کھانا پکانے، کپڑے سینے اور مریضوں کی تیمارداری کرنے کے معاملہ میں اُنھیں بہت کم معلومات ہوتی ہے۔ تیرنا اور کشتی کھینا بھی نہیں جانتے، اپنی مدافعت کے فن سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ کیونکہ تعلیم کے اس اہم جزو کی طرف یہاں کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ البتہ ایک چیز وہ جانتے ہیں لینی اپنا کام نکالنے کے لائق انگریزی بول سکتے ہیں۔ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ جن ممالک میں انگریزی بولی جاتی ہے وہاں وہ بیچ منجدھار میں ڈوبنے سے بچ جاتے ہیں۔

(۳) اب ذرا اس تعلیم کے معاشرتی رُخ کو ملاحظہ کیجیے، جس کا اُنھیں کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ موسیقی سے لطف اُٹھانے کے لئے نہ اُن کے کان ہوتے ہیں اور نہ کسی تصویر کے محاسن سمجھنے کے لئے اُن کے پاس آنکھیں۔ پنجاب اور یوپی والوں کے مقابلہ میں بنگالی اور مرہٹے اپنی خاندانی روایات کی وجہ سے اس معاملہ میں کچھ بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ ذرا شمالی ہند والے سے کہیے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے حاضرین کو محظوظ کرے، پھر دیکھئے وہ کیسے کیسے عذر کرتا ہے۔ اُسے گانا نہیں آتا، باجا بجانا نہیں جانتا۔ نظم یا اشعار بھی نہیں پڑھ سکتا۔ حتیٰ کہ قصے کہانی بھی نہیں کہہ سکتا۔ اُسے کسی محفلِ رقص و سرود میں یا فنونِ لطیفہ کی نمائش میں لے جائیے وہاں وہ ایسا محسوس کرے گا جیسے کسی پرند کو قفس میں بند کردیا۔ نہ کسی چیز کی خوبی کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اُس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ تنہائی میں وہ بدنصیب اپنا وقت کچھ گنگنا کر بھی نہیں گزار سکتا۔ بس وہ اتنا جانتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم عظمت کے راگ گائے، حالانکہ اسے یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ عظمت کا اصل راز کیا تھا۔ یا بعض نوجوان ہندوستان کی پرانی تہذیب کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے اتنا ہی ناواقف ہوتے ہیں جتنے اس تہذیب کے مداح۔ اگر کسی جگہ کچھ لڑکے اور لڑکیاں تفریحِ طبع پر تُلے ہوں تو اُن کے درمیان میں ایک پنجابی نوجوان کی حالت بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ وہ اُن کی دلچسپیوں میں شریک نہیں ہوسکتا بس وہ تو ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنا جانتا ہے۔ اگر اُس سے کچھ اشعار پڑھنے کو کہا جائے تو ممکن ہے کہ لجاتے ہوئے وہ ٹینسن اور شیکسپیر کے کچھ بند پڑھ دے۔ لیکن پنجابی اردو، ہندی یا سنسکرت شاعری کا اُسے ایک مصرعہ بھی نہیں آتا۔ کیونکہ اُن پر تضیعِ اوقات کرنا وہ حماقت سمجھتا ہے۔ اپنے ملک کے گیت بھی اُسے نہیں آتے۔ اکثر ایسے غیر ملکیوں سے اُسے سابقہ پڑجاتا ہے جو اُس کے یہاں کے گیتوں اور افسانوں سے اس سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اس وقت اس کی ذلت اور شرم کی انتہا نہیں رہتی، اور اس کی حالت قابلِ رحم ہوجاتی ہے۔

لالہ لاجپت رائے کے خیالات

اس باب کے اختتام پر میں تعلیم کے مسئلہ میں لالہ لاجپت رائے کے زرّیں خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ اُن محب وطن ہندوستانیوں کے خیالات کا آئینہ ہیں جو جاپان، یورپ اور امریکہ ہو آئے ہیں

"جاپانی تعلیم میں ذہنی اور جسمانی تربیت کا نظام بالکل مکمل ہے، وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ ہر نوجوان کو اپنی مدافعت کا فن اچھی طرح سیکھنا چاہیے۔ اس لئے وہ پٹہ بازی، گھونسہ بازی، تیر اندازی۔ تیراکی۔ گولی چلانے اور دوڑنے وغیرہ کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔ ہر طرح کے اسکول چاہے وہ مذہبی ہوں یا قومی۔ علمی ادبی ہوں یا صنعتی، عام ہوں یا خاص، جسمانی تعلیم کے معاملہ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹینس، فٹ بال اور بیس بال کا بھی کافی انتظام ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ کھیلوں سے انسان مدافعت اور حملہ دونوں کے قابل بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر لڑکا گانا بجانا اور ڈرائنگ بھی جانتا ہے۔ جاپان والے حسنِ فطرت کے تو فطرتاً قدردان ہیں۔ لیکن تعلیم اس ذوق کی تکمیل کردیتی ہے۔ جاپانی تعلیم کا یہ ضروری جزو ہے کہ ہر چیز کے متعلق طالب علم کو کچھ معلومات ہوجانا چاہیے۔ لینی تھوڑا سا پکانا۔ تھوڑا کپڑے سینا وغیرہ ضرور آنا چاہیے۔ آج کل جاپان والے دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ قطبِ شمالی سے لے کر قطبِ جنوبی تک اور جاپان سے کیلی فورنیا تک، انھیں (اور چینیوں کو بھی) ہر جگہ خانگی ملازمت مل جاتی ہے۔ لیکن ہندوستانی اتنے بے ڈھنگے ہیں کہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے معمولی سے معمولی نوکری بھی ملنا مشکل ہوتی ہے۔ آخر کیوں؟ اس لئے

کہ انھیں اس قسم کی تربیت ہی نہیں ملتی۔ جو انسان کو کم سے کم کارآمد تو بنا دیتی ہے، چاہے وہ کسی شعبۂ زندگی میں کمال رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

بے شک آج ہمیں سنسکرت اور انگریزی کے عالموں، سائنس والوں، انجنیروں، ڈاکٹروں، قانون والوں، مورخوں اور ماہرینِ اقتصادیات کی غرض کہ ہر شعبۂ علم کے فاضلوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ہمیں ایسے ہوشیار لوگوں کی ضرورت ہے جو ہر موقع اور ہر صورت میں اپنی ضروریات خود پوری کر سکیں، اور جو چیز بھی موقع پر اُن کے ہاتھ لگے اُسی سے چند پیسے پیدا کر لیں، اسی قسم کی تربیت پر اعلیٰ تعلیم کی عمارت تعمیر ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اعلیٰ مقاصد کے لئے ملک کو اچھے مشین سازوں ہوشیار بڑھیوں، بجلی کے کاریگروں، اور سمجھ دار دوا سازوں کی ضرورت ہے۔ یعنی ملک ایسے لوگ چاہتا ہے جو دوسرے ممالک کے ساتھ صنعت و حرفت میں مقابلہ کر سکیں۔ ہمارے یہاں قواعد داں، لغت داں، زبان داں اور مقرر تو کافی ہیں، اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو فلسفۂ مذہب اور روحانیات کے متعلق بہت کچھ باتیں بنا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ بھوکے پیٹ والوں کے اعلیٰ خیالات کیسے ہو سکتے ہیں ایک قوم جو بیکس اور غلام ہو جس میں معمولی سمجھ بوجھ اور ذوقِ سلیم کا فقدان ہو اور جو اپنی ضروریات زندگی کے لئے دوسروں کی محتاج ہو مذہب کا نام تو رٹ سکتی ہے مگر اس پر عمل نہیں کر سکتی۔ فلسفۂ مذہب کا تذکرہ اب حد سے گزر چکا ہے اور اب یہ ہمارے مرض کا علاج نہیں رہا ہے۔ اب تو ہمیں زندہ مذہب کی ضرورت ہے جو موجودہ دَورِ حیات میں اعلیٰ نصب العین اور شاندار کارناموں کے لئے ہمیں تیار کرے نہ کہ اس تخئیلی زندگی کے لئے جس کا علم صرف غیب دانوں کو ہوگا۔ ہمیں عقلی پرواز کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ کاروباری زندگی کی ضرورت ہے۔ روح سے ہمیں انکار نہیں لیکن فی الحال تو جسم و جان کو یکجا رکھنے کا سوال درپیش ہے، خدا کے لئے گاڑی کو گھوڑے کے آگے مت رکھو، جو چیز مقدم ہونا چاہیئے اُسے مقدم سمجھو اور جو مؤخر ہونا چاہیئے اُسے موخر۔

دنیا نے ہمارے فلسفے، ہمارے تصوف اور ہماری روحانیت کی جس کی ہمارے بزرگوں نے نشوونما کی تھی کافی قدر کی، لیکن اس کے باوجود ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، کیوں کہ ہم میں خودداری، خود اعتمادی، خود اختیاری، اور آزادی کی کمی ہے۔ ہم اپنی قومی زندگی کے بڑے نازک دَور سے گزر رہے ہیں۔ اور ہمیں اپنی قوم کی حالت سدھارنے کے لئے مناسب صورتیں پیدا کرنے کا خاص لحاظ رکھنا چاہیئے آج ہم دنیا کے پردے پر سب سے ذلیل اور حقیر سمجھے جاتے ہیں، حتیٰ کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی ذرا عزت نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم صحیح تعلیم سے محروم ہیں۔

آہ! یہ ناکارہ موجودہ تعلیم!! کاش اگر یہ نہ ہوتی تو ہم اس کشمکش حیات میں اس سے کہیں بہتر رہتے، کیوں کہ اس نے تو ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

اب سے بیس سال پہلے لالہ جی نے اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا لیکن ہم اب تک اپنے نظامِ تعلیم میں ان نقائص کی اصلاح نہیں کر سکے ہیں۔ مانا کہ حکومت اس معاملہ میں ہماری مدد نہیں کرتی۔ لیکن آخر خود ہم نے عوام کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے سلسلے میں کیا کیا ہے۔ ہر ہندوستانی کا یہی فرض ہے۔ اور اگر وہ اس فرض کو انجام دینے پر دل و جان سے لگ جائے تو دس سال کے اندر اندر سارا ملک تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے۔ لیکن گاندھی کے سوا کون ہزاروں نوجوانوں کو اس خدمت پر آمادہ کر سکتا ہے کہ وہ دیہات میں جا بسیں اور تعلیم، حفظانِ صحت اور صنعت و حرفت کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنا لیں۔ تعلیم ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔ اور اگر ہماری قوم تعلیم حاصل کرلے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔

سماجی تعلیم

باوجودیکہ جاپان کا نظامِ تعلیم بالکل مکمل ہے۔ لیکن پھر بھی عوام کی علم کی پیاس بجھانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ اسکول کی تعلیم ختم کر لیتے ہیں وہ اپنا مطالعہ جاری رکھنے کے ذرائع کی تلاش میں رہتے ہیں اور دنیا کی عام رفتار اور اپنے خاص شعبۂ زندگی میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اُن سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ضرورت بڑی حد تک سماجی تعلیم سے پوری ہوتی ہے جس کی حکومت ہر طرح ہمت افزائی کرتی ہے۔ اخبار و رسائل کا سماجی تعلیم میں خاص حصہ ہے۔ جاپان کے ناظرین کو تصنیف و تالیف اور ترجموں وغیرہ کی صورت میں مطالعہ کا کافی سامان ملتا ہے وہاں بائیس ہزار مطبوعات جدیدہ اور دس ہزار طبع ثانی کا سالانہ اوسط ہے۔ علاوہ ازیں کوئی پچاس ہزار رسائل نکلتے ہیں۔

کتب خانوں کا بھی سماجی تعلیم سے خاص تعلق ہے۔ اُن کی تعداد ساڑھے چار ہزار کے قریب ہوگی۔ ان میں سے بعض نجی ہیں اور بعض تعلیمی اداروں اور

مقامی بورڈوں وغیرہ کے زیر اہتمام ہیں۔ مختلف انجمنوں کی طرف سے مسائل حاضرہ پر اور سائنس پر لیکچروں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے اور بڑے بڑے اخباروں کے یہاں سینما کے ذریعہ تعلیم کی اشاعت کے لئے محکمے قائم ہیں۔

سماجی تعلیم کی سب سے اہم جماعتیں نوجوان مردوں اور نوجوان عورتوں کی انجمنیں ہیں۔ جن کا مقصد اچھے شہری پیدا کرتا ہے۔ وہی لوگ اُن کے رکن ہو سکتے ہیں جو ابتدائی تعلیم ختم کر کے کسی روزگار میں لگ گئے ہیں۔ یہ انجمنیں ہر گاؤں اور ہر قصبے میں موجود ہیں۔ نوجوان مردوں کی انجمنوں کی تعداد ۲۰۰و۱۵ ہے جن میں ۰۰۰و۵۳۰و۲۵ ۱ اراکین ہیں اور عورتوں کی انجمنوں کی تعداد ۰۳۲۳و۱۳ ہے جن میں ۰۰۰ ۵۵ اراکین ہیں، یہ انجمنیں مختلف قسم کے جلسے کرتی ہیں۔ مدارسِ شبینہ کھولتی ہیں اور طرح طرح کی سماجی تحریکوں میں حصہ لیتی ہیں۔ اُن کے علاوہ بوائے اسکاوٹ کی تحریک بھی سنہ ۱۹۲۱ء میں انگریزی اصولوں پر جاری کی گئی ہے۔ یہ اسکاوٹس بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس وقت جاپان میں اِن کی ۰۳۷ جماعتیں ہیں جن میں ۰۲۹و۷۱ اراکین ہیں۔

جاپان میں سو سے زیادہ عجائب خانے ہیں، اور ہر علاقہ میں وہاں کی پیداوار کی ایک مستقل نمائش گاہ ہے، اس کے علاوہ متعدد چڑیا گھر اور ایسے باغات ہیں جن میں ہر قسم کے درخت پودے، پھول اور بیلیں موجود رہتی ہیں۔ محکمۂ تعلیم پبلک کے استفادہ کے لئے وقتاً فوقتاً منتخب کتابوں، اچھے سے اچھے فلموں اور بہترین ریکارڈوں کی فہرست شائع کیا کرتا ہے۔ ریڈیو بے انتہا مقبول ہے اور ریڈیو سننے والوں کی تعداد اس وقت دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یعنی ہزار افراد میں سے ۱۶۰ شخص ریڈیو سنتے ہیں۔ اس کے روزانہ پروگرام میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں۔ جن میں سماجی تعلیم کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔

خوشکہ جاپان نے ہمارے سامنے اس کی ایک زندہ مثال پیش کر دی ہے کہ ایک قوم تعلیم پانے کے بعد کیا کچھ کر سکتی ہے، کاش ناظرین اس سادی سی بات کو سمجھ سکیں کہ جاہل لوگ اگر تعداد میں لاکھوں بھی ہوں پھر بھی وہ کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنی جہالت کے باعث اکثر نازک مواقع پر خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن جب علم کا ہتھیار اُن کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو ایک منظم فوج کی طرح قوم پر جانیں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم جنگِ آزادی میں عوام کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو "ہر گھر میں تعلیم" "ہر خاندان میں تعلیم" یہی ہمارا مسلک اور یہی ہمارا نعرۂ حریت ہونا چاہئے۔

تخیّلِ مزدُور

میرے انوارِ تبسم سے جہاں تابندہ تر
میری محنت خالقِ سیم و طلا لعل و گہر

میرے احساسِ نمو سے آبروئے بحر و بر
میری خوں افشانیوں سے تابشِ لعل و گہر

میری ہستی سے ہے قائم گردشِ لیل و نہار
میری زحمت سے وقارِ رحمتِ پروردگار

دامنِ غم سے مرے وابستہ ہے ذوقِ نشاط
میرے آنسو میں جھلکتی ہے ضیاءِ انبساط

بندگی سے ہے مری اربابِ زر کا اعتبار
میری پستی سے ہے قائم رفعتِ سرمایہ دار

لیکن اب میری شبِ خوابِ گراں کٹنے کو ہے
تیرگی کافور ہونے کو ہے پو پھٹنے کو ہے

میری شامِ زندگی ہے جلوہ دارِ صبحِ نو
اک جہانِ تازہ و تابندہ تر ہے در جلو

ہر رگ و پے میں رواں میرے ہے خونِ زندگی
رہ نہیں سکتا میں اب صیدِ زبونِ زندگی

امتیازِ بندہ و خواجہ مٹانے کے لئے
آسماں بیتاب ہے بجلی گرانے کے لئے

عبداللطیف شمیم بھیروی

سورت کا قہوہ خانہ

از ٹالسٹائی   مترجمہ عباس جعفری

"اے بدنصیب غلام! کیا تیرے ناقص ذہن میں خدا کا وجود ہے؟"

یہ تھے وہ الفاظ جو ایک ایرانی ماہرِ الٰہیات نے اپنے غلام سے کہے۔ اس نے اپنی زندگی فطرتِ الٰہی کے مطالعے میں صرف کر کے اس موضوع پر کئی کتابیں پڑھیں اور تصنیف کیں تھیں۔

اس نے خدا کی ہستی کے متعلق اس قدر سوچا کہ اس کے حواس پریشان ہوگئے، یہاں تک غور کیا کہ خدا کے وجود کا منکر ہوگیا۔ اور یہ سمجھنے کے عوض کہ اُس نے اس نے اپنی عقل و فہم کھو دی ہے یہ خیال کرنے لگا کہ کارخانۂ عالم کا چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ جب ملک میں یہ خبر عام ہوئی کہ وہ خدا سے منحرف ہوگیا ہے تو شاہِ ایران نے اُسے جلاوطن کر دیا۔ ایران سے نکل کر اُس نے متعدد ممالک کی سیر کی اور اب ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے سورت کے ایک قہوہ خانے میں داخل ہوا۔ یہاں ملک ملک کے مسافر اور سیّاح جمع ہوتے اور مُبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ اُس نے قہوہ خانے کے ایک ملازم سے افیون طلب کی اور جب افیون نے اس کے دماغ کو متاثر کیا تو اُس نے اپنے حبشی غلام کو جو دروازے کے باہر ٹھہرا ہوا تھا آواز دی اور کہا "بدنصیب غلام! کیا تیرے ناقص ذہن میں خدا کا وجود ہے؟"

"جی ہاں! خدا موجود ہے" غلام نے جواب دیا اور کمربند میں سے ایک چوبی مورتی نکالتے ہوئے کہا "دیکھئے! خدا یہ ہے۔ اس نے ہی پیدائش سے لے کر اب تک میری حفاظت کی ہے ہمارے ملک میں ہر شخص اس درخت کی پرستش کرتا ہے جس کی لکڑی سے یہ خدا بنایا گیا ہے۔"

آقا اور غلام کی گفتگو قہوہ خانے کے تمام مہمانوں نے نہایت حیرت و استعجاب سے سُنی۔ وہ لوگ آقا کے سوال سے متعجب تھے ہی مگر غلام کا جواب بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا۔ ان میں سے ایک برہمن، غلام کے الفاظ سن کر اُس کی طرف مخاطب ہوا "بیوقوف!" اس نے کہا "کیا تیرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ خدا ایک کمربند میں رکھا جائے؟ دنیا میں صرف ایک ہی بھگوان ہے۔ برہما۔ اور وہ تمام دنیا سے بڑا ہے کیونکہ وہی خلاقِ عالم ہے۔ برہما ہی خدائے قادر ہے۔ اسی کی تعظیم میں گنگا کے سارے مندر بنائے گئے ہیں۔ اور یہاں اُس کے سچے پجاری ـــــ برہمن ـــــ اس کی عبادت کرتے ہیں۔ حقیقی بھگوان سے صرف یہی لوگ آشنا ہیں اور دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ ہزاروں سال گزر گئے بسیکڑوں انقلابات ظہور میں آئے۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ وید مقدس پر کاربند رہے اور اسی ایک پرماتما نے اُن کی حفاظت کی۔"

برہمن کا یہ خیال تھا کہ تمام حاضرین اُس کی حمایت کریں گے۔ مگر ایک یہودی دلّال نے جو اُس وقت موجود تھا، جواب دیا "نہیں!" اس نے کہا "حقیقی خدا برہمنوں کا نہیں بلکہ ابراہیمؑ، یعقوبؑ اور اسحٰقؑ کا خدا ہے۔ وہ بجز اپنی برگزیدہ قوم ـــــ بنی اسرائیل ـــــ کے اور کسی کی حفاظت نہیں کرتا۔ ابتدائے عالم سے اس نے ہماری اور صرف ہماری ہی قوم کو پسند کیا ہے۔ اگر اب ہم منتشر اور پراگندہ ہو گئے ہیں تو اس سے تحقیر مقصود نہیں، یہ صرف امتحاناً ہم پر مصیبت نازل کی گئی ہے۔ کیونکہ اس معبودِ حقیقی نے وعدہ کیا ہے کہ ایک دن

میں اپنی قوم کو بیت المقدس میں جمع کرکے اسرائیل کو نوعِ انسانی کا بادشاہ بناکر روانہ کروں گا۔

یہودی نے صرف اسی قدر کہہ پایا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ مگر اطالیہ کے ایک پادری نے جو تبلیغ کے لئے بھیجا گیا تھا اُسے روک دیا: "تم جو کچھ کہہ رہے ہو غلط ہے" اس نے کہا: "تم خدائے عادل کو ناانصاف بتلاتے ہو۔ وہ دوسروں سے بڑھ کر تمہاری قوم کو نہیں پسند کرسکتا۔ ممکن ہے کہ ازمنۂ گزشتہ میں اُس نے بنی اسرائیل کا ساتھ دیا ہو۔ لیکن آج انیس سو سال گزر گئے کہ اس نے انکی قوم کو مقہور کرکے دنیا میں ایسا پریشان کردیا کہ نہ انکا مذہب پھیلایا جاتا ہے اور نہ اس کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ خدا کسی ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر فضیلت نہیں دیتا، بلکہ ان تمام لوگوں کو جو رحمت اور مغفرت کے خواہاں ہیں، کیتھولک کلیسا کی راہ بتلاتا ہے، کیونکہ صرف یہی ایک مذہب ذریعۂ نجات ہے۔"

جب اطالوی کی تقریر ختم ہوئی تو ایک پروٹسٹنٹ پیشوا نے اس کو نہایت عتاب آمیز نگاہ سے دیکھا "تم کس بنا پر کہتے ہو؟" وہ کہنے لگا، "کہ تمہارے ہی مذہب والے بخشے جائیں گے؟ شفاعت کا تو صرف وہی شخص حقدار ہے جس نے انجیل اور مسیح کے احکام کے مطابق عمل کیا ہو اور خدا کی عبادت خشوع اور خضوع کے ساتھ کی ہو۔"

یہ سنکر ایک ترکی نے جو سورت کے ایک محصول خانے میں ملازم تھا، دونوں عیسائیوں پر حقارت کی ایک نگاہ ڈالی اور اس طرح مخاطب ہوا "تم لوگ عیسائی مذہب کو وسیلۂ نجات خیال کرتے ہو، یہ عبث اور لاحاصل ہے۔ تیرہ سو برس ہوئے جب اس "وحدہٗ لاشریک لہ" نے دینِ عیسیٰ کو منسوخ کرکے دینِ محمدی کو رائج کیا۔ اصلی انجیل کا دنیا میں اب کہیں بھی وجود نہیں ہے۔ کلام مجید کے سوا کوئی دوسری کتاب دنیا و آخرت کا دستور العمل نہیں ہوسکتی، تم خود دیکھتے ہو کہ اسلام یورپ اور امریکہ میں کس سرعت کے ساتھ پھیلتا جاتا ہے اور تمہیں نے اس کو تسلیم کیا ہے کہ خدا نے یہودیوں پر عذاب نازل کیا ہے اور اس کے ثبوت میں تم نے یہ حقیقت بیان کی کہ یہودی ذلیل کئے گئے اور اب ان کے مذہب کی اشاعت نہیں ہوتی۔ پھر اسلام کی اصلیت اور صداقت کا اقرار کرنے میں کونسا امر مانع ہے۔ کیونکہ یہی وہ مذہب ہے جس کو بجا طور پر عالمگیر کہا جاسکتا ہے اور اس کے پیرو اور مبلغ مشرق و مغرب شمال و جنوب ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ حشر کے دن شافعِ قیامت پیغمبر اسلام اپنی امت کی شفاعت کے لئے دعا مانگیں گے۔ مسلمانوں کے سوا اور کسی کی مغفرت نہ کرے گا۔ اور ان میں بھی صرف عمرؓ کے پیرو ہی بخشے جائیں گے نہ کہ حضرت علیؓ کے جنھوں نے سچے مذہب سے منہ موڑ کر شاہراہ صداقت کو ترک کردیا ہے۔"

اس پر ایرانی اہل الٰہیات جو حضرت علیؓ کے پیرووں میں سے تھا غضبناک ہوکر آگے بڑھا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس وقت تک مختلف اہل مذاہب میں جو وہاں موجود تھے کچھ ایسی قیل و قال شروع ہوئی کہ اُسکو بات کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ وہ سب خدا کی قدرت اور اُس کی عبادت کے مختلف طریقوں پر بحث کررہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص دلائل و براہین سے یہ سمجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ صرف اسی کے ملک میں خدا کو جانا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور وہیں اُس کی صحیح طور پر عبادت اور پرستش کی جاتی ہے۔

حاضرین نہایت جوش اور سرگرمی کے ساتھ اس مناظرے میں حصہ لے رہے تھے۔ مگر ایک چینی جو کنفیوسیش کی تعلیمات کا متبع تھا، قہوہ خانے کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھا چائے پی رہا اور دوسروں کی گفتگو کو بڑے غور و انہماک سے سُن رہا تھا۔ ترک نے اس کو علیحدہ بیٹھا ہوا دیکھکر اس سے درخواست کی: "میرے عزیز چینی! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم اس کی تصدیق کرسکتے ہو۔ بظاہر تم خاموش معلوم ہوتے ہو۔ لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ جب تم بات کرنے پر آمادہ ہوئے تو میرے خیال کی پُرزور تائید کروگے۔ تمہارے وطن کے اکثر تاجروں سے میری ملاقات ہے اور انھوں نے بار ہا کہا ہے کہ اگرچہ چین میں متعدد مذاہب کی تبلیغ کی جاتی ہے مگر اہل چین اسلام کو سب پر ترجیح دیتے ہیں اور ہزاروں مسلمان ہوتے جارہے ہیں۔ پھر تم سے بڑھکر میرے الفاظ کی تصدیق کون کرسکتا ہے؟ اب تم اپنی رائے کا اظہار کرو کہ خدا اور اس کا سچا پیغمبر کون ہے؟"

دوسروں نے بھی اس سے اتفاق کرتے ہوئے چینی کو اپنی رائے ظاہر کرنے پر مجبور کیا "تمہارا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا" اُنھوں نے کہا "اور ہم اسکو تسلیم کریں گے" چینی کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے سوچتا رہا۔ پھر اُس نے استقلال کے ساتھ نرم اور مطمئن لہجے میں یوں تقریر شروع کی۔

"عزیزو! مجھے ہمیشہ سے ان باتوں سے دلچسپی رہی ہے اور بہت غور کرنے کے بعد میں آخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صرف غرور و نخوت کی وجہ سے

انسان مذہب کے بارے میں ایک دوسرے سے جھگڑتا ہے۔ اگر آپ لوگ میری تقریر سننے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو میں ایک واقعہ بیان کروں جس کے ذریعے سے موجودہ مباحثے کے تمام اختلافات بہ آسانی رفع کئے جاسکتے ہیں۔

چین سے میں ایک برطانوی جہاز پر سیاحت کے واسطے سوار ہوا۔ راستے میں تازہ پانی کے لئے ہمیں جزیرہ "سماٹرا" کے شمالی ساحل پر اترنا پڑا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا اور ہم میں سے بعض لوگ ستانے کے لئے سمندر کے قریب ہی ایک ناریل کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

ہم کو آئے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ ایک اندھا وہاں آیا۔ اس کے متعلق بعد میں ہم کو اس قدر معلوم ہوا کہ اس بات کا پتا چلانے کے لئے کہ آفتاب کیا ہے اور اُس کی روشنی پر کس طرح تصرف حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ مدت دراز تک مسلسل سورج کو گھورتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کی بصارت کمزور ہونے لگی۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا "آفتاب کی روشنی سیال نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ سیال ہوتی تو اُس کو ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈالنے کا امکان ہوتا اور ہوا کی موجوں سے اس میں بھی پانی کی طرح جنبش پیدا ہوتی۔ نہ وہ آگ ہے کیونکہ اگر وہ آگ ہوتی تو پانی نے اُس کو یقیناً سرد کر دیا ہوتا۔ نہ وہ روح ہے کیونکہ آنکھیں اُس کو دیکھ سکتی ہیں۔ نہ وہ مادہ ہے کیونکہ وہ غیر متحرک ہے۔ پس جب سورج کی روشنی نہ تو سیال ہے نہ آگ، نہ روح ہے، نہ مادہ، تو گویا کچھ بھی نہیں ہے" وہ ایسی ہی باتیں کرکے اپنے دل کو تسلی دیا کرتا۔ آفتاب کو مسلسل دیکھتے رہنے اور اس کے متعلق سوچتے رہنے سے اس کی بینائی اور عقل دونوں رخصت ہوگئے۔ اور اُسے کامل یقین ہوگیا کہ سورج کا وجود ہی نہیں ہے۔

اس اندھے کے ہمراہ اس کا ایک غلام بھی تھا جس نے اپنے آقا کو سائے میں بٹھا کر زمین پر سے ایک ناریل اُٹھالیا اور رات کے لئے چراغ بنانے میں مصروف ہوگیا۔ ناریل کے ریشے سے اُس نے ایک بتی بنائی۔ کھوپرے سے تیل نکالا اور بتی کو اس میں بھگو کر چراغ تیار کر لیا۔

اِدھر غلام نے اپنے کام سے فراغت پائی اُدھر اندھے نے ایک آہ کھینچی اور یوں گویا ہوا "اے غلام! کیا میں نے غلط کہا تھا کہ دنیا میں سورج نہیں ہے! کیا تو نہیں دیکھتا کہ کتنی تاریکی چھائی ہوئی ہے؟ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ سورج موجود ہے۔ اگر حقیقت میں سورج کا وجود ہے تو وہ کیا ہے اور اس کی کس چیز سے تعبیر کی گئی ہے"

"مجھے اس کا علم نہیں کہ سورج کیا ہے" غلام نے جواب دیا "ہاں اتنا میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ روشنی کیا ہے۔ میں نے یہ چراغ بنایا ہے جس کی مدد سے میں آپ کی خدمت کرسکتا ہوں اور رات کے وقت اندھیرے میں ہر چیز کو بہ آسانی دیکھ سکتا ہوں" پھر اُس نے ناریل کو زمین سے اٹھالیا اور کہا "یہ ہے میرا آفتاب"

ایک لنگڑے نے یہ گفتگو سنی اور ہنس کر کہا "ظاہر ہے تم تمام عمر نابینا ہی رہے کیونکہ تمہیں اس کا بھی علم نہیں ہے کہ سورج کیا ہے۔ سنو، میں بتاتا ہوں۔ وہ آگ کا ایک گولا ہے جو ہر صبح دریا سے نکل کر شام کو جزیرے کے پہاڑوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ ہم سبھوں نے اس کو دیکھا ہے کہ اگر تم میں بھی بینائی ہوتی تو تم بھی اُس کو دیکھ سکتے"

تھوڑے فاصلے پر ایک ماہی گیر کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا۔ جب لنگڑا خاموش ہوگیا تو وہ قریب آکر بولا "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم نے کبھی اس جزیرے کے باہر قدم نہیں رکھا۔ اگر تم لنگڑے نہ ہوتے اور میری طرح دریا کی سیر کشتی میں باہر نکلتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ سورج پہاڑوں کے پیچھے نہیں چھپ جاتا بلکہ جس طرح ہر صبح سمندر سے نمودار ہوتا ہے اسی طرح ہر شام اسی میں ڈوب جاتا ہے جو کچھ میں کہتا ہوں بالکل سچ ہے کیونکہ ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور ......"

ہمارے حلقے کے ایک ہندوستانی نے جب یہ باتیں سنیں تو ماہی گیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے سخت حیرت ہے کہ تم ایک ذی عقل انسان ہوتے ہوئے کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آگ کا گولا پانی میں چلا جائے اور پانی اس کو نہ بجھا دے۔ سورج آگ کا گولا نہیں بلکہ "دیوا" نامی ایک دیوتا ہے جو ہمیشہ سواری میں بیٹھ کر "میرو" نامی سنہری پہاڑ کا دورہ کرتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ "راگو" اور "کیتو" جو دو بڑے زہریلے ناگ ہیں وہ اس پر حملہ کرکے اُسے نگل جاتے ہیں اور تمام دنیا تیرہ و تار ہو جاتی ہے۔ لیکن جب ہمارے پجاری بھگوان سے دعا اور التجا کرتے ہیں تو وہ رہا کر دیا جاتا ہے۔ صرف تمہارے سے جاہل لوگ

جنھوں نے اپنے جزیرے کے باہر قدم بھی نہیں رکھا۔ تصور کرتے ہیں کہ آفتاب صرف اُنھیں کے ملک پر چمکتا ہے "

ابھی برہمن نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ ایک مصری جہاز کا مالک بول اُٹھا۔ نہیں! تم بھی غلطی پر ہو۔ سورج کوئی دیوتا نہیں ہے اور نہ صرف ہندوستان اور اس کے سنہری پہاڑوں کے اطراف گشت لگاتا ہے۔ میں نے بحرظلمات، بحرعرب، جزیرۂ فلپائن، مداغاسکر اور دیگر ممالک کا سفر کیا ہے۔ سورج صرف ہندوستان ہی کو نہیں، بلکہ تمام دنیا کو روشن کرتا ہے، وہ فقط ایک پہاڑ کے گرد نہیں گھومتا، بلکہ دور مشرق میں جاپان سے طلوع ہوکر مغرب میں انگلستان کے اس طرف غروب ہوجاتا ہے۔ اسی وجہ سے اہلِ جاپان اپنے ملک کو "نپن" یعنی "مولدِ آفتاب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میرے دادا نے بھی جنھوں نے تمام دنیا کی سیاحت کی تھی۔ مجھ سے یہی بیان کیا تھا۔

اس نے اپنی گفتگو کو تمام بھی نہ کیا تھا کہ ہمارے جہاز کے ایک انگریزی مسافر نے اس کی باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا" یہ فخر صرف انگلستان ہی کو حاصل ہے کہ وہاں سورج کی ہر نقل و حرکت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ وہاں کا معمولی آدمی بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ سورج نہ کہیں سے طلوع ہوتا ہے نہ غروب۔ بلکہ دنیا کے گرد چکّر لگاتا ہے۔ اسکا قوی ثبوت یہ ہے کہ ہم نے ابھی ابھی دنیا کا دورہ کیا ہے۔ مگر کہیں بھی ہمارا سورج سے تصادم نہیں ہوا۔ ہم جہاں کہیں گئے تو دیکھا کہ وہ صبح کو نکل کر شام کو غائب ہوگیا، اور ہر مقام سے بالکل اسی طرح دکھائی دیا جیسا کہ اب نظر آتا ہے "

یہ کہتے ہوئے اس نے زمین پر ایک نقشہ کھینچا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ سورج آسمان پر گردش کرتا ہے اور زمین کے اطراف گھومتا ہے۔ لیکن جب اچھی طرح سمجھانے میں ناکام رہا تو جہاز کے ناخدا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ صاحب مجھ سے زیادہ واقف ہیں اور خوب سمجھا سکیں گے:

ناخدا نہایت قابل اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے خاموشی سے تمام باتیں سنیں اور جب اس کو گفتگو کرنے کا موقع ملا تو یوں گویا ہوا ــــــ

"تم لوگ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو اور دوسروں کو بھی مغالطے میں ڈال رہے ہو۔ سورج زمین کے اطراف نہیں پھرتا، بلکہ زمین سورج کے اطراف پھرتی ہے، اور خود بھی گردش کرتی ہے۔ اور ہر چوبیس گھنٹوں کے دوران میں نہ صرف جاپان، فلپائن اور سماٹرا کو بلکہ افریقہ، یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک کو بھی سورج کی جانب پلٹا دیتی ہے۔ سورج صرف کسی ایک پہاڑ، کسی ایک جزیرے کسی ایک سمندر، اور کسی ایک زمین کو منور نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے سیاروں کو بھی ہماری دنیا کے ساتھ روشنی پہونچاتا ہے۔ اگر تم بجائے زمین دیکھنے کے آسمان پر نگاہ ڈالو تو ممکن ہے کہ یہ حقیقت آشکار ہوجائے۔ اور پھر یہ خیال نہ کرو کہ آفتاب صرف تم پر یا تمہارے ہی ملک پر ضیا پاشی کرتا ہے "

"اس حکایت سے ظاہر ہے" چینی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا ـــ کہ" انسان صرف غرور اور تعصب کے باعث ایک دوسرے سے اختلاف کرتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فتنہ و فساد پیدا ہوکر انسانیت کی دیواریں لرز جاتی ہیں۔ جس طرح سورج کے بارے میں ہر ایک نے یہی سمجھا کہ میں حق پر ہوں۔ اسی طرح خدا کے متعلق بھی ہر شخص یہی خیال کرتا ہے کہ صرف میرا ہی مذہب صراطِ مستقیم اور شاہراہِ صداقت ہے اور اسی بنا پر وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے لئے یا کم سے کم اپنے وطن کے لئے ایک علیحدہ دیوتا رکھے اور آفتوں میں اس سے دستگیری چاہے۔ وہ ایک لامحدود ہستی کو جس کے لئے تمام پہنائے کائنات ناکافی ہے ایک ذرا سے مندر میں محصور اور محدود کرکے دوسروں کو اس کے فیضِ عام سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔

کیا کوئی مندر ایک ایسے مندر کا مقابلہ کرسکتا ہے جس کو خود ذاتِ خداوندی نے بہ نفسِ نفیس نوعِ انسانی کو ایک رشتے میں مربوط و وابستہ کرنے کے لئے تعمیر کیا ہے۔

تمام منادرِ انسانی اسی ایک مندر کے نمونے پر ـــــ جس کو دنیا کہتے ہیں ـــــ بنائے گئے ہیں۔ ہر مندر میں اس کے حوض، گنبد، چراغ، تصاویر، مجسمے، مورتیں، قوانین کی کتابیں، کتبے، قربانگاہیں اور پجاری ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کونسا مندر ہے جس میں سمندر کا سا حوض، آسمان کا سا گنبد، سورج، چاند اور تاروں، کیسے چراغ ہیں؟ یا ایسے مجسمے اور مورتیں ہیں، جن کا مقابلہ ذی روح، رحمدل اور ہمدرد انسانوں سے کیا جا سکتا ہو؟ کیا اوصافِ خداوندی کی کوئی ایسی یادگار بھی ہے جو اُن تمام نعمتوں سے جو اُس نے نوعِ بشر کی خوشحالی کے لئے مرحمت فرمائی ہیں۔ زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے؟ کیا کسی قانون کی کتاب میں ضمیرِ انسانی سے بڑھکر توضیح کی گئی ہے۔ کونسی قربانی ایسی نفس کشی کی برابری کرسکتی ہے جس سے محبت کرنے والی انسانی ہستیاں

ایک دوسرے پر نثار ہو جاتی ہیں؟ اور کس قربانگاہ کا تقابل ایک نیک انسان کے دل سے ہو سکتا ہے جس کی قربانی کو خداوندِ عالم خود قبول فرماتا ہے؛ سہ

غافل اند از جلوۂ یزداں فریش آیت تسلیم
سادہ لوحانیکہ تعبیرش بہ انساں کردہ اند

انسانی تخیل جس قدر بلند ہوتا جائے گا اسی قدر ذات باری تعالیٰ کے متعلق علم و عرفان بڑھتا جائے گا۔ اور جتنا اس کا علم بڑھیگا اتنا ہی انسان اس کے صفات سے قریب تر ہو کر درد دل، پاس وفا اور جذبۂ ایمان کی دولت سے مالا مال ہوتا جائے گا۔

پس اس شخص کو ۔۔۔۔۔ جو یہ حقیقت جانتا ہے کہ آفتاب کی روشنی تمام دنیا کو منور کرتی ہے ۔۔۔۔۔ چاہیئے کہ اُس باطل پرست آدمی پر جسے صرف اپنی ہی مورتی میں تجلی دکھائی دیتی ہے اعتراض کرنے اور اُس کو حقیر سمجھنے سے احتراز کرے۔ اور اس اندھے اور بے دین کو بھی جس کی آنکھیں آفتاب کو نہیں دیکھ سکتیں، دوسروں کا مضحکہ اڑانا اور ان کی تذلیل کرنا نہ چاہیئے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ انسانیت پرستی کو اپنا شعار بنائے۔ اپنے دل سے تعصب اور تنگ نظری کی جڑوں کو جس کی تخم ریزی نام نہاد مذہب کی آڑ میں کی گئی ہے اُکھاڑ کر پھینک دے اور نوعِ بشر سے محبت کرنا ماحصلِ حیات سمجھے۔ سہ

ہماں عشق است بر خود ساخت چندیں داستانہا را
کسے بر لفظ یک معنی چنیں دفتر نمی سازد!

چینی کی اس تقریر نے تمام حاضرین کو اتنا متاثر کیا کہ ایک سناٹا سا طاری ہو گیا اور سب نے تہیہ کر لیا کہ پھر کبھی اس موضوع پر رد و قدح نہ کریں گے۔

یادگار رات

تھا مرا سجود اک جنتِ نظر کل رات کو
میں رہا سارے جہاں سے بے خبر کل رات کو

لے رہا تھا اس طرح انگڑائیاں مستِ شباب
موج مے بل کھا رہی تھی سر بسر کل رات کو

مست نظروں کی جنوں انگیزیوں کا ذکر کیا!
تھی سراپا، ہر ادا، صہبا اثر کل رات کو

اُس کے آگے مہوشانِ بزم سب خاموش تھے
ایک گُل، بھاری تھا سارے باغ پر کل رات کو

لال ڈورے تھے سیہ آنکھوں میں کیا حشر آفریں
دل کی دنیا ہو گئی زیر و زبر کل رات کو

کس قیامت کی کشش اس چہرۂ گلگوں میں تھی!
جس سے اک پل ہٹ نہ سکتی تھی نظر کل رات کو

بڑھ گیا تھا عشق سے بھی خود فراموشی میں حسن
میں تو میں، اس کو نہ تھی اپنی خبر کل رات کو

میرے خمخانے میں شاہ مہر طلعت کے طفیل
لٹ رہی تھی دولتِ نورِ سحر کل رات کو

ہر پہر پر ہو رہا تھا، وحدِ لمحے کا گماں
وقت سمٹا جا رہا تھا اس قدر کل رات کو

(سید سکندر علی وجد بی اے عثمانیہ)

جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی!

اسرائیل احمد خاں

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد!
در حرم زائید و در بتخانہ مُرد!

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ بھی مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کے "دَور" کا اب اک "جواں مرگ" ادارہ ہے! ع

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود!

ناواقف پبلک کے سامعے کے لئے یہ کتنی سنسنی خیز "خبر" ہوگی! لیکن تاریخِ انسانی کے کتنے مسلمہ واقعات ہیں جن کا ابتدائی ظہور اک "خبرِ وحشت اثر" ہی کی حیثیت سے ہوا، اور بعد میں دُنیا کو اعتراف کرنا پڑا کہ لوگوں کو اس ناگہانی حادثے کے وقوع پر اس قدر متعجب ہونے کا حق نہ تھا۔ جس قدر کہ ان "نام نہاد" ناگہانی حوادث کو پبلک کی معصوم بیخبری اور شدید گراں گوشی سے شکوہ سنج ہونے کی وجہ حاصل تھی! عدمِ علم، علمِ عدم کا مُستلزم نہیں! جس طرح کہ ایک طرف یہ صحیح ہوا کرتا ہے کہ ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

اُسی طرح دوسری طرف اسی ماجرے کا مُثنیٰ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی مامون و مصون کمینگاہ میں ایک ناپسندیدہ نشوونما عرصۂ دراز تک پرورش پاتی رہتی ہے اور خوش گمان عوام نیز خواص کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی! انقلابی تحریکات بھی اس قسم کی اُفتادِ بد سے بالاتر نہیں ہوا کرتیں! اگر

کوئی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تاریخِ عالم کے بکثرت جلی العنوان وقائع اُس کی نظر سے مستور ہیں! "انقلابِ فرانس" جریدۂ بشریت کا پہلا اہتمام بالشان واقعہ ہے جو عظیم ترین انسانی عزیمت، استقامت، احتساب، ایثار، عُقابِ نظری ضمیر پروری، اصول پرستی۔ حق پژوہانہ فدویت و شیدائیت کی مشترک کارفرمائی کا "ثمرِ بہشت تھا"! تاہم آپ کو کچھ معلوم ہے کہ مابعد انقلاب کے ردِ فعل کی تخریبیں کتنی عبرت انگیز تھیں؟! ایسی تھیں کہ سات آٹھ چیدہ ترین علم بردارانِ انقلاب فرانس میں سے دو تین نے "ملوکیت" کا نعرہ از سرِ نو بلند کیا۔ دو تین جدید القیام دربارِ شاہی کے "ارکانِ رکین" بنے، اور دو تین نے اس بازگشتہ دَورِ سعادت میں خطاباتِ امارت کے طُرّے اپنی کلاہِ افتخار میں لگاکر جاگیرداریت کی "سنتِ پارینہ" کو تازہ کیا! —— یہ ہے روشناسِ عالم انقلابِ فرانس کی شکست انجامی، جس کی تفصیل نامور مورخ میر آلونے کی ہے! ؎

مایۂ طینتِ آدم زخمیرِ دگر است
تو توقع زگلِ کوزہ گراں میداری؟!

انقلابِ فرانس سے صدیوں پہلے کا "انقلابِ اسلام" بھی اس ازلی انسانی زبوں تابی سے محفوظ نہ رہ سکا! چنانچہ جب حضرت عائشہؓ نے ھوالذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ کی یہ تعبیر سمجھی کہ "سعادتِ ظہورِ اسلام اک دائم و قائم نعمت ہے جو ابد تاقیامت

سلامت باامانت رہے گی" تو سرورِ عالم کی اس بیدارکن رفعِ غلط فہمی سے آپ کتنی تلخ کام ہوئی ہیں کہ "نہیں عائشہ! یہ حسینۂ انسانیت صرف تین نصلہائے بہار کی مقدرہ عمر رکھتی ہے"! ——— ہیہات! ؎

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات
کلی نے یہ سنکر "تبسم" کیا!

الغرض ؎

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسّم شرار کا

مثلاً اس طوفانِ عالم آشوب میں ہمارے بعض "نابالغ لیڈر" اپنے کو اک لنگر گسستہ کشتی میں امواج پر تھپیڑے کھاتے ہوئے پانے لگیں تو ایسا مستبعد حادثہ نہیں! ؎

گیا سالم نہ کوئی اس بھنور سے
یہی دیکھا کیا ہوں عمر بھر سے!

تاریخِ انسانی کی "عہدگاہ" پر سے اتنے نظارے اور مطالعے کے بعد ہمارے لئے "جامعۂ ملیہ" کے حوالۂ بالا ارتداد کے امکان کو تسلیم کرنا ایسا دشوار رہا ہوگا: ہم اس احتمال کے دروازے کو باز دکھا کر اس کے خالی خاکے میں اثبات کا رنگ بھر کر بتائیں گے! اور اسلامی ہندوستان کو اک پیامِ احتساب دیں گے! ع

پس بہر دستے نباید داد دست!

سیاسی تنبّہ کا کتنا چشم کشا کلمۂ جلیل ہے کہ!

"The price of liberty is eternal vigilance."

(حریت کی قیمت اربابِ اختیار کی دائمی نگرانی ہے!)

ہم اہلِ مشرق اس تشکیک مزاج پہرہ داری کے خوگر نہیں! "ظنّ المومنین خیرا" کی ہم نے بےمحل تفسیر کی ہے! ہم زیادہ سے زیادہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ کسی سے پہلے اک آدھ دفعہ لغزش سرزد ہو، اور پھر ہم اس مسنون احتیاط پر عمل پیرا ہوں کہ "مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنک نہیں کھاتا"! ——— ہم ان ہر دو ارشاداتِ نبوت کو غلط سمجھتے ہیں۔ جماعتی اور اداراتی احتساب کے حدود اس سے کہیں وسیع تر ہیں! حضرت عمرؓ کا جاسوسانہ شبانہ گشت مدینے کی گلیوں اور شہر کے بیرونی نواحی سے اور اہلِ بیت کی جماعت کے افراد پر مناصب و خدمات بیرونِ دارالخلافت کا عملاً ممنوع قرار دینا وغیرہ اک "پیش بندی" ——— گویا "بلا اشتعال"! ——— سوئے ظن نہ تھا تو کیا تھا؟! حقیقت یہ ہے کہ معشرِ انسانی کی زندگی کی بعض صورتیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ اک اُصولی وازلی بدگمانی کی قدرتی محل ہوتی ہیں! قومی ادارات کا اہتمام و انصرام اور حکومتی سررشتے کا نظم و نسق ایسے دو مشہور و معروف گوشے ہیں۔ ان میں اک طبعی میلانِ بدعت و فساد پایا جاتا ہے! پس ان حلقوں کے متعلق یہ راہ دیکھنا کہ وہ کسی علانیہ غلط کاری کا ارتکاب کریں تو ہم گرفت کریں اور پھر اپنی نگرانی کا آغاز کریں، بالکل ایسا ہی ہے کہ پہلے "نیشِ عقرب" کو متحرک ہونے دیجئے اور اس کے بعد ہم اُس کی سرکوبی میں حق بجانب ہوں گے! "ہم" مقتضائے طبیعتش "کے" علی الاطلاق" عذر سے لاقصور سے اپنے ذہن کو "سادہ لوح" پاتے ہیں! رقبۂ سکونتی کے گرد اک دیوار و حصار کھڑا کرنا، صندوق میں قفل لگانا، دفاتر و محاکمِ سرکاری کا معائنہ کیا جانا، ملازمین کا مناسب و تنہائے وقت سے تبادلہ و منتقلی، پولیس و فوج کا مستقل قیام، سی۔ آئی۔ ڈی و پرچہ نویسی کی ماموری کیا ہیں۔ اگر معاملات و جماعات و افراد کی "بالقوۃ فطری فساد پذیری" کے "ایمان بالغیب" کے تحت اُس کا قبل از وقت سدِباب نہیں ہے؟! پس "الحزم" کو "سوء الظن" سے منفصل نہیں کیا جا سکتا! جہاں ہم اس خوش گمانی سے کام لیتے ہیں معاً اس خوش فہمی کی سزا ملتی ہے! سچ تو یہ ہے کہ بکثرت صورتوں میں ہمارا حُسنِ ظن۔ خصوصاً ممتد و مسلسل حُسنِ ظن ——— فریقِ ثانی کی غلط کاری کا تخم ریز بنتا ہے! بغیر قفل کے صندوق کا نظارہ ہی اک خوابیدہ داعیۂ سرقہ کے لئے محرک ثابت ہوتا ہے! ؎

زمن پُرس فرسودۂ روزگار
کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار!

پھر روزِ اوّل سے اعتماد بھی روزِ آخر بداعتمادی کی حرکات کا داعی بنا کرتا ہے! مفاسد و بدعات اس خیال کی پناہ میں بے غل و غش پرورش پایا کرتے ہیں کہ دیکھنے والا کون ہے؟ جو ہیں وہ سب مبتلائے خوش اندیشی ہیں! ایسے اوقات میں موقع شناسوں کا مقولہ یہ ہوا کرتا ہے! ؎

چو خانہ خالی و معشوق مست و نازبود
تواں گریست بہ آں کس کہ پاکباز بود!

قصۂ مختصر،

تعمونی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں! نیکی میں شاک اُس کی کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکے رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ پر اس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں!

(۱)

پہلی چیز جو جامعہ کے موجودہ چہرے کی پیشانی کا داغ ہے وہ اُس کا وہ "زوالِ روح" ہے جس کے مظاہر اس کا گزشتہ پانچ چھ سال کا نامۂ اعمال ہیں! کسی تحریک کی اسپرٹ کا اضمحلال اُس کا معنوی اختلاجِ قلب ہے: اس ضعف کی گرفت میں جب کوئی قوت آجائے تو وہ داغدار ہی نہیں ہو جاتی، اُس کی شہرگ کٹ جاتی ہے:

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

جامعہ اپنے عضوِ رئیس کی اسی جانِ جاں کو کھو چکا ہے! اُس کی تعلیمگاہ، اقامت گاہ، دارالخطابت، دارالمناظرہ، دارالمطالعہ، سب یکسر اک افسردگی و پژمردگی کا منظر ہیں! جہاں کبھی "الور پاشا کیمپ" کی رُستاخیز با مرہ نواز تھی، وہاں آج "اتحادی دوکان" اور "مکتبہ جامعہ" کی "لقالانہ زق زق دبق بق" سامعہ خراش ہے! جامعہ کی جماعت کے اندر بعض ناجائز عناصر روزِ اول سے یہ ناشدنی دون ہمتیاں رکھتے تھے! اُنھوں نے اس مخرب جوہر کا نام حسرتِ تعمیر، رکھا تھا! اس پست فطرت گلے کے تصور کی بدخوابی پر مولانا محمد علیؒ نے ایک موقعے پر ان "حسرت نصیب معمارانِ تخریب" کو قرار واقعی پھٹکار سنائی تھی! مولانائے مرحوم کی (غالباً قیدِ فرنگ سے) اک مراجعت جامعہ کے لمحۂ روح پرور پر جامعی "سپاسنامے" کے مصنفین نے جب یہ مرگ نوا مصرع اُن کے سامنے پڑھا کہ ؎

"وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے"!

تو وہ مادرزاد فاتحِ اسلام اس دنارتِ نفسی پر تڑپ اُٹھا! اُس نے اپنے ان خود فراموش سامعین کو للکارا کہ جو "تعمیر" تمہارے سینوں کے اندر اک "حسرت" کی تخم کاری کرے، وہ ہزار تخریب سے زیادہ مخرب ہے! ؎

گر خدا داری، ز غم آزاد شو!
از خیالِ بیش و کم، آزاد شو!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اک عرصے کی گردشِ نشیب و فراز کے بعد جامعہ کی عنانِ اختیار ایسے ہی اربابِ کار کے ہاتھ میں آئی جنھوں نے اپنی "حسرتِ تعمیر" جی بھر کے نکالی! اُنھوں نے "اتحادی دوکان" کھولی! "اتحادی بنک" کا افتتاح کیا، اوکھلے میں "جامعہ نگر" کا سنگِ بنیاد رکھا، اور اب ڈاکٹر انصاری مرحوم کے "جامعے کے ولی" کی حیثیت سے "مزارِ پُر انوار" کی نقشہ بندی ان بزرگوں کی لاعلاج، جوع البقر نما، "حسرتِ تعمیر" کا آئندہ خواب ہے! شاید اوکھلے میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے "رین بسیرے" کے نقشِ قدم پر مستقبل قریب میں اک "عرسِ مبارک" کا بشارت نوا اعلان سنایا جائے گا! ؎

جا وُش تھے للکارتے جن رہگذروں میں
دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے!

خشت و گل کی یہ تعمیر جاری ہے، اور اُسی کے پہلو بہ پہلو روح و دل کی اک تخریب! ؎

خواجہ در بندِ زیبِ ایوان است
خانہ از پائے خویش ویران است!

"Professors" "معاشیات" کے "پیشہ ور معلمین" ——— کو یہ بتانا شکل ہے کہ آب و گل کے "بیجان تودوں" کا اجتماع "تعمیرات" نہیں ہیں، "مقبرے" ہیں! ؎

من از فریبِ عمارت گدا شدم، ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دلِ افتاد است!

خود جامعہ کے موجودہ اربابِ تعلیم و درس میں سے ایک بزرگ نے ابھی حال میں ایک مختصر لیکن پبلک صحبت میں بیان کیا کہ "بلاشبہ اہلِ جامعہ پر اک دیدنی افسردگی پیدا ہے، اور جس جماعت کو افسردگی عارض ہو جائے تو اُس کے پنجے میں بھیر رہ کیا جاتا ہے؟!"

اس پر اک شریکِ مکالمت دل جلے نے واشگاف کہا کہ "واللہ اب تو جامعہ کے نام سے کافور و کفن کی بُو آتی ہے!"

یہ فضائے قبرستان جامعہ پر طاری ہے، اور اُس کے سائے میں ماشاء اللہ نئی عمارتوں کے مقابر کی تعمیر جاری ہے!

معلوم ہوتا ہے جامعہ "زندہ و پُر ولولہ اجسامِ انسانی" کے عہد سے گزر کر بیروح و فنا پذیر در و دیوار کے دور میں داخل ہو چکا ہے! مسلمانوں

معمور دقلوبہا خراب! ——— مبارک ہو "حسرت تعمیر" کے دردمندوں کو:

(۲)

جامعہ جتنا جتنا اپنے "پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ" کے کاروبار میں پاگل ہوتا گیا، اُتنا ہی وہ ملت ہند کے کارزار جہاد حریت وحیات سے خارج البلد ہوتا گیا! اور اب تو سالہا سال سے ماشاء اللہ یہ حال ہو کہ اگر جامعہ کے اساتذہ یا طلبہ میں سے کسی کو توفیقِ ایزدی اپنے مادرِ علمی کے صدرِ اوّل کی روایات عمل واقدام کی لاج سے، تحریکِ قومی کی کسی علم کشائی کے وقت، میدان میں کود پڑنے کی توفیق ہوئی تو جامعہ خیر سے بدحواس ہو گیا ہے! اُس نے علی الاعلان اپنے سرکاری آرگن ——— رسالۂ جامعہ ——— کے باب شذرات کے صیغۂ گزٹ میں، اِن گویا "منحرف" متعلقینِ جامعہ سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے! اپنے اِن حقیقی "فرزندانِ رشید" سے تبری کرتے ہوئے اُس نے جو "عاق نامے" شائع کئے ہیں وہ: مولانا محمود حسنؒ، بانیٔ جامعہ، کی غازیانہ روحِ پُرفتوح کے لئے ناقابلِ رشک فاتحہ و درود کے تحفے ثابت ہوئے ہوں گے! کیا مولانا محمد علی مرحوم جامعہ کی مسندِ درس سے وقتاً فوقتاً جب معرکہائے جہادِ قومی کے عین محاذ پر منتقل ہوا کرتے تھے، اور وہاں سے زندانِ حکومت میں، تو کیا اُن کی دوبارہ تشریف آوری جامعہ پر اہلِ جامعہ جس طرح اپنی "حسرتِ تعمیر" کو اُن کے سامنے پیش کیا کرتے تھے، اپنی یہ آرزو بھی عرض کیا کرتے تھے کہ "کاش آپ کے گریز از جامعہ و داخلۂ میدانِ جنگِ حُریت پر ہم آپ کو جامعہ کے اربابِ حل وعقد سے خارج کر سکتے، اور آپکی گمراہی اور جامعہ سے فسخِ تعلق کا اعلان اخبارات و جرائد ملک میں کرتے!

——— اُس وقت ہم دیکھتے کہ آیا ہمارے دوسرے غریب دلدادگانِ آزادی کی طرح مولانا محمد علیؒ کو یہ خداوندانِ "حسرتِ تعمیر" کس طرح "خوارج" میں داخل کرتے ہیں؟! ؎

تفو، بر تو اے چرخِ گرداں، تفو!

اور ہاں کیا ڈاکٹر انصاری مرحوم، کانگریس پریذیڈنٹ و مستقل رکن ورکنگ کمیٹی کانگریس دیکھے از ازواج و روانہائے تحریکِ قومیت وحریت، جب معلوم مواقع و مراحل پر جہادِ وطنیت کے جھنڈے کے نیچے جا کھڑے ہوتے تھے، یا اپنے مطب سے نقلِ مکان کر کے محبسِ فرنگ میں جا داخل ہوتے تھے تو کیا "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" کے جریدۂ اعلامیہ ——— رسالۂ جامعہ ——— کے "خرق العادت گزٹ" (Gazette Extra-ordinary) میں اُس وقت بھی اس بات کا اعلان کیا جاتا تھا کہ "بجرم شرکت کاروبارِ حریت وسیاست اُنکا نام "امارتِ جامعہ" کے منصب سے خارج ہو گیا ہے! فلہٰذا "عالمِ بالا" کو غلط فہمی نہ ہو! ہم ماشاء اللہ بجز اک "تعلیمی جماعت" کے کچھ نہیں ہیں! اور ؎

اِسپہ گزرے نہ گماں ریوؤ ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے!

مگر نہیں، ایسا نہیں کیا گیا! ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ساتھ اہلِ جامعہ کی وابستگی تا دمِ آخر جاری رہی! لیکن اک ناگزیر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دوعملی و دورنگی آخر کیا معنی رکھتی ہے؟! کیا جامعہ کے اربابِ حل وعقد کے پاس بجز اس کے کوئی اور جواب ہے کہ "ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ" ڈاکٹر صاحب" تھے! دولتمند آدمی تھے! فیاض و زرپاش تھے! پھر اُن کے درِ دولت کی رسائی کا جامعہ نے عملاً بلاشرکتِ غیرے اجارہ (Monopoly) لے رکھا تھا! جب جامعہ والوں پر "اپنی سوکھی روٹی چٹنی سے کھانے" کی اُفتاد پڑا کرتی تھی تو کسی نہ کسی پیرائے میں وہ اپنے اس صومِ زہد کی خبر ڈاکٹر صاحب کے گوش گزار کر ہی دیا کرتے تھے، اور پھر "حُسنِ طلب" کے اِس "فن شریف" کی فاتحکارانہ "کشائشِ رزق" کے طفیل میں زیادہ سے زیادہ شام تک "زُہادِ جامعہ" کا یہ روزہ اک "مُحرب عید" سے افطار ہو ہی جاتا تھا، جس کے خوانہائے ضیافت ڈاکٹر انصاری مرحوم کے امیرانہ مطبخ کے الوانِ نعمت سے بہم پہنچایا کرتے تھے! واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب! ؎

یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
وگرنہ "عالمِ معیشت" وسیع ہے واللہ!

پس ڈاکٹر انصاری ایسی "سونے کی چڑیا" چھوڑنے کی چیز نہ تھے! نا بجہ اُس بھولے بھالے "انصاری مردِ میزبان" کا قرار واقعی "تعاقب" کیا گیا! ان کی وفات حسرت آیات پر ارکانِ جامعہ نے اگر اپنے قرول باغ کے خانگی خانوں میں نہیں، تو سب کی طرف سے "شیخ الجامعہ" نے دہلی کے ریڈیو اسٹیشن کے سرکاری "منبرِ ذاکر" سے اطراف و اکنافِ ہند کے بے شمار گھروں کو اپنا ہمنوا بنا دیا! ——— اور قصہ کوتاہ کر دیا! ؎

اِس طرف نعش کسی کشتۂ غم کی اُٹھی
اُس طرف [illegible] کے اٹھا

ہاں لاریب کہ ڈاکٹر انصاری ایسی موٹی آسامی چھوڑنے کی چیز نہ تھے! مشہور ہے کہ ہندوستانی طاقاتی قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتے! لیکن موقع شناس و مطلب آشنا حریفانِ جامعہ نے اِن مشرقی روایات کا بھی ریکارڈ توڑ دیا! اور ڈاکٹر انصاری کی دامنگیری کو منزلِ قبر سے بھی متجاوز لے گئے: زندگی میں ان کی دولت اور اُن کے خوانِ نعمت کے بعد پس مرگ اُن کی نعش کو بھی اُن کے خاندانی پسماندگان سے ہتھیا لیا! اور اوکھلے کے جدید البنا "جامعہ نگر" میں اُن کے اک مجوزہ روضۂ مبارک کی تعمیر کے ذریعے اسے اپنے لئے اک صدقۂ جاریہ کا سرچشمہ بنانا چاہتے ہیں!———بدحامز کے اِن "انقلاب بدوشوں" کی یہ جدید العہد سائنٹیفک استخوان فروشی، کیا پُرانی دلّی کے مزاراتِ کہنہ کی فرسودہ گورپرستی کا اک قابلِ داد نقش ثانی نہیں ہے؟! ؎

ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو وہ بھی نہ سہی!

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ایک طرف ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ساتھ یہ دائمی و ناشکستنی، عینِ حیاتی و مابعد الطبیعیاتی وابستگی! اور دوسری طرف بعض غریب و غیر معروف اعضائے جامعہ کی، اُن کی شرکتِ تحریکِ قومی کی پاداش میں، دورانِ درگاہی! آخر اِن دو متبائن طرز ہائے عمل میں کونسی راہِ تطبیق ہے؟! مگرع

زر می طلبی سخن دریں است!

ڈاکٹر انصاری کی "حیات بعد الممات کی برکات" میں اُن کے زیارتا پذیر مزار، واقع جامعہ نگر کے علاوہ اُن کی منزفی تصنیف———
"Regeneration in Man"———بھی تھی!
"جامعہ ملیہ کا مکتبہ خیر سے ہر قومی پارۂ ادب کے ترجمہ، اشاعت و تجارت و جلبِ منفعت کا خدا کا ٹھیکیدار ہے!———اُسے تو صرف جہادِ حریت کے "سوز" سے انکار و فرار ہے! قومی ادبیات کے "ساز" سے نفع اندوز ہونیکے میدان میں ماشاء اللہ وہ ہمیشہ "السابقون الاولون" ثابت ہوا کرتا ہے! ———ہاں تو ڈاکٹر مرحوم کی موسومۂ بالا انگریزی کتاب بھی بصورتِ اردو پیراہن، مکتبہ جامعہ کی صیاد اندازی کا نشانہ بنی رہی تھی، لیکن آخر کار یہ ترشکارِ عین اُس کے جبڑوں میں سے نکال لیا گیا! ہم کو جامعہ ملیہ سے عموماً، اور مکتبۂ جامعہ کے صیدِ شکار سے خصوصاً، اِس تلخ کامی پر ہمدردی ہے! ؎

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند! دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا!

تعلیمی اداروں کی سیاسیات سے علیحدگی اک مستقل، مخلوط تعلیمی و سیاسی مسئلہ ہے، ہمیں خوف ہے کہ جامعہ کے اربابِ بست و کشاد اُس کی کما حقہ تحلیلِ فہم سے قاصر ہیں! بلاشبہ اس معنی میں تعلیم و سیاست الگ الگ کئے گئے ہیں کہ اول الذکر کی پیشگی تکمیل خود آخر الذکر کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے طبعی حالات میں اُصولاً سیاست کو تعلیم کے مرحلے کے اختتام تک معلق رکھنا چاہئے———اس معنی میں نہیں کہ تعلیم و سیاست میں کوئی نظری اُصولی تناقض ہے! خود اک واحد معاملے کے ایک جزئی تفصیل میں اگر ہم مشغول ہوں تو اُسی معاملے کے بقیہ، آئندہ مراتب کو ہم چھیڑنا پسند نہیں کیا کرتے! کیا اس طرح ایک حصۂ کار کا اشتغال اور دوسرے کا التوا یہ تعبیر رکھتا ہے کہ ایک ہی چیز کی "وحدت" اک "اجتماعِ ضدین" ہے؟! نہیں، یہ صرف عملی طریق کار کی اک حکمتِ عملی سی ہوتی ہے! میدانِ جنگ کے اک معینہ و مفوضہ مورچے پر اگر ہم تعینات ہیں تو دوسری رزمگاہ و کارزار میں لڑنا ہر بار ضرورت ہونے کی صورت میں بھی ہم، باصطلاحِ لغتِ جنگ، "اپنی ہی توپوں سے وابستہ" رہا کرتے ہیں! کیا اس کے امکاناً یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ دوسرے طالبِ کمک گوشۂ عرصۂ حرب میں ہماری دستگیری فی نفسہ اک "کورٹ مارشل" کی مستوجب ہوتی! "کاش میں یہ کام کر سکتا" اور "واللہ میں اس کام کو ممنوع جانتا ہوں" میں جو فرق ہے وہ اِتنا باریک تو نہیں جسے جامعہ کے فلاسفہ و منطقین سمجھ نہ سکیں! تاہم جامعی اربابِ حل و عقد نے جس زبان و بیان اور جس لب و لہجہ میں جامعہ کے وابستگان کے تعاونِ تحریکاتِ حریت سے براءت کی ہے، اُس میں دوسری ہی روح کار فرما نظر آتی ہے: یہ کام کی ترتیب اور مہم کے مختلف مراحل کی تقدیم و تاخیر کا معاملہ دکھائی نہیں دیتا، ہمارے عظیم فریضۂ زندگی———علمِ حقیقت اور عملِ حق (اجتہاد و جہاد!)———کا جزء اختیار ہے اور جزء ترک! یہ پیرایۂ نؤمن ببعض و نکفر ببعض و نتخذ بین ذالک سبیلا!

ایک چیز ہے فوجی چھاؤنی میں سپاہیانہ تربیت حاصل کرنے کے قبل ہی میدانِ جنگ میں داخل ہو جانے کے خام طریقۂ کار کی تنقیص، اور دوسری چیز ہے عرصۂ کارزار کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے "رقبۂ ممنوعہ" (Forbidden Area) اور "منطقۂ خطرہ" (Danger Zone) قرار دیدیا جانا! دونوں چیزیں یکساں نہیں! ایک موطا کا ...

منظم ارتداد!

جامعۂ ملیہ کی طرف سے، اپنے خال خال سعید الفطرت طالب علموں اور معلموں کے دخل در عملی سیاسیات پر جو "حاشا وکلّا" وقتاً فوقتاً رسالۂ جامعہ کے صفحات شذرات سے گوش زد ہوئی ہے، وہ زیر بحث موقف کے دوسرے پہلو کی غمازی کرتی ہے! کم از کم جامعہ کے اگر بعض فارغ التحصیل طلبہ نہیں تو پختہ مغز و پختہ کار اساتذہ ایسے "رنگروٹِ سیاست" نہ تھے کہ محاذِ جنگ پر جن کی "سرگرم خدمت" ("Active Service") اک قبل از وقت "تجاوز عن الحدود" ("Trespass") قرار پاتی! لیکن ہم نے دیکھا کہ جامعہ کے اسٹاف کے "پیرانِ مغانِ" نے بھی جب کبھی "سیاست" میں اپنا ہی "سجادۂ تعلیم رنگین" کیا ہے تو وہ خود اپنے لئے بھی "سالکِ باخبر" تسلیم نہیں کئے گئے ہیں! قلبی "آزادیٔ ضمیر" ایک طرف، روحانی حریتِ اشتغالِ قلبک تک انھیں نہیں دی گئی ہے: اُن کی یہ "بے راہروی" جامعہ کے "سرکاری مسلک" ("Official Creed") کے بہر حال منافی ہی سمجھی گئی ہے! کیا جامعہ ملیہ کے اساتذہ و شیوخ تک ہمیشہ "پیرانِ نابالغ" ہی رہتے ہیں؟! انھیں نہ کبھی بلوغ سن حاصل ہوتا ہے، نہ رسائی فکر، نہ بصیرتِ قلب، نہ استقلالِ عمل؟! جامعہ کیسی "مادرِ علمی" ہے جس کی پیداوار تلون پر پختگی و رسیدگی حرام ہے؟! جب کبھی متعلقینِ جامعہ میں سے کسی نے اس کے خلاف دعوی کیا ہے، جامعہ نے اپنے "تبریٔ ناموں" میں انھیں جتایا ہے کہ گویا "میری کنارِ خام میں رہتے ہوئے تو وہ اس کی آرزو نہ رکھیں! یہ "خام بدم، پختہ شدم، سوختم" کے "مدارج خودی و بیخودی" تو انھیں میرے قلاوہ غلامی کی شکست سے پہلے نصیب نہیں ہو سکتے! یہ چیزیں وہ معصری [illegible] اور اس راہ تلاش کا پہلا قدم یہ ہے کہ جامعہ سے "مجوب الارث" ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کریں! ــــ ہیہات!

[illegible]

کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ اور اُسی غارِ ہلاکت کی سمت میں، جو امروز فردا میں مسٹر جناح کا "مقبرۂ عالیہ" بننے والا ہے!

ہاں، غالباً یہ لوگ جامعہ کے "ناخلف فرزند" ہیں جو اُس کی "مصلحت پسندی و سلامت روی کے بچکانہ صحن خانہ" سے رینگ رینگ کر بالائے سیاست و حریت" میں داخل ہونا چاہتے ہیں! ہاں اِن "شوریدہ سروں" کو واضح ہو کہ نعوذ باللہ منہا ہم بجز اک تعلیمی جماعت ہونے کے اور کچھ نہیں ہیں!

گویا ہم یکسر "زنانِ قول و ارشاد" کا اک "زنانخانہ" ہیں! ننگ "مردانِ کارزارِ جہاد" کا اک اکھاڑا! ــــ یہاں تک کہ اگر سوئے اتفاق سے ہم میں سے کوئی مجاہد حق پیدا بھی ہو جائے تو ہمیں چاہئیے کہ بعجلت تمام اس حقیقت کا اعلان کریں کہ "ایسے لوگ چمنستانِ جامعہ کی ایسی "غیر طبعی رویدگی" ہیں جس کی شاخ و بیخ کا اک رگ و ریشہ بھی اس سرزمین کے آب و گل میں نہیں! ــــ

آہ! کیا مولینا محمد علی مرحوم کی روحِ مجروح کا یہ شیون ہمارا سامعۂ تخیل اس وقت نہیں سن رہا ہے کہ ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد!

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد!

سیاسیات، اور خاصکر جدید العہد ہندوستانی سیاسیات خانداں آدم کے پورے پانچویں حصے کی مظلوم و محروم، مقہور و رنجور خلق اللہ کے ساتھ غمگساری اور ممکن چارہ سازی کا دوسرا نام ہے! کیا یہ ایسا ناشدنی کام ہے کہ اُس سے آلودہ دامن ہوتے ہی اک جامعی اپنی "مادرِ جامعہ" کی آغوشِ تعلق کے لئے "اچھوت" ہو جاتا ہے؟! اگر سیاسیات کی وسیع انسانی ہمدردی و خدمت گزاری ایسا ہی کارشنیع ہے تو ہمیں خوف ہے کہ اگر کسی موقع پر کبھی کسی جامعہ والے طالب علم یا استاد نے کسی پڑوسی کی آتش زدہ جھونپڑی کا اک سہارا، یا کنوئیں میں گر جانے والے کسی بچہ کو کنوئیں میں سے نکالا، تو ہمیں رسالۂ جامعہ کے شذرات کے کسی گوشے میں یہ دیکھنا پڑے گا کہ [illegible] جامعہ [illegible] کر وہ خدمت کے ارتکاب [illegible] پر مستعفی ہو گیا [illegible] حیثیت سے کیا ہے!

"ڈوڈی" علمائے اسلام کو اگر اپنے اس مشہور "مذہب" کی تائید میں کہ "اسلام سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا" اگر کسی مجموعۂ "دلائلِ ساطعہ و براہینِ قاطعہ" کی ضرورت ہو تو "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی "اکادمی" کی یہ "ریسرچ" (تحقیق انیق) اور بعض "شیوخ جامعہ" کی سیاست بیزاری کی یہ شہنت ہو کہ "ان کی بیت کچھ دستگیر ثابت ہو سکتی ہے!" ؎

من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم!

کیا اک شریف باپ کے لئے یہ بات موجب ننگ ہو سکتی ہے کہ اُس کا بیٹا کسی مظلوم و معصوم انسان کے کام آیا، یا کسی خرمغز حاکم سرکار سے کامیاب طور پر متصادم ہوا؟! ایسے سپوت کو باپ سینے سے لگائے گا، یا اُسے ننگِ خاندان کہہ کر عاق کر دے گا؟! سر وزیر حسن صاحب ہی کو دیکھئے کہ اُنھوں نے باوجود اپنی سابق حیثیت کُورٹ کی جیدبجی اور موجودہ "نائی" کے مقامِ محمود کے اپنے نوجوان فرزند ارجمند سید سجاد ظہیر کے دادِ حریت دینے والے "قال و حال" پر یہی نہیں کہ اُنھیں مردود قرار نہیں دے دیا۔ بلکہ بزرگ سن باپ نے نوخیز بیٹے کو عملاً اپنا "پیرِ طریقت" بنا لیا! اور آج وہی "سر وزیر حسن" ہیں جو اپنی پُر زور و بیم آزاد مقالی کی بنا پر "کانگریسی نائٹ" کا خطاب پا چکے ہیں! ؎

رشکِ وفا نگر کہ بدعوئ گرہ رضا ہر کس چگونہ در پئے معقود میر ددا!
فرزند زیر تیغ پدر می نہد گلو گر خود پدر در آتشِ نمرود میر ددا!

جامعۂ ملیہ والے اپنے تعلیمی مرکز نمبر ۱ و نمبر ۲ اور اپنے ننابِ وجود "پیام تعلیم" کو کہاں کا "حرمین شریفین" سمجھتے ہیں کہ جس سے اپنی "بیعتِ رضوان" کو محفوظ رکھنے کے لئے انسانیت، غیرت و ضمیر نیت کے ہر رشتے کو منقطع رکھنا ضروری ہے! ؎

در مدرسہ کس را نرسد دعوئ توحید
منزل گہِ مردانِ مُوحد سَر دار است!

اور پھر تکمیلِ تعلیم کے بعد میدانِ عمل و اصلاح میں داخل ہو کر اپنی تعلیم کی ...ن العباد ی کا ثبوت ہی نہیں دیتا ہے، بقول ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا وہ پھر لہو کیا ہے!

بلکہ خاص حالات میں تعلیم کے "ہفتوان" کے طے کرنے سے پیشتر ہی ہم کار فرمائی اور زور آزمائی کی منزل سے کبھی دوچار ہو جایا کرتے ہیں! یہ ہماری کوئی خامکاری اور جلد بازی نہیں ہوا کرتی! اصولِ عمل سے بظاہر یہ "انحراف" بجائے خود ایک اصول کی "بجا آوری" ہوا کرتی ہے! ہم بلاشبہ ایسے موقعوں پر اک اصول سے بھاگتے ہیں۔ لیکن لاریب کہ اک اصول ہی کی طرف! یہاں منسوخ اک اصول ہوتا ہے، لیکن جو چیز ناسخ ہوتی ہے وہ بھی اک اصول ہی ہوتی ہے، ہم بڑی چیز کے لئے چھوٹی چیز قربان کر دیا کرتے ہیں! اس طرح ہم متعلقہ مقاصد عالیہ کی دعوت کو بھی محروم لبیک نہیں کرتے، اور معقولیت کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتے! یہاں ہم "دیوانگی و فرزانگی" کے علاً جامع بنجاتے ہیں۔ اور اُس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں، جہاں سے اُفق پر ہمیں یہ آتشیں و نورانی تحریر نقش نظر آتی ہے کہ "زندگی منطق سے فائق تر واقع ہوئی ہے!" "Life is larger than logic" ایسے اوقات میں ہمارا "جوش" ہمارے "ہوش" کو یوں جواب دیا کرتا ہے:

عشق سے مست ہوں مجھے ساغرِ ہوش سے غرض!
تُرکِ سیاہ چشم کو سُرمہ فروش سے غرض!
آپ کو جسِ خیر و شر، آپ کو حُبِ مال و زر!
آپ جُنوں سے بے خبر! آپ کو جوش سے غرض!

"جنون سے بے خبر" ان لوگوں کے مقابلے میں "جنون سے باخبر" لوگ ہی عقل و دانش سے بھی حقیقتہً زیادہ "آشنا" ہوا کرتے ہیں! لیکن اُن کی حکمت نغز کے سمجھنے کے لئے "مغز" چاہئیے! ؎

ہم سے وفا پرست اگر کارِ جنوں کو چھوڑ دیں
اہلِ خرد کے درمیاں جوش بڑا "فساد" ہو!

ہاں تو یہ "مشارٌ الیہ" "خاص حالات" جو فتوائے عمل کو ایسا متغیر کر دیا کرتے ہیں وہ "اوقات" رکھتے ہیں جو اقبال کی لغتِ حیات کی اصطلاح میں "محشر کی گھڑی" کہلاتی ہے!، اور یہ اوقات وہ "مقامات" رکھتے ہیں جو اسی زبانِ رمز میں "عرصۂ محشر" کہلاتا ہے! ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے!
پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!!

یہ ساعتِ محشر اور عرصۂ محشر کہاں ہے؟ شاعر اس استفسار پر محوِ استعجاب ہو جاتا ہے! ؎

۱

سخن ز نامہ و میزان" دراز تر گفتی
بحیرتم کہ نہ بینی "قیامت موجود"!

اس طرح ہم اِس حقیقت نادرہ کے محرمِ راز بنائے جاتے ہیں کہ ہمارا عہدِ حاضر بھی بمنزلۂ اُن "ایامِ اللہ" کے ہے جو "مالک یوم الدین" والے "یوم الدین" ـــــــــ روزِ جزاو سزا ـــــــــ کی وسیع تر تفریغ میں آتا ہے:

"اللہ اور اولو العلم" مشاہدہ" ہیں کہ اِس وقت اک "یوم دین" اپنے پورے آثار و لوازم کے ساتھ ہمارے سامنے آگیا ہے! اور یہ کہ اک "لمن الملک الیوم؟ لِلّٰہِ الواحد القہار!" کی ندائیں تک سننے میں آرہی ہیں! ع

گوشِ نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست!

گو ہم "کتاب دربغل" اور "لکچر برزبان" بزرگوں کو اِس بزمِ راز میں بار تا ذکر سکیں! ؎

نسنہا دربغل و فہم محال   جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست!

آئیے، نزدیک تر آئیے، اور اپنے کو قریب الفہم بناکے ہم آپ کو اس وقت و ساعت و حالت سے اس طرح روشناس کریں کہ آپ کو بتائیں کہ یہ وہی مخصوص زمان و مکان و شان ہے، جسے جواہر لال اک ملک و قوم کی زندگی کے "غیر طبعی حالات" کہہ کر پکارتا ہے! جواہر لال کا بھی عموماً یہی قول ہے کہ اگر زمانہ مہلت دے تو تعلیم کی مشیا از بس تکمیل کر لینی چاہیئے۔ لیکن پھر جلد ہی وہ کہتا ہے کہ ساری دنیا کی یہ "عمومیت" ہم ہندوستانیوں کے لئے اک "خصوصیت" سے منسوخ ہوگئی ہے! ہندوستان کا طالب علم اک "غیر طبعی دور" سے گزر رہا ہے! وہ کسی طبعی حالت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا! اپنے اسکولوں اور کالجوں کی ذہنی چہار دیواریوں کے اندر وہ اِس طرح مقیم ہے کہ اردگرد کی زمینیں "رقبۂ جنگ" بنی ہوئی ہیں! اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس لمحے "قوم کا یہ رنگروٹ" تیار یا نیم تیار حالتِ تربیت میں میدانِ جنگ میں بلا لیا جائے گا! ایسے لمحہ و ساعت پر اُس کا یہ کہنا تو خیر اک گولی کھانے کا سزاوار ہو گا کہ "میں کینٹینٹ کا اک ازلی ساکن ہوں!" لیکن اگر وہ عرصۂ کارزار کے طرم کی بہی آواز پر اُفتاں و خیزاں اُٹھ کھڑا ہونے میں بھی اک منٹ کی دیر کرے گا تو اک کم دبیش "منفرو" کی طرح "بیوفا سپاہی" سمجھا جائے گا" انفروا خفافاً و ثقالاً و جاھدوا

فی سبیل اللہ!

ہاں، ہمارے گردوپیش اِس وقت یہی فضا ہے! "جامعہ ملیۂ اسلامیہ" کے "تعمیری حسرت زدگان" کو اگر اس کی خبر نہیں تو غالباً "جامعہ اتحادی دوکان" "جامعہ بنک"، "جامعہ مکتبہ" ہی کے کاروبار داد و ستد اِس گرانگوشی کے ذمہ دار ہوں گے!

دیر سے توپوں کے مُنہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی میں ہے جن کی دھمک سے خلفشار!
حسرتِ تعمیر سے فرصت نہیں ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں!!

"اسلامیت و ملیت" کی اِس ہنگامہ اور "جامعہ نگر" کے درمیان جو چیز اک "حجابِ مستور" بن کر کھڑی ہوگئی ہے وہ "شیوخِ جامعہ" کی زبان میں اُن کا "ٹھوس کام" ہے! نیز "جامعہ تعلیمی مرکز" مبرا کا "تعلیمی تجربہ"! ؎

بگئے زدیم و سر انا الحق شد آشکار!
مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود!

آہ، اِس "ٹھوس کام" سے بڑھکر "مٹس کام" کیا ہوسکتا ہے! اِس "تعلیمی تجربہ" سے زبوں تر "آزمودہ را آزمودن" کا کیا "جہل" ہوسکتا ہے!! ؎

من آں علم و قلم را با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد طفلِ غازی را!

ہم بزرگانِ جامعہ کے گوشِ حق نیوش تک کیونکر اِس شکایتِ رنگین کو پہنچائیں کہ "حضرت! یہ ننگ تو سرکاری تعلیمگاہوں کے "غلام سازوں" کا تھا، کہ اُن کے اسیرانِ تعلیم و تدریس ایسے وقت شیکسپیئر و ملٹن کی معیت میں فراغت و کتابے و گوشۂ چمنے" کی خلوتہائے خرابات کے اندر مرکبِ بہشتی و سرمستی پائے جاتے تھے! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب جامعہ ملیہ کے زیر سایہ "علم علم" جو حال گوئٹے اور ہرڈر کے مُبتلاؤں کا ہو رہا ہے، شیکسپیئر و ملٹن کے فتنوں سے کچھ کم بدتر نہیں! ؎

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا   ناہید بغمزہ گشت و مریخ بقہر!

کیا بقول برنارڈ شا کے "ہم احرار" کا ہر "بُت شکن تیشۂ سومنات شکنی" کے بعد خود اک "لات و ہبل" میں منتقل نہیں ہو جایا کرتا!! ؎

ہر چند سُبکدست ہوئے بُت شکنی میں   ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور!

"ہم اک غیر طبعی دورِ حیات ہی سے گزر رہے ہیں، اور اس روشنی میں اپنے مشغلۂ تعلیم و تعلم کو کسی بھی لمحے خیرباد کہہ کر کارزارِ حریت میں چلے آنے کے فرمان کے لئے گوش بر آواز رہنے پر مکلف ہیں!" —— پنڈت جواہر لال نہرو کے اس مسلکِ عمل و جہاد پر لبیک کہنے کے لئے کتنے اساتذہ و طلبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ تیار رہا کرتے ہیں؟! عام اس سے کہ جامعہ کا "مکتبہ" جواہر لال کی سوانح عمری —— "میری کہانی"! —— کے ترجمہ و طباعت و اشاعت و منفعت کا پی رائٹ کے منصبِ منفعت سے کتنا داخلِ حسنات ہوتا ہے!!! ؎

لاتقربوا الصلوٰۃ "زِ نہیم" بجا طراست! ۔۔۔ وز امر "یاد ماندہ" کلوا و اشربوا "مرا!

افسوس ہے کہ جامعہ ملیۂ اسلامیہ کو نہ اپنے "پولیٹیکل مجاہدے" والی فرض کا پاس ہے، نہ اپنے اسلامی منصب کے شرف کا لحاظ، اور نہ ملک کے ہمعصر غیر اسلامی، اصلاحی و انقلابی اداروں کی شاندار نظیروں پر غیرتمندانہ رشک و جذبۂ مسابقت!

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز ۔۔۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست؟

"سابرمتی آشرم" کی زندہ تعلیمگاہ و تربیت گاہ کے مہاتما گاندھی جی کے "ڈانڈی مارچ" میں "السابقون الاولون" بنتے ہیں، اور ایام امن میں، نیز بعد فراغ تعلیم، آشرم کے نواح میں سینکڑوں میل تک گجرات کے دیہات و قصبات کو بیروزگاری، بیکاری، مقدمہ بازی، قرضداری، اور رشتہ بازی کی لعنتوں سے پاک کر دیتے ہیں! ٹیگور کے "بول پور اسکول" کے طلبہ و اساتذہ کا دیہاتی کام اور آراضیات کی متعلقہ ریسرچ حکومتِ بنگال کے محکمۂ زراعت کے لئے لاثانی تنویر افکار کا سامان بنی ہے۔ ڈاکٹر پی سی رائے ہر سال، بنگال کے موسم بارش و سیلاب کی افتاد کے وقت، اپنا بین الاقوامی شہرت رکھنے والا "ریسرچ انسٹیٹیوٹ" مقفل کر دیتے ہیں اور مع اپنے شاگردوں اور مستفیدوں کی پوری جماعت کے طوفانِ نوح کا منظرِ محشر رکھنے والے بنگالی دیہات میں منتقل ہو جاتے ہیں، اور شہر کا "دارالتحقیق" گاؤں (بیشتر مسلمان!) کے "مراکز ریلیف" سے بدل جاتا ہے!! ؎

چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسائگاں!

از سمومِ تجد در باغِ عدن پژمان شدن!

بنارس کے "ودیاپیٹھ" کی سیاسی بیداری، مجلسی خدمتِ عوام اور سارے صوبے میں اُن کی شہرتِ عام کا یہ کرشمہ ہے کہ گذشتہ انتخاباتِ مجالسِ قانون کے موقعے پر یو پی کی کانگریس کاؤنسل پارٹی کی اکثریت اُنہی کے اسٹاف اور اولڈ بوائز نے بہم پہونچائی! —— بد دن اس کے کہ ودیاپیٹھ نے اپنے ان جگر گوشوں کو "عاق" کیا ہو! یا ان فرزندانِ تعلیم نے اپنی "مادرِ علمی" کو "طلاق" دی ہو! —— جیسی واردات خیر سے جامعہ ملیۂ اسلامیہ کی ماضیٔ قریب کی مقدس روایات ہیں!

اِس سب کو شاید متوازن کر دینے کے لئے جامعہ کا سب سے جلیل الشان کارنامۂ قومیت صرف یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ سابقہ انتخاب دہلی میونسپلٹی کے وقت حضرت شیخ الجامعہ اپنے بعض ارکانِ دربار کی طرف سے تختیاں لگانے پر قرول باغ کی مسلم نشست کے لئے کھڑے ہوئے تو سخا بٹھا دئے گئے! بدقسمتی سے اس حادثۂ فاجعہ کی وجہ یہ ہوئی کہ معزز امیدوار کے نام نامی کا اندراج دو موقعوں پر باہم مختلف پایا گیا، جس کے طفیل میں ایک نام بھی باقی نہ رہا، اور شیخ الجامعہ کی آئینہ جبینی "وہیں" جہدلی "دو شیرۂ" قسمت آزمائی کا پھول حالتِ غنچگی ہی میں افسردہ ہو کر رہ گیا!؛ شیخ کے اس "تعدد ِاسم" کا بھی اک دلچسپ معاملہ ہے! وہ "پٹھان" ہونے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ افغانی لاحقہ —— "خان" —— نہیں لگایا کرتے۔ "قرول باغ کا گاندھی" اس ترکِ خطاب "حالی" پر علیگڈھ میں خیر سے "شیعہ" سمجھا جاتا تھا۔ صدارتِ جامعہ کے دور میں ماشاءاللہ "سید" فرض کیا جانے لگا۔ اور اب کارپوریشن الیکشن کی گزشتہ معرکہ آرائی کے موقعہ پر اسی "بہام" نے سرے سے اُن کی شخصیت ہی کو مشتبہ بنا دیا! ع

اس عاقلانہ میں عزت سادات بھی گئی!

سیاسی میدان کی ان معرکہ آرائیوں کے بعد اگر سابرمتی آشرم، وسوا بھارتی بنگال، اور ودیاپیٹھ بنارس کی سی نوعیت کا جامعی نمونے والا "سوشل ورک" دیکھنا ہو تو وہ جشم بد دور یہ ہے کہ ہر سال "زہاد جامعہ" اک "یوم خاکروبی" منایا کرتے ہیں، جب کہ قرول باغ کے پاخانوں اور پاخانوں سے بھی پاکیزہ تر قرول باغ کی گلیوں کی جاروب کشی و بھنگی کاری کا سارا "مجاہدۂ نفس" وہ سال بھر کے لئے سر کر لیا کرتے ہیں! ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ دوست ۔۔۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!

ہاں، تحقیق کہ اس کے آگے "لا تعدوا"! کے مطلقاً حرام حدود واقع ہیں! ——

—— حرام در خطرناک! "ومن یتعد حدود الجامعۃ فقد ظلم نفسہ"!

گاندھی جی کی بس اتنی ہی تقلید ہر "مجنوں" تک کا لیڈر بنجانے کے لئے کافی ہے! اگر کچھ مزید اقتدار کی گنجائش ہے تو وہ اُن کی ذات سے یہ مالی استفادہ ہے کہ اُن کی سوانح عمری —— "تلاش حق" —— بھی ترجمہ و فروخت کے لئے حاصل کر لی جائے! مہاتما جی کے لئے یہ کتاب "تلاش حق" ہو گی، لیکن جامعہ کے کھنچے کے "رند ہزار شیوہ" منیجر کے لئے اک مزید فتح "تلاشِ معاش"! ؎

ہر کسے از ظن خود شد یارِ من ۔۔۔ وز درونِ من نجست اسرارِ من!

جامعہ کے روشناس ہندوستان "تعلیمی تجربے" کے بعض شعبے یہاں قابل ذکر ہیں!

"احمد آباد آشرم" کے تربیت یافتگان اگر گجرات کے دیہات کی خاک چھانتے ہیں، اور پی سی رائے کے شاگرد بنگال کی طوفانی بارشوں میں گاؤں کے اندر پانگل ہوا کرتے ہیں، تو اہل جامعہ بھی اس میدان میں اُن سے کچھ پیچھے نہیں ہیں! —— وہ تاج محل کو دیکھنے کے لئے آگرہ کی "سیاحتِ مطالعہ" کیا کرتے ہیں! اور مناظرِ قدرت کا "صوفیانہ مکاشفہ" کرنے کے لئے کشمیر جنت نظیر کی سیر فرماتے ہیں! زہے بہا! تا چند در خلوتِ بفکر گاؤخر؟ ۔۔۔ ہاں بیا و صورتِ مشاطۂ قدرت نگر!

"واللہ کہ ہم ٹھوس کام کرنے والی اک خالص و اخلص تعلیمی جماعت ہیں،

سیاسیات سے ہمارا دامن قطعاً پاک ہے!—— غالباً یہ کانگریسی ہندوؤں کا خاص پولیٹیکل کام ہے"! چاہے مولینا ابوالکلام آزاد اپنے "ذوقِ الحاد" کے تقاضے سے کتنا ہی کہا کریں کہ "ہندوؤں کے لئے کانگریس کا کام اک "سیاسی خدمت" ہے، لیکن مسلمانانِ ہند کے لئے وہ اک مہتم بالشان فریضۂ "جہاد فی سبیل اللہ" ہے!"—— قریب ہے کہ جامعہ ملیۂ اسلامیہ کے نصابِ دینیات کی اک انقلابی تطہیر عمل میں آئے گی، اور سرسید علیہ الرحمۃ کا وہ دَورِ سعادت تازہ ہو جائے گا جب کہ "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کے "تھیالوجی کورس" سے "باب الجہاد" خارج کرنے کا اجتہاد "اُنیسویں صدیٔ مسیحی کا مجددِ اعظم" کر ڈالنا چاہتا تھا! ؎

من و دل گر فنا شدیم، چہ باک؟

غرض اندر میاں سلامتِ اوست!

مولینا شبلی مرحوم فطرۃً اک اعتدال مشربِ سیاسی مفکر تھے۔ لیکن چونکہ فکرِ رسا اور جگر سوزِ دردِ اسلامی رکھتے تھے، اس لئے باوجود قربتِ پیری کے سیاسۃً وقلباً اُن پر اک "آمدِ شبابِ حریت" ہی کے مظاہر دیکھے گئے! اُن کے آخری دَور کی سیاسی نظمیں کتنی شوخ و بیباک واقع ہوئی ہیں! اِن ایام کی اُن کی ایک قلم کاری کے اندر تو سچ مچ عَلَمِ بغاوت بلند ہوتے نظر آتے ہیں! ابتدائی مخاطب تو اس نظم کا غالباً علی گڑھ تھا۔ لیکن آج "بیدار ہو جانے والے علی گڑھ" کے بجائے "سو جانے والے جامعہ نگر" کے وہ کہیں زیادہ حسبِ حال ہے! یاللعجب: ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا!

ہم سمجھتے ہیں مولینا شبلیؒ کی محبوب یاد اور اُن کے محبوب تر "جامعہ ملیۂ اسلامیہ" کو تازہ کرنے کے لئے اُن کی موالۂ بالا نظم یہاں نقل کرنا اک ضیافتِ دماغ و دل ہوگی! وہُو ہذا!

مذہب یا سیاست!

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو ۔۔۔ دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں ۔۔۔ کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگِ شرار
جتہ یہ وہ قوتِ پُر زور کہ جس کی ٹکرار ۔۔۔ سنگِ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشتِ غبار
اس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیادِ زمیں ۔۔۔ اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراقِ دیار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے شتر بانی ۔۔۔ کھینچے جاتے تھے ایوانِ کسریٰ میں شکار

وہ اُلٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں ۔۔۔ جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی مہار
اس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم ۔۔۔ بنگئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن ۔۔۔ فاش کرنے لگے جبریلِ امیں کے اسرار

یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے ۔۔۔ کر دئے دم میں قوائے عمل سب بیدار
ہے اسی مے سے یہ سرمستیٔ احرارِ وطن ۔۔۔ ہے اسی نشے سے یہ گرمیٔ ہنگامۂ کار

آپ دونوں سے کئے دیتے ہیں ہم کو محروم ۔۔۔ نہ سیاست ہی، نہ ناموسِ شریعت کا وقار

(۳)

اک قوم کی زندگی میں "غیر طبعی حالات" والا موسم اجتماعیات کا اک مستقل مبحث ہے! تاریخِ اقوام کے ہر مصلح اور داعیٔ انقلاب نے اُس کے مقتضیات کو ملحوظ رکھا ہے! "طالب علموں کو دورانِ تعلیم میں سیاسیاتِ عملی میں حصہ نہ لینا چاہئے!" بلاشبہ، لیکن اس سے بھی بڑھ کر کم سن لڑکوں اور نازک بدن عورتوں کو میدانِ جدال و قتال کے شدائد و صعوبات اختیار نکرنا چاہئے! لیکن پھر آپ کو معلوم ہے کہ "غیر طبعی دَورِ قومی" میں یہ بے اعتدالیاں آزادانہ عمل میں آئی ہیں، اور اربابِ حل و عقد نے نہ اُنھیں روکا ہے، نہ اُنھیں مُضر یا مذموم سمجھا ہے۔ خود اسلام کے "خیر القرون" کی مثالی تاریخ کے آثار اس کے شاہدِ عادل ہیں، اگر ایک طرف اک موقعے پر رسول اللہؐ حضرت علی شیرِ خدا کو مدینے کی "مدنی آبادی" ("civil population") کا محافظ بنا کے چھوڑ جاتے ہیں (جس پر جنابِ امیر کو اپنے تئیں "رضوا بان یکونوا مع الخوالف" کے زُمرے میں شامل ہو جانے کا تکلیف دہ واہمہ تک گزر جاتا ہے!) تو دوسری طرف اپنی "غیر طبعی حالات" کے زمانے پر آپ خورد سال بچوں اور نوجوان عورتوں —— گھروندوں اور ماموں خلوتوں کی مخلوق! —— تک کو صفوفِ جنگ میں داخل کر لینے میں متامل نہیں ہوتے! اور پھر معلوم ہے اِن بچوں نے عساکرِ اسلامی کی صفِ مدافعت کی "بنیانِ مرصوص" (سیسہ پگھلائی اور پلائی ہوئی دیوار) میں کوئی کمزور رخنہ نہ پیدا ہونے دیا! اور نہ اُن زنانِ اسلام نے کسی موقعے پر اپنی اک بہت بعد میں آنے والی بہن —— نور جہاں بیگم —— کے اِس "پارٹ" سے اپنے شاندار تعامل کو کچھ کم رکھا کہ ؎

نور جہاں گرچہ بظاہر زن است
درصف مرداں زنِ شیر افگن است!

ہماری حیرانی کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو اتنا "خام" اور اپنے اساتذۂ بزرگ کو ایسا "بیرنا بالغ" سمجھتی ہے کہ گویا وہ معرکۂ زندگی میں اُترنے کے کبھی اہل ہی نہونگے! اور اگر "خدا نخواستہ" اپنی "مادرِ علمی" کی ساری معکوس "روح پروری" (Inspiration) کے علی الرغم، ایسی "جرأت بیجا" کا ارتکاب کریں گے، جس سے جامعہ کی نیکنامی اور نیک چلنی اور حصول چندہ کی آسانی میں خلل واقع ہو، تو وہ اک "عضوِ مسموم" کی طرح کاٹ کر پھینک دئے جائیں گے! ع

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

مگر ہر دل عزیزی حاصل کرنے کی یہ کاوشیں کہیں جامعہ ملیہ کو سوائے اغیار کے ہر اپنے کے لئے بے وقار نہ کردیں؟! ؎

بقول دشمنے پیمانِ دوست بشکستی
بہبیں کہ از کہ بُریدی وبا کہ پیوستی؟!

ہمارے دوستوں کو یاد رہے کہ ہر دل عزیزی سے بڑھکر کوئی فتنہ نہیں!

ہر بزم میں "آفریں" کے لائق ہونا — شیریں سخنی میں شہد فائق ہونا
ممکن نہیں! جبتک کہ ہو دل میں نفاق! — آسان نہیں مقبولِ خلائق ہونا! (حالی)

یہی وجہ ہے کہ لسانِ اسلام میں اہل حق کا طغرائے امتیاز یہ قرار پایا کہ لایخافون لومۃ لائم! ؎

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا
میری کوئی "سوسائٹی" ہی نہیں!
حنیفاً وما انا من المشرکین!

ہم مولنٰنا محمد علی مرحوم اور حضرت شیخ الہندؒ والی جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی روحِ آوارہ کا یہ شیون سُن رہے ہیں: ؎

ایں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت!
شیر خدا و رُستمِ دستانم آرزوست!

اربابِ جامعہ کم از کم اپنے گرد وپیش کے دوسرے مُعاصر، غیر مُسلم، ادارات تعلیم قومی ہی کو دیکھیں، اور اُن کے مقابلے میں اِتنی المناک پسماندگی کا ثبوت نہ دیں؛ "جامعہ ملیہ" پر افسردگی، پژمردگی، اور نامردی کا جو دَور اک مدّت سے گزر رہا ہے... وہ اک مستقل مرثئے کی قرأت کا طالب ہے!

اے دل! جنونِ عشق کے ساماں کو کیا ہوا! — ہوتا نہیں ہے چاک، گریباں کو کیا ہوا؟
رسم وفا کی کاہشِ پیہم کدھر گئی؛ — ذوقِ نظر کی کاوشِ پنہاں کو کیا ہوا!
ہے خاک تجّد برف میں گویا ڈھلی ہوئی — اے قیسِ عامری! دلِ سوزاں کو کیا ہوا
وہ جوہری رہے نہ وہ گوہر نظر فریب — بازارِ مصر و یوسفِ کنعاں کو کیا ہوا!
ہر اک صدف ہے آنکھ میں آنسو بھرے ہوئے — یارب! نزولِ قطرۂ نیساں کو کیا ہوا؟
آنکھیں ہیں بند، دید کی حسرت پہ کیا بنی؟ — دل ہے خجل، تصورِ جاناں کو کیا ہوا؟
کعبے میں بار پا گئے اصنامِ آذری — کاشانۂ خلیل کے درباں کو کیا ہوا؟
اب آستانِ کفر پہ ہیں سجدہ ریزیاں — پروردگار! مردِ مسلماں کو کیا ہوا؟
قبضوں پہ ہاتھ ہیں نہ جبینیں ہیں خاک پر — ذوقِ جہاد و جذبۂ عرفاں کو کیا ہوا؟
شانِ وغائے حمزہؓ و حیدرؓ کدھر گئی؟ — رُوحِ دعائے بوذرؓ و سلمانؓ کو کیا ہوا؟
عزمِ حسینؓ ہے نہ ثباتِ ابو ترابؓ — صبرِ جمیل و ضبطِ فراواں کو کیا ہوا؟
پھر ابر سامری سے برستے ہیں اژدہے — یارو! عصائے موسیٰ عمراں کو کیا ہوا!
سینے میں اس گروہ کے کیوں اُڑ رہی ہے خاک؟
گنجِ حدیث و دولتِ قرآں کو کیا ہوا! (جوش)

ہم کسی گوشۂ عالم پر نظر ڈالیں، جامعہ ملیہ کی روش کی تاویل کے لئے کوئی راہِ گریز نہ ملے گی! ہندوستان کے اُس مایۂ نازش خطۂ شریف میں جس کا نام بنگال ہے لڑکیاں تک اپنے نازک دست وبازو قومی جھنڈے کے بلند کرنے کے لئے وقف کر رہی ہیں، اور اس شانِ مردانگی وبلند آہنگی سے کہ اُن میں سے بعض "نظر بند کیمپوں" کے قفسِ تاریک کی عنادل محبوس بن چکی ہیں! کہاں بنگالے کے شاعرانہ گھرانوں کی بے غل وغش خلوتیں، اور کہاں زندانوں اور بندی خانوں کی پُر وحشت حراستیں!

فضائے ناز میں تھا پرفشاں اک طائرِ رنگیں — نہ تھا برقِ حوادث کا خطر جس کے نشیمن کو
مگر صیاد کو خود کھینچ لایا نغمۂ شیریں — سُریلے چہچہوں کی گود میں پالا ہے دشمن کو!

سچ تو یہ ہے کہ بعض مردوں کی مردمی خیر سے اتنی تحتِ زنانیت واقع ہوتی ہے کہ جوش کی زبان کا یہ رنگین طعن بھی شاید اُنھیں نہیں شرما سکتا کہ:

یا حجلۂ رنگیں میں دکھا عشوۂ پُرفن — یا رَن میں کچھ اس شان سے آ گوبخ اٹھے زن!
یا گوندھ کے چوٹی کو پہن پھول کے کنگن — یا سر سے کفن باندھ کے مرنے پہ ہو طیار!

الغرض بنگال کا ہر طالب علم، طالبِ طبل وعلَم ہو رہا ہے! ورآنحالیکہ ہم

خود علم کی نظری حیثیت سے بھی اِتنے بیگانہ و نفور نظر آتے ہیں کہ بجائے طالبِ علم کے بجا طور پر "تائبِ علم" کہلانے کے مستحق ہیں!

جدید العہد اسلامی مصر میں بھی طلبہ ہی تھے ———— مردانہ بھی اور زنانہ بھی ———— جنھوں نے اپنی شورش سے سوکینی کی دُور سے دکھائی جانے والی مُٹھیّوں کو برطانوی اقتدار کے لئے ایسی زلزلہ فگن ضربوں میں تبدیل کر دیا کہ "وادیٔ نیل" سے برطانوی "شیر ببر" کو بیک بینی و دو گوش رخصت ہونا پڑا! سے

نوا پیرا ہو اے بلبل! کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

اور آج انگلستان کی طالب علموں کی دنیا پر اک نگاہِ عبرت ڈالئے!

ابھی چند ہی مہینے ہوئے ہیں کہ کیمبرج کے "انڈر گریجوائٹس یونین" نے اپنے یہاں یہ تجویز پیش اور پاس کی کہ:

"ہم آئندہ کی کسی جنگ میں خدا، بادشاہ اور ملک کے لئے نہ لڑیں گے!"

آپ بے خبر نہ ہوں گے کہ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد نے اِس آتش نوائی و بغاوت سرائی پر اِن طالب علموں کا "رسٹی کیشن" نہیں کر دیا، نہ اِس ریزولیوشن کو پیشی سے قبل اُسے مسترد کر دیا! نہیں، بلکہ اِس کے بالکل برعکس، پروفیسروں نے ہمّت آمرزانہ اِس سنگین مناظرے میں شرکت کی، اور اُسے بمراحل سنگین تر بنا دیا! نامور سوشیلسٹ پروفیسر سی۔ ایم۔ جوڈ نے طالب علموں کی "شراب" کو اِس طرح "دو آتشہ" کر دیا! اُن کے الفاظ یہ تھے۔

"مجھے آپ سے سخت شکایت ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "جو جائے اُستاد خالی ست"، والی مثل ہے شاید اک ازلی حقیقت ہے! افسوس یہ ہے کہ آپ لوگ ابھی تک الفاظ کا صحیح استعمال تک نہیں جانتے: آپ کی قرأت شدہ قرار داد کے الفاظ کی ترتیب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا آئندہ جنگ اپنے مقاصد کے اعتبار سے خدا پرستی اور ملک پروری کا اک مقدس "جہاد" ہوگی، اجی آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مستقبل میں بین الاقوامی پیمانے پر انسانیت کا جو قتلِ عام ہوگا اُس میں ہم نوجوان اپنے شریف انسانی ہاتھ رنگین نہ کریں گے!!"

بالآخر کیمبرج کے طلبہ کی یہ تجویز، اساتذۂ کیمبرالسن کی اِس رشکِ صد شباب ترمیم کے ساتھ پاس ہوئی، اور ۱۰۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ" کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا! ع

کشیم نالہ، خدا آسماں نگہدارد!

"فرنگیت مآب" کیمبرج اور گہوارۂ "اسلامیت وملیت" جامعہ کے مسلک و مشرب کے درمیان اگر "تفاوتِ رہ" کو دیکھنا ہو تو آخرالذکر کا یہ "آرڈی نینس" ملاحظہ فرمائیے۔

"ہماری سالِ تعلیمی کی ابتدا رسے بلکہ اُس سے بھی پہلے سے، دہلی میں سیاسی تحریک کا بازار گرم ہے[1]، اور اُس کے اثر سے تمام تعلیمگاہوں کے کام میں کم و بیش حرج ہو رہا ہے[2]! مگر جامعۂ ملیہ میں تقریباً کامل سکون کی حالت رہی[3]! اور تعلیم کا کام پوری سرگرمی سے جاری رہا[4]! جامعہ کے معلمین سے دو چار حضرات نے سیاسی جوش سے متاثر ہو کر استعفا دیدیا[5]۔ اور کانگرس کا کام کرنے کی وجہ سے جیل چلے گئے[6]۔ مگر طالب علموں کی تعلیمی حالت پر اِس کا کوئی اثر نہیں پڑنے پایا[7]۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جامعہ کے کارکن عموماً یہ طے کر چکے ہیں کہ اپنی عمر ملک و ملت

---

[1] گویا یہ اک شہر آشوب ہے! ———— اک بازاری شور و شر، نہ کہ معرکۂ جہاد و حریت! صاحب چیف کمشنر بہادر دہلی اور شیخ جامعہ کی رایوں میں کیا آپ کے لئے امتیاز کرنا ممکن ہے؟ ع پروردگار، مردِ مسلماں کو کیا ہوا؟! [2] علمِ جہاد کے کھل جانے اور نفیرِ عام کے بلند ہو جانے کے بعد یہ کونسا اُلٹا وظیفہ ہے جس کی تلاوت میں حرج واقع ہو رہا ہے؟! جامعہ کی تعلیم شاید "صلوٰۃ الٰہی" سے بھی اولیٰ و افضل ہے جو قتال فی سبیل اللہ کی ساعات تک بالکل موقوف و معلق تک ہو جاسکتی ہے!! [3] بالفاظ صحیح تر "جامعہ نگر" اس تمام ہنگامۂ جہد و جہاد میں اک شہرِ خموشاں بنا رہا! ہیہات! "رضوا بان یکونوا مع الخوالف وطبع علیٰ قلوبھم"! [4] اور تقاضائے علم اور مطالبۂ عمل کا فریضۂ عظیم پوری سرد مہری و مردہ دلی سے معطل رہا! "وزین لھم الشیطان اعمالھم! فصدّھم عن سبیل وھم لا یؤمنون!" [5] اور جامعہ کی

(بقیہ دوسری طرف پڑھیے)

کی تعلیمی خدمت میں گزار دیں گے؛ ہندوستان کی ساری فضا پر سیاست کے بادل چھا جانے کے باوجود یہ ایک گوشۂ آفتابِ علم کے نور سے منور رہے گا! سیاست دلوں کو لاکھ لبھائے (!!) مگر تعلیم کے سچے خادم اُس کا دامن کسی طرح نہیں چھوڑیں گے!"

(رسالۂ جامعہ، بابتہ ماہ دسمبر ۳۶ء ص ۴۸۰ ۔ بہرۂ شذرات)

کیا مناسب ہوگا کہ اب علی گڈھ یونیورسٹی، "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کو اپنی اک "نجیب الطرفین" "دختر نیک اختر" کی طرح گود لے لے!، اور بعدمدت وہ مبارک واقعہ باعرہ(؟) نوازی کرے

آئیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!

نظر ایسا آتا ہے کہ عالم بالا کے معتمد و باخبر حلقوں میں اس تجویز سعید پر سنجیدگی کے ساتھ غور شروع ہو گیا ہے۔ اور شاید مستقبلِ قریب میں سارے اینگلو انڈین اخبارات اور برطانوی کنٹرولڈ پریس اس تحریک کو متفق اللفظ ہو کر پوری بلند آہنگی سے اُٹھانے والا ہے! کم از کم "اسٹیٹسمین کلکتہ" ——— ہندوستانیت، ہندوستانی قومیت، اور ہندوستانی دعوتِ حریت کا وہ بدنام دشمن سیاہ! ——— نے اس مبارک منصوبے کی بسم اللہ کر دی ہے! اپنی ۱۴ رجون ۳۸ء کی اشاعت میں وہ اپنی "منظورِ نظر" جامعۂ ملیہ کی معلومہ "ادا ہائے دلبری" پر یوں شکر ریز ہوتا ہے:

"یہ ادارہ ہندوستانی مسلمانوں کی اس تمنا کا بہترین مظاہرہ ہے کہ اُن کے نوجوانوں کی تعلیم ان بلند نظریوں اور اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہو جو اُن کی ادبی اور تمدنی روایات کے حامل ہیں، اُن کی تربیت میں غیر ملکی اور اجنبی اثرات بہت کم ہوں۔ غیر ملکی تمدن و تہذیب سے وہی اخذ کیا جائے جو کارآمد اور مفید ہو"

قارئینِ کرام اول تو شاید اِس رپورٹ کو باور نہ کریں، یا اگر کریں تو اِس کو اسٹیٹسمین کا کوئی "اپریل فول" نما مغالطہ قرار دیں! لیکن سُنئے کہ اولاً روایت کے استناد کی تو یہ شان ہے کہ اُس کے راوی خود اربابِ جامعہ ہیں! اور وہی اسٹیٹسمین کے اِس اعلان پر "صداقت یا صحیفۂ انگلیسیہ" کے لب و لہجہ میں یوں اُس کے خراجِ تحسین کو ازراہِ خاکساری و کم بینی "قبول فرماتے ہیں:

"۱۴ رجون کے اسٹیٹسمین میں ایڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون جامعۂ ملیہ دہلی پر شائع ہوا ہے۔ جس میں جامعہ کے پچھلے ۱۵ سالوں کی تعلیمی تاریخ اور کارگزاریوں پر مفصل نظر ڈالی گئی ہے۔ فاضل مدیر اِس مضمون کے دوران میں کہتے ہیں (اقتباس بالا!) فاضل مدیر نے جامعہ کے نصاب اور

بہ آموزی سے "بیگانہ" رہ کر اُس سے پا بزنجیر نہ رہے! ——— افسوس جامعہ سے استعفیٰ؟! اور صفوفِ حریت میں شرکت؟! ؎ بقول مشفقے پیانِ دوست بشکستن وہ ہیں کہ از کر بر بدی وباکریستی! ؂ اور جامعہ میں اک بے روح تعلیم پاتے ہوئے اُس کے گوشۂ عافیت کو غنیمت نہ جاننا! "یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ! ولا تتبعوا خطوات الشیطان!" ؂ سبحان اللہ! وقالوا قلوبنا غلف! ؂ اور اپنی عمرِ عزیز کی اس "عصمت فروشی" ("prostitution") کو پورے شرحِ صدر سے انگیز کریں گے! ——— خیر اپنی مدت العمر کی خدمتِ ملک و ملت کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے اپنے دو چار "ناخلف فرزندانِ تعلیم" یا خیرہ سر ارکانِ اسٹاف کو ملک و ملت کی نقصان رسانی ("dis - service") کا بھی ارتکاب کر لینے دیجئے! خاندانِ آذر میں دو ایک "ابراہیموں" کے پیدا ہو جانے سے اُس کی نیکنامی میں کچھ فرق نہ آئے گا! ؂ "سیاست کے بادل"؟! ——— اور ترکِ سیاست کا "مطلع صاف"! کصیبٍ من السماء فیہ ظلمات و رعد و برق یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت! ؎ ہم سے وفا پرست اگر کار جنوں کو چھوڑ دیں اہلِ خرد کے درمیاں جوش بڑا فسردہ ہوا! ؂ ع "اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی"! ——— یہ "آفتابِ علم" آفتابِ قیامت سے کم نہیں! اللہ اکبر، یہ "حجاب اکبر"!! ؎ صد کتاب و صد ورق در نار کن: جان و دل را جانبِ دلدار کن! ؂ "سیاست دلوں کو لاکھ لبھائے"! امیر جامعہ، ڈاکٹر انصاری تک کو اک فریبِ لفظانہ میں گرفتار کر لے؛ تاہم "شیوخِ جامعہ" اس دلالۂ سیاست کے دام میں آنے والے نہیں! ؎ وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے! ؂ کیوں نہ ہو! ؎ اسپ تازی میاں بجا دیدہ، روز میدان، نہ گاو پرواری! افسوس، ہم ان "سچے خادمانِ علم" اور سچے منزورانِ میدانِ عمل کو کس طرح بتائیں کہ:

وہ میغ عشق جُز نکو را نکشند لاغرصفتان و زشت خو را نکشند!
تو عاشق صادقی، زکشتن مگریز مُردار بود ہر آنکہ او را نکشند!!

طریقِ تعلیم پر اظہارِ استحسان کیا ہے! اور کارکنانِ جامعہ کی بے غرضی اور سچی قربانی کی تعریف کی ہے!

(رسالۂ جامعہ، بابتہ جولائی ۳۶ء)

حیف گر درسِ امروز بود فردائے!

ہمارا یقین ہے کہ کلکتے میں "ہمدردانِ جامعہ" کا جو حلقہ ہوگا اُس کا معلّیٔ اعظم، نیز اُس کا سرپرستِ اعلیٰ یادش بخیر اسٹیٹسمین کا "مدیرِ شہیر" ہی ہوگا اور حلقے کا دفتر بھی اخبار موصوف کے آفس کے اک پُرخلوت گوشے میں واقع ہوگا! سے

اور ہمدرد کہاں! ہو نہ ہو لے حضرتِ دل
درد اب تم کو ہمارا ہو، تمہارا ہم کو!

اہلِ جامعہ کے "ضمیر کا امین" (Keeper of conscience) مجلۂ شریفہ اسٹیٹسمین ہندوستانی سیاسیات کی تاریخ میں قابلِ رشک روایات رکھتا ہے! پنڈت جواہر لال نہرو اپنے وارداتِ زنداں کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "جیلخانہ اک حصارِ سخت ہوتا ہے، جس کے اندر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ لیکن وقتاً فوقتاً اُس کی سنگین دیوارِ حصار کے اندر اک کھڑکی کھول دی جاتی ہے، جس پر اک گہرے رنگ کا شیشہ لگا ہوتا ہے، جس کے اندر سے بیرونی دنیا کی اک نہایت رنگ آمیز تصویر دکھائی جاتی ہے!—— یہ رنگین کھڑکی عبارت ہے، یادش بخیر جریدۂ اسٹیٹسمین سے!"

کیا اربابِ جامعہ اسی شاہی محل کے جھروکے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے خدمات کے ڈرامے کا اک نہایت رنگین، متکلم و مترنم فلم (all talking & singing film) ملک کی پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں؟! یہ بھی بادب استفسار ہے کہ اسٹیٹسمین نے وقتاً فوقتاً جواہر لال، گاندھی جی، اور جدید ہندوستان کے بکثرت مردانِ کار کی مزعومہ کج نظری، شوریدہ سری، تخریب و فساد پروری —— نیز برطانوی حکومتِ ہند کی رعایا پروری کی نسبت جو دفتر کے دفتر سیاہ کئے ہیں کیا وہ سب تحریریں بھی ایسی ہی "لسانِ صدق" کی تراوشیں ہیں، جیسا کہ اسٹیٹسمین کا وہ "پروانۂ خوشنودیٔ مزاج" جو جامعہ کے "جدید منظورانِ نظر" کو عطا ہوا ہے؟!

ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ عنقریب دہلی کے صاحب چیف کمشنر بہادر بالقابہٗ "جامعہ نگر" میں نزولِ اجلال فرمائیں گے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مزار پر اک فرمائشی فاتحہ کے لئے دستِ دعا اُٹھائیں گے! جامعہ کی غیر مکمل عمارات اور مجوزہ "مسجد" کی تکمیل کے لئے جیبِ خاص سے اک گرانقدر عطیہ منظور فرمائیں گے! اور آئندہ نوروز کے یومِ سعید پر حضرت "شیخ الجامعہ" کو "خان بہادر" کا خطاب ملنے کی سفارش روانۂ گورنمنٹ ہند کریں گے! سے

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز!

یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ جامعہ و اہلِ جامعہ کو حضرت مفتیٔ ہند مولانا اسٹیٹسمین کے اس پروانۂ خوشنودیٔ مزاج کے بعد اب راہِ صداقت و امانت و ہدایت کے کسی مزید "سلوک" کی ضرورت نہیں ہے! باقی اگر کوئی لذتِ ناچشیدۂ الطاف و الطاف یہ کہہ گزرے تو بکتا ہے کہ: سے

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم!
یہی ہے عشق، تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ!

ہاں! سے

باز آمدم کہ سجدۂ آں خاکِ پا کنم
گر طاعتے قضا شدہ باشد ادا کنم!

(۴)

"شیخ الجامعہ" بڑے لائق و فائق، خلیق و مسکین، صاحبِ ایثار و قربانی بزرگ ہیں۔ لیکن اک انقلابی تعلیم و تربیت کے مرکز کے صدر کے لئے جس گرم دلی اور مخمور المزاجی کی ضرورت ہے وہ دُور دُور اُن میں پائی نہیں جاتی! تنہا ذہانت، انقلابیت سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی! سے

"عقل" ہم خوب است واز ذوقِ جنوں بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست!

اُن کی اسی "شکستہ رنگی" پر "جامعۂ ملیہ" کی تحریک کی ولادت کے دردِ زہ کے ساعاتِ صعب میں ایک موقعے پر مولانا حسرت موہانی نے اُن سے برملا کہہ دیا تھا کہ "ارے میاں! بڑے بودے آدمی ہو! پٹھان اور جوان ہو کر ڈرتے ہو!"

اِس گفتگو کی تقریب وہ وقت تھا کہ نوزائیدہ جامعہ کے علی گڑھ کالج

کے احاطے کے اندر قیام یا ترکِ قیام کی گرم تنقیح چھڑی ہوئی تھی —— اور اُس وقت کے "شاب" اور اِس وقت کے "شیخ" منفی "فی الفور تخلیہ" کی رائے دیتی تھی!

غیرہ بھائی کہ اپنی ملت کی متاع کی اِس "رضاکارانہ دستبرداری" پر اُس "جبریہ اخراج" کو ترجیح دی گئی جو "جامعۂ ملیہ اسلامیہ" کے لئے ایک "سعادتِ ہجرت" بن کر اُس کے صدرِ اول کی تاریخ کے ایک صحیفۂ زرین پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئی! نیز شکست خوردگی و ترکِ میدان داری کی وہ اولین بُری مثال نہ پیدا ہونے پائی جو زندگی کے "پہلے قدم و اقدام" ہی کو اک "فرار" میں تبدیل کر دینے والی ہو جاتی! سید الاحرار حسرت موہانی کا یہ جواب، خداوندانِ علی گڈھ کالج کے "الٹیمیٹم" پر استقامت و ظرافت کا کیسا مسرح قلب نسخہ تھا کہ "We simply ignore this notice"

گویا ؎

اُس فتنہ خُو کے دَر سے اب اُٹھتے نہیں اسد
اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو!

یہ نہ سمجھئے کہ "شیخ" کے پُرانی دِلی کا محل اُن کا دل ہی ہے! —— ماشاءاللہ اُن کے "دماغ" میں بھی کوئی ریشۂ بغاوت نہیں، وہ یکسر اک غیر انقلابی ذہن رکھتے ہیں! وہ مشکل سے کسی قدیم و کہنہ چیز پر معترض ہو سکتے ہیں۔ بعض دقیانوسی چیزوں کے وہ اس درجہ دلدادہ واقع ہوئے ہیں کہ اُن کے بعض آزاد دماغ رُفقائے کار "شیخ" کے اِس میلان پر ہجو ملیح سے لبریز تلمیح کرتے رہتے ہیں! وہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کو "ڈاکٹر" نہیں "طبیب" کہا کرتے تھے! لیکن پھر ڈاکٹر انصاری کی تشخیص پر حکیم نابینا کے "فی طغیانهم یعمهون" کو ترجیح دیا کرتے تھے! اُن کے دل و دماغ کا ایک لطیفہ یہاں ضیافتِ طبع کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، برلن یونیورسٹی کے فلسفے کا یہ ڈاکٹر کہا کرتا ہے کہ "کاش خدا مجھے اتنی فرصت دیتا کہ میں طبیہ کالج میں داخل ہو کر طبِ یونانی کی تحصیل و تکمیل کر سکتا!" —— انا للہ!

پانی کی ایک بوند سے مرعوب ہو شرر! حیراں شکوہ قطرۂ شبنم سے ہو گُہر!
چھانے کے طراق سے لرزاں ہو نیشتر! ذرے پہ آفتاب جھکائی ہوئی ہو نظر

یہ اُس طبیہ کالج کی عقیدت ہے جس کی مخلوط طبی و ڈاکٹری و ویدک تعلیم، بیک وقت تین تین نظریہائے طب و معالجہ کے "اخلاط" کا خلطِ مبحث مختلف عناصر متخالفہ کی "اعلاج" غیر ہم آہنگی، ویدک و طب کی جامد دقیانوسیت کے ساتھ یوروپین میڈیسن کے برق رفتار ارتقائے صبح و شام کی باہمی شکست و گریبانی، اور جس کے نظام و پروگرام کے سارے "معجون مرکب" کی "طرفگی" وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو خود طبیہ کالج کے نا معلوم کتنے طالب علم ہنسی مضحکہ بناتے رہتے ہیں! —— "آیورویدک اینڈ طبی کالج" دراصل اک ایسا "میڈیکل فیڈریشن" ہے جو ہندوستان کے "مجوزہ" "سیاسی وفاق" سے بھی زیادہ بے ربط و خبط واقع ہوا ہے! —— کیا "شیخ" کے دماغ کی یہ "شیخوخت" و کہولت، ڈاکٹر انصاری مرحوم کے "اعادۂ شباب" (   ) کے بھی بس کی بات ہے!؟ ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا!
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!

لاریب کہ "شیخ الجامعہ" پرانی دلی کے کسی مقبرۂ کہنہ کے مجاور بننے کے لئے مخلوق ہوئے تھے —— "جامعہ ملیہ" ایسی انقلابی تربیت گاہ کی سرگروہی کے لئے اک یکسر دوسرے ہی روح و جگر کی ضرورت تھی! ہمیں "شیخ" نہیں چاہئیں، "جوان" چاہئیں "جوان"! —— اور کیسے جوان! ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہوں کمند!

بلا شبہ اُن کی مالی قربانی ناقابلِ انکار ہے، لیکن مالی قربانی لاانتہا وہ قلب و روح نہیں خرید سکتی جس کی طالب جامعہ ملیہ کی مسند نشینی تھی ؎

ایں سعادت بزورِ زر ہم نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

ہمیں مختلف اوصافِ اخلاقی کے درمیان فرق کرنا چاہئیے، اور ایک کا منصب دوسرے کو نہ تفویض کرنا چاہئیے! حضرت عمرؓ نے جب عمرو معدی کرب کو قادسیہ کے معرکے میں عربی صفوف کی کمک کے لئے روانہ کیا تو اُنہی کے ہاتھ یہ پروانہ بھی امیرِ لشکر کے نام دیا کہ "میں تمہاری مدد کو دو ہزار سوار بھیجتا ہوں! لیکن للہ انھیں سردار ۱۰ آدمیوں پر بھی مقرر نہ کرنا!" ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند!

ہمارا خیال ہے کہ "شیخ الجامعہ" کچھ اسی قسم کی تاریخی حقیقت کی تازہ

نظیر ہیں! اپنے ذاتی مالی ایثار کے علی الرغم وہ اپنے جیب و دامن میں وہ متاعِ نغز نہیں رکھتے جو اک انقلابی ادارے کی روح پروری (inspiration) کے لئے ناگزیر ہے! ع

شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست!

الغرض اک عاری جیب خالی کر کے آپ اک لبریز قوتِ قلبِ زندہ کے مدعی نہیں بن سکتے! "انفاقِ مال" اور "جہاد بالنفس" میں فرقِ مراتب کی ضرورت ہے! ؎

"نقدِ جاں" نذر کرو، سوچتے کیا ہو جوہر!
کام کرنے کا یہی ہے، ہمیں کرنا ہے یہی!

یہ نعرۂ جنگ ہے "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" کے اولین کارواں سالارِ اول اور سرعسکروں میں سے ایک ——— مولینا محمد علیؒ ——— کا! لیکن اب جامعہ کا "تکیۂ کلام" اور "سبعاً من المثانی" کیا ہے؟ "تم تو صرف اک تعلیمی جماعت ہو!" ——— ہیہات! ؎

قُم باذنِ اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

ہاں یاد رہے کہ "جامعہ نگر" میں اک عارضی مسجد کے چبوترے پر "اذانیں" دینے، اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی "قبر" کو پکا کرنے کے اعمالِ صالحہ کچھ بہت زیادہ قابلِ رشک نہیں ہیں۔

بیا کہ سجدہ بمحرابِ نگاہِ نو رہنیم   بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم!
حطیمِ کعبہ شکست و حصارِ قبلہ بریخت   بتازہ طرحِ کئے قصرِ بے قصور نہیم!

پھر یہ کوئی "معمولی نقصان و فقدانِ روح" نہیں! جو چیز "شیخ الجامعہ" کو شب و روز کے ہر بیدار لمحے میں جامعہ کے طلبہ اور اپنے رفقائے کار کو دینی چاہیئے اُسی سے وہ قطعاً مفلس واقع ہوئے ہیں! ع

سینۂ آتش فارغ ز قلبِ زندۂ!

برادرانِ وطن میں بھی ایسے صاحبِ ایثار و زرپاش لوگ ہیں لیکن پھر اُن کے خدمات کا اعتراف صحیح میدان میں کیا جاتا ہے! سیٹھ جمنا لال بجاج کو ہندو لوگ "بھاگوان" کہتے ہیں، لیکن اُنھیں گجرات ودیا پیٹھ کا "پردھان" تو کسی نے نہیں بنایا! ع

دولتِ دُنیا کجا و ہمت و جرأت کجا!

پھر دولت و ثروت کی طرح یہاں علمی فضیلت و مشیخت بھی سودمند نہیں! یہیں معلومات کی کھتونی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجاہدات کے میگزین کی! ع

بزورِ بازوئے حیدر بدہ ادراکِ رازی را!

جامعہ کے موجودہ اربابِ حل و عقد شاید بھولے نہوں گے کہ جس دورِ سعادت اور جس فضائے حرارت میں جامعۂ ملیہ کا قیام عمل میں آیا تھا، ہماری قوم کی وضعِ نفسی کا نعرہ (بزبانِ مولینا شوکت علی) یہ تھا کہ ؎

مفتیٔ شہر ہو یا "شیخ" حرم کوئی ہو
جو ہو مست نکالو اُسے میخانے سے!

جناب ذاکر حسین خاں صاحب (یا بخیالِ خود اُن کے مرید "ڈاکٹر ذاکر حسین، پی، ایچ، ڈی"!) اک ازلی طور پر نرم و آب و گل کی مخلوق واقع ہوئے ہیں! وہ طبعاً بس ہندوستان کی معتدل سیاست کے حلیف ہو سکتے تھے! وطنی سیاسیات میں اُن کی شیر گرم روش "ماڈریٹ پالیٹکس" سے اوپر نہ جا سکتی تھی! اُن کی بلند ترین معراج اس سے زیادہ نہ تھی کہ اک دوسرے "سر تیج بہادر سپرو" بن جائیں! اب یہ سیرت و خصلت جامعۂ ملیہ کی کارواں سالاری و کمانداری سے وابستہ ہوئی! فطرت کی اس ستم ظریفی میں معلوم ظرافت زیادہ تھی یا ستم گری!! ع

قرعۂ فال بنامِ منِ "فرزانہ" زدند!

ڈاکٹر ذاکر حسین، پی ایچ، ڈی، نہایت باقاعدگی و التزام کے ساتھ سرد و مہر طریقوں اور شکست پذیر اطوارِ سیاست کے علمبردار رہے ہیں! آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ماضیٔ قریب میں حکومت کی پُرپیچ ڈپلومیسی نے ڈاکٹر ضیاء الدین پی ایچ ڈی کو علی گڈھ کی تعلیمی و سیاسی فرمانروائی پر دوبارہ مسلط کیا، تو اندر اور باہر اک عام غم و غصہ کا اظہار کیا گیا، لیکن نرم یا گرم فریق کے تمامی وابستگان میں سے پہلی اور آخری آواز "ڈاکٹر ضیاء الدین کے تقرر یا تسلط کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے، نیز اُن کے دورِ حکومت کے ساتھ بہرحال اشتراکِ عمل کرنے کے لئے اُٹھی وہ اک دوسرے "پی، ایچ، ڈی" ——— ڈاکٹر ذاکر حسین ——— کی تھی!! ؎

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

بلاشبہ جناب ذاکر حسین خاں صاحب نے جامعہ کے لئے بڑی قربانی

کی ہے! کم و بیش مبلغ ایک ہزار روپیہ کا ممکن مشاہرہ ــــــ جس کی پیشکش ٹرنا میں عرصے تک اُن کو علی گڈھ کے اربابِ زر کی طرف سے کی جاتی رہی!ــــ یقیناً اک گرانقدر رقم ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی شاید پورے طور پر روشنی میں نہیں آیا ہے! جامعہ کو یہ بخشش بڑی مہنگی پڑی ہے! ذرا اس دادو ستد کا موازنہ کیجئے! ایک طرف قوم کو ایک ہزار کی منفعت ہے، اور دوسری طرف اس سے بدرجہا بیش بہا، بلکہ بے بہا، چیز ــــ نصب العین جامعہ ملیۂ اسلامیہ ــــ ہے، جس کی ساری روح اور تمامی حرارت، ساری عملیت اور تمامی جانبازی، اِن ایک ہزار کی نذر ہو چکی ہے! ہمارا خیال ہے کہ "ملیت و اسلامیت" کے "بازار ایکسچینج" میں مبلغ ایک ہزار ماہوار کی دوامی قسط کی مالیت بھی اِتنی جانستان حد تک گرانبار "شرحِ مبادلہ" سے متعین نہ کی جائے گی! ؎

مرا فروخت محبت، ولے ندانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است!

پھر اس میں شک نہیں کہ یہ گرانقدر رقم اُنھوں نے عملاً ماہ بماہ جامعہ کو دی ہے، لیکن ہماری التجا یہ ہے کہ ازراہِ کرم اس "نیم صداقت" ("half - truth") کو مکمل کیجئے! ــــ یعنی جامعہ نے بھی اپنی کل کائناتِ متاعِ دروح اُن کے نذر کر دی ہے! پس یہ معاملہ یک طرفہ نوازش کا نہیں ہے، دو طرفہ "تقابُضِ بدلین" کا ہے! ہم قیمتِ خرید کو "عطیہ" نہیں کہا کرتے، نہ شے خریدکردہ کو "امانت" اور نہ اس "تاجرانہ داد و ستد" کو تاجدارانہ داد و دہش"! ــــ "گھی کہاں گیا؟ اپنی ہی کھچڑی میں!" ــــ یہ ہے اس ماجرائے شگفت کا اصلی عنوان!!ــ اب وہ ہیں، جزو کل کے مالک، اور سیاہ و سفید کے مختار! اب وہ عوام کالانعام کی طرح "تھرڈ کلاس" میں سفر نہیں کیا کرتے! وہ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے بہت پرے نکل گئے ہیں! البتہ جواہر لال کی اِتنی ریس سے اُنھیں بھی خاص ذوق ہے کہ اپنی بیٹی کو بیرونی سیاحتوں اور پبلک تقریبوں میں ماشاء اللہ ہمرکاب رکھا کرتے ہیں! ــــ ہاں جامعہ کے اربابِ حل و عقد کو یہ لٹکا خوب رواں ہے کہ وہ ہر مشہور شخصیت !! ہر مقبول تحریک سے اُس کا اِفادی پھل اور نمائشی پھول توڑ لیا کرتے ہیں، اور بیخ و خار کی خشکیاں اور زحمتیں "احمق قربانی بازوں" کے لئے چھوڑ دیتے ہیں!

من ز قرآں مغز را برداشتم!

آج بھی وہ اگرچہ اپنے کو اک سچے اور پکے کانگریسی کی حیثیت سے مشتہر کیا کرتے ہیں ــــ بالشبہ متعلقہ حلقوں میں! ــــ تاہم اپنی پرائیوٹ صحبتوں میں مسٹر جناح کی مسلم لیگ اور "حکیم اسلام" ڈاکٹر سر اقبال کی دعوتِ "پاکستان" سے پوری وابستگی اور احترام بیکسی کا شرحِ صدر کے ساتھ ثبوت دیا کرتے ہیں! ع

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود

اُنھیں اس سے مطلق خوف نہیں کہ ع

لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست!

اس لئے کہ گو وہ "صنم شکن" نہوں، لیکن صنم کو دم دینے والے ضرور ہیں! ؎

دیر و حرم میں آپ کو دیکھا ہے پیش پیش
فرمائیے کہ "شیخ" ہیں یا "برہمن" ہیں آپ؟

بایں ہمہ، علی گڈھ کی طرف شیخ کا اضطراری میلان اُنکا مستقبل مسلک بنتا جاتا ہے! اُن کے وجود کا کم از کم تین رُبع حصہ جسماً و روحاً علی گڈھ میں رہا کرتا ہے! وہ اگر اوکھلے کے "جامعہ نگر" میں ایک دفعہ جاتے ہیں تو دس دفعہ علی گڈھ کے اکابر کی بزمِ خاص میں باریاب ہوتے ہیں۔ مکان۔ دفتر اوکھلہ، علی گڈھ، ــــ اِن اماکنِ اربعۂ مقدسہ میں سے اُنکا زیادہ مستقل مستقر، خصوصاً ایامِ تعطیل و اوقاتِ فرصت میں، علی گڈھ ہی ہوا کرتا ہے! ع

رُخ سُوئے "میخانہ" دارد شیخِ "ما"!

شاید قارئینِ کرام کو سب سے زیادہ مستبعد میرا جو قول مسموع ہوا ہوگا وہ یہ ہے کہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، پی ایچ ڈی، اجتہادِ فکر اور حریتِ رائے کی متاع کے بھی کچھ ایسے مایہ دار نہیں! ــــ لیکن آئیے، "اہلِ خرد" کی "پابستگیٔ رسم و رہِ عام" کی نظیر میں اک تازہ واقعہ سُنائیں! "معاشیات: مقصد و منہاج" نام ہے اُس معرکہ آرا مقالے کا جو "ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد" کے فضلا کے "مجمعِ عالی" کے سامنے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۳۲ء میں پڑھا تھا۔ سر دست اِس تصنیف یا تالیف کے "تہدیہ" سے ہمیں تعرض کرنا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہاں بھی وہی قلادگی

وسرافگندگی مینغاب ہوتی ہے جو عبارت ہے اُن کی ساری مغلوب و مرعوب نفسیت وسیرت سے! فرماتے ہیں:

"اِن مقالوں میں اگر کچھ توجہ کے قابل ہو تو وہ ہے جو میں
نے اپنے محترم اور شفیق استاد، پروفیسر ورنر زومبارٹ
استادِ جامعہ برلن کے حلقۂ درس میں بیٹھکر اور اُن کی
تصانیف کو پڑھکر سیکھا۔ اس لئے اپنی اس طالب علمانہ
کوشش کو اُن کے نامِ نامی سے منسوب کرتا ہوں۔ ذاکر حسین"

یہیں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ "تہدیہ" دیوبند کے اک فارغ التحصیل جاٹگامی "طالب العلم" کا ہے یا "برلن یونیورسٹی" کے اک "ڈگری یافتہ پی ایچ ڈی" کا! تعلیم مغربی کے اک نوجوان فرزندارجمند کی زبان سے تو اِس قسم کی گفتگو کا خواب بھی نہ دیکھا جاسکتا تھا، لیکن شاید ہمارے ندوے کا اک منتہی بھی اپنے کسی ایسے مجلے کے انتساب کی تقریب پر عمر خیام کی اِس مردانہ لوائی کو نہ بھولتا کہ:

صیاد نہ، حدیث تحسیر مکن   چیزے کہ نخواندہ، تو تفسیر مکن
چوں مردِ حقیقتہ از تو معنی طلبد   از دیدہ بکن، روایت از پیر مکن!

(۵)

آزاد قومی تعلیمی ادارات کے لئے حکومت کی مالی امداد ناجائز سمجھی گئی ہے۔ تحریکِ ترکِ موالات کا نعرۂ جنگ یہی تھا! بلاشبہ یہ اک صحیح اصول تھا "جس کا کھاتے ہیں اُس کا گاتے ہیں" نہ صرف یہ کہ اک مقولہ ہے، بلکہ اک ناگزیر لزوم ہے! جامعہ ملیہ کی معاشی زندگی کا آغاز بھی اِسی کلمۂ بے نیازی سے ہوا کہ "ہم نہ حکومت کا نمک کھائیں گے نہ اُس کا حقِ نمک ادا کرنے کے مکلف ہوں گے"! ہم کو وہ موقع یاد ہے کہ جب جامعہ کے قیام واجرا کے بعد اولین موقعِ سکون آنے پر اُن لوگوں کے ناموں کی اک فہرست تیار ہونی شروع ہوئی جو اس جدید البنا درسگاہِ "ملیت واسلامیت" کے متوقع ومکن ومستحسن مالی پشت پناہ ہوسکتے تھے تو مولانا محمد علی مرحوم کی طرف سے اُن کے چند دولت مند دوستوں کے اسمائے گرامی کے ادخال پر فی الفور مولانا ابوالکلام آزاد نے گرفت کی تھی، اور مولینا محمد علی کے اس عذر کو کافی نہ سمجھا گیا تھا کہ "یہ لوگ ذاتی طور پر تحریکِ قومی کے ہمدرد ہیں، اگرچہ جماعتہ وسیاستہ وعموماً صفِ مخالفین سے رشتہ رکھتے ہیں!" ——— اِس لئے کہ جیسا کہ مولینا ابوالکلام صاحب کا قول تھا، اِس رخصت کی بنیاد پر ہر رکنِ مجلسِ شوریٰ اپنے دو دو، چار چار دوست ایسے پیش کرسکے گا جو اس قسم کی خصوصیت کے حامل ہوں گے، جس کا نتیجہ پھر یہی ہوگا کہ ہمارے اصول کی بیلاگی اور ہیلوثی کالعدم ہوجائے گی! بالآخر مولینا محمد علیؒ کو مولینا ابوالکلام صاحب کا اختیار کیا ہوا موقف تسلیم کرلینا پڑا۔ اور اس طرح جامعہ کے اولین معاونین کی فہرست اِس آتشین عنوان کے تحت ترتیب پائی کہ

والئ ملک ہو، یا صاحبِ زر، کوئی ہو
جو ہنومست، نکالو اُسے میخانے سے!

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی معاشی بسر اوقات کی روایات اِس "صدقِ مقال اور اکلِ حلال" سے شروع ہوئی تھیں! لیکن اس درخشاں آغاز کا واژگوں انجام یہ ہے کہ آج ہر "خداوند دولت" کے سامنے جامعہ کے لئے دستِ سوال دراز کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ان کلماتِ توبۂ دانابت کے ساتھ سرِ تسلیم خم کیا جاتا ہے کہ "ہم محض اک تعلیمی جماعت ہیں! سیاسیات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں!" ——— گویا

بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن "مولوی" ہرگز نہیں ہے "خانساماں" ہے!

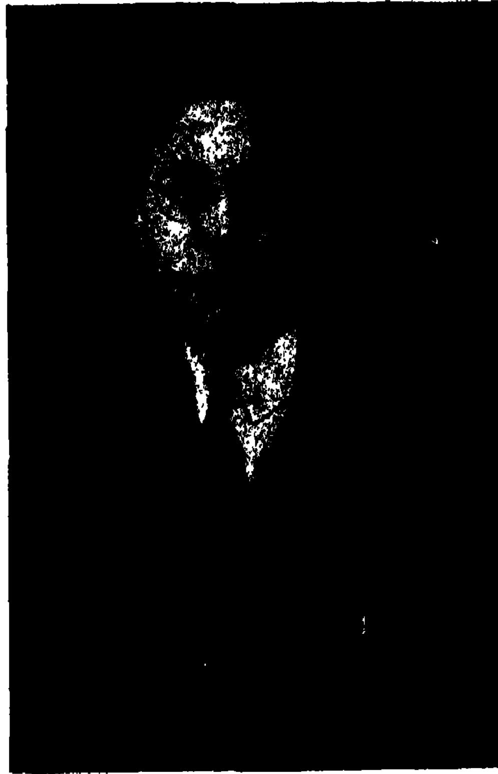
چندے کے معاملے میں حضرت "مسیح الملک" کی حکیمانہ احتیاط یہاں قابلِ ذکر ہے! حکیم صاحب مرحوم کے زمانے تک جامعہ کے اندر چندے کے فتنے کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ وہ عموماً اپنی جیبِ خاص ہی سے جامعہ کے "مولود علم وعمل" کی شیر خورانی کیا کرتے تھے! اُنھیں کسی طرح یہ بات گوارا نہ تھی کہ اِس شیر خوار کے "شیرِ مادر" میں ایک جرعہ بھی "مالِ حرام" کا دخیل ہوجائے! چنانچہ انتہائی ذاتی عسرت کے زمانوں میں بھی جب کبھی احیاناً اُنھوں نے کسی صاحبِ استطاعت ہندوستانی سے جامعہ کی مالی اعانت کے لئے کوئی اپیل کی بھی تو اپنے "حسنِ طلب" کو اِس سے زیادہ متجاوز نہ کرسکے کہ "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، مسلمانانِ ہند کی صراطِ اسلامیت وسیاست کی خضرِ راہ ہے، اور میں اُس کا امین و ترجمان ہوں"! ——— ظاہر ہے کہ ہمارے ہندوستان کے گرانگوش اربابِ ثروت کے سامنے اِس نوع کی لطیف و پُرکنایہ اثر آفرینی اک صدا بصحرا ہے! چنانچہ یہی ہوا کرتا تھا کہ

بات بھی کھوئی التجا کرکے!

اور پھر جو کچھ ہوتا تھا وہ یہ کہ حکیم صاحب کی نظر اپنے ہی دستِ ہمت پر پڑتا



سید قاسم رضا صاحب مختار "کلیم" کے مقالہ نگار



شبلی - بی کام - ''کلیم' کے مقالہ نگار

کرتی تھی، اور وہ کچھ اپنی جیب کھکولکر اور کچھ اپنے ہم خیال ارکانِ خاندان کو داخل حسنات کرکے جامعہ کے ماہوار مطالبات جار یہ جوں توں بہم پہنچایا کرتے تھے! غور کیجئے، اُن کے لئے یہ کس قدر آسان تھا کہ کسی والیٔ ریاست یا رئیس وقت سے اپنی گو دلی ہوئی دُخترِ ملّی کی ضروریات کو بیان کردیتے، اور بمجرد اس کے اک "انبارِ زر" جامعہ کے لئے حاصل کرلیتے! لیکن نہیں، اُنکا مسلکِ شرافت یہاں وہی تھا کہ ؎

ز نہار ز دستِ ناکساں آبِ زُلال
برلب مچکاں اگر درآتش باشی!

الغرض اُن اوقات میں بھی کہ وہ عارضی طور پر جامعہ کے لئے قوتِ لایموت فراہم نہ کرسکتے تھے، وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلتِ زبوں گوارا نکرتے تھے اور جامعہ کے ساتھ شریکِ رنج وراحت رہنے کو ترجیح دیتے تھے! ؎

قوتِ "دادن" اگر نیست مرا، باکے چیست؟
قوتِ ناستدن ہست و للّٰہ الحمد!

وہ اُس روحِ غیرت وحمیت کے پیکر تھے جس کا فلسفۂ "معاشیات" یہ ہوا کرتا ہے کہ ؎

دستِ سوال سیکڑوں عیبوں کا عیب ہے
جس دست میں یہ عیب ہنو دستِ غیب ہے!

اُن کا ایمان تھا کہ دستِ سوال اس قدر پاتا نہیں جس قدر کہ کھوتا ہے! وہ شکم سیر ہوکر "سبک سر" ہوجاتا ہے! وہ پیٹ کو اُبھارتا ہے، اور سر کو "دانہ دلیا" کرتا ہے! ؎

از سوال افلاس گردد خوار تر!
از گدائی گریہ گر نادار تر!

"عطایا وہدایا" کے خوش چشیدہ اپنے "رزق مقسوم" کو اسی سرچشمۂ پاک سے وابستہ سمجھتے ہیں، اور "استقامت کی کرامت" اور توکل علی اللہ کی فاتحکاریوں کے تصور کے اہل نہیں ہوا کرتے! اُن کے "نابینا ایمان" کو اس حقیقتِ نغز کا مشاہدہ کرانا ناممکن ہوتا ہے کہ ؎

خود بخود گردد درِ میخانہ باز
بر تہی پیمانگانِ بے نیاز!

وہ نہیں جانتے کہ زیادہ کھانے والے تومند نہیں ہوا کرتے، بلکہ بقول شاعرے "بسیار خوار است بسیار خوار"!

مولانا ابوالکلام آزاد کا مشربِ آزادانہ "خوش خوراک" اربابِ جامعہ کے پیشِ نظر رہنا چاہئے تھا! مولانا کا "الہلال" جب پہلی دفعہ کلکتے کے اُفقِ مشرق سے طلوع ہوا تو اک مشہور والیٔ ریاست نے چھوٹتے ہی تین ہزار کا ایک چیک بھیجا اور اتنی رقم کے ماہ بماہ پہنچتے رہنے کی بشارت سنائی، اور بشرطِ ضرورت اس سے زیادہ مقدار کی نذر کا پیامِ خوش دیا! — "بہر السحر الحلال فی مجلدات الہلال" کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ "گفتگوئے خرید و فروختِ ایمان" کے اس "بیعانے" پر مولانا کا جواب کیا تھا! یہ تھا:

"ہم ایسے فقرائے خاک نشین کے لئے ۳ ہزار اک ضرورت سے زیادہ رقم گرانا یہ ہے! ہم ایسے ہیچ زر تو کوڑی کے بھی تین تین آسکتے ہیں، تاہم یہ معاملہ سراسر ہماری ذاتِ بمقدار کا ہے! اگر خدانخواستہ آپ حضرات ہمارے ایمان وضمیر کے خریدار بن کر بازار میں آئے ہیں تو تین ہزار تو تین ہزار ہیں، دولتِ کونین پر بھی اپنے کو فروخت نہ کریں گے!" ؎

عیاں ہیں جن پہ تہیدستیاں سلاطیں کی
لباسِ فقر میں وہ شہریار ہیں ہم لوگ!

الہلال کی تمامی زندگی لاگ اور لوث سے مبرّیٰ ومنزہ اک مستقل تاریخ غیرت واستغنا ہے! سارے اسلامی ہندوستان میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً اُن کے ہزاروں، لاکھوں مداح، روحانی مریدوں اور عاشقانہ فدائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن مولانا آزاد نے اُن کا ایک پیسہ اپنے اوپر حرام رکھا! الہلال پر بڑے بڑے حوادثِ عُسرت وغربت آئے، اور لوگوں نے کوئی ممکن طریقہ اُس کی امداد کا اُٹھا نہ رکھا، لیکن اِن تمام پیشکشوں اور اثر آفرینیوں پر مولانا کی مستانہ نوائے بے نیازی یہی رہی کہ ؎

برو، ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ!

مولانا شبلی مرحوم نے اُنہی ایام میں اپنے حیدرآباد دکن کے اک وقتی قیام کے دوران میں، مولانا ابوالکلام کو لکھا کہ حیدرآباد کے لوگ آپ کے بید مشتاق ہیں! کیا آپ کا اِس نواح میں ایک دورہ مناسب ہوگا؟ — "مردِ آزاد" کی زبان پر بس اِنہی کلمات کی تکرار رہی کہ ؎

مژدہ بشارتِ طوبیٰ کہ مرغِ ہمتِ ما
بر اں درخت نشیند کہ بے ثمر باشد!

ہندوستانی ریاستوں سے دامن کشی کے معاملے میں اُن کی ادائے پرہیز وگریز دیدنی ہے! وہ شاید اپنی تمامی زندگی میں کسی رجواڑے کی زمین کو اپنے قدوم سے مَس کرنے سے ناآشنا رہے ہیں! ریاست بھوپال میں اگرچہ مولینا کی خود ہمشیرہ صاحبہ اک ممتاز منصب پر مکین تھیں، لیکن مولینا نے بھوپال کے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بھی کبھی قیام نہ فرمایا! ؎

غلام ہمت آنم کہ زیرِ چرخِ کبود
ز ہرچہ رنگِ تعلق پذیرد آزاد است!

الہلال کی ضمانتیں ضبط ہوئیں، ضمانتیں طلب کی گئیں، لوگوں نے اعانتیں بھیجیں اور مولینا کی طرف سے واپس ہوئیں! "حریفِ علیغوں" نے گمنام منی آرڈر بھیجے، اور مولینا نے بلطائف الحیل فرستندوں کے نام اور پتے پوچھ پوچھ کر پھر اس سارے "عطائے تو" کو "بہ لقائے تو" کیا! کلکتے کے مشہور سیٹھ جمال نے یکمشت دس ہزار کی رقم پیشکش کی، تاکہ الہلال کی مطلوبہ ضمانت داخل کی جائے، اور "دعوتِ قرآن کے اس منادی" (الہلال) کو خاموش ہونے نہ دیا جائے! —— لیکن سب واپس! —— بمبئی کے ایک نوجوان و وارستہ مزاج مسلمان انجینیر نے اسی موقعِ نازک پر لکھا کہ الہلال کی تحریرات نے میرے پیکرِ رندانہ کے اندر دوبارہ روحِ اسلامی نفوذ کی ہے! آج میرا سارا قلب ودماغ الہلال کا عطیہ ہے! تاہم میں "هل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے اقتضاء کو آج تک پورا نہ کرسکا! میں آج بھی غیر مستطیع حالت میں ہوں۔ البتہ میرا اک نو تعمیر بنگلہ پورے دس ہزار کی لاگت کا ہے۔ میں اُسی کو آپ کے نام ہبہ کرتا ہوں! آپ فی الفور اُسے بیچکر الہلال کی اسی کی ہم مقدار ضمانت ادا کر دیجئے! اور للہ میرے اس ہدیئے کو رَدّ نہ فرمایئے! —— اس پر مولینا کا جواب ملاحظہ فرمایئے!

عزیزِ من! میں اس گرانقدر پیشکش کو شکریے کے ساتھ واپس کرنے کی اجازت چاہتا ہوں! مبلغ دس ہزار روپیہ بلاشبہ اک رقم خطیر ہے، لیکن اس سے براحل زیادہ گرانمایہ آپ کی وہ عقیدت ومحبت ہے جو آپ کو الہلال کی تحریک اور میری ذات سے ہے! میں دس ہزار کے بدلے میں اس نقدِ نغز کو دینا نہیں چاہتا! مگر آپ سے روپیہ قبول کرلینے کی صورت میں اس نادر نعمت سے دستبردار

اس معاملے کا ناگزیر نتیجہ ہوگا!"

اللہ اللہ! سچے انسان کی بلند نظری وپاکبازی! سچ ہے کہ ؎

جس انساں کو سگِ دُنیا نہ پایا
فرشتہ اُس کا ہم پایہ نہ پایا!

الغرض ع

بے نیازی ناز ہا دارد بسے!

اور یہی راز ہے کہ سارے انبیاء ومرسلین کا نعرۂ بے نیازی وپاکبازانہ یہ ہوا کیا ہے کہ "یا قومِ لا اسئلکم علیه مالاً" و "یا قوم لا اسئلکم علیه اجراً"

تاہم، آپ کو معلوم ہے کہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کا مستقر، قرول باغ، اور اس کا زیرِ تعمیر مسکن ہے؟ اوکھلا، لذابان وامراء، اہلِ دولت وارباب ثروت کی مستقل جائے نزول ہے! پھر ان اکابر کے شایانِ شان استقبال ہوتے ہیں۔ پُرتکلف ضیافتیں ہوتی ہیں اور پُرتکلف ٹی پارٹیاں! اور پھر ظاہر ہے کہ "زہاد جامعہ" اگرچہ قوم کا ایک پیسہ بھی اپنے تکلفات وتعیشات پر اٹھانے کا خیال خواب میں بھی نہیں لاتے، لیکن جب اعیانِ ریاست اور عمائدِ ملت کے لئے غریب جامعہ اک "مائدۂ لذتِ درد" ترتیب دے تو ہم پیالگی وہم نوالگی یا کم از کم "پس خوردگی" کی سعادت تو نصیب میں از خود آجاتی ہے! ارکانِ عملۂ مطبخ اگر الوانِ نعمت کی دیگیں اتارتے ہوئے، نمک چکھ لیں تو یہ چیز "مفت خوری" کی تعریف میں نہیں آجاتی!

پھر "مقدسینِ جامعہ" اس محفلِ "کلوا واشربوا" اور اس مجلسِ ضیافتِ معدہ واحشاء" کا انعقاد پورے شرحِ صدر کے ساتھ کیا کرتے ہیں! اللہ کی نعمتیں —— محض "تحدیثِ نعمت" کے لئے! —— کھاتے ہیں! اور اپنی اس نفس کُشانہ وصوفیانہ زندگی کے مُرقعے (بصورتِ فوٹو) "پیامِ تعلیم" میں شائع کیا کرتے ہیں!!

—— نازم برینِ "پیامِ تعلیم" و "صلائے عام نادِ نوش"! ؎

تا بعزم من قنع شدہ نقشِ نگیں ترا
دارند اہلِ فقر ز دست تو صد جزع!

اور پھر یہی نہیں، دیسی ریاستوں کے اندر مہنتوں اور مہینوں خداوندانِ دولت کی آستاں بوسی اور اربابِ رسوخ کی دُنبالہ روی کی جاتی ہے! —— یہ فریضۂ مقدسہ خود حضرت شیخ الجامعہ انجام دیا کرتے ہیں! ؎

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے!

معاملات کی زبونی کی یہ آخری نوبت نہیں ہے! "شیخ" پایۂ تخت دہلی کے جناب صاحب چیف کمشنر بہادر کے دربار میں بھی باریاب ہوا کرتے ہیں! تاکہ جامعہ کو چند صد روپیہ ماہوار کی میونسپل گرانٹ کی جو مجوزہ منظوری تھی اُس پر جامعہ کا استحقاق اِس طرح جتایا جائے کہ "حاشا وکلا! ہم کوئی آزاد، باغیانہ تعلیمگاہ نہیں ہیں! ہماری روزی میں کھنڈت نہ ڈالی جائے اور ہمارا پیٹ نہ کاٹا جائے!" ـــ بہہات! ے

تیرے فقیر، اور دیں کوچۂ کفر میں صدا!!
تیرے غلام، اور کریں اہلِ جفا کی چاکری!

شاید ہماری کج نظری جس چیز کو جامعہ کے اربابِ حل وعقد کی رندانہ ہزار شیوگی سمجھتی ہے، وہ جامعہ کی "وسیع المشربی" ہو! وہ اپنے مہمان خانے میں باوقاتِ مختلف جواہر لال کو بھی "خوش آمدی" کہتا ہے، اور راجہ صاحب محمود آباد کو بھی "آمد آں یارے کہ ما می خواستیم!"، مہاتما گاندھی کی بھی قدم بوسی کرتا ہے اور نواب مستطاب عالیجناب مہدی یار جنگ بہادر کے حضور میں بھی جبہ سائی! ـــ واللہ کہ شخصیتوں کے اس زمین آسمان کے تباین میں مطلقاً کوئی دو رنگی نہیں! جامعہ کو ان سارے ادانی واعالی، باغی وفدائی بزرگوں سے جلبِ منفعت کرنے سے غرض ہے، کسی اور شے سے واسطہ نہیں! چونکہ جواہر لال کی خود نوشت سوانح عمری ـــ "میری کہانی" ـــ اور مہاتما جی کی "تلاشِ حق" "معاشیاتِ معیاری" کے نقطۂ نظر سے ایسی ہی قیمتی چیزیں ہیں، جیسے کہ والیانِ ریاست اور عمائدِ حکومت کے گرانقدر عطیئے، اِس لئے دونوں کی خدمتوں میں نیاز حاصل کرنا در اصل ایک ہی شے ـــ حضرت "مُبلغ" علیہ السلام ـــ کی آستاں بوسی ہی ہے! ے

"مقصودِ ما" ز دیر وحرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ "بر آں آستاں" رسد!

"چہرۂ شاہی" رکھنے والا سکّہ ایسی چیز نہیں کہ اُس کا نقش کسی جگہ نظر آئے، اور اُس کو سجدہ کرنے کی ناگزیری سے گریز کیا جاسکے، پھر چاہے ہمیں اپنی شاہراہِ مسلک سے کتنا ہی انحراف کیوں نہ کرنا پڑے۔

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل!
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا!

"گورنمنٹ گرانٹ" کے معاملے میں بھی جامعہ کی پالیسی ناقابلِ فہم ہے۔ برطانوی حکومتِ ہند سے بے نیازی اور والیانِ ریاست کی آستان بوسی! کچھ اچھا سلوکِ طریقت نہیں! آخر الذکر طائفۂ شریفہ آخر کون بزرگ ہیں؟! شاید اس کا جواب ناگفتہ بہ ہے! گاندھی جی نے ہندوستانی رجواڑوں کے متعلق جو پھبتی کہی ہے، جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے سیاسئین ومعاشئین اُس سے بے خبر نہ ہوں گے! برطانوی ہند کے اک سیاسی مجاہد کے لئے اک دیسی ریاست کوئی "دار الہجرۃ" یا "دار الامن" نہیں! وہ کڑھائی سے کود کر چولھے میں جا پڑنے کا اک طریق پناہ جوئی ہے! "ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست!" ریاستوں کی "زمین" کہیں زیادہ "سخت" ہے، اور آسمان کہیں زیادہ "دور"! ریاستیں بقول مہاتما گاندھی کے "دوگونہ غلامی" کے معابد ومنادر ہیں! مہاتما جی کی آپ بیتی ـــ "تلاشِ حق" ـــ اور مہاتما جی کے آواز بانئے اعلانِ حق ـــ "قوم کی آواز" ـــ شائع کرنے والی جامعہ شاید اس سے ناواقف نہ ہوگی! پھر یادش بخیر مکتبۂ جامعہ نے پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری ـــ "میری کہانی" ـــ "ہم خورما" و "ہم ثواب" حاصل کرنے کے لئے ابھی حال ہی میں چھاپنے کا جو "خیر دارین" حاصل کیا ہے، اس آتشیں کتاب کے وہ فقرے شاید بزرگانِ جامعہ "ممنوع التلاوت" سمجھتے ہوں گے، جو ماشاء اللہ اِس "ہندوستانی ہندوستان" کے متعلق اُس میں پائے جاتے ہیں! ـــ وہی ہندوستانی ہندوستان "جو خیر سے سولہویں سترہویں صدی کا اک تمدنی تبرک ہے، جو بیسویں صدی کی "بجلی کی روشنی" کا اک اندھیرا ہے! جہاں کے کرۂ ہوا میں سانس لینے سے دَم گھٹتا ہے"! جہاں کے ریلوے پُلوں پر سے گزرنے والی ٹرینوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو اُن "ندیوں کے آب رواں منجمد ہوتے محسوس ہوتے ہیں! جہاں کا "راج محل اور قصرِ شاہی" وسیع دیہات وقریات کے "ملبہائے تخریب وویرانی" کے وحشت زار کے درمیان "تنہا نظر نواز تعمیر" پائی جاتی ہے!

یہ ہندوستانی ریاستیں ہیں جو "ارباب مقدسینِ جامعہ" کی قبلۂ مقصود وکعبۂ اُمید ہیں! "جیسی روح ویسے فرشتے"۔ کیا یہ اُس ماجرے کی اک نظیر ہے؟! جامعہ کے لئے گورنمنٹِ ہند کا "عطیۂ اعانتِ تعلیمی" حرام ہے۔ لیکن چشم بد دور ریاستہائے ہند کے "خوانہائے یغما" اُس کے ذہنِ معصومیت کے لئے "شیر مادر" ہیں! "گڑ کھاؤں، گلگلوں سے پرہیز" والا اصولِ حکمت کیا "حضرت شیخ الجامعہ" نے جامعہ کے ہموار

"ملیہ کالج" کی آب و ہوا میں سیکھا ہے ؟! کیا برٹش گورنمنٹ کی گرانٹ کا قلادۂ غلامی کافی نہ تھا کہ اُسے "دو چند گلوگیر" کرنے کے لئے دیسی ریاستوں کے خزانوں کی طرف "تحویلِ قبلہ" عمل میں آیا ہے ؟! جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے "مفتی و شیخ" کو سرکاری گرانٹ پر سے حرمت کی قدغن اُٹھا کر اک رخصتِ اِباحت حاصل ہی کرنی تھی تو برطانوی حکومتِ ہند ہی کی خیرات و صدقات کے متعلق "کراہت کا فتویٰ" کیا معنی ؟! یہ فقہ اسلامی میں اک نئے باب کا اضافہ ہوگا ! ممکن ہے یہ "معاشیاتِ اقتصادی" کا کوئی قانون ہو ! اور والیانِ ریاست کے خزانوں اور توشہ خانوں کی سمت میں رُخ "معاشیاتِ معیاری" کا کوئی عنوان ہو ! ہم تو معاشیات کے مبادی سے بھی واقف نہیں۔

ورنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ !

حقیقت تو یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی گرانٹ اگرچہ عملاً قابلِ پرہیز ہے، لیکن اصولاً جائز ہے ! وہ بہرحال ہماری ہی حکومت ہے۔ گو غیر ذمہ دارانہ سہی، تاہم ہماری ! اُس کا خزانہ خود اُس کے لئے اتنا جائز نہیں جتنا کہ ہمارے لئے ! ہم اک استعارے کے پیرایہ میں اُس کے عیاش اربابِ حل و عقد کو اِس "خزانۂ عامرہ" کے متعلق یوں متنبہ کرسکتے ہیں کہ ؎

بہ بادہ دست میالائے کاں ہمہ خون است

کہ قطرہ قطرہ چکیدست از دلِ انگور !

پس اگر گورنمنٹ ہند کے ہاتھ سے تعلیمی امداد کی مد میں ہم کو کچھ وصول ہو جائے تو اگرچہ اس "ثقیل غذا" کو ہضم کرکے اپنے جسم کے اندر "خونِ صالح" پیدا کرنا ہر بودے قومی یا تعلیمی ادارے کے بس کی بات نہیں، تاہم اصولاً وہ اصلاً یہ رقوم سرکاری ایسی ہیں کہ انھیں ہم اپنی "متاعِ بُردہ" کی بازیافت کی اک ایسی قسط سمجھ سکتے ہیں، جس کو "رہزن" نے کم و بیش اپنے اوپر اک "قرض" تسلیم کرلیا ہے !

لیکن دوسری طرف، ہندوستانی ریاستوں سے ہمارا کوئی "آئینی" رشتہ نہیں ! پھر اک عام ہندوستانی قومیت کا رابطۂ اخوت بھی وہ ہم سے جس قدر محسوس کرتی ہیں اُس کا اندازہ آپ اِس سے کیجئے کہ اُن کے قلمروئے حکومت و حلقۂ عبودیت سے باہر بسنے والا ہر ہندو یا مسلمان اُن کی سرکاری زبان میں "غیر ملکی" کا مکروہ نام رکھتا ہے ! ع

ہر کو نہ "خر" است "کافر" "میخوانند" !

ایسی دُنیائے "قلعۃ الموت" "نشین" سے "برطانوی ہند" کا اک ادارہ کیا پا سکتا ہے ؟! اور اگر پا سکتا ہے تو اُنہی "ناگفتہ بہ شرائط داد و ستد" کی مفاہمت پر کہ وہ اُس کے عُریاں استبداد و مطلق العنانی کے بارے میں اک "مُہرِ طلائی" اپنے لب و دہن پر لگائیگا ! اِسی عہدِ وفا کا ناگزیر مثنیٰ یہ ہوگا کہ وہ موقع و بےموقع، ریاست اور سیاسیاتِ ریاست کی حمایت کرے گا ! چنانچہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ نے بھی ماشاء اللہ پوری "اسلامی عہد پروری" اور "ملی وفاکیشی" سے اِن نئے اختیار کئے ہوئے پیمانہائے محبت و ارادت و "دعایت" ("Propaganda") کو نبھایا ہے ! اُس سے شائع ہونے والے رسائل اِن ریاستوں اور اُن کے پایۂ تختوں کے حالات سے "زرین" ہوا کرتے ہیں، اور اُن کے اکابرِ دولت و اعیانِ حکومت کی ضیافتوں کے فوٹوؤں سے مُرصع ! ؎

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا !

وہ دن گئے "دہ کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں" !

ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ تحریرات و مُرقعات، "جامعہ ملیہ" کے زیر تربیت و مخاطبت معصوم بچوں کے رسالے — "پیامِ تعلیم" — میں شائع کئے جاتے ہیں ! "ٹھوس کام" کرنے والی جامعہ اِس سے زیادہ اور کیا "تعلیمی پیام" "شاہانہ سیاست" کے ساتھ محبت و عقیدت کا، آزاد پیدا ہونے والے معصوم بچگانِ ملک کو دے سکتی ہے ؟! — یہ گویا "فطرۃِ اسلام" پر پیدا ہونے والی ارواحِ ملک و وطن کے کانوں میں لمحۂ پیدائش ہی پر "اذان و اقامت" کے کلماتِ طیبات کی تلقین ہے ! ؎

مدہوش کر دے ساقی ساغر پلا پلا کے

دیں گے دُعا شرابی پھر ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے !

جامعہ ملیہ اگر اپنی پاک بازی اور بےنیازی کی نمود و نمائش کا "خرقۂ سالوس" اُتار پھینکتی اور دیسی ریاستوں کی "بخششوں" کی ایمان طلبیوں پر برطانوی حکومتِ ہند کی نسبتۂ بہت زیادہ صاف اور مقابلتۂ بہت ہی کم بےلوث گرانٹ کو مُرجّح قرار دیتی تو، دوسری بیشمار علتوں اور قباحتوں سے بچ جانے کے علاوہ اس گرانٹ کی مالی مقدار بھی زیادہ ہوتی ! مثل مشہور ہے کہ ع

خاک از تودۂ کلاں بردار !

مگر شاید اِس کا راز یہ ہو کہ "جامعہ" اپنے کو اک ایسا گدائے خاک نشین سمجھتی ہے کہ دہلی و شملہ کے بابِ عالی کے سنگِ آستاں تک اپنی پیشانیٔ پست کو بلند نہیں کرسکتی، اور بدرجۂ مجبوری دیسی رجواڑوں کی "دُکشنا" پر قانع

ہوگئی ہے:۔

تو دلبری وماہ قامتِ دوست!
فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست!

تاہم جامعہ کے "ماہرینِ علم معیشت" نے اِس نارسائی و بے ہنری کی کافی دوا اور تلافی کر لی ہے! گورنمنٹ ہند کی سرپرستی کے سایۂ عاطفت سے محرومی سے فائدہ اُٹھاکر اُنھوں نے "جامعہ" کو اک "آل انڈیا یتیم" کی حیثیت سے مشتہر کرنا شروع کر دیا! اور اب یہ مہم پوری معاشی بارآوری کو پہنچ گئی ہے چنانچہ اس وقت وہ والیانِ ریاست سے بھی فیضیاب ہیں، اور ہندوستانی رؤسائے حریت پرور (مثل جمنالال بجاج) سے بھی! مقتدرائے ملک (مثل مہاتما گاندھی وغیرہم) کے دستِ کرم سے بھی مستفید ہیں اور جانبازانِ "قلزم دانہ" (مثل جواہر لال) کے بازوئے ہمت سے بھی! وہ شیخ سعدی شیرازی کی زبان میں بغداد کی نعمتِ سکندری رکھنے والی "زبیدہ خاتون" ہیں، جو روزِ ولادت سے اک خلیفہ (مہدی) کی لڑکی بیٹی تھی، اور بعد میں اک دوسرے خلیفہ (ہارون الرشید) کی چہیتی بیوی بنی، اور بعد ہی اک اک تیسرے خلیفہ (مامون الرشید) کی والدۂ محترمہ! ع

نہ مثلِ زبیدہ است ہر بیوہ! (سعدی)

تاہم موجودہ اربابِ حل وعقد جامعہ کو زیبا نہیں کہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کی ولادت باسعادت، اُس کے محترم متولیان امانت، اُس کے سابقہ نامور جانبازانِ خدمت واستقامت، اُس کی گزشتہ مبارک روایاتِ امانت و دیانت و عسرت و عزیمت، اُس کے موقر نام اور مسلمۂ عام شہرت کے آبگینۂ نازک پر ذرا بھی ٹھیس لگنے دیں! ع

نام نیک رفتگاں ضائع مکن!

آزاد تعلیم کے معاملے میں سرکاری گرانٹ کا مسئلہ بیحد نازک واقع ہوا ہے۔ جنگِ عظیم میں انگلستان کی شہرۂ آفاق پرائیویٹ یونیورسٹیوں ۔۔۔ کیمبرج و آکسفورڈ ۔۔۔ کے نوخیز طالب علموں سے لیکر نازک دماغ پروفیسروں و آبگینۂ طبع شعراء تک نے میدانِ جنگ کو اپنے خونِ گرم سے رنگین کر ڈالا تھا! لیکن جنگ کے آفاق گیر معاشی خلفشار و مالی سقوط کے نتیجے میں یہ دونوں یونیورسٹیاں جب بڑی طرح گرفتارِ مشکلات ہوئیں اور ملک کی قومی حکومت نے محض بتقاضائے "**ھل جزاء الاحسان الا الاحسان**" اپنے خزانے سے اُن کی دستگیری کرنے کی پیشکش پیش کی تو اُن جامعاتِ علم وشرافت کے علماء وفضلاء، ارکانِ اہتمام وارباب حل وعقد کی نگاہ غیرت

"مجلسِ شوریٰ" میں جو مناظر پیش آئے اُنھوں نے تمدنِ اسلام کے اُس علمی و تعلیمی خیر القرون کی تاریخ دوہرادی جب کہ عروس البلاد بغداد کے اولین سرکاری مدرسۂ عالیہ ۔۔۔ "نظامیۂ بغداد" ۔۔۔ کا افتتاح اک دیدنی شاہانہ تزک واحتشام سے کیا گیا۔ اُس وقت علمائے وقت نے اک مجلسِ عزا منعقد کی جس میں یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ "ہیہات! دورِ علم و شرافت ختم ہوا! آج سے علم، معرفتِ حقیقت اور خدارسی کے لئے نہ پڑھا جائے گا بلکہ قربِ سلطان وامیر کے لئے!":۔

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد!

اگر ہم خدانخواستہ موجودہ مجاہدینِ جامعہ کا جائزہ، قدیم و جدید تاریخ علم و تعلیم کے اس بلند منارے پر کھڑے ہو کر لینے لگیں تو اُس کے یہ اطفالِ کتب سوائے اِس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ "**لا علم لنا الا ما علمتنا**"!:۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق؟
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد!

جامعۂ ملیہ اسلامیہ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ تعلیم کے معاملے میں اسلام کا تصورِ تنزہ واحتیاط اِس درجہ نازک واقع ہوا ہے کہ "عالم بالا" کے سرپرستوں کے گرانقدر عطیئے تو ایک طرف، رہے، ہمارے معلمانہ قدموں میں زانوئے ادب تہ کرنے والے شاگردوں کی تعلیمی فیسیں تک شرعاً جائز نہیں رکھی گئی ہیں! پھر اِس فتوے کو آپ کسی "مفرطِ غیر پرستی" پر بھی محمول کیجئے! محصلینِ زکوٰۃ کا نصِ قطعی قرآنی سے معاوضہ مقرر کرنے والا اسلام بغیر کسی وجہِ فاسق کے تعلیم کے حق الخدمت کو ممنوع قرار دینے والا نہ تھا! ہم اگر چاہیں تو بادنیٰ تامل اس راز کی تہ کو پا سکتے ہیں! کیا آپ کو اپنے مخاطب طلبہ کی تھوڑی سی بہت رعایت ملحوظ نہیں ہوا کرتی!! رجسٹرہائے طلبہ کی فہرستیں خوب طویل ہوں! اُسی کے تناسب سے رقومِ فیس وصول ہوں! والدین کو خوشگوار قسم کی تعلیمی رپورٹیں بھیجی جائیں! ہمارے ہاں کے پاس ہونے والوں کا اک اچھا "فیصد" (Percentage) ہو! کوئی ایسی چیز نہ پڑھائی جائے جو لڑکوں، اُن کے جذبات، اُن کے "سرپرستوں" کے تعصبات و توہمات کو ٹھیس لگائے! "یومِ والدین" (Parents' Day) وغیرہ کی قسم کی تقریبات منعقد کرکے بچوں کے گھر والوں تک پر ڈورے ڈالے جائیں! وعلیٰ ہذا القیاس ابھی لڑنے کی گوناگوں ترکیبوں اور ڈپلومیسیوں نے ہمارے بہت سے مشن اسکولوں اور پرائیویٹ،

نام نہاد قومی تعلیمگاہوں کو "اعلیٰ سیاسیات کے اکھاڑے" بنا رکھا ہے! سوائے فیس کی آمدنی اور اُس کے اضافے کے خیال کے کونسی چیز ہے جو تعلیم و تربیت کے چیلے سے یہ بیسیوں پاپڑ بیلنے پر مجبور کرتی ہے؟! پس معاوضۂ تعلیمی کا فتنہ ناقابل انکار ہے!۔۔۔ تا بہ "گرانٹِ گورنمنٹ" چہ رسد؟!

اسی شر کو آپ اک دوسرے شعبۂ زندگی میں دیکھئے: اخبار کے خریداروں سے اخبار کا چندہ لینا کتنا معصوم حق ہے! لیکن پھر آپ کو معلوم ہے کہ خریداروں کو اپنے اخبار یا رسالے سے وابستہ رکھنے کے لئے مقررہ تعدادِ صفحات و اوراق "ریڈنگ میٹر" کے علاوہ کیا کیا کچھ "ناقابلِ قرأت موادِ متعفن" ("Unreadable rotten stuff") بھی دیا جاتا ہے؟ اسی چیز نے مغرب کے ممالک کے "چوتھے رکنِ ریاست" (رسائل و جرائد) کو ("Gutter Press") بنا رکھا ہے!

آپ اپنے حاصل کردہ "تعلیمی عطایا و ہدایا" کو کہاں کا "مائدۂ من السماء" سمجھتے ہیں؟! جس شے کو ہم اپنی "فتوح و خراج" سمجھے ہوئے ہیں وہ دراصل ہمارے ضمیر و ایمان کی "قیمتِ خرید" ہے!

مرا فروخت محبت ولے ندانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است؟!

ان ساری خرابیوں اور علتوں، اس تمام لاگ اور لاٹ، اس ساری لوٹ و غرض کی طویل کار فرمائی اور انقلاب انگیزی کا مجموعی نتیجہ آج یہ ہے کہ ہم اک عالم نفاق جامعہ پر طاری پاتے ہیں! شیخ الجامعہ کانگریسی بھی بنتے ہیں، اور مسلم لیگی بھی!، وہ جامعہ ملیہ کے سالار کارواں ہیں، اور علی گڑھ کے شب و روز کے زائر!، وہ ٹیگور کے بھی معتقد ہیں اور اقبال کے بھی مرید!، خالدہ ادیب خانم سے ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" پر خطبات رجز بھی دلواتے ہیں اور پھر خود "صنمخانۂ علی گڑھ کے میلے" ۔۔۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ تعلیم ثانوی کی بزم میں "شبنم افشانی" بھی کر آتے ہیں!، رسالۂ جامعہ میں صیغۂ ادارت کی طرف سے اسلامی سیاستِ ہند کے مسائل متنازعہ فیہ پر نفیاً کچھ کہتے ہیں نہ اثباتاً، لیکن قلمی معاونین کی معرفت یہ بھی لکھوا لیتے ہیں، اور وہ بھی! تاکہ وقت پر چت بھی اپنی ہو اور پٹ بھی اپنی! نیز اگر ضرورت ہو تو ہر دو سے بری الذمہ بھی! منیجر صاحب مکتبۂ جامعہ خیر سے "جامعۂ ملیہ" سے ملحق ہیں اور "جامعۂ اسلامیہ" سے بھی وابستہ، اور باایں ہمہ بھرے جلسوں میں گھبرا کر یہ بھی بول اٹھنے والے کہ "نا صاحب! ہم نہ "مسلم کانگریسین" ہیں نہ "نیشنلسٹ مسلم"! ہم تو صرف "کتب فروش" ہیں! شیخ الجامعہ، جواہر لال نہرو سے بھی جامعہ کے دروازے پر شیک ہینڈ کرتے ہیں، اور راجہ صاحب محمود آباد سے بھی معانقہ! وہ لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہونے کے لئے سال بھر میں ایک دفعہ "یوم خاکروبی" بھی منا لیتے ہیں، اور پھر نہا دھو کر باقی سارے برس علیگڑھ کا مسلسل گشت و باز گشت سیکنڈ کلاس ریلوے کمپارٹمنٹ میں فرماتے رہتے ہیں! وہ خود بیرون خانہ کھدر پوش نظر آتے ہیں، لیکن اُنکا زنانخانہ ہر کوالٹی کے بدیسی کپڑے کا مستقل سرپرست ہے!، تاہم بچی "کی بسم اللہ خوانی کا جب "پبلک فنکشن" مرحلے میں انجام پاتا ہے تو اسی غریب بچی کو اُس کے سارے لال پیلے، ریشمی و قیمتی، جاپانی و انگریزی کپڑوں کے جوڑوں سے ننگا کر دیا جاتا ہے، اور بر وقت اک خاص طور پر سلوایا ہوا "شدھ کھدر" کا باناً اُسے زیب تن کرا دیا جاتا ہے!

حافظا! مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را!

(۶)

قومی خدمت کے کاموں میں گرانٹ اور چندے کا دخل و مداخلت اک بڑی بے پناہ آفت ہے! برنارڈ شا نے اپنے ایک ڈرامے میں اک حق پرست اور جانباز لڑکی کے کردار کو پیش کیا ہے۔ یہ لڑکی اپنے دولت مند باپ کو اُس مشہور شعر کے دوسرے مصرعے کی نظیر پاتی ہے جو یہ ہے کہ:

کریماں را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست!

اُس کا یہ دردانگیز مشاہدہ اُس کے اندر مسلسل تلخی اور بیزاری پیدا کرتا رہتا ہے! تا آنکہ دولت کی عیش کوشی اور عزت آزاری کے یہ مناظر اُس کی آنکھوں میں اُس کے باپ کے گھر کو اک ایسے خوفناک مقام میں تبدیل کر دیتے ہیں جس کی ملعونیت کسی بھی لمحے اُسے عذابِ الٰہی کے نزول کا ہدف بنا دے سکتی ہے! بالآخر لڑکی باپ کے دولت خانے کے مامونِ محن کی آتش فشاں سرزمین سے ہجرت کر جاتی ہے! اور "سیلویشن آرمی" (مکتی فوج) کے اک مرکزِ خدمتِ خلق سے رشتۂ عقیدت جوڑتی ہے!

وہ عرصے تک اس جگہ پورے سکونِ دل اور شرحِ صدر کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ پاکیزہ مامن اُس کی روحِ معصوم کے لئے ایسا تسکین بنجاتا ہے کہ

وہ بعض پبلک تقریبات کے موقعوں پر بھی اپنی اخوات طریقت کے ساتھ اِس حرمِ قدس سے باہر نہیں نکلتی، اور اِسی دار السلام کے حصار میں آسودۂ قیام و قرار رہتی ہے!

ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ اِسی طرح، سب کے باہر چلے جانے کے بعد اِس آشیانۂ امن کی تنہا قمری بنی بیٹھی تھی۔ کچھ جی گھبرایا تو شغلِ بیکاری و وقت گزاری کے طور پر اُس نے سامنے میز پر رکھے ہوئے آرمی ہیڈ کوارٹرز کے رجسٹرِ ابل کی ورق گردانی شروع کی۔ معاً اُس کی نظر اک عُنوانِ جلی پر پڑی — "فہرست مُعطیانِ چندہ"! لڑکی بڑے اشتیاق سے اسمار کے اِس "سلسلۃ الذہب" (زنجیرِ زر) کے مطالعے میں مشغول ہوگئی! کیا دیکھتی ہے کہ عین سرِ فہرست کے اسمائے گرامی میں اُس کے "بابا جان" کا نام نامی بھی "زیبِ قرطاس" بنا ہوا ہے! اور اُن سارے القاب و خطابات کے ساتھ جو رقمِ چندہ کی بخشش و بذل کا نعم البدل ہوا کرتے ہیں!! ع

شکر نعتہائے تو چند آنکہ نعتہائے تو!

مبہوت کمسن لڑکی سر پکڑ کر رہ گئی! اللہ اللہ، میرا باپ! سارے جنودِ شیاطینِ شر و ظلم کا سرخیل، اور "عساکرِ نجات" (Salvation Army) کا اک "کیپ ٹالورز"؟! ع

آنچہ می بینم، بہ بیداری ست یا رب یا بخواب؟!

اُف! دولت کی یہ "ریاکاری"؟! اور ثروت کے دامِ سخت کی یہ "ہمہ گیری" — "مکتی فوج" کو بھی اُس کی گرفت و دست درازی سے نجات نہ مل سکی؟! ہیہات! ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مُرغِ قبلہ نما آشیانے میں!

وا مصیبتا! کہ دولت کی عالم آشوبی کے خلاف کوئی "دار الامن" نہیں! وا اسفا! کہ اس سمائے دُنیا کے نیچے انسانی خدمات و حسنات بھی اربابِ سرمایہ ہی کے دستِ کرم پر پل رہی ہیں! "یزداں" کی پرورش بھی "اہرمن" ہی کے خوان پر؟! ع

حیف گر در پسِ امروز بود فردائے!

اک ناقابلِ بیان و ناممکن التسکین کوفت و کلفت اور یاس و قنوط کی حالت میں لڑکی اُس "سیلویشن آرمی" کے معسکرِ مُجاہدین کا بھی اِسی طرح تخلیہ کر دیتی ہے جس طرح کہ قبل ازیں اُس نے اپنے باپ کے "محلِ قارونی" کو خیرباد کہا تھا! ؎

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردئ "سرمایہ" در بہشت!

خلق اللہ کی خدمت اور قومی تعمیر کے کاروبار میں دولت و سرمایہ کی اس "تیر در کمانی و صیاد در کمینی" سے قدم قدم پر ہوشیار و خبردار رہنے کی ضرورت ہے! مولانا ابو الکلام آزاد پر "الہلال" کے پر و بال پر اُڑنے کی پہلی جنبش پر مبلغ ۴۰ ہزار روپیہ کے چیک کے "دامِ زرین" کا فی الفور پڑنا، اور اِس عنقائے بلند آشیاں کا ذہین اُس کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دینا اوپر کہیں مذکور ہو چکا ہے! ہم سب کو معلوم ہے کہ مولانا آزاد کا نعرۂ حریت یہی رہا ہے کہ ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں!
جسے غرور ہو آکر کرے شکار مجھے!!

"تاہم یہ مایۂ نازشِ انسانی مثالیں اُتنی ہی شاذ ہیں جتنی کہ شاندار! وقلیل ما ہم! خال خال "افراد فرید" سے قطع نظر کرکے عالمگیر مرقع اِس معاملۂ ناشدنی کا بالکل برعکس واقع ہوا ہے! انگلستان اور مشیر ممالکِ مغرب کے اخبارات و جرائد کو اہلِ سرمایہ نے خفیہ وہاں کے کرد ریتیوں ہی کا کلمہ گو ہے! پیرس سے غربا و مساکین نات اور مزدوران و اشتراکیان برِ اعظم کا اک زبردست آرگن نکلتا ہے! — در آپ کو معلوم ہے کہ کس کے سرمائے سے اور کس کی پسِ پردۂ زرنگاری کا فیہا جرائی سے؟! — کر سرمایہ پرستوں اور جُبادری قارونانِ یورپ کی جنگِ زرگری سے!! جنگِ عظیم کے بعد کے خستہ و شکستہ و شکست خوردہ جرمنی کی "نشاۃِ ثانیہ" کی ہر تگ و دو کو یہودی خداوندانِ سرمایہ نے بھیس بدل بدل کر شرکت کرکے خراب کر ڈالا! تاآنکہ ہٹلر اک نعرۂ فاقہ مستانہ مار کر اُٹھا، اور اپنے وطنِ عزیز کی اِن طلائی زنجیروں کو پارہ پارہ کر ڈالا! اِسی اژدرِ دولت کی سرکوبی کے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ جرمنی کا "کرپ" کا کارخانۂ آہن و فولاد اِتنا برق دم ہو گیا کہ اُس کے سامانِ برآوردہ نے ایک غروب و طلوعِ آفتاب کی درمیانی شب میں ساری "ارضِ رہائن" پر اپنا پرچم اُڑا دیا! ——— پھر سرمایہ ہی ہے جو جدید العہد امریکہ کی تمام معاشی بحالی اور تمدنی ترقی و سربلندی کی راہ میں "سالخوردہ ججانِ سپریم کورٹ" کے پیکرِ قانون و آئین کی راہیں سنگِ راہ ہے، اور پریذیڈنٹ روزویلٹ کے سارے جہاد و تطہیرِ ہئیتِ اجتماعیہ کا عَلَم بار بار سرنگوں کر کر دینا چاہتا ہے! ع

الاماں، اے جانستانِ سرمایہ داری، الاماں!!

جب حال یہ ہے کہ ہر حق تحریک کی شاہراہ پر سرمایہ کا اژدہا دہانہ

بچاڑ سے اُسے نگل لینے کو پڑا ہوا ہے تو سالکانِ صراطِ مستقیم کو کتنا بیدار و نظر باز رہنے کی ضرورت ہے! وہ ہمارا شیر خوراں نہ بنیگا، ہمارا خون آشام ثابت ہوگا!

مباش غرّہ، دغافل چو میش سر در پیش
کہ در طبیعتِ ایں گرگ "گلہ بانی" نیست!

خاتمۂ سخن میں اب ہم اس بحث کو بالکل جامع و مانع بنا دینا چاہتے ہیں! واضح رہے کہ ہم "چندے" کو ازلاً و ابداً حرام و ممنوع کہنے پر آمادہ نہیں! اور یہ کیونکر ممکن ہو! چندہ دیو بند نے بھی لیا ہے، چندہ کانگریس بھی لیتی ہے! دوستوں سے نذرانہ مولٰنا محمد علی مرحوم نے بھی لیا، اور بعض خاص احباب کے پیشکشوں کے قبول کرنے والے مولٰنا ابو الکلام بھی ہے! بڑی بڑی بھینٹیں گاندھی جی نے بھی لیں اور خطیر رقومِ امداد کو ٹیگور نے بھی نوازا! اک مشہور تاریخی ہدیۂ گرانمایہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے آستانے کے دراجابت تک بھی پہنچا! اور یہ ہدایا، و تحالف ہی تھے جن کے زرِ کثیر نے حضرتِ داعیٔ اسلام کے قدم مبارک چومے، اور جن عظیم میزانوں نے کبھی حضرت عمرؓ کو اپنے نصف انبارِ متاع سے سبکدوش کر دیا، کبھی صدیق اکبرؓ کے گھر میں صرف "اللہ اور اللہ کے رسول کا نام" چھوڑ دیا! اور کبھی حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سالم باغات اور حضرتِ عثمان غنیؓ کے سارے تجارتی قافلے دائرِ نیلام کر لئے! —— تاہم ذرا عقل و تمیز کو کام فرمائیے، اور تفاوتِ رہ کی پوری پیمائش کیجئے! یہ تنبیہ یہاں اشد ضروری نظر آتی ہے کہ ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ مانَد در نوشتن شیر و شیر

عموماً و اصولاً اِن سب بزرگوں نے یہ پیشکش اس طرح قبول کئے کہ بیشتر شریف النفس بے لوث لوگوں نے بطیبِ خاطر انھیں اُن کی خدمتوں میں پیش کیا، اُن کو خریدنے کے لئے نہیں؛ بلکہ خود اُن کے درِ قبول کو پہنچنے کے لئے! اُن کی اور اُن کے مخدوموں کے درمیان شرائطِ مفاہمت کا عنوان یہ تھا کہ ع

با چوں توئی معاملہ بر خویش منت است!

دراصل اِن خدام کو متعلقہ تحریکوں یا شخصیتوں نے متاثر یا کم از کم "مرعوب" کیا! اُنھوں نے جو کچھ دیا وہ محسنین و یا بندگان کے ایمان و ضمیر کی "قیمتِ خرید" نہ تھی، اُن کی دعوت کی قوت کا "زرِ خراج" تھا! اوپر جو فہرست خواص و اکابر گزر چکی ہے اُس سے سر دست ازمنۂ قدیم کے بزرگانِ دین کو الگ کر دیجئے، اور عہدِ حاضر کے محولۂ بالا مردانِ کار و بانیانِ تحریکات و سربراہکارانِ ادارات کو لیجئے! ہاں نذرانہ مولٰنا محمد علیؒ کی طرح لیجئے کہ جب جب کسی وقت سابق کے نذر گزار بزرگ، نازک سیاسی موقعوں پر اُن سے "حسابِ دوستاں دردل" چکوا لنے کا تقاضا کیا کرتے تھے تو گو اُنکا شخصی موقف تھوڑی دیر کے لئے کتنا ہی بد نما ہو جائے، لیکن وہ اپنی زبان یا اپنی موضوعِ خدمت تحریک کے کسی جز کو بھی مکفول یا معطل نہ کرتے تھے! ہاں ہدیہ مولٰنا ابو الکلام کی طرح قبول کیجئے جنھوں نے زراندوزی کے زرین ترین موقعوں کو اپنی اک ادنیٰ ادائے بے نیازی کی نذر کر دیا ہے! چندہ گاندھی جی کی طرح وصول کیجئے، کہ وہ عین جس وقت ملک کے خداوندانِ دولت پر تبرّی کر رہے ہیں، اُن کے قدموں میں قارون و فرعون بھینٹوں کے ڈھیر لگا رہے ہیں! عطیہ ٹیگور کی طرح نوازیئے کہ اُس کے ایک اشارۂ چشم و ابرو پر سلطانِ مصر پورے کتب خانۂ عربی کے ساتھ، شاہِ ایران سارے ذخیرۂ ادبیاتِ ایرانی کے ساتھ، سلطنتِ چین اپنے گرانقدر تحفۂ اسفار و صحائفِ چینی کے ساتھ، جاپان، امریکہ، اور یورپ اپنی گوناگوں قدردانیوں اور نیاز پیشگیوں کے ساتھ، اور "نوبیل پرائز کمیٹی" اپنے سوا لاکھ کے انعام کے ساتھ، دست بستہ حاضر ہے!، درآنحالیکہ خود شاعر، مشرق و مغرب کی اِن ساری مقتدر ہستیوں، جماعتوں، قوموں، اور حکومتوں کے سامنے اپنی تمدنی نقادی اور اپنی روحانی آزادمقالی کے ساتھ بالکل شمشیر برہنہ ہے! —— ہاں تحفہ لیجئے مادام خالدہ ادیب خانم کی طرح، کہ اِدھر شریت جمنالال بجاج مبلغ ایک ہزار روپیہ انھیں اُن کے سفرِ آمد و رفتِ ہندوستان کے بہانے سے نذر کرتے ہیں، اور اُدھر خانم موصوف اِس رقم کو جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی مقدم تر ضرورت کے حیلے سے اہلِ جامعہ ہی کے حوالے فرما دیتی ہیں! —— اور ہاں چندہ نہ لیجئے "بعذر" سربراہ کارانِ جامعہ کی طرح، کہ وہ اک غریب الوطن، نیز جلا وطن، اور شیدائے علم و فن دخترِ اسلام کا ذاتی ہدیہ بھی (جو بمشکل اُن کی طویل زحمت کشی اور دماغ سوزی کا بدل تھا!) بے تکلف ہتھیا لیتے ہیں! ع

ایں کار از شماست و مرداں چنیں کنند!

مردانِ حق بلاشبہ زمین پر حالتِ تہیدستی میں ظہور کرتے ہیں، لیکن اپنے "دمِ نقد" سے خزانے اور کانیں، سلطنتیں اور تہذیبیں پیدا کر جاتے ہیں! تاہم یاد رکھئے کہ یہ اُنکا "حاصلِ دریوزہ" نہیں ہوا کرتا، اُنکا "جہانِ خلاقی" ہوتا ہے! وہ جس طرح نسلِ آدم سے "جانباز" فدائی لیتے ہیں، اِسی طرح اُس سے "زرپاش"

مردانِ ایثار بھی اخذ کرتے ہیں! اُن پر اُن کی زندہ کی ہوئی قوم کا "تن من دھن" سب قربان ہوتا ہے! کہا جا سکتا ہے کہ سب کچھ لینے کے بعد بھی یہ بے نیاز ان حق کچھ بھی کسی سے نہیں لیتے: وہ جو کچھ مخلوق سے وصول کرتے ہیں، مخلوق کو اُنہی کا عطیہ ہوا کرتا ہے: وہ بہت کچھ لیتے ہیں، لیکن دینے والوں کو دینے کا یہ جذبہ اُنہی کا دیا ہوا ہوتا ہے!!

آں کس کہ ترا بجواست، جاں راچہ کند؟　　فرزند و عیال و خانماں راچہ کند؟
دیوانہ کنی، ہر دو جہانش بخشی!　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند؟

اسی قسم کا پایا ہوا "دھن" اُن کے لئے "اکل حلال" بھی ہوتا ہے، اور "خونِ عالم" کا مُولّد بھی: بصورت دیگر وہ دوسروں کی کمائی ہے، مگر ہمارا روحانی کسب و خلق! اور بدیں وجہ نہ ہمارے لئے شایان ہے، نہ ہماری اخلاقی "صحت" کے لئے محفوظ غذا!

مالِ دُنیا دامِ مُرغانِ ضعیف!　　مالِ دُنیا طعمِ مُرغانِ شریف!
مالِ اہلِ دل بوُد "سمالِ" شاں　　مالِ اہلِ تن بود "اَحمالِ" شاں!

جامعۂ ملیہ میں اس وقت جبکہ دل و دماغ اور جبکہ قلب و رُوح کے اصحاب "رفتوح" اور "مربیانِ داعیۂ انفاق فی سبیل اللہ" موجود ہیں اُن کی بلند پایگی و علوئے نفس کا مشتے نمونہ از خروارے یہ ملاحظہ فرمائیے کہ وہ رسالۂ "ہمدردِ جامعہ" (اگست نمبر) میں اپنا کشکولِ گدائی ہاتھ میں لے کر یوں صدا لگاتے ہیں:

"ہم (دہلی کے) تاجرانِ چرم کے دستِ کرم کے خاص طور پر ممنون ہیں!"

ہیہات! سے

جا بجُش سے لکارتے جن رہگذروں میں
دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے!

(باقی آئندہ)

کھری کھری باتیں

جو لوگ غریبوں کو ستا ہی نہیں سکتے　　وہ لطف امارت کا اُٹھا ہی نہیں سکتے
تقدیس کا اُن کی کوئی قائل نہیں ہوتا　　جو رعب، تقدس کا جما ہی نہیں سکتے
گھر سے بھی وہ ہو جاتے ہیں اور رہیں بھی محروم　　ویرانہ گھروں میں جو ورآ ہی نہیں سکتے
فطرت کا یہ ہے فیصلہ ناقابلِ تنسیخ　　مٹ جائیں گے وہ خود، جو مٹا ہی نہیں سکتے
حائل ہے زمانے میں جنھیں قوت و طاقت　　کمزور کو خاطر میں وہ لا ہی نہیں سکتے
رہنا اُنھیں جھک کر ہی بہر حال پڑے گا　　جو گردنیں اوروں کی جھکا ہی نہیں سکتے
جو جنگ کے میداں میں ہیں چلتی ہوئی تلوار　　وہ قبضۂ اغیار میں آ ہی نہیں سکتے
بہ جائیں گے اک روز خود اپنے ہی لہو میں　　جو خون میں اوروں کے نہا ہی نہیں سکتے
ہو جاتے ہیں معزول بہت جلد وہ خواجہ　　تعداد جو بندوں کی بڑھا ہی نہیں سکتے

کیا منزلِ مقصود کو پہونچیں گے وہ ارشد
جو راہ سے رہزن کو ہٹا ہی نہیں سکتے

ارشد تھانوی

افسانے کا آغاز و انجام

(امداد صابری)

ابتدائی اور آخری اثرات عموماً بہت کاری ہوتے ہیں۔ ابتدائی اثرات اس لئے کہ ابتداء میں دماغ آزاد اور اثرات قبول کرنے پر آمادہ و طیار رہتا ہے۔ آخری اس لئے کہ ان کے بعد مصنف کی طرف سے کوئی اور ایسی بات نہیں کہی جائے گی جو ان اثرات میں ترمیم یا تنسیخ کرے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کسی مضمون کے شروع اور آخر کو اس مضمون کی تشکیل میں نمایاں اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اور ان میں سے آغاز و انجام زیادہ توجہ اور غور کا مستحق ہے۔

افسانے میں انجام، آغاز کی بہ نسبت بہت ہی زیادہ اہم ہوتا ہے جہاں پہنچ کر تأثر زیادہ سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ ابتدا ہی سے افسانہ نگار کی نظر انجام پر رہتی ہے۔ اور افسانہ نگار ہی پر نہیں خود پڑھنے والا بھی یہ جاننے کے لئے بے چین ہوتا ہے کہ آخر میں کیا ہوا۔ افسانے کا سارا طغیان بیان و واقعات کا ماحصل انجام ہی ہوتا ہے۔

انجام افسانے کا خلاصہ نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت کسی مناظرے کی صدر کی آخری تقریر سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس میں ساری بحثوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تو افسانے کے واحد تأثر کا آخری اور سب سے زیادہ پُر زور آوازہ ہوتا ہے۔ اگر انجام قوی الاثر ہو تو واحد تأثر پڑھنے والے کے ذہن پر زیادہ سے زیادہ گہرا اور پائدار نقش چھوڑے گا۔ اگر اس کے خلاف انجام اثر کے لحاظ سے کمزور رہے تو پڑھنے والا نتیجے کے اعتبار سے افسانے سے مایوس رہے گا۔

ہر افسانے میں ابتدا ہی سے افسانہ نگار پڑھنے والے کے ذہن سے وعدہ کرتا آتا ہے کہ میں تجھے ایک ادراک پر ور اثر دوں گا۔ یہ وعدہ افسانے کے انجام پر پورا کیا جاتا ہے۔ اگر انجام کو اثرات کے لحاظ سے کمزور رکھنا ہے تو افسانہ نگار کو پڑھنے والے کے ذہن سے کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہیئے یا اس وعدے کا ایفا ہونا چاہیئے۔ اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انجام کو زیادہ سے زیادہ گہرے اثرات کا حامل بنایا جائے۔ اگر انجام قابل اطمینان نہیں ہو تو افسانہ ناکامیاب قرار پائے گا۔

ایک برتن خواہ بناوٹ کے اعتبار سے کتنا ہی خوبصورت اور دل آویز کیوں نہ ہو لیکن آخری بار آنچ کھاتے وقت وہ چٹخ کر ٹوٹ جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی تمام خوبصورتی اور دل آویزی کے باوجود بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ مٹی کے سوا کچھ نہیں۔

اسی طرح اگر افسانہ پڑھنے والے کو مطمئن نہ کرے اور اس کی توقعات کو پورا نہ کر سکے تو وہ وقت اور دماغی قوت کی بربادی کے سوا ہے کیا، توقعات انجام ہی سے پوری ہوتی ہیں۔ جس کا کام یہ ہے کہ نہ صرف افسانے کو مناسب طور پر انجام پذیر دکھائے بلکہ افسانے کے واحد تأثر کو اثرات کی پوری چمک دمک کے ساتھ پیش کر کے نفس مضمون کے اعتبار سے بھی مکمل کر دے۔

افسانہ ختم کرنے کا کوئی مخصوص طریقہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ افسانے کے ڈھنگ اور اس کے تأثر کو پیش نظر رکھتے ہوئے افسانے کا انجام تراشا جاتا ہے۔ بعض افسانے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ نقطۂ عروج پہ پہنچتے ہی فوراً ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض ان کے برخلاف نقطۂ عروج کے بعد بھی چند فقروں یا

یا پارول تک آگے جاتے ہیں۔ تاہم یہ کلیہ ہے کہ واقعات اس مرحلے پر پہنچ کر باعتبار نتائج و اثرات مکمل ہو جانے چاہئیں۔ جہاں افسانہ مکمل ہو جائے۔ اگر تکمیل افسانے کے بعد بھی افسانے کو آگے بڑھایا جائے گا تو جتنے الفاظ اور فقرے اس ضمن میں استعمال ہوں گے وہ سب بیکار اور ضائع جائیں گے۔ چونکہ افسانے کی تشکیل اور اس کے موضوع میں ایک قسم کا رابطہ ہوتا ہے اس لئے افسانے کی تکمیل کے بعد اسے مزید طوالت دینا پڑھنے والے کو خواہ مخواہ گراں گزرتا ہے۔ کیونکہ جب افسانے کو غیر ضروری طور پر طوالت دی جاتی ہے تو تاثر میں فرق آ جاتا ہے۔ اور پڑھنے کے لئے اطمینان بخش ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح انجام کو الفاظ کے بل پر دور تک کھینچ کر لے جانے سے بھی افسانے کو نقصان پہنچتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ ضرورت سے زیادہ مختصر انجام بھی خطرے سے خالی نہیں، کیونکہ وہ افسانے کی تکمیل نہیں کرتا۔ اور یوں بھی پڑھنے والا غیر مطمئن رہتا ہے۔

تاہم انجام فوری ہونے کے باوجود بھی مکمل ہو سکتا ہے۔ نقطۂ عروج اور انجام دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ افسانے کے اس مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد کوئی بات تشریح طلب باقی نہیں رہتی۔ افسانہ اپنے اوپر خود ایک کافی تبصرہ بن جاتا ہے۔ انجام ایسی صورت میں پلاٹ کی پیچیدگی کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے تاہم اکثر اوقات آخری سطر یا آخری لفظ تک بالکل نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اور پڑھنے والے کو سان گمان بھی نہیں ہوتا کہ پلاٹ کا ماحصل اس صورت میں نمودار ہونے والا ہے۔ افسانہ ترقی کے نقطۂ عروج کی طرف اُن ترکیبوں سے بڑھتا ہے جو پڑھنے والے کی نظروں سے بامقصد پوشیدہ رکھی جاتی ہیں۔ اور یہ ترکیبیں اسی وقت ظاہر ہوتی ہیں جب پڑھنے والا افسانہ ختم کر لینے کے بعد پھر پلٹ کر واقعات پر ایک مطمئن نگاہ ڈالتا ہے۔ پریم چند اسی وضع کے انجام کا ماہر ہے۔ اس کی ہر کہانی کا انجام غیر معمولی طور پر استعجاب پرور ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس قسم کے انجام تراشنے کی کوشش میں اپنے افسانوں کو غیر معقول اور غیر فطری بھی بنا دیتے ہیں۔ وہ پہلے سے تو پلاٹ میں ایسے عناصر شامل نہیں کرتے جو آخر میں حیرت انگیز انجام کا جواز بن سکیں۔ افسانے کے آخر میں دفعتاً ایک اچانک انجام پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کو تعجب تو ضرور ہوتا ہے مگر نفرت انگیز۔

نیاز کے اکثر افسانے کچھ اس ڈھنگ کے ہوتے ہیں کہ ان میں نقطۂ عروج اور افسانے کا انجام دونوں ایک دوسرے پر از روئے تشکیل منطبق نہیں ہوتے نقطۂ عروج اپنی جگہ پر دو ایک نئے حل طلب مسائل اپنے سامنے لے آتا ہے اور ان کا جواب دینا بھی ضروری ہوتا ہے، مثال کے طور پر نیاز کے افسانے "آتیاز" میں جب جعفر کی بینائی جاتی رہتی ہے تو سلیمہ کے اصرار کے باوجود جسے وہ بینائی کھونے سے قبل چاہتا تھا اس سے نکاح کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، وحدت تاثر کے لحاظ سے افسانہ یہاں ختم ہو جانا چاہیئے، کیونکہ یہی افسانے کا نقطۂ عروج ہے۔ مگر نقطۂ عروج نے ایک اور اہم سوال پیش کر دیا ہے کیا حقیقت میں ایک عاشق معشوق کے اصرار کو رد کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا کر گذرے تو پھر اس کی زندگی کیسی کٹتی ہے، اس سوال کا جواب دینے کے لئے نیاز کو نقطۂ عروج کے بعد بھی چند سطریں افسانے میں بڑھانی پڑیں۔

> صبح ہوتے ہی سلیمہ جلدی جلدی اٹھی اور جعفر کے کمرے میں آئی کہ اس کا ہاتھ منہ دھلائے۔ لیکن اس کو بدستور سوتا دیکھ کر واپس آ گئی۔ اُسے حیرت تھی کہ آج خلاف معمول وہ کیوں ابھی تک نہیں اٹھا پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد وہ پھر گئی۔ اور آہستہ آہستہ چادر ہٹا کر اس کو جگانا چاہتی تھی کہ دفعتاً اس کی نگاہ ایک شیشی پر پڑی۔ جو بستر پر الٹی پڑی تھی اور چند قطرے اس کے اندر سے بہہ کر چادر کو داغدار بنا چکے تھے اس نے شیشی اٹھا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ آنکھ میں ڈالنے کی دوا تھی۔ جو جعفر کے پلنگ ہی کے پاس میز پر رکھی تھی۔ تکیے کی طرف نگاہ گئی تو وہاں ایک پرزہ کاغذ رکھا ہوا تھا جس پر پنسل سے ٹوٹے ٹوٹے حروف میں "خدا حافظ سلیمہ" لکھا تھا اور جعفر کا جسم سرد ہو کر بالکل نیلگوں ہو گیا تھا۔

اس نوع کے انجام سے اس استفہام کو دور کیا جاتا ہے جو نقطۂ عروج سے پڑھنے والے کے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب تک یہ استفہام دور نہ ہو اس کی تشفی نہیں ہوتی۔ مندرجہ بالا افسانے میں نقطۂ عروج کے بعد صرف ایک پیراگراف بڑھایا گیا ہے۔ بعض اوقات

اس غرض کی تکمیل کے لئے کئی کئی پیراگراف کا اضافہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ یہ افسانے کی تکمیل کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ "ایثار" میں پڑھنے والا یہ جاننے کے لئے مضطرب تھا کہ سلیمہ کے اصرار کے بعد جعفر نے کیا کیا۔ جعفر کی موت اس کا جواب ہے۔ سلیمہ کے اصرار کو رد کرنے کے بعد واقعہ یہ ہے کہ جعفر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

نقطۂ عروج کی پوری قوت اس تصریح میں پوشیدہ ہے جو نقطۂ عروج کے پیش کرنے کے بعد کی گئی ہے۔ بعض اوقات نقطۂ عروج کئی کئی حل طلب مسائل پیش کر دیا کرتا ہے۔ اور جب تک ان سب کا قابلِ تشفی جواب نہ ملے افسانہ مکمل نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں نقطۂ عروج اور انجام کے درمیان کافی فصل ہوتا ہے۔

عام طور پر افسانے کے آخر میں پیچیدگی پیدا نہیں کی جاتی۔ اسے سادہ رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ انجام کی سادگی افسانے کے تاثر اور اس کی غایت کو واضح کرنے میں نمایاں مدد دیتی ہے۔ "ایثار" میں نیاز نے انجام کو اسی لئے پیچیدگی سے بچایا ہے۔ تاکہ ہیرو اور ہیروئن دونوں کے ایثار کی کیفیت خوب اچھی طرح پڑھنے والے پر روشن ہو جائے۔ ہیرو کا ایثار آپ اوپر دیکھ ہی چکے ہیں کہ اس نے مرجانا قبول کیا مگر یہ گوارا نہ کر سکا کہ جان بوجھ کر اس کی زندگی کو تباہ کر دے۔ خود اس کے الفاظ ہیں "کیا شادی ہو جانے سے میرے دل سے اس سوگواری کا خیال کسی طرح نکل سکتا ہے؟ جو ایک نابینا کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے خیال سے قدرتاً جلد یا بدیر تم (سلیمہ) میں پیدا ہو جانا چاہیے"۔ اب ہیرو کے ایثار کی داستان سننے کے بعد ہیروئن (سلیمہ) کے ایثار کو بھی ملاحظہ کیجئے، احمد نے دوسری شادی کر لینے کے بعد سلیمہ کو "آزاد" کر دیا ہے۔ سلیمہ کو دوبارہ کالج میں داخل ہوئے دو سال کا زمانہ گذر گیا ہے۔ بی۔ اے کے امتحان کا زمانہ قریب ہے اور وہ (سلیمہ) پوری کوشش کے ساتھ مطالعہ میں مصروف ہے۔ دفعتاً اسے جعفر کا خط ملتا ہے جو اس نے اپنی بینائی ضائع ہو جانے کے بعد لکھا ہے۔ سلیمہ یا تو جعفر کو بذریعہ خط یہ جواب دے چکی تھی کہ "آپ کی وہ تمام آرزوئیں جو مجھے نہایت عزیز ہیں جنہیں افسوس ہے کہ میں پوری نہیں کر سکتی"۔ مگر یہ خط پاتے ہی وہ فوراً جعفر کے پاس بنارس آجاتی ہے۔ جعفر شدید تپ میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر نے ممانعت کر دی تھی کہ کسی قسم کا دماغی ہیجان پیدا نہ کیا جائے ورنہ سرسام ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے جعفر سلیمہ کی آمد سے بالکل بے خبر رہا۔ تیسرے دن جب تپ میں کچھ کمی ہوئی ہے تو مایوسی کے ساتھ جعفر اپنے آپ سے کہتا ہے۔ "آہ کون مصیبت میں ساتھ دیتا ہے؟" سلیمہ بے قابو ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ "آپ کیوں گھبراتے ہیں میں آگئی ہوں"۔ جعفر گھبرا جاتا ہے۔ مگر سلیمہ کی گفتگو ملاحظہ ہو: "میں تمہاری مجرم ہوں اور ایک مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوئی ہوں تاکہ جو سزا میرے لئے تجویز کی جائے اس کو خوشی سے برداشت کر لوں"۔ اور جب جعفر اس بات کا یقین نہیں کرتا تو سلیمہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے اور بار بار اصرار کر کے جعفر کو نکاح پر رضامند کر ہی لیتی ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتی ہے کہ ایک نابینا سے شادی کر کے وہ اپنی زندگی کو کس مصیبت کی نذر کر رہی ہے۔

افسانہ ختم کرنے کا ایک اور ڈھنگ بھی ہے۔ انجام اس صورت میں نہ تو نقطۂ عروج ہوتا ہے اور نہ اس کا ماحصل۔ اس انجام کے سلسلے میں حل طلب مسائل کا کوئی حل بھی پیش نہیں کیا جاتا۔ بلکہ انجام واحد تاثر کو زیادہ سے زیادہ شدت کا حامل بنا دیتا ہے۔ اس قسم کا انجام تراشنے میں افراط و تفریط یا مبالغہ کا امکان بہت قوی ہوتا ہے۔ بعض افسانہ نگار غیر ضروری فقرے بھر دیتے ہیں۔ یا ضروری فقروں کو ضرورت سے زیادہ طویل کر دیتے ہیں۔ تاہم اس قسم کے انجام سے تاثر کو گہرا اور افسانے کو مکمل کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔

مکمل افسانے میں آغاز اور انجام میں ایک قسم کی یگانگی ہوا کرتی ہے۔ اکثر اولین اور آخری فقروں تک میں ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس یگانگی اور ہم آہنگی سے افسانے کے تاثر کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔ تشکیل کے اور کسی ڈھنگ سے یہ کام اس قدر کامیابی کے ساتھ نہیں ہوتا جتنی کامیابی کے ساتھ آغاز و انجام کی ہم آہنگی سے۔ مگر اس ہم آہنگی میں بناوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہونا چاہیے۔ کامیاب افسانہ نگار تو کچھ ایسی ترکیب سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں کہ بادی النظر میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آغاز و انجام میں یگانگی اور یکسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ فضا۔ کیفیات۔ کردار۔ اشارات وغیرہ سب سے ایک قسم کی ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر مجیب نے اپنے

افسانے "خاں صاحب" دیکھیا گر رہیں خاں صاحب کے نفرت انگیز کردار کی بنیادی خصوصیت کے بیان سے افسانے کے انجام و آغاز کو ہم آہنگ بنایا ہے۔ آغاز میں ہے۔

> خاں صاحب کے پیشہ کا کسی کو علم نہ تھا ان کمبختوں کے سوا جنہیں کسی ناگہانی مصیبت میں روپے کی ضرورت ہوگی اور انہوں نے خانصاحب سے مدد مانگی۔

انجام یہ ہے کہ خانصاحب بیوی کی مخالفت کے باوجود اپنی بیٹی کی شادی پانسو روپے نقد اور دس ہزار کے مہر پر کرتے ہیں۔ گویا روپے کے لالچ میں اس غریب کو فروخت کر ڈالتے ہیں۔

"ایک روز شام کو جب ان کی بیوی گھر میں مصروف تھیں تو وہ میری خالہ کے یہاں پہنچے۔ سکینہ (بیٹی) کو رات بھر کے لئے گھر لے جانے کی اجازت چاہی اور اسے یکے پر بٹھا کر لے گئے۔"

"رات کو وہ اکیلے گھر پہنچے تو کھانے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ بیوی نے انھیں دیکھتے ہی جلدی جلدی کھانا نکالنا شروع کیا مگر کھانے کی خاطر بیٹھنے کے عوض وہ دیا اندر لے گئے۔ اور گرہ سے نوٹ نکال کر گننے لگے۔ جب گن چکے تو بیوی سے کہا: "دیکھو تو کہہ رہی تھی کہ سکینہ کی شادی سے ہم کو کیا مل سکتا ہے۔ پانسو روپے نقد اور دس ہزار کا مہر لکھوا لایا ہوں۔ اور کسی کی کیا مجال ہے۔ کہ کچھ کہے۔ اپنے سامنے نکاح کرایا۔ اور چار گواہوں کے دستخط ہیں۔"

> بیوی کے ہاتھ سے کفگیر گر پڑا۔ ان کا سر چکرانے لگا اور وہ وہیں پتیلیوں کے بیچ میں لیٹ گئیں۔ خانصاحب نے نہایت اطمینان سے کھانا نکالا کھایا اور حسب معمول ٹانگیں پھیلا کر چت لیٹ گئے۔ اور حمد و نعت کی نظمیں پڑھنے لگے۔

اسی طرح پروفیسر مجیب کے ایک دوسرے افسانے "باغی" میں کشن پرشاد اسٹیشن ماسٹر اور ٹکٹ بابو کے کردار کے جو نقوش افسانے کے آغاز میں پیش کئے گئے ہیں، انجام کو انھیں سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ کشن پرشاد کے متعلق افسانے کے آغاز میں بتایا ہے کہ وہ:-

> "اپنی تنہائی کی زندگی پر قانع بلکہ اس میں مگن تھے۔ اور جو کوئی ان کے پرسکون چہرے اور خاموشی بھری آنکھوں پر نظر ڈالتا تھا اسے اس بات پر حیرت بھی نہ ہوتی تھی۔"

برخلاف ان کے

> "بابو ٹکٹ بابو اور ہی طرز کا آدمی تھا۔ وہ بہت کمزور قلب کا اختلاجی آدمی تھا۔ اسے ہر وقت جلدی رہا کرتی تھی اور کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ بڑے بابو سے بات کہہ کر ان کے جواب کے انتظار میں اور ان کے سکون و اطمینان سے عاجز آکر جلدی جلدی ان کے گرد پھرتا تھا اور اس وقت تک اپنے سوال کو دہرائے جاتا تھا جب تک کہ جواب نہ مل جائے۔"

اب انجام سنیئے۔ ایک کسان بلا ٹکٹ ریل سے اترتا ہے اور اسٹیشن ماسٹر اور ٹکٹ بابو کو لاٹھی کا ڈراوا دے کر بہت کچھ صلواتیں سناتا ہے اور اپنے گھر کو ہولیتا ہے۔ ٹکٹ بابو کا مارے خوف کے دم خشک ہونے لگتا ہے اس کے نزدیک یہ:-

> "بڑا غضب ہوا۔ اب وہ جا کر دوسرے کسانوں سے کہے گا اور سب لاٹھی باندھ کر آئیں گے۔ اور ہمیں مار ڈالیں گے۔ میرے خیال میں ہمیں پولیس کو فوراً اطلاع کرنا چاہیئے۔"

برخلاف اس کے اسٹیشن ماسٹر پر اس واقعے کا ذرا بھی اثر نہیں ہے جب اس کے پکارنے پر بابو اس کے پاس پہنچتا ہے تو اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے۔

> "ہاں میں نے پکارا تھا۔ آؤ دیکھو کیسی پیاری رات ہے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دم بھر میں چاند کہیں سے نکل آئے گا۔"

مگر ٹکٹ بابو کو لاٹھی بند کسان کا خوف ہی مارے ڈالتا ہے، وہ اسٹیشن ماسٹر سے کہتا ہے۔

> "ہاں تو بتایئے آپ کسان کے معاملے میں کیا کریں گے بہت سخت کارروائی کی ضرورت ہے۔"

لیکن اسٹیشن ماسٹر ٹال دیتا ہے۔ ٹکٹ بابو جب زیادہ اصرار کرتا

ہے تو اسے یقین دلاتا ہے کہ تمھیں ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اس پر بھی جب ٹکٹ بابو نہیں مانتا اور مصر ہوتا ہے کہ :-

آپ کو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ ورنہ کسانوں کی نظر میں ہماری بڑی بے رعبی ہوگی۔ اور خدا جانے کیا ہوگا"

تو اسٹیشن ماسٹر جواب دیتا ہے۔

"میں اس وقت جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم کو گھر پہنچا دوں۔ اب کوئی کام نہیں۔ اس لئے اب تمہیں آرام کرنا چاہیئے"

پریم چند کے افسانہ "پچھتاوا" میں مصنف نے مرتے ہوئے ٹھاکر کی زبان سے پنڈت درگا ناتھ کے متعلق جو فقرے کہلوائے ہیں وہی فقرے آغاز افسانہ میں ان کے کردار کے متعلق کہے گئے ہیں۔

بعض افسانوں میں آغاز و انجام کو اس خوبی سے ایک دوسرے کے مطابق تراشا جاتا ہے، کہ درمیانی کہانی اشارات میں بہت کچھ ظاہر ہو جاتی ہے۔ نیاز کے افسانے "شاعر کی محبت" (جمالستان) میں آغاز افسانے میں قاہرہ کے ملک التجار ابراہیم کی اکلوتی بیٹی نصر الدوبارہ کی بالائی منزل کے برآمدے میں اس طرح ہمارے سامنے لائی گئی ہے۔

"اس کی ہر ادا غیر مطمئن ہے اور اس کی ہر نگاہ بے تاب وہ ہر منٹ کے بعد مضطربانہ کبھی سڑک کی طرف دیکھتی ہے اور کبھی دروازے کی جانب۔ اسے انتظار تھا اور اسی انتظار میں اس نے اب تک قہوہ وغیرہ طلب نہیں کیا تھا لیکن کس کا؟

آخر کار جب اس کا انتظار مایوسی میں بدلنے والا ہوتا ہے، حجرے کا دروازہ کھلتا ہے اور جاوید داخل ہوتا ہے۔ جس کے حسن کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا سوگوار تبسم ہے۔ خالدہ اس سے کہتی ہے کہ کاش آپ بھی سکرات انتظار سے واقف ہوتے۔ تو وہ اپنی بےحسی کے ساتھ صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ معاف کیجئے۔ خالدہ کو جاوید سے جو شغف ہے اور جاوید اس کی طرف سے جو بےحسی ظاہر کر رہا ہے۔ اس آغاز سے افسانے کے پلاٹ کی طرف صاف صاف اشارہ ہو رہا ہے کہ ان دونوں کے میلانات کا بڑا سخت تصادم ہوگا۔ چنانچہ انجام یہ ہے کہ جب جاوید کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ خالدہ نے اسے ممی ملکہ بن کر دھوکہ دیا ہے تو وہ خود کشی کر لیتا ہے۔ اور خالدہ شادی کے پیغاموں کو رد کرتی رہتی ہے۔ اور جاوید کی اس ننھی سی یادگار کو ہر وقت اپنے آغوش میں لئے اس کی پرستش کرتی ہے۔ جسے وہ جاوید صغیر کہہ کر پکارتی ہے۔

افسانے میں آغاز و انجام کی طوالت کے متعلق کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے اور نہ حدود مقرر کی جا سکتی ہیں، یہ ممکن ہے کہ افسانے کا آغاز صرف ایک فقرہ ہو یا ایک پیراگراف یا چند پیراگراف ہوں۔ یا وہ کئی صفحات پر پھیل جائے۔ بعض اوقات افسانے کا آغاز ایسے غیر محسوس طریق پر افسانے کے واقعات میں حل ہو جاتا ہے۔ کہ پڑھنے والا اس کی حدود متعین ہی نہیں کر سکتا۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب پڑھنے والا پورے طور پر افسانے سے دلچسپی لینے لگے (دوسرے لفظوں میں) جب وہ محسوس کرنے لگے کہ واقعات پیچیدہ ہونے لگے ہیں اسی وقت افسانہ شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ پڑھنے والا اس فضائے بعید یا پس منظر کو پوری دلچسپی سے پڑھ رہا ہو جو مصنف کاغذ پر منعکس کر رہا ہے مگر وہ جانتا ہے کہ افسانہ ابھی شروع نہیں ہوا۔ کپلنگ کے اس افسانے میں جسے نیاز نے "رادھا" کے نام سے اردو میں منتقل کیا ہے افسانے کا ایک چوتھائی حصہ پس منظر رادھا کے سرسری تعارف اور گذشتہ واقعات کا خاکہ پیش کرنے میں صرف کر دیا گیا ہے۔ یہ اپنی جگہ بے انتہا دلچسپ ہے۔ مگر اس تمام وقت میں جب پڑھنے والا۔ دیہات کی صبح کے منظر۔ گاؤں کے کنوئیں کی سی چہل پہل وغیرہ سے محظوظ ہو رہا ہے اسے اس امر کا احساس ہے کہ افسانہ ابھی تک شروع نہیں ہوا ہے۔ اور اسی وقت شروع ہوتا ہے جب بیوہ رادھا جینے سے تنگ آ کر کنوئیں میں چھلانگ مارنی چاہتی ہے اور ایک اجنبی آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

اب پڑھنے والے کو پیچیدگی کے امکانات نظر آنے لگتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ جس وضع کی کشمکش مصنف آگے چل کر پیش کرنے والا ہے ضروری نہیں کہ مصنف اس سے قبل ہی سے کماحقہٗ واقف ہو گر پیچیدگی کے امکانات سامنے آتے ہیں تو یہ بھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب عنقریب ہی ہیرو اور ہیروئن کے اس ملاپ کے راستے میں کوئی روک آئے گی۔ اور پھر سچ مچ وہ روک نمودار ہو جاتی ہے اور پلاٹ

کی پیچیدگی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ تو پڑھنے والا دلچسپی کے ساتھ افسانے کے مطالعے میں منہمک ہو جاتا ہے۔

ہر چند اس لحاظ سے بعض آغاز طویل ہوتے ہیں اور بعض مختصر اور سارے آغاز ہی ایک سے نہیں کہے جا سکتے تاہم بلحاظ کارگزاری وہ ایک دوسرے سے بہت مماثل و مشابہ ہوتے ہیں۔ ہر صحیح آغاز افسانے میں افسانے کا جذباتی لب و لہجہ متعین کیا جاتا ہے اور نمایاں کرداروں کو متعارف کرایا جاتا ہے۔ شروع میں جذباتی لب و لہجہ متعین کر دینے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وحدت تاثر کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ایک دفعہ افسانے کا لب و لہجہ متعین کر لینے کے بعد اگر کوئی ایسا عنصر افسانے میں شامل ہو جو افسانے کے لب و لہجہ سے ہم آہنگ نہ ہوتا ہو تو اس کے وجود کی ناموزونیت فوراً محسوس ہو جائے گی اور اسے افسانے سے خارج کر کے سطح ہموار کر دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ابتدا میں لب و لہجہ متعین کر دینے سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن کو فوراً ایک نیا راستہ مل جاتا ہے، اور اس کے ذہن کے لئے زاویئے قائم ہو جاتے ہیں اور انھیں زاویوں سے وہ افسانے کے واقعات دیکھتا ہے۔

لب و لہجہ تو اس طرح متعین ہو سکتا ہے کہ افسانے کی غایت کے کسی پہلو کو خاصہ ابھار دیا جائے۔ پھر پس منظر سے لب و لہجہ کا تعین ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں آغاز کا اثر ذہن پر تیز فوری اور شدید ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں آغاز طوالت آمیز ہو جاتا ہے۔

چنانچہ جیسا کسی افسانے کا لب و لہجہ ہوگا اسی اعتبار سے آغاز طویل یا مختصر ہوگا۔ سبھی قسم کے لب و لہجہ کو ایک ڈھنگ پر ظاہر نہیں کیا جا سکتا بعض افسانوں کا لب و لہجہ ایسا ہوتا ہے کہ ضرورتاً پہلی صورت اختیار کرنی پڑتی ہے اور بعض کے لئے صرف دوسری صورت موزوں ہوتی ہے۔

اب آغاز کی دوسری کارگذاری کو لیجئے۔ ہماری مراد نمایاں کرداروں کے تعارف سے ہے۔ اس سے پہلے کہ پڑھنے والا پلاٹ کی پیچیدگی کا احساس کرے کردار ضرور سامنے آجاتے ہیں اور ان میں سے بھی مرکزی کرداروں کو سب سے زیادہ سامنے لایا جاتا ہے، چونکہ حدود کے اعتبار سے افسانہ بہت ہی محدود ہوتا ہے اور چونکہ ابتدائی کردار اسی حد تک سامنے آنے دیئے جاتے ہیں جس حد تک کہ وہ مرکزی کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں یا جس حد تک پلاٹ کی ساخت اور ترقی پر ان کا اثر پڑتا ہو اس لئے اس ترکیب کی صحت میں یقیناً کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ سب سے پہلے مرکزی کردار ہی کا خاکہ پیش ہو جانا چاہئے، اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے انھیں پڑھنے والے کے ذہن پر ابتدا ہی میں اپنا اثر قائم کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ابتدا ہی میں کرداروں کے متعلق ایک مکمل بیان قلم بند کر دیا جائے یا چھوٹتے ہی انھیں عمل افسانہ میں ژولیدہ دکھایا جائے۔ بس اس حد تک ان کا تعارف کافی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو ایک بات کا علم ہو جائے۔ اس اعتبار سے آغاز افسانہ کی تراش کے لئے بڑے سلیقے کی ضرورت ہے۔ آغاز دلچسپ اور پرکشش ہونے کے لئے "نمایاں" ہونا چاہیئے۔

کرداری افسانوں میں معمولاً کردار آغاز میں پوری قوت کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ عملی افسانوں میں ابتدا ہی سے عمل کی ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ فضائی افسانوں میں آغاز میں فضا پر زیادہ زور صرف کر دیا جاتا ہے۔ تاہم اس قسم کے آغازوں سے صرف افسانے کا ٹائپ ہی ظاہر نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے بھی کہ آغاز کردار، عمل اور فضا کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے۔

آغاز عمل بہت جلد توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ آغاز کے صرف ایک ہی فقرے سے افسانے کا لب و لہجہ متعین ہو جاتا ہے۔ اور افسانہ نگار کرداروں کو ہم سے متعارف کرانے لگتا ہے۔ عمل کئی طریق سے دکھایا جاتا ہے۔ کہیں تو آغاز افسانہ میں مستقبل کے متعلق تجاویز بیان کی جاتی ہیں۔ کہیں گذشتہ واقعات کا ریکارڈ سامنے لایا جاتا ہے۔ کہیں عمل کو اسی وقت ہنگامہ پذیر دکھا دیا جاتا ہے ہر چند آغاز عمل میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کے ذریعے سے جلد از جلد بعض ابتدائی امور اور مراحل کو طے کر لیا جا سکتا ہے تاہم یہ ملحوظ رہے کہ آغاز عمل بہترین قسم کا آغاز نہیں ہوتا۔

آغاز عمل کے مقابلے میں کردار یا فضا پیش کرنے میں زیادہ طویل آغاز ہوتا ہے۔ ضرورتاً یہ آغاز حدود کے اعتبار سے بھی ذرا کم ہی تعیینی حیثیت رکھتا ہے۔ اور فوری دلچسپی پیدا کر دینے کا باعث بھی نہیں

ہوگا۔ چونکہ کردار پیچیدگی کے لئے ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے آغاز کردار سے ہر قسم کا افسانہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بات فراموش نہ ہونی چاہیئے کہ کردار کو بے انتہا دلچسپ بنانے یا بے انتہا غیر دلچسپ شکل دے دینے کی ذمہ داری اس طریق پر ہے جس سے اس کی بے نقابی میں کام لیا جاتا ہے۔ عمل کے ساتھ ممزوج ہو کر کردار بہت زیادہ قریب فطرت ہو جاتا ہے۔ اور اسی نسبت سے بطور آغاز افسانہ زیادہ دلچسپ بھی بن جاتا ہے۔

آغاز فضا یا تو فضائی افسانوں میں دیکھا جاتا ہے۔ یا ان افسانوں میں جن میں فضا یا پس منظر کو بحیثیت اثر کوئی اہمیت حاصل ہوتی ہے چونکہ آغاز فضا سے افسانے کے جذباتی لب و لہجہ پر بھی قابل لحاظ اثر پڑتا ہے اس لئے ہر قسم کے افسانے میں آغاز فضا سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اگر افسانے کی ابتدا میں غمناک فضا دکھائی جاتی ہے تو پڑھنے والے پر اندوہ و غم طاری ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے برخلاف مسرت آگیں اور تابندہ فضا کا نقشہ کھینچا جائے تو اس کے قلب میں مسرت و سرور کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ اگر آغاز افسانے میں فضا مبہم اور خواب آلود ہو تو اس کا ذہن خوابیدہ سا ہو جاتا ہے۔ بعض افسانہ نگار فضا میں ان سب اثرات کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔ جو اکثر و بیشتر غلط ہوتا ہے۔

بعض افسانے اس طرح شروع ہوتے ہیں کہ ابتدائی فقرات میں افسانے کی غایت یا غرض کا کچھ نہ کچھ پیش کر دیا جاتا ہے اور انجام کی طرف ایک بلیغ اشارہ بھی ہوتا ہے۔ اس وضع کا آغاز اصل میں افسانے کے حقیقی آغاز کا ہراول ہوتا ہے۔ پڑھنے والا اس قسم کے آغاز میں کوئی پیچیدگی یا پیچیدگی کا امکان محسوس نہیں کرتا۔ وہ اس امر کا انتظار کرتا رہتا ہے کہ جو کچھ افسانے کی غایت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اب واقعات کو اس کے سانچے میں ڈھال کر دکھایا جائے گا۔ اس نوع کے آغاز سے افسانے کی قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں جان نہیں ہوتی البتہ اس سے افسانے کا لب و لہجہ ضرور متعین ہو جاتا ہے، ہر چند بیشتر افسانوں میں اس ڈھنگ کا آغاز افسانے کی اہمیت میں اضافہ کرنے کا باعث نہیں ہوتا تاہم بعض افسانے ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جن میں ابتدائی فقروں میں افسانے کی غایت ایسے سلیقے سے عکس ریز کی گئی ہے کہ بے

اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مظہر انصاری کا افسانہ "چنگاری" ایک ایسی عورت کا عبرتناک کردار پیش کرتا ہے جو ہر چند گھر گھر ہستی ہے مگر اس بام کی پری معلوم ہوتی ہے، جہاں نسائی حیا عیاش نگاہوں کے سول لٹتی ہے۔ وہ اتنی کٹر اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے اتنی بے مہین ہے کہ گھر کے امن و سکون کو غارت کر دیتی ہے۔ کہانی کی اس غایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب افسانے کے ابتدائی فقرے پڑھیے۔

> "سخت اور مضبوط، یہ آہن کی خصوصیات ہیں۔ بعض انسان بھی دل کے گداز سے محروم اور لوہے کی طرح سخت ہوتے ہیں۔ بھٹی سے نکلے ہوئے لرزاں و تپاں شعلوں کی روشنی میں کھیلتے ہیں"
>
> "شمیم بے گناہ تھا مگر کیا ان ہاتھوں کو اچھا کہا جا سکتا ہے جو اس کے خون سے لال ہوئے۔ میرا خیال ہے نہیں۔ پھر ان ہاتھوں کے بعد اس عورت کا نمبر ہے بار گناہ اس کے سر رہے گا۔ کیسے کہوں؟ میں تو بھٹی ہوں بات آخر کو وہیں آجائے گی۔ گداز قلب سے محرومی۔ لوہے کی سختی۔ دنیا کی بھٹی سے نکلتے ہوئے شعلے۔ زندگیوں کے ناٹک!"

کہانی کی غایت کی کس قدر صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔

افسانے کا آغاز طویل ہو یا مختصر، مگر دلچسپ ضرور ہونا چاہیئے پڑھنے والے کو آغاز کے فقرے پڑھنے کے بعد جستجو لگ جانی چاہیئے کہ آگے کیا ہوگا۔ آغاز میں کردار، عمل، فضا وغیرہ کے متعلق ایسے دلچسپ اشارات ہونے چاہئیں کہ مزید حالات جاننے کی خواہش بیدار ہو جائے اور پڑھنے والا پوری دلچسپی کے ساتھ افسانہ پڑھنا شروع کر دے۔ بعض افسانے اس اعتبار سے اس قدر کامیاب ہوتے ہیں کہ اولین فقرے ہی سے افسانے کے واقعات کا چکر چل پڑتا ہے اور پڑھنے والے کی توجہ کو اپنے ساتھ وابستہ کر لیتا ہے۔ "چنگاری" کے اس اولین فقرے کو دیکھئے جو اوپر درج کیا گیا ہے۔ دل کی سختی کے اعتبار سے "بعض انسانوں کو" لوہے سے تشبیہ دینا اس قدر عجیب اور نادر اشارہ ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن

فوراً افسانے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، پہلا فقرہ پڑھنے کے بعد پڑھنے والے کے ذہن میں یہ احساس نمودار ہو جاتا ہے کہ افسانے میں کسی ایسے مرد یا کسی عورت یا بہت سے مردوں یا بہت سی عورتوں کا ذکر ہوگا جن کے دل لوہے کی طرح سخت تھے۔ افسانہ نگار اس دلچسپی میں مزید اکساہٹ پیدا کرنے کے لئے ان کی زندگیوں کو ناٹک کہہ کر یہ بھی بتا دیتا ہے کہ یہ لوگ آگ اور خون کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اس مرحلے پر پڑھنے والے کی دلچسپی افسانے سے وابستہ ہو چکی ہے۔ مگر پوری طرح وابستہ نہیں ہے۔ اس نے مصنف ایک اور وجہ کشش پیدا کرتا ہے۔ وہ "شمیم" اس کے قاتل اور اس "عورت" کا بھی اڑتا ہوا سا تذکرہ کر دیتا ہے اب پڑھنے والا ختم کئے بغیر افسانے کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ وہ یہ امور جاننے کے لئے بے چین ہے کہ شمیم کو کس نے اور کیوں قتل کیا۔ اور اس "عورت" کا شمیم کے قتل سے ایسا کیا تعلق تھا کہ "بار گناہ" تک اس کے سر پر رکھا جا سکتا ہے۔ یقیناً عورت کا پارٹ کوئی اہم پارٹ ہے، پڑھنا چاہیئے کہ اس نے ایسی کیا "شعلہ باری" اور خوں ریز حرکت کی۔ ابھی چند سطریں اوپر وہ افسانے کا نام بھی پڑھ چکا ہے "چنگاری"۔ یقیناً یہ عورت ہی چنگاری ہے جس نے شمیم کا خرمن حیات جلا دیا۔ مگر کس طرح جلایا یہ معلوم کرنے کے ارادے سے پڑھنے والا افسانے کے مطالعے میں ڈوب جاتا ہے۔

آغاز افسانہ کو دلچسپ اور جاذب توجہ بنانے کے کئی ڈھنگ اور بھی ہیں۔ جن میں سے سادہ ترین ڈھنگ تو وہی ہے جو "چنگاری" کے آغاز کے دوسرے پارے میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی پڑھنے والے کے سامنے افسانے کے واقعات پر ایک یا دو سوالات پیش کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک اور ڈھنگ یہ ہے کہ پہلے فقرے کو ناتمام چھوڑ دیا جاتا ہے اس میں وہ سب کچھ عمداً نہیں بتایا جاتا جس سے پڑھنے والا واقف ہو جانے کی توقع رکھتا ہے۔ بعض اوقات اس ڈھنگ کے آغاز میں (استفہامیہ طور پر نہ سہی) چند سوالات ابھار دیئے جاتے ہیں۔ اور افسانہ نگار بغیر ان سوالات کا جواب دیئے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس خیال سے کہ آگے ان سوالات کا جواب ملے گا۔ پڑھنے والا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک ڈھنگ یہ بھی ہے کہ ابتدائی فقرے یا فقروں میں کوئی سوال پیش نہیں کیا جاتا۔ بلکہ آغاز بذات خود بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ گویا ایک شخص آرام کرسی پر نیم دراز کسی کی دلچسپ گفتگو سن رہا ہے، نیاز کے ایک افسانے "دنیا کا اولین ہدایت" کا آغاز ملاحظہ ہو۔

> زرقا کی خاموش زندگی جس کی ابتدا خود اسے بھی معلوم نہ تھی اور جو جابلقا کے سنگستان میں اس طرح گذر رہی تھی جیسے صرف ایک سایۂ متحرک یا ایک غیر محسوس آواز بازگشت۔ اب اپنے اندر کوئی انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھی۔ خواہ وہ انقلاب سمندر کی اسی پرشور موج سے کیوں نہ حاصل ہو جو روز اس کے ساحل اور اس کے غار کے سپید سپید پتھروں سے مل کر کسب عریانی کیا کرتی تھی۔
>
> زرقا طلوع وغروب کے ارغوانی مناظر میں ایک خونی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ اور چاند اسے ایسا نظر آتا تھا جیسے کوئی عریاں لاش۔ جنگل کی چڑیاں جو اس کے چاروں طرف جھاڑیوں اور درختوں پر چہچہایا کرتی تھیں، اس کے دماغ کے لئے کوئی نغمہ فراہم نہ کر سکتی تھیں کیونکہ اب وہ شیریں سے شیریں آواز میں اپنے لئے ایک طعن محسوس کرتا تھا اور الجھنے لگتا تھا۔ سمندر کی خوشگوار ولطیف ہوا۔ جو ہر وقت موجوں کی چادر کو تہ کر کے کھول دینے کا دلچسپ منظر پیش کیا کرتی تھی زرقا کے لئے گویا چین پیشانی تھی۔

یا ایک ڈھنگ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آغاز سے پڑھنے والے کے دل میں ایک قسم کی نامعلوم اور غیر معروف آرزو کروٹیں لینے لگے جیسے بہار کی ایک شام یا ایک چمن کو دیکھ کر ایک شخص کے دل پر ایک قسم کی ہلکی ہلکی مسرت چھا جاتی ہے۔ ایسی صورتوں میں آغاز افسانہ پڑھنے والے کے ذہن کو عام سطح زندگی سے بلند لے جاتا ہے اور وہ خود کو ایک ستھری اور ملکوتی فضا میں سیر کناں پاتا ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند کے افسانے "دھوکا" کا آغاز ملاحظہ ہو۔

> ستی کنڈ میں کھلے ہوئے کنول بسنت کے دھیمے دھیمے

جھونکوں سے لہرا رہے تھے، صبح کی سکون بخش سنہری کرنیں اُن سے گلے مل مل کر مسکراتی تھیں، جن کے پھول فضا کے سنہرے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، راجکاری پربھا کنڈ کے کنارے ہری ہری گھاس پر کھڑی خوشنوا چڑیوں کے نغمے سن رہی تھی اُس کا رنگ انھیں پھولوں کی طرح دمک رہا تھا، صباحت کی ایک تصویر تھی جو آفتاب کی زریں شعاعوں سے بنائی گئی تھی۔"

فضا کی تصویر اختصار کے ساتھ اس دلآویز طریقے پر پیش کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں ایک ایسی آرزو کروٹیں لینے لگتی ہے کہ کاش ایسی پاکیزہ فضا میں وہ سانس لے سکتا۔

بعض افسانوں کے آغاز اس قدر تابناک اور پرمسرت یا اس قدر غم انگیز ہوتے ہیں کہ ذہن پر مسرت یا غم ہی طاری ہو جاتے ہیں، بعض اوقات اولین فقرہ صرف ایک واقعہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر جس واقعے کا اظہار اس میں کیا جاتا ہے وہ اس قدر غیر معمولی اور اہم ہوتا ہے کہ نرا اظہار واقعہ ہی پُر اثر ہو جاتا ہے، اسی طرح بعض دفعہ پہلے فقرے میں کسی ایسی شے کی جس سے پڑھنے والا واقف ہو غیر متوقع طور پر اس قدر صحیح صحیح تصویر کھینچ دی جاتی ہے کہ نہ صرف پڑھنے والے کے منہ سے داد نکلتی ہے بلکہ وہ اس بات کی جستجو بھی کرتا ہے کہ آخر افسانے کے آغاز ہی میں ایک چیز کی جس سے لوگ باگ عام طور پر شناسا ہیں۔ اس قدر واضح تصویر کیوں پیش کی گئی ہے، یقیناً افسانہ نگار اِس شے سے آئندہ واقعات کی پیچیدگی میں بھی کوئی کام لینا چاہتا ہے۔

یہ تمام مختلف صورتیں ہیں جن سے آغاز کو دلچسپ بنایا جاتا ہے،

اولین فقرہ ہی اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اُس کے بعد تھوڑی دور تک جتنے فقرے چسپاں کئے جاتے ہیں اُن میں سے ہر فقرہ اس جاذبیت کو قائم رکھتا ہے۔ یہاں تک حالات و واقعات کی پیچیدگی شروع ہونے کا مرحلہ آجاتا ہے اور قاری واقعات کے مدوجزر سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

منشی پریم چند عموماً آغاز افسانہ ہی سے کردار کے سرسری تعارف کے بعد واقعات اور حالات بیان کرنے شروع کر دیتے ہیں، ان حالات میں افسانے کی بنیادی پیچیدگی تو نہیں ہوتی مگر واقعات اس کی کڑیاں ضرور بن جاتے ہیں" ایمان کا فلسفہ" میں پنڈت بھرگو دت کے مختار عام منشی ست نرائن کے کردار پر سرسری تبصرہ اور اُن کی تبصرہ اور ان کی کارگزاری کا ذکر ساتھ ساتھ چلتا ہے اور یہ دونوں چیزیں آئندہ واقعات سے پیدا شدہ پیچیدگی کی کڑیاں ہیں کیونکہ جب پنڈت جی کی موت کے بعد آٹھ سال تک ایمانداری کے ساتھ کاروبار چلانے کے بعد دفعتہً منشی جی بیس ہزار کے ایک گاؤں کے معاملے میں پنڈت جی کی بیوہ سے کپٹ برتنے پر اُتر آتے ہیں تو پڑھنے والا فوراً سوچتا ہے کہ یہ آدمی اب ویسا نہیں رہا۔ جیسا آغازِ افسانہ میں بیان کیا گیا ہے۔ "بازیافت" کا آغاز ہیروئن کے تعارف سے ہوتا ہے :-

"جب میں سسرال آئی تو بالکل غیر مہذب تھی۔ مجھے نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا نہ بات چیت کرنے کی تمیز، میں آنکھیں ملا کر کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی، وہ خود بخود جھک جاتی تھیں۔ مجھے کسی کے سامنے گاتے ہوئے شرم آتی تھی، میں کچھ تھوڑی سی ہندی پڑھی ہوئی تھی، لیکن مجھے ناولوں کے پڑھنے میں لطف نہ آتا تھا، مجھے فرصت ملتی تو رامائن پڑھتی، میں سارے دن گھر کا نہ کوئی کام کرتی تھی، اپنی بوڑھی ساس سے تھر تھر کانپتی، لیکن میری یہ دہقانیت میری بے تمیزی اور بھولا پن میرے بابو جی (شوہر) کو پسند نہ آتی تھی۔"

ہر چند ابتدا میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار ہیروئن کو متعارف کرا رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ جو کشمکش آگے چل کر عجیب و غریب واقعات کا روپ دھارن کرنے والی ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک مصنف نے یہ کہہ کر دکھا دی کہ میری (یعنی ہیروئن کی) یہ باتیں میرے شوہر کو پسند نہ تھیں، پلاٹ کی پیچیدگی یہاں سے صاف نظر آرہی ہے کہ مہذب یا تہذیب پرست شوہر اسے ضرور اپنے راستے پر لانا چاہے گا اور اس میں یقیناً ایک قسم کی کشمکش ہوگی، افسانہ کی بنیادی پیچیدگی یا اس کی غائت کا پڑھنے والے کو کوئی علم نہیں ہے، مگر پیچیدگی کے امکانات اسے شروع ہی سے نظر آنے لگتے ہیں۔

"زنجیر ہوس" میں پریم چند نے افسانے کا آغاز اس طرح کیا ہے کہ جری اور جواں بخت قاسم ملتان کی مہم سر کر کے فرمانروائے ملتان کی بیگمات اور شہزادیوں کے لحافے اور رکھوال لئے چلا آرہا ہے :-

"قاسم لشکر کے عقب میں تھا گھوڑا ایڑ پا کر آگے بڑھا۔

قیدیوں کا غول پیچھے چھوٹ گیا، زخمی سپاہیوں کی ڈولیاں پیچھے چھوٹیں، سواروں کا دستہ پیچھے رہا، سواروں کے کے آگے فرمانروائے ملتانی بیگمات اور شہزادیوں کے کھانے سکھپال تھے قاسم اپنی رَو میں بڑھا چلا جاتا تھا، دفعتہً اسے ایک تکلف پالکی میں دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ قاسم ٹھٹک گیا، اسے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُسے اپنے جگر میں ایک لرزش، دل میں ایک ضعف، حواس میں ایک وحشت سی محسوس ہوئی۔ وہ دو آنکھیں دو منور رقصاں ستاروں کی طرح جنہیں ساحرانہ کشش تھی اس کے گوشۂ دل میں آبیٹھیں۔

افسانے کا یہ آغاز آغازِ عمل ہے۔ مگر فی الاصل اس آغاز میں آئندہ واقعات سے پیدا ہونے والی پیچیدگی جھلکا دی گئی ہے۔ ملتان کے فتح کے بعد جتنے لوگ قیدی بنے ہیں وہ سب بادشاہ کے قیدی ہیں، اور قاسم کا بحیثیت شاہی ملازم یہ فرض ہے کہ وہ بادشاہ کے تمام قیدیوں کو بادشاہ تک پہنچا دے گر وہ راہ میں ایک قیدی حسینہ کو دل دے بیٹھتا ہے۔ یہ سوال فوراً سامنے آجاتا ہے کہ اس کی اس ناعاقبت اندیشی کا کیا انجام ہوگا۔ گویا آغازِ افسانہ ہی سے پیچیدگی صاف صاف نظر آرہی ہے۔

ایک گدائے قوم کی صدا

غمخوارئ انڈیا کیے جا — چھپ کر نہیں برملا کیے جا
کچھ خدمتِ ملک بھی بجا لا — کچھ حقِ نمک ادا کیے جا
بنیادِ فلاحِ قوم رکھکر — کچھ خیر کی ابتدا کیے جا
للہ مریض کی طرف سے — غفلت نہ برت، دوا کیے جا
بادل کی طرح برس برس کر — گلزارِ وطن ہرا کیے جا
قسمت بھی مساعدت کرے گی — کوشش کے حقوق ادا کیے جا
دانا ہے تو زورِ عقل سے چھین — ناداں ہے تو التجا کیے جا
آنکھیں ہیں تو آجفا کی حد دیکھ — اندھا ہے تو جا وفا کیے جا
حق بات خطا سہی، مگر تو — دن رات یہی خطا کیے جا

آزاد، پھر اک صدا لگا چل
بابا کیے جا بھلا کیے جا

آزاد انصاری

رُوح کا معمّا

امام اکبر آبادی

بُت پرست یونانیوں اور رومیوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی روح اُس کے جسمانی صورت سے مشابہ ہے۔ اور جسم کے عروج و زوال کے ساتھ اُس کا تعلق ہے۔ یعنی جب جسم بڑھتا ہے تو یہ بھی اسی مقدار سے بڑھتی ہے اور جب یہ گھٹتا ہے تو وہ بھی گھٹ جاتی ہے۔

قدیم عیسائیوں کے خیالات یہ تھے کہ آنے والی دنیا میں روحیں اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب سے اسی طرح مل کر بات چیت کریں گی جس طرح انسان اس دنیا میں کرتا ہے۔ اس خیال سے اُن کے دلوں کو ایک گونہ تسکین ہو جایا کرتی تھی۔ اور یہ خیالات اسی تسکین کی بنا پر تھے کہ سینٹ پیٹر بہشت کا دربان ہے، اور اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس روح کو چاہے بہشت میں داخل کرے اور جس کو چاہے نکال دے۔ اس میں ایک گروہ کا خیال تھا کہ موت کے بعد روح اپنی قبر پر منڈلایا کرتی ہے دوسرا گروہ کہتا تھا کہ وہ حالتِ سراسیمگی میں اِدھر اُدھر فضائے بسیط میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

تمام یورپ میں نہ صرف جہلا بلکہ عقلا بھی یہ بات تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ روحیں وقتاً فوقتاً آکر اپنے دیرینہ مساکن میں بود و باش اختیار کرتی ہیں اور کبھی ویران محلوں، تنگ و تاریک ویرانوں میں جا کر رہتی ہیں، یا چاندنی راتوں میں تنہا خاموش چہل قدمی کیا کرتی ہیں۔

ایشیا میں اس کے برعکس تصورات تھے، یعنی ماہیتِ ذاتِ باری کے تصورات سے مشرقی ایشیائیوں نے تجسیمیت کے خیال کو خارج کر کے یہ ظاہر کیا کہ روح کے باب میں انفصال و انجذاب لازمی ہے۔

ویدوں میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ روح تمام کائنات میں جاری و ساری ہے اور اسی سے انسانی روح کا انفصال و انجذاب ہوتا رہتا ہے۔ منو کی سمرتیوں میں بھی یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ روح شعلۂ عقل کی ایک چنگاری ہے جو اس سے جدا ہو گئی ہے، اور ایک مدّت مدید کے بعد پھر اسی میں مدغم ہو جائے گی۔

بُدھوں کا عقیدہ یہ تھا کہ قوت کا وجود اصلی و حقیقی مادّے کو اپنا مظہر بنا کر عالمِ شہود میں لاتا ہے۔ یعنی ایک جلتی ہوئی شمع ایک انسان کی مورت کے مانند ہے۔ جس میں مادہ مجسم ہو کر قوت کے عملِ ارتقا کو ظاہر کرتا ہے، اُن کے نزدیک شمع بذاتِ خود مادہ ہے، اور شعلہ مثلِ روح کے ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جب شمع جلی نہ تھی تو شعلہ کہاں تھا، کیا اس وقت وہ معدوم تھا؟ اور اب فنا ہو گیا؟ نہیں بلکہ شعلے کا وجود پہلے بھی تھا، اور بجھنے کے بعد بھی ہے، جسے ہماری ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔

یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک عقلِ مطلق اور ایک غیر محدود طاقت ہے جو کائنات کے رگ و ریشے میں جاری و ساری ہے۔ اسی سے روحِ انسانی کا تعلق ہے، جو ایک طرف تو اُس ازل سے وابستہ ہے جس کی کوئی ابتداً نہیں، اور دوسری طرف اُس ابد سے متعلق ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

مسلمانوں کا عقیدہ تھا اور ہے کہ روح ایک حکم ربی ہے، اور اُس کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی خدا کا ایک حکم ہے جو کائنات کی ہر ہر شے میں حیات بن کر رونما ہے۔ یہی قرآن نے کہا ہے اور اسی پر تمام مسلمان فلاسفر متفق نظر آتے ہیں۔ مثلاً ابن رشد۔ ابن تیمیہ، ابن حزم۔ امام غزالی۔ ابن عربی فخرالدین رازی۔ بوعلی سینا، فارابی، شاہ ولی اللہ اور سر سید احمد خاں، یہ

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت کے امام گزرے ہیں، اور جو یورپ کے فلاسفروں سے آزاد خیالی میں دو قدم آگے ہیں، لیکن یہ تمام کے تمام کسی مسئلہ کی تشریح کے باب میں قرآن ہی کے محتاج نظر آتے ہیں۔

ابنِ رشد کے فلسفہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شے زندہ ہے، اور اس کا تعلق کسی ایسی شے سے ہے جو پہلے سے زندہ تھی۔ مادہ مرئی چونکہ دنیائے حیات ہے، اس لئے لازماً یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کا انفصال کسی وجودِ لامتناہی سے متعلق ہے، اور وہ وجود وہی ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں۔ ابنِ رشد کے فلسفے کا اثر یورپ پر اس قدر پڑا کہ تمام اس کے عقیدت مند ہو گئے۔

اس کے بعد امام غزالی کے فلسفہ کا ظہور [illegible] میں ہوا۔ ان کا فلسفہ رُوح کے متعلق یہ ہے کہ

"خدا نے انسان کی رُوح کو اپنے نُور کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے اور اس قطرے کی خلقت کا منشا یہ ہے کہ جس سمندر سے یہ نکلا تھا اس میں جا کر مل جائے۔ اپنے نفس کو اس بے بنیاد خیال سے دھوکا نہ دو کہ جسم کے فنا ہوتے ہی روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ جب تم دنیا میں آئے تھے تو تمہاری شکل و صورت کچھ اور تھی، اور اب کچھ اور ہے، اس لئے ضروری نہیں کہ جسم کے ہلاک ہونے کی وجہ سے روح بھی ہلاک ہو جائے۔"

ابنِ رشد کے پیروؤں کا عقیدہ تھا کہ جب ایک آدمی مرتا ہے تو اس کا جوہرِ عقلی، یعنی روح جداگانہ طور پر قائم نہیں رہتی۔ بلکہ اس عالمگیر روح یا عقلِ فعال، یا روحِ کائنات، یعنی خدا کی طرف رجوع کر کے اس میں جذب ہو جاتی ہے، جس سے ابتداً اس کا صدور یا خروج یا انفصال ہوا تھا۔

خلفائے اندلس اگر ایک طرف عیش و عشرت کے حیرت افزا لوازم مہیا کر رہے تھے، تو دوسری طرف علوم و فنون کے چرچے بھی تھے۔ عربوں کے فلسفیانہ خیالات اندلس سے نکل کر آہستہ آہستہ یورپ تک پہونچتے رہے، حتیٰ کہ دسویں صدی عیسوی میں خلیفہ حاکم ثانی نے اندلس کو فردوسِ عالم بنا دیا تھا۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان بے روک ٹوک ملتے تھے، اور ان میں ایک عالمگیر برادری قائم ہو گئی تھی، اور مساوات کی انتہا نہ تھی۔

پیئر جو کچھ دن کے بعد پاپائے اعظم بن گیا تھا اس کا بیان ہے کہ میں نے ایسے ایسے علماء کو دیکھا جو تحصیلِ علم کے لئے برطانیہ سے چل کر اندلس پہونچتے تھے، اندلس کے اربابِ علم و فضل کا یہ حال تھا کہ آنے والا عام اس سے کہ وہ کہیں کا باشندہ ہو، اس کا نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا کرتے تھے، حکمت اور فلسفے کی درسگاہیں قائم تھیں۔ فرانس، جرمنی، اٹلی اور انگلستان میں ابنِ رشد کا فلسفہ مسلط تھا، ایسا کہ فرانسسکن فرقے کے پادریوں نے اس کے فلسفے کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا، حتیٰ کہ پیرس کی یونیورسٹی اس کا مرکز بن گئی۔

یہودیوں میں بھی جو اس زمانے کے صدر نشینانِ بزم اور ادراک مشہور ہوتے تھے، فلسفہ ابنِ رشد نہایت سرعت سے پھیل گیا۔ غرضکہ سائنس و فلسفہ کی حکومت ایشیا و یورپ کے ایک بڑے حصے پر قائم ہو گئی۔ اگر اس وقت مذہبی لوگ حائل نہ ہوتے تو آج خدا جانے زمین پر رہنے والا انسان ترقی کے کس درجہ پر ہوتا۔ لیکن جس طرح عروج کے بعد زوال اور زوال کے بعد عروج ہوتا رہا ہے۔ جس طرح تاریکی کے بعد روشنی اور روشنی کے بعد تاریکی ہوتی رہی ہے اسی طرح حکمت و جہالت کا بھی ہمیشہ ساتھ رہا ہے،

چنانچہ اسپین میں خلیفہ المنصور نے محض دُنیوی حصول وجاہت و سلطنت کی غرض سے مذہبی لوگوں کا ساتھ دے کر ضعیفی میں ابنِ رشد کو یہ کہہ کر ملک بدر کیا کہ اُس کے فلسفے سے اسلامی عقائد خراب ہوتے ہیں۔

یورپ میں فرقۂ ڈامنیکن نے جو فرقۂ فرانسسکن کا رقیب تھا فلسفۂ ابنِ رشد کی مخالفت شروع کر دی، اور اعلان کر دیا کہ چونکہ ابنِ رشد کا فلسفہ ذات و شخصیت کے تصور کو مٹاتا ہے، جبریہ خیالات کی اشاعت کرتا ہے، اور عقولِ منفردہ کے اختلافاتِ مدارج و ترقی کی کوئی توجیہ نہیں پیش کر سکتا۔ اُس کا یہ دعویٰ کہ کائنات میں صرف ایک عقل کا وجود ہے، محض غلط ہے، اس لئے کہ اس سے اولیاء کی کرامات و تصرفاتِ روحانی کی نفی ہوتی ہے، اور انسانوں کے مدارج میں کوئی فرق نہیں رہتا، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ پاپائے اعظم پیئر کی مقدس روح اور یہودا کی ملعون روح میں کوئی فرق نہ ہو، اور دونوں کا درجہ برابر ہو۔ پس ابنِ رشد کا یہ ملحدانہ مسلکِ پیدائش تائیدِ ایزدی، الہام، اقانیم ثلثہ، استجابتِ دعا، ثواب، خیرات، اور قبولِ استغفار کا منکر ہے۔ اور حشرِ اجسام و بقائے روح کو باطل قرار دیتا ہے۔

اس انقلاب کا اثر یہودیوں پر بھی پڑا، اور یہاں بھی مذہبی لوگوں

نے مخالفت شروع کردی۔ موسیٰ بن میمون اور اُس کے شاگردوں کا جو ابن رشد کے فلسفے کے پیرو تھے، اور جو دنیا کے ہر حصہ میں اس فلسفے کی اشاعت کررہے تھے۔ مذہبی فرقہ دشمن ہوگیا، اور اس ہستی کو، اس علامہ کو جس کے متعلق یہودیوں کا قول تھا کہ وہ ایک زبردست عالم و فاضل ہے راس العلماء و فرزانۂ دوراں ہے، سرزمین مغرب و مشرق کا آفتاب ہے، یہی لوگ اس کے اس قدر مخالف ہوئے کہ ملحد، منکر، اور کافر وغیرہ کہنے لگے۔ یہاں تک کہ اس کی تمام تصانیف کو نذر آتش کردیا

بہر نوع روح کے باب میں دنیا کے بڑے بڑے عقلاء، بڑے بڑے حکیم و فلسفی، اور بڑے بڑے پیغمبر و مہاتما سر ٹپک کر چلدئے، مگر کوئی نہیں بتا سکا کہ یہ کیا چیز ہے! کیسا سحر ہے؟ اور کیسا جادو و طلسم ہے؟ آیا بجلی کی ایک رَو ہے جو ہر ہر قطرے اور ہر ہر ذرّے میں دوڑ رہی ہے؟ جوہر برق ہے جو غیر مرئی اشیاء تک میں جاری و ساری ہے! یا جوہر لطیف ہے جو جمادات میں سوتی ہے، نباتات میں کروٹیں بدلتی ہے۔ اور حیوانات میں آکر بیدار ہو جاتی ہے؟ پھر کون ہے جو بتا سکے، کہہ سکے، اور عوز کرسکے بجز اس کے کہ

کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

رازونیاز

خموش رہنے پہ طعنے، جو کچھ کہو تو عتاب ۔۔۔ کرے تو کیا کرے انسان اور کیا نہ کرے
مزے مزے کا گلہ تھا، مزے مزے کا جواب ۔۔۔ کہ اب سے نام محبت کوئی لیا نہ کرے
جو پوچھا عشق میں بھرتے ہیں پھر مزہ کیونکر ۔۔۔ کہا کہ خون ہو دل کا اور اُف ذرا نہ کرے
جو پوچھا درد میں لذّت کی اور کیا تدبیر ۔۔۔ کہا کہ سامنے کی بات ہے، دوا نہ کرے
جو پوچھا کہتے ہیں کس کو شہید طرز نگہ ۔۔۔ کہا طلب جو سرِ حشر خوں بہا نہ کرے
جو پوچھا صبر کسے کہتے ہیں محبت میں ۔۔۔ کہا کہ دم ہو لبوں پر مگر دعا نہ کرے
جو پوچھا عشق میں کیا کوئی شے ہے خودداری ۔۔۔ کہا کہ لاکھ تمنا ہو، التجا نہ کرے
جو پوچھا عشق میں کیا آرزو کو دخل نہیں ۔۔۔ کہا کہ بھول کے ایسی کبھی خطا نہ کرے
جو پوچھا شیوۂ محبوب دلربا کیا ہے ۔۔۔ کہا کہ وعدہ تو کرلے، مگر وفا نہ کرے
جو پوچھا ہوشربا کون ہے ادا، تو کہا ۔۔۔ سنائے پردے سے آواز، سامنا نہ کرے

جو پوچھا سچ ہے یہ کیا، جذب ہے محبت میں
کہا غلط ہے، اگر ترکِ مدعا نہ کرے

آثر لکھنوی

شاعرِ ہندوستان

اے حریفِ بختِ خفتہ، شاعرِ ہندوستاں　　تا کجا یہ رنگِ غفلت، تا کجے خوابِ گراں
ترک کر بلبل کا قصہ۔ چھوڑ گل کی داستاں　　نغمۂ حسن و محبت تا کجا ورد زباں
کیا زمیں بدلی نہیں، کیا آسماں بدلا نہیں!
ہاں مگر تیرا ابھی رنگِ بیاں بدلا نہیں

صاحبِ ثروت کی آخر مدح خوانی تا کجا　　اہلِ زر کی شان میں رطب اللسانی تا کجا
سوزشِ پروانہ پر آتش بیانی تا کجا　　شمع کی توصیف میں شعلہ زبانی تا کجا
فائدہ دنیا کو کیا پہنچا تری تحریر سے
اب بدل دے قوم کی قسمت کسی تدبیر سے

دیکھ حالت ملک کی غافل نگاہِ غور سے　　سابقہ آکر پڑا ہے قوم کو کس دور سے
خود ہے تو ذی فہم، سمجھائیں تجھے کس طور سے　　ننگ ہے تیرے لئے. پوچھے اگر تو اور سے
ایک عالم میں مسلّم ہے تری فرزانگی
کس لئے پھر واقعاتِ حال سے بیگانگی؟

تو اگر چاہے تو پیدا ہو جہاں میں انقلاب　　تو اگر چاہے تو ذرے کو بنا دے آفتاب
شاہدِ مقصود کا رخ ہے حجاب اندر حجاب　　اب خدا کے واسطے غافل الٹ بھی دے نقاب
جذبِ الفت سے بدل دے حسن کا دستور تو
سب کو بے پردہ دکھا دے جلوۂ مستور تو

ہم نے مانا، وقت اپنا تو کبھی کھوتا نہیں!　　رات کو فکرِ سخن میں بستر پہ سوتا نہیں
پھر بھی ہونا چاہیئے جو کام وہ ہوتا نہیں　　بھول کر بھی قوم کی حالت پہ تو روتا نہیں

وہ صدا نکلے ترے بیتاب دل کے ساز سے
جاگ اُٹھیں سونے والے آہ کی آواز سے

بُھول کر دل میں نہ لا بغض و تعصب کا خیال   چھوڑ دے، ہاں چھوڑ دے ہندو مسلماں کا سوال
مُلک کی حالت ہے ابتر۔ قوم کا ہے غیر حال   اب نہ کر بہر خدا ہندوستاں کو پائمال
ہاتھ کانوں پر نہ رکھ ظالم اذاں کی یاد سے
شور و ہنگامہ نہ کر، ناقوس کی فریاد سے

ایک دُنیا ہے ازل سے ماننے والی تری   ہوش میں اپنے نہیں آتی ہے متوالی تری
رو رہے ہیں دیکھکر ہم آج بدحالی تری   کیا ہوئی ہاں کیا ہوئی وہ ہمتِ عالی تری
منہ چھپا کر بزم سے خلوت میں روپوشی تری
اے ستمگر کس لئے یہ مصلحت کوشی تری؟

رہنمائے قوم سب کہتے ہیں تیری ذات کو   کیوں صداقت سے عیاں کرتا نہیں جذبات کو
کس طرح سمجھے کوئی افسوس تیری بات کو   رات کو جب دن بتائے، دن کہے تو رات کو
ہے زباں پر اور کچھ، دل میں مگر کچھ اور ہے
راست گوئی، حق شعاری کا یہی کیا طور ہے؟

ننگِ دُنیائے ادب، فکرِ سخن ہی چھوڑ دے   بارِ خاطر اب نہ بن، تو انجمن ہی چھوڑ دے
جب نہیں الفت چمن کی تو چمن ہی چھوڑ دے   بیخبر ہے گر وطن سے تو وطن ہی چھوڑ دے
قدر جب دل میں نہیں، ہندوستاں سے کیا غرض
کافرِ نعمت کو اس جنت نشاں سے کیا غرض

کاش تجھکو افتراقِ مُلک کا احساس ہو   قوم کے مٹتے ہوئے ناموس کا کچھ پاس ہو
شوق بے پایاں ہو باسطؔ، دُور دل سے یاس ہو   دیکھ کر تیری اُمنگیں ہم کو بھی کچھ آس ہو
رنگِ ہمدردی دکھا، کچھ جذبِ دل سے کام لے
چھیڑ وہ نغمہ کہ اک دنیا کلیجہ تھام لے!

باسط بسوانی

ترجیح شاہی

عبدالرحیم شبلی۔ بی۔ کام

بین الاقوامی تجارت کے دو نظریئے ہیں۔ ایک یہ کہ بلا روک ٹوک ہو اور دوسرے یہ کہ ملکی مصنوعات کو خارجی مقابلہ سے محفوظ رکھنے کے لئے، دوسرے ممالک کے مال پر تحفظاتی محاصل عائد کئے جائیں۔

آجکل برطانیہ، اپنی سلطنت کی حدود کے اندر "آزاد تجارت" کے اصول پر عمل پیرا ہے لیکن نوآبادیات اور ممالک محروسہ برطانوی مال کو، غیر سلطنتی اشیاء پر ترجیح دیتے ہیں۔

مثلاً ہندوستان، کپڑے کی تجارت، برطانیہ اور جاپان، دونوں سے کرتا ہے لیکن چونکہ جاپان، سلطنت برطانیہ کا حصہ نہیں ہے، اس لئے اُسے اپنے مرسلہ کپڑے پر تحفظاتی محصول ادا کرنا پڑتا ہے لیکن برطانیہ کا مال، بلا تحفظاتی محصول، درآمد ہوسکتا ہے، بلکہ بندرگاہوں پر، جو دستوری محصول، گورنمنٹ کی آمدنی بڑھانے کے لئے لیا جاتا ہے، اس میں بھی اسے دس فی صدی چھوٹ دی جاتی ہے۔ "ماں سلطنت" کے ساتھ یہ ترجیحی سلوک ترجیح شاہی کہلاتا ہے۔

ترجیح شاہی کا مقصد

اس کا مقصد "ماں سلطنت" اور نوآبادیات و ممالک محروسہ کے درمیان تجارت کو فروغ دینا اور غیر ملکی مال کے خلاف امتناعی محاصل لگا کر، سلطنت کو خارجی مقابلہ و مبارزہ سے محفوظ رکھنا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اس لائحۂ عمل سے منشاء یہ ہے کہ سلطنت برطانیہ ایک بڑے پیمانے پر کافی بالذات ملک بن جائے۔ تاکہ جنگ وغیرہ کے دوران میں خارجی تجارت کے منقطع ہونے پر، برطانیہ یا اس کے کسی ماتحت علاقے کو نقدان غذیہ کی تکلیف نہ ہو، اور یہ "معاشی قومیت" بالآخر سیاسی اقتدار پر منتج ہو کیونکہ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ جو ملک، اقتصادی طور پر مضبوط ہوگا۔ اس کی اپنی سیاسی طاقت کے لوہا منوانے میں بھی کوئی دقت درپیش نہ ہوگی۔

ترجیح شاہی اور محافظت میں فرق

ترجیح شاہی ایک قسم کی تجارتی محافظت ہی ہے، جو "چہیتے ملک" کو دی جاتی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ استحفاظ میں مستعملین کے مفاد، ان کے اپنے ملک کی کسی صنعت کی ترقی کے لئے قربان کردیئے جاتے ہیں لیکن ترجیح میں، قربانی کا فائدہ، اس ملک کے صناعین کو پہنچتا ہے، جس کو مراعات دی جائیں۔

تحفظاتی محاصل کی طرح ترجیح شاہی کے باعث بھی مستعملین پر بوجھ کے علاوہ گورنمنٹ کی آمدنی میں کمی واقع ہوجاتی ہے، کیونکہ خواہ غیر ملکی مال پر شرح محصول بڑھا دی جائے اور مترجح ملک کے مال پر محصول وہی رہے۔

اگر قیمتیں بلند شرح کے مطابق مقرر ہوں گی تو بلند اور کم شرح کے درمیان جو فرق ہوگا اس کی رقم اُن صناعین کو ملے گی جن کو ترجیح دی گئی ہے۔ پس وہ تمام رقم جو مستعملین ادا کرتے ہیں گورنمنٹ کے خزانے میں نہیں آتی۔

ترجیح شاہی کی تاریخ

سلطنت برطانیہ کے مختلف حصص کے درمیان اس تجارتی ارتباط کی

تاریخ غالبًا سنہ ۱۸۹۷ء سے شروع ہوئی۔ جب کینیڈا نے برطانوی مال کے لئے محصول درآمد کے میں ۱/۸ کمی واقع کردی۔

سنہ ۱۸۹۸ء میں یہ کمی ۱/۴ کردی گئی۔ برطانیہ کے لئے تو یہ غیر مشروط تھی۔ لیکن دوسرے ممالک کو یہ رعایت صرف اس شرط پر دی گئی کہ وہ بھی کینیڈا کے ساتھ اسی قسم کا ترجیحی سلوک روا رکھیں۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں نوآبادیات کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں کینیڈا کی تقلید میں سب اجزائے سلطنت کو "ترجیح شاہی" کے اصول پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی، چنانچہ نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ نے سنہ ۱۹۰۳ء میں اور آسٹریلیا نے سنہ ۱۹۰۷ء میں برطانوی مال کو شاہی ترجیح دینے کا فیصلہ کیا۔

لیکن برطانیہ ابھی تک اپنے "آزاد تجارت" کے پرانے اصول سے منحرف ہونے کے لئے طیار نہ تھا۔ وہ مواد خام اور اغذیہ درآمد کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ صنعتی ملک ہونے کی حیثیت سے اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اپنی ضروریات سستی سے سستی مارکیٹ میں خرید کرے۔ علی الخصوص اغذیہ کے لئے وہ "اپنے تمام انڈے شاہی ٹوکری میں ڈالنے کے لئے" ہرگز طیار نہ تھا۔ اندریں حالات برطانیہ عملی "ترجیح شاہی" کی تحریک میں ایک عام حصہ لینے سے قاصر رہی لیکن نوآبادیات اس امید پر اپنے فیصلہ پر کاربند رہیں کہ شاید مادر وطن کسی مستقبل قریب میں اس پالیسی میں شامل ہوجائے۔

سنہ ۱۹۲۰ء سے نوآبادیات اور ممالک محروسہ نے اپنی پالیسی کو بہت وسیع کردیا ہے۔ اور برطانیہ کی بہت سی اشیاء پر انہوں نے فراخ دلی سے ترجیح دی ہے۔

جنگ کے بعد برطانیہ نے جہاں اور بہت سے اسباق سیکھے وہاں ایک یہ سبق بھی سیکھا کہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے معاشی اقتدار پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ برطانوی سلطنت کو معاشی اور تجارتی طور پر متحد کرکے ایک "کافی بالذات ملک" بنایا جائے۔ چنانچہ برطانیہ اب جوابی طور پر ترجیح شاہی کے اصول پر کاربند ہو رہا ہے، اور سرکاری طور پر اس نے مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میں اپنی اس پالیسی کا اعلان بھی کردیا تھا۔

ترجیح شاہی کی موافقت اور مخالفت

حامیان "ترجیح شاہی" کا خیال ہے کہ چونکہ تجارتی تعلقات کی وجہ سے برطانوی ممالک میں ایک حد تک اتحاد پیدا ہوجائے گا اس لئے برطانوی سلطنت کو سیاسی طور پر بھی طاقت حاصل ہوجائے گی، یہ گویا "ترجیح شاہی" کا سیاسی فائدہ ہے۔

دوسرے آج کل برطانیہ اپنی اغذیہ کے لئے غیر ممالک (مثلاً امریکہ وغیرہ) پر انحصار رکھتی ہے۔ اور جنگ کے دوران میں بہت ممکن ہے کہ یہ تجارتی تعلق ٹوٹ جائے اور انگلستان کی آبادی کو تکلیف ہو اس لئے بہتر یہی ہے کہ اغذیہ "ترجیح شاہی" کے ذریعے سے نوآبادیات اور ممالک محروسہ سے حاصل کی جائیں۔ اس سے نہ صرف برطانیہ کو فائدہ ہوگا۔ بلکہ نوآبادیات بھی نفع حاصل کریں گی۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے مال کی فروخت بالکل یقینی یقینی اور مستقل ہوجائے گی۔

اس لائحہ عمل کے خلاف یہ کہا جاسکتا ہے کہ "ترجیح شاہی" سے انگلستان کو مالی نقصان ہوگا۔ کیونکہ اس کو اغذیہ بجائے مقابلے کی سستی چیزوں کے خریدنے کے لازمی طور پر نوآبادیات سے خریدنا پڑیں گی۔ خواہ وہ مہنگی ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسرے چونکہ غیر سلطنتی مواد خام پر بلند تحفظاتی محاصل عائد کئے جائیں گے، اس لئے برطانوی مصنوعات کی لاگت بہت بڑھ جائے گی جس کی وجہ سے ان کی فروخت خارجی منڈیوں میں بہت کم ہوجائے گی۔ علاوہ ازیں خطرہ ہے کہ جوابی طور پر غیر سلطنتی ممالک بھی امتناعی محاصل لگا کر برطانوی مال کا مقاطعہ کردیں گے۔

دوسری طرف نوآبادیات اور ممالک محروسہ انگلستان کی ان معاشی قربانیوں کا کوئی بدلہ نہ دے سکیں گے۔

بس جہاں تک معاشی نقطۂ نظر کا تعلق ہے۔ اس پالیسی سے برطانیہ کو کسی منفعت کی قطعاً کوئی امید نہیں ہوسکتی۔ صرف سیاسی وجوہ ایسی ہیں جو اس لائحہ عمل پر کاربند ہونے کے لئے ترغیب و تحریص دے سکتی ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی مارشل کا خیال ہے کہ "ان سکیموں سے مفاہمت اور اچھے تعلقات پیدا ہونے کی بجائے مایوسی اور انشقاق ہی پیدا ہوگا۔"

ہندوستان اور شاہی ترجیح

چونکہ ہندوستان بھی سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ اسے بھی اس پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کس حد تک اس پالیسی میں حصہ لے سکتا ہے۔ اور اس کا اشتراک عمل کہاں تک برطانیہ یا سلطنت کے کسی دوسرے ملک کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اس کے لئے ہمیں برطانیہ اور برطانوی سلطنت کے ساتھ ہندوستان کی خارجی تجارت کا بغائر مطالعہ کرنا پڑے گا۔ جو مندرجہ ذیل نقشے[1] سے ہو سکتا ہے۔

	قبل از جنگ اوسط		زمانۂ جنگ کی اوسط		مابعد جنگ اوسط		سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء		سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء		سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء		سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء	
	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد	درآمد	برآمد
سلطنت برطانیہ	۶۹ر۷	۴۱ر۱	۶۵ر۴	۵۱ر۷	۶۵ر۲	۴۱ر۴	۵۴ر۰	۳۵ر۵	۴۴ر۰	۴۴ر۵	۵۰ر۰	۴۶ر۷	۴۹ر۴	۴۵ر۹
برطانیہ عظمیٰ	۶۲ر۸	۲۵ر۱	۵۶ر۵	۳۱ر۱	۵۷ر۶	۲۴ر۲	۴۴ر۷	۲۱ر۴	۳۵ر۵	۲۸ر۲	۴۱ر۷	۳۲ر۲	۴۰ر۶	۳۱ر۶

اس نقشے سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

۱۔ قبل از جنگ زمانے میں ہندوستان کی درآمد کا ⅔ حصہ سلطنت برطانیہ سے آتا تھا۔ اور اس میں بھی اکثر حصہ برطانیہ عظمیٰ کا تھا۔

۲۔ جنگ سے قبل ہندوستان کی برآمدہ تجارت زیادہ تر غیر سلطنتی ممالک کے ساتھ تھی کیونکہ کل برآمد کا صرف چالیس فی صدی حصہ سلطنت برطانیہ کو جاتا تھا۔ اور کل برآمد میں برطانیہ عظمیٰ کا حصہ صرف ¼ تھا۔

۳۔ جنگ کے بعد برطانیہ اور برطانوی سلطنت سے ہندوستان کی درآمدہ اور برآمدہ دونوں قسم کی تجارت بہت کم ہوگئی ہے اور علی الخصوص درآمد کا حصہ بہت گھٹ گیا ہے۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ تجارت پھر بڑھ گئی۔ اس کی وجہ زیادہ تر میثاق اوٹاوہ تھا۔ جو برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان ہوا اس کا مفصل حال ہم بعد میں لکھیں گے۔

بہرحال ان اعداد و شمار سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آج کل اگرچہ ہماری درآمد زیادہ تر برطانیہ سے ہوتی ہے لیکن برآمد کا اکثر حصہ ــــــــ ساٹھ فی صدی ــــــــ غیر سلطنتی ممالک کو جاتا ہے پس اگر ہم غیر ممالک کی بجائے برطانوی مال کو ترجیح دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غیر ممالک انتقام لینے کی خاطر ہماری اشیاء کا بائیکاٹ کردیں گے یا امتناعی محاصل لگا کر ان کا داخلہ اپنے ملک میں بند کردیں گے۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری برآمدہ تجارت تباہ ہو جائے گی۔

پھر ہندوستان، برطانیہ اور دیگر ممالک کو زیادہ تر اغذیہ اور سواد خام (مثلاً گیہوں۔ چاول۔ روئی۔ پٹ سن۔ روغنی بیج اور کھالیں وغیرہ) بھیجتا ہے پس اگر برطانیہ ان اشیاء کے لئے ہندوستان کو دیگر ممالک پر ترجیح دے تو اس کا چنداں فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ترجیحی محاصل کی وجہ سے ان اشیا کی قیمتیں برطانیہ میں بہت بڑھ جائیں گی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایک طرف مزدور بوجہ اغذیہ کے مہنگا ہونے کے زیادہ اجرتیں طلب کریں گے تو دوسری طرف مصنوعات کی لاگت بھی بڑھ جائے گی جو ہندوستانیوں کے لئے بلا ریب نقصان دہ ہوگی۔

پھر ہماری برآمد میں سے اکثر اشیاء ایسی ہیں جن پر کسی ترجیح

نوٹ:۔ ر سے مراد واو اعشاریہ ہے۔

[1] ماخوذ از ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء صفحہ ۲۰۱۔

کی ضرورت نہیں مثلاً پٹ سن کا ہندوستان کو اجارہ حاصل ہے۔ اب اس پر کسی قسم کے ترجیحی محاصل لایعنی ہوں گے کیونکہ اگر اس پر کوئی شاہی ترجیح نہ ہو تو بھی برطانیہ کو یہ چیز ہمارے ملک سے ہی خریدنا پڑے گی۔ کیونکہ اس باب میں ہندوستان کو اجارہ حاصل ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک کی چائے بہرحال برطانیہ کو خریدنی پڑتی ہے۔ کیونکہ ایسی عمدہ اور سستی چائے وہ کہیں اور سے حاصل نہیں کر سکتا۔ باقی گیہوں روئی اور چاول وغیرہ کی برآمد پہلے ہی گھٹ رہی ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کا مطالبہ ملک میں ہی بڑھ رہا ہے پس ان پر کسی قسم کی ترجیح کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہم فروخت ہی نہیں کرنا چاہتے۔

یہ تو برآمد کا حال تھا۔ اب درآمد کو لیجئے، برطانیہ ہمارے ملک میں زیادہ تر مصنوعہ اشیاء بھیجتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ پالیسی ہندوستانی مصنوعات کے حق میں نہایت ضرر رساں ہے کیونکہ برطانوی اشیاء ہندوستانی اشیاء کے ساتھ مقابلہ کریں گی۔ اور جو تحفظ ہندوستانی مصنوعات کو دیا گیا ہے اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔

پھر اگر برطانوی اشیاء کو ترجیح دی جائے تو قدرتی طور پر ان کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ اور ہندوستانی مستعملین کو جو پہلے ہی غریب ہیں بہت نقصان ہوگا۔

پس برطانوی درآمد کو ترجیح دینے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوستانی صنعت کو تباہ کر دیا جائے۔ اور مستعملین کو شدید مالی نقصان پہنچایا جائے

باقی رہی ہندوستانیوں کی نوآبادیات وغیرہ کے ساتھ تجارت، سو وہ اس قدر قلیل ہے کہ معاشی لحاظ سے بالکل ناقابل التفات ہے پس اس حصے پر ترجیح دینا کسی منفعت کا باعث نہیں ہو سکتا۔

لارڈ کرزن کے زمانے میں بھی ترجیح شاہی کا سوال اٹھایا گیا تھا لیکن اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا نے سکرٹری آف سٹیٹ کو ایک طویل مراسلہ بھیجا۔ جس میں ترجیح شاہی کو اس بنا پر مسترد کر دیا تھا کہ اس کی وجہ سے غیر ممالک انتقام کی طرف مائل ہو جائیں گے اور چونکہ برطانوی مال پر محصول کم کرنا پڑے گا اس لئے گورنمنٹ کو مالی نقصان ہوگا۔

پروفیسر کویاجی وغیرہ جو ترجیح شاہی کے حامی ہیں انتقام کے خطرہ کو یہ کہہ کر دور کرتے ہیں کہ چونکہ ہندوستان مواد خام برآمد کرتا ہے جس کے بغیر غیر ممالک کا گزارا نہیں اس لئے جوابی مقاطعے کا قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ مزید برآں دیگر ممالک نے بھی انتقام کی چنداں پرواہ نہیں کی۔ اور ہندوستان نے بھی تحفظاتی محاصل کی پالیسی پر عمل کر کے نقصان نہیں اٹھایا۔ پس یہ کوئی ایسی وجہ نہیں جس کی بنا پر ترجیح شاہی کے اصول کو ترک کر دیا جائے۔

اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان، برطانیہ کو اس کے مال پر محصول درآمد کم کئے اور گورنمنٹ کی آمدنی کو نقصان پہنچائے بغیر بھی ترجیح دے سکتا ہے۔ یہ اس طرح کہ برطانوی مال پر شرح محاصل وہی رہے لیکن غیر ملکی اشیاء پر محصول زیادہ کر دیا جائے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمتیں بلند شرح محصول کے مطابق مقرر ہوں گی۔ اور کم اور زیادہ شرح کے درمیان کے فرق کی رقم بجائے خزانۂ عامرہ میں پہنچنے کے خارجی صناع کو پہنچے گی۔ پس گورنمنٹ کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔

میثاق اوٹاوہ

اس کے بعد ہم شاہی ترجیح کے ماتحت ایک جدید معاہدے کو لیتے ہیں۔ جو برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ اور دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کو اس معاہدے سے کس حد تک نفع یا نقصان ہوا۔

جن حالات میں یہ معاہدہ ہوا وہ واقعی ایسے تھے کہ اگر یہ میثاق نہ ہوتا تو ہندوستان کی تجارت کو ایک زبردست دھچکا لگنے کا احتمال تھا جنگ کے بعد تمام زرعی ممالک نے جدید اکتشافات سے کام لے کر اپنی اپنی زراعت کو ترقی دینا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افریقہ، جنوبی امریکہ کینیڈا، ریاستہائے متحدہ وغیرہ میں زرخیز زمینیں زیر کاشت لائی گئیں اور لازمی طور پر زرعی پیداوار میں ایک حیرت انگیز اضافہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے جنس کا بھاؤ یک دم گر گیا۔

دیگر ممالک میں بھی دولت آفرینی روز افزوں تھی۔ چنانچہ مقابلہ سخت ہو گیا۔ اور روغنی بیج، کپڑے، غلہ اور لکڑی کے بارے میں علی الخصوص ہندوستان کی تجارت کو زبردست نقصان پہنچا۔

یہ خطرہ اس بات سے اور بھی زیادہ ہو گیا کہ غیر ممالک نے بعض اشیاء کے بدل دریافت کر لئے، اور اس وجہ سے ہندوستان کی اشیاء کی مانگ بہت کم ہونے گی۔

پھر اکثر ممالک معاشی قومیت کے اصول پر چلنے لگے۔ اور انھوں نے اپنی مصنوعات کو خارجی مقابلے سے محفوظ رکھنے کے لئے درآمد پر امتناعی محاصل لگانا شروع کر دیئے۔ جس کے نتیجے میں ہندوستانی تجارت بہت کم ہو گئی۔

اسی اثنار میں (ستمبر ۱۹۳۱ء) برطانیہ عظمیٰ نے میعار طلا ترک کر دیا اور ہندوستان اور سلطنت کے دیگر ممالک کی کرنسیوں کا الحاق اسٹرلنگ سے ہو گیا۔

۱۹۳۲ء میں برطانیہ نے ایک امپورٹ ڈیوٹیز ایکٹ پاس کیا، جس کی رو سے تمام غیر سلطنتی ممالک کی درآمد پر بھاری محاصل عائد کر دیئے گئے۔ اور ہندوستان اور نو آبادیات کو اس امید پر مستثنیٰ کر دیا گیا کہ وہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لیں گے۔

پس اگر ایک طرف ہندوستان کی تجارت غیر ممالک میں کم ہو رہی تھی تو دوسری طرف برطانیہ نے اس کو موقع دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کوئی تجارتی معاہدہ کرے۔ چنانچہ ہندوستان نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور کینیڈا میں اوٹاوہ کے مقام پر ایک شاہی کانفرنس ہوئی جس میں قرار پایا کہ ہندوستان برطانوی اشیا کو دس فی صدی ترجیح دے اور اس کے بدلے میں، برطانیہ بھی ہندوستانی اشیا سے ترجیحی سلوک کرے۔

یہ معاہدہ فی الحال تین سال تک کیا گیا جس کے بعد اس پر نظرثانی کی جانی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں اس معاہدہ کے نتائج پر غور کیا گیا۔ اور مرکزی اسمبلی نے کثرت رائے سے فیصلہ کیا کہ چونکہ اس معاہدے سے ہندوستان کو چنداں فائدہ نہیں پہنچا اس لئے اسے فی الفور منسوخ کر دیا جائے۔ چونکہ یہ اختلاف رائے کی بات ہے اس لئے میں ذیل میں اعداد و شمار کے ذریعے سے اصل حقیقت کو واضح کرتا ہوں۔ اگر کوئی نیا معاہدہ کیا گیا تو امید ہے کہ یہ توضیح شمع راہ کا کام دے گی۔

میثاق اوٹاوہ کی حمایت میں

حامیان میثاق کا خیال ہے کہ ہندوستان کو اس معاہدے سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اور بہتر یہی ہے کہ اس معاہدے کو ابھی منسوخ نہ کیا جائے، وہ اپنے ثبوت میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کی کل برآمد۔ لاکھ رُ پوؤں میں

مال جو گیا	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء
تمام ممالک کو	۱۵۷۵۶	۱۳۳۲۷	۱۴۷۵۲	۱۵۲۳۹
قیمتیں	۱۰۰	۸۴٫۶	۹۳٫۶	۹۶٫۷
برطانیہ عظمیٰ کو	۴۲۸۸	۳۶۸۲	۴۷۲۱	۴۸۰۷
قیمتیں	۱۰۰	۸۵٫۹	۱۱۰٫۱	۱۱۲٫۱
دیگر ممالک کو	۱۰۰	۸۴٫۱	۸۷٫۵	۹۰٫۹

	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء کے بالمقابل سنہ ۳۳-۳۴ء میں اضافہ کی اوسط	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء کے بالمقابل سنہ ۳۴-۳۵ء میں اضافہ کی اوسط	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء کے بالمقابل سنہ ۳۴-۳۵ء میں اضافہ کی اوسط
تمام ممالک	۱۰٫۵	۳٫۳	۱۴
برطانیہ عظمیٰ	۲۸٫۲	۱٫۸	۳۰٫۵
دیگر ممالک	۴	۳٫۹	۸

ہندوستان سے مترجح اشیار کی برآمد۔ لاکھ روپوؤں میں

مال جو گیا	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء
کل برآمد	۱۱۰۹۳	۹۵۰۴	۹۹۳۴	۹۴۴۱
قیمتیں	۱۰۰	۸۵٫۷	۸۹٫۶	۸۵٫۱
برطانیہ عظمیٰ کو	۳۳۳۰	۲۹۷۳	۳۶۴۸	۳۶۷۱
قیمتیں	۱۰۰	۸۹٫۳	۱۰۹٫۵	۱۱۰٫۲
کل برآمد میں برطانیہ کا حصہ	۳۰٫۰	۳۱٫۳	۳۶٫۷	۳۸٫۹
دیگر ممالک کو	۷۷۶۳	۶۵۳۱	۶۲۸۶	۵۷۷۰
قیمتیں	۱۰۰	۸۴٫۱	۸۱٫۰	۷۴٫۳
کل برآمد میں دیگر ممالک کا حصہ	۷۰٫۰۷	۶۸٫۷	۶۳٫۳	۶۱٫۱

	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء کے بالمقابل سنہ ۳۳-۳۴ء میں تغیر کی اوسط	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء کے بالمقابل سنہ ۳۴-۳۵ء میں تغیر کی اوسط	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء کے بالمقابل سنہ ۳۴-۳۵ء میں تغیر کی اوسط
برطانیہ عظمیٰ	+ ۲۲٫۶	+ ۰٫۶	+ ۲۳٫۴
دیگر ممالک	- ۳٫۷	- ۸٫۳	- ۱۱٫۷
کل	+ ۴٫۵	- ۵٫۰	- ۰٫۷

سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء میں ہماری برآمد کی کل قیمت ۱۵۲٫۴ کروڑ روپیہ تھی جس میں سے ۶۲ فی صدی مترجح اشیاء کا تھا۔

غیر مترجح اشیاء کی برآمد۔ لاکھ روپوں میں

جو مال گیا	۱۹۳۱-۳۲ء	۱۹۳۲-۳۳ء	۱۹۳۳-۳۴ء	۱۹۳۴-۳۵ء
کل برآمد	۴۶۶۳	۳۸۲۳	۴۸۱۸	۵۷۹۸
قیمتیں	۱۰۰	۹۲٫۰	۱۰۳٫۳	۱۲۴٫۳
برطانیہ عظمیٰ کو	۹۵۸	۷۰۹	۱۰۷۳	۱۱۳۶
قیمتیں	۱۰۰	۷۴٫۰	۱۱۲٫۰	۱۱۸٫۶
برطانیہ کے حصہ کی اوسط	۲۰٫۶	۱۸٫۵	۲۲٫۳	۱۹٫۶
دیگر ممالک کو	۳۷۰۵	۳۱۱۴	۳۷۴۵	۴۶۶۲
قیمتیں	۱۰۰	۸۴٫۰	۱۰۱٫۱	۱۲۷٫۸
دیگر ممالک کے حصہ کی اوسط	۷۹٫۵	۸۱٫۵	۷۷٫۷	۸۰٫۴

	۱۹۳۲-۳۳ء کے بالمقابل ۳۳-۳۴ء میں اضافہ کی اوسط	۱۹۳۳-۳۴ء کے بالمقابل ۳۴-۳۵ء میں اضافہ کی اوسط	۱۹۳۲-۳۳ء کے بالمقابل ۳۴-۳۵ء میں اضافہ کی اوسط
برطانیہ عظمیٰ	۵۱٫۳	۷٫۷	۶۰٫۳
دیگر ممالک	۲۰٫۴	۲۴٫۴	۴۹٫۷
کل	۲۶٫۰	۲۰٫۳	۵۱٫۶

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء اور سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء کے درمیان جہاں ہندوستان کی برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ برآمد تجارت ۲۲٫۶ فی صدی بڑھی وہاں اس میں غیر ممالک کے ساتھ صرف ۴ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اس اضافہ کی وجہ انگلستان میں مواد خام کے مطالبے میں زیادتی تھی۔ لیکن چونکہ برطانیہ کی ترقی صرف ان صنعتوں میں ہوئی ہے جن میں ہندوستانی مواد خام بہت کم استعمال ہوتا ہے اس لئے ہم اس اضافہ کو صرف صنعتوں کی مانگ پر محمول نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کی وجہ میثاق اوٹاوہ بھی ہے۔

پھر برطانیہ عظمیٰ کی درآمد سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء کے اعداد و شمار بتاتے ہیں ــــــــــــ کہ ہندوستانی اشیاء کی درآمد میں اضافہ ـــ مواد خام کی کل درآمد کے اضافہ سے زیادہ ہوا ہے۔ جس سے یہ صاف ثابت ہے کہ سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء میں ترجیح شاہی کی وجہ سے ہندوستانی اشیاء کی برآمد میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء کے اعداد و شمار سے ترقی کچھ کم نظر آتی ہے۔ لیکن یہ کمی متوقع تھی کیونکہ ترجیح کے پہلے سال میں بوجہ جوش، اضافہ قدرتی طور پر غیر معمولی ہونا تھا۔ اور اس کے بعد کچھ کمی ہو کر اصل حد آنا تھی۔ مزید برآں بعض، خاص حالات کی وجہ سے بعد کو برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ تجارت کا کم ہونا ضروری تھا مثلاً ایک بین الاقوامی معاہدہ کی وجہ سے چائے وغیرہ کی برآمد کم ہو گئی۔ اور اسی طرح بعض خاص حالات کی وجہ سے ہندوستانی تجارت بعض دیگر ممالک کے ساتھ بڑھ گئی، مثلاً جاپان نے سنہ ۱۹۳۳ء میں کچھ عرصہ کے لئے ہندوستانی روئی کا بائیکاٹ کیا تھا۔ بعد کو صلح ہو گئی، اس لئے جاپان نے پچھلی کمی پوری کرنے کے لئے غیر معمولی طور پر زیادہ روئی خریدی۔

پس اگر برطانیہ کے ساتھ کچھ مدت کے لئے تجارت کم ہو گئی یا دیگر ممالک کے ساتھ بڑھ گئی، تو یہ مخصوص حالات کی وجہ سے ہوا۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں مترجح اشیاء کی برآمد صرف دس فی صدی بڑھی وہاں غیر مترجح اشیاء کی برآمد اٹھارہ فی صدی بڑھ گئی۔

اس سے بعض معترضین استنباط کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان کی برطانیہ کے ساتھ کوئی تجارت بڑھی تو وہ برطانیہ کی غیر معمولی صنعتی ترقی

کی وجہ سے تھی۔ نہ کہ ترجیح کی وجہ سے اور دوسرے شاہی ترجیح کی وجہ سے ہندوستان کو کوئی غیر معمولی منافع نہیں ہوا کیونکہ غیر مترجح اشیاء کی برآمد مترجح اشیاء کی نسبت زیادہ بڑھی ہے۔

اس لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ غیر مترجح اشیاء کی برآمد میں اضافہ چنداں حیرت خیز نہیں ہے کیونکہ یہ وہ اشیاء تھیں جن کی غیر ممالک میں کسی خاص مقابلے و مبارزے سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ اور اسی وجہ سے ان کو ترجیحی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

دوسرے غیر مترجح اشیاء کی برآمد میں اضافہ کے اسباب بعض غیر معمولی حالات تھے۔ مثلاً لنکاشائر۔ انڈین کاٹن کمیٹی کے پروپگینڈے کی وجہ سے روئی کا مطالبہ بڑھ گیا۔ یا بوجہ بندش کی خاص اسکیم کے۔ بڑی برآمد میں اضافہ ہو گیا۔ یا دھاتوں وغیرہ کی مانگ میں زیادتی کی وجہ سے بعض بڑی صنعتوں کی از سر نو ترقی تھی۔

اسی طرح لاک کی برآمد میں اضافہ لندن کے بعض تخمینین speculators کی خرید کی وجہ سے تھا۔ جو قیاس کر کے قیمتوں کے فرق سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

پھر یہ بات بھی فراموش کر دی جاتی ہے کہ ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک برطانیہ عظمیٰ کی کل درآمد میں ۲۲ فی صدی کمی واقع ہوگئی۔ پس اگر اس انحطاط کے زمانے میں ہندوستان کی برطانیہ بھیجی جانے والی اشیاء میں دس فی صدی اضافہ ہوا ہے تو اس کی وجہ سوائے "ترجیح شاہی" کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

بعض مخالفین میثاق کہتے ہیں کہ اگر ایک طرف برطانیہ کے ساتھ ہماری تجارت بڑھ گئی ہے تو دوسری طرف غیر ممالک کے ساتھ یہ گھٹ بھی گئی ہے۔

لیکن غیر ممالک کے ساتھ تجارت میں کمی کی وجہ ترجیح شاہی کو قرار دینا سخت غلطی ہوگی۔ کیونکہ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ باقی تمام ممالک معاشی قومیت کے اصول پر کاربند ہونے کے لئے خارجی درآمد پر امتناعی محاصل لگا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ہندوستانی تجارت کو بھی نقصان پہنچا۔

لیکن اس کا ترجیح شاہی زیر بحث کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اگر یہ اضافہ محاصل جذبۂ انتقام کے ماتحت ہوتا تو اس حربہ کو صرف ہندوستان کے خلاف استعمال کیا جاتا لیکن اس کا عمومیت کا رنگ اور تمام ممالک کے خلاف ہونا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اس کی وجوہات ترجیح شاہی کے خلاف جذبۂ انتقام کی بجائے کچھ اور ہیں۔

میثاق اوٹاوہ کے مخالف میں

جو لوگ میثاق اوٹاوہ کے مخالفت میں ہیں ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس معاہدہ کی وجہ سے ہندوستان کی تجارت اپنی قدرتی روش سے منحرف ہوگئی ہے۔ اور اس وجہ سے ہندوستان کو نقصان پہنچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ترجیحات کی وجہ سے برطانیہ عظمیٰ میں مقابلہ و مبارزہ کم ہو گیا ہے تو وہ بعض اہم غیر ملکی منڈیوں میں سخت بھی ہو گیا ہے۔ اگر مترجح اشیاء کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف السی۔ قالین اور چاولوں کو قدرے فائدہ پہنچا ہے۔ ورنہ باقی اشیاء کے باب میں یہ ترجیحی انتظام یا تو ناکافی ثابت ہوا ہے یا ناقص!

پھر بعض اشیاء جن کو ترجیح دی گئی ہے درحقیقت کسی ترجیح کی ضرورت نہ تھی۔ مثلاً چائے کی تجارت کا "بندش چائے کی تجویز" کے ماتحت خود بخود انتظام ہو رہا تھا۔ اور ہندوستان۔ جاوا۔ اور سیلون ایسے بڑے بڑے چائے پیدا کرنے والے ممالک نے آپس میں پہلے ہی معاہدہ کر لیا تھا۔

اسی طرح بعض ایسی اشیاء پر بھی جن کی برطانیہ میں پہلے ہی مانگ کافی تھی ترجیح دینے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ مثلاً پٹ سن۔ بکری کی کھالیں لاکھ۔ رینڈی کے بیج (Castor seeds) اور ابرک وغیرہ ایسی اشیاء ہیں جو برطانیہ پہلے ہی کافی تعداد میں ہم سے خریدتا ہے۔

دوسری اشیاء کے بارے میں بھی ترجیح کا چنداں فائدہ نہ تھا کیونکہ ان میں سے اکثر اشیاء کے لئے سلطنت کے دیگر ممالک ہندوستان سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ مثلاً آسٹریلیا بکری کی کھالوں کا۔ کینیڈا اور آسٹریلیا خام سیسے کا۔ سیلون ناریل کی چٹائیوں اور مسالے کا۔ برٹش ویسٹ افریقہ مونگ پھلی کا اور برٹش ایسٹ افریقہ کافی کا، بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔

بعض چیزوں کی مانگ برطانیہ میں دیگر ممالک کی نسبت بہت کم ہے مثلاً مونگ پھلی۔

پھر بعض اشیاء کی برآمد اس قدر کم ہے کہ اس پر کسی قسم کی ترجیح کی ضرورت نہیں۔ مثلاً تمباکو۔ جوار، چاول۔

بعض اشیاء ایسی ہیں کہ اس قسم کی اشیاء برطانیہ میں مطلوب نہیں ہیں اس لئے ترجیح فضول ہے. مثلاً ہندوستانی تمباکو۔

مزید براں بعض اشیاء کی ترجیح کا اثر ان کے بدل دریافت ہونے کی وجہ سے زائل ہو گیا ہے مثلاً روغنی بیج۔

ایک اور اعتراض ترجیح شاہی کے خلاف یہ کیا جاتا ہے کہ اس سے گورنمنٹ کی آمدنی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے سستی خارجی اشیاء کی بجائے مجبوراً مہنگی برطانوی اشیاء خریدنے کی وجہ سے مستعملین کو نقصان ہوتا ہے۔ اور یہ نقصان نہ گورنمنٹ برداشت کرنے کے لئے طیار ہے اور نہ ہندوستانی مستعملین۔

ترجیح شاہی زیادہ تر نو آبادیات کو فائدہ پہنچا سکتی ہے کیونکہ وہی ایسی اشیاء پیدا کرتی ہیں جن کا مطالبہ برطانیہ میں بہت ہے اور دوسرے وہ برطانوی مصنوعات کی اپنی منڈیوں میں کھپت کرنے کے لئے بھی طیار ہیں۔

ہندوستان کے لئے یہ زیادہ نفع بخش ہے کہ وہ اپنی اشیاء کے لئے وسائر میں منڈیاں تلاش کرے۔ اور ملکی ترقی کے لئے "کافی بالذات" ہونے کی کوشش کرے جس کے لئے اسے تحفظاتی پالیسی پر عمل درآمد کرنا پڑے گا۔

غیر ممالک میں منڈیاں بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان دیگر ممالک سے باہمی تجارتی معاہدات کرے اور یہ میثاق اوٹاوہ کی موجودگی میں نہیں ہو سکتا۔

دیگر ممالک سے تجارتی معاہدات کرنے کا نتیجہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ برطانیہ سے ہندوستان کی تجارت کم ہو جائے گی۔ بلکہ وہ اپنی ضروریات اور مواد خام وغیرہ پھر بھی ہندوستان سے بآسانی خرید سکتا ہے۔

میثاق اوٹاوہ کے خلاف یہ اعتراضات بھی وارد کئے جاتے ہیں کہ ہمارے نمائندوں نے برطانیہ کو بہت کچھ دے دیا۔ اور اس کے عوض میں ہندوستان کے لئے کوئی ٹھوس چیز حاصل نہ کی، یہ معاہدہ جلدی میں کیا گیا۔ اور ٹیرف بورڈ وغیرہ کی سفارشات پر اس کی بناء نہ تھی۔

الغرض یہ معاہدہ جیسا بھی تھا میں نے موافقت اور مخالفت دونوں کی دلائل پیش کر دی ہیں۔ اب قارئین کا کام ہے کہ وہ ان دونوں کو ملاحظہ کر کے فیصلہ کریں کہ راستی پر کون فریق ہے۔

دراصل بین الاقوامی تجارت پر متعدد باتیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ہم کوئی قطعی فیصلہ ان کے اثر کے متعلق نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بھی کوئی آخری فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ اور یہی کہنے پہ مجبور ہوں کہ "دونوں طرف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے"۔

مارچ ۱۹۳۶ء میں اس معاہدہ کے اثرات کے متعلق اسمبلی میں بحث ہوئی۔ اور بالآخر فیصلہ ہوا کہ اس معاہدہ کو منسوخ کر دیا جائے۔

چنانچہ ۱۳ مئی ۱۹۳۶ء کو منسوخی کا نوٹس دے دیا گیا۔ اور چھ ماہ بعد ۱۳ نومبر ۱۹۳۶ء کو یہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ اب نیا معاہدہ زیر ترتیب ہے اس کے متعلق بھی اگر کسی فیصلہ کی ضرورت ہوگی تو مندرجہ بالا دلائل کی روشنی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ہندو ہوں نہ اے جوشؔ مسلمان ہوں میں
صد شکر نہ ظلمت ہوں نہ طوفان میں ہوں
آب و گل ہستی ہوں اور ہستی کا ہوں
نسلِ آدم سے ہوں اور انسان میں ہوں
(جوشؔ)

ملا ہے کبھی سے پیچھے مرے سب سے بیا
تمسخر کیا ہے سو وہ بھی بجا ہے بس
ان عالموں اور گرو گھنٹالوں میں بس
فرزندِ حسینی و زحیر و جبال است
(جوشؔ)

رفتار وقت

صوبہ سرحد!

صوبہ سرحد میں کانگریسی انقلاب وزارت ماہ مختتمہ کا ایک اہم باشان سیاسی حادثہ ہے۔ ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریسی دور حکومت کے قیام کے بعد یہ اُمید کافی معقول سمجھی جاتی تھی کہ اس کے آغاز کردہ فیاضانہ درعیت پرورانہ نظم ونسق کا پُر نور نظام شمسی بعض دوسرے صوبجات کے سیارات کو بھی اپنے قوی حلقۂ جذب (Orbit) میں کھینچیگا! یہ توقعات کچھ خوش‌بینی کا نتیجہ نہ تھیں۔ خود بعض معتمد اینگلو انڈین اخبارات نے ہی مبشرانہ سیاسی پیغمبری کی شان سے اپنے کو پیش کیا تھا! تاہم یہ حوصلہ وداعیہ کم لوگوں کو تھا کہ حریت وسعادت کی شعاع کا آیندہ مطلع پشاور بنے گا۔ اس کے یہ معنی بھی نہ سمجھئے کہ ہم سرحد کو کوئی ایسا بد توفیق خطۂ وطن سمجھتے تھے! حاشا وکلا! سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ پانچ چھ سال کی وطنی سیاسیات کے کارزار میں صوبہ مذکور صف اول کا موقع حاصل کرچکا ہے! لیکن جنگاہ قومیت کے اس مخصوص گوشے کی کوئی فتح اس قدر محبوب آرزو تھی — نیز بساط سیاست کے "اس نیل شتہ" خانے کے گرداگرد "فرزین" قیصریت کی شاطرانہ قلعہ بندی کچھ اس درجہ بے پناہ واقع ہوئی تھی! — کہ محض انہی وجوہ سے سارے سازگار آثار کے علی الرغم، ہم اس نعمتِ نادرہ کے نزول کے پیشگی اعلان میں اپنے کو گرفتار بیم ورجا پاتے تھے! اگرچہ اب ہم اپنی سابقہ اُمید واثق اور اس کے بر آنے پر اپنی عمیق مسرت ہر دو کا بیک وقت یوں اظہار کرتے کہ ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید!

سیاسی اُفق کے مظاہر کے علاوہ اگر کوئی لطیفۂ غیبی اس واقعۂ شگفت کے اندر کارفرما نظر آتا ہے۔ تو وہ "سرتاج سرحد" خاں عبدالغفار کی خدمات جلیلہ اور اُن کا "ایثار مردانہ" ہے جس کا شایان شان اجر سنت الٰہی نے دیا ہے بہ بفحوائے "کذالک نجزی المحسنین"!

لاریب کہ صیاد سرحد کا یہ پہلا "بڑا شکار" ہے، جو اس نے جیل‌خانہ کی "کچھار" سے نکلکر مارا ہے! آج ان کا پرچم اقبال اتنا ہی سربلند ہے جتنی کہ خود اُن کی "قامت شایانہ"! خان بلاشبہ آج "خانِ خاناں" ہے اور خان کے برادر معظم "ڈاکٹر خان" آج صوبہ سرحد کی حکومت کے وزیر اعظم بن کر "خان اعظم" نظر آتے ہیں! اللہ اللہ! ان "خدائی خدمتگاروں" کی شان مخدومی! ع

آں کہ خدمت کرد او مخدوم شد!

باخبر حلقوں کی دوسری بشارت یہ ہے کہ صوبۂ سرحد کے بعد کانگریسی سلطنت ہند" اب آسام کی آئینی تسخیر والحاق کا عزم رکھتی ہے! گویا اس طرح "ہمالے" "ہمالہ والے سنتری" کے "دونوں بازو" کانگریس کے "کمان افسر" کے اشارۂ چشم وابرو پر متحرک ہوا کریں گے! اللہم زد فزد!

کیا ہم اُمید کریں کہ سرحد اور آسام کے بعد بنگال اور پنجاب اس جلوس فتح میں شرکت کرکے ہوا خواہان وطن کو شاد کام کریں گے؟ ع

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک　　(ا-ا-سخ)

جزائر انڈیمن کے یارانِ نذال

کالے پانی کے "سیہ بخت" سیاسی قیدیوں اور جلاوطنوں کی طرف سے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی اپیل پر، اپنے "مقاطعہ جوعی" (hunger-strike) کا ترک، اور اپنے "مشرب" ہیبت انگیزی" کو خیرباد گوئی، ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کے ایک انقلابی مرحلے کا نشان

راہ سمجھی جانی چاہئے۔ بنگال میں یہ سیاسی حربہ وہاں کے "سلف صالح" کی اک مقبول سُنت کی حیثیت حاصل کر چکا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ معرکۂ حریت کے فتح مندانہ اختتام ہی پر وہ اس ہتھیار کو اپنی کمر سے کھولیں گے! ہیبت انگیزی کے دلدادگان کو اس آلہ کی فتحکاری پر پورا ایمان تھا۔ بظاہران کے دماغوں میں مِتی انقلاب کے اس فلسفے ۔۔ "اصلاح بذریعہ اسلحہ" ۔۔ کی تشکیل پذیری ایک کافی متنوع نشوونما تھی! اہم دُنیا کی سیاسی تاریخ جدید میں کم وبیش بلاناغہ اس عنصر کو کارفرما دیکھتے ہیں! خود "جدید بنگال" کی تعمیر میں اس کی تخریب کا کافی دخل پایا جاتا ہے! بایں ہمہ آج ہم ان ہی مُبارزانِ سرکف کی زبانوں سے ہیبت انگیزی کی معزولی کا اعلان سنتے ہیں۔ اور اک خاصے سیاسی حصے سے دوچار نظر آتے ہیں!

کیا بات یہ ہے کہ بنگال کا نوجوان زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ:۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

حاشا کہ نہیں!

پھر کیا وہ اس بدمست تصوف کی افیون کا لذت چشیدہ ہو گیا کہ ؎

میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جاں دارد وجانِ شیریں خوش است

یقیناً یہ بھی نہیں!

بات یہ ہے کہ ہم بعض طریقے یوں بھی اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ "بہترین" نہیں ہوتے۔ لیکن ایک وقت خاص کے تمام دوسرے مروجہ طریقوں میں "بہترین ممکن" ہوتے ہیں! مادرِ بنگال کے نوخیز سپوتوں کا زاویۂ نگاہ اپنی مزعومہ ہیبت انگیزی کے متعلق یہی تھا! جب مہاتما گاندھی نے اپنے عدم تشدد و مقاومت مجہول و متابعت قوانین مدنی کو پیش کیا تو بنگالی علمبرداران انقلاب نے اپنی مخصوص مہم کو ہنگامی طور پر معطل کر دیا تھا۔ اور گاندھی جی کے آلات کی قرار واقعی آزمائش کے لئے اک پُرسکون فضا بہم پہنچا دی تھی! اس تحریک کے محاذ نے وقتاً فوقتاً اپنے بعض رخنے دکھائے۔ لیکن حقیقۃً جزری و وقتی امید شکنیوں کے لئے "نان وائیولینس" اتنی ذمہ دار نہ تھی جتنی کہ اس تنظیم جدید کی نارسیدگی! اب عدم تشدد ہی کے جھنڈے کے سائے میں ماضی قریب کی کانگریسی جد وجہد اک نظر افروز فتح و نصرت کے مناظر سے بارور ہوئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہاں بھی کامیابی کا سہرا اس قدر عدم تشدد کے سر نہیں جس قدر کہ عام نظم و تنظیم، تعلیم و تلقین، اشاعت و دِعایت، توسیع نظام کانگریس و افتتاح مزید مراکز کار، آغاز ارتباطِ شہر و دیہات وقیام رابطۂ عوام و تالیف قلوب جمہور کے کاروبار کے سر تھا! انڈمین کے بلاکشانِ زنداں و فریفتگان "بزن و شکن" کو انہی نوظہور آخر الذکر سرگرمیوں اور کارگزاریوں نے اپنا مُرید بنایا ہے اور وہ بے تکلف ان کارناموں پر اپنی نذرِ دل پیش کر چکے ہیں اور کیوں نہ کریں! ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی!

پس جانبازانِ بنگال کا ترک و اختیارِ مسلک ہر دو نہایت مخصوص و مشروط چیزیں ہیں! یہ ہے ہماری تعبیر ان تازہ بتازہ نونمود مظاہر سیاسی کی!

بلاشبہ یہ نوجوان اپنے جدید رابطۂ کانگریس سے عدم تشدد کے التزام کو خارج نہیں کرتے، لیکن اس کی اہمیت ایک ثانوی درجہ رکھتی ہے یعنی ایک پُرامن ماحول کے بغیر خود تحریک مزدوران و کاشتکاران کی وہ پرورش و پرداخت نہیں ہو سکتی جو بالآخر ایک "غیر خونریز خاموش انقلاب" کی بشارت سُنا رہی ہے! ہر انسان اور ہر ذی الحس نوجوان کی طرح فرزندان بنگال بھی امن و سکون کے خواہاں تھے۔ لیکن جب بقول مہاتما گاندھی کے، "امن و امان" "زنانخانہ کے سکون" کے ہم معنی ہو جائے تو ہر غیور و ناشکیبا مرد وطن بادل ناخواستہ اس سے روگرداں ہو ہی جائے گا! ؎

سخن کوتہ، مرا ہم دل بتقویٰ مائل ہست اما
زننگِ زاہد افتادم بہ کافر ماجرا ئیہا! (۱۰۱۔خ)

زنجبار کا قضیہ!

زنجبار میں برطانوی استعمار اور انگریز مُلوک التجار کی دست بُرد سے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس کے عام اخباری تفصیلات سے قارئین واقف ہو چکے ہوں گے۔ آئیے اس ماجرے میں جو معنویت مُضمر ہے تھوڑا اس کا مطالعہ کریں!

زنجبار کوئی منقطع، انفرادی معاملہ نہیں ہے! حقیقۃً مغرب و مشرق

کی عام کشمکش کے کثیر التعداد اور مختلف المقام مظاہر میں سے ایک مظہر ہے! ہم قبل ازیں برما میں برمی اور ہندوستانی تجارت کی یورپین اغراض کی طرف سے اسی قسم کی گلوگیری کی نظیر دیکھ چکے ہیں! خود جنوبی افریقہ، ایشیائیوں اور خصوصًا ہندوستانیوں کے خلاف معاشی بندش و اخراج کے فتنے کا سرچشمہ بن چکا ہے! ہندوستان کے سواحل برطانوی تجارت بردار جہازی کمپنیوں کے "تباہکنوں" کے ہاتھوں نوخیز ہندوستانی جہازرانی کے بیڑے کی غرقابی خونچکاں منظر دیکھ چکے ہیں! اور اب جبکہ حال میں، بمصداق "ہر فرعونے راموسیٰ"، جاپانی تجارتی جہازات کے بجر تعداد میں، ہجوم نے خود برطانوی کمپنیوں پر سواحل ہند کی ساری وسعتوں کو تنگ کرنا شروع کیا تو اک جدید قانون کے ذریعے "بچگان" "ملکۂ بحر" (برطانیہ) کا تحفظ اسی سلسلے کی اک اور کڑی ہے! اور "کفر ترجیح سلطنت" اور "میثاق اوٹارا" تو ماشاء اللہ اس سرمایہ دارانہ "جنگ زرگری" کے ڈرامے کے معراج ہی ہیں!

یہ مظاہر کس پس پردہ حقیقت کی غمازی کرتے ہیں؟ آپ اس تشخیص کو بالکل چسپاں پائیں گے کہ یورپی معیشت عمومًا اور برطانوی تجارت خصوصًا اب دنیا کے کھلے بازار کی بین الاقوامی رزمگاہ میں میدان داری کی سکت نہیں رکھتی! اس کی زندگی و سرسبزی کے لئے "تحفظ و ترجیح کے خس پوش گملوں" کی ضرورت ہے! ساتھ ہی مشرقی تجارت و حرفت ایک حیات بعد ممات کے دور سے دوچار ہے جس کی نہضت کو دبانے کے لئے بھی مصنوعی شکنجوں کی حاجت ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ اول الذکر "مغل شہزادی" "چمچے کے تغذیئے" پر کب تک اپنی رعنائی کو قائم رکھ سکے گی؟ اور آخر الذکر نوزائیدہ "ستر کن" کی بالیدگی بر دو دش میں اس کی حیثیت صدری کب تک حائل ہو سکیگی؟ نوخیز مشرقی تجارت و حرفت کی دھارے سے کہولت زدہ و عافیت کوش مغربی معیشت اپنی خود ساختہ خلیجوں کی خلوتوں میں اب زیادہ دن تک مامون رہنے والی نہیں! ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات!

سردست بھی ہم اہل ہند اپنے کو قابل مبارکباد ہی سمجھتے ہیں! ہم اگرچہ زنجبار میں بالفعل ہار گئے ہیں۔ لیکن شملہ ہماری اک "فتح مبین" کا شاہد بنا ہے! زنجبار کی نوآبادیاتی حکومت اور "آل انڈیا مسلم لیگ" کا مین جیالی "محی و قیوم" صدر (مسٹر جناح) بیک وقت اس تماشائے سیاست میں برہنہ ہوتے ہیں! ؎

افشائے راز عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا، مان تو گیا! (ا۔ ا۔ غ)

چین و جاپان

چین اور جاپان کے درمیان جو شدید تازہ آویزش جاری ہوگئی ہے وہ بعض بالکل جدید خصوصیات سے ممتاز نظر آتی ہے۔ مثلاً چین اب کی دفعہ دبا نہیں۔ جاپان کے جانستاں مطالبات کا جواب اس نے اٹھو کو کے استرداد کے دعوے سے دیا! پھر جب جنگی کارروائی شروع ہونے کے بعد جاپان نے بزعم خویش "بزن و بگیر" والی اپنی رواں مشق کا آغاز کیا تو چین کے دست و بازو میں پہلی بار اُسے صلابت و غلظت کا احساس ہوا اگرچہ اپنے اس "انیونی ہمسائے" کے متعلق وہ اس غرور و غرے میں تھا کہ ؎

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار تم سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں!

لیکن ماضی کو مستقبل کا مستقل آئینہ دار سمجھنا اپنے غلبۂ اقتدار کو "خدائے لم یزل" کے ہمسر فرض کر لینے کے ہم معنی ہے! جاپان کا نشۂ پندار اب اسی "دیدہ بر دوختگی" کی منزل میں ہے! پسماندہ و افتادہ چین کی زبان حال کا یہ خاموش جواب جاپان کی متکبرانہ گرانگوشی مشکل سے سن سکتی تھی کہ ؎

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر!
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد!

اس میں شک نہیں کہ "گروہ چین" کے پیچھے "سرخ روس" کا سوار "اشہب دوراں" موجود ہے، لیکن یہ امر بھی اب ضرور مشتبہ ہے کہ "خاکسار جہاں" چین بدستور سابق اک "خاک پامال" ہے! گزشتہ ایک عشرۂ سنین، بیک وقت چین کی کمزوری اور قوت آفرینی کا "دور عبوری" رہا ہے! بیس سال اُدہر جو چین اک پیر فرتوت تھا، دس برس گزرے کہ ایک "طفل نوخیز" سے بدل گیا، جو طفل نوخیز آج ایک "جوان بالغ" ہے!

جو صرف یہ کہ سرخم کر کے جاپان کے چپیت کھانے کے لئے تیار نہیں بلکہ گزشتہ چہل سالہ دورِ مغلوبی و مضروبی کی ساری ضربات کا تقاضا یا وصول کرنے کا عزم رکھتا ہے! جو "افیون نوش،، چین آج اپنے فرزندوں کو افیون نوشی کی پاداش میں تختۂ دار پر کھینچ دیتا ہوا جس کے "زرد جسم" کے نصف (مغربی) حصے میں کمیونسٹ "سرخ خون" رواں ہوا اور رگوں میں دوڑتے پھرنے، کے بجائے "مرثم کہو سے ٹپک پڑنے" کے لئے بیتاب ہو! جو چین ترک افیون کے بعد ایسا دلدادہ "شراب احمر،، ہوا اسکو جنگ باز ان جاپان،، کا ایسا صیدِ زبون سمجھ لینا جیسا کہ مسٹر ہیروٹا، جاپانی وزیر خارجہ نے سمجھا ہے، سوائے اس کے کیا معنی رکھتا ہے کہ یہ ہماری نہ صرف آرزو ہے، بلکہ آثار رفتہ کی تقریبا غیر مشتبہ تشخیص، کہ چین و جاپان کا موجودہ تصادم مشرقِ بعید کی تاریخ میں ایک انقلاب کا افتتاح بننے والا ہے سہ

باضعیفاں گاہ نیروئے پلنگاں میدہند
شعلۂ شاید بروں آید ز فانوس حباب
انقلاب! انقلاب اے انقلاب	(ا۔ا۔خ)

دریاؤں کی تربیت!

چودہری مختار سنگھ صاحب، جو ہندوستان کے دیہات اور کاشتکار کی معاشی زندگی سے متعلق نہایت عرق ریزی اور قابل داد تحقیقات و تصنیفات شائع کر چکے ہیں "ملک کے دریاؤں کی تربیت،، کے ایک نادر عنوان و بحث سے وطن کے ارباب حل و عقد کو روشناس کرتے ہیں! وہ ہم کو بتاتے ہیں کہ انسانی معیشت میں ایک ایسی چیز بھی وجود رکھتی ہے جسے ہم "ندیوں کے سدھانے،، کی اصطلاحی ترکیب سے تعبیر کر سکتے ہیں! اس اجمال کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمائیے!

دریا اک ملک کی معاشی زندگی میں ایک نہایت حیات پرور عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں! وہ صحن سرزمین کے پانی کی نکاسی کی نالیاں ہیں! ہندوستان کشت زار کی آبجوئیں ہیں! حمل و نقلِ اسباب تجارت اور سیر و سفر مسافران کی کشتیوں کی سواریوں کی آبی سڑکیں ہیں! اُن کے سواحل ہماری دریائی جہاز رانی و کشتی سازی کی حرفت گاہیں، شکار ماہی کی جولانگاہیں، عالمِ آب کی سیر کے رستے، مقدس مقامات کے حرم، اور دریائی تجارت کے بنادر ہوتے ہیں!

لیکن ان عظیم خدمات کی انجام دہی سے قبل، دریاؤں کو ان فرائض کی بجا آوری کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے! یا اگر وہ قدرتہً ہی حدود آہنی کے اندر واقع ہوئے ہیں تو ان کے مزاج کے فطری اعتدال کا تحفظ رکھنا پڑتا ہے! اس لئے کہ بہت سے اسباب ہیں جو دریاؤں کے "توازنِ اخلاط" کو درہم برہم کر دیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں دریاؤں کی نگرانی سے قرار واقعی طور پر عہدہ برا ہونے کے لئے پورے "اتالیق،، بلکہ ایک پورے "مشیر طبی،، کے فن لطیف کی سی احتیاط مرعی رکھنی پڑتی ہے! چنانچہ جن طوفانی دریاؤں پر بند باندھ کر ان کی "عناں گیری" کر لی جاتی ہے، اس پابہ زنجیر حالت میں بھی اُن کی زنجیر شکنی کی تگ و دو کا بڑی نظر بازی سے مشاہدہ و مطالعہ کیا جاتا رہتا ہے! دریائی انجینرنگ کے اس شعبے کا نگراں کار افسر دریا کا "نبّاض" (ulse feeler ?) کہلاتا ہے! الغرض دریاؤں کا معاملہ بڑا نازک واقع ہوا ہے۔ قدیم غیر سائنٹفک زمانے میں دریاؤں کے معاملے میں ہمارا "مبدم بامن دہر نخط گریزاں ازمن،، والا معاملہ اس سے زیادہ ارتقا یافتہ نہ تھا کہ سہ

بدریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت برکنار است!

لیکن آج صحراؤں میں رینگنے اور پھنکارنے والے ان مہیب اژدہوں، کو "کیل" دیا گیا ہے اور اب عموماً "فطرت کے یہ خادم" مطلق العنان آقا" نہیں بنا کرتے! تاہم دنیا کے متعدد غیر ترقی یافتہ ملک اس کلیہ کے افسوسناک مستثنیات بنے ہوئے ہیں! — از انجملہ ایک ہندوستان ہے!

دریاؤں کی عظیم تعمیر، نیز اُن کی قاہر تخریب، مادرِ ارض کے جغرافیہ و تاریخ کے روشناس عالم مناظر اور شہرہ آفاق حوادث ہیں، مصر یا وادی نیل، یکسر دریائے نیل کی قدرتہً منظم و منضبط سالانہ (باراں نما!) طغیانیوں کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ چنانچہ وہ بجا طور پر "عطیۂ نیل" کہلاتا ہے! اور خود یہ مجازی پروردگار مصر "سقائے نیل،،! سعدی شیرازی کا یہ شعر قابل نقل ہے سہ

چنیں یاد دارم کہ "سقائے نیل"	نکرد آب بر مصر سالے سبیل

بہشتِ شداد" اورؔ نوشیروانی بغداد" وجلہ و فرآت کے "بین النہرین" کی آغوش مادری پدری کے نونہالان تمدن تھے! "ہندوستان جنت نشان"، کا جغرافیائی نام ہی "وادیٔ گنگ کا عمران" ہے! عظیم چین کی "بہشتی مملکت" دریائے یانگزی کی "ارضی کشت" ہے! وسطی یورپ کا ڈینیوب، قلب روس کا والگا، امریکہ کا سیسیپی، کناڈا اور ریاستہائے متحدہ کا مشترکہ دریائے سینٹ لارنس وغیرہ، مشرق و مغرب کی نوآبادیوں تجارتوں، حرفتوں، اور تمدنوں کے نامور مرکز و ظرف ہیں!

تاہم تصویر کا دوسرا (تاریک) رخ بھی موجود ہے! ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ شمالی چین کے دریا سے ہوانگ ہو کو لیجئے۔ جس کی وارستگی "تباہ کاری کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے جوش جنون کے دوروں کے وقت پان پان سو میل اپنے دھارے اور راستے کو بدل دیا کرتا ہے! ایک بحیرے کو چھوڑ کر دوسری خلیج میں جاکر بحر اعظم سے ملاقی ہوتا ہے! اور اپنی ان عالم آشوب آوارگیوں کے نتیجے میں "چین کا عذاب" کہلاتا ہے!

ہندوستان کی ندیوں، کی چال ڈھال بھی ایک عرصے سے بگڑی ہوئی ہے! یہ برٹش راج کی "سبز قدمی"، کے کچھ قدم بقدم رہی ہے! بنگال کے مانسونی سیلاب وہاں کا سالانہ باضابطہ نیچرکا پروگرام بن گئے ہیں! ہر برسات بنگالے کے اہل دیہات کے لئے اک "بارانِ زحمت"، لاتی ہے! یہ کیا ستم ظریفی ہے؟!

ماہرین کا بیان ہے کہ یہ آفتِ سماوی دراصل اک "آفتِ ارضی" ہے۔ بنگال اور دوسرے اقطاعِ ملک کے دریاؤں کے راستوں کے اُتار چڑھاؤ کو سرکاری سڑکیں، نہریں، ریلیں، پُل، اور پشتے وغیرہ بنانے والے! انجنیروں نے تہ و بالا کر دیا ہے اور یہی گندہ مگر ایجاد بندہ" سرگرمیاں زرعی بنگال کی اک ہمہ گیر، لاتناہی مصیبتیں بن گئی ہیں! بعض خطوں میں جنگلوں کی بے اصول و لاابالی قطع و برید نے بھی طوفان کی رسّی ڈھیلی کر دی ہے! یہ تباہیاں فصلوں کی خرابی، انسان و مواشی کی غرقابی، دیہات کی دریا بُردی وغیرہ ہی پر محدود نہیں ہیں، وہ بکثرت اوقات زمین کو زراعتی صلاحیتوں سے بھی مستقلاً عاری کر دیتی ہیں!

حسب تجویز چودہری مختار سنگھ صاحب، ضرورت ہے کہ، ترجیحاً کانگریسی وزارتوں کے دورِ مسعود ہی میں "اک مقتدر کمیٹی ماہرین کی مامور کی جائے کہ وہ عین موسم باراں میں ایک قرار واقعی فنی تحقیقات ہمارے شتر بے مہار دریاؤں پر انجام دے، انہیں تخریبی عناصر فطرت کے بجائے تعمیری سرچشمہائے معیشت میں تبدیل کروا دے۔ انہیں ندیوں کی مزید نگرانی و صفائی وغیرہ کے ذریعہ اُنہیں عہد حاضر کے "لانچوں" کی گردش کے قابل بنائے، اور اس طرح ہمارے اک قدیم ذریعہ حمل و نقل اور وسیلہ سفر و خبر کو ازسر نو زندہ کرے، اور ہمارے دریاؤں کے سواحل پر آباد شہروں کو اُن کی سابقہ تجارتی و حرفتی سرسبزی پر بحال کرے، نیز ہندوستانی تمدن و مذہب کے ان مراکز کو اُن کی عظمت رفتہ واپس دلائے! ۵

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں! (ا-ا-ع)

بحر الروم کا میدان حشر

بحر الروم، جو اپنے انگریزی جغرافیائی نام میں "میڈی ٹرینیئن سی"، (بحر متوسط") کہلاتا ہے، اس وقت یورپین سیاست کے مرکز ثقل بنجانے کی وجہ سے تاریخاً بھی اہم بامعنی ہو گیا ہے! ایطالیہ کی فوج کشی و فتح حبش، برطانیہ کے لئے جس علت خاص کی بنا پر اہم و موجب فکر تھی، اسمیں شاہ نجاشی" — ہیل سیلاسی (دُہول تثلیث") — کی دوستی و ہمدردی تو محض اک مفت کرم داشتن ہی تھی، لیکن مطلب سعدی،" یہ تھا کہ بحر الروم، جو برطانوی "سلطنتِ ماورائے بحر"، کو انگلستان کے سر سلطنت سے پیوستہ کرنے والے خطوطِ مواصلات کی "شہرگ"، کی گردن واقع ہوا ہے، اس کے امن و تسلط پر بحیرۂ احمر کے تقویت یافتہ ایطالوی مراکز بحری کی طرف سے شہ پڑتی تھی! بدقسمتی یہ ہے کہ یہ شہ اب "ملکہ بحر"، (برطانیہ عظمیٰ) کے لئے "شہ مات"، بنا چاہتی ہے! بحر الروم میں اٹلی نے اپنی جنگی طاقت کو آناً فاناً المضاعف کر لیا ہے۔ آج مسولینی جو اپنے کو جولیس سیزر کا بیسویں صدی والا اوتار سمجھتا ہے، بحر الروم کو لفظاً و معناً "بحر الروم"، بنا لینے پر مُصر ہے! وہ کہتا ہے کہ انگلستان

کی بحری تجارت کو اس بین الاقوامی آبی شاہراہ سے گزرنے کا اخلاقی حق بلا شبہ حاصل ہے، لیکن سیاسی اقتدار اور حربی تسلط کے اعتبار سے بحرالروم نوظہور سلطنت "رومتہ الکبریٰ"، کے باب عالی کا "پیش دروازہ" ہی ہے! جدید "عظیم تر ایطالیہ" اپنے اس حوصلے کو عملی عزائم کی بہت سی منزلیں طے کرا چکا ہے! اس نے ہسپانوی مراکش کے نقطہ سیوٹا پر اپنا پرچم اثر گاڑ دیا ہے، جو آبنائے جبل الطارق والے بالمقابل تہنام بحری مستقر کے ہاتھ سے بحر متوسط کی کلید "چھین چکا ہے"، اسپینی جزائر بلیارک اور ایطالوی "الجزائر"، کے سواحل کے قریب کے اک اور نو قلعہ بند جزیرے کے قبضہ کے ذریعے "برطانوی مالٹا" سے اس کا سارا طلسم سلب کر چکا ہے! پھر مشرقی بحرالروم کے گوشے میں جزیرہ رھوڈز کی بحری تعمیر و استحکام کی معرفت ترص و اسکندریہ وغیرہ کو چیلنج کر رہا ہے اور پھر بحر متوسط کی وسیع عربی دنیا میں "ناصر الاسلام" بنکر برطانیہ کے کبھی کے ابلہ فریب دعوے دربارہ "عظیم ترین اسلامی دولت"، کے سحر کا ردِ سحر کر چکا ہے! جس کے افسون کی تکرار نے ابھی تک مصر، شام، اور فلسطین کو کم از کم نصف آزاد کرا دیا ہے۔ اور اب الجزائر و مراکش و ٹیونس کے فرانسیسی و ہسپانوی "زندانوں"، کے اندر نوخیز عرب تحریکاتِ حریت کا "جنون" پیہم زنجیر در کھڑکا رہا ہے!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ برہم زن "انقلاب یوروپ"، ناگہاں کیسے برپا ہو گیا؟ شیر انگلستان کو کیا ہو گیا، جو "بادرچی ایطالویوں" کی بیباک چٹکیوں سے اپنی مونچھیں اینٹھوانے پر بقول اخباراتِ مسولینی، گرجنا ایک طرف، چھینکتا تک نہیں!" یورپ کی کھڑڈ کلاس "طاقت"، "اٹلی" آج "عظیم روم" کی نہضت کا محیر العقول کرشمہ کیسے دکھا رہی ہے! بے پناہ جرمنی کا سر کچل دینے والا فرانس، ہیچمیرز ایطالیہ سے کیوں لرزہ براندام ہے!

دراصل یہ انقلابی حوادث اس قدر "انقلابی"، نہیں جس قدر کہ نظر آتے ہیں! حیرت و ناگہانیت کے مظہر یہ واقعات نہیں، ہماری بیخبری و گمراں گوشی ہے! "پس پردہ"، کتنی "بازیہائے پنہاں"، ہوتی ہیں جو عرصے سے پرورش پاتی رہتی ہیں اور ہم اُن کے بے نقاب بروز کو اُن کا اولین ظہور کہنے کی لغزشِ زبان میں گرفتار ہو جاتے ہیں!

برطانیہ عظمیٰ پر مدت سے ایک دورِ کہولت اور سن شیخوخت طاری ہے۔ جرمنی و اٹلی گزشتہ نصف صدی سے نوجوانی کا لنگر لنگوٹ کس رہے ہیں! جاپان نہ معلوم کب سے مشرق کی فتح کا پرچم اڑا رہا ہے! امریکہ "ملکہ بحر"، کی شہ نشین سے قبل ازیں انگلستان کو معزول کر چکا ہے! اور پھر شاید "سرخ روس"، تو محفل عالم میں ایک نو بنو تمدنِ بشری کی دعوت لئے ہوئے، مسند نشین مجلس بن چکا ہے! ترکی کی "ترکی تمام"، ہو جانے کے بعد قسطنطنیہ کا مرد بیمار کبھی کا "انقرہ کا مرد قوی" بن چکا ہے! اور یہاں سرزمین ہند و چین پر جو مناظر مدہشہ دیکھنے میں آتے ہیں ان کا عنوان جلی یہ ہے کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے!
"ہمالہ کے چشمے" اُبلنے لگے!

پس یہ ہم اہل ہند کا خواب خرگوش ہی ہے کہ ہم دنیا کو غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے ساکن سمجھ چکے ہیں! بقول مسولینی کے "تاریخ عالم چلتے چلتے رُک نہیں گئی ہے!" اور "انگریز لوگ خدانخواستہ خاتم الاقوام نہیں ہیں!!"، ایسی خوش فہمیوں میں انسان اس سے پہلے بھی مبتلا رہا ہے! لیکن بالفاظ "خضر مشرق"، شیخ سعدی کے دریائے دجلہ بدستور ع

پس از خلیفہ بخواہد گزشت در بغداد!

لوح تقدیر کبھی کی بے نقاب ہو چکی ہے! اب یہ ایک راز فاش ہے کہ انگلستان و فرانس کے بعد براعظم یوروپ کی کاروان سالاری جرمنی و اٹلی کو حاصل ہونے والی ہے! سوویٹ روس غالباً ایک نیم مغربی اور نیم مشرقی طاقت کی حیثیت سے اپنے ایک جداگانہ منصب پر قابض رہیگا، اور ہٹلر و مسولینی اپنے عارضی تخریبی دورِ عبوری کے خاتمے اور براعظم کے میدان کے تخلئے کے بعد شاید روس کے "پرو لتاری عمران"، کے جلوس رواں کے لئے سڑک صاف کرنے والے ثابت ہوں گے! جدید العہد جرمن اور ایطالوی ہماری ہندوستان کی تاریخ سابق کے "مرہٹے اور سکھ" بنتے نظر آتے ہیں!، در آنحالیکہ "برطانیہ عظمیٰ"، بادشاہ بجز عالمگیر کے بعد کی سلطنتِ

مغنیہ" کے تاریخی ڈرامے کے پارٹ کو کھیلنے والی ہے! جرمنی کا "نازی ازم" اور اٹلی کا "فاسیزم" اس وقت کے مہاراشٹر اور پنجاب کی "قزاقی جنگ" کا عین تاریخی مثنیٰ نظر آتا ہے! شاید موجودہ روس اُس وقت کے انگلستان کی تاریخ کو دہرائے! اور اِن "دوسرے اور تیسرے درجے کے تمام تباہکن عناصر" سے مطلع صاف کراکے ایک بشری تہذیب کے آفتاب جہاں تاب کے مطلع الانوار کی جلوہ گاہ بنے! اس سے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ، دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی!

(ا-ا-خ)

نقد و نظر

(ادارہ)

"نیساں" الہ آباد یونیورسٹی اُردو ایسوسی ایشن کا رسالہ قامت کتابی، ضخامت ۹۶ صفحات، ورق ٹائٹل، فیروزی، چرم نما کاغذ کا، قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ،

نیساں اک درجۂ اوّل کا علمی و ادبی و تنقیدی مجلہ ہے۔ جو مغز سیرت کے ساتھ ساتھ نقاب صورت بھی دیدہ زیب رکھتا ہے! چنانچہ کاغذ و کتابت و طباعت اور مضامین و مقالات کی معنویت سب عموماً بلند پایہ واقع ہوئی ہیں! تاہم ہمیں یہ کوئی "بدعت حسنہ" نظر نہ آئی کہ رسالے میں اگرچہ "جلد" ہے "شمارہ" ہے، سنہ (۱۹۳۶ء) ہے، لیکن "مہینا" ہی نہیں ہے! کیا "تا تب مدیران" کی طویل فہرست، کا "سلسلۃ الذہب" اس پر کچھ روشنی ڈالے گا؟ ایک اور ستم ظریفی یہ دیکھی کہ فہرست مضامین کی نظم — "ہم کون ہیں؟" — از پروفیسر فراق، اصل متن سے غائب ہے! وائے حسرت کہ "ہم کون ہیں" اس میں گم ہوکر رہ گیا کہ "ہم کہاں ہیں؟" "ادبی رسوم و قیود اور ذہنی انقلاب" اور "جدید اردو شاعری" اہم مقالات ہیں! نیساں "اُردو مُوقت ادبیات" میں ایک مُعزز نشست رکھتا ہے!

(ا-ا-خ)

ماہنامہ "ہندوستانی" عام رسالجاتی سائز، ضخامت ۵۰ صفحات کاغذ و کتابت و طباعت درجہ دوم کی۔ مع ایک تصویر آرٹ پیپر پر، چندہ ہے، پتہ عزیز منزل مُراد آباد

ایک اوسط درجے اور متعارف قسم کا "علمی، ادبی، ماہوار" رسالہ ہے، جو جناب رشید کمالی ایم-اے کی چیف اڈیٹری میں اور سر محمد یعقوب، ایم ایل اے کی "سرپرستی" میں نکلا ہے! ع

ہوئے تم دوست جسکے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

ہم بصد ادب جناب رشید کمالی صاحب کی خدمت میں عرض کرینگے کہ اخلاقی رُشد و ہدایت اور فنی تکمیل و کمال، نیز ادبی پاکیزگی دہلوی سب کا متفقہ، ناقابل رجوع مطالبہ یہ ہے کہ ہم "سروں کی سرپرستیوں" کے سایۂ ہما سے بے نیاز ہو جائیں! اس سے

ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر — ندامت کہ دریں دامگہ چہ اُفتادست!

رسالے کے دو مجوزہ شعبوں "باغ نسواں" و "شاخ سبز" سے ہم و مقدم ہندوستانی کو ایک "بیخ حقیقت اور تنۂ استقامت" کی ضرورت ہے! ہمارے نزدیک ادب انسان کی ارضی شریعت کا دوسرا نام ہے جس کا مہبطِ وحی خود اُس کا طورِ دل ہے! بہرحال رسالہ مستحق ہمت افزائی ہے!

(ا-ا-خ)

"اقدام" ایک نو اشاعت ہفتہ وار اخبار از کوہاٹ قامت درمیانہ ضخامت ۸ صفحات، مدیر خیر محمد جلالی، چندہ سالانہ للعہ قیمت فی پرچہ ار

مادی بے سروسامانی جو اعلان حق کی آواز کے ابتدائی مراحل کے شامل حال ہوا کرتی ہے، اس ہمعصر کی ساری صورت پر برستی ہے لیکن اس ابر غربت کے نیچے سے حق و حریت کی برقِ خاطف بے طرح تڑپتی ہے۔ چنانچہ اخبار کا خوش

عنوان سرنامہ یہ ہے سے

کیجئے نا رندو یہ بسر یونہی زندگی   اُٹھئے، اور اُٹھ کے اب کوئی اقدام کیجئے!

سرحد کے علاقے کے عوام و کاشتکاران کے ایک مجوزہ جلسے کے اشتہار کا

کا عنوان "جلی و جلالی" یوں ہے۔

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!!!

جس کھیت سے دہقاں میسر نہیں دانہ   اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو!

"مولویت اور اسلام" ایک پمفلٹ نما کتابچہ، از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی قیمت ۴؍ ، "چودہویں صدی کی مولویت - بخلاف صدر اول کے اسلام محمدی کے" اسے پر چۂ "علیہ ماعلیہ" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے! یہ موضوع مقدس تو ماشاء اللہ شیخ کی "ریش دراز" ہی کے ہم طوالت واقع ہوا ہے لیکن کتاب کی "قامت کہتر" کی تلافی اسکے "لہجۂ تلخ تر" نے کردی ہے جسمیں مولوی کا ناگفتہ بہ اعمالنامہ اشگاف بیان کیا گیا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں خیال ہوا کرتا ہے کہ مولوی پر یہ لعن وطعن شاید قرین مصلحت نہیں اس سے مقاصد تبلیغ و اصلاح فوت ہو جاتے ہیں! لیکن یہ واہمہ دوسرے ہی لمحے ہمارے دماغ سے رخصت ہو جایا کرتا ہے یہاں اس مولویت و مشیخیت کے مرض مزمن کو قابل علاج سمجھنا ہی "یکسر غلط تشخیص" ہے!

پس جرعہ دوا کے "خوش ذائقہ" ہونیکا سوال ہی خارج از بحث ہے! "مریضہ مولویت" کو ہمیں نوشدارو کے گلاس کے بجائے جام زہر پلانا ہے - پس اسلام کے ان "احبار و رہبان" خلاف جہاد کرنے میں جتنی شدت برتی جائے اتنی ہی مقتضائے حال کے مطابق ہے! ہمارا معاملہ مریض کے "جسم" سے نہیں ہے، اسکے "جراثیم" سے ہے! زیر تنقید کتاب کی تالیف و ترتیب میں غالبًا یہی "پس منظر" ملحوظ رکھا گیا ہے! قرن اول کا اسلام مولوی کی زندگی میں جیسا مجروح و مسخ کیا گیا ہے اسکو "آخر الزماں" کے "مفاسد و فتن" سے متعلق چند احادیث نبوی ہی کے آئینے میں منظر کر کے دکھا گیا ہے! مثلاً:۔

(۱) وَيْلٌ لِاُمَّتِيْ مِنْ عُلَمَاءِ سُوْءٍ   افسوس میری امت کی درگت علماء سوء کے ہاتھوں!

(۲) يَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ عِبَادٌ جُهَّالٌ وَعُلَمَاءُ فَسَقَة   جاہل نمازی اور بدکار عالم امت کے دور آخر کی دو لعنتیں ہوں گی!

(۳) عُلَمَاءُهُمْ اَشَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ!   ان کے عالم آسمان کی سقف نیلی فام کے نیچے سیاہ کار ترین مخلوق ہوں گے!

(۴) يُوْشِكُ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ!   مجھے خوف ہے کہ تم پر ایسا بھی اس زمانہ آنے والا ہے کہ پیام قرآن کے بجائے صرف ایک رسم تلاوت، اور حقیقت اسلام کے بدلے میں محض ایک اسم اسلام ہی کا تبرک باقی رہ جائے گا!!

حیف گر در پس امروز بود فردا ئے!   (ا-ا-غ)

"انکشاف موسیقی" حصہ اول چھوٹی کتابی قامت ۵۶ صفحہ ضخامت، کتابت طباعت و کاغذ بدرجہ اوسط قیمت ۱۲؍ آنہ مصنفہ جناب ایس آر چاند صاحب

انکشاف موسیقی میں (صدیا العہد) موسیقی ہند کے ہر اصول پر عالمانہ بحث و تنقید کی گئی ہے اور اس کو غلط ثابت کیا گیا ہے! اس اعتبار سے یہ کتابچہ بظاہر اپنی نوعیت کی سب سے پہلی کتاب ہی معلوم ہوتی ہے! ہماری قوم میں بیباک تنقید اور آزاد اجتہاد ایک قصہ ماضی ہو چکے ہیں، اسلئے اگر کوئی دل یا دماغ اس جوہر نادر کا ثبوت دے محض اس مردانہ اقدام کی بنا پر وہ خیر مقدم کا مستحق ہے! ہماری یہ جرأت رندانہ اپنے اندر صحت خود پیدا کر یگی بشرطیکہ ہم سائنٹفک مزاج کے اخلاص سے خالی نہوں سے

مباش اے رہ نوردِ عشق غافل از تپیدنہا   کہ در آخر بجائے میرسد از خود رسیدنہا!

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہم اس کتاب پر صرف اک عامی ہی کی حیثیت سے کچھ لب کشائی کر سکتے ہیں اس لئے ہمارے اظہار خیال کو مروجہ موسیقی ہند کی اس تنقید کی تنقید سمجھنا بالکل بے محل بات ہوگی! لیکن اگر ہماری فہم عامی اور زیر نظر کتاب کا عام رواں بیان اور خروش منطق استدلال کسی حد تک بنیاد فیصلہ سمجھا جا سکتا ہے تو یہ کتاب ملک کے فنی حلقوں میں با احترام پذیرائی کی حقدار سمجھی جا سکتی ہے۔

تفصیلات میں جانا نہ ممکن ہے نہ مطلوب، صرف یہ جامع ماحصل کافی سمجھئے کہ اس کتابچے میں ہندوستان کی قدیم موسیقی اور رائج الوقت گانے بجانے کے دریا ایک تقابل کیا ہے اور اہل نظر کو دعوت دی گئی ہے کہ ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا؟!

جناب چاند صاحب مجتہدانہ جرأت اور انسانی اعتراف بشریت کے جامع معلوم ہوتے ہیں دل اور دماغ کا یہ بڑا مبارک امتزاج ہے چنانچہ وہ اپنے الفاظ میں بار بار اس دعوت کی تکرار کرتے ہیں کہ ؎

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے!   (ا-ا-غ)

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی

چار پرانی تصانیف

حضرت جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے لیکن ان کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ انہیں شائع کرتے اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گذریں تو مناسب معلوم ہوا کہ ان کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کر کے انھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے

(۱) **جذباتِ فطرت** } حضرت جوش کی وہ معرکۃ آرا نظم ہے جس میں مظاہر قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کردیں قیمت ۴ر رعایتی ار

(۲) **اوراقِ سحر** } یہ حضرت جوش کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں قیمت ۵ر رعایتی ۲ر

(۳) **آوازۂ حق** } یعنی معرکۂ تسلیم و رضا سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو اور جنگ حق و باطل کے سب سے بڑے حسین ابن علیؑ کے خون ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ ہے قیمت ۸ر رعایتی ۳ر

(۴) **مقالاتِ زرّیں** } یہ حضرت جوش کے نادر کلمات، فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطائف کا دلچسپ اور کارآمد مجموعہ ہے قیمت ۱۱ر رعایتی ۴ر

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۲ر وی پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیجکر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ:- **مینیجر کلیم بک ڈپو۔ جنتی نواس نمبر ۴۰ دریا گنج دہلی**

قابل توجہ ناظرین رسالہ کلیم

رسالہ کلیم کی ترقی و فلاح کا دارومدار آپ کی توجہ پر مبنی ہے لہذا ہر قسم کی خرید کتب کے لئے

کلیم بک ڈپو دہلی

کو ضرور یاد رکھئے کیونکہ بک ڈپو نہایت کم منافع پر کتابیں فروخت کرتا ہے

یہ بھی ظاہر کرنا ضروری ہے کہ بک ڈپو کی آمدنی سے کلیم کے نقصان کی تلافی ہی نہیں بلکہ اسکی خوبیوں میں اضافہ یقینی ہے (منیجر کلیم)

[redacted]

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے



بہترین خوشبو منتخب کرسکوں، تعمیلِ حکم کے لئے فردوس
شمال کشمیر جنت نظیر سوئزرلینڈ، شباب انگیز عثمانیہ کے گلپاش
مرغزاروں میں گل چینی کی گئی، جب سب پھول دُور دراز
سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی
خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مُرجھائے ہوئے تھے،
کہ مہارانی کی حُسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس
خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی، کھانا پینا ترک
کردیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور وزراء سے مشورہ طلب کیا،

مہتمم توشہ خانہ نے **اصغر علی محمد علی** سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شبابِ رفتہ

ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

REG. NO. 5694. L.

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

کی

تازہ ترین تصنیف

جُنون و حِکمت

یعنی

چار سو کی مجموعۂ رُباعیات ہے

رُباعی، تمام اصنافِ سُخن میں وہ تہا رنگین عمیق اور فلسفیانہ صنف ہے، جو عظیم شعرا کی مشاقی کے نقطۂ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے، اور کسی شاعر کو اس وقت تک حقیقی رُباعی گو شاعر کا پُر شکوہ خطاب نہیں مل سکتا جب تک کہ اُس کی بے پناہ جنون پرور تخئیلی قوت بلند ہوتے ہوتے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہمدوش نہیں ہو جاتی۔ بدبخت ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رُباعی بھی ہرچہ گیر دعلتی علت شود کے زمرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے۔ یارانِ طریقت نے بزعم خود، یہ سمجھ رکھا ہے کہ رباعی نام ہے رُباعی کی بحروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا، اور بس —— حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رباعی شاعرانہ مطالعے، شاعرانہ تفکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینیٔ خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی بھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔

اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تمنا پیدا ہوئی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوا ہوتا تو آپ کا یہ اوّلین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں جنون وحکمت کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاض قدرت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں بھی ایک خیام پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اُس کی قدر نہ فرمائیں —— آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک "فیٹز جیرلڈ" مل گیا تھا جس نے اُسے ایک زندہ قوم سے روشناس کرا دیا تھا، لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مردہ اور غلام ہے، اور غلامی کو صرف یہی نہیں کہ کوئی "فیٹز جیرلڈ" نہیں پیدا کرتا، بلکہ خود اُس کی قوم بھی اُس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے طیار نہیں ہوا کرتی۔

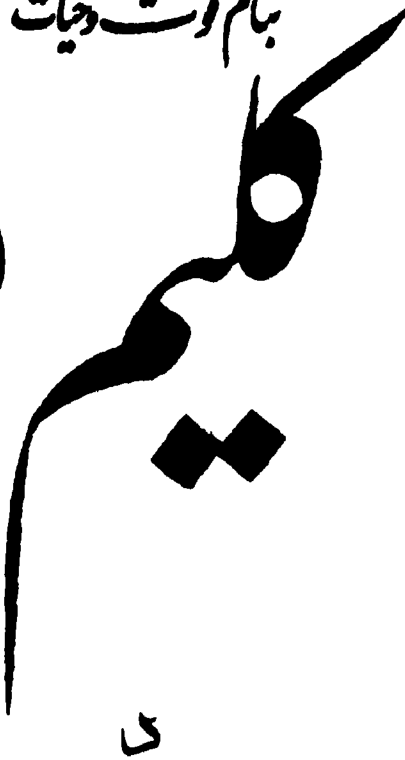
جنون وحکمت مندرجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے۔ (۱) معارف (۲) خرابات (۳) حسن و عشق (۴) پیرانِ سالوس (۵) متفرقات۔

قیمت صرف تین روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

منیجر کلیم بک ڈپو، جلیبی نواسے، دریا گنج دہلی

بنام قوت وحیات





دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا	آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم	بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے

ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ

قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۴ — فہرست مضامین بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۷ء — نمبر ۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ	نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	جوش ملیح آبادی	۲۷۴	۱۴	انسانی فرائض کے متعلق جوزف مینزنی	جناب سید اختر علی صاحب تلہری	۳۱۵
۲	پروپیگنڈا (نظم)	جوش ملیح آبادی	۲۸۰	۱۵	مولوی	مولوی شناس	۳۲۲
۳	انسانی زندگی اور اس کی دوامیت	ناظر	۲۸۱	۱۶	تلاش حیات (نظم)	جناب نعیم صاحب صدیقی	۳۲۷
۴	نعرۂ بغاوت	جناب ضیاء الدین احمد صاحب تلہری	۲۸۶	۱۷	باغی	جناب منظر صاحب انصاری بی اے (آنرز)	۳۲۸
۵	انسانیت سے ارفع و اعلیٰ کوئی مذہب نہیں	جناب محمد خلیق ابراہیم صاحب لکھنوی	۲۸۷	۱۸	جاپان کے کسان	جناب محمد ہاشم صاحب مولیدینا میونسپل کونسلر پونہ	۳۳۲
۶	اپنے بچے سے آخری باتیں (نظم)	جناب سید علی اختر صاحب اختر حیدرآباد دکن	۲۹۸	۱۹	عمر و جبل (رباعیات)	جوش ملیح آبادی	۳۳۵
۷	تحقیق اصلاح	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار	۳۰۱	۲۰	ماں	جناب مسعود حسن صاحب شمسی، داناپوری (انگلستان بینوری)	۳۳۶
۸	نعرۂ حریت (نظم)	جناب صبا صاحب اکبری	۳۰۳	۲۱	شعر مرا بمدرسہ کہ برد؟	جناب نواب جعفر علی خانصاحب اثر لکھنوی	۳۳۸ ✓
۹	ڈپٹی صاحب	جناب اختر انصاری صاحب دہلوی بی اے آنرز	۳۰۴	۲۲	منزل مقصود	جناب صادق حسین صاحب کنبہ	۳۴۱
۱۰	انقلاب	جناب وجاہت صاحب سندیلوی بی اے	۳۱۰	۲۳	خطر رفتار (نظم)	جوش ملیح آبادی	۳۴۴
۱۱	"عشق" اور "وطن" (نظم)	جناب مشتاق احمد صاحب شارق	۳۱۱	۲۴	رفتار وقت	ادارۂ کلیم	۳۴۵
۱۲	دین و ملت کو سلام (نظم)	جناب سنکیش صاحب اکبرآبادی	۳۱۲	۲۵	اشارۂ مشیت (نظم)	جوش ملیح آبادی	۳۴۹
۱۳	پنچھی کی آزادی	جناب محمد عبدالکریم صاحب آزاد (شرقی)	۳۱۳	۲۶	نقد و نظر	ادارۂ کلیم	۳۵۰

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم جینتی نواس نمبر ۱ دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مُدیر

عبرتناک ذہنیت اور خطرناک انجام

ریاست ٹونک کے (یادگارِ خلیل) کلب میں ریڈیو، دہلی کا پروگرام سُن رہا تھا، کہ ایک سیاہ فام دیسی عیسائی صاحب، چار عدد لڑکیوں کے ساتھ، جن پر مغربی طرز کی دیدہ دلیرانہ اور مشتبہ قسم کی انگریزی دوشیزگی برس رہی تھی، ہال میں تشریف لائے، اور ایک طرف بیٹھکر گانا سننے لگے، — لیکن اُن کی صاحبیت دیر تک ہندوستانی موسیقی کو برداشت نہ کرسکی، اور اُنھوں نے مغربی موسیقی کی طرف ریڈیو کا مُنہ پھیر دیا — جس کا سامعہ خراش نتیجہ یہ ہوا کہ کلب کا ہال، ناتراشیدہ پتھروں کے انبار کے اندر گونجتے ہوئے بے تکُے شور و غل سے، جسے مغربی موسیقی کہا جاتا ہے۔ بُری طرح کراہنے اور کراہتے کراہتے بھونکنے لگا اور جس سے ہم لوگ تو سخت بے کیف ہوئے، لیکن اُن عیسائی صاحب کے ساتھ آئی ہوئی لڑکیاں کیف کا اظہار کرنے کی خاطر پاؤں ہلا ہلا کر تال دینے لگیں —

جب میں نے ان صاحبزادیوں کا یہ عالم دیکھا تو تن بدن میں آگ لگ گئی، اور میرے دل نے مجھ سے کہا یہ کیسی چھچھوری لڑکیاں ہیں۔

اتنے میں میرے دوست ملک مجید صاحب نے مجھ سے باہر چل کر بیٹھنے کو کہا، اور میں فوراً اِس انداز سے اُٹھ کھڑا ہوا جس سے عیسائیوں پر یہ ثابت ہوگیا کہ میں اُن کی صحبت سے اُٹھ جانے کا کس قدر آرزومند تھا۔

اور چلتے چلاتے میں نے اُن لڑکیوں میں سے ایک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو نسبتہً ملاحت آمیز دلکشی رکھتی تھی، غیر ملفوظ طور سے یہ کہہ دیا کہ میں اُن کی مغربی وضع سے بے انتہا نافر ہوں۔

میں نے اظہارِ نفرت کے لئے اُن میں نسبتہً دلکش لڑکی ہی کو کیوں منتخب کیا، اس کا جواب میرے پاس کچھ نہیں، ممکن ہے کوئی نفسیاتِ بشر کا ماہر اِس کی توجیہہ کرسکے۔

یہ واضح رہے کہ یہ عیسائی صاحب، اور اُن کے ساتھ کی لڑکیاں، ان میں کوئی اینگلو انڈین بھی نہ تھا، بلکہ سب کے سب ہندی، اور ٹھیٹ ہندی تھے۔ اور ہم میں اُن میں صرف اتنا ذرا سا فرق تھا کہ اُنھوں نے بدیسی مذہب اختیار کرلیا تھا، اور چالاک و سیاسی گندم نما جو فروش پادریوں کے "جیسز س کرائیسٹ" پر ایمان لاچکے تھے — اِس کے علاوہ ہم میں اُن میں بال برابر بھی کوئی فرق نہ تھا۔ فرق ہو بھی کیونکر سکتا ہے، کیونکہ ہم سب ایک ہی ملک کے باشندے، اور ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ لیکن چونکہ وہ دیسی عیسائی، "صاحب لوگوں" کا مذہب اختیار کرکے اپنے نزدیک ہم سے نہایت ارفع و بلند ہوچکے تھے، اِس بنا پر وہ ہندوستانی موسیقی سے لُطف اندوز ہونے کے ننگ کو کیونکر گوارا فرما سکتے تھے۔

یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مذہب کے تبدیل ہوجانے سے قومیت کیونکر تبدیل ہوجاتی ہے۔

مذہب تو نام ہے تبدیلیٔ عقائد کا — تبدیلیٔ عقائد سے تبدیلیٔ نسل

وطن کا امکان کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

اگر آج میں چینی یا جاپانی مذہب اختیار کر لوں تو کیا میں اپنے نسلی مزاج اور وطنی خصوصیات سے قطعی مُعرّا ہو کر چینی یا جاپانی قوم کا فرد بنجاؤنگا۔ اور میری سرشت و فطرت، نیز شکل و صورت بھی وہی ہو جائے گی جو چینیوں یا جاپانیوں کی ہوتی ہے؟

لیکن بات یہ نہیں ہے — اس کے اندر ایک اور ہی تلخ راز ہے۔ اور وہ تلخ راز ہے ہماری ذلت و خواری، ہماری غلامی و محکومی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ہمارے بھائیوں میں سے کوئی "شاہی مذہب و معاشرت" اختیار کر لیتا ہے، تو ہر چند وہ اندر سے تو ہے وہی ٹھیٹ ہندوستانی، لیکن اپنی ہندوستانیت پر غیروں سے بھیک میں مانگا ہوا غلاف چڑھا لیتا ہے، تاکہ لوگ اُسے بھی "صاحب" سمجھیں، یا کم سے کم اُس پر "صاحب" کا دھوکا کھا کر، اُس کا احترام کرنے لگیں۔

آزاد و زندہ قوموں کے لوگ بھی مذہب تبدیل کرتے ہیں، مگر یہ تبدیلی، اُن کے قومی خصوصیات، اور نسلی مزاج کو محو و معدوم نہیں کر دیتی۔

مسٹر پکتھال کو، جو انگریز تھے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے حیدر آباد میں دیکھا تھا۔ ہر چند وہ مسلمان ہو چکے تھے، مگر اُن کی وضع قطع، چال ڈھال، لباس اور معاشرت میں ذرّہ برابر بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا — لیکن جس وقت کہ ہمارا کوئی بھائی عیسائی مذہب اختیار کر لیتا ہے تو اُسی وقت اپنی وضع قطع اور تمام معاشرت کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے، اور انتہا یہ ہے کہ نام تک تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

یہ ہے غلامی کی لعنت، جس کا ہم صبح و شام نظارہ کرتے رہتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر غلامی کی لعنت یہ ہے کہ ہم میں سے جو افراد اپنے دین و ایمان اور اپنے نام و کمال خصوصیات قومی کو کلیتہً ترک کر کے فاتح قوم کی طرف

ادھر آ ڈُبلے لیں بلائیں تمہاری

کے نعرے مارتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ اُنھیں دیکھتے ہی فاتح قوم کے افراد

"دیکھو، دیکھو، ہمیں نہ چھُو لینا"

کی ڈانٹ بتاتے ہیں، اور اُنھیں اِس قدر ذلیل سمجھتے ہیں کہ اپنے معبدوں میں بھی گھُسنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ان خاناں برباد دیسی عیسائیوں، یعنی انگریزوں کی حقارت آمیز زبان میں ان نیٹو کرسچینس کو

کن آلات کے ذریعے سے یہ بات سُنائی اور سمجھائی جائے کہ اے فریب خوردہ بھائیو! جیمز مس کرائمیسٹ کی قسم کہ تم یورپین نہیں ہو — تم ہندوستانی، اور خالص ہندوستانی ہو — تمہارے ماں باپ بھی لوقا اور سینٹ پال کی قسم یو۔ روپین نہ تھے۔ بلکہ وہ بھی ہم سب کی طرح ہندوستانی، اور خالص ہندوستانی ہی تھے — تم اس ہندوستان کی خاک پاک سے پیدا ہوئے ہو، اور ایک روز اسی خاک پاک میں دفن کر دئے جاؤ گے — اور تمہارے آباواجداد بھی، جن کے نطفے سے تم عالم وجود میں آئے ہو، اسی خاک سے اُٹھے تھے، اسی خاک میں سو رہے ہیں، اور اسی خاک میں حشر تک سوتے رہیں گے — تم نے مذہب تبدیل کر دیا، بہت اچھا کیا، "چشم ما روشن و دلِ ماشاد" لیکن "خدا" کے واسطے، "خدا کے" اکلوتے بیٹے" کے واسطے اِس تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے اپنے وطنِ عزیز کے حقوق اور اپنے آبا کے خصوصیات کو تباہ و پامال نکرو — ورنہ، خوب کان کھول کر سُن لو، جب ہندوستان آزاد ہوجائیگا اُس وقت سب سے زیادہ نرم دل ہندوستانی بھی تمھیں معاف کرنے پر آمادہ نہوسکے گا، اور بہت ممکن ہے، خدا نکرے کہ ایسا ہو، مگر بہت قوی اندیشہ ہے کہ آزاد ہندوستان تم سے وہی سلوک کرے گا جو آریوں نے گونڈوں اور بھیلوں سے کیا تھا — یعنی تم جنگلوں کی طرف ہانک دئے جاؤ گے، اور جب تم جنگلوں سے اپنے نجات دلانے والے عبا پوش، نلی بابا چالیس چوروں والے پادریوں کو امداد کے لئے پکارو گے۔ تو تمہاری آواز بھی اُن کے کانوں تک نہ جاسکے گی، کیونکہ وہ اُس وقت دُور، بہت دُور، انگلستان کے کسی صحرائی کنارے میں آلکوو کھود کر "انڈیا او انڈیا" "انڈیا او انڈیا" کے دردناک نعرے لگا رہے ہوں گے۔

کاش کوئی غور کرے کہ یہ کتنا پُرہول و دردناک انجام ہوگا!

حیف اُس نامراد کوّے پر جو ہنس تو بن نہ سکا — اور کوّا بھی نہ رہا!!

اسلام سے انکار

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم نے کوئی دو ماہ ہوئے ہوں گے کہ اسلام سے انکار کر دیا ہے۔ جس پر مسلمانوں کے طبقے و منبر سے سخت غیظ اور شدید اکراہ کا اظہار کیا جا رہا ہے؟

مجھے اپنے بھائیوں کے جذبات سے ہمدردی ہے اور میں اُن کی غیرتِ دینی کا احترام کرتا ہوں ——— لیکن جب اُس مسلمان نوجوان کے انکار پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس پر قطعی غصہ نہیں آتا، بلکہ میں اُس کے انکار کو معمول کرتا ہوں، مسلمانوں اور خصوصاً علمائے کرام کی اُس روش پر جو صدیوں سے اُنھوں نے اختیار کر رکھی ہے، اور جسے دیکھ کر ناواقف لوگوں کو اسلام سے شدید اکراہ پیدا ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس مسلمان طالب کو شیطان ملعون نے نہیں بلکہ دیندار مسلمانوں، اور انبیائے بنی اسرائیل سے مماثلت رکھنے والے مقدس "عالموں" "مجتہدوں" "صوفیوں" اور "پیروں" نے بہکا کر کافر بنا دیا ہے۔ اور اگر حشر کے دن اس کی پرسش ہوگی، تو اس غریب طالب علم کے عوض، گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے جائیں گے، ان دراز دست بزرگواروں کے نام جن کی عبائیں اور ڈاڑھیاں طویل اور آستینیں کوتاہ ہوا کرتی ہیں۔

معلوم نہیں عام مسلمانوں نے اپنے علمائے کرام کو بگاڑا ہے، یا ان علمائے کرام نے مسلمانوں کو مسخ فرمایا ہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے تو میرے نزدیک ایک طرف تو مسلمانوں نے جہالت، جمود اور تقلید کے باعث "علمائے کرام" کا احتساب نہ کرکے اُنھیں بگاڑ دیا ہے، اور دوسری جانب "علمائے کرام" نے تن آسانی، عیش پسندی، اور جھوٹی عزت کی خاطر مسلمانوں کو مسخ فرما دیا ہے ——— یہ بات بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان، اور "علما" دونوں اپنے اپنے گھوروں پہ ایک دوسرے پر غلاظتیں اُچھالتے رہے ہیں۔ اور اب ان دونوں کا یہ عالم ہے کہ ان کی جانب دیکھنے سے جی متلانے لگتا ہے۔

عقائد و اعمال صرف دو ہی چیزیں ہیں جن کا مطالعہ کرکے قوموں کے اچھے بُرے ہونے کے متعلق رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

مسلمان، خدا کے فضل سے ان دونوں نعمتوں سے مدت ہوئی کہ محروم ہو چکے ہیں۔

عقائد کا تو یہ عالم ہے کہ مسلمانوں میں وہ بنیادی چیز جسے توحید کہتے ہیں، اور جس پر اسلام کی پوری تعمیر کا مدار ہے، قطعی طور پر باقی نہیں رہی ہے۔

اور اعمال کے متعلق تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ اُن کا تو یہ عالم ہے کہ اب مسلمانوں کو کوئی دوسری قوم برداشت ہی نہیں کر سکتی ہے۔

مجھے مسلمانوں سے سب سے بڑی شکایت ہے کہ وہ انتہا سے زیادہ مغلوب الجذبات واقع ہوئے ہیں، اور اپنے خلاف کوئی بات، خواہ وہ کتنی ہی صحیح و مدلل کیوں نہ ہو، سُننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے، اس لیے مسلمانوں کے سامنے سچی بات کہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جامے سے باہر ہو جائے گا، اور مُنھ نوچنے لگے گا۔

یہ کتنی عبرتناک بات ہے کہ جس اسلام کے نامور ترین اکابر، کافروں تک کی سچی بات کے سامنے سر جھکا دیتے تھے، آج اُسی کے فرزند، دنیا میں اگر کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتے ہیں تو وہ سچی بات ہے ——— لیکن میں جسارت کرکے مسلمانوں کی خدمت میں عرض کروں گا کہ ذرا وہ اپنے اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر تو دیکھیں۔ اور ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ کیا وہ، اور اُن کے "علمائے کرام" اُسی اسلام کے پابند ہیں، جو قرآنِ کریم کے اندر موجود ہے، اور کیا اُسی لاثانی سیرت کا نمونہ ہیں جو اُن کے پیغمبرِ اعظم کی تھی؟

"ہٹیلے کے مُرغے" اور "شیخ سدو کے بکرے" کو تو آپ یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ یہ جُہلا کا فعل ہے، لیکن آپ کے پڑھے لکھے اور مہذب حضرات کے کارنامے کیا ہیں؟

کیا آپ گنڈے، تعویذ، نذر و نیاز، اور جھاڑ پھونک کے معتقد نہیں ہیں؟

کیا آپ "چار یار" "پنجتن" "مدحِ صحابہ" اور "آمین بالجہر" پر خون نہیں بہایا کرتے؟

کیا آپ میں سے اکثر و بیشتر حضرات رسولِ اکرمؐ کو بشریّت سے خارج کرکے الوہیت کے رنگ میں نہیں دیکھتے ؟

کیا آپ نے "خدا" کو ایک خاص مزاج کا پیر مرد نہیں سمجھ رکھا ہے؟

کیا آپ شبِ برات کے موقعے پر آتشبازی نہیں چھڑاتے، اور عید کے دن سوئیاں نوش نہیں فرماتے ہیں۔

کیا آپ قبور کی زیارت کے واسطے طویل سفر نہیں کرتے۔ مزارات کو غسل دے کر، اُن کا پانی نہیں پیتے، مزارات پر سجدے نہیں کرتے، اور صاحبانِ مزار سے اعانت طلب کرکے شرک کا ارتکاب نہیں فرماتے؟

کیا آپ بھیک مانگ کر، یا مقروض ہونے کے باوصف حج کرکے اپنے اُس روپے کو برباد نہیں کرتے جو آپ کے اور آپ کے اہل وعیال کے کام آسکتا تھا؟

کیا آپ تعزیوں، چھڑوں اور علموں کے سامنے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں نہیں مانگتے۔ اور ذوالجناح کی پُشت یا دُم کو مُقدس سمجھکر اُس پر ہات نہیں پھیرتے؟

کیا آپ "خواجہ کا صندل" اور "نال صاحب" کا جُلوس نہیں نکالتے ہیں؟

کیا آپ قوالیوں میں ناچتے، اُچھلتے، کُودتے، اور بھاؤ نہیں بتاتے ہیں؟

کیا آپ ہلکی ہوئی زُلفوں کے خطرناک اور عیاش سجادہ نشینوں کے قدموں پر سر نہیں جُھکاتے، اور نذریں دے دے کر اُنھیں اس قدر فارغ البال نہیں بناتے رہتے کہ وہ باسانی طوائفوں کو ملازم رکھ سکیں؟

کیا آپ اپنے بھائیوں کی غیبت، اور اپنے پڑوسیوں کی عیب جُوئی میں مصروف نہیں رہا کرتے ہیں؟

کیا آپ کاہل، کام چور، سُست، بدعہد، اور حاسد نہیں ہیں،

کیا آپ مہینوں غسل نہیں فرماتے، میلے کُچیلے نہیں رہتے، اور چوراہوں پر استنجے کے بہانے پینترے بدل بدل کر تمام دنیا کے سامنے قینچیاں مارتے ہوئے نہیں دیکھے جاتے ہیں؟

یہ تو تھے آپ کے اعمالِ حسنہ، اب ذرا اپنے مجتہدوں، اور عالموں کی طرف نگاہ ڈالئے۔

کیا آپ ملاحظہ نہیں فرماتے کہ وہ نرم گدّوں اور اُونچے تکیوں پر دراز رہتے ہیں؛ رزقِ کریم سے محروم رہتے ہوئے آپ کی خیرات پر زندگی بسر کرتے ہیں — جھوٹے فتوے دیا کرتے ہیں۔ اوقاف کا مال کھاتے رہتے ہیں مسلمانوں کے دینی، اخلاقی، معاشری، اقتصادی اور سیاسی حالات کی پروا نہیں کرتے۔ اسلامی ریاستوں کی گلیوں میں، رئیسِ وقت کا قرب اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے، مارے مارے پھرا کرتے اور حصولِ مقاصد کے واسطے افترا پردازیاں اور سازشیں کرتے پائے جاتے ہیں — اور سب سے بڑھکر یہ کہ یہ حضرات سُنّیوں، شیعوں، حنفیوں، وہابیوں اور قادیانیوں کو لڑا لڑا کر خفیہ وظائف اور علانیہ خطابات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ سچی بات کے کہنے سے ڈرتے ہیں، اور باطل جب اُن کے سامنے سے اپنا جلوس نکالتا ہوا گزرتا ہے تو وہ سلام کرنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آپ غصّہ تھوک کر، برائے "خدا و رسول" خود ہی انصاف سے کہئے کیا اسلام یہی ہے؟

کیا رسالت مآب نے اسی اسلام کی تعلیم دی تھی؟

کیا اسی اسلام نے دنیا کو مسخر کرکے رکھ دیا تھا؟

کیا قرونِ اولیٰ کے مسلمان آپ ہی کی طرح نرم و نازک اور غیر منظم رہتے تھے، اور کیا اُنھوں نے کسی غیر کی غلامی پر ایک لمحے کے لئے بھی قناعت کرلی تھی؟

مجھے یکایک ایک واقعہ یاد آگیا۔ لگے ہاتھوں اُسے بھی سُن لیجئے — ایک انگریز نے جو قرآن کریم کے مطالعے سے اسلام پر ایمان لے آیا تھا، اپنے ایک دوست سے کہا کہ اب وہ اپنے اسلام کا اعلان کرنا چاہتا ہے، اور اُس کی یہ تمنا ہے کہ وہ اُسے کسی مستند عالم کے پاس لے چلے، تاکہ اُس کے سامنے وہ اپنے اسلام کا باقاعدہ اعلان کردے۔

چنانچہ وہ دوست اُسی انگریز کو ایک خانقاہ میں لے گیا، جہاں قوالی کی "آہے واہ" پر بڑی بڑی ڈاڑھیوں والے ناچ رہے تھے۔

انگریز اس تمام تماشائے رقص و سرود کو بڑے غور اور انتہائی حیرانی کے ساتھ دیکھتا رہا، اور جب قوالی کے اختتام پر اُس کے دوست نے فرمائش کی کہ وہ "میاں صاحب" کے پاس چل کر اُن کے "دستِ مبارک" پر اسلام لے آئے، تو اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا، اور اُس نے انکار کرتے ہوئے یہ کہا کہ کتاب کے اندر تو تمہارا اسلام بہت اچھا ہے، مگر تمہاری

سوسائٹی اس قدر خراب ہے کہ میں مسلمان ہونا نہیں چاہتا، ورنہ میں بڑا بدمعاش بن جاؤں گا۔

یہ ہے آپ کی، اور آپ کی سوسائٹی کی حالت۔

اِن حالات میں کیا آپ یہ توقع کرسکتے ہیں کہ جس مکروہ اور بھیانک اسلام کو آپ پیش فرماتے ہیں اُسے اِس بیسویں صدی کے تعلیم یافتہ نوجوان ایک لمحے کے لئے بھی برداشت کرسکیں گے؟

خدا کی قسم اگر اسلام یہی ہے جسے آپ اور آپ کے "علمائے کرام" پیش فرماتے ہیں تو صرف از روئے تفکر و تدبر ہی نہیں، از روئے خودداری و شرافت بھی وہ اِس قابل ہے کہ بانگ دُہل جلد سے جلد اِس کا اعلان کردیا جائے، کہ حاشا، ہم مسلمان نہیں ہیں ——— اور ہمیں اِس اسلام سے کوئی دُور کا بھی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔

ہمیں تم کافر کہو، زندیق کہو، مُرتد کہو، جو جی میں آئے کہو، مگر ہم تمہاری طرف واپس نہیں آئیں گے۔ تمہاری گندگیاں، اور تمہاری وہم پرستیاں ہماری برداشت سے باہر ہوچکی ہیں، اور ایک شریف انسان کی طرح ہمیں شرم آتی ہے کہ ہمارا نام تمہارے رجسٹروں میں لکھا ہوا پایا جائے، اور ہم تمہاری محفلوں میں بیٹھے ہوئے پکڑے جائیں۔

اگر تمہارا اسلام، اسلام ہے، تو اُس خدائے بزرگ و برتر کی قسم جس کے قبضے میں ہماری جانیں ہیں، اور اُس رسولِ اکرم کی قسم جس کا ثانی زمین آج تک پیدا نہیں کرسکی ہے، ہم ہرگز ہرگز مسلمان نہیں ہیں۔ ہم کافر ہیں۔ کافر ہیں، کافر ہیں، اور کافر ———

تم ہمیں مار ڈالو، ہلاک کردو، پیس دو، جلا دو، ہمارے ٹکڑے اُڑا دو، مگر ہم کافر ہیں، کافر ہیں، اور کافر ———

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر در پسِ امروز بود فردائے!

کانگریس اور انسدادِ مے نوشی

غالباً یہ مرض ہم ہندوستانیوں میں بہت عام ہے کہ ہم میں سے جب کوئی فرد، یا گروہ، زندگی کے کسی شعبے میں نمود و شہرت حاصل کرلیتا ہے تو اُس منزل پر پہونچتے ہی اُس کے دل میں یہ خواہش بیجا پیدا ہوجاتی ہے، کہ وہ ہر میدان کا مرد اور ہر فن کا مولا مان لیا جائے، اور اس خواہش کے پیدا ہوتے ہی وہ زندگی کے اُن تمام بعید و قریب مسائل میں بے تکلف ہات ڈالنے لگتا ہے، جو اُس کے موضوع سے قطعاً خارج ہوتے ہیں۔

اِس وقت میرے ذہن میں میرے بہت سے معاصرین ایسے ہیں جو اِسی موذی مرض میں مدت سے گرفتار ہیں اور شاید تادمِ مرگ گرفتار رہیں گے۔ جن میں سے ایک پرچے کے ایڈیٹر صاحب اُن مریضوں میں سب سے زیادہ اُبھرے ہوئے نظر آرہے ہیں، یہ پہلے پہل "ادبِ لطیف" کے ذریعے سے مُلک میں رُوشناس ہوئے تھے۔ اور ان کے "شکرین" و "مرمریں" الفاظ نے بالخصوص ہمارے ٹیگوریت پسند نوجوانوں کو اُن کا بہت عقیدت مند بنا دیا تھا۔ لیکن جب اُنھیں اپنے "ادبِ لطیف" کے میدان میں کافی شہرت حاصل ہوگئی تو وہ ہر فن اور ہر شعبے میں نمود حاصل کرنے کے مرض میں یکایک گرفتار ہوگئے اور اس وقت وہ اِس موذی مرض کے اُس درجے میں ہے، جہاں مریض گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا رہتا ہے کہ جسے جو پُوچھنا ہو، مجھ سے پوچھ لے، اور جو مسئلہ حل کرانا ہو مجھ سے حل کرالے۔ چنانچہ آج وہی ایک ایسے فرد ہیں جو قرآن، وید، انجیل، توریت اور زبور کے مفسرِ اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ ماشاء اللہ بٹیر بازی، مُرغ بازی، پتنگ بازی اور "بیر بازی" میں یدِطولیٰ رکھنے کے مُدعی ہیں ——— ان کے بعد ایک صاحب اور بھی ہیں جو پہلے پہل ایک سیاسی راہنما کی صورت سے رونما ہوئے تھے، اور جب اُنھیں اِس میدان میں انتہا سے زیادہ شہرت حاصل ہوگئی تو اُنھیں یکایک مذہبی مذہبی دیوتا بن جانے کا مرض لاحق ہوگیا، اور اب وہ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں ایک اوتار ہی کی طرح ارشاد فرماتے ہیں، اور اس کا دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ اُن کے کانوں میں غیب سے آوازیں آتی رہتی ہیں۔

ہرچند یہ ایک نہایت ہی شرمناک اوچھا پن ہے، مگر ہم کیا کریں کہ یہ اوچھا پن ہمارے اکثر و بیشتر نمایاں افراد میں پایا جاتا ہے اور اِس سے ہماری قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچ رہا ہے، کیونکہ اُس مرض کے ہاتھوں ہمارے قابل افراد کی دماغی قوتیں مختلف شعبوں میں تقسیم ہوکر اس قدر کمزور ہوجاتی ہیں کہ ان سے کوئی تعمیری یا تخلیقی

کام نہیں لیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اسی طرح ہمارے ملک کی قابلِ ناز اور ہندوستانی قومیت کی واحد نمائندہ جماعت یعنی کانگریس بھی اس موذی مرض کا شکار ہو چکی یا ہو رہی ہے۔

کانگریس قائم ہوئی تھی حکومت سے ہندوستانیوں کے حقوق کا مطالبہ کرنے، اور اُس کے بعد اُس کا مطمعِ نظر ہو گیا کامل آزادی۔ ——— مطالبۂ حقوق سے کامل آزادی تک آنا۔ یہ اُس کی یک جہتی اور قدرتی رفتار تھی، جسے ہر صورت سے سراہا اور پسند کیا جاتا ہے، مگر اب وہ تحریکِ انسدادِ مے نوشی وغیرہ کے قضیوں میں گرفتار ہو کر اپنے دائرۂ عمل کو سیاسیات ہی تک محدود رکھتی معلوم نہیں ہو رہی ہے، بلکہ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ رشد و ہدایت اور پیمبری کے منصب پر فائز ہونے کے بھی خواب دیکھ رہی ہے ———

میں کانگریس کے متعلق اِس سے زیادہ کیا لکھ سکتا ہوں کہ میں اُس کے پرستاروں میں سے ہوں۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ کانگریس اور صرف کانگریس ہی ہمارے مظلوم برِاعظم کی نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے ——— مگر کانگریس کو اپنے سیاسی حدود سے تجاوز کر کے نوعِ انسانی کے ازلی رجحانات میں دخل دینے کا ارتکاب ہرگز نہ کرنا چاہیئے، ورنہ اُس کی ہر دل عزیزی میں سخت فرق آجانے کا شدید اندیشہ ہے۔ اور اِس نازک لمحے میں کہ ہندوستان کروٹ لے رہا ہے، کانگریس کی ہر دل عزیزی میں ذرہ برابر بھی فرق آجانے سے ملک کو شدید نقصان پہونچ جانے کا خطرہ ہے ——— کانگریس کو شاید علم نہیں کہ نوعِ انسانی کے واسطے کوئی ضابطۂ اخلاق، یا نظامِ روحانی مرتب کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

عظیم الشان پیمبروں کی حسرتناک تاریخیں اور اُن کی "پاک" زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں —— اور ہم سے صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ انسان اُس کو برداشت نہیں کرسکتا کہ اُس کے قدرتی رجحانات اور فطری میلانات میں کوئی دخل دے، اور جب کوئی اِن امور میں دخل دیتا ہے، تو خواہ وہ باپ ہی کیوں نہ ہو وہ اُس کی زندگی تک کو ختم کر دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

مذہب کا یہ بیان ہے کہ "خدا" نے انبیاء کے ذریعے سے نوعِ انسانی کی اصلاح کرنا چاہی تھی، اور اِس سلسلے میں ہزاروں نہیں، لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے گئے تھے۔ مگر نتیجہ کیا ہوا؟ مجھ سے جواب نہ طلب فرمایئے، عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر خود اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم اِس وقت کس راستے پر گامزن ہے۔

جب اِن امور میں حالات کی رفتار اِس شدت کے ساتھ حوصلہ شکن اور یاس انگیز رہی ہے، تو کانگریس کو خود غور کرنا چاہیئے کہ اِس شعبے میں اُس کے مساعی کہاں تک مشکور ہو سکتے ہیں۔

کانگریس کے سامنے ایک تازہ مثال بھی ہے اور وہ امریکہ کی تحریکِ انسدادِ مے نوشی ہے۔ شاید کانگریس کو بھی معلوم ہو گا کہ حکومت کے تمام جابرانہ احکام، اور قاہرانہ قوانین کے باوصف اہلِ امریکہ کی تری کسی طرح بھی خشکی سے نہ بدل سکی۔ اور آخر کار حکومت کو سپر انداختہ ہو کر اپنا وہ قانون جسے اُس نے پورے شاہی طمطراق، اور کامل پیمبرانہ تقدس سے جاری فرمایا تھا واپس لینا پڑا

ان امور پر نظر رکھتے ہوئے میں کانگریس کی خدمت میں پھر عرض کروں گا کہ وہ اپنے دائرۂ عمل کو محض سیاسیات تک محدود رکھے، اور رُشد و ہدایت کے دائرے میں داخل ہونے کی کوشش سے ہات اُٹھا لے ——— رُشد و ہدایت کا مطلع بڑے بڑے زبردست آفتاب پیدا کر چکا ہے، ایسے آفتاب جن کی تابانی کا کانگریس بیچاری تصور بھی نہیں کر سکتی، وہ تمام آفتاب جس شے کو "تیرگی" سمجھ کر اُسے دفع کرنے کی خاطر طلوع ہوئے تھے، وہ شے یا یوں کہئے کہ وہ "تیرگی" اُن کے زمانے سے بہت پہلے بھی تھی، اُن کے زمانے میں بھی بڑی تابانی کے ساتھ قائم رہی اور اُن کے بعد آج بھی اُسی تیرگی میں وہی پُرانی چمک دمک اور وہی پُرانا دم خم باقی ہے ——— یہ معاملہ ہے انسانی سرشت و جبلّت کا، سرشت و جبلّت سے وہ لڑے جو سرشت و جبلّت کو محو و معدوم کرنے کی قوت رکھتا ہو ——— کیا کانگریس کے حلقے میں ہے کوئی ایسا سُورما جو خم ٹھونک کر سامنے آئے اور یہ دعوے کرے کہ میں انسان کی قلبِ ماہیت کر سکتا ہوں؟

ہاں شغلۂ جام و سُبو جاری ہے — اب تک وہی رسمِ ہا و ہو جاری ہے
کمائی ہے کچھ انساں سے ٹکر ایسی — ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

پروپیگنڈا

وہ جھوٹ، بار بار جو بولا گیا ہے آج / اِس وقت جس کے نام سے ہوتا ہے اختلاج

حق کی قلیل فوج سے کرتا رہے گا جنگ / بھرتا رہے گا ریب میں ربّانیت کا رنگ

ڈھلتا رہے گا قالبِ صوت و کلام میں / چھپتا رہے گا مطبعِ تبلیغِ عام میں

دائم رہے گا گرمِ سفر ایک حال پر / مخلوق کی حدیث و روایت کی تال پر

کھوتا رہے گا اپنی ضلالت گزیدگی / پاتا رہے گا شام و سحر سے رسیدگی

آتا رہے گا اہلِ جہاں کی زبان پر / چڑھتا رہے گا نشر و اشاعت کی سان پر

پکتا رہے گا ذہن کے مطبخ میں صبح و شام / گاتا رہے گا سانس کی لَے پر بہ التزام

بنتا رہے گا موجۂ تکرار میں گُہَر / سُلگتا رہے گا حرف و حکایت کی آنچ پر

چڑھتا رہے گا اوجِ نظر پر بصد حشم / کاندھے پہ ماہ و سال کے رکھتا ہوا قدم

گاتا رہے گا وہم کی بزمِ سرود میں / پلتا رہے گا وقت کی نادیدہ گود میں

لیتا رہے گا جائزہ نزدیک و دُور کا / پیتا رہے گا دودھ سنین و شہور کا

دامانِ عقل و جیبِ نظر پھاڑتا ہوا / ذہنوں کی رفعتوں پہ عَلَم گاڑتا ہوا

تا آنکہ ایک روز وُہی ناسزا دروغ / حاصل کرے گا حلقۂ عالم میں وہ فروغ

اُس جھوٹ کو صداقتِ اعلیٰ کہیں گے لوگ
آفاق کی حقیقتِ کُبریٰ کہیں گے لوگ!

(جوش)

انسانی زندگی اور اُس کی دوا میت

ناظر

تمام حیوانات کے مقابلے میں حیاتِ انسانی کی امتیازی صفت اُس کا اخلاقی پہلو ہے۔ (اخلاقی پہلو سے مراد یہاں لازمی طور پر خوش خلقی یا عملی اخلاق سے نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی اخلاقی ذہنیت سے ہے) کیونکہ واجبی اور غیر واجبی۔ مناسب اور غیر مناسب، صحیح اور غلط، بھلے اور بُرے کا احساس، اُس شعوری کیفیت سے تعلق رکھتا ہے جو انسانی زندگی کا خاصہ ہے۔ یہ شعوری کیفیت یا اپنی ہستی سے باخبری اور آگاہی انسان کو دیگر مخلوقات سے متمیز کرتی ہے، حیات کی اور جس قدر صورتیں ہیں اُن میں یہ صفت تقریباً مفقود ہے۔ تمام ذی حیات ہستیوں میں انسان صاحب وقوف ہے، عقل اور استدلال اسی شعور کے لوازم ہیں۔ تمام کائنات کا ارتقا اسی شعوری کیفیت میں آکر منتہی ہوتا ہے جس کا مظہر انسان ہے، یہی شعور اخلاق کی بُنیاد ہے اور ہمارے اختیار، ارادے اور آزادیٔ عمل کا سرچشمہ اور ہمارے مخصوص کیرکٹر کا ذمہ دار۔ حیاتِ انسانی کی یہ نفسیاتی خصوصیت تمام طبعی اور میکانیکل قوانین سے ماورا ہے، جس کی توجیہہ محض حرکتِ سالمی کی بنا پر بعید از فہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دیگر بے زبان مخلوق کی طرح مادّی قوانین کی زنجیروں میں چار و ناچار اور اندھا دھند طور پر جکڑ بند نہیں ہے، بلکہ اس کا ارادہ اور اختیار حقیقی اور اصلی شے ہیں، جو اس کو فاعل کی حیثیت بخشتی ہیں، اگرچہ اپنے مادّی جسم کے باعث اُس کو طبعی قوانین سے کلیتہً نجات حاصل نہیں، اور اُس کے بیشتر افعال قانونِ حرکت کے تسلسلِ لازمی کا ایک جز ہوتے ہیں، مگر بعض افعال کسی نصب العین یا مقصدِ پیش نظر کی پیروی اور متابعت میں ہوتے ہیں۔ جو میکانیکل افعال سے بالکل مختلف بلکہ برعکس ہوتے ہیں اور ان انتخابی افعال میں اس کی حیثیت ایک فاعل کی ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ اس کا انتخاب خود اپنی جگہ پر نتیجہ ہوتا ہے، پیشرو حالات و اسباب کا، اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ تسلسلِ لازمی کی ہمہ گیری سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا، اور نقدر و معین کائنات میں اس کے افعال مستثنیٰ نہیں ہوسکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ کیفیتِ شعوری کے تقاضے سے اس کے افعال میں ایک انتخابی عُنصر پایا جاتا ہے جو کائنات میں دوسری جگہ نہیں ملتا، اور اگرچہ اُس کے افعال میں اختیار کا دائرہ کتنا ہی محدود اور تنگ ہو، مگر اُس کے وجود سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا، اس تمام بیان کا ماحصل یہ ہے کہ شعور انسانی زندگی کی مخصوص صفت ہے، جو ارتقائے حیات کی انتہائی منزل ہے، جس انسان میں یہ شعور جس قدر ترقی یافتہ ہوگا، اُس کی انسانیت اُسی قدر بلند اور ارفع ہوگی، اُس کی قوتِ مدرکہ ایسی چیزوں کا ادراک کرسکے گی جو محض طبعی نظام کے ماتحت ناممکن ہے، ایک فطری شاعر یا پیغمبر کی بصیرت اسی شعوری کیفیت کی ترقی یافتہ صورت ہے اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ اس شعور کی حدِ کمال عبادت ہے خدا سے۔ اسی شعور کی بنا پر انسان کو خدا کا خلیفہ یا نائب کا لقب ملا۔

یہاں پر ضمنی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف آدمیوں کی کیفیتِ شعوری کے کم و بیش ہونے کی کیا وجہ ہے، کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جس آدمی کی کیفیت شعوری زیادہ ترقی یافتہ ہے وہ پہلے بہت سی زندگیاں طے کر چکا ہے، اس سوال کا جواب تناسخ کے مسئلہ کے سلسلے میں آگے آئیگا یہاں پر صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ کسی انسان کے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ شعور کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود متعدد زندگیاں طے کر چکا ہو، بلکہ اس کے آباؤ اجداد کی زندگیاں اور متمدن ماحول میں اُن کا سلسلہ وار ارتقا اور دیگر مخصوص حالات اس اختلاف اور عدم مساوات کی توجیہہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

غرض یہ شعوری کیفیت انسانی زندگی کی ممتاز ترین صفت ہے اور اخلاقی احساس کی جڑ۔ اگرچہ ہر سوسائٹی میں اچھا اور بُرا، جائز اور ناجائز، درست اور غلط کا معیار مختلف ہے، مگر اس کا احساس انسانی زندگی کا لازمہ ہے، انسانی زندگی کے اسی اخلاقی پہلو کو استوار کرنے کے لئے مذہب نے کار فرمائی کی، اسی لئے انسانی زندگی کے لئے مذہب کی ضرورت کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کی جاتی رہی۔ اور تہذیب و تمدن کے ارتقا میں اُس نے بہت بڑا حصّہ لیا۔ اور اگرچہ اُن رسم و رواج اور روایات نے جو مذہب کے نام سے قائم ہوئیں، مذہب کو بدنام کر دیا۔ مگر مذہب کا تعلق جہاں تک تہذیب اخلاق سے ہے وہ ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیک آدمی بننے کے لئے انسان کو غیر فطری زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ مگر ایسے معترضین کے ذہن میں فطری زندگی کا جو تصور ہے وہ اُس حیوانی زندگی کا ہے جو بظاہر مطلق العنان اور تمام قیود سے بَری ہے، یہ بھی ایک غلط فہمی ہے، انسان کی فطرت حیوان کی فطرت سے مختلف ہے اور اس لئے ایک کی فطری زندگی وہی نہیں ہوسکتی جو دوسرے کی ہے۔ اگر انسان میں شعور نہ ہوتا تو بے شک وہ حیوانی زندگی کی سطح سے بلند ہوتا۔ اور اس کو نیک بنانے کے لئے غیر فطری زندگی پر مجبور کیا جاتا، جس طرح پالتو جانوروں کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ مگر شعور انسانی زندگی کی فطرت ہے۔ اور اس لئے اخلاقی زندگی جو شعور سے متعلق ہے، انسان کے لئے عین فطری ہے۔ حیوان کی ظاہری مطلق العنانی اور آزادی بعض لوگوں کے لئے قابلِ رشک ہے، مگر حقیقت میں وہ مجبور محض ہے۔ وہ طبعی اور مادّی قوانین کی زنجیروں میں انسان کے مقابلے میں زیادہ جکڑا ہوا ہے۔ انسان کو اپنے شعور کے باعث کسی حد تک آزادی حاصل ہے۔ پھر اس کی مدنیت بھی فطری ہے اور یہ حیوان کی طرح مطلق العنانی کی روادار نہیں ہوسکتی۔ غرض انسانی زندگی کے لئے کوئی اخلاقی معیار مقرر کرنا عین فطرت ہے اور یہی اس کی فطری زندگی ہے،

بعض لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی زندگی جس نہج پر گامزن ہو وہی اُس کی فطرت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نہ صرف انسانی زندگی بلکہ تمام دُنیا جس نہج پر چل رہی ہے، وہی اصلیت، حقیقت اور فطرت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور حقیقت نہیں ہے جس کی تلاش ہو۔ حقیقت کوئی ایک شے نہیں ہے، جو تنگ اور محدود ہو، نہ وہ کوئی خیالی چیز ہے، اُس کے بے شمار پہلو ہیں اور دُنیا کی یہی گوناگونی عین حق ہے۔ گویا واقعیت ہی حق کی مرادف ہے اور اس لحاظ سے اخلاقی معیار فضول شے ہے، اور غلط اور صحیح۔ مناسب اور نامناسب، واجب اور غیر واجب۔ جائز اور ناجائز۔ بھلا اور بُرا۔ یہ سب الفاظ دھوکہ پر مبنی ہیں، نیز مذہب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور ان حالات میں اگر کسی مذہبی تلقین کی ضرورت رہتی ہے تو یہی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مقدر ہے یعنی ایسے بیشمار اسباب کا نتیجہ ہے جو انسان کے قابو سے باہر ہے۔ ازل سے ایسا ہی ہونے والا تھا۔ یہی عین حق ہے اور انسان کے لئے بہترین مسلک یہ ہے کہ وہ راضی برضا رہے۔

لیکن اس خیال کی رُو سے انسانی زندگی بالکل میکانیکل رہ جاتی ہے اور یہ خود واقعیت کے خلاف ہے۔ کیونکہ انسان کے ارادے، اختیار اور انتخاب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور کیفیت شعوری کے موجود ہوتے ہوئے انسانی اعمال و افعال کو خالص میکانیکل قرار دینا لغو ہے، پھر انسان کی اپنے اعمال کی ذمہ داری اور ان کی سزا اور جزا سب بے معنی چیزیں رہ جاتی ہیں۔ اور تمام نظامِ عمل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ واقعیت کو حقیقت قرار دینا غلط نہیں، مگر کسی چیز کے واقع ہونے میں جس قدر اسباب کارفرما ہوتے ہیں اُن میں انسان کا ارادہ اور قوتِ فاعلی بھی شامل ہے، خواہ اُس کی قوتِ فاعلی دیگر اسباب و علل سے متاثر ہوئی ہو۔ مگر جب تک کسی فعل کے ارتکاب میں وہ بھی شامل ہے اس سے اغماض نہیں کیا جاسکتا۔ اور فعل کو بہتر بنانے کی کوشش کسی دھوکے پر مبنی قرار نہیں دی جاسکتی۔ اور اُس کو معطل کرنے کا مشورہ دینا خود انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

ہر چند کہ جبریت (Determinism) کا دائرہ انسانی آزادیٔ عمل کو بہت محدود کئے ہوئے ہے۔ مگر آزادی کا ایک شائبہ بھی اخلاقی معیار کا متقاضی ہے۔

انسانی زندگی کا اخلاقی پہلو ایسا پہلو ہے جس کی توجیہہ سائنس کے نظریات کے ذریعہ نہیں کی جاسکتی۔ ایک ظاہر بین عالم طبعیات انسان کے ہر فعل کی توجیہہ قانونِ حرکت کے تحت میں کرتا ہے جس میں آزادی کی گنجائش نہیں۔ اور ایک باطن بین ماہرِ نفسیات اُن کو اختیار، ارادے اور شعور کا مظاہرہ سمجھتا ہے، جو ساری کائنات کی علت غائی اور روح رواں ہے ہمارا شعور، عقل، قوت تمیز اور انتخاب ہمارے لئے ہر وقت ایک سطح نظر تجویز کرتے رہتے ہیں، اور یہی ہماری زندگی کا اخلاقی پہلو ہیں۔ جو کچھ ہے" ہمارے حواس اس کا ادراک کرتے رہتے ہیں، اور جو "ہونا چاہئیے" اس کا حکم عقل و شعور دیتے رہتے ہیں، اور اس طرح تہذیب و تمدن کی ترقی عمل میں آتی رہتی ہے، ہمارا تقاضائے عقلی ہماری اخلاقی زندگی کی اساس ہے۔ اس طرح پر مذہب کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اور وہ اِس اخلاقی پہلو پر اس قدر زور دیتا ہے کہ معاشرت کی تمام ضروریات کو اُسی کے تابع کرنا چاہتا ہے اور یہ ایک حد تک حق بجانب ہے، کیونکہ انسانیت کے لحاظ سے یہی پہلو اہم اور ارفع ہے، زندگی کا اقتصادی پہلو پیٹ اور تن کی ضروریات سے متعلق ہے۔ اور وہ ادنیٰ تر ہے، سیاسی پہلو حفاظتِ خود اختیاری کی اجتماعی صورت ہے، تعلیمی پہلو جامع ہے، اور اس لئے انسان کی جملہ ضروریات سے متعلق ہے، مگر سب سے زیادہ اخلاقی پہلو سے۔ فنونِ لطیفہ جو رُوح کی غذا سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے لئے بھی مذہب نے اخلاقی معیار مقرر کر دیئے ہیں، غرض مذہب ہماری زندگی پر مسلط ہے اور اگرچہ ہم نے عبادات، رسومات اور عقائد کی بیخ کنی کر کے مذہب کی صورت مسخ کر دی ہے۔ مگر ہم اِس سے بالکل خلاصی حاصل نہیں کر سکے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ شعور ہماری ذات اور وجود کا خاصہ ہے، عقل اس کا لازمہ ہے، اور اقتضائے عقل اخلاق ہے، اور مذہب تہذیبِ اخلاق کا ذریعہ۔

عبادات مذہب کے قائم کردہ اخلاقی معیار کو برقرار رکھنے کے لئے ہیں اور عقائد، عبادات کو قائم رکھنے کے لئے۔ تہذیب اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ عبادات کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی۔ اور اُسی کے ساتھ عقائد میں بھی اضمحلال آتا گیا۔ مگر سزا اور جزا کا عقیدہ چونکہ اہم اخلاقی پہلو رکھتا تھا۔ اس لئے وہ انسان کی فطرت سے قریب تر تھا، اور کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہا۔ سزا اور جزا کے عقیدے کے لئے حیات بعد الممات کا عقیدہ لازمی ہے۔ انسان بالطبع فطرت کے تمام مظاہر کی توجیہہ اخلاقی نقطۂ نظر سے کرنی چاہتا ہے، وہ دنیا کی ہر چیز کو صحیح اور غلط" بھلے اور بُرے" کی عینک سے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اُمور جو محض قانونِ طبعی کے تحت میں وقوع پذیر ہوتے ہیں، اُن کو بھی وہ اخلاقی ضابطہ کے تحت میں لانا چاہتا ہے، دُنیا میں عدم مساوات اور فرقِ مراتب، مفلسی اور تمول، صحت اور بیماری، قوت اور کمزوری، معذوری اور توانائی۔ ان سب اُمور کی اخلاقی توجیہہ نظریۂ تناسخ کے ذریعہ کی گئی۔ فطرت کو اُس کے ظاہر ظلم و ناانصافی کے الزام سے بری کرنے کے لئے انسان کو متعدد زندگیوں کا مالک قرار دیا گیا۔ اور دنیا کا تمام کارخانہ مکافاتِ عمل کا مظاہرہ سمجھا گیا۔ کیونکہ انسانی زندگی بالکل بے معنی شئے رہ جاتی ہے، اگر موت کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے اس کا اختتام ہو جائے، خدا کی کائنات بہت ہی نامعقول سمجھی جانی چاہئیے، اگر انسانی زندگی کی بھلی اور بُری تمام عملی سرگرمیاں موت کی ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائیں، کیونکہ اس صورت میں اس کے عمل کے نتائج کس پر مترتب ہوں گے، اور اعمال کا نتائج کے بغیر رہ جانا لغویت ہے، اس لئے حیاتِ انسانی کا سلسلہ جاری رہنا چاہئیے۔ اور اس لئے انسان کے لئے متعدد زندگیاں ناگزیر ہیں، اور پھر انسانی زندگی کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ ایک محدود زندگی میں پورا نہیں ہو سکتا۔ اُس کو تکمیلِ مقصد کے لئے دنیا میں بار بار آنے کی ضرورت ہے چنانچہ ایک ہی والدین کے متعدد بچوں میں ذہنی قوا کا برابر نہ ہونا درحالیکہ وہ تقریباً یکساں حالات میں پرورش کئے گئے ہیں، جاہل ماں باپ کے ہاں غیر معمولی ذہانت والے بچہ کا پیدا ہو جانا۔ ہماری بعض چیزوں سے قدرتی مناسبت اور عدم مناسبت یعنی رغبت اور نفرت کے مبہم رجحانات وغیرہ وغیرہ۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان پیشتر متعدد زندگیوں کے سلسلہ میں سے گزر چکا ہے۔ اگرچہ ان تمام باتوں کی کئی وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں۔ مگر پیدائشی نفع و نقصان اور کمی و بیشی کسی ایسے اخلاقی قانون کے ماتحت ہونی چاہئیے۔ جس میں حق تلفی اور ناانصافی کی توجیہہ ہو سکے۔ اور تلافی کی صورت مضمر ہو۔ بالفاظ دیگر ہماری اخلاقی فطرت کی تشفی ہونی چاہئیے۔ انسانی زندگی کوئی مہمل اور بے معنی چیز نہیں ہے۔ اس کا شعور و قوف۔

اس کی عقل و تمیز۔ اس کا اختیار و ارادہ۔ اس کی زندگی کو ایسی معنی خیز اہلیت اور حقیقت بخشتی ہیں۔ جو حیات کی دیگر صورتوں کو حاصل نہیں ہے۔ انسانی زندگی محض ایک مادی ہیولیٰ نہیں ہے۔ اس کی کیفیت شعوری۔ اس کا وقوف و آگہی اس کو تمام کائنات میں فائق ہستی کا درجہ عطا کرتی ہے جس کی نفسیاتی خصوصیات میں حسِ اخلاقی مضمر ہے، جو اس کی زندگی کا امتیازی وصف ہے، اور اس لئے لازماً اور فطرتاً اس کے نزدیک نظامِ عالم کی کوئی توجیہہ معقول اور دل نشین نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ وہ اخلاقی پہلو پر مبنی نہ ہو، اگرچہ بعینہٖ وہی وجوہات جو تکرارِ زندگی کے نظریئے کی اختراع کا باعث ہوئیں، اس کی تکذیب کے درپے ہیں۔ ہماری عقل، شعور اور تقاضائے انصاف جس نے فطرت کی ناانصافی کی توجیہہ تکرارِ پیدائش کے ذریعہ کرکے اپنی تشفی کرنی چاہی، اس نظریہ نے خود ان ہی چیزوں کے حق میں کمال بے اعتنائی سے کام لیا، کیونکہ اُس کو اپنے گذشتہ وجود کے متعلق کوئی شعور اور آگاہی نہیں، اور یہ عجیب انصاف ہے کہ ایک شخص کو ایسے اعمال کی سزا دی جائے جن کے ارتکاب کا اُس غریب کو مطلق علم نہیں۔ ایک پیدائشی اندھے، لُولے، لنگڑے کے ساتھ فطرت کی ناانصافی کی تاویل اس طرح کرنا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کے اعمال کی سزا پا رہا ہے عجیب قسم کا استدلال ہے، ایک ناانصافی کی توجیہہ دوسری ناانصافی سے کرنا مضحکہ خیز ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو بتا دیا جائے کہ اس کو کس جرم اور گناہ کی سزا دی جا رہی ہے، نہ صرف انصافاً یہ ضروری ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ وہ آئندہ اس سے اجتناب کرے۔ ہر قانونی اور اخلاقی ضابطہ کی رُو سے اس کو متنبہ کرنا لازم ہے، مگر یہ گزشتہ زندگی کے اعمال کا مجرم ارتقائے حیات کے کسی درجہ پر بھی اپنے گناہ کی نوعیت سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔ زندگی کا ایسا تسلسل عملی مقاصد کے لئے بیکار ہے، جس میں ہر انتقال پر شعور زائل ہو جائے۔ اور اس اندھی مکافاتِ عمل سے اُس اخلاقی تقاضے کی تسلی نہیں ہوتی جس کے لئے اس کے اختراع کی ضرورت پیش آئی، اور پھر یہ عجیب بات ہے کہ انسان کا شعور اس کے مادی جسم سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ نفسیاتی خصوصیت ہے جو اس کی رُوح سے متعلق ہے اور حامیانِ نظریہ کے نزدیک موت کے ذریعہ اُس کی رُوح فنا نہیں ہوتی، مگر پھر بھی اس کو اپنے گزشتہ وجود کا شعور نہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر کہا جائے کہ انسان کی نادانی اور ناواقفیت اور اپنے گذشتہ وجود اور اس کے اعمال کو بھول جانا اُس کو عقوبت اور مکافات سے نہیں بچا سکتا۔ ہر عمل کا نتیجہ اور اثر ضرور مترتب ہوتا ہے اور کرنے والے کا جہل اور نادانی لازمی نتائج کو وقوع پذیر ہونے سے باز نہیں رکھ سکتے، اگر آگ میں ہاتھ ڈالا جائے گا تو وہ ضرور جل جائے گا، ناواقفیت کا عذر کچھ کام نہ دے گا، مگر یہاں پر یہ غلطی ہے کہ جس چیز کو ثابت کیا جا رہا ہے اس کو پہلے سے فرض کر لیا گیا ہے اور اس فرضی عقیدے کی دلیل اس طرح پیش کی جا رہی ہے جس طرح ایک حتمی طبعی قانون ہوتا ہے، پھر اس طرح کے استدلال میں طبعی قانون اور اخلاقی قانون میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ وہ اخلاقی جواز اور انصاف کی توجیہہ بادِ ہوا ہو جاتی ہے، جس سے متاثر ہو کر نظریہ کا اختراع کیا گیا تھا۔ طبعی فطرت نادانی اور لاعلمی، سہو اور دھوکے کے افعال میں کوئی تمیز نہیں کر سکتی، مگر ایک ذی شعور فطرت کے لئے یہ تمیز ضروری ہے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ دونوں صورتوں میں مختلف سلوک کیا جائے۔ مادی عالم کے قوانین کو علم اور لاعلمی سے کوئی سروکار نہیں، اس معاملے میں وہ اندھے ہیں اور اسی باعث انسان کی ذی شعور ہستی اُن سے مطمئن نہیں ہوتی، اور اخلاقی توجیہہ ڈھونڈتی ہے، اور اگر اخلاقی ضابطہ بھی ویسا ہی ہو جیسا طبعی ضابطہ تو پھر اخلاقی نظریئے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ خود انسان کا بنایا ہوا قانون بھی نادانی کے عذر کو قابلِ سماعت نہیں سمجھتا، مگر یہ اُس کی اپنی معذوری کا اعتراف ہے کیونکہ اصلی اور بناوٹی لاعلمی میں امتیاز کرنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں اور ایسی صورت میں اگر اس عذر کو تسلیم کر لیا جائے تو ہر شخص جھوٹ بول کر گلو خلاصی کر سکتا ہے اور ارتکابِ جرم پر زیادہ دلیر ہو جائے گا۔

امتیاز اور تفریق انصافاً ناروا ہے اور ذی شعور ہستی کے لئے عدم مساوات کی اخلاقی توجیہہ ضروری ہے، اگر اس تفریق کی وجہ گذشتہ نیک و بد اعمال ہیں تو ایک کے اعمال کا دوسرے سے نیک تر یا بدتر ہونا کس وجہ سے ہے، اگر اُس کی وجہ شعوری کیفیت کا کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہونا ہے اور شعور میں کمی بیشی کی وجہ ایک وجود کا دوسرے کے مقابلے میں ارتقائی سفر میں زیادہ زندگیاں طے کرنا ہے تو یہ فرق

کس طرح ہوا کہ ایک وجود نے دوسرے سے زیادہ زندگیاں طے کرلیں۔ مقابلۃً زیادہ زندگیاں طے کرنے کی تین ہی وجوہات ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ ایک رُوح دوسری سے پہلے پیدا ہوئی اور اس لئے وہ زیادہ زندگیاں طے کرسکی یا یہ کہ روحوں کے جوہر میں کوئی ازلی اور قدرتی فرق تھا جس سے ایک نے دوسرے کے مقابلے میں زیادہ زندگیاں طے کرلیں اور یا یہ کہ اُن خارجی اسباب و حالات میں فرق تھا، جن سے ہر ایک رُوح کو مخصوص طور پر سابقہ پڑتا رہا۔ مگر یہ تینوں صورتیں تفریق اور ناانصافی کی ہیں اور جس چیز کی توجیہہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ پھر بھی باقی رہ جاتی ہے۔

پھر چونکہ اس نظریئے کی رُو سے انسان کی موجودہ زندگی کی نوعیت اس کی گزشتہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے، اس لئے اس کے موجودہ کوائف پیشرو حالات و اسباب کے ذریعے سے مقدر ہوچکے ہیں اس کی حرکات و سکنات، اعمال و افعال وہی راستہ اختیار کریں گے، جو حالاتِ ماسبق نے پہلے سے اُن کے لئے معین کردیا ہے، اور اُس کے حق میں واقعات کی رَو کو اُس سمت سے رُوگرداں نہیں کیا جاسکتا جو ازل سے اس کے لئے مقرر ہوچکی ہے اس کے لئے وعظ و پند، نصیحت و ہدایت سب بیکار ہے، کیونکہ وہ تسلسل لازمی کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، اس کا اختیار و ارادہ باطل ہے، وہ اپنے فعل کا مختار نہیں۔ اور ایسی حالت میں اخلاقی پہلو کا ذکر بے معنی ہے، اس حالت میں مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی اور سلوک بھی روا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اپنی سزا بھگت رہا ہے۔ اور مجرم کی اعانت و دستگیری ٹھیک نہیں، جو نظریہ انسان کی ارفع ہستی کو اس قدر پستی کی طرف لے جائے، اور اس کو دیگر مخلوقات کی طرح مجبورِ محض ٹھہرائے، وہ یقیناً اخلاقی توجیہہ کا مدعی نہیں ہوسکتا، بلکہ ایسی مجبور حالت میں اخلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تمام کائنات کے ارتقا کی انتہا کیفیت شعوری کا حصول ہے اور جب وہ حاصل ہوجائے تو اس کا فنا ہوجانا ارتقا کا بطلان ہے۔ اس کی دوامیت اور تسلسل لازمی ہے اور چونکہ وہ کیفیت وجود انسانی میں جلوہ گر ہوتی ہے، اس لئے انسانی زندگی کا تسلسل ضروری ہے۔ مگر تکرار زندگی کے مذکورہ نظریہ میں جہاں حیات انسانی کے تسلسل کو نبھانے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں کیفیت شعوری کے تسلسل کو نظرانداز کردیا گیا ہے جو اصل مقصد تھا، لیکن جب یہ نظریہ غلط ہے تو پھر کونسی صورت ہے جس میں شعورِ انسانی کی دوامیت پائی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک انسانی وجود کی انفرادی حیثیت پر زور دیا جائے گا، یہ معمہ حل نہیں ہوگا، منفرد زندگی نہیں بلکہ سوسائٹی کی زندگی صحیح معنوں میں مسلسل زندگی ہے، چنانچہ جب زندگی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بتدریج ارتقائی منازل طے کررہی ہے، تو اس کا مقصد اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کی انفرادی حیثیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اخلاق کا تعلق منفرد انسان ہی سے ہے۔ اور انفرادی اعمال کی سزا اور جزا کے لحاظ سے انفرادی زندگی کے جاری رہنے کی ضرورت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے، اور اس کی انفرادی زندگی اپنے تمام افعال میں سوشل اہمیت رکھتی ہے، اور جب اس کے انفرادی افعال کے متعلق اخلاقی نقطۂ نظر سے فیصلہ کیا جاتا ہے، یعنی اُس کے اچھے یا بُرے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے تو وہ بھی سوشل اثرات و نتائج کی بنا پر ہوتا ہے، اور جب اس نظر سے دیکھا جائے تو دستِ اجل سے نہ تو اُس کے اچھے اعمال ضائع ہوتے ہیں اور نہ بُرے اعمال عقوبت سے بچنے پاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے اچھے اور بُرے نتائج اور اثرات سوسائٹی پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ خود اُس کی ذات تو زندگی کے اختتام پر عواقب اور سزا اور جزا سے بچ جاتی ہے۔ تو یہ غلط ہے، کیونکہ مسئلۂ زیر بحث میں جسمانی انفرادیت سے مراد نہیں ہے بلکہ اُس کے شعور سے مراد ہے اور اعلیٰ سوسائٹی میں انفرادی شعوریت سوسائٹی کے شعور کا جزو ہوتی ہے۔ ہم جان بُوجھ کر ارادتاً سختیاں اُٹھاتے ہیں اور تکالیف مول لیتے ہیں محض اس لئے کہ ہماری آئندہ نسلیں مستفید ہوسکیں۔ نفسانیت اور انفرادیت کے لئے اجتماعی زندگی میں کہیں جگہ نہیں ہے۔ ایک ترقی یافتہ سوسائٹی میں ذاتی مفاد و اجتماعی مفاد کے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ علوم و فنون کی ترقی میں انفرادی کوشش موت سے ختم نہیں ہوجاتی بلکہ سوسائٹی کے دوسرے ارکان اس سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دیتے، اور اس طرح حیاتِ انسانی کی ارتقائی منزلیں ہر حیثیت سے طے ہوتی رہتی ہیں، اور اس متحدہ زندگی میں فطرت کی ناانصافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر ایک چیز کا بدل

خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز کی بازگشت کا دائرہ انفرادی زندگی کے مقابلے میں سوسائٹی کی زندگی میں کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے افراد جس قدر آپس میں مربوط ہوں گے اسی قدر زندگی خوش حال ہوگی، یہی وہ زندگی ہے جس کو شعور انسانی کی معراج کہنا چاہیے۔

نعرۂ بغاوت

ضیاء الدین احمد سلہری

بھول جاؤ

خدا کو کہ وہ سرمایہ داروں کا خدا ہے۔
بہار کے بعد خزاں اور موت کے بعد حیات
کی اُلجھنوں کو اُس نے افسانہ بنا دیا ہے۔
غریب کے احساسات کو خاک سمجھتا ہے۔
اور امیر کی خوشی کو مقدّم

ہاں خاموش کر دو
مدحِ فیضانِ قدرت کے ساز کو
کہ اُس کے تاروں سے
مہیب چیخیں نکل رہی ہیں
اُس کی حمد و ثنا بیکار ہے۔
اُس کے گُن گانا فضول

قدرت نے مفلسوں کو کیا دیا!
پامال احساسات!
مردہ حسرتیں!
دردناک آہیں!
سوکھے ہوئے ہاتھ!
اور خشک لب

اے غریبو! قدرت بے پروا ہے
تم اپنی پیشانیاں کیوں رگڑ رہے ہو
تمہارے سجدے بیکار ہیں

اُسے محرابیں پسند نہیں
اُسے دلسوز حقیقتوں سے نفرت ہے
اُسے اگر دلچسپی ہے
تو امیروں کے محلوں سے!
سرمایہ داروں کے افتخار سے!
منعموں کے ناز سے

ہاں سرمایہ داری اور قدرت ایک ہے
توڑ دو نا کو سہائے سمع خراش کو
کہ اُن سے خوشامد کی راگنیاں نکل رہی ہیں
دفن کر دو اپنی چیخوں میں اُس کی نفیری کو
کہ یہ اُسے مغرور بنا رہی ہیں
انسانیت شیطنت بن رہی ہے
اور قدرت اُس کی پشت پناہ ہے
اے روندی ہوئی مخلوق
اُٹھ کہ قدرت کی حکومت تیرے لئے موجب ہلاکت ہے
اُس کے دیار میں صرف موسیقی کی ہم آہنگ و دلفریب آواز ہی داخل ہو سکتی ہے
جاہ و جلال کی دیویاں ہی وہاں قدم رکھ سکتی ہیں
تو پھر تو کیوں اپنی افلاس سے دبی ہوئی آواز سے اُس کو پکار رہا ہے
تیری دعاؤں کے لئے وہاں انگاروں سے مسلح فرشتوں کا پہرہ ہے
تیرا قدرت پر اعتماد ہے؟
اُٹھ کہ تو اپنے مستقبل کا مالک ہوا چاہتا ہے
اپنی قسمت کا آقا بن
اور قدرت سے انتقام لے ——— ! انتقام ——— !
انتقام! ——— انتقام!

انسانیت سے ارفع واعلیٰ کوئی مذہب نہیں

محمد خلیق ابراہیم لکھنوی

(۱)

سیٹھ شنکر چند نے اپنی لڑکی اُوشا کو انٹرنس کرا کے ولایت بھیج دیا۔ اُوشا اُن کی اکلوتی لڑکی تھی۔ لڑکے کی آرزو میں سیٹھ جی کی تمام عمر گزر گئی، مگر لڑکا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اوشا کو وہ اپنے لڑکے ہی کی جگہ پر سمجھتے تھے۔ بیحد چاہتے تھے، اور اُس کی تعلیم پر بیدریغ روپیہ اُٹھا رہے تھے۔ اُوشا کی منگنی اُنھوں نے اُس کی شیر خوارگی کے زمانے ہی میں اپنے ایک دوست جسٹس مہندر پرتاپ کے لڑکے کے ساتھ کر دی تھی۔ مہندر پرتاپ نے لڑکپن ہی سے لڑکے کو امریکہ بھجوا دیا تھا، وہ کہتے تھے کہ تعلیم و تربیت امریکہ میں بہ نسبت انگلستان کے زیادہ بہتر ہوتی ہے، سیٹھ شنکر چند بڑی سُوجھ بُوجھ کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ اگر اوشا کو معمولی تعلیم دلاتے ہیں تو شاید شادی کے بعد اُس سے اور سُریندر سے نہ بنے، اُن کے خیال میں میاں بیوی کا ہمخیال اور ہم معاشرت ہونا بیحد ضروری تھا، یہی خیال کر کے انٹرنس کے بعد اُنھوں نے اُوشا کو آکسفورڈ بھیج دیا، اُوشا کی ماں سیٹھ جی کے اس عمل سے بیحد ناراض تھیں۔ مہینوں اُنھوں نے سیٹھ جی کو طعنے دے دے کر اور باتیں سُنا سُنا کر اُن کی زندگی اجیرن کر دی، وہ کہتی تھیں "بھیجا تو ہے بِٹیا کو ولایت، کرسٹانی ہو کر نہ آئے تو جو کہو سو ہاروں۔"

سیٹھ جی بڑے پریشان تھے، اور کبھی کبھی پچھتاتے بھی تھے کہ آخر انھوں نے لڑکی کو کیوں ولایت بھیجا۔ پھر یہ خیال کر کے کہ "اوشا کی ماں تو جاہل ہے۔ میں اُس کی وجہ سے اپنی لڑکی کی زندگی تھوڑی برباد کر دوں گا۔ میں نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا" اپنے دل کو ڈھارس دے لیا کرتے تھے۔

(۲)

اُوشا صورت و سیرت کے لحاظ سے بہترین لڑکی کہی جانے کے قابل تھی۔ وہ بیحد خوبصورت تھی، بالکل دیوی کی طرح۔ اُس کا جسم نرم تھا، اور نازک، سرتاپا وہ ایک ملائم پنکھڑی تھی۔ گلاب کی سی پنکھڑی۔ سیرتاً بیحد نیک اور خلیق۔ جس شخص سے ایک بار ملتی ناممکن تھا کہ وہ اُس کا شیدا نہ ہو جاتا۔ صورت و سیرت کے علاوہ دماغی ارتقا میں بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ بلا کی ذہین اور سُلجھے ہوئے دماغ کی مالک تھی۔ نہایت تیز اور بامحاورہ انگریزی بولتی اور انگریزی کے چوٹی کے رسائل میں اپنے مضامین بھیجتی جن کو پڑھ کر پبلک بیحد محظوظ ہوتی تھی۔ اُس کے مضامین میں ایک نمایاں خصوصیت تھی وہ مشرقی اور خاصکر ہندوستانی تخیلات کو اس خوبصورتی سے انگریزی کا جامہ پہناتی تھی کہ وہ انگریزی کے ادبِ لطیف میں ایک خاص حیثیت

رکھتے تھے۔

آکسفورڈ میں داخل ہوتے ہی تمام یونیورسٹی میں اُس کی دُھوم مچ گئی۔ پروفیسر اُس پر فخر کرنے لگے۔ اور وہ انگریز طلبا جن کی دھاک یونیورسٹی میں اُس کے آنے سے پیشتر بیٹھی ہوئی تھی دل ہی دل میں اُس سے جلنے لگے۔ وہ ہندوستانیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے۔ اُن کے خیال میں ہندوستان عمدہ دماغ پیدا ہی نہیں کرسکتا تھا۔ اُنھوں نے اُوشا کی تعریفوں کو اپنی توہین و تذلیل خیال کیا۔

بورڈنگ میں اُوشا کے کمرہ سے ملا ہوا کمرہ ایک ہندوستانی طالب علم کا تھا۔ شاہد آکسفورڈ میں فلسفہ کا طالب علم تھا۔ اُس کے والد سرگرم کانگریسی تھے۔ اور اُسے سیاسیات کی لائن میں لانا چاہتے تھے۔ مگر فلسفہ کی طرف اُس کا بڑھتا ہوا ذوق دیکھکر اُنھوں نے اُسے آکسفورڈ بھیج دیا۔ شاہد کوئی خوبصورت نوجوان نہ تھا۔ لیکن پھر بھی یونیورسٹی کی لڑکیاں اُس کی بیحد گرویدہ تھیں۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اُسے عورتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اُن سے بچا بچا رہنا چاہتا تھا۔ نسوانی فطرت ہے کہ عورت اُس کی طرف زیادہ رجوع ہوتی ہے جو اُس سے بے اعتنائی برتے۔ نسوانی فطرت شکاری اسپرٹ رکھنے والی فطرت ہے۔ ہر نوجوان مرد کو اپنے دامِ حُسن میں پھانس لینا چاہتی ہے۔ لیکن ایسے لوگ جو جال کے اندر پڑے ہوئے دانے کے متمنی ہی نہ ہوں، اُسے ضد دلا دیتے ہیں اور وہ ہر امکانی کوشش اُن کو زیر کرنے کی کرتی ہے۔ شاہد کی اُسی بے رُخی نے یونیورسٹی کی لڑکیوں کو اُس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ دوسری خاص وجہ اُس کی مقبولیت کی نہ صرف لڑکیوں بلکہ تمام یونیورسٹی میں اُس کی فلسفہ دانی اور علمی قابلیت تھی۔ اُوشا کی طرح شاہد سے بھی بہت سے خودغرض طلبا رشک و حسد سے جلتے تھے۔ لیکن زیادہ تعداد اُن مخلص طلبا کی تھی جو اُس کی صحبت میں بیٹھنا فخر خیال کرتے تھے۔ فلسفہ میں اُس کی قابلیت لامحدود تھی۔ اکثر پروفیسر بڑا بھی جو ایک مشہور فلسفی تھے اُس سے مشورے اور رائیں لیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں تو یہاں تک مشہور تھا کہ پروفیسر اُس کو پڑھاتے ہوئے گھبراتے تھے کیونکہ بہت سے مسائل جن کو وہ بالکل درست اور ٹھیک سمجھتے تھے، شاہد اُن کو غلط ثابت کر دیتا تھا۔

اوشا کے یونیورسٹی میں داخل ہونے پر شاہد کو اُس سے باوجود عورتوں سے الگ تھلگ رہنے کے ایک دلچسپی سی پیدا ہو گئی۔ اس دلچسپی کا باعث وہ باتیں تھیں۔ ایک تو اوشا کا علمی ذوق اور ذہانت۔ دوسرے اُس کا ہندوستانی ہونا۔ اوشا بھی ایک تو اپنی فطرت کے تقاضے، دوسرے شاہد کی علمی قابلیت، اور تیسرے ہموطن ہونے کی وجہ سے شاہد میں ایک خاص دلچسپی لینے لگی۔ اُس کی دلچسپی شاہد کی دلچسپی سے مختلف تھی۔ شاہد کے دِل میں اوشا کی وقعت تھی، محبت نہیں، اوشا کے دل میں اُس کی فطرت کے مطابق جذباتِ محبت نشوونما پا رہے تھے گو اُسے اس کا احساس نہ تھا۔

(۳)

یونیورسٹی کے اوقات کے علاوہ اب دونوں کا زیادہ تر وقت ساتھ گزرتا جس میں علمی بحثیں ہوا کرتیں۔ شاہد کی صحبت نے اوشا کو بھی فلسفہ سے تھوڑا سا لگاؤ پیدا کر دیا تھا، اور اُسے شاہد کی فلسفیانہ باتوں میں بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اسی دوران میں اُوشا اس کوشش میں بھی لگی تھی کہ شاہد کو اپنا گرویدہ بنالے۔ وہ ہر ممکن طریقہ سے شاہد کو مسحور کرلینا چاہتی تھی۔ وہ ہر علمی یا فلسفیانہ بحث میں موضوع کو توڑ مروڑ کر، محبت پر لے آتی تھی۔ شاہد کہتا تھا کہ وہ محبت وغیرہ کے بیکار موضوعات پر اپنا دماغ اور قیمتی وقت صرف نہیں کرسکتا۔ اُس نے محبت کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، فلسفہ حاصل کرنے کا ذوق اُس کے دماغ پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ وہ دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتا تھا۔ اکثر اوقات اُس سے بالکل غیر فطری حرکات سرزد ہو جاتی تھیں۔ لیکن اوشا کی فطرت کے پے درپے حملوں نے اُس کے دل پر اثر کئے بغیر نہ چھوڑا۔ عورت کی فطرت مرد کی فطرت سے زیادہ نرم و نازک اور لطیف واقع ہوئی ہے۔ اُس کی رنگینی میں وہ طاقت ہے جو مرد کی فطرت کو اُس کے آگے سرنگوں کر دیتی ہے، وہ ایک خوبصورت اور حسین آبگینہ ہے جس کو دیکھتے ہی انسان دونوں ہاتھوں سے اُسے تھام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اوشا نے آخر شاہد کو راغب کر ہی لیا کہ وہ فلسفۂ محبت پر غور و فکر کرے۔ یونیورسٹی کی اور لڑکیاں اس میں ناکامیاب رہی تھیں۔ کیونکہ شاہد اُن کو ایسے موقعے ہی نہ دیتا تھا کہ وہ کھل کر بات کرسکیں۔ ایک روز شام کو دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ اُوشا نے سوال کیا۔ "شاہد آخر انسان کی کیا حقیقت ہے؟"

شاہد بولا "بس یہی کہ وہ خدا کی مکمل ترین ارتقائی مخلوق ہے، اور

اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتی ہے۔"

اُوشا۔ لیکن اشرف المخلوقات تو دیوتاؤں یا تمہارے مذہب کے لحاظ سے فرشتوں کو ہونا چاہیئے۔ انسان صرف مجسمۂ نیکی تو ہے نہیں۔ خیر و شر دونوں اس میں موجود ہیں۔

شاہد۔ خیر و شر دونوں کا مظہر ہونا ہی تو اشرف المخلوقاتی کا سبب ہے۔

اوشا۔ یہ کیونکر؟

شاہد۔ میں اسے اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھا ہوں۔ خدا نے پہلے صرف فرشتے پیدا کئے۔ شیطان کو نہیں پیدا کیا۔ معلم الملکوت وہی تھا جو سب سے زیادہ مکمل اور اکمل ترین فرشتہ تھا۔ اس کے بعد کے نتائج پر غور کرو جن کو تم اسلامی کتب میں مطالعہ کر چکی ہو تو تم کو معلوم ہوگا کہ در اصل ارتقائی اصول کے ماتحت فرشتہ کی انتہا اور معراج یہ ہے کہ شیطان ہو جائے۔ معلم الملکوت اکمل ترین فرشتہ تھا۔ اپنی معراج پر پہونچ کر شیطان ہو گیا۔ خدا جانتا تھا کہ ملکوتیت میں شیطنت کے اجزا مخفی ہیں اور اسی لئے اس نے شیطان اور فرشتے ساتھ ساتھ نہیں پیدا کئے۔ گو یا خیر کی انتہا یہ ہے کہ شر ہو جائے لیکن انتہا اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ لطف تو بین بین میں حاصل ہوتا ہے اور اسی لئے خدا نے انسان کی تخلیق کی جس میں ملکوتی اور شیطانی دونوں صفات موجود ہیں۔ گو یا انسان خیر اور شر دونوں پر قابو رکھتا ہے اور یہی وجہ کائنات میں اُس کے اشرف ہونے کی ہے۔

اُوشا۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسانی جذبات و احساسات کی تحریک یا تو خیر سے ہوتی ہے یا شر سے یا دونوں محرک ہوتے ہیں۔

شاہد۔ ہاں۔

اوشا۔ اور تم جانتے ہو کہ محبت بھی ایک جذبہ ہے خواہ وہ تمہارے خیال میں واہمہ ہی سے کیوں نہ پیدا ہوتا ہو۔

شاہد۔ ہاں، تو پھر۔

اوشا۔ تو یہ جذبہ خیر سے پیدا ہوتا ہے یا شر سے، یا دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔

شاہد۔ تم تو اُلٹ پلٹ کر وہی اپنے بے ڈھنگے آئیڈیل پر کھینچ لاتی ہو۔

اوشا۔ اور تم ہمیشہ اس سے بھاگتے ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محبت کی قوت اور عظمت کے تم بھی قائل ہو مگر اس ڈر سے کہ اس کا اثر تم پر نہ ہونے پائے اُس سے بچنا چاہتے ہو۔

شاہد۔ یہ تمہارا محض خیال ہے۔

اوشا۔ خیال ہی تو حقیقت ہے۔ تم کہتے تھے نا کہ دماغ میں کوئی ایسی بات آتی ہی نہیں جس میں حقیقت کا کچھ نہ کچھ شائبہ ہو۔

شاہد۔ ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن ....

اوشا۔ (روٹھ کر) تم تو ذرا سا دوستی کا خیال نہیں کرتے۔ میں نے ایک بات پوچھی۔ اُس پر غور کرکے سمجھا دو تو کیا تمہارا علم کم ہو جائے گا؟ اور معلومات بڑھ ہی جائیں گی۔

شاہد۔ (ہنس کر) اچھا تو روٹھی کیوں جاتی ہو۔ دیکھو میں اس پر غور کروں گا۔

اوشا۔ بس اب تم میرے پکے دوست ہو

اوشا کے اس خاص ادا سے کہنے پر شاہد نے جو جواب دیا اُوشا اس سے سمجھ گئی کہ اُس کا جادو اب شاہد پر رفتہ رفتہ اپنا اثر کر رہا ہے۔

(۴)

اب شاہد نے فلسفۂ محبت پر غور کرنا شروع کیا۔ سینکڑوں کتابیں پڑھیں اور پروفیسروں سے اس موضوع پر مباحثے کئے۔ جس قدر زیادہ وہ غور کرتا اُسی قدر زیادہ اُس کے خیالات اور عقائد میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوتا جاتا۔ اب وہ اُوشا کی اُن باتوں پر جو وہ محبت کے بارے میں کہتی مضحکہ نہیں اُڑاتا تھا۔ بلکہ کان دھر کے سنتا تھا۔ وہ صرف ایک خیال میں غرق رہتا تھا۔ محبت کیا ہے؟ وہ محبت کی حقیقت و ماہیت جاننا چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں اوشا کے لئے ایک نئی جگہ پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اوشا میں ایک کہربائی قوت، ایک مقناطیسی طاقت محسوس کر رہا تھا۔ وہ روز بروز اُس کو اپنے سے نزدیک تر پاتا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نامعلوم طاقت اُس کی رُوح کو اوشا کی روح میں آہستہ آہستہ جذب کر رہی ہے۔ اُسے اب اوشا میں ایک کشش، ایک طلسمی کشش دکھائی دیتی تھی۔ وہ اُس کی غیر موجودگی میں اپنے کو کھویا ہوا سا پاتا تھا۔ اُوشا اُس کے دل و دماغ میں بس گئی تھی۔ اُس کی شیریں اور محبت آمیز باتیں اُس پر اور زیادہ طلسمی اثر کرتی تھیں۔ اُسے ایسا نظر آتا تھا گو یا اُوشا عورت کے رُوپ میں محبت کا ایک مجسمہ ہے۔ اوشا اس اثر کو محسوس کر رہی تھی۔ اور اپنی کامیابی پر پھولوں نہیں سماتی تھی۔ اُس نے

اپنی کوششوں میں اور زیادتی کر دی تھی۔ ایک طرف تو وہ شاہد کو بیزو دبائے دیتی تھی اور دوسری طرف خود شاہد سے مسحور ہوئی جاتی تھی۔ تھوڑے عرصہ بعد خیر وشر کا فلسفہ تو دھرا رہ گیا اور میاں شاہد اپنے کو اُوشا کا عاشق پانے لگے مگر عاشق بھی فلسفیانہ رنگ کے۔

ایک روز شاہد اوشا سے کہنے لگا کہ "تم کو دیکھتا ہوں تو ساری کائنات حسین وخوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے"۔ اُوشا نے کہا "واہ۔ کیا فلسفہ ہے آپ کا، میری خوبصورتی سے دُنیا کیسے خوبصورت ہو سکتی"۔ شاہد بولا "خوبصورت پھولوں کے گلدستے کمرہ میں رکھو تو کمرہ کیوں خوشنما معلوم ہوتا ہے؟ اُوشا! تم میرے لئے کائنات کی زینت اور سجاوٹ ہو۔ تمہاری صورت لطف حُسن پیدا کرتی ہے۔ اُس کے بعد میں ہوں اور میرا لطف۔ شراب تم نے دی اور مست ہونے والا میں۔ جب میں مست ہوا تو میرے لئے ساری کائنات مست ہو گئی"۔

اوشا۔ تم مست ہو گئے۔ تمہارے لئے کائنات مست ہو گئی۔ مگر مجھے کیا فائدہ پہنچا! کاش تم محبت میں اپنے رُوکھے فلسفے کو دخل نہ دیتے۔ فطرت کے مطابق انسانوں کی طرح محبت کرتے۔

شاہد۔ فائدہ نقصان تو ادنیٰ درجہ کا خیال ہے۔ میں تو نہایت خود غرض ہوں۔ اپنے مزہ میں اپنے جسم تک کو تو شریک نہیں کرنا چاہتا اور تم چاہتی ہو تم کو بھی اس مزہ میں شریک کر لوں۔ پرستش کا مزہ بت نہیں جانتا اور نہ بُت پرست اپنے بُت کو پجاری بنانا چاہتا ہے۔

اوشا۔ خیر میں بُت بننا نہیں چاہتی۔

شاہد۔ تو پھر کیا چاہتی ہو؟

اوشا۔ تم نہیں جانتے؟

شاہد۔ نہیں۔ اور نہ جاننا چاہتا ہوں؟

اوشا۔ پھر پوچھا کیوں؟

شاہد۔ غلطی ہوئی۔

اوشا۔ تو اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

شاہد۔ دیکھو اوشا! تم مجھے تباہ و برباد نہ کرو۔

اوشا۔ واہ! میں نے کیا کیا؟

شاہد۔ تمہارا کچھ نہ کرنا ہی تو قیامت ہے۔ تم عین دنیا ہو۔ تمہاری کشش۔ خدا کی پناہ!

اوشا۔ میرے لئے تم عین دنیا ہو۔ فطرت کی قوت سے پناہ محال ہے۔

شاہد۔ مگر انسانیت تو اسی قوت پر قابو پانے کا نام ہے۔

اوشا۔ فطرت کے ماتحت رہنے میں لطف و مزہ ہے۔ اس حالت کو بدلنا حماقت ہے۔

شاہد۔ لطف اور مزہ کی تلاش تھک جانے کے آثار ہیں۔ تھکنا مادۂ حیات کی کمی ہے۔ جو عیش و مسرت کی تلاش کرے اُسے سمجھو کہ معنوی موت مر گیا۔

اوشا۔ تمہاری باتوں سے دماغ چکرانے لگا۔ سمجھتی ہوں مگر دماغ نہیں سمجھتا۔ بلند مینار پر چڑھ کر نیچے دیکھو تو دل چاہتا ہے اپنے کو نیچے پھینکدو۔ پیر نہیں جمتے۔ جی چاہتا ہے تم کو بھی اپنے ساتھ نیچے گھسیٹ لاؤں۔

شاہد۔ مگر میری تنزلی سے تمہیں فائدہ؟

اوشا۔ تمہارے خیال میں یہ تنزلی ہے۔ میرے خیال میں فطرت کے ماتحت رہنا ہی ترقی کی معراج ہے۔ دُوسرے فائدہ نقصان تو بقول تمہارے ادنیٰ درجہ کا خیال ہے۔ میں تو اپنے شوق کی رَو میں یہ چاہتی ہوں۔ مجھے نہ تمہارے نقصان کا خیال ہے نہ اپنے فائدے کا۔

شاہد۔ تمہاری نسوانیت کا تقاضا ہی یہی ہے۔ اُف! عورت کتنے بلند پرواز مردوں کو برباد کر چکی ہے، اور اُس پر ستم ظریفی یہ کہ معشوقیت کا دعویٰ کرتی ہے۔

اوشا۔ مرد کیوں ایسے لاچار و بے بس ہو گئے کہ شیر کے صرف سایہ پر ہاتھ ڈالنے ہی سے درخت کی ڈال چھوڑ دیں۔ اور نیچے آرہیں۔ اگر گر کا ڈوں سے ڈرتے ہو تو بلندی پر چڑھنے کا خیال ہی کیوں کیا۔ گوشہ نشین ہو کر مخلوقِ خدا کو کوستے اور فریاد کرتے کہ عورتیں مجھ تک آنے نہیں دیتیں۔ اِن کو ہٹائے تو اُڑ کر آجاؤں۔

شاہد۔ یہ تم کہہ رہی ہو کہ غیب سے آواز آرہی ہے۔

اوشا۔ غیب کے علاوہ بھی کہیں سے آواز آتی ہے۔ تم کو اب میرا چیلا ہو جانا چاہیئے۔

شاہد۔ ہوں تو چیلا۔

اوشا۔ کہاں ہو، کہا تو مانتے نہیں میرا۔

شاہد۔ خدا کب اپنا کہا منواتا ہے۔

اوشا۔ پھر گمراہی کی طرف ڈھلکے۔

شاہد۔ دیکھو نا۔ کھیر پکانے کے لئے دودھ اور چاول پتیلی میں ڈال کے آگ سلگا دو۔ کیا چاولوں کو زبانی یا تحریری حکم دو گی کہ گھُٹ کر کھیر بناؤ؛ کیا چاول کے امکان میں ہے کہ نہ گھُٹے اور کھیر نہ بنے۔ چاول کی گمراہی یہی اور صرف یہی ہے۔ کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ ایک بالاتر قوت کے ہاتھوں کوئی دوسری چیز بن رہا ہوں۔

اوشا۔ ارے۔ تم تو پھر چلے ہو گئے۔

اُس نے اپنا سر شاہد کے بازو پر رکھدیا۔ شاہد نے جذبات سے مغلوب ہوکر پیار کر لیا۔ اوشا مسکرائی اور کہا: "فطرت کی قوت بے پناہ ہے۔"

(۵)

ان واقعات کو چار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ شاہد اور اوشا دونوں کی تعلیم سے فراغت کو صرف چھ ماہ رہ گئے۔ ان چھ مہینوں میں دونوں کا جوشِ محبت اور زیادہ ترقی کرتا گیا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے، محبت کے عہد و پیمان ہو گئے۔ چونکہ ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا سے دُور تھے اور اپنے خیالات و جذبات کی رَو میں سب کچھ اپنے دماغ سے محو کئے ہوئے تھے۔ اس لئے دونوں میں سے کسی کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ وطن واپس جاکر اُن کی راہ میں کتنی دقتیں حایل ہوں گی۔ اب جو وطن واپس ہونے کا زمانہ قریب آیا تو ایک روز شاہد نے اوشا سے کہا "اوشا پیاری! دیکھو ہماری محبت کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

اوشا۔ (گھبرا کر) کیوں!

شاہد۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے والدین تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا پسند کریں گے؟ میرے والد تو خیر بڑے روشن خیال ہیں۔ اُنکا خیال ہے کہ قومی یگانگت اور طاقتور ہندوستانی قوم بنانے کے لئے ہندو مسلم شادیوں کا رواج دینا بہت ضروری ہے۔ مگر تم کیا کرو گی؟

اوشا۔ میرا ذاتی خیال بھی بالکل تمہارے والد جیسا ہے (پھر متفکر ہوکر) ہاں اب یہ سوچنا ہے کہ میں اپنے والدین کو کس طرح رضامند کر دوں (تھوڑی دیر بعد) خیر۔ والدین کے رضامند کرنے کا خیال بیکار اور عبث ہے، وہ لوگ حد درجہ کے فرقہ پرست اور متعصب ہیں ـــــ مگر ـــــ میں سب سے کنارہ کش ہو جاؤں گی۔ میں اپنے پریم کی بھینٹ اُن کی فرقہ پرستی اور تعصب پر نہیں چڑھا سکتی۔ میں اب قانوناً بالغ ہوں، لہٰذا وہ مجھ سے کسی بات میں زبردستی نہیں کر سکتے۔ گو مجھے کافی رنج انھیں چھوڑنے میں ہوگا ـــــ

شاہد پیارے! تم کو متفکر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اوشا نے یہ کہکر اپنے دل کو بہلا لیا۔ اُس کے دماغ میں آنے والے واقعات کے خاکے آتے تھے مگر وہ سب کو لاپرواہی سے اپنے دماغ سے نکال دیتی تھی۔ اُس نے خیال کیا کہ ہندوستان چل کر ان باتوں پر غور کروں گی۔ اتنے دن کیوں اپنا دماغ بیکار کے واسطے پریشان کروں۔

آخر کار نتیجہ معلوم ہونے کا دن آیا، شاہد اور اوشا اچھے ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ اُوشا نے سیٹھ شنکر چند کو کراچی تار دیا کہ وہ ہوائی جہاز سے دوسرے روز ہندوستان کے لئے روانہ ہو جائے گی۔ شاہد نے بھی اُس کے ساتھ ہی رختِ سفر باندھ لیا۔ وہ لکھنؤ کا رہنے والا تھا، اُس نے کہا کہ کراچی ایروڈروم سے لکھنؤ اپنی آمد کا تار دوں گا اور ریل کے ذریعہ سے لکھنؤ پہونچوں گا۔

دوسرے روز شاہد اور اوشا "امپیریل ایرویز" کے ایک جہاز پر ہندوستان روانہ ہوئے۔ جہاز کا ایک کمرہ اُن کے لئے ریزرو تھا۔ رات کو اوشا نے شاہد کے گلے میں ہاتھ ڈال دئے، اور اُس کے گلے کا ہار ہو گئی۔ شاہد کا ضبطِ نفس جواب دے گیا۔ جذبۂ محبت کا فعل جسم پر زور شور سے ہونے لگا۔ پہلے دونوں کے گال ملے۔ پیار شروع ہوئے، پہلے چند پیار انسانیت کے تھے، تہذیب و شائستگی اُن میں تھی۔ مگر اوشا کے سینے کی گدازگی سے جب شاہد کا جسم مَس ہوا تو اس سربستہ راز اور اُس کی مسرتوں کی تلاش میں وہ مصروف ہو گیا۔ اب جو پیار شروع ہوئے وہ انسانیت سے خارج تھے۔ شاہد اور اوشا دونوں غیر انسان تھے، عالمِ لذات میں دونوں غائب تھے جسم جو جہاز پر دکھائی دیتے تھے وہ اُن کی غائب شدہ ہستی کی پرچھائیاں تھیں۔

(۶)

ساتویں روز صبح چھ بجے ہوائی جہاز کراچی ایروڈروم پر اترا، سیٹھ شنکر چند، سُریندر جو امریکہ سے واپس آچکا تھا اور بہت سے لوگ استقبال کے لئے موجود تھے۔ سیٹھ جی اُوشا کو دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے،

اُس نے شاہد کا سب سے تعارف کرایا اور کہا کہ تم آج شام تک ہمارے
ہی یہاں ٹھیرو۔ رات کی گاڑی سے لکھنؤ چلے جانا۔ سیٹھ جی نے شاہد کو اچھی
نظروں سے نہیں دیکھا۔ خاصکر جب اوشا سریندر سے رُکی رُکی ملی تو اُن کو
سخت تعجب اور بیحد غصہ آیا۔ مگر اپنے غصّہ کو دبائے رہے۔

دن بھر اوشا زیادہ تر شاہد سے باتیں کرتی رہی جس کو اس کے
والدین اور سریندر وغیرہ نے اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ اس کی ماں نے سیٹھ جی سے
کہا "اچھا بٹیا نے تم سے دل لگایا ہے۔ باتوں سے فرصت ہی نہیں" سیٹھ جی
بولے "روشن خیال لڑکی ہے کوئی بات نہیں۔ وہ لڑکا آج رات کو تو چلا
ہی جائے گا۔"

اُوشا کی ماں۔ ہاں۔ بٹیا ولایت کیا ہو آئیں کہ باپ پھولے ہی
نہیں سماتے۔ وہ جو کچھ کریں سب ٹھیک ہے۔ خیر۔ مجھے کیا؟ خود ہی پچھتاؤ گے۔

سیٹھ جی۔ تم تو پاگل پن کی باتیں کرتی ہو۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

شام کو شاہد لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ جانے سے پیشتر اوشا میں اور اس
میں قریباً ایک گھنٹہ تک رازدارانہ طور پر گفتگو ہوتی رہی۔ اوشا اُسے اسٹیشن
پہنچانے گئی۔ اسٹیشن ہی پر سے شاہد نے اپنے والد کو اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ
تار دے دی۔

دو تین روز بعد سیٹھ جی نے اوشا سے کہا کہ اُن کا ارادہ ہے کہ اُس کی
شادی ایک ہی آدھ ماہ کے اندر سُریندر سے کر دیں۔

اوشا بولی۔ ابھی جلدی کاہے کی ہے؟

سیٹھ جی۔ نہیں میری خوشی یہی ہے کہ جلد از جلد شادی ہو جائے۔

اوشا۔ پتا جی! میں آپ کو زیادہ عرصہ تک دھوکے میں نہیں رکھنا
چاہتی۔ بات در اصل یہ ہے کہ مجھے سُریندر سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

سیٹھ جی حیرت زدہ اور ہکّا بکّا ہو کر اُسے دیکھنے لگے۔ اُس کی ماں بولی
"دیکھا بٹیا کو ولایت بھیجنے کا نتیجہ۔ کیوں نہ ہو، روشن خیال لڑکی ہے (غصہ میں
اوشا سے) اری اوشا! تجھ کو یہ کہتے شرم نہیں آتی۔ ہندو کنیا اور اتنی دیدہ
دلیر۔ آنکھ کا پانی مر گیا۔ ایک تو آپ کے والد صاحب کو آپ کے مشورہ ہی
کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارا جو دستور ہے ہم اُسی پر عمل کریں گے۔ شادی بیاہ
کے معاملہ میں تجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اوشا۔ واہ ماتا جی! میں ایسی باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ اگر
ایسا ہی تھا تو مجھے پڑھایا لکھایا ہی کیوں؟"

سیٹھ جی۔ نہیں بیٹی، کوئی زبردستی نہیں کر رہا ہے۔ مگر یہ تو سوچ کہ شادی
سے پہلے تو کسی کو بھی اپنے پتی سے لگاؤ نہیں ہوتا۔ بیاہ بعد سب لگاؤ اور پریم
ہو جاتا ہے۔

اوشا۔ نہیں پتا جی، میں سُریندر سے ہرگز شادی نہیں کرنا چاہتی۔

اوشا کی ماں۔ تجھکو کرنا پڑے گی۔ ہم برادری میں ذلیل اور کھلونا تو نہ
بنیں گے۔

اوشا۔ نہیں ماتا جی، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

سیٹھ جی۔ اچھا تو پھر تو ہی بتا تو کس سے بیاہ رچانا چاہتی ہے۔

اوشا کی ماں۔ ارے رام رام۔ ذرا سی چھوکری اور یہ باتیں۔
ابھی تم اور اُسے سر چڑھا رہے ہو۔

اوشا۔ ماتا جی، آپ اس بیچ میں نہ بولئے۔ پتا جی! سچ پوچھئے تو
مجھے شاہد سے پریم ہے۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ میری
زندگی چاہتے ہیں تو مجھے شاہد سے سول میرج کرنے دیجئے۔ ہمارے بچے
خالص قوم پرست بچے ہوں گے۔..........

یہ سننا تھا کہ سیٹھ جی اور اُن کی بیوی کا پارہ بیحد چڑھ گیا۔ لڑکی
کو بہت مارا۔ اپنی بیوی سے سیٹھ جی بولے "بیاہ کا سامان کرو۔ پرسوں ہی
سُریندر سے زبردستی اس کا بیاہ کئے دیتا ہوں۔ ورنہ آگے بات بہت
بڑھ جائے گی۔"

اوشا۔ (رو کر) پتا جی میں خودکشی کر لوں گی۔

سیٹھ جی۔ مر تو کہیں کلنکنی۔ یہ کہہ کر پنڈت جی غصہ میں باہر چلے گئے۔

دن بھر اوشا پر تھو تھو پھٹکار پڑتی رہی۔ رات کو باہر سے اُس کے
کمرے میں قفل ڈال دیا گیا۔ مگر اتفاقاً دوسرا دروازہ جو باہر پائیں باغ میں
کھلتا تھا کھلا رہ گیا۔

دوسرے روز صبح جب سب لوگ اُٹھے تو اوشا غائب تھی اور پائیں
باغ والا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ کمرہ میں سیٹھ جی کے نام حسب ذیل خط تھا۔

پتا جی! میں پہلے ہی ٹھان چکی تھی کہ فرقہ پرستی اور تعصب
پر اپنے پریم کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتی۔ آپ لوگوں نے
مجھ پر بیحد ظلم کیا۔ میں شاہد کے پاس جا رہی ہوں۔ امید ہے

کہ آپ اس واقعہ کا بڑھا چڑھا کر اپنے کو بدنام نہ کریں گے۔
اگر آپ نے عدالتی چارہ جوئی کی تو میں صاف صاف
آپ کے خلاف بیان دوں گی۔ میں چونکہ اب قانوناً بالغ
ہوں۔ لہٰذا آپ کو میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی
مجاز نہیں ہے۔
اوشا

سیٹھ جی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اپنی بیوی کو خط پڑھ کر سنایا۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ نریندر آیا ہوا تھا۔ وہ بولا "چاچا جی، جانے دیجئے، ایسی کلنکنی کا چلا جانا ہی اچھا ہے" مگر لڑکی کی محبت بغیر آنسو بہائے نہ رہ سکی۔ دونوں میاں بیوی کی عجیب حالت ہو گئی، چونکہ بیحد متعصب اور کٹر سناتنی تھے۔ اس لئے لڑکی کی محبت پر تعصب نے غلبہ پا لیا اور چپکے ہو بیٹھے۔ گو اکلوتی لڑکی کے اس طرح نکل جانے کا صدمہ اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ مگر چہرے سے کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی تھی جس سے پتہ چلتا کہ اُن کو اپنی لڑکی کے لئے تشویش ہے۔

(۷)

شاہد جب لکھنؤ پہنچا تو اُس کا زبردست استقبال اُس کے احباب کی طرف سے ہوا۔ اپنے باپ کے ساتھ چونکہ اکثر قومی پلیٹ فارم پر آ چکا تھا اس لئے کافی ہر دلعزیز ہو چکا تھا اور ایک وسیع حلقۂ احباب رکھتا تھا۔ اُس کی آمد کی خبر سنکر لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے جو اُس کے استاد رہ چکے تھے اُس کا نام شعبۂ فلسفہ کے ہیڈ کی جگہ کے لئے جو خالی تھی نامزد کر دیا، دوسرے ماہ سے اُس کی باقاعدہ تقرری اس جگہ پر ہونے والی تھی۔ باپ نے اُس سے کہا کہ وہ قومی کاموں میں بھی نمایاں حصہ لے۔ اُس نے کہا کہ میرا دماغ اور طبیعت اس کے لئے موزوں نہیں ہے کہ میں لیڈری کروں میں اپنے طور پر اپنے دوستوں میں اور ملنے والوں میں ضرور قومی خیالات کی تبلیغ صحبتوں کے ذریعہ سے کروں گا اور سماجی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔

چند روز بعد اُس نے باپ کا عندیہ لینے کے لئے اُوشا کا حال بیان کیا، اور اُس نے اپنی محبت کا ذکر کیا۔ باپ بولے "بیٹا، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مسلمان لڑکا ہندو لڑکی سے محبت کرے، نہایت ذلیل خیال ہے۔ تم اُس کا خیال چھوڑ دو۔ خدا کے فضل و کرم سے تم ماشاء اللہ قابل و لائق ہو، ایک سے ایک اچھی مسلمان لڑکیاں تمہیں مل جائیں گی" شاہد باپ کی یہ گفتگو سنکر حیرت زدہ رہ گیا۔ اُس نے کہا "آپ ہی تو چند سال اُدھر اپنی تقریروں میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے تھے اور مخلوط شادیوں کو سراہتے تھے"

باپ۔ یہ تو میری پالیسی تھی۔ پبلک پلیٹ فارموں پر تقریریں عمل کیلئے نہیں کی جاتی ہیں۔ تم ہی سوچو میں کافروں کے ساتھ مسلمانوں کی شادیوں کو کیسے انگیز کر سکتا ہوں۔

شاہد۔ معاف فرمائیے گا۔ میں اس کو پالیسی، نہیں ریاکاری سمجھتا ہوں۔ اپنے نام و نمود کے لئے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کو سیاست اور پالیسی کا لقب دینا۔ میں ایسی سیاست اور پالیسی کا قائل نہیں ہوں۔

باپ۔ شاہد، تم نہایت بدتمیز ہو گئے ہو۔ کہہ یا تم سیاست میں ابھی طفلِ مکتب بھی نہیں ہو۔ تم ان چالوں کو کیا جانو۔

شاہد۔ جناب میں خوب جانتا ہوں۔ ایسے ہی لیڈروں نے تو ملک کو تباہ کیا ہے۔

باپ۔ بس بس، جتنا خاموش رہتا ہوں اُتنا ہی سر چڑھا آتا ہے، نابکار! مجھے کیا معلوم تھا ولایت سے عیاش ہو کر آئے گا۔ میں اب تیری زبان سے اُس کافر بچی کا نام نہ سنوں۔

شاہد۔ ابا جان! اس معاملہ میں میں بالکل مجبور ہوں، اپنے ضمیر کو کسی غلط اصول پر قربان نہیں کر سکتا۔ اوشا میری ہے اور میری ہی رہیگی۔

باپ۔ ناخلف۔ اگر ایسا ہی ہے تو میرے گھر میں تیرے لئے ٹھکانا نہیں ہے۔

شاہد۔ (غصہ میں) بہت اچھا۔ اگر یہی حکم ہے تو میں تعمیل کو تیار ہوں۔

اس گفتگو کے تھوڑی دیر بعد شاہد اپنا سامان لے کر اپنے ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ اُس کے چلے جانے پر اُس کی ماں بیحد روئیں، اور باپ سے بولیں "لو خوش ہوئے جوان بیٹے کو گھر سے نکال کر"

باپ۔ ہاں تو بیٹے کو بٹھائے رکھتا اور ہندنی بیاہ لاتا۔

ماں۔ ہندنی کیسی۔ میں تو اُسے سمجھا بجھا لیتی۔

باپ۔ میں نے کوئی کم سمجھایا۔ وہ تو تم جانتی ہی ہو بچپن سے بیحد ضدی ہے۔

ماں۔ تو تمہارے سمجھانے پر وہ کیا بولا۔

باپ ۔ بولا کیا ۔ کہنے لگا میں بغیر اُس کے نہیں رہ سکتا ۔ ورنہ خودکشی کرلوں گا ۔

ماں ۔ خیر یہ بات بہت دن نبھنے کی نہیں ۔ چند روز بعد آپ ہی آجائیگا ۔ اور اگر نہ آئے تو میری جُوتی سے ۔ ہندنی کو تو میں کبھی اپنی بہو بنا کر اس گھر میں نہیں لاسکتی ۔

(۸)

اُوشا رات کو اپنے کمرہ سے ایک بیگ میں چند جوڑے کپڑے اور کچھ روپیہ اور زیورات لے کر سیدھی اسٹیشن پہنچی ۔ چونکہ اس وقت لکھنؤ کوئی گاڑی نہ جاتی تھی ۔ لہٰذا لاہور کا ٹکٹ لیا ۔ دوسرے روز شام کو لاہور سے سوار ہوئی ۔ اور تیسرے روز سہ پہر کو چار باغ پر اُتری ۔ ٹانگہ کیا ۔ شاہد کے والد کے مکان پر پہونچی ۔ وہ موجود نہ تھے ۔ نوکر سے شاہد کے اپنے دوست کے یہاں جانے کا حال معلوم ہوا ۔ پتہ پوچھکر وہاں پہنچی ۔ شاہد باہر ہی ٹہل رہا تھا ۔ اُسے دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گیا ۔ اپنے دوست سے اوشا کا تعارف کرایا ۔ دونوں نے اپنی اپنی بپتیاں بیان کیں اور عہد کیا کہ اپنے سابقہ پیمان پر ثابت قدم رہیں گے ۔

دوسرے روز شاہد اور اُوشا کی سِول میرج ہوگئی ۔ اُس کے بہت سے احباب ، یونیورسٹی کے پروفیسران اور وائس چانسلر صاحب تقریب میں شریک تھے ۔ وائس چانسلر نے دونوں کو بہت مبارکباد دی اور شاہد کی یونیورسٹی میں تقرری ہونے تک دونوں میاں بیوی کو اپنا مہمان بنایا ۔ شہر کے سوشلسٹوں اور روشن خیال لوگوں نے امین الدولہ پارک میں ایک عام جلسہ منعقد کرکے شاہد اور اوشا کو سماجی زندگی کے اس انقلابی قدم پر مبارکباد دی اور سماجی اصلاحات پر پُرمغز اور زبردست تقاریر کی گئیں ۔

شادی کے دوسرے روز ہندوستان بھر کے اخبارات نے نہایت جلی سرخیوں سے خبریں شائع کیں ۔ اوشا کی ماں اپنی بیٹی کی ایک مسلمان کیساتھ شادی کی اس تشہیر کو برداشت نہ کرسکیں اور زہر کھا لیا ۔ سیٹھ جی کو بیحد غم ہوا ۔ لیکن مرد کی فطرت قوی ہوتی ہے ۔ وہ اپنے غم و غصہ کو ضبط کئے رہے ۔ شاہد کے باپ نے اُسے عاق کردیا ۔ اُن کے اس فعل پر اُن کی ساری سیاسی زندگی اور نام و نمود اکارت ہوگیا ۔ لوگوں نے کہا کہ کل یہی حضرت اس فعل کی تلقین کرتے تھے ، اور آج جب بیٹے نے اُس پر عمل کیا تو ایک دم سیدھے سادے مردِ مسلمان بن بیٹھے ۔ اُن کی سوشل لائف بالکل بیکار ہوگئی اور وہ اپنی ریاست کے انتظام کی دیکھ بھال کے لئے دیہات چلے گئے ۔ شاہد نے کہا ایسے لیڈروں کا ریٹائر ہوجانا ہی اچھا ہے " شاہد کی ماں غضب کے دل و جگر کی عورت تھی ۔ شاہد کو دیکھنے کی خواہش اُس کے دل میں رہ رہ کر اُٹھتی تھی ۔ اور بیٹے کی محبت دل میں چٹکیاں لیتی تھی ۔ مگر اُس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا ۔ وہ حد درجہ کی متعصب عورت تھی تعصب نے بیٹے کی الفت کو ظاہرا دبا دیا ۔ مگر دل کے اندر کی چنگاری برابر سلگتی رہی ، اور چھ ماہ بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا ۔ اس خبر کو سنکر شاہد نے اوشا سے کہا " اوشا پیاری ! دیکھو عورتوں کی تعلیم کی کس قدر زیادہ ضرورت ہے مرد اپنی فطرت کی وجہ سے پھر بھی راہ راست پر جلد آسکتے ہیں ۔ مگر عورت کو سمجھانا ـــــ خدا کی پناہ ! ـــــ کسی کامل نے کہا ہے عورت قوموں کی بنانے والی ہے ۔ بھلا جس ملک کی عورتوں کے تعصب اور جہل کا یہ حال ہو کہ وہ تعصب کی بنا پر اپنی جانیں دے سکتی ہوں اُس ملک کے باشندوں کا کیا حال ہوگا "

اوشا ۔ ہاں پیارے ۔ تعلیم نسواں واقعی ملک کے لئے سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے ۔

شاہد ۔ تو تم خواتین کی ایک انجمن قائم کرو ۔ ہر طبقہ اور ہر اعتقاد کی عورتوں کو اس کا ممبر بناؤ ۔ اپنے کو اُن میں ہردلعزیز کرو اور پھر اپنے خیالات کا پرچار کرو ۔ اگر عورتوں پر تعلیم کی اہمیت ظاہر ہوگئی تو پھر دیکھو کیا رنگ ہوتا ہے ۔ ہر بیوی اپنے میاں پر مسلط ہوگی ۔ کہ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی ضرور تعلیم دلاؤ ۔ قدیم خیالات کے مردوں کے بھی اس طرح سے درست ہوجانے کی امید ہے ۔

اوشا ۔ ہاں ، یہ بڑا مبارک خیال ہے ۔ تم وائس چانسلر صاحب سے بھی اُس کا ذکر کرو ۔ پھر ہم لوگ مل کر اس کارِ عظیم کو انجام دینے کی کوشش کریں ۔

(۹)

بیوی کے مرجانے سے سیٹھ شکم چند کا دل ٹوٹ گیا ۔ کاروبار سے لاپرواہی برتنا شروع کردی ۔ دوستوں نے کوشش کی کہ کسی طرح ہر رنج و غم

ہو جائے۔ اُن کی پے در پے کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیٹھ جی کو دُنیا سے دوبارہ لگاؤ پیدا ہونا شروع ہوا۔ مگر یہ لگاؤ پہلے لگاؤ سے مختلف تھا۔ پہلے وہ ایک گرہست آدمی تھا۔ اب گھر سے لاپرواہ۔ پہلے اُن کا دُکھ سُکھ بیوی کے دُکھ سُکھ میں مدغم تھا۔ اب اُن کو دنیا کے "جو فروش گندم نما" لوگوں سے واسطہ تھا۔ پہلے اگر وہ غم سے متاثر ہوتے تھے تو اب کسی کو غمگین دیکھکر منہ پھیر لیتے ہیں۔ اب اُن کو دُنیا میں ہر طرف مسرت کی تلاش تھی۔ وہ عیش و عشرت میں اپنے کو فنا کر دینا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے جُوا کھیلنا شروع کر دیا۔ شراب بھی اب اُن کے لئے آبِ حیات سے کم نہ تھی۔ لوگ اُن کی یہ حالت دیکھکر اُن کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ عورتیں اُن پر نام رکھتی تھیں۔ ہر شخص یہی کہتا کہ دیکھو تو بدھے کو کیا جنون سوار ہوا ہے۔ لیکن کیا واقعی وہ خطاوار تھے؟ سنگدل سماج جو کچھ کہے لیکن میں اُسے نہیں مان سکتا۔ سماجی بندشوں نے اُن کی بیٹی کو اُن سے علیحدہ کیا۔ اُن کی بیوی کو اُن سے ہمیشہ کے لئے جُدا کیا۔ اور اب اُنھیں بندشوں کو سراہنے والی سماج اُن کو موردِ الزام ٹھیرا رہی تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر ایک مرتبہ دلدوز اور متاثر کُن واقعات کی وجہ سے کوئی شخص تارکِ الدنیا ہو جائے اور اُس کے بعد پھر کسی طریقہ سے دُنیا کی طرف رجوع ہو تو وہ ہرگز ہرگز رنج و غم کا نام بھی نہ سُننا چاہے گا۔ وہ اُن کے تلخ تجربات خوب اُٹھائے ہوتا ہے۔ وہ اب دنیا کو مسرت میں رنگی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت بھی اگر کوئی شخص بغیر سختیاں جھیلے راہِ راست پر آجائے تو وہ انسان نہیں کچھ اور ہی ہے۔ فرشتہ یا ابلیس!

غرضکہ یہ کہ اب سیٹھ سُکھ چند ہر وقت شراب کے نشہ میں مست یا تو جُوا کھیلتے رہتے تھے۔ یا ایک طوائف کے یہاں، جس سے اُنھوں نئی نئی راہ و رسم پیدا کی تھی۔ بڑے خوش گپیوں میں مصروف رہتے تھے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اُنھوں نے جُوئے کے ساتھ ساتھ طوائف پر سے بھی اپنی دولت بے اندازہ لُٹانا شروع کر دی۔ خود حساب کتاب نہ دیکھنے کی وجہ سے کاروبار پہلے ہی بیٹھا جا رہا تھا، اب اور بدتر حالت ہو گئی۔ اُن کے مختار نے بہتیرا سمجھایا مگر وہ اپنے آپے ہی میں کب تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار بالکل بیٹھ گیا۔ قرض لینا شروع کیا گیا۔ دو تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ روپیہ یوں آسانی سے وصول ہونے کی امید نہیں ہے تو دعوے دائر کر دئے۔ چھپنوں مقدمات لڑے جاتے۔ رہا سہا سرمایہ اُن کی نذر ہو گیا۔ انجام بانجام رسید کہ ڈگری ہو گئی۔ سیٹھ جی نشہ کی حالت میں مکان سے نکال باہر کئے گئے۔ اس وقت کوئی نہ تھا جس کو اُن پر رحم آیا ہو۔ اور جو ان کو پناہ دینے کے لئے تیار ہوا ہو۔ سماج کس قدر ظالم ہے۔ خود ہی انسان کو تباہ کرتی ہے اور خود ہی اُسے موردِ الزام بناتی ہے۔ سماج انسانیت کے خلاف ایک عظیم نظام ہے۔ دھوکا اور فریب سے لبریز۔

اسی نشہ کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ اپنی طوائف کے یہاں پہونچے۔ اُسے پہلے ہی خبر ہو چکی تھی کہ سیٹھ جی کا دیوالہ نکل گیا ہے۔ کمرہ میں اُن کے قدم رکھتے ہی اُس نے "بدمعاش! بدمعاش!" چلانا شروع کر دیا۔ بھڑوؤں اور سازندوں نے مار مار کر اور گالیاں دے دے کر سیٹھ جی کو کوٹھے سے دھکے دے دے کے باہر نکال دیا۔ مار کھاکر سیٹھ جی کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اب اُن کی سمجھ میں واقعات کا سلسلہ آیا۔ آدمی سمجھدار اور ذہین تھے۔ اپنی بدقسمتی اور سماج کی سنگدلی پر بے انتہا پھوٹ پھُوٹ کر رو دئے۔ ظاہرا یہ فطرت کے خلاف ہے کہ کوئی عیاش شخص اس قدر جلد سنبھل جائے۔ لیکن عظیم الشان واقعات فوری انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ گھڑی کی گھڑی میں سیٹھ جی کا قلاّش اور بے گھر و بار ہو جانا اور اُس پر مزید اضافہ یہ کہ دُنیا کا ایک دم اُن سے آنکھیں پھیر لینا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ شروع سے اپنی زندگی کا پورا خاکہ اُن کے دماغ میں آیا اور نکل گیا۔ آج اُن کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سماج کتنی سنگدل اور ظالم ہے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے "اوشا کتنا سچ کہتی تھی کہ پتا جی سماج ایک دھوکہ ہے۔ ایک رنگین دھوکہ۔ اس کی بندشیں مکر و فریب سے پُر اور تعصب و بربریت سے لبریز ہیں"۔

اس حالت میں دن بھر سیٹھ جی ایک ایک کر کے اپنے دوستوں کے یہاں گئے کہ شاید کوئی رحم کھاکر اُن کو پناہ دینے پر تیار ہو جائے۔ بہتوں نے تو ملنے تک سے انکار کر دیا۔ اور جو ملے انھوں نے جھڑک کر کہا "ایسے بدمعاشوں کا ہمارے یہاں گزر نہیں۔ ہمیں اپنا گھر تھوڑی برباد کرنا ہے"۔ اسی آیند و روند میں رات ہو گئی۔ بھوک کے مارے سیٹھ جی کو چلنے کا یارا نہ رہا۔ سر چھپانے کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ آدمی غیرتدار تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ سڑک پر ایک دوکان کے آگے چبوترے پر لیٹ گئے اور

رات گزار دی۔ دوسرے دن دوپہر تک اپنی خودداری پر اڑے رہے۔ بھیک مانگنے کی ہمت نہ پڑی۔ جب بھوک نے بالکل بیتاب کر دیا۔ تو اُن کے دل میں سماج سے بغاوت کی آگ بھڑکنا شروع ہوئی۔ اُنھوں نے کہا "خودداری! خودداری کس کے سامنے برتی جائے۔ کوئی انسان بھی ہو؟ اب اُنھیں اپنی عزت ذلت کا بالکل خیال نہ رہا۔ اُنھوں نے ہتیہ کر لیا کہ سماج کی اس سنگدلی کا زبردست انتقام لیں گے۔ انتقامی جذبہ نے اُن میں پھر سے قوت و طاقت پیدا کر دی۔ اُنھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بھاگتے ہوئے وہ اپنے ایک مالدار دوست کے یہاں پہونچے۔ وہ اپنی کوٹھی کے باہر باغ میں ٹہل رہا تھا۔ پہنچتے ہی اُنھوں نے لپک کر اُس کا گلا پکڑ لیا اور اسی ہئیت میں کہ کف منہ سے جاری تھا کہنا شروع کیا "نابکار! تجھے کیا حق ہے کہ غریبوں کے سرمایہ کو چوس چوس کر اپنی تن پروری کرے۔ میں اپنے احسانات تجھ پر نہیں جتانا چاہتا۔ لیکن غریبوں کے سرمایہ کو غصب کر لینے کا تجھے کیا حق ہے۔ حرامزادے کتے! تجھے کیا حق ہے کہ میرے بھوکا رہتے ہوئے خود شکم سیر ہو۔ او بدنام کنندۂ انسانیت! تو کس منہ سے اپنے کو انسان کہتا ہے۔ بدمعاش! تو جانور ہے! جانور سے بدتر:۔۔۔۔۔۔۔۔۔" اُس نے یہ کہکر "پہلے اپنے ماضی پر تو نظر کر" نوکروں کو حکم دیا کہ اسے گردن پکڑ کر نکال دو"۔

سیٹھ جی لاکھ گالیاں دیتے رہے اور سماج کو کوستے رہے لیکن نوکروں نے زبردستی دھکے دے دے کے اور مار مار کے باہر نکال دیا۔ اُن کے اس قدر کافی چوٹ لگ گئی تھی کہ وہیں سڑک کے کنارے کراہتے ہوئے گر پڑے۔ اُس مکان کے قریب ہی ایک غریب مسلمان کلرک کا مکان تھا۔ وہ ولائت کا گریجویٹ لیکن زمانہ کی گردش کا پسا ہوا تھا۔ سنگدل سماج کا کسی زمانہ میں وہ بھی شکار رہ چکا تھا۔ کراچی بھر میں وہ اکیلا انسان تھا جسے سیٹھ جی کی حالت پر ترس آیا ہو۔ اس وقت وہ دفتر سے گھر واپس جا رہا تھا۔ چونکہ خود تکلیفیں اُٹھا چکا تھا اور سوسائٹی کے بے پناہ مظالم کا شکار ہو چکا تھا لہٰذا سیٹھ جی کو اس ہئیت میں دیکھکر اُس کا دل بھر آیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور یہ کہتے ہوئے ع

دیکھنا اے اہلِ عبرت آسماں کے ظلم کو

وہ سیٹھ جی کے قریب آیا۔ اُن کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رویا اور کہنے لگا "سیٹھ جی! شاید اب آپ کی آنکھیں کھل گئی ہوں سماج اور اُس کے بنائے ہوئے مذہب پر جان نثار کرنے والوں نے آپ کو امن و شانتی کا خوب پیغام دیا۔ مذہب کے نام پر اپنی جانیں قربان کر دینے والوں نے اپنے ایک ہندو بھائی کے ساتھ کیسا اچھا برتاؤ کیا!"

سیٹھ جی۔ "بھیا کیا دُنیا میں ابتک تمہارے جیسے پُرش باقی ہیں۔ سماج اور اُس کے بنائے ہوئے مذہبی تفرقے ایک دھوکا ہیں۔ کسی ہندو کو مجھ پر رحم نہ آیا۔ سچ ہے اچھے لوگ ہر دھرم میں ہوتے ہیں۔"

وہ۔ "سیٹھ جی۔ ہندو مسلمان کیا؟ انسانیت سے بلند اور عظیم کوئی مذہب نہیں ہے۔ انسان انسان میں تفرقہ کیسا؟ یہ سب پُرفریب سماج کے بنائے ہوئے ڈھونگ ہیں۔ مذہب کا کام گمراہوں کو راہِ راست پر لانا اور اُنھیں ہدایت کرنا ہے نہ کہ اُنھیں انسانی برادری سے خارج کرکے مجرمانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دینا۔"

وہ شخص سیٹھ جی کو اپنے مکان پر لے گیا۔ کھانا اُن کے سامنے رکھا وہ ذرا ہچکچائے۔ اُس نے کہا "سیٹھ جی۔ یاد رکھئے انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں ہے"۔

سیٹھ جی جب کھانا کھا چکے تو وہ بولا "اب آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ اپنی بیٹی کو چھوڑ دینے سے آپ نے کتنی عظیم غلطی کی، انسان انسان سب ایک ہیں۔ سماج نے تو اس قدر بندشیں عاید کر دی ہیں کہ ہندو ہندو میں بَیر اور مسلمان مسلمان میں دشمنی۔ اگر آپ کی لڑکی ان سماجی بندشوں کو توڑ کر ہندو مسلمان میں محبت کی تخم ریزی کرنا چاہتی تھی تو یہ کیا بُرا خیال تھا۔ آپ کی لڑکی تعلیمیافتہ تھی۔ اُسے سماج کی حقیقت و ماہیت کا بخوبی علم تھا۔ مذہبی تفرقے سماج کے بنائے ہوئے رنگین دھوکے ہیں۔ انسانیت ان میں جکڑی نہیں جا سکتی۔ وہ ان قیود سے آزاد اور ان ذہنیتوں سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے"۔

سیٹھ جی۔ "بھیا! انسان کچھ کھو کے سیکھتا ہے۔ سچ ہے مذہبی تفرقے دھوکوں کی ٹٹیاں ہیں۔ خدا ان کے مکر و فریب سے بچائے۔ تمہارا یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا کہ "انسانیت سے ارفع و اعلیٰ کوئی مذہب نہیں ہے"۔

وہ۔ "تو سیٹھ جی! آپ اب اپنی لڑکی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔ شاید لکھنؤ میں رہتی ہے۔ لکھنؤ میں اُن کی شادی بھی ہوئی۔ وہاں تک کا کرایہ میں حاضر کر دوں گا۔

سیٹھ جی ۔ بیٹا میں تمہارے احسانات سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتا ۔ سچ ہے انسانیت تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے ۔ میں آج ہی شام کو لکھنؤ روانہ ہوتا ہوں ۔ اپنی لڑکی کا میں نے بڑا دل دکھایا ہے ۔ اس سے اوشا، مانگوں گا ۔ شاہد کو اپنا بیٹا سمجھوں گا ۔ شُر بیندر سے مجھے نفرت ہو گئی ۔ کل اس کے باپ نے اور اُس نے ملنے تک سے انکار کر دیا ۔ سچ ہے انسانیت سب مذہبوں سے بلند اور عظیم ہے ۔

(۱۰)

تیسرے روز صبح کو سیٹھ جی چار باغ اسٹیشن پر لکھنؤ یونیورسٹی تک کے لئے تانگہ چُکا رہے تھے ۔ یونیورسٹی جا کر اُنھوں نے مسٹر شاہد" ڈین آف دی فیکلٹی آف فلاسفی" کی کوٹھی کا پتہ پوچھا ۔ کوٹھی پر پہنچے تو دیکھا شاہد اور اوشا باہر ہی ٹہل رہے تھے ۔ اخبارات سے اوشا کو سیٹھ جی کے حالات کا پتہ چل چکا تھا ۔ لہٰذا کچھ رنجیدہ سی تھی ۔ باپ کو دیکھتے ہی محبتِ دخترانہ نے جوش مارا ۔ دوڑی ۔ اُدھر سے باپ دوڑے ۔ دونوں لپٹ گئے ۔ سیٹھ جی بولے "بیٹیا، سچ ہے انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں " بیٹی کو گلے لگا کر شاہد کو لپٹا لیا ۔ دونوں میاں بیوی ان کی اس ذہنیت کے انقلاب پر خوش بھی تھے اور متعجب بھی ۔ تھوڑی دیر بعد سیٹھ جی نے اطمینان سے بیٹھ کر ساری آپ بیتی سنائی، اور بیٹی سے بولے " اوشا ! میں اس جملہ کا عاشق ہوں کہ انسانیت عظیم ترین مذہب ہے " اوشا بولی، سچ ہے پتا جی ! انسانیت عظیم ترین مذہب ہے" ۔

شاہد کے باپ عرصہ سے بیٹے کے پاس آنے جانے لگے تھے مسلمان انسانیت کے رموز جلد اور بآسانی سمجھ سکتا ہے ۔ ہندو آریوں کی نسل سے ہیں ۔ آریہ قوم کا رجحانِ طبیعت تقسیم اور تفریق کی جانب اس شدت کے ساتھ تھا کہ انسانی زندگی کو خانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے، اُن پر "شُدھ" رہنے کا شیطان سوار رہا کرتا تھا ۔ اس قدر کہ دکنی برہمن قنوجی برہمن سے ازدواجی تعلقات نہیں پیدا کر سکتا تھا ۔ قوم کے بہتے ہوئے خون کو ذاتوں میں جکڑ بند کر کے قوم میں وہ وہ تفرقے ڈالے کہ خدا کی پناہ ۔ یہی باتیں سناتنیوں میں ابتک باقی تھیں ۔ مسلمان ان سے ناآشنا تھا وہ مساوات و اخوت کا دلدادہ تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ شاہد کے والد جلد ہی اپنی غلطیوں پر نادم ہو گئے اور بیٹے سے میل کر لیا ۔

اوشا کے پتا کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی آئے، اوشا نے اپنے باپ کا اُن سے تعارف کرایا ۔ سیٹھ جی نے خود ہی اپنی تمام کہانی اُنھیں کہہ سنائی ۔

سارا قصہ سنکر شاہد کے والد اور وہ ایک دوسرے سے خوب زور سے بھینچ کر بغل گیر ہوئے اور شاہد کے والد نے کہا " لاریب، انسانیت سے ارفع و اعلیٰ کوئی مذہب نہیں ہے " آج کا دن شاہد اور اوشا کے لئے عید سے بڑھ کر تھا ۔ دونوں خوشی میں پھولے نہیں سماتے تھے، رات کو شاہد اوشا سے کہنے لگا " اوشا پیاری یہ ہماری سچی محبت کا نتیجہ ہے " ۔

اوشا ۔ ہاں ۔ آج ہمارے سامنے حقیقی انسانیت اپنے میٹھے میٹھے ملاروں سے ہمارا دل بہلا رہی ہے ۔

ہمراز ہے سکونِ گلستاں کا اے دل
انداز نرالا ہے بیاباں کا اے دل
سکھتا ہے جبینِ داغ "نیلم" گل میں
دراصل تصور ہے خزاں کا اے دل
جوشؔ

آتی ہے صبا چمن میں گانے کے لئے
کلیاں نہیں جوش میں اٹھلانے کے لئے
فریاد کرتا عاقبت اندیش بلبل بھی
تیار ہی ہے مسکرانے کے لئے
جوشؔ

اپنے بچّے سے آخری باتیں

غنچۂ نورس! مبارک ہو تجھے سیرِ حیات
نوبہارِ سرمدی ہو اور تیری کائنات
میں رہا ہوں مدتوں اس راہ میں گرمِ ستیز
میری آنکھیں دیکھتی ہیں وقت کی رفتارِ تیز
جانتا ہوں تھک چکی ہے دانشِ سعی و عمل
میری بالیں پر کھڑی اب مسکراتی ہے اجل
موت کا آئینِ مستحکم بدل سکتا نہیں
زندگی کے دل سے یہ کانٹا نکل سکتا نہیں
موت ہے تنہا امینِ عرصۂ سود و ضرر
خاک ہو یا پھول، ذرے ہوں کہ ہو موجِ گہر
موت ہے تنہا کلیدِ رازِ عمرِ مختصر
میں ہوں یا تو ہو کوئی قاروں ہو یا دریوزہ گر
الغرض جب زمزمے چونکیں گے تیرے ساز میں
اک نشاط بے خبر ہوگی ترے انداز میں

موت مرہم رکھ چکی ہوگی دلِ صد چاک پر
عبرتیں روتی ملیں گی تجھ کو میری خاک پر

میرے بچے! اپنی دنیا کا تماشا دیکھنا
شب کی خاموشی، سحر کا مسکرانا دیکھنا
ہاں نقاب الٹے عروسِ شادمانی آئے گی
وہ بھی کیا دن ہوں گے، جب تیری جوانی آئے گی
زندگی کی وہ درخشاں فصل، وہ عہدِ جمیل
سینۂ طوفاں میں جیسے رقص جوئے سلسبیل
زندگی کا وہ لطیف احساس، وہ پنہاں امنگ
خاک کی تاریک ترشحوں میں جیسے موجِ رنگ
زندگی کا وہ خیالِ حسن، وہ حسنِ خیال
تشنگی میں جیسے ساغر کی کھنک، مے کا اچھال
زندگی کے وہ طلسم آمیز ایامِ سکوں
عقل جن ایام میں کرتی ہے تعمیرِ جنوں
کاش میں بھی دیکھتا نورس کلی! تیری بہار
اپنی اس رعنائیِ حسنِ تخیل کے نثار!
ولولے دل میں مچلتے ہوں گے آنکھوں میں سرور
آسماں کو خاک جانے گا جوانی کا غرور
اس چمن میں شادمانی بھی تجھے مل جائے گی
ہر کلی تیرے نفس کی آگ سے کھل جائے گی

آہ لیکن گھر کے جب اٹھے گا ابرِ نوبہار
جانے کس عالم میں ہوگی یہ مری مشتِ غبار

میرے بچے! رازِ ہستی ہے ابھی زیرِ نقاب
جس کو ہم سمجھے ہیں دنیا ہے وہ بیداری کا خواب
ساحرہ دنیائے فانی کی بصد حسن و جمال
پھینکتی ہے روحِ انساں پر تمناؤں کا جال

اور پھر چہرے پہ اپنے ڈال لیتی ہے نقاب   آدمی ہوتا ہے، یہ قیدِ زبوں، اور اضطراب!
چھا رہا ہے اس کُرے پر دردِ عبرت کا دھواں   عشرتوں کے کچھ اُدھوئے خواب کچھ مایوسیاں
زندگی اُن کی ہے جو آئینِ شناسِ روزگار   جبر کے اجزا سے رکھتے ہیں بنائے اختیار
رُوح کی تعبیر ہے بیداریٔ سعی و عمل   صف بہ صف موجوں کے جزر و مد میں کھلتا ہے کنول
سینۂ انساں ہے اک دریائے ناپید اکنار   جس کی وسعت میں ہیں بے اندازہ موجیں بیقرار
اہلِ بینش حلقۂ امواج میں رہتے نہیں   رُخ بدل دیتے ہیں طوفانوں کا خود بہتے نہیں
میں بتاتا ہوں تجھے رازِ سکونِ بے خلل   ہر قدم منزل شناسی، ہر نفس فکر و عمل
وقت کی ناسازگاری پر نہ جانا چاہیئے   کھیل ہے یہ رنج کیا، مسکرانا چاہیئے
یوں تو ہے ہر موجِ ہستی دشمنِ صبر و شکیب   سب سے گہرا ہے جہاں میں علم و دانش کا فریب
علم کیا ہے، فاطرِ ہستی کا ایسا فیضِ عام   جس سے ہو جائے گوارا زندگی کا تلخ جام
علم کیا ہے، ظلمتوں میں ناتواں سی موجِ نُور   چند دن اس درد کی دُنیا میں جینے کا شعور
بے نیازِ حکمت و منطق ہے شرحِ کائنات   علم کی حد سے بہت آگے ہیں اسرارِ حیات
درسِ دانش لے مگر اندازِ نادانی نہ سیکھ   سیر کر لیکن اس آئینہ سے حیرانی نہ سیکھ
شاعری دنیا میں ہے گو اک مقدس فن ضرور   بچ کے رہنا اس کے سائے سے مری آنکھوں کے نُور
دیکھتا ہے اُن کو شاعر کی نظر کا اضطراب   زندگی کے جو حقائق ہیں نقاب اندر نقاب
اور ہے سرنامۂ ہستی فریبِ اعتبار   چند ذرّے خاک کے ہیں ورنہ اجزائے بہار
شاعر اوروں کو پلا سکتا ہے پی سکتا نہیں   زندگی کا درس دے سکتا ہے جی سکتا نہیں

~~~

میرے بچے! دشمنِ علم و یقیں ہے روزگار   ذرہ تا خورشید سب ہیں ایک پیکاں کے شکار
عقل کی رَو میں بہا جاتا ہے انسانِ حقیر   رُوح کی آواز سے بیگانہ، محرومِ ضمیر
کچھ کھلونے ہیں زمانے کے نشانِ امتیاز   چند اوہامِ زبوں جن پر ہے اس دنیا کو ناز
اک نہ اک دن زندگی سے ہاتھ دھونے ہی تو ہیں   قصر و ایواں کیا ہیں، مٹی کے کھلونے ہی تو ہیں
اِن میں دب کر رہ گئی دانش کہ تھی انجم طراز
اِن میں پھنس کر کھو گیا انساں کہ تھا دانائے راز
چھوڑتا ہوں میں تجھے تنہا یہاں میرے یتیم   آہ وہ غنچہ کہ ہو بیگانۂ لطفِ نسیم!
~~~

زندگی بھر گشتۂ بے مہریٔ دوراں رہا
میں رہا لیکن رہینِ کاوشِ پنہاں رہا
دردِ محرومی سے تھی آباد میری کائنات
صرف اک غم تھا مری دُنیا میں آئینِ حیات
صبح کو جب مُسکراتا تھا جہانِ رنگ و بُو
میری آنکھوں سے برستا تھا مرے دل کا لہُو
جب سُناتی تھی عروسِ شام رودادِ طرب
میرے سینے میں تڑپ جاتا تھا احساسِ تعب
ہر نفس تھا آتشِ پنہاں سے کمہلایا ہوا
کچھ دُھواں سا میری دُنیا پر رہا چھایا ہوا

~~~~~~~~~~

میری اِس حالت کا شاہد ہے خداوندِ قدیر
میں نے اِس عالم میں بھی بیچا نہیں اپنا ضمیر
خم ہوئی گردن نہ میری ماسوا کے سامنے
سر جھکایا تو جھکایا ہے خدا کے سامنے
میں رہا گو عمر بھر تلخیٔ کشِ رندِ سیاہ
میری پیشانی پہ لیکن کج رہی میری کلاہ
نامرادی پھینکتی تھی گو مرے دل پر کمند
اور بھی لیکن بپھرتا تھا مرا عزمِ بلند
جس قدر اُٹھتا تھا گھر گھر ابرِ دہشت آفریں
میرے سینے میں چمک جاتا تھا ایمان و یقیں

دیدۂ بینا ضمیرِ بے ریا رکھتا تھا میں
کیوں فریبِ ناخدا کھاتا، خدا رکھتا تھا میں

سازِ ہستی میں نوائے دردِ گو پاتا نہیں
میں تری تعمیرِ مستقبل سے گھبراتا نہیں
جانتا ہوں یوں تو ہیں اِسکی جفائیں بے پناہ
دہر میں بخشا نہیں جاتا یتیمی کا گناہ
جانتا ہوں، بیکسوں کو آسرا ملتا نہیں
آہ کیا ملتا ہے اس دُنیا میں کیا ملتا نہیں!
تیری مونس ہوں گی اے آسائشِ قلبِ تباہ
وہ دعائیں جن کی بے اندازہ راتیں ہیں گواہ
اُن عزیزوں سے اُمیدِ دلنوازی کیا کروں
قاتلوں پر اعتمادِ چارہ سازی کیا کروں
جنگی و خانی یہ ہے جن کی محبت کا مدار
جن کی پیغمبر ہے دولت، جن کا خالق روزگار
جو مرے زخمِ جگر پر مُسکراتے ہی رہے
نفس کے بندے؛ فریبِ نفس کھاتے ہی رہے
میں خدا کو سونپتا ہوں تجھکو اے جانِ پدر
جس کی رحمت ہے طرازِ محفلِ نوعِ بشر
ہو سکے تو قوم کے غم سے نہ کرنا احتراز
بن پڑے تو ملک کی خدمت سے ہونا سرفراز
مضمحل ہونے نہ پائے کلفتوں میں قلبِ شاد
اور اپنی قوتِ بازو پہ رکھنا اعتماد

تو نہ ہونا عمر بھر منت پذیرِ ناخدا
تیری کشتی ہے یہ دریا تو ہے اور تیرا خدا

سید علی اختر، اختر، حیدرآباد
~~~~~~~~~~

تحقیقِ اصلاح

سیّد رضا قاسم مختار

محترمی عبدالاحد صاحب شرف الدین پوری، رکن ادارۂ تحریر پٹنہ کے مضامین رسالہ ندیم گیا، نیز دیگر موقر رسائل میں بعنوان اصلاح اکثر شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں موصوف نے زبانِ اُردو میں بعض الفاظ کے غلط استعمال کی طرف اُردو داں طبقے کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ممدوح کی اس قسم کی نکتہ چینیاں قابل صد ستائش ہیں اور اردو بحیثیت زبان اپنی وسعت کے لحاظ سے ابھی بہت کچھ قابل توجہ اور مستحق امداد ہے، اکثر و بیشتر خامیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ شدید ضرورت ہے کہ اس کی خامیوں کو دور کرکے ترقی کی راہیں پیدا کی جائیں، نیز اُس کی وسعت کو بڑھا کر اس پایہ کی بنادی جائے کہ دنیا کی متمدن زبانوں کی ہم سری کرسکے ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے　　　اقبال

فاضل صلاح کار نے لفظ مشکور کا استعمال زبانِ اردو میں بمعنی شکرگزار غلط بتایا ہے جس کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

لفظ مشکور عربی میں پسندیدہ، ستودہ اور شکر کیا گیا کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس لفظ کی جو ترکیب ہے اس لحاظ سے اس کی نسبت اُس شخص کی طرف ہوتی ہے جس نے احسان کیا ہے، نہ یہ کہ جس پر احسان کیا گیا ہے، لیکن اردو کے روزمرہ میں یہ لفظ شکرگزار کے معنی میں رائج ہوگیا ہے۔ چاہے وہ غلط ہو۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ ہماری زبان کا روزمرہ اس غلطی کی وجہ سے بدل سکتا ہے۔ اور مشکور کے بجائے عربی قاعدے سے متشکر یا شاکر ہی لکھنا جائز ہوگا:

"قاعدہ ہے کہ جب ایک زبان میں دوسری زبان کا کوئی لفظ جس تلفظ، املا، ترکیب کے ساتھ اور جس معنی میں رائج ہوجاتا ہے۔ تو اُس زبان میں وہ لفظ اپنے نئے معنی، املا اور ترکیب استعمال کے ساتھ صحیح مانا جاتا ہے"

بطور مثال عربی کے دو لفظ خاطر و تواضع کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو قاعدۂ مذکور الصدر کو اپنی جگہ پر درست و اٹل ثابت کرنے میں یقینی مددمعین ہوں گے۔ تواضع عربی میں عاجزی اور فروتنی کے معنی پر آتا ہے، لیکن اردو میں دعوت، مدارات، مہمان نوازی اور ضیافت کے معنی میں مستعمل ہے۔ اسی طرح لفظ خاطر کے عربی معنی کو اردو زبان سے چنداں لگاؤ نہیں ہے۔

غرضیکہ خاطر تواضع، یہ دونوں الفاظ عربی میں ہرگز ایک ساتھ استعمال نہیں ہوتے، لیکن اردو میں چونکہ یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں اس لئے ایک ساتھ ان کے استعمال میں کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔ اردو میں جس معنی کے لئے یہ دونوں الفاظ آتے ہیں اس کو ان کے اصلی معانی سے کوئی تعلق نہیں ہے، آؤ بھگت اور آدر مان کے معنی پر الفاظ خاطر تواضع عربی نہیں رہے۔ بلکہ وہ اردو ہیں۔

الفاظ خاطر تواضع ہی پر کیا موقوف ہے دوسری زبان کے بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جن کے معانی میں ہماری زبان نے زبردست تغیر و

وتبدل پیدا کرکے ان کو اردو بنا لیا ہے۔ چنانچہ لفظ حُقّہ جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن جس معنی میں یہ لفظ اردو زبان میں بولا جاتا ہے اس کو اس کے اصلی معانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قارورہ عربی میں شیشے (GLASS) کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اردو میں کچھ اور ہی معنی رکھتا ہے جس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں اس لفظ کے عربی معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی کے سوالِ آب پر اگر کوئی اس طرح استفسار کرے کہ جناب کو قارورے میں پانی پینا مرغوب ہے یا فلزاتی ظروف میں، تو یقینی یہ استفسار خلافِ روزمرّہ ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے روزمرّہ کو غلط ٹھہرا کر اور اس لفظ کے مروجہ معنی کو ترک کرکے محض شیشے ہی کے معنی میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔ یا ہماری زبان کے روزمرّہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس لفظ کے مروجہ معنی کو بھی کوئی اہمیت دی جاسکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اردو زبان میں جس معنی میں لفظ قارورہ استعمال کیا جاتا ہے اُس معنی میں یہ لفظ عربی نہیں رہا بلکہ اردو بن گیا۔ اسی طرح لفظ مشکور بھی جو عام طور پر شکر گزار کے معنی میں مستعمل ہے وہ اس معنی میں اب عربی نہیں رہا۔ بلکہ اردو بن گیا۔ اور وہ اس معنی میں صحیح ہے جو زبانِ اردو میں رائج ہو چکا ہے۔

خواجہ آتش نے لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں لفظ المضاعف کو المضاف اور بیگم کو غم اور نم کے قافئے میں کافِ فارسی کے فتحہ کے ساتھ باندھا تھا؂

زہر پرہیز ہوگیا مجکو   دردِ درماں سے المضاف ہوا

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں وہ نورجہاں بیگم ہے

اس پر اُن کے حریفوں نے سرِ مشاعرہ انھیں ٹوکا کہ المضاعف عربی ہے اور بیگم ترکی۔ اہلِ عرب المضاعف بولتے ہیں نہ کہ المضاف اور ترکی زبان میں بیگم بہ ضمہ کاف فارسی بروزن گُندم ہے۔ نہ کہ بہ فتحہ کاف فارسی بروزن ہمدم، خواجہ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ ہم عربی یا ترکی نہیں بولتے اور جب اِن زبانوں میں گفتگو کریں گے تو المضاعف اور بیگم کہیں گے۔ اسی طرح جب خواجہ صاحب نے یہ مصرع کہا ؏

اس خوان کی نمش کفِ یارِ سیاہ ہے

تو لوگوں نے کہا کہ قبلہ! یہ لفظ فارسی ہے اور اصل میں نشک ہے، خواجہ صاحب نے کہا کہ جب ہم ایران جائیں گے تو ہم بھی نشک کہیں گے۔ یہاں نمش بولا کرتے ہیں تو نمش ہی شعر میں باندھنا چاہئے ——

(ملاحظہ ہو آبِ حیات)

مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے (جن کی شخصیت عربی و اردو دونوں زبانوں میں تسلیم شدہ ہے) اپنی تحریر میں لفظ مشکور کو شکر گزار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ تحقیق کے لئے "خطوطِ شبلی" مرتبہ محمد امین زبیری ملاحظہ فرمایئے۔ صفحہ ۱۱۶ پر مولٰینا مرحوم کی یہ تحریر موجود ہے۔

"آپ کی تکلیف فرمائی کا بہت مشکور ہوں"

ان مثالوں اور نظریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اردو زبان میں لفظ مشکور کا شکر گزار کے معنی پر بولنا یا لکھنا صحیح ہے اور اس کی ترکیب اردو لفظ ہو جانے کی حیثیت سے بالکل درست ہے ؏

ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

مگر ہاں جب ہم عربی میں گفتگو کریں یا عربی عبارت لکھیں تو البتہ لفظ مشکور کا استعمال اس معنی میں سراسر غلط ہوگا اور اس کی جگہ عربی قاعدے سے شاکر یا متشکر ہی لکھنا جائز ہوگا۔

"ممنون و مرہون" یہ دونوں الفاظ بھی تو لفظ مشکور کی طرح مفعولی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا استعمال فاعلی معنوں میں کیا جاتا ہے ماسوا اس کے دوسرے فاعلی الفاظ کا استعمال مفعولی معنوں میں کیا جاتا ہے تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ مثلاً میں معقول ہوگیا کی جگہ عام طور پر اربابِ علم "میں قائل ہوگیا" بولتے اور لکھتے ہیں۔

تعجب ہے کہ قابلِ صلاح کار نے نہ معلوم کن اصولوں کی بنا پر لفظ مشکور کا استعمال زبانِ اردو میں احسانمند کے معنی پر غلط ٹھیرایا ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ اب بھی جبکہ اردو زبان کو آسان سے آسان تر بنانے کی کوششیں جاری ہیں ——————

——— بعض حضرات اردو زبان کو بھی عربی قاعدوں پر چلانا چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان عربی زبان کے امتزاج سے بنی ہے۔ مگر ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ دریا کو اُس کے ماخذ کی طرف بہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہر زبان کا قاعدہ جداگانہ ہے ایک زبان کسی دوسری زبان

لہ "قائل" نہیں۔ بلکہ "قابل" کہا جاتا ہے۔   مدیر

کے قاعدے کی پابند نہیں ہے بلکہ قواعد و ضوابط زبان کے تابع ہیں۔ اول زبان بنتی ہے بعد کو اس سے قواعد اخذ کئے جاتے ہیں ؎

ہنر بچشمِ عداوت بزرگ تر عیبے ست
گُل است سعدی و در چشمِ دشمناں خار است

ریل انگریزی میں پٹری کو کہتے ہیں۔ مگر اُردو میں یہ لفظ گاڑی کے معنی میں مستعمل ہے۔ آپ خیال فرمائیں کہ انگریزی زبان کے جو الفاظ اردو عبارت میں مستعمل ہیں کیا اُن الفاظ پر انگریزی زبان کے قواعد کا دستبرد ہو سکتا ہے؟ اردو زبان اُن الفاظ پر قابض ہو چکی ہے اور جس طرح چاہتی ہے اپنے قواعد و ضوابط کے زیرِ تحت رکھ کر اُن سے کام لیتی ہے۔ اب اہلِ زبان انگریزی کو اس اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ انگریزی الفاظ جس طریقے پر اردو عبارت میں استعمال کئے جاتے ہیں وہ انگریزی کے قاعدے سے غلط ہیں ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے!

اسی طرح لفظ مشکور اردو زبان میں احسان مند کے معنی پر بالکل صحیح ہے، اور عربی زبان کے قاعدوں کا اُس پر کوئی تصرف نہیں ہو سکتا، ہماری زبان اس پر قابض ہو کر اس کو اپنا لفظ بنا چکی اور ہمارے روزمرہ میں یہ لفظ اردو ہو جانے کی حیثیت سے شکرگزار کے معنی پر زبان زدِ خلائق ہے۔ ہمارا روزمرہ اب ہرگز بدل نہیں سکتا، اور بمصداق غلط العام[1] فصیح زبانِ اردو میں لفظ مشکور کا استعمال احسان مند کے معنی میں جائز اور صحیح ہے ؎

گر نیاید بگوشِ رغبت کس
بر رسولاں بلاغ باشد و بس

---

[1] لیکن "غلط العام" اور "غلط العوام" میں امتیاز کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ مدیر

نعرۂ حرّیت

(یہ نظم محض اپنی معنوی حیثیت کے لحاظ سے شائع کی جا رہی ہے۔ مدیر)

دلِ سوختہ کے غضبناک نالو
غلامانِ خفتہ کو بیدار کر دو

خودی اپنی پامال جو کر چکے ہیں
خدا کے لئے ان کو خود دار کر دو

نکالو غلامی سے بچنے کی راہیں
جو مجبور ہیں ان کو مختار کر دو

ہلا دو کبھی عرشِ اعظم کو جا کر
خمیدہ کبھی پشتِ کہسار کر دو

کبھی دیوِ گردوں سے زور آزما ہو
نظامِ ثوابت کو سیار کر دو

کبھی تیغ بن کر کبھی تیر بن کر
حریفوں کو مجروح و افگار کر دو

کرو حلِ مشکل کے اسباب پیدا
کسی طرح بیڑے کو خود پار کر دو

وگرنہ صبا کا تخیل بدل کر
اسے خوگرِ رنج و آزار کر دو

صبا اخگری

ڈپٹی صاحب

اختر انصاری دہلوی، بی اے (آنرز)

یہ تقریباً پانچ سال پہلے کا ذکر ہے۔ ڈپٹی صاحب نینی تال میں تھے اور اُن کی ملازمت کا آخری زمانہ تھا۔

اُس زمانے میں قاضی عبد الغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" لاہور کے ایک ماہوار رسالے میں بالاقساط چھپ رہے تھے۔ اور ہم سب —— اردو زبان کی علمی و ادبی دنیا کے افراد —— متفقہ طور پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایک کہنہ مشق اور بلند پایہ ادیب نئی آن بان سے جلوہ گر ہوا ہے۔ نئے افکار، نئے اسالیب بیان، اور نئی سحر طرازیوں کے ساتھ بیدار ہوا ہے، اور یہ کہ ہمارے .... ادب میں ایک شاندار اور عہد آفریں تصنیف کا اضافہ ہونے والا ہے۔ ہر طرف "لیلیٰ کے خطوط" کے چرچے تھے۔ ہر ادبی محفل میں اِسی کارنامۂ نثر کے بے شمار محاسن پر اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں نینی تال گیا تو ایک مدت کے بعد ڈپٹی صاحب سے ملا۔ اُن کے ادبی ذوق سے میں واقف تھا ہی، پہلی ہی ملاقات میں دو چار اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ادب اور ادبی مسائل پر گفتگو ہونے لگی۔ اور قبل اس کے کہ میں اُن سے پوچھوں کہ "لیلیٰ کے خطوط" بھی آپ کی نظر سے گزرے یا نہیں، اُنھوں نے خود یہی ذکر چھیڑ دیا اور لگے نہایت جوش کے ساتھ خطوط کی عظمت پر روشنی ڈالنے۔

ڈپٹی صاحب ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو حد سے زیادہ جامد اور بے حس ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے عہد کے بہترین رجحانات اور اپنے زمانے کے بلند ترین تصورات سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ اُن کے وجود سے بھی باخبر نہیں ہوتے۔ حکمرانی اور دولت اندوزی کے نشے میں چُور رہتے ہیں۔ اور باہر کی دنیا —— تکلیفوں، مصیبتوں، محکومیوں اور مظلومیوں کی دنیا —— اِن کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یوں کہلانے کو صاحبِ علم اور صاحبِ فضل کہلاتے ہیں، لیکن مطالعۂ ادب کو اِن کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔ یہ کبھی کوئی ادبی کتاب نہیں خریدتے۔ کبھی کوئی حقیر سے حقیر رقم ایک ادبی رسالے کی سرپرستی میں خرچ کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔ جب میں نے ڈپٹی صاحب کو —— اسی طبقے کے ایک فرد کو —— "لیلیٰ کے خطوط" کی تعریف میں رطب اللسان پایا تو مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ کچھ بھی ہو اس شخص میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ یہ ایک انقلابی اور احتجاجی تصنیف سے باخبر ہی نہیں، اس کی قدر بھی کرتا ہے۔

نینی تال میں میرے جاننے والے بہت کم تھے۔ اس لئے ڈپٹی صاحب سے تقریباً روزانہ ملاقات رہنے لگی۔ اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب کو تو "لیلیٰ کے خطوط" کا جنون ہو گیا ہے۔ یہ چیز ہر وقت ان کے دماغ پر مسلط رہتی ہے۔ اِس کے سوا ادبی گفتگو کا کوئی اور موضوع اُن کے پاس ہے ہی نہیں۔ اُنھوں نے خطوط کی سب قسطیں رسالے سے جدا کر لی تھیں اور اُن کو نتھی کر کے یکجا کر لیا تھا۔ اوراقِ پریشاں کا یہ مجموعہ ہر وقت اُن کی میز پر رہتا تھا اور وہ بار بار اُس کا مطالعہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی سُرخ پنسل کو اِن صفحات پر بہت

شدت کے ساتھ استعمال کیا تھا اور اس طرح صفحے کے صفحے رنگین نظر آتے تھے، میں ان کے ہاں جاتا تو اکثر دیکھتا کہ لوگ اُن کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے ہیں اور وہ خطوط کے مختلف حصے اُن کو پڑھکر سنا رہے ہیں۔ وہ ہر شخص سے لیلیٰ کے خطوط کا تعارف کراتے تھے، ہر اُس شخص سے جو اُن کے پاس آتا اور تعلیم یافتہ بھی ہوتا۔ اُن کے تعارفی الفاظ کچھ اس طرح کے ہوتے۔

"یہ ایک بازاری عورت کے خطوط ہیں جو وہ اپنے ایک چاہنے والے کو لکھتی ہے۔ ان خطوط میں مصنف نے عصمت فروش عورتوں کی زندگی پر ہمدردانہ اور روادارانہ انداز میں بحث کی ہے اور بتاتا ہے کہ مردوں کی نفس پرستی ہی اس مظلوم طبقے کے وجود کی ذمہ دار ہے، ہم ان ناموس باختہ عورتوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور یہ نہیں جانتے کہ ان میں بہت سی ایسی ہیں جو کبھی شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں تھیں۔ ہماری ہی جنس کے بعض ہوسناک افراد کی ہوس کا نشانہ بنیں اور گناہ کی دنیا میں دھکیل دی گئیں۔ اور پھر یہ سب کچھ ایسی پُر زور زبان میں لکھا گیا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ جب لیلیٰ اپنی گزشتہ اور موجودہ زندگی کا ذکر کرتی ہے تو اُس کے بیان میں بے انتہا غمگینی پائی جاتی ہے، اور جب وہ مرد کی نفس پرستی پر روشنی ڈالتی ہے تو اُس کے انداز میں ایک زہرناک طنز پایا جاتا ہے" اس قدر کہنے کے بعد ڈپٹی صاحب خطوط میں سے بہت سے اقتباسات پیش کرتے۔ مجھے وہ ٹکڑے اچھی طرح یاد ہیں جو اُن کو بہت زیادہ پسند تھے۔ کتاب میرے پاس موجود ہے، اُن میں سے چند یہاں نقل کرتا ہوں۔

"آپ اپنے اظہارِ التفات کو اس ناچیز پر کیوں ضائع کرتے ہیں۔ شب کا لطف والتفات ضروری نہیں کہ صبح کو بھی باقی رہے۔ آپ اپنی جگہ پر رہیئے اور مجھے میری جگہ پر رہنے دیجئے۔ آپ یوں سمجھیں کہ آپ نے ایک کھلونا خریدا تھا جس سے آپ دل بہلاتے رہے اور میں یہ سمجھوں کہ جو کچھ آپ کی جیب سے نکال لائی وہ میرا سرمایۂ تجارت ہے۔ اس کے علاوہ آپ جو کچھ شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں وہ سب محض تضیعِ اوقات ہے۔ آپ کی جیب اور میرا جسم، یہی دو چیزیں ہیں۔ آپ کے عیش کا مدار آپ کی جیب پر اور میری آسائش کا انحصار میرے جسم کی خوبصورتی پر ——— مجھے آپ پسند کرتے ہیں تو اس کھیل کو کھیل ہی سمجھکر کھیلئے۔ میں اپنی نسوانیت فنا کر چکی، آپ کا جی چاہے تو اپنی جوانی اور اُس کے ساتھ اپنا روپیہ خرچ کیجئے۔ مگر اندازِ عاشقانہ کی شعریت سے مجھے معاف رکھئے۔

پیارے دوست: تمہارے اظہارِ عشق سے متاثر نہیں ہوتی۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے آغوش میں اپنے لئے کوئی راحت نہیں پاتی۔ سوائے اک چند نقرئی اور طلائی سکوں کے، جو تمہارے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں آتے ہیں۔ قسمت بُری سہی پر طبیعت بُری نہیں۔ میری زندگی ناپاک ہے۔ لیکن اس عشوہ فروشی کے بازار میں آنے سے پہلے مجھے علم و تہذیب و شرافت کی اتنی دولت حاصل ہو چکی تھی، جتنی کہ عام طور پر شاید اچھے گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو بھی حاصل نہ ہوتی ہو۔ اس بیان کو خود فریبی اور پندار پر محمول نہ کرنا۔ جوہرِ اصلی کچھ میرے پاس بھی تھا۔ مگر میرے قلب کو میری زندگی نے تلخ کام کر دیا ہے۔ میں دل ہی دل میں اپنے وجود سے شرمایا کرتی ہوں۔ مگر اس مُردہ دنیا اور مُردہ اثر دنیا والوں نے جہاں پھینک دیا جس گندگی میں ڈال دیا اُسی میں مبتلا ہوں، اور اب گناہ کی بھاری زنجیریں میرے پاؤں میں ہیں ———"

آج کی شب خالی ہے۔ میرا یہ خاص شغلہ ہے کہ جب میرے سوا میری خلوت میں کوئی نہیں ہوتا۔ چاہنے والوں کے ہجوم سے نجات پاتی ہوں اور بستر میں (جو مجھ کمبخت کو بہت کم خالی ملتا ہے) جا کر لیٹتی ہوں تو خود اپنے وجود کو اپنے آغوش میں لیتی ہوں۔ اُس وقت میں عاشق ہوتی ہوں اور میرا وجود معشوق۔ گویا ایک دوسرا کوئی ہوتا ہے جس کا سر میں اپنے بازو پر رکھتی ہوں، لیلیٰ! کمبخت، بدنصیب لیلیٰ! کیا آج فرصت ہے؟ تھک گئی ہے؟ کچھ ڈھونڈھتی ہے؟ کوئی یاد آتا ہے؟ یہ رات تو خالی ہے۔ جا سو جا! کل پھر دکان لگانی ہوگی۔ خریدار آئیں گے۔ سودا چکایا جائے گا۔ تہی دست قسمت! سو جا!!

اگر آپ عورت اور اُس کے حُسن سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، جس طرح شکاری، محض اس لئے ہرن کے گولی مارتا ہے کہ اُس کے بہیمانہ قویٰ اپنی قوتِ حیوانی کی مستی کا نظارہ کریں۔

اور اُس کا نفس مسرور ہو، تو اس چمن میں تنگ داماں نہ ہو جئے، پھول بہت ہیں۔

"جب تم میری طرف دستِ طلب بڑھاتے ہو تو اپنے نفسِ لئیم سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ یہ عورت جو اپنی نسوانیت کا اعلیٰ ترین جوہر نذر کئے دیتی ہے۔ کبھی وہ ستی کہ کسی گھر کا اجالا ہوتی۔ اور انسان کی ایک نسل کو اپنی گود میں پالتی۔ آج شب کو وہ اپنے بستر کی آرائش ہے اور کل صبح منظرِ عام پر آپ اُس کی طرف دیکھکر ہاتھ اُٹھانا بھی پسند نہ فرمائیں گے۔"

"تم کبھی کبھی روتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ عشق ہے۔ مگر میں ہنستی ہوں، اس لئے کہ ہنسنا میرا پیشہ ہے اور اس لئے کہ رو نہیں سکتی ——— آنسو کہاں سے لاؤں! ———"

غرض ڈپٹی صاحب اس قسم کے بہت سے ٹکڑے مزے لے لے کر پڑھتے اور اپنے دوستوں کو سناتے۔ کبھی میں بیچ میں بول اُٹھتا۔ صاحب! بازاری عورتوں کی زندگی پر ہی کیا موقوف ہے، قاضی عبدالغفار صاحب نے نسوانی دنیا کی عام پستی، ذلت اور محکومی کو بے نقاب کیا ہے اور مرد کے جبر اور تفوق کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔" ڈپٹی صاحب اس پر مزید روشنی ڈالتے اور اس سلسلے میں بھی خطوط کے بعض حصے پڑھکر سناتے۔ مثلاً،

"مرد جب عورت کو مستقلاً اپنے نفس کی خادمہ بنانا چاہتا ہے تو نکاح پڑھوا لیتا ہے۔ مگر عورت جب سر جھکائے ہوئے، آنکھیں بند کئے ہوئے، اپنے سر کے اشارے سے کسی مرد کو اپنا شوہر قبول کرتی ہے تو اس بدنصیب کو خبر نہیں ہوتی کہ مرد کیا چیز ہے، کیا جنس ہے، کیا قیامت ہے، کیا بلا ہے، اگر وہ اپنے ہونے والے شوہر سے محبت بھی کرتی ہو تب بھی اُس کو خبر نہیں ہوتی کہ بکری کی کھال کے نیچے جو بھیڑیا چھپا ہوا ہے اُس کے دانت کس قدر تیز ہیں ——— سوسائٹی اور مذہب نے جس کے ٹھیکیدار صرف مرد ہیں عورت کو اس قدر گھیر لیا ہے اور بے دست و پا کر دیا ہے کہ نکاح عورت کی آخری شکست اور مرد کی فیصلہ کن فتح بن جاتا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول کے نام پر عورت مرد کی ملکیت بنا دی جاتی ہے ———"

میرے دوست! زنا بہت بڑا اخلاقی گناہ ہے، اگر صرف عورتیں کے لئے۔ مرد زانی ہو تو بھی معصوم ہے۔ عورت زانی نہ بھی ہو مگر غیر مردوں کے ساتھ کچھ ارتباط رکھتی ہو تو وہ گردن زدنی۔ یہ مرد کا قانون ہے۔ ہر زانی اور بدکار شرفا کے گھروں میں شریف بہو بیٹیوں سے ارتباط رکھ سکتا ہے۔ لیکن ایک زانیہ تائب ہونے کے بعد بھی شریفوں کے دروازے پر نہیں جا سکتی۔ یہ مردوں کا قانون ہے ——— سوسائٹی ہر بدمعاش مرد کی چادر کے دھبوں کو بآسانی نظر انداز کر سکتی ہے۔ مگر عورت کی چادر کی ہر شکن اُس کو گناہ اور مکر سے آلودہ نظر آتی ہے۔ یہ مرد کا قانونِ زندگی ہے! بڑی سی داڑھی لگا کر، بڑا سا عمامہ باندھکر، لمبا سا جبہ پہن کر تم اپنے حجرے میں گناہ کرو۔ لوگ کہیں گے تم عبادت کر رہے ہو، وہ تمہارے ہاتھ چومیں گے۔ مگر وہ عورت جو تمہارے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کرے گی تمہاری نظر میں بلاشبہ فاحشہ ہو گی۔

دراصل گھر کی چہار دیواری میں بیویاں ذرا اونچے درجے کی کنیزیں ہوتی ہیں۔ "سرکار" ان کو اپنے دسترخوان پر بٹھاتے ہیں اپنے بستر میں سلا لیتے ہیں اچھے اچھے لباس اور زیور عطا فرماتے ہیں۔ یہ سب "سرکار" کا کرم ہے۔ بیویوں کا کام یہ ہے کہ عاجزانہ شکریے کے ساتھ ان نوازشوں کو قبول کریں اور ہمیشہ دست بہ عا رہیں۔ اس لئے کہ سرکار ہی کے دم سے ان کا سہاگ قائم ہے ———"

ہندوستان میں کم از کم اور غالباً تمام ایشیا میں عورت ایک دفعہ مرد کے تفوق کے خلاف ایسی خوفناک بغاوت کرنے والی ہے جو تمہاری سوسائٹی کے خود ساختہ شیرازے کو درہم و برہم کر دے گی۔ ہم تم غالباً دنیا میں زندہ نہ ہوں گے۔ جب وہ طوفانِ نوح آئے گا۔ لیکن ہماری آئندہ نسلیں عورتوں کو مردوں سے جگہ بدلتے ہوئے دیکھیں گی۔ وہ نسلیں ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لیں گی۔ اور بلاشبہ جفاکار مردوں کے لئے وہ یوم الحساب بہت سخت ہو گا ———"

کبھی ڈپٹی صاحب کہتے "بھئی حقیقت یہ ہے کہ "لیلےٰ کے خطوط" میں لکھنے

والے کا موضوع بے حد وسیع ہے، یعنی ان میں نسوانیات سے ہٹکر زندگی کے بہت سے دوسرے مسائل پر بھی نہایت فلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے" اس دعوے کے ثبوت میں وہ اِس نوع کے اقتباسات پیش کرتے :-

"زندگی کا یہ ہنگامہ۔ انسان کے گناہ۔ اُس کی کمزوریاں، قوی کا ظلم ضعیف پر۔ طاقتور کا پنجہ کمزور پر۔ بڑی مچھلیوں کا کھلا ہوا منہ چھوٹی مچھلیوں کے لئے۔

چیونٹیوں پر ہاتھی کے پاؤں کا فنا کر دینے والا وزن، مغرور شہسوار کا بدلگام گھوڑا اور سڑک پر چلنے والے اندھے بہرے۔

کیا یہ سب تقدیر الٰہی ہے؟ کیا یہ سب تقدیر الٰہی ہے! یہ اشرف المخلوقات کیا اسی لئے پیدا کئے گئے تھے کہ ایک دوسرے کا گوشت اور پوست نوچیں اور کھائیں۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے پر، گیہوں کے ایک ایک دانے پر خون کی ندیاں بہا دیں۔ کیا قدرت نے ساری دنیا کو انسان صورت درندوں سے اِس لئے بھر دیا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر کسی ایک گھر میں بھی سکون و اطمینان باقی نہ رہنے دیں؟

یہ حقوق ملکیت جس کا اعلان کیا جاتا ہے جس کے جزو مذہب و تمدن بتایا جاتا ہے، یہ تفوق و فضیلت جس کا اشتہار دیا جاتا ہے، مسجدوں میں، مدرسوں میں، خانقاہوں میں، یہ سب زیردستوں کی زبردستی کا اعلان و اشتہار ہے۔

یہ سب لوگ جو مذہب مذہب پکارتے ہیں، درحقیقت ایک قسم کے بُت پرست ہیں۔ اُن کا بُت پتھر یا سونے چاندی کا نہیں ہے، تخیل اور توہم اُن کا دیوتا ہے، جو مندر اور شوالے کے طاق میں نہیں، بلکہ اُن کے دماغ کے سومنات میں رہتا ہے، ہم سب اُسی دیوتا کے غلام ہیں۔ کوئی پوچھے کہ مذہب نے ہمارے احساس و ادراک کے کتنے پردے اُٹھا دئے، لاکھوں قرن گزر گئے، ہزاروں صدیاں گزر گئیں، اور اُس سیاہ پردے کا ایک کونا بھی نہ اُٹھ سکا، جو کائنات کے وجود پر پڑا ہوا ہے۔ میں اِس مذہب کے دیوتا سے بیزار ہوں کہ اُس کے پجاریوں نے دنیا میں جس قدر فساد برپا کیا، جس قدر خون بہایا کسی نے نہیں بہایا"

"بات یہ ہے کہ دنیا میں گناہ کوئی چیز ہے نہ ثواب، ساری انسانی زندگی کی بُنیاد صرف دو چیزوں پر ہے۔ قوی اور ضعیف، قوی ثواب ہے، ضعیف گناہ ہے، قوت یکسر خیر ہے، اور ضعیف یکسر شر۔ صرف وہی قانون ہیں، وہی مذہب ہے، وہی مسلک ہیں، انسانیت کے وہی اصول ہیں۔ ترازو کے وہی پلّے ہیں، بس! قوی اور ضعیف! قوی اور ضعیف! قوی اور ضعیف!!"

ہماری دنیا میں اعلیٰ دماغ وہ کہلاتے ہیں جو دوسروں کو غلام بنانے کا فن جانتے ہوں۔ سیاست اُس کو کہتے ہیں کہ ایک فرد اور ایک قوم کے وسیع پیٹ میں دوسرا فرد اور دوسری اقوام ہضم کی جا سکیں۔ معاشرت اُس کو کہتے ہیں کہ ایک چھوٹا، دولتمند اور چالاک طبقہ باقی تمام طبقوں پر جابرانہ حکومت کر سکے....."

غرض یہ کہ ڈپٹی صاحب قاضی عبدالغفار کی اِس تصنیف کے بڑے مداح تھے۔ ہر شخص سے اُس کی تعریف کرتے۔ اُس کی خوبیوں پر تبصرہ کرتے، اور اُس کے مختلف حصے پڑھکر سناتے۔ خود مجھ سے آئے دن اسی موضوع پر گفتگو رہتی اور کہتے "میرا خیال ہے کہ اردو زبان میں شاید ہی اِس سے زیادہ شاندار اور بلند ادبی تصنیف پیش کی گئی ہو۔ اگر محض انشا پردازی کے لحاظ سے دیکھئے تو اس نثر کا جواب کہیں نہیں ملتا۔ "بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب" یہیں نظر آتی ہے۔ اردو زبان کے کسی دوسرے ادیب کو یہ زورِ بیان اور یہ حسنِ نگارش نصیب نہیں ہوا" مجھے یہ دعویٰ مبالغہ آمیز معلوم ہوتا، لیکن جب وہ مندرجۂ ذیل قسم کے ترشے ترشائے جملے پڑھکر سناتے تو مجھے اُن کے الفاظ کی صداقت کو ماننا ہی پڑتا۔

"کمہار نے ایک خوبصورت آبخورہ بنایا، لوگوں نے اُس کو جامِ صہبا بنا لیا۔ یا کمہار نے ایک جامِ صہبا بنایا اور لوگوں نے اُس کو آبخورہ سمجھکر مسجد کی دیوار پر رکھدیا۔ تو پھر کیا اس مٹی کی حقیقت بدل گئی؟ جام میں چاہے شراب بھر دیجئے چاہے زمزم! عورت کو بیسوا بنا دیجئے یا گھر کی مالک......؟"

جب زندگی کا مدار غذا کے چند لقموں پر ہو اور جسم و روح کا تعلق منحصر ہو معدے کی اعانت پر، جب ہوس پیٹ کے لئے اچھا کھانا مانگے، اور جسم کے لئے سامانِ زینت، تو پھر اتنی مہلت کہاں

کہ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے ــــــــــ

اگر آپ پانی کی مچھلی سے کہیں کہ وہ خشکی پر دوڑا کرے، یا اگر ہرن سے کہیں وہ پانی کے اندر تیرا کرے تو معاف کیجئے غلطی آپ کی ہی ہوگی۔ جو شخص میخانے میں جاکر وضو کے لئے پانی مانگے، یا مسجد میں بیٹھکر ساغر کی صراحی جیب سے نکالے اُس کو دنیا کیا کہے گی؟ ــــــــــ"

ایک دن میں ڈپٹی صاحب سے ملنے گیا تو دیکھا کہ مسہری پر دراز ہیں اور "لیلیٰ کے خطوط" پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا "ڈپٹی صاحب! کیا اس کو حفظ کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ میرے سوال کا جواب دئے بغیر بلند آواز سے پڑھنے لگے ــــــــــ

"جب ازدواجی زندگی کی بوجھل گاڑی نہیں چل سکتی اور مرد کی ہوسناکی کے مظلوم شکار دم دیتے ہیں، مرد کس قدر روتا ہے اور سینہ کوبی کرتا ہے! ہائے میرا گھر تباہ ہوگیا، ہائے میں اکیلا رہ گیا، چند روز تو اس طرح چیختا اور چلاتا ہے کہ گویا عنقریب یہ بھی مرحومہ کی قبر کے اندر اپنا گھر بنائے گا۔ لیکن دو ہی تین ماہ کے بعد عقدِ ثانی کی گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ کہتا ہے، کیا کروں، دوسرے نکاح پر مجبور ہوں۔۔۔ روٹی پانی کی تکلیف ہے، بچے بے آرام ہوگئے ہیں، تنہائی میرے لئے عذابِ جان ہوگئی ہے۔ حالانکہ ان عذرات کے پردے میں نفس کا ایک شدید تقاضا رو پوش ہوتا ہے جو ستر اسی برس کے بوڑھوں کو بھی عقدِ ثانی کی ضرورتوں کے خواب دکھاتا ہے۔۔۔۔۔:

مجھے شرارت سوجھی۔ محض مذاق کے طور پر کہنے لگا "آپ کیا ان بیکار باتوں پر سر دھنتے ہیں۔ ارے صاحب کوئی ایسی چیز پڑھئے جس سے خیالات میں بلندی پیدا ہو، دماغ کو روحانی مسرت حاصل ہو۔ میرؔ و مرزاؔ کا کلام پڑھئے، "نگارستان" اور "خیالستان" پڑھئے۔ اس "عقدِ ثانی" اور "تقاضائے نفس" کی داستان میں کیا ملے گا۔ اگر ایک ستر یا اسّی برس کا بوڑھا کسی نوعمر دوشیزہ سے نکاح کرتا ہے تو ایک ادیب کو اس سے کیا۔ اور اگر سوسائٹی عورت پر ظلم کرتی ہے تو ایک شاعر اس سے کیوں متاثر ہو؟ یہ سب سطحی چیزیں ہیں، ہنگامی اور وقتی مسائل ہیں۔ آج ہیں کل نہ ہوں گے، ادب کو ان سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے"

ڈپٹی صاحب تڑپ کر بولے۔ "آپ کا خیال بالکل غلط ہے، ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ اور زندگی عبارت ہے، انہی وقتی ہنگامی مسائل سے۔ اگر ادب ان مسائل کو نظر انداز کرتا ہے، تو زندگی کو نظر انداز کرتا ہے، اس لئے بے جان ہے، بے بنیاد ہے، ایسے ادب سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا"

"ادب سے آپ فائدے کی امید کیوں رکھیں؟" میں نے انھیں چڑانے کے لئے کہا۔

ڈپٹی صاحب نے جواب میں وہ کہا جس سے میری طبیعت خوش ہوگئی، کہنے لگے "میں مانتا ہوں کہ ادب اور آرٹ کا ایک مقام وہ بھی ہے جہاں اس کا مقصد "تخلیقِ حسن" اور "تلاشِ حسن" کے سوا کچھ نہیں ہوتا، جہاں وہ کوئی اصلاحی خدمت انجام نہیں دیتا، اور صرف زندگی کے بعض مناظر کو صداقت کے ساتھ پیش کر دینے پر اکتفا کرتا ہے، لیکن اگر کسی بیکار چیز کو کارآمد اور غیر مفید چیز کو مفید بنا لیا جائے تو اچھا ہی ہے، بُرا کیا ہے، اور پھر آج کل ہم اپنی اجتماعی زندگی کے ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں! اہم مسائل اور شدید دشواریوں سے دوچار ہیں، ہمیں ان مسائل کو حل کرنا ہی ہوگا، ان دشواریوں کو آسان بنانا ہی ہوگا، ہم کیونکر ان سے بے پروا ہو سکتے ہیں۔ سوسائٹی کو انقلاب کی ضرورت ہے، اس لئے ادب کا انقلابی ہونا لازمی ہے، یاد رکھئے کہ موجودہ زمانے میں جو ادب انقلابی نہیں وہ ادب نہیں کچھ اور ہے"

"کیا خوب" میں نے قدرے طنز کے ساتھ کہا۔

"اس کو اس طرح دیکھئے" ڈپٹی صاحب نے پھر ابتدا کی، "ایک طرف تو یہ مسلمہ امر ہے کہ ہم ادب میں زندگی کا عکس پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں، اب ہمارے ادب میں اس بے اطمینانی کا جھلک جانا ضروری ہے، اور جونہی ادب میں بے اطمینانی کی جھلک پیدا ہوئی وہ انقلابی ادب بن گیا۔ اب تک جو ہمارے ادب میں یہ چیز نہیں پائی گئی تو اس کا سبب یہ تھا کہ وہ صرف ایک خوشحال اور مطمئن طبقے کی زندگی کا آئینہ تھا۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ادب ایک محدود سماجی طبقے کا ادب نہ رہے بلکہ عوام کا ادب بن جائے، اُس کا ایک

خاص متعین مقصد ہو، یعنی یہ کہ وہ سماج کے مظلوم طبقوں کے نقطۂ نظر سے زندگی پر نقد وتبصرہ کرے، اور اُس ظلم، بے انصافی اور لوٹ مار کو بے نقاب کرے جس پر یہ نظام زندگی قائم ہے۔ میں لیلیٰ کے خطوط کو اِس دَور کی اہم ترین تصنیف اسی لئے خیال کرتا ہوں کہ اُس نے ادب عالیہ کی تمام شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی اور ادب کو یکجا کر دیا ہے،

وہ "لیلیٰ کے خطوط" کی تعریف میں بہت کچھ کہتے مگر میں نے اُن کی بات کاٹ کر کہا: "ڈپٹی صاحب! میرا مذاق ختم ہوا۔ آپ نے جو کچھ فرمایا میں اُس کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں، لیکن اِس سلسلے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، میری خواہش تھی کہ اِسی وقت جبکہ وہ ادب کا ایک انقلابی تصور پیش کر رہے تھے، میں اُن کی متوسط طبقے والی ذہنیت اور زندگی کا ایک رُخ بھی بے نقاب کر دوں۔

"کیا؟"

"مجھے یہ بتائیے کہ ادب ہماری زندگی کا ترجمان ہوتے ہوئے بھی، ایک مخصوص نصب العین رکھتے ہوئے بھی، ہماری زندگی پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتا؟"

"ہماری زندگی پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتا!"

"ہاں ہمارے عمل کو کیوں نہیں متاثر کرتا؟"

"یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ ادب ہمارے عمل کو متاثر نہیں کرتا۔" ڈپٹی صاحب نے کہا "میرے خیال میں ضرور متاثر کرتا ہے۔"

"یہ میں اس لئے کہتا ہوں" میں نے جواب دیا "کہ ہم افسانے پڑھتے ہیں، نظمیں پڑھتے ہیں۔ ایسی نظمیں اور ایسے افسانے جو انقلابی خیالات کے حامل ہوتے ہیں۔ جن میں غریبوں کی مصیبتیں اور دولت مندوں کی عیش پرستیاں بیان کی جاتی ہیں، جن میں رجعت، قدامت، اور فرسودگی کے خلاف قلمی جہاد کیا جاتا ہے۔ ہم یہ سب کچھ پڑھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اپنی جگہ پر جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔ ہماری تاریک خیالی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ہمارے عقائد کی کہنگی میں ذرا فرق نہیں آتا۔ ہمارے اندر کوئی ایسا ولولہ پیدا نہیں ہوتا جو ہمیں جہالت اور ظلم کے خلاف عملی جدوجہد پر آمادہ کرے۔ "لیلیٰ کے خطوط" ہزاروں انسانوں نے پڑھے ہوں گے، بہت سمجھ کر پڑھے ہوں گے۔ لیکن اُن میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے کوئی مستقل اثر لیا ہو، اور جن کی زندگی میں اور خیالات میں واقعی کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہو۔ ہمارا ادب پانی کے اُن قطروں کی طرح ہے جو ریگستان کی تپتی ہوئی زمین پر گرتے ہیں اور جذب ہو جاتے ہیں۔"

ڈپٹی صاحب بولے "نہیں صاحب! میرا خیال ہے کہ ادب کو ہماری زندگی پر ضرور اثر ڈالنا چاہیئے۔"

میں نے کہا "ڈالنا چاہیئے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے، یہ تو صحیح ہے کہ ادب ایک عہد کے سماجی اور معاشری ماحول سے بنتا ہے اور پھر اُس ماحول کو بناتا بھی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں نہیں، ہمارا ماحول ہمارے ادب سے متاثر کیوں نہیں ہوتا؟"

ڈپٹی صاحب سوچنے لگے۔

میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے خیال میں اِس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم جس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں اُس سے ہمیں کچھ اُمیدیں ہیں، توقعات ہیں، جنھیں ہم کسی طرح منقطع کر لینے کے لئے تیار نہیں ہیں، ہم نہایت ڈھٹائی کے ساتھ خود غرضی اور خود پرستی کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ گویا قصور ادب کا نہیں، ہمارا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ادب ہماری رہنمائی کرے، ہمیں زندگی کی تاریک بھول بھلیوں سے نکال کر ایک روشن شاہراہ پر ڈال دے تو پہلے ہمیں اپنی زندگی کے بنیادی اصولوں کو تبدیل کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد بہت دیر تک گفتگو رہی۔ بلکہ جتنے دن میں نینی تال رہا، یہی مسئلہ زیر بحث رہا۔ ڈپٹی صاحب کی ذاتی زندگی کو معرض بحث میں نہ لاتے ہوئے مجھ سے اپنے نقطۂ نظر کی جس قدر وضاحت ہو سکی میں نے کی لیکن وہ میری بات کو کبھی اچھی طرح نہ سمجھ سکے، اور صرف اِتنا کہے گئے کہ ادب ہماری زندگی پر ضرور اثر ڈالتا ہے۔

میں لکھنؤ میں تھا۔ نینی تال کی سیر کو پانچ مہینے گزر چکے تھے۔ ایک صاحب کے ذریعے معلوم ہوا کہ شروعِ جاڑوں میں ڈپٹی صاحب کی بیوی اپنے پوتے کی موت کے غم میں پاگل ہو کر مر گئیں، اور اس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد ڈپٹی صاحب نے ایک نوعمر پہاڑی دوشیزہ سے نکاح کر لیا۔

میرے لئے متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

انقلاب

وجاہت سندیلوی، بی اے

اُن نڈر خود دار کیڑوں کے نام جو باوجود اپنے حقیر جسم اور ناچیز طاقت کے زیادہ پریشان اور تنگ کئے جانے پر اپنے ایذا رساں پر پلٹ پڑتے ہیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا رہا تھا، گاؤں میں سناٹا تھا۔ چرواہے گھر پلٹ چکے تھے اور دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد گاؤں کے لوگ اپنے گھروں میں گھسے چولہے کے اردگرد کھانے کے منتظر تھے۔ لڑکے تالاب کے کنارے کھیل رہے تھے۔ اُن کی آوازیں اور درخت پر کوؤں کی کائیں کائیں احساس خموشی بڑھا رہی تھی، گاؤں کا جمود اور معنی خیز سناٹا دیکھکر خیال ہوتا تھا گویا کوئی مزدور بڑی محنت کا کام کرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے تھک کر بیٹھ گیا ہو۔

ایک طرف درختوں کے جھنڈ سے جن پر نہ معلوم کتنے سیاہ دیو دل کا بار لدا ہوا تھا کلو سر جھکائے مغموم چلا آرہا تھا۔ اُس نے تالاب کی طرف نظر اٹھائی تو اُس میں گاؤں کے اِکّا دُکّا چراغ جھلملا رہے تھے۔ اُسے یہ منظر بڑا بھلا معلوم ہوا۔ اُس نے فوراً اپنے گھر کی طرف نظر اُٹھائی۔ وہاں اندھیرا پاکر اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ گھر کے دروازے پر پہونچکر پہلے وہ ٹھٹکا، پھر اندر داخل ہو گیا۔ اُسے اپنا گھر قبرستان سے بھی بدتر معلوم ہوا۔ چولھا ٹھنڈا تھا۔ صحن میں دو ٹوٹی کھٹیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر اُس کی بڈّھی ماں کراہ رہی تھی اور دوسری پر اُس کی بیوی ایک روتے ہوئے بچّے کو تھپکا تھپکا کر سُلا رہی تھی، اور ایک کو گود میں لئے ہوئے تھی۔ بیوی نے پہلے بڑی اُمید سے کلّو کے چہرے کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، پھر اُس پر پریشانی اور مایوسی کے آثار دیکھکر فوراً دوسری طرف دیکھنے لگی۔ کیا میاں سے آنکھیں چار کرکے اُس کو ذلیل کرتی؟

وہ گود کے بچّے کو لئے ہوئے پلنگ سے اُٹھ گئی۔ کلّو پلنگ پر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد اُس نے پیر جھاڑے، اور پیر پکڑ کر لیٹ گیا، جیسے بہت تھک گیا ہو۔ ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہ بولے، لیکن دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے مطالب سے پوری پوری طرح واقف تھے۔ "کلّو، کلّو" دروازہ پر ایک کرخت آواز سنائی دی۔

بیوی نے میاں کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "ہیں نہیں ابھی کام سے نہیں آئے۔" "ایسی تیسی اس کے کام کی بڑا کام کرنے والا بنا ہے، حرامزادہ، اب ہم نہیں رُک سکتے۔ ابھی اسی وقت لٹیا تھریا" لیجائیں گے، یہ بھی کوئی بات ہے۔" پھر آواز آئی۔ بیوی نے گڑگڑا کر کہا "مہاراج کل وہ آجائیں گے تب" مہاراج نے اس کو بات بھی نہ کرنے دی اور ہزار ہا مغلظات سنا ڈالیں، اور اُس کے بعد ایک فاتحانہ کھنکار کے ساتھ گھر میں داخل ہوگئے۔ کلّو نے

کمرے میں چھپ جانے کی ناکام کوشش کی وہ بیچ صحن ہی میں تھا کہ مہاراج نے اُسے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا۔ کیوں بے سالے، کہہ کر اُنھوں نے اس کو پکڑ لیا اور مارنا شروع کردیا۔ چانٹوں، گھونسوں۔ لاتوں۔ جوتوں سے اُسے مارتے جاتے اور ہزار ہا گالیاں دیتے جاتے۔ بیمار ماں جاگ پڑی، اور اپنے لڑکے کا یہ حال دیکھکر پرمیشر کی دہائی دینے لگی، بچے اپنی ماں سے چمٹ گئے اور وہ بیچاری غیرت اور شرمندگی سے رونے لگی۔ بیچارہ کلّو، مہاراج کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بنا ہوا تھا۔ کبھی ہاتھ جوڑتا، کبھی پیروں پڑتا، کبھی دُہائی دیتا، لیکن مہاراج بالکل متاثر نہ ہوتے، اور اُن کی مصروفیت میں ذرا بھی فرق نہ آتا، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی بھوکا درندہ اپنے مردہ شکار کو جھنجوڑ رہا ہو۔ جب کلّو بیہوش ہوکر ایک طرف گر پڑا تو مہاراج سینکڑوں گالیوں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ اگر کل تک ان کا حساب آنہ پائی سے بیباق نہ ہوگیا تو آج تو اُنھوں نے چھوڑ دیا، لیکن کل خیر نہیں۔

مہاراج چلے گئے تو بیوی نے آکر کلّو کو پلنگ پر لٹایا اور پنکھا جھلنے لگی۔ رات کو گھر میں سب سوگئے لیکن کلّو جاگتا رہا۔ قریب بارہ بجے کے وہ اُٹھا اور کُنڈی کھول کر دروازے کے باہر نکل گیا۔ دروازے سے نکلتے وقت اُس کے چہرے پر پڑوس کے چراغ کی لو جھلملائی اور اس کی آنکھیں بڑی خوفناک معلوم ہوئیں۔ یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ اُسی کلّو کی آنکھیں ہیں جو شام کو مہاراج کے قدموں پر لوٹ لوٹ کر ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

دوسرے دن سویرے تڑکے گاؤں بھر میں بجلی کی طرح یہ خبر دوڑ گئی کہ رات کو کسی نے مہاراج کا گلا گھونٹ دیا اور اُن کا روپیہ والا بکس لے کر چمپت ہوگیا۔ گاؤں بھر کے لوگ مہاراج کے مکان پر جمع ہوگئے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے، کلّو ان سب سے الگ ایک لٹھ کندھے پر رکھے بانکی پگڑی باندھے شہر کی طرف جا رہا تھا، ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، وہ بازار سے ماں کے لئے دوا، بیوی کے لئے کپڑے اور بچوں کے لئے کھلونے لینے جا رہا تھا۔

"عشق" اور "وطن"

یہ سچ ہے عشق سے بنجائیگی مری ہستی
بلندیوں سے گزر جائے گی مری پستی

یہ سچ ہے عشق سے قائم ہے کائنات کا نظم
اسی کے دم سے ہے وابستہ جوشِ گرمیٔ بزم

یہ سچ ہے ماہ نے بھی اس سے بھیک مانگی ہے
یہ سچ ہے مہر نے بھی اس سے روشنی لی ہے

یہ سچ ہے پائی ہے گلشن نے تازگی اس سے
کلی کلی نے طلب کی ہے دلکشی اس سے

غرضکہ عشق مجسم لطافت و رحمت
مرے ندیم! مگر مجھکو تو نہیں فرصت

کہ مجھکو اس سے اہم ایک کام کرنا ہے
خزاں کے نقش میں رنگِ بہار بھرنا ہے

(مشتاق احمد شارق)

دین و ملّت کو سلام

مل گئے کل راستے میں اک معزز شہر کے
آرہے تھے کرکے اربابِ حکومت کو سلام

مجھ سے فرمایا کہ "گو تم ہو بہت قابل مگر
جو نہ آئے کام ایسی قابلیت کو سلام

سجدہ گاہِ اہلِ دل ہے یہ تمہارا آستاں
آسماں کرتا تھا جھک کر جس کی رفعت کو سلام

شہر میں تم دیکھتے ہو آدمی کوئی نہیں
کرلیا ہے کس لئے تم نے سیاست کو سلام

حاکمانِ شہر شاکی ہیں کہ تم ملتے نہیں
کبر سے کرتے نہیں اربابِ دولت کو سلام

ہو کے عالم دین کے چلتے ہو راہِ عقل پر
ہو کے صوفی حلقۂ اہلِ طریقت کو سلام

یہ تمہاری وضع و صورت یہ تمہارے رنگ ڈھنگ
اک نہ اک دن تم کروگے دین و ملت کو سلام"

سلسلہ اُن کی ہدایت کا جو پہونچا دین تک
عرض کی میں نے بھی پھر کر کے متانت کو سلام

مشفقِ من! شہر میں جب آدمی کوئی نہیں
آپ ہی کہئے نہ کرلوں کیوں سیاست کو سلام

جس میں حق سننے کی استعداد بھی باقی نہیں
ایسی باطل قوم کی باطل قیادت کو سلام

حاکموں سے جھوٹ بولوں بیچ ڈالوں قوم کو
آپ کا منشا یہ ہے کرلوں شرافت کو سلام

خود لڑاؤں جاہلوں کو خود کروں تبلیغِ امن
لوں حکومت سے خطاب ایسی سیاست کو سلام

مجھکو اپنے نفس کی ذلت بھی ہی دل سے عزیز
غیر سے جو مانگئے ہر ایسی عزت کو سلام

جس کی پاپوشیں بنی ہوں مفلسوں کی کھال سے
دور سے اُس وارثِ قاروں کی دولت کو سلام

جس کے ہاتھوں سے ٹپکتا ہو شہیدوں کا لہو
سُن رکھیں اہلِ حکومت اُس حکومت کو سلام

رند ہی اچھا، نہ دو ذوقِ ریاکاری مجھے
قید جو حلقے میں ہو ایسی طریقت کو سلام

دین بھی فطری ہے میرا عقل بھی فطرت مری
ہو جو فطرت کے مخالف اس شریعت کو سلام

ناصحا جس دین و ملت کے نمائندے ہیں آپ
میکشِ بے دین کا اس دین و ملت کو سلام

(میکشؔ اکبرآبادی)



ہونے کے بعد ھنگیانگ کی سڑکوں پر جاپانی سپاہی چھپے ہوئے چینیوں کی تلاش کر رہے ہیں



جاپان کی پیادہ فوجین جو شمالی چین پر پر زور حملے کر رہی ہین-



پتنگے کی آزادی

محمد عبدالکریم آزاد اشرفی

جون کی ایک شام تھی۔ گذشتہ شب کافی بارش ہوئی تھی۔ نالے، گڈھے، جھیل، تالاب، سب بھر گئے تھے، مینڈکوں کے ٹرٹر کرنے کی سامعہ خراش آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ جھینگر کی طبیعت اُکتا دینے والی آواز تو نہ تھی، لیکن اسی قسم کے دوسرے حشرات الارض قبل از وقت پانی کے برس جانے کی خوشیاں منا رہے تھے۔ بعض دھیمی اور بعض کچھ تیز آوازیں، انگریزی باجے کی طرح موٹے، بھین بُس مینڈکوں کی کرخت موسیقی کے ساتھ ملا رہے تھے، حبس تو اس روز بھی تھا، لیکن گذشتہ رات کا سا نہ تھا، کبھی کبھی ہوا کے دو ایک ٹھنڈے جھونکے کچھ پھولوں کے خوشبو لئے ہوئے دروازے کی کوٹھری میں آجاتے، بارش کا نتیجہ تھا کہ دو چار سبک، اور دو چار مضبوط پروں والے پتنگے ولائتی لالٹین کے گرد چکر لگانے لگے، میں مطالعے کے کمرے میں بیٹھا ایک مضمون بعنوان "مسولینی کی بتدریج ترقی" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جس کا پہلا جملہ اس طرح شروع ہوتا ہے "گر جکر! آؤ!! ہم فتح کریں۔ یقین مانو ہم ضرور فتح یاب ہوں گے —— زندہ باد! اٹلی زندہ باد!!"

میں سوچ رہا تھا کہ کاش! ایسا کوئی بہادر ہندوستان میں بھی جنم لیتا، اور غول بیابانی کی طرح، جس طرح اٹلی میں لوگ مسولینی کی پیروی کرتے ہیں ہندوستان میں بھی لوگ اس کی پیروی کرتے۔

دو تین دفعہ اس جملے کو پڑھا۔ ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہوگئی، مجبور غصہ ور انسان کی طرح آپ ہی آپ گرجنے لگا "آزاد نسل کا بچہ ہوں۔ گو پنجرے میں ہوں۔ لوگو! اُٹھو!! عَلَم آزادی ہاتھ میں لو —— بجلی کی تیز روشنی کی طرح سارے ملک میں پھیل جاؤ —— طوفان میں گُل نہو! موسلا دھار پانی میں سرد نہ پڑ جاؤ! —— انسان کے روکے نہ رُکو —— کم ہمتوں کے دل میں ہمت —— اور ہمت ور کے دل میں اور زیادہ ہمت و جوش پیدا کر دو! بلا خوف و خطر سمندر میں کود پڑو! پہاڑوں کو اُکھاڑ پھینکو! —— اور پھر جنگل کے آزاد سردار کی طرح زندگی بسر کرو! —— اگر ایسا نہیں کرو گے تو ہمیشہ تمہیں نچلے طبقے کے غلام کی طرح نظریں نیچی کرکے چلنا ہوگا —— ہمیشہ ہمیشہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی —— اور پاؤں میں لوہے کی مضبوط بیڑیاں ہوں گی —— کچھ غم، کچھ غصہ۔ کچھ جھنجھلاہٹ۔ کچھ دَورِ موجودہ کی لا انتہا مصیبتوں کو یاد کرکے رونے لگا —— رونے لگا بالکل پاگل کی طرح۔ بالکل پاگل کی طرح ہنسنے لگا۔ آنسو کے دو چار قطرے کتاب کے صفحے پر بکھرے پڑے تھے —— دو ایک رخسار پر تھے، ایک دو پلکوں کو بھاری کئے آنکھوں میں ناچ رہے تھے —— ناچ رہے تھے کہ ساڑھے نو بجے —— گھڑی کی دوہری آواز سے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا ——

آنسو پونچھے اور دوسرا صفحہ اُلٹا —— اُلٹے ہوئے ورق کی بمشکل دو سطریں پڑھی ہوں گی کہ آہستہ آہستہ پڑھا ہوا ورق اُٹھنے لگا —— میں نے آہستہ سے دبا دیا —— ڈیڑھ سطر پڑھنے کے بعد پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی —— "یا خدا" کہتا ہوا پھر صفحہ برابر کر دیا —— اور مطالعے میں مشغول ہو گیا —— اب سرسراہٹ کی آواز پیدا ہونے لگی —— اس کا خیال نہ کرتے ہوئے اب کی ذرا زور سے دبا دیا —— نتیجہ یہ ہوا کہ ——

"صندی نیچے کی طرح" اور زور سے سرسراہٹ کی آواز نکلنے لگی ـــــ تنگ آکر مجھکو مطالعہ چھوڑ دینا پڑا ـــــ اور چپ چاپ ایک ہاتھ سے سر ٹیکے پتنگوں کا "رقصِ مجنونانہ" دیکھنے لگا ـــــ پتنگے بھیچنے سے اُڑ رہے تھے ـــــ بتی تیز تھی ـــــ کتاب کھلی ہوئی تھی، بھنبھناہٹ کی آواز صفحے کے نیچے سے برابر آرہی تھی ـــــ آنکھیں ٹکٹکی لگائے اس کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ آواز میں پہلے سے زیادہ تیزی تھی ـــــ ورق کچھ اوپر کی طرف اُٹھنے لگا ڈرامے کے پردے کی طرح ـــــ اندر سے وہی بھنبھناہٹ کی آواز جیسے کوئی مصیبت میں کراہ رہا ہو برابر آرہی تھی ـــــ چند لمحے میں آواز تیز تر ہو گئی۔ اور اُس کے بعد بھنبھناہٹ ہوا میں گونج رہی تھی ـــــ پتنگا اب آزاد تھا ـــــ پہلے کی طرح ـــــ اس کے ساتھ ہی اور چند پتنگے نکل بھاگے ـــــ گویا اُس نے انقلاب کا پرچم لہرایا تھا ـــــ اور کئی چھوٹے، بڑے، پتنگے اس پرچم کے نیچے سے آزادی کا راگ الاپتے ہوئے نکل گئے ـــــ اور بہت خوش خوش وہ میرے منہ، کان، اور سر پر اُچھلنے اور میرے کان میں "آزادی" کا افسانہ کہنے لگے۔ وہ سب اپنے عادات و اطوار سے بتا رہے تھے کہ اب وہ سب ہر طرح سے آزاد ہیں ـــــ اور اُنھیں کامل آزادی مل گئی ہے۔ ہر طرف کی گھڑیوں میں دس بجنے لگے ـــــ کوئی آہستہ آہستہ کوئی زور زور سے شہر کے گھنٹہ گھر کا گجر بجنا شروع ہوا، اور اُس کے بعد شہر کے تمام گھنٹے یکے بعد دیگرے بجنے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جیل کا کوئی قیدی بھاگ گیا ہے ـــــ اور اس کی تفتیش کے لئے لوگوں کو بیدار کیا جا رہا ہے۔ اور کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ سارے شہر میں آگ لگی ہوئی ہے ـــــ اور آگ بجھانے کے لئے گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میرا دل اب زیادہ دھڑکنے لگا ـــــ گھنٹیاں بدستور بج رہی تھیں ـــــ آخرش یہ خیال دماغ میں زہریلے گیس کی طرح گھس گیا کہ ـــــ ضرور یہ "انقلابی گھنٹیاں" ہی ہیں ـــــ اور ہمیں بیدار ہو جانا چاہئیے ـــــ اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی مدد کے لئے دوڑ پڑنا چاہئیے ـــــ ذہن میں ایسا نقشہ کھنچ گیا کہ ـــــ "انقلابی گھنٹیاں" بج رہی ہیں ـــــ اور لوگ پریشان صورت، اُلجھے ہوئے بال، خوابیدہ چہرے، آنکھیں ملتے ہوئے بوڑھے، جوان، لڑکے، بچے، مرد، عورت، دوڑتے، ہانپتے، گرتے پڑتے ہوئے ـــــ کسی کے ہاتھ میں کچھ ہے، کسی کے ہاتھ میں کچھ ـــــ سب ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں ـــــ ایک ہنگامہ ہے، دکھائی نہیں پڑ رہا ہے کہ کون سردار ہے اور کون سپہ سالار ـــــ سب کی زبان پر انقلاب ہی انقلاب ہے۔ غول کے بیچ سے کوئی چیخ چیخ کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا ہے ـــــ "صف بندی کرو! ـــــ صف بندی کرو! ایک قطار میں ہو جاؤ! ـــــ ہو جاؤ! نوجوانوں کو آگے کرو! جلدی کرو! پھرتی کرو! لائن بناؤ! اُف دیکھتے نہیں! دشمن قریب آگیا ـــــ غالباً شہر پناہ کے اُس پار ہے ـــــ سنو! میرے شیرو! میرے بہادرو! میرے قابل قدر نوجوانو! میرے جنگجوؤ! ڈرنا مت! ہرگز ہرگز مت ڈرنا ـــــ نپولین کی طرح بلا خوف خطر لڑ پڑو، ڈٹ کر مقابلہ کرو! ٹوٹ پڑو! بھائیو! دیکھو، دیکھو، دشمن کی فوجی مشعل کی روشنی قریب تر ہو رہی ہے ـــــ ہوشیار! ہوشیار!! ـــــ ہو ـــــ ش ـــــ یا ـــــ یا ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ"

گھنٹیوں کی آواز آنی ختم ہو گئی ـــــ لیکن "ر" کی آواز ہنوز فضا میں گونج رہی تھی ـــــ اب ہر طرف سناٹا چھا گیا ـــــ بالکل سناٹا۔ جیسے نصف رات بھاگ چکی ہے ـــــ ہمارے تخیلات کا سلسلہ ختم ہو گیا ـــــ میں تنِ تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا وہی میگزین ـــــ وہی مضمون ـــــ وہی "ولائتی لالٹین" ـــــ وہی آزاد پتنگے ـــــ اور وہی غلام ہندوستان ـــــ کیا میں جاگ رہا تھا؟ کیا میں سو رہا تھا؟۔

جب رات کو چھپتے ہیں بادل کالے
ظلمت میں پیتے ہیں دلوں کے چھالے
قربان ترے اس وقت کی تاریکی پہ
اے نکہتِ سحر سے دل کو چھونے والے

انسانی فرائض کے متعلق جوزف میزنی کے گرانقدر خیالات

سید اختر علی تلہری

جوزف میزنی اُنیسویں صدی کی ایک نامور شخصیت ہے۔ اٹلی کی سرزمین کو اس کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اگر ایک طرف یہ زبردست مفکر اور اہلِ قلم تھا تو دوسری طرف عملی سیاسیات میں بھی بہت زیادہ منہمک رہنے والا۔ چنانچہ اپنی اس سیاسی جد و جہد کی وجہ سے قید اور جلا وطنی کی مصیبتیں بھی اُسے برابر جھیلنا پڑیں۔ اُس کے مقالات عام طور سے نہایت پُرمغز اور دانش و خرد کا گرانبہا ذخیرہ ہیں۔ اُن کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ غور و فکر کے سنگلاخ میدانوں میں اُس کی عقل کا بادِ پا کس سبک خرامی کے ساتھ دوڑتا ہے۔

چونکہ عملی سیاسیات اُس کی زندگی کا جز بن چکے تھے اس لئے وہ مجبور تھا کہ بحث و نظر کے لئے وہی مباحث چُنے جن سے فعل و عمل کی دُنیا میں فائدے اُٹھائے جا سکیں۔ اُس کا عنوانِ بحث اُن علمی موشگافیوں سے یقیناً خالی ہے۔ جو مابعد الطبیعاتی مباحث کے لئے طغرائے امتیاز ہیں، تاہم اُس کے خیالات میں ایک حد تک فلسفیانہ استحکام موجود ہے اور وہ اُس کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اُس "فکری ذوق" کو تسلی دے سکیں۔ جو عمل سے بیگانہ بنا نہیں چاہتا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ ایک خیال کو بہت بڑے پھیلاؤ کے ساتھ بیان کرتا ہے، مگر یہ اُس کی خطابت کا کمال ہے کہ بیان کا یہ پھیلاؤ طبیعتوں پر گراں نہیں ہوتا۔

انسانی فرائض کے متعلق اُس کا یہ طویل الذیل مقالہ ہے جس میں اُس نے بہت سی تمدنی و اخلاقی حقیقتوں کا تذکرہ کیا ہے، یہ سچ ہے کہ میزنی کا نظریۂ فرائض کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ یہ وہ صداقت ہے جس کی تبلیغ مختلف شکلوں میں اخلاقی و روحانی سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی رہتی ہے، تاہم جہاں تک کہ اس نظریہ کا تعلق ہے اُس نے "پُرانی شراب" کو نئی خوشرنگ بوتلوں میں سلیقہ سے بھر کر پیش کیا ہے۔

میزنی نے مسیحیت کی آغوش میں تربیت پائی ہے، ایسی صورت میں وہ اپنے اُن خیالات کو جن پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے "عیسائی اصطلاحات" سے بے نیاز کیونکر بنا سکتا تھا؟ اُس نے جا بجا بعض عیسائی نظریوں کی حکیمانہ ترجمانی کی بھی سعی کی ہے اور اُس کا یہ رنگ اُس مقام پر خصوصیت سے جھلک آتا ہے جہاں اُس نے ان فرائض کا تذکرہ کیا ہے جو خدا سے متعلق ہیں، مگر ان باتوں سے متوحش ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، دیکھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ میزنی جو اٹلی کے مفکرین کا میرِ قافلہ ہے بعض اہم اخلاقی و سیاسی مسائل کے متعلق کن خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میزنی نے نظریۂ فرائض کی تبلیغ جس حکیمانہ بلند آہنگی سے کی ہے اُس کی معقولیت کو خالص سے خالص عقلیت پسند انسان کو بھی ماننا پڑے گا اٹلی کے مزدوروں کو خطاب کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

میں تمہارے فرائض کے متعلق تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، ہمارے دائرۂ معلومات میں جو مقدس ترین چیزیں ہیں یعنی خدا۔ انسانیت، وطن اور خاندان اُنھیں کے متعلق اپنے دل کی ہدایتوں کے مطابق میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اُسی محبت کے ساتھ تم میری باتیں سنو جس محبت کے ساتھ میں اُنھیں تم سے کہہ رہا ہوں۔ میرے الفاظ اس عقیدہ کے آئینہ دار ہیں جس میں برسوں کے رنج و غم مشاہدہ اور مطالعہ نے پختگی پیدا کر دی ہے، جن فرائض کو تمہیں بتانا چاہتا ہوں اُن کے انجام دہی کی حتی الوسع کوشش کرتا رہا ہوں۔ اور جب تک زندہ ہوں کوشش کروں گا۔ ممکن ہے کہ مجھ سے غلطی ہو جائے۔ لیکن میرا قلب سچا ہے۔ ممکن ہے کہ میں اپنے نفس کو فریب میں مبتلا کر لوں، لیکن تمہیں فریب نہیں دوں گا۔ ایک بھائی کی طرح میری باتیں سنو اور آپس میں آزادی سے اس کا فیصلہ کرو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ تمہیں سچ معلوم ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ باتیں جنھیں میں تمہیں سُنا رہا ہوں تم کو جھوٹی معلوم ہوں تو مجھے چھوڑ دو۔ لیکن اگر اُنھیں سچ سمجھو تو میری پیروی کرو اور میری تعلیم کے مطابق عمل کرو۔ غلطی میں مبتلا ہو جانا ایک بدنصیبی ہے، جو رحم کے قابل ہے۔ لیکن سچائی کا علم ہو جانے کے بعد اپنے افعال کو اُس کے مطابق نہ بنانا ایسا جرم ہے جو دنیا و عقبیٰ دونوں میں قابلِ لعن و سرزنش ہے۔

حقوق طلبی پر فرائض کی انجام دہی مقدم ہے

میں کیوں "تمہارے حقوق" پر گفتگو کرنے سے پیشتر تمہارے فرائض پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں؟ میں کیوں ایسی سوسائٹی میں جس میں ہر چیز اختیاری یا اضطراری طور سے تم پر ظلم کر رہی ہے۔ جس میں کسی انسانی حق کے برتنے کے تم مجاز نہیں ہو — جس میں صرف تکلیف و مصیبت تمہارا حصہ ہے، اور جس میں خوشوقتی و خوشحالی دوسرے انسانی طبقوں کا حق ہے۔ ایسے سماج میں فتوحات حاصل کرنے کے بجائے قربانی و ایثار کی، مادی بہتری کے بجائے نیکی، اخلاق، اتقا اور تعلیم کی تمہیں تبلیغ کر رہا ہوں؟

یہ وہ سوال ہے جس کا جواب مجھے سلسلۂ کلام کے آگے بڑھانے سے پہلے دیدینا چاہیئے، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے سیاسی خیالات اور اُن دوسرے سیاسی خیالات میں جن کی آج یورپ میں تلقین کی جارہی

ہے، فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہی وہ سوال ہے جو معیبت زدہ مزدوروں کے خشمگیں دماغوں میں برابر پیدا ہوتا ہے، وہ پوچھتے ہیں "ہم غریب ہیں، غلام ہیں۔ تکلیف میں ہیں۔ ہم سے ہماری مادی حالت کی بہتری، آزادی اور خوشحالی کے متعلق گفتگو کرو۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ آیا ہم اُنھیں مصیبتوں کو ہمیشہ جھیلتے رہیں گے یا کبھی زندگی کی مسرتوں سے بھی بہرہ اندوز ہوسکیں گے۔ ہمارے آقاؤں کو اور اُن اونچے طبقہ والوں کو فرائض کی تعلیم دو جنھوں نے ہمیں مشین بنا رکھا ہے، اور جنھوں نے اُن تمام نعمتوں پر جو سب کا حصہ ہیں تنہا اپنا اجارہ قائم کر لیا ہے، ہم سے تو ہمارے حقوق کے متعلق بات چیت کرو۔ ہمیں تو وہ ذرائع بتاؤ جن سے ہم اُنھیں حاصل کر سکیں۔ ہمیں تو قوت و طاقت کی تعلیم دو۔ ہمیں پہلے اپنا وجود تو منوا لینے دو پھر فرائض اور قربانی کی تعلیم دینا"۔

یہ وہ باتیں ہیں جنھیں ہمارے بہت سے مزدور پیشہ کہتے اور اُن معلموں اور جماعتوں کی پیروی کرتے ہیں، جنھیں اُن کی ان خواہشوں سے عملی ہمدردی ہے، لیکن وہ ایک بات بھول جاتے ہیں یعنی جس نظریہ کو وہ اس شد و مد سے پیش کرتے ہیں، اُس کی پچاس برس سے تلقین کی جارہی ہے، لیکن اُس سے مزدور پیشہ جماعت کی حالت میں ذرا سی بھی مادی ترقی پیدا نہیں ہوسکی ہے۔

گزشتہ پچاس سال میں مطلق العنان حکومتوں اور خاندانی امیروں کے خلاف (عام انسانی) ترقی اور بہتری کی خاطر جو کچھ کیا گیا وہ انسانی حقوق کے نام سے کیا گیا ہے، آزادی کو ذریعہ بتایا گیا تھا، اور خوشحالی و بہبود کو زندگی کا مقصد —— وہ تمام افعال جو انقلاب فرانس اور بعد کے دوسرے تقلیدی انقلابات کے دوران میں کئے گئے ہیں "اعلان حقوق انسانی" ہی کا نتیجہ تھے۔

ان تمام فلسفیوں کے مصنفات کی بنیاد جنھوں نے ان انقلابات کی زمین طیار کی تھی "آزادی" کے نظریہ پر اور اس امر کی ضرورت پر تھی کہ ہر شخص کو اُس کے حقوق جتا دئے جائیں۔ جتنی انقلابی جماعتیں تھیں وہ اسی کی تبلیغ کرتی تھیں کہ انسان خوش حالی اور خوش وقتی کے لئے پیدا ہوا ہے، اُسے اُس کا حق ہے کہ وہ اس خوشحالی کے حاصل کرنے کی تمام امکانی ذریعوں

سے کوشش کرے کوئی شخص اس کا مجاز نہیں ہے کہ اُس کی اس تلاش میں رکاوٹیں ڈالے (اگر رکاوٹیں ڈالی جائیں) تو وہ حق رکھتا ہے کہ وہ اُن تمام موانع اور رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹا دے۔ چنانچہ یہ موانع راستہ سے ہٹائے بھی گئے اور آزادی حاصل بھی کی گئی۔ بہت سے ملکوں میں وہ برسوں تک قائم رہی۔ بعض میں وہ ابھی تک قائم ہے۔ لیکن کیا عام اشخاص کی حالت میں ترقی ہوگئی؟ کیا اُن لاکھوں آدمیوں کو جو روزانہ محنت و مزدوری کرکے پیٹ پال رہے ہیں، اُس خوشحالی کا کوئی حصہ بھی ملا جس کی انھیں توقعات تھیں اور جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا تھا؟ نہیں۔

عام اشخاص کی حالت میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ قریب قریب ہر ملک میں اُن کی حالت کچھ اور بھی خراب ہوگئی ـــــــ

ـــــــ خصوصاً اُس مقام پر جہاں کہ میں لکھ رہا ہوں۔ (لندن)

ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ مزدوروں کی اجرتیں بہت سی حرفتوں میں کم ہوتی جارہی ہیں۔ اور آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، قریب قریب ہر ملک میں مزدوروں کی حالت کچھ زیادہ غیر پائدار اور خراب ہی ہوگئی ہے۔ ایسی اسٹرائکیں جن سے ہزارہا مزدور بیک وقت بیکار ہو جاتے ہیں، آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلے جانے اور یورپ سے دنیا کے دوسرے حصوں میں منتقل ہو جانے کی رفتار میں زیادتی۔ عام فائدہ رساں اداروں کی تعداد میں ترقی پذیر اضافہ، مفلسوں اور غریبوں کے سامان خورش اور حفاظت کی فکر میں روز افزوں ترقی ہمارے دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ موخر الذکر امر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پبلک کی توجہ برابر غریبوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی طرف بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن اُن کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو کسی محسوس حد تک کم نہ کرسکنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان طبقوں میں جن کی وہ مدد کرنا چاہتے ہیں افلاس بھی اُسی تیزی سے ترقی کرتا جارہا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ان آخری پچاس برسوں میں تمدنی دولت اور مادی برکتوں کے حصول کے ذریعوں میں نہایت تیزی سے اضافہ ہوا ہے، پیداوار دوگنی ہوگئی ہے، تجارت کا بازار متواتر مواقع خطرات کے پیش آنے کے باوجود جن کا سامنا تنظیم کی عدم موجودگی کی حالت میں ناگزیر تھا۔ برابر رونق پکڑتا جارہا ہے، اور اُس کے حدود میں وسعت ہوتی جارہی ہے۔ ذرائع آمد و رفت ہر جگہ محفوظ اور سریع ہوگئے ہیں۔ روانگی اشیا کے محصول کی کمی کی وجہ سے چیزوں کی قیمتیں بھی بہت گھٹ گئی ہیں۔ اس کے ساتھ حقوق کا تخیل جو انسانی فطرت میں داخل ہے، آج عام طور سے قبول کیا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو عملاً اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اُسے لساناً منافقانہ طور ہی سے سہی ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مزدوروں کی حالت نہیں سدھرتی ہے؟ اس کا کیا سبب ہے کہ پیداوار کی تقسیم یورپ کی تمدنی جماعتوں میں مساویانہ طور سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کی جگہ صرف چند اشخاص کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جس سے ایک نئی "جماعت الامراء" کا وجود ہوتا جارہا ہے؟ اس کا کیا باعث ہے کہ صنعت و حرفت و تجارت میں جو نئی روح پیدا ہوگئی ہے اُس نے اکثریت کی بہبود کا سامان مہیا کرنے کے بجائے چند افراد کی عیش پسندیوں میں اضافہ کر دیا ہے؟

ان تمام سوالات کا جواب اُن لوگوں کے لئے بالکل واضح ہے جو ان تمام معاملات پر ذرا غور سے نظر کرتے ہیں۔

حقوق کا تصادم

انسان تعلیم کا آفریدہ ہے۔ وہ جس قسم کے تعلیمی اصولوں سے مستفید ہوتا ہے اُنھیں کے مطابق عمل کرتا ہے۔ جن اشخاص نے انقلابات کو اتنی ترقی دی ہے، اُنھوں نے ان کی بنیاد "انفرادی حقوق" پر رکھی ہے۔ انقلابات نے آزادی حاصل کر لی۔ انفرادی آزادی، تعلیمی آزادی، اعتقادی آزادی، تجارتی آزادی، غرضکہ ہر چیز میں آزادی اور ہر شخص کے لئے آزادی لیکن اپنے ان حقوق کا احساس اُن لوگوں کے واسطے کیا مفید ہوسکتا ہے، جن کے پاس اُن کے برتنے کے ذرائع ہی نہیں ہیں؟ آزادیٔ تعلیم سے اُن کو کیا فائدہ پہونچتا جن کے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ دوسرے ذرائع کہ وہ اُس سے نفع اُٹھائیں؟ آزادیٔ تجارت سے اُنھیں کیا نفع جن کی نہ تو کوئی ساکھ ہے اور نہ جن کے پاس کوئی سرمایہ؟ اُن تمام ملکوں میں جہاں اس اصول کا اعلان کیا گیا تھا سوسائٹی کی ترکیب دو قسم کے افراد سے تھی قلیل افراد تو وہ تھے جن کے قبضے میں زمین اور سرمایہ تھا، لیکن کثیر تعداد ان افراد کی تھی جن کے قبضے میں اپنے ہاتھوں کے سوا اور کچھ نہ تھا اور جو اس پر مجبور

تھے کہ اپنے زندہ رہنے کے لئے پہلے طبقہ کی عائد کردہ شرائط پر تمام دن ایک طرح کی محنت و مزدوری کریں اور ان کے ثمرات سے اپنے آقاؤں کو فائدہ پہونچائیں۔ اس طبقہ کے لئے جو بھوک سے جنگ کرنے پر برابر مجبور رہتا تھا آزادی سوائے ایک فریب نظر اور تکلیف دہ طنز کے اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس حالت کے بدلنے کی خاطر پہلے طبقہ کے افراد کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ مزدوری کے اوقات کم کریں۔ اجرت میں اضافہ کریں۔ عوام کے لئے مفت اور ایک طرح کے تعلیمی ادارے قائم کریں اور اچھے اور نیک کردار مزدوروں کے لئے بونس فنڈ (انعام) مہیا کریں، لیکن وہ طبقہ ایسا کیوں کرے؟ کیا بہبودی زندگی کا عام مقصد نہیں تھا؟ کیا مادی نعمتیں دوسری چیزوں سے پہلے قابل خواہش نہیں تھیں؟ وہ کیوں اپنی مسرتوں اور عیش پسندیوں کو دوسروں کے فائدے کے لئے کم کریں؟ وہ لوگ جو اپنی مدد کر سکتے ہیں خود اپنی مدد کریں، جب کہ سوسائٹی نے ہر شخص کے لئے جوان "انسانی حقوق" سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اُس کی آزادی محفوظ کر دی ہے کہ وہ ان حقوق کو برتے تو اب اُس سے اور کس بات کی خواہش کی جا سکتی ہے؟ اگر کوئی شخص اپنے حالات کے عدم مساعدت کی وجہ سے ان حقوق کو برت نہیں سکتا، اور اُن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا تو اُسے صبر کرنا چاہیئے اور دوسروں کو الزام نہیں دینا چاہیئے۔ یہ بالکل فطری تھا کہ خوشحال طبقہ یہ باتیں کہے اور چنانچہ اُس نے کہیں بھی۔

غربا کے بارے میں خوش نصیب و خوش طالع طبقوں کا یہ دماغی رجحان پھیلا، اور بہت جلد یہی کیفیت ہر فرد کی دوسرے فرد کے متعلق ہو گئی۔ ہر شخص اپنے ہی حقوق اور اپنی ہی حالت کے سدھارنے کی فکر کرتا رہا۔ دوسروں کی اُسے کوئی فکر نہیں رہی اور جب کبھی اُس کے حقوق دوسروں کے حقوق سے متصادم ہوئے تو لڑائی چھڑ گئی۔ خون بہانے والی لڑائی نہیں، بلکہ سونے (دولت) اور مکر و فریب کی لڑائی۔ اگرچہ یہ لڑائی خونریز لڑائی کے مقابلہ میں مردانہ نہیں تھی، لیکن اُسی کے برابر تباہ کن ضرور تھی۔ اس بے رحمانہ لڑائی میں اُن لوگوں نے جن کے پاس ذریعے تھے اور جو مضبوط تھے کمزوروں اور غیر سلیقہ مندوں کو بیدردی سے کچل [illegible]

[illegible] ہونے والی جنگ میں لوگوں کو انانیت و خود پرستی کی خوب تعلیم ہوئی اور اُن میں اپنی مادی بہتری کی حرص و طمع پیدا ہو گئی۔ مذہبی آزادی نے تمام مذاہب تباہ کر دئے۔ تعلیم کی آزادی نے اخلاقی سرکشی پیدا کر دی۔ افراد میں کوئی رشتۂ اتحاد نہیں رہا۔ مذہبی عقائد و مقاصد میں یکسانی باقی نہیں رہی۔ صرف ایک مقصد رہ گیا کہ ذاتی و انفرادی مسرتوں اور لذتوں کے حاصل کرنے میں انہاک رکھا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص نے اپنا الگ راستہ اختیار کیا بغیر اس کی پروا کئے ہوئے کہ وہ اس راستہ کے چلنے میں کتنے بھائیوں کے سر کچلتا جا رہا ہے، یہ بھائی نام کے ہیں اور حقیقت میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

تصادم حقوق کی صورت میں کون چیز مفید ہو سکتی ہے؟

یقیناً "حقوق" کا وجود ہے، لیکن جہاں کہیں ایک فرد کے حقوق دوسرے فرد کے حقوق سے متصادم ہوں وہاں کیونکر ہم اُن میں مصالحت پیدا کر سکتے ہیں، جب تک کہ حقوق سے بالاتر کسی اور چیز سے اپیل نہ کی جائے؟ ایسے ہی جہاں کہیں ایک فرد یا بہت سے افراد کے حقوق ملک کے حقوق سے متصادم ہوں وہاں کونسی وہ عدالت ہے جس سے ہم اپیل کریں؟ اگر امکانی حدود تک اچھی حالت میں رہنے کا حق ہر متنفس کو پہونچتا ہے تو پھر وہ کون شخص ہے جو مزدوروں اور کارخانہ داروں کے درمیان میں پیش آنے والی دقتوں اور دشواریوں کا فیصلہ کر سکے؟ اگر وجود کا حق ہر شخص کا اولین اور مقدس ترین حق ہے تو پھر اس کا مطالبہ کون کر سکتا ہے کہ دوسروں کے فائدے کے لئے اُس کے وجود کو قربان کر دیا جائے؟ کیا تم ملک کے نام سے سوسائٹی کے نام سے یا اپنے بھائیوں کی جماعت کے نام سے اس کا مطالبہ کر سکتے ہو؟ اُن لوگوں کی رائے میں جن کا میں اس وقت تذکرہ کر رہا ہوں، ملک اُس مقام سے عبارت ہے جہاں ہمارے "انفرادی حقوق" پورے طور سے محفوظ ہوں۔ ان کی نگاہ میں سوسائٹی ایسے انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے جنہوں نے اس امر پر اتفاق کر لیا ہے کہ اکثریت کی قوت انفرادی حقوق کی تائید میں استعمال کی جائے۔ جب تم اپنے ہر فرد کو پچاس برس سے یہ تعلیم دے رہے ہو کہ سوسائٹی کا قیام ہی اس لئے ہوا ہے کہ وہ ہر شخص کے لئے اپنے حقوق کے استعمال کا حق یقینی بنا دے تو کیا ایسی صورت میں اُس [illegible] کہ

سوسائٹی کی خاطر وہ ان سب حقوق کو قربان کردے، اور اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے کو مسلسل تکلیفوں جیل اور جلاوطنی کے لئے سوسائٹی کے بہتر بنانے کے واسطے پیش کردے؟ ہر موقع پر یہ تبلیغ کرنے کے بعد کہ زندگی کا مقصد خوشحالی ہے کیا تم دفعۃً کسی فرد سے یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ اپنی خوشحالی اور اپنی زندگی اس لئے قربان کردے کہ اُس کا ملک غیر ملکیوں کے پنجہ سے آزاد ہوجائے یا اُس جماعت کی حالت اچھی ہوجائے جس سے کہ اُس کا کوئی تعلق نہ ہو؟ تم نے اُس سے برسوں مادی اغراض و مقاصد کی گفتگو کی ہے۔ اب جبکہ دولت و قوت اُس کے رستہ میں آچکی ہے اُس سے کیونکر کہہ سکتے ہو کہ وہ اپنا ہاتھ اُس پر قبضے کے لئے نہ بڑھائے؟

اٹلی کے مزدورو! یہ میرے دماغ کا وقتی خیال نہیں ہے جس کی بنیاد واقعات پر نہ ہو۔ یہ تاریخی حقیقتیں ہیں۔ ہمارے خاص زمانے کی تاریخی حقیقتیں جن کے صفحات انسانوں کے خون سے رنگین ہورہے ہیں۔ اُن تمام لوگوں سے دریافت کرو جنھوں نے سنہ ۱۸۳۰ء کے انقلاب کو اس شکل میں کہ افراد کا ایک مجموعہ دوسرے مجموعہ کے قائم مقام ہوجائے، تبدیل کردیا۔ (مثال کے طور پر) تمہارے اُن فرانسیسی رفقا کے جسموں کو جو تین دن میں لڑتے ہوئے قتل کئے گئے تھے اُنھوں نے اپنے عروج و ترقی کا آئینہ بنا لیا۔ سنہ ۱۸۳۰ء سے پہلے اُن کے تمام نظریوں کی بنیاد اسی پرانے نظریہ "انسانی حقوق" پر تھی۔ اُن کے نظریوں کو "انسانی فرائض" سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تم آج اُنھیں غدار اور دشمن جماعت و وطن قرار دیتے ہو، لیکن اصل یہ ہے کہ اُن کا عمل اُن کے نظریوں کے بالکل مطابق تھا۔ وہ چارلس دہم کی حکومت کے خلاف نہایت صداقت سے جنگ آزما ہوئے تھے، کیونکہ وہ حکومت براہِ راست اُس طبقہ کے مخالف تھی جس سے اُن کا تعلق تھا اور اُس حکومت کی یہ برابر کوشش تھی کہ وہ اس طبقہ کے حقوق پامال کردے۔ اُن لوگوں نے اُسی بہبودی و خوشحالی کے نام پر جنگ کی تھی جو اُنھیں اُن کے حسب خواہش حاصل نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو "حریت خیال" کی بنا پر مصیبتوں میں مبتلا کیا گیا تھا، کچھ لوگ جو طاقتور دماغوں والے تھے اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُن سے غفلت و بے توجہی برتی جارہی ہے، اُن پر مختلف اعلیٰ عہدوں کے دروازے بند کردیئے گئے ہیں، حالانکہ جو لوگ اُن سے دماغی قابلیت میں کم ہیں وہ اُن پر فائز ہیں، اس کے علاوہ عام افراد کے ساتھ جو زیادتیاں اور بے رحمیاں روا رکھی جارہی تھیں اُن سے بھی ان میں برافروختگی پیدا ہورہی تھی۔ ان تمام باتوں سے متاثر ہوکر اُنھوں نے سچائی اور دلیری کے ساتھ انفرادی حقوق کے متعلق لکھنا شروع کیا اور جب اُن کے سیاسی و ذہنی حقوق محفوظ ہوگئے، اعلیٰ عہدوں کے دروازے اُن کے لئے کھل گئے اور اُنھوں نے اُس خوشحالی و بہبودی کو حاصل کرلیا جس کی وہ تلاش میں تھے تو اُنھوں نے عام لوگوں کو بھلا دیا اور اسے وہ قطعی فراموش کرگئے، کہ لاکھوں آدمی جو اُن سے تعلیم اور حوصلوں میں پست ہیں وہ اپنے حقوق کے استعمال کی آزادی تلاش کررہے ہیں اور وہ دوسرے قسم کی بہبودی اور فارغ البالی ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دماغوں کو سکون دے لیا اور اپنے سوا کسی دوسرے کی فکر سے اپنے کو پریشان کرنا ترک کردیا۔

ان لوگوں کو غدار وطن کیوں کہتے ہو؟ مناسب یہ ہے کہ ان کے نظریوں کو دغاباز اور غدار کہو۔

اُس زمانہ میں فرانس ایک ایسے شخص کا سکونت گاہ تھا جسے ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ اُس کی دماغی قوت فرانس کے تمام دماغوں کی مجموعی طاقت سے زیادہ تھی۔ وہ اُس وقت میں ہمارا مخالف تھا لیکن "انسانی فریضہ" کا ماننے والا۔ اُس کا یہ اعتقاد تھا کہ عام بھلائی کے لئے صداقت کی کامیابی حاصل کرنے کے لئے تمام چیزیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ اُس نے انسانوں کا اور وقت کے تمام حالات کا نہایت عمیق مطالعہ کیا تھا۔ وہ نہ تو کبھی اپنی مدح و ستائش کی وجہ سے غلط جادہ پر گام فرسا ہوتا تھا اور نہ کبھی ناکامیوں کی وجہ سے شکستہ دل۔ اگر وہ کسی راستہ پر چلتا اور اس میں کامیاب نہ ہوتا تو عام انسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کرلیتا۔

واقعات کی رفتار نے جب اُس پر یہ واضح کردیا کہ صرف ایک قوت یعنی احساس فرائض اس کے حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اور جب عام لوگوں نے اپنے کو عمل کے میدان میں اُن افراد کے مقابلہ میں جو اُن کی حمایت کا دم بھر رہے تھے زیادہ کارآمد اور زیادہ پختہ کار ثابت کردیا تو وہ یعنی "لیمینیاس" جو "ایک معتقد کے کلمات" کا مصنف ہے اور جسے تم سب نے پڑھا ہوگا اس مقصد کا زبردست علمبردار بن گیا۔

جس میں ہم سب شریک ہیں۔ لیکن اس میں اور اُن لوگوں میں جن کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا تم اس فرق کو معلوم کرسکتے ہو جو "نظریۂ حقوق" اور "نظریۂ فرائض" کے قائلین میں ہے۔ نظریۂ حقوق کے معتقدین جب اپنے انفرادی حق حاصل کرلیتے ہیں تو ان کا جوش جاتا رہتا ہے۔ اور اس طرح اُن کی آئندہ کی کوششیں بالکل رُک جاتی ہیں۔ لیکن "نظریۂ فرائض" کے قائلین کی جد و جہد دنیا پر صرف زندگی کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

اُن قوموں میں جو مکمل طور سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں، اور جن میں اس قسم کے جھگڑوں کے خطرات کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے، جہاں کہ حالات کے بہتر بنانے کے متعلق جو قدم بھی اُٹھایا جاتا ہے وہ کسی نہ کسی شہید کے خون سے آلودہ ہوتا ہے، جہاں کہ اُن بے انصافیوں کے خلاف عملی کارروائیاں جو بڑی جگہوں سے تعلق رکھتی ہیں، لازمی طور سے خفیہ ہوتی ہیں۔ اور جن کو نہ تو شہرت ہی نصیب ہوتی ہے اور نہ مدح و ثنا ہی۔ ایسی قوموں میں کون سی وہ مجبوریاں یا عمل کے یکساں جاری رکھنے پر اُبھارنے والی قوت ہے جو اُن لوگوں کو ترقی کے راستہ پر قائم رکھے، جن کا مذاق یہ ہے کہ اس مقدس معاشرتی جنگ کو محض حقوق کی جنگ میں مسخ کردیں؟

اسے خوب سمجھ لینا چاہئیے کہ میں عام اشخاص کے متعلق ان خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔ اُن مستثنیات سے مجھے کوئی بحث نہیں ہے جو ہر جماعت میں موجود ہیں۔

نظریۂ فرائض کا اعتقاد ہی انسان کو سچی قربانی و ایثار پر آمادہ کرسکتا ہے

ظلم کے خلاف ردِ عمل کا گرم خون اور وہ جوش جو فطری طور سے نوجوانوں کو اس کشمکش میں کھینچ لیتا ہے؛ جب ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو وہ کونسی چیز ہے جو ان لوگوں کو چند برسوں کی ناکام کوششوں کے بعد جو ایسی مہموں میں ناگزیر ہیں تھکنے سے روک سکے؟ آخر وہ کسی قسم کی راحت و آرام کو کیوں نہ ایسی بے اطمینانی کی زندگی پر ترجیح دیں جو مسلسل کشمکشوں اور خطروں کی وجہ سے اضطراب کی حالت میں رہتی ہے اور جس کے لئے ہر وقت اس کا خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں جیل میں یا پھانسی کے تختہ پر یا جلا وطنی میں ختم ہو، اٹلی کے موجودہ باشندے جو فرانس کے پرانے خیالات سے متاثر ہو رہے ہیں اُن کی یہ عام حالت ہے؛ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت دردناک ہے۔ لیکن اُسے اُس وقت تک کیونکر بدلا جاسکتا ہے جب تک کہ اُس اصول کو نہ بدل دیا جائے۔ جسے اپنا بنا کر وہ اپنی زندگی شروع کرتے ہیں؟ کس طرح اور کس بنا پر اُن کو اس کا یقین دلایا جائے کہ خطروں اور ناکامیوں سے اُنھیں اور زیادہ مضبوط بننا چاہئیے؟ اُنھیں چند برسوں ہی کے لئے جنگ نہیں کرنا ہے بلکہ اپنی تمام زندگی بھر اُنھیں اس میں مشغول رہنا ہے؟ ایسی صورت میں کہ کشمکش میں مبتلا رہنا اُس سے علیحدہ ہو جانے کی بہ نسبت بہت زیادہ تکلیف دہ اور مصیبت خیز ہے کون شخص کسی دوسرے سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنے حقوق کے لئے برابر جنگ کرتے رہو؟

ایسی سوسائٹی میں بھی جس کی بنیاد ہماری سوسائٹی سے زیادہ عدل و انصاف پر ہو کون شخص "نظریۂ حقوق" کے معتقد کو اس کا یقین دلا سکتا ہے کہ اُسے عام بہبود کے لئے کام کرنا اور عام معاشرتی خیالات کے نشو و نما دینے میں منہمک رہنا چاہئیے؟ فرض کرو وہ بغاوت پر آمادہ ہو۔ فرض کرو وہ اپنے کو طاقتور محسوس کرے اور تم سے یہ کہے "میں اس معاشرتی اتحاد کو توڑنا چاہتا ہوں۔ میرے رجحانات، میری صلاحتیں مجھے دوسری طرف لے جا رہی ہیں، مجھے اس کا مقدس حق حاصل ہے کہ میں اُنھیں نشو و نما دوں اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص سے جنگ کروں"؛

اب تم اسے کیا جواب دے سکتے ہو؟ وہ بہر طور "نظریۂ حقوق" کا پابند ہے۔ تم اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اس کا کیا حق رکھتے ہو کہ اُسے اُن قوانین کی اطاعت پر مجبور کرو جو اُس کی خواہشوں اور اُس کے انفرادی حوصلوں کے مطابق نہیں ہیں؟ اگر وہ ان قوانین کو توڑتا ہے تو اُسے سزا دینے کا تم کیا حق رکھتے ہو؟ حقوق کا تعلق ہر فرد سے یکساں ہے۔ ایک ساتھ ایک جماعت میں رہنے سے کسی "انفرادی وحدت" کی خلقت نہیں ہو جاتی۔ سوسائٹی میں زیادہ طاقت ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرد کی بہ نسبت اُسے حقوق بھی زیادہ حاصل ہیں۔ ایسی صورت میں تم کیونکر کسی فرد پر یہ ثابت کرسکتے ہو کہ اُسے اپنی رضا کو ملکی و انسانی بھائیوں کی رضا میں مدغم کردینا چاہئیے۔

جلاد کے ذریعے سے؟ قید و بند کے ذریعے سے؟ سوسائٹیوں نے جن کا وجود اب تک ہے ان ذریعوں کو ضرور استعمال کیا ہے، لیکن بہر حال یہ جنگ ہے۔ ہم آشتی چاہتے ہیں۔ یہ تشدد ہے اور ہم تعلیم و تربیت چاہتے ہیں۔

ہم نے تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے اور واقعتاً یہ اتنا بڑا لفظ ہے، جو ہمارے پورے نظریئے پر مشتمل ہے۔ وہ اہم سوال جو ہمارے ملک میں اضطراب پیدا کئے ہوئے ہے۔

تعلیم ہی کا سوال ہے، ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم ان چیزوں کو نئی ترتیب میں تشدد کے ذریعے سے لائیں۔ اس طریقہ سے کوئی نئی ترتیب قائم کرنا ہمیشہ ظالمانہ ہوگا، خواہ وہ پہلے کی بہ نسبت بہتر ہی کیوں نہ ہو، ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ ہم اول پوری قوت سے اُس ہیئت کو ختم کر دیں، جو اس زمانہ میں ہر ترقی کی مخالف ہے اور پھر اُس قوم کی منظوری کے لئے جو اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہوگی، ان چیزوں کی اُس ترتیب کو پیش کریں گے جسے ہم بہتر سمجھتے ہیں، اور ہر ممکن ذریعے سے لوگوں کو تعلیم دیں گے تاکہ اُسے نشو و نما ہو اور اس کے متعلق عمل درآمد ہو سکے۔ نظریۂ حقوق ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم اُبھریں اور اپنے راستہ سے موانع دور کریں، لیکن اس سے قوم کے مختلف عناصر کے درمیان میں اتحاد و ہم آہنگی کی مستحکم بنیاد نہیں قائم ہو سکتی۔

نظریہ خوشحالی و بہبودی کو زندگی کا اعلیٰ مقصد قرار دے کر ہم خود پسند اشخاص اور "مادیت" کے پرستاروں کی تخلیق کر سکتے ہیں، جو پرانے جذبات کو اشیاء کی نئی ترتیب میں پورا کریں اور چند ماہ میں اُسے بھی برباد کر دیں، اسی لئے ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم ایسے نظریہ کے مقابلہ میں کسی اعلیٰ نظریۂ تعلیم کی بنیاد ڈالیں جو انسانوں کی بہتر چیزوں کی طرف رہنمائی کر سکے جو اُنھیں قربانی میں تسلسل قائم رکھنے کی تعلیم دے سکے اور اور جو اُن میں جماعت میں اس طرح جذب ہو جانے کی صلاحیت پیدا کر سکے کہ کسی مخصوص فرد کے خیالات یا پوری جماعت کی قوت پر اُن کی زندگی کا انحصار نہ ہو جائے۔

اور یہ اصل "فرض" ہے، ہمیں اُنھیں اس کا یقین دلا دینا چاہیئے کہ وہ چونکہ ایک خدا کے بیٹے ہیں اُنھیں دنیا میں صرف ایک قانون کی اطاعت کرنا چاہیئے، اور اُن میں سے ہر ایک کو اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے زندہ رہنا چاہیئے۔ اُن کی زندگی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ زیادہ یا کم خوشحال رہنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی اور دوسروں کی حالت بہتر بنائیں، اُنھیں معلوم ہو جائے کہ اپنے بھائیوں کے فائدہ کے لئے بے انصافی اور غلطی کے خلاف جنگ کرنا صرف حق ہی نہیں بلکہ ایک فریضہ ہے، اور ایسا فریضہ جس سے اغماض گناہ ہے اور جس سے زندگی بھر روگردانی ناجائز ہے۔

(باقی آئندہ)

گناہ

جی کو ناحق نڈھال کرتے ہیں
روح کو پائمال کرتے ہیں
آدمی اور گناہ سے پرہیز
ہم بھی اکثر کمال کرتے ہیں

(ظفر انصاری، بی اے)

قطعات (جوانی)

نیند آتی ہے اس طرح سے شباب
جیسے مینا میں نشہ چھپتا ہے
صبح اس طرح سو کے اٹھتے ہیں
جیسے سیلاب آگے بڑھتا ہے

(ظفر انصاری، بی اے)

مولوی

از مولوی شناس

خیر نگر کے ایک مشہور خاندان کی عالی شان عمارت کے کشادہ صحن کے وسط میں ایک طویل شالباقی پردہ پڑا تھا۔ ایک جانب مولوی عبدالقدوس صاحب کرسی پر متمکن تھے اور دوسری طرف دو دیہاتی بیگمات۔ مولوی صاحب ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر حد درجہ متانت سے فرما رہے تھے "جی ہاں معظمہ! لیکن حج کے متعلق بیشمار احادیث و روایات موجود ہیں، فروع دین میں داخل ہے۔ اور ہر مسلم و مسلمہ پر چند شرائط کے ساتھ فرض کیا گیا ہے، آپ دونوں بہنیں ماشاءاللہ صاحب جائداد ہیں، کافی سے زیادہ سرمایہ پس انداز کر چکی ہیں، علائق دنیا سے آزاد ہیں، نہ شوہر، نہ بیٹا، نہ بیٹی۔ پھر سن بھی وہ آیا کہ اب توشۂ آخرت مہیا کرنا ضروری ہے۔ میری رائے ناقص میں حکم خدا اور رسول سے صریحی انحراف ہوگا، اگر اب بھی آپ اس فریضے سے سبکدوشی حاصل کرنے میں اغماض کریں گی!"

پردے کے اس طرف جو دو بیبیاں بیٹھی تھیں وہ دونوں کانپ اٹھیں۔ دونوں حقیقی بہنیں، بڑی کا سن اس وقت پچاس کے قریب ہوگا، سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں کے گوشوں پر باریک باریک نشانات پڑ چکے تھے، چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں، اور صراحی دار گردن میں بڑھاپے کا دبلا پا آچکا تھا۔ ان کا نام عالیہ بیگم تھا، عمر کے بارہویں سال میں قدم رکھتے ہی بیاہ دی گئی تھیں، چند ہی سال میں کئی لڑکوں لڑکیوں کی ماں بنیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا، شوہر بھی شادی کے دس برس بعد داغ مفارقت دے گئے، جب سے آج تک جائداد کا انتظام، شوہر اور بچوں کا ولیا، اعمال، اوراد، وظائف ان چیزوں میں وقت صرف کرتیں یا چھوٹی بہن کی دلجوئی و تالیف قلب میں۔

ان کا نام رابعہ تھا، بچپنے ہی میں چیچک نے صرف ان کی صورت ہی نہ بگاڑی تھی بلکہ دونوں آنکھوں کا نور بھی لے لیا تھا، جب سے اب تک یہ یونہی کنواری بیٹھی رہیں۔ باپ کے پاس دولت و شرافت سب چیزیں تھیں، لیکن وہ اُن کے جوان ہوتے ہی مر گئے، اور دیگر اعزا ار خاندان نے، جو اُن کے غیر شادی شدہ ہونے اور لاولد مرنے سے منتفع ہونے والے تھے، اس طرح کے جوڑ توڑ لگائے کہ آج تک رابعہ کے لئے جب کہ ان کا سن چالیس کے قریب پہنچ چکا تھا، کوئی بر نہ مل سکا تھا، ان کی دنیا بھی بڑی بہن کی اطاعت، مولویوں کی پرستش، عبادت و ریاضت میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، باوجود چیچک کے حد درجہ مکروہ داغوں کے ان کے چہرے پر وہ تازگی اب تک باقی تھی، جس میں شباب کی چنگاریاں دبی پڑی تھیں، اور ان کے جسم میں وہ گداز پن بھی باقی تھا جو کنوارپنے کی خصوصیت ہے۔

دونوں بہنیں قریب قریب ایک ہی طرح کا کپڑا پہنے تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عالیہ کا دوپٹہ اور کرتا سپید تھا۔ اور رابعہ کا گلابی، ایک بیوہ تھی دوسری اب تک بن بیاہی۔ اس لئے وہ تمام انتظامات میں بھی آگے آگے رہتی اور اعزا و مولویوں سے گفتگو میں بھی وہی سبقت کرتی تھی۔

رابعہ بڑی بہن کے خیال سے زیادہ تر خاموش رہتی۔ نیز اسے گھر یا جائداد کے انتظامی معاملات سے زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ باوجود چہل سالہ ہونے کے اب تک اسی طرح کی زندگی بسر کرتی تھی جیسے وہ اب تک چار دہ سالہ ہے۔

مولوی عبد القدوس جو اس وقت ان بیویوں سے پردے کے اس طرف بیٹھے گفتگو کر رہے کوئی ایسے غیر نہ تھے۔ قصبے کے رہنے والے عالیہ کے ساتھ کے کھیلے، اور اپنی قابلیت، نیکی، اتقار اور سادہ دلی کے لئے دور دور مشہور تھے۔ جو شخص ان کا گول آفتابی چہرہ، چوڑی پیشانی، ستواں ناک، سفید رنگ، مہندی سے رنگی ڈاڑھی ایک بار دیکھ لیتا وہ اس امر کا یقین کر لیتا کہ مولوی صاحب سا باخدا آدمی دنیا کے پردے میں کم دکھائی دیگا۔ یہ دونوں بہنیں بھی یہی سمجھتی تھیں، اور اسی لئے جب کبھی مولوی صاحب اپنی نوکری سے قصبہ میں دو چار دن کے لئے بھی تشریف لاتے تو مولوی صاحب کی دعوت ضرور کی جاتی اور اُن کے موعظے سے یہ بیویاں بھی شاد ضرور ہوتی تھیں۔

آج غیر معمولی بات یہ ضرور ہوئی تھی کہ مولوی صاحب حسب معمول بلائے نہیں گئے تھے، بلکہ بن بلائے ہی تشریف لائے تھے۔ اور آتے ہی انہوں نے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ وہ حج کو تشریف لے جا رہے ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں مولانا نے یہ بھی اصرار شروع فرمایا کہ یہ بیویاں بھی حج کے لئے تشریف لے چلیں۔

عالیہ بیگم نے کہا "قبلہ و کعبہ حج کے واجب ہونے میں شک نہیں لیکن جناب تو اس امر سے بھی واقف ہیں کہ ہم دونوں بہنوں کے لئے اتنا بڑا سفر کس قدر مشکل ہے۔ ہم پردہ دار، اعزا میں سوائے مبارز میاں کے کوئی نہیں، انھیں اپنی بیوی بچوں اور اپنے دوسرے کاموں سے فرصت نہیں، ہم کیونکر جا سکتے ہیں؟ بھلا ہماری قسمت میں یہ سعادت کہاں؟"

مولوی صاحب نے فرمایا "جی ہاں، ماشاء اللہ ان کے مشاغل تو کثیر ہیں۔ انھیں اس کی فکر کیوں ہونے لگی کہ آپ حضرات کی آخرت کیوں کر درست ہوگی؟"

عالیہ بیگم نے کہا "نہیں قبلہ وہ لڑکا سعید تو ضرور ہے، اور اس نے کبھی ہماری خدمت و اطاعت سے گریز نہیں کیا۔"

مولوی صاحب کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ذرا سی چمک پیدا ہوئی، مگر فوراً وہ دبکا لی گئیں۔ وہ اپنے متین دھیمے لب و لہجہ میں ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے، "جی ہاں صحیح ارشاد فرمایا آپ نے، اُن کی سعادت میں کیا اشکال ہے، لیکن حج آپ دونوں بہنوں پر واجب ہے نہ کہ اُن پر، آخرت میں باز پرس بھی آپ ہی سے ہوگی۔ خدا اس دن کے حساب سے ہم سب کو بچائے، جب سوا نیزے پر آفتاب ہوگا، اس دن نہ کوئی عزیز ہوگا نہ دوست، نہ باپ نہ بیٹا، نہ بھائی نہ بھتیجا، عجیب بے بسی و بیکسی ہوگی، ہم گنہگاروں کی تو پوچھئے ہی نہیں، جو کچھ بھی گت بنے۔ بڑے بڑے انبیاء و مرسلین کے چہروں پر ہوائیاں اُڑتی ہوں گی اور بند بند کانپتے ہوں گے، اس وقت سوائے اپنے اعمال کے کوئی کام نہ آئے گا۔"

مولوی صاحب نے اپنی رقت آواز میں یہ سماں کچھ اس انداز سے کھینچا کہ دونوں بیویوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور خوف سے لرزنے لگیں۔

مولوی صاحب نے اپنی تقریر کے اثر کو پردے کی دوسری جانب سے محسوس کیا۔ اور خاتمۂ کلام کے طور پر بولے "میں اسی لئے تو عرض کرتا ہوں کہ ہمیں چاہئے کہ ہم سے اگر اور امورِ خیر نہ ہو سکیں تو کم از کم ہم واجبات تو ادا کرتے رہیں۔ ان میں تو تساہل نہ ہونا چاہئے۔ حج آپ دونوں بیویوں پر واجب ہے، اس میں شرعی حیثیت سے نہ تو پردہ حائل ہے اور نہ کوئی اور امر!"

عالیہ نے خوفزدہ ہو کر کہا "تو کیا قبلہ و کعبہ میں حج کرنے کے لئے پردہ اٹھا دوں؟"

مولوی صاحب نے قدرے مسکرا کر کہا "جی میں نے یہ تو عرض نہیں کیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ وہ دقتیں جو جناب معظمہ نے ابھی بتائی ہیں وہ سب رفع ہو جائیں۔"

عالیہ نے ذرا گھبرا کر پوچھا "تو قبلہ و کعبہ فرما دیں میں اُنھیں سر آنکھوں سے بجا لاؤں گی۔"

مولوی صاحب نے نظریں اُٹھا کر پردے کو دیکھا، گویا چاہتے تھے کہ جو بات کہنا چاہتے ہیں، اس کے قبل مخاطب کے قیافہ سے اچھی طرح اندازہ کر لیں کہ اسے کس پہلو سے پیش کریں کہ سنتے ہی دل میں لفظ لفظ اتر جائے۔

مولوی صاحب نے آہستہ سے کھانس کے گلا صاف کیا اور پھر بولے

"میرا اشارہ اس امر کی جانب ہے کہ رابعہ بیوی کا اب تک عقد نہیں ہوا ہے۔ یہ امر مستحب بھی ادا ہو سکتا ہے اور حج کا فریضہ بھی؟"

پردے کے اس طرف رابعہ بیگم نے ذرا جھرجھری لی اور گردن جھکالی۔

عالیہ بیگم بولیں "تو مولوی صاحب بیچاری رابعہ کے لئے کہاں بر موجود ہے کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جائے۔ اور ان کا میاں حج کے لئے انھیں لے کے چلا جائے؟"

مولوی صاحب کی آنکھوں کی چمک اور زیادہ بڑھی اور اُن کی انگلیاں ڈاڑھی کے بالوں پر اس تیزی سے چلنے لگیں جس تیزی سے استاد عنایت خاں کی انگلیاں ستار کے تار پر! وہ مہین آواز سے بولے "تو اگر آپ اسے معیوب نہ سمجھیں تو میں بادب عرض کردوں کہ یہ عبدِ ذلیل ہی حاضر ہے، میں جانتا ہوں کہ لوگ مجھ پر طرح طرح کے نام دھریں گے، اور جو لوگ احکامِ خدا، رسول سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ اُسے میری شان کے منافی بھی سمجھیں گے، لیکن مجھے آپ حضرات کے فائدے کے سامنے اپنی کوئی پروا نہیں۔ آپ کی آخرت درست ہو، ہم مردوں کا کیا، ہمارے لئے تو بدنامیاں اور رسوائیاں ازل ہی سے مقدر ہیں؟"

عالیہ بیگم پہلے تو یہ تقریر سُن کر سناٹے میں آگئیں۔ استعجاب، غصہ اور خوف نے ان کی زبان بند کر دی تھی۔ اندھی بہن جو کر پہلو سے لگی بیٹھی تھی ان کی حرکات سے ان کے جذبات سمجھ گئی، اور بہن کا زانو دبا کر اس نے نفی کے لئے سر ہلا دیا۔ عالیہ بیگم نے بہن کے چہرے کی طرف محبت سے دیکھا، پھر بھرائی ہوئی آواز سے بولیں۔

"مولانا یہ امر تجویز کرتے وقت شاید آپ یہ بھول گئے، کہ آپ ماشاءاللہ بیوی بچے والے ہیں، اور آپ کی بیگم صاحبہ بھی کوئی غیر نہیں، ہماری ہی برادری کی بیٹی ہیں۔ آخر ہم اُنھیں کیا منہ دکھائیں گے؟"

مولوی صاحب نے پھر وہی احتیاط والی مہین آواز میں جواب دیا، "میں نے تمام عواقب پر نظر کرلی ہے، البتہ ایک دشواری ضرور باقی رہی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ باوجود اس عقد کے، اگر آپ اور رابعہ بیگم اسے منظور بھی کرلیں، میں آپ کا حسبِ شرع پھر بھی نامحرم باقی رہتا ہوں، اور حج کے لئے آپ کی ہمراہی میں پھر انھیں دقتوں کا سامنا ہوگا؟"

عالیہ بیگم نے اس طرح کی سانس لی، جیسے اُنھیں کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔ وہ جلدی سے بولیں "جی ہاں یہ آپ نے صحیح فرمایا۔ سارے خاندان میں نکّو بھی بنے اور جس غرض سے یہ سارے پاپڑ بیلے تھے وہ پوری نہ ہوئی۔"

مولوی صاحب پھر تھوڑی دیر داڑھی کے بالوں پر ستار بجاتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "تو اس کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ میرے دو نابالغ لڑکے موجود ہیں۔ اس فرض کے ادا کرنے کی غرض سے آپ دونوں صاحبان میری بہوئیں بن جائیں۔ میں دونوں کا محرم ہو جاؤں گا۔ اور اس طرح میرے ساتھ سفر میں کوئی قباحت اور کوئی شرعی خرابی نہ رہ جائے گی؟"

عالیہ بیگم نے کہا "مگر مولانا.........؟"

مولوی صاحب نے جلدی جلدی داڑھی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور بات کاٹ کر بولے "جی ہاں آپ پہلے میری بات تو پوری سُن لیں۔ واللہ، باللہ، اس امر میں سوائے آپ کے فائدے کے اور کوئی خیال نہیں۔ وہ دونوں بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ جو بھی سُنے گا وہ یہی سمجھے گا کہ آپ سی عصمت مآب خواتین کی سوائے اس فریضہ کے ادا کرنے اور اس لئے سہولتیں بہم پہنچانے کے اور کوئی غرض نہیں ہو سکتی۔ زندگی انسان کی بہت ہی بے اعتبار ہے، اوسط عمر انسانی بہت قلیل ہے۔ آپ ماشاءاللہ میری ہمسن ہیں اور رابعہ بیگم آپ سے دو چار برس چھوٹی ہوں گی؟"

عالیہ بیگم بولیں "جی نہیں! وہ مجھ سے دس برس چھوٹی ہے؟"

مولوی صاحب نے فرمایا "جی تو بھی کافی عمر آچکی ہے۔ بچوں میں سے ایک کا سن دس برس کا ہے اور ایک آٹھ برس کا ہے، جب تک وہ جوان ہوں گے خدا جانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ آپ پر قبل بلوغ و رشد ان کے کوئی حقوق نہیں، اور نہ میری حیات تک ان کی مجال ہے کہ وہ میرے خلافِ حکم کر سکیں۔ پھر خطرہ کاہے کا ہے، دین، مہر، نان و نفقہ مرد پر واجب ہے نہ کہ عورت پر!"

عالیہ بیگم نے کہا، "قبلہ و کعبہ آپ ہم لوگوں کے مجتہد ہیں، ہم ہمیشہ آپ ہی کی تقلید میں رہے۔ اس لئے آپ کا فرمانا ہمارے لئے حکمِ خدا و رسول ہے، لیکن یہ بات کسی طرح حلق سے نہیں اُترتی۔ میں بوڑھی ہوچلی ہوں

بکاکے اب اپنا عقد کرنے چلوں اور پھر وہ بھی ایک چھوکرے سے۔ ہاں رابعہ کے ابھی رن سن ہیں۔ ان کے لئے کوئی ایسی بُری بات نہیں، پھر وہ بھی جب میں ان کے سر پر موجود ہوں۔۔۔۔۔"

رابعہ خاتون نے پھر بہن کا زانو دبایا۔ بہن نے جھک کر ان کی طرف دیکھا، انھوں نے ان کے کان میں چپ کے سے چپکے چپکے کہا "باجی میں بغیر آپ کے شادی نہیں کروں گی۔"

عالیہ نے فوراً جھنجلا کے کہا "لڑکی سٹرن تو نہیں ہو گئی۔"

مگر جب رابعہ نے بہت سختی سے سر ہلا کے اپنی بات پر اصرار کیا تو کچھ نرم پڑیں۔

اِدھر مولوی صاحب کے ستارے پھر آواز شروع ہوئی "میں کہتا ہوں کہ جناب بیگم صاحبہ اس میں خرابی ہی کیا ہے۔ دنیا میں آپ کے محارم میں سوائے مبارز میاں کے اور کوئی موجود نہیں۔ انھیں اپنے ہی جھگڑوں سے فرصت نہیں کہ وہ ان امور کی طرف توجہ کر سکیں اور سچ پوچھئے تو اُن کی ساری ہمدردی بس اسی میں ہے کہ آپ دونوں بہنیں خزانے جمع کر کے ان کے لئے چھوڑ جائیں۔ خواہ اس صورت میں آپ کے خود فرائض ادا ہوں یا نہ ہوں، آپ احکامِ خداوندی پورے طور پر بجالا سکیں یا نہ لا سکیں!" پردے کی دوسری جانب ذرا حرکت پیدا ہوئی تو مولوی صاحب نے بایاں ہاتھ اُٹھا کر روکا اور بولے "میں ان تمام دشواریوں کو سمجھتا ہوں جو آپ کے پیشِ نظر ہیں۔ لیکن عوام کے خوش اور ناخوش ہونے سے کسی فریضہ کے بجالانے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، پھر یہ بھی خیال رہے کہ میں نے جو صورت آپ کی خدمت میں پیش کی ہے، اس میں کوئی پہلو ملعون کرنے کا نہیں ہے۔

آپ حضرات پر حج واجب ہے، آپ بغیر کسی مرد کی مدد کے اسے ادا نہیں کر سکتیں۔ آپ اس لئے دو بچوں سے عقد کر لیتی ہیں اور یوں اُن کے باپ کی محرم بن کر اس فریضہ کو ادا کر لیتی ہیں۔ خداوند عالم کی خوشنودی دیکھنا چاہئے۔ انسانوں کی خوشی کیا چیز ہے، آپ کے فعل سے خدا خوش، رسول خوش، اہلِ ایمان خوش، اب اگر دو چار جہلا ناخوش ہوں گے تو ہوں۔ ان کی ناخوشی سے آپ کے ثواب میں اور اضافہ ہوگا، اور جنت النعیم میں قصر ہائے زریں ملیں گے!"

عالیہ بیگم پر مولوی صاحب کی اس سحر کن تقریر کا یہ اثر ہوا کہ وہ ہندی آباء و اجداد کے طریقے بھول گئیں، اُنھوں نے پھر بھی اپنا پہلو بچایا اور بولیں "مولانا۔ میں آپ کا حکم بجالانے کے لئے تیار ہوں مگر ایک شرط سے بڑے کا عقد رابعہ سے ہو اور چھوٹے کا میرے ساتھ!"

مولوی صاحب کا چہرہ گلنار ہو گیا، اور وہ بہت ہی مسرت سے بولے "خدا آپ کی نیت میں برکت عطا فرمائے، اور آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ مرحمت فرمائے! آپ ہی کی باعفت و باایثار بیویوں سے اسلام زندہ ہے! چھوٹے بڑے کی شرط ہی بیکار ہے۔ اس لئے کہ یہ عقد دنیا داری کے لئے نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس کی غرض تو محض حمایتِ دین ہے۔ بہر نوع آپ کی خاطر مجھے یہ منظور ہے۔ چھوٹے کا عقد آپ کے ساتھ اور بڑے کا رابعہ بیگم صاحبہ کے ساتھ ہوگا۔ اب آپ مجھے اجازت دیں، میں دونوں کا ولی ہوں، میں آپ کا وکیل بن لوں تو خطبہ پڑھ دوں۔"

عالیہ بیگم نے گھبرا کر کہا "تو کیا ابھی وقت؟"

مولوی صاحب نے ذرا تیکھے تیوروں سے کہا "معظمہ خدا اور رسول کے کاموں کی انجام دہی کے بارے میں اسلام نے یہ فرمایا ہے کہ لبیک کہتے ہوئے دوڑنا چاہئے، آپ پھر پس و پیش فرماتی ہیں۔ اس سے ثواب میں کمی ہوتی ہے، آپ مجھے اجازت دیں۔"

عالیہ بیگم نے بڑی بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا، ماما، دائیاں آج پہلے ہی سے ہٹا دی گئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا بھی نہ ملا!

مولوی صاحب نے پھر فرمایا کہ "جناب بیگم صاحبہ میں آپ کا عقد اپنے لڑکے حمید اللہ سے مہرِ فاطمی پر پڑھ دوں؟ اجازت ہے؟

وہ بڑھیا ہونٹ چاٹ کر بولی "بہت خوب، جیسی آپ کی مرضی!

مولوی صاحب ذرا مسکرائے پھر بولے "اور آپ جناب رابعہ بیگم صاحبہ، آپ اجازت دیتی ہیں کہ آپ کا عقد میں اپنے بیٹے عبید اللہ سے مہرِ فاطمی پر پڑھ دوں، منظور ہے؟"

اُنھوں نے بہن کے ٹہوکا دینے پر لجاتی ہوئی آواز میں "ہوں" کہا اور بہن کے زانو پر سر رکھ کر رونے لگیں۔

مولوی صاحب نے صیغہ جاری کر دیا!

مبارز شہر سے جب واپس آیا تو اسے باہر والے حصّہ مکان میں خبر ملی کہ مولوی صاحب تشریف لائے ہیں، اور بڑی دیر سے زنان خانے کے اس حصّہ میں تشریف فرما ہیں جدھر اس کی پھوپھیاں رہتی ہیں۔ وہ مولوی صاحب کے اشتیاقِ زیارت میں دَرّانہ اندر چلا آیا۔ دیکھا تو پھوپھیاں کچھ سہمی سہمی بیٹھی ہیں، ہر ایک کے سامنے پانچ پانچ روپے رکھے ہیں، مولوی صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے جاتے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں "تم دونوں میری بیٹیاں ہو، میری لختِ جگر ہو۔ تم اطمینان رکھو، انشاء اللہ میری زندگی تک تمہیں کوئی زحمت نہیں ہو سکتی۔ خداوند کریم تم سی بیویوں کی خود بھی حفاظت فرماتا ہے"۔

مبارز کی یہ حالت کہ یہ سماں دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ غیرت قوی سے زمین میں گڑ جائے یا آسمان پر اُڑ جائے، جس کے خاندان میں تمام غیر محارم سے، خواہ وہ کیسے ہی عزیز قریب کیوں نہ ہوں پردہ کیا جاتا ہو، اس کے گھر کی سر برآوردہ خواتین یوں ایک غیر مرد کے سامنے بے پردہ بیٹھی ہوئی ہوں! وہ عجیب غم وغصہ کی حالت میں چیخ کر بولا "پھوپھی اماں! یہ آخر کیا معاملہ ہے؟ یہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا آپ لوگوں نے سچ مچ مولانا سے پردہ اٹھا دیا؟"

پھوپھیاں بھتیجے کے اس سوال پر اور سہم گئیں۔ مگر مولوی صاحب نے اپنی دھیمی آواز میں کہا "مبارز میاں اب آپ کی پھوپھیاں میری محارم میں سے ہیں، وہ میری بیویاں ہیں، اب وہ مجھ سے کیوں پردہ کرنے لگیں؟"

مبارز اور بوکھلا گیا اور پلنگ پر اس طرح بیٹھ کے گر پڑا جیسے کسی نے اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی ہوں۔ وہ تھوڑی دیر سر پکڑے مولوی صاحب کی پہیلیاں بوجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

قبلہ وکعبہ کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، وہ حج کا فرض ہونا، پھوپھیوں کا دولت مند ہونا، حیلۂ شرعی کا ضروری ہونا، جنت کا قریب اور دوزخ کا دور ہونا یہ سب کچھ بتا رہے تھے، لیکن مبارز یہ دیکھ رہا تھا کہ جس جس طرح پھوپھیوں سے جنت قریب ہوتی جاتی تھی، اسی قدر اس سے ریاست وامارت دور! وہ ایک بار گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی بڑی پھوپھی سے ڈانٹ کے پوچھا۔

"آپ کا دفعتہ دماغ کیسے خراب ہو گیا تھا کہ آپ اس پاجی مولوی کے کہنے میں آگئیں؟"

قبل اس کے کہ وہ کچھ بولیں مولوی صاحب نے فرمایا "مبارز میاں! دیکھئے غصّہ حرام ہے، میں آپ کا ہر طرح بزرگ ہوں، سن میں بھی، دینی حیثیت سے بھی، اور اب رشتے میں بھی! آپ اپنی پھوپھیوں کے روپوں کے لالچ میں دیوانے ہو رہے ہیں"۔

مبارز پلٹ پڑا، بولا "جی ہاں۔ میں ان کے روپیوں کا، ان کی دولت کا مستحق ہوں، آپ اتنی آسانی سے میرے گھر کی دولت وعزت نہیں لے جا سکتے"۔ یہ کہتے کہتے وہ اندر کمرے میں گھس گیا۔ اور وہاں سے بندوق اٹھا لایا۔ مولوی صاحب کا شلجمی رنگ پھیکا پڑ گیا۔ جوڑ جوڑ ہلنے لگے، زبان میں کانٹے پڑنے لگے۔ مبارز دانت پیس کر بولا۔

"مولوی صاحب۔ بس اسی میں جان کی خیر ہے کہ چپ کے سے جس طرح آپ نے نکاح پڑھا ہے ویسے ہی طلاق بھی پڑھ دیجئے۔ اور یہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے سدھاریئے۔ ورنہ میں آپ کو حج کی ساری زحمتوں سے بچا دوں گا۔ ایک منٹ میں آپ جنت کے ان قصروں میں سے ایک میں سے ہوں گے، جو آپ اپنے مطالب کے پورا ہونے کی غرض سے زندگی بھر بانٹتے رہے ہیں، پڑھئے صیغۂ طلاق!"

مولوی صاحب نے دو تین مرتبہ زبان خشک ہونٹوں پر پھرائی، جلدی جلدی طلاق پڑھی، اور مبارز کے انگلی سے اشارہ کرنے پر کفش بر سوار بسرعت تمام باہر تشریف لے گئے۔

دوسرے دن جب لوگ انھیں مع صاحبزادگان اسٹیشن پر حج کے سفر کے سلسلے میں رخصت کر رہے تھے تو انھوں نے ایک ملفوف خط مبارز صاحب کے نام ان کے ایک عزیز کو دیا۔

خط میں لکھا تھا۔

"مبارز صاحب!

"بندوق سے دھمکا کے طلاق پڑھوا لینے سے طلاق نہیں ہوتی، نابالغ کی طرف سے ولی نکاح کر سکتا ہے لیکن طلاق نہیں دے سکتا۔ آپ کی پھوپھیاں شرعی اور قانونی حیثیت سے اب بھی میری بیویاں ہیں"۔

میں حج بیت اللہ سے واپس آلوں تو عدالتی چارہ جوئی کرکے ان کو رخصت کراؤں گا۔ اور آپ سے ایک ایک پیسہ کا حساب لوں گا۔

"عبدالقدوس"

مبارز خط پڑھ کے بڑی دیر تک غصے سے بوٹیاں نوچتا رہا۔ پھر اس نے اپنے اعلیٰ عزیز کی طرف خط بڑھا دیا کہ "دیکھئے!" انھوں نے خط پڑھا، مسکرائے، پھر بولے، "میاں تم نے ایک مولوی کی مخالفت کی ہے۔ بس اب کیا ہے۔ "خسر الدنیا والآخرۃ!"

تلاشِ حیات

خانقاہوں میں سوز و ساز کہاں   اب مشائخ میں وہ گداز کہاں؟
دَیر سے گرمیاں ہوئیں رُخصت   اہلِ کعبہ کے دل سے دیں رُخصت
گلستاں سے نکل گیا لالہ!   بے اثر عندلیب کا نالہ
شاعروں کے دلوں میں سوز نہیں   تیر اب اُن کے سینہ دوز نہیں
میکدوں میں سبو ہوئے خالی   ہندیوں کے کدو ہوئے خالی
مطربوں کی صدائیں بے معنی   مہ رخوں کی ادائیں بے معنی
اہلِ مکتب میں اب کہاں وہ مذاق   جس سے ہر اک عشا ہوئی اشراق
واعظوں کی تمام تقریریں   پیٹ بھرنے کی صرف تدبیریں!
اہلِ مشرق میں ذوقِ فکر نہیں   اہلِ مغرب میں شوقِ ذکر نہیں

مل سکے اب کہاں سے سوز و گداز!
کس سے پوچھے کوئی حیات کا راز؟

نعیم صدیقی

باغی

مظہر النساء، بی اے آنرز

یہ رپورٹ تربیت گاہ (یتیم خانہ) کے ایک لڑکے رحیم کی ہے، جسے پیارسے "ریو" کہتے تھے، ایک ہفتہ ہوتا ہے وہ تربیت گاہ سے بھاگ گیا، لڑکا غیر معمولی ذہانت رکھتا ہے، پکڑے جانے پر اپنے فرار کی ذمہ داری کسی نہ کسی عجیب و غریب دلیل سے تربیت گاہ کے سر تھوپنے کی کوشش کرے گا، اس لئے مہتمم کی طرف سے نگراں کی خدمت میں اس کی گذشتہ عجیب و غریب حرکات کی سرگذشت پیش کی جاتی ہے۔ اس تذکرے میں ایک لڑکی کا نام آنا ناگزیر ہے، جس کا اصلی نام شمیمہ تھا اور جسے عرفِ عام میں "میمہ" کہتے تھے۔ ابتدا ہی سے جب یہ لڑکی یتیم خانہ میں لائی گئی، ریو کو اس سے غیر معمولی تعلق ہوگیا، اور اسی وقت سے اُس نے شرارتیں شروع کیں۔ ریکارڈ میں اس کی سب سے پہلی شرارت کا حال یوں درج ہے۔

"اس لڑکے کا سنبھالنا بہت دشوار ہو رہا ہے۔ تمام وقت "میمہ" نامی لڑکی کے ہمراہ رہنا چاہتا ہے۔ کل اُسے باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ آج صبح احتجاج کے طور پر اُس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ اصلاحاً سزا دی جائے تو فرضی طور پر بیہوش ہو جاتا ہے"

پھر دو تین ماہ بعد کے ریکارڈ میں درج ہے کہ

"ریو نے بہت پریشان کر رکھا ہے، کپڑے اور گوڈے کے گڈے گڑیوں سے نہیں کھیلتا۔ کہتا ہے، یہ منہ سے تو بولتی ہی نہیں۔ میں تو میمہ سے کھیلوں گا۔ وہ مجھ سے باتیں بھی کرتی ہے ------- پڑھائی کی جماعت سے بھاگ گیا، اور باہر نکل کر فاختاؤں کو پکڑنے لگا، وجہ پوچھی گئی تو بولا میں میمہ کے لئے فاختہ پکڑنے گیا تھا"

بطور سزا منتظمہ نے ریو کو دن بھر کمرے میں بند رکھا اور شام کو کھانا نہیں دیا۔ دوسرے دن صبح اس سے پوچھا گیا، کیا تم اپنے فعل پر نادم ہو؟ بولا۔ جی نہیں، آخر کار زبانی تنبیہہ کرکے چھوڑ دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ باز نہیں آیا۔ چند دن بعد کا ریکارڈ یہ ہے کہ۔

"اُس نے ایک لڑکی کے ریشمی تاگے کے گولے چرا لئے، جب چوری پکڑی گئی اور اُس سے پوچھا، کیوں چرائے تھے؟ تو کہنے لگا "میں قوس قزح بنانی چاہتا تھا، سوال کیا گیا۔ قوس قزح بنانے کی تمہیں ایسی کیا ضرورت پڑی تھی۔ کہنے لگا۔ واہ! میں اور میمہ اس میں بیٹھیں گے نہ؟"

یہ سب سے پہلی منتظمہ کے دَور کا ریکارڈ تھا، سابق منتظمہ کو بھی ریو کے سلسلے میں دشواریاں پیش آئیں، اُس نے ریو کے ریکارڈ میں پہلی شکایت یہ لکھی ہے۔

"آج سب بچوں کو تحفے بانٹے گئے۔ مگر ریو نامی لڑکے نے تحفہ لینے سے انکار کر دیا، کہنے لگا، میں تو بانسری لونگا کسی کو بانسری بجاتے دیکھ آیا ہوگا۔ اُسی کے لئے ضد کرنے لگا۔ بار بار کہتا تھا، میمہ کے سامنے بانسری بجاؤں گا۔ یہ بچہ صرف چار سال کا ہے، مگر بہت ذہین ہے۔ میں نے

اُسے بانسری منگا دی۔"

موجودہ منتظمہ کی رائے ہے کہ سابق منتظمہ کی اسی نرمی نے ریو کی عادتیں بگاڑ دیں ایک جگہ ریکارڈ میں لکھا ہے کہ

"ریو اور میمہ کی بڑی گہری دوستی ہے اصولاً میں اس کے خلاف نہیں ہوں۔ مگر یہ بڑی مشکل ہے کہ وہ ہر وقت میمہ کو اپنے ہی پاس رکھنا چاہتا ہے۔ جس سے انتظام میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ کل دسترخوان پر کھانا کھاتے کھاتے اپنا سالن اٹھا کر میمہ کی طشتری میں الٹنے کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھنے لگا۔ اور سارا سالن اپنے کپڑوں پر گرالیا ایک دن رات کے وقت جب سب بچوں کو سلا دیا گیا تو ریو اپنی چارپائی سے اُٹھ کر میمہ کی چارپائی کی طرف جانے لگا۔ اس سے وجہ پوچھی گئی تو بولا "میرا جی چاہتا ہے کہ میں میمہ کے پاس سو جاؤں۔ میمہ کے بال ریو کو بہت پسند ہیں۔ اس سے ایک بڑی عجیب و غریب مشکل پیدا ہوتی ہے۔ میمہ کی گُندھی ہوئی مینڈھیاں کھول کر وہ اس کے بالوں سے کھیلنا چاہتا ہے۔"

سابق منتظمہ نے ان باتوں پر تنبیہ کرنے کے عوض ریو کو ڈھیل دی۔ اس سے لڑکے کی عادات اور بھی بگڑتی چلی گئیں۔ سابق منتظمہ نے ایک جگہ ریکارڈ میں لکھا ہے

"ریو کسی دن فنِ موسیقی کا ماہر بنے گا۔ تربیت گاہ کو چاہیئے کہ ایسے بچوں کی ہمت افزائی کرے۔ میں نے اسے ایک چھوٹا سا ہارمونیم منگا دیا تھا۔ مگر بہت جلد وہ ریو سے واپس لے لینا پڑا۔ کیونکہ وہ ایک رات ہارمونیم اپنے ساتھ ہی لیکر سو گیا، اور رات کو تین بجے اُٹھ کر ہارمونیم بجانے لگا۔

موجودہ منتظمہ کی رائے ہے کہ سابق منتظمہ کو ریو کے لئے ہارمونیم کبھی مہیا نہیں کرنا چاہیئے تھا انھیں باتوں سے اس کی عادات بگڑیں۔ سابق منتظمہ آگے چل کر لکھتی ہے۔

"آج کی رپورٹ میں میں ریو کی ایک خوبی کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ اس میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض وقت وہ حیرت انگیز باتیں کرتا ہے۔ پرسوں عید میلاد کے اجتماع میں اُس نے ایسی خوش الحانی سے نعت پڑھی کہ لوگ وجد میں آگئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی ایک افسوسناک حرکت کا ذکر بھی کرنا پڑتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک بچے سے معروفِ جنگ ہو گیا۔ میمہ نے، جو اس لڑائی میں ریو کی مددگار تھی، بتایا کہ لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ اس بچے نے ریو کو یتیم کہہ دیا تھا!"

اس کے بعد سابق منتظمہ بدل گئی اور یتیم خانے کا انتظام موجودہ منتظمہ کے سپرد کیا گیا۔ موجودہ منتظمہ کے خیالات سابق منتظمہ سے بہت مختلف ہیں۔ وہ یتیم خانے میں نظام دیکھنے کی مشتاق تھی اور چاہتی تھی کہ درسگاہ کے ہر بچے کو محنت و مشقت کا عادی بنایا جائے۔ چنانچہ اس نے انتظام ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ہر بچے کے ذمے کوئی نہ کوئی کام لگا دیا۔ ریو کو یہ کام دیا گیا کہ وہ منتظمہ کے دفتر کے کواڑے صاف کیا کرے۔ دیکھا جائے تو یہ کام کچھ بھی نہیں تھا، مگر ریو نے اس معمولی سے کام سے بھی جان بوجھ کر گریز کیا۔ ایک دن وہ علی الصباح، جب جھاڑ پونچھ کرنے کا وقت تھا کمرے کے ایک قیمتی صوفے پر منتظمہ کا منہ پونچھنے کا تولیہ اوڑھے پایا گیا۔

موجودہ منتظمہ جب تربیت گاہ میں آئی تو اُس نے دیکھا کہ ریو اور میمہ بہت زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ بات اُسے قابلِ گرفت محسوس ہوئی اور اُس نے یہ حکم جاری کر دیا کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے میل جول نہ رکھیں، اُس وقت کے سوا جب دسترخوان پر ہوں۔ ریکارڈ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ریو نے اس حکم کی مسلسل خلاف ورزی کی۔ بار بار اُسے میمہ سے گفتگو کرتے پایا گیا اور بیتوں کی سزا دی گئی اس سزا سے بچنے کی ریو نے یہ ترکیب سوچی کہ پڑھائی کے گھنٹوں میں جماعت سے بھاگ جاتا۔ اُس نے باغیچے میں ایک مقام مقرر کر لیا تھا۔ وہیں میمہ بھی پہنچ جاتی۔ جب ایک دفعہ دونوں کو وہاں پکڑا گیا تو ریو نے یہ عذر پیش کیا کہ ہم دونوں آپس میں باتیں نہیں کیا کرتے بلکہ آسمان کو دیکھا کرتے اور پرندوں کی آوازیں سنا کرتے ہیں۔

ربیو، جتنا جتنا بڑا ہوتا گیا، اس لڑکے کی جھوٹ بولنے کی عادت ترقی پکڑتی گئی، ایک دفعہ ایک دائی نے سُنا، ربیو دوسرے بچوں سے کہہ رہا تھا کہ جب درختوں میں ہوا سائیں سائیں کرتی ہے تو اُس کی آواز میں ایک یتیم بچے کی ماں کی چیخیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے بچے کے لئے روتی ہے، ایک اور موقعہ پر وہ بچوں سے یہ کہتے سنا گیا کہ یتیم بچے فرشتوں کے بیٹے ہوتے ہیں جو انھیں آسمانوں سے گرا دیتے ہیں۔ اور پھر حوریں زمین پر آتی ہیں اور ان بچوں کو لوگوں کے دروازوں پر ڈال جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ منتظمہ نے خود اپنے کانوں سے سُنا ربیو سیمہ سے کہہ رہا تھا میری ماں سمندر کی ملکہ ہے، بہت جلد وہ مجھے لینے کے لئے ایک چاندی کی کشتی بھیجے گی۔ اور میں تمہیں بھی اس میں بٹھلا کر اپنے ساتھ لے چلوں گا۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اُس نے تربیت گاہ کے معاملات میں بھی دخل اندازی شروع کر دی۔ ایک دفعہ ایک صاحب جو بے اولاد تھے اس خیال سے تربیت گاہ میں تشریف لائے کہ ایک لڑکی کو گود لے کر پال لیں۔ اُنھوں نے سیمہ کو پسند کیا۔ جب اس بات کا ربیو کا پتا چلا تو اُس نے سیمہ کو ہدایت کر دی کہ اب کی مرتبہ جب تم ان صاحب کے پاس جاؤ تو رونے لگنا اور بگڑ جانا اور مچل جانا اور اُن کا منہ نوچنا اور لاتیں چلانا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور وہ صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔ جب سیمہ کو سزا دی گئی تو ربیو جو کہیں سے یہ سب دیکھ رہا تھا دوڑا ہوا آیا اور دایہ کو لاتیں مارنے لگا۔ اسی طرح اور بھی کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ صاحب استطاعت لوگوں نے سیمہ کو لے کر پالنا چاہا اور ربیو نے اسے بہکا کر اس سے ایسی حرکتیں کرائیں جنھوں نے لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ دیکھا دیکھی یہ جذبۂ بغاوت دوسرے بچوں میں بھی پیدا ہو گیا اور انھوں نے بھی نو واردوں کے سامنے ایسی ہی حرکتیں شروع کر دیں۔ ایک دفعہ ایک خاتون ایک لڑکے کو گود لینے کے خیال سے آئیں اور اُنھوں نے ایک بچہ پسند بھی کر لیا، مگر ربیو نے اُن کو یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ جس بچے کو آپ نے پسند کیا ہے وہ بڑا شریر ہے، اور وہ خاتون مایوس ہو کر چلی گئیں۔

منتظمہ ان حرکتوں سے بہت نالاں تھی اُس نے تربیت گاہ سے دُور کرنے کے لئے ربیو کو ایک دوکان پر کام کاج کے واسطے بھجوا دیا جاتے وقت ربیو نے سیمہ کو ایسا بھڑکا دیا کہ وہ سارے دن ربیو کے لئے روتی رہی اور کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ دوسرے ہی دن دوکاندار ربیو کو واپس کر گیا، وہ کہہ گیا، جناب یہ لڑکا بہت شریر ہے میں اسے نہیں رکھ سکتا۔

اصلاح کے خیال سے زبانی سرزنش کر کے منتظمہ نے ربیو کو پھر تربیت گاہ میں داخل کر لیا۔ مگر معلوم نہیں وہ اب اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگا تھا، کیونکہ چند دن بعد منتظمہ نے معلوم کیا کہ ربیو اور سیمہ نے خود کو باقی بچوں کا لیڈر بنا لیا ہے اور خفیہ جلسے شروع کر دئے ہیں۔ اور یہ جلسے پڑھائی کے اوقات میں ہوا کرتے ہیں، ان جلسوں میں یہ دونوں باقی بچوں سے قول لیا کرتے تھے کہ خواہ کچھ بھی بات ہو مگر جب ہم منتظمہ سے لڑنے لگیں تو تم سب ہمارا ساتھ دینا۔ ایک دن ربیو نے منتظمہ سے کہا کہ کئی دن سے صبح کو دال پک رہی ہے، بس اب کل دال نہ پکے ورنہ میں مہتمم صاحب کو خط لکھ دوں گا۔ اور دھمکی کے لہجے میں یہ بھی کہا کہ سب بچے میرے ساتھ ہیں۔ اس پر منتظمہ نے بطور سزا کئی روز تک اُسے دال کھلائی۔

چونکہ منتظمہ کو اُس کی اصلاح مدنظر تھی پڑھائی کے اوقات سے پہلے اور بعد ربیو کے لئے اخبار بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اخبار سمجھتا نہیں پڑھتا رہتا ہے۔ جب چاہا گیا کہ وہ اس سے باز رہے، اس نے ہڑتال کرنے کی دھمکی دی۔ یہ خیال اُس کے دماغ میں اخبار پڑھنے سے آیا ہوگا۔ ایک دن جب بچے ورزش کے لئے جا رہے تھے سیمہ نے سیٹی بجائی تو سب استانی کے قابو سے باہر ہو کر باغیچے میں پھیل گئے، منتظمہ خود اُنھیں منانے گئی تو ربیو نے سخت کلامی کی اور کہا جب تک تم میرے ساتھ صلح کی گفتگو نہ کرو گی ہڑتال ختم نہ ہوگی اور جب اُس کی یہ شرط پوری کی گئی اُس وقت ہڑتال ختم ہوئی۔

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اب ربیو ہمارے قابو کا نہیں ہے، منتظمہ نے مہتمم سے درخواست کی کہ وہ ربیو کا کوئی اور بندوبست کر دیں۔ محترم ممبرانِ بورڈ کو یاد ہوگا کہ یہ درخواست اُن کی خدمت میں پیش ہوئی تھی، اور ربیو اور سیمہ دونوں نے ممبران کے سامنے پیش ہو کر روتے ہوئے یہ بیان دیا تھا کہ انھیں تربیت گاہ کے بچوں سے بے انتہا محبت ہے اور اس لئے وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔ اس پر محترم ممبران نے انھیں یہاں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ اصل میں ربیو اور سیمہ نے بڑی چالاکی سے بیان

دیا تھا، اُن کا رونا بھی بناوٹی تھا اور تربیت گاہ کے بچوں سے اظہارِ محبت
بھی بناوٹی تھا۔ مطلب فقط منتظمہ کی درخواست کو نامنظور کرانا تھا۔ اس کا
ثبوت یہ ہے کہ جس دن درخواست نامنظور ہوئی ہے اُسی رات وہ تربیت گاہ
کے صدر دروازے کی چھت پر چڑھے اور دروازے کے اوپر کے پتھر پر
جو سامنے سے نظر آتا ہے یہ کھودا "ریو اور سیمہ کی فتح کی یادگار میں اگست ۱۹"
منتظمہ کو جب خبر لگی تو اس نے مالی کو حکم دیا کہ اس پر سمنٹ لگا دے،
بارش سے سمنٹ دُھل گیا اور آج تک یہ فقرہ دروازے کی سل پر گُھدا
ہوا ہے۔

اس کے بعد یہ انتظام ہوا کہ لڑکے اور لڑکیوں کو علیحدہ علیحدہ رکھا
گیا تاکہ ریو اور سیمہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر کسی نئی شرارت کی
بنیاد نہ ڈال سکیں۔ اسی اثنا میں ایک صاحب مسٹر نعمان آئے اور اُنھوں
نے بتایا کہ اب سے چند سال پہلے میں اور میری بیوی الہ آباد میں رہتے
تھے۔ میری بیوی کے یہاں بچہ ہونے والا تھا۔ اور بچے کے لئے جو کپڑے
تیار کئے گئے تھے اور اُن پر ایک خاص قسم کا نشان بنا دیا گیا تھا۔ بعض
گھریلو رنجشوں کی وجہ مجھ سے اور ان سے تکرار ہوگئی، وہ ذرا سرکش تھیں
گھر سے نکل کھڑی ہوئیں اور خبر نہیں کہاں گئیں۔ مجھے تلاش کے باوجود اُنکا
پتہ نہ لگا۔ کئی سال کی چھان بین کے بعد یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اس شہر میں
آئی تھیں اور دورانِ زچگی میں یہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ یہ بھی معلوم ہوا
کہ اُن کے ایک بچہ بھی ہوا جو پیدائش کے ایک دو ہفتے بعد ایک مقامی
یتیم خانے کو دیدیا گیا۔

مسٹر نعمان کی یہ گفتگو سن کر منتظمہ نے اُن سے وعدہ کر لیا کہ آپ کو
وہ کپڑے دکھا دئے جائیں گے جو پہلے دن بچوں کے جسم پر سے اتار کر
محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ اتفاق سے یہ گفتگو ریو بھی سن رہا تھا۔ اس نے
ضد کی کہ پہلے مجھے میرے کپڑے دکھائے جائیں، شاید اُن پر کوئی نشان
ہو۔ منتظمہ کو ریو کی یہ بات کچھ زیادہ بری نہیں معلوم ہوئی۔ اور ریکارڈ
روم میں داخل ہونے کی اجازت دیدی گئی، جہاں بچوں کے کپڑے
چھوٹے چھوٹے بکسوں میں رکھے تھے۔ مگر چند منٹ بعد ریکارڈ روم میں داخل
ہونے پر اُسے ریو کی مجرمانہ نیت کا پتہ چلا۔ ریو نے دو بکس کھول رکھے تھے
ایک سیمہ کا اور دوسرا کسی اور بچے کا۔ اُس بچے کے کپڑے سیمہ کے بکس میں
رکھ رہا تھا اور سیمہ کے کپڑے جن پر سُرخ تاگے سے ایک نشان بنا تھا دوسرے
بچے کے بکس میں۔ ابھی وہ اپنے جرم کا مکمل طور پر ارتکاب نہ کر سکا تھا کہ منتظمہ
جا پہنچی۔ اُس نے بچوں کے کپڑے حسبِ سابق کر دئے اور ریو کو دھتکار کر
کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیمہ کے کپڑے سامنے آنے پر مسٹر نعمان نے اپنی بچی کو
جان لیا اور وہ اپنے باپ کے حوالے کر دی گئی۔ ریو جاتے وقت اُس سے
گلے مل مل کر رویا اور اُس کے جانے کے بعد جب تک یہاں رہا روتا رہا۔
دو دن ہوتے ہیں وہ یہاں سے بھاگ گیا اور اب تک لاپتہ ہے، حالات
کی رپورٹ محترم ممبران کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے۔

قطعہ

انسان کو رہے ہیں تقلیب بندروں کی
سمجھ لیجئے تو یہ بھی اک فیض ارتقا ہے
اپنی طرف توجہ کرتا نہیں کوئی بھی
جو ہے وہ قوم ہی کی اصلاح پر تلا ہے

(راجہ رحمٰن ندوی)

مفتی حیات

میری سو مستقبلوں کی عمر دراز ہیں
ہوں اک آزاد و بے نیازی میں
زندگی میری اس زمانے سے ہے
میرے دن رات میرے نغمے ہیں

(اختر انصاری)
(ترنم)

جاپان کے کسان

محمد ہاشم مولیدینا، میونسپل کونسلر۔ پونہ

ہمارے ہندوستانی کسان کا خمیر چار چیزوں سے مل کر بنا ہے، اونٹ کی قناعت۔ گائے کا بھولاپن۔ بھیڑ کی اندھی چال۔ اور کتے کی قدامت پسندی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تقدیر کا اس حد تک قائل ہو چکا ہے کہ مجسم "الیشور کی مرضی" بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا الیشور مہربان اور رحیم چیز نہیں بلکہ قہار اور جبار واقع ہوا ہے اس لئے اس کی عبادت ڈرنا اور گڑگڑانا ہے۔

شہری اور متمدن انسانوں میں چونکہ تخلیق کا مادہ مقابلتہً زیادہ ہوتا ہے اس لئے یہ بھولا انسان ان سے بھی ڈرتا ہے اور ان کو "مائی باپ" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس طرح اس نے اپنی انفرادیت۔ قدرت۔ حکومت اور سماج کے ہاتھوں بہت کم قیمت پر بیچ کر اپنے وجود کو خود اپنے لئے وبال دوش بنا لیا ہے۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قدرت اس سے تمسخر کرتی ہے۔ حکومت ستم ظریفیاں اور سماج ظلم۔ اور یہ بھولا شکار میمنہ میسرہ اور قلب کی طرف سے پسپا ہو کر زندگی کی بھاگ دوڑ میں برابر پیچھے ہٹتا چلا آ رہا ہے۔

اب آیئے اس کا مقابلہ ہم جاپان کے کسان سے کریں۔ سب سے بہتر ذریعہ کسی قوم کی فطرت کو جانچنے کا یہ ہے کہ مخصوص حالات کے اندر اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کیا جائے اور اس سے نتائج اخذ کئے جائیں۔ چنانچہ ذیل کا واقعہ جاپانی کسان کی فطرت پر پوری روشنی ڈالتا ہے۔

الکشن کے زمانے میں مختلف امیدوار گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے تھے۔ ایک گاؤں میں ایک پارٹی نے ایک جلسہ کیا جس میں تقریباً ساٹھ دیہاتی موجود تھے اور ان سے اپیل کی کہ وہ ایک امیدوار کو ووٹ دیں کیونکہ وہ بہت جہاندیدہ ہے۔ یورپ اور امریکہ کا سفر کر چکا ہے اور اس کے علاوہ انگریزی بھی بہت اچھی طرح بول لیتا ہے۔

یہ سنتے ہی حاضرین میں سے ایک شخص جو مخالف پارٹی سے تعلق رکھتا تھا کھڑا ہو گیا اور اس امیدوار پر اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ———

"اگر اس جگہ کے لئے سیر و سیاحت ایک لازمی قابلیت ہے تو کیوں نہ اس امیدوار کے بجائے کسی جہاز کے کپتان کو کھڑا کر دیا جائے۔ اور اگر انگریزی بول لینا دوسری شرط ہے تو وہ بھی اس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ جاپان کے کسی بندرگاہ میں جا کر کسی مترجم کا ہاتھ پکڑ کر اسکو پارلیمنٹ میں بھیج دیا جائے۔ نہیں جناب۔ ایسے امیدوار جو اپنی تمام عمر یورپ اور امریکہ کے سیر سپاٹے میں گنوا کے پھریں اور انگریزی بول لینے کو اپنی ذات کے لئے قابل صد افتخار سمجھیں، ہمارے لئے بیکار محض ہیں۔ میں جس امیدوار کی موافقت کر رہا ہوں وہ دوسرے ہی قسم کا ہے، وہ ایک بڑی یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد ایک مدت تک دھان کے کھیتوں میں کام کرتا رہا ہے اور اس طرح وہ ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح واقف ہو چکا ہے۔"

اس تقریر نے پہلے امیدوار کو زندہ درگور ہی کر دیا ہوتا، اگر فوراً ہی ایک بوڑھا کسان نہ کھڑا ہو جاتا ——— وہ چیخ کر کہنے لگا کہ

"اچھا بھیا اگر تمہارے خیال میں پارلیمنٹ کے لئے یہی قابلیت ضروری ہے تو ہم خود ہی کیوں نہ اس جگہ کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ کیونکہ ہم تو جب سے پیدا ہوئے اسی دم سے دھانوں کے کھیت میں کام کر رہے ہیں اور ہم نے تو اپنی عمر یونیورسٹی میں بھی برباد نہیں کی ———

اس واقعہ سے ہم جو کچھ نتائج اخذ کرسکتے ہیں وہ ہمارے دیہاتی تو کجا خود ہم ہی کو شرما دینے کے لئے کافی ہیں۔

کیا باوجود اس تمام تعلیم کے ہم اتنے نڈر، حاضر جواب، اور بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ اور کیا یہ واقعہ جاپانی کسان کی معاملہ فہمی اور حساس طبیعت کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ دوسرا واقعہ جو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے اس سے زیادہ نتیجہ خیز ہے، اس کے راوی ایک انگریز سیاح مسٹر پرسن اسکاٹ ہیں۔

جس طرح آج کل ہمارے ملک میں دیہات سدھار کے سلسلے میں محکمۂ زراعت کے افسر گاؤں گاؤں لکچر دیتے پھرتے ہیں، اسی طرح محکمۂ زراعت جاپان کی طرف سے بھی دیہاتیوں کی ترقی کے لئے مناسب موقعوں پر لکچروں کا انتظام کیا جاتا ہے، چنانچہ ایک گاؤں میں "دھان" کی پیداوار پر ایک افسر کے لکچر کا پروگرام تھا۔ لیکن اس مقرر کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے حاضرین کی صفوں کو بالکل خالی پایا۔ ایک شخص کے علاوہ جو ایک بوڑھا کسان تھا، جب مقرر نے اس عمر رسیدہ کسان سے لوگوں کی غفلت اور عدم توجہی کی شکایت کی تو اس نے کہا کہ ــــ "دیکھئے بابوجی ہم سب کامی آدمی ہیں اور خاص طور سے اس موسم میں تو ہمیں دم لینے کی بھی فرصت نہیں، چونکہ میں گاؤں بھر میں سب سے زیادہ بوڑھا ہوں۔ اس لئے انھوں نے مجھے انتخاب کرکے اپنے عوض لکچر سننے کو بھیجا ہے، میں اپنے وسیع تجربے اور معلومات کی بنا پر کہہ سکوں گا کہ آیا آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ہمارے لئے مفید بھی ہوگا یا نہیں۔ اس لئے اگر آپ نے مجھ کو مطمئن کردیا تو گویا تمام گاؤں کو مطمئن کردیا۔"

اس حکایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی کس قدر محنتی ہیں کہ اپنے کام کے سوا دوسری باتوں کی پروا بھی نہیں کرتے۔ اُن کا اپنی طرف سے ایک بوڑھے آدمی کو انتخاب کرکے بھیجنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کس قدر ہوشیار واقع ہوئے ہیں۔ اور اس بوڑھے کا بحث و مباحثہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اندھی تقلید کے قائل نہیں۔

جاپانیوں کی جفاشعاری اور قربانی کی مثال جس کا اندازہ ذیل کی حکایت سے ہوگا دنیا کے بہت کم کسانوں میں مل سکے گی۔ کاش ہم ایسا کیرکٹر اپنی یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ ہی میں پیدا کرسکتے۔

ایک ذہین اور کفایت شعار کسان اس قدر بوڑھا ہوگیا کہ اس کے لڑکے نے اسے کام چھوڑ کر باقی ماندہ عمر کے لئے آرام کرنے پر مجبور کیا، لیکن اس بوڑھے نے اصرار کیا کہ اس کو بدستور کام کرنے دیا جائے۔ مگر لڑکا نہ مانا۔ آخر کار اُس نے اپنے کھیت پر جانا چھوڑ دیا۔ لیکن اپنے بیٹے کی نگاہ بچا کر وہ روزانہ ایک دور کی پہاڑی پر جو بالکل بنجر اور ویران تھی جانے لگا۔ وہاں اس کے ڈھلان پر اس نے آہستہ آہستہ ایک دیوار کھڑی کی۔ اپنے کمزور ہاتھوں سے اُس نے اس ڈھلان پر مٹی ڈالنی شروع کی، یہاں تک کہ وہاں ایک کھیت تیار ہوگیا۔ لیکن وہ صرف تیس مربع فٹ کی جگہ تھی مگر اس بوڑھے کا دل ہی جانتا تھا کہ اس نے کس قدر عرق ریزی کی تھی۔ جب ایک دن اس لڑکے نے اس تیار شدہ اراضی کو دیکھا تو وہ بے ساختہ رونے لگا اور کہا کہ تم نے خود کو کس لئے ہلکان کیا؟ آخر یہ کھیت کس کام آئے گا؟ اگر یہ گاؤں کے قریب ہوتا تو جوتا بویا جاسکتا تھا مگر آبادی سے اتنے دور کون اس کو بوسکے گا؟

یہ سنکر بوڑھے نے اپنے پائپ سے تنباکو گراتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ اگر تم ٹوکیو جاؤ اور وہاں کے ایوما قبرستان کی سیر کرو تو تمہیں وہاں بڑے بڑے پتھر ملیں گے جن پر سپاہیوں اور افسروں کی یادگار میں وہ عبارتیں نقش ہیں کہ جنھوں نے ان کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ لیکن ہم نے کبھی ان بہادروں کا نام بھی نہیں سنا۔ میرا خیال ہے کہ حیاتِ جاودانی کے لئے بڑے بڑے پتھروں کی ضرورت نہیں، میں شرط لگا کر کہتا ہوں کہ تم کو جاپان کے سب سے بڑے شاہ مردہ (HERO) کی قبر کا نشان تک نہیں معلوم۔ لیکن اس کے باوجود تم اس کو بھولے نہیں۔ بیٹا غیر فانی مقبولیت زندگی کے کارناموں سے حاصل ہوتی ہے۔ سنگِ مرمر کے کتبوں سے نہیں۔ یہ مصنوعی یادگاریں مٹ جاتی ہیں۔ لیکن جن بہادروں کی قبریں بنی نوعِ انسان کے دلوں میں بنی ہوئی ہوتی ہیں وہ امٹ ہوجاتی ہیں۔ ہم کسان بھی اپنے مخصوص انداز میں اپنی یادگاریں چھوڑ سکتے ہیں۔ اور وہ یادگاریں کونسی ہیں؟ بنجر پہاڑی کے ڈھلوان پر ایک نیا دھان کا کھیت تیار کرنا اور ایک باغ لگانا ہمارے بہترین کارنامے اور لازوال یادگاریں ہیں۔ مجھکو کس قدر ندامت اور افسوس ہوتا کہ میرے مرجانے کے بعد میرا نام فراموش کردیا جاتا اور اب جبکہ اس کھیت میں مٹھی بھر

دھان بھی پیدا ہوگئے تو میرا نام زندہ رہ سکے گا۔ مجھے کس قدر مسرت اور اطمینان ہے، گویا میری زندگی بیکار نہیں گئی، اور اب تو میں اس پر ایک جنگل لگانے والا ہوں۔

وہ بوڑھا اتنے عرصے تک زندہ رہا کہ وہ بنجر پہاڑی لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل ہوگئی اور اس کے ہر چہار طرف گھنا جنگل اُگ آیا۔

اس کے بعد ہم جاپانی کسان کی مشکلات بیان کریں گے، جن میں و شاہ می جس کے زمانے سے جاپان کا نشاۃ الثانیہ شروع ہوتا ہے برابر اضافہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ شروع میں اس کو لگان نقد رقم میں ادا کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ جنس دینے کا عادی تھا، اس لئے سکّے کے دلالوں نے اس کو نا لؤے کے پھیرے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس کو جدید زراعت سکھائی گئی۔ جس نے اس کا دیوالہ نکال دیا۔ اس نے آنکھ بند کرکے زراعت کے جدید آلات اور کیمیاوی اجزا خریدنا شروع کئے اور ان چیزوں کے سوداگروں نے ان کے دام بڑھانا شروع کئے۔ یہاں تک کہ اس نے جتنا خرچ کیا تھا اتنا وصول ہونا بھی مشکل ہوگیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ جدید زراعت نے اس کا خاتمہ کردیا تو اس نے کھیتی باڑی کے ساتھ ہی ساتھ مرغیاں اور سور پالنا شروع کردئے تاکہ ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہو جائے۔ اس میں اس نے اتنی ترقی کی کہ دس ہی سال میں جانوروں کی تعداد تمام جاپان میں دگنی ہوگئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مرغی خانہ کے لوازم مثلاً مصنوعی بیضہ کش۔ جالیاں اور حد بندی کے تار وغیرہ کی قیمت بھی اسی تناسب سے بڑھتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر دولتمند بنے اور گاؤں تباہ ہوگئے

اس کے علاوہ جاپانی کسان ہندوستانی کاشتکار کے برخلاف جو اپنے مکان کی دہلیز پھلانگنا بھی نہیں جانتا۔ اکثر سفر کرتا رہتا ہے اور اپنے قریب کے شہروں کو جاکر دیکھتا ہے۔ اس لئے ریلوے کمپنیاں دولتمند ہوتی چلی جاتی ہیں مگر کسان کے افلاس میں زیادتی ہوتی چلی جارہی ہے، [illegible] تہذیب و تمدن بھی بڑی حد تک اس کی بربادی کا باعث ہے، [illegible] گاؤں کی صحبت میں جاہل آدمی اور فاضل [illegible] تعلیم کو عام کرنے کے لئے بعض گاؤں [illegible] ٹیکس لگا دیا گیا [illegible] پہنچی ہے۔ اس لئے اس [illegible]

اپنے دھان کے کھیتوں میں کاشتکاری بند کردی اور ان میں شہتوت کے درخت لگانا شروع کئے تاکہ ریشم کے کیڑوں کی پرورش سے فائدہ اٹھا سکیں مگر اس میں بھی ان کو نقصان ہوا۔ کیونکہ اس کے مقابلے پر مصنوعی ریشم کا کاروبار بڑھنے لگا۔

اب اگر وہ اپنی کاشتکاری کو قائم رکھنا چاہے تو اس کے لئے ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اناج کی کاشت کے بجائے وہ ترکاریوں اور پھلوں کی پیداوار پر اپنی پوری توجہ منعطف کرے، جاپان میں مربے، اچار، چٹنی۔ تازہ پھل اور ترکاریاں ٹین کے ڈبوں میں بند کرکے باہر بھیجنے کا کام مستقل رکھتا ہے۔ جاپان کی زمین پھلوں کی کاشت کے لئے موافق بھی ہے اس لئے جہاں پہلے دھان پیدا ہوتا تھا اب وہاں ناشپاتی، انگور، انجیر، آڑو، بیر، اور اسٹابری کے باغ لگے ہوئے ہیں، جاپان کی چائے کی کاشت زیادہ منافع نہیں دیتی، کیونکہ اس کا مقابلہ ہندوستان، لنکا، اور جاوا سے ہے، جہاں کی چائے کو دنیا پر فوقیت حاصل ہے۔

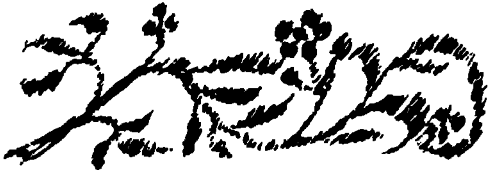
دورِ حاضرہ میں جاپانی کسان کے لئے دوسری راہ بھی کھلی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ کھیت چھوڑ کر شہر میں آجائے اور اس پر عمل بھی بڑی تیزی کے ساتھ ہورہا ہے۔ شہروں کی آبادی کثرت سے بڑھ رہی ہے پینتیس سال کے عرصے میں جاپان کے شہروں کی آبادی تین سو فیصدی بڑھی ہے اور گاؤں کی آبادی صرف سات فیصدی۔ یہ ایک دوسرا خطرہ ہے جو حکومت اور کسانوں کے لئے موجب فکر ہے۔ بہرحال ہم کو اس مختصر باب میں جاپانی کسانوں کی مشکلات کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہوگیا ہوگا۔ اور ہم نے یہ بھی نظر انداز نہیں کیا ہوگا کہ باوجود ان تمام مشکلات کے جاپانی کسان کس قدر بہادر ہے کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ کتنی جلد جلد بدل رہا ہے۔ تاکہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے۔ دا ہے ہمارے ہندوستانی کاشتکار کے حال پر کہ وہ جہاں تھا وہیں ہے۔

حکومت اپنے فرائض سے غافل نہیں ہے۔ دیہات کی تباہی اور شہروں کی کثرت آبادی کو دیکھتے ہوئے اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صنعت و حرفت غیر مرکزی صورت میں لائی جائے [illegible] کارخانے شہروں سے ہٹا کر گاؤں میں کھولے جائیں۔ تاکہ وہاں کی آبادی [illegible] صنعت و حرفت

میں حصہ لینے کے باوجود اپنے کاشتکاری کے فرائض بھی انجام دے سکے۔ اس طرح شہروں کی آبادی کم ہو جائیگی، بے روزگاری گھوٹ جائے گی۔ دیہاتیوں کو جو تکالیف شہری زندگی میں پیش آتی ہیں وہ بھی باقی نہ رہیں گی چونکہ جاپان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ فاصلہ بہت کم ہے اس لئے مصنوعات کو گاؤں کے کارخانوں سے بندرگاہوں تک لے جانے میں خرچ بہت کم آئے گا۔

ایسے دیہی کارخانے جاپانی دیہاتوں میں تقریباً گیارہ ہزار ہیں، جو سب بجلی سے چلائے جاتے ہیں ان میں سے ۲۲۶ کارخانے میونسپلٹیاں چلاتی ہیں۔ ۱۴۰۱ کارخانے امدادی انجمنیں چلاتی ہیں۔ ۵۰۲۰ زراعتی انجمنوں کے زیر نگرانی ہیں اور ۵۱۳۱ کارخانے مشترکہ سرمائے سے چلتے ہیں۔ اسی سلسلے میں زراعتی کاروبار کو منظم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ گاؤں میں ریشم کے کیڑوں کی پرورش و پرداخت ان کے کویوں کی خرید و فروخت وغیرہ کے لئے گاؤں والوں کی مشترکہ انجمنیں تشکیل میں آچکی ہیں اس طرح دوسری پیداواروں کے لئے بھی کیا جارہا ہے، ہم ہندوستان میں بھی اس قسم کے بند و بست کی پرزور سفارش کریں گے تاکہ ملک کی دولت صرف چند شہروں ہی تک محدود نہ رہے بلکہ اس سے تمام آبادی مستفید ہوسکے۔ اس کو ترقی دینے کے لئے بجلی پیدا کرنے کے کارخانے کثرت سے کھولے جارہے ہیں اور وہاں بہت سستی رَو مہیا کی جاتی ہے۔

ملک اور حکومت اب تک صنعت و حرفت کی طرف اپنی تمام توجہ منعطف کئے ہوئے تھی۔ اور سیاست کی پیچیدگیوں میں اپنے دیہاتیوں کی پوری خدمت نہیں کرسکی تھی۔ لیکن اب تمام ملک کو اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ "جاپان کی بنیاد زراعت پر ہے" اس لئے اس طبقے کا مستقبل اب بہت روشن نظر آرہا ہے۔



علم و جہل

جب دل کو سکوں بتا نہیں ہے واللہ
جب عقل کو تسکیں روا نہیں ہے واللہ
کیا نفع ہے علم سے جو ہوتا ہے سوار
جب جہل کی انتہا نہیں ہے واللہ
(جوش)

گر ذرۂ علم قہر بن جاتا ہے
پیکر یہ لطیف نہر بن جاتا ہے
وہ علم کہ اکسیر ہے انساں کیلئے
گر ہضم نہ ہو تو زہر بن جاتا ہے
(جوش)

اک عمر میں ہوتی ہے بصیرت پیدا
کرتا ہے خدا آشنا یہ دولت پیدا
رگ رگ میں نفس نہ اتر جائے اگر
خود علم سے ہوتی ہے جہالت پیدا
(جوش)

ماں

مسعود حسن شمسی داناپوری (کلکتہ یونیورسٹی)

یہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے جب میں انٹرمیڈیٹ کالج میں تعلیم پا رہا تھا اور خالو ابا کے ساتھ بانکی پور کے ایک محلہ مرادپور میں رہا کرتا تھا، اسی زمانہ میں یوپی کی ایک خاتون میرے پڑوس میں آکر مقیم ہوئیں جو بڑی خوش مزاج، نیک دل، اور فرشتہ سیرت واقع ہوئی تھیں۔ طبیعت میں حد درجہ لطافت اور سنجیدگی تھی، اچھی تعلیم اور بیسویں صدی کی دل و دماغ روشن کر دینے والی تربیت نے اُن میں چار چاند لگا دئے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلوص اور محبت کی پیکر، جس سے ملتیں فراخ دلی اور گرمجوشی سے، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ محلہ میں آتے ہی گھر گھر اُن کا چرچا ہونے لگا تھا۔

شادی کے چند ہی دنوں بعد شوہر ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے کر جنت کو سدھار چکے تھے۔ اور تھوڑی سی جائداد اور ایک خوردسال بچہ بطور یادگار چھوڑ گئے تھے۔ خاتون کو اس بچے سے شدید محبت تھی، اور سچ پوچھئے تو رنج و غم اور بیوگی کی اس ہیبتناک تاریکی میں اگر بچے کی شعاعِ محبت کا اجالا نہ ہوتا تو وہ اپنی بے لطف اور سوگوار زندگی سے کب کی منہ موڑ لیتیں۔

بچہ جس کا نام حامد تھا نہایت خوبصورت اور حسین تھا، اس کے سرخی مائل گورے گورے گال، اور پیشانی کے ارد گرد سنہرے گھنگھریالے بال بہت دلفریب معلوم ہوتے تھے۔ بھرا ہوا پُر گوشت بدن، صاف رنگ، گلابی ہونٹ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، وہ اپنے سرخ کنول جیسے نرم و نازک پیروں سے چھوٹے سے صحن کے ہزاروں چکر کر ڈالتا تھا، ذہن بھی بلا کا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص اور اقبال کی متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں نوک زبان تھیں۔ گفتگو کرتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی خوش الحان طائر گلاب کے خوشنما پودے پر جھوم جھوم کر نواسنجی کر رہا ہے۔

پڑوس میں ہونے کی وجہ سے خاتون اور ہمارے گھر کی عورتوں میں بہت جلد ارتباط قائم ہو گیا۔ وہ اکثر خالہ جان سے ملنے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ میں بھی کالج کی حاضری، اور تعلیمی فرائض کی انجام دہی کے بعد اپنے وقت کا اکثر حصہ ان کی صحبت میں گذارتا تھا۔ خاتون کی نتھری ستھری زبان، ان کا دلکش اندازِ بیان اور اُن کے کلام کی دلکش رنگینی، میرے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوتی۔ ننھا حامد بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ وہ میرے قدم کی چاپ سنتے ہی دُور ہی سے "ماموں آئے، ماموں آئے" کہتا ہوا ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ لئے ہوئے میرے پیروں سے لپٹ جاتا تھا۔ پھر میں اُسے گود میں اُٹھا لیتا تھا اور پیار کرنے لگتے تھا۔ مجھے اُس کی بھولی بھالی ادائیں اور میٹھی میٹھی باتیں بہت دلکش اور دلآویز معلوم ہوتی تھیں، میں اُس سے کبھی کہتا "گانے کی بولی بولو" کبھی کہتا "سورۂ فاتحہ سناؤ" اور کبھی کسی نظم کے سنانے کی فرمائش کرتا۔

(۲)

گرمی کی ایک خوشگوار صبح تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا نرم و نازک جھونکا دروازے میں لگے ہوئے رنگین پردے کو حرکت دے رہا تھا، اور میں اپنی

خوبصورت داڑھی کی تزئین و آرائش میں مصروف تھا۔ میں اپنی داڑھی درست کر رہا تھا، اور برقؔ مرحوم کی دلکش نظم "نسیم صبح" کا یہ شعر گنگنا رہا تھا۔

گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کو صد چاک داماں کر دیا

اتنے میں محلہ کی ایک عورت دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "حامد بابو کنوئیں میں گر گئے ہیں جلد چلئے" میرا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ میں زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر ایک مدہوشانہ عجلت کے ساتھ بھاگتا ہوا خاتون کے مکان تک پہنچا۔ میرے سر پر غم و الم کا ایک گرانبار پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جب میں نے دیکھا کہ پیارا حامد کنوئیں میں زندگی کا آخری سانس لے رہا ہے۔ اُسے کنوئیں سے زندہ نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، لیکن آہ، ساری کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ ننھی سی جان اس جانگسل صدمہ کی تاب نہ لا سکی، اور افسوس، ظالم موت بیوہ کے لختِ جگر کو چھین لینے میں کامیاب ہو گئی۔

خاتون کے دل و دماغ پر اس ہوشربا سانحہ کا کیا اثر ہوا، کچھ نہ پوچھئے۔ اس واقعہ کے بعد میں نے کبھی اُنھیں ہنستے ہوئے نہیں پایا، وہ اکثر چپ رہتیں، بولتیں تو درمیان میں رُک جاتیں، جیسے کچھ سوچ رہی ہیں، میں نے اُن کا غم غلط کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کیں۔ لیکن مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اُن کی دلجوئی جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہ تھی۔

حامد کے انتقال کے بعد میں پابندی کے ساتھ روزانہ ان کے یہاں جاتا رہا۔ لیکن وہ مجھ سے اور سب لوگوں سے بہت کم بولتی تھیں، دورانِ گفتگو میں حامد کا تذکرہ آ جاتا تو اُن کے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی، لبوں پر گو مُہرِ سکوت ہوتی، مگر آنکھوں سے ساون کی جھڑی کی طرح آنسوؤں کی بارش شروع ہو جاتی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہو گیا کہ حامد ماں سے زیادہ روز تک جدا رہنا نہیں چاہتا اور وہ دن دُور نہیں جب بچھڑے ماں بیٹے پھر ایک جگہ جمع ہو جائیں گے، اور شاید پھر کبھی جدا نہ ہوں گے۔

(۳)

جون جولائی کے مہینوں میں میرا کالج بند ہونے والا تھا۔ اور ابا جان کا اصرار تھا کہ اس تعطیل میں کلکتہ چلے آؤ۔ خود میں بھی ہارڈنگ پارک۔ لالن اور مراد پور کی سیر سے اُکتا گیا تھا۔ اس لئے کالج بند ہونے کے دوسرے ہی دن کلکتہ روانہ ہو گیا۔ کلکتہ کے دورانِ قیام میں مجھے خاتون کے حالات سے قطعاً لاعلمی رہی، کیونکہ سچ پوچھئے تو یہاں کی ہنگامہ آفریں فضا میں پہنچکر میں خود اپنے کو بھی بھول گیا تھا۔ گرمی کی طویل تعطیل ختم کر کے بانکی پور واپس آیا تو گھر کے لوگوں سے خاتون کی خیریت دریافت کی، مگر یہ لوگ کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ سیدھا خاتون کے مکان پر گیا، خلافِ معمول دروازہ بند ملا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ ایک ڈیڑھ ماہ سے یہ دروازہ یوں ہی بند رہتا ہے۔ دروازہ چونکہ اندر سے بند تھا۔ اس لئے بہت دیر تک باہر کی کنڈی ہلایا، آوازدی، مگر کوئی جواب نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر آس پاس کے لوگوں کے صلاح و مشورہ سے دروازہ توڑا گیا۔ گھر میں کسی کا پتہ نہ تھا، ہر شئے پر افسردگی اور موت کی خموشی طاری تھی۔ تین چار چھوٹی چھوٹی پیالیاں، کوئی نصف درجن برتن، میلے کچیلے کپڑے، دو چار بوسیدہ کتابیں ادھر اُدھر پڑی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے برسوں سے انھیں ہاتھ نہیں لگایا ہے، خاتون کو ہر ہر کمرے میں تلاش کیا مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ناکام واپس ہونے لگا تو اتفاقاً کنوئیں کے ایک کنارے خاتون کی زیرپائی پر نظر پڑ گئی۔ پھر قریب ہی ایک چبوترے پر کاغذ کا ایک بوسیدہ ٹکڑا جو مُردے کی کفنی کے مانند زرد ہو کر رہ گیا تھا ایک پتھر سے دبا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اسے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُٹھا لیا، اس میں لکھا تھا،

"ننھے حامد سے ملنے جا رہی ہوں

حامد کی ماں"

میں نے اسی دن رات کو خواب دیکھا، دُور، دنیا اور اس کے ہنگاموں سے بہت دُور، ایک وسیع اور شاندار محل میں خاتون ایک زرنگار اور مرصع تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں، اُن کی ممتا بھری آغوش آباد ہو چکی تھی۔ حامد ماں کی گود میں چودھویں رات کے چاند سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اور خاتون کی گفتگو میں بلبل کے نغمے سے بھی زیادہ دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔

"شعر مرا بمدرسہ کہ برد؟"

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

جولائی ۱۹۵۳ء کے نگار میں رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری کا ایک مضمون "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، یہ جواب ہے اُن اعتراضات کا جو کسی صاحب نے رسالۂ کلیم میں صنفِ غزل پر عائد کئے ہیں۔ میرا مقصود نفسِ مضمون سے معارضہ نہیں بلکہ حضرت بیخود کے ایک شعر اور حضرت صفی کے دو شعروں کی جو مٹی پلید کی گئی ہے اُس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہے۔ حضرت بیخود موہانی کا شعر یہ ہے ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے، کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:-

"موصوف نے غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ وہ اس شعر کو انتخاب الفاظ، سلاست بیان، سادگی اور ترنم سے سوز و ساز کی آخری منزل پر لے گئے ہیں۔ مگر یہی جزئی "خوبیاں" اس شعر کو ابتذال کے گڑھے میں گرا رہی ہیں۔ غزل میں رونے کا ذکر کرنا اپنے اوپر بڑی نازک ذمہ داری لینا ہے جس کی کامیاب مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

"بنال بلبل اگر بامنت سرِ یاریست
کہ ما دو عاشقِ زاریم و کار ما زاریست"

"رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے"

مگر حضرت بیخود کے شعر میں تو رونے والے کے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی بہتی ہوئی ناک اور منہ سے گرتی ہوئی رال، ناک کی سُرخی اور تھرتھراہٹ، آنکھ کی سرخی اور گندگی بھی نظر آ رہی ہے، جس سے شعر نہایت گھنونا ہو گیا ہے اور مظلوم کے غم کا احترام یا اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہونے کے بجائے اس ذلیل قسم کی رقت سے نفرت و بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ یہ رونا نہیں ہے، یہ سوز و ساز نہیں ہے۔ یہ زنخوں کی سینہ کوبی ہے، یہ اظہارِ غم نہیں یہ جھک مارنا ہے اور یہ ابتذال صرف لب و لہجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔"

حضرت فراق کا استدلال اُن کے سوا کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اُن کی عبارت کا ابتدائی حصہ بتاتا ہے کہ شعر کے ابتذال کا دار و مدار گھنونی محاکات پر ہے۔ مگر خاتمے پر فرماتے ہیں کہ شعر کا لب و لہجہ ابتذال پیدا کرتا ہے، حالانکہ لب و لہجہ کے متعلق خود ہی ابتدا میں ارشاد کر چکے ہیں کہ شعر میں انتخاب الفاظ کا سلیقہ، سلاست بیان، سادگی اور ترنم کے صفات موجود ہیں، ان کی موجودگی میں لب و لہجہ سے ابتذال پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔ حضرت معترض کا ایک سقطہ اُن کے دوسرے قول کی تردید کرتا ہے۔ اب دوسرا پہلو لیجئے کہ شعر میں گھنونی محاکات ہے۔ اگر ایسا ہے تو جس شعر میں رونے کا لفظ آئے وہی گھنونا ہے، دور کیوں جائیے خود حضرت فراق کا ایک شعر لے لیجئے ؎

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا وہ اک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا

بے اختیار رو تا تھا یعنی ہچکیاں اُلٹی ہوئی تھیں، جبڑے کھنچ گئے تھے اور دانت نمایاں ہوگئے تھے، گویا ایک کُتا دوسرے کتے کو بھنبھوڑنے سے پہلے بُری بُری آوازیں نکال رہا ہے۔ ناک سے رینٹ بہہ رہا تھا جو کچھ آستین پر پونچھا اور کچھ نُڑک لیا جاتا تھا، ہُو بُو اور بھُوں بھُوں کے بعد پھر یہ مصرع پڑھتا تھا ع

وہ اک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا

پھر منہ ایک خاص انداز سے پھیلا اور سُکڑا اور گدت کی سی بائیں آواز خارج ہوئی۔ خیر یہ تو فراق صاحب کے "بگڑے ہوئے چہرے"، "بہتی ہوئی ناک"، "گرتی ہوئی رال"، "ناک اور آنکھ کی سُرخی و گندگی" کا ترکی بہ ترکی جواب تھا اور خود اُنھیں کے شعر سے، اب حضرت بیخود کا شعر لیجئے۔ اس میں رونے اور سجدے کرنے کا صرف ذکر ہے، بیان واقعہ ہے، نہ کہ صورت حال، جس شخص کا نشیمن پھونک دیا گیا ہے وہ نشیمن پھونکنے والے کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اے بے خانماں کرنے والے کیوں حال پوچھکر جلے ہوؤں کو اور جلاتا ہے، اب ہماری زندگی یہ رہ گئی ہے کہ کبھی خاکِ نشیمن پر روتے ہیں اور کبھی انتہائے غم و جوشِ محبت میں اس خاک پر سجدے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قائل اُس وقت نہ تو رو رہا ہے نہ سجدے کر رہا ہے، تخیلہ کہنے والے کی تصویر حزن و یاس پیش نظر کرتا ہے نہ کہ رونے اور سجدے کرنے کی جس کو وہ بیان کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شعر پر اعتراض کرتے وقت حضرتِ فراق کو اپنا لڑکپن یاد آگیا اور اُسی کی تصویر کھینچ دی ورنہ شعر میں رال وال کچھ نہیں بہتی۔ علاوہ بریں یہ ضرور نہیں کہ جس وقت خاکِ نشیمن پر روئے اُسی وقت سجدے بھی کرے، خصوصاً جب شاعر نے دونوں حالتوں کے پہلے لفظ کبھی لاکر تفاوت زمانی پیدا کر دیا۔ ایسا نہ بھی ہو تو ہنگام گریہ سجدہ کرنے سے وہ شکل نہیں بن سکتی جو حضرتِ فراق کے ذہن میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فراق صاحب نے کوئی ایسا سجدہ وضع کیا ہو جس میں سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوتی ہیں۔

حضرتِ صفی کے وہ اشعار جن پر حضرتِ فراق نے مشقِ ستم کی ہے یہ ہیں ؎

دیکھئے کیوں؟ کوئی تربت ہوگی آپ کو مفت ندامت ہوگی

~~~~~~

؎

جب کبھی گورِ غریباں میں چراغاں کرنا ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

فرماتے ہیں کہ

"پہلے شعر میں ردیف کی شوخی اور مختصر انداز نے شاعر کو اس امر پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ آخر میں کہہ کیا رہا ہوں، کتنی ذلیل جھلکی لے رہا ہوں، کتنا بازاری طنز اس شعر میں آگیا ہے، کتنی خباثتِ روح کا اظہار کر رہا ہوں۔ دوسرا شعر غنیمت ہے، مگر شمع مزار کا ذکر کرنا بھی روشنی کے ذکر سے نازک ذمہ داری کا کام نہیں ہے۔ احسان کرنا کوئی بہت مستحسن انداز بیان نہیں ہے .... سستے اور اوچھے طریقے سے رقت پیدا کرنے کے یہی خطرات ہیں پھر بھی حضرت بیخود کی مبتذل سینہ کوبی سے جناب صفی کے اشعار لب و لہجہ کے لحاظ سے غنیمت ہیں"

کہنا پڑتا ہے کہ ع

سخن شناس نہٖ دلبرا خطا اینجاست

پہلا شعر ایک نشتر ہے جو دل میں پیرتا چلا جاتا ہے۔ ایک عاشق تھا جو ناشاد و نامراد اس دُنیا سے اُٹھ گیا، قبر پر جانا اور فاتحہ پڑھنا درکنار معشوق نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ غریب کو گور گڑھا کہاں نصیب ہوا۔ اتفاقاً اس معشوق کا اُس طرف گزر ہوتا ہے جہاں اس عاشق کی تربت ہے۔ کششِ جذبِ عشق متوجہ کرتا ہے۔ اس کشتۂ یاس و حرماں کا ایک رازدار مدد جو اُس جگہ موجود ہے (شعر کے الفاظ مرنے والے سے جذبۂ رقابت کے بجائے محبت و مودت کا پتا دیتے ہیں اور یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ شخص معشوق کے ہمراہ تھا)

کہتا ہے ؎

دیکھئے کیوں؛ کوئی تربت ہوگی
آپ کو مفت ندامت ہوگی

اس کہنے سے اُس کا مُدعا دل آزاری نہیں ہے بلکہ لطیف و نازک ترین پیرایہ میں معشوق کے شبہ کو یقین میں بدل دیتا ہے کہ ہاں آپ کے چاہنے والے ہی کی تربت ہے اور اُس کی محبت کی کشش ہے جو تربت کی طرف دیکھنے کو مجبور کر رہی ہے۔ مگر نہ دیکھئے کیونکہ مفت ندامت ہوگی اُس کی زندگی میں ندامت سے جور و تغافل کی تلافی ہو جاتی، اب کیا حاصل، اس اسلوب بیان نے شعر کو درد و سوز و گداز کا مجسمہ بنا دیا۔ مگر لذت یاب ہونے کو وجدان اور ذوقِ سلیم درکار ہے جس سے اکثر لوگ بے بہرہ ہیں۔
~~~~~~

شعر میں ایک دنیائے معنی ہے۔ ممکن ہے کہ جب معشوق کو علم ہو جائے کہ اُس کے کشتۂ وفا کی تربت ہے تو وہ جذبِ محبت جو کارفرما ہے اور تربت پر ایک نظر ڈالنے کو مجبور کر رہا ہے مزید اثر دکھائے۔ آنکھ سے بے اختیار ایک آنسو ٹپک پڑے یا کم از کم مژہ نمناک ہو کر تمام گذشتہ مظالم کا کفارہ ہو جائے،

اگر شعر کے الفاظ اس مطلب کی رہنمونی کرتے ہیں تو خدا جانے خباثت رُوح کا آئینہ شعر ہے یا تنقید۔

دوسرے شعر کے متعلق اتنا ہی ارشاد ہوا ہے کہ احسان کرنا کوئی بہت مستحسن اندازِ بیان نہیں ہے، حالانکہ اسی لفظ نے شعر میں نشتریت پیدا کی اور ظاہر کیا کہ ایسے بیکس و گمنام کی تربت ہے جس کا آشنا و غمخوار نہ جیتے جی تھا نہ مرنے کے بعد ہے۔ ورنہ تربت شکستہ و بوسیدہ نہ ہوتی۔ بربنائے محبت نہیں کہہ سکتے کہ چراغ جلاؤ۔ اگر جلا دوگے تو تمہارا احسان ہوگا —— دورِ حاضر کی ستم ظریفی دیکھئے کہ حضرت فراق کی ہرزہ سرائی کو انتقادِ عالیہ کا خطاب ملتا ہے۔

ینفع الناس

واللہ کہ بے علم و کتب بدتر ہیں وہ لوگ
اسلام کے دائرے سے باہر ہیں وہ لوگ
دنیا میں ہے نفع سے جن کو انکار
از روئے کلامِ پاک کافر ہیں وہ لوگ

(رئیس)

خارج از عقول

عقلوں سے جدا اعتراف کرتا ہوں میں
ذہنِ انساں کو صاف کرتا ہوں میں
کیا مجھکو پکارتا ہے کعبے کی طرف
ہر سانس میں سو طواف کرتا ہوں میں

(جوش)

قطعات

کیفِ زندگی

آج موسم بدل رہا ہے رنگ
دل پہ چھائی ہوئی ہے ایک ترنگ
آخر اس کیفِ زندگی پہ نثار
فصلِ زہد و ریا و نام و ننگ

(اختر انصاری)

قصیدہ گو

ہائے کیا مبتذل نوائی ہے
فن کی کس درجہ جگ ہنسائی ہے
شاعری تیری اے قصیدہ گو!
اصل میں کاسۂ گدائی ہے

(اختر انصاری)

منزلِ مقصود

صادق حسین کنبو

دونوں ایک ساتھ اسکول میں پڑھے، ایک ساتھ ہی کالج میں داخل ہوئے اور ہوسٹل میں ایک ہی کمرہ رہنے کو ملا۔ غرض طالب علمی کا سارا زمانہ دو سچے ساتھیوں کی طرح گذار دیا، ہاں "زندگی" میں داخل ہوئے تو رستے الگ الگ ہو گئے۔ راجکمار پولیس ٹریننگ میں چلا گیا، اوم پرکاش نے قومی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا۔

گردشِ روزگار نے چند ہی سال میں پھر دونوں کو ملا دیا۔ راجکمار اسی قصبہ میں تھانیدار مقرر ہو کر آیا جو پرکاش کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بعد مدت کے دو بچھڑے ہوئے دل ملے تھے، خوب بھینچ بھینچ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے لیکن تقدیر کا متبسم چہرہ کچھ کہتا سنائی دے رہا تھا۔

یہ ڈراما دکھائیگا کیا سین   پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

حسب الحکم راجکمار پہونچا۔ دیکھا کہ اوم پرکاش جلسہ میں کھڑا دھواں دھار تقریر کر رہا ہے، ٹھٹک کر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ تقریر دلچسپ تھی لیکن قابلِ گرفت اور حکومت کی زبان میں، "باغیانہ"۔ اُس کا فرض تھا کہ مجرم کو گرفتار کرے، لیکن مجرم وہاں تھا کون؟ گردن جھکاتا تو پلیٹ فارم سے مجرم کے باغیانہ الفاظ بجلی کی طرح کان میں آتے، لیکن گردن اُٹھاتا تو بچپن کا دوست پرکاش نظر آتا۔ کیسے یقین کرتا کہ اُس کا مجرم پرکاش ہے۔ دل، ضمیر تک انکاری تھے۔

اتنے میں گھرررسے ایک کار آکر رُکی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نیچے اُترے، مجمع کو دیکھا، مُقرر کے باغیانہ کلمات سُنے اور راجکمار کو ایسی نظروں سے دیکھا جو سوال کر رہی تھیں "ایسے الفاظ استعمال کرنے والا ابھی آزاد ہے؟" راجکمار کی نگاہوں نے بھی زبانِ حال سے جواب دیا۔

"آج تعمیلِ حکم مشکل ہے"

حاکم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ خشمگین لہجہ میں حکم دیا: "گرفتار کر لو" راجکمار نے حسبِ عادت قدم اُٹھائے، لیکن نظر اوپر اُٹھی تھی کہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ "گرفتار کر لو! کسے؟ پرکاش کو! کیسے ممکن ہے" حاکم کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی، گونجتی ہوئی آواز میں ڈپٹ کر بولا "میں حکم دیتا ہوں گرفتار کر لو"

راجکمار کے ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے، بدن کا رُواں رُواں باغی ہو رہا تھا، بارے خود پرکاش نے مشکل آسان کر دی، راجکمار کی طرف دیکھا، مسکرایا اور دونوں ہاتھ آگے بڑھا دئے، راجکمار نے آنکھیں بند کر لیں پیٹ کے غلام ہاتھوں نے کانپتے ہوئے تعمیل حکم کی۔ مجرم گرفتار ہو گیا۔ مجمع نے نعرہ لگایا،

"شریمان اوم پرکاش جی کی جے!!"

پرکاش ہنسی خوشی حوالات میں چلا گیا۔ لیکن راجکمار کے لئے گویا قیامت ہی آگئی۔ وہ پاگل سا ہو گیا۔ لوگ تعجب سے سُن رہے تھے کہ تھانیدار صاحب آخر کہہ کیا رہے ہیں "مجرم، مجرم۔ کون ہے مجرم۔ راجکمار۔ راجکمار! دنیا کا سب سے بڑا مجرم۔ پرکاش! ہرگز مجرم نہیں۔ وہ "دوست" ہے، مجرم نہیں۔ وہ بادشاہ ہے، میرے دل کا بادشاہ" اِتنے میں اُس کا نوجوان لڑکا سہما ہوا آیا، باپ

کو دیکھا اور گردن ہلا کر خلافِ اُمید مسکرایا۔ پھر باپ کو گھر میں لے گیا۔

کافی دیر کے بعد راجکمار کے ہوش و حواس قائم ہوئے۔ اُس نے فوراً اپنے کپڑے درست کئے اور ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ گھر والے حیران تھے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ لیکن وہ فوراً حوالات میں پہونچا۔ تھانیدار کو دیکھ کر پہرہ دار نے آہنی دروازہ کھول دیا۔ راجکمار گردن جھکائے اندر داخل ہوا اور دیکھتے ہی پرکاش کے قدموں میں گر پڑا۔ حسبِ عادت پرکاش مسکرایا۔ "ہائیں راجکمار۔ اُٹھو کر بیٹھو بھئی۔ یہ کیا ——— لیکن راجکمار کو یونہی تسکین ہو رہی تھی۔ دنیوی عزّ و جاہ کی بگڑی دل کے بادشاہ کے قدموں کو بوسہ دے رہی تھی۔

پرکاش کے بہت اصرار کے بعد اُس نے سر اٹھایا، اور حوالات کی آہنی سلاخوں کو دیکھ کر بولا۔ "یہ میں نے کیا کیا پرکاش" پرکاش نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اپنا فرض ادا کیا تھانیدار صاحب"۔

"تھانیدار صاحب"! راجکمار نے حیرت سے اُس کے الفاظ دہرائے "تم یہ کیا کہہ رہے ہو پرکاش۔ تم چاہتے ہو کہ میں ابھی اپنے آپ کو شوٹ کرلوں؟"

"نہیں نہیں اتنے غصے کی ضرورت نہیں"۔

"پھر تم نے مجھے تھانیدار صاحب کیوں کہا۔ کیا میں تمہارا دوست راجکمار نہیں ہوں"۔

"ہو تو ضرور" پرکاش مسکرا کر بولا "لے ——— کن، مجھے تم سے ایک درخواست کرنی تھی اس لئے یوں مخاطب ہوا"۔

"مجھ سے! وہ کیا؟ فوراً کہو۔ میں اُسے پورا کرنے کو تیار ہوں چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے"۔

"جان دینے کی ابھی ضرورت نہیں۔ تم نے ایک شخص پر اپنی طرف سے بیجا پابندیاں عاید کر رکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اُٹھالی جائیں"۔

"وہ کون ہے؟"

"میرا بھتیجا انندکمار"۔

"وہ بھتیجا نہیں، تمہارا اپنا بچّہ ہے اور آج سے وہ تمہارے ہی گھر رہے گا"۔

"میرے گھر! قومی خادموں کے گھر یہی ہیں۔ حوالات، جیل۔

"میرا مطلب ہے کہ بھابی کے پاس"۔

"وہ بھی نینی جیل میں دیش کی سیوا کر رہی ہیں"۔

راجکمار نے حیرت سے گردن اُٹھا کر پرکاش کو دیکھا، پھر نظریں نیچی کرلیں۔ پھر دیکھا اور پھر۔ اُس کا ضمیر دونوں کے معیارِ زندگی کا میزان کر رہا تھا۔ لیکن ترازو کا ایک پلڑا زمین پر پڑا خاک چاٹ رہا تھا اور دوسرا آسمانی بلندیوں میں نظر آرہا تھا۔

اگلے ہی دن اُس نے نوجوان انندکمار کو قومی جلسہ کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ حاضرین پُرجوش تالیوں سے اُس کا خیر مقدم کر رہے تھے، جذبات سے لبریز دلوں سے اس کی جے کے نعرے یوں بلند ہو رہے تھے جیسے بچاریوں کے حلقہ میں کوئی دیوتا۔ وہی انندکمار جو ایک کاہل اور ناکارہ مشہور تھا۔ جسے گھر والے کچھ نہ کرسکنے کے طعنے دیا کرتے تھے، آج ایک قومی ہیرو بنا ہوا تھا۔ راجکمار نے یہ سب کچھ تھانیدار کی نگاہ سے نہیں، باپ کی نظر سے دیکھا۔ دل نے مسرت کا ایک فوارہ چھوڑا اور رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اتنے میں صدر نے ایک مختصر تقریر کے بعد روپیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی انندکمار کو نذر کی جو قصبہ کے نوجوانوں نے چندہ کرکے اُس کے خیر مقدم کے لئے جمع کی تھی۔ راجکمار کے دل و دماغ کے لئے یہی نظارہ کیا کم تھا کہ اُس نے دیکھا کہ انندکمار نے وہ تھیلی اُٹھائی۔ اپنے ہم عمروں کا شکریہ ادا کیا اور یہ کہتے ہوئے صدر کو واپس کر دی۔

"میں یہ روپیہ قوم کی سیوا کے لئے وقف کرتا ہوں"۔

آج راجکمار کو معلوم ہوا کہ روپیہ کی حقیقت کیا اور اس کا بہترین مصرف کیا ہے، اس روپیہ کا جس نے اُسے شروع زندگی سے غلام بنا رکھا تھا۔

دوسرے دن ٹھیک سوا دس بجے وہ پولیس کے حاکمِ اعلیٰ کے دفتر میں کھڑا ہوا تھا۔

"تھانیدار، تمہیں اپنے لڑکے کی حرکتوں کی خبر ہے؟"

"جی ہاں، وہ قومی کاموں میں زیادہ حصہ لیتا ہے"۔

"کیا کہتے ہو تھانیدار۔ قومی کاموں میں! یہ بہت بُرا ہے، اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی"۔

"کیوں صاحب؟"

"اس لئے کہ تم پولیس کے آدمی ہو"۔

"تو کیا پولیس کا آدمی اپنی قوم کا آدمی نہیں ہوتا؟"

"اس کے معنی ہیں کہ تم حکومت سے بغاوت کرنا چاہتے ہو!"

"اگر اپنے ملک و قوم سے محبت کرنا بغاوت میں داخل کیا جائے"

"اچھا تو ---------" فقرہ پورا ہونے سے پہلے راجکمار مطلب سمجھ چکا تھا۔ ارادہ اور عمل کی تمام قوتوں کو جمع کرکے اس نے جواب دیا:

"بہت بہتر۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے"

گھر پہونچا تو جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ رہا تھا۔ خیالات تیزی سے چکر کھا رہے تھے، دل کی گہرائیوں میں بے پناہ تلاطم برپا تھا۔ کہ ایک دفعہ ہی نگاہیں انند کمار کے کمرے کی کھڑکی پر پڑیں۔ اندر دیکھا تو قوم کا نوجوان خادم ہتھیلی پر سر رکھے حسرت کے ساتھ دیوار میں لگے ہوئے ایک چوکٹے کو دیکھ رہا تھا جس میں بھارت ماتا غلامی کی سخت زنجیروں میں گرفتار دکھائی گئی تھیں۔ راجکمار کا جی بھر آیا، چاہتا تھا کہ کواڑ کھول کر اندر داخل ہو کہ انند کمار نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چھت کی طرف دیکھا اور انتہائی حسرتناک لہجہ میں بولا "اب کیا ہوگا۔ پرمیشور!" راجکمار گھبرا سا گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ اس کی عدم موجودگی میں کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے۔ ایک دم کواڑ کھول کر اندر پہونچا اور پوچھا۔

"کیوں کیا ہوا انند کمار؟" انند کمار باپ کی خلافِ اُمید آمد سے چونک پڑا لیکن فوراً سنبھل کر بولا "کچھ نہیں پتاجی!"

"آخر کچھ تو انند کمار جلدی بتاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں"

"ٹاؤن کمیٹی کا خیال پریشان کر رہا ہے"

"کیوں اسے کیا ہوا۔ کیا پولیس والوں نے کچھ ------؟"

"نہیں پتاجی، سوال یہ ہے کہ بغیر سردھڑ کے کیسے کام چلے گا۔ یوں تو ہم نوجوان بہت سے ہیں مگر بڑوں میں کوئی ایسا پڑھا لکھا نہیں جو ہمارا سرپرست بنے۔ پرکاش جی تھے وہ ---------"

راجکمار کا دل بھر آیا، قوتِ ارادی کے ساتھ گردن بلند کی اور بولے، "فکر نہ کرو اُن کی جگہ میں موجود ہوں"

انند کمار نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھا۔ راجکمار نے مسکرا کر اسے گلے سے لگا لیا۔

قوم کا نام بھی لے دینا ایک پولیس والے کی گرفتاری کے لئے کافی ہو چہ جائیکہ پوری ایک پُرجوش تقریر۔ راجکمار اگلے ہی دن گرفتار ہو گئے۔ وہی تھانہ تھا، وہی عملہ لیکن راجکمار کی دنیا بدل چکی تھی، کبھی وہ اس حوالات اور اس میں بند ہونے والوں کو انتہائی حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، لیکن آج اُسی کے آہنی دروازے میں اس شان اور تمکنت سے داخل ہو رہے تھے، جیسے دنیا کی پُرخطر راہگذر میں یہی اُن کی منزلِ مقصود تھی۔

ہیں نبض ہمیں سب کی [illegible] دینے والے
ہے نبض کسی [illegible] دینے والے
معراج [illegible] شمع کو روشن رکھنے والے
اللہ تری [illegible] دینے والے
اے [illegible] دینے والے
(رجنیش)

یہ دید یہ پرواز، اللہ اللہ
[illegible] کا یہ طرفہ تماشا، اللہ اللہ
[illegible] کھا بیٹھا حسنؔ
سیکھے نہ ترا فریب
دنیا ترا اطوار، اللہ اللہ
(رجنیش)

خطِ رفتار!

دیکھ چشمِ غور سے راہوں میں قدموں کے نشاں	یہ لکیریں ہیں کہ جنبش میں ہے موجِ کارواں
بعض نقشِ پا ہیں کچھ سمٹے ہوئے سے مضمحل	جن سے ظاہر ہے کہ تھے پژمردہ ان لوگوں کے دل
اور کچھ اُبھرے نظر آتے ہیں فرشِ خاک پر	لے رہا ہے جن میں انگڑائی غرورِ مال و زر!
کچھ نشاں ہیں ہلکے ہلکے دلفریب و دل نشیں	جن سے ثابت ہے کہ یہ رہرو تھے شاید نازنیں
کچھ نشاں ایسے بھی ہیں پامالِ بارِ آرزو	جن کے ہر خط میں پر افشاں ہے تمنّا کا لہو
کچھ نشاں ایسے ہیں جیسے خون سارا جم گیا	فرطِ ناکامی سے دل دھڑکا، دھڑک کر رہ گیا
بعض میں آمادگی ہے مسکرانے کے لئے	اور کچھ بیچین ہیں آنسو بہانے کے لئے
کچھ ہیں یوں زیر و زبر، نغمے کے جیسے زیر و بم	جن سے ثابت ہے کہ یہ شاعر کے ہیں نقشِ قدم
اے مسافر دیکھ شانِ پیچ و تابِ زندگی	یہ نشانِ پا ہیں اوراقِ کتابِ زندگی
حرف ہیں ذروں کے، دفتر راہِ ناہموار کا	لکھ گیا ہے خاک پر کیا کیا قلم رفتار کا

دیدۂ احساس میں تسبیح کے دانے ہیں یہ
بزم گاہِ جادۂ ہستی کے افسانے ہیں یہ

(جوش)

رفتارِ وقت!

نزولِ اجلال جواہر لال!

۱۰ اکتوبر کی صبح کو پنڈت جواہر لال نہرو اک کوکبِ امید و نوید کی طرح پایۂ تخت دہلی کے افقِ اسٹیشن پر طلوع ہوئے! ع

خوش آمدی اے نگارِ سرمست!

پنڈت جواہر لال کے ورود و مسعود، کانگریس کے پریزیڈنٹوں کے عام دوروں سے کچھ مختلف واقع ہوئے ہیں! ملک کی سیاسیات کی "اعلیٰ کمان" کے دو سالہ حامل کی حیثیت سے اُن کی مساعیٔ حسنہ اور جذباتِ جلیلہ دو بنابت درجہ اہم و قابلِ ذکر طغرا ہائے امتیاز رکھتی ہیں۔ ایک اُن کی مسلسل و غیر منقطع گردش چہار دانگِ ہند میں بلکہ بیرونِ ہند میں بھی، اور دوسری اُنکا مستقل و غیر متزلزل انعطافِ توجہ ہندوستانی مسئلہ سیاسی کے نمایاں ترین خط و خال کی طرف! یہ دونوں چیزیں متواتر دو سال سے اہلِ ملک کے سامنے ہیں۔ اس لئے اُن کی جدت و ندرت اور قدر و قیمت میں ممکن ہے وہ تازگی باقی نہ رہی ہو جو اُن کے آغاز و اجرا کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن یہ تو عوام کالانعام کی اعجوبہ پسندی کا محض اک خمار ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ وطنی سیاست میں پنڈت نہرو کے داخل کئے ہوئے یہ مذکورۂ بالا ہر دو عناصر اک دائم و قائم اہمیت و معنویت رکھتے ہیں! کسی معرکۂ حیات میں فاتح کار چیزیں۔ زیادہ "نہیں ہوا کرتیں، وہ صرف اپنی ماہیت میں۔ نادر ہوا کرتی ہیں!

ادارہ

جہانبانی سے ہے دُشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اِس عقابِ نظری سے جب عنادلِ نازک دِل کی آنکھ مسلح ہو جاتی ہے تو اُس کی ایک ایک نگاہِ غلط انداز، طوفانِ فروش و صاعقہ پیا و حشر خیز بن جاتی ہے! ؎

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

جواہر لال کو اپنے کسی آنی لمحۂ انکشاف میں ہندوستان کی مہم آزادی کے متعلق ایسی انقلاب انگیز عمیق و ہمہ گیر ژرف نگاہی و بالغ نظری کی رسائی حاصل ہو چکی ہے! ؎

می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

چنانچہ اب اس جواں سال و جواں بخت میرِ کارواں کے لئے مطلع صاف ہے، حقیقۃ الحقائق اُس کے زیرِ نظر ہے، اور منزلِ مقصود زیرِ قدم! اور معلوم ہے کہ ع

ترا علاج "نظر" کے سوا کچھ اور نہیں!

پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادتِ اعلیٰ کے یہ فیصلہ کن عناصر کیا ہیں؟

مجملاً تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ؎

چہ باید مرد را؟ طبع بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

لیکن اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اُنھوں نے کانگریس کی مسند پر متمکن ہوتے ہی بلکہ غالباً اُس سے بہت پہلے سے ہی، دیکھ لیا تھا کہ وطن کے جہاد حریت کے محاذ میں چند رُخنے اور صفوفِ مجاہدین میں چند خلے ہیں! نیز اِس جلوسِ یلغار کی آخری جائے نزول میں بھی کافی پستیاں ہیں! بلاشبہ وہ دیکھ چکا تھا کہ مُلک کو اتحاد کی ضرورت ہے، رُفقائے جنگ کو ایک ہی پرچم کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دینی بھی ضروری ہے، ملک کے بعض مخصوص مسائل اور عقدہ ہائے مشکل بھی ہیں، لیکن.......... نہ یہ وہ ہیں جو سمجھے جاتے ہیں۔ اور نہ کشودِ کار کی وہ راہیں ہیں، جن پر سالکانِ طریقت عرصے سے سرگرداں ہو رہے ہیں! اُس نے کہا کہ یقیناً ہم مسلمانوں کو پیامِ ائتلاف دیں گے، لیکن مُسلم سوادِ اعظم کو، نہ کہ اُن کے نام نہاد، خود ساختہ زعیموں کو! اس جدید نسخے کی تجویز کے تحت انڈین نیشنل کانگریس کے شعبہ "رابطۂ عوامِ مسلمین" کا قیام عمل میں آیا! پھر مُلک نے دیکھا کہ "اس صحیح سمت میں اِس صحیح قدم" نے کتنے کہنہ مشق کجَروؤں کے قدم متزلزل کر دیے! مولینا شوکت علی کے لیے اب نہ تبنّی کا "قصرِ خلافت" نہ اک حصنِ حصین ہے، نہ دہلی کی جامع مسجد اک محفوظ منبرِ خطابت اور حضرت امارت پناہ جناب جناح کی ہیٹ نما "دستارِ امامت" تو اب اس درجہ خطرے میں نظر آتی ہے کہ اُس کے سر پر قائم رکھنے کے لئے اُنھیں ابھی حال میں بمقام لکھنؤ "علمِ اسلام" اپنے فرنگی ہئیت فرقِ مُبارک پر لہرانا پڑا! ع

دریغا آبروئے دیر گر غالب مسلمان شد!

مولینا شوکت علی کا مجلسی وقار اِس وقت ماشاء اللہ جس نقطۂ "نصف النہار" پر ہے اُس کی پیمائش آپ یوں کیجئے کہ پنڈت جواہرلال کی اِسی زیرِ ذکر آمدِ شد کی شام کو، جب کہ وہ فرانٹیر میل سے پنجاب کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو مولینائے ممدوح کے فرزندِ اکبر مسٹر زاہد علی، مشایعت کناں ہجوم کے حلقے کو چیر کر دہلی کے مہمانِ محترم، کانگریس پریزیڈنٹ، کی خدمت میں "اپنی ہی قوتِ بازو سے" باریاب ہو گئے اور اُن کے روبرو یہ "دفعِ دخلِ مقدر" کیا کہ، "آپ کو یہ گمان نہ ہونا چاہیئے کہ چونکہ میرے والد، مولینا شوکت علی مسلم لیگ کے ارکانِ رکین میں سے ہیں، اس لیے میں بھی "لیگی" ہوں! ہرگز نہیں! میں کانگریسی ہوں، اور بجز کانگریسی کے کچھ ہو نہیں سکتا!"

یہ ہے المناک انجام مُسلم لیگ کی سلطنت کے شاہ و وزیر کی "آل انڈیا بے تاج کی بادشاہی" کے اُس عزمِ عظیم کا، جس کا پرچمِ افتتاح ابھی ماضیٔ قریب میں بلند کیا گیا تھا! ؎

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو "یوسفِ بے کارواں" ہو کر!

بجز جواہرلال کے شاطرانہ فنِ جنگ کے یہ کس چیز کا کرشمہ ہے۔ جس نے اِن تکلیف دہ، خلل انداز، فرسودہ و متحجر (fossilised) لیڈروں کی سنگین کمینگاہوں کو اک "زیرِ زمین سُرنگ" کے ذریعے مسمار کر دیا! ہمارا رُوئے سخن "مُسلم ماس کانٹیکٹ" کے حربے کی طرف ہے!

مسلم لیگ کی متقابل مثیل ——— ہندو مہا سبھا ——— کا کریاکرم، کانگریس اپنی گزشتہ انتخاباتِ عامہ والی مہم کی پہلی ضرب ہی میں کر چکی ہے، جب کہ بھارت کی ہندو جاتی کے اِن نیتاؤں اور "بھگتوں" کے کلیم جیسی نمائندے مجالسِ قانون ساز کے لئے منتخب ہو سکے! ——— جن میں سے پورے دس صرف "زندہ دلانِ پنجاب" سے تھے!

اور پھر یہ وسیع تر قومی پیمانے پر "رابطۂ عوامِ ہند" ہی کی زنجیرِ آہنی تھی، جس نے برطانوی حکومتِ ہند کے "دیوِ استبداد" کو بالآخر ایسا پابزنجیر کر ڈالا کہ آج ہندوستان کے پورے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں "کوس لمن الملک الیوم" بجا رہی ہیں، اور "ڈکٹیٹر گورنر" مجالِ دم زدن نہیں رکھتے!

جواہرلال نے اپنی اک خیر مقدمی نظم کے اس مصرعے پر کہ ع

تمہارے نام کا سکہ رواں ہندوستاں میں ہو!

پُرلطف سخن سنجی کی! آپ نے کہا کہ "سکے کی روانی" کے کلمات نے میرا خیال شاہوں اور شاہنشاہوں کے زرّیں ماضی کی طرف منتقل کر دیا! خدا نہ کرے کہ ملوکیت و قیصریت کی یہ سعادت کوئی "نشاۃِ ثانیہ" حاصل کرے! نسلِ آدم اُن سے اِتنی زیرِ بارِ منت ہو چکی ہے کہ اُنھیں مزید تکلیفِ التفات دینے کا کوئی میلان اپنے سینے میں نہیں پاتی! ؎

اِتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا!

پایۂ تخت میں اپنے ورود مسعود کی ابتدائی ترین ساعتوں میں پنڈت جی کا دلّی کے "سوختہ بخت" بیتھر بھوڑدں، کی بستی میں قدم رنجہ فرما ہونا اُن کی دردآشنا فطرت کی مخصوص ادائے دلبری تھی :-

دلِ شکستہ دراں کوچہ میکنند درست
چنانکہ خود نشاسی کہ از کجا بشکست

طبیہ کالج میں پنڈت جواہر لال جی اک آنی تشریف آوری اور مختصر حرفِ زنی اس صدائے غفلت شکن کی یادگار رہی کہ "آپ (کلمہ گویانِ طب یونانی و آیورویدیہ) کو اپنی عصبیت اس امر کا مرتکب نہ بنائے کہ یورپین سیڈیسن کی خدمات و معجزات کے آپ منکر ہو جائیں! یونانی اور آیورویدیہ اپنی کسمپرسی کے لئے اپنی ہی بے مائیگی اور جمود پرستی کی مرہونِ منت ہیں۔

(ا۔ا۔خ)

قادیان میں تحویلِ قبلہ!

مرزا البشیر الدین محمود ——— "ہین پورِ نبوتِ قادیان"! ———

وامیرِ جماعتِ احمدیان، "راسخ الاعتقاد" نے اوائلِ اکتوبر کی اک تاریخِ سعید کو، باصطلاحِ صحافتِ جدیدہ "اک درجۂ اوّل کا استعجاب برپا کیا" جب کہ آپ نے "قادیان دار الامان" سے بسواریٔ "خرِ دجال" لاہور میں نزولِ اجلال فرمایا، اور اپنے ہزارہا متبعین کے حلقۂ و ہجوم میں، اور کثیر التعداد تماشائیانِ "غیر احمدیان" کے متحیر نظارے کے درمیان اک انقلاب انگیز خطبہ ارشاد فرمایا جس کے دوران میں اعلان کیا کہ میں مع اپنی جماعت کے، بطیبِ خاطر، انڈین نیشنل کانگریس کے مسلکِ سیاست و مشربِ حریت کو قبول کرتا ہوں، اور اپنے تمام مسلم و غیر مسلم سامعین و مخاطبین کو بھی یہی دعوتِ عام دیتا ہوں! .... اس جدید تحریک کی تشکیل و تنظیم کے لئے "آل انڈیا نیشنل لیگ" کے عنوانِ جلی سے اک وسیع "ہندوستان گیر" ادارے کا افتتاح عمل میں آرہا ہے، جو اس نئے اقدام کو عملی جامہ پہنائیگا، اور "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کے متوازی اک زبردست "رفیقِ جہاد" بہم پہونچائے گا! جب صلائے عامِ صاحبزادہ صاحب اِس "آل انڈیا نیشنل لیگ" کی رُکنیت کا دروازہ بلا امتیازِ مذہب و ملت، فرقہ و جماعت، اُن تمام اہلِ ہند کے لئے کھُلا رہے گا جو بحالتِ موجودہ کانگریس کی تنظیم سے منسلک نہیں ہیں، لیکن ملک و وطن کے سیاسی و تمدنی مستقبل کی تعمیر میں اپنا فرض اور حق دونوں حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اپنی تقدیر کا پانسا ڈالنے میں اب کسی مزید تاخیر و تذبذب کو روا رکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔

مرزا البشیر الدین محمود نے کانگریس کی خدمات کو اک خراجِ خوشنودیٔ مزاج بھی پیش کیا اور کانگریس کی حریف دوسری سیاسی جماعتوں کی روِش پر نقد و جرح بھی فرمائی! یادش بخیر مسلم لیگ اس "ذکرِ جمیل" کی خاص طور پر موضوع بنی! اُس کی بیمائیگی اور فضول کاری اُلم نشرح کی گئی، اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کانگریس کے خلاف رقیبانہ و محتسبانہ تنظیموں کے قیام کو غیر ضروری خلط مبحث قرار دیا گیا۔ اِس دلیل کی بنیاد پر کہ خود کانگریسی نظام اِن "ضعفاء فی الارض" کا متولی ہے۔

خلیفۂ قادیان کی اس "ڈرامائی" لب کشائی کی ماہیت اور نیت کا جائزہ غالباً رائے عامہ کا بیتابانہ مطالبہ ہوگا! پہلے یہ سُن لیجئے۔ ——— یا اُسے اپنے حافظے میں تازہ کر لیجئے! ——— کہ مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب صدر مجلسِ احرار ہند نے مرزا محمود کے اس اعلان و اقدام پر کیا بیان شائع فرمایا ہے،

اِس ماجرے کی پوری بوالعجبی اور صاحبزادہ صاحب کی ساری مظہر العجائبی کو مع اُس کے تمام غیر متوقع تغیرات کے امکانات کے تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ جرأت بھی محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہم قادیان کے اِس نسخ شریعۃ کی "تاویل" کر سکتے ہیں! پھر یہ ہماری کوئی دُور کی کوڑی بھی نہ سمجھی جانی چاہئے! ہمارے خیال میں یہ ایک "تل اوٹ پہاڑ" والی نظیر ہے! قادیانی نبوت، بقول اقبال کے حقیقۃً اک سیاسی فتنے کا ظہور تھی، جس کا سرچشمۂ الہام عرش و کرسی نہ تھے، شملہ و لندن تھے! اور جس کے پیامبر جبریلِ امین نہ تھے، بلکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے دسیسہ کار برطانوی افسر تھے! جس کی غایت الغایات نجاتِ اُخروی نہ تھی، "فلاحِ دنیوی" تھی! جس کا نصب العین مسلمانانِ ہند کو از سرِ نو "عباد اللہ" بنانا نہ تھا، برٹش راج کی "وفادار رعایا" کی شکل میں اُنھیں ڈھال دینا تھا! .... جس رسالت و شریعت کا سارا "الہامی پس منظر" یہ رہا ہو، اُس کے ہاں "پیر کے شجرے" کا جزوی یا کُلّی نسخ و مسخ اک "بدعتِ حسنۂ عظیمہ" ہونا چاہئے! ایسے سیاسی ادیان اصولاً ارضی و مادی اغراض کے ساتھ "پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے" ہوا کرتے ہیں! پس اوّل الذکر کے اندر انتقالِ اقتدار کا کوئی حقیقی انقلاب معاً آخر الذکر کی صفوف میں

اک روحانی محاذ کی تبدیلی کا پیش خیمہ بن جایا کرتا ہے! اب یہ اک رازِ فاش ہے کہ برِاعظمِ ہند کی سرزمین اک صف اول کے سیاسی انقلاب کی "مہبط" بن رہی ہے، پس "رندِ ہزار شیوہ" کو "طاعتِ حق" سے کیا گریز ہو سکتا ہے؟!

تاہم سوال یہ ہے کہ "صنم" کانگریس اپنی "محرابِ سجدہ" میں اک "ناصیۂ مشترک" کو قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہوگا؟!

بلاشبہ "پیرِ مغان" کانگریس کے سامنے قادیان کے "نومرید" کا (بروایتِ مولٰنا حبیب الرحمٰن احراری) "پنجاہ سالہ اعمال نامہ" موجود ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ کانگریس شاید غلطی کرے گی، اگر "توحید فی الایمان" کی شرط پر ضرورت سے زیادہ زور دے گی: خود سابقہ "خدائے قادیان" کو بھی یہ "مقام محمود" نصیب نہ تھا؛ وہاں بھی "طاعت میں مئے و انگبین کی لاگ" تھی! یہاں بھی "حلوے مانڈے کا ڈھنگ" ہے! اگر اول الذکر چیز سابقہ تعلق کو "اخلاص فی الدین" بخش سکتی تھی، تو آخر الذکر مواد سے بھی اس جنس کی تخلیق کیوں نہیں ہو سکتی؟! —— ہمارا خیال ہے کہ اپنی قوم، اپنی مرزبوم، آزادی و سربلندی کا فطری مذاقِ انسانی، اور اس دوسرے سودے میں بمراحل بہتر "فتوحِ روح" کے اسباب، ان "نو واردانِ کاشیٔ کانگریس" کے قلوب میں نئے مسلک کے لئے بہتر "شرحِ صدر" کے محرکات بہم پہنچائیں گے!!

تاہم ہمارا باادب مشورہ ہے کہ ابھی اک مختصر مدت تک اک "دورِ عبوری" کو تسلیم کرنا چاہیئے! اس درمیانی وقفے میں ہم ان "يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا" کا خیر مقدم تو پوری ہمت افزائی سے کریں گے، لیکن اگر ان مہربانوں نے اپنا رعب زیادہ جمایا تو ہم چپکے سے ان کے کان میں اتنا عرض کریں گے، کہ "لَمْ تُؤْمِنُوا، بَلْ تُسْلِمُوا!!" —— بہر حال ع

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی بازآ!!

(ا۔ ا۔ خ)

یوروپ!

فرانس نے اپنی شکست رگی سے، اور انگلستان نے اپنی مخصوص سرد مہری سے، اسپین کو، حبش کے بعد، "ہنگِ ایطالیہ" مسولینی، کا صید زبوں بنتے دیکھنا گوارا کیا، لیکن برِاعظم کی دو سرخیل سلطنتوں کی یہ مہیب فرض فراموشی اپنے نتائج کے دوسرے ہی قدم پر خود انہی کے لئے اک خطرناک کیفرِ کردار بنگئی!

ہمارا روئے سخن اس حقیقت کی طرف ہے کہ یوروپ کے بزم بحر میں اٹلی و جرمنی کو اک دورِ ہیبت انگیزی برپا کر دینے کا "لیسنس" ملنے کے بعد انہوں نے مہذب دنیا کے اس گوشے کو اپنی بے پناہ ترکتاز کی اک مستقل جولانگاہ ہی بنا لیا، جس کا سنگین ترین نیز آخریں یہ ہے کہ بحر الروم اب اٹلی اور جرمنی کی بحری قزاقی کی اک آسان "بازیگاہ" بن گیا ہے!! فرانس اور بالخصوص انگلستان کے لئے یہ موت و حیات کا اک مسئلہ ہو جانے والا ہے!

بحر الروم ان دونوں "عالمگیر قیصری نظاموں" میں بمنزلہ "شہ رگ" کے ہے، جو اگر مسولینی و ہٹلر کے "تحت البحروں" کی پوری زد میں آجائے تو شاید قبل اس کے کہ ہسپانوی جمہوریہ، اٹلی و جرمنی کی شکار بنے، فرانس و برطانیہ کے "پیکرِ خیالانِ قیصریت" مفلوج و پا بزنجیر ہو کر رہ جائیں گے!!

گزشتہ ماہ کے یورپی شطرنجِ سیاست کی لبساط کا یہی نقشہ تھا کہ اسے دیکھ کر "ستیاگرہ کے فرنگستانی بھگت" —— انگلستان! —— کے "صبرِ ایوب" نے بھی جواب دیدیا! فرانس بھی حسبِ معمول لرزاں و ترساں اپنے اسی "اخی طریقت" کے پہلو میں موجود تھا! اب "نیان کانفرنس" وہ محفلِ صلح و آشتی تھی، جس پر اسپین و بحر الروم کے "فاسستی دنازی ترکانِ خوانِ یغما" کو دعوت دی گئی! "عقابِ رذمہ" بھلا اس دامِ زرلم میں کب آنے والا تھا! نتیجہ یہ ہوا کہ "انجمنِ نیان" اک "مردہ نو مولود" ثابت ہوئی! تاہم انگلستان کے پاس دوسرا افسون "غیر جنبہ داری کمیٹی" کا تھا، جس میں مسولینی بخوشی آگیا! یقیناً اس باہمی اتفاق و اجتماع کا حشر بھی "نشستند و گفتند و برخاستند" ہی ہونے والا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انگلستان اب اپنی جانبری کا یہ آخری ممکن موقع و مہلت سمجھ چکا ہے! مسٹر ایڈن، برطانوی وزیرِ خارجہ، کا یہ اعلان کہ "اگر اس مجوزہ گفت و شنید مصالحت کا سقوط یا جمود ظہور میں آیا تو قضیۂ ہسپانیہ کے معاملے میں متعلقہ حکومتیں اپنی اپنی آزادیٔ عمل کو مباح سمجھیں گی!" بڑا معنی خیز اور خطرات سے لبریز اک انتباہ ہے! —— اس کے معنی کم از کم اسپین کے اکھاڑے میں اٹلی، جرمنی، اور روس کی کھلی، آر پار زور آزمائی کے ہیں: اس معرکۂ بیگانہ اور یورپ کے اک "بین البراعظمی" محاربۂ عظیم میں برائے نام ہی خلا یا زمانی وقفہ ہوگا! انگلستان، مسٹر ایڈن کی زبانی سے، جب اس عمومیت پذیرِ "آتش زدگی" کا خیر مقدم کر رہا ہے کہ یہ امر

اک نحوۂ مرتبہ ہے کہ وہ خود بھی اِس خونی غسل کے "نہان" میں "اشنان" کرنے کی نیت باندھ چکا ہے! برطانیہ کو اپنے سابقۂ طویل و بیہودہ تجربے کے بعد اب یہ شرح صدر حاصل ہو چکا ہے کہ یورپ کے اُفق پر عرصے سے جنگ کا جو ابرِ غلیظ "چھایا ہوا ہے وہ غالباً اک لمحۂ" برقِ شمشیر ہی سے چھٹیگا! مسٹر ایڈن کی حوصلہ مندی اک نعرۂ تحسین کی مستحق بنی جب کہ اُنھوں نے اسی زیرِ ذکر موقعے پر اِس ترکی بہ ترکی انداز کے آغاز کرنے کا اعلان کیا کہ "اگر ہمیں آئینِ جمہوریت کا قرار واقعی تحفظ کرنا ہے تو ہمیں بھی اُس کے لئے "تیغوں کا وہی سایہ" بہم پہنچانا پڑے گا جو دوسرے مذاہبِ سیاست "کے علمبردار اپنی طرف سے قبل ازیں بہم پہنچا چکے ہیں!" ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر!

ماضی قریب میں برطانیہ کی پالیسی اِن اُمور میں جیسی مذبذب رہی ہے وہ ناظرینِ سیاسیاتِ عالم کی اِس تشنگیٔ نظر کی حسرت رکھتی تھی کہ ع

معشوقیٔ و بیہودہ سلگی طرفہ بلا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ انگلستان "بین الیوروپی توازنِ طاقت" میں مدت سے اک مرکزِ ثقل بنا رہا ہے، پس جب وہ متزلزل ہوا تو لامحالہ اک "بین الاقوامی زلزلۃ الارض" وقوع میں آنا شروع ہوا! اب قبل اس کے کہ یورپ میں انگلستان کی "حکمرانی" کی چوپال منہدم ہو وہ اپنی "موروثی دخیل کاری" کے قیام کے لئے ظاہر حریفوں پر اک ضرب کاری لگانا چاہتا ہے! پھر چاہے "تختِ سلطنت" ہو یا "تختۂ تابوت"!! ع

ہو چکے حشر کہیں قصہ ہو یکسو اپنا!

(ا۔ا۔غ)

اشارۂ مشیّت!

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا
کہ ہر نظام کے ہمراہ ابتری بھی رہے

موحدوں کو رہے افتخارِ بت شکنی
برہمنوں کے لئے اذنِ آذری بھی رہے

طلسمِ کوثر و تسنیم بھی ہو باطل
شرابِ ناب کی موجِ فسونگری بھی رہے

حدیثِ طاعت و آیاتِ حق کے دوش بدوش
زمیں پہ کفر و بغاوت کی شاعری بھی رہے

فسوں طرازیٔ واللیل کے تقابل کو
کرشمہ سازیٔ گیسوئے دلبری بھی رہے

شعارِ عجز و سرِ انکسار کے ہمراہ
سرشتِ حضرتِ انساں میں خودسری بھی رہے

مذاقِ بندگی و ذوقِ سجدہ کے باوصف
مزاجِ آدمِ خاکی میں داوری بھی رہے

غرضکہ حکمِ مشیت یہ ہے کہ دنیا میں
پیمبری بھی رہے اور کافری بھی رہے

جوشؔ

نقد و نظر!

ادارہ

(۱) عصامی نامہ } عام کتابی تقطیع، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ و کتابت اعلیٰ، طباعت بلاک کی، شائع کردہ اردو یونیورسٹیہ مدراس

سید یوشع صاحب بی اے (علیگ) حیدر آبادی، جونیر لیکچرار فارسی، مدراس یونیورسٹی، کا یہ اک منظوم "خراج تحسین" ہے منظومہ "فتوح السلاطین" کے لئے، جو اک فارسی جنگنامہ ہے اسلامی فتح ہند کا، اور جس کا مصنف عصامی ہے!

فتوح السلاطین اک عظیم رزمیہ ہے جو کم و بیش چھ صدیوں سے اک "مہر زدہ کتاب" کی حیثیت سے رہی ہے! عصامی کے پورے نام کا سراغ نہ لگ سکا، جو کچھ حالات و واقعات دستیاب ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں۔

عصامی بمقام دہلی ۷۱۱ھ ۱۳۱۰ء میں پیدا ہوا! ۔ اُس کے مورثانِ اعلیٰ میں سے ایک شخص نعمان بن منذر کا حاجب رہ چکا ہے! عصامی کے اجداد میں سے ایک بزرگ، فخر الملک، آخری خلفائے عباسیہ کے اک وزیر تھے، پھر اسلامی ہندوستان میں منتقل ہو کر وہ سلطان التمش کے دربار میں اسی منصب عالی پر فائز ہوئے! عصامی کے دادا، عز الدین عصامی، عہد بلبن کے اک سپہ سالار تھے، سلطان محمد تغلق کے ڈکٹیٹرانہ فرمانِ انتقالِ پایۂ تخت از دہلی بہ دیوگری کے ہنگامۂ حشر و نشر میں یہ بوڑھا نود سالہ سر عسکر اول منزل ہی پر جاں بحق ہو گیا! عصامی، غالباً حالتِ یتیمی میں، اور ۱۶ سال کی کمسنی میں، افتاں و خیزاں، دولت آباد پہنچا! اور چار و ناچار وہاں توطن گزیں ہو گیا!

۲۴ سال تک عصامی سلطان تغلق کی جنون سامانیوں اور شہر آشوبیوں کا خون در جگر عینی شاہد بنا رہا۔ یہاں تک کہ ۷۴۵ھ ۱۳۴۴ء میں ان مناظر و حوادث سے برداشتہ خاطر ہو کر مکۂ معظمہ کے "بلداً آمناً" کو ہجرت کر گیا! عصامی چونکہ زنگ تعلق سے قطعاً آزاد اک غیر متاہل زندگی بسر کرتا تھا، اس لئے اس کے لئے ترکِ وطن کا یہ طویل انقلابی اقدام چنداں پُر ابتلا نہ ثابت ہوا، لیکن دکن و ہند کو خیر باد کہتے ہوئے وہ اپنی اک زندۂ جاوید نشانی اس سرزمین میں چھوڑ گیا! ہمارا مشار الیہ یہی "ہندوستانی شاہنامہ" ——— فتوح السلاطین ——— ہے! لیکن افسوس ہے کہ عصامی کے پورے دو دیوان دولت آباد کی تاراجی کی نذر ہوئے!

قاضی القضاۃ، بہاء الدین دولت آبادی، نے عصامی کو سلطان علاء الدین حسن بہمنی (۷۴۸ھ-۱۳۴۷ء) بانیٔ دولتِ بہمنیہ، کے دربار میں پیش کیا، اور سب کی مشترک تجویز پر عصامی کے ہاتھوں، ہندوستان کی اسلامی فتح (از محمود غزنوی تا حسن بہمنی!) کا یہ جنگنامہ لکھا جانا شروع ہوا، جو ۲۷ رمضان المبارک ۷۵۰ھ کو افتتاح پذیر ہو کر ۵ ماہ ۹ روز میں تمت بالخیر کو پہنچا! رزمیۂ مذکور بارہ ہزار ابیات پر مشتمل ہے!

یہ مثنوی نہایت فصیح و سلیس فارسی میں لکھی گئی ہے۔ شاعرانہ و مورخانہ ہر دو اعتبار سے وہ اک ممتاز پارۂ ادب ہے! عصامی اپنی تاریخی روایت و بیان میں جا بجا اپنے ذاتی تجربات اور اپنے داخلی جذبات کی طرف بھی اشارے کرتا جاتا ہے، اور اس طرح قیمتی عبرت و انتباہ کے روشن شرارے بکھیرتا جاتا ہے

"فتوح السلاطین" اپنے پورے متن میں "ایڈٹ" ہو کر عنقریب مدراس

یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والی ہے! سید یوشع صاحب کی یہ "ریسرچ" نہایت نادر و قابلِ داد ہے۔ (ا۔ا۔غ)

(۲) ہدیۂ اخلاص بحضرتِ اقبالؔ

از محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھی مع مختصر تعارف از جناب عبد اللطیف صاحب اعظمی، رُکن مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر۔ اعظم گڈھ۔ تقریباً جیبی تقطیع۔ ضخامت ۴۴ صفحات، قیمت ۲؍ بہ پتۂ بالا!

جناب محمد یحییٰ صاحب نے حضرتِ اقبال پر یہ منظوم تنقید ۱۹۳۳ء میں لکھی تھی، جو سال مذکور ہی کے اختتامی مہینے میں رسالۂ جامعہ دہلی میں شائع بھی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناقدِ موصوف کا یہ کوئی آنی و فانی لمحۂ استقامت و بغاوت تھا، جس کی طوفانی آمد و شد کے بعد وہ اس اُفتادِ بد کے خمیازہ کش بنے ع

کہ زود آخر شود ایں نشۂ و من در خمار اُفتم!

چنانچہ اس "خطاب بہ شاعرِ حکیمِ ہند" کے بعد اُس کا "کفارہ" (بالفاظ اعظمی صاحب!) وہ اک دوسری نظم ۔۔۔ "شاعرِ مشرق اور فلسفۂ حیاتِ ملی" (داخل کتابچۂ زیر نقد، بطور ضمیمہ!) ۔۔۔ کی تسوید سے فرماتے ہیں! ہم اس توبۂ و انابت کی دادِ مبارکباد بجز اُس کے کس طرح دے سکتے ہیں، کہ ؎

دھوکے میں مر گیا جو نہ مردِ ہنر وہ تھا
عشقِ ہنر و پیشۂ طلبگار مرد تھا!

"خطاب بہ شاعرِ حکیمِ ہند" کلیم کے مقالہ نگار المتخلص بہ "کشاف" (محرر مضمونِ "اقبال و پیامِ اقبال" در جون جولائی مشترک نمبر کلیم) کا اچھا ہمصفیر ہوتا، لیکن اب تو "مصنفِ خطاب" اُس کی دوبارہ اشاعت بصورتِ کتاب سے بھی خائف ہیں! ؎

کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو!

"خطاب بہ شاعر" کے بعد "شاعرِ مشرق" علانیہ اک "خود را فضیحت" کی نظیر ہے! ہمارا خیال ہے اول الذکر حصۂ کتاب آج بھی عملاً نا قابلِ رجوع ہے! منقولۂ ذیل ابیات ملاحظہ ہوں:

ہاں مگر اے فیلسوف و شاعرِ جادو طراز
تیری خدمت میں مری اک عرض ہے با صد نیاز

یہ گہرہائے درخشاں صرف تیرے قال ہیں
تیری فطرت کے رُخِ روشن کے خط و خال ہیں

دوسرا رُخ ہے ابھی تک تشنۂ بحث و نظر
اک نظر اس پر بھی ہاں تیری اجازت ہو اگر!

بارگاہِ علم میں گر ہو یہ گستاخی معاف
تیری دنیائے عمل کا بھی ذرا کر لوں طواف!

آہ یہ نظارہ ہے میرے لئے صبر آزما!
یہ تماشا دیدۂ بینا کو ہے عبرت فزا!

دیکھتا کیا ہوں کہ ہے اک دشتِ ناپید اکنار
جس میں کوسوں تک نہیں ملتا نشانِ سبزہ زار

کارواں کیا، مل نہیں سکتا یہاں اک نقشِ پا!
یہ زمیں ہے آج تک بیگانۂ بانگِ درا

راہرو کوئی یہاں محوِ سبک رانی نہیں
کوئی اعرابی یہاں وقفِ حُدی خوانی نہیں!

کچھ نظر آتے نہیں ہیں اس میں آثارِ حیات
کوئی ذرہ تک نہیں سرگرمِ پیکارِ حیات!

رُخ اِدھر کرتا نہیں ابرِ گہر بارِ حیات
نامیہ یاں ہو نہیں سکتا ہے "معمارِ حیات"

زندگی اس دشت میں ہے مرثیہ خوانِ خودی
خاک و خوں میں لوٹتا ہے ہم عنانِ خودی

ہے یہاں کا ذرہ ذرہ سوگوارِ زندگی
اس زمیں کا چپہ چپہ ہے مزارِ زندگی!

ذوقِ بیداری یہاں پامال ہی مجروح ہے
رُوحِ آزادی یہاں مغلوب ہے مفتوح ہے

اس سرابستاں میں کیسی جستجوئے زندگی؟
جرم ہے یاں لب پہ لانا گفتگوئے زندگی

اس دیارِ خواب و خور میں زہر ہے جوشِ عمل
اس خراباتِ وفا میں ننگ ہے ہوشِ عمل

کیا اُٹھے اس خاک دامنگیر میں پائے طلب!
آکے یاں کھویا گیا خود جادہ پیمائے طلب!

جس کے نغمے تھے نقیبِ مقدمِ فصلِ بہار
آہ وہ مرغِ چمن اب ہے خزاں کا سوگوار

برق کو جس نے سکھائی شوخیٔ طرزِ خرام
اُف کہ وہ خود منزلِ ہستی میں ہے اب سست گام

رہبری کرتا تھا سوئے عرش جس کا نقشِ پا
آہ اب وہ جا رہا ہے جانبِ تحت الثریٰ!

جس کے نغموں نے دیا تھا درسِ آزادی ہمیں
کر دیا تھا آشنائے ذوقِ "صیادی" ہمیں

اب عمل سے دے رہا ہے وہ غلامی کا سبق
شعلۂ رقصاں کو آہستہ خرامی کا سبق!

جس نے سکھلائے تھے اندازِ سناں بوسی ہمیں
دے رہا ہے اب وہ درسِ آستاں بوسی ہمیں!

جو پڑھاتا تھا "صداقت کا عدالت کا سبق"
جو ہمیں دیتا تھا "دنیا کی امامت" کا سبق

مل رہا ہے اب اُسی سے ضعفِ ہمت کا سبق
دے رہا ہے اب وہی فسخِ عزیمت کا سبق!

اے بہارِ باغِ ملت، طوطیٔ گلزارِ ہند!
آفتابِ اوجِ مشرق، یوسفِ بازارِ ہند

آج مسجودِ نظر ہے تیرا تہر فیضِ قلم
کیوں نہ تڑپے دل؟ "غلط اُٹھے اگر تیرا قدم"!

نکتہ چینی یہ نہیں، اک داستانِ غم ہے یہ
آبروئے ملتِ اسلام کا ماتم ہے یہ!

اب "شاعرِ مشرق اور فلسفۂ حیاتِ ملی" والی اس فرم و نیگرم معذرت کی نُسبک اختامی کو دیکھئے:

گاہ تیری آہِ سوزاں کے شرار
زندگی کے قصر کے نقش و نگار!

گاہ پہنچاتا سرِ عرشِ بریں | تیرا شورِ لا اُحِبُّ الآفلین!
آہ! پھر بھی اُمتِ خیر البشر | ہے مئے غفلت سے مست و بے خبر!
ہے وہی شغلِ مئے و مینا و جام | منتشر شیرازۂ ملّت تمام!
ہے تلاطم دیں سے سرتابی وہی | اب بھی طاری ہے گراں خوابی وہی
لذتِ آہِ سحرگاہی نہیں! | خودشناسی و خود آگاہی نہیں!
آہ کیا اِس ملتِ خوابیدہ کو | آہ کیا اب مسلمِ شوریدہ کو
حاجتِ پیغمبر و جبریل ہے | انتظارِ صورِ اسرافیل ہے؟
اے خدا! اس عندلیبِ زار کو | گلشنِ مشرق کے خوش گفتار کو
آرزوئے حال و استقبال کو | ملتِ اسلام کے اقبالؔ کو

فطرتِ برق و شرر کر دے عطا
اور بھی "سوزِ جگر" کر دے عطا!

ہم محمد یحییٰ صاحب کی اُس نقادانہ یلغار اور اِس سرفگندگانہ رجعتِ قہقری پر جوشؔ کی اِس رُباعی سے بڑھ کر کسی اور پیرائے میں [illegible] نہیں کرسکتے کہ:

بگڑی ہوئی عقل سے حماقت بہتر | دھوکے کی محبت سے عداوت بہتر
شیطان و ابوجہل کی عظمت کی قسم! | سو بار غلامی سے بغاوت بہتر!

(ا-ا-خ)

(۳) ندیم، گیا } چوڑا رسالجاتی سائز، ضخامت ۶۰ صفحات، کاغذ اچھا سفید چکنا، کتابت و طباعت عمدہ، مع اک تصویر آرٹ پیپر پر۔

رسالۂ ندیم گیا ۸ سال سے صوبۂ بہار میں اُردو زبان اور اسلامی ثقافت کا مشہور علمبردار ہے! لیکن مسرّت بالائے مسرت یہ ہے کہ اب وہ اک اصلاح کے دور سے گزر رہا ہے جس کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز نامور ندوی فاضل، سید ریاست علی ندوی کے ہاتھوں میں اُس کی عنانِ ادارت کا انتقال ہے! اس جدید نظم و نسق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ندیم پر اک یکسر انقلاب طاری ہوتا ہوا پاتے ہیں! آج ندیم گیا اگر معارفِ اعظم گڈھ کا ہمپایہ نہیں، اپنی موجودہ حالت و ہیئت میں ندیم عملاً اک نیا اور بلند پایہ صحیفۂ علم و ادب ہے! جو لوگ اُس کے سابقہ دور کے واقف اور اُس کی بنا پر اُس سے کسی قدر غیر مطمئن رہے ہیں، وہ اِسے اپنے جدید پیکر میں دیکھیں، اور ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ بے اختیار اُس کا خیر مقدم کریں گے۔

رسالے کے زیر نظر نمبر (بابتہ ستمبر ۱۹۴۰ء) کے "شذرات" میں علاوہ بہار کے اندر ماضئ قریب کی اردو ہندی نزاع کی روداد، اور "مقالات" میں "دو ہفتے میسور و مدراس میں" (از مولینا سید سلیمان ندوی) اور "دورِ عباسیہ کا اخلاقی اثر علوم و فنون پر" (از خامۂ جناب عبدالسلام ندوی) گرانقدر نگارشیں ہیں۔ "میرا اعمالنامہ" (پروفیسر محمد مسلم) ممتاز اخلاقی افسانہ ہے،

حصۂ نظم میں سہیلؔ کی "تابشیں" اور شمیمؔ کی "نکہت بیزیاں" جنت نظارہ اور فردوس شامہ ہیں!

شروع میں میاں نظیرؔ اکبرآبادی کے زبان زد خاص و عام ترجیع بند — "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا!" — کے اسی ٹیپ کے مصرعے کو اک فلاکت و ہلاکت مجسم درویش منشی کے سراپے میں جس مصورانہ کمال سے منتقل کیا گیا ہے اُس نے اس آفاقی عبرت کو چند نقوش و سطور کے اندر مرکوز کر دیا ہے! اس کامیاب مرقعے کی طرازش پر جناب مصور کو، اور اُس کے انتخاب و اشاعت پر حضرتِ مدیر کو ہم بہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں!

الغرض ندیم گیا ہماری خلوتِ ادبی کا مستقل "ندیم" ہونا چاہیے!

(ا-ا-خ)

[illegible]

کلیم کے ایجنٹ

دہلی کے علاوہ کلیم کہاں کہاں سے مل سکتا ہے؟

۱۔ عبدالرزاق صاحب نمبر ۷، کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ
۲۔ رحمت اللہ صاحب نمبر ۳ بینٹنگ اسٹریٹ کلکتہ
۳۔ علی رضا صاحب ایجنٹ ریلوے سٹیشن باورا
۴۔ عبدالرزاق صاحب نظامی نمبر ۱۷۲ بار سٹریٹ پوسٹ نمبر ۳ رنگون
۵۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ حیدر آباد دکن
۶۔ صادق کمیشن ایجنسی قصہ خوانی پشاور
۷۔ سید محمود صاحب فردوسی بک ڈپو۔ اولڈ ہوز پور روڈ بنگلور چھاؤنی
۸۔ نورالدین صاحب کامل ایجنٹ اُجین۔ گوالیار
۹۔ حبیبی میاں صاحب نیوز ایجنٹ آرہ۔ شاہ آباد
۱۰۔ پریمیر بک ڈپو صینانگ سٹریٹ ملتان چھاؤنی
۱۱۔ مسعود احمد صاحب انصاری ملتان
۱۲۔ ربانی نیوز ایجنسی اورچھا دروازہ جھانسی
۱۳۔ عبدالغنی صاحب ایجنٹ اخبارات لائل پور
۱۴۔ ہلیتھ اینڈ الیفی شنسی شملہ
۱۵۔ سعید بک ایجنسی بھوپال
۱۶۔ محمد عمر خاں صاحب نیوز ایجنٹ کالج بک سٹال لاہور
۱۷۔ دیوان چند صاحب نارنگ سرگودھا
۱۸۔ نارورن انڈیا پبلسٹی سروس امرتسر
۱۹۔ میسرز فضل الٰہی اینڈ سنز نیوز ایجنسی پشاور
۲۰۔ کازمو پولیٹن نیوز ایجنسی میرٹھ۔

شاعر کی راتیں

شاعرِ انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفریں اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے، جنھیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں [illegible] ہے۔ راتوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے

مست رات　بدمست رات　راز و نیاز کی رات　انتظار کی رات

اندھیری رات　چاندنی رات　جوانی کی رات　تصورات کی رات

التفات کی رات　جدائی کی رات　اشکوں کی رات　برسات کی رات

ربودگی کی رات　بیخودی کی رات　سرشار رات　بھیگی ہوئی رات

تصورات کی رات　بچپن رات　پیا بن ناگن کالی رات

قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس، دریا گنج، دہلی

پیغمبرِ اسلام

خواجۂ دو جہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں، اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے، اس کے دلائلِ قاطع کے سامنے ادراک منطق چیانشا بھول جاتا ہے —— شاعرِ انقلاب پر جب ایک سرشاریت کا عالم طاری ہوا، اُسی وقت اُنھوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی۔ عالمِ بیخودی میں چار روز کی ریاضتِ شاقہ اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا، جبتک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرت جوشؔ نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے۔ قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴، دریا گنج، دہلی

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

(کی)

چار پرانی تصانیف

حضرت جوشؔ نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے لیکن ان کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ انھیں شائع کرتے اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گذریں تو مناسب معلوم ہوا کہ اُن کی قیمت [illegible] طور پر کم کر کے انھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

(۱) **جذباتِ فطرت** — حضرت جوشؔ کی وہ معرکہ آرا نظم ہے جس میں مظاہرِ قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کر دیں قیمت ۲؍ رعایتی ۱؍

(۲) **اوراقِ سحر** — یہ حضرت جوشؔ کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۵؍ رعایتی ۲؍

(۳) **آوازۂ حق** — یعنی معرکۂ تسلیم و رضا کے سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو اور جنگِ حق و باطل کے سب سے بڑے سالار حسین ابنِ علیؓ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ ہے۔ قیمت ۸؍ رعایتی ۳؍

(۴) **مقالاتِ زرّیں** — یہ حضرت جوشؔ کے نادر کلمات، فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطائف کا عجیب اور کارآمد مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۱؍ رعایتی ۴؍

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰؍ محصول ڈاک ۳؍ وی پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں، بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ

مینیجر کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

مستند و مجرب دوایات

ہندوستانی دواخانہ دہلی سے طلب کیجئے، جسے ملک و قوم کے شیدائی طبی دنیا کے شہنشاہ حضرت مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے سنہ ۱۹۰۵ء میں قائم کیا تھا، اور جو آپ کے خلف ارشد عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب کی سرپرستی میں بدستور جاری ہے۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی نے اپنے پینتیس سالہ دَورِ زندگی میں ملک میں بہترین مجرب دوائیں پیش کر کے جو عزت و وقار حاصل کیا ہے اس کے لحاظ سے یہ دیسی دواؤں کا لاجواب کارخانہ ہے، علاوہ ازیں اس دواخانہ کا ایک خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے کسی کا ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے، بلکہ یہ ملک و قوم کی ملکیت ہے، اس کا منافع جو تقریباً **دو لاکھ روپیہ سالانہ** ہے، مردانہ و زنانہ طبیہ کالج اور اس کے متعلقہ شفاخانوں پر خرچ ہوتا ہے۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی کی ہزارہا مستند و مجرب دواؤں میں سے مندرجۂ ذیل چار دوائیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں، ان کو طلب کر کے فائدہ حاصل کیجئے۔

جمیلان

جریان اور رقت و سرعت کی لاجواب دوا ہے۔ مادۂ تولید کی اصلاح کرتی ہے اور قدرتی امساک پیدا کرتی ہے۔
ترکیب استعمال دو قرص صبح کو نہار منہ دودھ کے ساتھ کھائیں۔ تیل، ترشی اور گرم چیزوں سے پرہیز رکھیں۔
قیمت فی شیشی ۳۲ قرص چار روپے آٹھ آنے

قرص مفاصل

گٹھیا (جوڑوں کا درد) عرق النساء (ٹانگ کا درد) کے لئے نہایت مفید ہے، یہ بیماریاں خواہ کیسی ہی پرانی ہوں اس دوا کے ۱۲ روز کے استعمال سے بالکل دور ہو جاتی ہیں۔
ترکیب استعمال ایک قرص رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے کھائیں، تیل، ترشی، ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز۔ قیمت فی شیشی ۳۰ قرص عہ

قرص جدید

غذا کو ہضم کرتے ہیں، بھوک لگاتے ہیں، ریاح کو خارج کرتے اور نفخ اور قراقر کو زائل کرتے ہیں۔
ترکیب استعمال ایک قرص دونوں وقت بعد غذا کھائیں۔ قابض بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز۔ قیمت ۱۰۰ قرص ایک روپیہ دو آنہ

قرص بواسیر

بادی بواسیر کے لئے نہایت مفید دوا ہے اس کے چند روزہ استعمال سے یہ مرض بالکل دور ہو جاتا ہے۔
ترکیب استعمال۔ اس کے دو دو قرص صبح و شام پانی سے کھائیں۔ قابض، بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز۔ قیمت ۶۴ قرص دو روپیہ

تار کا پتہ۔ [illegible] دہلی — **منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲، دہلی** — ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

اطلاع

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیئے، اور جواب طلب امور کے لئے ار ٹکٹ ارسال فرمایئے۔

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر مہینے کی دس تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ ورنہ پرچہ قیمتاً ارسال ہوگا۔

نمونہ کے لئے ۹ر کے ٹکٹ ارسال فرمایئے۔

منیجر کلیم

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کر دو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے



بہترین خوشبو منتخب کرسکوں، تعمیلِ حکم کے لئے فردوس شمال کشمیر، جنت نظیر سوئزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی، جب سب پھول دُور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کیے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے، کہ مہارانی کی حُسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی، کھانا پینا ترک کر دیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور وزراء سے مشورہ طلب کیا،

مہتمم توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شبابِ رفتہ

ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی

تازہ ترین تصنیف



جنون و حکمت

یعنی

مجموعۂ رباعیات

تیار ہو گئی

رباعی، تمام اصنافِ سخن میں وہ تنہا رنگین، بلیغ اور فلسفیانہ صنف ہے، جو عظیم شعراء کی مشاقی کے نقطۂ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے، اور کسی شاعر کو اس وقت تک حقیقی رباعی گو شاعر کا پُرشکوہ خطاب نہیں مل سکتا، جب تک کہ اس کی بے پناہ جنون پرور تخیلی قوت بلند ہوتے ہوتے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہمدوش نہیں ہو جاتی۔ بدبخت ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رباعی بھی ہر چہ گیرد علتی علت شود کے زمرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے۔ ہماری طالبیت نے بزعمِ خود، یہ سمجھ رکھا ہے کہ رباعی نام ہے رباعی کی بحروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا، اور بس ——— حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رباعی شاعرانہ مطالعے، شاعرانہ تفکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینیٔ خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی بھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔

اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تمنا پیدا ہوئی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوا ہوتا تو آپ کا یہ اولین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں جنون و حکمت کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاض قدرت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں بھی ایک خیام پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اس کی قدر نہ فرمائیں ——— آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک "فٹز جیرلڈ" مل گیا تھا جس نے اسے ایک قوم سے روشناس کرا دیا تھا، لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مردہ اور غلام ہے، اور غلاموں کو صرف یہی نہیں کہ کوئی "فٹز جیرلڈ" نہیں ملا کرتا، بلکہ خود اس کی قوم بھی اس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے طیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون و حکمت مندرجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے۔ (۱) معارف (۲) خرابات (۳) حسن و عشق (۴) پیرانِ سالوس (۵) متفرقات۔

قیمت صرف تین روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

منیجر کلیم بک ڈپو، جلیس نواس دریا گنج دہلی


کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی

بنام قوت وحیات

کلیم



آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

دہلی

آگے گئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ
گورنمنٹ میسور، دپٹیالہ، وممالک محروسہ سرکار نظام

سہ ماہی چندہ دو روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد (۴) — نمبر (۶)

فہرست مضامین بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	مدیر	۳۶۲
۲	مفلسوں کی عید (نظم)	جوش ملیح آبادی	۳۶۷
۳	احسان نہ کیجئے (نظم)	جوش ملیح آبادی	۳۶۸
۴	موجودہ ہندوستانی سیاسیات	جناب احتشام رضوی نابلی، ایم اے	۳۶۹
۵	محبوبہ کی شرط (نظم)	جناب سید الطاف صاحب مشہدی	۳۷۷
۶	بلیدان	جناب تقی صاحب مہردلی	۳۷۸
۷	عیاش حرم (نظم)	جناب احسان بن دانش کاندھلوی	۳۸۲
۸	مردم مضحک	جناب اسرائیل احمد خاں صاحب	۳۸۴
۹	عید ملنے والوں سے (نظم)	جوش ملیح آبادی	۳۹۳
۱۰	افسانے کا بنیادی خیال	جناب مولانا امداد صابری صاحب	۳۹۴
۱۱	مسئلہ جبر و اختیار	ناظر	۴۰۱
۱۲	شاعر کی عید (نظم)	جوش ملیح آبادی	۴۱۰
۱۳	شانتی	جناب وجاہت سندیلوی بی اے	۴۱۱
۱۴	نسیم آزاد (نظم)	جناب حکیم آزاد صاحب انصاری	۴۱۵
۱۵	جامعہ ملیۂ اسلامیہ دہلی	جناب اسرائیل احمد خاں صاحب	۴۱۷
۱۶	پھول (نظم)	جوش ملیح آبادی	۴۲۷
۱۷	انتظار (نظم)	جناب محمد ضیاء الاسلام صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور	۴۲۸
۱۸	اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے	جناب گوہر سلطان صاحب سرحدی، پشاور	۴۳۰
۱۹	آرزوئے محروم (نظم)	جوش ملیح آبادی	۴۳۲
۲۰	رفتار وقت	ادارہ	۴۳۳
۲۱	نقد و نظر	ادارہ	۴۳۷
۲۲	اشتہارات	مشتہرین	۴۴۱

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم جنتی نواس دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مُدیر

خطرناک جماعتیں

"کلیم" کی کسی گزشتہ اشاعت میں غالباً عرض کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے ملک اور بالخصوص ہندوستان کی موجودہ سیاسی بدبختی کے دورِ نحوست میں ہر اُس انجمن سے پناہ مانگنا چاہیئے جو وطنِ عزیز کی متحدہ قومیت کے اہم ترین اور تنہا مسئلے کو پسِ پشت ڈال کر کسی خاص طبقے، کسی خاص گروہ، اور کسی خاص فرقے کے "حقوق" کی خاطر عالم وجود میں آئی ہو ——

ہندوستان میں آزادی کا جذبہ کم سے کم اس مقدار شدّت سے تو ضرور بیدار ہو چکا ہے کہ اب بڑے سے بڑا غدار بھی اِس کے خلاف علانیہ لب کشائی کی جُراٴت نہیں کر سکتا —— اس لئے آزادی کے دُشمنوں، اور اغیار کے دوستوں نے اپنی حسرتیں نکالنے کا راستہ یہ اختیار کیا ہے کہ مذہب کے نام پر اپنی اپنی جماعتیں اور ٹولیاں علیحدہ علیحدہ بنا ڈالی ہیں، اور اُن ٹولیوں کے منبروں سے یہ آوازیں بلند کی جاتی ہیں کہ کانگریس ہماری جماعت اور ہمارے مذہب کی دشمن ہے۔ جب تک کانگریس ہماری جماعت کو ہمارے مذہب اور ہمارے "حقوق" کی سلامتی کی ضمانت نہیں دے دیگی، اُس وقت تک ہم اُس میں شریک نہیں ہوں گے۔

ہندوستان ہنوز اِس عبرتناک حد تک جاہل اور اندھا ہے کہ یہاں مذہبی کھیل نہایت آسانی کے ساتھ کھیلا جا سکتا ہے، اور مذہب کا نام لے کر یہاں کے انسان نما حیوان ایک دوسرے کا خُون بہانے پر نہایت ہی سہولت کے ساتھ آمادہ کئے جا سکتے ہیں —— اس بدبخت ہندوستان میں "اللہ اکبر" اور "شری رام چندر جی کی جے" وہ آلہ ہے جو ہماری مجموعی قوت کو آنِ واحد میں ریزہ ریزہ کر کے رکھ دینے کی طاقت رکھتا ہے —— چنانچہ انھیں اُمور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، وطن دشمن ہندوؤں اور مسلمانوں نے "ہندو مہاسبھا" اور "مسلم لیگ" کے ناموں سے اپنی اپنی ٹولیاں بنا رکھی ہیں۔ اور اپنے اپنے جاہلوں اور اندھوں کے دلوں میں یہ زہر اتارنا شروع کر دیا ہے کہ کانگریس تمہارے مذہب، تمہارے تمدن اور تمہاری زبان کی دشمن ہے۔ خدارا تم اپنے کو منظّم بناؤ، ورنہ کانگریس تمہیں اپنے معدے میں رکھکر ہضم کر جائے گی —— مہاسبھائی اور لیگی حضرات عوام کے دل موہ لینے کی خاطر اپنی اپنی تقریروں میں ویدوں کے اشلوک اور قرآن کی آیتوں کو اِس بازیگرانہ چالاکی سے استعمال کرتے ہیں کہ بچارے عوام کو فرقہ دارانہ جنُون، اور بے بنیاد مذہبی جوش و خروش دیوانہ بنا دیتا ہے، اور اِس تمام قابلِ ملامت اُچھل کُود کا مُدعا، جیسا کہ بارہا عرض کیا جا چکا ہے، صرف اِس قدر ہوتا ہے کہ کانگریس کو ضعیف، اور جذبۂ آزادی کو زنگ خوردہ بنا کر ہندوستان کو ایک مشترکہ و متفقہ محاذ پر جمع ہونے کے تمام امکانات و مواقع سے یکسر محروم کر دیا جائے۔

تقریباً دو مہینے ہوئے کہ مہاسبھائیوں اور لیگیوں نے اپنے اپنے جلسے بڑے طمطراق سے منعقد کئے تھے، اور دونوں نے کانگریس کے خلاف خوب زہر اُگلا تھا —— لیکن کانگریس کے خلاف اِن دونوں کی مخالفت

کو غور سے دیکھنے کے بعد صاف نظر آتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں، اور پہلے ہی سے سرگوشیاں کرکے اپنی اپنی تقریروں کے حدود متعین کر لیتے ہیں۔

عجیب مزے کی بات ہے جس پر رونا بھی آتا ہے اور ہنسی بھی یعنی لیگ تو کانگریس سے اس لئے بیزار ہے کہ وہ مسلم کُش ہے، اور مہاسبھا کانگریس سے اس لئے نافر ہے کہ وہ مسلم نواز واقع ہوئی ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

ان کی بدی باتوں کو صرف "مختار" ہی نہ سمجھ سکیں گے ——

ورنہ صاف ظاہر ہے کہ مہاسبھائیوں اور لیگیوں نے پہلے ہی سے یہ مشورہ کر لیا تھا کہ ہم کانگریس کے خلاف یہ یہ کہیں گے، اور تم کانگریس کے خلاف یہ یہ کہنا۔

معلوم نہیں اپنے قول میں مسلم لیگ سچی ہے کہ مہاسبھا —— ان دونوں نے اسلام کو آڑ بنا رکھا ہے، ایک تو یہ کہتی ہے کہ کانگریس اسلام کی دشمن ہے، اور دوسری کہتی ہے کہ کانگریس اسلام کی دوست ہے۔

گویا بہ الفاظ دیگر اُس راہنما گروہ سے جس کا نام کانگریس ہے، یہ کہا جا رہا ہو کہ

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

یہ "لیگیے" اور "سبھائی" کیا واقعی مسلمان اور ہندو ہیں! اور کیا واقعی یہ اُن کا مذہبی جذبہ ہے جو اُنھیں کانگریس میں داخل ہونے سے روک رہا ہے؟

مجھ سے اس کا جواب طلب نہ فرمائیے۔ ذرا ان دونوں کو قریب جا کر دیکھئے، آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کا مذہب انھیں خدمت وطن سے روک رہا ہے یا اس خوشنما پردے کے پیچھے کوئی اور ہی جذبہ کام کر رہا ہے۔

مسلم لیگ، اور مہاسبھا کے ارکان کی زبانوں سے اکثر سُنا گیا ہے کہ ہم "مسلمان" اور "ہندو" پہلے ہیں، اور "ہندوستانی" بعد کو۔

بات یہ ہے کہ اپنے کو ہندو یا مسلم کہنے میں کسی قسم کا خطرہ پیدا ہوتا ہی نہیں۔ لیکن اگر اس کے عوض اپنے کو ہندوستانی کہا جائے تو یہ قول ایک آن واحد میں سیکڑوں فرائض اور بے شمار خطرے پیدا کر دیتا ہے، جن کا یہ تن پرور ہندو مسلمان مقابلہ نہیں کر سکتے۔

سب جانتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کوئی نہیں پکڑتا، لیکن ہندوستانیوں کو ہر وقت دار و رسن کا سامنا رہتا ہے، کیونکہ اپنے کو ہندوستانی وہی کہے گا جو ہندوستان کو ایک متحدہ قومیت کے ذریعے سے نجات دلانے کی ٹھان لے گا، اور ظاہر ہے کہ کسی ملک کو نجات دلانے کی راہ میں سب سے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ کفن سر سے باندھ لیا جائے۔

اس کے علاوہ اپنے کو مسلم یا ہندو پہلے، اور ہندوستانی بعد کو کہنا جغرافی صداقت، اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے —— یہ بات مدرسے کے طلاب تک کو معلوم ہے کہ مذہب، نام ہے عقائد کے ایک مجموعے کا، کوئی بچہ مذہب یا عقاید کے کسی مجموعے کو ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا نہیں ہوتا، اور ہر وقت اُسے اس کی آزادی حاصل رہتی ہے کہ جس لمحے اس کا جی چاہے اپنے عقائد کو تبدیل کر کے اُن سے منحرف ہو جائے۔ یعنی یہ بات ہر وقت، ہر لحظہ، اور ہر آن ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اپنا مذہب تبدیل کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لیں۔

آج جو شخص اپنے کو ہندو کہہ رہا ہے، کل بہت ممکن ہے کہ وہ مسلمان بن جائے، اسی طرح آج جو اپنے کو مسلمان کہہ رہا ہے، کل بہت ممکن ہے کہ وہ ہندو ہو جائے۔ لیکن ہم ہندوستان کے تمام و کمال تیس کروڑ عیسائیوں، پارسیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے ایک فرد کی بھی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ ہندوستانیت کو ترک کر کے انگریز یا فرانسیسی بن جائے۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت و وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقت بشری سے خارج ہے —— اور اسی بنا پر کسی کا یہ کہنا کہ میں ہندو یا مسلمان پہلے ہوں، اور ہندوستانی بعد کو ہوں، ایک ایسی بات ہے جس کا نہ تو جغرافی صداقت ہی ساتھ دے سکتی ہے، نہ فطری قانون ——

مذہب، زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے، لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے، بدن کی جلد کیسی، قومیت تو ہمارا گوشت پوست، اور ہمارا ضمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور ضمیر کو کون تبدیل کر سکتا ہے؟

لیکن کہا جائے تو کس سے کہا جائے، اور سمجھایا جائے تو کیسے سمجھایا جائے؟

سوتے ہوئے کو تو جگا دینا بہت آسان ہے، مگر جو جھوٹ مُوٹ سونے کا بہانہ کئے ہوئے پڑا ہو، اُسے کون جگا سکتا ہے۔

مسلم لیگ، اور مہاسبھا کے ارکان کوئی بچے نہیں ہیں کہ انھیں مذہبیت و قومیت کا فرق بتایا جائے یا آزادی کی خوبیاں بیان کر کے انھیں غلامی سے نفرت دلائی جائے۔

ان دونوں رجعت پسند جماعتوں کے ارباب حل و عقد سچائی کی تمام باتوں کو سمجھتے ہیں۔ اور دلوں میں اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کے واسطے ایک زبردست خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ لیکن خدا بھلا کرے ذاتی اغراض کا کہ وہ راہِ راست پر آنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ اور مہاسبھا نے کانگریس میں اپنے شریک ہونے کے سلسلے میں جس قدر بھی شرطیں پیش کی ہیں، وہ سب کی سب بے بنیاد اور فرضی ہیں — اور یہ بھی میرا دعویٰ ہے کہ خود لیگ اور سبھا کے ارباب بست و کشاد بھی اپنی ان شرطوں کو پوچ اور لچر سمجھتے ہیں، اور اُن پر محض اس لئے قائم ہیں کہ وہ ہندوستانیوں کی مجموعی قوت کے توڑنے میں اُن کا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں۔

میرا یہ ایمان ہے کہ کانگریس اگر آج "لیگ" اور "سبھا" کی تمام و کمال شرطیں، ایک استثنیٰ کے بغیر بھی قبول کرلے، پھر بھی خداوندانِ لیگ و سبھا، کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہوں گے اور جلدی جلدی جلسے کرکے دس ہزار ایسی نئی شرطیں پیش کردیں گے جنھیں دنیا میں کوئی معقول انسان قبول ہی نہیں کرسکتا۔

کاش کانگریس، عقل و جرأت سے کام لے کر اتمام حجت کے واسطے لیگ و سبھا کی تمام شرطیں ایک سانس میں منظور کرکے اور پھر یہ تماشا دیکھ لے کہ یہ جماعتیں کس طرح قلا بازیاں کھاتی پھر رہی ہیں۔

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں
تا سیہ روئے شود ہر کہ در و غش باشد

رواداری

اگر آپ ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو شیروانی کو بیحد عزیز رکھتا ہے اور تمام کوٹ پہننے والوں کو ہر صحبت، اور ہر مجلس میں بد مذاق و بے حیا کہتا پھرتا ہے۔

یا اگر آپ کو کوئی ایسا شخص ملے جو اُن تمام افراد سے نفرت کرتا ہے جو انگرکھے کو سیب اور سفید کمر بند کو رنگین کمر بند پر ترجیح دیتے ہیں —

یا اگر آپ کے علم میں یہ بات لائی جائے کہ فلاں شخص اس مزاج کا ہے کہ اگر اُس کے سامنے پیلے رنگ کی تعریف، اور نیلے رنگ کی مذمت نہ کی جائے تو وہ ہاتا پائی کرنے لگتا ہے۔

یا اگر آپ کو کوئی ایسا آدمی ملے جو اُن تمام اشخاص کو فاسق و ملحد اور دوزخی سمجھتا ہو جو ریشم کے کپڑوں کے سامنے سجدہ نہیں کرتے اور ہر آن اِس فکر میں رہتا ہو کہ کسی نہ کسی طرح ریشم کے کپڑوں کے منکرین پر توہینِ حق کا مقدمہ دائر کرادے۔

یا اگر آپ کے نوٹس میں یہ بات لائی جائے کہ آپ کے شہر میں ایک بزرگوار ایسے ہیں جو یہ سُنتے ہی کہ املی کوئی اچھا پھل نہیں ہے، یکایک مغلظ گالیاں دینے لگتے ہیں .... تو حواس کی سلامتی اور عقل کے ثبات کے نام پر میں آپ سے سوال کروں گا کہ آپ اُس شخص، یا ایسے اشخاص کے باب میں کیا رائے قائم کریں گے؟ اور اگر کوئی آپ سے سوسائٹی کے اِن معزز مہانوں کے قیام کی خاطر کسی مکان کے تجویز کرنے کے لئے کہے گا۔ تو کیا آپ بے دھڑک آگرے، اور بریلی کے کشادہ و ہوادار سرکاری مکانات کی طرف اشارہ نہیں کردیں گے؟

اس دُنیا کی ہر چھوٹی بات، بڑی۔ اور ہر بڑی بات، چھوٹی ہوتی، اور ہوسکتی ہے — یہ محض حالات و مواقع ہوتے ہیں جو اشیائے عالم، اور مسائلِ حیات کو چھوٹا بڑا، یا اہم و غیر اہم بنایا کرتے ہیں — باتیں چھوٹی ہوں کہ بڑی، مسائل اصولی ہوں کہ فروعی — بحث چھوٹے بڑے، یا اصولی و فروعی کی نہیں ہے، دیکھنے کی چیز تو صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مسائل و عقائد کے باعث، اپنے ابنائے زمانہ سے، اُن ابنائے زمانہ سے جو ہم سے اُصولی اختلاف رکھتے ہیں کیا سلوک پسند کرتے ہیں۔

اگر کوئی فرد، یا جماعت ایسی ہے کہ ادنیٰ ترین اختلافات تک کو برداشت نہیں کرسکتی، اور ہر اختلاف رائے پر اس قدر جامے سے باہر ہوجاتی ہے کہ اُس کی شریعت خون ریزی کا فتویٰ دے دیتی ہے تو میں آپ سے

حواس کی سلامتی، اور عقل کے ثبات کا واسطہ دے کر پھر سوال کروں گا کہ آپ اُس فرد یا جماعت کے باب میں کیا رائے قائم کریں گے؟

وہ شخص جو امّی کی مذمت سُنکر گالیاں دینے لگتا ہے، اور وہ گروہ جو اپنے عقائد کے خلاف ایک حرف سُنکر چھُری مار دیتا ہے، کیا ان دونوں کے حواس درست ہیں؟ ان کی عقلیں صحیح ہیں؟ یا یہ کہ یہ دونوں شدید قسم کے پاگل ہیں؟ اور اِن کا پاگل پن اتنا عظیم الشان ہے جیسا ہندوستان کا ہمالہ —— یا اِن کا عقلی وجود اِس درجہ بھیانک ہے جیسا مصر کا ابوالہول؟

اِسی طرح اب میں، کسی تمہید کے بغیر، براہ راست آپ سے یہ بھی لگے ہاتھوں دریافت کر لینا موقع کی بات سمجھتا ہوں کہ مذہبی اُمور پر ایک دوسرے کو زندیق و کافر کہنے والے، اور عقائد کے اختلاف کی بنا، پر ایک دوسرے کا خون تک پی لینے والے کس گروہ، اور کس طبقے میں شمار کئے جائیں؟

آپ اُس بیچارے کو تو بے دھڑک پاگل کہہ دیتے ہیں جو امّی کی مذمت سنتے ہی گالیاں دینے لگتا ہے، لیکن نہیں معلوم کیا بھید ہے کہ جب کوئی شخص اختلافِ عقائد کی بنا، پر کسی کے چھُری مار دیتا ہے تو آپ اُس کے پاگل خانے سے باہر ہونے پر قطعی اظہارِ حیرت نہیں فرماتے۔

یہ بات شاید دس ہزار بار مر کر زندہ ہونے کے بعد بھی میری عقل میں نہ آسکے گی کہ اگر کوئی بات کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، تو اُسے مجرم کیوں قرار دیا جاتا ہے؟

کیا ہر وہ بات جو زید کی سمجھ میں آچکی ہے، محض اِس بنا، پر کہ وہ زید کی سمجھ میں آگئی ہے اِس قدر قابلِ قبول بن چکی ہے کہ وہ ہر شخص کی سمجھ میں آجائے؟ اور کیا وہ ہر پتھر جو زید سے اُٹھ گیا ہے، محض اِس بنا، پر کہ وہ زید سے اُٹھ گیا ہے، لازماً وہ ہر شخص سے اُٹھ جانا چاہیئے؟

میں اربابِ تعصّب کی خدمت میں تفکّر و تدبّر، اور تأمّل و تعقّل کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ حضرات کسی بات کا کسی شخص کی سمجھ میں نہ آنا کوئی جُرم، کوئی خطا، اور کوئی گناہ نہیں ہے ——

اِس بحث کو سرِ دست چھوڑیئے کہ عقلمند کون ہے، جس طرح یہ ممکن ہے کہ مذہب پرست عقلمند ہوں، اُسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ لامذہب عقلمند ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں عقلمند نہ ہوں، بلکہ وہ گروہ عقلمند ہو جو اِن کے بین بین واقع ہوا ہے —— لیکن رفعِ شر، اور اتمامِ حجّت کی خاطر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مذہب اور متعلقاتِ مذہب جن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں، اُن کے متعلق اربابِ مذہب کی طرف سے اگر معقولیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کچھ کہا جاسکتا ہے تو صرف اِس قدر کہ اُن کی عقلیں کمزور ہیں —— فرض کر لیجئے، جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، اتمامِ حجّت و رفعِ شر کے واسطے فرض کر لیجئے کہ ایسا ہی ہے، لیکن کیا اہلِ مذاہب نے کبھی اِس امر پر بھی غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ اگر لامذہبوں کی عقلیں کمزور واقع ہوئی ہیں تو اِس ضعفِ عقل کی ذمّہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟

کیا منکرانِ مذہب اپنی عقلوں کے خالق ہیں؟ اور اگر وہ اپنی عقلوں کے خالق نہیں ہیں تو اُن کی اُس بے دینی کا، جو ضعفِ عقل سے پیدا ہوئی ہے، کون جوابدہ قرار دیا جائے گا؟

گھوڑے کو لنگڑا پیدا کر کے اُسے دوڑنے کا حکم دینا، اور جب وہ دوڑ نہ سکے تو اُسے کوڑے مارنا کس شریعت میں روا رکھا گیا ہے؟

ظاہر ہے کہ مذہب، کوئی ذی حیات وجود نہیں ہے اور جب وہ کوئی ذی حیات وجود نہیں ہے تو اُس سے معاندانہ جذبات، یا مخاصمانہ واقعات کی بنا، پر انکار کرنے کا کوئی خیال پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ جو کوئی انکار کرے گا، وہ محض اِس بنا، پر انکار کرے گا کہ وہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے، اور اِس صورتِ حال میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ منکر کا قصورِ فہم ہے —— اور ظاہر ہے کہ قصورِ فہم نہ تو کوئی قانونی جُرم ہے، نہ مذہبی گناہ۔

میری سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آتی کہ اربابِ مذہب، جذبات کے دھارے پر اس قدر کیوں بہتے رہتے ہیں، اور اپنے اِس بے بسی سے بہے چلے جانے کو کس طرح برداشت کرتے ہیں؟

آخر یہ حضرات، معاملات کو اُن کی صحیح روشنی میں دیکھنے کے خوگر کیوں نہیں ہیں، اور زندگی کے مسائل پر ٹھنڈے دل سے ایک مُفکّر کی صورت سے غور کیوں نہیں کرتے؟

فرض کیجئے کوئی شخص سوسائٹی کے تمام مفید ضوابط کا پابند ہے لیکن خدا کے وجود کو اِس طرح تسلیم نہیں کرتا جس طرح اہلِ مذاہب تسلیم کرتے ہیں،

تو اس میں کسی کا کیا نقصان ہے، اس سے کسی کے گھر سے کیا جاتا ہے، اس سے کس کا نامۂ اعمال سیاہ ہوتا ہے، اور اس سے کس کی عاقبت خراب ہوتی ہے؟ —— خدا، اگر ہے تو سب کا خُدا ہے، صرف اہلِ مذاہب ہی کے واسطے ریزرو (مخصوص) ہو کر نہیں رہ گیا ہے، اگر کوئی خدا کا منکر ہے تو اپنے خدا کا منکر ہے، اس سے اہلِ مذاہب کو آخر واسطہ ہی کیا ہو سکتا ہے؟ سزا دے گا تو خدا سزا دے گا، یہ اربابِ مذہب بیچ میں ٹانگ کیوں اڑاتے ہیں؟ —— کیا یہ خدا کے نمائندے ہیں؟ یہ کتنا ہولناک مغالطہ ہے!

ایک شخص بدبختی یا بے عقلی کے باعث فرض کیجئے اپنے کو حوروں کی ہم آغوشی کے تمام امکانات سے محروم کر رہا ہے تو اس سے کسی دوسرے کو کیا غرض، اُس کے محروم ہو جانے سے دوسروں کی حوریں تو چھن نہ جائنگی —— اور اگر اربابِ مذہب کا یہ قول ہے کہ نہیں یہ معاملہ نہیں ہے، ہم منکرانِ مذہب سے لڑتے ہیں صرف اُن کی ہوا خواہی و ہمدردی کی بنا پر —— سو بندہ پرور ہمدردی و ہوا خواہی کا فریضہ سب و شتم اور جنگ و پیکار سے نہیں، بلکہ تالیفِ قلب، دلسوزی، اور افہام و تفہیم کے ذریعے سے ادا ہو سکتا ہے۔ گالیوں اور تلواروں سے قلوب نہیں بدلا کرتے —— دلوں کو اگر کوئی شے موہ لے سکتی ہے تو وہ حکمت کی بات، اور محبت کی نگاہ ہوتی ہے ——

ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اہلِ مذہب اگر معقولیت کے ساتھ لامذہبوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتے ہیں تو صرف اس قدر کہ اُن کی عقلیں کمزور ہیں —— اور یہی وہ خیال ہے کہ اگر قوی ہو جائے تو اہلِ مذہب، نفرت کے عوض، لامذہبوں پر اُسی طرح ترس کھانے لگیں گے، جس طرح ایک تندرست بھائی اپنے بیمار بھائی پر ترس کھاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب مذہبی حضرات، اپنے لامذہب بھائیوں کو علیل سمجھنے لگیں گے تو بددعائیں، اور سزائیں دینے کے عوض اُنھیں بہتر دوائیں اور غذائیں دیں گے۔ اور اس طرح اِن دونوں میں ایک ایسی حقیقی یگانگی، اور ایک ایسی قوی محبت پیدا ہو جائے گی .... کہ ایک، دوسرے کی بات کو ٹھنڈے دل سے سُننے اور قبول کرنے کے تمام امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس روز اربابِ مذہب کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ لامذہبیت اُن کے یا اُن کے خدا کے مقابلے میں کسی نوع کی سرکشی، گستاخی، زندیقیت، یا ارادی بے دینی نہیں ہے بلکہ یہ یا تو ضعفِ عقل کا نتیجہ ہے، یا ایک ایماندارانہ اختلافِ رائے، معصومانہ استنباطِ نتائج، اور حکیمانہ تصفیۂ عقلی ہے تو مجھے یقینِ کامل ہے کہ وہ کسی شرط پر بھی اس روشِ قدیم پر ایک لمحے کے لئے بھی قائم رہنے پر آمادہ نہ ہو سکیں گے۔ کہ نوعِ انسانی میں فتنہ برپا کیا جائے، اور بھائیوں کے خون میں ہات رنگے جائیں۔

جس دن اہلِ مذاہب اس حقیقتِ کبریٰ کو پا لیں گے، ایک بہت بڑے منارے پر یہ عبارت کندہ کی جائے گی کہ انسان سے بڑا کوئی مذہب نہیں، انسانیت سے بلند کوئی شریعت نہیں، اور جو شخص اپنے ذاتی مذہب کی بنا پر انسانی شریعت کے خلاف ایک کلمہ بھی زبان سے نکالے گا اُس پر قتلِ عمد کا مقدمہ چلایا جائے گا۔

ہاں اُسی دن انسانیت کے منبر سے پہلی مرتبہ یہ آوازہ بلند کیا جائیگا کہ آج کی تاریخ سے مذہبی منافرت کو حرام قرار دیا جاتا ہے، اور سفرقہ وارانہ تعصبات کے پھاٹک کو جو انسانی خون سے سُرخ ہو رہا ہے ایک ایسے مسالے سے چُن دیا گیا ہے کہ کروروں صدیوں کے بادوباراں سے بھی اُس میں کوئی شگاف نہ پڑ سکے گا۔

ہماری آئندہ نسلیں اُس دن کو مُفکرانہ سنہ کا روزِ آغاز، اور انسانی ذہن کے بلوغ کا یومِ اولین قرار دے کر تعطیلیں منائیں گی —— اور ہر تعطیل کے موقع پر ایک ایسا جشنِ فتح منایا جائے گا کہ انسانیت اپنے ماتھے پر کلاہِ فخر کج کرکے اُن تمام فرشتوں پر قہقہے مارے گی جنھوں نے اُس کی تخلیق کے وقت اُسے زمین پر خون بہانے والی مخلوق کہا تھا۔

قطعہ

[illegible]

مُفلِسوں کی عید

اہلِ دُوَل میں دُھوم تھی روزِ سعید کی مُفلس کے دل میں تھی نہ کرن بھی اُمید کی

اِتنے میں اور چرخ نے مٹی پلید کی بچّے نے مُسکرا کے خبر دی جو عید کی

فرطِ محن سے نبض کی رفتار رُک گئی

ماں باپ کی نگاہ اُٹھی، اور جُھک گئی

آنکھیں جُھکیں کہ دستِ تہی پر نظر گئی بچّے کے ولولوں کی دِلوں تک خبر گئی

زُلفِ ثبات، غم کی ہوا سے بکھر گئی برچھی سی ایک، دل سے جگر تک اُتر گئی

دونوں، ہجومِ غم سے ہم آغوش ہو گئے

ایک دوسرے کو دیکھ کے خاموش ہو گئے

جوش ملیح آبادی

احساں نہ کیجئے

برباد پھر بزرگیٔ قرآں نہ کیجئے　　اب زحمتِ آمادۂ پیماں نہ کیجئے
اب خانۂ اُمید میں ظلمت ہی نُور ہے　　تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجئے
دیکھے ہوئے ہُوں کتنے بہار و خزاں کے رنگ　　اب خارزارِ دل کو گلستاں نہ کیجئے
چھایا ہوا ہے مطلعِ اُمید پر غبار　　اب رُخ پہ کاکلوں کو پریشاں نہ کیجئے
انجامِ عذر خواہیٔ پیشیں کا واسطہ　　اب اعترافِ جورِ فراواں نہ کیجئے
اب خطِ شوق بھیجئے بے رنگ ہی مجھے　　افشاں کو صرفِ زینتِ عنواں نہ کیجئے
اب دل کو بزمِ ناز کی حسرت نہیں رہی　　اب عُذرِ بدمزاجیٔ درباں نہ کیجئے
سُلجھا چکا ہوں عُقدۂ آسودگیٔ موت　　اب ذکرِ خضر و چشمۂ حیواں نہ کیجئے
اب خنجرِ فراق کو رکھئے نہ میان میں　　اب توسنِ وصال کو جولاں نہ کیجئے
اقرارِ اوّلیں کا جنازہ ہے دوش پر　　اب تازہ، رسمِ کہنۂ پیماں نہ کیجئے
جس دل پہ ناز تھا وُہی باقی نہیں رہا　　اب زندگی سے مجھکو پشیماں نہ کیجئے

دم ہی نہیں ہے جوشؔ میں تجدیدِ شوق کا
احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجئے!

جوشؔ ملیح آبادی

موجودہ ہندوستانی سیاسیات کے بعض رجحانات

احتشام رضوی ایم اے

تاریخ کے کسی عہد میں دُنیا کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل میں اتنی پیچیدگیاں نہیں تھیں جتنی آج ہیں۔ ہر واقعہ پر مدبروں اور سیاست دانوں کی نگاہیں مستفسرانہ انداز میں پڑتی ہیں اور وہ اُس کی کڑیاں تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ ماضی کی تمام روایات فلسفۂ سیاست و تمدن نئے علوم کی تیز روشنی میں دیکھے جا رہے ہیں اور اب دنیا کے بسنے والوں میں اتنی جرأت آ رہی ہے کہ وہ اُن تمام حقائق سے انکار کر دیں جو اُن کی سمجھ میں نہیں آتے، یا جو زندگی کے مسائل کا حل پیش نہیں کرتے۔ تغیر اور انقلاب کی مسلسل کشمکش ہر شعبۂ حیات میں نظر آ رہی ہے، اور اُس سے دلچسپی لینے والے اندھیرے اور اُجالے کے درمیان اپنا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔

تاریخ کے فلسفۂ جدیدہ یعنی کارل مارکس کے نظریۂ تاریخ نے رفتارِ زمانہ کی تحلیل کا وہ حربہ ہمارے ہاتھ میں دے دیا ہے جس کی مدد سے واقعات کے اسباب وعلل، نتائج اور اثرات کا بالکل صحیح تجزیہ ہو سکتا ہے، زندگی حرکت میں ہے! اور کائنات کو ایک لمحہ کے لئے سکون نہیں، دنیا کا چپہ چپہ اقتصادی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہے اور خواہ زمین کا کوئی حصہ غلامی کی کتنی ہی مضبوط زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو، لیکن وہ بھی کسی دن زنجیر کا بوجھ محسوس کر کے اُس سے آزاد ہونے کی کوشش کرے گا۔ ہندوستان اِن انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس کے یہاں بھی زنجیر میں جھنکار پیدا ہوئی اور چونکہ وہ بوسیدہ ہو چکی تھی اِس لئے اُس میں جا بجا رخنے بھی پیدا ہو گئے۔ شہنشاہی اور سرمایہ داری کے پرانے اصول جو اُسے جکڑے ہوئے تھے دنیا سے اُٹھ رہے تھے اِس لئے ہندوستان کے سامنے بھی ایک آزاد اور ترقی پسند جمہوریت کا تصور آ گیا۔

یوں تو غیر ملکی حکومت سے آزاد ہونے کی کوشش ہندوستان میں کیا بلکہ اس سے بھی پہلے ہی سے نظر آ رہی ہے لیکن اُس جد و جہد کا تعلق اِس مضمون سے نہیں، ہمارے پیش نظر بیسویں صدی ہے اور اُس کا بھی وہ حصہ جسے سیاستِ جدیدہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ۲۱-۱۹۲۰ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کے سامنے آزادی کا مطالبہ کچھ اس طرح آیا کہ سیاست اور آزادی کی لڑائی سرمایہ داروں اور متوسط طبقہ کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود عوام تک اپنا اثر ڈالنے لگی اور عمل کے جذبے کچھ تو عوام میں اور زیادہ تر متوسط طبقہ کے لوگوں میں بیدار ہونے لگے۔ اُس وقت سے لے کر اگر ہم آج تک کے رجحانات کا اندازہ کرنا چاہیں تو اِس سیاسی تحلیل کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو جلد جلد اُلٹنا پڑے گا، یہاں تک کہ ہم ۱۹۲۹ء تک آ جائیں۔ مہاتما گاندھی اور دوسرے آزادی چاہنے والے ہندوستان کی بے بسی، افلاس اور اقتصادی تاراجی سے اچھی طرح باخبر تھے، یہی وہ خیالات تھے جو انھیں اس جد و جہد کی طرف لے گئے، لیکن اتنا ہمیں یقیناً ماننا پڑے گا کہ اُن لوگوں کے سامنے آزاد ہندوستان کی کوئی منظم اور صاف تصویر نہ تھی، اُن کی سیاست ہندوستان سے متعلق تھی یا کبھی کبھی انگلستان کی تبدیلیوں پر بھی نظر پڑ جاتی ہو گی وہ بھی اِس اُمید میں کہ وہاں کس جماعت کے لوگ برسرِ اقتدار ہو رہے ہیں اور اُن سے زیادہ سے زیادہ کیا حقوق ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔ اس کے اثرات گو آج

بھی جا رہے ہیں، لیکن بہت کم، کیونکہ جب گاندھی جی وائسرائے سے ملنے جاتے ہیں تو بہت سے لوگ ایک اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اخبارات بڑی امید افزا سُرخیاں قائم کرکے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس قِرآن السعدین سے ہندوستان کے معاملات میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی ہوگی۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ ۲۹-۱۹۲۸ء تک ہندوستانی مدبرین کو بین الاقوامی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ لڑتو رہے تھے لیکن اس طرح نہیں جیسے آج لڑ رہے ہیں۔

جب ہم ہندوستان اور اُس کی سیاسی تبدیلیوں یا آزادی کی جدوجہد کا تذکرہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ اس میں اور دوسرے ملکوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک مدت سے برطانوی سامراج کے تسلط نے ذہنیت ہی بدل دی ہے، ہمارے سوچنے اور غور کرنے کا ڈھنگ ہی وہ نہ تھا جو دوسری جگہ کے لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ بار بار لکھا جا چکا ہے اب اُس میں بڑا تغیر ہوگیا ہے اور اُسی کا تذکرہ ان آگے کے صفحات میں ہوگا، اس جگہ اتنا اور ذہن نشین ہو جانا چاہیئے کہ ہندوستان کی جو طبقاتی تقسیم ہے وہ کچھ اس طریقہ کی ہے کہ اس میں اِسی حالت کو قائم رکھتے ہوئے خود اپنے یہاں کے لوگوں کی حالت درست کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے چہ جائیکہ اس میں اور ملکوں کا مفاد بھی شامل ہو، یہ برطانوی سرمایہ داروں کا اکھاڑہ ہو، امریکہ، جاپان اور جرمنی وغیرہ کے لئے بازار کا کام دے رہا ہو۔ بیرونی حکومت لاکھ ہمارا فائدہ چاہتی ہو، لیکن اپنے ذاتی نفع سے زیادہ نہیں چاہ سکتی۔ ہمارے تمام ذرائع آمدنی اور دولت پر اُس کا قبضہ ہے، اور ہماری حیثیت اُس لومڑی کی ہے جو صراحی کے اندر منہ ڈال کر کھانے والے سارس کے چونچ سے گری ہوئی چیزوں ہی سے بہرہ یاب ہوسکتی تھی۔

اب ہمیں ہندوستان کی سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور معاشی جماعتوں کا جائزہ لینا چاہیئے، کیونکہ اُنھیں کی خواہشات اور نظریات کے تصادمات سے مختلف رجحان پیدا ہوتے ہیں، ایک کا دوسرے پر کیا ردِ عمل ہوتا ہے اور ان سب کی تہ میں وہ کون طوفانی لہریں ہیں جن پر ہندوستان کے مطالبات کی بنیاد ہے۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ رُجحانات اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں کہ ممکن ہے اس مضمون کے شائع ہونے تک کوئی بالکل نئی تبدیلی بین الاقوامی فضا میں پیدا ہو جائے، اور اس کا اثر ہندوستان پر بھی پوری طرح پڑے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے کسی موقعہ پر کہا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ــــ ایک آزادی چاہنے والی اور دوسری آزادی نہ چاہنے والی۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور ہندوستان کی جماعتوں کا سیاسی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا جائے تو یہی بات بالکل سچ نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ مضمون بالکل خارجی طریقہ پر پیش کیا جا رہا ہے، اس لئے کسی جماعت کے منشار اور پروگرام (اگر کوئی ہو) سے زیادہ بحث نہ کی جائے گی بلکہ جیسا کہ خود عنوان سے ظاہر ہے، اس میں صرف رجحانات کا ذکر ہوگا اور اُن سے جو اثرات مترتب ہوں گے اُن پر بھی غیر جانبدارانہ نگاہ ڈالی جائے گی۔ سب سے پہلے ہمیں یہاں کی اُن جماعتوں کا جائزہ لینا چاہیئے جن کے کچھ سیاسی یا نیم سیاسی نظریات ہیں، اور جن پر قائم رہ کر وہ جماعتیں عوام کے لئے کوئی ایسا خاکہ تیار کرنے کی مدعی ہیں جس میں زندگی آرام اور چین سے بسر ہو۔

ایک ایسے طبقہ کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جو ہر طرح برطانیہ کا خیر خواہ ہے اُن کی حیثیت اُن وفادار جماعتوں کی طرح ہے جو اپنے بادشاہ کے پسینہ پر خون بہانے کو تیار رہتی تھیں اور جنھیں (Loyalists) لائلسٹ کہتے تھے، یہاں اُن کی تعداد زیادہ تر برطانوی حکام سے بڑھتی ہے، ہندوستان کے بھی کچھ لوگ طبعاً اور فطرتاً اِس نقطۂ نظر کو پسند کرتے ہیں، لیکن زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جن کو مصلحتہً اِسی جماعت میں پناہ لینی پڑی۔ چونکہ یہ جماعت سیاسی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، اور قومی مطالبات کے سامنے کوئی ایسی دلیل نہیں پیش کرتی جسے عوام اچھی نظر سے دیکھ سکیں، اس لئے اُن پر زیادہ وقت ضائع کرنا بیکار ہے، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی جو مصلحتہً اس جماعت کے حامیوں میں سے ہیں، فضا کے بدل جانے پر اپنی جگہیں دوسری سیاسی جماعتوں میں تلاش کرلیں گے۔

ایک دوسری سیاسی جماعت جس کی تعداد کم نہیں ہے "لبرل" (Liberals) کہی جاسکتی اِس جماعت کا سیاسی پروگرام اِس قدر غیر متعین ہے کہ اُس کی قوت اور جماعت کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ تلک اور گوکھلے کے زمانہ میں اِسے عروج تھا اور فضا اِسی کی مقتضی تھی کہ اِسی غیر متعین پروگرام سے کام لے کر متوسط طبقہ میں قومی جذبات اُبھارے جائیں، لیکن زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ یہ جماعت اپنے قدم نہ بڑھا سکی،

نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے قومی اور اقتصادی مطالبات تو کہیں سے کہیں پہونچ گئے لیکن اس جماعت کی نظر میں وسعت اور خیال میں ترقی نہ پیدا ہوئی، ان لوگوں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے مطالبات میں کوئی امتیاز نہیں رکھا، اور دستوریت کے اسی طرح شیدائی بنے رہے، چنانچہ آج جب انقلاب کی لہر عوام میں بھی بیداری اور زندگی کی روح پھونک رہی ہے۔ لبرل جماعت کے پاس صرف متوسط طبقہ کے درد کا علاج ہے، اس وقت کی ترقی پسند جماعتیں لبرل پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کو رجعت پسند اور سامراج دوست تصور کرتی ہیں۔ اس جماعت کے حدود معین نہیں، اس میں ہر وہ اصلاح پسند شخص رکنیت پاسکتا ہے۔ جو ہندوستان کی آزادی بتدریج چاہتا ہے، جو دستور اور اصلاحات کے تقاضوں میں خوش ہو لیتا ہے جس کی نظریں عوام کے دکھ درد سے آشنا نہیں۔ یہ جماعت اپنی کامیابی کے لئے صرف اخباروں اور کانفرنسوں، تقریروں اور تحریروں پر بھروسا رکھتی ہے عمل کی اس میں کہیں گنجائش نہیں۔ جب یہ عمل کی طرف آتے ہیں تو اس کا تعلق بھی صرف بڑی اونچی عمارتوں کے ڈرائنگ روم سے ہوتا ہے۔ جس طرح یہ عوام سے بیخبر ہوتے ہیں اسی طرح عوام بھی ان سے واقف نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ان کا کوئی پروگرام متعین نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ لبرل اخباروں میں کبھی کبھی ایک کانگریس کی اعتدال پسندی پر خوشی منائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ لبرل بھی یہی کہتے ہیں اور کبھی کبھی رجعت پسندوں کی حمایت میں صفحے سیاہ کئے جاتے ہیں اور سامراج کی تعریف کے پل باندھے جاتے ہیں،

یہ دو جماعتیں جن کا ذکر اوپر ہوا اس طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جن کے سامنے آزاد ہندوستان کا تصور نہیں بلکہ وہ ان جماعتوں کی عملی جد و جہد کو بھی بری نظر سے دیکھتی ہیں جو آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ فضا کے تقاضے کے ساتھ یہ کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔

اب ہماری نظر آل انڈیا نیشنل کانگریس پر پڑتی ہے، یوں تو یہ جماعت جس کی بنیاد ہی میں غیر ملک والوں کا ہاتھ شریک تھا بہت سے انقلابات دیکھ چکی ہے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے اس میں جتنی تیزی سے تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اس کا بہت بڑا ثبوت ہیں کہ کانگریس وقت کا ساتھ دے رہی ہے کانگریس عوام کے مطالبات کے ساتھ بدل رہی ہے اور بین الاقوامی مہمات سے متاثر ہو کر اپنی جگہ تاریخ میں حاصل کر رہی ہے سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے کانگریس لبرل جماعت کے اثر سے کسی حد تک باہر نکلی اور دن پر دن آگے ہی بڑھتی چلی گئی۔ اس کے بہت سے ساتھی پیچھے چھوٹ گئے، لیکن اس کے قدم زمانہ کا ساتھ دے رہے تھے، ان اہم تبدیلیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان تغیرات میں کچھ لوگ تو آگے نکل گئے کچھ ساتھ نہ دے سکے مگر کانگریس کا دامن انھوں نے نہ چھوڑا اسی لئے آج بھی جب ہم ذرا غور سے دیکھتے ہیں تو خود کانگریس میں مختلف درجے نظر آتے ہیں جیسے تھیئٹر دیکھنے کے لئے لوگ مختلف درجوں میں بیٹھے ہوں اسی طرح ہندوستان کی آزادی اور دنیا کی تحریکات کا تماشا پوری کانگریس مختلف نگاہوں سے کر رہی ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو اس کے دو بڑے ٹکڑے ہندوستانی سیاست کے ایک معمولی طالب علم کو بھی نظر آجائیں گے، آسانی کے لئے ہم پہلے طبقہ کو "گاندھی کا مقلد" اور دوسرے کو "ترقی پسند جماعت" کہہ سکتے ہیں۔ دونوں کی خصوصیتیں اس قدر الگ الگ ہیں کہ ہم آسانی سے انھیں دو نام دے سکتے ہیں۔

مہاتما گاندھی نے افریقہ میں ہندوستانیوں کے لئے کارنمایاں کرنے کے بعد ہندوستان کی طرف نظر کی، ان کی حیثیت ایک مصلح قوم سے زیادہ نہ تھی، لیکن سامراج اور سامراج سے تعلق رکھنے والوں نے انھیں ہمیشہ باغی سمجھا۔ انھوں نے عوام تک اپنی آواز پہونچانے میں پوری کامیابی حاصل کی، عدم تشدد اور اہنسا کے فلسفہ کی مدد سے قومی تحریک کو ایک باضابطہ انقلابی جماعت کی شکل دے دی، انھوں نے آزاد ہندوستان کا کوئی باقاعدہ تصور نہیں پیش کیا، لیکن آزادی کی تڑپ بہت سے دلوں میں پیدا کر دی، ان کی سادہ زندگی، ان کی تحریر اور تقریر کا زور، ان کا استقلال اور ہندوستانیوں کی نبض شناسی نے انھیں صرف ایک سیاسی لیڈر اور قومی رہنما ہی نہیں مانا بلکہ ایک ہلکی سی مذہبی اہمیت بھی ان کے نام کے ساتھ شریک کر دی گئی۔ لہٰذا لوگ صرف ان کے سیاسی خیالات سے نہیں بلکہ اخلاقی تعلیمات سے بھی متاثر ہوئے اور ایک ایسی جماعت بن گئی جو ان کی پوری مقلد کہی جاسکتی ہے، اس جماعت کے لوگوں نے درحقیقت خود کچھ نہیں سوچا بلکہ اسی حال میں رہے گا جو گاندھی جی نے پھیلا دیا تھا۔ ان کی زبردست شخصیت کا یہ جادو تھا کہ کچھ دلوں کے لئے ان کی ذات اور کانگریس ایک سمجھی جانے لگی، یہاں ان سے بحث نہیں بلکہ صرف بتانا یہ ہے کہ ان کے

مقلدین کا ایک گروہ تیار ہو گیا جو جان اور مال کی قربانیوں کے لئے تو ہر وقت تیار ہے مگر اُس کے سامنے کوئی ایسا پروگرام نہیں جسے تاریخی ارتقار کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اُس جماعت میں خود کئی اونچے نیچے طبقے ہیں۔ ایک زینہ پر ہیں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی، ستیہ مورتی اور راجگوپال اچاریہ نظر آتے ہیں تو اُس سے کچھ اونچائی پر مولانا ابو الکلام آزاد اور بابو راجندر پرشاد کے سے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ ستیہ مورتی اور ڈیسائی ہندوستان کی بین الاقوامی حیثیت ذہن میں نہیں رکھتے۔ ممکن ہے ان کا اپنا کوئی ذاتی تصور ہو مگر یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ موجودہ تاریخی ارتقا میں کسی خاص مرتبہ پر نہیں رکھا جاسکتا۔ اس اختلاف کا ایک ادنیٰ ثبوت تو یہی ہے کہ ہندوستانی فوجوں کے شنگھائی بھیجے جانے میں ان حضرات کو اور دوسرے بہت سے کانگرسیوں کو کوئی بات نظر نہیں آتی۔ لیکن اور کانگرسی جن میں جواہر لال نہرو، سرت چندر بوس اور نوجوان طبقہ شریک ہے حکومت کے اس طرزِ عمل کو نہایت بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ میری نظر سے گاندھی کا بھی کوئی بیان اس پر نہیں گزرا، غالباً انھوں نے بھی اس کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت پر غور نہیں کیا ہوگا۔ وہ سامراج کے دوست نہیں لیکن وہ اور اُن کے مقلدین کے دلوں میں کہیں نہ کہیں دستوریت اور اصلاحات کے لئے اب بھی جگہ ہے۔

ترقی پسند جماعت کانگریس ہی کا ایک جزو ہے اور اُسے کانگرس سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ صرف فرق یہ ہے کہ اُس کے سوچنے اور غور کرنے کا انداز، اُس کا سیاسی اور آئینی تصوّر، اُس کا طریقۂ جنگ گاندھی کے مقلدوں سے جداگانہ ہے، اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کے پاس ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ آزاد ہندوستان کے لئے بھی ایک باقاعدہ پروگرام ہے، وہ اشتراکیت اور اجتماعیت ہی میں دُنیا کا امن و سکون دیکھتے ہیں اور ہندوستان کو ایک لمحہ کے لئے بھی دنیا سے علیحدہ نہیں دیکھتے، کانگرس کا یہ ترقی پسند طبقہ اگرچہ متوسط طبقہ اور اُس میں بھی نیچے کے حصے سے تعلق رکھتا ہے، مگر اس کا ہر قدم عوام کے لئے اُٹھتا ہے، وہ اس انقلاب کو مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ایک سلاحِ جنگ کی طرح دے دینا چاہتا ہے، کیونکہ اُس کے سامنے تاریخ کا یہ سبق موجود ہے کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہی ہیں۔ اس جماعت کی راہ میں بڑی دقتیں ہیں کیونکہ ہندوستان کے عوام میں زیادہ تر تعداد اُن کسانوں کی ہے جو ذہنی طور پر آسانی سے کسی بڑے کام کے لئے اُبھارے نہیں جاسکتے، صدیوں کی غلامی نے اُن کے خون اور جسم میں کچھ بھی باقی نہیں رکھا، اُنھیں اپنی مصیبت اور اقتصادی پستی کا احساس بھی مشکل سے ہوتا ہے، وہ کوئی ایسی جد و جہد نہیں کرتے جس میں اجتماعی حیثیت سے اُن کا کوئی فائدہ ہو، وہ جاہل ہیں اور اُن تک آزادی اور مساوات کا پیغام پہونچانا آسان نہیں ہے، اگرچہ حالت بہت اُمید افزا ہے، مگر اب بھی اُن میں انقلابی شعور پیدا کرنے کے لئے وقت اور محنت کی ضرورت ہوگی، کانگرس کی یہ جماعت اپنی نگاہیں صرف عوام پر جمائے ہوئے ہے، تھوڑے سے زمیندار ناخوش ہوتے ہیں تو ہوں، کچھ فیکٹریوں کے مالک ناراض ہیں تو رہیں۔ مگر غریبی اور افلاس اُس وقت تک آرام اور سکون میں تبدیل نہیں ہوسکتا، جب تک بعض طبقے بعض طبقوں کے لئے کچھ قربانیاں نہ کریں، وہ اپنی خوشی سے ہو یا جبر کے ساتھ۔

یہ ترقی پسند جماعت ہندوستان کو دنیا کے نقشہ میں دیکھتی ہے اور تمام سامراج دشمن طاقتوں میں اپنے لئے ہمدردی پاتی ہے، اُسے اسپین کی حکومت سے محبت ہے کیونکہ وہ آزادی اور مساوات کی علمبردار ہے اور فرینکو کی باغی فوجیں وہاں پھر وہی دورِ متوسط کا سا مستبد اور انحطار پذیر نظام قائم کرنا چاہتی ہیں، وہ چین کے سرفروش بہادروں سے ہمدردی رکھتی ہے، کیونکہ اُن کی کوشش جاپانی شہنشاہیت سے نجات پانے کی ہے، انھوں نے ابی سینیا کی فتح پر افسوس کا اظہار کیا تھا، وہ فلسطین کے عربوں سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں، کیونکہ برطانوی سامراج اُن کے ساتھ بھی وہی کھیل کھیل رہا ہے جو ہندوستان کے ساتھ۔ اس طرح آزادی کی وہی جد و جہد جو گاندھی جی کے ساتھ صرف ہندوستان کی آزادی تک محدود تھی، اب سامراج دشمن بن گئی ہے، پورے زاویۂ نگاہ میں فرق آگیا ہے، یہ سب کچھ پچھلے پانچ چھ برسوں میں ہوا، اس سے پہلے یہ عام تاریخی اور اقتصادی نقطۂ نظر چند پڑھے لکھے اشتراکیوں تک محدود تھا، وہ کانگرس کو ایک چھوٹے سرمایہ داروں اور متوسط طبقہ کے لوگوں کی نمائندہ جماعت سمجھتے تھے، وہ گاندھی اور اُن کے ہر طریق کار کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن جب آہستہ آہستہ جواہر لال نہرو

کی سرکردگی میں کانگریس عوام سے بالکل قریب پہونچ گئی تو اُس فلسفہ سے دلچسپی لینے والے لوگ بھی اِسی جھنڈے کے نیچے آگئے۔ اِس طرح کانگریس ہی کے اندر ایک ترقی پسند طبقہ پیدا ہو گیا۔

بہت سے سوشلسٹ جو کانگریس میں شریک ہوئے اس کے پورے پروگرام سے متفق نہ ہو سکے اور اس بڑی جماعت کے اندر ہی اندر اُنھوں نے اپنی ایک چھوٹی سی جماعت اور بنالی اور اُس کا نام بھی کانگریس سوشلسٹ پارٹی رکھا۔ اس کا دامن ایک طرف تو کانگریس سے بندھا ہوا ہے دوسری طرف خود اُس کے پیشِ نظر کارل مارکس کا دیا ہوا وہ اقتصادی پروگرام ہے جسے کانگریس پوری طرح نہیں لے رہی ہے۔ اُن میں اور پرانے کانگریسیوں میں کافی اختلافات ہیں، جن کا سب سے بڑا ثبوت وزارتوں کے قبول کرنے اور نہ کرنے کا مسئلہ تھا۔ کانگریس کی مجلسِ انتظامیہ نے وزارتیں قبول کرلیں۔ لیکن سوشلسٹ پارٹی نے کانگریس میں ہونے کے، باوجود اسے قبول نہیں کیا اور کوئی شخص جو اچھے وزیر بنتے عوام کو اس طرح فائدہ نہ پہونچا سکے۔ یہ بحث اس مضمون سے خارج ہے کہ اس جماعت کا یہ طرزِ عمل کیسا رہا مگر اتنا ضرور کہا جائے گا کہ یہ موقع کی سیاسی سخت تھی کہ وزارتیں قبول کی جائیں۔ پرانے کانگریسیوں (جنھوں نے وزارتیں بنائی ہیں) کے آسانی سے اصلاحی اور آئینی ہو جانے کا زیادہ اندیشہ ہے، مگر چونکہ سوشلسٹ جانتے اُن کے پاس ایک مکمل فلسفۂ عمل تھا وہ اِس گڑھے سے اپنے تئیں بچا سکتے تھے۔ یہ خوف بالکل بجا تھا کہ ہمارا محاذِ جنگ ہٹ کر صرف اسمبلیوں پر چلا جائے گا، لیکن سوشلسٹ وزارتوں میں جا کر عوام کا اس سے زیادہ بھلا کر سکتے تھے، جتنا وہ اِس وقت باہر کر رہے ہیں۔

بہرحال ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ خود کانگریس کے اندر جو جماعتیں ہیں اُن میں یہی ترقی پسند جماعت آزادی کی جدوجہد میں سب سے آگے ہے کیونکہ اس نے ہندوستانی سیاست کو بین الاقوامی رنگ دے کر تاریخی ارتقاء سے ہم آہنگ بنا دیا ہے، یہ اُس طبقہ کو ساتھ لے کر آگے جانا چاہتی ہے جن پر کسی ملک کی قوت کا مدار ہوتا ہے۔

کچھ تعداد ایسے اشتراکیوں کی مل جائے گی جو کسی وجہ سے کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔ اُن کے علاوہ دہشت پسند اور کچھ دوسرے انتہا پسند بھی ہیں جو تشدد کے قائل ہیں، لیکن اُن کی قوت زیادہ نہیں ہے، اور وہ بھی آہستہ آہستہ کانگریس ہی میں شریک ہوتے جا رہے ہیں۔ کاکوری کی سازش کے سلسلہ میں جو لوگ قید تھے وہ چھوٹ گئے ہیں اور اُنھوں نے جو بیان دئے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصلحتِ وقت کے لحاظ سے وہ کانگریس ہی کی صفوں کو مضبوط بنائیں گے۔ وہ اپنے الگ سیاسی نظریہ کو کانگریس کی ترقی میں کسی طرح کی رکاوٹ ڈالنے کا سبب نہ بنائیں گے، یہ تمام جماعتیں جن کا کانگریس کے سلسلہ میں ذکر ہوا ویسے لاکھ مختلف خیالات رکھتی ہوں، لیکن اس کے باوجود استعماریت کے خلاف سب کا محاذ ایک ہی ہے اور آہستہ آہستہ سب ایک ہوتی جا رہی ہیں۔ اِن نظریات کا تصادم تو درحقیقت ہندوستان کی آزادی کے بعد ہوگا۔ کیونکہ موجودہ انقلاب تو اصل میں سامراج سے چھٹکارا پانے کے لئے ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے کہ یہاں کے لوگوں کا نفسی تجزیہ کرنا آسان نہیں ہے، جذبات اور خیالات اتنے گوناگوں ہیں کہ اُن کی تحلیل سمجھ میں نہیں آتی۔ سیاسی اختلافات تو اتنے شدید نہیں لیکن ہندوستان پر اور اثرات جو کام کر رہے ہیں اُن کی وجہ سے ترقی کے راستہ میں بڑی رکاوٹیں نظر آتی ہیں۔ اگر اس ملک کی مذہبی جماعتوں کی تقسیم کی جائے اور اُن پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہ کئی حیثیتوں سے دلچسپ ہوگی۔ اپنی اکثریت کی وجہ سے سب سے پہلے ہندو ہمارے سامنے آتے ہیں، لیکن چونکہ اس مضمون میں ہمیں صرف سیاسی رجحانات پر نظر ڈالنا ہے، اس لئے ہم مذہبی جماعتوں کا اتنا ہی ذکر کریں گے جتنا اُن کا ردِّ عمل سیاسیات پر ہوتا ہے، جب مذہبی جماعتیں بنتی ہیں تو اُن میں بعض تو خالص مذہبی اور معاشرتی فرائض انجام دیتی ہیں اور بعض سیاسیات کو بھی اپنے پروگرام میں رکھتی ہیں، ایسی صورت میں ہمیں ہمیشہ یہی نظر آتا ہے کہ وہ جماعتیں رجعت پسند ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ انحطاط پذیر روایات کے دامن میں پناہ لیتی ہیں، مہا سبھا یا مہا سبھائی ذہنیت کے سکھ، بنگال وغیرہ کی نیشنلسٹ پارٹی اس تقسیم کے تحت میں جگہ پاتی ہیں۔ اِن سے سیاسی میدان میں تو کچھ بڑی بات ہوتی نہیں ہاں کبھی کبھی ان کی وجہ سے فضا مکدر ضرور ہو جاتی ہے، اور جو کام آسانی سے طے ہو جاتا وہ نہیں ہو سکتا، اس میں بالعموم یہی ہوتا ہے کہ یہ چند پڑھے لکھے لوگوں کی ذاتی اور ذاتی مفاد کا مشغلہ ہوتا ہے اور عوام کو اس سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ یہ لوگ صاف طرح یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، اُن کے یہاں مذہبی

مطالبات سیاسی مطالبات سے پہلے آتے ہیں، ان کے یہاں انسانوں کی اقتصادی اور معاشی زندگی مذہب کے بعد آتی ہے ۔ مختصر یہ کہ ان میں کافی رجعت پسندی پائی جاتی ہے ،

اس طرح کی مذہبی تقسیم کرتے وقت اور بالخصوص ہندوؤں کے ذکر میں اچھوت ذاتوں کا نام نظر انداز کرنا بات کو نامکمل چھوڑ دینا ہے ، اچھوتوں کی اصلاح کا مسئلہ تو عرصہ سے چلا آ رہا تھا ، لیکن گاندھی جی کے فاقہ کے بعد سے اس نے بڑی سیاسی اہمیت اختیار کر لی ، کچھ مسلمان اسے محض مذہبی چیز سمجھتے ہیں اور کچھ سیاسی ، خیال یہ ہے کہ سب اچھوت ہندوؤں کی طرح حقوق پا کر ہندو قوم کی طاقت اور تعداد میں اضافہ کر دیں گے اور اس طرح مسلمانوں کا فیصدی تناسب اور بھی کم ہو جائے گا ، ہندوؤں کے یہاں خود اس مسئلہ پر کئی طرح سے نگاہ ڈالی جاتی ہے ، بغیر تفصیل میں گئے ہوئے جہاں تک اس مسئلہ پر سیاسی رجحان کا تعلق ہے یہ کسی قدر یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے ، جداگانہ انتخاب کے لئے انھیں ہندوؤں میں شریک ہونا ہی پڑے گا ، ورنہ اگر ان کی نشستوں کا تعین بھی کیا گیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اور بہت سی اقلیتیں اپنے لئے الگ جگہیں مقرر نہ کرائیں ، مخلوط انتخاب جس کا آنا ضروری ہے ، غالباً اس تفریق کو مٹا کر رہے گا ، اب تک ان کے ساتھ جو مراعات رکھی گئی ہیں وہ اس کا پیش خیمہ ہیں کہ مستقبل میں انھیں عام ہندوستانیوں کے تمام حقوق ضرور ملیں گے ، ان کے یہاں بھی لیڈروں کی خود غرضیوں کی وجہ سے کوئی فیصلہ کن رائے اب تک قائم نہ ہو سکی ، اس سلسلہ میں یہ ضرور ہوا کہ چند ہندو ، مسلمان اور عیسائی تبلیغی اداروں کے لئے ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا اور مذہبی اخباروں کو کچھ مضامین کے لئے مواد ۔

ہندوؤں کے بعد ہماری نظر مسلمانوں پر پڑتی ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے زیادہ تر مسلمان کسی قدر کشمکش و پیچ کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ چونکہ وہ مذہب کو بھی ساتھ رکھنا چاہتے ہیں اس لئے انھیں ہندو اکثریت سے خوف ہے ۔ کانگریس کی تجویز یا اور دستور العمل ، ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق کی دفعات سب ان کے سامنے ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمت نہیں کرتے ۔ اُن کے یہاں شیعہ سنی ، وہابی اور قادیانی ، مقلد اور غیر مقلد کے اتنے جھگڑے ہیں کہ سات آٹھ کروڑ کی جماعت انھیں مسائل میں پھنس کر رہ گئی ہے ، اس میں کچھ تو یقیناً سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ مذہب کو زندگی کا جزو سمجھ کر اختلاف رکھتے ہیں اور اُس کا اظہار کرتے ہیں ، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں صرف اہم معاملات سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے لئے مذہبی مسائل کو قومی مسائل کے سامنے لا کر کھڑا کر دینے میں لطف آتا ہے ، ہندو ذہنیت کے خوف کی وجہ سے مسلمان کوئی فوری فیصلہ نہیں کر رہے ہیں ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں دو گروہ خاص طور پر نمایاں ہیں ، ایک تو وہ جو جنگ آزادی میں شریک ہونے سے پہلے اپنے حقوق متعین کرا لینا چاہتے ہیں ، اور اِسے شرط کے طور پر پیش کرتے ہیں ، لیکن کچھ وہ بھی ہیں جو بغیر شرط کے کانگریس میں شریک ہو جانا چاہتے ہیں ۔ غالباً ہندو ذہنیت کا خوف ایک وقتی چیز ہے اور مسلمان فضا کے تقاضوں سے مجبور ہو کر جد و جہد میں شریک ہوں گے ، اور یہ صاف بات بھی ہے کہ جب تک مسلمان بڑی تعداد میں کانگریس میں شریک نہ ہو جائیں گے اُس وقت تک کانگریس میں ہندوؤں کی اکثریت کا تناسب کس طرح بدل سکتا ہے ، جب مسلمان پرزوں کی طرح کانگریس کی مشین میں لگ جائیں گے تو اُن کے حقوق نظر انداز کئے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکے گا ، جہاں تک مسلمانوں کی شرکت اور عدم شرکت کا تعلق ہے وہ اس بحث سے خارج ہے ، لیکن رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس تیزی سے مسلمان عوام کانگریس کے ممبر بن رہے ہیں وہ اُن کے کانگریس میں پوری طرح مل جانے کا پتہ دے رہی ہے ۔ جہاں تک عوام الناس کی ضرورتوں کا تعلق ہے اُس میں ہندو اور مسلمان سب برابر ہیں ، اس لئے جو جماعت اُن کا دکھ دور کرنے کا دعویٰ کرے گی وہی اُن کی نگاہوں اور خیالات کا مرکز بن جائیگی ، اب تک مسلمانوں کی کسی جماعت نے کوئی اقتصادی اور معاشی پروگرام عوام کے سامنے نہیں پیش کیا ، اس لئے کوئی جماعت اُن کی تمام ضرورتوں کے پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ، کانگریس مذہبی معاملات سے علیحدہ ہو کر اُن کی روٹی اور زمین کا خاکہ اُن کے سامنے لاتی ہے ، اس لئے اُن کا ایسی جماعت سے ہمدردی رکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

اس مذہبی تقسیم میں اتنی جگہ نہ صرف ہونی چاہئے تھی ، مگر بات میں بات نکلتی آئی اور شاید اس میں بعض ضروری باتیں تھیں جن کے بغیر رجحانات کا مکمل نقشہ نہیں نظر آتا ، اب ایک اقتصادی یا طبقاتی تقسیم کا اور ذکر کر کے ہم پورے مضمون کا جائزہ لیں گے ۔

اس سلسلہ میں حکومت کے عمال اور حکام کا ذکر کچھ زیادہ نامناسب نہ ہوگا، کیونکہ اُن کا معیارِ زندگی اور سیاسی نقطۂ نظر عوام سے بالکل مختلف ہوتا ہے، لیکن صحیح اقتصادی تقسیم رجعت پسند امیر اور ترقی پسند غریب ہی میں ہو سکتی ہے۔ سماج کے یہ درجات ہندوستانی سیاست کی گتھیوں کو اور پیچیدہ بناتے ہیں، امراء میں دو بڑے گروہ زمینداروں اور بڑے سرمایہ داروں کے نظر آتے ہیں۔ ہمارے تمدن میں اِن دو گروہوں کی خاص اہمیت ہے کیونکہ زمیندار زمین کا مالک ہوتا ہے، اُس کی پیدائش ہی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد برطانیہ کی خیر خواہی کے سلسلہ میں ہوئی؛ چونکہ زمیندار طبقہ کے لوگ کسی قدر آرام سے رہتے ہیں، اُن کے ہاتھوں میں چھوٹے پیمانہ پر حکومت ہوتی ہے اور اُن کی خدمت کرنے کے لئے رعایا کا ایک پورا طبقہ ہوتا ہے، اس لئے اُن کی بات حکومت کی نظر میں عوام کے مقابلہ میں بہت اہم ہوتی ہے، اُن کو اپنے مفاد کا اتنا خیال ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں رعایا کے عیش و آرام سے بالکل غافل ہو جاتا ہے، اور بعض صورتوں میں تو اس کا اظہار غلامی سے زیادہ بُری شکلوں میں ہوتا ہے۔ یہ طبقہ چونکہ حکومت کا بنایا ہوا ہے اس لئے اس نے ہر معاملہ میں حکومت کا ساتھ دیا اور حکومت نے بھی اس پر خاص نظر رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور سامراج دشمن طاقتوں نے زمینداری کو بھی حکومت کا ایک مستحکم قلعہ سمجھا اور ہر طرح اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں مصروف رہے، اِدھر چند ہفتوں سے جب کانگریس کے ہاتھ میں وزارتیں آگئیں تو اُن کا پہلا وار زمینداروں ہی پر ہوا۔ موجودہ گورنمنٹ کے اِس حکم میں کسانوں کی کھلی ہوئی طرفداری کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ عوام کے مقابلہ میں زمیندار کی ہمدردی نہیں کر سکتی۔ آج زمینداروں کو اس سے تکلیف یقیناً پہونچ رہی ہے، کیونکہ اُن کی حکومت اُن کے معیارِ زندگی اور اثرات میں فرق آ رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اُسی سطح پر لائے جا رہے ہیں، جہاں غریب کسان ہیں۔ یہ ایک قدامت پرست طبقہ کے دل پر چوٹ لگانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک دولت اور زمین کی یہ غیر مساوی تقسیم دنیا میں موجود ہے، کائنات کو امن و سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ جب تک دولت افضلیت کا معیار ہے اُس وقت تک انسانیت کو معراج حاصل نہیں ہو سکتی۔

بڑے بڑے سرمایہ دار فیکٹریوں اور ملوں کے مالک ہیں، ہزاروں لاکھوں مزدوروں کی جانیں اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ اُن کی محنت کا معمولی حصہ انھیں مزدوری کے طور پر دیتے ہیں، اور بہت زیادہ منافع خود رکھتے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام آج تقویم پارینہ بن رہا ہے ہندوستانی سیاست بھی اس سے متاثر ہے اور آئے دن کی مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش اِسے مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ چھوٹے چھوٹے مہاجن بھی ہیں جنھوں نے مزدوروں اور کسانوں کا خون چوس لیا ہے، اور جن کی اُمیدیں غریب کسانوں ہی سے وابستہ ہیں۔ یہ سب رجعت پسند طبقے اپنے مفاد کے خیال سے غربت اور افلاس کا خاتمہ ابھی نہیں دیکھنا چاہتے، لیکن طوفان اس قدر تیز ہے کہ اُن کی کمزور آواز اس سے اونچی نہیں جا سکتی۔

ان رجعت پسند طبقوں کے مقابلہ میں چھوٹے زمیندار اور تاجر، کسان اور مزدور ہیں۔ ان سب میں بیداری کی لہر نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہے۔ اور چونکہ اُن کے سامنے ایک اچھا مستقبل ہے اس لئے وہ جدّ و جہد میں پوری طرح شریک بھی ہیں۔ اگرچہ صنعت کی کمی کی وجہ سے ہندوستان کے سے بڑے ملک میں مزدوروں کی بہت کمی ہے، لیکن جو ہیں وہ زندہ اور بیدار ہیں، وہ آگے بڑھ کر حکومت کی باگ سنبھالنا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا کے اور مزدوروں کی طرح اپنے حقوق کے لئے ہر طرح کی قربانیاں کرنے پر تیار ہیں۔ اُن کی زندگی کا ثبوت بی، این، آر، کلکتہ جوٹ مل اور کانپور کی اسٹرائک اور ہڑتال سے اچھی طرح مل جاتا ہے۔ اگر مزدوروں کی تعداد اور زیادہ بڑھتی جائے اور اُن کے مطالبات قوت کے ساتھ حکومت اور سرمایہ داروں کے سامنے آئیں تو آزادی کی ساعت قریب تر آ سکتی ہے۔

اوپر لکھی ہوئی باتوں کی روشنی میں ہم کو ہندوستان کی فضا کے سیاسی تقاضے اور رجحانات کی رَو کا صحیح اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی، اب تک تو ہم نے صرف ہندوستانیوں کو مختلف زاویۂ نگاہ سے تقسیم کر کے اُن کے اثرات کا جائزہ لیا ہے، اب ہمیں اور زیادہ وسیع النظری کے ساتھ اُن پر تاریخی تنقید کی روشنی میں نظر ڈالنا چاہئے تاکہ اِس تحلیل کے نتائج سامنے آجائیں۔

اب ہندوستان کی سیاست سمندروں کو پار کرکے یورپ اور افریقہ کے واقعات سے اپنا رشتہ جوڑ رہی ہے، ہمالیہ کو عبور کرکے چین، روس اور فلسطین پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ ایسا کرکے وہ اس تاریخی حقیقت کا ثبوت پیش کر رہی ہے کہ دنیا کا چپہ چپہ ایک دوسرے سے وابستہ ہے، جہاں کہیں بھی استعماریت کے مظالم نظر آجاتے ہیں ہندوستان کے ترقی پسند لوگ اُسے اپنی حالت سے منطبق کرکے دیکھتے ہیں، اس رجحان سے یہ فائدہ ہوگا کہ عوام بھی اِن باتوں سے باخبر رہیں گے اور انھیں اس کا احساس ابھی سے ہوگا کہ ہندوستان آزاد ہوجانے پر اپنی حکمتِ خارجیہ میں کن طاقتوں کا دوست اور کن کا دشمن ہوگا

جب ہم ہندوستان کی سیاست پر ذرا وسیع اور گہری نگاہ کرتے ہیں تو ہم کو صرف دو قوتیں ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہیں ـــــ شہنشاہی اور شہنشاہی سے اختلاف رکھنے والی جماعتیں ـــ ان کے علاوہ اور تو چھوٹی چھوٹی لہریں ہیں جو اسی طرح اُٹھتی ہی مٹتی رہتی ہیں۔ لوگ ایک طرف سے ٹوٹ کر دوسری طرف شریک ہوتے رہیں گے اور دونوں فریق کی قوتیں بدلتی رہیں گی لیکن وہی جماعت فتحمند اور کامیاب ہوگی جس کے پیچھے عوام کے جائز حقوق اور مطالبات کی طاقت ہے۔

ابھی یہاں "اصلاحی ذہنیت" (Reformist Mentality) بھی موجود ہے اور اکثر تو وہ لوگ اس میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں جو اپنے کو ترقی پسند ظاہر کرتے ہیں۔ جب حکومت کی جانب سے تھوڑے سے مطالبات مل جاتے ہیں یا ملنے کی اُمید ہوتی ہے تو انقلابی شعور کی باڑھ کچھ ضرور کُند ہوجاتی ہے اور ذرا سے حقوق کے مل جانے سے فضا میں سکون اور مطالبات کی طلب میں کمزوری آجاتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو زیر سایۂ برطانیہ آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی طاقت عوام کے مطالبات کے مقابلہ میں اتنی کمزور ہے کہ اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی، اُن کے پاس کوئی اخلاقی یا قومی دلیل اس کی نہیں ہے کہ وہ کیوں ایسا چاہتے ہیں۔ یا تو وہ متعصب ہیں یا رجعت پسند۔ اسی سلسلہ میں ایک بات اور کہتا چلوں جو میرے ذہن میں عرصہ سے ہے، اقلیتوں میں زیادہ تر شنگوں کے گروہ پائے جاتے ہیں جو اصلاح پسند رہنمائی (Reformist Leadership) کی وجہ سے ترقی پسند راستہ پر نہیں آجاتے۔ میں مسلم لیگ کو بھی ایک ایسی ہی انجمن تصور کرتا ہوں۔ جو عوام اُس میں شریک ہیں اُنھیں ترقی کے راستے ابھی دکھائے نہیں گئے، ورنہ وہ آسانی سے اُس انجمن میں شریک ہوجائیں گے جو ان کی روٹی اور آزادی کا حل پیش کرتی ہے۔ اس وقت صرف آزادی یا تعین حقوق کا سوال نہیں ہے بلکہ بھوک اور کام کا سوال اُس سے زیادہ اہم اور خطرناک انداز میں اُٹھ رہا ہے۔ جو حکومت، وہ قومی ہو یا غیر ملکی، ان سوالات کا حل نہ بتائے گی اُسے انقلاب کا سامنا یقیناً کرنا پڑیگا۔

یہ خیال فضا میں پھیلا ہوا ہے کہ اب ہر طرح کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوجانا چاہئیے۔ زمین کا مالک صرف زمیندار یا حکومت نہیں رہ سکتی، فیکٹریاں سرمایہ داروں کی ملکیت نہ رہیں اور تجارت اور پیداوار پر کسی طرح کی پابندیاں عاید نہ کی جائیں۔

اگرچہ یہ موقع نہیں لیکن چونکہ تشدد اور عدم تشدد ہندوستانی سیاست کا ایک جزو بن چکے ہیں، اس لئے دو لفظ اِن پر لکھ دینا چاہئے۔ اس وقت قریب قریب تمام ہندوستانی اس بات پر متفق ہیں کہ مصلحتِ وقت کے لحاظ سے ہمیں عدم تشدد ہی کا کاربند رہنا چاہئیے۔ جیسا کہ پہلے کسی جگہ کہا گیا وہ لوگ بھی جو تشدد کے ماننے والے تھے، اُسے چھوڑ رہے ہیں،

ہندوستانی سیاسی جماعتوں کے انتہا پسند طبقے بھی اپنے طریق کار میں مختلف راستے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اشتراکیت اور آزادی کے مطالبات کو ساتھ ساتھ چلنا چاہئیے یا پہلے آزادی حاصل کرکے اُن تمام مدارج کو طے کرنا چاہئیے جو ایسے انقلاب کے لئے ضروری ہیں، یہ مسئلہ روز بروز بڑی اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے۔ ہندوستان کے اشتراکیوں میں دونوں خیال کے لوگ موجود ہیں، دونوں اپنے لئے کارل مارکس اور لینن ہی کو سرچشمہ بنائے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی ان میں اختلاف کی خلیج نہایت وسیع ہے، کانگریس سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے اور ایم این رائے کے متبعین ایک دوسرے کو غدار کی حیثیت دیتے ہیں، مسئلہ اہم ضرور ہے اور اشتراکیت کے پروپیگنڈے کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ تاہم ابھی سیاسی ضرورت یہی ہے کہ عوام کی ذہنیت کو مختلف مسائل میں الجھایا نہ جائے، پہلا مطالبہ یقیناً آزادی کا ہونا چاہئیے، اور ساتھ ہی عوام کے ساتھ جس قدر بھی کیا جاسکے کیا جائے، قوت کے ہاتھ میں آجانے پر ضرورتِ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے عوام کے لئے نئی دنیا پیدا کی جائیگی۔

ہیں کارل مارکس یا کسی اور کے اقتصادی نظریہ کو آنکھ بند کر کے نہ ماننا چاہیئے کیونکہ ہندوستان کئی حیثیتوں سے ابھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے مختلف ہے۔ ترقی پسند سیاسی اور اقتصادی نظریوں کی روشنی میں ہندوستان کی خصوصیات کا لحاظ رکھ کر قدم اُٹھانا پڑے گا۔

ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے اختلافات کچھ بھی ہوں لیکن تقدیر کی انگلی اس شاہراہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس پر سب کو چلنا ہے وقت کا مطالبہ ہے کہ سامراج، غلامی، بھوک، بیکاری اور افلاس دنیا میں نہ رہیں اور انسانوں کی ایک بڑی برادری قائم ہو جس میں رنگ روپ اور قوم و نسل کے امتیازات مٹ جائیں۔

محبوبہ کی شرط

تمہارے ہجر میں مرنا قبول کر لوں گی — غموں میں جی سے گزرنا قبول کر لوں گی
شبوں کو درد کے دریا میں ڈوب جاؤنگی — جگر کو سوز کے خنجر سے گدگداؤں گی
وفورِ گریہ سے آنکھیں خراب کر لوں گی — بہارِ زیست کو وقفِ عذاب کر لوں گی
غموں کی رات یہ توڑے گا دم شباب مرا — جلے گا آہ کے نغمات سے رباب مرا
کسی سکھی کو کسی گود میں جو پاؤں گی — جگر کو تھام کے چوکھٹ پہ بیٹھ جاؤں گی
کبھی جو کالی گھٹائیں فلک پہ چھائیں گی — تو بجلیاں سی رگ و پے میں دوڑ جائیں گی
یہ سب درست کہ تڑپا کروں گی راتوں کو — تمہارے ہجر میں آہیں بھروں گی راتوں کو

غرورِ غرب مگر جب تک نہ شرمائے
دیارِ ہند میں جب تک نہ پھر بہار آئے

اسیرِ دامِ غلامی نہ ہوں رہا جب تک — ملے نہ داغِ غلامی کا خوں بہا جب تک

شرابِ وصل کا اک گھونٹ بھی نہ پاؤ گے
تڑپ تڑپ کے یونہی زندگی گنواؤ گے

الطاف مشہدی

بلیدان

تقی، مہرولی

یہ اس وقت کی بات ہے، جب ہمارا بچپن تھا۔ ہم ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے، پاس گھر ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایک ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ پڑوس میں اور بھی ہم عمر ساتھی تھے۔ مگر ہم ایک دوسرے کے بغیر کسی کھیل کود میں حصہ نہ لیتے تھے۔ مدرسے سے بعد کا سارا وقت کھیل کود میں صرف ہوتا تھا، میں مٹی کے گھروندے بنا تا تھا اور وہ پھول پتیوں سے ان کی سجاوٹ کرتی تھی۔ ایک دفعہ سنا تھا، کہ "جس کا مٹی کا گھر بگڑ گیا سمجھو، اس کا اصلی گھر بھی بگڑ گیا"۔ اس لئے ہم اپنے مٹی کے گھروندوں کی زیادہ حفاظت کرتے تھے، برسات کے دنوں میں ہماری مصروفیتوں میں زیادہ اضافہ ہوجاتا تھا، وہ جھولتی تھی اور میں جھلاتا تھا۔ اسے صرف دو گیت آتے تھے، اور وہ بھی ادھورے۔ "میرے پیا کا یہی پتہ ہے۔ سانوری صورت بانکی ادا ہے" جب وہ گاتی تھی تو نظریں نیچی اور لبوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ مگر "ساون آیا پی گھر جائیں" کا گیت گانے میں اس کی آواز بھرا جاتی تھی، اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے —— نہ معلوم کیوں! —— تہواروں میں ہماری خوشیوں کی انتہا ہوتی تھی، ہولی کی رنگ رلیاں، دیوالی اور بسنت کی مسرتیں نہ معلوم ہمیں کس دنیا میں پہنچا دیتی تھیں۔ دسہرے کے دنوں میں اس کا معصومانہ انداز سے سیتا بننا آج تک یاد ہے۔

وقت کو گزرتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ کھیل ہی کھیل میں دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ بچپن کی دلچسپ باتیں سنجیدگی اور بردباری میں تبدیل ہوگئیں۔ بڑھے پن نے اس کی مصروفیتوں میں اضافہ کر دیا۔ وہ اب گھر کے سارے کام کاج کی ذمہ دار تھی، سورج نکلنے سے پہلے ہی پیسنے اور گھر کی صفائی سے فارغ ہوجاتی تھی، اس کے بعد ماں کے ساتھ پانی لاتی اور بعد میں رسوئی کا کام کرکے سینے پرونے میں مشغول ہوجاتی تھی۔ مدرسہ چھوڑنے کے بعد یہ اس کا ہر روز کا پروگرام تھا جس میں کسی کمی کی گنجائش نہ تھی۔ وقت کے لحاظ سے ہماری راہ و رسم اور ملاقاتوں میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ ہم اب بھی ایک ساتھ مندر جاتے تھے۔ ایک ساتھ بیٹھکر مختلف مسائل پر بات چیت کرتے تھے۔ ہر تہوار پر وہ میرے ٹیکہ لگاتی تھی، کشیدہ کاری کا اسے بہت شوق تھا۔ میں اسے کتابوں میں سے نئے نئے ڈیزائن بتاتا تھا۔

آخر وہ دن بھی آپہونچا جب مجھے کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گاؤں کو خیرباد کہنا پڑا، ہم ایک دوسرے سے جدا ہوگئے میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوگیا، تھوڑے ہی عرصے میں شہر اور کالج کی فضا نے میری زندگی میں نمایاں تغیر پیدا کر دیا، ہندوستان کی تحریک آزادی کا زمانہ تھا، کالج میں آئے دن ہڑتالیں ہوتی رہتی تھیں، بڑے بڑے جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہونے کا موقع ملتا تھا۔ لیڈروں کی تقریروں، جیلاؤں کی گرفتاریوں بچوں اور بوڑھوں کی قربانیوں نے مجھے اپنی ذمہ داری یاد دلائی، انگریزی سامراج سے بغاوت میں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ کالج کی تعلیم چھوڑ دیہاتوں میں گورنمنٹ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا، آخر ایک روز کسانوں کو مالگزاری ادا نہ کرنے کی تلقین کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ مجسٹریٹ نے بغاوت کا جرم عائد کرتے ہوئے تین سال قید سخت کی سزا تجویز

کر دی۔ سزا کی مدت سے کر چہرے پر حزن و ملال کے آثار نمایاں ہوگئے۔ تنہائی کے تصور نے سکونِ قلب اور دماغی توازن کو درہم برہم کر دیا۔ باس نے معافی مانگنے کو کہا، لیکن عزم و استقلال نے کچھ ڈھارس بندھائی، اس وقت لاکھوں برٹش اور استریوں کی مصیبتوں کا خیال آیا، مادرِ ہند کی آزادی کے سپنے نے جسم میں ایک نئی روح پھونکدی: مر جانا اس ذلت سے ہزار درجہ بہتر ہے، وطن کی آن اور آزادی کے وقار کو صدمہ پہنچانا کمینہ اور ذلیل لوگوں کا کام ہے، اعلیٰ اور عمدہ مثالیں قائم کر کے دوسروں کو ترقی کا موقع دو۔ ان الفاظ کے ساتھ دل نے ترجمانی کی اور مجسٹریٹ کے معافی مانگنے کے سوال پر "نہیں" کہہ کر میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

اب میں جیل کی چار دیواری میں تھا۔ سیاسی قیدی کی حیثیت سے میری کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ مجھے کسی سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میری تمام ڈاک اور خبروں پر سنسر تھا۔ نراشا اور بزدل بنانے کے لئے ہر طرح کی سختی کی جاتی تھی۔ بعض دفعہ جب دو دو دن تک کھانا نہ ملتا تھا، تو گھاس اور پتیوں سے پیٹ بھرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں رات کا زیادہ حصہ سانپ اور دیگر زہریلے جانوروں کے ڈر سے جاگنے میں بسر ہوتا تھا۔ زبانی طور پر بارہا اس کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر کچھ پیش نہ چلی۔ آخر اس سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگی کی بازی لگا دی، دو ماہ بعد جب میری حالت بہت نازک ہوگئی گورنمنٹ کی عرضداشت مجھے وصول ہوئی، جس میں اُس نے میرا پہلا مطالبہ منظور کر لیا۔ اور باقی کے متعلق "مطالبہ جوعی بند کرنے کی صورت ہی میں کچھ غور کیا جا سکتا ہے" میں نے بھوک ہڑتال بند کر دی، میرے نزدیک پہلا مطالبہ زیادہ اہم تھا، مجھے اپنی تکالیف کی کچھ زیادہ پروا نہ تھی، لیکن میں یہ چاہتا تھا، کہ میرے نام کے خط انسپکٹر جیل کے پڑھنے کے بعد مجھے ضرور دیدئے جایا کریں۔ خواہ اُن کے جواب لکھنے کی اجازت دی جائے یا نہیں۔

علاج سے رفتہ رفتہ میری حالت ٹھیک ہوگئی، مجھے اب کسی بات کی خواہش نہ تھی، جیل کی سختیاں میری زندگی کے جزو بن گئی تھیں۔ میں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ سختیوں کا جتنا زیادہ بوجھ اٹھاتا تھا اتنا ہی اپنے آپ کو زیادہ ہلکا محسوس کرتا تھا۔ مہینے میں دو دفعہ ڈاک آتی تھی، اور ہر ڈاک میں میرا کوئی نہ کوئی خط ضرور ہوتا تھا، گاہے گاہے کسی دوست کا خط آ جاتا تھا۔ ورنہ تمام خط رشتہ داروں کے ہوتے تھے جس خط کی سب سے زیادہ خواہش تھی اور جس کے لئے یہ سب کیا گیا وہ ابھی تک وصول نہ ہوا تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ گھر کے بھی تمام خط اس کے ذکر سے خالی ہوتے تھے، طبیعت میں ایک الجھن سی پیدا ہوگئی، دل میں طرح طرح کے شبہات جاگزین ہونے لگے، خطوں کا پڑھنا بالکل بند کر دیا۔ ایک روز جب میں خشک گھاس کے گٹھے باندھ رہا تھا، جیلر نے ایک کھلا لفافہ میرے سامنے لا کر ڈال دیا۔ میں نے جیلر کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ گھاس سمیٹتے وقت میری نظر لفافہ کے پتے پر پڑی۔ پتہ ہندی میں تھا۔ میرا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ خود بخود ہنسی آ گئی، کام چھوڑ کر فوراً خط پڑھنا شروع کر دیا ———— خط پورا پڑھا یا نہیں، یہ مجھے معلوم نہیں۔ بیہوشی کی وجہ بھی میری سمجھ میں نہ آئی، خط کی عبارت کو دوبارہ یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی یاد نہ آ سکی، مجبوراً روشنی میں خط کو دوبارہ پڑھا، اس میں لکھا تھا،

سرمایۂ حیات!

سلام، نیاز، عقیدت!

تم جیل کی چار دیواری میں بیٹھے ہو، اور میں گھر کی، تم پر حکومت کی پابندیاں ہیں، مگر میں مذہب، سماج اور رسم و رواج کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہوں، شاید سمجھ گئے ہوگے کہ میرا کیا مطلب ہے، میرے اتنے عرصے تک خط نہ لکھنے کا کیا باعث تھا، اور آئندہ نہ لکھنے کا کیا باعث ہوگا، پیارے! میں ماضی کے واقعات سے خط کو طویل کرنا نہیں چاہتی، اس سے کیا فائدہ؟! وہ خوشیوں کے دن تھے جو بیت گئے۔ اب تو ہمیں مستقبل کا سوگ منانا ہے، اس دو سال کے عرصے میں کیا کیا واقعات پیش آئے ان سب کے لئے تو بہت وقت درکار ہے۔ میں تو صرف اہم واقعات بتانا چاہتی ہوں، تم یہ تو جانتے ہو کہ تمہارے کالج جانے سے پہلے ہی سے ہم پر مذہب اور سماج کی قیدیں شروع ہوگئی تھیں۔ ایک روز میں چندرمان کی چاندنی میں تمہارے سندیسے کا جواب لکھ رہی تھی۔ اس میں میں نے اپنے اور تمہارے مستقبل کو درخشاں بنایا تھا، اور وہ وہ باتیں کہہ ڈالی تھیں جو اب تک تم سے نہ کہی تھیں۔ بچپن کی معصوم باتوں کو وِواہ کے پریم بندھن میں باندھا تھا، خط کے لکھنے میں زیادہ دیر ہوگئی۔ پتاجی کو کچھ شبہ ہوا، اُنھوں نے

خط میرے ہاتھ میں سے لیکر پڑھنا شروع کردیا۔ خط کے اصل مقصد کو پاکر انکا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ مجھے تمام رات نیند نہ آئی۔ بار بار خط کی عبارت کو سوچا۔ ہر دفعہ کوئی غلطی نکالنے کی کوشش کی۔ مگر ناکامیاب رہی۔ میرے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ وہی جو ایک ہندوستانی لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے، میں اب اپرادھن تھی۔ ننگِ خاندان تھی، ان کے ناموس پر کلنک کا ٹیکہ تھی، میری آنکھ کا پانی ڈھل گیا تھا ——— لیکن یہ سب کچھ گھر کی چار دیواری تک محدود تھا۔ باہر اس کا ذرا چرچا نہ تھا۔ وہ اپنی بدنامی سے ڈرتے تھے۔ باہر چرچا ہونے کی صورت میں سارے سنسار کی انگلیاں اُٹھنے کا ڈر تھا۔ تمہارے گھر سے وہی تعلقات تھے، صرف میرا آنا جانا بند ہوگیا تھا ——— اب مکان تبدیل کئے ہوئے دو سال کے قریب عرصہ ہوگیا ہے۔ گھر کی حالت کچھ سکون پذیر دکھائی دیتی ہے، میں اب بالکل خاموش ہوں، اور میری یہ خاموشی میرے "تبدیلِ قلب" کے مترادف سمجھی جارہی ہے۔ تبدیلِ قلب کا سوال کہاں تک صحیح ہے۔ میں اسے زیادہ واضح نہیں کرسکتی۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ سماج اور مذہب سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ماتاجی کا دن رات کا رونا بے چین کئے دے رہا ہے۔ اپنے بعد ان کی اور پتاجی کی حالت کا تصور مجھے کسی فرض کی یاد دلا رہا ہے، اور وہ فرض کیا ہے" فرمانبرداری، ان کی ہر آگیا کا پالن کرنا" چاہتی تھی کہ کچھ تمہاری سیوا کرتی۔ تمہارے چرنوں میں اپنا جیون گزارتی، مگر کیا کروں، مجبور ہوں۔ بے بس ہوں، مذہب اور سماج کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہوں۔

نہ معلوم اس بدنصیب ملک میں کتنے پریم والے دل سماج اور رسم و رواج کا شکار ہوتے ہیں۔ کل تک کانوں سے دوسروں کی محبت کے افسانے سنے اور آنکھوں نے سینکڑوں نردوش انسانوں کو مذہب اور رسم و رواج کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھتے دیکھا۔ مگر آج ہم خود اپنے آپ کو اس مقصدِ اعلیٰ کے لئے تیار پا رہے ہیں۔ نراشا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ویدوں کی دنیا میں نراشا مہا پاپ ہے، دیش کی سیوا اپنی زندگی کا سب سے بڑا آدرش بنالو۔ اور بس ——— بھول جاؤ۔ اس بات کو بالکل بھول جاؤ، کہ تم نے کبھی کسی سے پریم کیا تھا، آزادی کی جدوجہد میں اپنی زندگی جیل کی چار دیواری میں گزارنا، اور کبھی بھول کر بھی اس سرزمین کا خیال نہ کرنا، جہاں تم نے عمر کے بیس سال کسی کے ساتھ مل جل کر بسر کئے تھے۔ تمہارے بعد بستی کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ نہ وہ گلیاں ہوں گی، جہاں تم نے اپنا بچپن گذارا۔ نہ وہ بازار جہاں تمہاری دلبستگی کا سامان موجود تھا، اور نہ وہ باغ اور کھیت، جہاں ساون اور بسنت کے دن گزرتے تھے۔ آج سے تمہارے بچپن کی کملا بھی رخصت ہو رہی ہے، اب اگر تم یہاں آئے تو کیا فائدہ؟! کس سے ملاقات کروگے، کس سے بولوگے اور کسے دیکھوگے، سب اجنبی ہوں گے ——— بستی اور بستی والے سب!!

تم آزادی کی دیوی کے چرن لو اور میں سماج اور رسم و رواج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتی ہوں، مجھے بیوفا نہ کہنا۔ اس سے مجھے دکھ ہوگا، غیر سے شادی ہوجانے پر بھی کملا تمہاری ہوگی ——— صرف تمہاری، ہمیشہ اپنے من کے مندر میں تمہاری مورتی کی پوجا کیا کروں گی۔ راتوں کے سپنوں میں تم سے ملاقات ہوا کرے گی، برکھا کی بہاروں میں پپیہا اپنی پی سے تمہاری یاد دلائے گا۔ اور میں تمہارے سمرن میں "برسات آئی پر تم نہیں" کا گیت گایا کروں گی۔

الیشور کرے ہمارا بلیدان آخری بلیدان ہو، سماج رسم و رواج اور انگریزی سامراج سے آزاد ہوکر ہمارا دیش بھی قومیت کی جیتی جاگتی تصویر بن جائے۔

بدنصیب

تمہاری داسی، کملا

کاش میں ہندو ہوتا! مگر کیوں؟! اگر ہمارا ایک مذہب نہیں تو کیا ہوا۔ اس سے ہمارا ساتھ کیوں چھوٹے، دوسرے مذہب سے تعلق رکھنا کیا گناہ ہے، مذہب کو محبت سے کیا واسطہ۔ سماج کو ہمیں جدا کرنیکا کیا ادھیکار ہے، ان خیالات نے میرے دماغ پر تسلط پالیا۔ خط نے میری دنیا ہی بدل ڈالی۔ بغاوت کا جذبہ میری رگ رگ میں پیوست ہوگیا۔ میں اب حکومت کا باغی تھا، سماج کا باغی تھا، اور ان سب سے زیادہ مذہب کا باغی تھا۔ مگر اس وقت مجھے بدیشی حکومت کی موجودگی میں ملک کا سماج اور مذہب سے نجات حاصل کرنا ذرا مشکل نظر آیا، اس لئے سماج اور مذہب کے خلاف کوئی عملی قدم اُٹھانے کا ارادہ ملتوی کردیا، اور اپنی ساری توجہ حکومت کے خلاف بغاوت کی اسکیم مرتب کرنے

میں صرف کردی۔ مجھے عدم تشدد پر اب کوئی اعتماد نہ تھا۔ میرے نزدیک دہشت انگیزی اور طاقت ہی بدیشی حکومت سے نجات کا ذریعہ تھی۔ رہائی کے فوراً بعد میں نے انقلابی پارٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے قواعد مرتب کئے اور خفیہ طور پر سارے ملک میں اس کی شاخیں کھولیں۔ چند ہی دنوں میں اس کی طاقت بڑھ گئی۔ ممبروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ ملک میں آئے دن دہشت انگیزی کے واقعات ہونے لگے، دہشت انگیزی کے ساتھ ساتھ پارٹی کا پروپیگنڈا بھی ہوتا رہا۔ افسروں، فرقہ پرست لیڈروں اور سرمایہ داروں کے پاس ہزاروں خوف آمیز خطوط ڈالے جاتے تھے۔ روپیہ حاصل کرنے کے لئے بنکوں، ریلوں اور ڈاکخانوں پر ڈاکہ زنی کی جاتی تھی، اکثر موقعوں پر پولس اور فوج سے دست بدست جنگ ہوتی تھی۔ پارٹی کی طرف سے سرخ اشتہارات تقسیم ہوتے تھے جن میں پبلک کو حکومت سے بدظن کیا جاتا تھا، ان کو منظم بغاوت کی ترغیب دی جاتی تھی، دہشت انگیزی کے ساتھ ساتھ حکومت کی سخت گیری میں بھی اضافہ ہوگیا۔ تعزیری پولس کا بار شہروں اور قصبوں پر ڈال دیا گیا، خاص آرڈیننس جاری کئے گئے۔ نوجوانوں کی کڑی نگرانی کی جانے لگی، ان کے چلنے پھرنے کے اوقات تک معین کر دئے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں لا تعداد مقدماتِ سازش قائم ہوگئے۔ انقلابیوں کو عمر قید حبس دوام اور پھانسیوں کی سزائیں دی جانے لگی، کچھ عرصہ بعد حکومت کی ہمہ گیر پالیسی اور عوام کے تعاون نے دہشت انگیزی کی تحریک کو سست کر دیا، لیکن وہ ابھی تک مجھے گرفتار کرنے میں ناکامیاب رہی۔ میں برابر اس کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا رہا۔ افسران اور تعاون پرست طبقے کے خلاف میری سرگرمیوں میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ سلطانی گواہوں کی مدد سے حکومت نے پارٹی کے تمام خفیہ اداروں کا پتہ چلا لیا تھا، میری گرفتاری کے لئے پچاس ہزار کا انعام مقرر کیا گیا، اسپشل خفیہ پولیس مختلف جگہوں پر تعینات کر دی گئی۔ میں نے شہروں کو چھوڑ قصبوں اور گاؤں میں رہنا شروع کر دیا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی، دیہات کے لوگ تالاب کے کنارے بسنت کا جشن منا رہے تھے۔ عورتیں بسنتی کپڑوں میں ملبوس پوجا کی تھالیاں ہاتھوں میں لئے مندر کی جانب چلی آرہی تھیں۔ بسنت کا دن تھا، مورتی سرسے پاؤں تک سرسوں کے پھولوں میں ڈھنپی ہوئی تھی۔ عفت مآب دیویاں تتلیوں کی طرح اس پر ٹوٹی پڑتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے معصومانہ انداز میں دیوی کے چرن لے رہے تھے، شوخ و شریر لڑکیاں ایک دوسرے کے منہ لی ٹیکے لگا رہی تھیں ——— میں! ——— میں بھی ایک اجنبی کی حیثیت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہ بار بار بچوں کے خوبصورت مٹی کے گھروندوں پر پڑ رہی تھی، میں ان کی معصومانہ حرکتوں کو بڑے انہاک سے دیکھ رہا تھا۔

——— ناگاہ بھیڑ میں ابتری پیدا ہوئی لوگ بدحواس سے نظر آنے لگے۔ بچے کٹ سمٹ کر ایک جا ہوگئے ——— "سپاہی" ایک دیہاتی نے کہا۔ میرا ہاتھ ایکدم پستول پر پڑا، اور پیشتر اس کے کہ مسلح سپاہیوں کا دستہ مجھے گرفتار کرے میں نے فائر کرنے شروع کر دئے، پولس کی جانب سے بھی فائر شروع ہوگئے میلے میں گڑبڑ مچ گئی۔ عورتوں اور بچوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ میں ایک درخت کی آڑ لئے فائر کر رہا تھا، پشت کی جانب سے میری پوزیشن خطرے میں تھی، اس طرف سے بار بار فائر ہو رہے تھے۔ مندر کا دروازہ بند تھا، عورتوں اور بچوں نے اس کے اندر پناہ لے رکھی تھی۔ میری حالت خراب ہوتی گئی۔ زخموں کی وجہ سے بایاں بازو بالکل بیکار ہوگیا۔ مندر کے سوا کوئی محفوظ جگہ نظر نہ آئی، دیوار تک آنے میں شدید مقابلہ کرنا پڑا۔ اس پر چڑھنے کی کوشش میں میرے ہاتھ سے پستول گر پڑا میں اب مندر کے اندر تھا، مگر نہتا، میری حالت بالکل نڈھال ہوگئی تھی، جسم زخموں سے چور چور ہوگیا تھا، مگر میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا، مجھے اب زندگی کے بچاؤ کی کوئی فکر نہ تھی ——— اور جب ایک سپاہی نے اپنا پستول سنبھالا اور اس کا رُخ میری جانب کیا تو میں نے آنکھیں بند کرلیں، خاموش لبوں سے ہندوستان، ہندوستان، کے مبارک لفظ ادا کئے، دل نے اس کی پوجا کی، اور تصور نے اُسے پُر جنت نشان بنا دیا، پستول کی آواز سے آنکھیں وا ہوئیں۔ میں ابھی تک زندہ تھا ——— مگر ——— کملا!

تم یہاں کہاں؛
آج تو بسنت کا دن ہے!
بسنتی کپڑوں کے ساتھ پوجا کرتی تھی؟! میں نے کہا
یہاں میری شادی ہوئی ہے، ساجن!
اب بسنت کہاں!!

بسنت تو بچپن میں منایا کرتے تھے۔
تمہارے ساتھ نا!! اس نے کہا۔
گولی سینہ سے پار ہو چکی تھی۔ ایک دفعہ پھر آنکھیں کھولیں۔ میری طرف حسرت سے دیکھا۔ اور "تشدد آزادی حاصل کرنے کا غلط راستہ تھا، پہلے دیش کی سماجی حالت کو درست کرو۔ اس کو رسم، رواج کے بندھن سے چھڑاؤ" کہتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

عیّاشِ حرم

تان سے قوال کی گونجی ہوئی ہے خانقاہ　　رونما ہے آنسوؤں کے بھیس میں شرمِ گناہ
قلب کو پگھلا رہا ہے زمزموں کا زیر و بم　　فاقہ کش مزدور کے صبر و تحمل کی قسم
آنکھ میں انگڑائیاں لیتا ہے طوفاں نوح کا　　تپ رہا ہے آنچ سے لَے کی سونا روح کا
مطربِ مستانہ ایسی برمحل دیتا ہے تال　　ایک ہی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں ماضی اور حال
لیکن اس محفل میں بھی رنگِ ریا پاتا ہوں میں　　آہ اس مکروہ منظر سے گڑا جاتا ہوں میں

سامنے بیٹھا ہے وہ اک صوفئ احرام پوش　　ظاہرا درویش اور باطن میں درویشی فروش
ابروؤں میں مکر کی جنبش، نگاہیں بے لگام　　گفتگو میں رنگ بھرنے کے لئے وارث[1] کا نام
تشنگی اصنام کے بوسوں کی ہونٹوں سے عیاں　　دل میں سیلابِ ہوس اشعارِ رنگیں بر زباں
گندمی رنگ اور ہونٹوں میں تبسّم کے چراغ　　تجربوں کا دیدۂ بد بیں کے ڈوروں میں سراغ
عطر پاشی کر کے گیسوے سیہ پالے ہوئے　　دامِ عیاشی پہ دانے فقر کے ڈالے ہوئے
پان کی سرخی لبوں پر شاہدِ خونِ شباب　　فطرتِ بیباک پر رنگِ تصوف کی نقاب
صندلی گنجان ڈاڑھی میں سفیدی کی نمود　　ہرزہ گوئی کو چھپانے کے لئے وردِ درود

[1] حاجی وارث علی شاہ صاحبؒ

ہر نفس میں زخم خوردہ پارسائی نالہ ریز — بے ادب خود بیں نگاہوں میں ہوس کی جست و خیز
معصیت کے ذوق پر بے چینیاں چھائی ہوئیں — رُوح کی سب زردیاں احرام پر آئی ہوئیں

~~~~~~

ایک خوش گل، خوش ادا، خوش رنگ شاہد، دلربا — چومتا ہے جس کی پیشانی کو جھک کر بار بار
گفتگو ہے بندۂ بے دام کرنے کے لئے — اپنی فطرت کی وَبا کو عام کرنے کے لئے
فقرہ فقرہ سے ریا کی پختہ کاری آشکار — ہر تبسم شاطرانہ، ہر نظر عصمت شکار
فقر کی سنجیدگی پر بیخودی تز ویر کوش — دل میں دھڑکن، دست دیا میں تھرتھری، سینے میں جوش
یہ لباس فقر کے پردے میں دل چکتا ہوا — دشمن دیں جامۂ احرام میں لپٹا ہوا
آہ یہ صورت، یہ سیرت، شرم کر اے نابکار! — کیا ہوس رانی بھی ہے تعلیم مرشد میں شمار؟
مرحبا اے نقش بندانِ تصوف مرحبا! — کیا اسی کو صوفیار کہتے ہیں تسلیم و رضا!
شمع ایمانی تمہاری جلوۂ اصنام ہے — منہ سے کچھ پھوٹو! تصوف کیا اسی کا نام ہے!
کیا تمہیں ہو پیروانِ وارث[1] عالم پناہ! — کیا ملا ہے تم کو ورثہ میں یہی ذوقِ گناہ!
کیا فقیری ہے یہی تکمیلِ فنِ حرص و آز؟ — منتقل ہوتا ہے سینوں میں یہی سوز و گداز؟
کیا اسی تعلیمِ صیادی پہ ہیں نازاں بزرگ — رفتہ رفتہ جس سے آدم زاد بن جاتا ہے گرگ
راتدن گھولو گے آخر شیر میں شر کب تلک — زہر دوڑائیں گے یہ زلفوں کے اژدر کب تلک

اب تمہارا یہ طلسم ہاؤ ہو توڑوں گا میں
رازہائے خرقہ پوشی کھول کر چھوڑوں گا میں

احسان دانش

[1] الله، الله، وارث، اور عالم پناہ الله، الله، الله، الله
~~~~~~

مردِ مضحک

مترجمہ اسرائیل احمد خاں

(سلسلے کے لئے جون، جولائی مشترک نمبر کلیم)

(۱۶)

تیر درکماں وصیاد درکمیں

جو زیادہ کے محاذِ مدافعت میں سب سے زیادہ کمزور نقطہ معلوم کرنا، اور اُس نقطے پر اک ضرب کاری لگانا، یہ تھا بارکلفیڈرو کا مقصدِ وحید! اب سوال یہ تھا کہ اِس منصوبے کو بروئے کار کیونکر لایا جائے؟ یہاں ایک ایک قدم اک "منزلِ قیامت" تھا! ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!

خامکار و ناتجربہ کار بدمعاش اپنی کارستانیوں کا پہلے سے اک خاکہ تیار کر لیتے ہیں، اور اُسی لائحۂ عمل کے مطابق چلنا چاہتے ہیں۔ بخلاف اس کے جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ بانیانِ کار قبل از وقت پروگرام کی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہوا کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ اصولِ کار قابلِ عمل نہیں! ہم "بندگانِ جبر" مستقبل پر کوئی "اختیار" نہیں رکھتے! یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنے والا کل، آج کی توقعات کا پابند ہوگا؟! لوحِ تقدیر ہمارے لئے ناقابلِ قرأت ہے۔ اور کارکنانِ قضا و قدر کے کاروبار ہماری پیشینیوں سے غیر محکوم! الغرض وہ اپنی ریشہ دوانیوں کو پیشگی "اوقات نامے" سے وابستہ نہیں کیا کرتے، اپنی تجاویز کی ترتیب وہ واقعاتِ پیش آمدہ کی روشنی میں کرتے ہیں! اور حسب اقتضائے وقت و حالت اُس میں ترمیم و اصلاح، یا تنسیخ و اضافہ کرتے رہتے ہیں! بارکلفیڈرو اِنہی موخرالذکر پختہ مغز شاطروں کی جماعت کا اک حریف تھا، اور اُنہی کا ہم طریقت!

پس ایسے لوگ بلا غیر معمولی کاوش اور پس و پیش کے اپنی کاروائی شروع کر دیتے ہیں، اور تغیر پذیر مُوقت حالات کے اشاروں پر مختلف اطراف میں اپنی نقل و حرکت کا رُخ پھیرتے رہتے ہیں! وہ پہلے سے کوئی آرپار راہ طے نہیں کر لیتے، اِس لئے کہ واقعاتی اُفتادوں کی نشان دہی کردہ شاہراہ سے وہ راہ لامحالہ انحراف کرتی رہتی ہے۔ وہ آج کے دن کوئی ایسا خاکۂ عمل نہیں بنا لیتے جو کل "تقویمِ پارینہ" ہو جائے! وہ کوئی ایسا نعل پہلے سے تراش خراش کر کے اپنی جیب میں نہیں رکھ لیتے، جو "ابلقِ ایام" کے سُم پر فٹ نہ پڑے! صرف لمحۂ موجودہ میں اک وقتی قدم اُٹھانا اور پیش پا اُفتادہ فائدے پر گرفت کر لینا، اور آئندہ کے تبدیل شدہ نقشۂ جنگ کے لئے اک تبدیل شدہ محاذ کے ساتھ تیار و منتظر رہنا، یہی کار آزمودہ بیکار آزمائی کا سب سے "چلتا ہوا حربہ" ہے۔

اک "کھلاڑی" کی گوفن میں وقت پر جو بھی پتھر آ جائے گا اُسے وہ تم پر کھینچ مارے گا! مگر نوآموز "سیانے" غیر متوقع حالات سے اپنی اُمیدیں وابستہ کئے رہتے ہیں، جو کبھی شرمندۂ ظہور نہیں ہوا کرتے! بساطِ شطرنج پر یہ بات بھی تمہارے پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ تمہارا سابقہ کس اور کیسے حریف سے ہے! پھر معرکہ گاہ کی پیمائش، معائنہ، اور مسلسل گرداوری

بھی ضروری ہے!

بارکلفیڈرو، ملکۂ آین کو بھی کم از کم اپنا نشانۂ ابلہ فریبی بنانا چاہتا تھا، بعض اوقات اپنی کمینگاہی نشست میں وہ اپنے شکار کے اتنے قریب پہنچ جاتا تھا، کہ حضرتِ عُلیا کی سرگوشیاں تک اُسے سُنائی دیتی تھیں! کبھی کبھی دونوں بہنیں ہمکلام ہوتیں، اور وہ اُن کے گویا پہلو ہی میں، کسی مخفی گوشے کے اندر کھڑا ہوا محوِ تجسس ہوتا! وہ اُس کو اپنی باہمی مکالمت میں دخل درمعقولات دینے سے بھی باز نہ رکھتی تھیں! بعض موقعوں پر تو اُسے رائے دینے تک کی صاف صاف دعوت دی جاتی تھی! مگر وہ ازراہِ خاکساری اپنی نااہلی کا عُذر پیش کرتا، اور اِس نمائشِ بیلوثی و بے نیازی سے اور بھی اپنا اعتبار جماتا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ بارکلفیڈرو ڈچیز جوزیانہ کی پشت پر کھڑا ہوا تھا، ہیمپٹن کورٹ کے باغ میں وہ اس وقت مصروفِ گلگشت تھی۔ ملکۂ آین بھی تشریف فرما تھیں۔ ملکۂ موصوفہ نے اپنے معمولی بھونڈے انداز میں اپنے جذبات کی بے نقابی اور تقدیر کی شکوہ سنجی شروع کردی،

"جانور بڑے مزے میں ہیں! وہ دوزخ و جنت کے جھگڑوں سے آزاد ہیں: کم از کم جہنم کا اُن کو کوئی دغدغہ نہیں!

"اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِهِمْ!" (جانور پہلے ہی سے جہنم میں گرفتار ہیں!) جوزیانہ نے اک بصیرت افروز ریمارک کیا۔

اس جواب نے اک دینی مسئلے کو معاً اک فلسفیانہ موضوع میں بدل دیا! ملکۂ آین کسی قدر منغص ہوگئی! جوزیانہ کے اس استدراک میں جو معنی خیزی تھی اُسے محسوس کرکے آین کو اک مغلوبانہ محجوبیت سی ہوئی: تھوڑے توقف کے بعد وہ جوزیانہ سے یوں گویا ہوئی،

"عزیزہ مَن! ہم طفلانہ طریقے سے اِن مسائلِ مُبہمہ پر گفتگو کرکے اُن کی بے احترامی کیا کرتے ہیں: ہم ہمہ دانی کے مُدعی بنا کرتے ہیں، حالانکہ ہم بیخبر محض ہوتے ہیں! بہتر ہو کہ اِس مذاکرے میں ہم بارکلفیڈرو کو بھی شریک کریں، اور اُس کی ذہانت وفراست سے مستفید ہوں: اِن دانش فروشیوں کے بجائے ہمیں کچھ دانش اندوزی کی ضرورت ہے!"

"جی بجا ہے!" جوزیانہ بولی، "بارکلفیڈرو اِن مسائل کو ایسا ہی جانتا ہے جیسا کہ معلم الملکوت!"

"نہیں، جیسا کہ اک بے زبان جانور!" بارکلفیڈرو نے عرض کیا، اور ساتھ ہی سرخم کرکے کورنش بھی بجالایا!

"خاتونِ محترم!" ملکہ نے فرمایا، "یقین کیجئے کہ وہ اک دانا انسان ہے! ہماری ذہنی نارسائی کو اُس کے مبلغِ علم سے کوئی نسبت نہیں!"

جوزیانہ نے اِس سادہ لوحانہ جواب کو "نذرِ خاموشی" کردیا!

بارکلفیڈرو کے سے آدمی کے لئے ملکۂ آین تک رسائی حاصل ہوجانا حضرتِ عُلیا پر گرفت حاصل کرلینے کے ہم معنی تھا! واقعہ یہ ہے کہ وہ بجا طور پر ایسے ہی رسوخ و اقتدار کا مدعی ہوسکتا تھا! اور اب وہ اپنے اس مقتدر موقف سے اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل کے لئے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا! اُس نے دربار میں قبل ازیں قدم جما ہی لیا تھا، اور دربارِ شاہی کا داخلہ بڑی فاتحانہ چیز ہوا کرتا ہے! اب کوئی موقع اُس کے ہاتھ سے جا نہ سکتا تھا، متعدد بار وہ ملکہ کو اک بدباطنی کے انداز میں متبسم کردینے میں کامیاب ہوگیا تھا: یہ گویا فیر کرنے کا پہلا لیسنس تھا! لیکن کیا نقشۂ جنگ کے پورے خط و خال بالکل متشکل ہوگئے تھے؟ کیا اِس اشارۂ چشم و ابرو میں خود ملکۂ معظمہ کی ہمشیرۂ عزیزہ کو نشانہ بنانے کا ایما مضمر تھا؟

یہاں ذرا اک نازک ذہنی صورتِ حال تھی: بارکلفیڈرو کسی قدر متشکک تھا اور نتیجۃً متذبذب: پہلی تنقیح اُسے یہ طے کرنی تھی کہ آیا آین کو اپنی بہن سے محبت ہے یا نہیں؟! اس لئے کہ اس قسم کے غایت درجہ مخدوش معاملات میں ایک غلط قدم بھی ساری مُہم کو درہم برہم کردینے کے لئے کافی ہوا کرتا ہے!

حصولِ اطمینان کی خاطر، بارکلفیڈرو نے حقیقتِ نفس الامری کی قطعی ترصید کے لئے اک مزید مہلت لینی ضروری سمجھی!

اک ہوشمند گنجفہ باز کھیل شروع کرنے سے پہلے اپنے پتوں پر اک نظر ڈال لیتا ہے، جس میں اپنے ترپ کارڈوں کا خاص طور پر شمار کرلیتا ہے: بارکلفیڈرو نے بھی اپنے تاش کا پیشگی جائزہ لیا۔ یہ عبارت تھی ملکہ اور ڈچیز کی عمروں کے تناسب کے اندازہ کرنے سے!! ——— جوزیانہ ۲۳ سال کی اک دوشیزۂ نورس تھی، درآنحالیکہ آین کا سن ۴۰ سال سے متجاوز ہوگیا تھا! بساطِ سیاست کا یہ نقشہ بارکلفیڈرو کی دسیسہ کاریوں کے لئے اپنے اندر بہت سے ممکنات رکھتا تھا! ملکہ کی جوانی کی فصلِ بہار

ڈھل چکی تھی، خزاں رسیدہ چمنستانِ حُسن میں شبابِ رفتہ کی جستہ جستہ باقیاتِ صالحات، گزشتہ عہدِ زریں کی خون در جگر کن یادگار حسرت آثار تھیں! اک گلبنِ قامت کے نوشگفتہ غنچے تاراجِ خزاں سے پامال شاخِ گُل کے لئے اک جگر خراش خارزار کا منظر پیش کرتے ہیں! ع

گُلِ شباب کہ در چشمِ شب یک خار است!

رلیعانِ شباب کا نوروز کہولت سِن کے لئے اک عشرۂ محرم ہوتا ہے! شش جہت میں بہار کی رنگپاشیاں اور نکہت باریاں اُس کے کلبۂ احزاں کی تاریکی کو ظلماتِ یاس و حرماں میں ملفوف کر دیتی ہیں! تختہہائے گلاب، السبتر خار ہو جاتے ہیں! آفتابِ حسن و شباب جب نقطۂ نصف النہار سے ڈھلنے لگتا ہے تو اک طلائعِ صبحِ محشر کا منظر سامنے ہوتا ہے! ـــــ ملکۂ این اب اسی منزلِ عمر میں تھی، اور یہی دردِ دل رکھتی تھی! بارکلفیڈرد اسی خالِ پیشانی صورتِ حال کو کلیدِ قفلِ مشکل بنانا چاہتا ہے! چہل سالہ ملکۂ عالم کے چہرے کی جھُرّیاں اور پیشانی کی شکنیں اُس کے عقدۂ دشوار کی گرہ کشائی کرتی معلوم ہوتی تھیں! این کے اندرونی تکدرِ خاطر کی یہ بیرونی چینِ جبیں بارکلفیڈرد کے لئے تنہا شعاعِ امید تھی!

جذبۂ رشک و حسد کی اک مبہم سی کاوش، غیظ و غضب کے اک پورے طوفان کو ہیجان میں لے آتی ہے۔ لبِ آب اک موشِ حقیر کی حرکتِ پا اک نہنگِ بحر کو اپنی خلیج سے نکال لیتی ہے۔

خیالات کے "تخم" اور جذبات کے "جنین" "این کے" رحمِ دماغ" میں جنباں تھے، یہ ابھی عالمِ وجود ہی میں آئے تھے، اور نہ ابھی اُنھوں نے کوئی متمائز صورت اختیار کی تھی، تاہم اُن کے وجود میں کلام نہ تھا، اگرچہ ہنوز وہ عالمِ ہیولیٰ میں تھے؛ خود ملکہ اپنے دل و دماغ سے کماحقہٗ واقف نہ تھی! وہ اپنے واردات کو محسوس کرتی تھی، اُن کے صاف و شفاف مشاہدے سے قاصر تھی! اک متلاطم اور گِل آلود پانی کے تال کی سطح پر جو پیچ در پیچ تموج پیدا ہوا کرتے ہیں، اُن کی باہمدگر مخلوط و ژولیدہ اشکال کا صحیح تعین کر لینا آسان نہیں! این کی تاریک و توہم پرست روح پر بعض اوقات عجیب و غریب الہامات نازل ہوا کرتے تھے۔ بارکلفیڈرد انہی اوقات میں سے کسی ایک لمحے کا منتظر تھا، اِس لئے کہ یہی وہ موقعے تھے جن میں اُس کا افسونِ ایک پُر عشوہ دل والے احمق پر کامیاب ہو سکتا تھا! ہاں اب سب سے پہلے ملکہ کے خانخانۂ دل کے اسی رازِ سربستہ کا سُراغ لگانا ضروری تھا کہ ڈچیز جوزیانہ کے بارے میں وہ کس قسم کے حسیات رکھتی ہے؟! یہی اس راہ کا اولین قدم تھا، اور اسی عقدہ کے خاطر خواہ طور سے حل ہونے پر تمام آئندہ نقل و حرکت معلق تھی!

ایک دن کا ذکر ہے کہ ملکۂ معظمہ گرجا سے مراجعت فرما ہو رہی تھیں۔ بارکلفیڈرد بھی مع چند دیگر ندیموں کے ہمرکابی میں تھا، یہی موقع تھا کہ لارڈ ڈیوڈ یکبارگی خواتین کی صفوف کے سامنے سے گزرا، اور صنفِ لطیف کے سارے مجمع میں اپنے خوش جمال قامت و پیکر سے اک وقتی ہیجان پیدا کر گیا! اُس کا نمودار ہونا تھا کہ بے اختیار عورتوں کی زبانوں سے "احسنت و مرحبا" کے آوازے بلند ہوئے۔

"کتنا سجیلا، کیسا البیلا!" ـــــ ایک بولی۔

"کتنا خوشرو، کیسا قدِ دل جو!" ـــــ ایک دوسری کا خراجِ تحسین تھا۔

"کتنا بدرو، کیسا مکروہ!" ـــــ ملکۂ این کا عطیۂ داد تھا (زیرِ لب آواز میں)!

ظالم بارکلفیڈرد نے سن پایا! - - - - - - - - یہی وہ "حرفِ کاشف" تھا جس کے لئے وہ سالہاسال سے ہمہ تن گوش تھا! سہ

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید!

اس ایک آنی و فانی "چشمکِ برق" نے اک "مستقل منارۂ سحر" کا کام دیا! اب گویا وہ ملکہ کا عتاب اپنے اوپر نازل کئے بغیر ڈچیز جوزیانہ پر وار کر سکتا تھا! پہلا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ لیکن اب دوسرا عقدہ دعوتِ طبع آزمائی دے رہا تھا!

بظاہر اب بھی وسیع اقدام کا دروازہ بند تھا۔ شبِ تاریں کو ندے کی ایک لپک کے بعد مطلع پھر تاریک ہوتا نظر آیا ـــــ "کلما اضاء لھم مشوفیہ، و اذا اظلم علیھم قاموا"!

(۱۷)

اِنگلستان، آئرستان، اور اسکاٹستان

جس طرح کوئن ایلزبتھ اک ناکتخدا ملکہ تھی، اسی طرح لیڈی جوزیانہ

اک دوشیزہ شہزادی تھی! وہ شاہانہ زندگی بسر کرتی تھی، کبھی شہر کی سیر کا لطف اٹھاتی، کبھی دیہات کی سکونت سے لذت اندوز ہوتی! سال کے مختلف موسموں کی مناسبت و رعایت سے وہ مختلف مقامات و مکانات میں نقلِ مکان کرتی رہتی تھی! اس کا دربار بھی اپنے ٹھاٹ باٹ میں قریب قریب بارگاہِ سلطانی کی شوکت و صولت کا روکش تھا! جس میں اُس کا سب سے مقرب ندیم لارڈ ڈیوڈ تھا! لارڈ ممدوح کے علاوہ متعدد امرا بھی اُس کی بزمِ شہزادگی کے رتن تھے،

لارڈ ڈیوڈ اور لیڈی جوزیانہ کی ہنوز شادی خانہ آبادی نہیں ہوئی ہے، تاہم مجوزہ جوڑائے محبت ایک دوسرے کی معیت میں بلا تکلف ہر تقریب پر رونقِ بزم و انجمن ہوا کرتا تھا! محض حبالۂ عقدِ زوجیت میں منسلک نہ ہونے کی وجہ سے اُنکا یہ آزادانہ اختلاط، آدابِ معاشرت کے منافی نہ سمجھا جاتا تھا! اُن کی باہمی بے تکلف زندگی ہر قسم کے اشارہ و کنایہ سے بھی مامون تھی! وہ گھوڑ دوڑوں اور تماشاگاہوں میں ساتھ ساتھ جایا کرتے، اور اپنی سواری کی گاڑی میں بالکل ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے! جب وہ اپنی متعلق شادی کا خیال کرتے تو کم از کم لمحۂ اول پر اُن کے قلبی واردات کی زبان سے یہ چیخ بلند ہو جاتی کہ ع

لیس خوں ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے!

لیکن اس شادی کا انعقاد نہ صرف یہ کہ اُن کا فرضِ عین تھا، بلکہ اس کی اُنھیں آزاد اجازت تھی، تاہم وصل و ہجر کے درمیان اس بین بین حالت میں اک نادر کیفِ لذت تھا کہ ع

دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من!

اِس مقامِ "اعراف" میں وہ "بہشتی لطف" اٹھا رہے تھے! اک منسوب شدہ جوڑے کے درمیان تخلیہ اک ایسا برائے نام "برزخ" ہے، جسے بآسانی عبور کیا جا سکتا ہے! لیکن وہ اِس آسان فتح کے تمتع سے محترز رہتے تھے! آسان کام آسان ضرور ہوتے ہیں، لیکن "لطف" سے عاری بھی ہوتے ہیں! لارڈ ڈیوڈ کے لئے "کج دار و مریز" کی پیچیدگی رکھنے والا "ساغرِ سرشار" اک طرفہ لذتِ بے نام تھا! سے

چہ کنم باکہ تواں گفت کہ اُو
در کنارِ من و من مہجورم!

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت مُکّہ بازی کا سب سے بڑا مقابلہ مقام لیمبتھ میں ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک کلیسائی مرکز ہے، جہاں کینٹربری کے قسیس اعظم کا اک محل بھی ہے، ! اگرچہ یہاں کی آب و ہوا مضرِ صحت واقع ہوئی ہے، تاہم وہاں مختلف عمرانی دلچسپیوں کے سامان بہم ہو گئے ہیں۔ از انجملہ ایک کتب خانہ ہے جو اک عمدہ ذخیرۂ ادب سے مالامال ہے، اور مخصوص اوقات میں صاحبِ ذوق لوگوں کے لئے کھلا رہتا ہے۔

جاڑوں کا موسم تھا، اِنہی ایام میں ایک دن شام کے وقت مقام مذکور کی اک نزہت گاہ کے اندر جس کے حصار کی پھاٹک عموماً بند رہا کرتی تھی، مکہ بازی کی اک آویزش برپا ہوئی۔ اس موقعے پر ڈچیز جوزیانہ بھی نہضت فرما ہوئی تھیں، اور جوزیانہ کے ساتھ، حسبِ معمول، سائے کی طرح لارڈ ڈیوڈ بھی موجود تھا!

جوزیانہ نے اِس تماشا گاہ میں داخل ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

"کیا خواتین کو آنے کی اجازت ہے؟"

اس کا جواب، اک تفنن آمیز پیرائے میں، لارڈ ڈیوڈ نے اک ایسے فرانسیسی ذومعنی جملے میں دیا جس کا لفظی ترجمہ تو یہ تھا کہ

"معزز خواتین قدم رنجہ فرما ہو سکتی ہیں!"

لیکن محاورۂ زبان کے اعتبار سے دوسری تعبیر یہ بھی تھی کہ،

"دُکان نشینانِ (جلوہ فروشی) کا داخلہ ممنوع ہے!"

لیڈی جوزیانہ نے حاضرینِ مجلس کی اکثریت کی جنس (رجال) کی ہئیت سے قدرے مشابہت پیدا کرنے کے لئے، نیز آدابِ محفل کو مرعی رکھتے ہوئے، یہ کیا تھا کہ اس تقریب میں مردانہ لباس پہن لیا تھا! یہ بھی اُس زمانے کا اک فیشنیبل دستورِ امارت تھا۔ اِس عہد میں خواتین شاذ و نادر ہی بجز مردانہ لباس کے کسی اور وضع و پوشش میں بیرون خانہ سیر و گشت کے لئے جایا کرتی تھیں! لنڈن سے ونڈسر جاتے ہوئے کثیر التعداد زنانہ مسافروں میں بمشکل ایک یا دو عورتیں ایسی نظر آیا کرتی تھیں جو اپنے صنفی لباس میں ملبوس ہوں! شرفا کے خاندانوں کی خواتین کا یہ اک خاص طغرائے امتیاز تھا۔

لارڈ ڈیوڈ چونکہ جوزیانہ کی معیت و ملازمت میں تھا، اس لئے آج وہ خود کھیل کود میں کوئی حصہ نہ لے سکتا تھا، اُس کا تنہا فریضہ یہی تھا کہ لیڈی موصوف کی مصاحبت کی خدمات انجام دے!

جو زیانہ نے یہاں اپنی نسائی فطرت کی، اک خاص پیرائے میں نمائش کی، اُس نے تماشا دیکھنے کی اک خوشنما دُوربین نکالی، اور تماشا گاہ کا مشاہدہ کرنا شروع کیا! ؎

یقیں ہے دیدۂ باریک بیں سے
کرے عینک طلب یہ ناتوانی!

یہ چیز بھی اُس عہد کے شرفا کے لوازمِ معاشرت میں داخل تھی!

جسمانی ورزش اور شوقِ تماشا کی اس تقریب میں، جو کثیر التعداد خواصِ عالی نسب کی کشش کی باعث بنی تھی، لارڈ جرمین کرسیٔ صدارت پر متمکن ہوا! یہ اُس لارڈ جرمین کا دادا تھا جو اٹھارویں صدی کے اواخر کے سینین میں فوج میں اک کرنیل تھا، اور اپنی اسی عسکری زندگی کے دوران میں جس سے یہ ننگ سرزد ہوئی تھی کہ ایک خاص معرکۂ کارزار کے اندر پشت دکھائی تھی۔ یہی امیر بعد میں وزارتِ جنگ کے منصبِ عالیہ پر سرفراز کیا گیا! اور اگرچہ قبل ازیں میدانِ جنگ میں خوش قسمتی سے (یا بدقسمتی سے) دشمن کی تیغ و تفنگ سے بچ گیا تھا، لیکن مابعد کی "ترقیٔ درجات و درازیٔ عمر" کے دَور میں اُس کا حشر اِس سے بھی زبوں تر ہوا! اس لئے کہ امارتِ حربیہ کی مسندِ اقتدار پر وہ انگلستان کے مشہور محتسب خطیب — شیریڈن — کے جانستانِ طعن و تشنیع کے تیر و سناں سے خونچکاں ہوا۔

مُکّہ بازی کے اِس مُقابلے میں جو دو حریف ہم نبرد تھے اُن میں سے ایک آئرلینڈ کا باشندہ تھا۔ یہ اپنے وطن کی سرزمین کے اک پہاڑ کے نام کے انتساب سے فیلم میڈن کہلاتا تھا؛ دوسرا مُبارز اک ساکنِ اسکاٹستان تھا جس کا نام ایلیگیل تھا۔

یہ دونوں مدِمقابل نوجوان اپنے اپنے مُلک و وطن کے قومی فخر و عزّ کے علمبردار تھے! گویا خود آئرستان اور اِسکاٹستان اکھاڑے میں اُتر رہے تھے! اصلی مقابلے کی ہارجیت کی رقم کے علاوہ، مختلف حاضرین و تماشائیاں کے آپس میں کوئی چالیس ہزار گنی سے زیادہ کی شرطیں بھی بدی گئی تھیں!

دونوں پہلوان قریبًا برہنہ تھے، اور صرف کوتاہ و چست قسم کے لنگر کسے ہوئے تھے، اُن کے پاؤں میں لمبے لمبے بوٹ تھے، جن کی ساخت بڑی بھدی اور جن کے اندر بعض لوازم غیر ضروری نظر آتے تھے۔

اِسکاٹستانی بچّہ — ایلیگیل — اک نوخیز جوان تھا جو مشکل اُنیس سال کا ہوگا۔ بایںہمہ اُس نے ابھی حال میں مُکّہ بازی کے حلقوں میں اک پُرشور شہرت حاصل کر لی تھی! اِسی کا نتیجہ یہ تھا کہ اِس افتتاح پذیر مبادرت میں اُس کی طرف شرطوں کی رقوم کا تناسب دوچند سہ چند تھا! ابھی سابقہ مہینے ہی کی بات تھی کہ اُس نے ایک نامور مُکّہ باز — "سکس مائلز واٹر" (چھ میل گہرا پانی) نامی — کی پسلیاں توڑ کر قعرِ تہیگاہ میں اتار دی تھی، اور مارے گھونسوں کے اُس کے چشمہائے چشم خشک کر دئے تھے! ہونہار ایلیگیل کی ذات تماشبین پبلک میں غیر معمولی گرمجوشی و پذیرائی کی محرک ہوا کرتی تھی۔ اُس نے اپنے اوپر شرط بدنے والوں کو اب تک بارہ ہزار پونڈ جتائے تھے! انسانی جسم کے اعضا و جوارح کی شکست و ریخت اور زد و خورد کے اِن پیہم تصادموں میں، ایلیگیل کا ایک جبڑا بھی ٹوٹ گیا تھا! اِس وقت بھی اُس کی پیشانی کی صدمہ رسیدہ جلد پر ٹانکے لگے ہوئے تھے!

وہ بڑا سجیلا اور سُبک تیلا نوجوان تھا، وہ قدرے اک کوتاہ قامت، اگرچہ راست قد، پیکر رکھتا تھا، فطرت نے جسمانی جوڑبند اور بدنی طاقت و قوت کی جتنی امانتیں اُسے ودیعت کی تھیں اُن میں شمہ بھر اُس نے خیانت نہ کی تھی! تمام اعضا و عضلات میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی پوری ورزش اور پرورش نہ کی گئی ہو، اور اُسے اپنی طبعی نشو و نما کے ممکنات نہ پہنچایا گیا ہو! اُس کا تمامی نظامِ جسمانی مُکّہ بازی کی معرکہ آرائیوں کے لئے وقف تھا، اُس کا مضبوط سینہ فولاد کا ایک تختہ تھا، اور زرہ بکتر کے چار آئینہ کی اک پلیٹ کی طرح چمکتا تھا! جب وہ ہنستا تھا تو تین شکستہ دانتوں کا خلا اُس کے جمالِ تبسم کی دلآویزی کو دوبالا کر دیتا تھا!

بخلاف ازیں، اُس کا فریقِ مقابل اک بھاری بھرکم، لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ مُکّہ بازی کی اغراض کے لحاظ سے، کہنا چاہیئے کہ، وہ اک ناقص حریف تھا،

فیلم میڈن اک چہل سالہ پہلوان تھا، قد ۶ فیٹ بلند تھا، سینہ اک دریائی گھوڑے کا آگا معلوم ہوتا تھا، بایںہمہ چہرہ و بشرہ ملائمت مائل تھا! اُس کا گھونسا اتنا مہیب اور قاہرانہ تھا کہ خیال ہوتا تھا کہ اگر اُس کی بھرپور ضرب پڑ جائے تو اک جہاز کا عرشہ تک ٹوٹ جائے! تاہم اپنے اِس بےپناہ حربے کے استعمال سے وہ نابلد واقع ہوا تھا!

آئرستانی پہلوان بظاہر خالی الذہن ہو کر اکھاڑے میں اُترا، وہ بجائے حملے کے دفاع کا پہلو لئے ہوئے معلوم ہوتا تھا! سارے قرائن سے

یہی قیاس ہوتا تھا کہ اُس کی خوب ہی دُرگت بنے گی! اُس کے جسم و جثہ کی مثال ایسے گوشت کی سی تھی جو صرف آدھا گلا ہوا ہو! ـــــ جو چبانے میں سخت ہو، اور نگلنے میں مشکل! وہ کامیاب شکاری تو کسی طرح نہ تھا، لیکن اِسی طرح آسان شکار بھی بننے والا نہ تھا!

وہ مرعوبیت کی حالت میں اپنے ہمنبرد کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا، اُس کی بے اکڑی ہوئی گردن میں اک سرِ تسلیم خم ہوتا نظر آتا تھا! اُس کی خالی از عزم آنکھوں میں اعترافِ شکست کی آئینہ داری نمایاں تھی! وہ اِس روحِ فتادگی کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا کہ ع

بیا کہ ما سپر انداختیم گر جنگ است!

دونوں حریفوں نے گزشتہ شب ایک ہی بستر پہ بسر کی تھی، اور ایک ہی جام شراب سے ہم مقدار "پورٹ وائن" نوش کی تھی! رات کو ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالنے والے اب صبح باہم دست و گریباں ہونے والے تھے! چند ساعت اُدھر کے ہم مشرب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے! ـــــ یہ رنگ میں بھنگ؟! ع

دستانۂ مخمل میں ہے پنجۂ فولادی!

ہر اک پہلوان کے ساتھ اُس کے جتھے کے آدمی تھے۔ یہ لوگ بڑے ہی وحشیانہ حلیئے رکھتے تھے! اُن کے خدمات یہ تھے کہ جب ضرورت ہو تو اپنے امیدوار کی پشت گرمی و طرفداری میں اکھاڑے کے ثالثوں کو ڈرائیں دھمکائیں۔ ہیلمسگیل کے پشت پناہوں میں ایک خاص شخص "جان گردین" نظر آیا جس نے ایک دفعہ یہ محیر العقول کارنامہ انجام دیا تھا کہ اپنی گاؤں دری میں ایک بیل کو اپنی پیٹھ پر اُٹھا لے گیا تھا! اسی گروہ میں ایک دوسرا دیو ہیکل آدمی جان برے تھا، جس نے اپنے اک جوشِ جنوں کے لمحے میں اپنی پشت پر "اسٹیل[1] آردِ گندم مع ایک عدد آدم کے رکھ لیا تھا، اور اس وزن کو لے کر دو سو قدم تک چلا گیا تھا!

دوسری طرف فیلم میڈن کا سرپرست، لارڈ ہانڈ، اپنے ایک پُر زور بے، "کلمنز" نامی کو لایا تھا، یہ حصارِ گرین کیسل کا اک خانہ زاد تھا، اس کا کمال یہ تھا کہ وہ بیس پونڈ وزن کے اک پتھر کو قصرِ مذکور کے بلند ترین مینار کی چوٹی سے اونچا پھینک سکتا تھا!

کلمنز، برے، اور گردین۔ یہ تینوں رویئں تن اپنے اپنے وطن کی تومند اور زور آوری کے گویا لہراتے ہوئے پرچم تھے، جب کہ وہ اِدھر اُدھر خراماں خراماں پھرا کرتے تھے،

دوسرے اہالی و موالی بھی کم و بیش ایسی ہی بدوی و غیثانی ہیئت کذائی رکھنے والے آدم زاد تھے، اِن کے بر و دوش چوڑے چکلے تھے، ٹانگیں خمیدہ تھیں، مٹھیاں سنگ پشت کی طرح سخت تھیں، اور چہرے بھدے اور بھونڈے! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ سارے کے سارے کچھ ایسے جنات واقع ہوئے تھے جو کسی بلا سے ڈرنا نہ جانتے تھے! قریبًا یہ سب کے سب "مستقل طائرانِ قفسِ جیل" رہ چکے تھے!

اِن میں بیشتر افراد، پولیس والوں کو شراب پلا کر اپنے حسبِ مرضی ہر قسم کے حرکات و جرائم کا "لیسنس" حاصل کر لینے کے کام میں طاق تھے! کیوں نہو! عیب کرنے کو ہنر چاہیے، اور ہر عرضِ ہنر کے لئے ایک خداداد استعداد! پھر اس سب کے نتیجے میں شہرت اور قدر دانی کی آپ ضمانت ہو جاتی ہے! ع

کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی!

اِس مقابلے کے انعقاد کے لئے جو میدان منتخب کیا گیا تھا اُس کا موقع وہ تھا جو "ریچھوں کا باغ" کہلاتا تھا! اس مقام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں یہ جگہ ریچھوں۔ بیلوں، اور کتّوں کی ضیافت گاہ تھی! یہ مقام آبادی کے بیرونی مضافات سے بھی کچھ پرے واقع ہوا تھا "سینٹ میری اُوری" کی خانقاہ کے خرابے کے زیر سایہ اُس کی جائے وقوع تھی! خانقاہِ مذکور وہ مقامِ مقدس تھی جو شاہ ہنری ہشتم کے عہد میں حکمِ سلطانی سے مقفل کر دی گئی تھی!

اس وقت بادِ شمال چل رہی تھی، جو انگلستان میں ایک زمہریری ہوا ہے۔ کچھ ترشح بھی ہو گیا تھا، جب کہ بارش کے قطرات زمین سے مس ہوتے ہی ژالہائے جامد میں منتقل ہو گئے تھے۔

حاضرینِ مجلس میں اکثر لوگ بزرگانِ خاندان معلوم ہوتے تھے، اُن کو چھتریاں لگائے ہوئے دیکھنے سے یہ نتیجہ بہ سرعت آسانی سے نکالا جا سکتا تھا!

فیلم میڈن کی طرف سے کرنل مانکرف بطور "امپائر" (حکم) کے تھا۔ کلمنز اُس کی ہمت آموزی اور پشت گرمی کے لئے موجود تھا۔

ہیلمسگیل کی طرف علی الترتیب یہی فرائض ادا کرنے کے لئے "آرزیل

---

[1] بُشیل: ۲۵ سیر کا پیمانہ!

پہونچے تو میرین اور لارڈ ڈیز یٹم متعین وشکن تھے!

دونوں حریف چند ثانئے (سیکنڈ) تک اکھاڑے کے اندر بلا کسی نقل وحرکت کے کھڑے رہے! لعطل کے ان چند لمحوں میں حاضرین نے اپنی اپنی گھڑیاں ایک دوسرے سے مقابلہ کرکے درست کیں، معاً دونوں پہلوان پیش قدمی کرکے ایک دوسرے سے قریب ہوئے اور پہلے ہاتھ ملے:

فیلم میڈن نے اپنے فریق مقابل ہیلیگیل، سے کہا:

"میرے لئے تو یہ بات قابل ترجیح ہے کہ اپنے گھر چلا جاؤں!"

ہیلیگیل نے اس کا جواب بڑی خوبصورتی سے یہ دیا:

"جو اصحاب یہاں تشریف لائے ہیں، ان کے ذوقِ تماشا کو مایوس نہ کرنا چاہیئے!"

سردی بڑی شدید تھی، اور دونوں پہلوان قریبًا برہنہ تھے: فیلم میڈن کے عضلات کانپنے لگے، اور دانت بجنے!

ڈاکٹر الینر شارپ نے، جو آرک بشپ آف یارک کا بھتیجا تھا، حوصلہ انگیزی کے لہجے میں باآوازِ بلند کہا:

"جُٹ جاؤ شیرو! دیکھتے کیا ہو؟ ---...... تمہارا بدن بھی ابھی طرح گرم ہو جائے گا!

ان گرم کلمات نے پہلوانوں کے منجمد ارادوں میں اک عملِ گداختن شروع کردیا! وہ جلد دست وگریبان ہوگئے!

لیکن ابھی تک کسی کو غصہ نہ آیا تھا! تین بیتر سے ہوئے لیکن بدونِ تصادم! اس پر ریورینڈ ڈاکٹر مگذریتھ نے جو "مدرسۂ عالیۂ ارواحِ عامہ" کے "مُرشدانِ چہل" میں سے تھا، باتجبر کہا:

"ان کو تھوڑی تھوڑی جن (شراب) پلاؤ! تب اِن پر "جنگ کا جن" سوار ہوگا!"

تاہم "شائقینِ باتمیز" نے کھیل کے مسلمہ دستور العمل سے انحراف کو پسند نہ کیا، اور "سالکِ باخبر" کا ارشاد معرضِ تعمیل میں نہ آیا! اس سب کے علی الرغم زمہریری سردی کے حُکم کا حکم ناطق ہی معلوم ہوتا تھا! ؎

بیا بہ موسمِ و بلو دمے ودائے ما

بیار را حدیثِ حلال وحرام چیست!

بالآخر اُن کی رگہائے خون میں جنبش ہوئی۔ وہ پھر ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئے، ایک دوسرے کی طرف بڑھے، اپنے اپنے بازو پھیلائے، اور دونوں کی مُٹھیاں آپس میں مَس ہوئیں، لیکن معًا پھر پسپا ہوگئے۔

یکبارگی چھوٹے حریف ہیلیگیل، نے اپنی جگہ سے اک پُرعزیمت جست کی، اور اس نے عملی معرکہ کا افتتاح کردیا!

فیلم میڈن کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں پیشانی پر اک ضرب پڑی! اُس کا سارا چہرہ چو رنگ ہوگیا! مجمع سے اک آواز بلند ہوئی،

"ہیلیگیل نے اپنے قلمِ مُشت سے اپنے حریف کے خون کی روشنائی سے اُسی کے ماتھے پر اپنی فتح کی پہلی مُہر ثبت کردی!"

"شاباش، زندہ باش!" کے بکثرت نعروں نے ہیلیگیل کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

فیلم میڈن نے اپنے لمبے چوڑے بازوؤں کو اک پَوَن چکی کے بادبانوں کی طرح چاروں طرف حرکت دی، اور بادہوائی انداز میں اُنھیں اِدھر اُدھر گھمانا شروع کیا!

"ایں کیا فیلم اندھا ہوگیا ہے؟" ——— زُمرۂ امراء میں سے ایک لارڈ نے اُس کے اِس دوراز کار کرتب کو دیکھکر کہا!

لیکن یہ صحیح نہ تھا فیلم میڈن کی آنکھیں ہنوز سلامت تھیں۔ تاہم یہ اُس کی دماغی نابینائی ضرور تھی، جس کی بدحواسی میں اُس سے یہ حرکتِ مذبوحی سرزد ہوئی تھی!

کثیر التعداد زبانوں نے، اعتماد افروز لہجے میں، ہیلیگیل سے یہ فرمائش کرنی شروع کردی:

"ہاں ہیگے! پھر فیلم میڈن کے ان رہے سہے دریچوں کو بالکل چوپٹ ہی کردے نا؟!"

طرفین کے سارے عناصرِ ضعف وقوت کو محسوب کرتے ہوئے یہ کہنا صحیح تھا کہ جوڑی عمومًا متوازن تھی، اور اگرچہ موسم باردومرطوب تھا، تاہم اُمید تھی کہ مقابلہ گرم رہے گا!

کوہ پیکر میڈن کو اپنی "فربہئ تن" کی "بیشگی" محسوس ہونے لگی! اُس کا دیو ہیکل بدن اُس کے لئے مصیبت ہورہا تھا! اُسے اپنے بوجھل اور لدّے پھدّے جسم کے ساتھ نقل وحرکت کرنا دوبھر معلوم ہورہا تھا! اُس کے بازو دو شہتیروں کی طرح جسیم تھے، لیکن اُس کا سینہ اک مضغۂ گوشت کی طرح پلپلا ہورہا تھا!

اُس کا کم قامت حریف بڑی سُرعت وعجلت سے ہر چہار طرف جست وخیز، داؤں کی پیچ، زدو خورد کرتا، آویزش کی جوشش میں وہ اپنے دانت پیستا، اور اپنی تیز رَو وشتاب کار حرکات سے اپنی قوت کو دو بالا کرتا! جنبش نمائی اور طاقت اندوزی کے اِس باہمی فعل وانفعال کے قانونِ ورزش سے وہ خوب واقف تھا!

ایک طرف اناڑیوں کے سے بے تکے ہاتھ تھے، اور دوسری طرف فاتحکارشاطرانہ ضربیں! ہیلنگیل جتنا اپنے "عضلات" سے لڑ رہا تھا، اُتنا ہی اپنے "اعصاب" سے بھی پیکار آزما ہو رہا تھا! فیلم میڈن اک شست رگ، لیکن گراں بار موگری باز تھا، اگرچہ ابھی تک وہ اپنے اِس گرز گراں کے استعمال کے موقعے کا بیسود ہی جُو یا رہا تھا! بلکہ اُلٹا خود ہی کوفتہ بجنیہ ہوتا رہا تھا! —— قصہ مختصر، بدنِ حیوانی اور فنِ انسانی، کُندۂ ناتراش وحشت اور ساختہ وپرداختہ تربیت، ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے!!

یہ اک یقینی طور پر بے نقاب تقدیر تھی کہ اوّل الذکر شے آخر کار شکست کھائے گی —— لیکن آسانی سے نہیں! اور اِسی بات کے اندر اِس مقابلے کے ساری دلچسپی مضمر تھی!

اک چھوٹے اور بڑے پہلوان کی کُشتی میں جیت عموماً چھوٹے کی ہوا کرتی ہے! کتے اور بلّی کی لڑائی میں فتح کا سہرا "بلّی بلّی" ہی کے سر بندھا کرتا ہے! —— یہاں اِن آثار کو مزید تقویت ملی، ہیلنگیل کی کامیاب بزن وشکن" پر حاضرین کی طرف سے داد آمیز وجوش آور کلمات کی اک بارش ہو گئی!

"خوب! کیا خوب!! شاباش! مرحبا!! —— واہ رے سطحِ مرتفع (اسکاٹستان) کے عقابِ برق تاب!

اِس پر ہمدردان وہوا خواہانِ آئرستان بھی اک لہجۂ آور دیں بولے!

"ہاں فیلم میڈن! تو ہی کیا دیکھتا ہے اب؟! کسی "مشتے بعد از جنگ" کو کیوں اُٹھائے رکھتا ہے؟!"

ہیلنگیل کے نام لیوا اپنے فاتحکار نعرے میں گرجے:

"ارے پھوڑ بھی دے اپنے حریف کی آنکھوں کو بھی، کہ غلط بینوں کی آنکھیں کھل جائیں!"

ہیلنگیل نے اور بھی کمال کے ہاتھ نکالنے شروع کئے، وہ ایک نقل وحرکت کے بعد معاً سانپ کا سا پیچ وتاب کھا کر وہ پیچھے یکبارگی پیچھے ہٹا، پھر دفعتہً آگے تڑپا، اور فیلم میڈن کی بیچ چھاتی میں ایک مکّہ ایسا رسید کیا کہ اُس کی بے پناہ ضرب سے دیو ہیکل فیلم متزلزل ہو گیا!

"بےقاعدہ ہاتھ!" —— وائیکونٹ برنارڈ نے للکار کر ٹوکا!

میڈن متزلزل ہو گیا! اُس کی زبان سے اک ماندہ وتکان زدہ لہجے میں یہ الفاظ مسموع ہوئے!

"مجھے اپنے دل پر بڑی گرمی معلوم ہو رہی ہے!"

لارڈ ڈینزرم نے ثالثوں سے اُن کی ماہرانہ رائے پوچھی، اور پھر اپنا فیصلہ یوں دیا:

"اختتامِ وقت سے پانچ منٹ پہلے!"

"فیلم پر نقاہت کا غلبہ ہو رہا تھا، کلٹر نے اُس کے مضروب ومجروح بدن کا خون اور پسینا اک فلالین کے پارچے سے پونچھا، اور قرابۂ شراب کا مُنھ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا! مقابلے کا اب گیارھواں "پانی" تھا۔ فیلم کی پیشانی پھر خونچکاں ہو رہی تھی۔ سینے کا منظر حریف کے مُکّوں کی پیہم ضربات سے مسخ ہو گیا تھا! پیٹ نفخ زدہ ہو رہا تھا، اور سر کا اگلا حصّہ یکسر چُور ہو گیا تھا! —— لیکن اُدھر ہیلنگیل کا کہیں بال بھی بیکا نہ ہوا تھا!

مجمعے میں اک شور وغوغا مچ گیا۔ لارڈ برنارڈ نے اِس ہنگامے میں اپنے ابتدائی احتجاج کا اعادہ کیا:

"یہ ہاتھ یقیناً غلط لگایا گیا ہے!"

"اور اِس مقابلے پر جو شرطیں بدی گئی تھیں وہ کالعدم!" اک خاص تنبیہہ گوش زد ہوئی!

"لیکن میں اپنی جیتی ہوئی رقم لے لوں گا!" —— سر ٹامس کول پیپر نے "انشاءِ فتح" کے ساتھ اپنی دلدادگیٔ کام ودہن کا ثبوت دیا!

"اجی مجھے میری پانسو گنی واپس کر دیجئے، کہ میں چلا جاؤں: اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہئے!" —— سر بارتھالومیو نے دادِ آشتی دیتے ہوئے کہا!

کیا دیکھتے ہیں کہ فیلم میڈن پھر کھڑا ہو رہا ہے، اک مخمور کی طرح اُس کے پاؤں میں لغزش تھی، لیکن اک پُر استقامت لہجۂ زبان میں وہ لب کشا ہوا:

"اچھا، ہم دونوں کو پھر لڑنے دیجئے! لیکن شرط یہ ہے کہ میں بھی اک ایسا

ہی بیضا اللہ ہاتھ مارنے کا حق رکھوں گا؟"

"منظور، منظور!" اکھاڑے کے چاروں گوشوں سے دِل رُبایانہ آوازیں آئیں!

ہیلسنگیل نے اک معنیٰ خیز پھریری لی!

دونوں حریف دوبارہ مصروفِ آویزش ہونے لگے!

جو لڑائی فیلم کے لئے اک "وبال" تھی وہ ہیلسنگیل کے لئے اک کھیل تھی!

مار پیٹ اور گرلاگ کی بھی بلا دُور ہے!

آخر کار اس بُرکالہٗ آفت نے قصائی والا داؤں چلایا! یعنی اپنے حریف کی گردن یکبارگی اپنی کہنی کے آہنی خم کے اندر لے لی، اور اک گلوگیر و جانستان سختی و تنگی سے اُس کے سر کو اپنی بغل میں دبایا! اور پھر دوسرے ہاتھ کی مٹھی سے نیچے ہی نیچے تابڑ توڑ ضربیں لگانی شروع کیں! ہیلسنگیل کا مُکہ اک فولادی ہتھوڑے کی طرح فیلم میڈن کے منہ پر پڑ رہا تھا!

جب فیلم اس خون آشام گرفت سے چھُوٹا ہے تو اُس کے چہرے پر بمشکل "چہرے" کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا تھا! ——— جو چیزیں پہلے منہ، آنکھ، ناک نقش، اُن کا اب یہ حلیہ ہو رہا تھا کہ گویا وہ اک سیاہ اسفنج ہے جس میں خون جذب کیا گیا ہے! اسی عالم میں فیلم نے تھوکا تو پورے چار دانت زمین پر آرہے! اب وہ تیورا کر پھر گرا، لیکن کلتر آڑے آگیا اور اپنے زانو پر اُسے لے لیا!

اس تمام حرب و ضرب اور زد و خورد کے بعد بھی ہیلسنگیل عموماً اچھوتا ہی تھا، اُس کو چند خفیف جراحتیں آئی تھیں، اور پسلی کی ہڈی پر اک چھوٹا سا خراش!

لڑائی کا نتیجہ اب قطعاً فیصلہ کُن تھا! ہیری کارلٹن نے کہا:

"فیلم میڈن کا کام تمام ہے، آج سے ہیلسنگیل ہی کے سر پر رستمِ برطانیۂ عظمیٰ" کا تاج ہے!"

کلتر نے فیلم کا سارا خستہ و خون آلودہ بدن عرق شراب میں اک کپڑے کو تر کر کے دھویا۔ خاک و خون کی نقاب سے فیلم کا چہرہ پھر نکلا! اُس نے آنکھ کا اک پٹ کھولا!

"بس ایک ہی باقی اور، میرے شیر!" کلتر نے التجا کی، "اپنے وطنِ عزیز کی عزت کے لئے!!"

ویلز اور آئرلینڈ کے لوگ ایک دوسرے کی زبان سمجھ لیتے ہیں، لیکن

فیلم میڈن اب بالکل مبہوت و لایعقل معلوم ہوتا تھا! کلتر کی اثر آفرینی کے جواب میں اُس نے دست و زبان کی کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے معلوم ہو کہ اس میں ہوش و حواس کا کوئی شمہ باقی ہے!

بایں ہمہ فیلم پھر اُٹھا! ایسی حالت میں کہ کلتر اُسے سہارا دئے ہوئے تھا! اب یہ پچھیواں دَور تھا! جس طرح یہ کھمشم آدمی کھڑا ہوا، اُس سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ دَور آخری دَور ہوگا! وہ ایسی خستگی و فنادگی کی ہیئت کذائی سے استادہ تھا کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ آئندہ ضرب کے اولین لمس ہی سے فرشِ خاک پر دراز ہو جائے گا!

ہیلسنگیل جس کی جلد بدن بمشکل عرق آلود بھی ہوئی تھی، فاتحانہ جوش کے بحران سے چلا اُٹھا:

"میں خود اپنی طرف سے" ایک ہزار" اور اپنے حریف کی طرف سے صرف ایک" پر شرط لگاتا ہوں!"

اِس کے ساتھ ہی ہیلسنگیل نے اپنا بے پناہ بازو اُٹھایا اور معاً پھر تصادم کا آغاز کر دیا!

دیکھنے والوں کے لئے یہ نقشہ کس درجہ ناقابلِ فہم، اور اپنی ہی آنکھوں کی یہ شہادت کس قدر ناقابلِ یقین تھی کہ اب کی دفعہ دونوں فریق بیک وقت زمین بوس نظر آئے!!!

اک حال بلب انسان کے حلق سے نکلا ہوا اک عجیب السماعت نحیف قہقہہ سنائی دیا!

یہ فیلم میڈن کا منتقمانہ اعلانِ مسرت تھا!!!

اس مرتبہ ہوا یہ کہ جونہی ہیلسنگیل نے اک، شاید آخری مہلک، ضرب فیلم کے سر پر لگانی چاہی، فیلم نے بھی موقع پاکر اک بیقاعدہ مُکہ ہیلسنگیل کی "ناف" پر رسید کیا!

فیلم کا یہ اناڑی ہاتھ ایسا کاری پڑا کہ ہیلسنگیل چاروں شانے چت ہو گیا۔

اُس کے نرخرے سے "خرخر" کی آوازیں آنے لگیں!!

تماشبین گھبرا کر اُسے دیکھنے کے لئے اُس پر جھُک پڑے!

"مل گیا نمازی کا ٹکہ!" ——— بعض لوگوں نے نعرہ کیا!

اب سب تالیاں پیٹنے لگے حتیٰ کہ اس اظہارِ مسرت کے عمل میں اُن لوگوں نے بھی اضطراراً شرکت کی جو شرطیں ہار رہے تھے، اور جن کا اُمیدوار ہیلسنگیل تھا۔

فیلم میڈن نے ایک بضابطہ ضرب کے بدلے میں ایک ہی بیضابطہ ضرب[2] لگانے کی" باضابطہ خانہ پُری" کی تھی! لیکن "ہار کی اس ایک" نے "سُستار کی اُن سینکڑوں" کی پوری کسر نکال لی تھی!! ؎

نومید ہم مباش کہ رندانِ جرعہ نوش
ناگہ بیک خروش "بمنزل رسیدہ اند!"

فوراً میلسگیل کو اٹھا لیا گیا۔ کئی آدمیوں نے اپنے ہاتھوں سے ڈولی کی سی اک نشست بنا کر اس پر اسے بٹھایا، اور طبی امداد کے موقعے پر پہنچا دیا!

—— عام خیال یہ تھا کہ وہ جانبر نہ ہوگا!

ناگہاں اک پُر جلال نعرہ لارڈ رو بارٹس نے لگایا۔

"مابدولت نے بارہ سو گنی جیتیں!"

فیلم میڈن اگرچہ عین فیصلہ کُن لمحے کا فاتح بن گیا تھا، لیکن ساری عمر کے لئے وہ اکھاڑے سے خارج ہو گیا! —— اب وہ صرف اک "تیمور لنگ" تھا!

مجمع منتشر ہونا شروع ہوا!

جوزیانہ نے اُٹھتے ہوئے لارڈ ڈیوڈ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا! یہ وہ "دستی ہم آغوشی" تھی جو نسبت شدہ جوڑے کے درمیان اُس وقت کے آدابِ معاشرت میں جائز رکھی جاتی تھی!

"خوب رہی!" جوزیانہ کے منہ سے نکلا، "لیکن ——"

"لیکن کیا؟" لارڈ ڈیوڈ نے پوچھا۔

"میں خائف ہو رہی تھی کہ وہ ابتدائی دردانگیز منظر میری "طمال" کو اپنی جگہ سے ہٹا دے گا، مگر شکر ہے میں اس اُفتاد سے بچ گئی!"

لارڈ ڈیوڈ وہیں ٹھہر گیا، اور ناقابلِ فہم آنکھوں سے جوزیانہ کو دیکھنے لگا!

یہ اُس پر دورۂ فکر پڑنے کے علامات و آثار تھے!

ان معنی خیز حالات کو اپنے اوپر طاری کر کے اُس نے ڈچیز سے یوں خطاب کیا،

"طمال کے لئے تو اک نہایت بہتر بہدف اکسیر طمال اب دستیاب ہو گئی ہے"

"وہ کیا؟"

"گن پلین!"

"گن پلین کس عنقا کا نام ہے؟!"

"میں اِس اُلّو کے پٹھے کو تمہیں دکھاؤں گا!"

---

[1] اُس وقت کی انگریزی کا اک روزمرہ، جو ہم معنی ہے ہماری اردو زبان کے غالباً اس محاورے کے کہ "میاں کی الٹی ..."

عید ملنے والوں سے!

ملنے نہ آؤ عید کی تقریب میں یہاں
اپنے کو اہلِ عید کا پاتا نہیں ہوں میں

کیوں رسمِ عید میں نے اُٹھا دی ہے یکقلم؟
یہ داستاں کسی کو سُناتا نہیں ہوں میں

زریں اُفق پہ دیکھ کے نازِ صباحِ عید
تا وقتِ شام ہوش میں آتا نہیں ہوں میں

تشریح کا دماغ نہیں، مختصر ہے یہ
یارانِ شہر! عید مناتا نہیں ہوں میں!

جوش

افسانے کا بنیادی خیال

امداد صابری

جہاں تک بنیادی خیال کے مطلب کا تعلق ہے وہ تو بالکل صاف ہے ۔ اور اس کی مزید تشریح لاحاصل ہوگی ۔ مگر مشکل تو یہ درپیش ہے کہ معنوی اعتبار سے اس کی صحیح تعریف کیونکر کی جائے ؟ وجہ یہ ہے کہ خواہ ہم کتنی ہی احتیاط کے ساتھ افسانہ کے بنیادی خیال کی تعریف کریں مگر اس میں ترکیب ہذا کے سارے معنوی پہلو نہیں آسکیں گے ۔ بنیادی خیال کو آخر کیا کہا جائے ؟ افسانہ کی غائت ؟ اس کا نفسِ مضمون ؟ یا مدعا ؟ بنیادی خیال ان سب پر منطبق ہو سکتا ہے ، مگر اس کے باوجود بھی ان سب سے جدا ہے ، اس ابہام کو دور کرنے کے لئے ہم ایک فلمی کہانی کا خاکہ پیش کر کے غائت ، نفسِ مضمون اور مدعا وغیرہ افسانوی اصطلاحات کی تشریح کر دیتے ہیں ،

ایک شخص اپنی دو لڑکیوں کے ورثہ میں ایک کلوتھ مل چھوڑ جاتا ہے بڑی لڑکی جو سخت گیر طبیعت کی مالک ہے ، مل کے انتظامی بورڈ کی پریزیڈنٹ بنتی ہے ، اور بڑے زور شور کے ساتھ کام کر کے مل کو ترقی دیتی ہے ۔ حالات ایسے آ کر پڑتے ہیں کہ کارخانہ کے جنرل منیجر پر جو ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے ترقی کر کے مل کا کرتا دھرتا بن گیا ہے ، بڑی لڑکی عاشق ہو جاتی ہے ۔ مگر چھوٹی پہلے سے اسی شخص پر فریفتہ ہے جب بڑی لڑکی پر یہ حال کھلتا ہے تو وہ اپنی چھوٹی بہن کی محبت . . . . . . کو اپنی محبت پر ترجیح دیتے ہوئے خودکشی کر کے اُس کا راستہ صاف کر دیتی ہے ۔

کہانی کا عنوان ہے "پریزیڈنٹ"۔ نفسِ مضمون یہ ہے کہ جب محبوب مرد اور چھوٹی بہن کی محبتوں میں تصادم ہوا تو ایک عورت نے کس طرح بہن کی محبت کے مقابلہ میں محبوب مرد کی محبت کو ہیچ سمجھا ۔ کہانی کا مدعا ہے ایک عورت کی قربانی دکھانا اور غائت ہے عشق و محبت کے تباہ کن اثرات کی تصویر کھینچنا ۔

کئی باتیں اس کہانی کا بنیادی خیال ہو سکتی ہیں ۔ مثلاً کسی معمولی مزدور کا ترقی پا کر مل کا جنرل منیجر بن جانا یا کسی مل کا دروبست ایک عورت کے ہاتھ میں ہونا یا دو سگی بہنوں کا ایک ہی شخص پر عاشق ہو جانا ، اور بڑی بہن کا جان دے کر شکھ مول لینا وغیرہ ۔

اب مندرجہ بالا افسانوی اصطلاح کا مطلب بالکل صاف ہو گیا ۔ یعنی عنوان کہانی کا نام ہوتا ہے جو اُسے اور کہانیوں سے ممیز کرتی ہے ، نفسِ مضمون یہ ہے کہ کہانی میں کیا بیان کیا گیا ہے ، مدعا اُس نتیجہ کو کہتے ہیں جو افسانہ کے نفسِ مضمون سے اخذ ہوتا ہے ۔ اور غائت کہانی کا سبق ہے ۔

ان سب کی کوئی نہ کوئی شکل ضرور ہوتی ہے ۔ مگر اُن کے برخلاف بنیادی خیال ایک بنجر اور بن بنا خیال ہوتا ہے ۔ عموماً یہ غیر ارادی طور پر افسانہ نگار کے ذہن میں نمودار ہو جاتا ہے ، اور اس سے کہانی بنانے کے لئے ذہن کو کافی زور آزمائی کرنی پڑتی ہے ، بنیادی خیال کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے دماغ پہلی لرزش محسوس کرتا ہے اور تصورات کی مہمیز لگتی ہے ، یہی افسانہ کی تعمیر کی شروعات ہے ۔

مگر یاد رہے کہ بنیادی خیال سے افسانہ کے پلاٹ کی تیاری شروع ہو جاتی ہے ۔ اس سے تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ مصنف کا احساس بیداری کی پہلی کروٹ لیتا ہے ، اور افسانہ نگار کو یہ سوجھتی ہے کہ اس خیال پر ایک کامیاب

افسانہ تعمیر ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بنیادی خیال ایک قسم کا اشارہ ہوتا ہے، جس سے کہانی بنائی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ بنیادی خیال جو ذہن میں آئے چل بھی جائے اور نہ ہی بنیادی خیال کی وضع قطع کو سامنے رکھتے ہوئے یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ اس خیال کی بنیادوں پر جو افسانہ تعمیر ہوگا اُس کی وضع قطع کیسی ہوگی، کیونکہ اوّل تو ایک بیک کسی خیال پر افسانہ نہیں بن جاتا، دوسرے جب افسانہ مکمل ہوتا ہے تو یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اُس کے بعض پہلو ایسے ہوتے ہیں جو افسانہ کے لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اُن کا بنیادی خیال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر بنیادی خیال سے افسانہ نہیں بنتا، مگر ہر افسانہ کسی نہ کسی بنیادی خیال پر ضرور بنتا ہے،

مختلف لوگوں کے دماغ مختلف طور پر بنیادی خیال فراہم کرتے ہیں مگر اکثر و بیشتر افسانوں کی بنیادیں واقعوں پر رکھی جاتی ہیں۔ واقعہ کی طرف انسانی ذہن اس لئے اور بھی کشش محسوس کرتا ہے کہ واقعہ بجائے خود ایک داستان ہوتا ہے اور تصور کے لئے اس میں افسانہ کی تعمیر کے واسطے مواد ڈھونڈ لینا ان دیگر ممکنہ چیزوں کی بہ نسبت آسان تر ہو جاتا ہے جو داستان کے امکانات سے محروم ہوتی ہیں۔ واقعہ دو صورتوں میں بنیادی خیال بن سکتا ہے۔ ذاتی تجربہ ہو یا اس کی تفصیلات کسی سے سن سنا کر دماغ میں محفوظ کر لی ہوں اس کے علاوہ واقعہ حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور خیالی بھی۔ عصری تاریخ کے کسی واقعہ سے بھی اشارہ لیکر افسانہ بنایا جا سکتا ہے۔

حقیقی یا تصوری صورت حال بھی بعض اوقات افسانہ کی بنیاد کا کام دیتی ہے، مشہور امریکن افسانہ نگار ہاتھورن (Hawthorne) اپنی ایک دائمی یادداشت میں اپنے افسانوں کے بنیادی خیالات گاہ بگاہ درج کرتا رہتا تھا، یہ یادداشت بعد میں امریکن نوٹ بُک کے نام سے شائع ہوئی۔ صورت حال کی چند دلچسپ مثالیں اس میں سے لے کر ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) ایک پرانا آئینہ۔ ایک شخص یہ راز معلوم کر لیتا ہے کہ اس آئینہ میں جتنی شکلیں عکس ریز ہو چکی ہیں وہ کیونکر ایک بار پھر اس میں جھلک دکھا سکتی ہیں۔

(۲) ایک مخبوط الحواس شخص خود کو کسی صوبائی حکومت کا وزیر اعظم سمجھنے لگتا ہے۔

(۳) چند اشخاص ایک دوائی پیتے ہیں جو ان میں سے کسی پر زہر کا اثر کرتی ہے اور کسی پر ٹانک کا۔

(۴) دو دوست الف اور ب۔ الف کا کردار بہت قوی ہے۔ ب اس کا اخلاقی دباؤ مانتا ہے۔ الف اُسے کام کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ب اس کام کو شروع کر دیتا ہے، حکم دینے کے بعد جسے بدلنے کا ارادہ تھا، الف فوراً فوت ہو جاتا۔ اور اُس کا ارادہ ب پر ظاہر نہیں ہوتا۔ ب زندگی بھر وہی کام کرتا رہتا ہے۔

(۵) ایک شخص اپنی محبوبہ کو فانی انسانوں کی سطح سے بلند کرنے کے جذبہ میں اسے مار ڈالتا ہے۔

(۶) دو آدمی کسی واقعہ کے منتظر ہیں اور یہ معلوم کرنے کے بعد آرزومند ہیں کہ اس واقعہ میں دو بڑے کردار کون کون ہیں آگے چل کر ان پر یہ کھلتا ہے کہ مذکورہ واقعہ عین انہی ایام میں جبکہ وہ اس کے ظہور پذیر ہونے کے منتظر تھے ہو رہا تھا اور خود وہ دونوں اس کے دو بڑے کردار تھے۔

(۷) دو آدمی آپس میں لکھا پڑھی کر کے ایک دوسرے کو اپنی اپنی املاک کا وارث بنا دیتے ہیں۔ اور پھر بے چینی کے ساتھ ایک دوسرے کے فوت ہونے کا انتظار کرنے لگتے ہیں، اور اتفاق ایسا آ کے پڑتا ہے کہ دونوں ایک ہی وقت میں فوت ہوتے ہیں۔

ان بنیادی خیالوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ جس بنیاد پر تعمیر کیا جاتا ہے وہ کس قدر غیر اہم ہوتی ہے۔

کردار، ماحول اور عمل کے اثرات (یعنی ان سے اخذ کردہ تاثرات) بھی افسانوں کے بنیادی خیالات بن سکتے ہیں، ایک شخص کی ظاہری صورت اور اس کے کیریکٹر کی وضع قطع اس قدر آئینہ داری کرتی ہے کہ بعض اوقات ایک شخص کو دیکھتے ہی فوراً تصور کو ایک قسم کی مہمیز لگتی ہے۔ اسی طرح ایک شخص کی مخصوص حرکات اور اس کی چال ڈھال سے بھی افسانہ کے لئے بنیادی خیال فراہم ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک نوعمر شخص ہے جو گردن اُٹھائے اور سر بلند کئے چلتا ہے، جس کی آنکھیں ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتی ہیں اور موڑ پر تیزی کے ساتھ مڑتا ہے علمائے نفسیات کے نزدیک ایسا نوجوان کسی بڑے تغیر یا انقلاب کے ہلاکت خیز طوفان میں اپنے حواس قائم رکھنے کا اہل نہیں ہوتا۔ اب اگر یہ بیان کیا جائے کہ زندگی میں ایک اہم انقلاب کے موقع پر اس کا طرز عمل کیا تھا تو یہی افسانہ کا بنیادی خیال بن جائے گا۔

ماحول کے اثرات سے بھی افسانہ بنتا ہے، کوئی ماحول خواہ خود کسی افسانہ میں کام نہ دے سکے۔ مگر اس کا پیدا کردہ اثر ضرور کام دے جاتا ہے، مقامات اور واقعات میں ایک طرح کی غیر مرئی نسبت ہے، کسی خوبصورت وادی میں پہنچکر یہی جی چاہتا ہے کہ یہاں تھوڑی دیر کے لئے ضرور ٹھہرنا چاہئے۔ رات کے وقت بہتے ہوئے پانی، روشن بستیوں، نور کے تڑکے اور سمندر کے نظارے وغیرہ سے دماغ میں ایک عجیب و غریب نشاط انگیز بشاشت پیدا ہوتی ہے۔ یہی صورت ناموں اور چہروں کے ساتھ ہے، واقعات اور حوادث کا بھی یہی رنگ ہے، اپنی جگہ وہ بے نتیجہ اور بے رنگ نظر آتے ہیں۔ مگر غائر نظر سے دیکھئے پر ان میں افسانوں کی پر تاثیر شروعات کے اشارہ صاف صاف دکھائی دے جاتے ہیں، لاپرواہ مصنف ان پر گہری نظر نہیں ڈالتے مگر جن طبیعتوں کو تجسس کی نعمت ملی ہے وہ ان ہی معمولی واقعات سے اشارے پاکر دل ہلا دینے والی کہانیاں تعمیر کر لیتے ہیں۔

ہنگامی کیفیات کسی مثال یا دو چیزوں کے تقابل کی روئداد، اور بعض اوقات کسی نام ہی سے افسانہ کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ بعض دفعہ ذہن میں سب سے پہلے افسانہ کا نام آتا ہے اور ذہن اس سے اشارہ پاکر افسانہ تراشنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ افسانہ کے عنوان میں افسانہ کے نفسِ مضمون کا ضرور کچھ نہ کچھ اشارہ ہوتا ہے (اس پر کسی آئندہ باب میں بحث کی جائے گی) بعض لوگوں کے تو اس طرح کام کرتے ہیں کہ عنوان ہی سے افسانہ نکلتا ہے۔ بعض دیگر عنوان کو کہانی کی تعمیر کا "لمس آخر" بناتے ہیں۔ مثلاً مظہر انصاری نے اپنے مشہور افسانہ "ٹوٹے ہوئے کھلونے" میں عنوان کو بڑی حسن کے ساتھ افسانہ کا "لمس آخر" بنایا ہے، کہانی یہ ہے کہ شوہر اور بیوی میں کسی بات پر ایسی ان بن ہوگئی کہ بیوی گھر چھوڑ میکے جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے بچہ جو ماں باپ کی ان بن اور ماں کے گھر چھوڑنے کی اہمیت کو نہیں جانتا ماں کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ تم ساتھ لے چلنے کے لئے اپنے ثابت کھلونے ایک جگہ کر لو۔ بچہ جب کھلونے جمع کرنے بیٹھتا ہے تو یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کون سے کھلونے لے جائے اور کون سے چھوڑ دے۔ قربت اور تعلق نے اس کے لئے ہر کھلونے کو خواہ وہ کتنا ہی ٹوٹ پھوٹ گیا ہو اہم بنا دیا ہے، ادھر ماں جان کا یہ حکم ہے کہ صرف ثابت کھلونے ساتھ لے جائے جائیں گے۔ بچہ اس حکم کو بھی قائم رکھتا ہے اور کھلونوں سے اپنے تعلق کو بھی۔ وہ دن بھر محنت کرتا ہے اور اپنی طفلانہ مساعی سے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کو بھی جوڑ جاڑ کر اور چیپیاں وغیرہ لگا کر ثابت کر دیتا ہے، اور ماں کے سامنے جا کر فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ میں نے اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے بھی جوڑ لئے ہیں۔ اسی اثنا میں بچہ کا باپ بھی گھر میں آگیا ہے، ماں باپ دونوں بچے کے اس گہرے تعلق سے جو اسے اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونوں تک سے ہے بیحد متاثر ہوتے ہیں اور آپس میں صلح و صفائی ہو جاتی ہے۔

اس افسانہ کا نام "ٹوٹے ہوئے کھلونے" رکھنے میں افسانہ نگار نے اپنے حسنِ ذوق کا ایک بین ثبوت پیش کر دیا ہے، کیونکہ اگر ایک طرف عنوان معنی خیز اور اچھوتا ہونے کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے تو دوسری طرف کہانی کی ترتیب میں یہ "لمس آخر" کا کام بھی دیتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی ضرب المثل سے کہانی کا پلاٹ ذہن میں اپنے ہلکے ہلکے نقوش ظاہر کرنے لگتا ہے، مگر یہ صورت بہت ہی شاذ ہے۔ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ضرب المثل تجربات کا نچوڑ ہوتی ہے۔ خود اس میں افسانویت نہیں ہوتی اور اس لئے تصور کو اس لئے مہمیز نہیں لگتی۔

تجربہ اور مطالعہ افسانہ کا مواد فراہم کرنے کے دو بہترین ذرائع ہیں۔ تجربہ کے ذیل میں صرف ذاتی تجربات ہی نہیں آتے۔ سنے سنائے تجربات بھی بشرطیکہ وہ مشاہدات سے ہم آہنگ ہوں اسی قبیل سے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے گرد و پیش پر ہمیشہ عمیق نظر ڈالتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ عام طور پر لوگوں کی توجہ نادر اور انوکھی چیزوں اور واقعات کی طرف جلد منعطف ہوتی ہے، اور اس لئے قدرتاً افسانہ نگاروں کی نگاہیں اپنے گرد و پیش سے آگے بڑھکر غیر معمولی اور نادر حالات اور فضاؤں پر پڑنی چاہئیں۔ مگر اس سے پیش پا افتادہ واقعات کی دلچسپی اور اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ اگر واقعات قدرتی ہیں اور فطرتِ انسانی کے کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں تو ایک کامیاب افسانہ نگار کی نگاہ سے وہ کبھی بھی اوجھل نہیں ہوتے۔ عام اس سے کہ وہ اس کی اپنی زندگی سے متعلق ہوں یا منطقہ شمالی کے اسکیمو لوگوں کی زندگی سے۔ انسان ہر جگہ نبرد آزما ہے۔ اپنے ہم جنسوں سے، یا فطرت کی قوتوں سے، یا خود اپنے وجود سے۔ یہ کشمکش ہر جگہ صاف صاف نظر نہیں آتی۔ مگر نتائج کا اظہار بار بار ہوتا رہتا ہے اور نتائج کے مشاہدہ سے ان قوتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔

ہمارے گرد و پیش میں عجیب و غریب واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں، اُن کے مجموعہ پن اور اُن کی دلچسپی کا مطالعہ کرنے کے واسطے جس چیز کی ضرورت ہے وہ نظر ہے۔ بعض افسانہ نگار اپنی مشاہدے اور تجزیہ کی طاقتیں اس قدر بڑھا لیتے ہیں کہ وہ افسانوی خیالات کے لئے ایسے ہی ہو جاتے ہیں جیسے لوہے کے لئے مقناطیس۔ ان کا تخیل اس قدر حساس ہو جاتا ہے کہ بہت معمولی معمولی باتوں سے جو اوروں کے لئے شاید قابلِ اعتنا بھی نہ ہوں۔ اشارے لے کر وہ افسانہ طرازی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب افسانہ نگار زندگی کا مشاہدہ اور مطالعہ کرے، اور مختلف جذبات اور رجحانات کی طرف ہمدردانہ طور پر متوجہ ہو۔ ایسی حالت میں افسانہ نگار زندگی اور اس کے ساز سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، وہ اپنے اپنے قصرِ ہوش کے دروازے خیالات کے لئے کھلے چھوڑ دیتا ہے۔ بنی نوع کی گفتگوؤں اور ان کی حرکات کا مشاہدہ کرتا ہے اُن کی وضع قطع کو دیکھتا ہے۔ اُن کے کیرکٹر کا تجزیہ کرتا ہے۔ شخصیتوں کی خلیجوں کو وہ اپنے تصور کی مدد سے عبور کرتا ہے اور دوسرے کی جذبات کی دنیا میں داخل ہو کر ان کے پوشیدہ احساسات کا پتہ لگاتا ہے، دنیا اسے افسانوں سے لبریز دکھائی دینے لگتی ہے۔

ایک شخص کا ذاتی تجربہ بھی اسے افسانہ طرازی میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔ ہر تجربہ عام اس سے کہ وہ معمولی ہو یا اہم، بذاتِ خود بہت کچھ دلچسپی اپنے اندر رکھتا ہے۔ مگر روزمرہ کے تجربات اس سلسلہ میں اسی وقت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ جب ان پر غور و خوض کیا جائے جو افسانہ نگار اپنے ذاتی تجربات کے خزانہ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اُن کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض موثر تجربات کو برابر ذہن میں الٹتے رہتے ہیں، اور ان میں تبدیلیاں بھی کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اُنھیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اب اگر اس ذاتی تجربہ کو فلاں فلاں تبدیلی کے ساتھ قرطاس پر پیش کیا جائے تو یہ ایک کامیاب افسانہ ثابت ہوگا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس طریق سے بعض خواب بھی اچھے افسانے بن جاتے ہیں۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ افسانہ کے مواد کی فراہمی کے لئے دنیا کی سیاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ تجربات ہوتے ہیں، اور اگر کوشش کرے تو وہ اُن سے کام لے سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو زندگی بھر اپنی پیدائشی بستی سے کبھی باہر نہ گئے ہوں یا جنھوں نے ساری زندگی دفتروں اور کارخانوں میں کام کرتے گزاری ہو خود اپنے تجربات میں افسانوں کے لئے بنیادی خیالات پا سکتے ہیں۔

مگر صرف تجربہ تک افسانہ کی فراہمی مواد محدود نہیں ہے۔ مطالعہ سے بھی مدد ملتی ہے۔ سائنس اور دیگر علوم کی کتابوں سے غیر معمولی حالات کے متعدد اشارات ملتے ہیں۔ تاریخ اور بالخصوص سوانح فراہمی مواد کا بہترین ذریعہ ہے۔ مثلاً کسی ایک شخص کی سوانح حیات سے ایک افسانہ نگار غیر مکمل صورت حالات لے کر ان کی تکمیل کر کے افسانہ تعمیر کر سکتا ہے، یا مکمل صورتِ حال لے کر یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اگر یہی صورتِ حال کسی اور شخص کی زندگی میں جس کے حالات مختلف ہوں وقوع پذیر ہو تو نتائج کیا نکلیں گے، یوں بھی افسانے بن سکتے ہیں۔

سوانح سے بھی زیادہ روزانہ اخباروں سے افسانوں کے لئے بنیادی خیال فراہم ہوتے ہیں۔ روزانہ اخبار میں واقعات و حالات کا لامحدود خزانہ موجود ہے، قدم قدم پر ایسے حقیقی وقوعے ملتے ہیں، جو افسانہ بن سکتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ خبروں کے عنوانات، کارٹون، اور "ضرورت" اور گم شدگی کے اشتہار تک سے افسانوں کے بنیادی خیالات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

یاد رہے کہ افسانہ کے لئے بنیادی خیال حاصل کرنا اور اس بن بنے اور بنجر خیال سے کہانی بنانا دو مختلف چیزیں ہیں، ان متعدد خیالات میں سے جو اس کے ذہن میں نمودار ہوتے ہیں افسانہ نگار صرف ایک خیال کو لیتا ہے۔ مگر اس خیال کے بھی کئی کئی پہلو نکلتے نظر آتے ہیں، اور ہر پہلو سے ایک مختلف قسم کا افسانہ بنتا دکھائی دیتا ہے، اس مرحلہ پر افسانہ نگار بنیادی خیال کے سارے پہلوؤں کو سمجھ بوجھ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اور صرف اس پہلو کو اختیار کر لیتا ہے جس پر زیادہ سے زیادہ بلند پایہ افسانہ تعمیر ہو سکے۔ اس سلسلہ میں وہ خیال کے بہترین پہلو کو کئی لحاظ سے دیکھتا ہے اگر اس پہلو پر افسانہ کی بنیاد رکھی جائے تو وہ صرف افسانۂ عمل ہوگا یا افسانۂ کردار، یا افسانۂ ماحول، نفسیاتی افسانہ معلوم ہوگا یا افسانۂ مسائل؟ یا افسانۂ تمثیل؟ پھر اگر بنیادی خیال کا موزوں ترین پہلو یہ اشارہ کرتا ہے کہ اس پر جو افسانہ تعمیر ہوگا وہ بلند پایہ افسانۂ کردار ہوگا۔ تو افسانہ نگار کو افسانہ کی تعمیر شروع کرنے سے قبل یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کس وضع کا کردار افسانہ میں پیش کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ آیا بنیادی خیال کا اشارہ کسی مخصوص وضع کے کردار کی طرف تو نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو کسی وضع کے کردار بنائے جا سکتے ہیں؟ اور کل جتنی وضعیں سامنے آ رہی ہیں ان میں کونسی

وضع افسانہ کے کردار کے لئے مناسب ترین ثابت ہوگی؟ اسے یہ بات بھی سمجھنی پڑتی ہے کہ بنیادی خیال کو مدنظر رکھ کر جو حالات پلاٹ کے اجزا کے طور پر ترتیب دئیے جارہے ہیں، ان حالات میں کردار کو کس انداز سے بے نقاب کیا جائے گا؟ کیا ان حالات میں ڈرامائیت ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا ان سے کوئی موثر پلاٹ ترتیب پاسکے گا؟ اگر پاسکے گا تو کردار اور حالات کو کس قدر متصادم کیا جائے،

اگر بنیادی خیال واقعہ ہو تو افسانہ نگار کے سامنے اور طرح کے حل طلب سوالات ہوتے ہیں کیا اس واقعہ کو افسانۂ عمل کا بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟ یا اگر نہیں بنایا جاسکتا تو شاید یہ کسی اور افسانہ کا واقعہ ہے؟ وہ کس قسم کا افسانہ ہوسکتا ہے؟ کس قسم کے کردار درکار ہوں گے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ افسانۂ کردار یا افسانۂ ماحول ہو؟ غرض یوں ہر بنیادی خیال کے تمام پہلوؤں پر افسانہ شروع کرنے سے قبل نظر ڈالی جاتی ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا بنیادی خیال جس کے متعدد پہلو ہوں کامیابی کے ساتھ استعمال نہ ہوسکے، اور اگر ہو بھی جائے تو جو کہانی اس سے بنے وہ کچھ بلند پایہ نہو، اسی طرح اس امر کا بھی قوی امکان ہے کہ بنیادی خیال بہت ہی معمولی سا ہو مگر اس پر مبنی ہے کہ افسانہ اعلیٰ درجہ کا ادبی شہ پارہ بن جائے، بہرکیف خواہ افسانہ طنزیہ ہو خواہ مزاحیہ، دردناک ہو یا تبسم بخش۔ مگر کمزور نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کمزوری افسانہ کو فنا کردیتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں افسانہ کا نفسِ مضمون زندگی بخش ہونا چاہیئے۔ اگر کسی ایسے نفسیاتی نکتہ پر افسانہ کی بنیاد رکھی جائے جو انسانی فطرت کی گہرائیوں سے تعلق رکھتا ہو تو افسانہ خواہ مخواہ پرکشش ہوجاتا ہے، جب تک اس رنگ کی کشش پیدا نہ کی جائے افسانہ پڑھنے والے کے لئے باعثِ دلچسپی نہ ہوسکیگا۔

افسانہ کا مخصوص کمال یہ ہے کہ اس میں ایک فرد کی اندرونی زندگی کے مدوجزر کا خاکہ بڑی آسانی سے کھینچا جاسکتا ہو اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ فرد حالات کے اعتبار سے پست ترین ہے یا کردار کے اعتبار سے قابلِ تنفر۔ افسانہ نگاری کے استادوں کی کہانیوں کا نفسِ مضمون ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تنگ حالات میں ایک فرد کی بہادری نے کیا کرشمہ دکھایا یا ان حالات میں کیا مضحکہ انگیز یا دردناک صورتیں پیش آئیں اور زندگی کا نکھرا ہوا جوبن کس طرح جلوہ نما ہوا، افسانہ کا پلاٹ خواہ کتنا ہی نادر بنایا جائے مگر دلچسپی اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب افسانہ میں انسانی طرزِ عمل کی نیرنگیاں، مسرت، غم، مایوسی اور تمنا کی صورت میں عکس ریز کی جائیں، یہ تصویریں پڑھنے والوں کے دلوں کی لوح پر کندہ ہوکر ان کی زندگیوں کا جزو بن جاتی ہیں۔ اور یہی اُن کا مصرف ہے،

پروفیسر مجیب نے اپنے افسانہ "خانصاحب" میں خانصاحب اور "خالہ اماں" کے کردار کتنے فطری بنا کر پیش کئے ہیں اور حقیقت میں یہ بڑی کامیابی ہے، خانصاحب کو جب افسانہ نگار نے پہلی مرتبہ دیکھا تو،

"اُن کی عمر قریب پینتالیس سال کی تھی۔ مگر روایات سے معلوم ہوا کہ اُن کے بال ہمیشہ سے ایسے ہی سیاہ وسپید کی آمیزش رہے ہیں، آنکھیں ایسی خوفناک، مزاج ترش، اور ٹوپی میلی، بواسیر کی شکایت بھی ان کی ہستی ہی سے وابستہ تھی۔ خان صاحب سویرے جاکر موذن کو جگاتے تھے، مسجد کا امام اُن کے ڈر سے نماز میں لمبی لمبی سورتیں پڑھتا تھا دیر تک دعا مانگتا، اور دعا مانگتے مانگتے کثرتِ گناہ کا احساس اُسے رُلا بھی دیتا تھا، خانصاحب کی ذات نے اسی مسجد کو جو علاوہ جمعہ کے ویران پڑی رہا کرتی تھی، اجتماعِ مسلمین کا مرکز بنادیا تھا، خان صاحب کی ڈاڑھی دیکھکر شریفوں کیا غنڈوں کو بھی ڈاڑھی مونڈنے کی ہمت نہ رہی، خاں صاحب شریعت کے ایسے عالم تھے کہ بغیر کفر کا الزام سر لئے دنیاوی معاملات میں بھی کوئی اُن کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا۔ منطقی ایسے کہ جوشِ گفتار سے دوسرے کا دماغ پھرادیں۔ اور فلسفی اس پایہ کے کہ جب بیان شروع ---- کردیں تو کسی کو بغیر ہاں میں ہاں ملائے نہ بن پڑے"

خالہ اماں کا کردار بھی کچھ کم فطری نہیں ہے۔

"اُنھوں نے اپنی عمر عبادت کے لئے وقف کردی اور جائداد کی ساری آمدنی غریب بچوں کی تربیت اور حاجتمندوں کی امداد میں صرف کرتیں۔ ہر مولوی، مُلا، امام، حافظ، عالم کو ان کے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا، خاں صاحب نے شریعت کی پابندی اور رکھے کے زور سے جو اقتدار حاصل کیا تھا وہ میری خالہ کے اثر سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ میری خالہ کو

"یہ معلوم ہو گیا تھا کہ خانصاحب کو (اپنی بیوی کی) ڈولی کا کرایہ
دینا ناگوار گزرتا ہے اور انھوں نے خانصاحب کی بیوی کو
پیشگی کرایہ بھیجنے کا قاعدہ بنا لیا تھا، اس پر بھی خادمہ کو سخت
تاکید تھی کہ خانصاحب اُسے دیکھ نہ پائیں"

منشی پریم چند کے ہاں ایسے کرداروں کی بہت بہتات ہے، "بازیافت" میں بھولی ششما، اور اُس کے شوہر۔ "بوڑھی کاکی" میں ننھی لاڈلی۔ "بینک کا دیوالہ" میں نیک اطوار کنور جگدیش سنگھ "مشعلِ ہدایت" میں صحیح زینب ار بابو لال۔ "خواب پریشاں" میں وفا کی دیوی منورما۔ "جج اکبر" میں جاں نثار اناعباسی، "آتما رام" میں مہادیو سنار، "ایمان کا فیصلہ" میں شیر دل برہنی بھان کنور، اور منشی جی کی ماں، اور بیوی، "درگا مندر" میں شوہر پرست بھاما، "خون حرمت" میں غیر تمند زبیدہ کے کردار زندگی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔

نیاز کے کرداروں کی تخلیق عموماً "ذہنی لطف اندوزی" کے خیال کی بنا پر ہوتی ہے مگر جہاں کہیں نیاز نے زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ "۱۹۲۵ء کا ایک صوفی" میں بدطینت لوتی شاہ "سودائے خام" میں اسلم۔ "بعد المشرقین" میں سلیم الطبع اقبال۔ "محلہ کی رونق" میں ناگریز مصیبت مہر زمانی بیگم۔ "ایثار" میں سلمہ۔ "میر بیدانہ" میں سید لطافت حسین کے کردار اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

مظہر انصاری کے افسانے بھی ایک بلند حیاتی پیغام کے حامل ہوتے ہیں، اور اس پیغام کو دل نشیں بنانے کے لئے مصنف کو اپنے کرداروں کو زیادہ سے زیادہ قریب الفطرت بنانا پڑتا ہے "آخری سوغات" میں رفیق اور اس کی منہ بولی بہن، "ماں" میں مرحوم عورت اور اُس کے نالائق بیٹے۔ "تلاپ کے فرشتہ" میں سلیمہ اور اس کے بھولے ننھے۔ "چنگاری" میں ناعاقبت اندیش جٹھانی۔ "شہزادی" میں جاوید اور ہیروئن، "مسلے ہوئے پھول" میں سماج کے باغی ڈاکٹر۔ "دل کی دو کروٹیں" میں نوجوان ڈاکٹر، بیمار نواب اور عطیہ چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں، جن کے اعمال و افعال پڑھنے والے کے دل پر مستقل نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

اسی طرح افسانہ میں جدّت اور انوکھا پن بھی ہونا ضروری ہے ورنہ کوئی اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہوگا، نفسِ مضمون پرانا ہو سکتا ہے، مگر اسلوب بیان بالکل نیا ہونا چاہیئے، اصل یہ ہے کہ ایک چیز کی طرف سے اگر وہ دلچسپ نہ ہو انسان کی توجہ بہت جلد ہٹ جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہی باتیں جو بار بار دوہرائی جا چکی ہیں، ایکبار پھر دوہرائی جاتی ہیں اور لوگ انھیں دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنتے ہیں، اس کی وجہ؟ اسلوب بیان کی جدت اور کشش۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی افسانہ نگار انہی واقعات میں سے کوئی واقعہ لے کر اس پر افسانہ تعمیر کرے جو بار بار اسی غرض کے لئے استعمال کئے جا چکے ہیں تو پڑھنے والے ایسے افسانہ کے ساتھ یہی سلوک مناسب سمجھیں گے کہ اسے بے پڑھے چھوڑ دیں وہ پہلے ہی جانتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔

افسانہ کا خصوصی امتیاز ہے کہ وہ پڑھنے والے کے دماغ کو جھنجوڑ کر بیدار کرے اور اسے اس سوچ میں ڈال دے کہ خبر نہیں افسانہ کا انجام کیا ہوگا۔ فرسودہ مضمون سے پہلے ہی دماغ سیر ہو چکا ہوتا ہے، اگر ایک بار پھر اس کے سامنے اسی فرسودہ مضمون کا اعادہ ہونے لگے تو وہ یقیناً سو جائے گا، افسانہ موثر اسی وقت تک ہو سکتا ہے جب اس میں جدت ہو، انوکھا پن ہو، اور وہ دماغ کو فکر و غور کی راہ پر گامزن کرے۔

کسی متنازعہ فیہ مسئلہ پر افسانہ کی بنیاد رکھنا بہت خطرناک ہوتا ہے کیونکہ پھر سارا افسانہ دلائل و براہین سے لبریز نظر آتا ہے۔ افسانہ میں بحث و نظر کے لئے میدان تلاش کرنا خود بالکل غلط راستے پر ڈالتا ہے، ایسا افسانہ پند و نصائح اور وعظ و نصیحت کا ایک دفتر تو یقیناً بن سکتا ہے مگر افسانہ نہیں بن سکتا، کیونکہ اس میں جذبات سے اپیل کرنے کا کوئی سامان نہیں، بعض لوگ افسانہ لکھتے وقت متنازعہ فیہ مجلسی معاملات پر اپنی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ اقدام بھی افسانہ کے لئے سم قاتل بن جاتا ہے۔ اگر سوسائٹی مجموعی طور پر ابھی تک کسی مسئلہ کا حل تلاش نہیں کر پاتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مسئلہ بہت اُلجھا ہوا ہے، یا کم از کم اس کے دو پہلو ہیں افسانہ میں کسی ایسے مسئلہ کو چھیڑ دینے کا صریح نتیجہ یہ ہے کہ افسانہ نگار وحدتِ تاثر کو برباد کر دے گا، کیونکہ دو پہلو رکھنے والے مسئلہ پر یک طرفہ بحث کر کے وہ لوگوں سے جو دوسرے پہلو کے موید ہیں، کبھی بھی یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے افسانہ سے کوئی اثر لیں گے۔ مثلاً ایک افسانہ نگار جنگ پر کوئی افسانہ لکھے تو وہ اس میں یقیناً جنگ کی ہولناکیوں کی تصویر کھینچے گا مگر افسانہ میں یہ دکھانے کی کوشش کرنا یقیناً خطرناک ہے کہ "جنگ بند ہو جانی چاہیئے" اس میں کوئی حرج نہیں کہ افسانہ کسی مجلسی یا سیاسی

مسئلہ کے بہت قریب تک جا پہونچے، مگر اس کی جزئیات تک یا اس کی پیچیدگیوں میں اُتر جانا درست نہیں۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک یہ ہے کہ کسی ایسے نفسِ مضمون پر افسانہ تعمیر کیا جائے جس کا افسانہ نگار کو پوری طرح علم نہیں، اور جس پر وہ پورا عبور نہیں رکھتا، مثلاً ایک ایسی لڑکی جس کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہے سیاسیات سے متعلق افسانہ نہیں لکھ سکتی۔ کیونکہ وہ علمِ سیاست سے بالکل بے بہرہ ہے اسی طرح ایک ایسا شخص جس نے اپنی ساری زندگی خشکی پر بسر کی ہے، سمندری زندگی کے متعلق افسانہ لکھے گا۔ قطعاً نااہل ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سمندری زندگی کے متعلق کتابوں سے معلومات مہیا کرے۔ مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں ضرور ایسی ٹھوکر کھائے گا کہ اس کی لاعلمی کی پول کھل جائے گی۔ اگر محض مطالعہ کے بل بوتے پر کوئی شخص اجنبی ماحول کا افسانہ لکھنا چاہے تو اسے اپنے پسند کردہ ماحول کے متعلق اس قدر وافر ذخیرۂ معلومات مہیا کر لینا چاہیئے کہ یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ تصور میں وہیں زندگی بسر کر رہا ہے اور پھر جب وہ افسانہ میں اس فضا کی تصویر کھینچے تو چاہیئے کہ اس تصویر کو زیادہ سے زیادہ بے رنگ رکھے۔ تاریخی کہانیوں میں بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

بہرکیف پڑھنے والے جدت کے شیدائی ہوتے ہیں وہ ہر قسم کی جدت چاہتے ہیں، اسلوبِ بیان کی جدت، کردار نگاری کی جدت، پلاٹ کی جدت، فضا کی جدت، مگر یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اس جدت کی بنیاد میں بھی وہ فطرتِ انسانی کے نکات تلاش کرتے ہیں، کیونکہ ان نکات میں انھیں مقاصد اور اعمال عکس ریز نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ فطرتِ انسانی یہ بھی ہے کہ ہر شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں دوسرے کس وضع کے انسان ہیں اور اُن کو کیا کیا حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ فطرتاً ہر شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کارنامے جن میں ہم کامیاب نہیں ہو سکے دوسروں نے کس طرح انجام دے لئے۔ یوں وہ افسانے جن میں اجنبی اور اَن دیکھے افراد کی زندگیاں پیش کی جائیں۔ مدامی دلچسپی کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔

اب سوال سامنے آتا ہے۔ افسانہ کے مقصد کا۔ مقصد اور افسانہ کا نتیجہ دونوں ہم معنی نہیں ہیں۔ مقصد افسانہ کے واقعات کے طور طریق سے ترتیب پاتا ہے۔ بعض اپنی کہانیوں میں زندگی کے مسحور انگیز پہلو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعض مخصوص کرداروں کے قابلِ توجہ پہلوؤں کو ابھار کر دکھاتے ہیں بعض فطرتِ انسانی کی رفعت یا اس کی پستیوں کو دکھاتے ہیں۔ گر کچھ بھی ہو کامیاب افسانہ نگار بنیادی خیال پر غور کرنے کے بعد افسانہ ترتیب دیتے وقت افسانہ کی غرض اور اس کے مقصد کا صحیح یا اندازہ کر لیتے ہیں اور اسی اندازے کی اٹکل سے وہ واقعات کو ترتیب دیتے ہیں، تاکہ وحدتِ تاثر پیدا ہو سکے۔



ملبوسِ سیم و زر لٹانے والو
غیروں کی تونگری بڑھانے والو
لرزاں ہے فقیروں کی صدا سے اب
اے بہرِ نمازِ عید آنے والو

اے عطر کے دریا میں نہانے والو
بادِ رمضاں سے ناز اٹھانے والو
[illegible]
... اے عید منانے والو

مسئلہ جبر و اختیار

ناظر

(یہ مسئلہ علمی حیثیت سے بہت اصطلاحی ہے اور سائنس اور فلسفہ کی موشگافیوں کو عام فہم پیرایہ میں پیش کرنے کا ایک ہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ مباحث کی علمی شان فنا ہو جاتی ہے۔ بلکہ اصطلاحات کو ترک کرنے سے غلط فہمی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر اس مضمون میں کہیں کہیں اسلوب بیان غلط فہمی کا باعث ہو جس کی حتی الامکان احتیاط کی گئی ہے، تو بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اہل علم حضرات محض اسلوب بیان کی بنا پر غیر ضروری نکتہ چینی سے احتراز کریں گے۔ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ یہ مضمون کسی چیز کا ترجمہ نہیں ہے)

جبر و اختیار کا مسئلہ باوجود اپنی عظمت اور اہمیت کے اس قدر پیش پا افتادہ ہے کہ اس پر بے شمار مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ مذہب اور فلسفہ کے جملہ مباحث میں یہ کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر رہا ہے، اور تاریخ انسانی کے ہر دور میں اس پر طبع آزمائی کی گئی۔ مگر باوجود ان تمام مساعی جمیلہ کے یہ مسئلہ ہنوز عقدۂ لاینحل ہے۔ رائے عامہ کا اجماع اس بات پر ہے کہ انسان نہ بالکل مجبور ہے اور نہ بالکل مختار۔ بلکہ ان دونوں صورتوں کی درمیانی حالت میں ہے، یہ ایک منطقی استنباط ہے، سائنٹیفک حقیقت نہیں ہے۔ علمی تحقیقات کی بنا پر دو ہی صورتیں ہیں یعنی جبر یا اختیار، یا ایک پہلو پر زور دیا جا سکتا ہے، یا دوسرے پہلو پر۔ دونوں کے ہموزن یا متوازی ہونے پر ذہنی توازن قائم نہیں رہتا۔ ترازو کا پلہ کسی ایک طرف جھکتا معلوم ہوگا۔ اس کے متعلق ہم آگے چل کر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے،

مذکورہ عقیدے کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ جسم اور روح دو علیحدہ علیحدہ اور متضاد چیزیں ہیں۔ جسم موت کے بعد فنا ہو جاتا ہے اور روح باقی رہتی ہے۔ جسم مادی ہونے کے باعث طبعی قوانین کا پابند ہے اور روح غیر مادی ہونے کی وجہ سے اُن سے بری ہے، اور انسان چونکہ جسم اور روح سے مرکب ہے، اس لئے وہ مقید بھی ہے اور آزاد بھی (یہاں پر روح سے مطلب محض حیات نہیں ہے، بلکہ روحِ انسانی یا نفسِ انسانی یا نفسِ ناطقہ مراد ہے، ورنہ بمجرد روح اور جسم کے اتصال یا اتحاد کی بنا پر جو کچھ انسانی افعال کے متعلق کہا جا سکتا ہے، وہی حیوانی افعال کے متعلق بھی لازم آنا چاہیے، درآنحالیکہ بعض ادنیٰ قسم کے جانوروں کے افعال میں ارادے کا عنصر بمنزلۂ نفی کے ہوتا ہے۔ اُن کے افعال ارادی نہیں ہوتے بلکہ زیادہ تر اضطراری ہوتے ہیں، جیسے انسان کے شیر خوار بچے کے، کیونکہ انسان رحم مادر سے لے کر پیدائش تک اور شیر خوارگی سے لے کر سن شعور تک مختصراً اُن تمام مدارج کا اعادہ کرتا ہے جو ہزارہا سال کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہیں) غرض انسانی افعال کے جبر و اختیار کے بین بین ہونے کا تصور یا تخیل دو انتہائی اور متضاد نظریوں کے درمیان سمجھوتہ پر مبنی ہے، واقعتہً اس کا ثبوت نہیں بہم پہنچ سکا ہے[1]

[1] یہاں پر اگر کوئی شخص کہے کہ یہ چیزیں تو ذہن ہی کے متعلق ہیں۔ ان کا شمار اُن شواہد میں نہیں ہے جن پر سائنس اپنا عمل کرتی ہے تو ایسا شخص علم النفس اور مابعد الطبیعات میں امتیاز نہیں کرتا۔ علم النفس ایک سائنس ہے جس میں تجربہ اور مشاہدہ کو دخل ہے، مسئلۂ زیر بحث علم النفس کے متعلق ہے مگر خود سائنس ہی کے بعض مسائل ایسے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے متنازعہ فیہ ہیں (بقیہ صفحہ دوسری پر)

پھر اس طرح کے استدلال میں جو نقائص ہیں وہ ظاہر ہیں۔ اس تمام استدلال کی بنا اس مفروضہ پر ہے کہ جسم اور روح دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ یہ ایک قدیم مذہبی عقیدہ ہے، جو زیادہ سے زیادہ ایک حسنِ ظن کہا جا سکتا ہے کافی ثبوت کی عدم موجودگی میں جس طرح اس کے جھٹلانے کی کوشش کرنا علمی حزم و احتیاط کے پہلو کے شایانِ شان نہیں، اسی طرح اس کے منوانے کی کوشش کرنا بھی ایک ناروا تحکم سے کم نہیں۔

اس مسئلہ کے حل کا انحصار زیادہ تر اسی بات کے فیصلہ پر ہے کہ جسم اور روح دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں یا نہیں۔ علیحدہ کا لفظ اکثر غلط فہمی کا باعث رہا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ دلیل عموماً پیش کی جاتی ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو جسم بغیر روح کے رہ جاتا ہے اور اس سے دونوں کا علیحدہ علیحدہ شے ہونا پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسے عامیانہ استدلال کو روا رکھا جائے تو دوسری طرف یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنین ابتدائی حالت میں محض مضغۂ گوشت ہوتا ہے اور پھر جب آگے چل کر اس جسم میں روح حلول کرتی ہے تو وہ کہیں اوپر سے یا باہر سے علیحدہ طور پر نہیں داخل ہوتی ہے بلکہ وہ اسی میں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور پیدا ہونے کا لفظ بھی غلط ہے بلکہ وہ شروع سے اس میں پنہاں ہوتی ہے اور بتدریج آشکار اور نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ اور زیادہ صحیح یہی ہے کہ روح جسم ہی کی ایک مخصوص طبعی کیفیت ہے جو موافق حالات میں ([illegible]) ہوتی ہے اور جب اس طبعی توازن میں کوئی اہم فرق آجاتا ہے تو وہ کیفیت زائل ہو جاتی ہے۔ اور اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے فطرت کا وہی عمل درکار ہوتا ہے جو اس مقصد کے لئے مخصوص ہے۔ ذیل کے صفحات میں جو بحث کی گئی ہے وہ زیادہ تر مسئلہ کے اسی پہلو کے متعلق ہے، یعنی روح و جسم علیحدہ علیحدہ شے ہیں یا نہیں۔

پھر یہ بات توجہ طلب ہے کہ ایسی دو چیزیں جو بنیادی اور اساسی طور پر مختلف الجنس بلکہ مختلف الاصل ہیں، جن میں کوئی شے اصلاً جزو مشترک نہیں، ان میں باہمی یگانگت، ربط اور اتحاد کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے اور نہ صرف ممکن ہو سکتا ہے بلکہ اس کو عمومیت کے ساتھ متحد حالت ہی میں دیکھا جاتا ہے، بنا بریں کیا یہ زیادہ قرینِ قیاس نہیں ہے کہ جس چیز کو زندگی یا حیات یا روح کہا جاتا ہے وہ ایک کیفیت ہے جو مخصوص حالات اور مخصوص ترکیب اور ترتیب کے تحت میں مادے ہی کی ایک ارتقائی شان کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے جس طرح ایک گردش کرنے والے پہیے کی رگڑ سے چنگاری یا شعلہ نمودار ہوتا ہے اور مادے کی یہ حیاتی صورت بتدریج ارتقائی منازل طے کر کے ذہن اور نفس کو رونما کرتی ہے۔ مادی اجزا کی باہمی ترکیب اور ترتیب، ان کے خواص اور باہمی اوزان کا تناسب ضروری ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن گیسوں کی آمیزش سے پانی بنتا ہے، منفی اور مثبت بجلی سے برقی رو پیدا ہوتی ہے۔ اگر برقی بیٹری بنانے میں مخصوص اجزائے ترکیبی کے باہمی تناسب اور ترکیب کے نسخہ میں ذرا بھی فرق ہو جائے تو بجلی نہیں پیدا ہوگی اگرچہ تمام چیزیں بظاہر درست ہوں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن ذی روح چیز غیر ذی روح سے پیدا نہیں ہوتی۔ حیات سابقہ حیات ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ روح اور مادہ کا فرق درجہ کا نہیں ہے بلکہ اصلی اور حقیقی ہے۔ سائنسدانوں کی مساعی جمیلہ کے باوجود کسی معمل کیمیائی میں صحیح معنوں میں کوئی جیتی جاگتی چیز جو حیات کے تمام لوازم اور خواص سے متصف ہو پیدا نہیں کی جا سکی ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اگر نقلی اور مصنوعی طریقہ سے ایسا نہیں کیا جا سکا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نظریہ غلط ہے۔ بلکہ جس حد تک اس باب میں کامیابی ہو چکی ہے وہ اس نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ حیاتیات کے متعلق طبعی نظریہ درست ہے۔ ارتقائی نتائج کے پیدا ہونے میں وقت ناگزیر ہے، اور پیدائش کے معاملہ میں وقت کے عنصر سے ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے چاہے وقت کے معنی کچھ ہی مقرر کئے جائیں اور وقت کی کوتاہی اور درازی کتنی ہی اضافی شے تصور کی جائے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وقت کا عنصر ارتقا کی جان ہے، اور ارتقا اور وقت لازم و ملزوم ہیں مطلوبہ نتائج کو حاصل کرنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ مخصوص اجزا کو مناسب اوزان اور ترتیب کے ساتھ رکھ دیا جائے بلکہ گردشِ لیل و نہار، ایک مسلسل چکر اور حالات و تغیرات کا یکے بعد دیگرے مخصوص تسلسل کے ساتھ واقع ہوتے رہنا اشیا کی قدر و قیمت کے اضافہ کرنے میں ازبس ضروری ہے، جس طرح ایک کپڑے کے سیل میں متفرق مشینوں کی مسلسل گردش سے ہوتا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ [illegible] مثلاً ڈارون کا نظریہ۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ذہنی چیز ہے بلکہ اس کا سبب خود مسئلہ کی نوعیت ہے۔ ورنہ یوں تو تمام علوم کو ذہنی کہا جا سکتا ہے۔ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز لاکھوں برس کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہو، اس کو تجربہ سے ثابت کرنا گویا وقت کے عنصر کو حذف کرنا ہے، درحالیکہ وقت ہی ہر قسم کے ارتقا کا جزوِ اعظم ہے۔

تانگا اور سپھر بنا ہوا کپڑا نکلنا شروع ہوتا ہے ۔

عالم شہود میں فطری مناظر اور تجاربِ مشاہدات کی ایسی توجیہ جو کسی خارجی اور بیرونی یا مافوق العادت قوت کی مداخلت کی بنا پر کی جائے (Rational) نہیں کہی جا سکتی اور سائنس یا با فنا بطہ علم کے نزدیک قابلِ تسلیم نہیں ۔ تا وقتیکہ خود اشیا ہی میں اس کی صلاحیت نہو۔ مثلاً اگر سیب کے گرنے کی توجیہ اس طرح کی جائے کہ جنات اس کو توڑ کر زمین پر گرا دیتے ہیں تو عقلِ سلیم باور نہیں کرتی ۔ البتہ جب کششِ ثقل کے ذریعہ اس کی توجیہ کی جائے تو تمام شکوک مطمئن ہو جاتے ہیں ۔ یہ خیال کہ روح کائنات کی اسکیم میں باہر سے داخل ہو گئی ہے ، کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتا ، تا وقتیکہ اس کا تکوینِ عالم میں ارتقائی طور پر خود بخود جلوہ گر ہونا قیاس نہ کیا جائے ۔ اور اگرچہ اس کی ابھی تک کافی شہادت موجود نہیں اور ہم زندگی کی ہدایت سے لاعلم ہیں جس طرح مادے کی بدایت سے بھی لاعلم ہیں ، لیکن اس لاعلمی سے کسی ضعیف الاعتقادی کو استوار کرنا ایک قسم کی خیانت ہے ، ہمیں اس وقت کے لئے خندہ پیشانی کے ساتھ تیار رہنا چاہئیے ، جب کہ ہمارا جہل و نادانی کا حجاب اُٹھ جائے اور ایسی حقیقت سے دوچار ہونا پڑے ، جس کے ماننے کے لئے ہم اپنے تعصبات کی وجہ سے آمادہ نہیں ۔ لاعلمی کو آڑ اور پناہ بنانا کمزوری کا پہلو ہے ، اور یہ طرزِ عمل بے لوث علمی تحقیقات کے راستہ میں سدِ راہ ہے ، ایسے لوگوں کے لئے "راز دہر کمتر جو" کا مسلک بہت مناسب ہے ۔

جبر و اختیار کے اکثر مباحث میں طبعی رجحان اور قدیم روایات کی جھلک پائی جاتی ہے ، جو خالص علمی مباحث ہیں ۔ ان میں بھی یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ اہلِ تحقیق کا میلان اس پہلو کی طرف زیادہ ہوتا ہے جس کے وہ مخصوص عالم ہیں ۔ مثلاً نفسیات کا عالم انسانی افعال کے اختیاری پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے اور طبعیات کا عالم جبر کے پہلو پر زور دیتا ہے ، اور یہ ایک فطری بات ہے ۔ کیونکہ ہر اہلِ علم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ علم کے اُس صیغہ کے ساتھ جس کا وہ مخصوص عالم ہے وفاداری ۔ موافقت اور مطابقت کی کوشش کرے ۔ وہ اشیا کے ساتھ اپنے مخصوص علم کے دائرے میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے ، اور بے ربطی کو برداشت نہیں کر سکتا ۔ یہ وہ نقص ہے جو تقسیمِ علوم کا لازمی نتیجہ ہے ، اور روائتی تعصب کی جگہ علمی تعصب لیتا جاتا ہے ۔

دیگر مضامین میں غلط مبحث کی شکایت پائی جاتی ہے ۔ لکھنے والے کے ذہن میں مسئلہ کا ایک مبہم تصور ہوتا ہے اور اُس کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس بحث میں کیا چیز ثابت کرنی ہے اور کس چیز کا ابطال کرنا ہے ۔ بعض جگہ ہم نے یہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ انسان کا اپنے افعال میں مجبور ہونا اس بنا پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی کوشش میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا ، مگر اس بات کو انسانی افعال کے بالارادہ ہونے سے کیا تعلق ہے ، نتائج کے کامیاب ہونے کا انحصار بے شمار اسباب کے متحد العمل ہونے پر ہے ، جو انسان کے قابو کی بات نہیں ، جہاں تک اس کو اپنے فعل کا اختیار ہے وہ کوشش سے کام لیتا ہے ۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ انسان خود اپنے فعل کا صحیح معنوں میں مختار ہے یا نہیں ۔ جس چیز کو ارادہ کہا جاتا ہے وہ انسان کی آزادی اور اختیار کا مظہر ہے یا اُن بے شمار طبعی اسباب سے متاثر ہونے کا لازمی و مقررہ نتیجہ ہے جو کائنات کی تکوین اور ارتقا میں کارفرمائی کر رہے ہیں اور جس سے کسی چیز کو مفر نہیں ۔ نفسیاتی پہلو پر زیادہ زور دینا مذہبی اثرات کا نتیجہ ہے ، لیکن مادہ پرستوں نے اس پہلو کے ساتھ جس بے اعتنائی کا سلوک روا رکھا ہے ، وہ بھی شکایت کے قابل ہے ۔

نہ صرف منطقی استدلال میں ذہنی عنصر شامل ہوتا ہے بلکہ خالص تجربہ اور مشاہدہ کا بھی وہ لازمی جز ہے جس پر سائنس کے حقائق کا دارومدار ہے ۔ اور بقول ایک ماہرِ نفسیات کے سائنس کے جملہ نظریئے مثلاً سالمہ ۔ ذرہ ، برقپارہ وغیرہ سب ذہن ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں ۔ غریب نفسِ انسانی کی کارفرمائیوں کو مفروضہ ذرہ کے ماتحت رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے ، درآنحالیکہ یہ ذرہ کا نظریہ خود اسی نفسِ انسانی کی ایجاد ہے ۔ تخیل کی دنیا کے مقابلے میں مادی عالم کو زیادہ پُر حقیقت اور اصلی سمجھا جاتا ہے ، کیا یہ فطرت کی ستم ظریفی نہیں ۔ (اس لطیفہ کے بیان کرنے سے ہمارا یہ مقصد ہے کہ اُن تمام دشواریوں کا اندازہ ہو سکے جو اس مسئلہ کی تحقیق میں حائل ہیں ، صحیح نتیجہ پر پہونچنے کے لئے کوئی

رابطہ اختیار کا تادرست اور زیادہ محفوظ ہوگا یہ خود اپنی جگہ پر ایک مسئلہ ہے، سچ پوچھئے تو جبر و اختیار کا مسئلہ نہ آج تک حل ہو سکا ہے اور نہ اُس کے کما حقہ حل ہونے کی اُمید۔ جب تک علمی تحقیقات کے ذریعے نئے نئے انکشافات ہوتے رہیں گے، کسی ایک نتیجہ کو مامون و مصئون نہیں قرار دے سکیں گے۔

...... نفس سے مراد وہ ذہنی حالت ہے جس کو عرف عام میں عقل، شعور، تمیز، سوچ بچار، ارادہ وغیرہ لزمات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ذہن میں آزادی اور اختیار کا عنصر کہاں تک شامل ہے اور آیا صحیح معنوں میں شامل ہے بھی یا نہیں۔ اس کے متعلق دو خیال ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ ارتقا کا نتیجہ ہیں جیسا کہ اغلب ہے تو طبعی قوانین اور ضوابط کے علی الرغم اختیار کا تصور بر خود غلط ہے۔ علت و معلول کے تسلسل ضروری میں اختیار کی گنجائش کہاں۔ لیکن اگر وہ عام ارتقا سے علیحدہ اور پہلے سے مکمل ذہن کی مداخلت کی وجہ سے ہے تو اختیار کے تصور میں کوئی لازمی نقیض نہیں، لیکن خود ایسی مداخلت اپنی جگہ پر کائنات کی عام روش کے ساتھ متناقض ہے۔ بیرونی مداخلت یا مافوق العادت اور کائنات سے علیحدہ یا ماورا ہستی کا تصرف اہل تحقیق کے نزدیک خالص علمی نقطۂ نظر سے خود اپنی جگہ محل نظر ہے اور بحث طلب مسئلہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ارادے میں اختیار کا عنصر لازمی طور پر شامل ہوتا ہے تو پھر حیوانات کے مبہم رجحانات طبع میں اور انسان کے افعال ارادی میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کیا ابہام سے شعور کی طرف آنا طبعی قوانین کی گرفت سے رہائی اور خلاصی کے مرادف نہیں ہے، لیکن یہ بات کہ بعض حیوانات[1] میں بھی افعال ارادی کا وجود پایا جاتا ہے اور انسان بھی بعض دفعہ مبہم رجحانات پر عمل کرتا ہے جو اس کے حیوانی آبا و اجداد کی یادگار کے طور پر اس میں باقی ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں کا فرق درجہ کا ہے، اصلی اور اساسی نہیں۔ اور اس لئے آزادی محض سطحی ہے حقیقی نہیں۔

اس جگہ دو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ کیا مذکورہ استدلال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگرچہ انسان بالکل کا مجبور رہنے مگر کچھ حد تک آزاد ہے اور اس لحاظ سے کیا یہ خیال اس عام عقیدے کے مساوی نہیں جس کی رُو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب کہ انسان کو بھلے اور بُرے میں تمیز اور انتخاب کی قوت دی گئی ہے تو اس میں اختیار کا نہ ہونا بے معنی ہے۔

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ کائنات کے ارتقائی نظریئے میں اختیار کے لئے کسی حد تک بھی گنجائش نہیں ہے۔ ہر تغیر پیشتر تغیر کا نتیجہ ہوتا ہے، اور نہ صرف قوت کی مقدار ہر حالت میں یکساں رہتی ہے بلکہ اس کے اخراج کی سمت بھی معین ہوتی ہے، بادی النظر میں اختیار معلوم ہوتا ہے جو نظر کا دھوکا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ یہ دھوکہ کیونکر لاحق ہوا تو اس کی وجہ اسباب و علل کا بے پایاں ہونا، اور ان کی عظمت و وسعت، مثال کے طور پر اس طرح سمجھئے کہ زمین ظاہر میں چپٹی معلوم ہوتی ہے مگر دراصل وہ گول ہے اور وہ کسی حد تک بھی چپٹی نہیں، کیونکہ دائرہ کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی خط منحنی ہوتا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بھلا اور بُرا کوئی حقیقی چیز نہیں بلکہ اضافی شے ہے، اور جس کو امتیاز یا انتخاب کہا جاتا ہے وہ ہمارے مخصوص قسم کے رجحانات کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے تحت الشعوری تاثرات عند الضرورت اُبھر آتے ہیں اور مختلف محرکات میں سے قوی تر محرک بازی لے جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض دفعہ ہم قوی محرک کو مصلحت اندیشیوں کی بنا پر دبا لیتے ہیں اور ضعیف محرک پر عمل کرتے ہیں اور یہ بات ہمارے ذی اختیار اور قادر ہونے کی دلیل ہے۔ مگر یہ غلط فہمی ہے۔ کسی محرک کو کسی خاص نقطۂ نظر سے ضعیف کہا جا سکے۔ مگر خود یہ بات کہ وہ بالآخر غالب آ جاتا ہے۔ اس کے مجموعی طور پر قوی ہونے کی دلیل ہے۔ مثلاً بعض لوگ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں اجتماعی مفاد کے حق میں عمل کرتے ہیں۔ مگر جن لوگوں میں آخر الذکر محرک اول الذکر کے مقابلہ میں واقعی ضعیف ہوتا ہے وہ کبھی قومی ایثار سے کام نہیں لیتے۔ ہماری مصلحت اندیشیاں جو ضعیف محرکات کو انجام کار قوی بنا دیتی ہیں وہ بھی ہمارے مخفی تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں جن میں پوشیدہ طور پر غلبہ کے لئے جنگ ہوتی رہتی ہے۔

ان تمام بحث کے بعد یہ تنبیہہ ضروری ہے کہ مخصوص علوم کے تحت میں جزوی اور تفصیلی بحث سے اغماض کر کے عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں اہل علم کے حلقوں میں مادیت اور روحانیت، دہریت اور الوہیت کی تحریکوں میں سے جس زمانے میں جس پہلو پر زیادہ زور دیا جائے گا، اُسی لحاظ

---

[1] مثلاً کتے میں بعض اعلیٰ قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں جیسے محبت و وفا داری۔ یہاں تک کہ انفعال کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے یا کم از کم اپنے قصور پر سزا پانے کی توقع۔

سے جو ہر و انتشار ہو کہ ایک یا دوسرے پہلو ہر ذرے کا اجتماع ہوگا۔ فی زمانہ مادیت کی تحریک کا عروج کم ہوتا جا رہا ہے خصوصاً جب کہ (Radio-activity) یا بالفاظ دیگر تحلیل مادہ کا انکشاف ہوا ہے کیونکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ مادہ جس کو غیر فانی سمجھتے تھے اور جو تمام عالم کی اساس تھا۔ اس کا تحلیل ہونا یا توانائی میں منتقل ہونا ایک حیرت انگیز اور انقلابی انکشاف ہے، کیونکہ اس سے قبل مادہ اور توانائی دو علیحدہ علیحدہ چیزیں سمجھی جاتی تھیں جو ایک دوسرے میں تبدیل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اِن حقائق سے جن امکانات کی جھلک نظر آتی ہے، وہ بہت دُور رس ہیں، مگر ان کی بنا پر جو استدلال کئے جاتے ہیں وہ غلطیوں اور تعصبات سے منزہ نہیں ہیں اور حسب منشا نتائج کا استنباط قبل از وقت ہے جن کی ہم ابھی تشریح کریں گے۔ زمانے میں اس قسم کے دَور آتے رہتے ہیں، ایک زمانہ تھا جب کہ مذہب اور روحانیت کا دَور دورہ تھا، پھر دہریت کو فروغ ہوا۔ گردشِ ایام باری باری سے ان کو دوہراتی رہتی ہے، وتلك الايام نداولها بين الناس۔

بعض لوگوں کا اس ضمن میں یہ خیال ہے کہ مذکورہ انکشاف کے ذریعہ مادہ کی ترکی تمام ہو گئی جس نے دہریت پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ خیال یہ تھا کہ مادہ کی مختلف شکلیں فنا ہوتی رہتی ہیں اور مادۂ مطلق فنا نہیں ہوتا ہے۔ اس مادہ سے مراد پہلے زمانے میں اربعہ عناصر تھے، یعنی آگ، پانی ہوا، اور مٹی۔ لیکن یہ چیزیں بھی بعد میں مرکب ثابت ہوئیں اور اس لئے قابل تجزیہ ان اربعہ عناصر کے فنا ہونے سے مادیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ کیونکہ مادہ سے مراد اساسی وجود ہے نہ کہ اجزائے مادہ کے مختلف قسم کے اجتماع ہے۔ جب اربعہ عناصر کا فنا ہونا ثابت ہو گیا تو اُن سے زیادہ مستقل اور اصلی وجود کے مظہر دیگر عناصر دریافت ہوئے جو ناقابل تجزیہ سمجھے گئے۔ ان کی تعداد ۹۲ تک دریافت ہوئی یہ (Atoms) یا ذرّے کہلاتے ہیں، ذرہ کو وجود کا اساس سمجھا جاتا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ ذرہ بھی جزو لا یتجزیٰ نہیں، بلکہ وہ برق پاروں کا مجموعہ ہے، جس میں کافی خلا موجود ہے۔ برق پارہ زیادہ مستقل اور اصلی و حقیقی وجود ہے ذرہ کے مقابلے میں۔ غرض بات وہی رہی، کہ اجزائے مادہ کے اجتماع اور ترتیب سے جو شکلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں وہ منتشر ہو جاتی ہیں، لیکن ترکیب کے ضائع ہونے سے مواد یا اجزائے ترکیبی ضائع نہیں ہوتے یہ سوال مفرد اور مرکب کا رہتا ہے، جن چیزوں کو اب تک پہلے بعد دیگرے مفرد سمجھتے آئے تھے وہ بھی مرکب نکلیں۔ اور پھر دہریت مادہ کی چار برق پارے اور اُن کے مراکز ہیں۔ ممکن ہے کہ اصلی اور مطلق وجود ان سے بھی متجاوز ہو جائے اور آئندہ کی تحقیقات میں یہ معلوم ہو کہ یہ مراکز بھی عقدہائے اہم سے زیادہ اصلیت اور اہمیت نہیں رکھتے، تب بھی مسئلہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اگر وجودِ مطلق کی سراغ رسانی ہم کو ذاتِ باری تک لے جائے تو بہت ممکن ہے مگر دہریت ہم مادی وجودِ مطلق سے بحث کر رہے ہیں جس کی اثر اندازی کے متعلق ہم اندازہ لگا سکیں۔ اگر کہا جائے کہ برق پاروں پر مادہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ ان میں کمیت نہیں ہوتی۔ وہ توانائی ہے جس میں مادہ مستحیل ہو گیا ہے۔ تب بھی اس کی اثر اندازی کی وجہ سے وہ طبعی چیز ضرور ہے، اور نیچریت یا دہریت سے مراد طبعی وجود ہے۔ کائنات کی مادی توجیہ میں مادہ اور توانائی دونوں چیزیں شامل ہیں اور یہ بات کہ ان دونوں چیزوں کا آپس میں کیا تعلق ہے، مسئلہ کی نوعیت کو نہیں بدلتی۔ مادہ کے انحطاط سے توانائی کو تقویت پہنچ گئی ہے۔ مگر مذہب پرستوں کے لئے یہ کوئی خوشی کا مقام نہیں ہے کیونکہ روح توانائی کی کوئی قسم نہیں ہے۔ روح کے متعلق اہلِ تحقیق کی کثرت رائے اسی بات پر ہے کہ وہ کائنات کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے، کہیں باہر سے نہیں آئی ہے بلکہ بتدریج طبعی مواد سے حیات رُونما ہوئی اور آہستہ آہستہ ذہن بروئے کار آگیا اور اس لئے عالم طبعی قوانین سے کسی کو مفر نہیں۔ ہر چیز مقدر اور معین ہے۔ تغیرات ماسبق تغیرات مابعد کے لئے راستہ مقرر کرتے رہتے ہیں جس میں انفرادی آزادی لہٰذا انحراف کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

اگر کہا جائے کہ عالم طبعی میں مادہ توانائی میں مدغم ہو جاتا ہے لیکن روح توانائی نہیں ہے تو پھر یہ اگر باہر سے نہیں آئی تو کس طرح پیدا ہوتی ہے اور ایسی کائنات میں روح کے لئے کہاں گنجائش ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ اگر چہ منفرداً ہم کو کسی ایک چیز میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سب چیزوں کا مجموعہ بعید جملہ قوانینِ فطرت کا باہمی عمل، امتدادِ زمانہ یا گردشِ لیل و نہار یہ سب باتیں اشیاء کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی رہتی ہیں، اور بہتر اور اعلیٰ تر شکلیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، روح ابتدائی حالت میں جس کو محض حیات کہنا چاہئے کوئی علیحدہ موجود

نہیں ہے بلکہ ایک کیفیت ہے جو مادّہ مخصوص حالات میں حاصل کرلیتا ہے۔ جس طرح ذرے کے اجزائے ترکیبی یعنی برقپارے خود صحیح معنوں میں مادّی شے نہیں ہیں۔ مگر وہ باہمی عمل سے مادّی خواص حاصل کرلیتے ہیں اور ذرّہ کی تکوین کا باعث ہوتے ہیں جو اصل مادہ ہے۔

یہ توانائی یا برقپارے جب مادّی خواص حاصل کرلیتے ہیں تو خود فنا نہیں ہوجاتے بلکہ موجود رہتے ہیں۔ مادی خواص اسی طرح طبعی عمل سے موافق حالات میں حیات کے خواص حاصل کرلیتے ہیں اور خود بھی موجود رہتے ہیں۔ اسی طرح حیاتی خواص آہستہ آہستہ نفسیاتی خواص پیدا کرتے ہیں اسی کا نام ارتقا ہے۔ یہ سب اگرچہ ظاہری طور پر ایک حد پر آکر فنا ہوجاتے ہیں مگر اس کے یہ معنی ہیں کہ اُن کی مخصوص شکل کی افادیت جاتی رہتی ہے مگر اس انتشار کے باوجود اُن کی انتہائی تجزیہ کی صورت یعنی برقپارے اور اُن کے مراکز قائم اور باقی رہتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یعنی کہیں تخریب کا عمل ہو رہا ہے کہیں تعمیر کا عمل ہو رہا ہے، اور اس مسلسل چکر سے بتدریج مجموعی طور پر قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، جس طرح مشین کی بار بار گردش اور پیہم چکر سے اس چیز کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، جس پر اس کا عمل ہوتا ہے۔ اگرچہ تنہا اور منفرد گردش کوئی معتد بہٖ اضافہ نہیں کرتی مگر اس کا یکے بعد دیگرے مخصوص التزام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہر ایک سابقہ تغیر بعد کے تغیر کو مخصوص شان عطا کرتا جاتا ہے جو منفرد طور پر ناممکن ہے۔

غرض تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک حد تک صحیح طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے ارتقا کے مختلف مدارج کا بغور مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس عالمِ کون و مکان کے شواہد طبعی قوانین کے تحت میں توجیہہ پذیر ہوسکتے ہیں یا نہیں اور اگر نہیں تو پھر اُن کے لئے کیا توجیہہ پیش کی جاسکتی ہے۔ تمام مظاہر فطرت کا ایک مسلسل زنجیر میں ہونا مقتضائے عقل ہے اور ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر بعض نوامیس فطرت اس عام قانون سے علیحدہ نظر آتے ہیں تو یہ ہمارے علم کی کوتاہی کی دلیل ہے ورنہ اس علیحدگی کو تسلیم کرلینا ایک رخنہ اندازی کے مرادف ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ بعض ناقابل توجیہہ نوامیس کو بھی ایک معلوم قانونِ فطرت کے تحت میں کھینچ تان کر لانے کی کوشش کرنا بالغ النظری کے منافی ہے اور تنگیٔ علم کی دلیل۔ اس طرح پر انکشاف حقائق کا دائرہ محدود ہوجائے گا۔ تو اس کا تعلق کسی معلوم قانون فطرت کی نوعیت سے ہے اگر نوعیت کے لحاظ سے اُس کے اطلاق کا دائرہ ہمہ گیر ہے تو ہر چیز کو بالآخر اسی کے تحت میں آنا چاہیئے۔ منفردہ حقائق کو ایک عظیم تر اور عام تر حقیقت کے تحت میں لانا تنگ نظری نہیں بلکہ عین بالغ النظری ہے۔ صحیح معنوں میں اسی کا نام علم ہے، البتہ بے جا تعصب اور ہٹ دھرمی علمی شان کے منافی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جدید انکشافات میں بعض ایسے حقائق معلوم ہوئے ہیں جو تسلسل ضروری کا ساقط ہونا ثابت کرتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ کائنات کے اسباب و علل کا سلسلہ فریب نظر ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو۔ مگر اس کے کوئی مخصوص اصطلاحی معنی ہوں گے۔ ورنہ عالم کون و مکان میں ہر تغیر حتی کہ خود فنا کا برپا ہونا بھی تسلسل ضروری ہی کا نتیجہ ہوگا۔ اور اسباب و علل کے تحت میں۔ وسیع معنوں میں تسلسل کا مفہوم امتداد زمانے کے مرادف ہے وقت اور تسلسل ایک ہی شے ہے خواہ اُن کے اصلی معنی کچھ ہی مقرر کئے جائیں۔

مذہبی عقائد کے لوگ اس قسم کی باتوں کی آڑ پکڑ کر اپنے طبعی رجحانات کو تقویت دیتے رہتے ہیں۔ ہمیں اس سے تعرض نہیں۔ مگر ہم ان اہل مذہب کو یہ جتا دینا چاہتے ہیں کہ جبر و قدر کے مسئلہ کا جہاں تک تعلق ہے اگر دہریت کو شکست فاش ہوجائے تب بھی خود مذہب کے نزدیک ہر چیز مقدر اور معین ہے۔ مذہبی حلقہ میں تدبیر کے مقابلہ میں تقدیر کا تفوق مادی نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے۔ خدائے قہار اور بزرگ و برتر کا تمام کائنات پر حاوی ہونا انسانی اختیار کو نفی کے برابر کردیتا ہے۔ تمام کائنات کا اُس کی مرضی کے مطابق عمل پیرا ہونا اور اس سے سرمو انحراف نہ کرسکنا اسی بات کی طرف اشارہ ہے، اور یہی مادی نقطۂ نظر ہے۔ ہر ایک تغیر سابق تغیر کی وجہ سے معین اور مقدر ہوتا ہے، اور یہ سلسلہ لازمی ہے۔ کوئی چیز اس جہاں میں منفرد اور اتفاقی نہیں ہے۔ تمام کائنات کا ارتقا ایک مقصد کی طرف منتج ہے۔ ایسے عالم میں کسی چیز کے لئے اختیار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تمام قوتیں طوعاً و کرہاً اسی مقصد کی پیروی میں مصروف ہیں جو ازل سے معین و مقدر ہے۔ ہمارا اختیار اور آزادی بالکل ظاہری اور سطحی ہے اور اپنی انتہائی تحلیل و تجزیہ میں کسی عالمگیر قوت کے تابع ہے۔

شعور کے متعلق دہریوں کا خیال ہے کہ اس کی حیثیت ایک طرح کے

(epiphenomenon) کی ہے جو حرکت سالمی کے ایک مخصوص حد تک شدید اور پیچیدہ ہو جانے پر رونما ہوتی ہے جس طرح پر ایک گردش کرنے والے پہیے کی رگڑ سے شعلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس توجیہہ میں جو خامیاں ہیں وہ محتاج بیان نہیں مگر سردست ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ باوجود اپنی خامیوں کے اس سے بہتر کوئی اور توجیہہ نہیں پیش کی جاسکی ہے جو کائنات کی عام اسکیم کے ساتھ چسپاں ہو سکے اور ہم آہنگی کی مدعی ہو۔ چاہے ارتقا کا خود رو ہونا مانا جائے یا اسکی رہنمائی میں کسی ذہنی قوت کا وجود تسلیم کیا جائے۔ بہر حال کائنات کا بتدریج ایک مقصد کی طرف بڑھنا جن عام قوانین کے ذریعہ عمل میں آرہا ہے اُن کی ہمہ گیری سے الگ ہو کر کوئی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا علمی اسپرٹ کے خلاف ہے۔

ارتقا کے باب میں بعض مسائل ابتک متنازعہ فیہ ہیں۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ مادی ارتقا خود بخود حیات کو پیدا نہیں کر سکتا۔ بلکہ جب مادی اجزا میں بتدریج ارتقا کے ذریعہ ایک خاص استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو حیات کا عنصر ایک مزید اور طرفہ شے کے طور پر اُس میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ قرینِ عقل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس اضافہ کی کوئی خاطر خواہ توجیہہ نہیں ہو سکتی تھی، تاوقتیکہ خود مادہ ہی میں یہ صلاحیت باطنی اور مخفی یا استعدادی طور پر موجود نہ ہو جس کو گردشِ ایام بتدریج استوار کر کے بروئے کار لے آتی ہے۔ حیات کی ابتدائی اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حرکت خود اختیاری پائی جاتی ہے۔ اور وہ اپنی مثل پیدا کرتی ہے اور تعداد بڑھاتی ہے۔ چنانچہ اس بات کے تجربے ہو چکے ہیں کہ مادہ میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ (organic) اور (inorganic) کی حدِ فاصل شکست ہو چکی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ حیات سے ذہن اور شعوری کیفیت کیونکر پیدا ہوتی ہے اس کے متعلق بھی بعینہٖ اسی قسم کی تفریق کی جاتی ہے ایک خیال ہے کہ شعور حیات کی ارتقائی صورت ہے اور دوسرا خیال ہے کہ ذہن علیحدہ طور پر اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شعوری افعال کی توجیہہ محض حیاتیاتی نظریہ کی بنا پر خاطر خواہ طور پر نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ ابتک اس کو تجربے سے ثابت کیا جاسکا ہے۔ غرض جس طرح بے جان مادے اور حیوانات کے درمیان حیات کی حدِ فاصل سمجھی جاتی تھی، اس طرح بعض لوگوں کے نزدیک حیوان اور انسان میں عقل و نطق کی حدِ فاصل سمجھی جاتی ہے۔ مگر جس طرح پہلی منزل طے ہو چکی ہے۔ اسی طرح دوسری کے متعلق بھی بجا طور پر خیال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ عام رجحان یہی ہے کہ شعور حیات کی ارتقائی صورت ہے۔ اسی طرح جس طرح ایک غنچہ بتدریج شگفتگی اختیار کرتا ہے اور کلی پھول بن جاتی ہے، بیج درخت بن جاتا ہے۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ انسان کا جسم یقیناً حیوانی آبا و اجداد کا ورثہ ہے جس میں حیات بھی لازماً شامل ہے۔ اور انسانی دماغ جو جسمانی چیز ہے حیوانی دماغ کے مزید نشو و نما کا نتیجہ ہے اور امتداد زمانے کے ساتھ اُسی طرح سلسلہ کی ارتقائی صورت ہے۔ انسان کے ذہنی قویٰ کی خصوصیت یقیناً اس کی مخصوص دماغی ساخت کا نتیجہ ہے اور اس لئے جسمانی ارتقا ہی ہے۔

ارتقا دو چیزوں سے کام لیتا ہے ایک وراثت اور دوسرے انفرادی تغیرات۔ ڈارون کا نظریہ نامکمل ضرور ہے لیکن غلط نہیں۔ توریث کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اکتسابی خصوصیات منتقل نہیں ہوتیں بلکہ صرف فطری خواص ہی منتقل ہوتے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے۔ پھر بھی اس قدر ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جو اکتسابی خصوصیات زیادہ مستحکم اور مرتسم ہو جاتی ہیں اور وہ وہی ہوتی ہیں جو فطری خواص سے زیادہ مماثلت رکھتی ہیں۔ اور جب وہ عادت میں داخل ہو جاتی ہیں تو فطرتِ ثانیہ کہلانے لگتی ہے، اور ان کا منتقل ہونا قرینِ قیاس ہے۔

انفرادی تغیرات کے متعلق بھی یہ خیال ہے کہ محض انتخاب طبعی اور بقائے اصلح کے قوانین کی بنا پر اُن کی کافی توجیہہ نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ مسلم ہے کہ جب تغیرات رُونما ہوئے تو قوانینِ وراثت اور انتخاب طبعی اور بقائے اصلح ان میں سے بعض کے معدوم ہونے اور بعض کے قائم رہنے میں معین و مددگار ہوئے۔ طبقات الارض کے ذریعہ جن نباتاتی اور حیوانانی انواع کا سُراغ ملتا ہے اور نیز مختلف جانوروں کے رحم کے نشو و نما کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات پایۂ یقین تک پہنچ جاتی ہے کہ انسان جسمانی حیثیت سے حیوانات کا خلف ارشد ہے۔ پھر یہ بھی مسلم ہے کہ جو قوانین بے جان مخلوق کے لئے ہیں وہی جاندار مخلوق میں بھی کارفرما ہیں، یہ نہیں کہ اجسام کے لئے الگ قوانین ہیں اور اجساد کے لئے الگ۔ اور وہ قوانین وہی ہیں جن کو علم طبعیات اور علم کیمیا نے دریافت کیا ہے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قرینِ عقل یہی ہے کہ تمام ترقی نیچے سے ہوتی ہوئی آئی ہے اور نفسِ انسانی حیات کی ارتقائی صورت ہے۔

یہاں پر یہ بحث پیدا ہو جاتی ہے کہ آیا دماغی تغیرات نفسیاتی یا ذہنی تغیرات کا سبب ہیں یا نتیجہ۔ ان میں علت کون ہے اور معلول کون۔ کون مقدم ہے اور کون موخر ہے۔ حیاتیات کے عالم حرکت سالمی کو سبب بتاتے ہیں اور نفسیات کے عالم نفس یا شعور کو۔ اس کے جواب کا انحصار اس بات پر ہے کہ دونوں میں سے کونسی چیز اصلی یا حقیقی ہے۔ حرکت سالمی یا روح۔ اگر کہا جائے کہ دماغ نفس کے عمل کا ذریعہ ہے جس کی وساطت سے نفس کام کرتا ہے اور دماغی تغیرات نفس کے باطنی اعمال کی ایک صورت ظاہری ہیں تو یہ ایک مفروضہ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن اس لحاظ سے کہ ارتقائی طور پر اول الذکر کو آخر الذکر پر تقدم حاصل ہے کیونکہ شعور بعد کی پیداوار ہے اس لئے جسمانی یا طبعی تغیرات نفسیاتی تغیرات کا موجب یا علت غائی ہیں۔ پھر جسمانی تغیرات کے ذریعہ نفس کی تاثر پذیری بھی ظاہر ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ نفس یا ذہن بغیر دماغ کے ظاہر ممکن نہیں۔[1] اس لئے اگر کہا جائے کہ دونوں چیزوں میں دماغ زیادہ اصلی اور حقیقی شے ہے تو کچھ غلط نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ذہنی تغیرات اور دماغی تغیرات ایک ہی چیز کے دو متوازی پہلو ہیں تو سوال ہوتا ہے کہ کس چیز کے۔ اور اس کا کچھ جواب نہیں۔ یہ تمام باتیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اختیار و ارادہ سطحی چیز ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسان طبعی قوانین کے ساتھ پابہ زنجیر ہے۔ یا مذہبی اصطلاح میں یوں کہئے کہ وہ تقدیر سے سرمو انحراف نہیں کرسکتا۔

ایک خیال یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر نفسیاتی اور ذہنی تغیرات دماغی (جسمانی اور طبعی) تغیرات کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اجزائے دماغ کا اس طرح بتدریج تغیر پذیر ہونا اور ترقی کرنا کہ مآل کار نفس اس سے رونما ہو کوئی اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ خود ذہن ہی کی کارگزاری ہے۔ کوئی ذہنی قوت تمام ارتقا کی تہ میں کام کرتی ہے جو ازل سے موجود ہے اور ارتقا کا مقصد اسی کو ظاہر اور عیاں کرنا ہے۔ وہی تغیرات کا اصلی باعث ہے، اور اُن کو اس طرح منضبط کرتی ہے کہ اُن سے مقصودہ نتائج پیدا ہو سکیں۔ اور کائنات کی ارتقا کا نتیجہ چونکہ مآل کار نفس یا شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ تمام وجود میں حقیقی شے یہی نفس یا شعور ہے جو دوسری چیزوں کے وجود میں لانے کا باعث ہے، جو اندر ہی اندر کام کرتا رہتا ہے اور ارتقا کی رہنمائی کرتا ہے، اور اعلیٰ مدارج پر خود رونما ہو جاتا ہے۔ بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے مگر بیج میں درخت موجود ہوتا ہے، اور خاص حالات کے ذریعہ آہستہ آہستہ ظہور میں آتا ہے۔ خود یہی بات کہ نفس یا شعور اعلیٰ ارتقائی منازل پر آکر ظاہر ہوتا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سب سے زیادہ اعلیٰ اور اہم وجود ہے جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ وہی ارتقا کا باعث ہے اور وہی ارتقا کا مقصود ہے۔ ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

لیکن یہ تمام استدلال اگر درست ہے تو اس کے معنی اس سے زیادہ نہیں ہیں کہ ذہن یا شعور محض استعدادی طور پر کائنات میں موجود ہے، جس طرح حیات بھی استعدادی طور پر موجود ہے اور اس طرح پر حیات اور شعور کا ارتقائی نظریہ جس کی گذشتہ صفحات میں تشریح کی گئی ہے مستحکم اور مضبوط ہوتا ہے، جو

---

[1] یہاں پر سائیکیکل ریسرچ کے بیان کردہ شواہد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ اہل سائنس کے نزدیک مسلم نہیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کی شخصیت (Personality) فنا نہیں ہوتی۔ اس کے ظاہری اور باطنی اعضا میں کتنا ہی تغیر ہو جائے مگر مخصوص شخصیت قائم رہتی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں قطع کر دیئے جائیں، اس کی صورت مسخ ہو جائے، اس کا دماغ مختل ہو جائے۔ اس کی ذہنیت بدل جائے۔ مگر شخصیت بدستور رہتی ہے۔ شخصیت ظاہری اور باطنی اعضا کا مجموعہ نہیں ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے، وہ محض روح بھی نہیں ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ پیکر نفس ہے جو ایک طرح کی پرچھائیں یا عکس ہوتا ہے اور جو مرنے والے کے بعد بھی بعض حالتوں میں دیکھا جاتا ہے۔

لیکن دراصل جس چیز کو شخصیت کہا جاتا ہے وہ ایک ذہنی (abstraction) ہے وہ ایک تمیز محدودیت یا انفرادیت کا تصور کہا جا سکتا ہے اور مخصوص محدودیت تعدادی یا شماری (unit) ہے جو ہندسہ کی طرح ذہنی چیز ہے۔ اس سے زیادہ اس کی اصلیت نہیں ہے۔ ہم کو وجود فی الخارج اور وجود ذہنی میں امتیاز کرنے کے لئے بیحد احتیاط کی ضرورت ہے۔ فوق العادت مشاہدات بسا اوقات مخصوص حالات اور فضا میں خود مشاہدہ کرنے والے نفس ہی کا کرشمہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ حسن عقیدت اور اس قسم کے خیالات کا بیک گراؤنڈ پہلے سے موجود ہو۔

لوگ حیات اور شعور کا باہر سے داخل ہونا مانتے ہیں اُن کا ابطلان ہوتا ہے نفس کے علیحدہ اور جداگانہ وجود کا نظریہ خود بخود شکست ہو جاتا ہے۔ رہا نفس کا اعلیٰ اور ارفع ہونا تو یہ عین ارتقا کے مطابق ہے۔ ارتقا اشیاء کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے اور اسی لئے نفس ارتقا کے تحت میں آتا ہے، یہ بات کہ ذہن باطنی طور پر ارتقائی عمل کی رہنمائی کرتا ہے صریحاً مبالغہ ہے۔ کیونکہ جب وہ خود استعدادی حالت میں ہوتا ہے اور بتدریج ارتقا کے ذریعے تکمیل کو پہنچتا ہے تو خود اس حالت میں رہنمائی کے قابل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ ایک قوتِ بالغہ جو پہلے سے کامل الشعور ہے یعنی خدائی ذہن کام کرتا ہے تو یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ لیکن جہاں تک جبر و اختیار کا تعلق ہے خدائی ہستی کا تصور بھی انسان کے اختیار کو ہیچ اور باطل کر دیتا ہے۔

مادہ اور رُوح کی بحث بھی قدیم سنت ہے۔ رہا مادہ کا حال یہ ہے کہ ابتک اس کی نوعیت کا پتہ نہیں چل سکا۔ جس قدر اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی اسی قدر وہ پیچھے ہٹتا گیا۔ اور نظر کو دھوکہ دیتا گیا۔ اب سے قبل مادہ کی انتہا ۹۲ عناصر بسیط تھے جو ناقابلِ تجزیہ تھے۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ یہ بھی تحلیل اور فنا ہو جاتے ہیں، اور اُن کے ترکیبی اجزا مثبت اور منفی برقپارے ہیں۔ یہ ایک کیفی چیز ہے کمی چیز نہیں۔ اس لئے اس پر مادہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہ محض قوت یا توانائی ہے جس میں مادہ مستحیل ہو جاتا ہے اور یہ مادہ ہیں۔ برقپاروں کی باہمی کشش سے ذرہ بنتا ہے۔ مختلف اور متعدد ذرّوں سے سالمہ، اور متعدد اور مختلف سالموں سے مادہ کی مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں جن کو مرکبات کہا جاتا ہے ان کی تین مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ دُخانی، سیال۔ اور ٹھوس۔ یہ لطافت سے کثافت کی طرف میلان تکوین کائنات کا باعث ہے اور کثافت سے لطافت کی طرف مراجعت فساد و فنا کا۔ یعنی اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا ہے، جو اساسی وجود ہے۔ غرض مادہ اور روح کی حدِ فاصل نئے نئے انکشافات کے ذریعہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر ہر چیز کی انتہائی اصلیت خدائے دانا و بینا ٹھہرے اور رُوح حکمِ ربی۔ اور مادہ روح یا نفس کی کارفرمائی کا محسوس ذریعہ۔ لیکن ابھی تک ایک ایسی ہستی کا تصور اور تخیل جو کائنات سے الگ اور ماورا ہو موجودہ معلومات سے باہر ہے، وہ معلومات جو تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ ان حالات میں ہم کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ واقعات کی صحیح تشریح بغیر ذاتی تعصبات کے ہم نے پیش کر دی ہے۔ محتاط علمی طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔ البتہ ان تفصیلی اور جزوی باتوں سے قطع نظر کرکے جو ابھی تک معرضِ بحث میں ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عالمگیر قوت اور اساسی حقیقت ہر چیز کی تہ میں کام کر رہی ہے، خواہ اس کا کچھ ہی نام رکھا جائے۔ اس کی ہمہ گیری سے کوئی شے منفرد اور الگ نہیں۔ سب ایک ہی اسکیم کے ماتحت اور ایک ہی زنجیر میں منسلک ہیں اور کسی کو سرِ مو انحراف کی گنجائش نہیں ہے۔ اختیار سطحی ہے اور جبر حقیقی۔ مذہب کے لہجے میں یوں کہئے کہ بندے کے لئے مشیتِ ایزدی اور رضائے الٰہی سے مفر نہیں۔ انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ میں فلاں چیز اپنے ارادے سے اختیار کر سکتا ہوں اور فلاں چیز کو ترک کرنے پر قادر ہوں۔ مگر اس کے تمام افعال۔ خواہشات اور خیالات واقعات و حالات ماسبق سے غیر محسوس طریقہ پر متاثر ہو کر تشکل پذیر ہوتے رہتے ہیں، اور وہ وہی کرتا ہے جو فطرت اس سے کرانا چاہتی ہے۔ فطرت کے چاہنے سے یہ مطلب ہے کہ اسباب و علل جو راستہ انسان کے لئے مقرر کر دیتے ہیں وہ لازماً اُسی پر گامزن ہوتا ہے، وہ فطرت کی اس جبریت کو محسوس نہیں کرتا اور بزعم خود اپنے کو آزاد سمجھتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی راج میں ہندوستانی غلام۔ شعور کے بھی مدارج ہیں اور شعور کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جب کہ انسان فطرت کی جبریت سے آگاہ ہو جائے۔

رہا سزا کا مسئلہ جو انسان کے ذی اختیار ہونے کی دلیل کے طور پر عموماً پیش کیا جاتا ہے یعنی انسان کو سزا کا مستوجب قرار دینے کے یہ معنی ہیں کہ وہ دو راستوں میں سے بہتر راستہ اختیار کرنے پر قادر ہے یا بُرائی سے اجتناب کرنے پر اس کو قدرت حاصل ہے تو یہ بھی ایک غلط فہمی ہے، ہم نہ صرف انسان کو بلکہ پالتو جانور کو بھی سزا دیتے ہیں۔ جب اس سے کوئی قصور ہماری نقطۂ نظر سے سرزد ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ جانور بھی آپس میں ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔ انتقام کے طور پر یا دیگر محرکات کے تحت میں، اور یہی بات انسان کے ساتھ ہے۔ انسان چونکہ بالطبع سوشل ہے اس لئے انسانی سوسائٹی میں سزا دہی کا کام ایک معین جماعت کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی جا رہی ہے کہ

مجرم کو ارتکاب جُرم سے روکنے کے لئے سزا کچھ زیادہ مفید چیز نہیں ہے بلکہ مجرمانہ میلان طبع کا انسداد تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جرم کا ارتکاب دو راستوں میں سے ایک کا مختارانہ انتخاب نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خاص حالات وماحول کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس لئے تعلیم و تربیت زیادہ صیح طریقہ ہے۔ عمدہ تعلیم و تربیت کے پہلو پر زیادہ زور دینا خصوصاً بچپن کے زمانے میں اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا اخلاق ماحول کی پیداوار ہے۔ علاوہ ماحول کے جو دوسری چیز انسان کے مخصوص رویہ کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ وہ وراثت ہے۔ اور اگرچہ یہ بات کہ دونوں میں سے کونسی چیز زیادہ اہم ہے ابھی تک قطعی نہیں ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں جبر و اختیار کے طبعی نظریئے کی تائید میں ہیں۔ اس نظریہ کے تحت میں سزا اور جزا اعمال کے فطری نتائج اور اثرات سے مراد ہے۔ حیات بعد الممات کی سزا و جزا اور خدا کی مشیت کے باوجود انسان کو اپنے اعمال کا مختار اور ذمہ دار ٹھیرانا ان سب باتوں کا بار ثبوت

شاعر کی عید

کہوں کیا دل پہ کیا کیا ہولناک آلام سہتا ہوں
نہ پُوچھ اے ہمنشیں کیوں عید کے دن سُست رہتا ہوں!

وہ صدمے جو لگے رہتے ہیں آسائش کی گھاتوں میں
وہ دنیا سسکیاں بھرتی ہے جو تاریک راتوں میں!

وہ چھوٹی راحتیں جن میں تپاں ہیں درد کے پہلو
وہ پھیکے قہقہے گرتے ہیں جن سے خون کے آنسو!

وہ چھوٹے زخم جن میں رات بھر دم ہی نہیں لیتی
غریب انسانیت کی سست روغمناک موسیقی!

وہ چشمہ غم کا سینے سے زمیں کے جو اُبلتا ہے
وہ غمگیں کروٹیں جو آسماں شب بھر بدلتا ہے!

وہ کوندے غم کے روحوں کے اُفق پر جو لپکتے ہیں
وہ دل جو سینۂ ذرّات کے اندر دھڑکتے ہیں!

وہ دل مشغول ہیں جو زندگی کے دردِ پیہم میں
وہ آنسو جو ہیں غلطاں دیدۂ اشیائے عالم میں!

صباحِ عید کے جس وقت جلوے مسکراتے ہیں
یہ سب روتے ہوئے مجھ سے گلے ملنے کو آتے ہیں!

جوش ملیح آبادی

شانتی

وجاہت سندیلوی بی اے

(نیک اور معصوم ارادوں کی اُن کمزور دوشیزاؤں کے نام جو آئے دن مجبوری کے بھیانک خدا کی بھینٹ چڑھتی ہیں!)

موضع نرائن پور ایک چھوٹی سی آبادی تھی جہاں زیادہ تر غریب کاشتکار رہتے تھے، میں گاؤں میں وہ تھا جو ہر ایک بنیا تھوڑے عرصہ میں ہو جاتا ہے یعنی مہاجن۔ اپنی دوکان کے ساتھ ساتھ میں لین دین کا بھی کام کرتا۔ اگرچہ میری عمر ابھی کچھ زیادہ نہ تھی، یعنی یہی پچیس چھبیس سال لیکن میرے تول کی وجہ سے گاؤں بھر میری عزت کرتا اور ہر جگہ میری آؤ بھگت ہوتی۔

جاڑوں کی ایک دوپہر میں دوکان کا کام ختم کرکے میں اپنے مکان کے احاطہ میں سود بیاج روپیہ آنہ پائی کے حساب میں محو اپنے آپ سے بے خبر دھوپ میں بیٹھا تھا۔ دفعتاً میرے کان میں ایک لڑکی کی آواز آئی، میں چونک پڑا۔ شیو نرائن مالی کی لڑکی شانتی مجھ سے کہہ رہی تھی "لالہ جی پتا جی نے کہا ہے کہ ہمارے یہاں پاہُن آگئے ہیں آپ ایک روپیہ دید یجئے، روپیہ ابھی اُن کے پاس نہیں ہے وہ کل دیدیں گے" میں چاہتا تھا کہ اس لڑکی سے مہربانی سے بات چیت کروں، لیکن مہاجنی کے بندھے ٹکے جملے میرے منھ سے بے اختیارانہ اُبل ہی پڑے "شیو نرائن کو تو جب دیکھو اُدھار کی پڑی رہتی ہے۔ آخر پھر ہمارا کام کیسے چلے اور وہ ابھی پچھلا ہی حساب صاف نہیں ہوا ہے۔ تمہاری ماتا کے کریاکرم ہی کے روپے ابھی نہیں ملے۔ میں تو تقاضے کے لئے آج خود آنے والا تھا"

شانتی کا منھ اُتر گیا، وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے ہونٹ ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ شیو نرائن بہت ہی غریب مالی تھا، بڑھاپے کی وجہ سے محنت مزدوری بھی نہ کرپاتا۔ شانتی جوان تھی لیکن بیچارے پاس پیسا ہی نہ تھا جو شادی کی کہیں بات چیت کرتا۔ مجھ سے اُس نے کئی بار کہا "لالہ جی بس پچاس روپیہ میں شانتی کے کام سے نپٹ جاؤں گا۔ آپ دیدیجئے، میں عمر بھر آپ کا غلام رہوں گا اور ایک ایک پیسہ کرکے آپ کو ادا کردوں گا" لیکن میں مہاجن ہو کر بھلا کب ایسی باتوں میں آنے والا تھا۔ میں ہمیشہ نفرت سے اُسے ٹال دیتا "بھائی ایسا روپیہ ہوتا تو سونے کی دیواریں نہ کھڑی ہوتیں؟" شیو نرائن خاموشی سے روتا ہوا چلا جاتا اور کہتا "شانتی مجھے مرنے نہ دے گی" اُس کی بیوی شانتی کی ماں اِسی غم میں گھل گھل کر مرگئی لیکن شانتی کی شادی دیکھنا اُسے نصیب نہ ہوا۔

میں اس وقت شانتی کو دیکھ رہا تھا اور وہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی، دفعتاً میرے دل میں نہ معلوم کیا سے کیا خیال آیا اور میں اُسے کسی اور ہی نظر سے دیکھنے لگا۔ میری بیوی کملا جوان اور حسین تھی۔ میں اُس سے بہت خوش تھا اور شادی کے بعد آج تک میں نے کسی عورت کو بری نگاہ سے بھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اُس وقت میرا دل نہ معلوم کیسے کیسے گمراہ کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جوانی سے بھرپور نازک حسین شانتی میرے پاس اپنی غرض لئے کھڑی تھی اور میں تھا اور میرا اکیلا احاطہ۔

میں نے سر سے پاؤں تک اُسے ایک جذبۂ بے اختیار سے دیکھا، اور دل سے اُس کے حُسن اور حُسن سے زیادہ اُس کی جوانی کی داد دی، وہ بیچاری

خاموش کھڑی رہی۔ میں نے پوچھا، "شانتی تمہاری شادی کب ہوگی؟"

پہلے تو اُس کا چہرہ شرم و حجاب سے سُرخ ہوگیا، پھر اُس کی آنکھوں سے کچھ ایسی حسرت برسنے لگی کہ میرا ایسا سخت دل بھی بےچین ہوگیا، معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اس سوال سے اُس کی خودداری کو ٹھیس لگی ہو۔ اور میں خود ہی اپنے دل میں نادم ہوگیا۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھو میرے بھی تو ایک لڑکی ہے یہ تو محض حادثۂ پیدائش ہے کہ شانتی میری لڑکی نہیں، لاؤ میں شیو نرائن کو پچاس روپے دے دوں۔ تاکہ وہ شانتی کی شادی کردے۔ لیکن پھر میرے نفس نے مجھکو سمجھایا کہ ایسے غریب تو سیوں ہیں۔ میرے روپے کی لالچ پھر عود کر آئی میں نے کہا "یوں تو میں روپیہ دے نہیں سکتا، ہاں اگر تمہارے پاس کوئی چیز ہو تو اچھے داموں رکھ لوں۔"

اب کے تو شانتی کے آنسو ہی نکل آئے، بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ہمارے پاس لالہ جی کوئی چیز کہاں؟"

اب تو مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اُس کے سامنے ڈال دیا۔ اُس نے روپیہ اُٹھا لیا۔ اور اپنی آنسو بھری آنکھوں سے مجھے بڑی احسان مندی سے دیکھا۔ میرے دل میں نشتر سا چبھ گیا۔

کسی وقت انسان نہیں جانتا کہ وہ گناہ سے کس قدر قریب ہے۔ ابھی تو میں نے نیک نیتی سے شانتی کو روپیہ دیا تھا اور ابھی میرے دل میں کیا کچھ خیالات آنے لگے۔ شانتی احاطے کے دروازے تک جا چکی تھی کہ میں نے پکارا، "ذرا بکھاری سے بھوسہ نکال دے" وہ بڑی خوشی سے ڈلیا اُٹھا کر بکھاری میں چلی گئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے میں بھی بکھاری میں جا پہنچا۔ "شانتی" کہہ کر میں نے ایک دم سے اُسے چمٹا لیا۔ اور اُسے بے قابو کرکے اُس کی آنکھوں اور رخساروں پر کئی بوسے دے دیئے۔ اُس نے تڑپنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بہت مضبوطی سے میری گرفت میں تھی۔ میں نے اور زور سے اُسے بھینچ لیا۔ میرا تنفس تیز تھا۔ میں نے رُک رُک کر کہا۔ "شانتی میں تمہاری شادی کا روپیہ دے دوں گا۔"

شانتی ایک دفعہ زور سے تڑپی۔ اور تڑپ کر میرے آغوش سے نکل گئی۔

"تم بھاگ نہیں سکتیں شانتی! دیکھو میں تمہاری شادی کا روپیہ دیدوں گا۔" میں اُس کی طرف بڑھا۔ مجھ پر بھوت سوار تھا۔ شانتی غصے اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ "لالہ جی ہم غریب ہیں، لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔" اُس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی اور وہ آگے کہہ نہ سکی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹی اور میں اُس کے بالکل قریب پہونچ گیا۔ میں نے پھر دیوانگی سے اُسے لپٹا لیا۔ اب کی اُس نے مجھے اس زور سے دھکا دیا کہ میں بھوسے پر گر پڑا۔ اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ بھاگی۔ میں اپنے جوش میں دیوانہ اُس کے پیچھے دوڑا۔ احاطے میں ایک پُرانا جوتا پڑا تھا اُس نے اُٹھا کر اس زور سے میرے منھ پر مارا کہ میں چکرا کر بیٹھ گیا اور میری ناک سے خون جاری ہوگیا۔ اور وہ لپک کر دروازہ کے باہر ہوگئی۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

تھوڑی دیر بعد جب میرے ہوش ٹھکانے ہوئے تو میرے دل میں بس ایک جذبہ تھا، جذبۂ انتقام! ایک ضعیف اور غریب مالی کی کمزور لڑکی سے انتقام! مجھے معلوم ہوتا کہ بس یہ ہے میری زندگی کا مقصد میں اپنے دل میں کہتا میرا سارا روپیہ خرچ ہو جائے مجھے کچھ پروا نہیں، لیکن میں بس ایک دفعہ شانتی کو اُس کی احسان فراموشی اور بدتمیزی کا مزا چکھا دوں!

تین چار روز بعد شانتی کے چچا کی لڑکی روپتی میرا روپیہ واپس کرنے آئی۔ اُس نے کہا، "شانتی نے دیا ہے۔" میرے دل میں انتقام کی آگ پھر بھڑک اُٹھی۔ میں نے دل میں کہا، "رہ جا شانتی اگر تجھ سے بدلہ نہ لیا ہو تو میرا نام نہیں۔" میں نے روپتی سے پوچھا، "کہاں ملی تھی تجھے شانتی؟" کہنے لگی "کل میرے ساتھ آلو کھودنے گئی تھی وہیں دیا تھا روپیہ" میں نے پوچھا "روز ملتی ہے تجھے؟" کہنے لگی "تینوں دن وہ میرے ہی ساتھ تو کام کرنے جاتی ہے۔" میں نے عجیب انداز سے روپتی کو دیکھا وہ نہ تو ایسی کچھ حسین تھی نہ جوان۔ اُس کی شادی کو بھی تین چار سال گزر گئے تھے۔ لیکن مجھے تو اپنا کام نکالنا تھا، اور بڑی ہوشیاری سے شانتی کو پھانسنے کے لئے اپنے جال کے پھندے مضبوط کرنا تھے، میں نے کہا "روپتی یہ روپیہ تو لے لے؟" وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے مسکرا کر اُس سے کہا "دیکھو ذرا بکھاری سے بھوسہ نکال دے۔" وہ بکھاری چلی گئی، اور میں بھی اُس کے پیچھے پہنچ گیا،

ایک غریب عورت روپے کے لالچ میں کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ مذہب
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

کے قیود صرف اُنھیں کے لئے ہو سکتے ہیں، جن کا پیٹ بھرا ہوا ہو، ورنہ بھوکے کا مذہب روٹی اور روٹی ہے۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے بہت دیر تک باتیں کرکے وعدہ لے لیا کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے شانتی کو میرے جنگل میں پھنسا دے گی، اور اُس کا انعام میں نے پانچ روپے مقرر کر دیا۔

تیسرے روز سویرے روپتی پھر آئی۔ اور مجھ سے کہہ گئی کہ آج شانتی میرے ساتھ جنگل میں گھاس چھیلنے جائے گی، میں نے اُس سے طے کر لیا کہ وہ گھاس چھیلتے چھیلتے شانتی سے دُور نکل جائے گی۔ مجھے کیا دیر تھی اُس کے جاتے ہی میں نے جلدی سے دوکان کا کام ختم کیا، اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل کیا تھا آبادی سے کوئی ڈیڑھ کوس پر راستے سے ہٹ کر جنگلی درختوں کا ایک چھوٹا سا کنج تھا، جو چاروں طرف سے گھنی جنگلی جھاڑیوں اور ڈھاک کے درختوں سے گھرا ہوا تھا، گاؤں والے اُسے جنگل کہتے، میں جب جنگل پہنچا تو اُس وقت تک شانتی اور روپتی وہاں نہیں پہونچی تھیں، میں ایک طرف جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے انتقام لینے کے طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ شانتی تنہا جنگل میں داخل ہوئی، اور روپتی اُس سے بہت دُور ڈھاک کے درختوں کی آڑ میں گھاس چھیلنے بیٹھ گئی۔ شانتی دھیمے سُروں میں کچھ گنگناتی بڑے والہانہ انداز سے چل رہی تھی۔ جیسے ہی میرے قریب آئی، میں ایک دم سے جھپٹ پڑا۔ پہلے تو وہ جھجکی، لیکن پھر تیزی سے اُس نے اپنا کھرپا تان لیا اور بڑی زور سے چیخکر روپتی کو آواز دی۔

چور کا دل ہی کتنا میں گھبرا گیا، "آپ بھی خفا ہو شانتی، میں تو اپنے کام سے آیا تھا یہاں۔ لو میں جا رہا ہوں"

شانتی میرے راستے سے ہٹ گئی، لیکن کھرپا اب بھی تانے رہی، کہنے لگی "لالہ جی تم امیر ہوا اپنے گھر کے، غریب بھی آخر آبرو رکھتے ہیں" میں اپنے دل میں بہت نادم ہوا، اور اُس سے معافی مانگنے لگا۔ پھر کہنے لگی "لالہ جی اگر جا کر کہہ دوں گاؤں میں اور تمہارے گھر میں"

اب تو میری نانی ہی مر گئی، میں بات بنانے لگا۔ اُس روز کا خیال نہ کرنا میں نے اُس روز شراب پی لی تھی۔ یہ کہہ کر مجھ سے جس طرح ہو سکا میں جنگل سے بھاگا۔ ایک دفعہ میں نے مڑکر دیکھا تو وہ اپنی ساری کے آنچل میں اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میرا دل کٹ گیا، راستے بھر اپنی شیطانیت اور بزدلی پر میں اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد شانتی کا باپ شیوزائن مر گیا، میں اس عرصے میں روپتی کے ذریعہ شانتی کو اپنے دام میں لانے کی برابر کوشش کر رہا تھا۔ اس واقعے سے میں خوش ہوا کہ شاید اب شانتی کا غرور ٹوٹ جائے اور روپے کے زور سے وہ میرے ہاتھ لگ جائے۔ لیکن باپ کی موت کے بعد وہ گاؤں سے کچھ ایسی غائب ہوئی کہ پتہ ہی نہ چلا کہ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ یوں تو میں شانتی کو بھول جاتا، لیکن اکثر آئینے میں اپنی ناک پر زخم کا نشان دیکھکر شانتی کو یاد کر لیتا۔

بارہ سال گزر گئے۔

رات کے دس بج چکے تھے، اور میں ایک طوائف کے کوٹھے پر چڑھ رہا تھا جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا میں تعجب سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا: "ایں، شانتی!"

"آئیے لالہ جی" کہہ کر شانتی کھڑی ہو گئی، اپنی ایک شال مجھے اُڑھا دی اور کہنے لگی، "اِدھر لالہ جی اطمینان سے بیٹھئے تکیہ کے قریب" میں بیٹھ گیا۔ کمرے کا ساز و سامان دیکھکر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دروازوں پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر سنہرے چوکھٹوں کی خوبصورت تصویریں آویزاں تھیں۔ چھت سے ایک بہت قیمتی بجلی کا فانوس لٹک رہا تھا۔ اور فرش پر قالین میں گھٹنوں تک پیر گھُسے جاتے، شانتی نے ملازمہ کو آواز دی، "لالہ جی کے لئے حقہ بھر لاؤ" ملازمہ نے چاندی کا ایک حقہ لاکر میرے سامنے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک میں امیرانہ ٹھاٹھ سے مرعوب رہا۔ لیکن دفعتاً میری نظر سامنے دیوار پر لگے ہوئے آئینے پر پڑ گئی، اور میں نے اپنی ناک پر زخم کا نشان دیکھ لیا۔ بارہ برس اُدھر کے واقعات بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوند گئے اور حسد نے آتشِ انتقام کو اور بھی بھڑکا دیا۔

"تو اب شانتی تم یہ کرتی ہو" میں نے نفرت سے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں" اُس نے متانت سے آنکھیں نیچی کرکے کہا۔ اُس کے چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اور اُس کا حُسن دیکھکر بیتاب ہو گیا۔ وہ اب پندرہ برس پیشتر سے زیادہ حسین تھی۔ کم از کم میرے لئے، مجھے اُٹھتی جوانی

جوانی سے وہ جوانی زیادہ پسند ہے جو شباب کے آخری دور میں انگڑائیاں لے رہی ہو۔

"روپتی کیا کرتی ہے؟" شانتی نے پوچھا۔

"کرتی کیا ہے وہی پیسنا پیستی ہے۔ بیچاری بیوہ ہو گئی" میں نے کہا۔

"اور کیسری کیا کرتی ہے" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ اس کا شوہر تو بڑا لاابالی ہے کچھ کرتا دھرتا نہیں" میں نے کہا۔

"تو گاؤں میں سب وہی کرتے ہیں جو پہلے کرتے تھے"؟

"اور کیا"؟

"آپ بھی وہی کرتے ہیں" اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا میں جھینپ گیا اور کچھ نہ بولا۔

"تم نے یہ کیا پاپ کیا شانتی" تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔

"پاپ۔ تم نے یہ کیا پاپ کیا کہ تم گھر میں بی بی بیٹی کو چھوڑ کر یہاں چلے آئے؟" اس نے تیزی سے کہا۔

میں نے اپنی شرمندگی مٹانی چاہی "لیکن تم کو تو بڑا ناز تھا شانتی، اور اب یہ کیا کر بیٹھیں؟"

"اب بھی ناز ہے مجھکو۔ میں اب کیا کسی کے سامنے ذلیل ہوں۔ تمہاری سماج یونہی بکا کرتی ہے۔ ذلیل وہی ہے جو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ میں اس وقت ذلیل تھی جب میں تمہارے سامنے ہاتھ پھیلانے گئی تھی، اور آج میں کیسے ذلیل ہوں، آج تو تم میرے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے آئے ہو" اس نے جواب دیا۔

مجھے بڑا اجل بل معلوم ہوا کہنے لگا "ذلیل وہ ہے جو خوددار نہیں، جسے اپنے آپ کی عزت نہیں۔ ایک تم ہو کہ خودداری بیچ کر یہاں گدوں اور قالینوں پر اپنی عزت کی دوکان لگائے بیٹھی ہو۔ اور ایک تمہاری ہی بہن روپتی سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر اپنی روزی کما رہی ہے لیکن اپنی عزت نہیں بیچتی"۔

"یہ تو تمہاری سمجھ کا قصور ہے کہ تم عزت کس چیز کو سمجھتے ہو اور ذلت کس چیز کو۔ بیچاری روپتی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہوگی۔ اپنے پرائے سب کی ڈانٹ پھٹکار سنتی ہوگی۔ اس بیچاری سے پوچھو تو جا کر خودداری اور عزت کہتے کسے ہیں۔ تم ہی جو آج یہاں بیٹھے اسے خوددار اور عزت والی کہہ رہے ہو کل جا کر اس کے جوتے لگاؤ گے۔ بڑے آئے خودداری لیکر عورت کو مجبور کرتے ہو اور پھر ڈھکوسلے لیکر چلے ہو خودداری اور عزت کے۔ لالہ جی اب جائیے۔ راستہ بھر ٹھنڈے دل سے سوچئے گا کہ وہ زیادہ خوددار ہے جو بیچاری آپ کی ڈانٹ پھٹکار سنکر خاموش ہو جاتی ہے۔ یا وہ جو اپنی مرضی سے آپ کے ایسے بیسیوں کو اپنے گھر سے نکال دیتی ہے"۔ ——— میں چپ چاپ نیچے چلا آیا۔

قطعہ

اس اُداسی سے مہکتے ہوئے گلزاروں پر
ابر جاتی ہوئی برسات کا لہراتا ہے
جیسے اک کشمکشِ کرب سے ماں کے دل میں
طفل سے دودھ چھڑانے کا خیال آتا ہے

(جوش)

قطعہ

ایک ہلکی سی مسرت، ایک مبہم سی خوشی
رُوح میں کچھ یوں مچلتی ہے بوقتِ پیچ و تاب
جیسے ہلکے ابر میں موہوم سا خطِ ہلال
یا کسی بیمار بچے کا تبسّم وقتِ خواب

(جوش)

تعلیمِ آزاد

کیا کہیں کیوں۔ یوں روبہ قضا ہیں
کیا کہیں کیوں غیروں سے خفا ہیں
کیا کہیں کیوں بیزارِ وفا ہیں
ڈیڑھ صدی سے صرفِ جفا ہیں

آخر جبر گوارا کب تک
آخر صبر کا یارا کب تک

غفلت کرکے جی نہیں سکتے
فاقے بھر کے جی نہیں سکتے
بھوکوں مرکے جی نہیں سکتے
جی سے گزر کے جی نہیں سکتے

اب دل مرنے سے نہیں ڈرتا
آخر مرتا کیا نہیں کرتا

یارو حالِ ملک تو دیکھو
رنگ و بالِ ملک تو دیکھو
فرطِ زوالِ ملک تو دیکھو
قحطِ رجالِ ملک تو دیکھو

آنکھ ہے اور غم خیز مناظر
بالکل یاس انگیز مناظر

کوئی مائل کارِ غلامی
کوئی حامل بارِ غلامی
جس کو دیکھو یارِ غلامی
تیس کروڑ اور غارِ غلامی

کیا کہیں کیا کہنے کی جگہ ہے
ڈوب کے مر رہنے کی جگہ ہے

اُٹھو ملک کے لالو اُٹھو اُٹھو ہمت والو اُٹھو
اُٹھو کام سنبھالو اُٹھو اُٹھو وقت نہ ٹالو اُٹھو

فتح کی حسکی شان دکھاؤ
شان دکھاؤ آن دکھاؤ

فکر عبث ہے جان نہ جائے جان کا کیا غم آن نہ جائے
ملکی قومی شان نہ جائے مرد بنو میدان نہ جائے

توپوں تُفنگ کے وار نہ مانو
جانیں دے دو ہار نہ مانو

بڈھو۔ جوانو۔ عورتو۔ مردو کر دو ترک غلامی کر دو
گھر دو۔ در دو۔ زر دو۔ سر دو بھر دو ملک کو دھن سے بھر دو

گھر گھر شمعیں روشن کر دو
چپہ چپہ گلشن کر دو

حکیم آزاد انصاری

غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رو موٹر مخالف سمت سے ہمدوش ہو کر جب گزرتے ہیں
یُونہیں دو بدگہر اشخاص جب ملتے ہیں آپس میں نئی تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں

جوش



چین کے شہر کینٹن پر جاپان کی بمباری کے نتیجہ کا
حسرتناک منظر

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، دہلی

اسرائیل احمد خاں

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۷)

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ پر جو مضمون کلیم کے اکتوبر نمبر میں سپردِ قلم کیا گیا تھا، اُس میں جامعہ کے زوالِ روح پر ہم نے جو باب باندھا تھا اُس کے بعض گوشے ہنوز تشنہ ہیں! ہم اِس قسط کے آغاز میں دو ایک تازہ ترین واقعات کا اور اضافہ کریں گے، جس سے یہ "بحث" تا تاریخ مکمل "(Uptodate) بھی ہو جائے گا، اور جامعۂ ملیہ کے جدید مشربِ ارتداد کی "معراج" (Climax) تک اُس کا تعاقب بھی ہو جائے گا! ؎

جفائیں دیکھ لیاں، بیوفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں!

دو تین مہینے اُدھر کی بات ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مجلسِ احرارِ ہند کے مشہور زعیم و خطیب، دہلی میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ جامعہ نے حسبِ معمول شاہ صاحب کی اک تقریر اپنے ہال کرا کے اپنے پروپیگنڈے کے طبلِ بلند بانگ میں ایک اور آہنگ کا اضافہ کرنا اور اپنے "وسیع تر علمِ معیشت" کا اک تازہ شکار کھیلنا چاہا! لیکن احتیاط پسند اربابِ حل و عقدِ جامعہ کو شاہ صاحب اک "تیغِ ذوالفقار" نظر آئے! وہ صاحب موصوف کو بلانا بھی چاہتے تھے اور اُن کی لائی ہوئی ممکن آفت سے بھی محفوظ رہنا بھی ضروری سمجھتے تھے! ع

معشوقیؔ و بیحوصلگی طرفہ بلا ہے!

پس سید صاحب کو دعوت دینے میں وہ شاطرانہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ع

پرسش ہے، اور پائے سخن درمیاں نہیں!

دیر تک طلبہ اور اسٹاف کے درمیان اک حیص بیص رہی! اک نو وارد طالب علم نے جو "نامحرم" ہونے کی وجہ سے اہلِ جامعہ کی اس گوںمگو کو سمجھنے سے قاصر تھا، دخل در معقولات دیتے ہوئے کہہ دیا کہ "حضرت! اس قدر تذبذب و تامل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ اُنھیں بلانا چاہتے ہیں۔ بس بلا لیجئے! کارِ خیر میں کسی استخارے کے معنی کیا ہیں؟!" ——— اس پر جامعہ ملیہ کے اک "خضرِ راہ" نے ارشاد فرمایا کہ "ہمارے لئے کسی قدر پُر اشکال سوال یہ آن پڑا ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ صاحب کا داعی ہم میں سے کون بنے؟ جامعہ کے "ادارے" کی طرف سے شاہ صاحب کو دعوت دینا قرینِ مصلحت نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ مسلّمہ طور پر گرم سیاست کے اک علمبردار ہیں، جن سے ہمیں اپنا دامنِ (عصمت!) بچانا ضروری ہے! پس مناسب یہ ہوگا کہ اصطلاحاً بلاوا تو طلبہ کی انجمن کی طرف سے دیدیا جائے، اور پھر وہ تو ہم سب شریک ہی ہیں!

اللہ اللہ! "دو عملی سیاسیات" کی یہ اختراعِ فائقہ! ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیبیست سالک را
خجل ہستم زکفرِ خود، کہ دارد "بوئے ایماں" ہم!

اچھا، اب دوسرا مرحلۂ صعب، موضوعِ تقریر کا تھا جو "مہمانِ خطیب" کے لئے تجویز کیا جائے! جامعۂ ملیہ کے صدرِ اول کے اک رُکنِ تعلیم نے، جن کے دل و دماغ میں اپنی حرارتِ "ملیت و اسلامیت" کی کافی باقیاتِ صالحات موجود ہیں۔ بے تکلف رائے دے دی کہ "مبحثِ وعظ بلاشبہ کوئی سیاسی مضمون ہونا چاہئے!" —— جامعہ کے اک جہاندیدہ —— اگرچہ خدانخواستہ اک "سرد و گرم چشیدہ" نہیں —— بزرگ مضطرب ہو کر بول اُٹھے کہ "سید عطاء اللہ شاہ صاحب کی کسی سیاسی تقریر سے کیا، ہم بیٹھے بٹھائے کسی آفتِ ناگہانی کو دعوت دیں گے؟! .... جی نہیں! سیاست و یاست لپس پُشت کر کے رکھئے! انسب یہی ہے کہ سید صاحب کا کوئی دینی وعظ ہو جائے۔ اور بس! قصہ ختم!"

گویا اگر:

در دیرِ مغاں آئی، مضمونِ بلند آور

لیکن:

در خانقہِ "صوفی" افسانۂ و افسوں "بہ"!

اور پھر کیا آپ کو معلوم ہے کہ "شعبۂ دینیات" کے حدود اربعہ کے اندر بھی وہ کونسا برمحل عُنوان تھا جو سید عطاء اللہ شاہ صاحب کے لئے محتسبینِ جامعہ نے اِملا کرایا؟ —— مسئلۂ ختمِ نبوت!

انا للہ!

"ختمِ نبوت" کے کلمات کیا اہلِ جامعہ کے سامعہ کو اِس وجہ سے خوشنوا معلوم ہوئے کہ اُن میں جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے پیامِ "ملیت و اسلامیت" کے اُس "خاتمۂ بالخیر" کے ساتھ اک برخود غلط ہمنوائی سی مسموع ہوتی ہے۔ جو جامعہ کے اربابِ حل و عقد کے ہاتھوں عمل میں آچکا ہے! ختم اللہ علی قلوبہم

جامعہ کے فضلاء و مجتہدین کو معلوم ہونا چاہئے کہ نہ پیامِ اسلام کا کام ابھی اتمام کو پہنچا ہے نہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے نصب العین نے ہنوز عملی جامہ پہنا ہے!

چونک لے دل! کہ ابھی تک ہے وہ محفل باقی — وہی محمل ہے، وہی لیلیٔ محمل باقی!

راہ کو منزلِ مقصود سمجھنے والے! — جاننا ہے ابھی کتنے ہیں مراحل باقی!
غور کرنے سے اُلجھتا ہے ترا دل ورنہ — اب بھی ہے کشمکشِ حلِّ مسائل باقی!
سُن! کہ ابتک ہی بپا بانگِ جرسِ گرمِ فغاں — اُٹھ! کہ ابتک ہیں بہت واقفِ منزل باقی
تُو نے سننے کی قسم کھائی ہے ناداں، ورنہ — اب بھی گلشن میں ہے گلبانگِ عنادل باقی
آج تک کشمکشِ عشق کا محکم ہے نظام — وہی ناخن ہے وہی عقدۂ مشکل باقی!
اب بھی ہر ملک پہ ہے اُس کا گلِ شبرنگ کا دام — اب بھی ہر روح میں ہے شورِ سلاسل باقی!
تو نے کیا سوچ کے یوں میان میں کھولی تلوار — دیکھ ابتک ہے نزاعِ حق و باطل باقی!

نبضِ ہستی کی دھمک جوش ہو کیونکر محسوس؟
جو دھڑکتا تھا وہ پہلو میں نہیں دل باقی! — جوشش

جامعہ کی زندگی کے ماضیٔ قریب ہی کا اک واقعۂ شگفت بیاں اور قابلِ ذکر ہے! جامعہ کی جس "بزمِ اتحاد" (Students Union) میں کبھی کنور محمد اشرف (حال ڈاکٹر محمد اشرف، پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ سیاسیات و معاشیات کانگریس) ایسے جواں سال و جواں دل طلبہ گرجا کرتے تھے، جن کی شعلہ زبانی دآتش خواری کی مرعوبانہ داد اچاریا پی سی رائے ایسے اکابرِ علم و عمل دیا کرتے تھے، اور جامعہ کی "انجمنِ مناظرہ" میں جن کے موضوعاتِ بحث اس سے کم گرم یا تنگ ہوا کرتے تھے کہ مثلاً "ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو "ہندوستانیت" کے اندر ہی محدود رہنا چاہئے، یا اُسے وسیع تر "آل ایشیا جہادِ حریت" کے ہم رکاب ہونا چاہئے؟" اور پھر جن مناظروں کا فیصلہ آخر الذکر قسم کے مسلکوں کی موافقت میں ہوا کرتا تھا۔ اُس جامعۂ ملیہ اسلامیہ کی موجودہ "ننگِ وجود" "بزمِ اتحاد" کا اعجاز یہ ہے کہ اُس کے اندر ابھی حال میں بحث و نظر کے لئے یہ مسئلہ (Proposition) پیش کیا گیا کہ "مسلمانانِ ہند کو کانگریس کی تحریک سے منسلک ہونا چاہئے یا نہیں؟!"

آنچہ می شنوم بہ بیداریست یارب یا بخواب؟!

جامعہ کے اندر، اور یہ سوال متنازعہ فیہ؟!

یہ تنقیح تو، بالفاظِ دیگر، بعینہ اس استفسار کے ہم معنی ہے کہ "آیا جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کا نام —— "ملیۂ اسلامیہ" —— باقی رہنا چاہئے یا اُسے تقویمِ پارینہ سمجھکر اک حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہئے؟!"

ہم مولینا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ اور مولینا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ کی مولودِ قلب و روح —— جامعہ ملیہ مرحومہ —— کی روحِ عفیفہ

کا یہ جگر دوز نالہ اپنے سامعۂ تخیل سے سُن رہے ہیں کہ "یَا لَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا!"

جس طائفۂ شریفہ کو اپنا نام نامی و اسمِ سامی ہی خیر سے محلِ نظر نظر آتا ہو اُن کی انقلابی فکر و رائے کا اگر اُن کا "شجرۂ نسب" بھی بن جائے تو کیا کوئی امر مستبعد ہوگا!!

حیف گر در پس امروز بود فردائے!

پھر قارئین کرام کو مژدہ ہو کہ جامعہ کی "بزمِ اتحاد" کا "مذکورۂ بالا بحث" اپنے تمام "مالہٗ و ماعلیہ" کے ساتھ منقح و متحقق ہو کر جب معرضِ انفصال میں آیا تو اک "زبردست غلبۂ آراء" سے بصورتِ "نفی" پاس ہوا! ع

تفو! بر تو اے چرخ گرداں، تفو!!

کیا مسٹر محمد علی جناح اِس امر کے استحسان پر غور فرمائیں گے کہ کیوں نہ چودھری فضل الحق، وزیر اعظم حکومتِ بنگال، اور سر سکندر حیات خاں، صدر سرکار صوبہ پنجاب کے بعد وہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، "آمرِ جامعہ ملیۂ اسلامیہ دہلی" کو بھی اپنی سیاسی حرم سرا میں داخل فرمالیں!——

عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا!!

یہ تھیں وہ شرمناکیاں اور رجعت پرستیاں جن کو دیکھ کر ہمارا معہود و ذہنی اک نووارد طالب علم جامعہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، اور اُس کے والد کا حجابِ حسنِ ظن پارہ پارہ ہو گیا! اور دونوں باپ بیٹے جامعہ کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے وطنِ مالوف کو مراجعت کر گئے! ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

جامعہ کے محیر العقول، بے مثال روحانی زوال نے اُسے جس نوبت کو پہنچا دیا ہے اُس کا اک نظارۂ طائرہ اِس لمحۂ حال پر کر لیجئے!——

اک عام افسردگی و مردنی کا ابرِ تاریک اُس پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔

وہ اُداسی، وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے!

یہ نوآبادی، بجائے نوآبادی کے اک "نئی شمشان بھومی" دکھائی دیتی ہے! اِس محلے کا زیرِ تعمیر —— یا معلق مابینِ ارتفاع و انہدام —— "جامعہ نگر"، جہاں اشتہار بازانِ جامعہ کی فقرہ طراز زبان میں "زرین مستقبل کا نونہال ہندوستان اک دیدنی شانِ بروز سے اُبھر رہا ہے"!

وابستگانِ سررشتۂ دفترِ جامعہ ہی کے اک صاحب فکر فرد کے طریقِ تسمیہ میں "جامعہ نگر"، "اوکھلا نہیں، کھوکھلا ہے"——تف ہے اِس جدید ہندوستان کی "اُٹھان" پر جس کی طرف اک نظر فریب فوٹو کی تشہیر کے ساتھ ساتھ جب الفاظ میں دعوتِ نظر دی جاتی ہے تو معاً بعد ہی کے جملے میں ارسالِ چندہ کی فرمائش بھی جڑ دی جاتی ہے! تاکہ یہ بے پناہ سرعتِ نہضت سے اُٹھنے والا "ہندوستان" قلبہائے بالا کی رفعتوں کو جلد از جلد پہنچ جائے! ؎

درپس ہر گریہ آخر خندہ ایست
بعد ہر ہیچ "آخر چندہ" ایست!

ہر طرف اک نہایت بند و تنگ، فشار آمیز و خفق آور فضائے استبداد محسوس ہوتی ہے! جامعہ کے ادارات و کاروبار کے اعضاء و جوارح کی ساری روح سلب ہو کر اُس کے پیکر کے اک گوشۂ قلب میں آکر مرکوز ہو گئی ہے، اور یہاں بھی وہ حرارتِ حیات کا کوئی "گلخن" روشن نہیں رکھتی، زندگی پر اک سخت گلوگیر "قدغن" عاید کئے ہوئے ہے! سارے شہرِ جامعہ کی عنانِ اقتدار معدودے چند بزرگوں کے اک "جتھے" (Clique) کے ہاتھ میں ہے، جو "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" بنے ہوئے ہیں! جامعہ عبارت ہے انہی افراد سے۔ اِن کے علاوہ جامعہ کی تعلیمی آبادی کی جو بقیہ اکثریت ہے خود اِس "فاسٹ گرانڈ کاؤنسل" کی "ڈکٹیٹرشپ" کے اک "کنسنٹریشن کیمپ" (Concentration Camp) کی سی زندگی بسر کر رہی ہے! کوئی شخص "ڈاکٹر صاحب" کے دربار کے "بادشاہ گروں" کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کرسکتا! حد یہ ہے کہ اعلیٰ عملۂ تعلیم کے ارکانِ (بیرونِ "بزمِ خاص") بعض "ناک کا بال" ہیڈ کلارکوں کے سامنے پانی بھرتے ہیں! اور آخر الذکر گویا "خرمغزیوں" کے صیدِ زبوں ہیں! محض اپنی اخلاقی جرأت کی کمی اور اپنی معاشی بینوائی کی ناچاری سے وہ یہاں کے بعض عالی نسب نودولتوں کے دامِ سخت میں پڑے پھڑک رہے ہیں، اور دم نہیں مارتے! اگر کبھی اُن کا ضبطِ فغاں جواب بھی دے جاتا ہے تو ایسے تمام موقعوں کو ٹالنے کے لئے سالارِ کارواں (حضرت شیخ الجامعہ) کو یہ کلمۂ ردِ بلا رواں ہے کہ:

"جامعہ میں جو چند لوگ کام کے پائے جاتے ہیں، آپ لوگ اپنی بدگوئیوں اور مطعونیوں سے اُنہی کو بھگا دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ اُن کے نکلنے کے بعد جامعہ کا مطلعِ عمل صاف ہو جائے!"

قارئین کے لئے یہ معلومات دلچسپ ہوگی کہ جن "مردانِ عمل" کی "گریز پائی" کے متعلق جناب شیخ تنبیہ فرمایا کرتے ہیں وہ جامعہ کی تختگاہِ حکومت میں "قطب از جانہ جنبد" کی استقامت کے حامل رہے ہیں! اور جن مظلوم فریادیوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُن کی زاغ صفت قیل و قال اِن "بیداغ عنادل" کی آشیاں ویرانی کا باعث ہوجائے گی، اُن کی کثیر تعداد ماضی میں شکستہ دل اور برداشتہ خاطر ہوکر جامعہ سے ہجرت کرچکی ہے! ؎

چو پردہ دار بشمشیر می زند ہمہ را
کسے مقیم حریم حرم نخواہد ماند!

ناقابلِ شمار ارکانِ اسٹاف اور افرادِ سر رشتۂ دفاتر جامعہ کی آمد و شد، جامعہ کی تاریخ ماضی کا عنوانِ جلی رہی ہے! اِس ماجرے کی علت یہی رہی ہے کہ کوئی آدمی، جو حقیقتہً قابل اور خود دار تھا، اس رنگِ محفل کو زیادہ عرصے تک برداشت نہ کرسکا، اور جب جامعہ کے نظام کا استبداد نمایاں اور اُس کے اعیانِ دربارِ خاص کی بافندگی عُریاں ہوگئی تو خون درجگر ہو ہو کر یہاں سے رخصت ہوگئے۔ زیرلب لہجے میں یہ فریاد کرتے ہوئے کہ ؎

یارب! ز سیلِ حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بُت خانۂ کہ خانۂ عشق نام کردہ اند

اور اب جو لوگ جم کر رہ گئے ہیں، وہ ہیں بھی اک "دُردِ تہ نشین" کی مثال! باقی بادۂ "سرجوش" کی جتنی امواج تھیں وہ جس تیزی سے آئی تھیں اُسی تیزی سے آگے بڑھ گئیں! ع

ہمہ "شوق" آمدہ بودم، ہمہ "حرماں" رفتم!

ذوقِ ایمان کو کھودینے والے اربابِ حل وعقدِ جامعہ سے ہم کس اُمید پر یہ شکوۂ رنگیں کریں کہ:-

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے   شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے!
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلہ لے بھی گئے   آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے!

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر!

ہمیں اُمید نہیں کہ موجودہ حاملینِ کاروبارِ جامعہ کے خط و خال کے اندر یہ اعادۂ حُسن ظہور پذیر ہوسکے گا، لیکن ع شاید کہ بجوئے خشک باز آید آب!

جامعۂ ملیہ کا قلب و جگر، جس نے یہ غلامانہ فضا اپنے گرداگرد پیدا کردی ہے، بالکل فاسد و مسموم ہوچکا ہے! شیخ الجامعہ آج اک پورے "باپر و بال" بڑے آدمی ہیں! ـــــــ "بڑے آدمی" نکہ "آدمی"! ؎

گویند ایں کہ شیخ "ملائک سرشت" ہست
آرے، من اعتراف کنم "آدمی" نہ ایست!

آٹھ دس سال اُدھر وہ جن ہمسایوں کی نشستگاہ پر آتے جاتے صبح وشام گھنٹوں نشست و برخاست رکھا کرتے تھے اور پوری برادرانہ بے تکلفی کی فضا نظر آیا کرتی تھی، آج وہ اُنھیں ہمچشموں کو اک عمیق لہجۂ تمکنت میں انتباہ فرمایا کرتے ہیں، محض اِس فردگذاشت کی پاداش میں کہ وہ غریب پانچ دن میں پوری پانچ دفعہ دربار کی حاضری دینے سے کیوں قاصر رہے! ـــــــ کیوں نہ ہو! ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا!

اُن کے ماتحتین، دفتری خط و کتابت میں بھی اُنھیں "حضرت..... مدظلہ" سے خطاب کیا کرتے ہیں اور اپنے تئیں "خادم ......" کی حیثیت سے پیش کیا کرتے ہیں! ـــــــ اگرچہ موخر الذکر جماعتِ "خدام" کا ایک فرد، جامعہ کے تعلیمی مرکز نمبر ا کا سربراہکار "نمبر ایک" ہے!

جامعہ کے اربابِ حل وعقد کے اک "رُکنِ رکین"، جو جامعہ کی قریبًا نصف آبادی کے لئے اک "فرعونِ بے سامان" بنے ہوئے ہیں، جب اپنے بُت خانۂ استبداد کے "صنمِ کبیر" کے روبرو کھڑے ہوتے ہیں تو بعض خاص ساعاتِ ارادت و عقیدت میں "دست بستہ ایستادہ" پائے جاتے ہیں:

بندہ پرور! مگر خدا شدہ؟!

ماضیٔ قریب میں بعض ایسے معنی خیز آثار دیکھنے میں آئے ہیں جو کچھ ایسے مستقبل کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں کہ شیخ الجامعہ شاید رفیع الدرجات شخصیتوں کے مقام سے متجاوز و مُرتفع ہوکر خاصانِ خدا، بلکہ "مامورین من اللہ" کے زمرے میں داخل ہورہے ہیں! ہمارا رُوئے سخن اس حقیقت کی طرف ہے کہ جامعہ کے بعض "مُوقتُ الشیوع" پروپیگنڈا لٹریچر (مثل رسالۂ "ہمدردِ جامعہ" وغیرہ) میں اب "حضرت شیخ الجامعہ کے "مزاج وہاج" اور "خاطرِ عاطر" کے تولہ ماشہ اُتار چڑھاؤ کی خبریں بھی "اطلاعِ عام کے لئے" شائع ہوا کرتی ہیں! .... برّاعظم ہندوستان کی

سیاسیاتِ عالیہ میں یہ "رتبۂ بلند" ابھی تک مولینا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، اور پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی نصیب نہیں ہوا ہے! یہ مقتدر آل انڈیا ہستیاں بھی، جہاں تک کہ اُن کی جسمانی صحت وحالت کا تعلق ہے، نارمل (طبعی) حالات میں "اخبارات کا موضوع" نہیں بنا کرتیں! اور جب تک کہ خاص صاحبِ فراش نہ ہو جائیں "ایسوشی ایٹڈ پریس" کے نمائندگان کی نظرِ التفات حاصل نہیں کیا کرتیں! تاہم شیخ الجامعہ صاحب جامعہ کے "پبلسٹی بیورو" کے اعلانات وبیانات کا عنوانِ جلی بنتے ہیں! اور سالانہ تعطیلات کے "ایامِ خالی" میں بھی اُن کی محض "روزانہ آمد وشد دفتر" کے نزولِ اجلال کا واقعۂ مہمہ بھی "براڈکاسٹ" کیا جاتا ہے! ع

تو و قطعِ منازلہا من ویک لغزشِ پائے!

ہم کو یہ بعض نشو ونمائے حالات کچھ پیش خیمہ نظر آتی ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نہیں "پورِ نبوت" و "خلیفۂ راشد" دار الخلافتِ قادیان کے روحانی ٹھاٹ باٹ کی! جن کے "صحیفۂ الفضل" میں اہلِ بیتِ نبوی کے اکابر اظہار کے "شب و روز کے خواب و خور کے نادر اخبار، اُمت کی "تشحیذ الاذہان" کے لئے اشاعت پذیر ہوا کرتے ہیں!

اگر حضرت شیخ الجامعہ کے "مُریدانِ پرانندگان" اُنھیں تقدس وکبریائی کے اس کوچے کی سیر کرانا چاہتے ہیں تو ہم بھی اپنے پیشگی قصیدۂ نعت و ترانۂ حمد کے اس مطلعے کے ساتھ خیر مقدم کرنے کو طیار ہیں کہ ؎

شیخ "امسال دعوائے نبوت" می کند
سالِ دیگر گر خدا خواہد، "خدا" خواہد شدن!

ایک آدھ سال میں شیخ کے "اوکھلے والے" "جامعہ نگر" کی دُور رو دراز اور مامون ومصئون فضا میں منتقل ہو جانے کے بعد، اُن کا وہاں کے "قلعۂ" المونت "کا "شیخ الجبل" بن جانا کم از کم چنداں بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا! ؎

اے گرامی! ترا شناسم من!
چہ بلا بود؟ پارسا شدۂ!

قبل ازیں، جامعہ کے "صوفیانِ صافی" کے حلقے میں سرمایہ داریت اور امارت کے کافی کاروبار و ادارات پیدا ہو چکے ہیں! ان "اخوانِ طریقت" میں آج آپ "طبقاتِ عالیات" اور "عوام کالانعام" (Classes & Masses) کو صاف صاف پہچان سکتے ہیں! مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ "معاشیاتِ معیاری" کے تحت جو یہ جدید ہیئتِ اجتماعیہ ظہور میں آئی ہے اُس میں "متوسط طبقے" (Middle Classes) کا عنصر برائے نام ہی پایا جاتا ہے! جامعہ کے اندر قدم رنجہ فرما ہونے والے والیانِ ریاست واکابرِ دولت وملوک التجارت کی ضیافتوں کے جو "خوانِ یغما" آراستہ کئے جاتے ہیں اُن کی بُو بھی "غربائے جامعہ نگر" پر حرام ہوتی ہے! اِن دعوتگاہوں میں داخلہ "بذریعہ ٹکٹ اور بمقدار چندہ" ہوا کرتا ہے!

یہ ہے انجام اُس آغاز کا کہ اہلِ جامعہ کو اُن کے دَورِ عُسرت میں جب ڈاکٹر انصاری مرحوم اپنے وسیع الوانِ نعمت سے خوان کے خوان بھیج دیا کرتے تھے تو سارے شہر کا ئے رنج وراحت، بلا تمیز شیخ وشاب اُن سے "کامیاب" ہوا کرتے تھے! ع

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

پاکبازانِ جامعہ کو یہ بات کہاں تک زیبا ہے کہ وہ ابھی سے "لارڈز اور کامنرز" ("Lords & Commoners") کی تمدنی تقسیموں کی اختراعاتِ فائقہ انجام دینے لگیں! کوئی چیز مساوات واخوت سے زیادہ باسعادت نہیں! ؎

بنازم بہ بزمِ محبت کہ آنجا
گدائے بشاہے مقابل نشیند

(۸)

جامعہ کی پیداوار

اس فصل میں ہم جامعہ ملیہ کے دَورِ زوال وظہورِ فتن کی تعلیمی پیداوار کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ فرزندانِ تعلیم بڑی دلچسپ ذہنیت کی مخلوق رہے ہیں! اپنی مادرِ علمی کی گود سے نکلتے ہی وہ معاش و ملازمتِ سرکار کی شاہراہ پر سَرِدرحال گُناں ہو گئے! گویا جامعہ کا ایوانِ تعلیم کسی بنیے کی دوکان تھا، جس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اِن تربیت یافتگان کی قدرتی منزل گاہ بازار یا دفاترِ سرکار تھی! اول تو جامعہ کے "بالغ الغنی منتہیانِ علوم وعرفان کا یہ مذاق اِن کی بڑی پست فطرتی، دُوں ہمتی، اور بیمائگی تھی! اِس لئے کہ قومی تعلیم کا تصور کچھ یہ نہ تھا کہ ہم بدستور وہی سرکاری

"غلام خانوں" کے بندگانِ شکم رہیں، اور صرف اپنے کاسۂ گدائی کو بدل لیں؛ یعنی سرکاری ڈگری کے بجائے قومی درسگاہوں کی سندیں اب مملکت روزمی و مُلکِ رزق کے "پاسپورٹ" بنیں!---------- جامعۂ ملیہ کے تربیت یافتہ دماغوں کے اندر اِس واہمے کا حلول اک بڑی "کامک ٹریجیڈی" تھی! جامعہ کا قلب وروح کچھ اِس درجہ معاشیاتِ عالیہ کے "پیمبروں" کے سایۂ ذلول میں رہا ہے کہ اُس کے نونہالوں کا شب و روز کا خواب ہی "معاش" رہا ہے،------- بجائے "معاد" کے؛ جامعہ کی "عبائے فضیلت" اور سرکاری یونیورسٹیوں کے (graduate's gown) دونوں کو اُنھوں نے "فقیر کی کملی اور جھولی" کے ہی دو نمونے سمجھا؛ علمی سند کا تخیل اور مصرف اُن کے ہاں کبھی شاید وہی رہا جو حکومتی تعلیم گاہوں کی شرمناکی تھی؛ یعنی؛

مل گئی رو دھو کے اک کاغذ کے پرزے پر سند
اُس سند کو پاکے تو اپنے کو سمجھا مستند
جو سند ہے "محنتِ بیہودہ کرنے کے لئے
جو سند ہے "بھوک" کو آسودہ کرنے کیلئے!

آزاد قومی تعلیم گاہوں اور اخلاقی تربیت گاہوں کے نصب العین کے معنی اک مختلف نظامِ تعلیم ہی نہ تھے، اک یکسر انقلاب انگیز مطمحِ نظرِ حیات تھے، اِن نونہالانِ تعلیم کو دورانِ تعلیم ہی میں سرکاری درسگاہوں کے طلبہ سے اپنی جداگانہ نشست نہ رکھنی تھی، بعد فراغِ تعلیم بھی اُن سے الگ اک جادۂ حیات پر چلنا تھا! ایامِ تعلیم میں یہ تقابل ناقص تعلیم اور صالح تعلیم کا تھا، بعد فراغ یہی تضاد خود پروری اور خلق نوازی، ملازمت اور خدمت کا ہو جانا چاہیئے تھا؛ واقعہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کے ہاں، جامعۂ ملیہ کے معاصر اداراتِ تعلیم کی حیثیت سے جو تربیت گاہیں معرضِ قیام میں آئی تھیں اُن کے دامن و صحن سے یہ اولادِ صالح پل کر نکلی بھی؛ گجرات ودیاپیٹھ اور کاشی ودیاپیٹھ کے فارغ التحصیل خدامِ خلق و رہنمایانِ سیاست کا ذکر اِس مضمون کی سابقہ قسط میں آچکا ہے؛ ہم اُس کی طرف یہاں اک اشارے ہی پر اکتفا کریں گے، اِس لئے کہ اِن "جوانانِ نوخاستہ" دلِ بصدق و صفا دل بیاراستہ" کی سیاسی، نیز عام تمدنی، مساعیٔ حسنہ و خدماتِ جلیلہ اتنی روشناسِ ملک ہیں کہ صرف پرلے درجے کے بےخبرِ ابنِ وطن اُن سے ناواقف، اور محض اول درجے کے فرزندان و بزرگانِ جامعہ ہی اُن کے منکر ہو سکتے ہیں! الغرض قومی تعلیم گاہوں کے سند یافتگان، قومی خدمت و مجلسی تطہیر ہی کے لئے اپنے اِن علمی آلات سے مسلح ہوئے تھے!

بایں ہمہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے نا بالغانِ دل و دماغ اِس تصور سے بڑی طرح ناآشنا ثابت ہوئے! ع

پروردگار! طفلِ مسلماں کو کیا ہوا!

(واضح رہے کہ ہم جامعہ کے عہد ارتداد کی ذُرّیت کا ذکر کر رہے ہیں؛ اُس کے صدرِ اول کا خیر القرون ہمارا موضوعِ سخن نہیں! ہماری تنقید کی مئے تند کے چھینٹوں سے مردانِ صدق و صفا کا دامنِ پاک پورا مامون و مصئون ہے!؎

جوشؔ اگو میکدے کا والی ہوں
بندۂ بندگانِ عالی ہوں!)

الغرض ہمارے معصوم جوانانِ جامعہ بیشتر حالات میں سرکاری یا تحتِ سرکاری یا نیم سرکاری ادارات کو اپنا معاشی ملجا و ماویٰ سمجھنے کی علمی ناخلفی کا ثبوت دیتے رہے ہیں! لیکن جیسی کہ توقع کی جانی چاہیئے۔ ان جگہوں میں اِنھیں "دور باش" کا پیغام سُنایا گیا! اور جب اُنھوں نے اپنی محترم مادرِ علمی کی سند پیش کی تو اُسے "ردی کی ٹوکری" میں پھینک دیا گیا، لاریب کہ اپنی اِس تذلیل کے لئے اُنھیں اپنا ہی ممنون ہونا چاہیئے! جب خود اُنہی نے اپنے اِس قابلِ عزت تمغائے علمی کی قدر نہ کی تو حریفوں سے اُس سے بہتر سلوک کی توقع گویا ضلالت پر حماقت کا بھی اضافہ تھا! جوانانِ جامعہ، اور حکامِ عالی مقام کے درِ دولت پر دریوزۂ ملازمت!؎

ترے فقیر، اور دیں کوچۂ کفر میں صدا؟
ترے غلام، اور کریں اہلِ جفا کی چاکری!

معاملے کی بدبختیاں اور شرمناکیاں یہیں ختم نہیں ہوتیں! سرکاری محاکم و دفاتر کے افسران نے "طیلسانینِ جامعہ" کی سندات کو جب رَدّ کر دیا تو اِن غیرتمندوں نے ظالم اغیار کے اِس "رَدّ" کو "قبول" کر لیا! "فردوسِ ملازمت" میں بہر حال داخل ہونے کے لئے اُنھوں نے سرکاری یا مسلمہ سرکار کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سمت میں گویا اک "تحویلِ قبلہ" انجام دیا، اور وہاں شاگردانہ---------- یا شاگردپیشگانہ!------ دربار جبہ

ہوکر اپنی تجدیدِ ایمانِ علمی کرنے لگے:۔

بازآمدم کہ سجدۂ آں خاک پاکنم
گر طاعتے قضا شدہ باشد ادا کنم!

اگر جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی سند کی ایسی ہی ناسخ علی گڈھ وغیرہ کی ڈگری تھی تو یہ صاحبزادگان جامعۂ ملیہ کے کیوں متبنیٰ بنے تھے؟ اُن کے نوجوان دماغوں کو کیا اُس ناقابلِ برداشت اہانت کا خیال ہے جو صومعۂ طاغوت کی محراب میں اُن کے اِس سجدۂ سہو سے لازم آتی ہے؟! افسوس:۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے!

جامعہ کے بعض "فرزندانِ رشید" نے اپنی دلدادگی ملازمتِ سلطانی کی ایسی آیاتِ قاہرہ پیش کی ہیں کہ ہم اُن کی روداد سنکر انگشت بدنداں ہی رہ گئے ہیں! جامعہ کے اک نیرنا بالغ "old boy" ــــــ نے اک بڑی ہندوستانی ریاست میں اپنے کو اک "علیگ" گریجوایٹ کی حیثیت سے پیش کیا! اور پھر وہاں اپنے اثر ونفوذ رسوخ اور ترقی درجات کے کچھ ایسے پے در پے مراتب طے کئے کہ ریاستِ مشارٌ الیہ کے صیغۂ نظم ونسق کے "سول سروس" میں اپنی نامزدگی کرالی!ــــــ معاملہ اِس مرحلے پر پہنچا تھا کہ اِس "جامعی جعل" کا پردہ چاک ہوگیا! خیر یہ جامعۂ نگر کا سپوت تو اپنی محترم مادرِ علمی کی "نسبتِ بزرگ" سے نہیں شرمایا تھا، لیکن پھر دوسروں ہی کو اُس کی طرف سے شرمانا پڑا! تاہم اِتنا افسوس ضرور رہا کہ اک جامعی نوجوان کی انقلاب انگیز ترکتازِ تسخیرِ ملازمتِ اعلیٰ کی مہم عین اپنے مرحلۂ تکملہ میں "ساقط الحمل" ہوکر رہ گئی!:۔

شکست و فتح تو قسمت سے ہے ولے اے میر
"مجاہدہ" تو دلِ "نوجوان" نے خوب کیا!

ہمارا خیال ہے کہ ہمارے معہودِ ذہنی فرزندِ جامعی کی تسکینِ قلبی کے لئے اِس حدیثِ نبوی کا ورد کافی شافی ثابت ہوگا کہ "السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ"!

اِسی قسم کے روز ہائے بد کو روکنے کے لئے جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے بعض ہواخواہوں اور اُس کے آبگینۂ ناموس کے قرار واقعی تحفظ پر اصرار کرنے والوں نے جامعہ کی گزشتہ زندگی کے بکثرت موقعوں پر امینانِ جامعہ کی خدمتوں میں بار بار یہ تجویز پیش کی کہ جامعہ کو معیشتہً "خود کفیل" بنا لیا جائے! اِس تقریب سے اکثر "دیالباغ آگرہ" کے تخیل کی طرف جامعہ کے اربابِ حل وعقد کی توجہ مبذول کی گئی! لیکن "قرولباغ" کے اکابرِ تعلیم اور اقطابِ تربیت نے کنایۃً بھی اِس نوع کی اثر آفرینیوں کو گستاخی گردانا! اور "ڈاکٹریٹ" کی پوری شانِ کبریائی سے ارشاد ہوا کہ:

"جامعہ، علومِ عالیہ کی اک یونیورسٹی ہے؛ اُسے "کارخانۂ آہنگری" کے غوغا میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا"!

صدقتم یا شیوخِ جامعہ! لیکن کیا ہمیں اِتنا عرض کرنے پر جاں بخشی نصیب ہوگی کہ:

"جامعہ کوئی "تکیۂ درویشاں" بھی نہیں ہے؛ جہاں سے دستارِ فضیلت باندھ باندھ کے طلبہ نکلا کریں، اور سرکارِ دولت مدار کے آستانۂ دولت پر "شیئاً للہ" کا نعرۂ "پیشکش صبحگاہ" کیا کریں! اور اِسی طرح جامعہ تعلیمیافتہ جرائم پیشہ نوجوانوں کی کوئی "کمینگاہ" بھی نہیں ہے۔ جہاں سے "وسیع تر علمِ معیشت" کے "ریسرچ اسکالرز" اٹھا کریں اور ریاستوں کے سول سروس کے مناصبِ عالیہ پر ایسا دن دہاڑے ڈاکا ڈالا کریں!:"

اسلام میں معاشی بے نیازی واستقلالِ ذاتی کا جو غیر معمولی ــــــ بلکہ یکسر عدیم النظیر ــــــ اہتمام والتزام پایا جاتا ہے اُس کا اندازہ وہ جامعہ کرسکتی، بشرطیکہ وہ حقیقتہً "ملیہ واسلامیہ" ہوتی! اسلامی تاریخ کے صدرِ اول میں خود حضرت داعیٔ اسلام کی مسند نشینی میں اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ کی جو تشکیل وتنظیم کی گئی اُس کے معاشی گوشے دقیق بصیرتوں اور عمیق عبرتوں کی جلوہ گاہیں ہیں! ہم کو قرآنِ عظیم کا یہ واشگاف اعلان (دربارۂ عدمِ مماثلت ومساوات مابین فرزندِ صلبی وفرزندِ متبنیٰ!) معلوم ہے کہ: "ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ"! یعنی ع

سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

تاہم آپ کو معلوم ہے کہ "ہجرۃِ مدینہ" کے بعد ــــــ یعنی تحریکِ اسلام کے عملی جامہ پہننے کے اولین اقدام پر! ــــــ اِس ناموسِ فطرت میں کتنا

فوق العادۃ تصرف کیا گیا! اسلام کی مدنی زندگی کا افتتاح جس "عقدِ مواخاۃ" کے ذریعے ہوا، اُس کے تحت مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ ایسے دو گروہ اجانب و اغیار ایسے "اخوانِ طریقت" کے خاندان میں ڈھال دیے گئے، کہ برادرانِ حقیقی کی دنیا بھی اس سلوکِ اخوت اور اس گرم جوش صلۂ رحمی کے مظاہر و مناظر سے خالی ہے! "غیر طبعی حالات" کے تحت اس غیر معمولی انصرامِ اُمور (dispensation) کا فرمان یہ تھا کہ ایک ایک مکی اور مدنی ہم رشتۂ "مواخاۃ" مکان کی سکونت، رقم جیب کے تصرف، جائدادِ غیر منقولہ کے تمتع وغیرہ وغیرہ میں برابر کا شریک و سہیم ہو گا!......... حد یہ ہے کہ بعض انصار مومنین قانتین اس پیشکش تک پر طیار رہتے کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کے حبالۂ زوجیت سے منسلک کر دیں! (اگرچہ اِس چیز کو شریعت کے مختص الحال احکام کی رُخصتوں سے بھی متجاوز کہہ کر مسترد کر دیا گیا!)......

بہر حال معاملے کی ساری "کلیدِ آہنگ" (key-note) یہ ہے کہ اک معاشی طور پر آسان و مطمئن سوسائٹی کے مزاج اقتصادی کو "صحیح الاخلاط" رکھنے کے لئے شریعتِ محمدیؐ کا "دین تمدن" وقتی تصرف و تغیر کی کتنی بعید حدود تک جا سکتا ہے! پھر ہمیں معلوم ہے کہ "اصحابِ صُفّہ" کیسے فانی فی اللہ اور وقف فی سبیل اللہ بزرگ واقع ہوئے تھے! تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں بھی "حبیبُ اللّٰہ" نہ "کسب" سے بالاتر نہیں رکھا گیا! اور خود رسول اللہ صلعم کے ارشاد کے تحت اِن لوگوں کو دن کی ساعاتِ مقررہ میں جنگل میں جا کر لکڑیاں جمع کرنا اور اُنھیں بازار میں بیچ کر اپنے آزوقۂ لایموت کا بندوبست کرنا پڑتا تھا!......... اور پھر بعد وصالِ آنحضرتؐ جب فتنۂ ارتداد کا ظہور ہوا تو یہ اسلامی نظامِ مجلسی کے "معاشی سنگِ بنیاد" کے متزلزل ہو جانے کا سنگین خطرہ ہی تھا جس نے "مانعینِ زکوٰۃ"———— منکرینِ ادائے "محصولِ غربا"!———— کے سارے "سرمایہ دارانہ نماز و روزہ و حج و جہاد" (!) کو مردود قرار دے دیا تھا، اور زکوٰۃ کا نعم البدل کسی دوسری چیز کو نہ تسلیم کیا تھا! اِن سارے کاروبار کی علت و غایت بجز اس کے کیا تھی کہ فرزندانِ توحید اپنی ضروریات مادی کے لئے اربابِ دول کے دست نگر نہ بنیں! ورنہ جن کے سامنے اُن کا دستِ بھی دراز ہو گا، اُنہی کے سنگِ آستاں پر اُن کی پیشانیٔ تذلل نگونسار ہو گی! جس کے بعد پھر وہ در و دیوار کی اِس لعنت و حقارت کی جائزہ بدف بنے گی کہ ؎

بزمیں چو سجدہ کردم، ززمیں ندا بر آمد
کہ مرا خراب کردی تو ز "سجدۂ ریائی"!

اس طرح آپ دیکھیں کہ مردانِ صدق و صفا نے اپنی "غیرتِ مشترک ناصیہ" کی عفت و عصمت کے تحفظ کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں! محض مسجد کی سقف و محراب کے نیچے نماز گزاری و قرآن خوانی کے مشاغل سے یہ مہمات برمحل پورا سے واقع ہوئے ہیں! آپ اپنے اِس کلمۂ طیبہ کا ورد کر کر کے کہ "ہم صرف اک تعلیمی جماعت ہیں" ملیت و اسلامیت، کے سارے فکری و عملی و تنظیمی و احتسابی و شفائی و حفظ ما تقدمی و تعمیری "ہفت خوان" سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے!! ؎

آسودہ می گردد آں دل کہ شکست از دوست
با قرأتِ مسجدہا، با دانشِ مکتب ہا!

پیغمبرِ اسلام، علیہ الف الف صلوٰۃ و سلام، نے مدینے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی "اولین فرصت" میں یہ "استقلالِ معاشی" (economic independence) کا مرحلہ طے کر لیا تھا! اور لاگ اور لوث سے ایسے پاک رہ کر کہ تعمیرِ مسجدِ نبوی کے جائے وقوع کی آراضی کی قیمتِ خرید کی پائی پائی اُس کے یتیم مالکوں کو ادا فرمائی تھی! جامعۂ ملیۂ اسلامیہ اوکھلے میں جو قلعۂ معلّیٰ تعمیر کر رہی ہے اُس کا سارا مایۂ خمیر قارونوں اور فرعونوں کی آستاں بوسی کا حاصلِ دریوزہ گری ہے! ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

غالباً "جامعہ نگر" کی مجوزہ مسجد جب چندے سے بن جائے گی تو اُس کی محرابِ "قبلہ نما" کا کتبہ قرآنِ مقدس کی اِس آیۂ شریفہ کی دوسری شانِ نزول بنے گا کہ: "لمسجدٌ اسس علیٰ التقویٰ من اول یوم"! ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ!

ممکن ہے "مشتہرینِ جامعہ" کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جائے کہ "جامعہ ملیہ کا مکتبہ" معاشی آزادی ہی کے مطمحِ نظر کا اک مولود ہے جو تقریباً روز اول

سے جامعہ کے ساتھ اُس کے "ہیولی" کی حیثیت سے نظر آتا ہے"! بلاشبہ مکتبہ، جامعہ کے لئے اک اچھا "معدہ" ہوتا۔ لیکن اپنے بعض ضرورت سے زیادہ ہوشیار سربراہکاروں کی رہنمائی میں اُس نے اک بے لاگ دکاندار کے بجائے اک بازاری "دلال" کا "رول" اختیار کیا! ——— جس کا اک "مشتے نمونہ از خروارے" کرشمہ یہ ہے کہ مکتبہ کا جدید الا ہزار کتابی اخبار— "کتاب نما" ——— اس قدر "کتاب نمائی" نہیں کرتا جس قدر کہ "کتاب فروشی"! وہ "انتقادِ کتب" اور "اشتہارِ کتب" کے درمیان کوئی فرقِ مراتب ملحوظ رکھنا نہیں چاہتا! جامعہ کی نشر کردہ بعض کتابوں کی نہایت معتدل تنقیدوں کی بھی وہ تاب نہیں لایا ہے، اور ایسے اک خاص موقعے پر اُس کے "سرِ سفال" نے اک مضحکہ خیز "عذرِ گناہ" کا تماشا دکھایا ہے! (ہم اس اجمال کی تفصیل اور اس ابہام کی تصریح کسی اور موزوں تر موقعے کے لئے اُٹھائے رکھتے ہیں!)

یہی حال جامعۂ ملیہ کی تشہیر کردہ "اتحادی دوکان" اور "اتحادی بنک" کا ہے! "معیشت و کفایت" کے ان جامعی ادارات سے بڑھ کر "ننگِ وجود" کونسی چیز ہوگی جو طالب علموں کو "عملی اقتصادیات" کی تربیت دیتے ہیں، درآنحالیکہ وہ خود دوسروں کے "مقروض" ہیں! واقعہ یہ ہے کہ جامعہ کی یہ "دوکان اور بنک" بچوں کو اس قدر "پڑھانے" کے لئے نہیں ہیں جس قدر کہ ان بچوں کے "بوڑھے والدین کو کھلانے" کے لئے ہیں! ؎

یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
دگرنہ "علمِ معیشت" وسیع ہے واللہ!

دلی میں منظم پروپگنڈے کی بساطِ شطرنج کی حیثیت سے "جامعہ نگر" آدکھلا، صرف نظام الدین اولیاء والے "رین بسیرے" ہی سے دوسرے نمبر پر ہے! "وفی ذٰلک فلیتنافس المتنافسون!"

اس مرحلے پر ہمیں اک ممکن شبہے کے صاف کر دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے! ہم نے باوقاتِ مختلف، معاش کے خیال کے ابتذال اور اُس کی ضرورتِ لایزال کا ذکر کیا ہے! دونوں کے درمیان راہِ تطبیق یہ ہے کہ روزی قطعاً ناگزیر ہے، لیکن ہر وسیلۂ رزق جائز نہیں! بلاشبہ آدمی محتاجِ آب و نان ہے، تاہم وہ "رزق کا کیڑا" بھی نہیں! اُسے صبح و شام کھانے کو چاہیئے، لیکن اُسے یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ آدمی کی غذا اُس کا مادۂ ترکیبی ہوتی ہے، جو لقمے اُس کے معدہ و امعاء کو پر کرتے ہیں، وہی اُس کے دل و دماغ کے رگ و ریشہ کو بناتے ہیں، پس "صدقِ مقال" اور "فراغ بال" کے لئے "اکلِ حلال" ضروری ٹھہرا ہے۔ بقول حضرتِ مسیحؑ کے "ابنِ آدم تنہا روٹی سے نہ جیئے گا"! اُس کا اک بالائے گوشت و پوست حصہ وجود بھی ہے! جس کا تغذیہ صرف "کلمۂ حق" سے ہوتا ہے:

جامعہ کے "میکائیل" نے "عشق و رزق" کے درمیان ضروری امتزاج کو ملحوظ نہ رکھا! ذرا سی ابتلائے عسرت میں اُن پر وہ اُفتاد بیتنے لگی کہ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ "یاراں" فراموش کردند عشق!

ان "اہلِ عشق" نے بلا امتیاز "ہر بابِ رزق" پر دستک دی، اُس گدائے مبرم کی طرح جس کی صدا یہ تھی کہ ؎

قسم خدا کی میں کچھ آج لے کے اُٹھوں گا!
کہ میں غریب ہوں، خواجہ مرا غریب نواز!

اپنے ماضیٔ بعید کے "دورِ عسرت" میں اہلِ جامعہ کی "غربت" میں شک نہ تھا! مگر اس مشکل کے حل کے سارے آغاز و انجام کا ماجرا یہ ہے کہ پہلے اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے لئے "قوتِ لایموت" بہم پہنچایا اور پھر منھ کو خون لگ جانے کی وجہ سے اُس "خوانِ یغما" پر شکم سیر ہونے لگے جس پر اُنھوں نے یہ بے محل آیتِ کشائشِ رزق پڑھی کہ "اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب"!

جامعہ کے اربابِ تعلیم کو رزق کی ان دو تقسیموں، اور اُن کے الگ الگ خواص و افعال کو بھولنا نہ چاہیئے تھا کہ ؎

جانور فربہ شود از "ناؤ نوش"
آدمی فربہ شود از "راہِ گوش"

جامعہ سے نکلے ہوئے طالب علموں کی اک محدود تعداد مُلک کی (عموماً اُردو) صحافت میں داخل ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ جامعہ کی تاریخی طور پر بہترین پیداوار ہے! عام طور پر جامعہ کے یہ فرزند سیاسیات میں قومیت پسند اور عمومی ثقافت میں حریت دوست

اور ترقی خواہ مسلک کے قائل اور عامل رہے ہیں! تاہم یہ نکتہ نظر انداز نہ ہو کہ جامعہ کے یہ سیاسی اور صحافی فرزند اپنی مادرِ علمی کے دورِ شباب کے اثمارِ شیریں ہیں! اب اپنے ایامِ کہولت میں عرصے سے جامعہ کے شجرۂ نسب کی رفتار جیسی رہی ہے اُس کے اعتبار سے اول تو کثرتِ ذہنی اسقاطِ حمل کے حوادث پیش آتے رہے ہیں! اور باقی جس قدر ولادتیں عمل میں آئی ہیں، اُن میں "فرزندِ نرینہ" خال خال ہی نکلے ہیں! اور اب آئندہ جیسے "گندے انڈے" دیکھے جانے کا اندیشہ کیا جا رہا ہے اُس کا اندازہ آپ اِس مضحک حقیقت سے کیجئے کہ ابھی حال میں، جب کہ اک صحبت کے اندر مستقبل کے مقاصدِ حیات کی قیاس آرائی موضوعِ ذکر و فکر تھی، متعدد بلوغ پذیر طلبائے جامعہ کے منہ سے اک معنی خیز لب و لہجہ میں یہ بشارت ہمارے سامعہ نواز ہوئی کہ :-

"ہم لیڈر بنیں گے!"

جو سادہ لوحی و سفاہت اِن صاحبزادگانِ جامعہ کے منقولۂ بالا کلمات میں سموئی ہوتی ہے، اُس سے ہمیں انکار نہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ یقیناً لفظاً نہ اعلان اک اور حقیقت کا بھی ترجمان ہے! ممکن ہے جامعہ نابالغان کے واہمے میں "لیڈری" سے مُراد جامعہ کے موجودہ کاروان سالاروں کی نوابانہ حکمرانی کا مجوبہ ہو جس کا مشاہدہ وہ شب و روز کیا کرتے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اِس آسان پسند و خود پسند قومی لیڈری کی ہَوَس اُن کے بشری سینوں میں نہ پیدا ہوتی ہو؟! ؏

کہ نتواں ازیں خوب تر راہ رفت!

جامعہ کی گود میں ایسے شہزادگان بلند اقبال پل رہے ہیں، اور شیخ الجامعہ پر اُدھر مولود شریف کی محفلوں میں، اپنی ساری ادا ہائے نشست سے، "حال" طاری ہونے کے آثار ہویدا ہیں! ؎

ساقیا! برخیز و در دہ جام را
خاک بر سر کن غمِ ایام را!

کسی وقت کی کثیر الاولاد اور قوی النسل جامعہ کی یہ عقیمی کیسی عبرت ناک ہے! ؎

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی، لیلیٰ کے دیوانے رہے

"جامعہ ملیۂ اسلامیہ" کی ماشاء اللہ اک پیداوار اور ہے جس کا ذکرِ خیر ہم اگرچہ "سب سے پیچھے" کر رہے ہیں، لیکن جو اپنی ندرت میں "کسی سے نیچے" نہیں! یہ مادرِ جامعہ کے وہ علمی "سہراب و افراسیاب" ہیں جنھیں ذہنی بلوغ برلن و لندن، پیرس و ہائیڈلبرگ میں جا کر حاصل ہوا کرتا ہے! جہاں سے وہ "پی ایچ، ڈی" کی ڈگری کا سُرخاب کا پر لگا کر آتے ہیں، اور جامعہ کی "سرزمینِ زرین" پر کچھ اس طرح "نزولِ اجلال" فرمایا کرتے ہیں کہ گویا چودھویں صدی ہجری کے وہ "معراج رسیدہ علمی پیمبران اولوالعزم" ہوں! جو "فلک الافلاکِ فرنگ" کی آخری عرفانی "آیاتِ کبریٰ" دیکھ کر آئے ہوں! اور پیرس و برلن کی "عرش و کرسی" کے خداوندانِ اسرار و رموز کے سامنے "زانوادب" تہ کر کے گویا مقامِ "قاب قوسین او ادنیٰ" سے مشرف و مفتخر ہو چکے ہوں! اور ؏

گویا وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں!

ہم جیسے "مڈل پاس" ذرۂ بے مقدار اِن "شموسِ علم" اور "اقمارِ عرفان" کے سامنے کہاں سے جسارت کریں کہ جوش کی یہ رُباعی پڑھ سکیں! :

جُز "دل" کوئی رہنما نہیں ہے واللہ — جُز "عقل" کوئی دوا نہیں ہے واللہ
"کاندھے پہ علوم کے" جو ہوتا ہے سوار — اُس "جہل" کی انتہا نہیں ہے واللہ

"ڈاکٹریٹ" کی ڈگری جامعہ کی نجیب الطرفین روح کی اس قدر پیداوار نہیں جس قدر کہ جامعہ کے موجودہ پرنسپل، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب قبلہ کی شخصی سُنت! تاہم ہم فی نفسہٖ اسے کچھ بُرا نہیں سمجھتے! ؎

سخن کز بہرِ دیں گوئی، چہ عبرانی چہ سُریانی
مکاں کز بہرِ حق جوئی، چہ جابلقا چہ جابلسا

تاہم اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ جامعہ کے اِن فضلا و کملا سے تشنگانِ جامعہ کو اتنی توقع بالکل بجا تھی کہ ارضِ یورپ میں اپنی علمی تاجپوشی کے بعد وہ اہل الذکر خاک نشینانِ شاگردی کو اُن کی کُہن زدہ تاریکی سے نکالنے کے لئے جامعہ میں مستقل قیام کر کے اُن پر ضیاباری فرمائیں گے! ؎

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے!

خاصکر جبکہ یہ اقطابِ علم، جامعہ کے اولڈ بوائے رہ چکے تھے، جامعہ

ہی کے اندر اک الوداعی ضیافت کے بعد اُن کا شدِ رحال ان قبلہائے علم مغرب کی طرف عمل میں آیا تھا۔ جامعہ ہی کے نام نیک سے فائدہ اُٹھا کر اُنھوں نے یوروپین یونیورسٹیوں میں داخلہ حاصل کیا تھا۔ اور جامعہ کے اندر اپنی زندگی اُن کا سارا علمی پس منظر تھی؛ تو اُنھیں زیبا نہ تھا کہ اپنی سابقہ مادرِ علمی کو ایسا مایوس التفات فرماتے! تاہم ہم نے دیکھا کہ اِن ڈاکٹران میں سے کوئی تو کسی جرمن پیٹنٹ دوا کا ہندوستانی ایجنٹ بنا! کسی نے اک ایسی جگہ کہ اک یونیورسٹی کالج میں مسندِ درس سنبھالی جو "ڈبل سلیوری" کا اک قلعۂ معلّی ہے! اور کوئی اک ایسے کالج کی پروفیسر چیئر پر متمکن ہوئے جو جامعہ کی قدیم زبان میں اک سرکاری غلام خانہ تھا! پھر اِن میں وہ آخر الذکر بزرگ شیخ الجامعہ کے برادرانِ خورد اور جامعہ کے سابق ابن علم" (old boy) واقع ہوئے ہیں!—

اس کے خلاف جامعہ کے لئے تازیست جو اپنی زندگی وقف کرنے کی توفیق پاتے ہیں تو وہ عابد صاحب اور مجیب صاحب ہیں، جنہیں سے کسی کو بھی اپنے علمی ماضی میں جامعہ سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا! ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ع

زخاکِ مکّہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست؟!

کیا جامعہ کا کوئی ہمدرد ان بیہر فرزندانِ جامعہ کی طرف روئے سخن کر کے یہ "سوز" نہیں پڑھ سکتا کہ ؎

غنی: روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن؛
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را!

ساری بیدردیوں کی خاتم یہ ستم ظریفی ہے کہ حضرت شیخ الجامعہ کے برادر زادے، جو اُنھیں کی ولایت و سرپرستی میں ہیں، جامعہ میں نہیں پڑھا کرتے، بلکہ اک سرکاری کالج کے طالبِ علم ہیں!

غالباً یہ عملی تفسیر ہے اس آیۂ بینہ کی کہ "وانذر عشیرتک الاقربین"!

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ع

تو بہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند؟

(باقی آئندہ)

پھول

یہ کس نے جوشؔ کو بھیجے ہیں ناز پرور پھول — شگفتہ پھول، جواں پھول، خلد پیکر پھول
ہوائے ناز سے چٹکے ہوئے شباب غنچے — شمیم زلف سے مہکے ہوئے معطر پھول
شعاعِ حُسن سے دہکے ہوئے خنک شعلے — لبِ نگار کے چومے ہوئے سخنور پھول
نسیمِ کاکلِ شب گوں سے پرفشاں گلبرگ — فروغِ نرگسِ شیریں سے خواب آور پھول
ارم سے آئی ہوئی حرفِ آرزو کلیاں — خدائے ناز کے بھیجے ہوئے پیمبر پھول

پلٹ کے، اے خلشِ نوکِ خار کے شاکی
اُسے بھی دیکھ، جسے ڈس رہے ہیں کافر پھول

جوشؔ

اِنتظار

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

کب تک یوں ترساؤ گی تم
پیاری پیاری باتیں ہے ہے

کب تک دل تڑپاؤ گی تم
رنگیں رنگیں گھاتیں ہے ہے

جلوہ کب دکھلاؤ گی تم
اُف وہ مہکتی راتیں ہے ہے

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

کالی کالی گھٹائیں آئیں
کھوئی ہوئی سی باتیں میری

شورِ نغمہ و مستی لائیں
سونی سونی راتیں میری

دل پر غم بن بن کر چھائیں
جیتیں تمہاری باتیں میری

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

گوری گوری رنگت ہے ہے — آؤ للہ جلدی آؤ
پیاری پیاری مورت ہے ہے — آکر اپنا رُوپ دکھاؤ
چاند کا ٹکڑا صورت ہے ہے — روپ دکھا کر جی بہلاؤ
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ — کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

آہ وہ کافر مست نگاہیں — تم کو میں دل میں بٹھلاؤں
آہ وہ گوری گوری باہیں — غم کے تم کو گیت سناؤں
آہ وہ میرے دل میں راہیں — خود روؤں، تم کو بھی رُلاؤں
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ — کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

اُف رنگ بسنتی ساری کا — یاد تمہاری آفتِ جاں ہے
طوفان سا اک گل کاری کا — نام تمہارا لب پہ رواں ہے
فرمانِ حسیں مے خواری کا — یہی وظیفہ وردِ زباں ہے
کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ — کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

محمد ضیاء الاسلام، بی، ایس سی۔ پی، سی، ایس
ڈپٹی کلکٹر، بجنور

اب کے بھی دن بہار کے یُونہیں گزر گئے

گوہر سلطان سحر صدیقی، منشی فاضل پشاور

بادِ صبا کے سرد اور عنبریں جھونکو! تم جو ہر صبح اپنے ساتھ بھینی بھینی خوشبو کا تحفہ لاتے ہو، بادِ بہار کے خوشگوار اور دل خوش کن جھونکو! تم جو ہر صبح ہزاروں حسینوں کی خوابگاہ ہوں تک پہنچ کر ان کے ساتھ شوخیاں کر کے جگا دیتے ہو اور اُنھیں صبح کا پیام پہنچاتے ہو۔ ہاں ہاں بادِ صبا کے راحت افزا جھونکو! تم نے کیا اپنا معمول بنا لیا ہے کہ علی الصباح ہی سنگدل اور جفا پیشہ لوگوں کے درِ دولت پر حاضر ہو کر ان کو بھی مجبور کر دیتے ہو کہ وہ تمہاری اٹکھیلیوں سے پریشان ہو کر اپنے چہروں کو ہاتھ سے ڈھانپ لیا کریں۔

حیات آفرین نسیم بہار! تیرے انتظار میں گلہائے نازک تارے گن گن کر رات گزار دیتے ہیں اور ننھی ننھی کلیاں دست بستہ کھڑی رہتی ہیں کہ کب تو چلے اور یہ فرطِ محبت میں آ کر اپنا اپنا آغوش کھول دیں۔ حیف صد حیف آج تو بھی میرے درد کا درماں نہیں بن سکتی اور میرے دلِ حزیں کی مرجھائی ہوئی کلی کو شگفتہ نہیں کر سکتی کیونکہ آج حسرت نصیب کی نگاہوں سے وہ مستور ہے۔

گلہائے رنگا رنگ و پرندہائے خوشرنگ! تم ہاں تم جن کو باہم خاص لاؤ لگاؤ ہے۔ زائرین کے لئے فردوس نظر ہو۔ ناظرین کے لئے خوش منظر ہو۔ کس دل ربائی کے سامان مہیا کئے ہوئے ہو۔

پیاری خوشنما بلبل! کس شوخی سے ڈالی ڈالی جھوم جھوم کر فکرِ فردا سے بے نیاز ہو کر پیارے گلہائے شگفتہ کو چوم رہی ہے۔

اے عندلیب ہزار داستان! تو کہ اپنی شیریں صدا سے عاشق مہجور کی تسلی قلب اور تسکین روح کے سامان مہیا کر کے اُسے بہلا رہی ہے، شمشاد و چنار کے سرسبز درختو! خوب ہنس ہنس کر علی الصباح تالیاں بجایا کرو جبکہ کوئل تمہاری ٹہنیوں پر بیٹھ کر راگ الاپ رہی ہو۔

مگر!

پھر بھی تم مجھے مسرور نہیں کر سکتے، کیونکہ میرے کاشانۂ دل کا مکین آج مجھ غمزدہ سے کوسوں دور ہے۔

رنگین قوس قزح! تیرے سامنے شفق کی سرخی ماند پڑ جاتی ہے تو کہ معشوقہائے زنگاری کی سبزی و سرخی چرائے ہوئے ہے اور دنیا کے لئے جاذبِ نظر ہے۔

اے مہتاب کی صاف اور شفاف مرمریں کرنو! تم کہ اپنی دھیمی دھیمی روشنی سے ایک جہان پر نور پاشی کر رہی ہوتی ہو مضطرب اور غمگین دلوں کے لئے سکوں بخش اور خواب آور ثابت ہوئی ہو۔

خوشرنگ اور دیدہ زیب پھولوں کے مددگار! تیری نورانی دنیا میں پھل اور پھول اپنے نصیبوں پر نازاں ہیں، کیونکہ تو ان کے حسن کو کو مشاطہ بن کر دوبالا کر رہا ہوتا ہے۔

او ملکۂ سحر کے دل پارے! تو کہ ابروؤں کے معمولی اشاروں سے تمام بحرِ ناپیدا کنار میں بے پناہ تلاطم پیدا کر سکتا ہے۔

او لق و دق صحراؤں اور بیابانوں کی نورانی مشعل! تیری ضیا پاشی

سے بھولے بھٹکے مسافر اپنا کھویا ہوا راستہ پا لیتے ہیں۔

آج تو میرے دکھ اور درد کا درماں ہنیں بن رہا ہے جو اس تک پہنچنے میں میری رہنمائی کرے جس کے ساتھ محفلہائے خلوت میں میری آرزوؤں کے سمندر میں ایک مد و جزر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ مگر آہ ....

اے برق رفتار غزالو! تم کہ دم کے دم میں چوکڑیاں بھرتے بھرتے صیاد کے پنجے سے جانبِ شمال سے جانبِ جنوب غائب ہو جاتے ہو۔

اے سحر آگین نگاہوں والے آہو! تو کہ آنکھوں میں خاص کشش مقناطیسی پنہاں کئے ہوئے شعرا کے لئے موقعِ فکر پیدا کر دیتا ہے۔

اے سبک خرام آہو! تو کہ دشت نوردی میں طاق ہے اور قیس کو لیلےٰ چشم بن کر دشتوں میں بہلاتا رہا ہے۔ آہ آہ آج تمہارا نافہ کس کام کا ہے۔ تیری یہ مقناطیسی آنکھیں کس کام کی جو مجھ مہجور کے لئے باعث علاج نہ بن سکیں کیونکہ میں جس کی تلاش میں ہوں اُس کا ملنا محال۔

سبزہ پرور خوشنما دلفریب وادیو! تم کہ سبزہ کے فرش فروشوں سے دل لبھاتی ہو تیرے دلپسند نظاروں سے بلا لحاظ ملک و ملت ہر ایک زائر تم سے یکساں طور پر لطف اندوز ہو رہا ہے صاف اور شیریں پانی مرمریں کنکریوں پر سے نہایت سکون کی حالت میں دائیں بائیں کناروں سے اٹکھیلیاں کرتی مست خرامی سے دن رات اپنی منزلِ مقصود کی جانب رواں ہیں۔

نکہت بار اور دلکش وادیو! تمہارے آبشار کے کنارے بید مجنوں جھوک جھک کر ہر رہ گذر کو دلربا انداز سے ایک نہ ایک درس دے رہا ہے، جس سے ہر نیاز مند فیضیاب ہوا جاتا ہے۔ مجھ دل فگار کے لئے یہ سماں بھی موجبِ تسکین نہ بن سکے، کیونکہ میں اپنے فرحت و انبساط سے چشمے سے مہجور ہوں۔

آسمان میں تیرنے والے بادلو! تم جو عین خشک سالی اور قحط کے دوران میں بارانِ رحمت برسا کر روتوں کو ہنسا دیتے ہو۔ ہوا کے دوش پر تیرنے والے خوشنما بادلو! جب کہ معمولی ترشح سے گرمی کی شدت کو کافور کر سکتے ہو۔ بحر پر بارش برسا کر سیپ کے منہ سچے موتیوں سے بھر سکتے ہو۔

شبِ مہتاب میں چاندنی سے ہم آغوش ہونے والے بادلو! تمہارا جھوم جھوم کر اور امڈ امڈ کر آنا بلاکشانِ محبت کے حزن و ملال کو دُور کرتا ہے اس وقت ساغر و مینا حرکت میں ہیں ساقی سرگرم محفل ہیں یعنی اپنے دل پسند اور رسیلے سروں سے کہے جائے ہے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

مگر!

اے نسیمِ صبحگاہی!! اے سحابِ باد رفتار!! اے غزالِ برق رفتار!! اے نکہت بار وادی!! تم میں سے کوئی اُٹھے اور جا کر اس غزالِ چشم سے فقط اتنا ہی کہدے کہ ؎

صبا، بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را　　که سر بکوه و بیابان تو دادهٔ ما را

قطعہ

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث
تری نگاہ میں ہے یا وہ خیالِ دل افروز
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیرِ شاعر میں
اور آب و تاب سے موزوں نہیں ہے پیرایہ

(رعنا)

قطعہ

سحر کا خواب ہے یا اس طرح کہ محفلِ صبح
حباب طرح صبا کی لرزش سے وہ اک شعلہ سا داغ
اور اس لرزی ہے جیسے کہ بلبل کے طاق میں
چھپا ہوا ہے کسی روزن کر دیا جائے چراغ

(ریشم)

آرزوئے محروم

فریاد ہے اے خلوتیِ پردۂ ناموس — کب سے ہوں تری دھن میں گریباں دریدہ
واقف ہے کہ کس طرح سرِ بالش و بستر؟ — راتوں کو تڑپتا ہے ترا زلف گزیدہ؟
دم بھر کے لئے تو کبھی آغوش میں آجا — اے عمرِ رواں! سایۂ آہوئے رمیدہ
ممکن ہو تو اب خاکِ مذلت سے اٹھا لے — میں کب سے پڑا ہوں صفتِ اشک چکیدہ
وہ سجدہ کروں، سر ہی نہیں، روح بھی جھک جائے — دے اِذن اگر جنبشِ ابروئے خمیدہ
قسمت کی طرح دستِ طلب بھی تو ہے کوتاہ — افسوس ہے اے میوۂ شاداب و رسیدہ
وحشی کا کسی رُت میں بھی جی خوش نہیں ہوتا — فریاد ہے اے افسرِ گلہائے دمیدہ
سونے کو ترستی ہیں برستی ہوئی آنکھیں — بیدار ہو اے تُرکِ محبت نچشیدہ
ظالم ترے دیوانۂ محروم کے سر پر — ہر آن ملامت کی کمانیں ہیں کشیدہ
آتا ہوں ترے شہر میں پامالِ ملامت — جاتا ہوں تری راہ سے دشنام شنیدہ

"در کوئے تو معروفم و از روئے تو محروم
گرگِ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ" (سعدی)

جوش ملیح آبادی

رفتارِ وقت!

اجلاس جمعیۃ طلبہ دہلی

زیرِ تبصرہ مہینے (نومبر) کا پہلا ہفتہ دہلی میں "اسٹوڈنٹس کانفرنس" کے پُرشور و خروش انعقاد، بصدارت مسز کملا دیوی چٹوپادھیائے، کا شاہد بنا! اجلاسِ جمعیۃ کے افتتاح کے لئے سر وزیر حسن، سابق چیف جج اودھ چیف کورٹ، کو بُلایا گیا تھا، اور یہ حُسنِ انتخاب قابلِ داد بلکہ یادگار ثابت ہوا!

کانفرنس طلبہ کے سرپرست و سرخیل کی حیثیت سے مُسِن وزیر حسن نے مجاہد و مجتہد نوجوان طلبہ کے حلقے میں وہ بے پناہ اور نادر مقبولیت و محبوبیت حاصل کی کہ بلاشبہ وہ اِس ماجرائے شگفت کی مصداق تھی کہ ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے!

لاریب کہ سر وزیر حسن پر اک اعادۂ شباب کے دَور کی آمد آمد ہے! انکا سر بھڑک اُٹھا ہے، اور سینہ اک آتشکدہ بن گیا ہے! سیدِ موصوف کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے مسٹر آصف علی کا یہ استعجاب بالکل برمحل تھا کہ "یہ آگ، اِس خاکسترِ پیری میں؟!"

سچ ہے کہ ؎

جب اِس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے وہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا!

ادارہ

سر سید وزیر حسن کے اِس دیدنی مظاہرۂ قوت و جلال و جدال میں ہمیں اُن کی عالی شانِ اسلامیت اور خاص جوہرِ سیادت کے عناصر کی بھی کچھ کم کارفرمائی و کرشمہ سازی نظر نہ آئی! اک مومنِ صادق اور نجیب الطرفین سید اپنی ساری سر دبہری اور بے عملی کے باوجود کسی بھی لمحے اک افسردہ کوہِ آتش فشاں کی طرح پھوٹ پڑنے کا احتمال رکھتا ہے! سر وزیر حسن کے واردات کچھ ایسے ہی ثابت ہوئے! ؎

بجھے پڑے ہیں زمانے کے ہاتھ سے ہرچند
مگر ہمیشہ برق و شرار ہیں ہم لوگ!

حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپا ضعف و قوت کا مرکب ہوتا ہے! وہ پختہ مغزی اور فکر فرزندو زن کی کمزوری کا جامعِ ضدین ہوا کرتا ہے! لیکن اگر آخر الذکر تنزل اور عنصر انسان کو کسی طرح نجات دیدے تو اول الذکر جوہر بے پناہ قوت سے یلغار اختیار کرتا ہے! ابراہیم خلیل اللہ اپنی شب ہا میں مسلسل و متواتر خوابیں دیکھتے ہیں۔ تاہم دغدغہ یہ عارضِ حال ہے کہ خوذبیا اس معاملے میں کہاں تک شرحِ صدر کا ثبوت دے گا! چنانچہ یہ کلماتِ ابن تذبذب کی صاف آواز ہیں کہ "فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ؟" لیکن جب "يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ!" کی بیباک وللہی گوش زد ہوتی ہے تو اک پیر نود سالہ اک گلوئے شانزدہ سالہ پر خنجر بکف ہوجاتا ہے! ؎

فرزند زیرِ تیغِ پدر می نہد گلو
گر خود پدر در آتشِ نمرود می رود!

اِس لونڈ کی سعادت سید وزیر حسن اور اُن کے فرزندِ ارجمند کے حصے میں آئی! سیدِ ممدوح کے لختِ جگر سید سجاد ظہیر نے سنتِ سجادیہ پوری کی۔ قرار دمر پد ریبر بھی معاً اعادۂ شباب کا منظر نظر آیا! ؎

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
تا سحر گہ زکنارِ تو جواں برخیزم!

"آزاد پارک" کی اسٹوڈینٹس کانفرنس کی معرکہ گاہ میں اس کہن سال وجوان دل بڈھے کی فی البدیہہ تقریر گویا آتشِ سیال کا اک طوفان تھی! نوجوان طالب علموں کو آپ نے "جنگِ آزادی کے سپاہی" کہا! اپنی موجودہ دورازکار زندگی میں اُنھیں، پھیر زکاشتکار سے بھی حقیر تر وجود قرار دیا، لیکن اک معیاری طالب علم کو وطن کی بہترین متاع بتایا، پھر جو لوگ اِن نونہالانِ ملک وقوم کی ذہنی وقلبی نشوونما میں سنگِ راہ بن رہے ہیں، اُنھیں مجرمینِ ملت گردانا، اور اُن پر دانشگاف تبرّا بھیجا! اُن کے شمشیر برہنہ خطبے کا یہ حصہ کتنا پُرجوش، حق طراز، سختگیر، پر درد، تحدی آمیز، اور فاتحانہ واقع ہوا ہے:۔

"وہ معنی (ڈسپلن کے) جو میرے قیاس اور دعوے میں اِس لفظ کے صحیح معنی ہیں نہ، وہ نہیں ہیں جو طالب علموں کے قلب وروح پر ضبط وتحکم استعمال کرنے والے لوگ اس لفظ کے ساتھ وابستہ کیا کرتے ہیں! یہ لوگ اِن نوجوانوں کی جائز جولانیوں کو بھی پابزنجیر کرسکتے ہیں! وہ اُن کی فکرِ انفرادی پر بھی قدغن عائد کرسکتے ہیں! وہ ضبط ونظم کے نام سے اُس شریف ترین اور جلیل ترین جذبے کو بھی محبوس کرسکتے ہیں، جو نوعِ انسانی کو فطرۃً ودیعت ہوا ہے! اگر یہی اِس لفظ کے معنی ہیں، اگر یہی وہ انداز ہیں جن سے ہمارے پروفیسر صاحبان اور ہمارے معرکۂ فردا کے سرہنگوں کے امینانِ امر وزکلمۂ "ڈسپلن" کا واسطہ دیا کرتے ہیں، تو پھر میں (بیدھڑک) کہوں گا کہ یہ بزرگ پرلے درجے کی غرض پرست ذاتہائے شریف واقع ہوئے ہیں! اور آزادی کی منزلِ مقصود کی طرف ہماری مادرِ وطن کا جو کاروانِ عزیمت وسبقت رواں ہے اس کی راہ میں دیدہ ودانستہ سنگِ راہ بہم پہنچا رہے ہیں!

تاہم وہ ایسا "کہا" نہیں کرتے!—— کم ازکم ایسی شرح وبسط سے! وہ صیغۂ راز میں کام کیا کرتے ہیں! وہ اپنے چہرے پر اک نقابِ فریب ڈال کر یہ جلوہ فروشی کیا کرتے ہیں! وہ سرگوشیوں میں یہ طاغوتی تلقینیں کیا کرتے ہیں! یہی تنہا وہ ممکن طریقہ ہے جس سے باطل جی سکتا ہے! یہ انداز قطعاً صادقانہ نہیں! صداقت کی یہ عادت نہیں کہ وہ روپوشی اختیار کرے! آفتابِ حقیقت اپنی طلعتِ جلیل پر کسی نقابِ ابر کی تاب نہیں لاسکتا! (ہاں سُن لو کہ) یہ لوگ بدباطن ہیں! لیکن اِن سارے جنودِ شیاطین کے علی الرغم ہم نے اب آزاد ہوجانے کا عزم بالجزم کرلیا ہے! (سنو، سنو!) جس شے کو وہ اپنے مراعاتِ مخصوص کہہ کر پکارتے ہیں اُس سے وہ اپنی کامجوئیوں کو اب بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں!—— اور اُسی باطل کے بھیس میں! اُسی "ڈسپلن" کے سکۂ مقلوب میں! لیکن یہ حضرات اب بے نقاب کردیے گئے ہیں! اُن کی مزید برہنگی آئندہ بھی جاری رہے گی! یہ میری ذاتِ حقیر نہیں جس کے قبضۂ قدرت میں یہ معرکہ سر کرنا ہے! پھر یہ نقاب کشا لوگ میرے وہ نوجوان ہمصفیر بھی نہیں جو آج یہاں سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہوئے ہیں!—— ریاکاری کی یہ پردہ در ذات وہ غیر مرئی قوتیں ہیں جو آج سارے عالمِ بشری پر فرمانروائی کررہی ہیں! (صدا ہائے احسنت ومرحبا) خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اک ایسے عہد میں واقع ہوئے ہیں جب کہ یہ معرکۂ آزادی نہ صرف برپا ہے، بلکہ عین گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے! اور واللہ مجھے آرزو نہیں، کسی اور زمانے میں پیدا ہونے کی بجز اُس دور کے جس میں سے میں اور آپ گزر رہے ہیں! (شورِ تحسین!) ہاں تو "ڈسپلن" کے نام سے، اور ہر اُس چیز کا واسطہ دے کے جو کہ پاک ومقدس ہے، یہ "غدارانِ ملک" نوجوان طلبہ کو ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنا رہے ہیں اور قوم کی روح کو اسیر وپابزنجیر کررہے ہیں!

اسی مہینے کے ختم ہونے سے پہلے پہلے حکومت صوبۂ متحدہ کا اعلان (دربارۂ عطائے آزادی بہ طلبہ برائے شرکت کانگریس وتنسیخ سابق فرمانِ گورنر یو، پی۔ بصیغۂ راز متعلق امتناع شرکت طلبہ در سیاسیاتِ ملک) اِس کانگریس نانٹ سکے نعرۂ حق کی بڑی فاتحکار صدائے بازگشت ہے! ع

کشیم نالہ خدا آسماں نگہ دارد!

اصل صدر کانفرنس، مسز کملا دیوی کا خطبۂ صدارت مردانہ حقگوئی حکیمانہ تشخیصِ صورتِ حال، سالکانہ خبر دہیٔ راہ ورسمِ منزل کا آمیزہ تھا! آپ کی بحث کا ماحصل ومآل مندرجۂ ذیل ہے۔

"آپ کی ساری تعلیم وتلقین وتربیت وہنظمت قطعاً غلط اُصولوں پر

اور قابلِ اعتراض مخفی اغراض دفتریت و قیصریت کے تحت ہوئی ہے!

اسکولوں اور کالجوں کی پیداوار جو نوجوان ہیں وہ نہ گھر کے ہیں نہ گھاٹ کے! اِن کا ڈگری پاکر برسرِ معاش و ملازمت ہوجانا ایسا ہی نادر الوجود حسنِ اتفاق ہوگیا ہے جیسا کسی نصیبے کے سکندر کے سر پر ہُما کا بیٹھ جانا! تاہم یاد رکھئے کہ یہ بد انجامی اور زبوں کاری ہندوستان کے سررشتۂ تعلیم ہی سے مخصوص نہیں! مغرب میں نظامِ تعلیم اپنا بہتر ہے۔ تاہم نتائج (بیکاری و بے روزگاری) کم و بیش یہی ہیں! حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کی پُشت پر اک اور چیز ہمارا آئینِ حکومت موجود ہے، اور اُس کی بھی بنیاد دراصل یہی اصل البلیات ہمارا دستورِ مجلسی اور ہمارا ننگِ بنیاد تمدن واقع ہوا ہے!

اِن تمام رشتے اور پسِ منظر کے ہوتے ہوئے تعلیم کو لامحالہ ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسی کہ وہ ہے! ہمارا معاملہ اک شجرِ خبیث سے ہے، نکہ اُس کے ثمرِ خبیث سے! چونکہ ہر چیز کی اصل و بیخ ہمارے معاشی و مجلسی مقدرات گشتگی میں سرایت کئے ہوئے ہے! اِس لئے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مسئلے کا تعلق بھی بالواسطہ سیاسیات و اجتماعیات سے ہے، نکہ محکمۂ تعلیم سے! مبدء و مخرج کے ساتھ ساتھ اُس کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے: یعنی وہ اصلاح و تجدیدِ تعلیم کے ڈرائنگ روم والے مذاکروں کے بجائے میدانِ سیاست اور معرکۂ انقلابِ مجلسی کا اک مُحاربہ بنجاتا ہے! پس مسئلۃ المسائل یہی ہے، ہر درد کا درماں یہیں ہے، اور سارے معاملے کا مرکزِ ثقل یہی نقطہ ہے! کُرۂ ارضی کے تمامی عالمِ انسانی کو اپنی ساری ہستی اور ایک ایک قطرۂ عرق ریزی اِسی اصلِ عظیم پر وقف و مرکوز کردینا چاہیئے!

مصلحت دیدِ من آنست کہ یاران ہمہ کار
بگذارند و سرِ طرۂ یارے گیرند!

(ا۔ا۔خ)

چین و جاپان اور دُولِ عالم!

چین و جاپان کی باہمی خونریز آویزش کے مجوزہ خاتمے کے بارے میں جاپان کی طرف سے فریقینِ جنگ کے درمیان "براہِ راست گفت و شنید" کے استحسان کا نظریہ پیش کیا گیا ہے! جاپان کا عشقِ چین قابلِ داد ہے! اُس کا پیامِ الفت و خلوت، محبوبِ چین کو یہ ہے کہ ع

اے کاش میں ہوں، تم ہو، اک گوشۂ سکوں ہو!

وہ دُولِ یورپ و امریکہ کو اپنی اور اپنی مدخولہ "چین" کی خلوتِ صحیحہ کے حرم کی پاسبانی کی زحمت دینا نہیں چاہتا، وہ جانبینِ عشق کے مابین کچھ ایسے محرمانہ تعلقات کا طالب ہے کہ ؎

میانِ عاشق و معشوق رازیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست!

اِس میں کیا شک ہے کہ "شیر و حلوان" کے درمیان سے اگر سارے حجاب و حصار اُٹھ جائیں تو "دریدہ و بریدہ و شکست و بہ بست" کے سارے مراتب بہت جلد طے ہوجاسکتے ہیں!، اور اِس بنا پر مُدبّرینِ جاپان کی اِس "صلاح کی بات" کی داد دینی ہی پڑے گی کہ "بلاواسطہ گفتگو کا طریقہ اِس قضیئے کے تصفیئے میں نہایت قاطع و ناتج رہے گا"! لاریب کہ "قاضیٔ شمشیر" سے بڑھکر کس کا فیصلہ ناطق و خاتم ہوسکتا ہے؟!

لیکن ہم دُولِ فرنگ کے نقطۂ نظر کی وکالت میں کہنا چاہتے ہیں کہ یہ بزرگ بھی اِس نزاع میں کم از کم "ترتیبی مدعا علیہم" کی فہرست سے خارج نہیں ہیں! جو "مجرمِ چین" اِس وقت جاپانی امپیریلزم کے زندان میں "دائم الحبس" کئے جانے کے لئے کشاں کشاں لے جایا جارہا ہے اُسے یہ دوسرے "قرضخواہان" راہ میں روک کر دامنگیر ہورہے ہیں کہ "ہم لوگوں کی ڈگریوں کی ادائی اور ہمارے دخلی رہن ناموں کے انفکاک کی کیا سبیل ہوگی"!——

دراصل اِس مواخذے میں روئے سخن بجائے چین کے جاپان ہی کی طرف ہے کہ "جاگیرِ چین" کے آئندہ قانونی وارث کی حیثیت سے وہ اِن دوسرے اربابِ "قبضۂ مخالفانہ" کے "حقوق ساقط الملکیت" کے بارے میں کچھ "حق حساب" دینے کے لئے تیار ہے یا نہیں؟!—— لیکن یہ فرنگی "جنٹلمین" جو "سائلانہ" انداز پیش کررہے ہیں اُس کی روشنی میں اُن کے سارے "حقوق و مراعات" کی "ضبطی" کا سنگین اندیشہ کیا جاسکتا ہے! چنانچہ بروسیلز کی "تازہ" کانفرنسِ مشرقِ ابعد جو خیر سے "معاہدۂ دُولِ تسعہ" اور "مقدس میثاقِ مجلسِ اقوام" کے زیر سایہ منعقد ہوئی اُس میں جو "بعد ادائے آدابِ فدویانہ" اک عرضداشت بنام [illegible] جاپان کی جنابِ عالی میں ارسال کیا گیا، اُس کی بسم اللہ ہی میں اپنی "تلخ نوائی" کی لمبی چوڑی معذرت کی گئی ہے! اور پھر چین و جاپان کے اِس سارے قضیئے نامرضیہ

میں لازماً اک پُرامن طریقِ کار سے وابستۂ دامن رہنے کی تشفی کی گئی ہے! اللہ اللہ: ؎

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا! قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر!

ایسے حالات میں جاپان کی زبانِ حال کا یہ "غیر ملفوظ" جواب کیا غلط ہے کہ ؎

نہ خنجر اُٹھیگا نہ تلوار تم سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں!

تاہم سست رگ و عاری از عمل دُولِ مغرب پر یہ امر بھی واضح رہے کہ ؎

سر چشمہ باید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نہ شاید گرفتن بہ پیل!

جاپان کی موجودہ چنگیزیانہ یلغار میں ان سارے دُولِ عظمیٰ کے "چینی منافع و مصالح" سوختہ ہو کر رہ جائیں گے! اور پھر اُس کے بعد بہت جلد فتحمند و حوصلہ مند جاپان کی قوت کی روز افزوں امواج کا تصادم سواحلِ آسٹریلیا و سرحداتِ ہند سے ہونے لگے گا! جو دُوَل آج چین کے مقتل میں "تماشائے رقصِ بسمل" دیکھ رہے ہیں وہ کل خود اپنی دیدنی عرصۂ دار و گیر میں دوسروں کو اپنی گلوگیری کا تماشا دکھانے والے ہیں! اگر حبش نہیں تو چین کی تخریب ضرور امنِ عالم کی تباہی ثابت ہوگی! ؏

اے زبر دست بیخبر در ہر چہ باشی زدہ باش! (ا۔ا۔خ)

محشرِ فلسطین!

فلسطین کا معاملہ علانیہ اک "طوالت پذیر کشمکش" میں تبدیل ہوگیا ہے! یہ اُفتادِ حوادث عین اِس تاریخی سرزمینِ خون آشام کی روایات کے شایانِ شان ہے! فلسطین مشرق و مغرب کی "بین البرّ اعظمی آویزش" کا اکھاڑہ رہا ہے! وہ "جنگہائے صلیبی" کی رزمگاہ ہے، جو صدیوں جاری رہی ہیں! پھر ماشاء اللہ انگلستان کو بھی اپنے "رچرڈ شیر دل" کے سپوت ہونے کی لاج ہے! لیکن پھر ناگزیر طور پر ارضِ مصر و قدس کو بھی اپنا "صلاح الدین" پیدا کرنا پڑے گا! مسجد اقصیٰ کے اندر اور باہر جو رستخیز بپا ہے اُس میں "قُمْ یَا عُمَرْ!" کی نوائیں صاف گوش زد ہو رہی ہیں! اور پھر انشاء اللہ مستقبل، ماضی ہی کا اعادہ ثابت ہوگا! انگلستان نے فلسطینی گورنر وَڈُکلیٹر کو "آخری صلیبی فاتح" بننے کا پورا ارمان نکال لینے دو! قبل ازیں لارڈ ایلنبائی آنجہانی کا بھی خود ساختہ خطاب باطل ہو چکا ہے! ہاں فلسطین کی ارضِ انبیاء و رسل پر تقسیم کے آرے چلنے دو! فلسطین کے عرب نوجوان بھی یہ عہد کر چکے ہیں کہ "وطن مقدس کی قطع و بُرید سے پہلے اُن کے اجسام کے دو دو ٹکڑے کرنے پڑیں گے"! ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر! (ا۔ا۔خ)

مولٰینا فضل الحق کی پیغمبرانہ وعید

عالیجناب مستطاب حضرت فضل الحق، وزیر اعظم بنگال نے مسلم لیگ کے ماضی قریب کے تاریخی اجلاس لکھنؤ کی تقریب بعید پر پیغمبرانہ لب و لہجہ میں یہ پیام براڈکاسٹ کیا کہ "کفر کے لئے کوئی ممکن مستقبل نہیں ہے اور اگر مسلمانانِ ہند (گویا میری طاغوتی بد آموزیوں کے تحت) چند روز اور ہندو کانگریس اور اُس کے دور از کار کاروبار سے مجتنب رہیں تو سارے براعظم ہند پر اسلام کا پرچم لہرانے لگے گا!" ——— مسٹر فضل الحق کو چونکہ بنگال کے چاول کے خطے میں "شکم سیر خشکہ" ملتا ہے، اس لئے اُنھیں حدود دار الوزارتِ بنگال کے باہر سارے ہندوستان میں "ہرا ہی ہرا" سوجھتا ہے! اب رہا برادرانِ وطن کی تقدیر کے بارے میں اُن کا "پیامِ بوم شوم"، تو ہم اِس "فرنگی مولوی" کو کیسے بتائیں کہ مذہب کی ساری گزشتہ تاریخ میں مستقبل اگر نصیب ہوا ہے تو کفر و اہلِ کفر ہی کو! عرب کا "انقلابِ اسلام" کیا عین کفار و مشرکینِ عرب کی خاطر نہ ثابت ہوگیا؟! پھر شاید مسٹر فضل الحق کو کسی انگریزی تاریخ ہی کی تلاوت سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ اسی عرب میں اسی دینی تجدید کی تحریک نے ریگ پشتینی کلید بردارانِ دین" ——— یہود و نصاریٰ ——— کی روحانی و مادی دونوں قسم کی قسمتوں پر صدیوں کے لئے مہر کر دی! ہم کس اُمید پر حضرت مجتہد العصر مولٰینا فضل الحق کے سامنے قرآن عظیم کی یہ آیۂ نادرہ تلاوت کریں کہ:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ!

(ا۔ا۔خ)

نقد و نظر

ادارہ

(۱) **انور** — ایک ناول، مجلد، ضخامت ۵۰۰ صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت و عام گیٹ اپ بہت عمدہ، مع متعدد تصاویرِ اشخاصِ ناول و مناظرِ قصہ و نقش برلوح، شائع کردہ انڈین پریس، الہ آباد، قیمت تین روپیہ

انور، فنِ افسانہ میں جناب فیاض علی صاحب کا نقشِ ثانی ہے! نقشِ اول "شمیم" تھا، جو ۱۰ سال اُدھر شائع ہوا تھا۔ اُردو ادب، نثر میں بمقابلہ نظم کے کم مایہ واقع ہوا ہے ــــ کم و کیف ہر دو اعتبار سے! زیرِ نظر ناول اسی حقیقت کی اک اور تلخ یاد دہانی ہے! سچ یہ ہے کہ بہت ہی کم اُردو ناول ایسے ہیں جن پر "ناول" کا لفظ شائستہ اطلاق کیا جا سکتا ہے! اُردو ناول کا جو ذخیرۂ ادب اِس وقت تک پیدا ہوا ہے اُس کی متاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً تخیل سے محروم ہے، پلاٹ کے ربط و ضبط سے بے نیاز ہے، کرداروں کی ترجمانی اور شخصیتوں کی تحلیلِ نفسی سے عاری ہے، اور حقائقِ زندگی اور مسائلِ مجلسی کے مَس سے بیگانہ! وہ مدت العمر کے بعض اساطیری آداب و مراسم سے پا بزنجیر ہے، اور معدودے چند ناگزیر نمونہائے طربیہ و حزنیہ کی فرسودگی سے زنگ آلود! ہم اپنی نام نہاد "ادبی نشأۃ ثانیہ" میں الف لیلہ اور داستانِ امیر حمزہ ہی کے گویا "تازہ ایڈیشن" نکالتے رہے ہیں! ہمارے دفاترِ ناول میں جدید العہد معاشرتی مسائل کے تذکرے، یا اِن مہمات کے حل کی تلاش مسدود ہو گی! ہم نے فیاض علی صاحب کی زیرِ ذکر قلمکاری میں اُمید وارانہ اِن عناصر و جواہر کی توقع کی، لیکن بدقسمتی سے ہماری آرزوئیں کم و بیش تشنہ رہیں! مصنفِ موصوف کے سابق مولودِ فکر و نگارش ــــ "شمیم" ــــ کی بعض ادبی خامیوں کا مکرر ظہور ہم "انور" میں بھی پاتے ہیں!

چنانچہ سارے کردار ماشاء اللہ "فرشتہ صفتی" کی عبا میں ملبوس پائے جاتے ہیں! ــــ ور کچھ اس شان سے کہ "قبائے حقیقت و معقولیت" پارہ پارہ ہو گئی ہے! ؎

گویند ایں کہ شیخ ملائک سرشت ہست

آرے، من اعتراف کنم "آدمی" نہ ایست!

حشو و زائد، مجلسی تنقید ــــ براہِ راست ہو یا ضمناً ــــ کا کامل فقدان، کسی تمدنی مسئلے کے حل کی جرأت کی عدم موجودگی "انور" کی یاس انگیز خصوصیات ہیں! مصنف نے مقدمے میں، نیز اثنائے ناول میں ایک کردار کی زبان سے اس استحسان کو بیان کیا ہے کہ ناول کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ لیکن پھر خود ہی اپنی اس بشارت کو تشنۂ ظہور رکھا! ہر کردار کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ؏

یا آدم نیست، یا دریں عالم نیست!

"دنیائے دنی" کے سارے مسائل و مشکلات ان "برتر انسانوں" کے لئے بے معنی ہیں! "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن" رکھنے والی لڑکیاں فلسفۂ عالیہ پر وہ وہ خطبات دیتی ہیں کہ ؏

خامشی میں ارسطو و فلاطون مرے آگے!

حُسنِ کمسن کے یہ کیا کرشمے ہیں! ؎

نگارِ من کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت

بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد!

اِن فوق الفطرۃ کرداروں میں عالمِ سفلی کا تنہا متنفس ممتاز نظر آتا ہے (ہیرو کا دوست) نیز اُس کی بیوی عذرا۔

تمام دوسرے کردار غیر جاذبِ توجہ واقع ہوئے ہیں، با وجود اِسکے

کہ اُن میں سے ہر ایک کی ہستی و شخصیت، ذہانت و حکمت کا مجسمہ پائی جاتی ہے! سارے طویل و لاطائل پلاٹ سے اک لق و دق بیابان سا پیدا ہو گیا ہے، ہمارے زندہ دل مصنف نے قیس و فرہاد کے عہدِ زرین کے مذہبِ عشق کا اک خزینہ تعمیر کیا ہے! حوادث و اشخاص کی کثرت، کا ہجوم قصے کی وحدتِ اثر کو فنا کر دیتا ہے!

تاہم مسٹر فیاض علی ہماری ضیافتِ طبع کے سلسلے میں کامیاب رہے ہیں! وہ آبِ رواں کی طرح سلیس اردو لکھتے ہیں، اُن کی تحریر جوش و جذبہ کی غماز ہے! اک خاص بجو شیح کا ... سارے طول و عرض ناول میں جاری و ساری پایا جاتا ہے! ... بہ حال اردو کی رومانی ادبیات میں اک ناگزیر جگہ ہے!

(... ح)

---

(۲) جدید دستور کا خاکہ

(علاوہ رسالہ کتابی قامت، ضخامت ۱۰ صفحات، کتابت و طباعت، بدرجۂ اوسط)

مؤلفہ (در انگریزی) جناب زین العابدین صاحب پی ایچ، ڈی، (لندن)، مترجمہ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی۔

——طبع ثانی" از رسالۂ جامعہ، نمبر ۳ سلسلۂ سیاسی و معاشی مسائل، شائع کردہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ جامعہ، قرول باغ، نئی دہلی،

"قانونِ ہند ۱۹۳۵ء" پر مصنفِ علام و نقادِ بالغ نگاہ کا یہ اک جامع نیز واضح تبصرہ ہے جسے مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی (جامعی) کی ترجمانی نے اردو پبلک کے لئے قابلِ رسائی بنا دیا ہے! اس رسوائے ہند قانون کے نظام، دستور العمل، مناصب و مقاصد نیز منشائے مضمر کی سیر حاصل شرح و بسط کے بعد اُس کا لب لباب، صاحب مقالہ نے جیسا خاتمۂ سخن میں دیا ہے وہ اصل تالیف، اُس کے اردو ترجمے، اور سارے مسئلۂ متعلقہ کے کامیاب مطالعہ و تفتیش کا بجائے خود بڑا اچھا ترجمان ہے! ہم اس حصے کو یہاں بجنسہٖ نقل کر دینے سے بہتر کوئی دوسرا طریق تنقید نہیں پاتے! چنانچہ ملاحظہ فرمائیے:

"مذکورۂ بالا تشریح سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مجوزہ دستور اپنے جملہ تحفظات خصوصی ذمہ داریوں، اور گورنر و گورنر جنرل کے مزید اختیارات کی وجہ سے سامراجی جبر و تشدد کا اک نیا حربہ ہے! اور ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے اک نئی تدبیر ہے! تمام اختیارات، خواہ وہ قانون سازی کے متعلق ہوں یا مالیات، عدالت، فوج اور پولیس کے، وہ سب سامراجی نظام کے اختیار میں ہیں! علاوہ ازیں رجعت پسند جاگیردار طبقے، یعنی زمینداروں اور دیسی ریاستوں کی قوت کو منظم و مستحکم کیا جائے گا، تاکہ اُن کا رشتۂ اتحاد سامراج کے ساتھ جوڑ رہے۔

"جدید دستور کے آغاز سے ملک کی آزادی کے لئے قومی جد و جہد کا اک نیا دَور شروع ہوگا! برطانوی سامراج چونکہ قومی تحریک کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوا ہے، اس لئے وہ اپنی گرفت کو اِس ملک کے مستقل حقوق رکھنے والوں کی کھلم کھلا امداد سے اور زیادہ مضبوط کریگا! اس سے بہت سے مسائل صاف اور واضح ہو جائیں گے۔ ایک طرف تو سامراج اور جاگیردار طبقہ ہوگا، جو یہ طے کر چکا ہے کہ باشندگانِ ہند کی ہر اُس خواہش اور کوشش کو ناکام بنایا جائے جو معاشی اور سیاسی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کی جائے —— اور دوسری طرف وہ تمام عناصر ہیں جو فاقہ مست ہیں اور جنھیں خوب لوٹا گیا ہے! یعنی کسان، مزدور، اور متوسط طبقے، جو موجودہ سامراجی نظام سے نجات حاصل کرنے کی کوشش اور جد و جہد کر رہے ہیں۔

"سامراجی اور جاگیرداری اتحاد کو موثر طریقے پر شکست دی جا سکتی ہے، اگر سامراج کی مخالف تمام قوتیں کانگریس کے اندر مجتمع اور متحد ہو جائیں! اس لئے اُن تمام لوگوں کو جو سامراج کا شکار ہوئے ہیں اپنے (باہمی) اختلافات کو دور کر دینا چاہئیے، تاکہ اس جدید مطلق العنانی کا مقابلہ کیا جائے! جس کی ابتدا نئے دستور سے ہونے والی ہے! قومی آزادی کی تحریک کا مقصد یہ ہونا چاہئیے کہ عوام کی سیاسی اور معاشی تکالیف کو رفع کیا جائے، اور یہی جد و جہد اُس کی تمام تر قوت کا سرچشمہ ہونا چاہئیے اس طرح اُس کی قوت میں اضافہ ہوگا اور مقاصد میں صفائی پیدا ہوگی!

"انتخاب کے معرکے میں اک اچھا موقع ملتا ہے کہ عام باشندگان میں سامراج کے خلاف احساس پیدا کیا جائے! اور قومی مطالبات کو عام طور پر پھیلایا جائے۔ مجالسِ قانون ساز کے اندر دستور کی سامراجی نوعیت کا بھانڈا اس طرح پھوڑا جا سکتا ہے کہ کسانوں کے مطالبات،

مزدوروں کے مطالبات اور غریب متوسط طبقے کے مطالبات ۔۔۔۔ غرض عام باشندگان کے مطالبات کو زور دے کر پیش کیا جائے۔ لیکن اس رجحان کو بہر حال روکنا چاہیئے کہ انتخابات اور پارلیمنٹری پروگرام ہی کو اصل مقصد سمجھ لیا جائے۔ انھیں تو اک بڑی لڑائی کا صرف اک حصہ سمجھنا چاہیئے! اسے جدید دستور کے خلاف زیادہ سے زیادہ شدید اضطراب اور بےچینی پیدا کرنے کا اک ذریعہ بنانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ صاف طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ حقیقی جد وجہد مجالس قانون ساز کے باہر ہوگی، اور مجالس کے اندر مخالفت کا موثر ہونا بالکل اُس مخالفت پر موقوف ہے جو باہر عام باشندگان کی طرف سے ہوگی! چنانچہ (یہ) باہر کی قوت اتنی بڑھنا چاہیئے کہ لاکھوں نہیں، کروروں انسانوں تک وہ پہنچ جائے اور اُن میں سامراج اور اُس کے اتحادیوں کی مخالفت کے لئے اک تحریک پیدا ہو جائے!

"باشندگانِ ہند کی طرف سے سامراجی دستور کا جو بدل تجویز کیا گیا ہے وہ نمائندہ اسمبلی کا مطالبہ ہے! اس مطالبے پر سامراج کی مخالفت جملہ قوتوں کو مجتمع ہو جانا چاہیئے۔ اور اسی کو قومی تحریک کا نعرہ بنانا چاہیئے! یہ بہر حال اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ مجلسِ آئین ساز صرف باشندگانِ ہند کی اپنی قوت سے پیدا ہو سکتی ہے! اور سامراجی اثرات سے اُس کو پاک اور آزاد ہو جانا چاہیئے، چونکہ اُس کے انتخاب میں ہر عاقل و بالغ کو عام طور پر حقِ رائے حاصل ہوگا۔ اس لئے یہی نہیں کہ مجموعی حیثیت سے باشندگانِ ہند کی خواہشِ آزادی کا اظہار ہوگا، بلکہ اُن کی فرمانروائی کے قیام کی طرف اک قدم اُٹھایا جائے گا!"

اس دل نشین تفہیم و تلقین پر کونسی مزید روشنی ڈالی جا سکتی ہے؟ ع

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (ا۔ ا۔ خ)

(۳) **"دُنیا کے بچے"** (مولفہ محمد حسین حسّان صاحب، ایڈیٹر پیامِ تعلیم) "ننھی مرغابی"، "لال مرغی" (از عبدالواحد صاحب سندھی، اُستاد جامعہ) "چھوٹا ٹٹو" (حسّان صاحب) "چھچھوندر" (از رقیہ ریحانہ وغیرہم!)

جامعۂ ملیہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی موسومۂ بالا تمام بچگانہ کتابوں پر ہم شاید یکجائی ریویو کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اُن کی عام حیثیت و نوعیت، قامت و ضخامت، صورت و ہیئت، زبان و بیان، اور مقصد و غایت اُصولاً یکساں واقع ہوئے ہیں! سب کے صفحات کا اوسط ۲۰، ۴۰ ہے، تاثیل بیچ مصور و تخیل پرور ہے، اور قیمت ۲ر سے لے کر ۳ر (اول الذکر جلد ۴ر کی ہے!)

نمبر (۱) دنیا کے مختلف ملکوں کے بچوں، اُن کے قومی ناموں، اُن کی پوششوں اور وضعوں، اُن کے جداگانہ شغلوں اور دلچسپیوں، اور عام زندگی و معاشرت پر اک حقیقۃً دلچسپ، معلومات افروز، اور نہایت مفید کتاب ہے، ہم اسے اپنے جرح و قدح سے مستثنیٰ کرنے پر مجبور ہیں، اور سوائے داد و تعریف کے ہمارے پاس اُس کے لئے کچھ نہیں! ۔۔۔۔ بجز اس ضمنی ریمارک کے کہ کتابچۂ زیرِ ذکر، اسی موضوع پر غالباً انگریزی کی کسی کتاب یا سلسلۂ کتب کا آزاد ترجمہ یا ملخص ہے، اور اس لئے مطالب کی نوعیت، دلچسپی، اور ترتیب بیان کی ساری خوبی کے لئے اصل مصنف یا سیاح ہی عموماً مستحقِ شکریہ ہے! تاہم حسین حسّان صاحب کی اتنی خدمت بھی (بشرطیکہ وہ اتنی ہی ہو!) قابلِ مرحبا ہے کہ اُن کی نظرِ انتخاب اک ایسے اچھے سرچشمۂ ادبیات پر پڑی، اور زبانِ اردو کو اس معصوم گلدستے سے گل بداماں کیا!

باقی کتابوں کا ہم بادب خردہ گیرانہ جائزہ لینا چاہتے ہیں! یہ سب "کتبیاں" آسان روزمرہ زبان میں لکھی گئی ہیں، اور کم از کم شمالی ہند کے اردو داں بچوں کے علم و فہم کی رسائی کے اندر واقع ہوئی ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ صرف سہل گھریلو بولی بچوں سے خطاب کے مقتضیات میں اگرچہ اولین چیز ہے۔ لیکن اہم ترین چیز نہیں! زبان کا اشکال بلاشبہ بچے کے لئے اک پردہ ہے، لیکن اسی پر سارے حجابات اور مشکلات ختم نہیں ہو جاتے۔ ہمارے دوستوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مشکل کی اک قسم "سہل ممتنع" بھی کہلاتی ہے! بچے کے لئے بعض نفسیاتی "اجنبیتیں" بھی ہوتی ہیں! جن کی ماہیت نہایت پیچیدہ اور پوشیدہ اور بغایت عمیق و دقیق واقع ہوئی ہے! "نفسیاتِ اطفال" میں بڑی تیز رفتگاہانہ بالغ نظری ہی اک مصنفِ بچگان کو اُس کا محرمِ راز بنا سکتی ہے! صرف آسان زبان اور پدرانہ لہجۂ خطاب و بیان اس مفتخواں کا قدمِ اول بھی نہیں اُٹھوا سکتے:

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست!
نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند!

سارے برّ اعظم یورپ میں بین البرّ اعظمی سند کاملُ العیاری رکھنے والے بچوں کے داستان گو شاید دو سے زیادہ نہیں! ۔۔۔۔ اینڈرسین

اور گرم ! جامعۂ ملیہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی بلاشبہ یہ قابلِ رشک کثیرالاولادی ہے کہ اُن کے ہاں بچوں کے مصنفوں کا گویا اک "دریا" کُھل گیا ہے! جس میں سے "ننھی مرغابی" اور "ننھی مرغی" اور "مرغی اجمیر چلی" اور نہ معلوم اور کیا کیا "مچھلیں" چُوں چُوں کرتی نکل پڑی ہیں! ——— سچ ہے "آسان پسندوں" کے لئے کوئی چیز "مشکل" نہیں! مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم (جامعہ کی لغت میں "بچوں کے اسمٰعیل") غالباً اپنی بہشتی آرامگاہ میں مضطرب ہو کر یہ وِرد کر رہے ہوں گے کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی!

لطف یہ ہے کہ ان مصنفین میں بعض "کمسن بچیاں" تک واقع ہوئی ہیں ——— اگرچہ بچوں کی کتابیں لکھنے کا اہل ہر کہنہ مشق و تجربہ کار مصنف بھی نہیں ہوتا! ع

تو و قطعِ مسافت لہان و یک لغزش پائے!

اقبال نے گوئٹے کے مقابل آ کر اس کے "مغربی دیوان" کا جواب "پیامِ مشرق" سے دیا؛ لیکن ہنس اینڈرسین اور گرم کی ہم دو یورپی صداؤں کی "صدا ہائے بازگشت" تنہا ایک مشرقی نقطے ——— جامعہ ——— سے اتنی کثیر تعداد میں اُٹھی ہیں کہ انھیں "ریکارڈ" کرنا مشکل ہے! ع

خدا کی دین کا موسیٰؑ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں "پیمبری" مل جائے!

ہم اربابِ جامعہ کی ہمت شکنی کرنا نہیں چاہتے : اُنھیں بچوں کا ادب شوق سے تیار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس منصبِ ممتاز کی اہم و نازک ذمہ داریوں کو کماحقہ مرعی رکھ کر! اس لئے کہ ع

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

(ا۔ا۔خ)

(۳) "شاعر کے سوزِ شعر" مکتبۂ جامعۂ ملیۂ دہلی کے جاری کردہ سلسلے کی قبیل پر، اور کم و بیش اسی کی قامت و ضخامت و صورت و ہیئت پر، جنابِ "افسرالشعراء" آغا شاعر قزلباش دہلوی کے کلام کا یہ ایک "صد ملتی" انتخاب ہے، جو اُن کے فرزندِ ارجمند جناب سرور آغا کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

حضرتِ آغا شاعر ہمارے عہد کے "میر جگر سوختہ" ہیں! پھر اُردو زبان و محاورہ پر اُنھیں جو مالکانہ قدرت حاصل ہے اس کی بنا پر وہ میرؔ ہی کے "مطلق چیلنج" کے لب و لہجہ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ؎

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے!

"افسرالشعراء" کی ادبی ٹکسال کے اک سکّے کی کامل العیاری ملاحظہ فرمائیے ؎

خالِ سیہ ہے کعبۂ ابرو میں جلوہ گر
"کافر" کہاں سے "حفظِ الٰہی" میں آ گیا!

آغا شاعر اپنی موجودہ "خاکسترِ پیری" کی پُشت پر اک "طوفانی شباب عشق و رومان" رکھتے ہیں۔ اُن کے قال میں اُن کے اِس حال کی صدائے بازگشت اک ناگزیر چیز ہے! پھر صرف "... شعر" کے عطر میں اِس سارے "آتشِ گل سے دہکے ہوئے چمنستان" کی "روح الروح" ہی معطر ہو گئی ہے:

انتخاب پر "شاعرِ انقلاب" حضرتِ جوش ملیح آبادی کا مقدمہ بجائے خود تعارف و انتقاد کا ایک شہپارہ ہے! اک "میرؔ" کو اک "سوداؔ" پیش کرے، اِس حُسنِ اتفاق کی ندرتیں اور کیفیتیں دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہرحال آغا کے "سوزِ شعر" اور جوش کے "سازِ نثر" ہر دو آہنگوں کو اس ایک ہی "ارغنون" میں سُنئے!

ملنے کا پتا، نگارستان ایجنسی، کشمیری دروازہ، دہلی۔ (ا۔ا۔خ)

ایک ضروری تصحیح

ہمیں افسوس ہے کہ "کلیم" کے کسی نمبر میں ایک افسانہ مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب فرنگی محلی کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ حکیم عبدالوالی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔

ضروری اطلاع

کلیم پہلی تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے لہٰذا کلیم نہ پہونچنے کی اطلاع ایک ہفتہ کے اندر اندر کر دینی چاہیئے ورنہ بعد میعاد تعمیل نہیں کی جائے گی: مینیجر

گورنمنٹ میسور سلک فیکٹری

کی بنی ہوئی جارجٹ، کریپ یا ساٹن ملاحظہ فرمائیے یقیناً آپ اُن کی عمدہ بناوٹ اور خوبصورتی کو دیکھکر ہندوستانی صنعت پر متحیر رہ جائیں گے، کیونکہ وہ بالکل ایسی ہی عمدہ ہیں

Fastidious people -
MYSORE
SILK
FABRICS
GEORGETTES
CREPES &
SATINS
Govt Silk Weaving Factory
MYSORE

کارآمد، دیرپا اور مضبوط مال سے تیار کی جاتی ہیں، جیسے ولائتی کثیر تعداد میں نئی قسم اور جدید ترین ڈیزائن کے نمونے ملاحظہ فرمائیے، یہ خالص اور صرف خالص ریشم سے تیار کی گئی ہیں، اس میں کسی قسم کی ولائتی یا نقلی آمیزش نہیں ہے۔

گورنمنٹ سلک فیکٹری میسور

ایجنٹ برائے دہلی اور صوبجات متحدہ

میسرز گوکل چند کھنہ اینڈ کمپنی سودیشی کلاتھ مرچنٹس
دہلی کلاتھ مارکیٹ، لکشمی بازار گیٹ۔ کوئنس روڈ دہلی

سو شعر کا ست

جوشؔ، جگرؔ، اصغرؔ، حسرتؔ، میرؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ
(کے)

ایک ایک سو بہترین اشعار

ہر شخص کو ہر شاعر کا سب کلام پڑھنے اور اس کی شاعری کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے، اسی خیال سے یہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے، ہر کتاب میں دور جدید یا دور قدیم کے ایک ممتاز شاعر کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کر کے بہترین سو شعر دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو اپنی پسند کے ملیں گے،

جیبی سائز، کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب، سرورق خوشنما جس پر ہر شاعر کی تصویر بھی ہے۔

قیمت فی کتاب چار آنے

منیجر کلیم بک ڈپو، جینتی لواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

کائنات

مصنفہ محمود علی خاں جامعی

اس کتاب میں علم ہیئت کے راز آسان سے آسان زبان اور سادہ سے سادہ اسلوب بیان میں بچوں کو ایسی مثالوں اور دلچسپ دلیلوں سے سمجھائے گئے ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کرۂ ارض کیا ہے۔ سورج و چاند، ستارے کیا ہیں، ان کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے، اور ایک دوسرے پر کیونکر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان سوالات کے نہایت کافی جوابات، متعدد نقشوں سے مزین۔ صفحات ۸۰ قیمت چار آنے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:- منیجر کلیم بک ڈپو، جینتی لواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

شاعر کی راتیں

شاعرِ انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفریں اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے، جنھیں پڑھکر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مست رات — بدمست رات — راز و نیاز کی رات — انتظار کی رات
اندھیری رات — چاندنی رات — جوانی کی رات — تصورات کی رات
التفات کی رات — جدائی کی رات — اشکوں کی رات — برسات کی رات
رنجیدگی کی رات — بیخودی کی رات — سرشار رات — بھیگی ہوئی رات
تصورات کی رات — بیچین رات — بیابن ناگن کالی رات

قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴۔ دریا گنج، دہلی

پیغمبرِ اسلام

خواجۂ دو جہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اُترتے چلے جاتے ہیں اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل قاطع کے سامنے ادراک منطق چھا نٹا بھول جاتا ہے —— شاعرِ انقلاب پر جب ایک سرشاریت کا عالم طاری ہوا اُسی وقت اُنھوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی، عالمِ بیخودی میں چار روز کی ریاضتِ شاقہ اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا۔ جب تک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرتِ جوش نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے قیمت صرف ۸؍

کلیم بک ڈپو۔ جینتی نواس نمبر ۴۔ دریا گنج۔ دہلی

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی

کی

(۴) چار پرانی تصانیف

حضرتِ جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے، لیکن اُن کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ اُنھیں شائع کرتے اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گزریں تو مناسب معلوم ہوا کہ اُن کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کرکے اُنھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

(۱) **جذباتِ فطرت** } حضرتِ جوش کی وہ معرکۃ آرا نظم ہے جس میں مظاہرِ قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کر دیں۔ قیمت ۳؍ رعایتی ۱؍

(۲) **اوراقِ سحر** } یہ حضرتِ جوش کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں قیمت ۵؍ رعایتی ۲؍

(۳) **آوازۂ حق** } یعنی معرکۂ تسلیم و رضا کے سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو اور جنگِ حق و باطل کے سب سے بڑے سالار حسینؑ ابن علیؑ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ ہے۔ قیمت ۸؍ رعایتی ۳؍

(۴) **مقالاتِ زریں** } یہ حضرتِ جوش کے نادر کلمات فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطائف کا دلچسپ اور کار آمد مجموعہ ہے، قیمت ۱۱؍ رعایتی ۴؍

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰؍ محصول ڈاک ۳؍ وی، پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو۔ جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج، دہلی

نقش و نگار

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

کی وجد آفرین نظموں کا مجموعہ جو مندرجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے

(۱) نگارخانہ (۲) خمریات (۳) تاثرات (۴) مطالعۂ فطرت (۵) نشیب

ہر نظم اپنی جگہ مکمل، مرصع اور کیفیاتِ شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے مسحور کن نغمے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں، لکھائی چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے (عا)

کلیم بک ڈپو۔ جینتی لواس نمبر ۴ - دریا گنج، دہلی سے منگایئے

شعلہ و شبنم

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

کی پرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ ہے، جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلامی شان و حریت کے خون کھولا دینے والے واقعات۔ بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا،

شاعرِ انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے

کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گرد پوش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپے — کلیم بکڈپو جینتی نواس ۴ دریا گنج دہلی

اُردو زبان کا بلند پایہ وارزاں ترین ماہوار

رسالہ یثرب لاہور

ماہ اکتوبر کے پرچہ میں مندرجہ ذیل مضامین ملاحظہ فرمائیں

(۱) واقعات وواردات (مسائل حاضرہ پر تبصرہ) (۲) ترکی تاریخ کا ایک غیر معروف صفحہ (ایک دلچسپ تاریخی افسانہ) (۳) دوشیزۂ مصر (ایک مصری ناول کا مسلسل ترجمہ) (۴) مشاہیر اسلام ودنیائے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں کے دلچسپ وسبق آموز حالات زندگی، (۵) مواہیر وبزرگان اسلام (ایک قابلقدر تاریخی جواہر ریزہ) (۵) دنیا کے امن کو کیا ہوا (سیاسیات یورپ پر ایک دلچسپ بحث) (۶) انگلستان میں تحریک عریانی (ایک دلچسپ انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ) (۷) سلطان صلاح الدین ایوبی کی نذر (۸) ابن خلدون۔ (عہد گزشتہ کے مشہور ترین مورخ کی سوانح حیات) (۹) مشہور ومعروف انگریزوں کے ہندوستان کے متعلق مقولے (۱۰) سبق (ایک نہایت ہی دلچسپ افسانہ) (۱۱) محاصرۂ بیت المقدس (تاریخ عروج وزوال امم کا ایک دردانگیز افسانہ (حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے (۱۲) سلطان نورالدین زنگی (۱۳) بدوی حمیت (ایک دلچسپ تاریخی مضمون) (۱۴) عہد حاضر وگزشتہ (۱۵) حصۂ نظم۔

یثرب، ہر ماہ $\frac{20\times30}{8}$ سائز پر شائع ہوتا ہے۔ حجم سا ٹھ صفحات طباعت وکتابت نہایت اعلیٰ۔ ٹائیٹل پیج رنگین اعلیٰ ولائتی کاغذ کا ہوتا ہے۔

چندہ سالانہ صرف ایک روپیہ

نمونہ مفت

منیجر رسالہ یثرب لاہور

بچوں اور بچیوں کا باتصویر ماہوار رسالہ

پیام تعلیم دہلی

یہ رسالہ محض بچوں کی خاطر جاری کیا گیا ہے، اس میں اُن کی دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے، اچھے اچھے اور مزے دار قصے، کہانیاں، مفید اور دلچسپ معلومات، لطیفے مفید مشغلے، لیتھو اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں وغیرہ وغیرہ۔ غرض اسے پڑھنے کے بعد انھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، پچھلے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایک انجمن بھی "پیام برادری" کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجمن کے ذریعہ ان کے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے، تاکہ مفید مشغلوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کرسکیں۔ اسی خیال سے اس کا چندہ بھی صرف دو روپے آٹھ آنے رکھا گیا ہے۔ اسی چندہ میں سالنامہ بھی دیا جاتا ہے۔ یہ سنکر شاید تعجب ہو کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان اب تک "پیام تعلیم" جیسا سالنامہ نہ پیش کرسکی۔

فوراً خریدار بن جائیے تو سالنامہ **مفت** ملے گا، ورنہ ۱۲؍ آنے بھیج کر منگانا پڑے گا۔ سالنامہ ۲۹؍ اکتوبر کو شائع ہوگا۔

مکتبۂ جامعہ۔ قرول باغ، نئی دہلی

اس کو ضرور پڑھیئے

خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیئے۔ اور جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر مہینے کی دس تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ ورنہ پرچہ قیمتاً ارسال ہوگا۔ نمونہ کے لئے ساڑھے نوآنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔

منیجر کلیم دہلی

مستند اور مجرب ادویات

ہندوستانی دواخانہ دہلی سے طلب کیجیے، جسے ملک و قوم کے شیدائی طبی دنیا کے شہنشاہ حضرت مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے سنہ ۱۹۰۳ء میں قائم کیا تھا، اور جو آپ کے خلف الرشید عالی جناب مسیح الملک حکیم محمد جمیل خاں صاحب کی سرپرستی میں بدستور جاری ہے۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی نے اپنے پینتیس سالہ دور زندگی میں ملک میں بہترین مجرب دوائیں پیش کر کے جو عزت و وقار حاصل کیا ہے، اس کے لحاظ سے یہ دیسی دواؤں کا لاجواب کارخانہ ہے، علاوہ ازیں اس دواخانہ کا ایک خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے کسی کا ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے، بلکہ یہ ملک و قوم کی ملکیت ہے، اس کا منافع جو تقریباً دو لاکھ روپیہ سالانہ ہے مردانہ و زنانہ طبیہ کالج اور اس کے متعلقہ شفاخانوں پر خرچ ہوتا ہے۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی کی ہزارہا مستند و مجرب دواؤں میں سے مندرجۂ ذیل چار دوائیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں ان کو طلب کر کے فائدہ حاصل کیجیے۔

جمیلان

جریان اور رقت و سرعت کی لاجواب دوا ہے۔ مادۂ تولید کی اصلاح کرتی ہے اور قدرتی امساک پیدا کرتی ہے **ترکیب استعمال**۔ دو قرص صبح کو نہار منہ دودھ کے ساتھ کھائیں تیل ترشی اور گرم چیزوں سے پرہیز رکھیں قیمت فی شیشی ۳۲ قرص چار روپے آٹھ آنے

قرص مفاصل

گٹھیا (جوڑوں کا درد) عرق النساء (ٹانگ کا درد) کے لئے نہایت مفید ہے، یہ بیماریاں خواہ کیسی ہی پرانی ہوں اس دوا کے ۲۱ روز کے استعمال سے بالکل دور ہو جاتی ہیں، **ترکیب استعمال** ایک قرص رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے کھائیں تیل ترشی اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز فی شیشی ۲۱ قرص تین روپے

قرص جدید

غذا کو ہضم کرتے ہیں، بھوک لگاتے ہیں ریاح کو خارج کرتے اور نفخ اور قراقر کو زائل کرتے ہیں۔ **ترکیب استعمال**۔ ایک قرص دونوں وقت بعد غذا کھائیں۔ قابض بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز، قیمت ۱۰۰ قرص ایک روپیہ دو آنہ

قرص بواسیر

بادی بواسیر کے لئے نہایت مفید دوا ہے اس کے چند روزہ استعمال سے یہ مرض بالکل دور ہو جاتا ہے۔ **ترکیب استعمال** اس کے دو دو قرص صبح و شام پانی سے کھائیں، قابض، بادی، اور نفاخ چیزوں سے پرہیز، قیمت ۶۴ قرص دو روپیہ

تار کا پتہ: ہیڈی سنز دہلی

منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے

بہترین خوشبو منتخب کرسکوں، شمال کشمیر، جنت نظیر سوئزرلینڈ، مرغزاروں میں گل چینی کی گئی، سفر کے بعد مہارانی کے حضور خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی کہ مہارانی کی حُسن شناس نگاہوں خواہش کے پورا نہ ہونے سے کردیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا



تعمیلِ حکم کے لئے فردوس شباب انگیز لستمانیہ کے گلپاش جب سب پھول دُور دراز میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی اس قدر مُرجھائے ہوئے تھے، کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس ملول رہنے لگی، کھانا پینا ترک اور روزراء سے مشورہ طلب کیا،

مہتمم توشہ خانہ نے "اصغر علی محمد علی" سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ

ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

REG. NO. 3694. L.

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی

تازہ ترین تصنیف

جُنُون و حِکمَت

یعنی

مجموعۂ رباعیات

رُباعی، تمام اصنافِ سخن میں وہ تنہا رنگین، عمیق اور فلسفیانہ صنف ہے۔ جو عظیم شعرا کی مشاقی کے نقطۂ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ اور کسی شاعر کو اس وقت تک حقیقی رُباعی گو شاعر کا پُرشکوہ خطاب نہیں مل سکتا جب تک کہ اُس کی بے پناہ جنون پرور تخیلی قوت بلند ہوتے ہوتے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہمدوش نہیں ہو جاتی۔ بدبخت ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رُباعی بھی ہر چہ گیرد علتی علت شود کے زمرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے۔ یارانِ طریقت نے بزعم خود یہ سمجھ رکھا ہے کہ رباعی نام ہے رُباعی کی بحروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا۔ اور بس —— حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رباعی شاعرانہ مطالعے۔ شاعرانہ تفکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینیٔ خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی بھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔

اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تمنا پیدا ہوئی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوا ہوتا تو آپ کا یہ اولین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں جنون وحکمت کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاضیٔ قدرت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں بھی ایک خیام پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اُس کی قدر نہ فرمائیں —— آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک "فیٹز جیرلڈ" مل گیا تھا جس نے اُسے ایک زندہ قوم سے روشناس کرا دیا تھا۔ لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مردہ اور غلام ہے، اور غلامی کو عرفت یہی نہیں کہ کوئی "فیٹز جیرلڈ" نہیں ہوا کرتا، بلکہ خود اُس کی قوم بھی اُس کی قدرشناسی کے واسطے آسانی سے طیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون وحکمت مندرجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے۔ (۱) معارف (۲) خرابات (۳) حسن و عشق (۴) پیرانِ سالوس (۵) متفرقات۔

قیمت صرف تین روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

منیجر کلیم بک ڈپو، چینی نواس، دریا گنج دہلی